یؤتی الحکمة من یشاء ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا

فقہائے ہند

محمد اسحاق بھٹیؒ

دار النوادر

Marfat.com

فقہائے ہند

گیارھویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

بہ اشتراک

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور فون: ۸۸۹۸۶۳۹ ۰۳۰۰

Marfat.com

۱۱۶۹۸۷
جلد ۲

جملہ حقوق محفوظ
۲۰۱۳ء/۱۴۳۴ھ

نام کتاب: ــــــــ فقہائے ہند

مصنف: ــــــــ محمد اسحاق بھٹی

اہتمام: ــــــــ محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
بہ اشتراک دار النوادر

مطبع: ــــــــ شفیق پریس

حروف خوانی: ــــــــ محمد سعید بھٹی

کمپوزنگ: ــــــــ محمود فرید

صفحات: ــــــــ ۵۰۶

سرورق: ــــــــ ضیاء الرحمٰن

جلد ساز: ــــــــ بنیامین

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز،
مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 37320318، 37239884
ای میل: Kitabsaray@hotmail.com

فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

Marfat.com

ترتیب

مقدمہ	۱۱
جلال الدین اکبر	۱۱
ولادت	۱۱
اکبر کی گرفتاری	۱۲
اکبر کی تخت نشینی	۱۳
پانی پت کی دوسری لڑائی	۱۴
دور اکبری کی فتوحات	۱۶
اکبر کا نظام مملکت	۱۷
اکبر کی مذہبی زندگی کا پہلا دور	۱۹
دوسرا دور	۲۳
تیسرا اور آخری دور	۲۹
علمی خدمات	۳۳
وفات	۳۷
گیارھویں صدی ہجری	
الف	
۱۔ مفتی آدم بن محمد گوپاموی	۳۹
۲۔ شیخ ابراہیم محدث اکبرآبادی	۳۹
۳۔ قاضی ابراہیم بن محمد کالپوی	۴۱
۴۔ سید ابراہیم غیاث پوری	۴۱
۵۔ قاضی ابراہیم بیجاپوری	۴۲
۶۔ قاضی ابراہیم سندھی	۴۳
۷۔ مفتی ابوالبقا جون پوری	۴۴
۸۔ شیخ ابوبکر شافعی سندھی	۴۵
۹۔ قاضی ابوبکر الہ آبادی	۴۶
۱۰۔ شیخ ابوتراب بیجاپوری	۴۶
۱۱۔ شیخ ابوتراب گجراتی	۴۷
۱۲۔ سید ابوالحسن سورتی	۴۸
۱۳۔ شیخ ابوالحسن کشمیری	۴۸
۱۴۔ سید ابوحنیفہ نصیرآبادی بریلوی	۴۹
۱۵۔ شیخ ابوالخیر بن مبارک ناگوری	۴۹
۱۶۔ شیخ ابوالخیر ٹھٹھوی سندھی	۴۹
۱۷۔ شیخ ابوالخیر بھیروی	۵۰
۱۸۔ شیخ ابورضا دہلوی	۵۰
۱۹۔ شیخ ابوسعید گنگوہی	۵۰
۲۰۔ قاضی ابوسعید گجراتی	۵۱
۲۱۔ مولانا ابوسعید امیٹھوی	۵۱
۲۲۔ شیخ ابوالعلا جون پوری	۵۱
۲۳۔ شیخ ابوالفتح ملتانی	۵۲
۲۴۔ قاضی ابوالفتح بلگرامی	۵۲
۲۵۔ قاضی ابوالقاسم کشمیری	۵۲
۲۶۔ مولانا ابوالواعظ ہرگامی	۵۲
۲۷۔ شیخ احمد بن اسحاق نصیرآبادی	۵۳
۲۸۔ شیخ احمد بن حسین ناکطی بیجاپوری	۵۴
۲۹۔ شیخ احمد بن رضا حیدرآبادی	۵۴

Marfat.com

٣٠۔ قاضی احمد بن سلامہ جزائری	۵۴
٣١۔ مولانا احمد بن سلیمان کردی گجراتی	۵۵
٣٢۔ شیخ احمد بن عبداللہ حضرمی	۵۵
٣٣۔ شیخ احمد بیجاپوری	۵٦
٣٤۔ شیخ احمد بن علوی حضرمی	۵٦
٣۵۔ شیخ احمد بن علی بُسکری	۵۷
٣٦۔ شیخ احمد بن مجتبیٰ مانک پوری	۵۷
٣٧۔ شیخ احمد بن محمد حضرمی	۵۷
٣٨۔ مفتی احمد بن محمد بہاری	۵۹
٣٩۔ قاضی احمد عسکری بیجاپوری	٦٠
٤٠۔ شیخ احمد سرہندی۔ مجدد الف ثانی	٦٠
سرہند کی تعمیر	٦١
ابتدائی حالات	٦١
خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں	٦٢
ورودلاہور	٦٢
مذہبی حالات	٦٣
مسند تدریس	٦٤
منصب تجدید	٦٤
گھریلو صدمات اور حضرت مجدد کا صبر وضبط	٦٨
عہد جہاں گیری میں مجدد الف ثانی کی مساعی	٦٩
ردعمل	٧٠
جہاں گیر کے دربار میں	٧٠
قلعہ گوالیار میں	٧٤
قید سے رہائی	٧٤
عہد جہاں گیری میں شیخ کی تبلیغ دین اور اس کے اثرات	٧٦
حضرت مجدد کی تعلیمات	٧٨
توحید	٧٨
شرک کی سخت تردید	٨٠
غیر اللہ سے استمداد	٨١
نذرونیاز کا شرکیہ انداز	٨٢
نجات کا ذریعہ اتباع شریعت ہے	٨٢
اعتقادی مداہنت قابل معافی نہیں	٨٣
ادلہ احکام شرعیہ	٨٣
اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا فعل شنیع ہے	٨٤
غیر اللہ کو ”مالک دوجہان“ کہنا کلمہ شرک ہے	٨٤
زبان سے نماز کی نیت کے لفظ کہنا بدعت ہے	٨۵
بدعت کو بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ میں تقسیم کرنا غلط ہے	٨٦
فاتحہ خلف الامام کے بارے میں	٨٦
تصانیف	٨٧
مکتوبات کی علمی سرگرمیاں	٩١
تجدید دین	٩١
وفات	٩٢
٤١۔ شیخ اسداللہ ہرگامی	٩٣
٤٢۔ مفتی اسماعیل ہرگامی	٩٣
٤٣۔ شیخ اسماعیل بن محمود سندھی	٩٣
٤٤۔ شیخ اسماعیل لاہوری	٩٤
٤۵۔ شیخ اسماعیل محدث بیجاپوری	٩٤
٤٦۔ شیخ افضل محمد اکبرآبادی	٩٤
٤٧۔ قاضی اللہ داد بلگرامی	٩۵
٤٨۔ مولانا اللہ داد سلطان پوری	٩۵
٤٩۔ شیخ امین بن احمد نہروالی	٩٦

Marfat.com

ب	
۵۰۔ شیخ بابو بن شیخ جیو گجراتی	۹۷
۵۱۔ شیخ بایزید انصاری سہارن پوری	۹۷
۵۲۔ شیخ بایزید بلگرامی	۹۷
۵۳۔ شیخ بدرالدین سرہندی	۹۸
۵۴۔ قاضی بدرالدین صدیقی بدایونی	۹۸
۵۵۔ شیخ برہان الدین برہان پوری	۹۸
۵۶۔ شیخ بلال لاہوری	۱۰۰
۵۷۔ شیخ بہلول دہلوی	۱۰۰
پ	
۵۸۔ شیخ پیر محمد سلونی	۱۰۱
۵۹۔ شیخ پیر محمد لکھنوی	۱۰۲
۶۰۔ شیخ پیر محمد جیندی	۱۰۳
ت	
۶۱۔ شیخ تاج الدین گجراتی	۱۰۳
۶۲۔ شیخ تاج الدین دہلوی	۱۰۴
۶۳۔ شیخ تاج الدین صدیقی جھونسوی	۱۰۵
ث	
۶۴۔ قاضی ثناء اللہ مچھلی شہری	۱۰۶
۶۵۔ قاضی ثناء اللہ جون پوری	۱۰۶
ج	
۶۶۔ مولانا جان محمد لاہوری	۱۰۶
۶۷۔ شیخ جعفر بن جلال الدین گجراتی	۱۰۷
۶۸۔ شیخ جعفر بن علی گجراتی	۱۰۸
۶۹۔ شیخ جعفر حسینی پٹنوی	۱۰۹
۷۰۔ شیخ جعفر بن عزیز اللہ جون پوری	۱۱۰
۷۱۔ شیخ جلال الدین گجراتی	۱۱۱
۷۲۔ ملا جمال اولیا کوڑوی	۱۱۱
۷۳۔ شیخ جمال الدین کشمیری	۱۱۲
۷۴۔ مولانا جمال الدین لاہوری	۱۱۲
۷۵۔ مولانا جمال الدین برہان پوری	۱۱۳
۷۶۔ شیخ جمیل الدین سہارن پوری	۱۱۳
۷۷۔ ملا جوہر نانت کشمیری	۱۱۳
۷۸۔ امیر جوہر احمد نگری	۱۱۵
ح	
۷۹۔ مولانا حاجی محمد کشمیری	۱۱۶
۸۰۔ مولانا حبیب اللہ سندھی	۱۱۶
۸۱۔ مفتی حسام الدین دہلوی	۱۱۷
۸۲۔ سید حسن بلگرامی	۱۱۷
۸۳۔ سید حسین بلگرامی	۱۱۷
۸۴۔ شیخ حسین ہروی	۱۱۷
۸۵۔ مولانا حسین خباز کشمیری	۱۱۸
۸۶۔ قاضی حسین سترکھی	۱۱۸
۸۷۔ مولانا حمیدالدین سندھی	۱۱۸
۸۸۔ مولانا حیدر کشمیری	۱۱۹
خ	
۸۹۔ خواجہ بہاری لاہوری	۱۲۰
۹۰۔ قاضی خلیل الرحمٰن گورکھ پوری	۱۲۰
۹۱۔ قاضی خوب اللہ جون پوری	۱۲۱
۹۲۔ مولانا خوشحال تاشقندی	۱۲۱
۹۳۔ قاضی خوشحال کابلی	۱۲۲
د	
۹۴۔ مولانا دانیال جوراسی	۱۲۲

Marfat.com

۹۵۔ مولانا داؤد مشکوٰتی کشمیری ۱۲۲
۹۶۔ ملا درویزہ پشاوری ۱۲۳

ر

۹۷۔ مولانا رضی الدین بھاگل پوری ۱۲۹
۹۸۔ سید رفیع الدین بلگرامی ۱۳۰
۹۹۔ مولانا رفیع الدین انصاری سہارن پوری ۱۳۰
۱۰۰۔ مفتی رکن الدین دہلوی ۱۳۱
۱۰۱۔ شیخ رکن الدین سنامی گنوری ۱۳۱

ز

۱۰۲۔ شیخ زین الدین اکبرآبادی ۱۳۲

س

۱۰۳۔ حاجی سلطان تھانیسری ۱۳۲
۱۰۴۔ علامہ سلیمان کردی گجراتی ۱۳۳

ش

۱۰۵۔ مولانا شاکر محمد دہلوی ۱۳۴
۱۰۶۔ ملا شاہ محمد بدخشی ۱۳۴
۱۰۷۔ مولانا شاہ محمد اخسیکتی ۱۳۵
۱۰۸۔ مفتی شرف الدین لاہوری ۱۳۵
۱۰۹۔ مولانا شمس الدین بروتوی جون پوری ۱۳۶
۱۱۰۔ مولانا شہباز بھاگل پوری ۱۳۶
۱۱۱۔ سید شیخ بن عبداللہ حضرمی ۱۳۷
۱۱۲۔ مولانا شیر محمد برہان پوری ۱۳۸

ص

۱۱۳۔ شیخ صبغۃ اللہ بیجاپوری ۱۳۸
۱۱۴۔ مفتی صدر جہان پھانوی کیتھلی ۱۳۹

ض

۱۱۵۔ مولانا ضیاء الدین جون پوری ۱۴۰
۱۱۶۔ شیخ ضیاء اللہ اکبرآبادی ۱۴۰

ط

۱۱۷۔ علامہ طاہر سندھی برہان پوری ۱۴۴
۱۱۸۔ شیخ طیب بلگرامی ۱۴۶
۱۱۹۔ شیخ طیب بنارسی ۱۴۶
۱۲۰۔ قاضی طیب عباسی موی ۱۴۷

ع

۱۲۱۔ شیخ عباس برہان پوری ۱۴۷
۱۲۲۔ شیخ عبدالاحد سرہندی ۱۴۸
۱۲۳۔ علامہ عبدالباقی جون پوری ۱۴۸
۱۲۴۔ مولانا عبدالجلیل جون پوری ۱۴۹
۱۲۵۔ مولانا عبدالجلیل لکھنوی ۱۴۹
۱۲۶۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۱۵۰
آغا محمد ترک ۱۵۰
ملک موسیٰ ۱۵۱
شیخ فیروز ۱۵۲
شیخ سعداللہ ۱۵۳
شیخ رزق اللہ ۱۵۴
شیخ سیف الدین ۱۵۵
شیخ عبدالحق دہلوی کی ولادت ۱۵۸
ابتدائی تعلیم وتربیت ۱۵۸
فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۶۱
دہلی سے روانگی ۱۶۴
شیخ محدث مکہ مکرمہ میں ۱۶۴
دیار ہند میں واپسی ۱۶۹
شیخ عبدالحق اور شاہان ہند ۱۷۰
شیخ محدث اور جہانگیر بادشاہ ۱۷۱
جہانگیر سے ملاقات ۱۷۲

Marfat.com

♦ شیخ کا مکان، مدرسہ اور کتب خانہ	۱۷۵
♦ تصانیف و تالیفات	۱۷۷
♦ تفسیر	۱۷۷
♦ تجوید و قرأت	۱۷۸
♦ حدیث	۱۷۹
♦ فقہ	۱۸۶
♦ عقائد	۱۸۶
♦ تصوف	۱۸۷
♦ اخلاق	۱۸۸
♦ وظائف و اوراد	۱۸۹
♦ منطق اور فلسفہ	۱۸۹
♦ تاریخ	۱۹۰
♦ سیاست	۱۹۲
♦ تذکرہ و سیرت	۱۹۲
♦ علم نحو	۱۹۳
♦ ذاتی حالات سے متعلق	۱۹۴
♦ خطبات	۱۹۴
♦ مکاتیب	۱۹۴
♦ شعر و شاعری	۱۹۵
♦ وفات	۱۹۷
♦ اولاد	۱۹۷
♦ مراجع و مصادر	۲۰۰

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کے فضل خاص اور اس کی نصرت کاملہ سے سلسلہ فقہائے ہند کی چوتھی جلد کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اس جلد میں اپنے محدود علم کے مطابق برصغیر پاک ہند کے گیارھویں صدی ہجری کے علما وفقہا کے حالات و سوانح بیان کیے گئے ہیں۔ گیارھویں صدی کا زمانہ علمی اعتبار سے برصغیر کا زرخیز زمانہ ہے۔ اس زمانے میں برصغیر کے مختلف بلاد وامصار میں اہل علم کی بوقلموں خدمات علمی کا دائرہ دور دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے، جس کو ایک جلد میں سمیٹنا مشکل تھا۔ لہٰذا اس کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

یہ جلد جو معزز قارئین کے پیش نگاہ ہے، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات تک ہے اور ایک سو چھبیس علما وفقہا کے علمی، فقہی، تدریسی، تصنیفی کارناموں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس سے اگلے حصہ کا آغاز علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے حالات سے ہوگا۔

دسویں صدی ہجری کا نصف آخر اور گیارھویں صدی کا دور ہندوستان میں مغل حکومت کے عروج کا دور ہے۔ اس دور میں یکے بعد دیگرے دودمان مغلیہ کے تین نامور حکمران تخت ہند پر متمکن ہوئے۔ وہ تھے جلال الدین محمد اکبر، نورالدین محمد سلیم جہاں گیر اور شہاب الدین خرم شاہ جہان۔!

جلال الدین اکبر کے دور کے بہت سے علما وفقہاء کا تذکرہ ''فقہائے ہند'' کی جلد سوم میں بھی مرقوم ہے اور جلد چہارم میں بھی۔ لیکن خود اکبر کی وفات چونکہ گیارھویں صدی ہجری کے اوائل (۱۰۱۴ھ) میں ہوئی، لہٰذا اس کے وہ حالات، جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں، زیر مطالعہ کتاب (چوتھی جلد) میں تحریر کیے جا رہے ہیں۔ جہاں گیر اور شاہ جہان کے بارے میں ہمارے دائرۂ موضوع سے مناسبت رکھنے والے واقعات پانچویں جلد میں ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔

Marfat.com

مقدمہ

جلال الدین اکبر

فقہائے ہند کی جلد سوم کے مقدمے میں ہندوستان کی مغل حکومت کے معمارِ اول ظہیر الدین بابر اور اس کے بیٹے نصیر الدین ہمایوں کے علمی و دینی پہلو قارئین کے مطالعہ میں آ چکے ہیں اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ علمائے وقت کے ساتھ ان کے تعلقات کی کیا نوعیت تھی اور فقہائے عصر سے وہ کس درجہ مودت و موانست کا برتاؤ کرتے تھے۔ اب فقہائے ہند کی جلد چہارم کے مقدمے میں اختصار کے ساتھ اس امر کی وضاحت کرنا مقصود ہے کہ بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کے عہد حکومت کے لیل و نہار کس قسم کے تھے اور اس میں اہل علم کو کیا حیثیت حاصل تھی۔ نیز دینی و مذہبی اعتبار سے دورِ اکبری کن کیفیات کا عکاس اور کن رجحانات کا آئینہ دار تھا۔

ولادت:

اکبر کی ولادت اتوار کے روز ۵ ربیع الاول ۹۴۹ھ/ ۱۹ جون ۱۵۴۲ء کو علاقہ سندھ میں عمر کوٹ کے مقام پر حمیدہ بانو کے بطن سے ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس کا باپ ہمایوں، شیر شاہ سوری کے حملے اور بھائیوں کی بے وفائی کی وجہ سے سخت پریشان کن حالات میں گھرا ہوا تھا اور اپنے چند وفادار ساتھیوں کی معیت میں ہندوستان کو خیر باد کہہ کر سندھ کے راستے قندھار جا رہا تھا۔ جب وہ عمر کوٹ سے کوچ کر کے چول کے مقام پر پہنچا تو نومولود بیٹے کو پاس بلوایا اور اسے دیکھ کر خوش ہوا۔

ہمایوں کے لیے یہ انتہائی مصیبت کے دن تھے۔ تا حد نگاہ لق و دق صحرا، دور تک نہ کہیں درخت نہ سایہ، پانی کی قلت، کھانے کی تکلیف، سندھ کے راجوں اور حکمرانوں سے ہر آن حملے کا خطرہ، سواری کے لیے اونٹوں اور گھوڑوں کی کمی۔ یہ سفر نہایت صبر آزما تھا اور ہمایوں کے مختصر لشکر میں سخت انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ لوگ لشکر سے کنارہ کشی اختیار کرتے جا رہے تھے، منعم خاں بھی، جو ہمایوں کا معتمد علیہ سردار تھا، ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ البتہ بیرم خان جو ان دنوں گجرات میں مقیم تھا، لشکر ہمایوں میں آ کر شامل ہوا۔ اس زمانے میں مرزا شاہ حسین سندھ کا بادشاہ تھا۔ اسے ہمایوں سے خطرہ تھا اور ہمایوں اس سے خوف زدہ تھا۔ ہمایوں نے اس سے سفر کے لیے کچھ کشتیاں اور اونٹ مانگے، اس نے وہاں سے ہمایوں کے چلا جانے کو غنیمت جانا اور فوراً تیس کشتیوں

Marfat.com

اور تین سو اونٹوں کا انتظام کر دیا گیا۔ اب ہمایوں دریائے سندھ عبور کر کے حدود ہند سے باہر نکل گیا۔

نوع بنوع مصائب برابر ہمایوں کے تعاقب میں لگے ہوئے تھے اور سامنے مہیب مشکلات منہ پھاڑے کھڑی تھیں۔ اب اس کا کاروان حیات ایک اور خطرناک موڑ میں داخل ہوتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اس زمانے میں ہمایوں کے بھائی مرزا کامران نے قندھار کا علاقہ مرزا ہندال سے چھین کر مرزا عسکری کے حوالے کر دیا تھا اور مرزا ہندال کو غزنی کی حکومت دے دی تھی۔ ہمایوں نے قندھار کا قصد کیا تو مرزا کامران نے شاہ حسین کی انگیخت پر مرزا عسکری کو خط لکھا کہ ہمایوں نے قندھار کا رخ کر لیا ہے، جس طرح ممکن ہو، اسے گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ جب ہمایوں اپنے رفقا کے ہمراہ شال شانگ (موجودہ کوئٹہ) کے مقام پر پہنچا تو مرزا عسکری نے اس کا راستہ روکنے کے لیے فوج کو حرکت دی اور چولی بہادر نامی ایک ازبک کو ہمایوں کے لشکر کی مخبری پر مامور کیا۔ چولی بہادر بجائے ہمایوں کی مخبری کرنے اور مرزا عسکری کو اس کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے، نصف شب کو ہمایوں کے لشکر میں آیا۔ بیرم خاں سے ملا اور اس کو تمام حالات سے مطلع کیا۔ بیرم خاں نے اسی وقت شاہی سراپردہ کے پیچھے پہنچ کر سب باتیں ہمایوں کے گوش گزار کر دیں۔ ہمایوں نے اپنے آگے بھائیوں کی سازش کا وسیع جال بچھا ہوا دیکھا تو قدم روک لیے۔ کابل اور قندھار جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور صرف بائیس آدمیوں کو ساتھ لے کر، جن میں بیرم خاں اور خواجہ معظم بھی شامل تھے، عراق کا عزم کیا۔ بیرم خاں اور خواجہ معظم کو ہمایوں نے اپنی بیوی حمیدہ بانو جسے بادشاہ بیگم بھی کہا جاتا ہے اور بیٹے شہزادہ اکبر کو لانے کی ہدایت کی۔ اس وقت ہمایوں کے پاس مناسب سواری کا انتظام بھی نہ تھا۔ مجبور ہو کر ایک مصاحب تردی بیگ کے آگے ہاتھ پھیلائے اور چند گھوڑے طلب کیے، مگر تردی بیگ نے اس نازک موقعے پر سخت اذیت ناک رویہ اختیار کیا۔ گھوڑے دینے سے بھی انکار کر دیا اور ہمایوں کا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔

اکبر کی گرفتاری:

شہزادہ اکبر کی عمر اس وقت صرف ایک سال تھی۔ ان دنوں شدید گرمی پڑ رہی تھی اور راستے میں پانی میسر نہ آنے کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لیے ہمایوں نے شہزادہ کو اپنے ایک امیر کے سپرد کر کے لشکر گاہ میں چھوڑ دیا اور بیوی کو ہمراہ لے کر رخصت ہو گیا۔ ہمایوں کے عازم عراق ہوتے ہی مرزا عسکری نے حملہ کر کے اس کے لشکر کو لوٹ لیا اور بعض امرا کو گرفتار کر لیا۔ شہزادہ اکبر کو بھی اپنے ساتھ قندھار لے گیا اور اسے اپنی بیوی سلطان بیگم کے سپرد کر دیا۔۔۔۔ یہ واقعات جن کی بہت سی تفصیلات چھوڑ دی گئی ہیں ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں پیش آئے۔

اب ہمایوں نے سب طرف سے مایوس ہو کر شاہ طہماسپ کے دروازے پر دستک دی اور اس سے طالب امداد ہوا۔ طہماسپ کی مدد سے ہمایوں نے قندھار بھی فتح کر لیا اور ۱۰ رمضان ۹۵۲ھ/ ۱۵ نومبر ۱۵۴۵ء کو کابل پر بھی فتح حاصل کر لی۔ کابل کی فتح کے بعد اس نے اکبر کو بھائی کی گرفت سے آزاد کرایا اور اسے دیکھ کر

Marfat.com

انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔ اس اثنا میں ہمایوں کے بھائی اس سے معافی بھی مانگتے رہے اور ساتھ ہی بے وفائی بھی کرتے رہے۔ لیکن ہمایوں جو نرم خو اور حلیم الطبع حکمران تھا، بار بار فراخ دلی سے ان کی معذرت سنتا اور انھیں ہر مرتبہ معاف کرتا رہا۔

فتح کابل کے بعد ہمایوں نے تسخیر بدخشاں کے ارادے سے اپنے لشکر کو حرکت دی۔ وہاں سلیمان مرزا سے مقابلہ ہوا۔ سلیمان مرزا کچھ عرصے تک لڑتا رہا، آخر شکست کھا کر فرار ہو گیا۔ لیکن اس اثنا میں ہمایوں پر ایک آفت یہ ٹوٹی کہ مرزا کامران نے کابل کو خالی پا کر، اس پر فوج کشی کر دی اور شہر پر قابض ہو گیا۔ ساتھ ہی ہمایوں کی خواتین اور شہزادہ اکبر کو قید کر لیا۔

ہمایوں نے یہ خبر سنی تو نہایت پریشان ہوا۔ بدخشاں کی فتح کے بعد ہمایوں نے اس کی حکومت پہلے مرزا ہندال کو دے دی تھی، بعد میں اس سے لے کر دوبارہ مرزا سلیمان کے حوالے کر دی اور خود نہایت تیزی سے کابل کی طرف لوٹ گیا۔ مرزا کامران کو اس کی فوجی نقل و حرکت کا پتا چلا تو اس نے شہر سے باہر مورچہ قائم کر لیا۔ لڑائی کا بازار گرم ہوا اور کامران کو میدان جنگ میں بری طرح ہزیمت اٹھانا پڑی۔ لیکن وہ بھاگنے کی بجائے پسپا ہو کر قلعہ کابل میں محصور ہو گیا۔ باہر ہمایوں لشکر لیے بیٹھا تھا۔ سخت محاصرے کی وجہ سے مرزا کامران کے حالات انتہائی ابتر ہو گئے۔ اس دوران میں مرزا کامران نے بدرجہ غایت سنگ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کئی مرتبہ دو سال کے شہزادہ اکبر کو قلعے کے اس کنگرے پر بٹھایا، جو توپوں، بندوقوں اور تیروں کی عین زد میں تھا۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ بیٹے کی جان کے خوف سے ہمایوں جنگ سے دست بردار ہو جائے۔ یہ منظر ہمایوں اور اس کی فوج کے لیے سخت تکلیف اور ذہنی اذیت کا باعث تھا۔ لیکن اکبر کی جان ہر بار سلامت رہی۔ بالآخر مقابلے کی تاب نہ لا کر کامران قلعے سے فرار ہو گیا اور شہزادہ اکبر صحیح سلامت باپ کو دوبارہ مل گیا۔

سلسلۂ واقعات کی متعدد کڑیاں حذف کر کے یہ تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے کہ اکبر کی زندگی کے ابتدائی حالات قارئین کے سامنے آ سکیں اور وہ یہ معلوم کر سکیں کہ اقتدار کی ہوس اور حکومت کی حرص بسا اوقات انسانیت کا خاتمہ کر دیتی ہے اور اپنے پرائے میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہنے دیتی۔ نہ اس کو خون کے رشتے کا کوئی پاس ہوتا ہے اور نہ چھوٹے پر رحم و شفقت کا کوئی احساس اس میں باقی رہتا ہے۔ ہمایوں کے ساتھ اس کے بھائیوں اور اکبر کے ساتھ اس کے چچاؤں نے جو کچھ کیا، وہ اس کی واضح مثال ہے۔

اکبر کی تخت نشینی:

جلال الدین محمد اکبر باختلاف روایات ۲ یا ۷؍ ربیع الثانی ۹۶۳ھ/ جنوری ۱۵۵۶ء کو چودہ برس کی عمر میں اپنے باپ نصیر الدین ہمایوں کی وفات کے بعد تخت ہند کا وارث بنا۔ ہمایوں ۷؍ ربیع الاول ۹۶۳ھ/ ۲۰؍ جنوری ۱۵۵۶ء کو بالا خانے کی سیڑھیوں سے گرا تھا۔ ایک ہفتہ تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد ۱۵؍ ربیع الاول

Marfat.com

۹۶۳ھ ۱۸؍جنوری ۱۵۵۶ء کو فوت ہوا۔ منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کی تاریخ تخت نشینی ۲؍ ربیع الاول تحریر کی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ نظام الدین ہروی نے طبقات اکبری میں ایک جگہ ۲؍ربیع الاول اور دوسری جگہ ۶؍ربیع الثانی لکھی ہے۔ مآثر رحیمی میں ملا عبدالباقی نہاوندی نے ۷؍ربیع الثانی رقم کی ہے۔ ظاہر ہے ۲؍ربیع الاول تو کسی طرح قرین صحت نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ ہمایوں ۷؍ربیع الاول کو سیڑھیوں سے گرا اور ۱۵؍ ربیع الاول کو فوت ہوا۔ اس صورت میں اس کے جانشین کی تاریخ تخت نشینی ۲؍ربیع الاول کیوں کر صحیح قرار پاسکتی ہے؟ یا تو یہ کتابت کی غلطی ہے یا مصنف سے سہو ہوگیا ہے۔

ہمایوں کی وفات کے وقت اکبر موجودہ جغرافیائی اعتبار سے قصبہ کلانور ضلع گورداس پور (مشرقی پنجاب) میں خانِ خاناں بیرم خان کے پاس مقیم تھا۔ وہیں خان خاناں بیرم خاں کے مشورے اور تائید سے اس نے ہندوستان کا تاج شاہی سر پر رکھا۔

اکبر کی زندگی کا آغاز ہی جدوجہد اور ہنگاموں کے ہجوم میں ہوا تھا۔ تخت نشینی کے بعد بھی اس کو یہی صورت حال پیش آئی۔ مقابلے، محاربے اور جنگ وجدال اس کی زندگی کا ایک لازمی جز بن گئے تھے۔

پانی پت کی دوسری لڑائی:

اکبر کی پہلی بڑی جنگ ہیموں بقال کے ساتھ پانی پت کے میدان میں ہوئی۔ ہیموں بقال یا ہیموں بنیا، عادل شاہ سوری کا وزیر اور سپہ سالار تھا۔ ریواڑی کا باشندہ تھا اور غرور ونخوت کی آخری حدوں تک پہنچ گیا تھا۔ وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی کی طرف یلغار کرتا ہوا بڑھا اور اس پر قابض ہوگیا۔ دہلی پر قبضے کے بعد اس نے بہت طاقت پیدا کر لی تھی اور اپنا خطاب بکر ماجیت رکھ کر خود مختار حاکم بن بیٹھا تھا۔ اسلامی قوانین منسوخ کر دیے تھے اور انتہائی سرکش ہوگیا تھا۔ اکبر کو اس کی اطلاع پہنچی تو اس نے فوج اور ضروری اسلحہ کے ساتھ دہلی کی طرف کوچ کیا۔ مقابلے کے لیے ہیموں بقال بھی دہلی سے روانہ ہوا اور پندرہ سو جنگی ہاتھیوں، توپ خانے، بہت بڑی فوج اور کثیر حربی ساز وسامان کے ساتھ پانی پت کے قریب آ کر پڑاؤ کیا۔ تزک جہاں گیری کی روایت کے مطابق ۲؍محرم ۹۶۴ھ/۵؍نومبر ۱۵۵۶ء کو اور منتخب التواریخ کی رو سے ۱۰؍محرم ۹۶۴ھ/۱۳؍نومبر ۱۵۵۶ء کو جمعے کے روز دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر اتریں۔ خود اکبر شاہی لشکر کے ساتھ تھا اور فوج کو برابر کمک بھیج رہا تھا۔ تزک جہاں گیری کی روایت کے مطابق اس لڑائی میں ہیموں کے سواروں کی تعداد تیس ہزار اور اکبر کے لشکر کی تعداد چار پانچ ہزار تھی۔ جنگ میں ہیموں کی فوج کو شکست ہوئی۔ اس کے ہزاروں فوجی مارے گئے۔ خود ہیموں کو زخمی حالت میں جب کہ اس پر بے ہوشی طاری تھی، اکبر کے پاس لایا گیا۔ بعض امرا نے اکبر سے عرض کیا کہ یہ حضور کا پہلا جہاد ہے۔ اس کافر پر اپنی تلوار کی دھار آزمائیں۔ اکبر نے جو بڑے دل گردے کا مالک اور بہت متحمل مزاج بادشاہ تھا، جواب دیا:

Marfat.com

ایں را کہ حالا حکم مردہ دارد چہ بزنم، اگر در حس وحرکتے می بود تیغ آزمائی کردم ❶۔
یعنی اس پر موت کی کیفیت طاری ہے، اسے کیا قتل کروں، اگر اس میں کچھ جان ہوتی تو تیغ آزمائی کرتا۔

اس سے قبل اکبر کی تخت نشینی کے وقت بھی، جب دربار شاہی کے ایک امیر ابوالمعالی نے، تاج پوشی کی تقریب میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا ایک شخص نے اس کو پکڑ کر جان سے مارنے کی کوشش کی تھی، مگر اکبر نے یہ کہہ کر اس کی جان بچائی کہ

دراول جلوس حیف باشد خون بے گناہے ریختن ❷۔
(تخت حکومت پر بیٹھنے کے پہلے ہی روز کسی بے گناہ کو قتل کر دینا افسوس ناک بات ہے۔)

بہر حال پانی پت کی اس دوسری لڑائی میں اکبری فوج کو پندرہ سو ہاتھی، بے شمار خزانہ اور بہت سامال و اسباب غنیمت میں ملا۔ ہیموں کی بیوی بہت بڑا خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر پہلے ہی بھاگ گئی تھی۔ اس کا تعاقب کرنے والے اکبر کے فوجی دستوں نے اس کو الور سے آگے جا کر گھیر لیا اور وہ خزانہ چھوڑ کر جنگلوں اور کوہستان بجوارہ اور کوامیں چلی گئی۔ اس کا کچھ خزانہ تو جاٹوں نے لوٹ لیا اور کچھ مغل فوج کے ہاتھ آیا، مگر اس کے باوجود وہ اتنا زیادہ تھا کہ اکبر کے سپاہیوں نے ڈھالوں میں بھر بھر کر اس کو آپس میں تقسیم کیا۔ جس راستے سے ہیموں کی بیوی بھاگی تھی، اس میں اشرفیاں اور سونے کی اتنی اینٹیں گری تھیں کہ اس واقعہ کے بہت عرصے بعد تک وہ راہ گیروں کو ملتی رہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

وخزینہ کہ شیر شاہ وسلیم شاہ وعدلی، سالہا جمع کردہ بودند، بایں گونہ تلف شد ❸۔
(یہ وہ خزانہ تھا جو شیر شاہ سوری، سلیم شاہ سوری اور عادل شاہ اپنے زمانے میں جمع کرتے رہے تھے، وقت کے ہاتھوں وہ اس طرح تباہ و تاراج ہوا۔)

فتح کے دوسرے دن اکبر پانی پت پہنچا۔ وہاں سے کوچ کر کے جاہ وحشم کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا اور منبر پر از سر نو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

اس سے ٹھیک بتیس سال قبل ۸؍رجب ۹۳۲ھ/۲۰؍اپریل ۱۵۲۶ء کو بروز جمعہ اکبر کے دادا ظہیر الدین بابر نے اسی میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دی تھی۔ تاریخ میں اس جنگ کو پانی پت کی پہلی جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جنگ میں ابراہیم لودھی کی افواج قاہرہ ایک لاکھ سوار اور ایک ہزار ہاتھیوں پر مشتمل تھیں، جب کہ بابر کے پاس صرف پندرہ ہزار سوار اور پیادے تھے۔

❶ منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۱۶۔ (مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء)
❷ ایضاً
❸ منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۱۷۔ (مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء)

Marfat.com

جلوس شاہی کے تیسرے سال ۱۷ر محرم ۹۶۵ھ/۹ر نومبر ۱۵۵۷ء کو اکبر کی شاہانہ سواری آگرہ میں داخل ہوئی۔

دور اکبری فتوحات:

اکبر سے پہلے اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کئی علاقائی سلطنتیں قائم تھیں اور مرکزی حکومت بھی مسلمانوں ہی کی تھی، تاہم ان کی سیاسی حیثیت زیادہ مستحکم نہ تھی۔ ملک متعدد علاقائی سلطنتوں میں بٹا ہوا تھا، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں سیاسی کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ شمالی ہند میں ہندو راجے اور غیر مسلم حکمران بڑی طاقت کے مالک تھے، جن میں رانا کنبھ، رانا سانگا، مالوہ کا میدنی رائے پنجاب کا جسرت کھوکھر اور ہیموں بقال خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ رانا سانگا کی طاقت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب بابر ہندوستان میں آیا تو دارالسلطنت آگرہ کے تخت پر ابراہیم لودھی متمکن تھا، مگر پورے شمالی ہند میں سب سے زیادہ اقتدار رانا سانگا کو حاصل تھا۔ اس زمانے میں مالوہ، گجرات اور خاندیش وغیرہ کے مسلمان حکمرانوں میں اگرچہ بعض حکمران آگرہ اور دہلی کے مرکز سے زیادہ مضبوط اور رعب و دبدبے کے مالک تھے، لیکن رانا سانگا کی طاقت سے سب لرزتے اور خوف کھاتے تھے۔ ابراہیم لودھی سمیت یہ حکمران کئی مرتبہ رانا سانگا سے شکست کھا چکے تھے۔ اس کا زور بابر نے توڑا۔ میدان جنگ میں اس کو شکست فاش ہوئی اور وہ اسی صدمے میں ۹۳۴ھ/ ۱۵۲۸ء کو میواڑ کے پہاڑوں میں وفات پا گیا، مگر افسوس ہے بابر کو زیادہ عرصہ ہندوستان میں حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ دہلی کی فتح پر ابھی چار سال بھی نہ گزرے تھے کہ اس کو موت کا پیغام آ گیا۔ اس کے بعد ہیموں بقال کو جو ایک زبردست اور متمرد ہندو جرنیل تھا، اکبر نے ختم کیا۔

اجمیر، ناگور اور ردولی وغیرہ میں بھی مسلمانوں کی حالت ابتر تھی اور ان کی مساجد کا تقدس ہندوؤں کے ہاتھوں پامال ہو چکا تھا۔ اسی طرح ہندوؤں کی بھگتی تحریک، گورونانک کے صلح کل رویے اور بعض دیگر عوامل نے مسلمانوں پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ پھر جنوبی ہند میں وجے نگر کی ہندو سلطنت نے جو ایک خودمختار اور وسیع سلطنت تھی، اس نواح میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے راستے میں سخت رکاوٹیں پیدا کیں۔ بلاشبہ بعض مسلمان حکمرانوں نے صورت حال کی اصلاح کے لیے بھرپور کوششیں کیں اور اس میں بہت حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے، مگر ان کا دور اقتدار و اصلاح بہت کم تھا۔ موت نے ان کو زیادہ تگ و تاز کی مہلت نہ دی۔ ان حکمرانوں میں بابر اور شیر شاہ سوری کے نام لائق تذکرہ ہیں۔

اکبر نے زمام اقتدار ہاتھ میں لینے کے بعد اس طرف پوری توجہ مبذول کی اور استحکام سلطنت کو سب امور سے مقدم گردانا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ہندوستان کے جو صوبے خودمختاری کا دعویٰ کرنے لگے تھے اور طویل عرصے سے مرکز کی گرفت سے باہر تھے، انھیں پھر سے سلطنت دہلی کے زیر نگین کیا اور وہ ان کے مرکز

Marfat.com

گریز رجحانات کو ختم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اکبر کے عہد میں مغلیہ سلطنت کے دائرے میں بڑی وسعت ہوئی اور پورے ہندوستان میں اس کا علم اقتدار لہرانے لگا۔ مالوہ فتح ہوا، گونڈوانہ مغلیہ سلطنت میں شامل ہوا، جے پور کے راجا بہاری مل سے صلح ہوئی، جس کے نتیجے میں راجا نے کور نے اکبر کی اطاعت قبول کی اور اپنے خاندان کی ایک لڑکی اس کے عقد میں دے دی۔ ساتھ ہی راجا کے بیٹے بھگوان داس اور پوتے مان سنگھ کو اعلیٰ مناصب عطا ہوئے، میواڑ کے راجا نے اس صلح کی مخالفت کی تو اکبر کے ہاتھوں چتوڑ کا قلعہ فتح ہوا، کالنجر اور رنتھنبور کے مشہور قلعے اکبر کے قبضے میں آئے، جیسلمیر اور بیکانیر کے راجوں کو اپنا اطاعت گزار بنایا۔ گجرات پر فتح حاصل کی اور بنگال پر قبضہ کیا۔

اس کے بعد فتوحات کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس میں اکبر نے کشمیر اپنے تابع فرمان کیا۔ اس سے قبل کشمیر کو مستقل سلطنت کی حیثیت حاصل تھی اور وہ کبھی شاہان ہند کے زیر فرمان نہ آیا تھا۔ سندھ پر اقتدار کا پرچم لہرایا، اڑیسہ پر تسلط جمایا، بلوچستان فتح کیا اور قندھار اکبری مقبوضات میں شامل ہوا۔

پھر دکن کی طرف عنان توجہ مبذول کی۔ احمد نگر کا مضبوط قلعہ اپنی مملکت میں شامل کیا اور خاندیش کا مستحکم قلعہ اسیر گڑھ مسخر کیا، جس کے نتیجے میں احمد نگر اور خاندیش کے تمام وسیع علاقے مقبوضاتِ مغلیہ میں شامل ہو گئے۔

اس طرح اکبر نے ہندوستان کی علاقائی سلطنتیں تقریباً ختم کر دیں اور مختلف راجاؤں اور حکمرانوں کا زور توڑ دیا اور پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اکبر کی ان مسلسل فتوحات کو تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

اکبر کا نظام مملکت:

نظام سلطنت کے سلسلے میں اکبر بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ وہ صاحب تدبیر، منتظم، فاتح، جنگ جو اور قابل حکمران تھا۔ اس میں ملک گیری، حکمرانی اور ملک رانی کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس نے اس وسیع ملک میں جس انداز سے حکومت کی اور نظم ونسق کے دائروں کو جس نہج سے وسعت دی، وہ اسی کا حصہ تھا۔ پھر اس نے ایک خاص ملکی نظام مرتب کیا، جو آگے چل کر معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں برقرار رہا اور کئی امور میں برطانوی نظام حکومت کی بنیاد بنا، جس پر ہندوستان اور پاکستان اب بھی عمل پیرا ہیں[۱]۔

اکبر کو مغلیہ نظام حکومت کے موسس اول کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے قواعد سلطنت اور قوانین حکومت نہایت مضبوط اور مثالی تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کا درباری مورخ منشی محمد کاظم اس ضمن میں اکبر کو زبردست خراج تحسین پیش کرتا ہے اور اسے مغلیہ سلطنت کے آئین کا موجد قرار دیتا ہے:

حضرت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ طاب ثراہ کہ مجدد آئین جہاں بانی ومشید قوانین ایں

---

۱ رود کوثر، ص ۸۱۔

Marfat.com

سلطنت جاودانی اند[1]۔

(یعنی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ، سلطنت مغلیہ کے آئین جہاں بانی کا موجد اول اور اس کے مضبوط و مستحکم قوانین کا بانی اولیں تھا۔)

اکبر زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا، لیکن مردم شناس اور جوہر قابل کا قدر دان تھا۔ اس نے فرض شناس اور لائق افراد اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے۔ اس کے امرا و ارکان سلطنت اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو سمجھنے اور پورا کرنے کی کامل صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کی بے پناہ فتوحات کا سلسلہ اسی لیے آگے بڑھا اور مختلف مہمات میں اس کی فتح و کامرانی کا دائرہ اسی بنا پر وسیع ہوا کہ اس کے ارکان سلطنت وفادار اور امرائے مملکت اصحاب عقل و دانش تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

حضرت عرش آشیانی کہ نوکرانِ خوب داشتند، از ہمیں جہت فتوحات متوارہ و مہمات متکاثرہ می فرمودند۔

(یعنی ہمارے جد امجد جلال الدین اکبر نے اسی لیے مسلسل فتوحات اور بہت سی مہمات سر کیں کہ اس کے ارکان حکومت نہایت عمدہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔)

اکبر کا نظام حکومت بڑا مضبوط اور کامیاب تھا۔ برصغیر کا وسیع و عریض خطہ ارض دور دراز صوبوں میں بٹا ہوا تھا، لیکن اس پر مرکز کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ کہیں بغاوت یا نافرمانی کا خطرہ نہ تھا۔ حکومت کے بلند مناصب پر بہترین صلاحیتوں کے مالک افراد متعین تھے اور ایک ایسا منصب داری نظام قائم تھا، جس کے عہدیداروں کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں تبادلے ہوتے رہتے تھے تاکہ ان کی قابلیت سے ہر علاقے کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ بہتر کارکردگی پر انھیں ترقی دی جاتی تھی۔ انگریزی دور کا نظام حکومت، اکبر کے نظام مملکت سے بہت حد تک ہم آہنگ تھا۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم پرسیول سپیر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

یہ (اکبر کا) مرکزی نظام منصب داری اس امپریل سروس سے اصولی طور پر مختلف نہ تھا، جس کے بل پر انگریزوں نے حکومت کی[2]۔

اکبر کا ایک قابل تعریف کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ملک میں بندوبست اراضی کا اہتمام کیا، جس پر تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اب تک عمل کیا جاتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان درحقیقت زرعی ملک ہیں۔ اس سرزمین میں یہ کام بنیادی اہمیت کا حامل تھا اور اکبر نے اس کو شائستہ التفات ٹھہرایا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے اس نے اپنے دو ماہر اور تجربہ کار اہل کاروں، راجا ٹوڈرمل اور امیر فتح اللہ شیرازی کو مامور کیا۔

[1] عالم گیر نامہ، ص ۳۸۷۔

[2] رود کوثر ص ۸۲۔

Marfat.com

اکبر کی مذہبی زندگی کا پہلا دور:

اکبر کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مذہبی زندگی تین ادوار پر محیط ہے۔ پہلا دور ایک اچھے مسلمان کی زندگی کا بہترین نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ چودہ سال کی عمر میں اورنگ ہند پر متمکن ہوتا ہے اور اس سے تقریباً بائیس برس بعد تک ایک باعمل اور پابند شرع مسلمان کی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ مذہبی اور دینی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اسی ماحول میں اس نے شعور کی آنکھیں کھولی تھیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے باپ کی گوناگوں تکلیفوں اور اس کی دشت نوردی کے تمام گوشوں سے خوب آگاہ تھا، جس کے باعث قدرتی طور پر اس کے دل میں نرمی پیدا ہوگئی تھی اور اس پر اللہ کا خوف طاری رہنے لگا تھا۔ جب وہ ماں باپ کے گزشتہ مصائب یاد کرتا اور اس کے مقابلے میں اپنی بادشاہت کا تصور اس کے ذہن میں آتا تو فوراً گردن اللہ کے حضور جھک جاتی اور قلب میں سوز و گداز کی ایک خاص کیفیت کروٹ لینے لگتی۔ تیسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس کے پیش رو یعنی سوری خاندان کے حکمران، شیر شاہ سوری اور سلیم شاہ سوری، مذہب اور دین سے قلبی وابستگی رکھتے تھے۔ اکبر بھی ازراہِ مصلحت یا کسی اور وجہ سے ممکن ہے اسی اسلوب حیات کو اختیار کیے رکھنا مناسب سمجھتا ہو۔

بہرکیف وجہ کچھ بھی ہو، اکبر کی زندگی کا یہ عہد تدین و تصوف کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ اپنے عصر کے مشہور بزرگ شیخ سلیم چشتی کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا، جو فتح پور سیکری میں اقامت گزین تھے۔ اکبر کی ان سے عقیدت خاطر کا یہ عالم تھا کہ ان کی وجہ سے کئی سال فتح پور سیکری کو دارالحکومت کی حیثیت دیے رکھی، تاکہ شیخ کا قرب حاصل رہے اور ان کی دعائیں اس کے شامل حال ہوں۔ اکبر کے کئی لڑکے کم سنی میں فوت ہو گئے تھے۔ شیخ سے بچے کی پیدائش اور زندگی کے لیے دعا کرائی۔ پھر جہاں گیر پیدا ہوا تو حصول برکت کے لیے انہی کے نام پر بیٹے کا نام سلیم رکھا۔ کئی مرتبہ شیخ معین الدین اجمیری کے مرقد پر جانے کے لیے اجمیر کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر اکبر نے بطور ایک نذر کی تکمیل کے فتح پور سیکری یا آگرہ سے پاپیادہ بھی کیا۔ شیخ سلیم کی وفات کے بعد آگرہ سے پاپیادہ ان کے مدفن پر فتح پور سیکری بھی گیا۔

اکبر کے ذوق عبادت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے ایک عبادت خانہ تعمیر کرایا۔ جب اس کو بڑی بڑی فتوحات حاصل ہوئیں، حدود مملکت روز بروز وسیع ہونے لگیں، پورے ملک کا نظم و نسق حسب منشا قائم ہوگیا، مکمل امن و امان کی صورت حال پیدا ہوگئی اور کوئی قابل ذکر دشمن اور طاقت ور حریف باقی نہ رہا تو اس کا رجحان پوری طرح عبادت و ریاضت کی طرف ہوگیا۔ ان دنوں اس کی صحبتیں درگاہ اجمیر کے درویشوں اور مجاوروں کے ساتھ رہتیں اور وقت کا زیادہ تر حصہ، اللہ اور رسول ﷺ کی عبادت و اطاعت میں گزرتا۔ علما کی محفلیں، فقہا کی مجلسیں، صوفیا کی صحبتیں اس کی دلچسپی کے مراکز تھیں، جہاں وہ تصوف کی باتیں

Marfat.com

کرتا، فقہی مسائل کو سمجھتا، اور علمی مباحث سے محظوظ ہوتا۔ راتوں کو وہ اللہ کی عبادت میں مصروف رہتا۔ عبدالقادر بدایونی کے بیان کے مطابق کسی نے اس کو ''یاہو'' یا ''ہادی'' کا وظیفہ بتا دیا تھا، وہ عموماً رات کی تاریکی میں یہ وظیفہ پڑھا کرتا تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اکبر کی مجالس تصوف کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وہ صوفیا اور علما کا بڑا ہی معتقد تھا۔ اس کے دل پر اللہ کی عظمت کا بے پناہ اثر تھا۔ اللہ کی عطا کردہ ان بے شمار نعمتوں پر اظہار تشکر کی غرض سے وہ بالعموم ایک قدیم حجرے میں چلا جاتا جو آبادی سے دور اور شاہی محلات سے قریب تھا، بادشاہ اس حجرے کے پتھر کے فرش پر بیٹھ جاتا اور ذکر الٰہی میں مصروف ہو جاتا۔ دیر تک وہاں حالت مراقبہ میں بیٹھا رہتا۔

اکبر بادشاہ ان دنوں حاکم بنگالہ سلیمان سے بھی بہت متاثر تھا۔ اس کے بارے میں اس نے سن رکھا تھا کہ وہ شب کے آخری حصے میں اٹھ کر ڈیڑھ سو علما و مشائخ کے ساتھ تہجد کی نماز باجماعت ادا کرتا ہے۔ بعد ازاں فجر تک علما کی مجلس میں بیٹھتا اور تفسیر و تذکیر میں مصروف رہتا ہے۔ فجر کے بعد ملکی معاملات اور فوج کے بارے میں ضروری مشورے کرتا ہے۔ سلیمان کے ان معمولات میں کبھی فرق نہیں آیا۔ اکبر نے بھی ان دنوں اسی طرح اپنے اوقات تقسیم کر رکھے تھے۔ اتفاق سے حاکم بنگالہ سلیمان کی آمد کی خبر بھی مشہور تھی۔ یہ صوفی منش اور صاحب حال بادشاہ تھا۔ صاحب بیعت بھی تھا۔ لوگ اس سے استفاضہ کرتے اور اس کے حلقہ بیعت میں داخل ہوتے تھے۔ اکبر اس کی آمد کی خبر سن کر بہت خوش ہوا اور کچھ معزز مہمان کی تشریف آوری اور کچھ اپنے شوق عبادت کی وجہ سے شیخ عبداللہ نیازی کے حجرے پر ایک بڑی عبادت گاہ تعمیر کرائی۔

اکبر کا معمول تھا کہ جمعے کی نماز کے بعد عبادت خانے میں ایک مجلس منعقد کرتا جس میں علما، مشائخ، امرا ہر طبقے کے لوگ شامل ہوتے۔ اس موقع پر بادشاہ کے قریب بیٹھنے کے لیے حاضرین میں اکثر تقدیم و تاخیر کا جھگڑا شروع ہو جاتا۔ اس کا علاج اکبر نے یہ کیا کہ سب طبقوں کے لیے الگ الگ نشستوں کا تعین کر دیا۔ فیصلہ کیا کہ امرا مشرقی جانب بیٹھیں اور سادات مغربی جانب۔ علما بجانب جنوب بیٹھا کریں اور مشائخ بجانب شمال۔ اس مجلس میں اکبر کا یہ معمول تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھتا، باری باری ہر طبقے کی نشست گاہ پر جاتا اور ان کی بحثوں میں حصہ لیتا۔

بادشاہ کے دل میں علما و فقہا کی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ حسب مدارج ان کی مالی مدد کرتا اور مطالعہ کے لیے ان کو کتابیں بھی عطا کرتا۔ گجرات کی فتح کے موقعے پر اعتماد خاں گجراتی کی جمع کی ہوئی بہت سی نفیس اور قیمتی کتابیں بطور غنیمت اس کو ملیں تو وہ کتابیں خود بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے اس مجلس میں شریک ہونے والے علما میں تقسیم کیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں، اس موقعے پر بادشاہ نے مجھے بھی کچھ کتابیں دی تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب ''انوار المشکوٰۃ'' تھی، جس میں ''مشکوٰۃ الانوار'' کے عنوان سے ایک فصل کا اضافہ بھی

Marfat.com

شامل تھا۔ جو کتابیں بچ گئیں، وہ امرا کو دیگر تحائف و اشیا کے بدلے میں عطا کیں۔

عبدالقادر بدایونی نے عبادت خانے کی مختلف مجلسوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

''ایک رات اس مجلس میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور حاضرین مجلس بلند آواز سے بحث کرنے لگے۔ ان کو خاموش کرانے اور مجلس کا انتظام صحیح رکھنے کے لیے بادشاہ نے مجھے مقرر کیا اور کہا کہ لوگوں کو شور و شغف سے روکو۔ جو شخص ناشائستہ بات کرے، اس کی اطلاع مجھے دو۔ میں اس کو مجلس سے اٹھا دوں گا۔ میں نے آہستہ سے آصف خاں سے کہا، اس طرح تو تقریباً سب کو اٹھا دینا پڑے گا۔ بادشاہ نے پوچھا، کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے جو کچھ کہا تھا، بادشاہ کو بتایا۔ وہ بہت خوش ہوا، اور حاضرین مجلس کو بھی میری یہ بات بتائی [1]۔

اکبر کے اس ابتدائی دور میں علما کو انتہائی قدر و منزلت حاصل تھی۔ بلاشبہ اس سے قبل شیر شاہ سوری اور سلیم شاہ سوری کے عہد حکومت میں بھی علما کو عزت و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، لیکن اکبر اس ضمن میں ان سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ اس نے شیخ الاسلام کے اعزاز میں مزید اضافہ کیا۔ مخدوم الملک کو مشیر دربار اور رکن سلطنت بنایا اور صدر الصدور کو وہ اختیارات تفویض کیے جو اس سے پہلے کبھی کسی صدر کے حصے میں نہ آئے تھے۔ اکبر کے عہد میں شیخ عبدالنبی گنگوہی، صدر الصدور کے منصب بلند پر فائز تھے۔ بادشاہ ان کا بے حد عقیدت مند تھا اور بدرجہ غایت احترام سے پیش آتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی سماعت کے لیے کبھی کبھی ان کے گھر بھی جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے جوتے اٹھا کر بھی ان کے سامنے رکھے۔ اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کو باقاعدہ ان کے حلقہ تلمذ میں داخل کیا اور اس نے شیخ سے مولانا جامی کی مرتب کردہ چالیس احادیث (چہل احادیث) کا سبقاً سبقاً درس لیا۔ اس زمانے میں اکبر شیخ عبدالنبی کے تقوی اور تدین سے بہت متاثر تھا۔ وہ اس کو نیکی کی تلقین کرتے اور مذہب پر راسخ رہنے کی تعلیم دیتے تھے، جس کے باعث اکبر کی یہ کیفیت ہوئی کہ شیخ فرید بھکری کے بیان کے مطابق وہ نماز باجماعت کی پابندی کرنے لگا اور خود اذان دیتا۔ بعض اوقات امامت بھی کراتا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا۔

ایک مرتبہ تو معاملہ یہاں تک پہنچا کہ اکبر کی جوانی کا زمانہ تھا۔ سال گرہ کی تقریب منعقد ہوئی۔ اکبر زعفرانی لباس زیب تن کر کے محل سرا سے باہر آیا۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی بھی موجود تھے۔ ان کی غیرت دینی جوش میں آئی۔ سر دربار عصا اٹھا کر اس سختی سے اکبر کو ٹوکا کہ عصا کا سرا بادشاہ کے سر کو جا لگا۔ اکبر پاس ادب سے اس وقت تو خاموش رہا، لیکن محل میں جا کر ماں سے شیخ کے طرز عمل کی شکایت کی۔ نیک بخت ماں نے جو حضرت زندہ فیل احمد جام کی اولاد سے تھیں، سعادت مند بیٹے سے کہا: بیٹا یہ خفگی اور شکایت کا مقام نہیں۔ تمھارے لیے ذریعہ نجات ہے۔ کتابوں میں لکھا جائے گا کہ ایک بوڑھے عالم نے اتنے بڑے صاحب اقتدار

---

[1] منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۲۰۲۔

Marfat.com

بادشاہ کو عصا مارا اور بادشاہ فقط ادب شرعی کی بنا پر صبر کر کے برداشت کر گیا۔ اس سلسلے میں ذخیرۃ الخوانین کے اصل فارسی الفاظ پڑھیے:

دریں اثنا سال گرہ حضرت خلیفہ بود، برلباس خاصہ ایشاں زعفران پاشیدہ بودند۔ شیخ عبدالنبی در غضب آمدہ درروی دیوان عصا بحضرت خلیفہ الٰہی انداخت و بدامن دولت ایشاں رسیدہ پارہ شد کہ چرا لباس اہل بدعت و نامشروع پوشیدہ و درآں وقت حضرت عرش آشیانی لباس مسنون می پوشیدند و در جریان امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہایت جدوجہد داشتند، حتی اذان خود فرمودہ امامت می کنانیدند، بلکہ جاروب مسجد رامی دارند، وایں شخص (عبدالنبی) آنحضرت را بسیار تنگ گرفتہ بودند، بادشاہ چوں پیش والدہ خود حضرت مریم مکانے کہ از اولاد حضرت زندہ فیل احمد جام بود، رفتہ، شکایت کردند کہ درروی دیوان عصا بمن زدہ، اگر مدعا امر معروف بود باید درخلوت نصیحت می کردند۔ بیگم گفتند کہ بوتم از وقوع ایں امر در خاطرت گراں نیاید، کہ مقصود شیخ اظہار تجمل خود نہ بود بلکہ اجرائے احکام شرعی می کرد، حق تعالیٰ شمارا ازعقوبت اخروی کہ خلائق اولین وآخرین درروز جزا جمع می آیند نگاہ داشتہ، ایں حکایت تادور قیامت باقی می ماند کہ ملائے مفلوک امر معروف با بادشاہ عصر چنیں نمود۔ حضرت خلیفہ الٰہی کہ کوہ وقار بودند بہ شیخ عبدالنبی چیزے نگفتہ [1]۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جن بزرگان دین سے اکبر کو بے پناہ عقیدت تھی، ان میں حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ وہ ان کے مدفن پر دعا کے لیے حاضر بھی ہوا تھا۔ اکبر سے پہلے شیخ فریدالدین کے مسکن کا نام اجودھن تھا، اکبر نے ازراہ عقیدت اس کو پاک پتن کے نام سے موسوم کیا۔ اس زمانے میں اجودھن کو ایک گاؤں کی حیثیت حاصل تھی اور وہ دریائے ستلج کے کنارے واقع تھا۔

بادشاہ نے بہت سے لوگوں کو اپنے خرچ سے حج بیت اللہ کے لیے بھی بھیجا۔ رجب ۹۸۵ھ/ اکتوبر ۱۵۷۷ء میں حجاج کا ایک قافلہ روانہ کیا، جس کا امیر شاہ ابوتراب کو مقرر کیا، جو شیراز کے مشہور بزرگ اور شاہان گجرات کے مرشد تھے۔ ان کے ساتھ اعتماد خاں گجراتی کو بڑی رقم دے کر مکہ معظمہ بھیجا اور عام منادی کرادی کہ جو شخص چاہے اس قافلے کے ساتھ حج کے لیے جا سکتا ہے۔ یہ قافلہ بادشاہ نے میرٹھ سے ترتیب دیا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ میں نے بھی صدرالصدور شیخ عبدالنبی سے درخواست کی کہ میرے لیے بھی بادشاہ سے حج پر جانے کی اجازت لے دی جائے۔ شیخ نے مجھ سے سوال کیا۔ ''کیا تمھاری والدہ زندہ ہیں''؟ میں نے کہا ''ہاں۔'' انھوں نے کہا ''تمھارا کوئی بھائی یا ایسا عزیز ہے جو تمھارے بعد ان کی خدمت کرتا رہے''؟ میں نے کہا: ''نہیں صرف میں ہی ان کا سہارا ہوں۔'' شیخ نے فرمایا: ''اگر تم والدہ سے اجازت حاصل کرلو، تو بہتر ہو گا۔'' اس سے آگے بدایونی کہتے ہیں: ''غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور اب میں اس محرومی پر

[1] ذخیرۃ الخوانین، ج ا ص ۶۹۔

117987

Marfat.com

حسرت وافسوس کرتا رہتا ہوں۔“

بہر حال اکبر کا پہلا اور ابتدائی دور خالص مذہبی اور دینی دور تھا اور اس کا دربار علما کا مرکز بن گیا تھا۔ اس میں ملک اور بیرون ملک کے بہت سے اہل علم موجود تھے۔ بادشاہ حسب مراتب سب کا احترام کرتا اور ان کے اکرام واحترام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ تفصیل کا یہ محل نہیں۔ اس سلسلے کے متعدد واقعات، منتخب التواریخ، طبقات اکبری، ذخیرۃ الخوانین، مآثر رحیمی، عالم گیر نامہ اور دیگر کتب تاریخ میں مرقوم ہیں۔

دوسرا دور:

سن جلوس کے تیئسویں سال کے آواخر (۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء) اور چوبیسویں سال کے اوائل (۹۸۶ھ/ ۱۵۸۷ء) میں جب اکبر سینتیس، اڑتیس سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کی مذہبی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اب اس کے ذہنی افکار کے قافلے نے ایک نیا موڑ کاٹنا شروع کر دیا ہے اور اس کے قلبی رجحانات کا کارواں نئی منزل کی طرف چل نکلا ہے جو اس کے سفر حیات کی ابتدائی سمتوں سے مختلف ہے۔ یعنی اس نے اپنے آباؤ اجداد کے صحیح مذہبی تصورات سے انحراف کی راہیں تلاش کرنے کی ٹھان لی ہے اور دینی و اسلامی روایات کو، جو مغل اسلاف سے اس کو ورثے میں ملی تھیں، ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اکبر کی زندگی کا یہ نیا پہلو، جسے دور ثانی سے تعبیر کرنا چاہیے، صحیح العقیدہ مسلمانوں کے لیے نہایت ذہنی کوفت کا باعث تھا۔ اس زمانے میں بادشاہ بے شمار لوگوں سے متاثر ہوا، اور بہت سے افراد نے اس کے فکر وعمل کے متعینہ خطوط کو بدلنے میں بھر پور حصہ لیا۔ ان میں ایک پرکھوتم برہمن تھا۔ اس کے بعد دیوی برہمن کا نام آتا ہے۔ ان برہمنوں نے بادشاہ کو ہندو مذہب کے اسرار بت پرستی سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ آتش پرستی، آفتاب پرستی اور ستاروں کی تعظیم کے رموز بتائے۔ نیز مشرک بادشاہوں اور ہندوؤں کے خیالی دیوتاؤں کی عظمت وتکریم اس کے ذہن نشین کرائی۔ یہ سب باتیں انھوں نے اس انداز سے بادشاہ کے کانوں میں ڈالیں کہ وہ ہندوؤں کے عقیدۂ تناسخ کا قائل ہو گیا۔

انھی دنوں شیخ تاج الدین بن شیخ زکریا اجودھنی دہلوی، بادشاہ سے خلوت میں ملا۔ اسے اکثر صوفیا ”تاج العارفین“ کہتے تھے اور وہ شیخ امان اللہ پانی پتی کا شاگرد تھا، جن کا اصل نام عبدالملک تھا۔ یہ شخص شرعی پابندیوں کو صحیح نہ سمجھتا تھا اور اس دور کے بعض گمراہ صوفیا کی طرح وحدت الوجود کا سختی سے قائل تھا۔ اکبر معمولی پڑھا لکھا اور خام فکر شخص تھا۔ تاج الدین نے اس کے سامنے دوزخ، جنت، ملائکہ، شیطان وغیرہ کی اس اسلوب سے تاویلیں کیں کہ بادشاہ اس سے متاثر ہو گیا۔ پھر اس نے ابن عربی کے عقیدۂ ترجیح رجا علی الخوف اور فرعون کے قبول ایمان وغیرہ کی اس ڈھنگ سے بادشاہ کے سامنے تشریح کی کہ وہ صوفیا کی ان شطحیات پر یقین کرنے لگا اور عقیدۂ وحدت الوجود سے متاثر ہو گیا۔

Marfat.com

شیخ تاج الدین نے ''انسان کامل'' کا تصور بھی بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور پھر اس ''انسان کامل'' کو خلیفہ وقت سے تعبیر کر کے خود اکبر بادشاہ کو اس کا مصداق ٹھہرایا۔ انسان کامل کے بعد اس کو عین واجب یعنی ذات خداوندی کا درجہ دیا۔ پھر اس کے حضور سجدہ ریز اور زمین بوس ہونے کو ضروری قرار دیا اور اس کے اعزاز و احترام کو یہاں تک بڑھایا کہ اسے ''کعبۂ مرادات'' اور ''قبلہ حاجات'' بنا دیا گیا۔

ایک اور بزرگ ملا محمد یزدی بادشاہ کے سامنے اپنے عقیدے کی تبلیغ و اشاعت کرنے لگے۔ انھوں نے خلفائے ثلاثہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف طنز وطعن کا سلسلہ شروع کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین، صلحائے سلف اور علمائے خلف سب کی تکفیر کی مہم کا آغاز کیا اور بادشاہ کی نظر میں اہل سنت کے علما و عقیدہ کا درجہ ختم کرنے کی ٹھانی۔ انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ سب سے بہتر شیعہ مذہب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ شیعیت سے متاثر ہو گیا۔ یاد رہے یہ وہی ملا محمد یزدی ہیں جنھوں نے بعد میں بادشاہ کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا اور اس کے خلاف خروج و بغاوت کو جائز قرار دے دیا تھا۔

اس زمانے میں عیسائی بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ان کے پادریوں نے دربار میں آمدورفت شروع کی اور اکبر کو اپنے افکار و تصورات سے متاثر کرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ انھوں نے بادشاہ کو عقیدۂ تثلیث سے متعارف کرایا اور انجیل کے احکام کی صحت اس کے دل میں ڈالی۔ عبدالقادر بدایونی کے بقول بادشاہ کی نظر التفات نے جو بزعم خود حق پرستی کے لیے دنیا بھر کی گمراہیوں کا خریدار بنا ہوا تھا، عیسائی پادریوں کو بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔ ان کے عقیدۂ تثلیث کی تصدیق کی اور عیسائی مذہب کو پھیلانے کی ہمت افزائی کی۔ بادشاہ کے حکم سے شہزادہ مراد نے ان دنوں عیسائی پادریوں سے انجیل کے چند سبق پڑھے اور ابوالفضل کو انجیل کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ آہستہ آہستہ ان عیسائی پادریوں کی جسارت یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے دجال ملعون کی عادات قبیحہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ میں نعوذ باللہ مشابہت پیدا کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اکبر کے ارکان سلطنت میں بیربر ایک نہایت خطرناک شخص تھا۔ اس نے بادشاہ کے سامنے آفتاب کے اوصاف بیان کرنا شروع کیے اور بتایا کہ دنیا کی ہر شئی آفتاب کی رہین منت ہے اور اسی کے نتیجے میں سب کچھ ظہور میں آتا ہے، اس لیے آفتاب پرستی ضروری ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس عقیدے کو بھی پسند فرمایا۔ اور اس ''نیر اعظم'' کی جو ''عطیہ بخش ہمہ عالم'' اور ''مربی بادشاہاں'' ہے، پرستش شروع کر دی۔

انھی دنوں گجرات کے ایک شہر نوساری سے آتش پرستوں کا ایک گروہ اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے دربار میں پہنچا۔ انھوں نے زردشت کے دین کو صحیح دین کی صورت میں اکبر کے سامنے پیش کیا اور آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت قرار دیا۔ چنانچہ اکبر نے حکم دیا کہ محل میں شب و روز آگ جلتی رہے، کیوں کہ آگ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے انوار کا ایک پرتو ہے۔

اس آتش کدے کا انتظام ابوالفضل کے سپرد کیا گیا۔

Marfat.com

پچیسویں سال جلوس کے نوروز کے موقعے پر اکبر نے سب کے سامنے آفتاب اور آتش کو سجدہ کیا۔ قشقہ لگایا اور اسلام کی برسر عام مخالفت کی اور اسے خلاف عقل وفہم ٹھہرایا۔

ملا مبارک ناگوری جو خود بہت بڑا عالم تھا، علما کی سخت مخالفت کرنے لگا۔ اس کے دولڑکے ابوالفضل اور فیضی بھی پوری قوت کے ساتھ میدان میں نکل آئے اور اسلام، دین حق اور علمائے شرع متین کی جس قدر مخالفت کر سکتے تھے، کرنا شروع کر دی۔ ان لوگوں کی مدد اور انگیخت سے اکبر نے ایک خاص کلمہ لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ ایجاد کیا، جزیہ منسوخ کر دیا اور احکام شرع کی علانیہ مذمت اور مخالفت ہونے لگی۔ ۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ء میں اکبر کو امامت و نبوت کا اعزاز بھی دے دیا گیا اور اسے ''صاحب دین حق'' بنا دیا گیا۔ جلوس کے اٹھائیسویں سال تو وہ اس سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اب اسے خدا کا اوتار سمجھا جانے لگا۔ اس عرصے میں جو بے شمار بدعات پھیلیں اور دین اسلام کی جو توہین ہوئی، اس کی تفصیلات عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں بیان کی ہیں۔ ان مختصر سطور میں ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ کتے اور خنزیر کو پاک قرار دے دیا گیا، غسل جنابت کو حرام ٹھہرا دیا گیا۔ مردوں کے لیے سونے کے زیور اور ریشم کا لباس جائز ثابت کر دیا گیا۔ عربی زبان کی مخالفت ہونے لگی۔ مسائل دینی کا تمسخر اڑایا جانے لگا۔ ذبیحہ گاؤ بند کر دیا گیا۔ داڑھی ترشوانے اور منڈھوانے کے جواز کا اعلان کر دیا گیا۔ علما کا ایک محضر طلب کیا گیا، ان میں سے بعض نے برضا و رغبت اور بعض نے بجبر و اکراہ اس پر دستخط ثبت کیے۔ اس کے بعد اسلامی احکام کی برسر عام توہین ہونے لگی اور غیر اسلامی رسوم و عوائد کی ترویج و اشاعت کے لیے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کر دی گئیں۔ اختصار کے ساتھ یوں سمجھیے کہ جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز کا درجہ دے دیا گیا۔ حرام کو حلال اور حلال کو حرام میں بدل دیا گیا۔ قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے پر اعتراضات کیے گئے اور اسے مخلوق قرار دیا گیا۔ وحی کو امر محال ٹھہرایا گیا۔ نبوت و رسالت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کیے گئے۔ معجزات کا انکار کیا گیا اور بعد از موت بقائے ارواح اور عذاب و ثواب کو صرف تناسخ پر منحصر کر دیا گیا اور ان غلط افکار و خیالات کی خوب تشہیر کی گئی۔

اس زمانے میں بہت سے امرائے مملکت، علمائے دین اور ارکان حکومت نے بادشاہ کے اس طرز عمل کی مخالفت کی اور نہایت سختی کے ساتھ کی، مگر ان میں سے بعض کو دور دراز علاقوں میں تبدیل کر دیا گیا، بعض کو قید میں ڈال دیا گیا، بعض کو قتل کرا دیا گیا، بعض کو حج کے بہانے حجاز بھیج دیا گیا، بعض کے وظیفے بند کر دیے گئے اور بعض کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی گئی۔ بہر حال اصحاب دین اور ارباب غیرت وحمیت کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش اور بدرجہ غایت ابتلا کا وقت تھا۔ اس کا مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے:

بادشاہ نے قطب الدین محمد خاں، شہباز خاں کنبوہ اور اس مرتبے کے دیگر امرا کو اسلام کی اطاعت ترک کر دینے اور اپنے نئے ایجاد کردہ دین کو اختیار کرنے کی ترغیب دی تو ان امرا نے جرأت سے کام لے کر بادشاہ کے اس حکم کو رد کر دیا۔ قطب الدین محمد خاں نے کہا کہ شاہان ولایت خلیفہ روم وغیرہ یہ باتیں سنیں گے تو

Marfat.com

کیا کہیں گے۔ وہ تو سب اسی اسلام پر ایمان رکھتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں، جس کی تعلیم اللہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو دی گئی ہے اور ہمیں اسی کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے۔ اکبر نے اس بات پر نہایت خفگی کا اظہار کیا اور کہا تم روم کے فرماں روا کی خاطر ہمارے ساتھ اس قدر درشتی سے بات کر رہے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ اور اسی کے پاس چلے جاؤ۔ وہاں تمھیں اعزاز و مرتبہ حاصل ہو گا۔

شہباز خاں کنبوہ نے بھی بادشاہ کے فرمان کی سختی سے مخالفت کی اور بیربر کو جو علی الاعلان اسلام پر طعنہ زنی کرتا تھا، سب کے سامنے سخت برا بھلا کہا اور ان الفاظ سے مخاطب کیا:

''اے ملعون کافر، اب تیری بھی زبان نکل آئی کہ ایسی باتیں کرنے لگا۔ ہم تجھے اس کا مزہ چکھائے بغیر نہیں رہیں گے۔''

ائمہ اور علما کے اعزاز یا تو گھٹا دیے گئے یا بالکل ختم کر دیے گئے۔ مسجدیں ویران ہو گئیں، دینی مدرسے اجڑ گئے اور شرفا کو ذلیل کیا گیا۔ اس سلسلے میں حکیم الملک اور ابوالفضل کے درمیان شدید تلخ کلامی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ ابوالفضل کو ''فضلہ'' کے نام سے پکارنے لگے۔ بادشاہ چونکہ ابوالفضل کی بہت عزت کرتا تھا، اس لیے حکیم الملک پر بڑا تشدد کیا گیا اور بالآخر انھیں مکہ معظّمہ کی طرف چلے جانے کا حکم دے دیا۔

ملا محمد یزدی کو جون پور کا قاضی القضاۃ مقرر کر کے بھیج دیا اور محمد معصوم خاں فرنخودی جو جون پور کی حکومت پر متعین تھا، دربار میں طلب ہوا اور دوبارہ اسی عہدے پر واپس بھیج دیا گیا۔ ملا محمد یزدی پہلے بادشاہ کے حامی تھے، اب سخت مخالفت پر اتر آئے تو انھیں جون پور بھیج دیا گیا، انھوں نے جون پور کا منصب قاضی القضاۃ سنبھالنے کے بعد بادشاہ کے خلاف خروج اور بغاوت کا فتویٰ جاری کیا۔ اس فتوے سے متاثر ہو کر محمد معصوم کابلی، محمد معصوم فرنخودی، میر معز الملک، نیابت خاں، عرب بہادر اور دوسرے امیروں نے تلواریں کھینچ لیں اور بادشاہ سے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ اکثر مقامات پر انھوں نے سخت لڑائیاں لڑیں۔ ائمہ مساجد اور بہت سے لوگوں نے ان کا پوری طرح ساتھ دیا۔ بنگال میں قاضی یعقوب نے بھی بادشاہ کی مخالفت کی۔ کچھ روز بعد بادشاہ نے ان میں سے اکثر کو کسی نہ کسی بہانے قتل کرا دیا۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی کو گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ اس طرح اور بہت سے علما و مشائخ کو شدید اذیتیں پہنچائی گئیں۔ ~~متعدد~~ علما و امرا کو مختلف علاقوں میں منتشر کر دیا گیا۔ لاہور کے علما کو بھی مختلف مقامات پر بھیج دیا، مثلاً قاضی صدرالدین جالندھری لاہوری کو، جن کو مرتبہ علمی مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری سے بھی زیادہ تھا، لاہور سے بدل کر بھڑوچ اور گجرات کے منصب قضا پر متعین کر دیا۔ ملا عبدالشکور گول دار کو جون پور روانہ کر دیا اور ملا محمد معصوم کو بہار کی قضاءت پر مامور کر دیا۔ شیخ منور کو لاہور سے منتقل کر کے صوبہ مالوہ کی صدارت پر فائز کر دیا۔ لاہور میں صرف مولانا معین کے پوتے شیخ معین رہ گئے، جو مشہور واعظ تھے۔ بادشاہ نے کبر سنی کی بنا پر انھیں نظر انداز کر دیا۔ اس عالم دین نے ۹۹۵ھ/ ۱۵۸۷ء میں وفات پائی۔

Marfat.com

اکبر نے یہ طرز حیات کیوں اختیار کیا اور اس اسلوب زندگی کو کس بنا پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا؟ اس کی کئی وجوہ ہیں۔

ایک یہ کہ اکبر کو حصول علم کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ اپنے آباواجداد کی طرح عالم نہ تھا۔ نہ اس کے باپ کو کہیں جم کر بیٹھنے کی سہولتیں میسر آئیں اور نہ اکبر کو تعلیم کے مواقع حاصل ہوئے۔ وہ ان پڑھ تھا، لیکن مسائل سمجھنے کا شائق اور ذہن کو تلاش و جستجو میں مصروف رکھنے کا عادی تھا۔ مسلمان، ہندو، عیسائی، مجوسی، ہر مذہب کے لوگوں کو آپس میں بحث و تکرار میں الجھا دیتا تھا۔ خود علمی اور تحقیقی معلومات سے کورا تھا۔ مختلف لوگوں کی باتیں سن کر ذہنی انتشار کا شکار ہو گیا اور اس کی بے علمی سے علمائے سو نے، جن میں ملا مبارک، تاج الدین دہلوی، ابوالفضل اور فیضی خاص طور سے قابل ذکر ہیں خوب فائدہ اٹھایا اور اس کو گمراہ کرنے میں دوسروں کے علاوہ یہ لوگ بھی پیش پیش تھے۔

دوسرے یہ کہ دربار میں مختلف مسائل کو علما اس انداز سے موضوع بحث ٹھہراتے تھے اور عبادت خانے میں اس طرح سلسلہ بحث جاری رہتا تھا کہ بادشاہ ان سے بدظن ہو گیا اور ملا مبارک وغیرہ نے اس کی ذہنیت کو سمجھ کر اسے مزید غلط راہوں پر ڈال دیا۔

تیسرے یہ کہ ہندوستان پر حکومت قائم اور مستحکم رکھنے کے لیے اس نے ضروری سمجھا کہ ہر مذہب کے لوگوں کو خوش رکھا جائے اور فکر و عمل کے لحاظ سے صلح کل رویہ اختیار کیا جائے۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے جو اکبر کا امام نماز اور مشہور عالم تھا، اس سلسلے کی تمام تفصیلات بیان کی ہیں۔

برصغیر کی علمی و فکری تاریخ کے بعض ماہرین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مذہبی سلسلے سے متعلق جو باتیں عبدالقادر بدایونی نے اکبر کی طرف منسوب کی ہیں، وہ بڑی حد تک مبالغہ آمیز ہیں اور اس کے بیان کردہ بہت سے واقعات کے بارے میں باقی معاصر کتب تاریخ خاموش ہیں۔ وہ حضرات دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکبر پر آزاد خیالی کا ایک دور ضرور آیا، لیکن اس کو اکبر کے ترک مذہب اسلام اور نئے دین کی ایجاد و اختراع سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مخالفت کے خطرے کے پیش نظر اکبر نے جن امراد علما کو دور دراز علاقوں اور صوبوں میں بھیج دیا تھا، بدایونی اسے جلاوطنی سے تعبیر کرتا ہے، حالانکہ اس پر جلاوطنی کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ پھر اس کا انداز منفی ہے، مثبت نہیں ہے۔ وہ ایسے واقعات کہیں سے ڈھونڈ نکالتا ہے، جو مخالفت اور نفی پر دلالت کناں ہیں۔

اس باب میں ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ صرف یہ عرض کریں گے کہ اکبر ہندوستان کا مطلق العنان بادشاہ تھا۔ عبدالقادر بدایونی اس کا ایک ملازم تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے عصر کا بہت بڑا عالم، مؤرخ اور مترجم تھا۔ طنز و تعریض کا بادشاہ تھا، حاضر جواب اور صاف بیان تھا۔ اکبر اس کے علم و فضل اور تعبیر و ترجمہ کی خوبیوں سے بہت متاثر بھی تھا، لیکن یہ کہنا قرین فہم نہیں کہ وہ ایک زبردست اور مطلق العنان بادشاہ کے بارے

Marfat.com

میں اور خود اسی کے عہد اور ملک میں اس درجہ بے باک ہو گیا ہو، یا غلط بیانی پر اتر آیا ہو، یا اس قدر مبالغہ آرائی کو اس نے اپنا شیوہ بنا لیا ہو۔

دوسری بات جس کا تعلق امرا و علما کے تبادلے سے ہے اور بدایونی ان انتظامی مصلحتوں کو جلاوطنی قرار دیتا ہے تو اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ وہ علاقے ان کے اصل علاقوں سے طویل مسافت پر واقع تھے اور اس زمانے میں آمد و رفت کے ذرائع نہایت مشکل اور صبر آزما تھے۔ پھر وہاں کا ماحول ان کے لیے بالکل اجنبی تھا، اور یہ تبادلے بطور سزا کیے گئے تھے، لہٰذا بدایونی اس پس منظر میں اگر اس پر جلاوطنی کا لفظ استعمال کرتا ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض یا اتنی غلط بات نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ تو حقیقت ہے کہ اس دور میں جن علما اور امرا کو بادشاہ نے حج پر بھیجا تھا، اس کی تہہ میں ضرور جلاوطنی کا تصور موجود تھا۔

سزا کے طور پر اب بھی مختلف جمہوری حکومتیں مختلف افسروں کے تبادلے کرتی رہتی ہیں اور وہ افسران تبادلوں سے نالاں ہوتے ہیں۔

رہا بدایونی کا منفی انداز بیان، تو اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ وہ ہر مقام پر یہ انداز اختیار نہیں کرتا، اسی مقام پر کرتا ہے، جہاں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

بدایونی کے علاوہ عہد اکبری کے معاصر مؤرخین بخشی نظام الدین (مصنف طبقات اکبری) ابوالفضل (مصنف آئین اکبری و اکبر نامہ)، اسد بیگ (مصنف اکبر نامہ) ہیں۔ یہ بھلا اس قسم کے واقعات کیوں کر ضبط تحریر میں لا سکتے تھے۔ رہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (مصنف تاریخ حقی) اور ان کے بیٹے شیخ نورالحق (مصنف زبدۃ التواریخ) انھوں نے اس دور کے حالات سے بحث تو کی ہے، مگر ان کی حیثیت کچھ اور قسم کی ہے۔ بدایونی نے منتخب التواریخ چھپ چھپا کر لکھی اور کسی کو بتائے بغیر واقعات قلم بند کرتے رہے۔ ظاہر ہے ان کا بنیادی مقصد ہر ممکن طریقے سے صحیح حالات کی عکاسی یا (کم از کم) ان کی نشان دہی کرنا تھا، اور وہ اس میں کامیاب ہیں۔

بہر حال بدایونی بے شک طناز مصنف ہے اور سخت مذہبی رجحانات کا حامل ہے، لیکن چوں کہ وہ اکبر کا معاصر، اس کا امام نماز، ملازم اور واقعات کا چشم دید گواہ ہے، لہٰذا اس کی بات کی آسانی سے تغلیط یا تردید نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ ذہن تصدیق ہی کی طرف جاتا ہے۔

حیات اکبر کے دوسرے دور حکمرانی کا اصل المیہ یہ ہے کہ بادشاہ کے زیادہ تر اور مؤثر ترین ارکان سلطنت یا تو غیر مسلم تھے یا وہ ''مسلمان'' جو اپنی خاص مصلحتوں کی بنا پر اسے اسلام سے قطعی دور رکھنا چاہتے تھے۔ واقعات کی رفتار کے تسلسل سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب رہے اور بادشاہ کو اسلام اور اس کے احکام و اوامر سے بہت دور لے گئے۔ بے شبہ اس دور میں بھی اکبر کے دربار میں اور مختلف بلاد و امصار کے اہم مناصب پر اسلام کا صحیح درد رکھنے والے امرا و علما متعین تھے، لیکن ان کی آواز بہت حد تک بے اثر ہو کر رہ گئی تھی۔

Marfat.com

تیسرا اور آخری دور:

اب اکبر کی مذہبی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے، جسے آخری دور کہنا چاہیے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ دربار پر پابند شرع ارکان سلطنت قابض ہیں اور خود بادشاہ کا اسلوب فکر اور طرز حیات بھی بدلا ہوا ہے۔ یا ممکن ہے بادشاہ میں ابھی اتنی ذہنی تبدیلی نہ آئی ہو، لیکن ارکان حکومت یقیناً بدلے ہوئے ہیں۔ پہلے ارکان حکومت اور مشیران بادشاہ یا تو موت سے ہم کنار ہو گئے ہیں یا اپنا اثر و رسوخ کھو چکے ہیں۔

اکبر کے اس آخری عہد میں اس کا رضاعی بھائی خان اعظم مرزا عزیز کوکہ وکیل مطلق اور امیر الامرا تھا۔ دربار کا یہ سب سے بااثر اور صاحب اقتدار امیر تھا۔ بادشاہ کی مہر اسی کی تحویل میں تھی۔ ایک اور رکن سلطنت بخشی الملک نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید تھا جو بڑا معاملہ فہم، دیانت دار اور بہادر تھا۔ اکبر اس پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ دین و مذہب سے وہ انتہائی وابستگی رکھتا تھا۔ لاہور کا گورنر قلیج خاں بڑا پابند شرع اور متدین امیر تھا۔ اس کی ایک بیٹی اکبر کے بیٹے دانیال کے عقد میں تھی۔ مرزا عبدالرحیم خان خاناں دکن میں تھا۔ یہ کسی قدر آزاد منش امیر تھا۔ لیکن خواجہ باقی باللہ کا مداح تھا اور ذہنی طور پر ان امرائے اکبری سے تعلق رکھتا تھا، جو حالات کا صحیح طور سے جائزہ لینے کے عادی تھے اور معاملات کو اعتدال کے دائرے میں رکھنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں اور بھی بہت سے امرا و علما موجود تھے، جن سے اکبر متاثر ہوا، اور حالات کی رفتار میں تبدیلی پیدا ہوئی۔

اکبر کی ذہنی تبدیلی کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ خواجہ خاوند محمود المعروف بہ حضرت ایشاں (المدفون لاہور) بادشاہ کے آخری عہد میں آگرہ گئے۔ ان کے صاحب زادے خواجہ معین الدین کشمیری اپنی تصنیف مرأۃ طیبہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت ایشاں آگرہ پہنچے تو خان اعظم سمیت کئی امرا ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ شاہی خاندان کی متعدد خواتین نے بھی ان کی بیعت کی۔ ان خواتین میں ایک سلیمہ سلطان بیگم تھیں جو اکبر کے حرم میں تھیں۔ دوسری گلرخ بیگم تھیں، جن کی بیٹی سے اکبر نے اپنے بیٹے سلیم کی شادی کر دی تھی۔ گلرخ بیگم نے فرط عقیدت سے حضرت ایشاں کے لیے ایک جامہ اس انداز سے سی کر دیا کہ ایک ایک ٹانکے پر کلمہ شریف پڑھا گیا۔ خواجہ معین الدین بیان کرتے ہیں کہ اکبر نے حضرت ایشاں خواجہ خاوند محمود سے اپنی فلاح کے لیے دعائے خیر (فاتحہ) کی درخواست کی[۱۹]۔

فیضی وفات پا چکا تھا۔ طریقہ اکبری کے مطابق ابوالفضل کو بادشاہ کے خلیفہ اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور دربار میں اکبر کے نزدیک سب سے زیادہ قابل اعتماد شاید ابوالفضل ہی تھا۔ لیکن آخری عہد میں حالات بالکل بدل چکے تھے۔ اکبر اور ابوالفضل میں اس انداز سے باہمی بدگمانیوں نے جنم لیا کہ دونوں ایک دوسرے

---

۱۹ رود کوثر، ص ۱۴۰۔ بحوالہ مرأۃ طیبہ۔

Marfat.com

سے دور ہو گئے اور ابوالفضل نے دربار میں جانا بند کر دیا۔ بلکہ اس دوران وہ خودکشی کرنے یا خانہ بدوش ہو جانے کے بارے میں بھی غور کرتا رہا۔ دربار اکبری کے جو ارکان ابوالفضل کے اثر و رسوخ اور طرزِ عمل سے پریشان تھے، انھوں نے جہاں گیر کو بھی واقعات کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا تھا۔ جہاں گیر نے ابوالفضل کے بارے میں بعض ایسی باتیں بادشاہ کے گوش گزار کیں کہ بادشاہ ان سے متاثر ہو گیا اور جہاں گیر کو حق بجانب ٹھہرایا۔ اب ابوالفضل نے دربار میں جانا بالکل بند کر دیا۔ لیکن بعد کو پھر آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ان دنوں ابوالفضل کے زیادہ مخالفوں میں خان اعظم اور شیخ فرید شامل تھے۔ خود جہاں گیر بھی اس کا شدید مخالف تھا، اور اس کی مخالفت سب سے زیادہ موثر اور ابوالفضل کے لیے اذیت رساں تھی۔

اس سے دو تین سال بعد دربار کے متشرع ارکان کی مخالفتوں کی بنا پر ابوالفضل کو دکن بھیجا گیا۔ وہاں کچھ عرصے بعد بادشاہ بھی گیا تو دونوں کی ملاقاتیں ہوئیں۔ محاصرۂ اسیر گڑھ کے موقعے پر بھی ابوالفضل بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اسیر گڑھ کی فتح کے بعد اکبر وہاں سے رخصت ہونے لگا تو خان خاناں نے جو دکن کی مہم پر مامور تھا، بادشاہ سے درخواست کر کے ابوالفضل کو وہیں روک لیا۔ اکبر تو آگرہ آ گیا، بعد میں خان خاناں نے ابوالفضل کو نہایت پریشان کیا۔ اس پریشانی کا اظہار وہ صاف الفاظ میں اپنے مکتوبات (رقعات ابوالفضل) میں کرتا ہے۔ قیام دکن کے دور میں اپنی مختلف ذہنی پریشانیوں کا اظہار، ان مکتوبات میں بھی کرتا ہے جو اس نے شہزادوں، شہزادیوں، بادشاہ کی بیوی اور والدہ کے نام لکھے۔ وہ ان سے درخواست کرتا ہے کہ بادشاہ سے کہو کہ وہ اسے دکن سے واپس بلا لے۔ ایک خط میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ میں کئی درخواستیں بادشاہ کی خدمت میں لکھ چکا ہوں، لیکن خان خاناں کے وہ حامی جو دربار میں موجود ہیں میری درخواستیں بادشاہ تک نہیں پہنچنے دیتے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ میں بادشاہ کو ہزار تاکید سے لکھتا ہوں کہ سپہ سالار اور سرداروں کے تبادلے کیے جائیں، لیکن بخشی الملک شیخ فرید خاں اس کے خلاف مشورہ دیتا ہے اور اس کا مشورہ مان لیا جاتا ہے۔ میرا مشورہ مسترد کر دیا جاتا ہے۔

اب ابوالفضل ایک سخت مصیبت سے دوچار ہوتا ہے جو اس کی زندگی کی آخری مصیبت ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جہاں گیر کی اپنے باپ اکبر سے مخالفت ہو گئی، جو یہاں تک پہنچی کہ جہاں گیر نے الہ آباد میں بیٹھ کر اپنی بادشاہت کا سامان فراہم کر لیا۔ دربار کے کئی بااثر امرا جو اکبر کے خیالات سے متفق نہ تھے اور جہاں گیر سے ذہنی طور پر ہم آہنگ تھے، ان کی ہمدردیاں ظاہر ہے، جہاں گیر کے ساتھ تھیں۔ ان حالات میں اکبر کو ابوالفضل کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے ابوالفضل کو لکھا کہ اپنا کام اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے سپرد کر کے فوراً آگرے پہنچ جاؤ۔ اکبر کے اس پیغام کی اطلاع کسی نے جہاں گیر کو بھی دے دی۔ اسے خدشہ ہوا کہ اگر ابوالفضل دربار میں چلا گیا تو کئی مشکلات پیدا ہوں گی۔ اس نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے بندھیلہ کے راجا نرسنگھ دیو کو خط لکھا کہ ابوالفضل دکن سے آگرہ جاتے ہوئے تمھارے علاقے سے گزرے

Marfat.com

گا، جس طرح ممکن ہو، اس کو ختم کر دو۔ اس کے بدلے میں تمھیں بڑی مراعات دی جائیں گی۔ چنانچہ اس نے تین چار ہزار افراد پر مشتمل فوج لے کر ابوالفضل کا راستہ روک لیا۔ ادھر ابوالفضل کے ساتھ بھی ایک مسلح جماعت تھی، مقابلہ ہوا، ابوالفضل مارا گیا اور اس کا سر جہاں گیر کے پاس بھیجا گیا اور جسد گوالیار میں دفن کر دیا گیا۔ اس طرح ابوالفضل اپنے انجام کو پہنچا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اکبر کے آخری دور میں اس کے مذہبی افکار میں بتدریج تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے اکبر کا ذہن تو شاید نہ بدلا ہو لیکن اس کے درباری امرا اور ارکان سلطنت ضرور بدل گئے تھے اور وہ، وہ نہ رہے تھے جو مذہب یا بالفاظ دیگر اسلام سے برگشتہ تھے۔ اس کا اندازہ مسٹر سی، ایچ پین کی تصنیف ''اکبر اینڈ دی جیسوئٹس'' کے اس اقتباس سے ہوتا ہے جو ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے درج کیا ہے۔ مسٹر پین کا بیان ہے ''گوا سے اکبر کے دربار میں تین مرتبہ پادری بھیجے گئے۔ دوسری مرتبہ جو مشن یہاں آیا وہ ناکام رہا۔ اس ناکامی کا ذکر اس نے اپنی رپورٹ میں کیا ہے۔'' مسٹر پین اس رپورٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سے واضح ہوتا ہے کہ خواہ پادریوں کے متعلق اکبر کا اپنا طرزِ عمل کچھ بھی ہو، اس کے امراء یقیناً ان کے مخالف تھے۔ بہت ممکن ہے کہ پادریوں نے اس خوش اخلاقی اور تدبر کا ثبوت نہ دیا ہو، جس کی صورت حال متقاضی تھی اور نتیجتاً امرا کی مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ مشن کو جاری رکھنا بے سود ہو گیا❶۔''

یہی مصنف ایک پرتگیز پادری زیویر کا واقعہ بھی بیان کرتا ہے کہ اس نے دربار میں تقریر کی تو دربار میں بیٹھے ہوئے مسلمانوں نے اس پر نہایت خفگی کا اظہار کیا، کیوں کہ اکبر کے مذہبی خیالات خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اس کے آخری عہد میں دربار اور معاملات سلطنت پر باشرع مسلمان امرا حاوی تھے اور وہ اسلامی مفاد کے تحفظ کی پوری کوشش کرتے تھے۔ مسٹر پین کے الفاظ کا خلاصہ شیخ محمد اکرام نے ان الفاظ میں درج کیا ہے:

بہت سے درباری مسلمان جو اس وقت بادشاہ کے ساتھ تھے، پادری کی تقریر پر بہت بگڑے اور ان میں سے ایک نے جو پادری کا دوست تھا، اسے سمجھایا کہ جب وہ شریعت اسلامی کا ذکر کرے تو اسے زیادہ احتیاط اور ادب کا ثبوت بہم پہنچانا چاہیے۔ اس درباری مسلمان نے کہا، یہاں مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں۔ جب تم شریعت اسلامی کی مذمت کرتے ہو تو وہ تمھارے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ میں اگرچہ تمھارا دلی دوست ہوں، مگر جب تم ہمارے نبی ﷺ کی بے ادبی کرتے ہو تو میرا جی چاہتا ہے کہ تمھارے جسم میں خنجر بھونک دوں❷۔

واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں ذاتی طور پر اکبر بھی

❶ رود کوثر، ص ۱۳۸، بحوالہ اکبر اینڈ دی جیسوئٹس، ص ۳۱۔

❷ رود کوثر، ص ۱۳۹، بحوالہ اکبر اینڈ دی جیسوئٹس، ص ۸۴۔

Marfat.com

بالکل بدل گیا تھا اور ذہنی اور قلبی طور پر اسلام سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ جہاں گیر کی چھوٹی تزک ❶ میں مرقوم ہے کہ اکبر نے بوقت موت کلمہ شہادت پڑھا، سورہ یٰس پڑھا کرسی اور ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے موت کی آغوش میں گیا۔ اس موقعے پر شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ اس اندراج کی صحت مشتبہ ہے، لیکن سفیر انگلستان سر طامس واڈ اس واقعہ کے پندرہ بیس سال بعد ہندوستان آیا تھا۔ اس نے مقامی حالات کے متعلق ایک تفصیلی خط انگلستان کے لاٹ پادری کو لشکر شاہی سے لکھا تھا۔ اس خط میں وہ لکھتا ہے کہ اکبر کی وفات ایک مسلمان کی حیثیت سے ہوئی۔

اسی طرح پرتگیز پادری جو بوٹیلو کے نام سے موسوم تھا، بیجا پور کے عادل شاہی ❷ بادشاہ سے ملا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ اکبر کس مذہب پر مرا؟ تو پادری نے بڑے افسوس سے جواب دیا کہ میری خدا سے التجا تھی کہ ایسا نہ ہوتا۔ لیکن اکبر ہمیں غلط امیدیں دلاتا رہا اور بالآخر آپ کے دین محمدی پر ہی مرا۔

اکبر کی وفات کے وقت پرتگیز پادری آگرہ میں موجود تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اکبر کو مرتے وقت ہی بپتسمہ دے لیں، اس لیے وہ لمحہ لمحہ کی خبر منگاتے رہتے تھے مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے ❸۔

ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کسی کے الحاد و زندقہ پر زور دیں یا اسے جہنمی بنانے پر اصرار کریں۔ ہمارے نزدیک اکبر زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونے کی وجہ سے ذہنی انتشار اور فکری پراگندگی کا شکار ہو گیا تھا اور اس میں تغیر احوال کے ساتھ ساتھ تغیر افکار بھی ہوتا رہتا تھا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آخری دنوں میں وہ اسلام کی حقانیت پر ایمان لے آیا تھا اور مسلمان کی حیثیت سے اس دنیا سے رخصت ہوا تو ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ پھر اس کے اسلام کی شہادت، ایک ایسا گروہ دیتا ہے جو نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسلام سے بہرہ مند ہو۔ کسی کی سچائی پر مخالف کی گواہی اپنے اندر ایک خاص وزن رکھتی ہے۔ بہر کیف موت کے بعد اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو گیا۔ وہی نیتوں کا جاننے والا ہے۔

اکبر کے آخری دور کے امرائے سلطنت پکے مسلمان تھے اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت ان کا بنیادی مقصد تھا۔ وہ اکبر کا جانشین بھی اسی شخص کو بنانا چاہتے تھے جو ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا خواہاں ہو۔

---

❶ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں، اس نسخے کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہے، لیکن چھوٹی تزک ہے بہت پرانی۔ اس کے عہد شاہ جہانی کے متعدد قلمی نسخے ملتے ہیں۔ مآثر الامرا اور دربار اکبری کے مصنف نے اس پر بڑا بھروسا کیا ہے۔

❷ عادل شاہی سلطنت کا پایۂ تخت بیجا پور تھا۔ اس کے موسس اعلیٰ کو تاریخ میں یوسف عادل شاہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جس نے ۸۹۰ھ/ ۱۵۸۵ء میں اس کی بنیاد رکھی۔ کم و بیش دو سو سال تک عادل شاہی سلاطین دکن کے بڑے حصے پر قابض رہے۔ ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء میں شاہ جہان نے اس کو دہلی کا باج گزار بنایا۔ ۱۰۹۸ھ/ ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر نے اس کو سلطنت مغلیہ میں ضم کر لیا۔

❸ رود کوثر، ص ۱۶۰، بحوالہ اکبر اینڈ دی جیسوٹس۔

Marfat.com

چنانچہ یہی وعدہ لے کر انھوں نے جہاں گیر کو تخت حکومت پر متمکن کیا۔

اکبر اینڈ دی جیسوٹس کا مصنف لکھتا ہے:

امرائے مملکت نے بالآخر فیصلہ کیا کہ حکومت اسی کو دینی چاہیے جو اس کا قانونا حق دار ہے۔ چنانچہ ایک برگزیدہ امیر (یعنی شیخ فرید) جسے دوسرے امرا نے اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، شہزادہ جہاں گیر کے پاس آیا اور امرا کی طرف سے اسے کہا کہ ہم سب آپ کی بادشاہت کی حمایت کریں گے، بشرطیکہ آپ اس بات کی قسم اٹھائیں کہ آپ شرع محمدیؐ کا تحفظ کریں گے اور اپنے بیٹے (خسرو) یا اس کے حامیوں کو کوئی سزا نہ دیں گے۔ شہزادے نے ان شرائط کو پورا کرنے کی قسم کھائی اور بہت سے محافظوں کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کو گیا[1]۔

علمی خدمات:

اکبر کے مذہبی خیالات سے اختلاف کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا دور علم وفن کے اعتبار سے بے حد زرخیز تھا۔ بے شمار علما وفضلا جو مروجہ علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے، دربار میں موجود تھے اور ملک کے مختلف علاقوں اور صوبوں میں بھی اہل علم بہت بڑی تعداد میں علمی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان میں اکثر حضرات کو دربار کی بحثوں اور چپقلشوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں مدارس دینی قائم تھے، جن میں افاضلِ روزگار کا غلغلۂ تدریس زوروں پر تھا۔ مثلاً دہلی، آگرہ، احمد آباد، جون پور لاہور، ملتان، سیالکوٹ، سرہند وغیرہ بلاد وامصار اور قصبات میں مشہور زمانہ حضرات علمانے تشنگان علوم کی علمی تشنگی بجھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس دور کے اصحاب علم، ایک طرف اگر منصب درس وتدریس پر فائز تھے تو دوسری جانب مسند رشد وہدایت پر بھی متمکن تھے، یعنی بیک وقت وہ فکری نشوونما کا سامان بھی فراہم کرتے تھے اور روحانی اصلاح کا اہتمام بھی فرماتے تھے۔ ان علما وصلحا میں حضرت مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، خواجہ باقی باللہ، شیخ نورالحق دہلوی، شیخ میر فتح اللہ شیرازی وغیرہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ ان کے علاوہ صدرالصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی، مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری، مولانا حاتم سنبھلی اور دیگر بہت سے علما تھے، جن میں بعض شاہی خدمات پر بھی مامور تھے، اور ساتھ ہی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے مشاغل بھی جاری رکھتے تھے۔

عہد اکبری میں ایک عالم دین مولانا علاء الدین لاری تھے، جنھوں نے شرح عقائد نسفی پر حواشی تحریر کیے۔ پہلے یہ جون پور میں خان زمان کے پاس مصروف تدریس تھے، بعدازاں آگرہ تشریف لے آئے تھے۔ درس و تدریس کا شوق ان پر اتنا حاوی تھا کہ آگرہ میں ایک چھپر ڈال کر مدرسہ قائم کر لیا تھا اور اسی میں تعلیم وتدریس میں

[1] رود کوثر، ص ۲۰۴۔

Marfat.com

مشغول ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد حج کے لیے تشریف لے گئے اور اسی سفر میں سفر آخرت کو روانہ ہو گئے۔

اس دور میں سرزمین کشمیر کو بھی اصحاب علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور مختلف مقامات پر اہل فضل و کمال نے تصنیفی اور تدریسی مسندیں آراستہ کر رکھی تھیں۔ اس کتاب کے مختلف مقامات پر ان حضرات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

عہد اکبری میں بادشاہ کے حکم سے یا خاص دربار سے تعلق رکھنے والے اہل علم کی طرف سے تصنیف و ترجے کی جو خدمات انجام دی گئیں، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ مہابھارت: یہ ہندوؤں کی مشہور کتاب ہے۔ اس کا سنسکرت سے فارسی میں رزم نامہ کے نام سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ کام ۹۰۰ھ سے ۹۹۵ھ/۱۴۹۵ء سے ۱۵۸۷ء تک نقیب خاں، ملا عبدالقادر بدایونی، ملا شیری اور حاجی سلطان تھانیسری نے مکمل کیا۔

۲۔ رامائن: یہ بھی ہندوؤں کی معروف کتاب ہے۔ اسے ۹۹۵ھ سے ۹۹۹ھ/ ۱۵۸۷ء سے ۱۵۹۱ء تک ملا عبدالقادر بدایونی نے سنسکرت سے فارسی زبان میں منتقل کیا۔

۳۔ سنگھاسن بتیسی: ''خرد افزا'' کے نام سے عبدالقادر بدایونی نے اس کو ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں فارسی کے قالب میں ڈھالا۔

۴۔ حیٰوۃ الحیوان: یہ دمیری کی مشہور کتاب ہے، اور عربی زبان میں ہے۔ ملا مبارک نے ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء کو اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

۵۔ اتھربن: یہ ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتاب اور چوتھا وید ہے۔ اس کے بعض احکام اسلام کے مطابق ہیں۔ دکن کا ایک ہندو پنڈت بھاون، جو لکھا پڑھا اور عاقل و فہیم شخص تھا، مسلمان ہو کر دربار میں آیا تو اس نے بادشاہ کو اس کتاب کے مندرجات سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی فارسی میں ترجمہ کرنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے عبدالقادر بدایونی، فیضی اور حاجی ابراہیم سرہندی کو اس کام پر مامور کیا۔ یہ ترجمہ ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء میں کیا گیا۔

۶۔ تزک بابری: یہ مغل حکمران ظہیر الدین بابر کی سرگزشت ہے۔ اصل کتاب ترکی زبان میں تھی۔ ۹۹۸ھ/ ۱۵۹۰ء میں عبدالرحیم خان خاناں نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

۷۔ انجیل: ابوالفضل نے ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء میں اس کو فارسی زبان میں منتقل کیا۔

۸۔ لیلاوتی: ہندوؤں کے فن ریاضی کی کتاب ہے۔ فیضی نے فارسی میں منتقل کی۔

۹۔ ہربنس: کرشن جی کے حالات پر مشتمل ہے۔ مولانا شیری نے اس کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۰۔ معجم البلدان: شہاب الدین عبداللہ یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء) کی شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ ملا احمد ٹھٹھوی، قاسم بیگ، شیخ منور اور عبدالقادر بدایونی نے ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں اس کا عربی

Marfat.com

سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۱۔ تاجک: علوم نجوم کی ایک کتاب ہے۔ مکمل خاں گجراتی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۲۔ تاریخ کشمیر: کشمیر کے حالات میں سنسکرت کی ایک مشہور کتاب راج ترنگنی کے نام سے سلطان زین العابدین کے عہد میں تصنیف کی گئی تھی۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے اس کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ پھر ملا عبدالقادر بدایونی نے ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں اسے سلیس فارسی میں منتقل کیا۔

۱۳۔ کلیلہ دمنہ: سنسکرت کا ایک قدیم قصہ ہے۔ ابوالفضل نے ۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء میں اس کا ''غبار دانش'' کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۴۔ نل دمن: ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء میں فیضی نے ہندوستان کی یہ مشہور عشقیہ داستان جو چار ہزار دو سو اشعار پر مشتمل مثنوی ہے، خسرو کی ''لیلیٰ مجنوں'' کی بحر میں تصنیف کی۔

۱۵۔ جامع رشیدی: عبدالقادر بدایونی نے ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء) کو اسے عربی سے فارسی میں منتقل کیا۔

۱۶۔ بحرالاسمار: یہ ہندی افسانے کی کتاب ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۶ء میں اسے فارسی کے قالب میں ڈھالا۔

۱۷۔ تاریخ الحکما: یہ شہرزاری کی تصنیف ہے۔ مقصود علی تبریزی نے ''نزہتہ الارواح'' کے نام سے اس کو لباس فارسی پہنایا۔

۱۸۔ زیج مرزائی: سنسکرت سے فارسی میں اس کا ترجمہ میر فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل، کشن جوتشی، گنگا دھر میش مہانند نے کیا۔

۱۹۔ کتاب الاحادیث: یہ کتاب فن تیر اندازی سے متعلق ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے ۹۷۶ھ/۱۵۶۹ء میں لکھی تھی۔ ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

۲۰۔ تاریخ الفی: یہ نقیب خاں، شاہ فتح اللہ، حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی، نظام الدین احمد، عبدالقادر بدایونی، ملا احمد ٹھٹھوی، جعفر بیگ اور آصف خاں کی مشترکہ تصنیف ہے۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں اس کی تصنیف کا آغاز ہوا، ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۲ء میں عبدالقادر بدایونی نے نظر ثانی کر کے اسے مکمل کیا۔

۲۱۔ اکبر نامہ: یہ ابوالفضل کی تصنیف ہے۔ اس کی تیسری جلد آئین اکبری کے نام سے موسوم ہے۔

۲۲۔ نجات الرشید: ملا عبدالقادر بدایونی کی فارسی تصنیف۔

۲۳۔ طبقات اکبری: مرزا نظام الدین احمد کی تصنیف۔

۲۴۔ سواطع الالہام: فیضی کی بے نقط تفسیر، جو ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء میں لکھی گئی۔

۲۵۔ موارد الکلم: فیضی کی بے نقط تصنیف۔

۲۶۔ مرکز ادوار: فیضی کا مجموعہ اشعار۔ مرتبہ ابوالفضل۔

Marfat.com

۲۷۔ کشکول: ابوالفضل کی منتخب تحریریں۔

۲۸۔ جوتش: خان خاناں نے جوتش پر مثنوی لکھی تھی، جس کے ہر شعر میں ایک مصرع فارسی کا اور دوسرا سنسکرت کا تھا۔

۲۹۔ ثمرۃ الفلاسفہ: اصل کتاب یونانی زبان میں تھی۔ عبدالستار بن قاسم نے ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں یونانی زبان سے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا۔ اس نے یہ کتاب ایک یونانی پادری سے حاصل کی تھی۔ اس میں روما کی تاریخ اور مشاہیر اہل کمال کا ذکر ہے۔

۳۰۔ خیرالبیان: یہ پٹھانوں کے ایک قبیلے کے پیر تاریک (یعنی روشن پیر) کی تاریخ ہے۔

۳۱۔ ہمایوں نامہ: اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم نے لکھا جو ایک عالمہ وفاضلہ خاتون تھیں۔

ان کتابوں سے واضح ہوتا ہے کہ دور اکبری کے علما کو عربی، فارسی، کشمیری، سنسکرت، یونانی وغیرہ زبانوں پر اس درجہ عبور حاصل تھا کہ وہ نہایت آسانی سے ایک زبان کے مشکل مضامین، پیچیدہ مباحث اور دقیق مسائل کو دوسری زبان میں منتقل کرنے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔

اکبر کا معمول تھا کہ وہ عام طور پر رات کو مختلف مضامین پر مشتمل کتابیں اہل علم سے سنتا تھا۔ بعض دفعہ تو پوری پوری رات کتابیں سننے اور پڑھنے میں گزر جاتی تھی۔ پھر انھیں وہ اہتمام کے ساتھ شاہی کتب خانے میں جمع کر لیتا تھا۔ مذکورہ بالا کتابیں بھی اس نے مختلف اہل علم سے جن میں ملا عبدالقادر بدایونی بھی شامل ہیں، با قاعدہ سنی تھیں اور بعد میں ان کو فارسی میں منتقل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس سے اکبر کی وسعت معلومات کا پتا چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ عالم نہ ہونے کے باوصف علمی ذوق کا حامل تھا۔

عہد اکبری کی کتب تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ اکبر کو اپنی کم علمی کا بہت احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے معلومات میں اضافے کے لیے مختلف مضامین سے متعلق کتابوں کی سماعت کا با قاعدہ ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں ان کتابوں کی فہرست درج کی ہے، جنھیں اکبر اہل علم سے پڑھوا کر سنا کرتا تھا۔ ان کتابوں میں تصوف، تاریخ، اخلاق، ادب، مسائل فقہ، حرب وضرب وغیرہ سے متعلق مشہور اہل علم کی ہندی، یونانی، عربی، فارسی، کشمیری اور دیگر زبانوں کی معروف تصانیف شامل ہیں۔ مثلاً کیمیائے سعادت، اخلاق ناصری، گلستان، بوستان، شاہ نامہ، قاموس نامہ، مثنوی مولانا روم، مکتوبات شرف منیری، کلیات امیر خسرو، تالیفاتِ ملا جامی، جام جم، دیوان انوری، خمسۂ شیخ نظامی اور حدیقہ وغیرہ اکبر کے سامنے پڑھی گئیں اور اس نے ان کے مندرجات سے استفادہ کیا:

وہر کتابے را از آغاز تا بانجام شنوند، وہر روز کہ بداں جا رسد بشمارۂ آں ہندسہ بقلم گوہر بار نقش کنند، وبعد داوراق خوانندہ را نقد از زر سرخ وسفید بخشش شود۔ کم کتابے مشہور بوذ کہ مذکور محفل ہمایوں نہ گردد ❶۔

---

❶ آئین اکبری، ج ۱، ص ۷۶۔

Marfat.com

(یعنی اکبر بادشاہ ہر کتاب شروع سے آخر تک سنتا، اور روزانہ جس ورق تک سن لیتا اس پر اپنے قلم سے نشان لگا دیتا۔ اوراق کے حساب سے پڑھنے والے کو سونے چاندی کے (مروجہ) سکے عنایت کرتا۔ کوئی کم ہی مشہور کتاب ہوگی جس کا ذکر بادشاہ کی مجلس میں نہ ہوا ہو۔)

دور اکبری میں ترجمہ و تصنیف سے متعلق جو خدمات انجام دی گئیں، سطور بالا میں ایک خاص تعداد کے ذریعے اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اس کے عہد میں اور بھی بہت سی کتابیں معرض تصنیف میں آئیں، جو اب بھی موجود ہیں اور اہل علم ان سے مستفید ہوتے ہیں۔

اس کے عہد میں، فتح گجرات کے بعد بے شمار علما ملک کے مختلف حصوں سے گجرات گئے اور وہاں اشاعت علم کی۔ گجرات اگرچہ پہلے سے علم و فضل کا مرکز تھا، مگر اکبر کی فتح کے بعد اس کی علمی رونق میں مزید اضافہ ہوا۔ اسی طرح بہت سے علما گجرات سے خطہ ہند کے دیگر علاقوں میں گئے اور وہاں انھوں نے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کی مسندیں بچھائیں۔

پھر ان علماء و مصنفین اور مدرسین و مبلغین کی ایک کثیر تعداد ملک کے مختلف علاقوں میں موجود اور مصروف اشاعت دین تھی، جن کا سرکار دربار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان حضرات کا دائرۂ اثر بہت وسیع تھا۔

وفات:

جلال الدین محمد اکبر، ۲؍ربیع الاول ۹۴۹ھ/ ۱۶؍جون ۱۵۴۲ء کو پیدا ہوا۔ ۲؍ یا ۷؍ربیع الثانی ۹۶۳ھ/ ۱۳؍ یا ۱۸؍فروری ۱۵۵۶ء کو ہندوستان کا تاج شاہی سر پر رکھا۔ پچاس سال سے کچھ زائد عرصہ حکومت کر کے ۱۳؍جمادی الاخریٰ ۱۰۱۴ھ/ ۱۵؍اکتوبر ۱۶۰۵ء کو وفات پائی اور اپنے دارالسلطنت آگرہ میں سکندرہ کے مقام پر دفن کیا گیا۔

یہ اکبر کی زندگی کے مختصر حالات تھے، جن کا تعلق ہمارے موضوع سے تھا۔ فقہائے ہند کی جلد پنجم کے مقدمے میں اکبر کے بیٹے جہاں گیر اور جہاں گیر کے بیٹے شاہ جہان کی زندگی کے علمی، دینی اور مذہبی پہلوؤں کی وضاحت کی جائے گی۔

ان شاء الله العزيز وما توفيقي الا بالله العلي العظيم۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

بندہ عاجز
محمد اسحاق بھٹی
۱۹؍جون ۲۰۱۲ء
۲۷؍رجب ۱۴۳۳ھ

Marfat.com

Marfat.com

گیارھویں صدی ہجری

الف

ا۔ مفتی آدم بن محمد گوپاموی

مفتی آدم بن محمد بن خواجہ بن شیخ بن آدم شہابی صدیقی گوپاموی، شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی اولاد سے تھے، جو اپنے دور کے مشہور عالم دین اور نامور بزرگ تھے۔ ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء میں ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مردم خیز شہر گوپامئو میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں جون پور کو علم وعلما کے عظیم مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور ایک عرصے سے وہاں درس وتدریس کی مسندیں آراستہ تھیں۔ مفتی موصوف نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو جون پور کا قصد کیا اور شیخ معروف بن عبدالواسع حسینی بخاری جون پوری کے حلقہ درس میں شمولیت اختیار کی۔ ان سے مروجہ علوم درسیہ بھی حاصل کیے اور تصوف وطریقت سے بھی بہرہ یاب ہوئے اور علوم متداولہ میں اس درجہ مہارت پیدا کی کہ اپنے عصر کے مشاہیر فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہونے لگا اور وقت کے بہت بڑے شیخ گردانے گئے، یہاں تک کہ اپنے شہر گوپامئو کے منصب افتا پر فائز ہوئے اور پھر اسی شہر میں عرصے تک درس وتدریس کا ہنگامہ بپا کیے رکھا۔ اس اثنا میں بے شمار اہل علم ان سے مستفید ہوئے اور طلبا کی کثیر تعداد نے کسب فیض کیا۔ تخت ہند پر اس زمانے میں مغل حکمران ظہیر الدین بابر متمکن تھا۔ وہ مفتی آدم بن محمد کا بہت قدردان تھا۔ اس نے ۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء میں ان کو معاشی تکفل کی غرض سے ایک قریہ عطا کیا۔ مفتی ممدوح نے نوے سال عمر پا کر ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء میں وفات پائی ❶۔

۲۔ شیخ ابراہیم محدث اکبر آبادی

شیخ ابراہیم بن داؤد قادری اکبر آبادی کی کنیت ابوالمکارم تھی اور وصالی تخلص کرتے تھے۔ مانک پور میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اساتذۂ عصر سے اخذ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عازم

❶ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲،۳۔

Marfat.com

بغداد ہوئے اور وہاں ڈھائی سال قیام پذیر رہے۔ اس اثنا میں علوم تفسیر و حدیث کی تکمیل کی۔ بعد ازاں حرمین شریفین کے لیے رخت سفر باندھا اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ پھر مصر گئے اور قاہرہ میں اقامت گزیں ہوئے۔ قاہرہ میں شیخ شمس الدین علقمی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے اخذ علم حدیث کیا اور شیخ محمد بن ابوالحسن بکری شافعی سے سند و اجازہ حاصل کیا۔ وہاں سے مکہ مکرمہ کو مراجعت کی اور شیخ عبدالرحمٰن بن فہد مغربی، شیخ مسعود مغربی اور شیخ علی متقی کے حلقۂ تلمذ میں شریک ہوئے اور ان تمام علمائے عظام نے ان کو باقاعدہ سند و اجازہ سے نوازا۔ مکہ معظّمہ سے دوسری مرتبہ پھر مصر گئے، اور وہاں خود درس و تدریس کا آغاز کیا۔ سرزمین مصر میں پورے چوبیس سال مسند تدریس پر فائز رہے۔ اس طویل مدت میں بے شمار علما و طلبا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے جنھوں نے ان کی صحبت میں رہ کر اپنی علمی تشنگی بجھانے کا سامان فراہم کیا۔ مصر کے دورانِ قیام میں ان کا یہ معمول رہا کہ ہر سال موسم حج میں مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے اور سعادت حج سے بہرہ اندوز ہوتے۔ چوبیس سال بعد دل میں جذبۂ حب وطن نے کروٹ لی اور واپس ہندوستان تشریف لے آئے۔ یہاں آ کر اکبر آباد (آگرہ) کو اپنا مسکن ٹھہرایا اور درس و افادہ اور وعظ و تذکیر کی مسند آراستہ کی۔ بے شمار لوگ ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر علم و ادراک کی دولت بے پایاں سے مالا مال ہوئے۔

شیخ ابراہیم کا زاد بوم اگرچہ مانک پور تھا۔ لیکن دیار عرب سے واپسی کے بعد علمی و تدریسی اعتبار سے اپنی بھرپور زندگی کا آخری دور چوں کہ اکبر آباد (آگرہ) میں گزارا تھا، اور برسوں اس شہر میں تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھی تھیں، اس لیے اکبر آبادی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ اپنے دور کے بہت بڑے عالم، عظیم محدث، نامور فقیہ اور ماہر علوم عربیہ تھے۔ ارض ہند میں علوم دینیہ بالخصوص علم حدیث کی تدریس میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ علاوہ ازیں بہت نیک، عابد و زاہد اور متقی تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بڑے تیز تھے۔ غنا و سماع کی مجلسیں منعقد کرنا اور ان میں شامل ہونا اس زمانے کے اہل علم اور اصحاب تصوف میں عام طور پر مروج تھا، مگر شیخ ابراہیم ان سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور دامن علم و اتقا کو اس قسم کے غیر شرعی مراسم و عواطف سے کبھی آلودہ نہ ہونے دیا۔

شیخ ابراہیم کے قیام آگرہ کے زمانے میں جلال الدین اکبر تخت ہند پر متمکن تھا۔ اس کا دارالحکومت بھی آگرہ تھا اور وہ بڑے رعب و دبدبہ اور جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ اس کے درباری امرا میں علمائے دین بھی شامل تھے، جو باقاعدہ دربار میں حاضر ہوتے اور بادشاہ کے حضور کورنش بجا لاتے تھے۔ لیکن شیخ ابراہیم اس سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے اور ہر آن خدمت علم میں مصروف رہتے تھے۔ وہ اونچے درجے کے حق گو عالم دین اور صحیح معنوں میں احکام شرع کے مبلغ تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ نے ان کو عبادت خانے میں تشریف لانے کی دعوت دی، شیخ گئے، بادشاہ موجود تھا، مگر اس کو مروجہ درباری سلام نہیں کیا۔ اس مجلس میں بادشاہ کے سامنے ایک خطبہ دیا، جس میں اس کو امور شرع پر کاربند ہونے کی ترغیب دی، غیر شرعی

Marfat.com

افعال کے ارتکاب سے روکا۔ اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔

برصغیر کے اس جلیل القدر محدث وفقیہ نے چھیاسی سال عمر پائی اور ۱۹؍ ذی الحجہ ۱۰۰۱ھ/ ۶؍ ستمبر ۱۵۹۳ء کو وفات پائی۔ ان کا مدفن آگرہ ہے ❶۔

۳۔ قاضی ابراہیم بن محمد کالپوی

قاضی ابراہیم بن محمد پنواروی کالپوی موضع پنواری کے باشندے تھے جو اعمال کالپی میں واقع تھا۔ انھوں نے اپنے والد (قاضی محمد پنواروی) سے اخذ علم اور کسب طریقت کیا اور اس عہد کے مشہور مدرس شیخ عبدالملک بن ابراہیم کالپوی سے ہدایہ پڑھا۔ حصول علم کے بعد اپنے قصبہ پنواری کی مسند تدریس پر فائز ہوئے اور پھر عمر بھر درس وتدریس اور افادۂ طلبا میں مصروف رہے۔ اپنے وقت اور علاقے کے شیخ اور عالم وفقیہ تھے۔ فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ صالح عالم دین، خوش خط اور فصیح البیان تھے۔ انداز گفتگو شیریں اور پُر تاثیر تھا۔ کسی مجلس میں زبان کو حرکت دیتے تو حسن بیان اور تاثر انگیزی میں سب سے سبقت لے جاتے۔ اپنے گوناگوں اوصاف کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت ومحبت مرتسم ہو چکی تھی اور ہر حلقے میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ نسب الانساب کے نام سے فارسی زبان میں ان کی ایک کتاب بھی ہے، جس میں تفصیل کے ساتھ ماں اور باپ کی طرف سے اپنے آباواجداد کے انساب بیان کیے ہیں۔

گیارھویں صدی کے اس ہندی عالم دین اور معروف فقیہ نے ماہ رمضان ۱۰۰۴ھ/ مئی ۱۵۹۶ء میں پنواری میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ❷۔

۴۔ سید ابراہیم غیاث پوری

سید ابراہیم نوری غیاث پوری، غیاث پور میں پیدا ہوئے۔ شیخ وقت، عالم دین اور محدث تھے۔ حدیث، فقہ اور تصوف کے نامور علما میں سے تھے۔ فقہ کی تعلیم لاہور میں شیخ اسحاق بن کاکو لاہوری کے مدرسے میں حاصل کی۔ پھر ملتان گئے۔ وہاں شیخ کبیر الدین حسینی بخاری سے بیعت ہوئے، جو ایک صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ملتان سے دہلی کا قصد کیا اور شیخ محمد غوث شطاری گوالیاری کی صحبت ورفاقت اختیار کی اور ان کی تصنیف ''الجواہر الخمسہ'' شیخ مبارک گوالیار سے پڑھی۔ پھر حج بیت اللہ کے ارادے سے دہلی سے نکلے، لاہور اور ملتان آئے۔ وہاں سے شیراز اور پھر بغداد گئے۔ بغداد میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشین شیخ زین

---

❶ اذکار ابرار، ص ۴۲۳، ۴۲۴۔ منتخب التواریخ، ص ۱۴۱، ۶۴۱۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴، ۵۔ بوستان اخبار، ص ۳۶ تا ۳۸۔

❷ اذکار ابرار، ص ۴۲۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۷۔

Marfat.com

العابدین حسنی بغدادی سے اخذ علم اور کسب فیض کیا۔ وہاں سے بلاد شام اور بیت المقدس ہوتے ہوئے مصر پہنچے۔ مصر میں شیخ محمد بکری شافعی سے علوم تفسیر و حدیث حاصل کیے اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ مصر سے عازم مدینہ منورہ ہوئے۔ وہاں سے مکہ مکرمہ گئے اور سعادت حج حاصل کی۔ وہاں شیخ علی متقی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور ان سے بعض اہم کتابوں کا درس لیا۔ پورے بارہ سال جبل ثور پر قیام فرما رہے، اس لیے ثوری مشہور ہوئے۔ پھر واپس ہندوستان آئے اور ۹۷۸ھ/ ۱۵۷۰ء کو اوجین شہر میں سکونت اختیار کی۔

شیخ ابراہیم غیاث پوری عابد و زاہد، قانع و متوکل اور صاحب بصیرت بزرگ تھے۔ ان کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چلا اور نہ یہ معلوم ہو سکا ہے کہ انھوں نے کہاں مسند تدریس بچھائی اور کن کن لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ بلاشبہ یہ اپنے عصر کے محدث و فقیہ اور عابد و زاہد عالم تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے، سیر و سیاحت کے زیادہ شائق تھے اور علمائے دین کی خدمت میں حاضر رہنے اور ان سے استفادہ کرنے کے متمنی رہتے تھے، لہٰذا نہ کوئی کتاب تصنیف کر سکے اور نہ کہیں بیٹھ کر درس و افادہ کے مواقع میسر آئے۔ ان کا سلسلہ نسب سید شاہ اجملی سامانوی ترمذی تک پہنچتا ہے۔ بارہ سال کی عمر میں گھر سے باہر نکلے۔ اس کے بعد تین مرتبہ اپنے وطن غیاث پور گئے۔ ایک دفعہ والدین سے ملنے کے لیے، دوسری مرتبہ والدہ کی وفات کے بعد، اور تیسری دفعہ والد کے انتقال کے بعد۔

گلزار ابرار کے مصنف محمد غوثی مانڈوی نے ۱۰۱۶ھ/ ۱۶۰۷ء میں ان کے گھر جا کر ان کے حالات معلوم کیے تھے۔ نہایت خود دار اور متوکل علی اللہ تھے۔ نہ ارباب حکومت اور اصحاب دولت کے پاس جاتے اور نہ ان سے کوئی چیز قبول کرتے۔ معلوم ہوتا ہے، انھوں نے ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء کے بعد وفات پائی ❶۔

۵۔ قاضی ابراہیم بیجاپوری

قاضی ابراہیم زبیری بیجاپوری، شیخ وقت، فاضل عصر، معرفت و ادراک میں یگانۂ روزگار، فقیہ، زاہد و متورع، بلند کردار اور عمدہ سیرت بزرگ تھے۔ علم و فضل کی فراوانیوں کے ساتھ ساتھ تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا اور یہ علم انھوں نے شیخ جان اللہ سہروردی بیجاپوری سے حاصل کیا تھا۔ طویل عرصے تک بیجاپور کی مسند قضا پر متمکن رہے اور فرائض قضا نہایت حسن و خوبی سے انجام دیے۔

برصغیر کے گیارھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ نے ۱۲/ رجب ۱۰۹۴ھ/ ۲۷/ جون ۱۶۸۳ء کو بیجاپور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ❷۔

❶ اذکار ابرار، ص ۵۵۵ تا ۵۵۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۸۔
❷ روضۃ الاولیاء۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۔

Marfat.com

۶۔ قاضی ابراہیم سندھی

قاضی ابراہیم ٹھٹھوی سندھی، شیخ مخدوم فیروز کے پوتے تھے۔ بہت بڑے عالم، شیخ اور فقیہ تھے۔ مغل حکمران شاہ جہان کی طرف سے دہلی کی مسند قضا پر متعین تھے۔ کئی سال اس منصب بلند پر فائز رہے۔ پھر ان کو قاضی عسا کر مقرر کر دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے قاضی القضاۃ بھی رہے، لیکن ساتھ ہی درس وافادے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

قاضی ابراہیم ٹھٹھوی سندھی اپنے دور کی عجیب وغریب شخصیت تھے۔ منقول ہے کہ کچھ مدت کے لیے ان کو ٹھٹھے کا امین بھی مقرر کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ان کی حویلی کی تعمیر پر ڈیڑھ لاکھ روپے خرچ کیے گئے تھے، لیکن جب وہ آئے اور حویلی پر نظر ڈالی تو انھیں پسند نہ آئی۔ ٹھٹھہ کا حاکم جو ہفت ہزاری منصب کا مالک امیر تھا، ہفتے میں ایک دن قاضی ابراہیم کے گھر پر آ کر دربار عام منعقد کرتا تھا۔ قاضی ممدوح بھی ہفتے میں ایک روز اس کے گھر جاتے اور دوپہر سے شام تک وہاں قیام کرتے۔

قاضی ابراہیم سندھی سے چند دلچسپ اور تعجب انگیز روایات بھی منقول ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک روز وہ شیخ میرک کے مکان پر حاضر ہوئے جو بادشاہ دین پناہ شاہ جہان کے آخری ایام حکومت میں صدارت مطلق کے منصب پر سرفراز تھے۔ اس وقت وہاں علما کی مجلس منعقد تھی۔ وہ کہتے ہیں جب میں وہاں جا کر بیٹھا تو اچانک ایک شخص سادہ لباس پہنے اور پیچ دار عمامہ باندھے ہوئے مجلس میں داخل ہوا۔ شیخ میرک نے اس کی آمد پر تمام علما سے زیادہ اس کی تعظیم کی۔ پھر جب وہ جانے لگا تب بھی شیخ اس کی انتہائی تعظیم بجا لائے۔ حاضرین مجلس نے شیخ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو جواب دیا کہ یہ شخص علوم نادرہ سے آگاہ ہے اور دنیائے جنات کا مرشد ہے۔ قاضی ابراہیم کہتے ہیں میں شیخ کی یہ بات سن کر تیزی کے ساتھ مجلس سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور التجا کی کہ کسی وقت مجھے ملاقات کا شرف بخشا جائے۔ انھوں نے مجھے اپنے گھر کا پتا دیا اور چلے گئے۔ تین چار روز کے بعد میں ان کے گھر گیا۔ اطلاع ملنے پر وہ بالا خانے سے جو ان کی خلوت گاہ تھا، نیچے آئے اور حال معلوم کر کے کہا۔ ''بندہ کو کچھ کام ہے، چند ساعت بالا خانے پر تشریف رکھیے، فارغ ہو کر حاضر خدمت ہونے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔'' میں ابھی دو چار زینے ہی اوپر چڑھا ہوں گا کہ ایک شان دار محفل آراستہ دکھائی دی۔ سب نے میرا استقبال کیا اور مجھے مجلس کے صدر مقام پر بٹھایا۔ ان میں سے تین چار اشخاص نے ہاتھ میں کتابیں پکڑ رکھی تھیں اور درمیان میں ایک شخص مطول کھولے بیٹھا تھا۔ ان دنوں ایک طالب علم نے ملا سعد الدین تفتازانی پر اعتراض کیا تھا۔ اس مجلس میں اس شخص نے مطول کھولی تو وہی مقام سامنے آیا جو زیر بحث تھا۔ اب پڑھنے پڑھانے اور سننے والوں نے اس مقام کو حل کرنے کے لیے آپس میں بحث شروع کر دی۔ میں نے بھی کچھ دخل دیا۔ ہر علم کی بحث اور دلیل پیش ہوئی۔ یہ مجلس پہر دن تک جاری رہی۔ اچانک

Marfat.com

صاحب خانہ نمودار ہوئے اور سب نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ میں شوق استفادہ کے جذبے میں سب سے پہلے ان کے سامنے جا پہنچا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''بڑی تکلیف ہوئی آپ کو۔ میرا بڑا انتظار کرنا پڑا۔'' میں نے جواب میں عرض کیا: ''ان عزیزوں کی صحبت سے میں نے بہت استفادہ کیا۔'' فرمایا: ''کن عزیزوں کی صحبت سے؟'' میں نے پلٹ کر پیچھے کو دیکھا تو کوئی بھی نظر نہ آیا۔ فی الفور میرے جسم میں رعشہ طاری ہو گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ شیخ نے پانی دم کر کے میرے منہ پر چھینٹے مارے تو مجھے ہوش آیا۔

قاضی ابراہیم سے یہ بھی منقول ہے، کہتے ہیں جس زمانے میں میں اعلیٰ حضرت جنت مکانی (عالم گیر بادشاہ) کے پوتے کا معلم تھا، ایک روز شیخ ناصر جو اپنے وقت کی عجیب و غریب شخصیت تھے، کتب خانے میں آئے۔ سلطان بھی موجود تھا۔ میں نے سلطان کو ان سے کچھ طلب کرنے کا اشارہ کیا۔ سلطان نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ شیخ سے تبرک کی درخواست کی، اور انھوں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر فرش کے نیچے سے چند کنکریاں اٹھائیں اور ہاتھ میں تین بار گھمائیں۔ میں نے دیکھا کہ اب ان کنکریوں میں سے کچھ تو آب دار عقیق ہیں، کچھ بے بہا لعل ہیں، کچھ مرجان ہیں اور کچھ موتیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ کہ پھر یہ سب انھوں نے داڑھی کے بال کی نوک سے ایک ایک پرو کر سلطان کو دیں۔

قاضی ابراہیم سندھی کے دو بیٹے تھے۔ شیخ امان اللہ جو لاولد فوت ہوئے، اور ایک شیخ عنایت اللہ۔ یہ دونوں بڑے نامور بزرگ تھے، لیکن آبادی سے دور اپنی جاگیر میں اقامت گزیں رہے۔ قاضی ممدوح کے بیٹوں کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ البتہ تین نواسے تھے۔ قاضی محمد یحییٰ، قاضی محمد امین اور محمد باقر۔

قاضی ابراہیم کے بھائی محمد کریم تھے۔ یہ بھی اپنی جاگیر میں نیرون کوٹ رہے اور وہیں فوت ہو گئے۔ لیکن قاضی مرحوم کے بھتیجے قاضی محمد اکرم موضع بھتوڑہ کے منصب قضا پر متعین ہوئے۔ ان کے بھائیوں کی اولاد میں سے ایک اور بزرگ قاضی عبدالجلیل تھے، جو پٹنہ کی مسند قضا پر متمکن کیے گئے۔ انھوں نے بہت ہی عزت کی زندگی بسر کی اور پٹنہ ہی میں وفات پائی [1]۔

قاضی ابراہیم کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کتاب کے مصنف نہ تھے، البتہ گیارھویں صدی ہجری کے برصغیر کے نامور قاضی، عالم دین اور فقیہ تھے۔

۷۔ مفتی ابوالبقا جون پوری

مفتی ابوالبقا بن درویش محمد حسینی واسطی جون پوری، جون پور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد (شیخ درویش محمد) اور دیگر علما سے تحصیل کی۔ پھر درس و تدریس کی مسند سنبھالی۔ نہایت ذکی، قوی الحافظہ، سریع الادراک اور عذوبت لسان کے مالک تھے۔ مدت مدید تک اپنے شہر جون پور میں فرائض تدریس انجام دیتے

[1] تحفۃ الکرام، ص ۶۶۱ تا ۶۶۵۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۔

Marfat.com

رہے۔ مشاہیر فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور گیارھویں صدی ہجری کے اسلامی ہند کے بلند پایہ شیخ، عالم دین اور فقیہ تھے۔ بادشاہ ہند شاہ جہان ان کے علم و فضل کی وجہ سے ان کا بہت قدر دان تھا۔ ایک مرتبہ دہلی گئے تو شاہ جہان انتہائی تکریم سے پیش آیا اور انھیں جون پور کے منصب قضا پر متعین کیا۔

ان کی قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو کتاب ایک مرتبہ مطالعہ میں آ جاتی، اس کا ایک ایک لفظ ذہن میں نقش ہو جاتا اور حافظہ اس کے تمام گوشوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے جو بعض تذکروں میں مرقوم ہے کہ ایک مرتبہ قیصر روم نے ابوالبقا عبداللہ بن حسین العکبری (متوفی ۶۱۶ھ/ ۱۲۱۹ء) کی تصنیف ''اعراب القرآن'' (جو دس جلدوں پر مشتمل ہے) بادشاہ ہند شاہ جہان کی خدمت میں بطور تحفہ ارسال کی۔ بُعدِ مسافت کی وجہ سے اس کتاب کے کچھ اوراق پھٹ گئے تھے۔ شاہ جہان نے یہ کتاب مفتی ابوالبقا کے پاس بھیجی تاکہ وہ اسے درست کر دیں۔ چھ ماہ گزر گئے مگر کتاب واپس شاہی کتب خانے میں نہ پہنچی۔ اب بادشاہ نے مفتی صاحب سے واپسی کا مطالبہ کیا۔ مفتی صاحب ممدوح نے اپنے کتب خانے میں کتاب (اعراب القرآن) تلاش کی تو نہ ملی۔ لیکن جب ان کے پاس کتاب پہنچی تھی، وہ اسے پڑھ چکے تھے اور اس کے مندرجات ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ انھوں نے اللہ کا نام لے کر قلم پکڑا اور اپنی قوت حافظہ سے پوری کتاب لکھ کر بادشاہ کو بھجوا دی۔ دربار میں یہ کتاب گئی تو کوئی اس کے اصل اور نقل میں تمیز نہ کر سکا۔ اصل واقعہ بادشاہ کے علم میں آیا تو اس نے مفتی صاحب کو اس کے صلے میں جاگیر اور انعام عطا کیا۔

مفتی ابوالبقا جون پوری مصنف و مولف بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے شرح جامی، شرح شمسیہ (رازی) اور منطق کی مشہور کتاب قطبی پر حواشی تحریر کیے۔

وہ ملا محمد ماہ دیوگامی کے شاگرد تھے، جن کا شمار اپنے دور کے مشہور اساتذہ اور اجل علما میں ہوتا تھا۔ مفتی ابوالبقا نے جمعہ کے روز ۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۰۴۰ھ/ ۱۷/ دسمبر ۱۶۳۰ء کو جون پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔ ان کی قبر جون پور کے مفتی محلّہ میں ہے[1]۔

۸۔ شیخ ابوبکر شافعی سندھی

شیخ ابوبکر سندھی، شافعی المسلک تھے۔ اپنے عصر کے بہت بڑے فاضل اور علامہ تھے۔ دمشق میں جامع اموی کے مشرقی مینار کے نیچے یہ سندھی عالم دین دس سال خدمت علم انجام دیتے اور علما و طلبا کو مستفید فرماتے رہے۔ یوں تو تمام مروجہ علوم کے ماہر تھے لیکن معقولات میں بالخصوص درک رکھتے تھے۔ ساتھ ہی انتہائی نیک بھی تھے۔ ان کے تدین کا یہ حال تھا کہ اکثر روزے رکھتے اور نماز با جماعت کا التزام کرتے۔ کم گو، متواضع اور عبادت گزار تھے۔ حکام کی مجلسوں اور ان سے ملاقات سے دامن کشاں رہتے۔ اگر کسی حکمران کو ان سے کوئی

[1] تجلی نور، ص ۶۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۔ تاریخ شیراز ہند، جون پور، ص ۲۷، ۲۸۔

Marfat.com

کام ہوتا تو خود حاضر خدمت ہو جاتا۔

دنیا اور اس کا مال و متاع انھیں پیش کیا جاتا، مگر وہ اس سے دور بھاگتے۔ خاموشی اور قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ علما وطلبا کا ایک ہجوم ان کے گرد رہتا اور یہ ان کو معقولات اور دیگر علوم کی تعلیم دیتے۔ طویل عرصے تک شائقین علوم ان کے فیوض عالیہ سے مستفید ہوتے رہے۔ ان کی وفات طاعون کے مرض سے ہوئی۔ ہفتے کے روز ۳ ربیع الاول ۱۰۱۸ھ/ ۱۹ جون ۱۶۰۹ء کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس دن وہ روزے سے تھے۔ شیخ نجم الدین غزی شافعی نے ان کی وفات پر یہ شعر کہے:

عجبت لطاعون اصابت نباله واربت علی الخطی والصارم الهندی

سرطا فی دمشق الشام عاما واخرا تبسط فی الهندی وما ترك السندی

انھیں باب الفرادیس میں تربت غربا میں دفن کیا گیا ❶۔

اس شافعی المسلک سندھی عالم دین کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کہاں پیدا ہوئے۔ سندھ میں کتنا عرصہ قیام پذیر رہے اور ان کے تلامذہ کی فہرست میں کون کون خوش بخت حضرات شامل تھے۔

۹۔ قاضی ابوبکر الہ آبادی

قاضی ابوبکر الہ آبادی گیارھویں صدی ہجری میں دیار ہند کے ممتاز عالم دین اور فقیہ تھے۔ انھوں نے فقہ امام ابوحنیفہ کی روشنی میں فقہ کی ایک کتاب تصنیف کی جو احناف کے معمول بہا مسائل پر مشتمل تھی۔ یہ کتاب انھوں نے اورنگ زیب عالم گیر کے مصاحب وندیم بختاور خاں کے نام معنون کی تھی ❷۔

۱۰۔ شیخ ابوتراب بیجاپوری

شیخ ابوتراب بن ابوالمعالی بن علم اللہ صالحی ایٹھوی ثم بیجاپوری کی جائے ولادت بیجاپور ہے۔ وہیں نشوونما پائی اور وہیں شیخ علی محمد بن اسد اللہ علوی گجراتی سے تحصیل علم کی اور ان سے مختلف علوم اس درجہ محنت و کوشش کے ساتھ حاصل کیے کہ اپنے تمام اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے اور بیجاپور کے اکابر علما میں شمار ہونے لگے۔ پھر خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی اور نصف عمر اس خدمت میں صرف کر دی۔ اپنے عہد کے فاضل بزرگ تھے اور فقہ اور اصول فقہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ ارض ہند میں بیجاپور اس زمانے میں اہل علم کا مرکز تھا اور شیخ ابوتراب کو اس مرکز علم و فضل کے رئیس کی حیثیت حاصل تھی۔

گیارھویں صدی ہجری کے بے شمار چوٹی کے علما نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اور ان میں

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲، بحوالہ لطف السمر وقطف الثمر۔

❷ مرأۃ العالم۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۳۔

Marfat.com

سے بعض اپنی عظیم علمی و فقہی خدمات کی بنا پر شہرت دوام کے مالک ہوئے، ان بلند مرتبت حضرات میں مرتبین فتاویٰ ہندیہ (جو فتاوے عالم گیری کے نام سے مشہور ہے) کے سربراہ شیخ نظام الدین برہان پوری بھی شامل ہیں جو شیخ ابوتراب کے نامور تلمیذ تھے۔ شیخ ابوتراب نے ۲۰ رصفر ۱۰۸۶ھ/ ۶ رمئی ۱۶۷۵ء کو وفات پائی ❶۔

۱۱۔ شیخ ابوتراب گجراتی

شیخ ابوتراب بن کمال الدین بن ہبۃ اللہ حسینی گجراتی۔ جانپانیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ ان کے دادا شیخ ہبۃ اللہ کا شمار خطۂ ہند کے کبار علمائے کرام میں ہوتا تھا، ان سے اور اپنے والد مکرم شیخ کمال الدین سے تعلیم پائی اور علم و فضل میں رسوخ حاصل کیا۔ جانپانیر سے گجرات (کاٹھیاوار) کے مشہور شہر احمد آباد منتقل ہو گئے، جو اس زمانے کے اسلامی ہند میں علم و علما کا مرکز، صوفیا و صلحا کا مسکن، اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور سلاطین گجرات کا دارالسلطنت تھا۔ جب مغل حکمران جلال الدین اکبر نے گجرات پر حملہ کر کے اس کو فتح کیا تو شیخ ابوتراب گجراتی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ ان کے علم و فضل سے متاثر ہوا اور انھیں ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں امیر حجاج مقرر کر کے مکہ مکرمہ بھیجا۔ حرمین شریفین کے مستحقین و مساکین میں تقسیم کرنے کے لیے بادشاہ نے ان کو چاندی کے پانچ لاکھ مروجہ سکے دیے اور دس ہزار خلعات فاخرہ عطا کیں۔ شیخ ممدوح سعادت حج سے بہرہ ور ہو کر ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء میں ہندوستان واپس لوٹے۔ منقول ہے کہ واپسی میں ارض حجاز سے ایک پتھر بھی لائے، جس پر رسول اللہ ﷺ کا قدم مبارک ثبت تھا۔ بادشاہ نے اپنے دارالحکومت آگرہ سے چار میل باہر نکل کر ان کا استقبال کیا۔ اس پتھر کو ہاتھ میں پکڑا اور احترام سے آنکھوں پر لگایا اور سر پر رکھا۔ شیخ کو جلوس کی شکل میں آگرہ لایا گیا اور ان کی نہایت تعظیم کی گئی۔

اس سے کچھ عرصہ بعد اکبر نے ان کو گجرات میں منصب جلیلہ پر متعین کیا اور ایک مدت تک وہ اس منصب پر فائز رہے۔ شیخ ابوتراب گجراتی صاحب تصنیف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب تاریخ گجرات ہے، جو فارسی زبان میں ہے۔ اس جلیل القدر عالم دین نے ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۰۰۳ھ/ ۱۳ر فروری ۱۵۹۵ء کو وفات پائی ❷۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کے پتھر پر نقش قدم اور بالوں وغیرہ کے متعلق جو حکایتیں بعض تذکروں میں منقول ہیں یا لوگوں کی زبانی سننے میں آتی ہیں وہ اصل حقیقت سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ آنحضرت ﷺ فداہ ابی و امی کے بال مبارک اب تک اس دنیا میں موجود ہیں، نہ آپ کا نقش قدم کسی پتھر پر مرتسم ہے اور نہ آپ کی کوئی اور چیز کہیں پائی جاتی ہے۔ اس قسم کے توہمات سے دامن بچا کر رکھنا

❶ روضۃ الاولیا۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۔

❷ مآثر الامرا۔ منتخب التواریخ، ص ۶۲ھ بضمن مرزا مظفر حسین کا گجرات پر حملہ (اردو ترجمہ)۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳، ۱۴۔

Marfat.com

چاہیے۔ صرف آپ کی تعلیمات، آپ کے ارشادات، آپ کی سنت مطہرہ، اسوۂ حسنہ اور اقوال و افعال کو سامنے رکھنا چاہیے۔ وہی ہمیشہ رہنے والے ہیں، انھی کو دوام حاصل ہے۔ انھی پر ہماری نجات کا دارومدار ہے اور یہی ذریعہ فلاح و کامرانی ہے۔

۱۲۔ سید ابوالحسن سورتی

سید ابوالحسن بن جمال الدین بن سید بادشاہ خوارزمی سورتی، مشائخ نقشبندیہ میں سے تھے۔ اپنے والد (شیخ جمال الدین) سے کتب فقہ کی تحصیل کی اور ان ہی سے اخذ طریقت کیا۔ والد کی وفات کے بعد مسند مشیخت پر فائز ہوئے۔ بے شمار لوگ ان کی تبلیغی مساعی سے راہ حق پر گامزن ہوئے۔ سید ابوالحسن سورتی نے ۹ رصفر ۱۰۵۴ھ/ ۷راپریل ۱۶۴۴ء کو سورت (ہندوستان) میں داعی اجل کو لبیک کہا اور وہیں سپرد خاک کیے گئے ❶۔

۱۳۔ شیخ ابوالحسن کشمیری

شیخ ابوالحسن کشمیری سندھی، فاضل کبیر اور معقولات و منقولات کے جید علما سے تھے۔ مغل حکمران شاہ جہاں کے عہد میں مسند تدریس پر متعین تھے اور علما و طلبا کو باقاعدہ درس دیتے تھے۔ شاہم بابا کے عرف سے معروف تھے۔ ملا یوسف گنائی ان کے علم و فضل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ تمام علوم مروجہ میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ جب ناظمان خطۂ کشمیر کے کہنے سے علما کے درمیان مباحثہ ہوا تھا تو یہ چوٹی کے علما کی مجلس میں تفسیر بیضاوی اور عصام الدین محشی کی عبارتوں کی عبارتیں اس درجہ تیزی سے پڑھتے تھے، جس طرح حافظ قرآن، قرآن پڑھتا ہے۔ اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی اکثر عبارات و تشریحات کا رد کرتے تھے اور وضاحت کرتے تھے کہ ملا عبدالحکیم نے کہاں کہاں علمی لغزش کھائی ہے۔ انھیں اپنی تحقیق پر اس قدر بھروسا تھا کہ مسلسل اپنی رو میں بولتے چلے جاتے تھے اور مجلس میں حاضر علما کی طرف بالکل التفات نہ کرتے تھے ❷۔

❶ حدیقہ احمدیہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۴۴۔ حدائق الحنفیہ، ص ۵۵۷۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵۔ ص ۱۷۔ تذکرہ علمائے ہند کے صفحہ مذکور پر ابوالحسن نام کے دو بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک مولوی ابوالحسن ساکن کاندھلہ کا اور ایک ملا ابوالحسن کشمیری کا۔ ملا ابوالحسن کشمیری کا تذکرہ ایک سطر میں کیا گیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ''ملا ابوالحسن کشمیری مشہور بشاہم بابا، معاصر شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ بود۔'' لیکن دوسرے بزرگ کے بارے میں صرف یہ الفاظ مرقوم ہیں: ''مولوی ابوالحسن ساکن کاندھلہ'' یعنی محض عنوان۔ تذکرہ علمائے ہند کے اردو مترجم محمد ایوب قادری سے یہاں سہو ہو گیا ہے۔ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت ملا ابوالحسن کشمیری کا متن، مولوی ابوالحسن ساکن کاندھلہ کے عنوان میں درج کر دیا ہے۔ (دیکھیے تذکرہ علمائے ہند، اردو ترجمہ، ص ۵۵۹)

Marfat.com

۱۴۔ سید ابو حنیفہ نصیر آبادی ثم بریلوی

سید ابو حنیفہ بن علم اللہ حسنی حسینی، نصیر آباد میں پیدا ہوئے۔ جب ان کے والد مکرم (سید علم اللہ) نصیر آباد کی سکونت ترک کر کے رائے بریلی منتقل ہوئے تو باپ بیٹا دونوں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ اس وقت سید ابو حنیفہ کی عمر بارہ سال تھی۔ حج سے واپس آئے تو باپ کے زیر تربیت رہ کر ان سے علم فقہ کی تحصیل کی۔ طریقت وتصوف کے حصول کا رجحان اس دور کے علما میں عام طور پر پایا جاتا تھا، سید ابو حنیفہ کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے یہ فیض بھی اپنے والد محترم ہی سے حاصل کیا اور اپنی حیات مستعار کے آخری سانس تک انہی سے منسلک رہے۔ سید علم اللہ صلاح وتقویٰ کے حامل اور متبع سنت محمدیہ تھے۔ سید ابو حنیفہ بھی اس معاملے میں باپ کے نقش قدم پر چلے اور فضل وصلاح کے اعتبار سے معروف بزرگوں میں گردانے گئے۔ انھوں نے اپنے والد کی زندگی ہی میں ماہ ربیع الاول ۱۰۸۸ھ/ مئی ۱۶۷۷ء میں بمقام رائے بریلی وفات پائی ❶۔

۱۵۔ شیخ ابو الخیر بن مبارک ناگوری

شیخ ابو الخیر بن شیخ مبارک ناگوری ۲۲ ر جمادی الاولیٰ ۹۶۷ھ/ ۱۹ ر فروری ۱۵۶۰ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد (شیخ مبارک ناگوری) سے جو اس دور کے عالم وفاضل بزرگ تھے، علم حاصل کیا۔ شیخ ابو الخیر مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے۔ جلال الدین اکبر سے ان کا تعلق پیدا ہوا تو اس نے ان کے علم وفضل سے متاثر ہو کر اپنے بیٹوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ تصنیف وتالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب ''الارشاد'' کی بسیط ومفصل شرح سپرد قلم کی۔ یہ ابو الفضل اور فیضی کے بھائی تھے۔ اتوار کے روز ۲۵ ر جمادی الاولیٰ ۱۰۱۹ھ/ ۱۵ ر اگست ۱۶۱۰ء کو فوت ہوئے ❷۔

۱۶۔ شیخ ابو الخیر ٹھٹھوی سندھی

شیخ ابو الخیر ٹھٹھوی سندھی، حنفی المسلک عالم وفقیہ تھے۔ شیخ فضل اللہ سندھی کی اولاد سے تھے جو علم وفضل کے زیور سے آراستہ اور تقویٰ وللّٰہیت کی دولت سے مالا مال تھے۔ علم فقہ میں شیخ ابو الخیر کی مہارت کی بنا پر سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے ان کو علما کی اس جماعت میں شامل کیا جو فتاویٰ عالم گیری کی تدوین وترتیب کے فرائض انجام دینے پر مامور تھی ❸۔

---

❶ السیرۃ العلمیہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷۔

❷ آئین اکبری، ج ۳، ص ۳۱۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۱۸۔

❸ تحفۃ الکرام ص ۶۶۱۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۸۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۲۷۹، ۲۸۱۔

Marfat.com

۱۷۔ شیخ ابوالخیر بھیروی

شیخ ابوالخیر بن ابوسعید بن معروف بن عثمان عمری بھیروی، ۱۰۰۸ھ/۱۶۰۰ء میں بمقام سلطان پور پیدا ہوئے اور اپنے والد (شیخ ابوسعید) سے علم حاصل کیا۔ پھر مزید تحصیل کی غرض سے دیگر بلاد وامصار کا رخ کیا اور متعدد علمائے عصر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعد ازاں عازم حجاز ہوئے اور حج بیت اللہ کیا۔ حج کے بعد واپس ہندوستان آئے اور اپنے گاؤں بھیرہ میں جو اعمال جون پور میں واقع تھا، سکونت اختیار کی۔ بہت نیک عالم دین تھے۔ ۱۱؍شوال ۱۰۵۹ھ/ ۸؍اکتوبر ۱۶۴۹ء کو فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

۱۸۔ شیخ ابورضا دہلوی

شیخ ابورضا بن اسماعیل دہلوی، دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نواسے تھے، انہی سے اخذ علم کیا، اور اپنے عصر کے ممتاز علما میں گردانے گئے۔ عمر بھر درس وتدریس کی شمع جلائے رکھی اور بے شمار اہل علم نے ان سے استفادہ کیا، جن میں شیخ مبارک بن فخر الدین بلگرامی بھی شامل ہیں۔ آخر عمر میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۳ء کو دہلی میں وفات پائی ❷۔

۱۹۔ شیخ ابوسعید گنگوہی

شیخ ابوسعید بن نورالدین بن علی بن عبدالقدوس حنفی گنگوہی، گنگوہ کے مردم خیز شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے دور کے مشہور عالم وفقیہ تھے۔ تصوف وسلوک میں شیخ نظام الدین عمری تھانیسری کے فیض یافتہ تھے۔ گنگوہ کی مسند ارشاد پر فیض رہے اور خلقِ کثیر نے ان کے حلقۂ ارادت میں شمولیت کی، جن میں صاحب تسویہ شیخ محب اللہ الہ آبادی اور شیخ محمد صادق بھی شامل تھے۔

شیخ ابوسعید گنگوہی کے مرید شیخ محب اللہ الہ آبادی نے ایک کتاب انفاس الخواص کے نام سے تصنیف کی جو ابن عربی کی فصوص الحکم کے انداز کی کتاب ہے۔ یہ کتاب اکیاسی (۸۱) حصوں میں منقسم ہے، جن کا نام مصنف نے ''انفاس'' رکھا۔ ہر نفس کسی نبی یا ولی کے نام سے موسوم ہے اور اس نبی یا ولی کی تعلیمات کے باطنی پہلوؤں اور اس کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ یہ انفاس حضرت آدم سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک مختلف انبیائے کرام کے اسمائے گرامی سے معنون ہیں۔ اس کے بعد خلفائے اربعہ سے چار انفاس منسوب ہیں۔ پھر مختلف مقامات کے بعض مشہور اولیا وصوفیا کے انفاس بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلۂ انفاس کا آخری نفس

❶ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۱۸۔

❷ الاسرایہ۔ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۱۹۔

Marfat.com

مصنف کے مرشد شیخ ابوسعید بن نورالدین گنگوہی کے نام سے منسوب ہے۔یعنی بالکل فصوص الحکم کے انداز کی تصنیف ہے۔اس زمانے کے اکثر صوفیا ابن عربی کے افکار سے متاثر اور وحدت الوجود کے قائل تھے جو سراسر قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔

شیخ ابوسعید گنگوہی نے ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء میں بمقام گنگوہ وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے❶۔

۲۰۔ قاضی ابوسعید گجراتی

قاضی ابوسعید گجراتی، اپنے زمانے کے شیخ، عالم اور فقیہ تھے۔قاضی عبدالوہاب پٹنی گجراتی کے داماد تھے۔۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء میں اپنے خسر قاضی عبدالوہاب پٹنی گجراتی کی جگہ دہلی کے قاضی مقرر کیے گئے۔بعدازاں ذی القعدہ ۱۰۹۴ھ/ نومبر ۱۶۸۳ء کو قاضی لشکر کے عہدے پر فائز ہوئے۔کچھ مدت بعد جمادی الاولیٰ ۱۰۹۵ھ میں اس منصب سے معزول کر دیے گئے اور ۱۰۹۹ھ/ ۱۶۸۸ء کو، اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اس دنیائے فانی سے انتقال کر گئے❷۔

۲۱۔ مولانا ابوسعید امیٹھوی

مولانا ابوسعید بن عبیداللہ بن عبدالرزاق صالحی امیٹھوی، ۴ ربیع الاول، ۱۰۰۷ھ/ ۲۵ ستمبر ۱۵۹۹ء کو امیٹھی میں پیدا ہوئے اور اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ سے علم حاصل کیا۔فارغ التحصیل ہونے کے بعد تمام عمر درس و افادہ کا ہنگامہ بپا کیے رکھا۔عالم و فاضل، صالح، متورع، عابد و زاہد، کریم النفس اور سخی تھے۔۸ محرم ۱۰۶۱ھ/ ۲۲ دسمبر ۱۶۵۱ء کو اپنے وطن امیٹھی میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے❸۔

۲۲۔ شیخ ابوالعلا جون پوری

شیخ ابوالعلا بن غلام حسین حنفی صوفی جون پوری، صدر جہاں جون پوری کی اولاد سے تھے۔جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔فارغ التحصیل ہونے کے بعد، مشہور درسی کتاب رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی سے اخذ طریقت کیا۔خرقہ تصوف ان کے صاحب زادہ گرامی شیخ محمد ارشد عثمانی جون پوری سے پہنا اور شیخ یٰسین بن احمد صوفی بنارسی سے شرف اجازہ حاصل کیا۔

شیخ ابوالعلا جون پوری عالم و فقیہ اور صاحب استقامت بزرگ تھے۔۷ شوال ۱۰۹۸ھ/ ۶ اگست

❶ خزینۃ الاصفیا۔نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۔

❷ مآثر عالم گیری، ص ۲۳۹۔نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹، ۲۰۔

❸ صبح بہار۔نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۰۔

Marfat.com

۱۶۸۷ء کو وفات پائی اور اپنے جدامجد قاضی صدر جہاں کے مقبرہ میں، جو بلدۂ جون پور سے باہر قریہ مصطفیٰ آباد میں واقع تھا، مدفون ہوئے ❶۔

۲۳۔ شیخ ابوالفتح ملتانی

شیخ ابوالفتح ملتانی فاضل روزگار تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے متبحر علما میں سے تھے۔ فنون حکمیہ میں بھی ماہر تھے۔ تدریس و افادۂ طلبا ان کا اصل مشغلہ تھا۔ مغل حکمران شاہ جہاں کے عہد میں ان کا فیضان علم جاری تھا۔ ان کے چشمۂ علم سے بے شمار لوگوں نے اپنی علمی تشنگی بجھائی ❷۔

۲۴۔ قاضی ابوالفتح بلگرامی

قاضی ابوالفتح بلگرامی، قاضی کمال کے عرف سے معروف تھے اور شاہ ہند جلال الدین اکبر کے عہد میں بلگرام کے منصب قضا پر متعین تھے۔ علوم فقہ میں اس وقت ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ ارض ہند کے اس عالم دین نے چوراسی (۸۴) سال عمر پا کر ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کیا ❸۔

۲۵۔ قاضی ابوالقاسم کشمیری

قاضی ابوالقاسم بن جمال الدین کشمیری نے اپنے والد شیخ جمال الدین اور عم محترم علامہ کمال الدین سے اخذ علم کیا، یہاں تک کہ فقہ و اصول اور دیگر علوم کے جلیل القدر علما میں سے گردانے گئے۔ علم و فضل کی فراوانی کے ساتھ ساتھ نیکی و صالحیت اور زہد و اتقا کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ کشمیر کے منصب قضا پر متعین تھے۔ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان کے تلامذہ میں مولانا محمد امین، مولانا عبدالنبی دیوانی اور علما کی بہت بڑی جماعت شامل ہے۔ کشمیر میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

تذکرہ علمائے ہند میں انھیں قاضی ابوالقاسم بن ملا جمال الدین سیالکوٹی لکھا گیا ہے اور مغل حکمران نورالدین جہاں گیر کے ہم عصر قرار دیا گیا ہے ❹۔

۲۶۔ مولانا ابوالواعظ ہرگامی

مولانا ابوالواعظ بن صدرالدین بن محمد اسماعیل بن قاضی عمادالدین احمد عمری بدایونی، موضع ہرگام

---

❶ تجلی نور۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۲۔

❷ عمل صالح، ج ۳، ص ۳۹۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۴۔

❸ مفتاح التواریخ، ص ۱۹۸۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۶۔

❹ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۱۔

Marfat.com

میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے دور کے مشہور عالم تھے۔ عمر بھر تعلیم و تدریس کا غلغلہ بلند کیے رکھا۔ حلقۂ تدریس وسیع تھا، جس سے تشنگان علوم نے اپنی علمی پیاس بجھانے کا سامان فراہم کیا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ مربی بن عبدالنبی بلگرامی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ تذکرۃ الانساب کی روایت کے مطابق شاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر نے بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ اپنے علم و فضل اور فقہ پر عبور کے باعث فتاویٰ عالم گیری کے مصنفین میں شامل تھے۔

مولانا ابوالواعظ کے دادا عماد الدین اس خاندان کے پہلے شخص ہیں، جو ہرگام میں جا کر آباد ہوئے۔ وہاں کے قاضی سے علم حاصل کیا اور ان کی بیٹی سے شادی کی۔ پھر وہیں گھر بنا لیا اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مشہور عالم دین، شیخ محبّ اللہ الہٰ آبادی مولانا ابوالواعظ کے چچا زاد بھائی تھے ❶۔

۲۷۔ شیخ احمد بن اسحاق نصیر آبادی

شیخ احمد کا سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن اسحاق بن محمد بن محمود بن علاء الشریف الحسنی نصیر آبادی۔ نصیر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ ابتدائی کتب درسیہ اور مختصرات اپنے شہر ہی میں پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لیے عازم الہٰ آباد ہوئے۔ الہٰ آباد میں ان دنوں مشہور عالم دین صاحب التسویہ شیخ محبّ اللہ الہٰ آبادی کا سلسلۂ تدریس جاری تھا۔ یہ اس میں شامل ہو گئے اور ان سے اخذ علم کرنے لگے، یہاں تک کہ علوم مروجہ اور اصول و فروع کے مختلف گوشوں میں مہارت پیدا کر لی اور فتویٰ و تدریس کی صلاحیتوں سے بہرہ اندوز ہو گئے۔ پھر اپنے شہر نصیر آباد کو مراجعت کی اور خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔ طویل عرصے تک شائقین علوم ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوتے رہے۔ بعد ازاں میلان طبع تصوف کی طرف ہوا تو عالم طریقت شیخ آدم بن اسماعیل حسنی بنوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ اس زمانے میں گوالیار میں مقیم تھے، ان سے کسب فیض کیا۔ شیخ آدم سفر حج پر روانہ ہوئے تو انھیں اپنا خلیفہ مقرر کر دیا۔ شیخ آدم ناخواندہ تھے اور کسی اہل علم سے کوئی کتاب نہ پڑھی تھی، لیکن نہایت نیک، بہت بڑے بزرگ اور متبع سنت تھے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے روحانی فیض حاصل کیا۔ ۲۳ر شوال ۱۰۵۳ھ/۴ر جنوری ۱۶۴۳ء کو مدینہ منورہ میں فوت ہوئے۔ شیخ احمد بن اسحاق نصیر آبادی بھی ان سے مستفیض ہوئے اور مرتبۂ خلافت کو پہنچے۔

شیخ احمد عالم دین، متقی، کثیر العبادت، منکسر المزاج اور اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ حرمت غنا کے موضوع پر ایک رسالہ تصنیف فرمایا۔ اس عالم دین نے ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۷ء کو نصیر آباد میں وفات پائی ❷۔

❶ مآثر الکرام، ص ۹۴۔ آمد نامہ۔ تذکرۃ الانساب۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۴، ۳۵۔ ماہنامہ ''برہان'' دہلی (جنوری ۱۹۴۹ء) برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۰۵۔

❷ سیرت سادات۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۷، ۳۸۔

Marfat.com

۲۸۔ شیخ احمد بن حسین نائطی بیجاپوری

شیخ احمد کا لقب نظام الدین اور ان کے والد شیخ حسین کا لطف اللہ تھا اور شیخ نظام الدین بن لطف اللہ قاضی بیجاپوری کے نام سے معروف تھے۔ شیخ احمد حدیث اور فقہ کے جید علما میں سے تھے۔ شیخ عوض بن محمد بن شیخ ضعیف سقاف کے شاگرد تھے۔ بیجاپور میں نظارت انشا کے منصب پر متعین تھے۔ کئی سال اس خدمت جلیلہ پر فائز رہے۔ پھر بیجاپور کے حاکم عادل شاہ نے ان کو مغل بادشاہ شاہ جہان کی خدمت میں سفیر بنا کر دہلی بھیج دیا تھا۔ یہ اہم خدمت بھی طویل مدت تک انجام دیتے رہے۔ آخر عمر میں سب امور سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ علم اور پرہیزگاری میں مشہور تھے۔ حدیث پر عبور حاصل تھا اور بے شمار احادیث زبانی یاد تھیں اور ان کی اسناد اور ان میں مختلف ائمہ کے مذاہب و رجحانات سے خوب آگاہ تھے۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۱۰۰ھ/۱۳ دسمبر ۱۶۸۸ء کو راہی ملک بقا ہوئے ❶۔

۲۹۔ شیخ احمد بن رضا حیدرآبادی

شیخ احمد بن رضا حیدرآبادی مذہباً شیعہ تھے۔ ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں ہندوستان آئے۔ علم رجال پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس موضوع سے متعلق ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کو فائق المقال کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب انھوں نے حیدرآباد دکن میں مکمل کی۔ اس میں اپنی نسبت تلمذ حر عاملی کی طرف کرتے ہیں۔ انھیں بارہ ہزار احادیث کے متون بغیر اسناد کے حفظ تھے اور بارہ ہزار احادیث مع متون و اسناد کے زبانی یاد تھیں۔ فائق المقال کے علاوہ منہج القویم اور قرأت سے متعلق بھی ایک رسالہ ان کی تصنیف میں شامل ہے ❷۔

۳۰۔ قاضی احمد بن سلامہ جزائری

قاضی احمد بن سلامہ جزائری بھی شیعہ تھے اور اپنے دور کے مشاہیر افاضل میں سے تھے۔ ہندوستان آئے اور حیدرآباد (دکن) کے منصب قضا پر متعین ہوئے۔ تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔ فاضل، فقیہ اور صالح بزرگ تھے۔ مصنف بھی تھے۔ چنانچہ علامہ حلی کی الارشاد کی شرح سپرد قلم کی۔ کہتے ہیں ان کی بعض اور تصانیف بھی ہیں، لیکن ہمیں ان کا علم نہیں ہوسکا ❸۔

---

❶ تاریخ نوائط۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۔

❷ نجوم السما۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۳۹۔

❸ امل الآمل (از حر عاملی)۔ نجوم السما۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹، ۴۰۔

Marfat.com

۳۱۔ مولانا احمد بن سلیمان کردی گجراتی

مولانا احمد کے والد مولانا سلیمان دراصل علاقہ کردستان کے رہنے والے تھے۔ وہاں کی سکونت ترک کر کے ارض ہند میں آ گئے تھے اور گجرات میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حدیث و فقہ کے عالم اور شیخ عبدالحق دہلوی کے تلمیذ تھے۔ گجرات ہی میں مولانا احمد کی ولادت ہوئی اور اپنے والد مولانا سلیمان کی گود میں تربیت پائی۔ اکثر کتب درسیہ اس علاقے کے مشہور عالم قاضی محمد شریف گجراتی سے پڑھیں۔ شرح المواقف اور دیگر فنون حکمیہ کی تحصیل مولانا ولی محمد خانو گجراتی سے کی۔ تصوف و طریقت کے لیے شیخ فریدالدین گجراتی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ فنون ریاضیہ امیر قباد بدخشی یعنی نواب ریاست خاں سے حاصل کیے۔ علم حدیث اور بعض فنون مروجہ کے لیے اپنے والد مکرم شیخ سلیمان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان تمام علوم و فنون پر عبور حاصل کرنے کے بعد خود مسند تدریس بچھائی اور درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے فیض علم سے بے شمار علما و طلبا مستفید ہوئے۔ یوں تو یہ تمام علوم پر عبور رکھتے تھے، مگر علوم حکمیہ میں نواحِ گجرات میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ اس نواح میں ان علوم کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں سب سے فوقیت لے گئے تھے۔ علم کلام سے متعلق فیوض القدس کے نام سے ان کی ایک عمدہ تصنیف ہے۔ اس عالم دین نے ۲۱ / جمادی الاخریٰ ۱۰۹۲ھ / ۲۸ / جون ۱۶۸۱ء کو احمد آباد (گجرات) میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

تذکرہ علمائے ہند میں تاریخ وفات ۲۱ / جمادی الاخریٰ ۱۱۱۲ھ (یکم و بست جمادی الثانی سال یازدہ صد و دوازدہ ہجری) مرقوم ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے [1]۔

۳۲۔ شیخ احمد بن عبداللہ حضرمی

شیخ احمد بن عبداللہ بن احمد بن حسین بن عبداللہ حضرمی حیدر آبادی، فقہی مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے۔ اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ مختلف علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ شیخ عبداللہ بن عمر باغریب سے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر مختلف علوم و فنون کی بہت سی کتابیں مختلف اکابر اساتذۂ عصر سے پڑھیں۔ حدیث، فقہ اور تصوف کی تعلیم اپنے والد مکرم شیخ عبداللہ سے حاصل کی۔ خرقۂ تصوف بھی ان ہی کے دست مبارک سے زیب تن کیا۔ شیخ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن شہاب الدین کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تہ کیا۔ سید زین الدین بن محمد جدیلی، سید محمد بن احمد شاطری اور دیگر علما و فضلا کی بھی مصاحبت و ملازمت اختیار کی اور ان سے مستفید ہوئے۔ جب مروجہ علوم کی تحصیل کر چکے تو علمی سیر و سیاحت کی غرض سے مختلف بلاد و امصار کا رخ کیا۔ سب سے پہلے احمد آباد (گجرات) تشریف لائے۔ وہاں ان کے ماموں شیخ جعفر صادق قیام فرما تھے۔ کئی سال ان

[1] مرأت احمدی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۰۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲، ۱۳۔

Marfat.com

کی خدمت میں رہے۔ پھر بلاد دکن کو رخت سفر باندھا۔ وہاں بعض امرائے مملکت سے منسلک ہو گئے اور طویل عرصے تک اس علاقے میں سکونت پذیر رہے۔ نہایت کریم، فیاض اور سخی تھے۔ جو بات زبان سے کہتے اس پر عمل کر کے دکھاتے۔ حدیث، فقہ اور ادب کے ماہر تھے۔ فصاحت و بلاغت اور لغت میں یگانۂ روزگار تھے۔ دیگر علوم میں بھی ماہر تھے۔ کتاب وسنت کے عالم اور عامل تھے۔ ان کا سلسلۂ درس وتدریس جاری تھا اور طالبین ومریدین کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ ارادت مندوں کو مشائخ متقدمین کے انداز سے تصوف وسلوک کی راہوں پر گامزن ہونے کی تلقین کرتے تھے۔

اس رفیع المرتبت شافعی عالم دین نے ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۳ء کو حیدر آباد میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں ❶۔

۳۳۔ شیخ احمد بیجاپوری

شیخ احمد بیجاپوری، حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ لفظ محدث ان کے نام کا جز ہو گیا تھا اور شیخ احمد محدث بیجاپوری کے نام سے معروف تھے۔ والد کا اسم گرامی عبداللہ تھا۔ قاضی عبداللہ بیجاپوری کے داماد اور بھانجے تھے۔ حدیث اور فقہ کے ممتاز علما میں سے تھے۔ بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ بن طہماسپ شاہ کے دور کے جلیل القدر عالم دین تھے۔ بیجاپور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

۳۴۔ شیخ احمد بن علوی حضرمی

شیخ احمد کا سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن علوی بن عمر بن عقیل بن محمد بن احمد بن عبداللہ بن محمد جمیل حضرمی۔ شیخ احمد گیارھویں صدی ہجری کے شافعی المسلک عالم وفقیہ تھے۔ ''روغہ'' نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور وہیں اپنے والد علوی کی گود میں پرورش پائی۔ سب سے پہلے قرآن مجید پڑھا۔ پھر علوم مروجہ کی تحصیل شروع کی۔ حدیث اور فقہ میں عبور حاصل کیا۔ حصول علم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے وطن کو خیر باد کہا اور عازم دیار ہند ہوئے۔ اس نواح میں کئی سال مقیم رہے۔ پھر مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ حج وزیارت کی سعادت حاصل کی اور وہاں کے اساتذہ کی کثیر جماعت سے علمی استفادہ کیا۔ حدیث، فروع اور علوم عربیہ میں مہارت پیدا کی اور پھر دوبارہ وارد ہند ہوئے ❸۔

---

❶ محبوب ذی المنن۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۵۳، ۵۴۔

❷ روضۃ الاولیا۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۵۷۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۵۸۔

Marfat.com

۳۵۔ شیخ احمد بن علی بُسکری

شیخ شہاب الدین احمد بن علی بن احمد بُسکری، نہایت متقی، مصلح وقت، صالح عالم دین اور فاضل کبیر تھے۔ مسلکاً مالکی تھے۔ شیخ عبدالقادر بن شیخ عیدروس اور دیگر اساتذۂ عصر سے علم حاصل کیا۔ کامل الصفات اور بلند افکار بزرگ تھے۔ یوم آخرت سے بہت ڈرتے تھے۔ متبع کتاب وسنت، مسلک سلف کے پابند، قناعت پسند، عفیف اور نیک شخصیت تھے۔ کسی وقت بے کار نہیں رہتے تھے، جب دیکھو یا تو کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہیں یا کچھ لکھ رہے ہیں۔ یعنی سارا وقت قلم وقرطاس کی صحبت میں گزرتا۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل نابینا ہو گئے تھے۔ بعض اہل علم نے ان کی مدح میں بڑے اچھے شعر کہے۔ شعر کہنے والوں میں اس دور کے ایک مشہور ادیب شیخ عبداللطیف بن محمد دبیر بھی تھے۔

منقول ہے کہ علم وفضل، ذکاوت وفطانت، ادب وفصاحت اور تقویٰ وتدین میں اس وقت کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ دین داری اور احکام خداوندی کے بارے میں نہ جھجک اور خوف محسوس کرتے تھے، نہ کسی کی ملامت کی پروا کرتے تھے۔

اس نامور مالکی عالم دین نے احمد آباد (گجرات) کو اپنا مستقل وطن قرار دے لیا تھا۔ ہفتے کی رات ۲۳/ربیع الثانی ۱۰۰۹ھ/۲۲/اکتوبر ۱۶۰۰ء کو احمد آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

۳۶۔ شیخ احمد بن مجتبیٰ مانک پوری

شیخ احمد بن مجتبیٰ بن مبارک بن احمد بن نور بن حامد حسینی رضوی مانک پوری۔ احمد حلیم کے نام سے معروف تھے۔ صالح عالم دین تھے اور مشائخ چشتیہ میں سے تھے۔ مانک پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والد گرامی شیخ مجتبیٰ سے علم فقہ حاصل کیا۔ طریقت وتصوف کی منزلیں بھی ان ہی کی صحبت میں طے کیں۔ بعد ازاں خود ارشاد وتلقین کی مسند پر متمکن ہوئے اور خلق کثیر نے ان سے استفاضہ کیا۔ اس عالم دین نے ۲۵/جمادی الاولیٰ ۱۰۴۰ھ/۲۰/دسمبر ۱۶۳۰ء کو شہر مانک پور میں وفات پائی [1]۔

۳۷۔ شیخ احمد بن محمد حضرمی

شیخ احمد بن محمد بن عبدالرحیم شہاب حضرمی گجراتی، اپنے عصر کے فاضل اجل اور رفیع المرتبت عالم دین تھے۔ شافعی المسلک تھے اور باجابر الشافعی الحضرمی کے نام سے مشہور تھے۔ فقہ شافعی پر عبور رکھتے تھے۔ اس لیے اہل علم کی محفلوں میں لفظ ''فقیہ'' ان کے نام کے جز کے طور پر استعمال ہونے لگا تھا۔ علم وفضل میں منفرد اور تقویٰ و

[1] گنج ارشدی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۵۹، ۶۰۔

Marfat.com

تدین میں یگانہ تھے۔ اپنے والد نام دار شیخ محمد حضرمی سے اکثر علوم حاصل کیے اور ان ہی کی آغوش تربیت میں نشوونما پائی۔ پھر دیگر علمائے کرام کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ بعد ازاں وارد ہند ہوئے اور شیخ عبدالقادر بن عیدروس وغیرہ اصحاب علم کی خدمت میں حاضری دی۔ بہت بڑے محقق، جودت، فکر میں معروف، دقیق سے دقیق مسائل حل کرنے میں ماہر اور امام وقت تھے۔ حافظہ نہایت تیز پایا تھا اور ذہنی وفکری اعتبار سے بلند مرتبے کے حامل تھے۔ دیگر مروجہ علوم وفنون کے علاوہ کتب ادب، لغت اور دواوین شعر پر گہری نظر تھی اور اس سلسلے کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے حافظے میں محفوظ تھا۔ گوناگوں علمی صلاحیتوں کی بنا پر اس دور کے علما وفضلا کے نزدیک بڑی قدرومنزلت کے مالک تھے۔ متعدد حضرات کی طرف سے انھیں درس وتدریس اور افتا کی اجازت حاصل تھی اور بے شمار واقعات، ادبی لطائف اور اشعار انھیں مستحضر تھے، جچی تلی اور سلجھی ہوئی گفتگو کرتے تھے۔

یہ جلیل القدر عالم دین اور نامور شافعی فقیہ ۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء کو حج بیت اللہ سے سعادت اندوز ہوئے۔ وہاں مشائخ حجاز میں سے سید ابوبکر بن ابوالقاسم الشہیر بصائم الدہر، امام کبیر شیخ محمد الخاص، علامہ ابوالقاسم مطیر، ان کے بیٹے امام ابوبکر اور بھائی علامہ امین، شیخ احمد اشخر، علامہ محدث سید طاہر بن حسین اہدل، علامہ عبدالملک بن عبدالسلام دعسی اور سید حاتم بن اہدال وغیرہ سے اخذ علم کیا اور ان کی صحبت میں رہے۔ ان حضرات نے ان کو متعدد کتابوں کے درس وتدریس کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس دوران میں ربیع الاول ۹۹۷ھ سے لے کر جمادی الاولیٰ ۹۹۸ھ تک شیخ عبدالقادر حضرمی کی خدمت میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔ ان سے بڑا استفادہ کیا اور پھر بلاد ہند میں جانے کی اجازت لی۔ وہاں سے برہان پور گئے۔ برہان پور کا حکمران اس زمانے میں سلطان علی عادل شاہ تھا۔ اس نے ان کی بڑی پذیرائی کی۔ وہاں کے علما وفضلا اور رؤسا نے بھی گرم جوشی سے استقبال کیا اور ان کی تشریف آوری پر خوشی اور مسرت ظاہر کی۔ برہان پور میں ان کو انتہائی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی اور شیخ عبداللطیف دبیر نے ان کی آمد پر چند شعر بھی کہے۔

شیخ احمد بن محمد حضرمی کی وفات لاہور میں ہوئی۔ انھیں زہر دے کر مارا گیا۔

بات یہ ہوئی کہ یہ برہان پور پہنچے تو شیخ عبداللطیف دبیر نے اپنا کتب خانہ دکھایا اور تمام کتابوں سے مطلع کیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ شیخ عبداللطیف وفات پا گئے اور بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کی طرف سے فیضی کو ایک منصب پر متعین کر کے دکن بھیجا گیا۔ اثنائے سفر میں فیضی کا گزر برہان پور سے ہوا تو والیٔ برہان پور سلطان علی عادل شاہ نے راجہ خان کو بہت سے تحائف دے کر فیضی کے پاس بھیجا۔ فیضی نے سلطان کو کہلا بھیجا کہ مجھے تحائف کی ضرورت نہیں، البتہ فلاں کتاب دی جائے، جو شیخ عبداللطیف کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے اور وہ ذخیرۂ کتب اب سلطان علی عادل شاہ کے قبضے میں ہے۔ سلطان مذکور کو فیضی کے اس سوال سے ذہنی کوفت ہوئی۔ وہ کتاب نہیں دینا چاہتا تھا، مگر مجبوراً بادل نخواستہ کتاب فیضی کو دینا پڑی۔ پھر سلطان نے اپنے طور پر یہ تحقیق کی کہ فیضی کو اس کتاب کے متعلق کس نے اطلاع دی، تو پتا چلا کہ شیخ احمد باجابر فقیہ نے فیضی کو اس کی

Marfat.com

اطلاع دی ہے اور شیخ احمد کو خود شیخ عبداللطیف نے اپنی کتاب کے بارے میں معلومات مہیا کی تھیں۔ اس سے والی برہان پور کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ شیخ عبداللطیف بہت سے اسرار مملکت اور راز ہائے سلطنت سے آگاہ ہیں، ممکن ہے کسی راز سے شیخ احمد باجابر فقیہ کو بھی مطلع کر دیا ہو اور وہ راز فیضی کے گوش گزار ہو جائے اور پھر فیضی کی معرفت اس کی اطلاع اکبر بادشاہ تک پہنچ جائے، اور اس طرح والی برہان پور کسی نئی مصیبت میں پھنس جائے۔ اتفاق سے انھی دنوں شیخ احمد باجابر فقیہ فیضی کی معیت میں عازم لاہور ہو رہے تھے۔ اس سے سلطان علی عادل شاہ کو اور بھی خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں شیخ اس کو راز کی باتیں نہ بتا دیں اور یہ باتیں اکبر تک پہنچ جائیں اور وہ اس سے بدظن ہو جائے۔ اس خوف اور خطرے کے پیش نظر اس نے اپنے چار غلاموں کو شیخ کے ساتھ کر دیا اور ان کو ہدایت کی کہ راستے میں جہاں کہیں ان کا داؤ لگے، زہر دے کر شیخ کو ہلاک کر دیں۔ چنانچہ لاہور کے قریب پہنچے تو ان کو موقع ہاتھ آ گیا اور وہ شیخ احمد باجابر فقیہ کو زہر دینے میں کامیاب ہو گئے، جس سے شیخ کو سخت تکلیف ہوئی اور وہ بدھ کی رات ۱۴ر شوال ۱۰۰۱ھ/۴ر جولائی ۱۵۹۳ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔

ان کی وفات سے بزم علم سونی ہو گئی، ادب و شعر کی رونقیں ختم ہو گئیں اور فقہ و حدیث کے دقیق مسائل پر بحث و مذاکرے کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ مختلف ہم عصر علما نے اس پر شدید کرب کا اظہار کیا اور ان کی وفات پر دردناک مرثیے کہے۔ شیخ شہاب الدین احمد بن علی بسکری نے سو سے زیادہ اشعار پر مشتمل قصیدہ کہا۔ شیخ محمد بن عبداللطیف جامی الشہیر بہ مخدوم زادہ نے بھی ان کی موت پر اشعار میں اظہار افسوس کیا۔ النور السافر فی اخبار القرن العاشر کے فاضل مصنف عبدالقادر حضرمی نے بھی متعدد اشعار میں اظہار حزن و ملال کیا۔ غرض متعدد شاعروں نے ان کی موت کو اپنا موضوع بنایا اور دردناک الفاظ میں ان کا ماتم کیا۔ بے شک ان کی موت اس وقت علم کی موت تھی اور ان کا سانحہ وفات اس دور کے اہل علم کے لیے بے حد دینی اور فکری اذیت کا باعث تھا۔ جس شاعر نے جن الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا اور جس لہجے میں ان کی موت پر اظہار حزن و ملال کیا، وہ بالکل صحیح تھا۔ اس قسم کے لوگوں کا اس طرح دنیا سے کوچ کر جانا ہمیشہ عظیم حادثہ قرار دیا گیا ہے۔

۳۸۔ مفتی احمد بن محمد بہاری

مفتی احمد بن محمد حسینی علوی بہاری، حاجی احمد سعید بن محمد سعید کے نام سے معروف تھے، علاقہ بہار کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ محمد بہاری اپنے دور کے صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے اس بیٹے کو خود ہی علوم و فنون کی تعلیم دی اور بہترین انداز سے اس کی تربیت کی۔ یہاں تک کہ یہ منزل فضیلت پر فائز ہوئے، درس و افتا کی مسند کو زینت بخشی، علم فقہ اور دیگر علوم میں مہارت پیدا کی اور دیار ہند کے کبار فقہا میں سے گردانے گئے۔ ہندوستان کے مغل حکمران شاہ جہان نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں مفتی عسا کر مقرر کر دیا تھا۔ طویل عرصے تک اس منصب پر متعین رہے اور حسن و خوبی سے یہ فرائض انجام

Marfat.com

دیے۔ واقعہ یہ ہے کہ مفتی احمد بہاری علوم عربیہ، فقہ واصول، معرفت مذاہب، فہم دین اور فراست وزیر کی میں دیگر علمائے عصر سے منفرد حیثیت کے مالک تھے۔

ان کی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر اپنے آخری ایام حکومت میں شاہ جہان نے ان کو ترکی کی دولت عثمانیہ اور حرمین شریفین میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا اور اس منصب کی ذمہ داریوں کو انھوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔ اس اثنا میں حج بیت اللہ بھی کیا۔ واپس آئے تو شاہ جہان معزول ہو چکا تھا اور تاج شاہی اس کے بیٹے عالم گیر کے سر کی زینت بنا ہوا تھا۔ عالم گیر نے ان کی انتہائی تکریم کی اور بدرجہ غایت عزت واحترام سے پیش آیا۔ ایک ہزاری منصب سے نوازا اور اپنی بہن جہاں آرا بیگم کا دیوان مقرر کیا۔ اس عالم دین نے ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء میں وفات پائی (1)۔

۳۹۔ قاضی احمد عسکری بیجا پوری

قاضی احمد بن ابو احمد حسینی بیجا پوری، گیارھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے معروف شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ بیجا پور کے حکمران ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں شہر بیجا پور میں عسکر سلطانی کے قاضی تھے اس لیے قاضی عسکری کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس عہدے پر کئی سال فائز رہے۔ کبار علمائے وقت میں سے تھے۔ منصب قضا کے نازک تقاضوں کو حسن وخوبی سے پورا کیا اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔ بہترین خطاط بھی تھے۔ ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء کو بیجا پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے (2)۔

۴۰۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی

حضرت شیخ احمد سرہندی، جمعے کے روز ۱۴؍ شوال ۹۷۱ھ/۲۷؍ مئی ۱۵۶۴ء کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ نسباً فاروقی تھے۔ سلسلۂ نسب ستائیس واسطوں سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ والد مکرم کا اسم گرامی شیخ عبدالاحد تھا جو بہت بڑے فاضل اور فقہ، اصول فقہ، اور معقولات ومنقولات کے ماہر تھے۔ طریقت وتصوف میں بھی کامل تھے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صاحب زادۂ گرامی شیخ رکن الدین گنگوہی سے بیعت تھے اور سلسلہ چشتیہ میں ان سے خرقہ خلافت حاصل کیا تھا۔ طریقہ قادریہ میں شاہ کمال الدین کیتھلی سے مستفیض اور خرقہ خلافت سے بہرہ مند تھے۔ سلسلہ نقشبندیہ میں بھی منازل سلوک طے کی تھیں۔ شیخ عبدالاحد نے اسی (۸۰) سال عمر پا کر ۱۷؍ رجب ۱۰۰۷ھ/۳؍ فروری ۱۵۹۹ء کو سرہند میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

---

(1) بادشاہ نامہ۔ مراۃ العالم ورق ۴۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۶۸۔

(2) بزم تیموریہ، ص ۲۵۰۔ محبوب ذی المنن۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۶۹، ۷۰۔

Marfat.com

سرہند کی تعمیر:

سرہند ایک مشہور شہر ہے جو ضلع پٹیالہ (مشرقی پنجاب۔ ہندوستان) میں واقع ہے۔ سرہند دراصل سہرند تھا۔ یہ دو الفاظ ''سہ'' اور ''رند'' سے مرکب ہے، اور اس کے معنی ہیں شیروں کا جنگل۔ ''سہ'' کے معنی شیر اور ''رند'' کے معنی جنگل کے ہیں۔ زمانہ قدیم میں یہ علاقہ بہت بڑا جنگل اور شیروں کا مسکن تھا، اس لیے ''سہرند'' کے نام سے مشہور تھا۔ کہتے ہیں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ایک مرتبہ شاہی خزانہ محافظوں کی نگرانی میں لاہور سے دہلی منتقل کیا جا رہا تھا، جب قافلہ اس مقام پر پہنچا جہاں اب سرہند آباد ہے تو ایک صاحب کشف بزرگ پر جو قافلے کے ہمراہ سفر کر رہے تھے، یہ منکشف ہوا کہ یہاں ایک بہت بڑا ولی پیدا ہوگا۔ یہ خبر بادشاہ کے گوش گزار ہوئی تو اس نے وہاں ایک شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا اور تعمیر کا کام شیخ رفیع الدین کے سپرد کیا۔ شیخ رفیع الدین چھٹی پشت میں شیخ احمد سرہندی کے اجداد میں سے تھے۔ شہر کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد شیخ رفیع الدین وہیں آباد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد کثرت استعمال کی وجہ سے یہ شہر ''سہرند'' سے ''سرہند'' میں بدل گیا، اور اب اس کو اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ابتدائی حالات:

شیخ احمد سرہندی برصغیر کے ایسے برگزیدہ خاندان کے چشم و چراغ تھے جو ابتدا ہی سے علم و فضل، زہد و ورع اور تدین و تقویٰ کی دولت سے مالا مال تھا۔ ان کے والد محترم شیخ عبدالاحد بھی صاحب علم و صلاح اور متبع کتاب و سنت بزرگ تھے۔ ان کی فیض رسانی کا سلسلہ بہت وسیع تھا اور بے شمار لوگ ان کے حلقہ درس و افادہ میں شامل تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے بھی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر تفسیر و حدیث اور علوم عقلیہ کی تکمیل کے لیے کبار علمائے کرام سے رجوع کیا۔ سیالکوٹ بھی گئے جہاں اس زمانے کے مشہور محدث و فقیہ مولانا یعقوب صرفی کشمیری اور مولانا کمال الدین کشمیری کا سلسلہ درس جاری تھا۔ شیخ احمد نے مولانا یعقوب سے سند حدیث لی اور معقولات کی بعض انتہائی کتابیں مولانا کمال الدین سے پڑھیں، جو اس دور کے عالم محقق اور عابد و زاہد تھے۔ سیالکوٹ میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی شیخ احمد کے ہم سبق و ہم مکتب تھے۔ نواب سعد اللہ خاں بھی جو بعد کو مغل حکمران شاہ جہان کے وزیر مقرر ہوئے، اس زمانے میں مولانا کمال الدین کے حلقہ درس میں شامل تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے ذہن اس قدر اخاذ، حافظہ اس درجہ تیز پایا تھا اور حصول علم کا شوق ان پر اتنا غالب تھا کہ سترہ سال (اور ایک روایت کے مطابق اکیس سال) کی عمر میں تمام علوم مروجہ سے فارغ ہو گئے تھے اور سرہند میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

شیخ کی ذہانت کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا تھا اور اصحاب علم ان سے بہت متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس

Marfat.com

واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ جس زمانے میں شیخ آگرہ میں تفسیر وحدیث کے مطالعہ میں مشغول تھے، ابوالفضل اور فیضی نے جو اکبر بادشاہ کے دست راست تھے، ان کی ذہانت کی شہرت سن کر انھیں اپنے حلقہ احباب میں شامل کرنے کی سعی کی، مگر یہ تعلق زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا، کیوں کہ ان کے دینی و مذہبی عقائد سے شیخ احمد سرہندی کو شدید اختلاف تھا۔ یہ بھی منقول ہے کہ فیضی کی مشہور بے نقط تفسیر سواطع الالہام کا کچھ حصہ شیخ سرہندی نے لکھا تھا[1]۔

خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں:

شیخ احمد سرہندی کے زمانے میں دہلی کی مسند تصوف پر حضرت خواجہ باقی باللہ متمکن تھے۔ حضرت خواجہ کا اصل وطن کابل تھا۔ وہ ترک وطن کر کے وارد ہند ہوئے تھے اور دہلی کو اپنا مسکن ٹھہرالیا تھا۔ اپنے عصر کے عظیم المرتبت صوفی اور رفیع القدر بزرگ تھے۔ ان کی تاریخ ولادت ۵/ ذی الحجہ ۹۷۲ھ/ ۴/ جولائی ۱۵۶۵ء اور تاریخ وفات ۲۵/ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۲ھ/ ۲۰/ نومبر ۱۶۰۳ء ہے۔ انھوں نے کل چالیس برس عمر پائی۔ اکبر کے عہد میں وارد ہند ہوئے اور دہلی میں اقامت گزریں ہو گئے تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے تکمیل علم کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور منازل سلوک طے کیں۔ اس کے بعد دہلی میں خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ باقی باللہ ان کی فراوانی علم، جودت طبع اور زہد وتقویٰ سے نہایت متاثر ہوئے اور بہت ہی قلیل مدت میں انھوں نے حضرت خواجہ سے تمام مراتب سلوک طے کر لیے۔ اس ضمن میں حضرت خواجہ اپنے ایک دوست کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

شیخ احمد مردیست از سرہند، کثیر العلم وقوی العلم، روزے چند فقیر باو نشت و برخاست کرد۔ عجائب بسیار از روزگار اوقات او مشاہدہ نمود، بآں ماند کہ چراغے شود کہ عالمہا از و روشن گردد۔ الحمدللہ تعالیٰ احوال کاملہ او مرا بہ یقین پیوستہ[2]۔

یعنی شیخ احمد سرہند کے رہنے والے ہیں۔ کثرت علم اور پختگی علم میں یکتا ہیں۔ چند روز فقیر نے ان کے ساتھ نشست و برخاست کی۔ ان کے کوائف اوقات سے بہت سے عجائب مشاہدہ میں آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک چراغ کی طرح چمکیں گے، جس سے دنیا میں روشنی پھیلے گی۔ الحمدللہ، ان کے احوال کاملہ سے مجھے اس بات کا یقین ہو چکا ہے۔

ورودِ لاہور:

خواجہ باقی باللہ کے حکم سے شیخ احمد سرہندی وارد لاہور ہوئے۔ لاہور میں ان کے علمی فیوض وکمالات

---

[1] روضۃ القیومیہ رکن اول، ص ۶۱، ۶۲، ۶۳۔ حضرات القدس، ج ۲، ص ۹، ۱۰

[2] مقامات امام ربانی، ص ۱۱۔

Marfat.com

نے بڑی شہرت پائی۔ یہاں کے جلیل القدر علما جن میں مولانا جمال الدین تلوی اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان کے حلقۂ بیعت وارادت میں شامل ہوئے اور بہت سے مشائخ نے ان سے فیض حاصل کیا۔ شیخ احمد لاہور ہی میں تھے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات کی خبر پہنچی۔ شیخ لاہور سے پاپیادہ دہلی پہنچے اور اپنے مرشد زادوں، ان کے عقیدت مندوں اور دیگر حضرات سے اظہار تعزیت کیا۔ یاد رہے، حضرت خواجہ کے پسماندگان میں دو کم عمر بیٹے تھے، ایک کا نام خواجہ عبیداللہ اور ایک کا خواجہ عبداللہ تھا۔ دو بیوگان تھیں اور یہ دونوں لڑکے ان دونوں کے بطن سے تھے۔

مذہبی حالات:

شیخ احمد سرہندی کی پیدائش شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر کے عہد میں ہوئی۔ اکبر کا عہد حکومت ۹۶۳ھ سے شروع ہو کر ۱۰۱۴ھ/ ۱۵۶۶ء سے ۱۶۰۵ء تک چلتا ہے اور اکیاون (۵۱) سال کے لیل و نہار میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی حکومت کے ابتدائی عہد کو اسلامی عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن بعد میں اس کی زندگی کا دھارا بالکل بدل گیا تھا اور اسلامی احکام واوامر کو ترک کر کے اس نے ہندوانہ رسوم ورواج کو خود بھی اپنا لیا تھا اور اپنی حکومت میں بھی یہی رسوم نافذ کر دی تھیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی اکبر کا درباری عالم اور اس کا ہم عصر مؤرخ ہے۔ وہ ایک پُر جوش اور پابند اسلام مؤرخ ہے۔ اس نے اپنی مشہور تصنیف منتخب التواریخ میں وہ واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں، جو اکبر کے اسلام سے دور ہونے کا باعث بنے۔

ملا بدایونی لکھتا ہے کہ بادشاہ اپنی ہندو رعایا کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اپنا رخ اسلام سے پھیر لیا تھا۔ اس نے علمائے سوء کی بے حد ہمت افزائی کی جو اس سے مالی فوائد حاصل کرنے کے لیے ہر قدم اٹھانے کو تیار رہتے تھے۔ اس نے اپنے گرد وپیش ایسے لوگوں کو جمع کر لیا تھا جو وحی اور شریعت کے منکر تھے۔ عقیدۂ وحی کے حاملین کو پرانی ذہنیت کے مقلدین قرار دیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے علیٰ رؤس الاشہاد اسلام کی مخالفت کی اور احکام اسلامی کو عارضی اور نامعقول قرار دیا۔ ہندوؤں نے رسول اللہ ﷺ پر زبان طعن دراز کی اور برملا آپ ﷺ پر سب وشتم کیا۔ بادشاہ قرآن کا منکر ہو گیا تھا، حیات بعد الممات اور یوم جزا کا انکار کرتا تھا۔ اس نے پہلے یہ حکم دیا تھا کہ لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ برسر عام پڑھا جائے، لیکن جب اس سے ہنگامہ آرائی کا خطرہ پیدا ہوا تو مصلحتاً اس کلمہ کو حرم سرائے کی چار دیواری تک محدود رکھنے کا حکم دیا گیا۔ سجدہ جسے اسلام نے فقط اللہ کے لیے مخصوص کیا ہے، بادشاہ کے لیے لازم ٹھہرایا گیا۔ شراب نوشی حلال کی گئی، خنزیر کا گوشت جزو خوراک بنایا گیا، جزیہ موقوف کر دیا گیا۔ ذبیحہ گاؤ حرام قرار دے دیا گیا، ملک میں کتے اور سور کے بچوں کی پرورش کو خاص طور پر مروّج کیا گیا، کیوں کہ وہ مظہر الٰہی سمجھے جاتے تھے۔ صوم وصلوٰۃ اور حج منسوخ کیے گئے۔ تقویم اسلامی کے بجائے الٰہی ماہ

Marfat.com

منصب تجدید

Marfat.com

ایک مکتوب میں ان کو ان الفاظ سے مخاطب فرمایا۔ امام ربانی، محبوب سبحانی، مجدد الف ثانی۔

زمانۂ طالب علمی کے تیس سال بعد ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء میں ان دونوں نامور شخصیتوں کے درمیان از سرنو تعلقات استوار ہوئے اور اب تعلقات کی نوعیت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اس طویل عرصے میں دونوں کی علمی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی تھی۔ مولانا عبدالحکیم کی علوم تفسیر و حدیث میں مہارت، علم کلام اور منطق و فلسفہ اور دیگر علوم میں عبور کی دھوم صرف مسجد کی چار دیواری تک محدود نہ رہی تھی بلکہ امرا و وزرا کے ایوانوں سے بھی آگے بڑھ کر بادشاہ کے فلک بوس محلوں تک جا پہنچی تھی اور شیخ احمد سرہندی کے دل میں بھی مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی انتہائی قدر و منزلت جاگزین تھی۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ شیخ احمد نے ان کو ''آفتاب پنجاب'' کا خطاب عطا فرمایا۔

دوسری طرف شیخ احمد سرہندی، امام الشریعت، قیوم اول اور مجدد الف ثانی کے پُرعظمت القاب سے ملقب ہو چکے تھے اور سرزمین برصغیر میں سرہند کو علم و فضل کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی بایں شکوہِ علم و فضل سرہند گئے اور شیخ کی بیعت سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے ''دلائل التجدید'' کے نام سے ایک رسالہ سپردِ قلم فرمایا، جس میں دلائل و براہین سے شیخ کے مجدد ہونے کا ثبوت فراہم کیا اور خود شیخ نے بھی مکتوبات میں کہیں اشارۃً اور کہیں صراحتاً مجدد الف ثانی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ اپنے بیٹے خواجہ محمد صادق کو ضرورت مجدد کا شدید احساس کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

اے فرزند! ایں وقت آں است کہ در امم سابقہ دریں طور وقتے کہ پر از ظلمت است، پیغمبر اولوالعزم مبعوث می گشت و احیائے شریعت جدیدہ می کرد، و دریں امت کہ خیر الامم است، پیغمبر ایشاں خاتم الرسل علیہ و علیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات علما را مرتبۂ انبیائے بنی اسرائیل دادہ اند و بوجود علما از وجود انبیا کفایت فرمودہ اند، لہٰذا بر سر ہر مائۃ از علمائے ایں امت مجددے تعین می نمایند کہ احیائے شریعت فرمائند۔ علی الخصوص بعد از مضی الف کہ در امم سابقہ وقت بعثت پیغمبر اولی العزم است و بہ ہر پیغمبرے در آں وقت اکتفا نمودہ اند، دریں طور وقتے عالمے عارفے تام المعرفت درکار است کہ قائم مقام اولوالعزم امم سابقہ باشد [1]۔

یعنی اے عزیز! یہ وہ وقت ہے، جب کہ ایسے ظلمت سے بھرے ہوئے دور میں پہلی امتوں میں اولوالعزم پیغمبر مبعوث ہوتے تھے اور نئی شریعت کا احیا کرتے تھے، اور اس امت (محمدیہ) میں جو خیر الامم ہے اور اس امت کے رسول خاتم الرسل حضرت محمد ﷺ ہیں، اس کے علما کو انبیائے بنی اسرائیل کا درجہ عطا کیا گیا ہے اور انبیا کے بجائے علما کے وجود کو کافی سمجھا گیا ہے۔ اسی لیے ہر صدی کے آخر میں اس امت کے علما میں سے ایک مجدد متعین کرتے ہیں تاکہ وہ شریعت کا احیا کرے۔ بالخصوص ہزار سال کے بعد جو کہ اولوالعزم پیغمبر کے مبعوث ہونے کا وقت ہے، اور اس وقت ہر پیغمبر پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ پیغمبر اولوالعزم کو مبعوث فرمایا۔ اسی طرح اس زمانے میں ایک ایسے عالم و عارف کی ضرورت ہے جو پوری معرفت رکھتا ہو اور گزشتہ امتوں کے

[1] دفتر اول، مکتوب ۲۳۴۔

Marfat.com

اولوالعزم پیغمبر کے قائم مقام ہو۔

ایک اور مکتوب میں واضح الفاظ میں اپنے مجدد ہونے کا اعلان فرماتے ہیں۔ ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

یہ معارف، احاطہ ولایت سے بالاتر ہیں۔ ان کے سمجھنے میں علما ظواہر کی طرح اصحاب ولایت عاجز و قاصر ہیں۔ یہ علوم انوار نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ کی مشکوٰۃ نبوت سے مقتبس ہیں، جو الف ثانی کی تجدید کے عبد تبعیت و وراثت کے طور پر تر و تازہ اور ظہور پذیر ہوئے۔ ان علوم و معارف کا حامل اس الف کا مجدد ہے، چنانچہ اس کے علوم و معارف میں جو ذات وصفات اور افعال سے متعلق ہیں، اصحاب نظر و فکر پر یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ان علوم کی تربیت احوال و مواجید اور تجلیات و ظہورات سے ہوتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ علوم و معارف علما کے علوم اور اولیا کے معارف سے بہت بلند اور ماورا ہیں۔ بلکہ اولیا و علما کے علوم ان علوم کے مقابلے میں قشر اور چھلکے کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان معارف کو ان چھلکوں کے اندر مغز کا درجہ حاصل ہے۔ اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی ہادی ہے۔ جان لینا چاہیے کہ ہر سو سال بعد ایک مجدد ہو گزرا ہے، لیکن سو سال کا مجدد اور ہے اور ہزار سال کا مجدد اور۔ جس قدر سو اور ہزار سال کے درمیان فرق ہے، اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ ان دونوں مجددوں کے درمیان فرق ہے۔ اور مجدد وہ ہوتا ہے کہ جو فیض اس مدت میں امتوں کو پہنچتا ہے، اسی کے ذریعے پہنچتا ہے اگرچہ اس زمانے میں اقطاب و اوتاد بھی موجود ہوں اور ابدال و نجبا بھی۔

ایک اور مقام پر اپنے صاحب زادۂ گرامی خواجہ محمد معصوم کو ایک مکتوب تحریر فرماتے ہیں، جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

اے فرزند! باوجود اس امر کے جو میری آفرینش سے متعلق ہے، ایک بہت بڑا کام میرے سپرد کیا گیا ہے۔ مجھے پیری مریدی کے لیے اس دنیا میں نہیں لایا گیا اور نہ میرے وجود سے ارشاد و تربیت مقصود ہے۔ معاملہ کچھ اور ہی ہے اور اللہ تعالیٰ مجھ سے کچھ اور ہی کام لینا چاہتا ہے۔ ہاں اس سلسلے میں جس کو مناسب ہو، وہ یہ فیض بھی حاصل کرے۔ جو کام اللہ کو مجھ سے لینا مقصود ہے، اس کے مقابلے میں یہ دعوت و ارشاد کا کام بہت ہیچ ہے۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت کو ان کے باطنی معاملات سے یہی نسبت تھی۔ اگرچہ منصب نبوت ختم ہو چکا ہے، لیکن نبوت کے کمالات و خصائص سے بطریق تبعیت و وراثت، انبیائے کرام علیہم السلام کے کامل متبعین کو بہرہ حاصل ہے [1]۔

حضرت علامہ نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تصنیف تقصار جنود الاحرار میں شیخ احمد سرہندی کے حالات بیان کرتے ہوئے انھیں مجدد، متبحر عالم، عارف کامل، متبع سنت اور شدید مخالف بدعات قرار دیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

عالم، عارف، کامل مکمل بود۔ طریقہ نقشبندیہ را امام عہد است و برائے صوفیا در سالک سلوک مجدد،

[1] دفتر دوم۔ مکتوب ۶۔

Marfat.com

مکتوباتش درسہ مجلد است، دلیل واضح اند بر علو علم و کمال تبحر او در معرفت و بلوغ غایت مقامات، ترجمہ شریفہ او رسالہا ساختہ اند۔ ایں موقع مختصر ذکر آں کمالات رانمے تواند گنجد۔ حریص بود بر اتباع سنت و ترک بدعت، وجود امثال شاہ ولی اللہ و میرزا جان جاناں مظہر در اصحاب طریقۂ او کفایت است از برائے دریافت قدر و منزلت وے، رضی اللہ عنہ۔ و بالجملہ امام اہل سنت بود در عہد خود، و طریقہ علیہ وے رحمۃ اللہ علیہ مبنی بر اتباع کتاب و سنت در ظاہر و باطن، و نہ پذیرفتن چیزے کہ مخالف ایں ہر دو اصل محکم باشد۔ و ایں مکتوبات اصول عظیمہ است از برائے وصول بمنازل معرفت و قبول، طالب صادق و سالک راغب را در ہیچ وقت از اوقات از مطالعہ آں بے نیازی حاصل نیست ❶۔

یعنی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ عالم و عارف اور کامل و مکمل تھے۔ اپنے عہد میں طریقہ نقشبندیہ کے امام تھے اور صوفیا کے لیے راہ سلوک کے مجدد۔ معرفت خداوندی اور مقامات سلوک کی انتہا پر پہنچنے میں ان کو جو علو علم اور کمال تبحر حاصل تھا، اس پر ان کے مکتوبات شاہد اور واضح دلیل ہیں، جو تین جلدوں کو محتوی ہیں۔ ان کے مبارک سوانح میں کئی رسالے لکھے گئے ہیں۔ ان مختصر الفاظ میں ان کے کمالات کا احاطہ نہیں ہوسکتا۔ وہ اتباع سنت اور ترک بدعت میں حریص تھے، شاہ ولی اللہ (محدث دہلوی) اور میرزا مظہر جان جاناں ایسے حضرات کا ان کے سلسلہ طریقت میں داخل ہونا ان کی قدر و منزلت کے ثبوت کے لیے کافی ہے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ خلاصۂ کلام یہ کہ وہ اپنے زمانے میں امام اہل سنت تھے، اللہ ان پر اپنی رحمت کی بارش کرے۔ ظاہر و باطن میں ان کا طریقہ کتاب و سنت پر مبنی ہے اور جو چیز ان دو محکم اصولوں کے خلاف ہو، وہ ان کے طریقے میں مقبول نہیں۔ معرفت و قبول کی منازل پر پہنچنے کے لیے یہ مکتوبات اصول عظیمہ ہیں۔ طالب صادق اور سالک راغب کو کسی بھی حال میں مکتوبات کے مطالعہ سے بے نیازی و بے اعتنائی نہیں ہوسکتی۔

ریاض المرتاض میں حضرت نواب صاحب ممدوح رقم طراز ہیں:

علو مرتبہ کشف ہائے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ دریافت باید کرد کہ از سرچشمہ صحو سرزدہ، وگاہے مخالف شرع نہفتادہ بلکہ بیشتر را شرع موید است و بعضے چناں است کہ شرع ازاں ساکت است و مرتبہ او در اولیا مثل مرتبہ اولوالعزم است در انبیا ❷۔

یعنی مجدد الف ثانی کے کشوف کے مرتبہ بلند کا اندازہ کرنا چاہیے کہ وہ چشمہ صحو سے ظہور پذیر ہوئے اور کبھی کوئی کشف خلاف شریعت نہ ہوا، بلکہ اکثر کی شریعت موید ہے، اور بعض کشف ایسے ہیں کہ شریعت ان کے بارے میں ساکت ہے۔ اولیائے کرام میں ان کا مرتبہ ایسا ہے، جیسا انبیاء علیہم السلام میں اولوالعزم نبیوں کا۔

شیخ محسن بن یحییٰ بکری تیمی الیانع الجنی میں ارقام فرماتے ہیں کہ حضرت مجدد نے جس انداز سے

❶ تقصار جنود الاحرار، ص ۱۱۱، ۱۱۲۔

❷ ریاض المرتاض، ص ۱۲۱، ۱۲۲۔

Marfat.com

اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور جس اسلوب وطریق سے انھوں نے دین کے نشر و ذیوع کو اپنا مطمحٔ نظر ٹھہرایا، اس میں وہ قطعی حق بجانب تھے اور اس ضمن میں انھوں نے جو قدم اٹھایا، علما کی بہت بھاری اکثریت نے اس میں ان کی تائید کی۔ اگر کسی طرف سے اظہار اختلاف ہوا بھی تو بہت کم مسائل میں۔!

وقل ماتعقب به عليه ورد من قوله والمسائل المعدودات التى شددبها النكر عليه بعض اهل العلم فالحق انه مصيب فى بعضها وله تاويل سائغ فى البعض الاخر وشاركه فيها من هذا الطائفة ممن لا يحصى كثرة❶۔

(بہت کم مسائل ہیں، جن میں حضرت مجدد کی تعقیب اور تردید کی گئی، اور جن بعض اہل علم نے کچھ مسائل میں ان سے اختلاف کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بعض مسائل میں مجدد صاحب برسرحق ہیں، بعض میں ان کی تعبیر درست ہے اور ان میں علما کی بہت بڑی تعداد ان کی موید اور ان سے متفق ہے۔)

بدعات کی تردید اور سنت کی ترویج کے بارے میں مجدد صاحب نے جو موقف اختیار کیا اور جو خدمات عظیم انجام دیں، اس کے متعلق الیانع الجنی کے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

ومنها انه حقق الفرق بين البدعة والسنة واقيسة المجتهدين واستحسانات المتأخرين والتعارف عن المشهود لها بالخير وما احدثه الناس فى القرون المتأخرة وتعارفوه فيما بينهم، فرد بذلك مسائل مما استحسنها المتاخرون من فقهاء مذهبه❷۔

(مجدد صاحب نے بدعت وسنت اور مجتہدین کے قیاس اور متاخرین کے استحسان میں فرق واضح کیا اور قرون خیر میں اور متاخرین کی ان بدعات میں جن کو انھوں نے مستحسن قرار دے لیا تھا، امتیاز فرمایا اور ان مسائل کا رد کیا، جنھیں فقہائے متاخرین، بدعت حسنہ سے تعبیر کرتے تھے۔)

گھریلو صدمات اور حضرت مجدد کا صبر وضبط:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ انتہائی بلند حوصلہ اور پیکر تسلیم ورضا تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں طاعون کا مہلک مرض پورے زوروں سے پھوٹا۔ اس میں تین چار روز کے اندر اندر ان کے خاندان کے متعدد افراد لقمۂ اجل ہوگئے۔ ان کے بڑے بیٹے خواجہ محمد صادق (جو چوبیس سال کے جوان رعنا تھے۔ ۱۹ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ/ ۲۷ مارچ ۱۶۱۶ء کو فوت ہوئے) دو کم سن بیٹے (محمد فرخ اور محمد عیسیٰ) ایک صاحب زادی (ام کلثوم) اور خاندان کے کئی افراد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ خواجہ محمد صادق جید عالم، متقی اور بڑے پرہیز گار تھے۔ انتہائی اور مشکل کتب درسیہ طلبا کو پڑھاتے تھے، جن میں مطول مع حاشیہ میر، شرح عقائد مع

❶ الیانع الجنی، ص ۶۶۔
❷ الیانع الجنی، ص ۶۵۔

Marfat.com

حاشیہ خیالی اور تحریر اقلیدس خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ کتابیں خود حضرات القدس کے مصنف اور شیخ مجدد کے شاگرد خلیفہ ملا بدرالدین سرہندی نے ان سے پڑھی تھیں۔ خواجہ ممدوح اپنے چھوٹے بھائی محمد عیسیٰ کے جنازے میں گئے اور انھیں دفن کر کے واپس لوٹے تو طاعون کی گلٹی نمودار ہوئی اور دوسرے روز انتقال کر گئے۔ یہ تمام موتیں بالخصوص خواجہ محمد صادق کی موت حضرت مجدد کے لیے انتہائی باعث حزن و ملال تھیں۔ اس کا اندازہ دفتر اول کے آخر اور دفتر دوم کے شروع کے ان مکتوبات سے ہوتا ہے، جو انھوں نے تعزیتی خطوط کے جواب میں لکھے۔ ان میں ایک مکتوب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نام بھی ہے۔

عہد جہاں گیری میں مجدد الف ثانی کی مساعی:

مجدد الف ثانی کی ولادت شہنشاہ اکبر کے عہد میں ہوئی۔ اکبر کا عہد حکومت ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس نے (قمری حساب سے) اکیاون (۵۱) سال سرزمین ہند پر حکومت کی اور ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء کو وفات پائی۔ عہد اکبری کے اختتام کے وقت حضرت مجدد کی عمر تینتالیس (۴۳) سال کی ہو چکی تھی۔ وہ اکبر کے زمانے میں کھل کر میدان جہاد میں نہیں اترے۔ البتہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور مکتوبات کا سلسلہ جاری رہا۔ اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہاں گیر تخت ہند پر متمکن ہوا تو وہ کھل کر اور پورے زور سے میدان عمل و حرکت میں نکل آئے۔

اس زمانے میں جو گوناگوں برائیاں پھیلی ہوئی تھیں اور جن بدعات و منکرات کا زور تھا، ان کو ختم کرنے کے لیے حضرت مجدد الف ثانی نے جو طریق کار اختیار کیا اس کو مختصر الفاظ میں مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کی بہت بڑی تعداد خدمت دین کی انجام دہی کے لیے تیار کی اور انھیں دین صحیح کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مختلف علاقوں اور شہروں میں متعین کیا۔ اور حکم دیا گیا کہ وہ اتباع سنت پر زور دیں اور لوگوں کو دائرۂ شریعت میں واپس لانے کے لیے جدوجہد کریں۔ اس مہم کو فقط سرزمین برصغیر تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اس سے متصل دیگر مسلمان ملکوں میں بھی موثر و منظم طریق سے اس کا آغاز کیا گیا۔

۲۔ شیخ مجدد نے متعدد ملکوں، علاقوں، شہروں کے سرکردہ اور نامور افراد سے بہت بڑے پیمانے پر سلسلہ مراسلات جاری کیا۔ یہ مراسلات و مکتوبات اب بھی موجود ہیں اور کئی بار شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں شیخ کا انداز یہ تھا کہ دینی امور کی وضاحت اور مذہبی مسائل کی تفصیلات بیان کرتے اور ان اعتراضات کا تسلی بخش جواب دیتے جو اس زمانے میں عام طور پر اسلامی اوامر و احکام پر وارد کیے جاتے تھے اور جو لوگوں کے قلوب و اذہان میں ارکان حکومت کے ایک حلقے کی طرف سے مرتسم کر دیے گئے تھے۔ ان اعتراضات کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کی تشریح کی جاتی اور کتاب و سنت کی اتباع کو نقلی و عقلی دلائل سے ثابت کیا جاتا۔

۳۔ دربار شاہی کے معروف امرا اور مؤثر شخصیتوں کو اپنے حلقہ ارادت میں داخل کیا تا کہ ایک طرف یہ

Marfat.com

اپنے دائرۂ اثر کے لوگوں میں اسلامی ذہن پیدا کریں اور ان میں دینی انقلاب بپا کرنے کے لیے کوشاں ہوں۔ دوسری طرف بادشاہ کی ذہنی وقلبی کیفیت کو بدلنے کے لیے اپنا ذاتی اور محکمانہ اثر استعمال کریں۔

۴۔ چوتھی اہم اور عظیم جدوجہد یہ شروع کی کہ لوگوں سے یہ عہد لیا جائے کہ وہ بادشاہ کے ان احکام کی اطاعت نہیں کریں گے جو اسلام کے خلاف ہیں۔ اس سلسلۂ جدوجہد کو رعایا کے عوام سے شروع کر کے شاہی فوج کے اعلیٰ ارکان تک وسعت دی گئی اور ہر شخص کو متاثر کرنے کے لیے اس کی ذہنی وفکری سطح کے مطابق دینی ضوابط اور شرعی ذرائع عمل میں لائے گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں شیخ کو بڑی کامیابی ہوئی۔ ان کی آواز صرف عوام تک ہی محدود نہ رہی، بلکہ ان کے صدائے حق بادشاہ کے امرا و وزرا کے رفیع الشان محلوں تک جا پہنچی اور پھر ان کی وساطت سے قصر شاہی کے باب عالی پر دستک دینے لگی، بلکہ اس سے بھی آگے نکل کر خود بادشاہ کے کانوں میں جا گونجی۔ یہ ایک مرد حق کی ایسی یلغار تھی، جس سے بادشاہ اور شاہی ارکان کے فکر وعمل کی بنیادوں میں لرزہ پیدا ہو گیا۔

ردعمل:

بادشاہ ہند جہاں گیر اور اس کے بعض وزرا پر اس کا شدید ردعمل ہوا اور وہ شیخ کی اس ہمہ گیر دینی جدوجہد سے گھبرا اٹھے۔ آصف جاہ، جہاں گیر کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ شیخ احمد کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔ یہ نہایت سرکش اور حکومت کا باغی ہے۔ اس کا اثر ہندوستان کی سرحدوں سے بھی آگے بڑھ گیا ہے اور ایران، توران اور بدخشان وغیرہ ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اس نے بادشاہ کو سجدہ کرنے کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے، جب کہ سجدے کی رسم شہنشاہ اکبر کے زمانے سے چلی آ رہی ہے اور علما و فقہا اس کے جواز کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ فوج کے سپاہیوں اور دیگر محکموں کے ارکان کو اس کی اور اس کے مریدین کی مجلسوں میں جانے سے روکا جائے۔ نیز اس موقعے پر یہ بھی ضروری ہے کہ شیخ احمد کو نظر بند کر دیا جائے۔ بادشاہ بلاشبہ شیخ کو نظر بند کرنا چاہتا تھا، مگر یہ آسان کام نہ تھا۔ بڑے بڑے امرا اور مشہور اعیان سلطنت ان کا احترام کرتے اور ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو چکے تھے۔ شیخ کو نظر بند کرنے کی صورت میں بادشاہ کو ان امرا کی طرف سے شدید خطرہ لاحق تھا۔ لیکن بادشاہ نے اس مشکل کا حل یہ تلاش کیا کہ ان امرا کو دور دراز مقامات میں بھیج دیا۔ خان خاناں کو دکن میں، سید صدر جہاں کو مشرقی ممالک میں، خان جہاں لودھی کو مالوہ میں، خان اعظم کو گجرات میں اور مہابت خاں کو کابل میں تبدیل کر دیا۔

جہاں گیر کے دربار میں:

اس کے بعد بادشاہ نے حضرت مجدد کو ایک شاہی فرمان کے ذریعے ملاقات کی دعوت دی اور کہا کہ ہم

Marfat.com

آپ کی اور آپ کے خلفا کی زیارت کے مشتاق ہیں، تشریف لا کر شکریہ کا موقع دیں۔ اس فرمان کے بعد حضرت مجدد اپنے بعض خلفا کی معیت میں جہاں گیر کے دربار شاہی میں داخل ہوئے۔

بادشاہ تخت پر جلوہ افروز تھا۔ حضرت مجدد تشریف لائے۔ بادشاہ کے حضور پیش ہوئے، مگر اس حالت میں کہ خلاف شرع آداب و رسوم بجالانا تو کجا، سلام تک نہ کیا۔ بادشاہ نے دریافت کیا۔ تم آداب سلطنت کیوں بجانہیں لائے؟ فرمایا دین اسلام کا یہ حکم ہے کہ ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو السلام علیکم کہنا چاہیے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ آپ ہمارے سلام شرعی کا جواب نہیں دیں گے، اس لیے میں نے السلام علیکم بھی نہیں کہا۔

اب بادشاہ مروجہ آداب کے مطابق سجدے کا طالب ہوا۔ لیکن حضرت شیخ نے انکار کر دیا اور فرمایا سجدہ ذات خداوندی کے سوا کسی کو کرنا روا نہیں۔ شیخ کے اس جواب پر مفتی عبدالرحمٰن آگے بڑھے جو دربار جہاں گیری میں شیخ الاسلام کے مرتبے پر فائز تھے۔ انھوں نے کتب فقہ سے سلاطین کے لیے سجدۂ تحیت کا جواز پیش کیا اور کہا میں بحیثیت مفتی فتویٰ دیتا ہوں کہ شہنشاہ کے سامنے سجدۂ تحیت جائز ہے۔ لیکن حضرت مجدد نے ان کے دلائل کو ٹھکرا دیا اور بادشاہ کے سامنے سجدہ ریز نہ ہوئے۔

حضرت مجدد کے اس جواب سے بادشاہ سخت غضب ناک ہوا اور ان کے لیے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا۔ پھر کچھ سوچنے کے بعد گوالیار کے قید خانے میں ڈال دیا اور شیخ ایک مدت تک اس قید خانے میں محبوس رہے۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ جہاں گیر کو اپنے باپ کے ''دین الٰہی'' یا اکبری الحاد سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور واقعات کے تسلسل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان حالات کو قائم نہیں رکھنا چاہتا تھا جو اکبر نے علمائے سو کے کہنے سے پیدا کر دیے تھے۔ وہ ابوالفضل کا بھی سخت مخالف تھا۔ بلاشبہ اس کی چہیتی بیوی نور جہاں کا بھائی آصف جاہ اس کا وزیر سلطنت تھا اور یہ دونوں بہن بھائی امور سلطنت میں بڑے دخیل تھے اور شیعہ تھے، لیکن جہاں گیر کو ان کے مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ خلفائے ثلاثہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بے حد احترام کرتا تھا اور جیسا کہ وہ خود تزک جہاں گیری میں لکھتا ہے، حضرت مجدد سے اس کی خفگی کی ایک وجہ دفتر اول کا گیارھواں مکتوب ہے۔ اس مکتوب کے مندرجات سے بعض لوگوں نے جہاں گیر کے دل میں حضرت مجدد کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا کر دی تھی کہ وہ خود کو خلفائے ثلاثہ سے بھی افضل قرار دیتے ہیں۔ اس کے متعلقہ حصے کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''دیگر عرض یہ ہے کہ دوسری مرتبہ اس مقام کے ملاحظہ کے وقت اور بہت سے مقامات ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوئے۔ نیاز و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس مقام سے اوپر کے مقام پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذوالنورین کا مقام ہے اور دوسرے خلفا کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ اور یہ مقام بھی تکمیل وارشاد کا مقام ہے، اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی جن کا اب ذکر ہوتا ہے، تکمیل وارشاد کے

Marfat.com

مقام ہیں اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا۔ جب اس مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور دوسرے خلفا کا بھی وہاں عبور واقع ہوا ہے اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام ظاہر ہوا۔ بندہ اس مقام پر بھی پہنچا اور اپنے مشائخ میں سے حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ کو اپنے مقام میں اپنے ہمراہ پایا۔ اور دوسرے خلفا کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے، سوائے عبور اور مقام اور مرور اور اثبات کے کچھ فرق نہیں ہے اور اس مقام کے اوپر سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابل ایک نہایت عمدہ نورانی مقام کہ اس جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا، ظاہر ہوا، اور وہ مقام اس مقام سے تھوڑا سا بلند تھا، جس طرح کہ صفہ کو سطح زمین سے ذرا بلند بناتے ہیں اور معلوم ہوا کہ وہ مقام محبوبیت کا مقام ہے اور وہ مقام رنگین اور منقش تھا۔ اپنے آپ کو بھی اس مقام کے عکس سے رنگین معلوم کیا۔''

اس مکتوب کی وجہ سے کچھ لوگوں نے حضرت مجدد پر اعتراض کیا اور کہا کہ وہ اپنے آپ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل گردانتے ہیں۔ اس کا انھوں نے جواب بھی دیا مگر معترضین کو تسلی نہ ہوئی اور مرزا فتح اللہ گیلانی اور قاضی سنام ایسے بعض مرید اس مسئلے پر ان سے علیحدہ بھی ہو گئے۔ اس پر شیخ نے مرزا فتح اللہ کو ایک تفصیلی خط لکھا، جس میں واضح کیا کہ میں اپنے آپ کو قطعاً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے افضل نہیں سمجھتا۔ شیخ کے چند الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل جانے اس کا حال دو امر سے خالی نہیں ہے، یا وہ زندیق محض ہے یا جاہل...... وہ شخص جو حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل کہے، وہ اہل سنت والجماعت کے گروہ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس شخص کا کیا حال ہے جو اپنے آپ کو افضل جانے؟''

مجدد الف ثانی کے اس مکتوب کا تذکرہ خود جہاں گیر نے بھی اپنے تزک میں کیا ہے۔ وہ چہار دہم (چودھویں) سال جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے:

دریں ایام بعرض رسید کہ شیخ احمد نام...... در سہرند...... خلیفہ نام نہادہ...... خود نوشتہ کتابے فراہم آوردہ، مکتوبات نام کردہ...... ازاں جملہ در مکتوبے نوشتہ کہ در اثنائے سلوک گزرم بمقام ذی النورین رضی اللہ عنہ افتاد، مقامے دیدم بغایت عالی وخوش بصفا۔ ازاں جا در گزشتم بمقام فاروق رضی اللہ عنہ پیوستم واز مقام فاروق بمقام صدیق عبور کردم وہر کدام راتعریفے درخور آں نوشتہ داز اں جا بمقام محبوبیت واصل شدہ مقامے مشاہدہ افتاد بغایت منور وملون۔ خود را بانواع انوار والوان منعکس یافتم۔ یعنی استغفر اللہ از مقام خلفا درگزشتہ بعالی مرتبت رجوع نمودم و دیگر گستاخی ہا کردہ کہ نوشتن آں طولے دارد واز ادب دور است، بنا بریں حکم فرمودم کہ بدرگاہ عدالت آئین حاضر سازند۔ حسب الحکم بملازمت پیوست واز ہر چہ پرسیدم جواب معقول نتوانست، سامان نمود و باعدم خرد و دانش بغایت مغرور وخود پسند ظاہر شد۔ صلاح حال او منحصر دریں دیدیم کہ روزے چند در زندان ادب محبوس باشد،

Marfat.com

تاشوریدگی مزاج و آشفتگی دماغش قدرے تسکین پذیر دوشورش عوام نیز فرونشیند۔ لاجرم بہ انی رائے سنگھ دلن حوالہ شد کہ در قلعہ گوالیار مقید دارد❶۔

ترجمہ: ''ان ہی دنوں ایک درخواست پہنچی کہ شیخ احمد نامی...... نے سرہند میں...... جو خلیفہ کہلاتا ہے...... ایک خودنوشت کتاب تیار کی ہے جس کو مکتوبات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے...... ان مکتوبات میں ایک مکتوب یہ تحریر کیا ہے کہ میں منازل سلوک طے کرتا ہوا مقام ذی النورین (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) تک پہنچا۔ وہاں ایک نہایت بلند و بالا اور عمدہ ونفیس مقام دیکھا۔ میں اس سے آگے نکل کر مقام فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچا اور مقام فاروق سے مقام صدیق رضی اللہ عنہ کو عبور کر گیا۔ پھر ہر مقام کی تعریف بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ وہاں سے مقام محبوبیت سے واصل ہوگیا۔ وہاں بدرجہ غایت پر انوار اور منقش مقام دیکھا، میں نے اپنے آپ کو بھی اس مقام کے انوار والوان سے انعکاس پذیر پایا۔ (جہاں گیر لکھتا ہے) یعنی استغفر اللہ! وہ مقام خلفا سے بھی عالی مرتبت ہوگیا۔ اس (مکتوب) میں اور بھی بہت سی گستاخانہ باتیں معرض تحریر میں لائی گئی ہیں، جن کا لکھنا باعث طوالت بھی ہے اور حد ادب سے باہر بھی۔ اس لیے میں نے حکم جاری کیا کہ اسے بارگاہ عدالت میں حاضر کیا جائے۔ چنانچہ حسب حکم اسے پیش کیا گیا، اور پھر میں نے جو سوال کیا، وہ غرور اور عدم خرد و دانش کی وجہ سے اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ معلوم ہوا کہ انتہائی مغرور اور خود پسند شخص ہے۔ اس کے اصلاح احوال کی یہی صورت نظر آئی کہ کچھ دنوں کے لیے زندانِ ادب میں محبوس کر دیا جائے تا کہ اس کی شوریدگی مزاج اور آشفتگی دماغ کی تسکین کا کچھ سامان پیدا ہو جائے، نیز عوام کی شورش بھی دب جائے۔ پھر بلاشبہ اسے انی رائے سنگھ دلن کے حوالے کر دیا گیا تا کہ وہ اسے گوالیار کے قلعے میں قید کر دے۔''

''حضرات القدس'' ایک مشہور کتاب ہے جو حضرت مجدد کے سوانح حیات اور اصلاحی کارناموں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مولانا بدرالدین سرہندی کی تصنیف ہے جو مجدد صاحب کے شاگرد اور خلیفہ تھے اور سترہ سال ان کی خدمت میں رہے تھے۔ اس میں بھی جہاں گیر کے دربار میں ان کی حاضری اور دونوں کے درمیان سوال و جواب کا ذکر موجود ہے۔ الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''جب کہ حضرت شیخ قدس سرہ کو اس کلام (مکتوب یازدہم) کے باعث جہاں گیر بادشاہ کے پاس لے گئے تو بادشاہ نے ان سے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے، آپ نے لکھا ہے کہ میرا مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بلند تر ہے۔ آپ نے یہی جواب دیا۔ (یعنی عبور و مرور اور اثبات کے فرق کی وضاحت کی) اور بادشاہ سے ایک مثال بھی بیان کی کہ مثلاً آپ کسی ادنیٰ کو خدمت کے لیے بلائیں اور اس سے ازراہ نوازش اسرار کی باتیں کریں تو وہ لامحالہ پنج ہزاری امرا کے مقام کو طے کر کے پیشی تک پہنچے گا اور پھر اپنے مقام پر واپس جا کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتبہ امرائے پنج ہزاری سے زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ جواب سن کر بادشاہ کا عتاب دور ہو گیا۔''

❶ تزک جہاں گیری، ص ۲۷۴، ۲۷۵۔

Marfat.com

''اسی اثنا میں ایک شخص نے جو خداشناسی سے دور تھا، بادشاہ سے کہا کہ اس شیخ کا حال دیکھیے کہ آپ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہیں، اس نے آپ کو سجدہ نہیں کیا، بلکہ معمولی آداب بھی بجا نہیں لایا۔ بادشاہ یہ کلام سن کر خفا ہوا اور گوالیار میں حضرت کو قید کرنے کا حکم دیا۔ اس واقعہ سے پہلے شہزادہ دین پناہ شاہ جہان کہ شیخ سے خلوص کامل رکھتا تھا، علمائے مقامی افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کو کتب فقہ کے ساتھ حضرت کی خدمت میں بھیج چکا تھا کہ سجدۂ تحیت سلاطین کے لیے جائز ہے۔ اگر آپ سجدہ کرلیں تو کوئی گزند بادشاہ سے آپ کو نہیں پہنچے گا۔ میں اس کا ضامن اور ذمہ دار ہوں۔ آپ نے فرمایا: یہ مسئلہ کمزور ہے اور حکم رخصت رکھتا ہے۔ مسئلہ قوی یہ ہے اور عزیمت اسی میں ہے کہ غیر اللہ کو کبھی سجدہ نہ کیا جائے ❶۔

قلعہ گوالیار میں:

حضرت مجدد کے انکار اور طرز عمل سے بادشاہ نہایت خشمگین ہوا اور حضرت مجدد کو انی رائے سنگھ دلن کے حوالے کر کے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔ ظاہر ہے کہ شیخ کو پہلے سے معلوم تھا کہ بادشاہ ان پر کس درجہ خفگی کا اظہار کرے گا اور اس کا انھیں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ لیکن چوں کہ دربار شاہی کے بڑے بڑے امرا اور فوج کے بعض نامور عہدے دار شیخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو چکے تھے اور ان سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے، اس لیے ان پر شیخ کی گرفتاری کا شدید رد عمل ہوا۔ اگرچہ بادشاہ نے بغاوت کے خطرے کے پیش نظر انھیں دور دراز علاقوں میں بھیج دیا تھا، تاہم ان کے دل شیخ کے دام عقیدت سے بندھے ہوئے تھے اور وہ کسی صورت میں ان کی اس عظیم ابتلا کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ وہ اس سے متاثر ہوئے اور بادشاہ کے اس انتہائی اقدام کی سخت مذمت کی۔ ان حضرات میں کابل کے گورنر مہابت خاں کا نام بالخصوص قابل ذکر ہے۔ اسے جب شیخ کی گرفتاری کی اطلاع پہنچی تو بہت برافروختہ ہوا۔ اس نے خطبے اور سکے سے جہاں گیر کا نام نکال دیا اور اپنی فوج کی ایک خاص تعداد کے ساتھ جو چیدہ چیدہ افراد پر مشتمل تھی، ہندوستان پر حملہ آور بھی ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے دریائے جہلم کے کنارے بادشاہ کو گرفتار بھی کر لیا تھا۔ ممکن ہے وہ اس سے بھی تجاوز کرتا، لیکن حضرت مجدد نے قید خانے سے اس کو پیغام بھجوایا اور ہدایت کی کہ بغاوت سے باز رہے۔ بادشاہ کی اطاعت سے انحراف نہ کرے اور فتنہ وفساد کو روکے۔ شیخ کے اس حکم سے اس نے بادشاہ کو رہا کر دیا ❷۔

قید سے رہائی:

جہاں گیر بادشاہ، تزک جہاں گیری میں پندرھویں سال جلوس (جشن پانزدھمیں نوروز از جلوس ہمایوں)

❶ حضرات القدس، دفتر ۲، ص ۸۹، ۹۰۔

❷ تفصیلات کے لیے دیکھیے روضۃ القیومیہ وغیرہ۔

Marfat.com

کے واقعات کے ضمن میں شیخ احمد سرہندی کی رہائی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

دریں تاریخ شیخ احمد سہرندی را کہ...... روزے چند در زندان ادب محبوس بود، بحضور طلب داشتہ، خلاص ساختم، خلعت و ہزار روپیہ خرچ عنایت نمودہ، در رفتن و بودن مختار گردانیدم۔ اواز روئے انصاف معروض داشت کہ ایں تنبیہ و تادیب در حقیقت ہدایتے و کفایت بود[1]۔

(اسی تاریخ شیخ احمد سرہندی کو جو...... چند روز زندان ادب میں محبوس رہے، حضور میں طلب کیا گیا۔ میں نے ان کو رہا کر دیا۔ خلعت اور ہزار روپے خرچ کے لیے عنایت کیے، چلنے پھرنے اور قیام کی آزادی عطا کی۔ انھوں نے از روئے انصاف، اس تنبیہ و تادیب کو اس بات پر محمول کیا کہ یہ درحقیقت ایک ہدایت اور سبق کا ذریعہ تھی۔)

شیخ کی رہائی کا اصل باعث کیا تھا؟ اس کے بارے میں تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ ایک رات بادشاہ ہند جہاں گیر نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ایک جگہ کھڑے ہیں اور حیرت و افسوس کے ساتھ دانتوں میں انگلی دبا کر بادشاہ سے فرما رہے ہیں:

''جہاں گیر! تو نے میرے دین کے کتنے بڑے خدمت گار کو قید کر دیا۔''

یہ منظر دیکھ کر جہاں گیر فوراً خواب سے بے دار ہوا۔ قلب و ذہن پر سخت ندامت و پریشانی کے اثرات ظاہر ہوئے اور بلا تاخیر شیخ کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ بعض روایات کے مطابق جہاں گیر نے خود جا کر شیخ کو زنداں سے نکالا۔ اپنی غلطی اور سوئے ادب پر ندامت کا اظہار کیا اور طالب عفو ہوا۔ شیخ نے معاف فرما دیا۔ اس نے شیخ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ انھی کو گواہ بنا کر اللہ کے حضور معاصی و منہیات سے تائب ہوا اور مغفرت کے لیے دعا کی درخواست کی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ عامل کابل مہابت خاں کے حملے کے بعد بادشاہ نے شیخ کو رہا کر دیا اور ان سے ملاقات کی خواہش بھی کی۔ مگر شیخ نے فرمایا، اس وقت تک ملاقات نہیں ہو سکتی، جب تک مندرجہ ذیل شرائط منظور نہ کی جائیں گی۔

۱۔ سجدۂ تعظیمی موقوف کیا جائے۔
۲۔ جو مساجد منہدم کی گئی ہیں، وہ از سر نو تعمیر کی جائیں۔
۳۔ ذبیحہ گاؤ کا امتناعی حکم منسوخ کیا جائے۔
۴۔ احکام شرعی کے نفاذ کے لیے قاضی اور مفتی و محتسب مقرر کیے جائیں۔
۵۔ غیر مسلموں سے جزیہ کی وصولی شروع کی جائے۔
۶۔ بدعات کا سد باب کیا جائے اور احکام شریعت کی تنفیذ کی جائے۔

[1] تزک جہاں گیری، ص ۳۱۲۔

Marfat.com

۷۔ جو لوگ اس جھگڑے میں محبوس کیے گئے ہیں، انھیں رہا کیا جائے ❶۔

بادشاہ نے یہ شرائط منظور کرلیں تو شیخ احمد نے آگرہ تشریف لا کر ملاقات کی۔ اس نے شیخ کو خلعت اور نذر پیش کی۔ بعد ازاں شیخ نے عمر کے آخری چھ سال بادشاہ کے مشیر خاص کی حیثیت سے بسر کیے ❷۔

شیخ احمد سرہندی اکبر کے عہد (۹۷۱ھ/۱۵۶۵ء) میں پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق سترہ اور ایک روایت کے مطابق اکیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ پھر عہد اکبری ہی میں اپنے شہر سرہند کو تبلیغی مرکز بنایا۔ وہاں انھوں نے درس و تدریس کا ہنگامہ بھی بپا کیا، تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا اور مختلف سرکردہ لوگوں کو مکاتیب بھی تحریر کیے۔ یعنی انھوں نے ہر اعتبار سے باقاعدہ اپنی تبلیغی مہم کا آغاز فرمایا۔ مگر یہ سب سرگرمیاں نہایت دھیمے پن اور انتہائی محتاط طریقے سے کی گئی تھیں، اس لیے موثر اور ہمہ گیر ہونے کے باوجود اکبر کو اس سے زیادہ خطرہ لاحق نہیں ہوا، نہ انھیں کچھ کہا گیا، نہ گرفتار کیا گیا اور نہ ان پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کی گئیں۔ انھیں جہاں گیر کے عہد میں ہدف ابتلا بنایا گیا اور پھر اس کا نتیجہ بہت بڑے اسلامی اور روحانی انقلاب کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

عہد جہاں گیری میں شیخ کی تبلیغ دین اور اس کے اثرات:

رہائی کے بعد جہاں گیر شیخ کے حلقہ عقیدت میں داخل ہو گیا۔ اس نے شیخ کو بالکل آزاد کر دیا تھا اور اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ گھر جانا چاہتے ہیں تو گھر تشریف لے جائیں اور اگر لشکر کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو لشکر میں رہیں اور تبلیغ دین کریں۔ شیخ نے گھر کے بجائے لشکر میں رہنے کو ترجیح دی، لشکر کی نقل و حرکت ہر وقت جاری رہتی تھی اور سارے ملک میں مختلف اوقات میں اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تھا، اس لیے اس سے تبلیغ کے زیادہ مواقع میسر آئے۔ اور لوگ زیادہ حلقہ بگوش ہدایت ہوئے۔ خود بادشاہ سے گفتگو کا طویل سلسلہ جاری رہتا۔ وہ دیر تک ان کی مجلس میں بیٹھتا اور ان سے مستفید ہوتا۔ بادشاہ کی شیخ سے دلچسپی کی وجہ سے امرا و وزرا، ارکان سلطنت اور رعایا کے عام لوگوں میں شیخ کا دائرۂ اثر وسیع ہوا اور دین اسلام سے ان کو مزید لگاؤ پیدا ہوا۔ بادشاہ سے جس انداز کی گفتگو ہوتی، خود شیخ اس سے بہت خوش تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے صاحب زادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو ایک مکتوب میں شاہی صحبتوں کے بارے میں مطلع کیا۔ اس مکتوب کا اردو ترجمہ یہ ہے۔ فرماتے ہیں:

''اللہ کی حمد اور اس کے برگزیدہ بندوں پر سلام۔ اس طرف کے احوال و کوائف لائق تعریف ہیں۔ عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت خاص ہے کہ ان گفتگوؤں سے امور دینیہ اور اصول

---

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے روضۃ القیومیہ رکن اول، ص ۱۸۶ تا ۱۹۵۔

❷ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مکتوبات دفتر دوم، مکتوب نمبر ۴۳، ۴۴۔ نیز دیکھیے روضۃ القیومیہ، رکن اول، ص ۱۹۹ تا ۲۰۹۔

Marfat.com

اسلامیہ میں کسی قسم کی سستی اور مداہنت راہ نہیں پا سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں وہی باتیں بیان ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال ضبط تحریر میں لایا جائے تو دفتر تیار ہو جائے۔ بالخصوص آج ماہ رمضان کی سترھویں شب کی صحبت میں انبیا علیہم السلام کی بعثت، عقل کے عدم استقبال، ایمان بالآخرت، اس کے عذاب وثواب، اثبات رویت باری تعالیٰ، حضرت خاتم النبیین کی ختم نبوت، ہر صدی کے مجدد، اقتدائے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم۔ تراویح کی سنیت، تناسخ کے ابطال، جنات کے احوال اور ان کے عذاب وثواب کے بارے میں بہت کچھ گفتگو ہوئی۔ وہ بہت خوشی اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ اس اثنا میں ضمناً اور بھی بہت سے امور زیر بحث آئے۔ اقطاب واوتاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیات کا ذکر بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ سب کچھ تسلیم کرتے ہیں اور کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔ ان واقعات اور ملاقاتوں میں شاید اللہ تعالیٰ کی حکمت کے اسرار پنہاں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی بے انتہا حمد ہے جس نے ہم کو نعمت ہدایت عطا فرمائی۔ اگر وہ ہدایت سے نہ نوازتا تو ہم کبھی ہدایت یاب نہ ہو سکتے۔ بلاشبہ ہمارے رب کے رسول سچے ہیں۔

''دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید سورۂ عنکبوت تک ختم کر لیا ہے۔ جب رات کو اس مجلس سے اٹھتا ہوں تو تراویح میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ حفظ قرآن کی یہ دولت عظمیٰ، اس فترت میں جو عین حقیقت ہے، حاصل ہوئی۔ اول و آخر تمام حمد وثنا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔''

واقعات کی ترتیب سے یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ شیخ کو رہا کرنے کے بعد جہاں گیر کو ان سے بہت زیادہ عقیدت ہو گئی تھی اور وہ ان کی مالی اعانت بھی کرنے لگا تھا۔ چنانچہ وہ شیخ کی رہائی سے تین سال بعد اپنی سال گرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

بدستور ہر سال خود را بطلا واجناس وزن فرمودہ در وجہ مستحقان مقرر فرمودم۔ ازاں جملہ شیخ احمد سہرندی دو ہزار روپیہ عنایت شد ❶۔

یعنی میں نے ہر سال کے معمول کے مطابق سونے اور اجناس میں اپنا وزن کرایا اور یہ چیزیں مستحقین میں تقسیم کر دیں۔ ان میں سے شیخ احمد سرہندی کو دو ہزار روپے عنایت کیے گئے۔

علاوہ ازیں بادشاہ نے شراب نوشی ترک کر دی تھی، خلاف اسلام رسوم اور منہیات سے تائب ہو گیا تھا، شیخ کی صحبت میں باقاعدہ بیٹھتا اور ان سے مستفید ہوتا تھا۔ قلعہ گوالیار سے رہائی کے بعد شیخ تین سال تک شاہی لشکر میں رہے۔ اس اثنا میں ان سے خود بادشاہ نے بھی استفاضہ کیا۔ امرا و وزرا بھی ان کی تبلیغ سے اثر پذیر ہوئے اور شیخ نے مختلف حضرات کے نام بہت سے مکتوبات بھی تحریر کیے جو دفتر سوم میں مرقوم ہیں۔ یہ دور شیخ کی تبلیغ دین، اشاعت توحید اور دعوت اسلام کا دور تھا۔ آگے چل کر اس کے بہت ہی اچھے نتائج برآمد ہوئے۔

---

❶ تزک جہاں گیری، ص ۳۷۹۔

Marfat.com

حضرت مجدد کی تعلیمات:

اب ہم اختصار کے ساتھ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی تعلیمات، ان کے افکار وتصورات اور اسلوب رشد وہدایت کی ایک جھلک پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ان کی عظیم شخصیت کی فکری وعملی تصویر سامنے آئے گی اور پتا چلے گا کہ مختلف مسائل دینیہ کے بارے میں ان کا کیا نقطۂ نظر تھا۔ نیز معلوم ہوگا کہ ان کے دور میں ان مسائل کی وضاحت کس درجہ ضروری تھی۔

توحید:

اس ضمن میں ہم سب سے پہلے چند سطور میں مجدد صاحب کے تصور توحید کی وضاحت ان ہی کے الفاظ میں کریں گے۔ وہ ایک مکتوب میں توحید کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

توحید عبارت از تخلیص قلب است از توجہ ما دون او سبحانہ وتعالیٰ تا زمانیکہ دل را گرفتاری بما سوی متحقق، اگرچہ اقل قلیل باشد، از ارباب توحید نیست۔ بے تحصیل ایں دولت واحد گفتن وواحد دانستن نزد ارباب اصول از فضول است [1]۔

(توحید کی تعریف یہ ہے کہ دل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف توجہ کے سوا ہر شے سے خالی ہو جائے۔ جب تک دل ماسوی اللہ میں گرفتار ہے، اگرچہ بہت ہی قلیل طور پر ہو، اصحاب توحید میں سے نہیں ہے۔ اس جذبے کے حصول کے بغیر توحید کا دعویٰ کرنا اور توحید کا دم بھرنا ارباب اصول کے نزدیک بے معنی اور بے مقصد ہے۔)

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور دنیا میں تشریف آوری کا مقصد محض یہ ہے کہ انسان غیر اللہ کی عبادت سے دور رہے اور فقط اللہ سے وابستگی اختیار کرے۔ ان کی فارسی عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

ہمارے انبیا پر صلوٰۃ وسلام ہو جو تعداد میں ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب ہو گزرے ہیں۔ سب نے مخلوق کو خالق کی عبادت کی تبلیغ فرمائی اور غیر اللہ کی عبادت سے منع کیا۔ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے بندے اور عاجز انسان جانا اور ہمیشہ اللہ کی عظمت وہیبت سے لرزاں وترساں رہے [2]۔

ایک مکتوب میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اصحاب توحید کی پہچان کیا ہے اور وہ کن اوصاف سے متصف ہوتے ہیں؟ حضرت مجدد الف ثانی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

کامل توحید والے لوگ ان ہی امور کو مرکز توجہ ٹھہراتے ہیں جو اللہ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہوں، ناپسندیدہ اور غلط امور کی طرف وہ بالکل ملتفت نہیں ہوتے۔ وہ اپنے ایمان کو چند شیریں لقموں کے عوض

---

[1] مکتوبات دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۱۱۔

[2] مکتوبات دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۶۷۔

Marfat.com

فروخت نہیں کرتے۔ وہ خوش نما لباس اوراعلیٰ پارچات کی خاطر غلامی کی زندگی اختیار نہیں کرتے۔ وہ تخت شاہی سے تعلقات استوار کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ وہ اللہ کی بادشاہی میں لات وعزیٰ کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ وہ بارگاہ خداوندی میں صرف دین خالص کے طالب ہیں۔ خبردار ہو جاؤ! خالص اطاعت وعبادت کا مستحق فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ الا لله الدين الخالص۔

اللہ کا فرمان ہے کہ اے پیغمبر ﷺ، اگر تو نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مانا تو تیرے اعمال اکارت جائیں گے لئن اشركت ليحبطن عملك۔

ایک ساعت کے لیے اپنے حال پر غور کرو۔ اگر یہ خالص دین تجھے میسر آ گیا تو تمھارے لیے بہت بڑی خوش خبری کا باعث ہوگا❶۔

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور سے قلب کو وابستہ کرنا باطنی امراض کی جڑ ہے۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

باطنی امراض کی سرداراور اندرونی بیماریوں کی رئیس بیماری یہ ہے کہ دل کا پیوند اللہ کے سوا کسی اور کے ساتھ ہو۔ جب تک اس بیماری سے نجات حاصل نہ ہو جائے ایمان کی سلامتی محال ہے۔ کیوں کہ شرک کو بارگاہ رب العزت میں ہرگز دخل نہیں ہے۔ خبردار! دین خالص صرف اللہ ہی کا حق ہے۔ الا لله الدين الخالص۔ پس جب شریک کو محبت الٰہی کے مقابلے میں غالب کر لیا جائے تو ایمان کا کیا حال ہوگا۔ یہ کس درجہ غلط بات ہے کہ غیر کی محبت کو اس انداز سے غالب کر لیا جائے کہ حق تعالیٰ کی محبت اس کے مقابلے میں مغلوب یا معدوم ہو جائے❷۔

ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں کہ تمام انبیا صرف اللہ تعالیٰ ہی کو بندگی کے لائق قرار دیتے تھے اور اپنے آپ کو اس کے عاجز بندے اور بشر قرار دیتے تھے۔ اس بات کو ان کی دعوت الی اللہ کے جز کی حیثیت حاصل تھی۔ فرماتے ہیں:

دوسرا دعوتی کلمہ جو انبیا علیہم السلام کا مخصوص کلمہ ہے، یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دیگر بنی نوع انسان کی طرح بشر جانتے ہیں اور عبادت وبندگی کے لائق صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو گردانتے ہیں۔ بنی نوع انسان کو اسی کی اطاعت وبندگی کی طرف دعوت دیتے ہیں اور خداوند تعالیٰ کو حلول واتحاد سے پاک ومنزہ ٹھہراتے ہیں❸۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی اس علوشان اور عظمت کے باوجود بشر اور اللہ کے عبادت گزار بندے تھے۔ الفاظ یہ ہیں:

---

❶ مکتوبات، دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۷۴۔
❷ مکتوب دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۰۹۔
❸ مکتوب دفتر اول، مکتوب نمبر ۶۳۔

Marfat.com

اے برادر! محمد رسول اللہ ﷺ باآں علوشان بشر بود، وبداغِ حدوث وامکان متسم۔ بشر از خالق بشر جل سلطانہ، چہ دریابد وممکن از واجب تعالیٰ شانہ، چہ فرا گیرد، وحادث قدیم را جلت عظمتہ، چہ طورا حاطہ نماید ❶۔

یعنی اے برادر! حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ باوجود اس علوشان کے بشر تھے اور حدوث وامکان کے وصف سے متسم۔ بھلا بشر، خالق بشر کی حقیقت کو کس طرح پا سکتا ہے؟ اور ممکن، واجب کا احاطہ کیوں کر کر سکتا ہے؟ اور حادث قدیم کو اپنے دائرۂ ادراک ومعرفت میں کیسے لا سکتا ہے؟

شرک کی سخت تردید:

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

انبیا علیہم السلام کے متفقہ کلمات دعوت یہ ہیں کہ ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے اور اللہ بلند و پاک کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ بعض مخلوق بعض مخلوق کو ارباب من دون اللہ نہ بنائے ❷۔

ایک اور مکتوب میں خالص علمی زبان میں شرک کی سخت تردید کرتے ہیں۔ ان کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

ممکن کو واجب ثابت کرنا اور واجب کے خیر وکمال کو ممکن سے وابستہ کر دینا، درحقیقت ممکن کو حق جل سلطانہ کی بادشاہت اور اس کے اختیارات میں شریک بنانا ہے۔ اسی طرح ممکن کو واجب تعالیٰ شانہ کا عین کہنا اور ممکن کے صفات وافعال کو واجب تعالیٰ کے صفات وافعال کا عین جاننا، واجب تعالیٰ کی جناب میں سوئے ادب اور اس کے اسما وصفات میں الحاد ہے ❸۔

ایک مکتوب میں رسول اللہ ﷺ کے وجود بابرکت کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ دائرۂ امکان میں ہے، دائرۂ وجوب میں نہیں ہے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں:

آنحضرت ﷺ باعلوشان وباآں جاہ وجلال ہمیشہ ممکن است، وہرگز از امکان نخواہد برآمد وبوجوب نخواہد پیوست، مستلزم تحقیق است بالوہیت۔ تعالیٰ اللہ ان یکون لہ ند و شریک، دع ما ادعتہ النصاریٰ فی نبیھم ❹۔

---

❶ ایضاً مکتوب نمبر ۱۷۳۔

❷ مکتوب دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۷۳۔

❸ مکتوبات دفتر دوم، مکتوب اول۔

❹ مکتوبات دفتر سوم، مکتوب نمبر ۱۲۲۔

Marfat.com

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ باوصف اس قدر اونچی شان اور جاہ وجلال کے ہمیشہ ممکن ہی ہیں اور ہرگز دائرۂ امکان سے نکل کر وجوب کے ساتھ پیوست نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ یہ امر وجوب کے ساتھ متحقق ہونے کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سروشریک سے برتر واعلیٰ ہے۔ جو دعویٰ نصاریٰ نے اپنے نبی کے متعلق کیا ہے، وہ اہل اسلام کو چھوڑ دینا چاہیے۔

غیر اللہ سے استمداد:

غیر اللہ سے استمداد، دفع امراض واسقام کی غرض سے اللہ کے سوا دوسروں سے مدد مانگنے اور طلب حاجات کے لیے ان کے دروازے پر دستک دینے کو حضرت مجدد الف ثانی شرک سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

استمداد از اصنام وطاغوت در دفع امراض واسقام کہ در جہلائے اہل اسلام شائع گشتہ است، عین شرک وضلال است وطلب حوائج از سنگہائے تراشیدہ وناتراشیدہ نفس کفر وانکار از واجب الوجود تعالیٰ وتقدس قال اللہ تبارک وتعالیٰ شکایتاً عن حال بعض اہل الکتاب۔ یریدون ان یتحا کموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ ویرید الشیطن ان یضلھم ضلالاً بعیداً[1]۔

اکثر زنان بواسطہ کمال جہل کہ دارند بایں استمداد ممنوع مبتلا اند وطلب رفع بلیہ ازیں اسمائے بے مسمیٰ می نمایند وبآدائے مراسم شرک واہل شرک گرفتار اند[2]۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ امراض واسقام کو رفع کرنے کی غرض سے بتوں سے اور طاغوت سے استمداد کرنا، جس کا جاہل مسلمانوں میں عام رواج ہو گیا ہے، عین شرک وگمراہی ہے۔ تراشیدہ وناتراشیدہ پتھروں سے اپنی ضرورتیں اور حاجتیں طلب کرنا اللہ تعالیٰ کا صاف اور عین کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض گمراہوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنا معاملہ طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس سے انکار کر دیں اور شیطان ان کو ضلالت میں مبتلا کر کے سیدھی راہ سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔ زیادہ تر عورتیں کمال جہالت کی وجہ سے استمداد کے اس ممنوع عمل میں مبتلا ہیں اور رفع بلیات کے لیے مراسم شرک اور عمل اہل شرک میں گرفتار ہیں۔

---

1. یہ سورۂ النساء کی آیت نمبر ۶۰ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: وہ چاہتے ہیں کہ اپنے جھگڑے قضیے سرکش اور شریر (طاقتوں) کے آگے لے جائیں، حالانکہ انھیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اس سے انکار کریں۔ اصل بات یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے، انھیں اس طرح گمراہ کر دے کہ سیدھی راہ سے بہت دور جا پڑیں۔
2. مکتوبات دفتر سوم، مکتوب نمبر ۴۱۔

Marfat.com

نذر و نیاز کا شرکیہ انداز:

مشائخ اور بزرگان دین کے ناموں کی نذریں ماننا اور ان کی قبروں پر جانور ذبح کرنا اعمال شرکیہ میں داخل ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

حیوانات را کہ نذر مشائخ می کنند، بر سر قبرہائے ایشاں رفتہ، آں حیوانات را ذبح می کنند، در روایات فقہیہ ایں عمل را نیز داخل شرک ساختہ اند، دریں باب مبالغہ نمودہ، وایں ذبح را از جنس ذبائح جن انگاشتہ اند کہ ممنوع شرعیست و داخل دائرۂ شرک۔ ازیں عمل نیز اجتناب باید نمود کہ شائبہ شرک دارد۔ و وجوہ نذر بسیار است۔ چہ درکار است کہ نذر ذبح حیوانے کنند وارتکاب ذبح آں نمائندہ بذبائح جن ملحق سازند و تشبیہ بعبدہ جن پیدا کنند ①۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

حیوانات اور جانوروں کو کہ مشائخ اور بزرگوں کے لیے ان کی نذر مانتے ہیں اور ان کی قبروں پر لے جا کر ان جانوروں کو ذبح کرتے ہیں، فقہی روایات میں اس عمل کو شرک میں شمار کیا گیا ہے اور اس میں فقہا نے بڑا سخت رویہ اختیار کیا ہے۔ ایسے جانوروں کے ذبح کرنے کو بھی ان ہی ذبیحوں میں گردانا گیا ہے جو جنات کے نام پر اور ان سے طمع و خوف کی بنا پر مشرکین ذبح کیا کرتے تھے۔ یہ سب شرعاً ممنوع ہے اور شرک کی ذیل میں آتا ہے۔ اس عمل سے بھی اجتناب ضروری ہے، کیوں کہ اس میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ نذر کی جائز اور مشروع صورتیں بہت ہیں۔ کیا ضرور ہے کہ جانور کے ذبح کرنے ہی کی نذر مانی جائے اور اس عمل کے ارتکاب سے جنات کے نام کے ذبیحوں میں شمولیت کر کے جنات کی پوجا کرنے والوں سے مشابہت پیدا کی جائے۔

نجات کا ذریعہ اتباع شریعت ہے:

نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ اور انسان کس طرح فلاح و بہبود سے ہم کنار ہو سکتا ہے؟

حضرت مجدد نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور مختلف مکاتیب میں اس مسئلے کو واضح کیا ہے۔ صاف لفظوں میں لکھتے ہیں کہ نجات صرف حضرت محمد ﷺ کی اتباع ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ نجات کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اس ضمن میں ایک مکتوب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

طریق نجات و راہ رستگاری ہمیں متابعت شریعت است، علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام، در اعتقاد و عمل۔ استاد و پیر برائے آں غرض می گیرند کہ دلالت بشریعت نمایند و ببرکت ایشاں یسر و سہولت در اعتقاد و عمل شریعت پیدا شود، نہ آں کہ مریداں ہر چہ دانند کنند، و ہر چہ خواہند خورند، و پیران سپر اینہا گردند واز عذاب

① مکتوبات دفتر سوم، مکتوب نمبر ۴۱۔

Marfat.com

نگہدارند کہ ایں معنی تمنائے محض است، آں جا بے اذن کسے شفاعت نتواند کرد، تا عمل مرتضٰی نبود، شفاعت او نہ کند، و مرتضٰی وقتے شود کہ بمقتضائے شریعت عامل شود ❶۔

اب ذیل میں ان الفاظ کا ترجمہ پڑھیے:

نجات کا ذریعہ اور فلاح و کامرانی کا راستہ فقط یہ ہے کہ اعتقادی اور عملی طور پر صاحب شریعت (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) کی اتباع کی جائے۔ استاد اور مرشد اس واسطے بنائے جاتے ہیں کہ وہ شریعت کی طرف رہنمائی کریں اور ان کی برکت سے شریعت کے مطابق عقیدہ اور عمل کی استواری میں آسانی و سہولت پیدا ہو۔ نہ یہ کہ مرید جو کچھ چاہیں کریں اور جو چاہیں کھائیں، اور پیران کو عذاب سے بچانے کی ڈھال بن جائیں۔ یاد رہے، یہ خیال ایک غلط اور بے ہودہ آرزو ہے۔ وہاں اذن کے بغیر کوئی شفاعت نہ کر سکے گا، اور جب تک عمل پسندیدہ نہ ہوں گے، کوئی سفارش نہ کرے گا، اور عمل پسندیدہ تبھی ہوں گے، جب شریعت کے مطابق چلا جائے گا۔

اعتقادی مداہنت قابل معافی نہیں:

عمل و عقیدہ کے بارے میں حضرت مجدد کا وہی نقطۂ نظر ہے، جو سلف صالحین کا ہے۔ ان کے نزدیک عمل میں مداہنت بارگاہ الٰہی میں قابل عفو ہو سکتی ہے لیکن عقیدے کی مداہنت معاف نہیں ہو سکتی۔ عقیدے کی مداہنت ان کے نزدیک شرک کے مترادف ہے۔

مداہنت و مساہلت در عمل امید مغفرت دارد۔ اما مداہنت اعتقادی گنجائش مغفرت ندارد۔ ان الله لا یغفران یشرك به ویغفر مادون ذلك لمن یشاء ❷۔

یعنی عمل میں مداہنت و غفلت کا ارتکاب ہو جائے تو مغفرت و عفو کی امید ہے۔ لیکن عقیدے کی مداہنت میں مغفرت کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ کا فرمان ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا جائے تو وہ نہیں بخشے گا، اس کے سوا جس کو چاہے گا بخش دے گا۔

ادلہ احکام شرعیہ:

ادلہ احکام شرعیہ کے بارے میں مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ صرف قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ ہیں، ان کے بعد قیاس اور اجماع امت کو بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

احکام شرعیہ کے اثبات میں صرف کتاب و سنت ہی معتبر و مستند ہیں۔ پھر قیاس اور اجماع امت بھی

❶ مکتوبات دفتر سوم، مکتوب نمبر ۱۴۱۔

❷ مکتوبات دفتر دوم، مکتوب نمبر ۶۷۔

Marfat.com

مثبت احکام ہیں۔ ان چار ادلہ شرعیہ کے بعد کوئی ایسی دلیل نہیں، جس سے احکام شرعیہ کا اثبات ہو سکے۔ اولیائے کرام کے الہام سے کسی چیز کی حلت اور حرمت ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ ارباب باطن کا کشف کسی چیز کو فرض یا سنت ثابت کر سکتا ہے ❶۔

ایک مکتوب میں فرماتے ہیں صرف قرآن وسنت سے استدلال کرنا چاہیے۔ جو شخص قرآن وسنت کو نظر انداز کر دے، اس سے کسی قسم کی گفتگو اور جھگڑا نہ کیا جائے ❷۔

اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا فعل شنیع ہے:

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا فعل شنیع ہے اور اس سے روکنا ضروری ہے:

بعضے از خلفا را مریدان ایشاں سجدہ می کنند...... شناعت ایں فعل اظہر من الشمس است، منع شاں بکنید وتاکید در منع نماید ❸۔

بعض خلیفوں کو ان کے مرید سجدہ کرتے ہیں...... اس فعل کی شناعت و مکروہیت سورج سے زیادہ روشن ہے۔ انھیں روکنا چاہیے اور پوری سختی اور تاکید سے منع کرنا چاہیے۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں، ترجمہ:

اے برادر! سجدہ زمین پر پیشانی رکھنے کا نام ہے۔ یہ عمل انتہائی تذلل، پستی، انکسار، عاجزی اور فروتنی کو متضمن ہے۔ تواضع کی یہ قسم صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، شریعت نے غیر اللہ کے لیے اسے جائز نہیں ٹھہرایا ❹۔

غیر اللہ کو ''مالک دو جہان'' کہنا کلمہ شرک ہے

ایک شخص نے اپنے مکتوب میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو ''خدیونشأتین'' سے مخاطب کیا۔ ''خدیونشأتین'' کے معنی مالک دو جہان کے ہیں۔ حضرت مجدد کو اپنے لیے یہ کلمہ سخت ناگوار گزرا اور اسے کلمہ شرکیہ سے تعبیر فرمایا اور جوابی مکتوب میں تنبیہ فرمائی کہ یہ لفظ فقط اللہ کے لیے مخصوص ہے، غیر اللہ کے لیے اسے ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہیے، اگرچہ وہ کتنی بھی بڑی شخصیت ہو۔ بندہ بہر حال مملوک ہے، اس کے لیے کسی صورت میں بھی شرعی

---

❶ مکتوبات دفتر دوم، مکتوب نمبر ۵۵۔

❷ مکتوبات دفتر سوم، مکتوب نمبر ۲۴۔

❸ مکتوبات دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۹۔

❹ مکتوبات دفتر دوم، مکتوب نمبر ۹۲۔

Marfat.com

اعتبار سے اس لفظ کے استعمال کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ انداز بیان کس درجہ زوردار، منطقیانہ اور مدلل ہے۔

مجدد صاحب کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں:

سعادت آثارا! فقرہ در صحیفۂ گرامی اندراج یافت بود کہ "خدیونشأ تین"۔ ایں نعتیست کہ مخصوص بحضرت واجب الوجود است جل سلطانہٗ۔ مملوك لا يقدر على شيء، راچہ رسد کہ بوجہ از وجوہ بخداوند خود جل سلطانہٗ مشارکت جوید و در راہ خداوندی پوید علی الخصوص درنشأ خرد یہ کہ مالکیت و ملکیت چہ بطریق حقیقت و چہ بطریق مجاز مخصوص بحضرت مالك يوم الدين است۔ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ در روزِ قیامت ندا دہد لمن الملك اليوم و خود را در جواب آں فرماید۔ لله الواحد القهار عبادر ادراں روز غیراز ہول و دہشت متحقق نیست و جز حسرت و ندامت متصور نہ ❶۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

اے سعادت مند عزیز! آپ کے مکتوب گرامی کے ایک فقرے میں "خدیونشأ تین" مرقوم تھا (جس کے معنی دونوں جہان کے بادشاہ کے ہیں) یہ وہ نعت اور تعریف ہے جو صرف حضرت واجب الوجود اللہ جل شانہ کے لیے مخصوص ہے۔ بندۂ مملوک کو جو کسی شے پر قادر نہیں، کیا لائق ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے اور اختیارات خداوندی میں دخل انداز ہو۔ بالخصوص عالم آخرت میں کہ مالکیت و ملکیت کیا حقیقی اور کیا مجازی حضرت مالک یوم الدین کے لیے مخصوص ہے۔ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ قیامت کے دن پکارے گا۔ لمن الملك اليوم (آج کس کی بادشاہی ہے) اللہ تعالیٰ خود ہی اس کے جواب میں ارشاد فرمائے گا۔ لله الواحد القهار (صرف اللہ واحد قہار کے لیے بادشاہی ہے) اس روز بندوں پر خوف و دہشت کے سوا اور کسی چیز کا غلبہ نہ ہوگا اور حسرت و ندامت کے علاوہ اور کوئی شے تصور میں نہ آئے گی۔

زبان سے نماز کی نیت کے لفظ کہنا بدعت ہے:

بعض لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوتے وقت زبان سے نیت کے الفاظ کہتے ہیں۔ حضرت مجدد اس کی سخت نکیر کرتے اور اسے بدعت قرار دیتے ہیں۔ یہ بدعت عوام میں تو رائج ہے ہی، بعض علما بھی اسے مستحسن گردانتے ہیں۔ حضرت مجدد ایک مکتوب میں اس کو بدعت سے تعبیر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک ارادۂ قلب ہی اصل شے ہے۔ زبان سے الفاظ ادا کرنا قطعاً خلاف سنت ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

وہم چنیں است آنچہ علما در نیت نماز مستحسن داشتہ اند کہ با وجود ارادۂ قلب بزبان نیز باید گفت۔ وحال آں کہ ازاں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ ثابت نہ شدہ است، نہ بروایت صحیح و نہ بروایت ضعیف، و نہ از اصحاب

❶ مکتوبات دفتر اول، مکتوب نمبر ۴۷۔

Marfat.com

کرام و تابعین عظام کہ بزبان نیت کردہ باشند بلکہ چوں اقامت می گفتند تکبیر تحریمہ می فرمودند۔ پس نیت بزبان بدعت باشد وایں بدعت را حسنہ گفتہ اند، وایں فقیری داند کہ ایں بدعت چہ جائے رفع سنت کہ رفع فرض می نماید، چہ در تجویز آں اکثر مردم بزبان اکتفامی نمایند واز غفلت قلبی باک ندارند۔ پس دریں ضمن فرضے از فرائض نماز کہ نیت قلبی باشد متروک می گردد وبفساد نماز می رساند ❶۔

اب ذیل میں ان الفاظ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

اسی طرح وہ امر ہے جسے علما نے نماز کی نیت کے بارے میں مستحسن سمجھا ہے کہ باوجود ارادۂ قلبی کے زبان سے نیت کے الفاظ کہنا چاہیے۔ حالانکہ یہ رسول اللہ ﷺ سے کسی صحیح یا ضعیف روایت سے ثابت نہیں، نہ صحابہ کرام اور تابعین عظام سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ انھوں نے زبان سے نیت کی ہو۔ بلکہ جب وہ اقامت (قد قامت الصلوٰۃ) کہتے تھے تو صرف تکبیر تحریمہ ہی کہتے تھے۔ سو زبان سے نیت کرنا بدعت ہے۔ بعض لوگ اس کو بدعت حسنہ کہتے ہیں، یہ فقیر جانتا ہے کہ یہ وہ بدعت ہے جو رفع سنت تو رہا ایک طرف سرے سے فرض ہی کو رفع کر دیتی ہے۔ کیونکہ اس میں اکثر لوگ محض زبانی الفاظ پر اکتفا کرتے ہیں اور دل کی غفلت کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سے فرائض نماز میں سے ایک فرض جو نیت قلب ہے، متروک ہو جاتا ہے اور یہ معاملے کو نماز کے فاسد ہونے تک پہنچا دیتا ہے۔

بدعت کو بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ میں تقسیم کرنا غلط ہے:

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے بدعت کی شدید مخالفت کی ہے اور وہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ بدعت دو اقسام پر منقسم ہے۔ ایک بدعت حسنہ ہے اور ایک بدعت سیئہ۔ ان کے نزدیک بدعت کی ایک ہی تعریف اور ایک ہی قسم ہے اور وہ یہ ہے کہ دین کی ان حدود میں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے متعین کر دی ہیں اور ان احکام میں جو کتاب و سنت میں منقول ہیں، کسی ایسی نئی چیز کو داخل کر لینا، جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ بدعت کو بس بدعت ہی کہنا چاہیے۔ اس کو بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کے خانوں میں تقسیم کرنا قطعی طور سے غلط ہے۔ یہ بات انھوں نے متعدد مقامات پر نہایت تفصیل سے بیان کی ہے ❷۔

فاتحہ خلف الامام کے بارے میں:

حضرت مجدد کے طریق عمل اور اسلوب کلام سے عیاں ہے کہ وہ ظاہراً اور باطناً ہر لحاظ سے کتاب و سنت پر عامل تھے۔ اس کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہ کرتے تھے۔ مختلف فیہ مسائل میں وہ تشدد کے قائل نہ تھے،

❶ مکتوبات، دفتر اول مکتوب، ۱۸۶۔

❷ اس کے لیے دیکھیے مکتوبات دفتر دوم مکتوب ۲۳، ۵۴۔ دفتر اول، مکتوب ۱۸۴، ۲۶۰۔

Marfat.com

لیکن ان کا عمل ہمیشہ حدیث وسنت کے مطابق رہا۔ فاتحہ خلف الامام کے بھی قائل تھے۔ ''زبدۃ المقامات'' ان کے حالات میں اولیں تذکرہ ہے اور مستند ہے۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی اس کے مصنف ہیں جو ان کے مشہور خلیفہ تھے۔ اس کتاب کے بارے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ مجدد صاحب کی وفات کے تین سال بعد ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب میں فاتحہ خلف الامام سے متعلق مجدد صاحب کے مسلک کی خواجہ محمد ہاشم کشمی ان الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں:

ایں حقیر چوں می دید کہ دائم حضرت ایشاں بنفس نفیس امامت می کردند۔ روزے در خاطر گزشت کہ آیا لم آں چہ باشد؟ بدیں خاطر بملازمت مشرف شد، تقریب جمع مذاہب درمیان آوردہ۔ فرمودند شافعیہ و مالکیہ رحمہم اللہ برآنند کہ جز بقرأت فاتحہ نماز درست نیست لہٰذا خلف امام فاتحہ می خوانند واحادیث صحیحہ نیز دلالت بریں نماید۔ اما امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فاتحہ امام را فاتحہ ماموم گفتہ، ماموم را فاتحہ خلف امام تجویز نمی نماید و جمہور فقہائے حنفیہ بریںند۔ مگر بعضے روایات مرجوحہ از حنفیہ برجواز فاتحہ خلف امام آمدہ۔ چوں ما مہما امکن برجمع مذاہب می کوشم، دریں صورت جمع را دراں دیدہ ایم کہ خود امامت کنم [1]۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

اس حقیر نے جب یہ دیکھا کہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرائض امامت خود انجام دیتے ہیں تو ایک روز دل میں خیال گزرا کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا سوال پوچھا۔ جواب میں فرمایا، شافعیہ اور مالکیہ رحمہم اللہ کے نزدیک سورہ فاتحہ کے بغیر نماز درست نہیں ہے لہٰذا وہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے ہیں اور صحیح احادیث بھی اس پر دلالت کناں ہیں لیکن ہمارے امام، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام کی فاتحہ کو مقتدی کی فاتحہ قرار دیتے ہیں اور امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے اور جمہور فقہائے حنفیہ بھی اسی پر عامل ہیں۔ مگر احناف سے بعض مرجوحہ روایات فاتحہ خلف الامام کے جواز کے متعلق بھی موجود ہیں۔ تاہم جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم ممکن حد تک، تمام مذاہب فقہیہ میں عملی تطابق کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے اس معاملے میں ہمارے نزدیک جمع وتطابق کی یہی صورت ہے کہ خود فریضہ امامت انجام دیں۔

حضرت مجدد صاحب کے ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اختلافی مسائل میں قولاً وعملاً تشدد کے روادار نہ تھے اور مسئلے کے اسی پہلو کو ترجیح دیتے تھے جو کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہو۔

تصانیف:

حضرت مجدد الف ثانی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ذیل میں ان کی تصانیف کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا جاتا ہے:

[1] زبدۃ المقامات، ص ۱۹۷، ۱۹۸۔

Marfat.com

۱۔ اثبات النبوۃ: معلوم ہوتا ہے یہ ان کی سب سے قدیم تصنیف ہے، جسے ایک علمی رسالے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ رسالہ مسئلہ نبوت سے متعلق ابوالفضل سے ایک بحث کے نتیجے میں معرض تحریر میں لایا گیا تھا۔ تمہید کے علاوہ یہ رسالہ دو بحثوں پر محیط ہے۔ ایک بحث میں نبوت کے معنی و مطلب کی تحقیق کی گئی ہے اور دوسری میں معجزے کے بارے میں ضروری امور ضبط کتابت میں لائے گئے ہیں۔ بعد ازاں ایک مقالے میں بعثت، حقیقت نبوت، خاتم النبیین اور اثبات نبوت کا بیان ہے اور اس ضمن میں فلاسفہ کے نقطۂ فکر کی تردید ہے۔ کتاب کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ اکبر کے عہد میں مذہبی حالت کیا رخ اختیار کر گئی تھی اور اس باب میں وہ حد اعتدال سے کتنا آگے بڑھ گیا تھا۔

۲۔ رسالہ رد روافض: یہ رسالہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے شیعہ کی تردید و مخالفت میں ہے۔ اس کی وجہ تصنیف کے بارے میں شیخ محمد اکرام مرحوم لکھتے ہیں:

غالباً سفر لاہور کی یادگار ہے۔ یہ رسالہ اصل میں اس رسالے کا جواب ہے، جو علمائے شیعہ نے علمائے ماوراء النہر کو اس وقت بھیجا، جب عبداللہ خاں ازبک نے ۹۹۷ھ، (۱۵۸۹ء) میں مشہد کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ لیکن اس کی تصنیف کی فوری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں کئی شیعہ علمائے مشہد کے مضامین دہراتے اور امراو سلاطین کی مجلسوں میں انھیں بڑے فخر سے بیان کرتے۔

حضرت مجدد ان کی تردید کرتے، لیکن انھیں خیال ہوا کہ اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ سپرد قلم ہونا چاہیے تا کہ عوام الناس میں بھی غلط فہمیوں کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ وہ اس رسالے کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں:

بعضے از طلبہ شیعہ کہ متردد ایں حدود بودند، بایں مقدمات افتخار و مباہات می نمودند و در مجالس امراو سلاطین ایں مغالطات شہرت می دارند و ایں حقیر در ہر مجلس و معرکہ مشافہ بمقدمات معقولہ و منقولہ رد آنہا می کرد، و غلطیہائے صریحہ ایشاں را اطلاع می داد۔ اما حمیت اسلام و رگِ فاروقیم بایں قدر رد و الزام کفایت نمی کرد و شورش سینۂ بے کینہ تشفی نیافت و بخاطر فاتر قرار یافت کہ اظہار مفاسد ایشاں تا زمانے کہ در قید کتابت نہ آید...... نفع عام نہ بخشد۔

اس رسالے میں شیعوں کی نسبت وہی نقطۂ نظر ہے، جس سے مکتوبات امام ربانی اور مکتوبات خواجہ محمد معصوم کے پڑھنے والے واقف ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ کافر ہیں اور واجب القتل۔ یہ رسالہ (اثبات النبوۃ اور رسالہ تہلیلیہ کے برعکس جو عربی زبان میں ہیں) فارسی میں لکھا گیا، لیکن اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں کثرت سے روایات و احادیث دی ہیں جو عربی میں ہیں [1]۔

۳۔ رسالہ تہلیلیہ: یہ بیس بائیس صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے، جس کا تاریخی نام "معارف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہے۔ اس میں کلمہ طیبہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ بحث کا آغاز لا سے کیا ہے۔ اس کے

---

[1] رود کوثر ص ۲۴۳، ۲۴۴۔

Marfat.com

بعد لفظ اللہ کی حقیقت اور اس کے اشتقاق نحوی کے متعلق علما و مفسرین کے اقوال کی روشنی میں بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں لفظ اللہ کے لطائف، وحدانیت الٰہی کے دلائل اور کلمہ طیبہ کے فضائل بیان کیے ہیں۔ اس رسالے میں تصوف کا انداز نمایاں ہے۔

۴۔ رسالہ معارف لدنیہ: اس میں حضرت مجدد نے ثابت کیا ہے کہ شریعت اور طریقت میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ پھر ان صوفیا کی مخالفت و مذمت کی گئی ہے جو شریعت کے خلاف باتیں کرتے اور احکام شرعی کو غلط انداز سے ہدف تاویل ٹھہراتے ہیں۔ اس قسم کے ناقص علم اور خام فکر صوفیا پر اظہار تعجب اور تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وعجب است از بعضے درویشاں خام ناتمام کہ کشف خیالی خود را اعتبار نمودہ بانکار و مخالفت ایں شریعت باہرہ اقدام می نمایند۔ وحال آنکہ موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام بایں کلیمی وقرب اگر زندہ می بود، غیر از متابعت ایں شریعت امر دگر نمی مود۔

یعنی بعض خام علم اور ناقص فکر صوفیا پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالی کشف کو قابل اعتبار گردانتے اور شریعت مقدسہ محمدیہ ﷺ سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت محمدی کی صداقت کا یہ عالم ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ سے قرب کے باوصف اور کلیم اللہ ہونے کے باوجود شریعت محمدی کے اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ پاتے۔

۵۔ رسالہ مبدا و معاد: یہ رسالہ بعض صوفیانہ مسائل اور عبارات پر مشتمل ہے جو حضرت مجدد کے خلیفہ خواجہ محمد صدیق بدخشی نے ان کی بیاض سے جمع کیے۔ بعض مندرجات حضرت مجدد کی روحانی زندگی سے متعلق ہیں۔

۶۔ تعلیقات بر شرح رباعیات خواجہ باقی باللہ: یہ رسالہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی رباعیات کی خودنوشت شرح پر مجدد صاحب کے اضافوں کو محتوی ہے۔ یہ رباعیات وجود باری تعالیٰ اور قدم باری تعالیٰ ایسے دقیق مسئلے سے متعلق ہیں۔ مجدد صاحب نے حضرت خواجہ کے نقطۂ نظر کی روشنی میں اپنے اسلوب خاص میں اس کی وضاحت کی ہے۔

۷۔ تعلیقات عوارف: یہ کتاب ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔

۸۔ ارشاد المریدین: یہ کتاب بھی طبع نہیں ہوئی۔

۹۔ مکتوبات امام ربانی: حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات جو مکتوب امام ربانی کے نام سے موسوم ہیں، بہت شہرت کے حامل ہیں۔ سرزمین برصغیر میں جو قدر و منزلت اہل علم میں ان مکتوبات کو حاصل ہوئی، وہ تصوف کی اور کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔ ان کی ہمہ گیر مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ حضرت مجدد کی زندگی ہی میں ان کی نقلیں مرتب و مدوّن ہو کر ہندوستان کے مختلف شہروں اور اس سے باہر دیگر ممالک میں پھیل گئی تھیں۔ ان مکتوبات کی تین جلدیں ہیں اور ہر جلد دفتر کے نام سے موسوم ہے۔

Marfat.com

دفتر اول: یہ دفتر درّ المعرفت کے نام سے موسوم ہے اور ۳۱۳ مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ ان کو حضرت مجدد کے مرید خاص خواجہ یار محمد بدخشی نے جمع کیا۔ یہ دفتر حضرت کی زندگی ہی میں مرتب ہو گیا تھا۔ حضرت مجدد کو جب ان مکتوبات کی تعداد بتائی گئی تو فرمایا: حضرات صحابہ بدر رضی اللہ عنہم کی تعداد بھی ۳۱۳ ہے۔ لہٰذا تبرکاً و تیمناً اس دفتر کو اسی مبارک عدد پر ختم کر دیا جائے۔ یہ دفتر ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں یعنی قلعہ گوالیار میں محبوس ہونے سے تین سال پہلے جمع ہوا، اور سب مکتوبات سے مفصل ہے۔ اس میں بیس خطوط وہ ہیں جو انھوں نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ کو لکھے۔ کئی خطوط شیخ فرید اور جہاں گیر بادشاہ کے دوسرے امرا کے نام ہیں، جن میں ان کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ نئے بادشاہ (جہاں گیر) کے عہد میں ترویج دین کی کوشش کریں۔ کچھ خطوط مختلف سوالوں کے جواب میں ہیں یا بعض علمی اور دینی مسائل کے بارے میں ہیں۔

دفتر دوم: اس دفتر کا نام نور الخلائق ہے اور یہ تاریخی نام ہے جو ۱۰۲۸ھ بنتا ہے اور یہی اس کی جمع و تدوین کا سال ہے۔ اس میں ۹۹ مکتوبات ہیں۔ حضرت مجدد کے مرید خواجہ عبدالحی ابن خواجہ چاکر حصاری نے خواجہ محمد معصوم کے ایما سے جمع کیا۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی تعداد بھی ۹۹ ہے، لہٰذا اس دفتر کو تبرکاً اسی عدد پر ختم کیا گیا۔ ان خطوط میں بعض بڑے مفصل اور طویل ہیں۔ ایک خط جو خواجہ محمد تقی کے نام ہے، بیس سے زیادہ صفحات پر محیط ہے۔ اس میں اہل سنت اور شیعہ مسلک سے متعلق مدلل بحث اور اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایک خط خان جہاں کے نام ہے، جس میں عقائد اسلام تفصیل سے معرض تحریر میں لائے گئے۔

دفتر سوم: اس دفتر کا نام معرفت الحقائق ہے۔ پہلے یہ ۱۱۴ مکتوبات کا مجموعہ تھا۔ ان مکتوبات کے جامع حضرت مجدد کے مرید خواجہ محمد ہاشم کشمی برہان پوری ہیں۔ یہ مکتوبات ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۲ء میں حضرت مجدد کی وفات سے تین سال پیشتر جمع کیے گئے۔ قرآن مجید کی سورتوں کی نسبت سے یہ ۱۱۴ مکتوبات ہیں۔ پھر دفتر چہارم شروع ہوا، لیکن اس میں چودہ مکاتیب لکھے گئے تھے کہ حضرت کا انتقال ہو گیا۔ لہٰذا ان چودہ مکاتیب کو بھی شامل دفتر کیا گیا۔ اس حساب سے یہ ۱۲۸ مکتوبات ہونا چاہئیں تھے، مگر مطبوعہ نسخوں میں ۱۲۴ مکتوبات ہیں۔ چار مکتوب اس میں شامل نہیں۔ یہ اس زمانے کے مکتوب ہیں جب حضرت مجدد قلعہ گوالیار میں محبوس تھے یا لشکر شاہی کے ہمراہ تھے۔ ان میں ایک مکتوب بادشاہ جہاں گیر کے نام ہے، اس میں دعا کے اسرار اور علما و صلحا کی تعریف کی گئی ہے۔
ایک مکتوب ایک نیک خاتون کے نام ہے۔ اس میں وہ شرائط بیان کی گئی ہیں جو عورتوں کی بیعت کے سلسلے میں اسلام نے مقرر کی ہیں اور مروجہ بدعات کی تفصیلات بتائی گئی ہیں، جن میں ہندوستان کی بہت سی عورتیں مبتلا تھیں اور یہ وہ بدعات ہیں جو اب بھی مسلمان معاشرے میں موجود ہیں۔ مثلاً مرض چیچک اور بعض دیگر امراض کی صورت میں سیتلا دیوی کی منت ماننا، بزرگوں کی قبروں پر جانا، وہاں نذر و نیاز دینا اور جانور ذبح کرنا، پیروں کے نام کے روزے رکھنا، مختلف چیزوں کے شگون لینا، جادو ٹونا وغیرہ کو صحیح سمجھنا اور قابل عمل گردانتا، ان بدعات کا دائرہ شرک تک پھیلا ہوا ہے۔ حضرت مجدد ان کے شدید مخالف تھے۔

Marfat.com

مکتوبات کی علمی ہمہ گیری:

مکتوبات امام ربانی کو علم و فضل کے دلآویز مجموعے کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں تحقیقی، فقہی، تبلیغی ہر قسم کا مواد موجود ہے۔ اسلوب نگارش بڑا زوردار، موثر اور خطیبانہ ہے۔ حضرت مجدد باطل کی تردید اور اعلائے کلمۃ اللہ میں نہایت جری ہیں۔ خلاف شرع امور کی پورے زور اور جوش سے تردید کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ ایک مکتوب کی چند سطور سے ہوسکتا ہے جو انھوں نے ملاحسن کشمیری کے نام تحریر فرمایا۔ لکھتے ہیں:

نوشتہ بودند کہ شیخ عبدالکبیر یمنی گفتہ است کہ حق سبحانہ وتعالیٰ عالم الغیب نیست۔ بے اختیار رگ فاروقیم در حرکت می آید وفرصت تاویل وتوجیہ نمی دہد۔ قائل ایں سخنان شیخ کبیر یمنی باشد یا شیخ اکبر شامی، کلام محمد علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام درکار است، نہ کلام محی الدین ابن عربی وصدرالدین قونیوی وعبدالرزاق کاشی۔ مارا بہ نص کاراست، نہ بہ فص۔ مارا فتوحات مدنیہ از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ است۔

یعنی لکھا گیا ہے کہ شیخ عبدالکبیر یمنی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب نہیں ہے۔ اس بات سے میری رگ فاروقی بے اختیار حرکت میں آ گئی اور اس نے تعبیر وتوجیہ کا کوئی موقع باقی نہ رہنے دیا۔ اس قسم کی باتیں کہنے والا شیخ کبیر یمنی ہو یا شیخ اکبر شامی، ہمارے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہمیں صرف حضرت محمد ﷺ کے کلام سے تعلق ہے۔ محی الدین عربی، صدرالدین قونیوی اور عبدالرزاق کاشی کے کلام کو ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ہمیں نص سے غرض ہے، نہ کہ فص (فصوص الحکم) سے۔ ہم کو فتوحات مدنیہ (حدیث) نے فتوحات مکیہ (ابن عربی کی کتاب) سے قطعی بے نیاز کر دیا ہے۔

اندازہ کیجیے یہ الفاظ حقیقت وصداقت، جذبہ وجوش اور تاثیر وخطابت کے لحاظ سے کتنے زوردار ہیں۔

تجدید دین:

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تجدید دین کا کیا مطلب ہے اور اسلام میں مجدد کا تصور کیا ہے؟ ابوداود میں ایک حدیث ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علیٰ رأس کل مائۃ من یجدد لھا امر دینھا[1]۔

(اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر صدی میں ایسا شخص پیدا کرے گا جو دین کی تجدید کرے گا۔)

یعنی امت محمدیہ میں اللہ تعالیٰ ہر صدی میں ایسا شخص پیدا کرتا رہے گا جو لوگوں کو مختلف برائیوں کے ارتکاب سے روکنے، بدعات ومحدثات سے دامن کشاں رہنے اور نیکی کے پھیلانے کی تلقین کرے گا۔ کہا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل اکابر دین اپنے اپنے زمانے کے مجدد و مصلح تھے:

---

[1] ابوداود، آخر کتاب المھدی اول کتاب الملاحم۔ باب مایذکر فی قرن المائۃ۔

Marfat.com

عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱ھ) پہلی صدی ہجری کے، امام شافعی یعنی محمد بن ادریس (۲۰۴ھ) دوسری صدی ہجری کے، ابن شریح (۳۰۶ھ) تیسری صدی ہجری کے، امام باقلانی احمد بن طیب (۴۰۳ھ) یا امام اسفرائنی احمد بن محمد (۴۰۶ھ) چوتھی صدی کے، امام غزالی (۵۰۵ھ)، پانچویں صدی ہجری کے، امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) چھٹی صدی ہجری کے، ابن دقیق العید (۷۰۲ھ) ساتویں صدی ہجری کے، امام بلقینی سراج الدین (۸۰۵ھ) آٹھویں صدی ہجری کے، جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) نویں صدی ہجری کے مجدد تھے۔ شیخ احمد سرہندی فاروقی کو دسویں صدی ہجری کے مجدد (مجدد الف ثانی) کہا جاتا ہے۔

تجدید دین کے بارے میں علمائے کرام نے مختلف کتابوں میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ زمانے کے حالات کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر دور، ہر ملک اور ہر علاقے میں ایسے مصلحین پیدا کرتا ہے جو اس دور کی گمراہیوں کی نشان دہی کرتے اور لوگوں کو ان سے روکتے ہیں۔ ان کی تعداد ایک یا ایک سے زائد ہو سکتی ہے اور ان کا نہج تبلیغ اور طریق تجدید وقت و ماحول کے مطابق الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ مجدد دین اور مصلحین صدی کے شروع یا آخر ہی میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ جب گمراہیوں کا زور بڑھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے حالات کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔ اس قسم کے اونچے کردار کے حامل حضرات صدی کے شروع میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور صدی کے وسط میں بھی۔ یعنی جب وقت کا تقاضا انھیں آواز دیتا ہے، وہ میدان عمل میں اتر آتے اور فرائض تبلیغ انجام دینے پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں [1]۔

وفات:

حضرت مجدد الف ثانی نے تریسٹھ سال عمر پا کر بروز سہ شنبہ ۲۸ر صفر ۱۰۳۴ھ/۳۰ر نومبر ۱۶۲۴ء کو سرہند میں وفات پائی۔ نماز جنازہ ان کے صاحب زادۂ گرامی خواجہ محمد سعید نے پڑھائی، جو زبدۃ المقامات کے مصنف خواجہ محمد ہاشم کشمی کے بقول ''افقہ فقہائے وقت'' تھے۔ زبدۃ المقامات میں مرقوم ہے کہ خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد گرامی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کی، جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں:

حضرت مخدوم زادۂ بزرگ خواجہ محمد سعید دامت برکاتہ نماز جنازہ پیر و پدر بزرگ وار خود رضی اللہ عنہ نمودند و بعد از نماز برائے دعا توقف نفرمودند کہ مقتضی سنت چنیں نیست و در کتب فقہ معتبرہ مرقوم است کہ بعد از نماز جنازہ ایستادہ دعا کردن مکروہ است، ہر چند کہ عمل بعضے امام دریں ایام چنیں است [2]۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے عون المعبود شرح ابوداؤد، ج ۴، ص ۱۷۸ تا ۱۸۲۔

[2] زبدۃ المقامات، ص ۲۹۴۔

Marfat.com

حضرت مخدوم زادہ خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ نے اپنے مرشد و پدر بزرگ وار رحمتہ اللہ علیہ کی نماز جنازہ پڑھائی اور نماز کے بعد دعا کے لیے نہیں ٹھہرے، کیوں کہ یہ دعا خلاف سنت ہے اور فقہ کی مستند کتابوں میں لکھا ہے کہ نماز جنازہ کے بعد کھڑے ہو کر دعا کرنا مکروہ ہے۔ تاہم بعض ائمہ مساجد ان دنوں بھی اس (خلاف سنت) فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔

۴۱۔ شیخ اسد اللہ ہرگامی

شیخ اسد اللہ بن اسماعیل بن حضر علوی حسینی ہرگامی، ۹۹۴ھ/ ۱۵۸۶ء کو ہرگام میں پیدا ہوئے جو اعمال خیر آباد میں ایک خاصا بڑا گاؤں تھا۔ ان کے والد مولانا مفتی اسماعیل ہرگامی مشہور عالم تھے، ان ہی سے تعلیم پائی۔ علم فقہ بھی ان ہی سے حاصل کیا۔ حنفی المسلک تھے۔ اس دور کے علمائے صالحین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تصوف وطریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ تمام عمر درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں صرف کر دی۔ ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء کو ہرگام میں فوت ہوئے اور جلالی پور نامی ایک قریہ میں دفن کیے گئے ❶۔

۴۲۔ مفتی اسماعیل ہرگامی

مفتی اسماعیل بن خضر علوی حسینی ہرگامی، ۹۴۵ھ/ ۱۵۳۸ء کو ہرگام میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو ونما پائی اور اپنے والد شیخ خضر ہرگامی سے علم حاصل کیا، جو اس عہد کے علمائے دین میں سے تھے۔ دیگر اساتذہ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ حتیٰ کہ دیار ہند کے بہت بڑے عالم، شیخ، فقیہ، اصولی اور علوم عربیہ کے ماہر گردانے گئے۔ ان کے بیٹے شیخ اسد اللہ ہرگامی نے شیخ عبدالسمیع بن عبدالرحمٰن عباسی لاہرپوری سے اخذ طریقت کیا۔ مفتی اسماعیل ہرگامی بھی شیخ عبدالسمیع سے مستفیض ہوئے۔ شیخ عبدالسمیع ان کے بھانجے ہوتے تھے اور اس زمانے کے معروف صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ان کے علاوہ شیخ عبدالقدوس بن عبدالسلام جون پوری سے بھی استفادہ کیا۔ عمر بھر اپنے گاؤں ہرگام کی مسند افتا پر فائز رہے اور درس و افادہ اور ذکر الٰہی میں زندگی بسر کر دی۔ اس عالم وفقیہ نے ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء میں وفات پائی اور اس نواح کے ایک قریہ اسمٰعیل پور میں دفن کیے گئے ❷۔

۴۳۔ شیخ اسماعیل بن محمود سندھی

شیخ اسماعیل بن محمود سندھی کی کنیت ابوالفرج اور لقب سراج الدین تھا۔ ابوالفرج سراج الدین برہان

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷۔

Marfat.com

پوری کے نام سے معروف تھے۔ بہت بڑے صوفی، صالح عالم دین اور فقیہ نام دار تھے۔ صغر سنی ہی میں مشہور صاحب طریقت وتصوف شیخ عیسیٰ بن قاسم سے لزوم اختیار کر لیا تھا اور اس میں کامل دلچسپی رکھتے تھے۔ شیخ اسماعیل نے ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۸ء کو برہان پور میں فارسی زبان میں ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام مخزن الدعوات رکھا۔ یہ کتاب اس مواد پر مشتمل ہے جو انھیں اپنے شیخ سے حاصل ہوا۔ کتاب دعوتی انداز کی ہے ❶۔

۴۴۔ شیخ اسماعیل لاہوری

شیخ اسماعیل بن فتح اللہ بن عبداللہ بن فیروز لاہوری، جلال الدین اکبر کے عہد میں پیدا ہوئے۔ کھوکھر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پانچ سال کی عمر کو پہنچے تو مرض طاعون میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے والد فتح اللہ نے اسی حالت میں ان کو شیخ عبدالکریم لاہوری کے سپرد کر دیا۔ بڑے ہوئے تو حصول علم میں لگ گئے اور تمام درسی کتابیں مکمل کر لیں۔ یہاں تک کہ عالم کبیر اور محدث وقت مانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور سے دس میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے ایک گاؤں کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا اور وہاں درس وافادہ میں مشغول ہو گئے تھے۔ طویل مدت تک وہاں مقیم رہے۔ پھر لاہور منتقل ہو گئے۔

لاہور کے اس عالم دین کا حلقہ درس بڑا وسیع تھا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ عبدالحمید لاہوری، شیخ تیمور لاہوری، شیخ جان محمد لاہوری اور خلق کثیر شامل ہے۔ ۵ر شوال ۱۰۸۵ھ/ ۲۳ر دسمبر ۱۶۷۴ء کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

۴۵۔ اسماعیل محدث بیجاپوری

شیخ اسماعیل محدث بیجاپوری، شیخ شمس الدین محمد ملتانی بدری کی اولاد سے تھے اور اپنے عہد کے عالم کبیر تھے۔ حدیث اور فقہ میں شہرت رکھتے تھے۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ کے دور حکومت کے بزرگ تھے اور اس کے زمانے میں بیجاپور کے منصب درس وتدریس پر فائز تھے۔ ان کی وفات بھی بیجاپور میں ہوئی اور دفن بھی اسی شہر میں کیے گئے ❸۔

۴۶۔ شیخ افضل محمد اکبر آبادی

شیخ افضل محمد بن یوسف بن عبداللہ تمیمی انصاری اکبر آبادی، فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۷۲۔

❷ خزینۃ الاصفیا۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۷۲۔

❸ روضۃ الاولیا۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۷۳۔

Marfat.com

سے تھے۔ ان کے والد شیخ یوسف بھی نامور عالم تھے۔ شیخ افضل محمد نے کتب فقہ اپنے والد سے پڑھیں اور علم طریقت بھی ان ہی سے حاصل کیا۔ بعض کتب درسیہ اپنے عم محترم جلال الدین سے پڑھیں۔ ان کی وفات کے بعد مفتی ابوالفتح عبدالغفور تھانیسری، قاضی جلال الدین ملتانی اور ملا مبارک ناگوری کی خدمت میں گئے اور ان سے حصول علم کیا۔ قاضی عیاض کی شفا، شیخ جعفر حسینی سے پڑھی۔ بعد ازاں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ نہایت قانع، عفیف و متوکل علی اللہ اور مستغنی المزاج عالم دین تھے۔ ۲۱/ صفر ۱۰۰۳ھ/ ۲۶/ اکتوبر ۱۵۹۴ء کو اکبر آباد (آگرہ) میں انتقال کیا اور وہیں تدفین ہوئی❶۔

۴۷۔ قاضی اللہ داد❷ بلگرامی

قاضی اللہ داد حنفی بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ قاسم❸ بن محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ عمر کی چند منزلیں طے کیں تو حصول علم کے لیے مختلف اساتذہ کی خدمت میں گئے۔ کتب درسیہ شیخ عبدالرحمٰن عباسی لاہر پوری سے پڑھیں۔ جب فقہ اور اصول وغیرہ میں مہارت پیدا ہو گئی، تو واپس بلگرام تشریف لے گئے اور مسند تدریس کو زینت بخشی۔ ان کا شمار معروف فقہائے وقت اور مشہور فضلائے عصر میں ہوتا تھا۔ شیوخ فرشوریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ فرشوری خاندان بلگرام اور اس کے گردونواح میں پھیلا ہوا تھا اور اس کے افراد عہد قدیم سے مختلف مناصب شرعیہ اور عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ اپنی علمی برتری اور تدین و تقویٰ کی وجہ سے شہر بلگرام اور دیگر علاقوں میں دودمان فرشوری کو نہایت احترام و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بلگرام میں یہ حضرات محلہ سید دائرہ میں سکونت پذیر تھے۔ ان میں قاضی اللہ داد بلگرامی معقولات و منقولات میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے یہ عالم و فقیہ بلگرام کی مسند تدریس پر بھی فائز تھے اور عدل و قضا اور افتا کا منصب بھی ان کے پاس تھا۔ تہذیب المنطق پر ان کی تعلیقات و حواشی ہیں❹۔

۴۸۔ مولانا اللہ داد سلطان پوری

مولانا اللہ داد سلطان پوری، درحقیقت علاقہ سندھ کے ایک قریہ ''نبودہ'' سے تعلق رکھتے تھے۔ مشرقی

❶ اذکار ابرار، ص ۴۲۵، ۴۲۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۳، ۴۷۔

❷ عربی اور فارسی تذکرہ نگاروں نے اسے الہداد لکھا ہے۔ لیکن ہم اللہ داد لکھیں گے، کیوں کہ اصل لفظ اللہ داد ہی معلوم ہوتا ہے۔

❸ حضرت قاسم رحمہ اللہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے۔ مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں سے تھے اور مشہور تابعی تھے۔ ۱۰۷ھ میں فوت ہوئے۔

❹ مآثر الکرام ص ۲۱۸، ۲۱۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۸۲، ۸۳۔

Marfat.com

پنجاب کی سابق ریاست کپورتھلہ کے ایک مقام سلطان پور میں پیدا ہوئے اور وہاں کے مشہور عالم دین مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری سے تحصیل علم کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سلطان پور ہی میں درس وافتا کی مسند آراستہ کی۔ منقول ہے کہ تصنیف وتالیف کا بھی شوق رکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے فقیہ، شیخ اور عالم دین تھے۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں کافی عرصہ پنجاب کی مسند صدارت پر متمکن رہے۔ بعدازاں الہ آباد میں قاضی مقرر کر دیے گئے تھے۔

مولانا اللہ داد سلطان پوری ملا عبدالقادر بدایونی کے معاصر تھے۔ وہ منتخب التواریخ میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شرافت اور حسب ونسب میں نہایت ممتاز اور سربرآوردہ ہیں۔ ابتدا میں علم کے غرور اور جوانی کی ترنگ میں انتہائی متکبر ومغرور تھے، لیکن اب دنیا کا کافی تجربہ ہو چکا ہے اور غرور وتکبر، فقر وانکسار میں بدل گیا ہے۔ کچھ عرصہ پنجاب کی صدارت کے عہدے پر فائز رہے۔ اب کافی عرصے سے الہ آباد کے نئے شہر کی قضاءت کے منصب پر مامور ہیں، لیکن بادشاہ کی خدمت ہی میں رہتے ہیں۔ الہ آباد میں جو معمولی سی معاش ملی ہے، اس پر قانع ہیں۔ دنیا داروں کے دروازوں پر دستک نہیں دیتے۔ بڑے نیک اور عبادت گزار ہیں۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے لیکن ان کی تصنیفات میں سے نام صرف کشف الغمہ ومنہاج الدین کا لکھا ہے۔ ۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۸ء میں فوت ہوئے ❶۔

۴۹۔ شیخ امین بن احمد نہروالی

شیخ امین بن احمد نہروالی گجراتی رفیع القدر عالم اور جلیل القدر محدث تھے۔ وسعت علم وفضل میں یگانہ روزگار تھے۔ صاحب مجمع البحار شیخ محمد بن طاہر پٹنی کے شاگرد تھے۔ اخذ حدیث ان ہی سے کیا تھا۔ گلزار ابرار کے مصنف شیخ محمد غوثی مانڈوی لکھتے ہیں کہ ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء میں مانڈو گئے، وہاں ایک سال قیام پذیر رہے۔ بعدازاں اجین تشریف لے گئے۔ وہاں مختلف شیوخ سے ملے، اجین میں ان کا قیام علمی اعتبار سے بہت مفید رہا۔ اس شہر میں انھوں نے درس وافادہ کا سلسلہ جاری کیا اور نہایت قناعت وعفاف اور زہد وعبادت کے ساتھ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان سے تشنگان علوم کی بہت بڑی تعداد نے استفادہ کیا۔ اجین سے قاضی عبدالعزیز بن عبدالکریم بن راجی محمد اجینی گجراتی سے ملاقات کے لیے برہان پور گئے۔ وہیں یکم ربیع الاول ۱۰۱۷ھ/ ۵ رجون ۱۶۰۸ء کو وفات پائی۔ تدفین بھی وہیں ہوئی ❷۔

---

❶ منتخب التواریخ۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۸۶۔

❷ اذکار ابرار، ص ۴۸۳، ۴۸۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۸۳۔

Marfat.com

ـــ ب ـــ

۵۰۔ شیخ بابو بن شیخ جیو گجراتی

شیخ بابو بن شیخ جیو حسینی بخاری پٹنی گجراتی، ارض گجرات کے مشہور شہر پٹن میں پیدا ہوئے اور اساتذۂ عصر سے علم حاصل کیا۔ فراغت کے بعد درس وافادہ میں مصروف ہو گئے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ عالم وفقیہ، زاہد وعابد، صاحب فضل وکمال اور علاقہ گجرات کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ ان کے درس و تدریس کا غلغلہ عرصے تک سرزمین گجرات میں بلند ہوتا رہا اور تشنگان علوم ان کے چشمہ علم سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ انھوں نے ۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۸ء میں وفات پائی ❶۔

۵۱۔ شیخ بایزید انصاری سہارن پوری

شیخ بایزید بن بدیع الدین بن رفیع الدین انصاری سہارن پوری، سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ وہیں اپنے والد شیخ بدیع الدین کی خدمت میں تعلیم وتربیت کی منزلیں طے کیں۔ پھر عازم سرہند ہوئے، وہاں شیخ محمد معصوم سرہندی سے اخذ طریقت بھی کیا اور دیگر علوم کی بھی تحصیل کی۔ طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے تا آنکہ مختلف علوم ظاہری اور معرفت وسلوک میں حصہ وافر حاصل کیا۔ شیخ محمد معصوم نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا تھا۔ سرہند سے واپس سہارن پور گئے اور دعوت وارشاد اور درس وتدریس کو مشغلہ قرار دے لیا۔ جلیل القدر عالم، فقیہ، متدین، عفیف النفس، متوکل علی اللہ، کامیاب مدرس، صحیح الفکر مصلح وقت تھے۔ ان سے بہت سے نامور علما نے استفادہ کیا۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ کس مہینے کی کس تاریخ کو وفات پائی۔ البتہ تذکروں میں مذکور ہے کہ سوموار کے دن ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۹ء میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ جائے وفات سہارن پور ہے ❷۔

۵۲۔ شیخ بایزید بلگرامی

شیخ بایزید بن کمال الدین بن عبدالدائم عثمانی بلگرامی حنفی المسلک تھے۔ جید عالم دین، فقہ اور اصول فقہ کے ماہر تھے۔ اصول بزدوی پر چوں کہ گہری نظر رکھتے تھے، لہٰذا بزدوی دان (یعنی عالم بزدوی) کے عرف

❶ اذکار ابرار، ص ۴۴۱، ۴۴۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۸۷، ۸۸۔

❷ مولوی رحمان علی نے تذکرۂ علمائے ہند میں انھیں شیخ بایزید برہان پوری لکھا ہے۔ الفاظ یہ ہیں: ''شیخ بایزید برہان پوری عالم متورع وفاضل متشرع بود۔ خرقہ خلافت از شیخ محمد معصوم سرہندی قدس سرہ داشت'' (ص ۲۶۲)۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۸۸۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۷۔

Marfat.com

سے معروف تھے۔ تمام عمر درس وافادہ میں صرف کر دی۔ ان کے عصر اور شہر میں ان کے پایہ کا کوئی عالم نہ تھا۔ تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا، البتہ ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء کے بعد زندہ تھے ❶۔

۵۳۔ شیخ بدرالدین سرہندی

شیخ بدرالدین بن ابراہیم سرہندی مسلکاً حنفی تھے۔ مشرقی پنجاب کے مشہور شہر سرہند میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اور ان کے فرزند گرامی شیخ محمد صادق سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی قابل ذکر تصنیف حضرات القدس ہے۔ اس میں اپنی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میں نے شرح المواقف، تفسیر بیضاوی، عضدیہ مع حاشیہ سید شریف جرجانی مجدد الف ثانی سے پڑھیں اور شرح عقائد مع حاشیہ خیالی، تحریر اقلیدس اور شرح المطالع مع سید شریف شیخ محمد صادق سے پڑھیں۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں سترہ سال شیخ محمد سرہندی مجدد الف ثانی کی خدمت میں رہا۔ اس اثنا میں ان سے اخذ طریقت کیا اور بہت سے فیوض حاصل کیے۔

شیخ بدرالدین کی تصنیف حضرات القدس دو جلدوں میں ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے، جن میں ایک سنوات الاتقیا ہے، جو مشائخ کے حالات وسوانح پر مشتمل ہے۔ ایک الروائح ہے جو اصطلاحات صوفیہ کی شرح اور بزرگان نقشبندیہ قادریہ کے اشغال واذکار سے متعلق ہے۔ دوسری تصانیف یہ ہیں: کرامات الاولیا، مجمع الاولیا، ترجمہ فتوح الغیب از شیخ عبدالقادر جیلانی، ترجمہ بہجۃ الاسرار ترجمہ روضۃ النواظر فی ترجمہ شیخ عبدالقادر۔ یہ ترجمہ انھوں نے دارشکوہ کے کہنے سے کیا۔ ترجمہ عرائس البیان، تفسیر روز بیان العقلی ❷۔

۵۴۔ قاضی بدرالدین صدیقی بدایونی

قاضی بدرالدین صدیقی بدایونی، شیخ وقت اور عالم وفقیہ تھے۔ ان کا شمار علوم عربیہ اور فقہ واصول فقہ کے جید علما میں ہوتا تھا۔ شاہ جہان کے عہد میں بدایوں کی مسند قضا پر فائز ہوئے اور عمر بھر اس پر فائز رہے۔ تبحر علمی میں ضرب المثل تھے۔ ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء کو وفات پائی۔ قاضی علی محمد بدایونی نے ''قد حسف بدری'' سے تاریخ وفات نکالی ❸۔

۵۵۔ شیخ برہان الدین برہان پوری

شیخ برہان الدین برہان پوری علاقہ خاندیس کے ایک قریہ میں پیدا ہوئے، جس کا نام ''معمولی'' تھا۔ پرورش بھی برہان پور میں ہوئی۔ والد کی طرف سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور والدہ کی طرف سے حضرت

❶ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۸۸، ۸۹، بحوالہ شرائف عثمانی۔

❷ حضرات القدس۔ تذکرہ علمائے ہند، ص۲۶۲۔ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۹۰۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۹۰۔

Marfat.com

حسین ؒ کی اولاد سے تھے۔ والدہ کا اسم گرامی فاطمہ تھا۔ نیکی اور تدین و تقویٰ کے ماحول میں تربیت پائی، کھانے پینے اور لباس کے معاملے میں اعتدال و اقتصاد کا عمدہ نمونہ تھے۔ اس دور کے بزرگ شیخ عیسیٰ بن قاسم شطاری کے زاویہ میں فروکش تھے اور فقرا اور اہل اللہ کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ علم و فضل کی مختلف شاخوں پر عبور رکھتے تھے، لیکن تصوف و طریقت اور ارشاد و تلقین کو شب و روز کا معمول قرار دے لیا تھا۔ امرا و سلاطین سے میل جول اور تعلقات قائم کرنے سے گریزاں رہتے، بلکہ اہل دولت اور ارباب حکومت میں سے کوئی ان کے پاس آتا تو عام طور پر ملنے سے انکار کر دیتے۔

خافی خاں منتخب اللباب میں لکھتا ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالم گیر جب اپنے بڑے بھائی داراشکوہ سے لڑائی کے لیے آگرہ کی طرف روانہ ہوا تو ہیئت بدل کر اچانک شیخ برہان الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کو ہیئت بدلنے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ شیخ ملوک و سلاطین سے ملنا پسند نہ کرتے تھے۔ شیخ نے پوچھا ”آپ کا نام کیا ہے؟“ کہا: ”اورنگ زیب!“۔ شیخ خاموش ہو گئے، اور بادشاہ کی طرف بالکل عنان توجہ مبذول نہ فرمائی۔ بادشاہ نے اپنی طرف سے شیخ کا یہ عدم التفات دیکھا تو اٹھ کر چلا گیا۔ دوسرے روز پھر آیا، شیخ نے فرمایا۔ ”اگر تمھیں یہ خانقاہ پسند آ گئی ہے تو میں اسے تیرے لیے خالی کر دیتا ہوں اور اپنے لیے کوئی اور جگہ تلاش کر لیتا ہوں۔“

شیخ کی یہ بات سن کر اورنگ زیب باہر نکل گیا اور ایک خادم جس کو شیخ اچھا سمجھتے تھے، بادشاہ کے پیچھے گیا اور اسے اشارے سے سمجھایا کہ ”جب شیخ نماز کے لیے اپنے حجرے سے باہر نکلیں تو حاضر خدمت ہو کر یہ عرض کرو کہ میں دعا کے لیے حاضر ہوا ہوں اور فاتحہ رخصت کا طالب ہوں۔“ چنانچہ نماز کے وقت بادشاہ حاضر ہوا اور عرض گزار ہوا کہ ”میرا بھائی داراشکوہ احکام شریعت اور دین اسلام سے روگرداں ہو گیا ہے اور میں اس سے لڑائی کی غرض سے نکلا ہوں اور دعائے خیر اور فاتحہ رخصت کا طلب گار ہوں۔“

بادشاہ کی یہ عرض سن کر شیخ نے فرمایا:

از فاتحہ ما فقیران کم اعتبار چہ می شود؟ شما کہ بادشاہ ہید بنیت عدالت و رعیت پروری فاتحہ بخوانید، ما ہم دست بر میدارم۔

یعنی ہم ادنیٰ درجے کے فقیر لوگ ہیں، ہمارے فاتحہ پڑھنے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ بادشاہ ہیں جو عدل و انصاف اور رعیت پروری کی غرض سے نکلے ہیں۔ آپ فاتحہ پڑھیں، ہم بھی آپ کے پیچھے ہاتھ اٹھائیں گے۔

نظام الدین برہان پوری نے شیخ کے اس فرمان کو عالم گیر کے لیے کامیابی کی خوش خبری سے تعبیر کیا اور کہا یہ آپ کے لیے فتح کی نوید ہے۔

عاقل خاں رازی (مؤلف واقعات عالم گیری) شیخ کے معتقد و مرید تھے، انھوں نے ان کے ملفوظات، ثمرات الحیات کے نام سے جمع کیے ہیں۔ ایک اور بزرگ نے ان کے ملفوظات و ارشادات کا مجموعہ

Marfat.com

مرتب کیا ہے، جس کا نام روائح الانفاس ہے

شیخ برہان الدن برہان پوری تصنیفی ذوق بھی رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں شرح اسماء اللہ الحسنی اور شرح امنت باللہ شامل ہیں۔ اس عالم وفقیہ نے ۸۰ سال سے زائد عمر پا کر ۱۰ر شعبان ۱۰۸۳ھ/ ۲۱ر نومبر ۱۶۷۲ء کو برہان پور میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

منتخب الباب کے منصف خافی خان کے بقول شیخ برہان الدین کا انتقال عالم گیر کے تیسویں سال جلوس میں ہوا۔ اس حساب سے سن ہجری ۱۰۸۹ھ/ ۱۶۷۸ء بنتا ہے۔

۵۶۔ شیخ بلال لاہوری

شیخ بلال بن عبداللہ حنفی قادری لاہوری، اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ معروف فقیہ اور زاہد وعابد بزرگ تھے۔ تصوف وطریقت میں شیخ شمس الدین لاہوری سے فیض یافتہ تھے۔ ارشاد وتلقین کی مسند پر فائز تھے۔ ان کی نیکی اور عبادت وزہد کی اثر پذیری کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ ہندشاہ جہان ایک سے زیادہ مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لاہور کے اس فقیہ نام دار نے ستر برس عمر پا کر ۲۸ر شعبان ۱۰۴۶ھ/ ۱۵ر جنوری ۱۶۳۶ء کو لاہور میں انتقال کیا ❷۔

۵۷۔ شیخ بہلول دہلوی

شیخ بہلول دہلوی دراصل شکار پور کے رہنے والے تھے، وہاں سے دہلی آئے اور مفتی جمال الدین دہلوی سے اخذ علم کیا۔ پھر گجرات گئے، وہاں کے مشہور اساتذہ شیخ عبداللہ بن سعد اللہ اور شیخ رحمت اللہ بن قاضی عبداللہ سے علم حدیث کی تحصیل کی اور طویل عرصہ ان کی صحبت میں رہے۔ گجرات سے پھر عازم دہلی ہوئے اور شیخ قمیص بن ابوالحیات ساڈھوروی سے کسب فیض کیا اور بعد ازاں درس وافادہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ عالم کبیر، محدث وقت اور مشہور فقیہ تھے۔ تفسیر اور حدیث پر گہری نظر رکھتے تھے۔ زہد وتعبد اور صلاح عمل میں ضرب المثل تھے۔

منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کے علم وفضل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علم حدیث میں بہت اشتغال اور مہارت رکھتے تھے، درس وافادہ میں مصروف رہتے تھے، ذوق معرفت وطریقت

❶ منتخب اللباب، ج ۲، ص ۵۵۳ تا ۵۵۵۔ مرآۃ العالم (قلمی) ورق ۳۵۴ ب۔ تاریخ برہان پور، ص ۱۴۰ تا ۱۴۲۔ مآثر الامرا، ج ۲۔ ''معارف'' (اعظم گڑھ) مئی 1951۔ احوال و آثار عبداللہ خویشگی، ص ۴۹، ۵۰۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۴۳ تا ۴۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۱، ۹۲۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۳۔ عمل صالح، ج ۳، ص ۳۶۶، ۳۶۷۔

Marfat.com

میں بے مثل تھے اور دنیا اور اہل دنیا سے بے نیاز تھے۔ چوں کہ مستقل طور پر دہلی کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا، لہٰذا دہلوی مشہور ہوئے۔

اس عالم دین اور گیارھویں صدی ہجری کے ہندی فقیہ نے ۱۴/ رجب ۱۰۰۷ھ/ ۳۱/ جنوری ۱۵۹۹ء کو دہلی میں وفات پائی❶۔

— پ —

۵۸۔ شیخ پیر محمد سلونی

شیخ پیر محمد کا سلسلہ نسب یہ ہے: پیر محمد بن عبدالغنی بن ابوالفتح بن اللہ داد بن من اللہ بن بہاء الدین عمری جون پوری سلونی۔ شیخ پیر محمد سلونی مشہور مشائخ ہند میں سے تھے۔ ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء کو سلون میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم کی غرض سے مانک پور کا سفر کیا اور اس کے لیے اپنی تمام مساعی وقف کر دیں، یہاں تک کہ بحث و اشتغال میں اونچے درجے کو پہنچے۔ قیام مانک پور کے زمانے میں ایک روز اپنے مدرسے کو جا رہے تھے کہ راستے میں شیخ عبدالکریم بن سلطان مانک پوری سے ملاقات ہوئی۔ شیخ عبدالکریم نے پوچھا: ”کون سی کتابیں پڑھتے ہو؟“ کہا: ”ہدایۃ الفقہ اور تفسیر بیضاوی۔“ شیخ نے فرمایا: ”میرے پاس آ جاؤ، جو چاہو گے میں تمھیں پڑھاؤں گا۔“ لیکن پیر محمد سلونی چونکہ شیخ عبدالکریم کے مرتبہ علم اور مذہب و مشرب سے واقف نہ تھے، لہٰذا ان کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور سیدھے مدرسے چلے گئے۔ استاذ کی خدمت میں پہنچے اور درس کے لیے ان کے حضور دو زانو ہو کر بیٹھے تو نہ شاگرد پڑھنے پر قادر ہو سکا اور نہ استاذ پڑھانے پر۔ استاذ کو اس غیر متوقع صورت حال سے بڑا تعجب ہوا اور شاگرد سے اس کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے وہ واقعہ بیان کیا جو ان کے اور شیخ عبدالکریم کے درمیان پیش آیا تھا۔ اب استاد نے شاگرد کو ساتھ لیا، شیخ عبدالکریم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے معذرت و عفو کی درخواست کی۔ بعد ازاں پیر محمد سلونی، چھ مہینے شیخ عبدالکریم سے وابستہ رہے۔ ان سے باقاعدہ ہدایہ اور بیضاوی کا درس لیا اور طریقت و سلوک سے بھی متمتع ہوئے۔ تصوف و طریقت کی منزلیں طے کر چکے تو شیخ نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے واپس سلون بھیج دیا۔

شیخ پیر محمد اس زمانے کی نہایت مؤثر شخصیت تھے اور دعوت و ارشاد میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے وعظ و نصیحت اور توجہ خاص سے بے شمار غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اس دور میں ہندوؤں کا ایک گروہ، جو سناسیوں کے نام سے مشہور تھا، ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھوم رہا تھا۔ دوران سفر شیخ پیر محمد سے بھی ان کی گفتگو ہوئی۔ شیخ نے ان سے کہا: ”تم کس کی عبادت کرتے ہو؟“ انھوں نے جواب دیا: ”ہم بتوں کی پوجا

❶ منتخب التواریخ۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۳۳، ۳۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۴۔

Marfat.com

کرتے اور ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔" یہ سن کر شیخ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور اس کی اچھائیاں بیان کیں، جس سے متاثر ہو کر وہ لوگ مسلمان ہو گئے۔

شیخ پیر محمد سلونی نے تمام عمر تلقین وارشاد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا اور سید علاء الدین سندھیلوی اور سید بدرالدین بریلوی ایسے بہت سے مشائخ نے ان سے استفادہ کیا۔

بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر کو ان کی نیکی اور صالحیت کا علم ہوا، تو اس نے دو گاؤں بطور جاگیر عطا کیے جو بطور وراثت ان کی اولاد و اعقاب میں منتقل ہوتے رہے۔

اس عالم دین نے ۲۲ رمحرم ۱۰۹۹ھ/ ۱۸ رنومبر ۱۶۸۷ء کو سلون میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ❶۔

۵۹۔ شیخ پیر محمد لکھنوی

شیخ پیر محمد بن اولیا جون پوری، ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، جس کا نام اٹاواں تھا اور اعمال منڈیا ہوں میں جون پور کے قریب ایک پررونق اور بڑا گاؤں تھا۔ شیخ پیر محمد کی تاریخ ولادت ۲۶ ررمضان ۱۰۲۷ھ/ ۶ رستمبر ۱۶۱۸ء ہے۔ شیخ کم سنی ہی میں باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد چچا کی گود میں تربیت پائی۔ بچپن کی حدود سے باہر قدم رکھا تو حصول علم کے لیے مانک پور کا قصد کیا اور وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ وہیں شیخ عبداللہ سیاح دکنی سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ پھر لکھنؤ چلے گئے اور کتب درسیہ قاضی عبدالقادر عمری لکھنوی سے پڑھیں۔ بعد ازاں شیخ عبداللہ سیاح دکنی سے ملاقات ہوئی، انھوں نے تاکید کی اور حکم دیا کہ طریقت وسلوک کی راہوں پر گامزن ہونے سے پہلے تکمیل علم اور فنی کتابوں پر عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ شیخ پیر محمد مزید تعلیم کے لیے دہلی گئے اور علامہ حیدر کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر باقاعدہ تمام مروجہ کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ علاوہ ازیں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، قنوج اور اجمیر کے اساتذہ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ دہلی میں شیخ عبداللہ سیاح سے پھر ملاقات ہوئی تو انھوں نے تمام طرق تصوف اور سلاسل طریقت کی اجازت مرحمت فرمائی۔

شیخ پیر محمد لکھنوی سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ اپنے دور میں درس و تدریس کے ماہر اور سربرآوردہ بزرگ تھے۔

شیخ پیر محمد لکھنوی، صاحب قلم بھی تھے اور تصنیف و تالیف میں ایک خاص مقام کے مالک تھے۔ ان کی تصانیف جلیلہ میں صدرالدین شیرازی کی شرح الھدایہ پر سراج الحکمۃ کے نام سے حاشیہ اور ہدایۃ الفقہ پر حواشی شامل ہیں۔ نیز فقہی مسائل سے متعلق فتاویٰ بھی ان کے سلسلہ تصانیف کی ایک کڑی ہیں۔ سلوک و تصوف اور احکام طریقت کے بارے میں بھی ان کی کتابوں کا پتا چلتا ہے۔

---

❶ خزینۃ الاصفیا، ج۱، ص۴۸۰۔ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۹۵، ۹۶۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص۸۱۔

Marfat.com

دیار ہند کے اس عالم وفقیہ نے ۱۴؍ جمادی الاخریٰ ۱۰۸۵ھ/ ۵؍ ستمبر ۱۶۷۵ء کو لکھنؤ میں وفات پائی اور دریائے گومتی کے کنارے دفن کیے گئے۔ بعض مورخین نے ان کی تاریخ وفات قرآن مجید کے الفاظ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون سے نکالی ہے❶۔

۶۰۔ شیخ پیر محمد جیندی

شیخ پیر محمد جیندی، مشرقی پنجاب کی ایک سابق ریاست جیند کے باشندے تھے۔ عالم وفقیہ اور متدین بزرگ تھے۔ دیوبند کے ایک صاحب علم بزرگ کے شاگرد تھے۔ عرصے تک ان کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل کیا اور علم ومعرفت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ درس وتدریس ان کا اصل مشغلہ تھا۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر ان کی بہت تکریم کرتا تھا اور ان کے علم وفضل پر اس کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ تصحیح وتحقیق کی غرض سے اپنے ہاتھ سے کتابیں لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجتا❷۔

ت

۶۱۔ شیخ تاج الدین گجراتی

شیخ تاج الدین کا نسب نامہ یہ ہے: تاج الدین بن اسماعیل بن محمود بن ابراہیم بن اسماعیل بن یعقوب بن شہاب الدین قادری بہاری ثم پٹنی گجراتی۔ قاضی ابوصالح نصر بن عبدالرزاق بن شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد سے تھے۔ اپنے والد شیخ اسماعیل سے اخذ طریقت کیا اور گجرات کو روانہ ہوئے۔ وہاں مستقل طور سے پٹن شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ لہٰذا پٹنی گجراتی کہلائے۔ نامور عالم اور محدث تھے۔ حدیث اور فقہ میں عبور رکھتے تھے۔ کتب حدیث پر عبور کا یہ عالم تھا کہ صحاح ستہ کے حافظ تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ جمال، احمد، اسحاق اور ابراہیم۔ سب سے چھوٹے ابراہیم پٹنی تھے۔ وہی علم وفضل کے اعتبار سے باپ کے قائم مقام ہوئے۔

شیخ تاج الدین گجراتی پٹنی نے ۱۱؍ جمادی الاولیٰ ۱۰۰۷ھ/ ۳۰؍ نومبر ۱۵۹۸ء کو پٹن میں وفات پائی❸۔

❶ مخزن برکت (سوانح حیات شیخ پیر محمد لکھنوی)۔ خزینۃ الاصفیاء، ج ۱، ص ۴۸۲، ۴۸۳۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۳۴، ۳۵۔ مرأۃ العالم، ورق ۳۵۹ ب۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۶، ۹۷۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۷۲ تا ۷۵۔ احوال و آثار عبداللہ خویشگی، ص ۳۹ تا ۴۱۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۷، ۹۸۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۸۶۔

❸ اذکار ابرار، ص ۴۴۲۔ مرآۃ احمدی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۸۔

Marfat.com

۶۲۔ شیخ تاج الدین دہلوی

شیخ تاج الدین بن زکریا بن عیسیٰ دہلوی حنفی المسلک تھے اور صوفی کے عرف سے معروف تھے۔ منطق، فلسفہ اور تصوف کے فاضل و ماہر تھے۔ اپنے والد شیخ زکریا اور شیخ عبدالملک بن عبدالغفور پانی پتی کے شاگرد تھے۔ عرصے تک شیخ عبدالملک کی خدمت میں رہے، جن کا لقب امان اللہ تھا، یہاں تک کہ علوم و معارف سے پوری طرح بہرہ مند ہو گئے۔ بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کے دربار میں آئے تو اس نے ان کو اپنے خاص مشیروں اور ندیموں میں شامل کر لیا۔

منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ اکبر کے دل میں الحاد و زندقہ کی تخم ریزی شیخ تاج الدین نے بھی کی۔ یہ تاج العارفین کے لقب سے معروف تھے۔ توحید اور تصوف کے سلسلے میں ابن عربی سے بہت متاثر تھے۔ ابن عربی کی تصانیف سے زیادہ تر ایسی باتیں بیان کرتے، جن سے آزاد خیالی کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ قرآن کی آیات اور احادیث نبوی کی ایسی ایسی تاویلات کیں کہ بادشاہ حیران رہ گیا۔ بادشاہ کے حضور انھوں نے سجدہ ریز ہونے کی تجویز پیش کی۔

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ تاج الدین رات رات بھر اہل تصوف کے شطحیات اور مزعومات بادشاہ کے سامنے بیان کرتا رہتا۔ وہ شرعی پابندیوں کا قائل نہیں تھا اور گمراہ صوفیا کی طرح وحدت الوجود کا پکا حامی تھا۔ اس کی باتوں کا نتیجہ بجز الحاد اور اباحت کے کچھ نہ تھا۔ اس نے وحدۃ الوجود کے غیر اسلامی نظریے اور ابن عربی کی فصوص الحکم کے اس طرح کے دیگر مسائل اچھی طرح بادشاہ کے ذہن نشین کر دیے۔ مثلاً ''ترجیح رجاء الخوف'' اور ''ایمان فرعون۔'' اکبر کے ذہنی فتور اور احکام شریعت سے اس کی بے زاری میں تصوف کے ان نظریات کو بہت دخل ہے۔ تاج الدین کی باتوں کے نتیجے میں اکبر کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ کافر دوزخ کی آگ میں ڈالے تو ضرور جائیں گے مگر یہ عذاب ان کے لیے دائمی نہیں عارضی ہوگا۔ تاج الدین نے یہ مسئلہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی تاویلیں کر کے اچھی طرح بادشاہ کے ذہن میں بٹھا دیا تھا۔ اور جب اس نے بادشاہ کو تصوف کے اس چکر میں بری طرح ڈال دیا تو اپنی تعلیم و تلقین کا آخری اور اہم نکتہ جو سب سے زیادہ خطرناک اور ضرر رساں تھا، بیان کیا، اور وہ تھا ''انسان کامل'' کا تصور۔

شیخ تاج الدین دہلوی نے اکبر کے سامنے ''انسان کامل'' کا ایک تصور پیش کیا، اور پھر اس انسان کامل کو خلیفۂ وقت سے تعبیر کر کے خود اکبر کو اس کا مصداق قرار دیا۔ انسان کامل کے بعد عین واجب (ذات خداوندی) کا درجہ باقی تھا۔ اب شیخ کی کمند تحقیق، انسان کامل کی منزل کو عبور کر کے عین واجب تک جا پہنچی۔ حوالی موالی نے بھی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر باتیں کیں اور خرافات و اختراعات کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ چنانچہ بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا اور اس کا نام ''زمین بوس'' رکھا گیا۔ بادشاہ کے ادب و احترام کو اتنا بڑھایا گیا کہ اسے

Marfat.com

فرض عین اور چہرہ شاہی کو "کعبہ مرادات وقبلہ حاجات" قرار دیا گیا۔ کسی نے زبان ہلائی تو جواب میں ہندوستان کے بعض مشائخ کے حضور، ان کے بعض مریدوں کے طرز عمل کو پیش کر کے، اس کا منہ بند کر دیا گیا۔

شیخ تاج الدین دہلوی کا نام ان اولین لوگوں میں شامل ہے، جنھوں نے اکبر کو الحاد کی راہ پر لگایا اور اسے اسلام سے برگشتہ کر کے بے دینی اور زندیقیت کی خطرناک وادی میں ڈالنے کے لیے اہم کردار ادا کیا لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے تاج الدین کی طرف سے نظر کرم پھیر لی، اور توجہ ہٹالی تھی اور اس کے نزدیک یہ مطرود و مقہور قرار پا گئے تھے۔ ان کی تصانیف میں سے شرح اللوائح اور نزہۃ الارواح کی شرح شامل ہیں ❶۔

۶۳۔ شیخ تاج الدین صدیقی جھونسوی

شیخ تاج الدین بن منہاج الدین صدیقی جھونسوی الہ آبادی، عالم و فاضل، علم نحو کے ماہر اور مشہور فقیہ تھے۔ ان کے اسلاف درحقیقت دہلی کے رہنے والے تھے، وہاں سے شیخ پورہ منتقل ہو گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شیخ تاج الدین نے بعض ابتدائی کتابیں اپنے عم محترم شیخ نصیر الدین جھونسوی سے پڑھیں۔ پھر جون پور گئے، وہاں شیخ نور اللہ بن طٰہٰ انصاری جون پوری کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے۔ ان سے منار الاصول تک کتب درسیہ پڑھیں۔ حصول طب کی طرف رجحان ہوا تو حاجی محمد مداری سے طب کی کتابیں پڑھیں اور اس میں اس درجہ مہارت پیدا کی کہ اس موضوع میں صاحب تصنیف ہوئے۔ علم حیوانات و نباتات سے متعلق کچھ رسائل لکھے اور اس ضمن میں ایک بہترین و مفید کتاب تاج المجربات کے نام سے تالیف کی، جو سو اجزا پر مشتمل ہے۔ وہ اونچے درجے کے معالج اور طبیب تھے۔

منقول ہے کہ اگرچہ وہ کتب درسیہ کی تکمیل نہ کر پائے، لیکن اللہ نے ان کو ہر علم اور ہر مروجہ فن میں ملکۂ راسخہ عطا فرمایا تھا۔ نہایت ذہین، تیز فکر، نقاد اور صاحب مطالعہ تھے۔ مسلسل مطالعہ سے مشکل علوم ان کے لیے آسان ہو گئے تھے اور پیچیدہ مسائل کو سلجھانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر علمی میدان میں ان کی تگ و تاز کے نقوش نمایاں نظر آتے ہیں اور فقہ، سلوک، تصوف، طب اور نحو میں ان کی تصانیف کا پتا چلتا ہے۔ علم نحو میں انھیں بالخصوص درک حاصل تھا اور اس موضوع سے متعلق وہ مرجع اہل علم تھے۔ شیخ تاج الدین صدیقی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ مختلف سلاسل سلوک سے تعلق رکھتے تھے۔ سلسلۂ سہروردیہ اور سلسلۂ چشتیہ کا حصول اس دور کے مشہور مشائخ سے کیا تھا۔ اشغال و اذکار سے بہرہ ور تھے اور ارشاد و تلقین کی مسند پر فائز تھے۔ مگر سماع وغیرہ سے گریز کرتے اور ان چیزوں کو سلوک و تصوف کے خلاف قرار دیتے تھے۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم دین نے جمعرات کے روز ۱۵؍ ذی الحجہ ۱۰۳۰ھ/ ۲۱؍ اکتوبر ۱۶۲۱ء کو وفات پائی ❷۔

❶ منتخب التواریخ ص ۳۱۹۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۳۵، ۲۶۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۸، ۹۹۔ رود کوثر، ص ۹۲۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۲، ۱۰۳، بحوالہ گنج ارشدی۔

Marfat.com

— ث —

۶۴۔ قاضی ثناء الدین مچھلی شہری

قاضی ثناء الدین جعفری مچھلی شہری، شیخ عصر اور فقیہ وقت تھے۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ مچھلی شہر میں ان کی وفات کے بعد کثیر تعداد میں ان کے اعقاب و اخلاف نمایاں حیثیت سے ابھرے اور اس خاندان میں بڑی وسعت پیدا ہوئی❶۔

۶۵۔ قاضی ثناء اللہ جون پوری

قاضی ثناء اللہ جون پوری کا سلسلہ نسب یہ ہے: ثناء اللہ بن ہدایت اللہ بن محمد منعم بن ابوالحسن بن محمد بن قاضی خواجگی عمری جون پوری۔ جون پور میں پیدا ہوئے، اور وہیں پرورش پائی۔ شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے فقہائے ہند میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ شہر جون پور کے منصب قضا پر متعین تھے۔ ۷؍شوال ۱۰۷۳ھ/ ۵؍مئی ۱۶۶۳ء کو جون پور میں وفات پائی❷۔

— ج —

۶۶۔ مولانا جان محمد لاہوری

مولانا جان محمد صوفی لاہوری، شیخ اسماعیل مدرس لاہوری کے شاگرد تھے۔ حنفی المسلک تھے۔ شیخ صالح اور جید عالم تھے۔ فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ مسجد قصاب میں ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا، جو اس زمانے میں شہر سے باہر واقع تھی۔ پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے، کسی کی احتیاج سے سخت گریزاں تھے۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۰۸۲ھ/ ۱۶۷۱ء کو لاہور میں وفات پائی اور اسی شہر میں دفن ہوئے❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۱۰۴۔

❷ تجلی نور، ج۲، ص۱۰۴۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص۵۲۷۔ ''تاریخ شیراز ہند جون پور میں قاضی ثناء اللہ جون پوری کی تاریخ وفات تو ۷؍شوال ہی مرقوم ہے، مگر سن وفات ۱۱۷۳ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔ ان کا سن وفات ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۳ء ہے۔ نزہۃ الخواطر، ج۵ ص۱۰۴۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۱۰۵۔

Marfat.com

۶۷۔ شیخ جعفر بن جلال الدین گجراتی

شیخ جعفر بن جلال الدین بن محمد حسینی بخاری احمد آبادی گجراتی کو بدر عالم کہا جاتا ہے۔ ۱۲ر شعبان ۱۰۲۳ھ/ ۷ر ستمبر ۱۶۱۴ء کو پیدا ہوئے اور علم و طریقت کی گود میں پرورش پائی۔ اپنے والد شیخ جلال الدین بخاری گجراتی (متوفی ۱۰۵۷ھ/ ۱۶۴۷ء) اور دیگر علمائے عصر سے اخذ علم کیا۔ بلاشبہ ان کے والد (شیخ جلال الدین) بھی جید عالم دین تھے، لیکن شیخ جعفر، تفسیر، حدیث، تصوف اور دیگر علوم و فنون میں والد سے زیادہ عالم اور صاحب فضل تھے۔ اپنے دادا (شیخ محمد) کی وفات کے بعد والد کی زندگی ہی میں مسند ارشاد و تدریس پر متمکن ہو گئے تھے۔ شیخ جلال الدین گجراتی، شاہ جہان کے عہد میں منصب صدارت پر فائز تھے۔ ان کی وفات کے بعد بادشاہ نے اس منصب کے لیے ان کے اس بیٹے (شیخ جعفر) سے درخواست کی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔

کتابت میں اتنے تیز تھے کہ پورے قرآن مجید کی کتابت فلکی گھڑی کے حساب سے ۵۴ ساعت میں کر لیتے تھے۔ خط نستعلیق اور نسخ کے ماہر تھے۔

ان کی تصانیف میں سے ایک کتاب روضات ہے جو سادات کے حالات پر مشتمل ہے اور چوبیس جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں تفسیر اور حدیث کے موضوع سے متعلق بھی رسائل موجود ہیں۔ ایک دیوان ہے جو ان کے کلام پر محیط ہے۔

شیخ جعفر گجراتی علوم و معارف، احوال و سوانح، مشائخ و اسلاف کی اصطلاحات اور فنون متعارفہ میں اپنے والد سے بہت آگے تھے۔ درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں ان کی مساعی ہمیشہ جاری رہیں۔ اچھے شاعر بھی تھے اور صفا تخلص کرتے تھے۔ ان کے چند اشعار یہ ہیں:

رازِ مادر زمانہ افتاد است　　بزمہارا فسانہ افتاد است
می کند یار آنچہ می خواہد　　دور گردوں بہانہ افتاد است
اے صفا میان ماہ وخاں　　شاہد ما یگانہ افتاد است

جز من کہ گرفتہ ام دو زلفش　　کس در شب تار مار نہ گرفت

بادشاہ کے حضور آئے، گوناگوں شاہی عنایات، نقد انعام، خلعت اور ہاتھی سے سرفراز ہوئے۔

یہ ہندی عالم دین ۹ر ذی الحجہ ۱۰۸۵ھ/ ۲۴ر فروری ۱۶۷۵ء کو اس عالم فانی سے راہی ملک بقا ہوئے۔ احمد آباد میں مدفون ہیں[1]۔

---

[1] مرآۃ احمدی۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۶۰، ۶۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۶۔ تذکرہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۴۔

Marfat.com

۶۸۔ شیخ جعفر بن علی گجراتی

شیخ جعفر کا سلسلہ نسب یہ ہے: جعفر بن علی بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ عیدروس شافعی حضرمی ثم ہندی گجراتی۔ شیخ جعفر بن علی فقہی مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے اور جعفر صادق کے نام سے مشہور تھے۔ ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء کو شہر تریم میں پیدا ہوئے۔ ان کے تمام آباواجداد ذی علم بزرگ تھے لہٰذا کہنا چاہیے کہ شیخ جعفر نے علم و فضل کی گود اور نیکی اور تقویٰ کے ماحول میں پرورش پائی۔ عرصے تک والد گرامی شیخ علی کی صحبت میں رہے اور ان سے مختلف فنون پر مشتمل کتابوں کی تکمیل کی۔ ان سے تجوید کے ساتھ قرآن مجید بھی حفظ کیا اور تبلیغ و ارشاد کے میدان میں اترنے کے لیے جن منزلوں سے گزرنا ضروری ہے، وہ بھی ان ہی کی خدمت میں طے کیں۔ بعد ازاں شیخ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن شہاب الدین، شیخ زین الدین بن حسین بافضل، ابوبکر شلی باعلوی اور اپنے چچا زاد بھائی شیخ عبدالرحمٰن سقاف بن محمد عیدروس سے کسب علم کیا اور تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، علوم عربیہ، حساب و ریاضی، فرائض و میراث اور ہیئت و فلکیات میں مہارت حاصل کی۔ شان دار زندگی بسر کرتے اور ٹھاٹھ سے رہتے تھے، مرفہ الحال اور خوش پوش عالم دین تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی فہم و فراست اور خوب صورتی کی نعمت سے نوازا تھا۔ بلند اخلاق اور عمدہ کردار کے عالم تھے۔ عوام و خواص میں مقبول اور علم و فضل میں مشہور تھے۔ نظم و نثر میں کامل اور انشا پردازی میں فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ تھے۔ حج کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے اور حرمین شریفین کے علمائے کرام سے اخذ علم کیا۔ واپسی میں اپنے آبائی شہر تریم کا قصد کیا تو شہرت کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ اثنائے سفر میں جس شہر اور قریے سے گزر ہوتا، لوگ انتہائی عزت و تکریم سے پیش آتے۔ تریم کے قریب پہنچے تو انسانوں کا ایک ہجوم خیر مقدم اور استقبال کے لیے امڈ آیا تھا۔

عرصے تک تریم میں قیام پذیر رہے۔ پھر دل میں علوم عقلیہ اور علم تصوف کے حصول کا جذبہ موج زن ہوا تو ہندوستان کے لیے رخت سفر باندھا، اس لیے کہ ہندی علما جہاں علوم نقلیہ یعنی تفسیر و حدیث اور فقہ کے سلسلے میں عالم اسلام کے حلقہ اہل علم میں شہرت رکھتے تھے، وہاں علوم عقلیہ اور تصوف وغیرہ میں بھی درجہ کمال پر فائز تھے۔ دیار ہند میں وارد ہوئے تو سب سے پہلے سورت کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ وہاں ان کے چچا شریف محمد سکونت پذیر تھے۔ اور اس نواح میں ان کے علم و فضل کا شہرہ اور درس و تدریس کا غلغلہ بلند تھا۔ ان کے چشمہ علم سے خوب سیراب ہوئے۔ پھر سرزمین دکن کا قصد کیا۔ وہاں کے حکمران عنبر سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کے علم و فضل کی فراوانی سے بہت متاثر ہوا اور انھیں اپنے ندیموں اور مشیروں میں شامل کر لیا۔ دربار دکن سے بہت سے علما و فضلا منسلک تھے۔ ان میں علمی بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بعض مسائل میں بادشاہ کے سامنے شیخ جعفر سے بھی ان علما کی بحث ہوئی تو شیخ کا پلہ بھاری رہا اور سب نے ان کی فراست اور علمی فوقیت کو تسلیم کیا۔ بادشاہ نے شیخ کو دکن کی مسند تدریس پر متمکن کر دیا۔ لیکن ہندوستان کے اصحاب علم میں اس زمانے میں فارسی کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور شیخ اس سے ناآشنا تھے، چنانچہ شیخ نے اس کمی کو محسوس کیا اور فارسی سیکھنے کی طرف

Marfat.com

عنان توجہ مرتکز فرمائی، تھوڑی ہی مدت میں اس میں مہارت حاصل کر لی۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ شیخ جعفر نے فارسی میں بھی واقفیت بہم پہنچالی ہے تو بعض حضرات نے ان سے فرمائش کی کہ اپنے جد امجد شیخ عبداللہ کی کتاب، العقد النبوی کا فارسی میں ترجمہ کر دیں۔ شیخ نے ان کی فرمائش قبول کی اور بہترین انداز سے کتاب کو فارسی کے قالب میں ڈھال دیا۔

علاقہ دکن میں شیخ جعفر کو اپنے علم وفضل کی وجہ سے بہت ہی احترام واکرام کا مستحق سمجھا جاتا اور وہاں کے حکمران عنبر کی وفات تک ان کو بے حد لائق تعظیم گردانا جاتا تھا۔ عنبر کے بعد اس کے بیٹے فتح خاں نے زمام اقتدار ہاتھ میں لی تو اس نے شیخ کے اجلال وتوقیر میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک دکن کی یہ حکومت قائم رہی اور اس سرزمین پر ان کا پرچم اقتدار لہراتا رہا، شیخ کے عظمت ووقار میں کوئی کمی واقعہ نہیں ہوئی، لیکن جب یہ حکومت ختم ہوگئی اور اس کے ارباب بست وکشاد منتشر ہوگئے تو شیخ اپنے عم محترم شیخ محمد عیدروس کے پاس سورت منتقل ہو گئے۔ سورت میں ان کے علم وفضل کی شہرت پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور اہل علم ان سے بہت متاثر تھے۔ وہاں گئے تو ہر حلقے میں ان کی پذیرائی ہوئی اور مال ودولت سے بھی سرفراز کیے گئے۔ سورت میں انھوں نے مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی تھی۔

شیخ جعفر کو تصوف وطریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ کہتے ہیں مختلف فنون میں ان کی تصانیف بھی تھیں اور ایک دیوان بھی تھا، جو ان کے مجموعہ اشعار پر مشتمل تھا۔

ان کی ملاقات مغل حکمران شاہ جہان سے ہوئی تو اس پر ان کی گوناگوں صلاحیتوں اور علمی قابلیت کا بہت اثر ہوا۔ سرزمین گجرات کے علاقے بھڑوچ میں اس نے ان کو کئی گاؤں بھی عطا کیے۔ شیخ جعفر نے شاہ جہان کے بیٹے داراشکوہ کے کہنے پر اس کی کتاب سفینۃ الاولیا کا، جو فارسی زبان میں ہے، عربی میں ترجمہ کیا۔

اس شافعی المسلک عالم وفقیہ نے ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء میں وفات پائی❶۔

۷۹۔ شیخ جعفر حسینی پٹنوی

شیخ جعفر پٹنوی کا سلسلہ نسب یہ ہے: جعفر بن ابوالحسن بن باقی بن مبارز بن ابراہیم حسینی پٹنوی۔ اصلاً پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ سلوک وطریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس سلسلے میں رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید بن مصطفیٰ عثمانی جون پوری سے استفاضہ کیا۔ طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ کہولت کی منزل سے بھی آگے نکل گئے۔ اس عمر میں شیخ محمد رشید ممدوح نے انھیں نکاح کرنے کا حکم دیا اور اپنے شہر (پٹنہ) لوٹ جانے کو کہا۔ نیز فرمایا کہ عبادات ومعاملات میں اتباع سنت کا خاص طور سے خیال رکھا جائے۔ چنانچہ واپس پٹنہ چلے گئے اور عمر بھر درس وافادہ میں مصروف رہے۔

---

❶ المشروع الروی از شلی۔ حدیقہ احمدیہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۰۷، ۱۰۸۔

Marfat.com

اس عالم دین اور نامور فقیہ نے جمعرات ۳ر رمضان المبارک ۱۰۷۵ھ/ ۱۰ر مارچ ۱۶۶۵ء کو وفات پائی اور پٹنہ کے قریب، شریعت آباد میں دفن کیے گئے ❶۔

۷۰۔ شیخ جعفر بن عزیز اللہ جون پوری

شیخ جعفر بن عزیز اللہ جون پوری کا لقب نور الدین تھا۔ سہ شنبہ کے روز ۸ر رجب ۱۰۲۴ھ/ ۲۴ر جولائی ۱۶۱۵ء کو جون پور میں پیدا ہوئے۔ اکثر کتب درسیہ شیخ محمد رشید جون پوری (صاحب رشیدیہ) سے پڑھیں۔ دیگر علما و شیوخ سے بھی اخذ علم کیا۔ تصوف و سلوک میں بھی مہارت پیدا کی۔ اس ضمن میں اپنے عم محترم شیخ نور محمد مداری سے فیض حاصل کیا اور تصوف کے سلسلۂ مداریہ سے منسلک ہو گئے۔ درس و تدریس کی مسند بھی آراستہ کی اور ان کے چشمۂ علم سے شیخ محمد افضل عباسی الٰہ آبادی، شیخ محمد کاظم عباسی سید پوری، شیخ محمد ماہ دیوگامی اور علما و فضلا کی بہت بڑی جماعت نے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔

شیخ جعفر جون پوری، زاہد و عابد، عفیف و قانع، حلیم و متواضع اور عالم باعمل تھے۔ کھانے پینے اور لباس میں کسی قسم کے تکلف اور تصنع کے عادی نہ تھے۔ دنیا اور دنیا داروں سے انھیں کوئی رغبت اور لگاؤ نہ تھا۔ ارباب اقتدار اور اصحاب مال و دولت کے دروازے پر کبھی دستک نہ دی۔ شب و روز درس و تدریس اور وظائف و اوراد میں مصروف رہتے۔ پورے بتیس (۳۲) سال ہنگامۂ تدریس بپا کیے رکھا۔ تصنیف و تالیف کے ذوق سے بھی بہرہ ور تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالباقی صدیقی جون پوری (متوفی قریباً ۱۰۸۲ھ/ ۱۶۷۱ء) نے فن مناظرہ کی کتاب شریفیہ پر دو شرحیں سپرد قلم کیں۔ ایک آداب الباقیہ شرح الشریفیہ اور دوسری ابحاث الباقیہ شرح الشریفیہ۔ ابحاث الباقیہ انھوں نے اپنے استاد شیخ محمود جون پوری کے حکم سے سپرد قلم کی تھی اور شیخ جعفر کے استاد شیخ محمد رشید جون پوری (متوفی ۱۰۸۳ھ/ ۱۶۷۲ء) کی کتاب رشیدیہ کے جواب میں لکھی تھی۔ رشیدیہ فن مناظرہ کی مشہور کتاب ہے۔ شیخ جعفر نور الدین جون پوری نے شیخ عبدالباقی جون پوری کی ابحاث الباقیہ کے جواب میں نور الانوار کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، اس کتاب میں انھوں نے اپنے استاذ کی تصنیف رشیدیہ کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان کے علم و فضل کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

شیخ جعفر جون پوری ملقب بہ نور الدین نے سہ شنبہ ۱۸ر جمادی الاولیٰ ۱۰۹۳ھ/ ۱۵ر مئی ۱۶۸۲ء کو نماز ظہر کے بعد جون پور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ بعض مورخین نے ان کی تاریخ وفات ''بہار علم گزشت'' سے نکالی ہے اور بعض نے ''صد حیف ملاذ علم رفت'' سے ❷۔

---

❶ تاریخ شیراز ہند، جون پور، ص ۶۵۱، ۶۵۲۔ اس کتاب میں ان کی تاریخ وفات ۳ر رمضان ۱۱۰۵ھ/ ۱۹ر اپریل ۱۶۹۴ء مرقوم ہے، جو صحیح نہیں۔ ان کی تاریخ وفات ۳ر رمضان ۱۰۷۵ھ/ ۱۰ر مارچ ۱۶۶۵ء ہے۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۹، ۱۱۰ بحوالہ گنج ارشدی۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۹، ۱۱۰۔ تاریخ شیراز ہند جون پور (ص ۲۴۷، ۴۲۵، ۴۷۲) میں بھی حضرت ''نور الدین مداری'' کے عنوان کے تحت (سنگرف دائم، ص ۶۱ کے حوالے سے) شیخ جعفر کا ذکر کیا گیا ہے۔ تاریخ ہائے ولادت و وفات صحیح درج نہیں کی گئیں۔

Marfat.com

۱۷۔ شیخ جلال الدین گجراتی

شیخ جلال الدین بن محمد بن جلال الدین حسینی بخاری گجراتی، مقصود عالم کے نام سے معروف تھے۔ ۱۵؍ جمادی الاخری ۱۰۰۳ھ/ ۱۵؍فروری ۱۵۹۵ء کو علاقہ گجرات میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور مولانا حسین بستانی سے حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں شیخ عبدالعزیز کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، جو ان کے والد کے شاگردوں میں سے تھے۔ پھر اپنے والد گرامی شیخ محمد بن جلال الدین گجراتی سے طریقت وسلوک کی تعلیم حاصل کی۔ جب علوم ظاہری اور تصوف وطریقت کی منزلیں طے کر چکے تو شاہ جہان بادشاہ نے انھیں اکبر آباد (آگرہ) میں بلایا، اور ۱۷؍شعبان ۱۰۵۲ھ/ ۳۱؍اکتوبر ۱۶۴۲ء کو صدارت کا عہدہ عطا کیا۔ شاہ جہان ایک دین پرور بادشاہ تھا اور ان کی فضیلت علمی کا بہت معترف تھا۔ وہ عام طور پر کہا کرتا تھا کہ اس دور میں شیخ جلال الدین گجراتی کا وجود انتہائی غنیمت ہے۔ اس نے ان کو آٹھ ہزاری منصب سے سرفراز کیا جو اس دور کا بہت بڑا سرکاری اعزاز تھا۔

شیخ جلال الدین گجراتی نے ۲۰؍ربیع الثانی ۱۰۵۷ھ/ ۱۵؍مئی ۱۶۴۶ء کو لاہور میں وفات پائی اور ان کی میت احمد آباد لے جائی گئی۔ وہاں اپنے والد شیخ محمد بن جلال الدین حسینی گجراتی کے قریب دفن کیے گئے[1]۔

۱۷۲۔ علامہ جمال اولیا کوروی

علامہ جمال اولیا بن مخدوم جہانیاں بن بہاء الدین بن سالار عالم کوروی ۹۷۳ھ/ ۱۵۶۶ء کو شہر کورہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ علم فقہ کی تعلیم اپنے والد گرامی شیخ مخدوم سے حاصل کی۔ بعد ازاں اودھ گئے۔ وہاں قاضی ضیاء الدین عثمانی نیوتی سے اخذ علم کیا اور تصوف کے مختلف سلسلوں میں ان سے مستفیض ہوئے۔ پھر اپنے شہر کورہ آکر درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔ شیخ وقت اور عالم کبیر تھے۔ صوفی المشرب تھے۔ فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ بہت سے علما وطلبا نے ان سے کسب علم کیا۔ سید محمد بن ابوسعید کالپوی (متوفی ۲۶؍شعبان ۱۰۷۱ھ/ ۱۶؍اپریل ۱۶۶۱ء) بھی ان کے تلامذہ میں سے ہیں، سید محمد کالپوی نے ان سے متعدد کتب درسیہ پڑھیں، جن میں مطول اور بیضاوی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مشہور مدرس شیخ لطف اللہ کوروی، صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری، شیخ یٰسین بناری اور خلق کثیر نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مدت تک ہنگامہ تدریس بپا کیے رکھا۔

شیخ جمال اولیا ان حضرات میں سے ہیں جنھوں نے وسیع حلقہ درس قائم رکھنے کے باوجود زہد و عبادت اور خدمت خلق کو اپنا معمول ٹھہرایا۔ برصغیر کے اس نامور عالم وفقیہ نے چوہتر (۷۴) سال عمر پا کر ۲۸ یا ۲۹؍رمضان ۱۰۴۷ھ/ ۳ یا ۴؍فروری ۱۶۳۸ء کو سفر آخرت اختیار کیا[2]۔

[1] مرآۃ احمدی۔ خزینۃ الاصفیا۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۱۱، ۱۱۲۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۶۔

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۱۲، ۱۱۳۔

Marfat.com

۷۳۔ شیخ جمال الدین کشمیری

شیخ جمال الدین بن موسیٰ شہید کشمیری، سرزمین کشمیر میں پیدا ہوئے اور شیخ فتح اللہ حقانی کشمیری کی صحبت اختیار کی۔ سالہا سال ان کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے فضل خاص سے ان کا شمار علمائے ربانیین اور فضلائے عصر میں ہونے لگا۔ پختہ ذہن اور راسخ فکر علما میں سے تھے اور اللہ نے ان پر علم و معرفت کے دروازے وا کر دیے تھے۔ متقی، منکسر المزاج اور متواضع بزرگ تھے۔ لباس و طعام میں کسی قسم کے تکلف کے عادی نہ تھے۔ بوریا نشین اور سادہ مزاج عالم دین تھے۔ صدر مجلس بننے اور آگے بڑھنے سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ پوری زندگی درس و تدریس، رشد و ہدایت، لوگوں کو اسلام کی سیدھی راہ پر لگانے اور شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین میں صرف کر دی۔ مشہور عالم و مدرس شیخ کمال الدین کشمیری کے بھائی تھے اور یہ دونوں بھائی علم و فضل کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ ان کے اوصاف حمیدہ سے متاثر ہو کر شیخ فتح اللہ حقانی کشمیری نے اپنی دونوں بیٹیاں ان دونوں بھائیوں (جمال الدین اور کمال الدین) کے عقد میں دے دی تھیں۔ شیخ جمال الدین کشمیری سے بے شمار علما نے اخذ علم اور کسب فیض کیا❶۔

سرزمین کشمیر کے گیارھویں صدی ہجری کے اس عالم دین کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا علم نہیں ہوسکا۔

۷۴۔ مولانا جمال الدین لاہوری

مولانا جمال الدین لاہوری قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد شیخ اسماعیل بن ابدال شریف حسنی اوچی، شیخ اسحاق بن کاکو لاہوری اور شیخ سعد اللہ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ عہد اکبری کے عالم کبیر، اور اپنے علاقے کے مشہور مدرس تھے۔ لاہور کے محلہ تلا میں فروکش تھے۔ ان کے درس و افادہ کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ تدریس میں اس عہد کا کوئی عالم ان کا حریف اور مد مقابل نہ تھا۔ تمام مروجہ علوم و فنون میں یگانۂ روزگار تھے۔ آدھی عمر نشر علوم میں صرف ہوئی۔ مختلف علاقوں اور شہروں سے تشنگان علوم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی علمی تشنگی کا سامان فراہم کرتے۔ خوش گفتار اور بلند اخلاق بزرگ تھے۔ انداز گفتگو اور حسن بیان میں بے مثال اور ظرافت و ملاحت میں عدیم النظیر تھے۔ عوام و خواص میں بڑی عزت و تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ فیضی نے سواطع الالہام کے نام سے بے نقط تفسیر لکھی تو ان سے بہت مدد لی۔ انھوں نے اس تفسیر کی بڑی اصلاح کی اور اس کی عبارتوں کو مربوط بنایا❷۔

---

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۴۳۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۲۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۱۴۔ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۱۸، ۱۱۹۔

❷ منتخب التواریخ (اردو ترجمہ) ص ۶۲۰۔ مرآۃ العالم۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۴۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۱۶۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۰۸۔

Marfat.com

۷۵۔ مولانا جمال الدین برہان پوری

مولانا جمال الدین برہان پوری، جلیل القدر عالم اور اپنے دور کے محدث تھے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہے۔ برہان پور میں شیخ ابراہیم کی مسجد میں ان کا سلسلۂ درس و تدریس جاری تھا۔

شیخ طاہر بن یوسف سندھی (متوفی ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۶ء) برہان پور تشریف لائے تو ان سے حدیث کا درس لیا۔ پوری صحیح بخاری ان ہی سے پڑھی۔ برہان پور میں وفات پائی اور ابراہیم بن عمر سندھی کے قبرستان میں دفن ہوئے[1]۔

۷۶۔ شیخ جمیل الدین سہارن پوری

شیخ جمیل الدین بن رفیع الدین بن عبدالستار انصاری سہارن پوری، سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ اپنے برادر کبیر شیخ بدیع الدین سہارن پوری مرید و تلمیذ مجدد الف ثانی سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ سلسلہ نقشبندیہ میں اخذ طریقت ان ہی سے کیا اور مدت تک ان کی صحبت میں رہے یہاں تک کہ درجہ کمال کو پہنچے۔

ان کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے اصحابِ فضل و صلاح ہندی علما میں ہوتا تھا۔ ۱۰۵۵ھ/ ۱۶۴۵ء میں وفات پائی[2]۔

۷۷۔ ملا جوہر نانت کشمیری

ملا جوہر کنائی، کشمیر کی نانت برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ سرزمین کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ سلطان قطب الدین کشمیری کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حج کی توفیق عطا فرمائی۔ مناسک حج ادا کرنے کے بعد حجاز کے علمائے کرام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور محشی مشکوٰۃ ملا علی قاری حنفی ہروی مکی اور شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی شافعی مکی سے کتب حدیث کا درس لیا اور بطریق معنعن سند و اجازۂ حدیث سے سرفراز ہوئے۔ دیار حرمین سے مراجعت کے بعد علیحدگی کی زندگی اختیار کر لی اور ہمہ تن اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ رزق حلال کی غرض سے اون کاتنے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا اور دوشالے تیار کر کے فروخت کرتے تھے۔ اس طریقے سے جو آمدنی ہوتی، وہی گزر و اوقات کا اصل ذریعہ تھی۔ ساتھ ہی علوم دینیہ کے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس عالم دین نے کشمیر کے علاقے میں علوم اسلامیہ کی بڑی ترویج کی اور ان کے حلقہ درس سے متعدد علمائے کرام نے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ حیدر بن فیروز چرخی، شیخ محمد

[1] اذکار ابرار، ص ۳۹۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۱۶، ۱۱۷۔

[2] مرآۃ جہاں نما۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۱۸۔

Marfat.com

ٹوپی گرمحشی شرح جامی اور بہت سے حضرات شامل ہیں۔

ملا جوہر نانت دیار کشمیر کے متوکل علی اللہ، عابد و زاہد اور مشہور عالم تھے۔ ۱۰۲۶ھ/ ۱۶۱۷ء کو کشمیر میں وفات پائی اور مقبرہ شیخ حسین خباز کے مشرقی جانب دفن کیے گئے۔

تذکرۂ علمائے ہند فارسی (ص ۴۴) اور اس کے تتبع میں اردو ترجمہ (ص ۱۵۴) میں انھیں (غالباً ہندو سمجھ کر) جوہر ناتھ لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ حدائق الحنفیہ (ص ۴۰۳) میں جوہر نات مرقوم ہے، جو غلط ہے۔

دراصل یہ لفظ ''نانت'' ہے، جو کشمیر کی ایک برادری ہے۔ چنانچہ تاریخ کشمیر اعظمی میں درج ذیل الفاظ میں ان کے حالات مندرج ہیں:

ملا جوہر کنائی از نجبائے ایں شہر بود۔ دراصل از قوم نانت است۔ اکثر عمر صرف تحصیل علم نمودہ۔ شاگرد و مدرس مدرسہ سلطان قطب الدین کہ متصل مسجد صراف کدل بر کنار شرقی جوئے مار بود۔ اواخر عمر راہ حرمین محترمین گرفت، بعد ادائے حج اسلام، تحصیل سند و اجازت حدیث از فحول و اکابر علما و محدثین مکہ معظّمہ کردہ و خدمت مولانا علی قاری را دریافت بلکہ بصحبت حضرت شیخ ابن حجر مکی ہم رسید، و اجازت بسند معنعن حاصل ساخت۔ چوں بہ کشمیر معاودت فرمودہ گوشہ انزوا اختیار کرد و بعبادت و عزلت اشتغال نمود، و بجہت قوت حلال کسب پشم پیشہ گرفت، و بسیار بہ قناعت می گزرانید و توکل و انزوا را بدرجہ اکمل رسانید، و درس علوم دینیہ ہم می گفت، در واقعہ وبائے عامہ در سال ہزار و بیست و شش رحلت فرمود، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔ بعض اولاد امجادش بکمالات صوری و معنوی فائز شدند۔ مزار ایشاں طرف شرقی مقبرہ حضرت اخوند ملا حسین خباز بہ کمال بے تکلفی واقعست [1]۔

اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

ملا جوہر کنائی، اس شہر (کشمیر) کے شرفا و نجبا میں سے تھے۔ دراصل نانت برادری کے فرد تھے۔ عمر کا زیادہ تر حصہ تحصیل علم میں گزرا۔ مدرسہ سلطان قطب الدین کے، جو کہ مسجد صراف کدل کے متصل، دریائے مار کے مشرقی کنارے واقع تھا، شاگرد اور مدرس تھے۔ آخر عمر میں حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے۔ مناسک حج ادا کرنے کے بعد مکہ معظّمہ کے فحول اور اکابر علما و محدثین سے سند و اجازۂ حدیث حاصل کیا اور ملا علی قاری سے ملے، بلکہ شیخ ابن حجر مکی کی خدمت میں بھی حاضری دی اور بہ سند معنعن اجازہ حاصل کیا۔ واپس کشمیر تشریف لائے تو گوشۂ علیحدگی اختیار کر لیا اور عبادت و عزلت نشینی کو شعار ٹھہرایا۔ رزق حلال کے لیے پشم کاتنے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ نہایت قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے، گوشہ نشینی اور توکل علی اللہ میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی علوم دینیہ کے درس و تدریس کا سلسلہ بھی باقاعدہ جاری تھا۔ ۱۰۲۶ھ/ ۱۶۱۷ء کو رحلت فرمائی، جب کہ پورے علاقے میں عام وبا پھیلی ہوئی تھی، رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کی اولاد میں سے بعض حضرات صوری و معنوی اعتبار سے مرتبہ بلند پر فائز ہیں۔ ملا جوہر نانت قبرستان ملا حسین خباز کے مشرقی جانب

---

[1] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

Marfat.com

مدفون ہیں۔ ان کی قبر سادگی اور بے تکلفی کا نمونہ ہے۔

سرزمین کشمیر میں جن علمائے عظام نے اسلام کی تبلیغ اور دین کی ترویج کے لیے زندگیاں وقف کر دیں، ان میں ملا جوہر نانت کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ انھوں نے بے شمار لوگوں کو دین کی تعلیم دی اور مدت تک درس و تدریس کے ذریعے قال اللہ و قال الرسول کی دل نواز صدا بلند کرتے رہے [1]۔

۷۸۔ امیر جوہر احمد نگری

جوہر دکنی احمد نگری، دیار ہند کے مشاہیر اور کبار امرا میں سے تھے۔ شافعی المسلک تھے اور حسن سیرت کا اعلیٰ نمونہ۔ بہت ہی نیچے درجے سے ترقی کر کے امارت کے بلند منصب تک پہنچے تھے۔ قصہ یہ ہے کہ جوہر چھوٹی عمر ہی میں سرزمین ہند میں آ گئے تھے۔ ان کو اور ان کے بھائی کو دکن کے حکمران برہان نظام شاہ نے خرید لیا تھا۔ اس نے جوہر میں قابلیت و حشامت کے آثار دیکھے تو قرآن مجید کے ایک معلم کے سپرد کر دیا، جس سے انھوں نے قرآن پڑھا اور حفظ کیا۔ بعد ازاں شہسواری، تیر اندازی اور شمشیر زنی وغیرہ میں مہارت پیدا کی۔ ملک عنبر نے ان کی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر انھیں اپنی بیٹی کی ملکیت میں دے دیا تھا۔ اب انھوں نے ارتقا کی منزلیں طے کرنا شروع کیں اور رفتہ رفتہ دو سو اسپ سواروں کے امیر مقرر ہو گئے۔

اس شافعی المسلک امیر نے اہل علم کی ایک جماعت سے سماع علم کیا۔ بہت سی درسی و دینی کتابیں پڑھیں۔ متعدد مشائخ کی مصاحبت اختیار کی۔ امام شیخ عبداللہ عیدروس سے منسلک رہے اور ان سے خرقہ طریقت و تصوف زیب تن کیا۔ ان کے علم و فضل کی وسعت پذیری کا اندازہ شلی کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ جب امیر جوہر سفر ہند پر روانہ ہوئے، میں ان کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بہت بڑے فاضل ہیں اور علم کے مختلف گوشوں پر انھیں عبور حاصل ہے۔ انھوں نے مجھ سے حدیث، فقہ اور نحو کی کتابیں پڑھیں۔ وہ گلستانِ علم کے ہر گوشے سے آشنا تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ، عبادت میں بھی بہت آگے نکلے ہوئے تھے۔ ہر وقت تلاوت قرآن، ذکر الٰہی اور وظائف و اوراد پڑھنے میں مصروف رہتے۔ دقیق اور مشکل موضوع پر مشتمل کتابوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ ملوک و سلاطین کی تاریخ اور سیرت خلفا پر دست رس حاصل تھی۔ راسخ العقیدہ، مصلح، خوش مزاج، شجاع، با اثر اور عمدہ کردار کے حامل تھے۔ سیاست دان، ذی فہم، رعایا کے مسائل سے آگاہ، جنگ جو اور مجاہد تھے۔ اہل کفر کے ساتھ انھوں نے باقاعدہ جنگیں لڑیں۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ لی اور وقت میں انقلاب و تغیر کی ایسی لہر چلی کہ وہ مملکت کے معاملات سے دور ہو گئے اور بیجاپور چلے گئے۔ اس مجاہد عالم و فقیہ نے بیجاپور ہی میں ۱۰۵۶/ ۱۶۴۶ء کو وفات پائی [2]۔

---

[1] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۰۳، ۱۰۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۱۹۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۳۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۴۴۔ ادبی دنیا کشمیر نمبر

[2] خلاصۃ الاثر۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۱۹، ۱۲۰۔

Marfat.com

ح

۷۹۔ مولانا حاجی محمد کشمیری

مولانا حاجی محمد کشمیری اصلاً ہمدان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اسلاف میں سے کوئی بزرگ شیخ علی ہمدانی (متوفی ۶ ذی الحجہ ۷۸۶ھ/ ۱۹ جنوری ۱۳۸۵ء) کے ساتھ ہمدان سے کشمیر آئے، اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ حاجی محمد کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو دل میں طلب علم کا جذبہ موجزن ہوا۔ حصول علم کی غرض سے عازم دہلی ہوئے اور وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ طبیعت تصوف وطریقت کی طرف مائل ہوئی تو اس دور کے شیخ کبیر خواجہ باقی باللہ دہلوی (متوفی ۱۴ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۴ھ/ ۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء) کی خدمت میں حاضری دی اور ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ جب حدیث، فقہ اور طریقت میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے تو دہلی سے واپس کشمیر تشریف لے گئے۔ وہاں درس وافادہ کی مسند آراستہ کی اور قال اللہ اور قال الرسول کا روح پرور غلغلہ بلند کیا۔

مولانا حاجی محمد کشمیری اس درجہ پاک باز بزرگ تھے کہ کبھی دنیا داروں کے دروازے پر دستک نہیں دی اور اپنا دامن دنیا طلبی کے میل سے آلودہ نہیں کیا۔

مولانا حاجی محمد کشمیری درس وتدریس اور تصوف وطریقت کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں سے شرح حصن حصین، شرح شمائل ترمذی، فضائل قرآن کے موضوع پر ایک کتاب، مصباح الشریعۃ اور شرح الاوراد قابل ذکر ہیں۔

سرزمین کشمیر کے اس جید عالم وفقیہ اور نامور صاحب سلوک بزرگ نے جمعرات کے روز ۲۹ صفر ۱۰۰۶ھ کو وفات پائی۔ ''نوزدہم بود زشہر صفر'' مادۂ تاریخ وفات ہے [1]۔

۸۰۔ مولانا حبیب اللہ سندھی

مولانا حبیب اللہ سندھی اپنے عہد کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے اور اپنے دور کے فحول علمائے احناف میں گردانے جاتے تھے۔ اعمال بھکر میں ہنکورنام کا ایک قریہ تھا۔ اس قریہ میں شیخ عباس بن جلال سندھی کا ایک مشہور مدرسہ تھا۔ مولانا حبیب اللہ سندھی اس مدرسے کی مسند تدریس پر فائز تھے۔ خاصی مدت اس مدرسے میں ان کا سلسلہ درس جاری رہا اور بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ مولانا حبیب اللہ سندھی گیارھویں صدی ہجری کے سراپا خلوص، عبادت گزار، علوم وفنون میں ماہر اور اپنے اقران ومعاصرین میں برگزیدہ شخص تھے [2]۔

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند، ص ۶۴۔ محبوب الالباب۔ تاریخ کشمیر اعظمی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۵، ۱۲۶۔

[2] اذکار ابرار، ص ۳۰۶، بضمن یاد مخدوم عباس۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۸۔

Marfat.com

۸۱۔ مفتی حسام الدین دہلوی

مفتی حسام الدین کا سلسلہ نسب یہ ہے: حسام الدین بن سلطان بن ہاشم بن رکن الدین بن مفتی جمال الدین حنفی دہلوی۔ معروف عالم اور اپنے دور کے مشہور فقہا میں سے تھے۔ شاہ جہان بادشاہ کے عہد میں، دہلی کے منصب افتا پر متعین تھے۔ اپنے علم وفضل کی وجہ سے عوام وخواص میں عزت وتکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ❶۔

۸۲۔ سید حسن بلگرامی

سید حسن بن نوح بن محمود حسینی واسطی بلگرامی، شیخ وقت، نامور عالم اور معروف فقیہ تھے۔ فقہ کی ایک درسی کتاب قدوری پر حاشیہ سپرد قلم کیا۔ ۱۰۰۸ھ/۱۶۰۰ء تک زندہ تھے۔ ان کی وفات ۹ رشعبان کو ہوئی۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کس سن میں ہوئی ❷۔

۸۳۔ سید حسین بلگرامی

سید حسین بلگرامی بھی سید نوح بن محمود حسینی واسطی کے بیٹے تھے۔ سید حسن بلگرامی کے بھائی تھے۔ جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے نامور فقہا میں ہوتا تھا۔ بغیر کسی معقول وجہ کے گھر کی چار دیواری سے باہر نہ نکلتے۔ اصل مشغلہ کتابت اور عبادت تھا اور اس میں بہت مشہور تھے۔ تاریخ وفات کا علم نہیں ہوسکا۔ البتہ ۱۰۰۸ھ/۱۶۰۰ء تک زندہ تھے ❸۔

۸۴۔ شیخ حسین ہروی

شیخ حسین بن باقر گیارھویں صدی ہجری کے فاضل ہندی عالم تھے اور حدیث وسیرت میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے شمائل ترمذی کی دو شرحیں جلال الدین اکبر کے دو بیٹوں کے لیے قلم بند کیں۔ پہلی شرح فارسی نثر کی صورت میں شہزادہ سلیم کے لیے لکھی۔ دوسری شرح بصورت نظم شہزادہ مراد کے لیے تصنیف کی۔ دونوں نہایت عمدہ اور بہترین شرحیں ہیں ❹۔

---

❶ شمس التواریخ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۸۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۲۔ شمس التواریخ۔

❸ مآثر الکرام، ص ۲۱۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۴۔

❹ منتخب التواریخ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۴۔

Marfat.com

۸۵۔ مولانا حسین خباز کشمیری

مولانا حسین خباز کشمیری، سرزمین کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ شیخ محمد قادری سے اخذ علم کیا اور کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہنے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ پھر دہلی کا عزم کیا اور شیخ عبدالشہید احراری سے مستفیض ہوئے اور ایک مدت تک ان کی مصاحبت اختیار کیے رکھی۔ بعدازاں شیخ باقی باللہ کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے استفاضہ کیا اور طویل عرصہ ان کی صحبت میں گزارا۔ پھر مراجعت فرمائے کشمیر ہوئے اور بقیہ عمر عبادت الٰہی اور علما وطلبا کے افادے میں صرف کردی۔

مولانا حسین خباز ارض کشمیر کے نامور شیخ، اونچے درجے کے عالم دین، معروف فقیہ اور صاحب فضل و صلاح بزرگ تھے۔ بعض کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء کو کشمیر میں فوت ہوئے ❶۔

۸۶۔ قاضی حسین سترکھی

قاضی حسین بن ابوالحسن سترکھی معقولات ومنقولات کے ماہر تھے اور شیخ عبدالرزاق بن خاصۃ الصالح امیٹھوی (متوفی ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۷ء) کے شاگرد تھے۔ ان سے طویل عرصے تک فیض حاصل کرتے رہے۔ شیخ عبدالرزاق نے ان کے علم وفضل اور صالحیت سے متاثر ہوکر اپنی ایک بیٹی ان کے عقد میں دے دی تھی۔ قاضی حسین سترکھی سے شیخ جعفر بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی (متوفی ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۶ء) نے علم حاصل کیا ❷۔

۸۷۔ مولانا حمید الدین سندھی

مولانا حمید الدین بن عبداللہ بن ابراہیم عمری سندھی۔ سندھ کے ایک مشہور شہر بدربیلہ میں پیدا ہوئے اور عمر کا کچھ حصہ وہیں گزارا۔ تحصیل علم بھی اسی شہر اور اسی نواح کے علمائے کرام سے کی۔ پھر ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور اسی ارض مقدس میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ حرمین شریفین میں وہاں کے جید اور مشہور اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا، جن میں شیخ ابوالحسن شافعی بکری، شیخ احمد بن حجر ہیتمی مکی، مدینہ منورہ کے خطیب شیخ نورالدین علی بن عراق، شیخ نجم الدین محمد بن احمد غیطی مصری، شیخ محمد سالم طبلاوی، شیخ محمد علقی شافعی مصری اور شیخ عبدالقادر حنفی مصری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا حمید الدین اپنے دور کے شیخ، امام، عالم کبیر اور محدث تھے۔ انھوں نے مکہ مکرمہ میں مسند علم و فضل آراستہ کی اور بے شمار علما وطلبا نے ان کے چشمۂ علم سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ ان کے درس وتدریس کا حلقہ

❶ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۳۲، ۱۳۳۔ خزینۃ الاصفیا۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۵، ۱۳۶۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۶، ۱۳۷۔

Marfat.com

بہت وسیع تھا، جس میں عرب وعجم کے مشہور اصحاب علم مستفید ہوئے۔ ان حضرات علمائے عظام میں شیخ محمد بن احمد عجل ابوالوفا یمنی، شیخ عبدالرحمٰن بن عیسیٰ عمری مرشدی مفتی حرم مکہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اسمائے گرامی بالخصوص لائق تذکرہ ہیں۔

عبدالقادر حضرمی نے النور السافر فی اخبار القرن العاشر میں ان کے بھائی شیخ رحمت اللہ سندھی مہاجر مکی کے حالات کے ضمن میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ رحمت اللہ سندھی کے ایک بھائی حمید اللہ سندھی تھے، جو علم وصلاح سے متصف، حسن اخلاق کے حامل، متواضع، ذی فضل، عقل وخرد سے مالا مال، فہم وفراست کے مالک، نجابت وشرافت کے پیکر اور جلیل القدر انسان تھے۔ اللہ نے ان کو بے حد عزت و جاہ اور عظمت و وجاہت سے نوازا تھا۔ وہ نو سال مکہ مکرمہ میں سکونت پذیر رہے اور بالآخر ۹۰ سال عمر پا کر ۱۰۰۹ھ/ ۱۶۰۱ء کو اسی ارض مقدس میں وفات پائی اور اپنے عظیم القدر بھائی شیخ رحمت اللہ کے قریب قبرستان معلیٰ میں دفن ہوئے۔

خلاصۃ الاثر میں محمد بن فضل اللہ مجی رقم طراز ہیں کہ شیخ حمید اللہ سندھی، صاحب معارف وفنون تھے۔ اصلاً اقلیم سندھ کے باشندے تھے اور وہیں وقار وعظمت کے جلو میں نشوونما پائی۔ رفیع المنزلت عالم دین تھے۔ بعد کو حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے۔ وہاں بہت سے علما وافاضل کی صحبت میں رہنے کی سعادت حاصل کی، جن میں خود ان کے بھائی شیخ رحمت اللہ سندھی اور حافظ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد شیخ عبدالرحمٰن ابوالفضل زین الدین شامل ہیں۔

شیخ حمید الدین بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ مکہ مکرمہ میں بڑی تکریم واحترام کے حامل تھے۔ متقی، خوش اخلاق، حسن سیرت سے بہرہ ور، خوف خدا رکھنے والے اور بلند مرتبہ عالم دین تھے۔ نو سال مکہ مکرمہ میں مقیم رہنے کے بعد ۱۰۰۹ھ/ ۱۶۰۱ء میں اسی پاک سرزمین میں سفر آخرت کو روانہ ہوئے [1]۔

۸۸۔ مولانا حیدر کشمیری

مولانا حیدر کشمیری، خواجہ فیروز کشمیری کے فرزند تھے۔ بے حد ذہین، سریع الفہم اور قوی الحفظ۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ ابتدائی کتابیں معروف کشمیری عالم شیخ نصیب الدین سے پڑھیں۔ پھر مولانا جوہر نانت محدث کشمیری کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اور ان سے علوم مرجہ کی بہت سی کتابوں کی تحصیل کی اور علم وفضل کی دولت سے بہرہ ور ہوئے۔ جب ارض کشمیر کے مشاہیر علما سے فیض یاب ہو چکے تو دہلی کا قصد کیا۔ وہاں محدث شہیر شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ تدریس جاری تھا، اس میں شریک ہو گئے اور شیخ ممدوح سے اخذ علم کیا۔ بعد ازاں اپنے وطن کشمیر کو معاودت فرمائی اور دلجمعی اور مستقل مزاجی سے تدریس وافادہ میں

[1] النور السافر، بضمن شیخ رحمت اللہ سندھی۔ خلاصۃ الاثر۔ تاریخ معصومی، ص ۲۷۹۔ تحفۃ الکرام، ص ۴۴۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۷، ۱۳۸۔

Marfat.com

مشغول ہو گئے۔ ان کا حلقہ درس بڑا وسیع تھا۔ اپنے دور کے نامور مدرس، محدث اور فقیہ تھے۔ تمام علوم پر گہری نظر رکھتے تھے اور طلبا سے لطف و مہربانی سے پیش آتے تھے۔ لوگوں سے منقطع اور علیحدہ ہو کر صرف تدریس کو اصل مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ بعض فرماں روایان کشمیر نے مولانا حیدر سے کئی مرتبہ عہدۂ قضا قبول کرنے کی درخواست کی مگر انھوں نے اس منصب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس پر درس و افادہ کو ترجیح دی۔ جب ایک حکمران کی طرف سے قبول منصب کا اصرار زیادہ بڑھا تو رات کی تاریکی میں شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر جب پتا چلا کہ دوسرے عالم کو قاضی مقرر کر دیا گیا ہے تو واپس آ گئے۔

غرض مولانا حیدر سرزمین کشمیر کے وہ عالم و مدرس تھے جنھوں نے تمام عمر درس و تدریس میں صرف کر دی اور بے شمار علما و طلبا کو دولت علم سے مالا مال کیا۔ ۱۰۵۷ھ/ ۱۶۴۷ء کو رحلت فرمائی[1]۔

ــــ خ ــــ

۸۹۔ خواجہ بہاری لاہوری

خواجہ بہاری لاہوری، اپنے دور کے مفسر، محدث، فقیہ اور متقی بزرگ تھے۔ ابتدا میں تحصیل علم کی نیت سے اپنے وطن حاجی پور سے گودہ پور گئے جو اس زمانے میں ایک قصبہ تھا۔ وہاں شیخ جمال الاولیا کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے کچھ علوم حاصل کیے۔ اس کے بعد عازم لاہور ہوئے۔ لاہور اس عہد میں مولانا محمد فاضل بدخشی لاہوری (متوفی ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰ء) کے غلغلہ تدریس سے گونج رہا تھا، خواجہ بہاری بھی ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ ان ہی سے دستار فضیلت حاصل کی اور ان ہی کے گھر میں سکونت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد حضرت میاں میر کے زمرۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور ان کے خلیفہ مقرر ہوئے۔

خواجہ بہاری لاہوری نے ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۵۰ء کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے[2]۔

۹۰۔ قاضی خلیل الرحمٰن گورکھ پوری

قاضی خلیل الرحمٰن گورکھ پوری حنفی المسلک تھے۔ اپنے عصر کے افاضل اور کبار علما میں سے تھے۔ صالح، عفیف اور اونچے کردار کے مالک تھے۔ منصب قضا پر فائز تھے اور اس سلسلے میں انتہائی دیانت دار اور بہتر شہرت کے مالک تھے۔ گورکھ پور کے والی فدائی خاں کے ہاں ان کو خاص قربت حاصل تھی اور اس نے ان کی گوناگوں صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان کو اپنا ندیم و مشیر مقرر کر لیا تھا۔ پھر سلطان ہند اورنگ زیب عالم گیر سے

---

1. تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۴۳، ۱۴۴۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۴۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۸، ۴۰۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۹
2. تذکرۂ علمائے ہند، ص ۵۸۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۱۲۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۶۸، ۱۶۹۔ عمل صالح، ج ۳، ص ۳۷۶۔

Marfat.com

ان کا ذکر کیا اور خاص طور پر ان کی سفارش کی۔ اورنگ زیب ان سے انتہائی تکریم سے پیش آیا اور اپنی قبولیت اور عنایات سے سرفراز کیا، حتیٰ کہ انھیں گورکھ پور کا والی مقرر کر دیا❶۔

۹۱۔ قاضی خوب اللہ جون پوری

قاضی خوب اللہ جون پوری، شیخ محمد حفیظ حسینی جون پوری کے نواسے تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے عصر کے جید اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ فاضل اور شیخ وقت تھے۔ علوم عربیہ اور علم نحو میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ علم حدیث میں بالخصوص درک رکھتے تھے۔ اٹھارہ سو مرفوع احادیث زبانی یاد تھیں۔ الہ آباد میں عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ تمباکو نوشی کے بارے میں ان کے دو شعر قابل ملاحظہ ہیں:

تنبا کو گرچہ ہست زیاں کار بے   زو فائدہ ہیچ گہ ندید است کسے
آخر بہ ازیں چہ خوب باشد ترا   خاموش کند زہرزہ گفتن نفسے

قاضی خوب اللہ جون پوری نے ۱۴؍ شعبان ۱۱۰۰ھ/ ۲۴؍ مئی ۱۶۸۹ء کو وفات پائی❷۔

۹۲۔ مولانا خوشحال تاشقندی

مولانا خوشحال بن قاسم بن مسکین تاشقندی، شیخ اور فاضل کبیر تھے۔ اپنے عہد کے کبار فقہا میں سے تھے۔ ہندوستان آئے اور شیخ وجیہ الدین گجراتی علوی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ ان سے تفسیر و فقہ، منطق و حکمت اور فلسفہ وغیرہ کی تحصیل کی۔ پھر شیخ وجیہ الدین گجراتی کے فاضل تلمیذ مرزا جان شیرازی سے شرح ہدایۃ الحکمۃ، حکمۃ العین، شرح التجرید اور حاشیہ قدیمہ، شرح چغمینی اور تحریر اقلیدس وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ تحصیل علم کے بعد احمد آباد کی مسند تدریس پر فائز ہوئے اور تیئیس (۲۳) سال علما و طلبا کو درس دینے میں مصروف رہے۔ ان کے حلقۂ درس سے بے شمار اہل علم نے استفادہ کیا۔ جب ۱۰۱۳ھ/ ۱۶۰۴ء کو بیرم خاں کا لڑکا عبدالرحیم خاں خاناں گجرات کا والی مقرر ہوا تو اس نے مولانا خوش حال تاشقندی کو ان کے علم و فضل اور فہم و فراست کی وجہ سے اپنے ندما میں شامل کر لیا اور بہت سے مال و منال اور عطایا سے نوازا❸۔

---

❶ مراۃ جہاں نما۔ ان کا اصل نام عبدالرحمٰن تھا۔ ملاحظہ ہو فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۲۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

❷ تجلی نور، ج ۲، ص ۱۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۱، ۱۴۲۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۳۳۷، ۳۴۷۔

❸ ماثر رحیمی، ج ۳، ص ۳۲ تا ۳۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۲۔

Marfat.com

۹۳۔ قاضی خوشحال کابلی

قاضی خوشحال کابلی حنفی علامہ وقت اور فاضل دوراں تھے۔ اپنے عنفوان شباب میں لاہور آئے۔ اس زمانے میں شیخ محمد یحیٰی کا سلسلہ درس جاری تھا، ان سے علوم عربیہ اور علم نحو کی تحصیل کی۔ پھر عازم بخارا ہوئے اور وہاں کے شہرۂ آفاق عالم شیخ یوسف قراباغی سے فنون حکمیہ کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۲ء کو واپس ہندوستان آئے۔ ''ہندوستان سے حجاز تشریف لے گئے اور حج و زیارت کی نعمت سے متمتع ہوئے۔ پھر ہندوستان آگئے اور اکبر آباد (آگرہ) گئے۔ دہلی کی مسند قضا پر متعین ہوئے۔ جب شاہ جہان نے قاضی محمد اسلم ہروی کو فوج کے منصب قضا سے معزول کر دیا تو قاضی خوشحال کابلی کو ان کی جگہ یہ عہدہ دیا گیا۔ پھر اورنگ زیب عالم گیر مسند آرائے سریر مملکت ہوا تو اس نے ان کو لاہور کا قاضی مقرر کر دیا، جس پر یہ عمر بھر متمکن رہے۔ ان کے حسن سلوک اور دیانت داری سے عوام و خواص خوش تھے۔ جب موت کا پیغام آیا تو آواز آئی:

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۞ ارْجِعِيٓ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ❶

اور ان کی روح عالم علوی کو پرواز کر گئی❷۔

د

۹۴۔ مولانا دانیال جوراسی

مولانا دانیال حنفی عمری جوراسی، شیخ زین الدین کی نسل سے تھے، جو شیخ نصیر الدین محمود اودھی دہلوی کے بھانجے ہوتے تھے۔ علاقہ اودھ میں پیدا ہوئے۔ وہیں تربیت پائی اور عبدالسلام اعظمی دیوی سے تحصیل کی۔ یہاں تک کہ علوم میں مہارت پیدا کر لی اور افتاو تدریس کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو گئے۔ اس کے بعد طریقت و تصوف کی منزلیں طے کیں۔ عالم کبیر اور شیخ عصر تھے۔ درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں شیخ قطب الدین محمد سہالوی اور بہت سے علمائے کرام شامل ہیں❸۔

۹۵۔ مولانا داؤد مشکوٰتی کشمیری

مولانا داؤد مشکوٰتی کشمیری بن ملک مسعود غوری، گیارھویں صدی ہجری کے نام دار کشمیری علما میں سے

❶ یہ سورۂ فجر کی آیات نمبر ۲۷، ۲۸ ہیں۔ ترجمہ یہ ہے:
اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار (کے جوار رحمت) کی طرف چل، اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔

❷ مرآۃ العالم۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۲۰۷، ۲۰۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۲۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۴، بحوالہ بحر زخار۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۵۔

Marfat.com

تھے اور تفسیر، حدیث، فقہ اور علوم حکمیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مشکوٰۃ کے حافظ تھے، اس لیے خواجہ حیدر چرخی کشمیری نے انھیں داؤد مشکوٰتی کا لقب دے دیا تھا۔ خواجہ حیدر بن فیروز چرخی کے شاگرد تھے، اور علوم دینیہ ان ہی سے حاصل کیے تھے۔ طریقت و تصوف میں وادئ کشمیر کے مشہور صوفیا بابا ابوالفقرا نصیب الدین اور خواجہ خاوند محمود بخاری سے مستفیض تھے۔ کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے اور علم و معرفت میں ان سے استفاضہ کیا۔ تصوف و طریقت کے سلسلے کی متعدد عربی اور فارسی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں ایک کتاب اسرار الابرار ہے، جو کشمیری مشائخ و علما اور سادات و فقرا کے حالات کو محتوی ہے۔ ایک کتاب کا نام اثمار الاشجار ہے۔ ایک اور کتاب منطق الطیر ہے۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۰۹۷ھ/ ۱۶۸۶ء کو کشمیر میں وفات پائی[1]۔

۹۶۔ ملا درویزہ پشاوری

ملا درویزہ پشاوری جنھیں اخوند بابا درویزہ پشاور کہا جاتا ہے، صالح عالم دین تھے۔ فقہ و اصول اور علم کلام کے ماہر تھے۔ طریقت و تصوف سے بھی لگاؤ تھا اور اس ضمن میں سید علی ترمذی غواص سے مستفیض تھے، جو شیخ نظام الدین بن عبدالشکور تھانیسری (متوفی ۱۰۲۴ھ/ ۱۶۱۵ء) کے تلامذہ میں سے تھے۔

ملا درویزہ پشاوری، احکام اسلام کے سخت متبع تھے اور اس ضمن میں مجادلہ و مناظرہ میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ زنادقہ و ملاحدہ کے شدید مخالف تھے۔ شیعہ سے بھی ان کے مباحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بالخصوص عیسیٰ ملامتی اور بایزید ملحد سے (جو پیر روشن کے نام سے موسوم تھا) ان کے اکثر مباحثے ہوتے۔ دین کے درد اور اسلام کی محبت سے ان کا دل معمور تھا۔ پشاور اور اس کے گردونواح میں بہت مشہور تھے اور درس و تدریس کا وسیع حلقہ قائم تھا۔ تمام عمر علما و طلبا کو علمی فائدہ پہنچانے اور ان کی ذہنی و عملی تربیت میں کوشاں رہے۔

ملا درویزہ تصنیف و تالیف کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ مخزن الاسلام ان کی مشہور کتاب ہے جو پشتو زبان میں ہے۔ اس میں اسلام کے حقائق و معارف اور احکام شرع وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ کتاب وہ اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکے۔ اس کی تکمیل ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مولانا عبدالکریم (متوفی ۱۰۷۲ھ/ ۱۶۶۲ء) نے کی۔ انھوں نے مخزن الاسلام کی شرح بھی سپرد قلم فرمائی، جسے کلمات باقیات کے نام سے موسوم کیا۔ خواجہ معین الدین خویشگی نے بھی اس کی شرح لکھی۔ اس شرح کا نام الکلمات الوافیات ہے۔

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات علما و مشائخ نے افغانوں میں تبلیغ دین کی طرح ڈالی، ان کے علاقے میں رشد و ہدایت کی بساط بچھائی اور انھیں اسلامی تعلیم سے آشنا کیا، ان میں سید علی غواص ترمذی المعروف حضرت پیر بابا اور ان کے مرید و شاگرد اخوند درویزہ پشاوری کے اسمائے گرامی خاص طور سے

[1] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۷۶، ۱۷۷۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۶۴۵، ۶۴۶۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۵، ۱۴۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۲۳، ۴۲۴۔

Marfat.com

قابل ذکر ہیں۔ سید علی غواص سادات ترمذ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا مولد ومنشا قندس تھا۔ ان کے والد مغل حکمران نصیر الدین ہمایوں کی فوج میں ایک منصب پر فائز تھے اور اسی کے ساتھ وارد ہند ہوئے تھے۔ لیکن سید علی غواص پر فقر و درویشی کا رنگ غالب رہا۔ وہ مشائخ وصوفیا سے استفاضہ کے لیے پانی پت اور اجمیر وغیرہ بھی گئے۔ خرقہ خلافت، طریقہ چشتیہ میں اجمیر کے سید سالار سے حاصل ہوا، اور مرشد نے کوہستان کو مرکز تبلیغ ٹھہرانے کی ہدایت کی۔ ان کی دو گیلانی عقیدت مندوں نے انھیں علاقہ افغان میں اقامت گزین ہونے پر آمادہ کیا۔ اس وقت اس علاقے کی جو مذہبی حالت تھی، وہ اخوند درویزہ نے اپنے مرشد سید علی غواص کی زبانی بیان کی ہے۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔ فرماتے ہیں:

''اس علاقے کے لوگوں کو میں نے انتہائی سادہ دل، ہر آن دین کی طلب وتلاش میں ساعی اور خدا رسیدہ پایا۔ دین کے معاملے میں جوان بوڑھوں سے آگے نکلے ہوئے، عورتیں مردوں سے بڑھ کر دین پر کاربند، بچے عالم طفولیت ہی میں نیکی وتدین کے متلاشی، اور ان کے کارندے بھی احکام شریعت پر عامل۔ ان لوگوں میں قبول حق کی صلاحیت تو موجود تھی مگر پورے علاقے میں نہ کوئی درس کا سلسلہ تھا، نہ کوئی مکتب ومدرسہ۔ نہ کہیں علم تھا اور نہ علما واتقیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت سے بے بہرہ مشائخ اور دین سے تہی دامن پیروں نے ان لوگوں کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر ان کو غلط راہوں پر ڈال دیا۔''

افغانوں کی یہ حالت دیکھ کر سید علی خواص ترمذی نے ان کے علاقے میں قیام پذیر ہونے اور ان کی اصلاح وتربیت کا تہیہ کر لیا۔ نیت چوں کہ نیک تھی، اس لیے اللہ نے کامیابی سے ہم کنار کیا اور اس نواح میں بڑی قبولیت حاصل کی۔ جہاں کہیں کسی بے علم اور شریعت سے بے بہرہ پیر کی اطلاع پاتے، وہاں پہنچتے اور اس سے باقاعدہ مباحثہ ومجادلہ کرتے۔ تذکرۃ الابرار والاشرار میں ایسے متعدد مدعیان مذہب کے نام مرقوم ہیں، جن سے سید علی غواص کے مقابلے ہوئے۔ ان کے سب سے اہم اور زوردار معرکے فرقہ روشنیہ کے پیر روشن سے ہوئے۔ پیر روشن کا اصل نام بایزید تھا۔ ان معرکوں میں اللہ تعالیٰ نے سید علی غواص کو کامیابی عطا فرمائی۔

غرض سید علی غواص نے پورے جوش وخروش اور بے حد محنت سے افغان علاقوں میں صحیح اسلام کی اشاعت کا آغاز کیا، جس کے نتیجے میں خلق کثیر ان سے فیض یاب ہوئی۔ ان کی مساعی تبلیغ کا سب سے نمایاں اور اہم پہلو یہ ہے کہ اخوند درویزہ پشاوری اور ان کے لڑکے شیخ عبدالکریم ان کے حلقہ ارادت وعقیدت میں شامل ہو گئے۔ اخوند درویزہ نے اپنی کتاب مخزن الاسلام میں سید علی غواص کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کی ان مساعی کو بہت سراہا ہے جو انھوں نے ملاحدہ اور زنادقہ کے خلاف انجام دیں۔ سید علی غواص نے ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء کو وفات پائی اور یوسف زئی علاقے میں بونیر اور سوات کی سرحد پر دفن کیے گئے۔

ملا اخوند درویزہ پشاوری اس نواح کے وہ بزرگ ہیں جو سید علی غواص ترمذی کے سب سے نامور عالم

Marfat.com

دین مرید اور شاگرد تھے۔ افغانوں میں یہ اپنی زیرکی وعلمیت کی بنا پر خاص شہرت اور احترام کے مالک ہیں اور اس نواح میں اخوند بابا یا اخون بابا کے عرف سے معروف ہیں۔ وہ علوم ظاہری میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ولی اللہ بزرگ تھے، اور بحر تصوف کے شناور! لیکن اپنی ولایت کو پردۂ تعلیم و تدریس اور ملائیت میں مستور کر رکھا تھا۔ خزینۃ الاصفیا میں ان کی اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"جمال ولایت خود را در پردۂ تدریس و تعلیم و ملائی پوشیدہ می داشت۔"

اخوند درویزہ کے بزرگ اصلاً علاقہ ننگرہار کے رہنے والے تھے، جسے اب جلال آباد کہا جاتا ہے اور مشرقی افغانستان میں واقع ہے۔ مغلوں اور یوسف زئی قبائل کی کش مکش میں ان کے دادا وفات پا گئے تو یہ خاندان مہمندوں کے علاقے میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہیں اخوند کی پرورش ہوئی۔ ابتدا میں انھیں زہد و ریاضت سے دلچسپی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی علوم ظاہری کی تکمیل بھی کی اور مروجہ علوم انہماک اور توجہ سے پڑھے۔ اخوند کے والد گرامی بھی صاحب علم بزرگ تھے۔ "ادبیات سرحد" میں ان کا نام اخون گدا لکھا ہے، لیکن اخوند صاحب کے بیٹے مولانا عبدالکریم تو علمی اعتبار سے اپنے دادا اخوند گدا سے بہت آگے نکل گئے تھے۔

برصغیر کی دینی اور علمی تاریخ میں اخوند درویزہ کے تعلیمی اور تبلیغی کارناموں کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور ان کی مساعی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ فرقہ روشنیہ کے خلاف محاذ آرائی ہے۔ اس میں وہ کامیاب رہے اور ہر میدان میں اس کے قائد پیر روشن کو شکست دی۔ جس رفتار سے اس فرقے کے اثرات پھیل رہے تھے اس کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اخوند درویزہ اس کے خلاف نبرد آزما نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ تمام افغانوں یا کم از کم ان کے مشرقی قبائل کو یہ غلط مذہبی نظام اپنی لپیٹ میں لے لیتا اور ان کی مذہبی حمیت اور دینی غیرت اس سے سخت مجروح ہوتی۔ اخوند درویزہ اور ان کے خاندان کے اہل علم اور ان کے عقیدت مند میدان عمل میں اترے اور انھوں نے علوم اسلامی کی ترویج و اشاعت کے لیے پشتو زبان میں کتابیں لکھیں اور ساتھ ہی ساتھ طریقہ روشنیہ کی تقریروں، مباحثوں اور مناظروں کے ذریعے بھرپور مخالفت کی۔ بایزید کو اس کے معتقدین "پیر روشن" کے نام سے پکارتے تھے، لیکن اخوند درویزہ نے اس کو "پیر تاریک" کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے مریدوں کے ساتھ مناظرے کیے۔ اس ضمن میں خزینۃ الاصفیا میں صاف لفظوں میں مسطور ہے:

"در رفع زنادقہ و ملاحدہ و رفض بسیار می کوشید و ہر جا کہ ملحدے یا رافضی شنیدے نزد او رسیدے و با او مذاکرہ کردے و او را ملزم ساختے۔"

اخوند درویزہ کے مرشد، سید علی غواص ترمذی بھی زنادقہ و ملاحدہ کے سخت مخالف تھے۔ اب مرید نے بھی ان کے خلاف محاذ قائم کر لیا اور اس میں اس درجہ شدت اختیار کی کہ جہاں جہاں بایزید جاتا، یہ بھی اس کے تعاقب میں وہاں پہنچتے، اس سے مباحثہ کرتے، یہاں تک کہ اس کو لاجواب کر دیتے۔ وہ مارے خجالت و شرمندگی کے خاموش ہو جاتا اور تاب سخن نہ پاتا۔ اس سلسلے میں اپنے مرشد کے ساتھ بھی جاتے اور تنہا بھی۔ اپنی

Marfat.com

تصنیف مخزن الاسلام میں وہ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

چوں حضرت پیر دست گیر ایں فقیر، شیخ المشائخ و اولیاء، سیف السنّت۔ سید علی ترمذی درمیان افغانان یوسف زئی در موضع بونیر بودہ، از بایزید خبر یافتہ، دفع دعویٰ او را بر خود فرض دید...... پس ایں فقیر ہم ہمراہ برفتم، او را دعوای خجل و شرمسار ساختم کہ سخن گفتن و دم زدن در حضور نتوانست، تا لقب او را پیر تاریک کردم، وہذا بکرات و مرات گاہے با حضرت پیر و با حیلہ گاہی و گاہے بہ تنہائی خود حاضر می شدم و ایں ملحد را خجل ساختم۔

لیکن پیر روشن اور اس کے فرقے کے ملحدانہ افکار کی مخالفت میں اخوند درویزہ کو وہ کامیابی نہ حاصل ہوتی تھی، جس کی وہ توقع کرتے تھے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس علاقے میں کوئی ایسی اسلامی حکومت قائم نہ تھی جو رفع شر اور ترویج خیر کا مناسب انتظام کرتی۔ دوسرے اس نواح میں علوم اسلامی کی اشاعت کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ اخوند ممدوح فرماتے ہیں کہ افغان دین سے محبت رکھتے ہیں اور اس کے طالب و متلاشی ہیں، لیکن دینی علم سے تہی دامن ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ میں اگر جاہل افغانوں میں سے کسی ایک شخص کو روکتا تو دوسرا بایزید کے پاس جا پہنچتا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر اخوند نے فیصلہ کیا کہ مسئلے کا اصل حل علوم دینی کی نشر و اشاعت ہے، چنانچہ انھوں نے پشتو اور فارسی زبان میں کئی کتابیں مرتب کیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

افغاناں چوں در طلب مولیٰ محبت تمام دارند و دین راجویان اند، اما بہ سبب نادانی و جاہلی کہ از علوم دینی محروم اند، حق را از باطل نمی دانند...... پس ایں فقیر می خواہد کہ متن عقائد بہ لفظ افغانی بیارد تا ہر کہ آں را در یابد و باور دار ہرگز گمراہ نہ کرد۔

اس موضوع سے متعلق ان کی مشہور تصنیف مخزن الاسلام ہے، جو پشتو زبان میں ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے عقائد و عبادات سے متعلق اہم اور بنیادی مسائل عربی اور فارسی کتابوں سے اخذ کر کے تحریر کیے ہیں اور اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ جو شخص سنت نبوی پر عامل نہ ہو اور تفسیر، حدیث اور فقہ کے علوم سے آگاہ نہ ہو، اسے ہرگز پیر یا پیشوا نہیں بنانا چاہیے۔

مخزن الاسلام کا بیشتر حصہ اخوند درویزہ کا اپنا تحریر کردہ ہے اور احکام شریعت کا تمام مواد ان ہی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ ان کے صاحب زادے مولانا عبدالکریم پشاوری نے دو ابواب کا اضافہ کیا ہے، جو حقائق و معارف کے بارے ہیں۔

اخوند درویزہ کو اس امر کا پورا پورا احساس تھا کہ بایزید کی بے راہ روی اس بات کا نتیجہ ہے کہ وہ طریقت کی غلط ترجمانی کرتا ہے اور شریعت پر طریقت کو ترجیح دیتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

''دریں ایام ہر کہ افغاناں در بلائے در آمدہ است، از پیری و مریدی در آمدہ است۔''

یعنی اس دور میں افغانوں میں جو برائیاں آئی ہیں وہ پیری مریدی کی وجہ سے آئی ہیں۔

مخزنِ اسلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مروجہ پیری مریدی اور طریق تصوف میں اصلاح کی ہے

Marfat.com

حد کوشش فرمائی۔ اس ضمن میں ان کی جامع اور مشہور تصنیف ارشاد الطالبین ہے، جو فارسی زبان میں ہے۔ اس کے آغاز میں وہ صاف الفاظ میں رقم طراز ہیں کہ اس دور کے مشائخ وصوفیا کے احوال واقوال، قرآن و حدیث کے صریح احکام سے متصادم ہیں۔ مختلف قسم کے الحاد و زندقہ نے لوگوں کے ذہن وفکر پر تسلط جما لیا ہے۔ سنت کے عالم اور عامل ان دیار میں اجنبی ہو کر رہ گئے ہیں اور صوفیائے عصر آئمہ دین کی روایات سے ہٹے ہوئے اور روگرداں ہیں۔ اس باب میں ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

اما بعد یکے از مریدانِ کمترینہ حضرت شیخ الاسلام والمسلمین، وارث علوم انبیا والمرسلین، شیخ علی ترمذی، یعنی اضعف عباد اللہ الباری ہمی گوید کہ...... چوں انواع اہل الحاد تغلب نمودہ اند، پس...... معتقدان و معتمدان مذہب سنت و جماعت، بل عالمان و عاملان مشرب شریعت را غریب الغربا دیدم...... از شدت تعصب دینی روز بروز درسوز وگداز در آمدم۔ اما از روئے تحقیق نظر کردم کہ سبب تفرق امت بہ ہفتاد وسہ گروہ چہ می باشد؟ جزامر شیخوخت مردودۂ مبتدعہ چیزے دیگر نیافتم زیرا کہ تمام افعال واقوال واحوال شیوخ ایں ایام را مخالف قرآن و حدیث ومخالف روایات آئمہ ومخالف حالات شیوخ سلف دیدم۔

اخوند درویزہ کے نزدیک امت کے اختلافات اور عوام کی گمراہی کا اصل سبب یہی "شیخوخت مردودۂ مبتدعہ" یعنی مشائخ و اکابر کے غلط دعوے اور مبنی بر بدعت طور طریقے ہیں اور ان کا علاج قرآن و حدیث کی اتباع اور ائمہ وشیوخ سلف کی پیروی ہے۔ انھوں نے روحانی مطلق العنانی اور خلاف شرع تصوف کی سخت الفاظ میں تردید کی ہے۔ ان کی تصانیف میں یہ شعر جو بایزید۔ پیر روشن۔ پر بظاہر صادق نظر آتا ہے، بار بار درج ہوا ہے۔

خیالاتِ نادانِ خلوت گزیں بہم برزند عاقبت کفر و دیں

بہر حال اخوند ممدوح نے جب محسوس کیا کہ افغان اگرچہ دین و مذہب کے دلدادہ ہیں، مگر قلت علم کی بنا پر ان کی اکثریت کو جاہل صوفیا نے صراط مستقیم سے دور کر رکھا ہے تو انھوں نے ان میں توسیع علم کی کوشش کی اور بڑی جدوجہد کے بعد اس میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔ انھوں نے ان لوگوں کو خاص طور پر ہدف تنقید ٹھہرایا، جو علم کو "حجاب اکبر" سے تعبیر کرتے تھے اور کہا کہ اگر علم فی الواقع حجاب اکبر ہے تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو کیوں رب زدنی علما کی دعا کا حکم دیا۔

اخوند درویزہ کی تصانیف میں سے چار کتابوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک مخزن الاسلام، دوسری ارشاد الطالبین، تیسری تلقین المریدین اور چوتھی تذکرۃ الابرار والاشرار۔ یہ کتابیں مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ وہ پشتو کے شاعر بھی تھے۔ میر احمد شاہ رضوانی مرحوم نے اپنی کتاب بہارستان میں فضیلت صبر کے بارے میں ان کی ایک مثنوی درج کی ہے۔

اخوند مرحوم اونچے درجے کے مصنف، شاعر، مصلح اور مبلغ اسلام تھے۔ انھوں نے صرف بایزید (یعنی

Marfat.com

پیر روشن) کا مقابلہ ہی نہیں کیا بلکہ جس جماعت اور گروہ کو بھی اسلام کے بنیادی ارکان اور عقائد دینیہ کے مخالف پاتے اس کے خلاف محاذ قائم کر لیتے۔ ان میں ''فدایان'' کا گروہ بھی تھا، جو اسماعیلیوں سے تعلق رکھتا تھا اور اس گروہ سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ اب بھی نواح چترال میں موجود ہیں۔ اس گروہ کی اخوند مرحوم نے شدید مخالفت کی۔ ایک روایت کے مطابق اخوند کی موت کا باعث بھی یہی گروہ ہوا تھا۔ اس کے سردار نے ان کو تربوز کھلا دیا تھا، جس میں زہر ڈالا گیا تھا۔ اسی کی وجہ سے اخوند کی موت واقع ہوگئی۔

اخوند درویزہ کے جوش اصلاح اور حمیت دینی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیر و مرشد شیخ علی غواص ترمذی کو بھی جن کا ان کے دل میں بے حد احترام تھا، غیر شرعی امور کے ارتکاب سے بلا جھجک ٹوک دیا تھا۔ شیخ علی غواص سلسلۂ چشتیہ سے منسلک تھے اور اس سلسلے کے رواج کے مطابق سماع کے قائل تھے۔ اخوند اس پر معترض ہوئے۔ سماع کو خلاف شرع قرار دیا اور مرشد کو اس سے منع فرمایا۔ شیخ علی نے کہا میں کبھی کبھی سماع کرتا ہوں اور اس لیے کرتا ہوں کہ اس سے مجھ پر بعض اسرار منکشف ہوتے ہیں، لیکن معترضوں کے پاس خاطر سے اسے ترک کرنے کو تیار ہوں، چنانچہ اخبار الاولیا میں مذکور ہے کہ اس کے بعد شیخ علی نے کبھی سماع نہیں کیا۔

اخوند عالم دین اور پابند شرع بزرگ تھے۔ بعض اوقات وہ اس درجہ یاد خدا میں مستغرق ہو جاتے اور ذکر الٰہی میں ڈوب جاتے کہ کسی چیز کا انھیں کچھ پتا نہ چلتا۔ اس قسم کا ایک واقعہ ''رود کوثر'' میں اخبار الاخیار کے حوالے سے مندرج ہے کہ ایک روز ایک خاتون سر پر تیل کا بھرا ہوا مٹکا اٹھائے جا رہی تھی۔ اخوند کو شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ خاتون سے کہا، بیٹی! پانی پلاؤ تو ثواب ملے گا۔ خاتون حیا اور ادب کے جذبات سے اس قدر مرعوب ہوئی کہ کچھ نہ کہہ سکی اور مٹکا اخوند کے سامنے رکھ دیا۔ انھوں نے پینا شروع کیا تو مٹکا خالی کر دیا۔ بعد کو منہ کا ذائقہ بدلا تو پتا چلا کہ یہ پانی نہ تھا، تیل تھا۔

اخوند درویزہ نے عہد شاہ جہانی میں ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں وفات پائی اور پشاور میں موضع ہزار خانی کے قریب مدفون ہیں

اخوند درویزہ کے صاحب زادے کا نام مولانا عبدالکریم تھا۔ یہ بھی عالم و فقیہ اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ انھیں ''محقق افغانستان'' کا خطاب حاصل تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ اشعار میں یہ خود کو اخوند کریمہ کہتے ہیں۔

اخوند کریمہ نے ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء کو انتقال کیا اور علاقہ یوسف زئی میں دفن کیے گئے۔

اخوند درویزہ کے تلامذہ اور تربیت یافتہ لوگوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ پیروی شریعت، اتباع سنت اور بدعات و خلاف شرع امور کی مخالفت اور بیخ کنی میں یہ حضرات اپنے استاذ و مرشد کے نقش قدم پر چلے۔ ان کی مساعی سے علاقہ سرحد میں علم و فضل کی شمع روشن ہوئی اور احکام شریعت پر عمل کی دیواریں استوار کرنے کے

Marfat.com

اسباب پیدا ہوئے۔ ان حضرات میں مولانا چالاک شاہ میانہ وشیخو شاہ شاہ جہان پوری وشیخ علی وغیرہ شامل ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ''ہر کہ بہ صحبت او پیوست، فضیلتے از علوم دینی یافت۔'' ان کی زبان پشتو تھی، لیکن فارسی اشعار بھی کہتے تھے اور ہندوستانی زبان میں بھی گفتگو کرتے تھے۔ ان کا سال وفات ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۳ء ہے اور مدفن پشاور!

اخوند درویزہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے افغانوں میں فرقہ روشنیہ اور اس کے بانی پیر روشن کا (جو میاں بایزید کے نام سے موسوم تھا) زور ختم کیا اور روشنی کے نام سے، وہ جو تاریکی پھیلا رہا تھا، اس کے اثرات دور کیے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ پیر روشن کے پوتے مرزا خان انصاری جو پشتو کے صاحب دیوان شاعر تھے، کسی زمانے میں کہا کرتے تھے کہ میرے اشعار کی شیرینی پیر روشن خان (پیر روشن) کی برکت سے ہے، لیکن اخوند درویزہ کی تبلیغ دین سے متاثر ہو کر مرزا خان انصاری نے فرقہ روشنیہ کو ترک کر دیا تھا اور ان تمام باتوں سے تائب ہو گئے تھے جو انھوں نے خلاف شرع کہی تھیں یا جن پر عمل کیا تھا۔ پشتو زبان میں علوم اسلامی کے متعلق جو کتابیں بصورت نثر یا نظم لکھی گئیں وہ سب اخوند درویزہ کی تبلیغی مساعی کا نتیجہ ہیں۔

ـــــــ ر ـــــــ

۹۷۔ مولانا رضی الدین بھاگل پوری

مولانا رضی الدین بھاگل پوری، حنفی المسلک تھے اور گیارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر علمائے ہند میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ عالم وفقیہ اور شیخ وقت تھے۔ علوم مروجہ میں درجہ ممتاز پر فائز تھے۔ علمائے عصر میں مشہور اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کے زمانے میں فتاویٰ ہندیہ، جو فتاویٰ عالم گیری کے نام سے معروف ہے، اورنگ زیب عالم گیر کی سعی وکوشش سے زیر ترتیب تھا اور مشاہیر علمائے ہند کی ایک بڑی جماعت اس اہم خدمت فقہی پر مامور تھی۔ اورنگ زیب کے کانوں میں مولانا رضی لدین بھاگل پوری کی شہرتِ علمی پہنچی تو اس نے ان کو بھی اس خدمت پر متعین کر دیا۔ قاضی محمد حسین محتسب اور مشہور مؤرخ بختاور خاں کی سفارش اور تعارف سے ان کو فتاویٰ عالم گیری کے مدونین کی جماعت میں رکھا گیا تھا۔ بادشاہ نے اس خدمت کے صلے میں ان کا تین روپے یومیہ وظیفہ مقرر کیا۔

مولانا رضی الدین بھاگل پوری، عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ فنون حرب میں بھی مہارت رکھتے تھے اور سیاست کی پیچیدہ گرہوں کی عقدہ کشائی میں ان کو خاص درک حاصل تھا۔ ان اوصاف کی وجہ سے بادشاہ نے ان کو ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء میں یک صدی منصب سے نوازا اور اپنے خاص مشیروں میں شامل کیا۔ پھر

Marfat.com

۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء میں ان کو ''خان'' کے لقب سے سرفراز کیا اور اودے پور کے شاہی لشکر میں شامل فرمایا، چنانچہ انھوں نے کفار ہند کے خلاف جنگیں لڑیں اور اپنی شجاعت و بسالت اور مجاہدانہ تگ و تاز کا ثبوت دیا۔ بعد ازاں بادشاہ کی طرف سے انھیں اقطاع برار کا والی مقرر کیا گیا، جہاں یہ امیر حسن علی خان کی جگہ کچھ عرصہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ مولانا رضی الدین بھاگل پوری نے ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۵ء میں سرزمین برار میں وفات پائی [1]۔

۹۸۔ سید رفیع الدین بلگرامی

سید رفیع الدین بن بدر الدین بن تاج الدین حسینی واسطی بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ حصول علم کے لیے مختلف مقامات میں گئے اور اپنے دور کے اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلت علمی میں ممتاز ٹھہرے اور فتویٰ و تدریس کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوئے۔ پھر بلگرام واپس آئے اور بلند مرتبہ علما میں گردانے گئے۔ فاضل عصر اور شیخ وقت تھے۔ بلگرام کی مسند درس پر فائز اور منصب افتا پر متعین تھے۔ نہایت خوش خط تھے اور مختلف کتابوں پر بہترین حاشیے بنا کر خوب صورتی سے لکھتے تھے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں ان کا تذکرہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے مطول اور تلویح وغیرہ کتابیں دیکھیں، جن پر ان کے حواشی تحریر تھے۔ تلویح کے خاتمے پر یہ الفاظ مرقوم تھے:

قد وقع الفراغ من تسويد هذه النسخة الشريفة المسماة بالتلويح فى شرح التوضيح بمدرسة استاذى العلامة النافع للخاصة والعامة، اعلم العلماء اكمل الاتقياء، حامى اهل الشرح والايمان، ماحى آثار الظلم والطغيان، الحضرة العلية الشيخ حسين بن الشيخ داؤد متع الله الطالبين بطول بقائه فى افضل الايام يوم الجمعة الثا من عشر من شهر ربيع الال وسنة خمس و تسعين و تسعمائة، مالكه وكتابه رفيع الدين بن بدر الدين بن تاج الدين بن الحسين الحسينى والما مول من القارئين لهذه الكتاب والمستفيدين به أن يذكروا الكاتب المذنب فى اوقاتهم الشريفة بدعاء الخير وسلامة الايمان والله سبحانه هو المستعان [2]۔

۹۹۔ مولانا رفیع الدین انصاری سہارن پوری

مولانا رفیع الدین بن عبدالستار بن عبدالکریم انصاری سہارن پوری، سہارن پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور شیخ رکن الدین گنگوہی سے تحصیل علم کی۔ تصوف سے دلچسپی ہوئی تو ان

---

[1] مآثر عالم گیری ص ۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۹۔ برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، ص ۲۸۱، ۲۸۲۔

[2] مآثر الکرام، ص ۲۱۶، ۲۱۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۹، ۱۵۰۔

Marfat.com

ہی سے اخذ طریقت کیا اور خرقہ تصوف زیب تن فرمایا۔ بعد ازاں عازم برہان پور ہوئے۔ وہاں شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی کی بساط تدریس وسلوک بچھی ہوئی تھی، ان سے علم حدیث حاصل کیا۔ بعض دیگر علوم بھی پڑھے۔ اس کے بعد اپنے شہر سہارن پور کو مراجعت فرمائی اور مجلس ارشاد و اصلاح کو رونق بخشی۔ تمام سلاسل تصوف سے منقطع ہو کر رشد و ہدایت کی سیدھی اور مستقیم راہ کے مطابق لوگوں کو فیض پہنچانے لگے۔

مولانا رفیع الدین انصاری سہارن پوری، اپنے دور کے نام ور محدث اور فقیہ تھے اور تمام علوم عربیہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ عمر بھر درس و افادہ میں مصروف رہے اور بے شمار علما و طلبا کو مستفید فرمایا۔ برصغیر کے اس عالم و فقیہ نے ۱۸؍ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ/ ۲۶؍ مارچ ۱۶۱۶ء کو انتقال کیا[1]۔

۱۰۰۔ مفتی رکن الدین دہلوی

مفتی رکن الدین بن جمال الدین بن نصیر الدین بن سماء الدین دہلوی کی جائے ولادت دہلی ہے۔ اسی شہر میں تربیت پائی اور والد مکرم شیخ جمال الدین اور قاضی نور اللہ تستری لاہوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مسلکاً حنفی تھے اور فقہ و اصول کے ماہر علما میں گردانے جاتے تھے۔ ۹۸۴ھ/ ۱۵۷۶ء میں اپنے والد کی جگہ مسند افتا پر فائز ہوئے اور تمام عمر اس منصب بلند پر متعین رہے[2]۔

۱۰۱۔ شیخ رکن الدین سنامی گنوری

شیخ رکن الدین سنامی گنوری، شیخ مجد الدین طاہر محمد سنامی کی اولاد سے تھے۔ مولد و منشا گنور ہے۔ حصول علم کی غرض سے مختلف مقامات کی خاک چھانی اور طویل سفر کیے۔ بہت سے علمائے وقت اور مشائخ عصر سے اخذ علم اور کسب فیض کیا۔ بعد ازاں اپنے وطن واپس تشریف لے گئے اور درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ تمام عمر ہنگامۂ درس بپا کیے رکھا اور لاتعداد علما و طلبا کو دولت علم سے مستفید فرمایا۔

شیخ رکن الدین سنامی گنوری، بے حد نیک، متدین، عبادت گزار اور قائم اللیل بزرگ تھے۔ اشراق تک مصروف عبادت رہتے، پھر درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے۔ زہد و عالی ظرفی میں بھی بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی کثیر الدرس اور کثیر الافادہ بھی تھے۔ اس ہندی عالم دین نے ۱۰۲۷ھ/ ۱۶۱۸ء کو رحلت فرمائی[3]۔

---

1. نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۰ بحوالہ مرأۃ جہان نما۔
2. نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۰، ۱۵۱۔
3. نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۱، بحوالہ اسراریہ۔

Marfat.com

ـــــ ز ـــــ

۱۰۲۔ شیخ زین الدین اکبر آبادی

شیخ زین الدین اکبر آبادی کا سلسلہ نسب یہ ہے: زین الدین بن منور بن نور اللہ بن معز الدین بن اللہ داد بن قاضی محمد شرعی اکبر آبادی۔ شیخ زین الدین کی جائے ولادت و تربیت اکبر آباد (آگرہ) ہے۔ علم و فضل کی گود میں نشو و نما پائی۔ بچپن ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ اکثر کتب درسیہ قاضی جلال الدین ملتانی سے اور بعض ملا مقیم سے پڑھیں۔ حصول علم کے بعد طبیعت ترک و تجرید اور علیحدگی وانزوا کی طرف مائل ہو گئی اور قناعت و عفت اور صلاح و تقویٰ کی زندگی بسر کرنے لگے۔ رؤسا و اغنیا سے حتی الامکان دور رہتے اور ان کے ساتھ ملاقات سے جہاں تک ہو سکتا گریز کرتے۔ اپنے دور کے جید عالم اور نامور فقیہ تھے۔

شیخ زین الدین اکبر آبادی نے ۱۷ / رمضان ۱۰۰۵ھ / ۲۴ / اپریل ۱۵۹۷ء کو اکبر آباد (آگرہ) میں وفات پائی اور اسی شہر میں اپنے زاویہ میں دفن کیے گئے [1]۔

ـــــ س ـــــ

۱۰۳۔ حاجی سلطان تھانیسری

حاجی سلطان تھانیسری مشرقی پنجاب کے شہر تھانیسر میں پیدا ہوئے۔ وہیں پرورش پائی اور اپنے عصر کے اساتذہ سے حصول علم کیا، یہاں تک کہ فقہ و اصول اور عربی کے علوم مروجہ کے فاضل اور ماہر گردانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حجاز تشریف لے گئے اور سعادت حج سے بہرہ اندوز ہوئے۔ پھر وارد ہند ہوئے تو ہندوستان کے بادشاہ جلال الدین اکبر سے تعارف و تقرب حاصل ہوا۔ اس نے ان کی علمی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنے درباری علما میں شامل کر لیا۔ شیخ سلطان تھانیسری جس طرح علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے، اسی طرح سنسکرت میں بھی عبور حاصل تھا۔ جب اکبر کو ان کے اوصاف علمی کا پتا چلا تو انھیں مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔

مہابھارت سنسکرت زبان میں ہے جو ایک ضخیم کتاب ہے اور ہندوؤں کے نزدیک مذہبی نقطہ نظر سے اسے مقدس اور مستند کتاب سمجھا جاتا ہے۔ حاجی سلطان نے چار سال میں اس کو فارسی زبان میں منتقل کر دیا۔ حاجی سلطان کا اس زمانے کا یہ لطیفہ منتخب التواریخ میں مرقوم ہے کہ جب یہ مہابھارت کا ترجمہ کر رہے تھے تو

---

[1] اذکار ابرار، ص ۴۱۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۳۔

Marfat.com

ایک شخص نے ان سے پوچھا:

ایں چیست کہ می نویسید۔؟

یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

کہا:

حرف دہ ہزار سالہ را بزبانِ حال موافق می سازم۔

دس ہزار سال پہلے کی باتوں کو موجودہ زبان کے قالب میں ڈھال رہا ہوں۔

ایک دور ایسا آیا کہ ہندوؤں نے ان پر ذبیحہ گاؤ کا الزام عائد کیا، جسے اکبر نے ہندوؤں کے پاس خاطر سے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ بادشاہ کو یہ شکایت پہنچی تو وہ نہایت خشمگیں ہوا۔ اکبرآباد (آگرہ) سے نکل جانے کا حکم صادر کیا اور جلا وطن کر کے سندھ کے شہر بھکر بھیج دیا۔ بھکر کی زمام ولایت بیرم خاں کے بیٹے عبدالرحیم خان خاناں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ان کے علم وفضل سے بہت متاثر تھا اور ان کی دل سے قدر کرتا تھا۔ بھکر میں وہ ان سے نہایت احترام سے پیش آیا اور ان کی طرف خصوصیت سے عنان توجہ مبذول کی۔ جب اس نے اسیر گڑھ کا قلعہ فتح کر لیا تو بادشاہ سے ان کی جلاوطنی ختم کرنے اور واپس بلانے کی سفارش کی۔ چنانچہ بادشاہ نے انھیں اپنے شہر تھانیسر میں سکونت پذیر ہونے کی اجازت دے دی اور تھانیسر اور کرنال کا منصب کروڑ گیری عطا کیا۔ یعنی ان شہروں کے خراج کا تحصیل دار مقرر کیا۔ ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۶ء میں وہ اس منصب پر فائز تھے❶۔

یہ پتا نہیں چل سکا کہ وہ اس منصب پر کتنا عرصہ متعین رہے۔ ان کی تاریخ وفات کا علم بھی نہیں ہوسکا۔

۱۰۴۔ علامہ سلیمان کردی گجراتی

علامہ سلیمان ابو احمد کردی گجراتی ایک فاضل بزرگ تھے۔ حدیث اور فقہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ کردستان سے ہندوستان آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دہلی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی بساط تدریس بچھی ہوئی تھی اور علما وطلبا ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ سلیمان کردی بھی ان کے حلقہ درس میں داخل ہو گئے۔ ان سے حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھیں اور ان میں عبور حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد علاقہ گجرات کو اپنا مسکن قرار دیا اور وہاں درس وتدریس کی مسند آراستہ کی جس سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا❷۔

---

❶ منتخب التواریخ۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۸، ۱۵۹۔

❷ مرآۃ احمدی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۹۔

Marfat.com

ش

۱۰۵۔ مولانا شاکر محمد دہلوی

مولانا شاکر محمد بن وجیہ الدین (یا وجہ الدین) دہلوی گیارھویں صدی ہجری کے کبار علمائے حنفیہ میں سے تھے۔ شیخ عبدالعزیز حسن چشتی کی نسل سے تھے۔ مولد و منشا دہلی تھا اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے تلمیذ تھے۔ علم و معرفت میں درجہ کمال کو پہنچے۔ پھر دہلی میں درس و تدریس کی مسند پر متمکن ہوئے۔ اس زمانے میں شہر دہلی میں علم و فضل اور تدریس و افادے میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ شاہ جہان بادشاہ ان کی انتہائی تکریم کرتا تھا اور ان سے بے حد تعظیم سے پیش آتا تھا۔

اس ہندی عالم دین نے آخر شعبان ۱۰۶۳ھ/ ۱۵ جولائی ۱۶۵۳ء کو وفات پائی ❶۔

۱۰۶۔ ملا شاہ محمد بدخشی

ملا شاہ محمد بن ملا عبدی صوفی بدخشی سرزمین بدخشاں میں علاقہ روستاق کے ایک مقام ارکسال میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے، اس لیے ملا کے عرف سے معروف تھے۔ یعنی لفظ "ملا"، علم و فضل میں کمال کی وجہ سے ان کے نام کا جز بن گیا تھا۔ ۱۰۲۳ھ میں لاہور آئے۔ ان دنوں شیخ محمد میر لاہوری (یعنی میاں میر رحمۃ اللہ علیہ) کا شہرۂ طریقت و تصوف عروج پر تھا۔ ملا شاہ محمد لاہور آکر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلوک کی منزلیں طے کیں۔ جب تک میاں میر زندہ رہے، ملا شاہ محمد بدخشی نے ان سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔ ان کی وفات کے بعد عازم کشمیر ہو گئے اور کوہ سلیمان پر مسجد اور خانقاہ تعمیر کی۔ باغیچہ بھی وہاں لگایا۔ اس میں اقامت گزیں ہو گئے اور اپنے آپ کو وظائف و اوراد کے سپرد کر دیا۔ ایک روایت کے مطابق اپنے شیخ میاں میر کی زندگی ہی میں کشمیر چلے گئے تھے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ گرمیوں میں کشمیر رہیں گے اور سردیوں میں واپس لاہور آجائیں گے۔

کتب تاریخ میں مرقوم ہے کہ ہندوستان کا مغل حکمران شاہ جہان کشمیر جاتا تو بار بار ملا شاہ محمد بدخشی کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کے ملفوظات و اقوال سے استفادہ کرتا۔ شاہ جہان کا بیٹا داراشکوہ بھی ان کے حلقہ ارادت میں داخل تھا اور اس کی بیٹی جہاں آرا بیگم بھی ان کی عقیدت مند تھی۔ بالفاظ دیگر ہندوستان کا حکمران خاندان، ان سے کامل عقیدت رکھتا تھا اور ملک کے بعض اکابر و مشاہیر ان سے باقاعدہ استفاضہ کرتے تھے۔

ملا شاہ محمد بدخشی عارف باللہ اور صاحب حال بزرگ تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی جو

---

❶ اسرار یہ (کمال محمد سنبھلی)۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۶۲۔

Marfat.com

نکات تصوف پر مشتمل ہے اور نامکمل ہے۔ اس تفسیر کی بعض تعبیرات بڑی عجیب وغریب نوعیت کی ہیں۔ مثلاً قرآن مجید کی آیت: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ❶ کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ اولیا سے متعلق ہے، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے اولیا کے دلوں پر مہر لگا دی ہے کہ ان میں وساوس شیطانیہ اور افکار شیطانیہ داخل نہ ہوسکیں۔ ان کے کانوں پر بھی مہر ثبت کردی ہے تاکہ غلط اور بے ہودہ باتیں ان میں راہ نہ پاسکیں۔ ان کی آنکھوں پر اپنی عظمت و کبریائی کے حسین وجمیل پردے لٹکا دیے ہیں اور ان کے لیے بہت ہی میٹھی اور پُرحلاوت شراب مہیا کی گئی ہے۔

اس سالک وصوفی فقیہ اور عالم نے ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء کو سفر آخرت اختیار کیا❷۔

۱۰۷۔ مولانا شاہ محمد اخسیکتی

مولانا شاہ محمد اخسیکتی، عالم کبیر اور مشہور بزرگ تھے۔ اپنے عصر کے علمائے عرب وعجم سے تحصیل کی اور اساتذہ کی زندگی ہی میں ان کا شمار نامور علما میں ہونے لگا۔ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد داخل ہند ہوئے اور گجرات (کاٹھیاواڑ) میں عرصے تک درس وتدریس کی شمع روشن کیے رکھی۔ پھر مختلف بلاد ہند کی سیر وسیاحت کے لیے روانہ ہوئے۔ اس اثنا میں مانڈو بھی گئے۔ وہاں قاضی جمال الدین ترکستانی کی صاحب زادی سے عقد کیا اور سات سال علما وطلبا کو درس دیتے رہے۔ اس دوران میں ان سے محمد بن حسن مانڈوی نے اصول فقہ کی کتابیں، الکشف، المنار اور تلویح پڑھیں۔ ان کے علاوہ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا❸۔

۱۰۸۔ مفتی شرف الدین لاہوری

مفتی شرف الدین لاہوری حنفی المسلک تھے اور اپنے وقت کے عالم وفقیہ تھے۔ شیریں کلام، فصیح البیان اور حسن اخلاق کے مالک۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں لاہور کی مسند افتا پر فائز تھے جس پر پوری زندگی فائز رہے۔ ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء کو بعہد عالم گیری وفات پائی❹۔

---

❶ یہ سورۂ بقرہ کی ساتویں آیت ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے: ان کے دلوں اور کانوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا۔ ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

❷ شاہ جہان نامہ، ج۳، ص ۳۶۴، ۳۶۵۔ تذکرۂ شعرائے کشمیر، ج۱، ص ۴۲۶، ۴۵۹۔ تحقیقات چشتی، ص ۲۲۴، ۲۲۵۔ مفتاح التواریخ، ص ۲۶۸۔ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص ۱۶۴، ۱۶۵۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۴۸۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص ۱۶۵۔

❹ خزینۃ الاصفیا۔ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص ۱۶۵۔ فرحت الناظرین (شخصیات)۔ ص ۲۰۵۔

Marfat.com

۱۰۹۔ مولانا شمس الدین بروتوی جون پوری

مولانا شمس الدین کا سلسلہ نسب یہ ہے: شمس الدین بن نورالدین بن عبدالقادر بن زین الدین بن نظام الدین بن خیرالدین بن احمد بن جمال الدین بن تقی الدین صدیقی اودھی ثم بروتوی جون پوری۔ ان کا مولدو منشا بروتہ ہے جو اس زمانے میں اعمال جون پور میں ایک قریہ تھا۔ مولانا شمس الدین نے علما کی ایک جماعت سے تحصیل کی، اور اپنے دور کے بہت بڑے عالم و فاضل ہوئے۔ ان کی شہرت علمی سے متاثر ہو کر بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے ان کو اپنے ایک بیٹے پرویز کا اتالیق مقرر کر دیا تھا۔ مدت تک الہ آباد میں سکونت پذیر رہے۔ پھر جون پور کے منصب قضا پر مامور کر دیے گئے۔ لہٰذا اپنے شہر جون پور واپس آ گئے۔ وہاں قضا کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ صاحب شمس البازغہ شیخ محمود جون پوری نے بھی ان سے بعض کتابیں پڑھیں۔ ان کے بھانجے شیخ محمد رشید جون پوری نے جو رشیدیہ کے مصنف تھے، ان سے شرح جامی، حاشیہ کافیہ مع شرح شیخ اللہ داد جون پوری مرفوعات کی بحث تک، قصیدہ بردہ، کچھ حصہ آداب الحنفیہ کا، کچھ حصہ حسامی کا، شرح وقایہ، ہدایہ اور تلویح وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ اس دور کے ایک بزرگ شیخ رکن الدین نے ان سے تمام کتب درسیہ کی تحصیل کی۔

مولانا شمس الدین بروتوی جون پوری نے ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں وفات پائی اور جون پور میں اپنے مدرسے کے احاطے میں دفن کیے گئے ❶۔

۱۱۰۔ مولانا شہباز بھاگل پوری

مولانا شہباز بھاگل پوری کا سلسلہ نسب یہ ہے: شہباز بن محمد بن خیرالدین بن علی بن اسمٰعیل بن اسحاق بن سعدی بن یعقوب بن محمد بن مسعود بن احمد حسینی لاہور ثم بھاگل پوری۔ شیخ کمال الدین حسینی ترمذی کی اولاد سے تھے۔ ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء کو دیورہ میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں اعمال بہار میں ایک قریہ تھا۔ اپنے سسر شیخ محمد ماہ دیوری سے علم حاصل کیا۔ پھر طبیعت مائل بہ تصوف ہوئی تو شیخ یٰسین سلمانوی کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے اخذ طریقت کیا۔ تیس سال کی عمر کو پہنچے تو دیوہ سے بھاگل پور منتقل ہو گئے۔ وہاں درس و تدریس کا مشغلہ اختیار فرمایا۔ یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور مولانا شہباز بھاگل پوری کے نام سے شہرت پائی۔ بہت بڑے عالم و فاضل، فقیہ و شیخ اور عابد و زاہد تھے۔ کثیر الفوائد عالم دین تھے۔ درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے ہنگامۂ اشاعت علم نے ایک دنیا کو متاثر کیا۔ مرض الموت میں بھی مصروف تدریس رہے۔ طلبا

---

❶ تجلی نور، ج ۲، ص ۸۴، ۸۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۶۸، ۱۶۹۔ تاریخ شیراز ہند، جون پور، ص ۲۳۸، ۲۳۹۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۷۔

Marfat.com

اردگرد بیٹھے مشکوٰۃ پڑھ رہے تھے اور آپ حالت مرض میں نہایت انہماک و توجہ سے درس دے رہے تھے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر مشکوٰۃ کے درس سے فارغ ہوئے اور ادھر روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ جمعرات ۱۶ر صفر ۱۰۵۰ھ/ ۲۸ر مئی ۱۶۴۰ء کا واقعہ ہے۔ ایک روایت کے مطابق ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۵۰ء کو وفات پائی۔ لیکن پہلی تاریخ وفات زیادہ قرین صحت اور لائق اعتنا ہے❶۔

۱۱۱۔ سید شیخ بن عبداللہ حضرمی

سید شیخ کا نسب نامہ یہ ہے: شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ عیدروس یمنی حضرمی۔ استاذ وقت، عالم کبیر، محدث عصر، فقیہ نامدار اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء کو موضع تریم میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور بعض دیگر علوم پڑھے۔ اپنے والد مکرم علامہ عبداللہ حضرمی کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے اور ان سے بہت سے علوم حاصل کیے۔ پھر دیگر علما سے استفادہ کرنے لگے۔ مشہور فقہائے عصر سے فقہ کی تحصیل کی۔ اخذ علم کے لیے یمن، شحر، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، عدن وغیرہ مختلف بلاد و امصار کے مشاہیر اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ کسب طریقت کے لیے بھی بعض مشائخ و صوفیا کے دروازے پر دستک دی۔ ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں داخل ہند ہوئے اور بعض علما و شیوخ سے کسب علم اور اخذ فیض کیا۔ پھر عازم دکن ہوئے۔ وہاں وزیر ملک عنبر اور سلطان دکن نظام شاہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان کی علمی قابلیت اور فضل و کمال سے بہت متاثر ہوئے۔ وزیر اور سلطان مذکور نے انھیں بڑی عزت و تکریم سے نوازا۔ دکن میں تشنگان علوم کی بہت بڑی تعداد نے ان سے استفادہ کیا اور پورے ملک میں احترام کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ لیکن بعض حاسدوں کو اس سے بڑا دکھ پہنچا اور انھوں نے وزیر اور سلطان کے پاس جا جا کر شیخ کے بارے میں ایسی باتیں کہیں کہ شیخ وہاں سے نکل جانے پر مجبور ہو گئے۔

اب انھوں نے دکن سے رخت سفر باندھا اور بیجاپور چلے گئے۔ بیجاپور میں سلطان ابراہیم عادل شاہ دادِ حکمرانی دیتا تھا۔ وہ شیخ کی گفتگو اور علم و فضل سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے ان کی بے حد عزت افزائی کی اور انتہائی تعظیم سے پیش آیا۔ اپنے حدودِ مملکت میں ہر جگہ ان کے لیے قدر و منزلت کی فضا پیدا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جہاں گئے، تکریم و اکرام کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ سلطان ان کی اصابت رائے کا اس درجہ قائل تھا کہ ہر معاملے میں ان سے مشورہ لیتا اور ان کی رائے کے بغیر کوئی اہم قدم نہ اٹھاتا۔

سلطان ابراہیم عادل شاہ کے نزدیک شیخ کے زیادہ اکرام و اقبال کی وجہ سے ان کی ایک کرامت تھی اور وہ کرامت یہ تھی کہ سلطان کی مقعد میں ایک زخم تھا جس کی بنا پر اس کا آرام و راحت ختم ہو گیا تھا اور اٹھنے بیٹھنے میں سخت دشواری ہوتی تھی۔ اس کے علاج سے اطبا عاجز آ گئے تھے۔ سید علی بن اسد اللہ گجراتی بیجاپوری

---

❶ در منشور۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۶۹۔

Marfat.com

المعروف بہ محمد علی (متوفی ۵؍ذی القعدہ ۱۰۷۰ھ/ ۳؍جولائی ۱۶۶۰ء) نے کسی وجہ سے بد دعا کی تھی کہ اس کا زخم درست نہ ہو۔ مگر جب سید شیخ بن عبداللہ حضرمی بیجاپور آئے اور انھوں نے سلطان کو اس حالت میں دیکھا تو سیدھا بیٹھنے کا حکم دیا۔ سلطان اسی وقت بیٹھ گیا اور بالکل تندرست ہو گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سلطان ابراہیم شیعی المسلک تھا۔ شیخ اس کو تبلیغ کرتے رہے، حتیٰ کہ اس نے مسلک اہل سنت اختیار کر لیا۔ جب باشندگان ملک نے یہ دیکھا کہ سلطان کو شیخ سے عقیدت پیدا ہو گئی ہے تو وہ ان سے حسد کرنے لگے اور ان کے درپے آزار ہو گئے۔

شیخ موصوف نے بڑی عمدہ کتابیں جمع کی تھیں اور بے شمار مال و دولت اکٹھا کیا تھا۔ وہ اس مال سے حضر موت میں بلند و بالا عمارت تعمیر کرنا، باغات لگانا اور متعدد اوقاف قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ مگر وقت نے ان کو مہلت نہ دی اور اس کے لیے جو رقم انھوں نے ارسال کی تھی، وہ سمندر میں غرق ہو گئی۔

شیخ موصوف سلطان ابراہیم عادل شاہ کی زندگی میں اسی کے پاس مقیم رہے۔ اس کی وفات کے بعد دولت آباد تشریف لے گئے۔ وہاں کے وزیر فتح خان بن ملک عنبر نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو اپنے مقربین کی جماعت میں شامل کیا۔ وہ تادم وفات یعنی ۱۰۴۱ھ/ ۱۶۳۲ء تک نہایت احترام و اعزاز سے وہیں مقیم رہے۔ ان کی قبر دولت آباد کے قرب و جوار میں ہے [1]۔

۱۱۲۔ مولانا شیر محمد برہان پوری

مولانا شیر محمد حسنی حسینی قادری برہان پوری معروف عالم و فقیہ تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے ایام ولایت میں جب وہ ولایت دکن کے منصب پر فائز تھے، اس سے منسلک ہوئے اور سفر و حضر میں کبھی اس سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ آخر عمر میں برہان پور میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے۔ ایک روایت کے مطابق یکم محرم ۱۰۹۰ھ/ ۳؍فروری ۱۶۷۹ء کو اور ایک کے مطابق ۱۰۸۲ھ/ ۱۶۷۱ء کو وفات پائی۔ قبر برہان پور میں ہے [2]۔

ص

۱۱۳۔ شیخ صبغۃ اللہ بیجاپوری

شیخ صبغۃ اللہ بن حبیب اللہ بن احمد بن خلیل بیجاپوری۔ بیجاپور ان کا مولد و منشا تھا۔ اپنے والد گرامی شیخ

---

[1] النور السافر۔ المشروع الروی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷۱، ۱۷۲۔

[2] شاہ جہان نامہ، ج ۳، ص ۳۷۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷۲۔ تاریخ برہان پور، ص ۱۴۳، ۱۴۳۔

Marfat.com

حبیب اللہ بیجاپوری سے اخذ علم کیا اور اس دور کے عالم وفقیہ گردانے گئے۔ بعدازاں طریقت سے لگاؤ پیدا ہوا تو کسب طریقت بھی والد ہی سے کیا اور مرتبہ کمال کو پہنچے۔ ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۱ء میں والد نے وفات پائی تو ان کی جگہ مسند مشیخت پر متمکن ہوئے اور عظمت وقبولیت سے نوازے گئے۔ شیخ صبغۃ اللہ نے ۲۰/رجب ۱۰۷۰ھ/۲۲/مارچ ۱۶۶۰ء کو بیجاپور میں انتقال کیا❶۔

۱۱۴۔ مفتی صدر جہان پہانوی کیتھلی

مفتی صدر جہان کا سلسلہ نسب یہ ہے: صدر جہان بن عبدالمقتدر بن شاہین بن محمد بن سراج الدین بن تاج الدین بن علیم الدین بن کمال الدین حسینی ترمذی کیتھلی ثم پھانوی۔ موضع پھانی میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں قنوج کے قریب ایک گاؤں تھا۔ نشو ونما بھی وہیں ہوئی۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصول علم کے لیے گھر سے نکلے۔ شیخ نظام الدین حسینی خیر آبادی اور دیگر علمائے عصر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ پھر شیخ عبدالنبی گنگوہی کے حلقہ درس میں داخل ہوئے اور ان سے سند حدیث لی۔ ان ہی کی سعی وسفارش سے لشکر شاہی میں مسند افتا پر فائز ہوئے۔ پھر انھیں اکبری عہد ۹۹۴ھ/۱۵۷۶ء میں حاکم توران کے پاس بھیجا گیا اور ہندوستان واپس آئے تو عہدۂ صدارت پر متمکن کیے گئے۔ دیار ہند کے معروف فقیہ اور عالم دین تھے۔

بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے انھیں جہاں گیر کا اتالیق مقرر کیا اور جہاں گیر نے ان سے چالیس حدیثیں حفظ کیں۔ جب وہ خود سریر آرائے مملکت ہوا تو ان کے منصب میں اضافہ کر دیا۔ یہاں تک کہ چار ہزاری منصب کو پہنچے۔ قنوج کے نواح میں جہاں گیر نے انھیں جاگیر بھی عطا کی اور اپنے عہد صدارت میں صرف پانچ سال کے عرصے میں اس درجہ انعام واکرام سے نوازے گئے کہ ان سے پہلے پچاس سال کے عرصے میں کسی صدر کو یہ مقام نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک سو بیس سال تک زندہ رہے لیکن ہوش وحواس اور قوائے جسمانی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بالکل صحیح سلامت تھے۔

خوش مزاج، باذاق اور حسن طبع کے مالک عالم دین تھے۔ شاعر بھی تھے لیکن بہت کم شعر کہتے تھے۔

جس زمانے میں اکبر بادشاہ دین حق سے منحرف اور علمائے حق سے ذہنی وفکری اعتبار سے دور ہو گیا تھا اور علما کو حجاز اور دور دراز علاقوں میں چلے جانے کے احکام صادر کر رہا تھا، اس دور میں ایک روز صدر جہان نے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کسی دن مجھے بھی جلا وطن کر دیا جائے گا اور میرا شمار بھی ان لوگوں میں ہونے لگے گا، جنھیں ملک بدر یا علاقہ بدر کیا جا رہا ہے۔

اس وقت نظام الدین ہروی بھی موجود تھے، انھوں نے صدر جہان کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو کہا آپ نے بادشاہ کے حضور کبھی کلمہ حق نہیں کہا۔ آپ کو بھلا کیوں جلا وطن کیا جائے گا۔

❶ محبوب ذی المنن۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷۷، ۱۷۸ء

Marfat.com

صدر جہاں کے اشعار میں سے ایک شعر یہ ہے:

ہر تار زلفِ یار الٰہی بلا شود وانگہ بہر بلادل ما مبتلا شود

انھوں نے ایک سو بیس سال عمر پائی۔ ایک روایت کے مطابق ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں ایک روایت کے مطابق ۱۲۰۷ھ/ ۱۶۱۸ء میں فوت ہوئے۔ قبر موضع پھانی میں ہے[1]۔

ض

۱۱۵۔ مولانا ضیاء الدین جون پوری

مولانا ضیاء الدین پھول پوری جون پوری تفسیر، حدیث اور دیگر علوم کے ماہر اور شیخ وقت تھے۔ صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری (متوفی ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ/ ۱۹ دسمبر ۱۶۷۲ء) کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ دیگر علمائے عصر سے بھی تحصیل کی تھی۔ بعد کو سنبھل چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شادی بھی وہیں کی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ غالباً ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء کے بعد فوت ہوئے[2]۔

۱۱۶۔ شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی

شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی شیخ محمد غوث شطاری گوالیاری کے بیٹے تھے۔ صغر سنی ہی میں گجرات چلے گئے تھے۔ وہاں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ/ ۱۵۹۰ء) کی مسند تدریس آراستہ تھی، ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ شیخ محمد بن طاہر پٹنی گجراتی (متوفی ۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء) کا سلسلہ درس بھی جاری تھا، ان سے علم حدیث کی تحصیل کی اور دس سال ان کی خدمت میں رہے۔ وہیں ان کے والد شیخ محمد غوث گوالیاری (متوفی ۹۷۰ھ/ ۱۵۶۳ء) نے ان کو خرقہ خلافت بھیجا۔ والد کی وفات کے بعد (۹۷۰ھ/ ۱۵۶۳ء ہی) میں گوالیار کو مراجعت کی اور خاصا عرصہ وہاں مقیم رہے۔ پھر اکبر آباد (آگرہ) منتقل ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے پینتیس سال علم و معرفت کے نشر و ذیوع میں صرف کیے۔

منتخب التواریخ کے مصنف ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی سے ملاقات کی تھی اور اپنی کتاب (منتخب التواریخ) میں بڑے دلچسپ انداز سے اس ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کا تعارف بھی کرایا ہے۔ لکھتے ہیں:

شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی شیخ محمد غوث کے جانشین ہیں۔ تصوف میں ان کا ایک خاص انداز بیان ہے جو

---

[1] سرور آزاد۔ منتخب التواریخ، ص ۴۶۲۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۹۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷۸، ۱۷۹۔

[2] تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۴۹، ۷۴، بحوالہ شنگرف۔ ج ۲، ص ۹۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۸۲، ۱۸۳۔

Marfat.com

صوفیا میں کم ہی کسی دوسرے کا ہوگا۔ ان کی مجلس میں ہمیشہ معرفت وحقیقت کے موضوع پر سلسلہ گفتگو جاری رہتا اور مسئلہ توحید سے متعلق باتیں ہوتیں۔ ان کے باطن کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کون سا جذبہ اور داعیہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے۔ پہلے پہل جب ان کے کمالات وفضائل کی شہرت پھیلی تو معلوم ہوا کہ اپنے باپ شیخ محمد غوث کی مسند فقر وارشاد کے جانشین ہو گئے ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے تو باپ پر فضیلت رکھتے ہیں۔ شیخ ممدوح قرآن مجید کے حافظ تھے اور اس کی تفسیر وتشریح میں کسی تفسیر سے مدد لینے کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ ۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء میں ان سے ملاقات کے لیے میں آگرہ گیا تو ان کے کسی واقف یا تعلق والے کو ذریعہ بنائے بغیر بے تکلفی سے جس کا میں مدت سے عادی تھا، ان کے پاس پہنچ گیا اور السلام علیکم کہہ کر مصافحہ کیا۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ بزرگوں سے ملاقات کے لیے دنیوی تکلفات برتے جائیں تو حصول مقصد میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ لیکن ادھر حال یہ تھا کہ شیخ کی محفل میں تعظیم وتکریم کے خاص آداب ومراسم تھے جن کو ملحوظ رکھا جاتا تھا، لہٰذا ان کو میری یہ بے تکلفی اور سادگی پسند نہ آئی۔ یہ دیکھ کر اہل محفل نے مجھ سے پوچھا:

''تم کہاں سے آئے ہو؟''

میں نے جواب دیا: ''سہسوان سے!''

پھر سوال کیا: ''کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟''

عرض کیا: ''کچھ عرصہ ہوا، ہر فن کی کچھ نہ کچھ تحصیل کی تھی۔''

اس کے بعد ملا عبدالقادر لکھتے ہیں:

سہسوان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس زمانے میں شیخ ضیاء اللہ کے والد (شیخ محمد غوث) کا مرید قلیچ چوگان بیگ جاگیر دار وہاں مقیم تھا، اس لیے شیخ نے مجھے کوئی اہمیت نہ دی اور طنز واستہزا کرنے لگے۔ ایک مسخرے کو اشارہ کیا کہ باتوں باتوں میں مجھے ذہنی طور سے پریشان کر کے مجلس سے نکال دیا جائے۔ لیکن میں مشائخ کی اس قسم کی اداؤں کو خوب جانتا تھا اور بارہا ایسے مواقع پیش آ چکے تھے لہٰذا میں ان کی اس نوع کی حرکتوں سے بظاہر انجان بنا رہا اور بدستور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اب وہ مسخرہ زیادہ مذاق اور ہزل پر اتر آیا اور بولا۔

''کہیں سے عطر کی مہک آ رہی ہے، جس سے میرا دماغ ابلنے اور جوش کھانے لگا ہے۔ اہل محفل ہوشیار رہیں، کسی کو میرے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔''

اس کے بعد وہ منہ سے جھاگ نکالنے لگا۔ یہ دیکھ کر شیخ کا ایک صوفی نما مصاحب مجھ سے مخاطب ہوا اور پوچھا:

''یہ اتنا عمدہ عطر کیا تم نے لگا رکھا ہے؟''

میں نے کہا: ''ہاں! میں نے لگا رکھا ہے، لیکن بات کیا ہے؟''

اس نے کہا:

Marfat.com

''یہ جو باؤلا شخص ہے، اس کو کسی زمانے میں کتے نے کاٹ کھایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب خوشبو سونگھ لیتا ہے تو اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتا ہے اور کتے کی طرح بھونکتے ہوئے لوگوں کو کاٹنے کو دوڑتا ہے، آپ ذرا ہوشیار رہیے۔''

اس سے حاضرین مجلس کچھ پریشان سے ہو گئے۔ شیخ بھی مجھے خوف زدہ کرنے کی غرض سے جان بوجھ کر کچھ دور ہٹ گئے اور اس طرح ان انسان نما شیطانوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ یہ حرکت دیکھ کر میں نے کہا:

''بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ اس بارگاہ عالی پر لوگ دور دراز سے اپنی حاجت برآری کے لیے آتے ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ ایک سگ گزیدہ دیوانے کا علاج نہیں ہو سکتا۔''

انھوں نے کہا: ''کیا تم اس کا علاج جانتے ہو؟''

میں نے کہا: ''ہاں! جانتا ہوں۔''

پوچھا: ''کیا علاج ہے؟''

میں نے جواب دیا: ''اس کے سر پر ڈھیلے اور جوتے مارے جائیں تو یہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے: ''سگ دیوانہ را دارو کلوخ است۔'' (باؤلے کتے کا علاج ڈھیلا ہے) پھر میں نے کہا۔ کلوخ ایک بوٹی کا نام بھی ہے، جو سگ گزیدہ کی ایک مؤثر دوا ہے۔''

شیخ نے جب یہ دیکھا کہ یہ حیلہ کارگر ثابت نہیں ہوا تو کہا: ''آؤ اللہ اور اس کے رسول کے ذکر میں مشغول ہو جائیں۔''

اب انھوں نے قرآن مجید کھولا اور سورۂ بقرہ کی ایک آیت کی تفسیر شروع کر دی اور ایسی باتیں کرنے لگے کہ جن کا اس آیت کے اصل مفہوم سے کوئی تعلق نہ تھا، مگر ان کے جاہل شاگرد ہر الٹی سیدھی بات پر امنا و صدقنا کے نعرے لگا رہے تھے۔ میرا دل تو ان کی طرف سے پہلے ہی سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر شیخ کو ٹوک دیا اور پوچھا:

''یہ مطلب جو آپ بیان کر رہے ہیں، قرآن کی کسی تفسیر میں بھی مرقوم ہے؟''

بولے: ''میں تو یہ تاویل و اشارہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں، ویسے یہ مضمون بہت وسیع ہے۔''

میں نے کہا: ''اچھا تو پھر بتایئے کہ یہ مطلب حقیقی ہے یا مجازی؟''

کہا: ''مجازی۔''

میں نے پھر سوال کیا: ''ان دو (حقیقی اور مجازی) مطلبوں میں کون سا علاقہ ہے؟''

اس سوال سے میں نے ان کو علم بیان کی بحث میں الجھا دیا۔ اب وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے۔ جب میں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تو اپنی جگہ سے اکھڑ گئے۔ قرآن مجید رکھ دیا اور بولے:

Marfat.com

''میں نے علم مجادلہ نہیں پڑھا ہے۔''

میں نے کہا: ''آپ قرآن مجید کا ایسا مطلب بیان کر رہے ہیں، جو کسی تفسیر میں منقول نہیں ہے۔ لامحالہ آپ سے حقیقی اور مجازی مطالب کا باہمی ربط و علاقہ دریافت کیا جائے گا۔''

جب شیخ نے دیکھا کہ کسی طرح بات بنانا مشکل ہے تو گفتگو کا رخ بدلا اور میرا حال احوال پوچھنا شروع کر دیا۔ میں نے ان ہی دنوں قصیدہ بردہ کی شرح لکھی تھی۔ اس کا ایک باب ان کے سامنے رکھ دیا اور قصیدہ کے مطلع کے سلسلے میں جو نکات میرے ذہن میں محفوظ تھے، بیان کیے۔ شیخ نے بڑی تعریف کی اور خود بھی اس کے متعلق چند نکتے بتائے:

اس سے آگے ملا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی سے پہلی ملاقات کا انداز تو یہ تھا۔ دوسری ملاقات اس وقت ہوئی، جب میں اکبر بادشاہ کے حلقہ ملازمت میں داخل تھا اور شیخ موصوف بادشاہ کی دعوت پر تنہا عبادت خانہ شاہی میں ٹھہرے ہوئے تھے اور حیران و پریشان تھے۔ ملا عبدالقادر بدایوانی اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

جمعے کا دن تھا، بادشاہ دو آدمیوں کے ساتھ عبادت خانے میں گیا۔ اس نے میرزا غیاث الدین، علی اخوند، میرزا اخوند اور میرزا علی آصف خاں کو پہلے سے کہہ رکھا تھا کہ شیخ ضیاء اللہ کو بحث و تمحیص میں الجھا کر تصوف کے بارے میں کچھ باتیں دریافت کریں اور دیکھیں کہ شیخ علمی لحاظ سے کتنے پانی میں ہیں۔ چنانچہ میرزا علی آصف خان نے گفتگو کا آغاز کیا اور مولانا جامی کی لوائح کی یہ رباعی پیش کی:

گر در دل تو گل گزر دو گل باشی   در بلبل بے قرار بلبل باشی
تو جزئی و حق کل است اگر روزی چند   اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

اور پوچھا:

''اللہ تعالیٰ کو ''کل'' کس طرح کہا جا سکتا ہے، جب کہ وہ ''جز'' اور ''کل'' ہونے سے بالا و برتر ہے۔''

شیخ تباہ حالی اور پریشانی کے بعد دربار شاہی میں آئے تھے۔ ان کا غرور و پندار خاک میں مل چکا تھا اور بڑی مصیبتیں جھیل چکے تھے۔ نہایت عجز اور ندامت کی کیفیت طاری تھی، اس لیے دھیمے لہجے میں کچھ باتیں کیں جو کسی کو سمجھ میں نہ آئیں۔

ملا بدایوانی لکھتے ہیں:

یہ صورت حال دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا اور جرأت کر کے کہا کہ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس رباعی میں اگرچہ اللہ تعالیٰ پر ''کل'' ہونے ہی کا اطلاق کیا ہے لیکن ایک اور رباعی میں جزئیت بھی بیان کی ہے:

ایں عشق کہ ہست جز لاینفک ما   حاشا کہ شود بہ عقل ما مدرک ما
خوش آنکہ دمد پرتوی از نور یقین   مارا برہاند از ظلام شک ما

لیکن اس ''کل'' اور ''جز'' کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جز ہو یا کل (ہمہ اوست) سب کچھ وہی

Marfat.com

ہے۔اس کے علاوہ دوسرا کوئی وجود، حقیقت میں نہیں ہے۔اصل بات یہ ہے کہ اس کی اصل حقیقت کو عبارت اور الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا،اس لیے اس کی تعبیر کبھی کل سے کی جاتی ہے اور کبھی جز سے کی جاتی ہے۔

اس سے آگے بدایوانی لکھتے ہیں کہ پھر میں نے وحدت الوجود کو ثابت کرنے کے لیے مزید چند مسائل، جن پر میں نے ان دنوں عبور حاصل کیا تھا، شیخ کی طرف سے تائیداً بیان کیے۔میری اس تقریر سے بادشاہ بھی بہت خوش ہوا اور شیخ بھی بڑے محظوظ ہوئے۔

بہر حال شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی ایک باوقار اور بارعب عالم تھے۔اسلوب زندگی درویشانہ تھا،تفسیر، حدیث ،تصوف اور اقوال صوفیا اپنے خاص انداز میں بیان کرتے تھے،جس کا بعض دفعہ اصل الفاظ سے زیادہ تعلق نہ ہوتا۔آگرہ اور اس کے گردونواح میں ان کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور عوام وخواص میں قبولیت حاصل تھی۔۳رر مضان ۱۰۰۵ھ/۱۰ راپریل ۱۵۹۷ءکو فوت ہوئے[1]۔

ط

۱۱۷۔علامہ طاہر سندھی برہان پوری

علامہ طاہر بن یوسف بن رکن الدین بن معروف بن شہاب الدین سندھی، شیخ وقت اور عالم کبیر تھے۔حدیث اور فقہ کے جید عالم تھے۔دسویں صدی ہجری کی دوسری دہائی کے کسی سال سندھ کے ایک قریہ پاتری میں پیدا ہوئے، جو انہی کے جد بزرگ وار کا آباد کردہ تھا۔صغرسنی ہی میں اپنے والد (شیخ یوسف) اور بڑے بھائیوں (طیب اور قاسم) کے ہمراہ سفر کا اتفاق ہوا،اور شیخ شہاب الدین سندھی کی خدمت میں حاضری دی۔شیخ نے منطق کی معروف کتاب شرح شمسیہ پڑھنا چاہی مگر شیخ شہاب الدین نے اس کتاب کو اپنی طبیعت کے مطابق حال نہ سمجھ کر پڑھانے سے انکار کر دیا اور اس کے بجائے امام غزالی کی منہاج العابدین پڑھانے لگے۔پھر ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں عازم گجرات ہوئے اور شیخ عبدالاول بن علی حسینی جون پوری دہلوی سے علم حدیث کی تحصیل کی اور سند حدیث لی۔طریقت وتصوف میں شیخ محمد غوث گوالیاری سے استفاضہ کیا۔بعدازاں احمد آباد اور بلاد دکن کا عزم فرمایا۔وہاں شیخ ابراہیم بن محمد ملتانی سے اخذ علم کیا۔پھر ایلچ پور کی راہ لی اور ایک مدت تک وہاں اقامت اختیار کیے رکھی۔وہاں سے عازم برہان پور ہوئے اور اس تعلق کی بنا پر برہان پوری کہلائے۔

علامہ طاہر سندھی تصنیف وتالیف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے اور کئی کتابوں کے مصنف ومؤلف تھے جو حسب ذیل ہیں:

مجمع البحرین: قرآن مجید کی تفسیر ہے،جس میں صوفیا کے ذوق ومشرب کی جھلک نمایاں ہے۔

[1] منتخب التواریخ کے علاوہ مآثر الامرا میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے۔

Marfat.com

مختصر قوت القلوب للمکی: ابو طالب کی قوت القلوب کا اختصار۔
منتخب مواہب اللدنیہ للقسطلانی: حافظ ابن حجر قسطلانی کی مواہب اللدنیہ کا انتخاب۔
مختصر تفسیر المدارک: قرآن مجید کی تفسیر المدارک کا اختصار، جو اپنے دو بیٹوں عبداللہ اور رحمت اللہ کے لیے کیا۔
تلخیص شرح اسماء رجال البخاری للکرمانی: شارح صحیح بخاری کرمانی کی شرح اسماء رجال البخاری کی تلخیص۔
ملتقط جمع الجوامع للسیوطی۔
ریاض الصالحین: یہ ایک مفید کتاب ہے اور تین روضات پر مشتمل ہے۔ روضہ اول احادیث صحیحہ پر محیط ہے۔ روضہ ثانی مقالات صوفیا کو محتوی ہے جن میں شیخ عبدالقادر جیلانی، امام غزالی، ابو طالب مکی (صاحب قوت القلوب) شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ زین الدین خافی اور شیخ علی متقی ایسے اکابر صوفیا و علما شامل ہیں۔ روضہ ثالث ملفوظات اہل توحید کو متضمن ہے۔

ان کی تصنیفات میں جمع البحرین قرآن مجید کی تفسیر ہے جو صوفیا کے انداز بیان کے مطابق ہے۔ یہ تفسیر عربی زبان میں ہے۔ ذیل میں اس کے ایک حصے کا اردو ترجمہ دیا جاتا ہے تاکہ اس کے نہج و اسلوب کا پتا چل سکے۔

قرآن کی آیت فی قلوبھم مرض (ان منافقین کے دلوں میں بیماری ہے) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: مرض دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک حقیقی اور ایک مجازی۔ حقیقی مرض کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ جسم کو لاحق ہو جاتا ہے تو اس کو اعتدال و توازن کے دائرے سے باہر نکال دیتا ہے اور مریض کے افعال و حرکات میں خلل انداز ہوتا ہے۔

مرض مجازی اس کیفیت سے تعبیر ہے جو اعراض نفسانی کو پیش آتی اور ان کے کمال میں خلل ڈالتی ہے۔ مثلاً جہالت، سوئے عقیدہ، کج فہمی اور ترغیب معصیت وغیرہ۔ یہ تمام مجازی امراض ہیں، اس لیے کہ یہ چیزیں یا تو انسان کے حد فضائل تک پہنچنے میں مانع ہوتی ہیں یا پھر اس کو حقیقی اور ابدی حیات کے زائل ہونے کی طرف کھینچ لے جاتی ہیں اور قرآن کی اس آیت میں یہی مجازی معنی مراد ہیں۔ کیوں کہ منافقین کے ہاتھوں سے مدینہ منورہ کی جو سیادت نکل گئی تھی، وہ ہر وقت اس کے غم میں مبتلا رہتے تھے، اور یہ گویا ان کے دلوں میں ایک مرض تھا جو ہر لحظہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ پھر آئے دن رسول اللہ ﷺ کے اثر و رسوخ کا جو دائرہ وسیع ہو رہا تھا اور آپ کی عزت و شان بڑھ رہی تھی، اس سے وہ حسد کرتے تھے اور ان کے دل اس صورت حال سے سخت الم و تکلیف محسوس کرتے تھے۔ یوں سمجھیے کہ ان کے مرض یا الم کو اللہ تعالیٰ نے اور زیادہ کر دیا۔ جیسے جیسے رسول اللہ ﷺ کے احکام پھیلتے جاتے تھے اور آپ کی عزت و شان میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، اسی نسبت سے حضور ﷺ

Marfat.com

سے اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منافقین کی عداوت اور دشمنی بڑھتی جاتی تھی۔

اس سے آگے تفسیر رحمانی کے حوالے سے علامہ سندھی لکھتے ہیں کہ: فی قلوبھم مرض کا مطلب یہ ہے کہ منافقین کے دلوں میں قوت حکمیہ کی کمی اور قوت شہوانیہ کی کثرت ہے۔

بہر حال علامہ طاہر کی تفسیر مجمع البحرین خالص متصوفانہ اسلوب کی حامل ہے۔ اس میں امام غزالی کی احیاء علوم الدین اور دیگر کتب تصوف کے کثرت سے حوالے دیے گئے ہیں۔

علامہ ممدوح نے ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۶ء میں وفات پائی ❶۔

۱۱۸۔ شیخ طیب بلگرامی

شیخ طیب بن عبدالواحد حسینی واسطی بلگرامی اتوار کے روز ۹ ربیع الثانی ۹۸۶ھ/۱۵ جون ۱۵۷۸ء کو پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ عبدالواحد سے علم حاصل کیا اور اونچے درجے کو پہنچے۔ شیخ وقت اور اللہ کے صالح بندے تھے۔ اکثر شیخ عبدالحق دہلوی کے پاس دہلی جاتے، مختلف مسائل میں ان سے تبادلہ خیال کرتے اور کتب درسیہ کے مشکل مقامات کے حل و توضیح میں ان سے مستفید ہوتے۔ دیگر علوم کے ساتھ ساتھ تفسیر و فقہ میں بھی کامل مہارت رکھتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ تفسیر بیضاوی اور ہدایہ پر تعلیقات سپرد قلم کیں۔ نہایت عابد و زاہد اور متقی بزرگ تھے۔ بدو شعور سے لے کر وفات تک کبھی ان سے نماز کا وقت فوت نہیں ہوا۔ ۵ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ/۲۳ دسمبر ۱۶۵۵ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے ❷۔

۱۱۹۔ شیخ طیب بنارسی

شیخ طیب کا سلسلہ نسب یہ ہے: طیب بن معین بن حسن بن داؤد بن خلیل عمری بنارسی۔ ارض ہند کے متقی اور پرہیزگار علما میں سے تھے۔ چھوٹی عمر ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور چچا نے اپنی گود تربیت میں لے لیا تھا۔ قرآن مجید اور درسیات کی ابتدائی کتابیں گھر میں پڑھیں۔ علم صرف اور علم نحو کی تکمیل شیخ نظام الدین بنارسی کے مدرسے میں کی۔ پھر جون پور کا قصد کیا، جس کو اس زمانے میں علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں شیخ نور اللہ بن طٰہٰ جون پوری کا سلسلہ درس جاری تھا، ان سے شرح وقایہ اور حسامی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ پھر اپنے وطن بنارس گئے اور شادی کی۔ تین سال وہاں رہے۔ بعد ازاں پھر جون پور کا عزم کیا اور فقہ و اصول کی بعض کتابیں پڑھیں۔ اس مرتبہ ایک سال جون پور میں قیام رہا۔ اب کے شیخ خواجہ کلاں بن نصیر الدین جھونسوی سے بھی ملاقات کی اور ان سے بیعت ہوئے۔ جون پور سے پھر بنارس گئے اور بعض

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: اذکار ابرار، ص ۴۲۶ تا ۴۳۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۸۵ تا ۱۸۹۔

❷ مآثر الکرام، ص ۴۴ تا ۴۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۸۹، ۱۹۰۔ تقصار جنود الاحرار، ص ۲۰۰، ۲۰۱۔

Marfat.com

امرائے حکومت کے حلقہ ملازمت میں داخل ہو گئے۔ ایک عرصہ تک ملازمت کا سلسلہ جاری رہا۔ بعدازاں اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور شیخ پورہ وغیرہ میں دس سال تک بعض علما و مشائخ سے استفادہ کرتے رہے۔ پھر بنارس گئے۔ کئی سال منڈواڈیہ میں بھی اقامت اختیار کیے رکھی۔

شیخ طیب بنارسی عابد و زاہد، متقی و متورع اور بلند اخلاق و خوش مزاج عالم دین تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بڑے تیز تھے۔ سلوک میں سلسلہ قادریہ سے منسلک تھے اور اس ضمن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے شرف اجازہ حاصل تھا۔ ابتدا میں سماع بھی کرتے تھے لیکن بعد کو اسے ترک کر دیا تھا۔ رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ/ ۱۹ دسمبر ۱۶۷۲ء) شیخ یٰسین بن احمد بنارسی (ولادت ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء) اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

اس عالم دین نے ۸ شوال ۱۰۴۲ھ/ ۸ اپریل ۱۶۳۳ء کو وفات پائی اور منڈواڈیہ میں دفن کیے گئے ❶۔

۱۲۰۔ قاضی طیب عباسی موی

قاضی طیب کا سلسلہ نسب یہ ہے: قاضی طیب بن قاضی قطب الدین محمد درویش بن محمد افضل بن عاشق محی الدین عباسی چریاکوٹی۔ قاضی طیب، گیارھویں صدی ہجری کے برصغیر کے فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور فتح پور کے منصب قضا پر متمکن تھے۔ پھر الٰہ آباد (یوپی) سے دس میل دور ایک جگہ کو مسکن ٹھہرایا اور اسے تعمیر کیا۔ یہ وہی جگہ ہے جو موٗ قاضی طیب کے نام سے معروف ہے اور الٰہ آباد کے نواح میں اچھا خاصا بارونق شہر ہے ❷۔

ـــــ ع ـــــ

۱۲۱۔ شیخ عباس برہان پوری

شیخ عباس بن نصیر الدین بن سراج محمد برہان پوری، علم و معرفت میں مرتبۂ بلند پر فائز اور یگانہ روزگار فقیہ تھے۔ مغل حکمران شاہ جہان ان سے بہت متاثر تھا اور انھیں دارالسلطنت دہلی میں لے آیا تھا۔ وہ ان سے نہایت احترام سے پیش آتا تھا اور اس کے نزدیک انھیں انتہائی قبولیت حاصل تھی۔ بعدازاں بادشاہ نے انھیں اپنے شہر جانے کی اجازت دے دی تھی اور وہ سب سے منقطع ہو کر گھر میں بیٹھ گئے تھے ❸۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۰، ۱۹۱ بحوالہ گنج ارشدی۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۱۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۳ بحوالہ تحفۃ الکرام۔

Marfat.com

۱۲۲۔ شیخ عبدالاحد سرہندی

شیخ عبدالاحد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے والد تھے۔ ان کا سلسلہ نسب چھبیس واسطوں سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ان کے آباواجداد کے چند اسمائے گرامی یہ ہیں: شیخ عبدالاحد بن زین العابدین بن عبدالحی بن محمد بن حبیب اللہ بن رفیع الدین عمری سرہندی۔ حضرت شیخ اونچے مرتبے کے ہندی عالم وفقیہ تھے۔ مشرقی پنجاب کے ضلع پٹیالہ کے معروف شہر سرہند میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ کچھ عرصہ وہیں تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں گنگوہ گئے اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے استفادہ کیا اور ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہونے کی درخواست کی۔ انھوں نے انکار فرمایا اور علوم مروجہ وفنون متعارفہ کی تکمیل کا حکم دیا۔ واپس سرہند آئے اور حصول علم میں مشغول ہوگئے۔ یہاں تک کہ تمام علوم میں مہارت پیدا کی اور فتویٰ وتدریس کے قابل ہوگئے۔ لیکن ابھی علوم کی تکمیل نہ کر پائے تھے کہ شیخ عبدالقدوس انتقال فرماگئے۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف بلادوامصار کا سفر کیا، مختلف مشائخ وعلما سے ملے اور ان سے مستفیض ہوئے۔ بعدازاں گنگوہ کا عزم فرمایا اور شیخ عبدالقدوس کے لڑکے شیخ رکن الدین گنگوہی کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے۔ طویل عرصہ ان کی خدمت میں گزارا۔ ۹۷۹ھ/۱۵۷۱ء میں شیخ رکن الدین گنگوہی نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور اپنے شہر سرہند واپس آگئے۔ وہاں درس وافادہ کا سلسلہ شروع کردیا۔

شیخ عبدالاحد معقول ومنقول میں ماہر اور فنون میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ بالخصوص فقہ، اصول فقہ اور تصوف میں یگانۂ عصر تھے۔ چند کتابوں کے مصنف بھی تھے، جو اس دور کے مذاق کے مطابق متصوفانہ نوعیت کی حامل تھیں۔

شیخ عبدالاحد نے ۱۷ر رجب ۱۰۰۷ھ/۳ر فروری ۱۵۹۹ء کو اسی (۸۰) سال عمر پاکر سرہند میں وفات پائی❶۔

۱۲۳۔ علامہ عبدالباقی جون پوری

علامہ عبدالباقی بن غوث الاسلام صدیقی جون پوری، اپنے عصر کے جلیل القدر عالم تھے۔ منطق اور فلسفہ میں بالخصوص اس دور کے مشاہیر علما میں سے تھے۔ شمس البازغہ کے مصنف شہیر علامہ محمود جون پوری (متوفی ۹ر ربیع الاول ۱۰۶۲ھ/۹ر فروری ۱۶۵۲ء) کے شاگرد تھے۔

علامہ ممدوح کی وفات کے بعد جون پور کی مسند تدریس پر فائز ہوئے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے ان کے علم وفضل سے متاثر ہوکر ان کو بطور انعام ایک گاؤں عنایت کیا، جس کی جمع بندی کی آمدنی آٹھ یا نو سو روپے

❶ حالات کے لیے دیکھیے زبدۃ المقامات۔ اذکار ابرار۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ وغیرہ۔

Marfat.com

سالانہ تھی اور یہ اس دور کی بہت بڑی آمدنی تھی۔

علامہ عبدالباقی نے ماہ رمضان ۱۰۶۰ھ/ستمبر ۱۶۵۰ء میں آداب الباقیہ کے نام سے فن مناظرہ کی مشہور کتاب شریفیہ کی شرح سپرد قلم کی۔ اس کا آغاز: سبحانك یا مجیب دعاء المسلمین بلا مانع و معارض...... الخ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ شریفیہ کی ایک اور شرح بھی لکھی، جس کا نام ابحاث الباقیہ ہے۔ یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک علمی اور فنی کتاب ہے۔

ابحاث الباقیہ انھوں نے اپنے استاذ علامہ محمود جون پوری کے حکم سے لکھی تھی، جیسا کہ اس کے مقدمے میں وضاحت کی گئی ہے۔ اس میں شیخ محمد رشید جون پوری (متوفی ۹ر رمضان ۱۰۸۳ھ/ ۱۹ر دسمبر ۱۶۷۲ء) کی فن مناظرہ کی معروف تصنیف رشیدیہ کے بارے میں بعض دقیق مباحث ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔

علامہ عبدالباقی جون پوری نے جلوس عالم گیری کے چودھویں سال وفات پائی، جو ۱۰۸۲ھ/ ۱۶۷۱ء کے قریب ہے ❶۔

۱۲۴۔ مولانا عبدالجلیل جون پوری

مولانا عبدالجلیل بن شمس الدین بن نور الدین صدیقی برونوی جون پوری عالم و فقیہ اور شیخ وقت تھے۔ ان کے والد مولانا شمس الدین بھی نامور عالم تھے، جو ان کے استاذ بھی تھے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالجلیل نے صاحب شمس البازغہ علامہ محمود جون پوری اور صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری سے استفادہ کیا اور فحول علمائے عصر میں سے گردانے گئے۔ پھر درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔ تمام عمر خدمت تدریس میں صرف کر دی اور اس کے لیے کبھی روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا۔ ہمیشہ قناعت اور عفاف کی زندگی بسر کی۔ اس عالم دین نے ۸ر شوال ۱۰۷۶ھ/ ۱۳ر اپریل ۱۶۶۶ء کو جون پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

۱۲۵۔ مولانا عبدالجلیل لکھنوی

مولانا عبدالجلیل بن عمر صدیقی بیانوی ثم لکھنوی، شیخ صالح اور فقیہ زاہد تھے۔ تصوف و طریقت سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹ر ربیع الثانی ۱۰۱۶ھ/ ۳ر اگست ۱۶۰۷ء کو فوت ہوئے ❸۔

❶ تجلی نور، ج ۲، ص ۶۵، ۶۶۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۵۔ بزم تیموریہ، ص ۲۵۱۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۳۴ تا ۱۳۶۔

❷ تجلی نور، ج ۲، ص ۶۵، ۶۶۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۶۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۵۔ بزم تیموریہ، ص ۲۵۱۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۳۴ تا ۱۳۶۔

❸ تجلی نور، ج ۲، ص ۶۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۴۰، ۴۱، ۴۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۰۔

Marfat.com

۱۲۶۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ سرزمین برصغیر کے رفیع المرتبت محدث، عظیم الشان فقیہ، جلیل القدر عالم دین اور فقید المثال مصنف تھے۔ علوم وفنون کی تمام شاخوں پر کامل عبور رکھتے تھے۔ ارض ہند کے اس وحید العصر بزرگ کے حالات ہم قدرے تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے آباواجداد اور خاندان کے کوائف بھی نظر وبصر کے زاویوں میں آسکیں۔

آغا محمد ترک:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اسلاف میں ایک بزرگ آغا محمد ترک تھے جو بخارا کے باشندے تھے اور اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں جب مغلوں نے وسط ایشیا میں بربریت کا مظاہرہ کیا اور آتش وخون کا کھیل کھیلا تو آغا محمد ترک نے وہاں کے حالات سے مایوس ہو کر اپنے ہم نوا ترکوں کی بڑی جماعت کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا اور اس ملک کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ اس طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اجداد میں یہ پہلے شخص تھے جو وارد ہند ہوئے۔ اس زمانے میں تخت ہند پر سلطان علاء الدین خلجی متمکن تھا۔ اس ضمن میں شیخ خود تحریر فرماتے ہیں:

جد بزرگ ما آغا محمد ترک بخاری از بخارا در زمان عظمت نشان سلطان محمد علاء الدین خلجی در دہلی تشریف آوردہ، چوں درآں جا قبیلہ دار وسر قوم بودہ است، جماعۃ کثیر از اتراک کہ پیوند قرابت ورابطہ بیعت و خدمت بوی داشتند، نیز از وطن اصلی انتقال نمودہ در ملازمت او دریں دیار رسیدہ اند وبنظر عنایت وتربیت آں سلطان عالی مرتبت درآمدہ، باقصی مراتب شوکت وعظمت رسیدہ[1]۔

یعنی ہمارے اسلاف میں سے آغا محمد ترک بخاری اپنے وطن بخارا سے سلطان محمد علاء الدین خلجی کے عہد میں دہلی تشریف لائے، چوں کہ وہ بخارا میں ایک بڑے قبیلے کے فرد اور اپنی قوم کے سردار تھے، لہٰذا ترکوں کی ایک کثیر جماعت بھی جو ان سے تعلق قرابت اور رابطہ بیعت رکھتی تھی، اپنے وطن سے منتقل ہو کر ان کی خدمت میں یہاں آگئی۔ یہاں وہ عالی مرتبت سلطان علاء الدین خلجی کی نظر عنایت اور التفات خاص کے مستحق قرار پائے اور شوکت وعظمت کے اونچے مرتبے کو پہنچے۔

ہندوستان میں سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کو انتہائی عروج کے عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہندی مسلمان اس کے دور میں علمی، سیاسی اور ثقافتی میدان میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ علمائے دین کو بڑی قدر ومنزلت حاصل تھی۔ آغا محمد ترک کو بھی اس نے اعلیٰ مراتب اور بلند مناصب سے نوازا۔ اس کا ثبوت اس

[1] اخبار الاخیار، ص ۲۹۸، ۲۹۹۔

Marfat.com

واقعہ سے مل سکتا ہے کہ اس زمانے میں گجرات اور اس کی بعض بندرگاہوں پر حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، سلطان نے اس کی تسخیر کے لیے ایک فوج روانہ کی، جس میں سلطنت کے بڑے بڑے امرا شامل تھے۔ اس میں آغا محمد ترک کو بھی شامل کیا گیا۔ فتح کے بعد سلطان کے حکم سے آغا موصوف نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شیخ لکھتے ہیں:

از برائے تسخیر ممالک گجرات و فتح بنادر آں با جماعہ از امرائے عالی شان متعین شدہ از امضا و انصرام آں مہم بحکم سلطانی ہماں جا مخیم اقامت ساخت ❶۔

(وہ چیدہ چیدہ امرا کی ایک جماعت کے ساتھ ملک گجرات اور اس کی بندرگاہوں کی فتح پر متعین ہوئے اور اس مہم کے انتظام و انصرام کے لیے سلطان کے حکم سے وہیں اقامت گزین ہو گئے۔)

آغا محمد ترک کو اللہ نے بہت سے مال و منال سے نوازا تھا اور کثیر صلبی اولاد عطا کی تھی، جس کی تعداد ایک سو ایک بتائی جاتی ہے۔ ان کے ساتھ وہ گجرات میں شان و شوکت اور اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن ناگہاں اللہ نے ان کو آزمائش میں ڈالا اور ان کی اولاد و احفاد میں سے سو افراد موت کی آغوش میں چلے گئے اور صرف ایک بڑا بیٹا زندہ رہا، جس کا نام ملک معزالدین تھا۔ شیخ فرماتے ہیں:

و در اندک مدتے آن ہمہ بحکم قادر مختار رفت اقامت بدار القرار بردند، غیر یک پسر ملک معزالدین نام داشتہ است و اکبر اولاد بود ❷۔

یعنی بہت تھوڑی مدت میں ان کی تمام اولاد قادر مطلق کے حکم سے وفات پا گئی۔ بجز ایک بیٹے کے جس کا نام ملک معزالدین تھا اور یہ ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔

یہ ان کے لیے ایک عظیم صدمہ تھا، جس کے بعد ان کا گجرات میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ اکلوتے بیٹے کو ساتھ لیا اور دہلی واپس آ گئے اور وہیں ۱۷ ربیع الثانی ۷۳۹ھ/۲ نومبر ۱۳۳۸ء کو وفات پائی۔ باپ کی وفات کے بعد ملک معزالدین نے دہلی ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی ❸۔ ہندوستان میں یہ سلطان محمد تغلق (۷۲۵ـ۷۵۲ھ/۱۳۲۵ء ـ ۱۳۵۱ء) کا عہد حکومت تھا۔

ملک موسیٰ:

ملک موسیٰ، آغا محمد ترک کے پوتے اور ملک معزالدین کے بیٹے تھے۔ انھوں نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ہوش سنبھالا۔ فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۲ھ سے لے کر ۷۹۹ھ/۱۳۵۱ء سے ۱۳۹۷ء تک سینتالیس سال

❶ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹۔

❸ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹۔

Marfat.com

ہندوستان پر حکومت کی۔ اس کی وفات کے بعد سلطنت دہلی کی مرکزیت ختم ہوگئی اور اس کا جاہ وجلال تاریخ کے اوراق میں منتقل ہو گیا۔ کئی خود مختار سلطنتیں عالم وجود میں آ گئیں اور سیاسی اعتبار سے انتشار وافتراق کا ایسا بے پناہ ریلا آیا کہ دہلی اور اس کے گردونواح کے علمی مراکز کا بھی خاتمہ ہو گیا، جس کے نتیجے میں وہاں کے علماو مشائخ کی کثیر تعداد گجرات، بنگال، جون پور اور دیگر علاقوں میں منتقل ہونے پر مجبور ہوگئی۔ ملک موسیٰ بھی انقلاب کی زد میں آ گئے اور انھیں دہلی کو خیر باد کہہ کر ماوراء النہر کی راہ لینا پڑی۔ شیخ عبدالحق نے یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وی در فترات کہ بعد انقضائے عہد دولت فیروزی واقع شد باز بولایت ماوراء النہر رفتہ ❶۔

(فیروز شاہ تغلق کے عہد کے بعد جس سیاسی انتشار اور بدنظمی نے سر اٹھایا، اس سے کبیدہ خاطر ہو کر ملک موسیٰ ماوراء النہر چلے گئے۔)

لیکن وہاں ملک موسیٰ زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکے۔ ۸۰۱ھ/ ۱۳۹۹ء میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ اس کی فوج کے ساتھ پھر ہندوستان آ گئے۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تیمور نے ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے ماوراء النہر کے علما سے مشورہ کیا تھا اور ان کی خاصی تعداد اس کی معیت میں ہندوستان آئی تھی، جن میں صاحب ہدایہ شیخ برہان الدین مرغینانی کے پوتے بھی شامل تھے اور تیمور کے دربار میں شیخ احمد تھانیسری نے ان پر کچھ اعتراضات بھی کیے تھے۔ بہت ممکن ہے، ملک موسیٰ بھی علما کی اس جماعت کے ساتھ ہی تیمور سے وابستہ ہو گئے ہوں اور اسی سلسلے میں دہلی پہنچے ہوں۔ اس کا اندازہ شیخ عبدالحق کے اس فرمان سے ہوسکتا ہے:

در رکاب دولت مآب صاحب قران اعظم امیر تیمور گورگان بدہلی قدم آوردہ، سلسلہ آبا واجداد تازہ کردہ، قدم اقامت واستقامت محکم ساخت ❷۔

یعنی صاحب قران اعظم امیر تیمور گورگان کے ساتھ وہ دہلی آئے۔ اپنے بزرگوں کے سلسلے کا احیا کیا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

شیخ فیروز:

ملک موسیٰ کے کئی فرزند تھے، جن میں ایک شیخ فیروز تھے جو اپنے خاندان میں خاص امتیاز کے حامل اور عمدہ شہرت کے مالک تھے۔ شیخ عبدالحق محدث نے اخبار الاخیار میں ان کی زندگی کے متعدد پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اور بہترین الفاظ میں ان کا تعارف کرایا ہے۔ ان کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

شیخ فیروز کی ذات میں بہت سے ظاہری، باطنی، وہبی اور کسبی فضائل جمع ہو گئے تھے۔ سپاہ گری میں وہ

❶ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹۔

Marfat.com

اپنے دور کی بے مثل شخصیت تھے اور فن حرب میں عدیم النظیر سلیقہ رکھتے تھے۔ علم، شعروشاعری، شجاعت وسخاوت، خوش طبعی وبذلہ سنجی، ظرافت، عشق الٰہی ومحبت خداوندی اور دیگر اوصاف حمیدہ میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ دولت و حشمت، جاہ ومرتبت، عزت وعظمت میں مشہور روزگار تھے۔ عذوبت کلام وحلاوتِ لسان اور شعروظرافت کی ابتدا ہمارے خاندان میں ان ہی کی ذات سے ہوئی ❶۔

شیخ فیروز جیسا کہ پہلے گزر چکا، بڑے بہادر اور جنگ جو تھے۔ وہ بہرائچ کی کسی جنگ میں شریک ہوئے اور مرتبہ شہادت کو پہنچے۔ ان کا مدفن بھی وہی خطہ ارض ہے۔ شیخ عبدالحق لکھتے ہیں کہ جن دنوں وہ جنگ کو جارہے تھے ان کی بیوی حاملہ تھیں۔ اس نے شوہر کو روکنے کی کوشش کی تو جواب میں فرمایا:

از خدا خواستہ ام کہ آں فرزند نرینہ باشد واز وے اولاد بسیار شود واو را وشمارا بخدا سپردیم، تابعد ازیں مارا چہ پیش آید ❷۔

(میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ بیٹا ہو اور اس سے نسل چلے۔ اب میں اس کو اور تم کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں، نہ معلوم آئندہ مجھے کیا حالات پیش آئیں۔)

شیخ فیروز کے محاربہ بہرائچ پر جانے سے کچھ عرصہ بعد ان کے بیٹے شیخ سعد اللہ پیدا ہوئے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے دادا تھے۔ شیخ فیروز ۸۶۰ھ/۱۴۵۶ء کو شہید ہوئے۔

شیخ سعد اللہ:

شیخ سعد اللہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، وہ ان تمام اوصاف سے متصف تھے، جو ان کے شہید باپ شیخ فیروز میں پائے جاتے تھے۔ عمر کا ابتدائی زمانہ تحصیل علم میں گزرا۔ پھر سلوک وتصوف کی وادی میں چلے گئے اور عبادت وریاضت کو مرکز توجہ ٹھہرالیا۔ ایک صاحب حال بزرگ شیخ محمد منکن کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ شیخ سعد اللہ کی عظمت وبزرگی کا یہ عالم تھا کہ سلطان سکندر لودھی ان کے حلقہ عقیدت میں شامل تھا۔

شیخ سعد اللہ کی نرینہ اولاد میں ان کے دو بیٹوں (شیخ رزق اللہ اور شیخ سیف الدین)۔ نے علم وفضل کی دنیا میں بڑی شہرت پائی۔ باپ کی وفات کے وقت شیخ سیف الدین کی عمر صرف آٹھ سال تھی شیخ عبدالحق محدث لکھتے ہیں کہ شیخ سعد اللہ وفات سے کچھ دن پہلے سحری کے وقت اپنے اس بیٹے (سیف الدین) کو مکان کے بالائی حصے میں لے گئے۔ اس سے آگے خود شیخ سیف الدین فرماتے ہیں۔

وبعد ادائے تہجد مرا مقابل ایستادہ کردند وگفتند، خداوندا تو می دانی کہ پسران دیگر را تربیت کردہ واز ادائے حقوق ایشاں برآمدہ ام، ایں را یتیم می گزارم وبے کس۔ حق ایں ہنوز بر ذمۂ منست۔ ایں را بتو می سپارم،

❶ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹، ۳۰۰۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹، ۳۰۰۔

Marfat.com

مربی ومتولی امور او تو باش ❶۔

(نماز تہجد کے بعد مجھے (یعنی سیف الدین کو) قبلہ رو کھڑا کیا، اور کہا، اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں دوسرے لڑکوں کی تربیت سے فارغ ہو چکا اور ان کے حقوق سے عہدہ برا ہو گیا۔ لیکن اس لڑکے کو یتیم و بے کس چھوڑ رہا ہوں۔ اس کے حقوق ابھی میرے ذمے باقی ہیں۔ اس کو اب تیرے سپرد کرتا ہوں، تو ہی اس کی تربیت وحفاظت فرما۔)

یہ الفاظ کہہ کر نیچے اتر آئے۔ (ایں گفت وفرود آمد) چند روز بعد جمعے کے دن ۲۲ ربیع الاول ۹۲۸ھ/ ۱۸ر فروری ۱۵۲۲ء کو انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور ان کا یہ بیٹا آگے چل کر نہ صرف دہلی، بلکہ پورے ہندوستان کی ایک معزز ومؤقر شخصیت بنا۔ اس کے گھر میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شکل میں علم وفضل کا وہ آفتاب طلوع ہوا، جس کی روشنی سے دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں علم وتحقیق کی روشنی پھیلی۔

شیخ رزق اللہ:

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا، شیخ سعد اللہ کے بیٹوں میں سے دو بیٹے شیخ رزق اللہ اور شیخ سیف الدین علم وفضل کی دنیا میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ باپ کی طرح جذبہ محبت الٰہی سے سرشار اور نہایت متقی تھے۔ دہلی کی عبادت وریاضت کی رونقیں ان کے دم سے وابستہ تھیں۔

مردم ایں شہر اتفاق دارند کہ دہلی عبارت ازیں برادران بود ❷۔

(اس شہر (دہلی) کے تمام لوگ اس پر متفق ہیں کہ دہلی ان ہی بھائیوں کے وجود سے تعبیر تھی۔)

ان کی مجلسیں ذکر الٰہی کا مرکز تھیں۔ اللہ کی یاد کے سوا ان میں کسی چیز کا دخل نہ تھا۔ اس سلسلے میں شیخ عبدالحق کے الفاظ قابل ملاحظہ ہیں۔ فرماتے ہیں:

مجلس ایشاں از اول تا آخر شوق وگریہ ودرد ومحبت بود۔ نسبت شیخ رزق اللہ در سوز وگرمی چناں بود کہ آتشے درزیر خاکستر پنہاں می باشد، اندک کہ کاویدند ہمہ آتش برآید۔ ومثال والد ماجد چناں کہ آب از چیزے چکیدہ می ماند، ادنیٰ آزارے کہ باو رسید تراوید۔ بغایت رقیق القلب وسریع التاثیر بودہ اند ❸۔

یعنی ان کی مجلس شروع سے آخر تک شوق وگریہ سے پُر اور درد ومحبت سے مملو تھی۔ سوز وگرمی سے شیخ رزق اللہ کا تعلق یوں سمجھیے، جیسا کہ راکھ کے نیچے آگ دبی ہو۔ جوں ہی اس کو ذرا کریدا، آتش بھڑک اٹھی۔

---

❶ اخبار الاخیار، ص ۳۰۰، ۳۰۱۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۳۰۱۔

❸ اخبار الاخیار، ص ۳۰۵۔

Marfat.com

لیکن ان کے برعکس والد ماجد (شیخ سیف الدین) کی کیفیت یہ تھی کہ جیسے کسی شے سے مسلسل پانی ٹپکتا رہے۔ ان کو اگر معمولی اذیت بھی پہنچتی تو فوراً آنسو بہنے لگتے۔ بدرجہ غایت رقیق القلب اور سریع التاثیر تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے عم محترم شیخ رزق اللہ کے حالات بطور خاص بیان کیے ہیں۔ وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے فاضل تھے۔ تاریخ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور فارسی اور ہندی کے شاعر بھی تھے۔ فارسی میں مشتاقی اور ہندی میں راجن تخلص کرتے تھے۔ شیخ عبدالحق نے ان کے علم و مطالعہ کی وسعت کا واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

شیخ رزق اللہ مردے کامل و فاضل و عارف واز نوادر روزگار واز مردم سلف یادگار بود۔ جامع فضائل صوری و معنوی، و در مشرب عشق و محبت و سلامت عقل و وسعت حوصلہ وصبر بر مصائب و دوام حضور و استقامت احوال یگانۂ عصر بود❶۔

(شیخ رزق اللہ مرد کامل، فاضل و عارف، نادر روزگار اور یادگار سلف تھے۔ فضائل صوری و معنوی کے جامع تھے۔ مشرب عشق و محبت، سلامتیٔ عقل و فہم، وسعت حوصلہ، مصائب و آلام کو صبر سے برداشت کرنے والے اور استقامت و دوام حضور میں یگانۂ عصر تھے۔)

اس ہمہ اوصاف موصوف عالم دین کا سن ولادت ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء اور تاریخ وفات ۲۰/ربیع الاول ۹۸۹ھ/۲۴/اپریل ۱۵۸۱ء ہے۔ بانوے (۹۲) سال عمر پا کر راہی ملک دوام ہوئے۔

شیخ سیف الدین:

شیخ سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے والد تھے۔ ۹۴۰ھ/۱۵۳۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اس دور کے بہت سے علما و صوفیا سے فیض حاصل کیا۔ کوئی بڑے عالم دین تو نہ تھے البتہ نیکی و تدین، زہد و عبادت، شعر و شاعری اور ذکر و فکر میں بہت مشہور تھے۔ شیخ عبدالحق ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

در شعر و فضیلت و قبول خواطر و ذوق و شوق و محبت و ظرافت و لطافت و بے تعلقی و وارستگی و طیبت قلب، و حضور خاطر و ذکر لطائف و نکات و فہم دقائق و اشارت یگانہ روزگار و افسانہ دیار خود شد❷۔

یعنی شعر و شاعری، فضیلت و مقبولیت عامہ، ذوق و شوق، محبت و ظرافت، زہد و عبادت، پاکیزگی دل، حضور قلب، لطائف و نکات، باریک بینی، دِقت نظر اور نکتہ سنجی میں بے مثال تھے اور اس میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

نہایت مستغنی المزاج تھے اور دنیوی جاہ و جلال سے سخت نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ اکبری دور کے

❶ اخبار الاخیار، ص ۱۷۴۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۳۰۱۔

Marfat.com

بعض علمائے عصر کو بادشاہ اور دنیا داروں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتے تو شدید ذہنی اذیت محسوس کرتے اور اللہ کے شکر گزار ہوتے کہ اتنا علم حاصل نہیں کیا، جتنا علمائے سو نے کیا ہے، ورنہ ہو سکتا ہے ان کی بھی یہی حالت ہوتی جو ان علمائے دین کی ہے۔ شیخ عبدالحق ان کے اس تاثر کو خود ان کی زبانی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

چوں مشاہدہ کردہ می شود کہ علما و فضلا در طلب جاہ و عزت و کثرت اسباب و جمعیت اموال و نزاع و خصومت کہ با خلق می رفتند، مرا شکرانہ آید بر آں کہ بسیار نخواندیم و اکابر نشدیم ❶۔

(جب میں دیکھتا ہوں کہ اس دور کے علما و فضلا عزت و جاہ کے حصول میں، زیادہ سے زیادہ مال و دولت سمیٹنے میں خلق خدا سے نزاع و خصومت میں مصروف ہیں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے زیادہ علم حاصل نہیں کیا اور بڑے لوگوں میں میرا شمار نہیں ہوتا۔)

شیخ سیف الدین شاعر بھی تھے اور سیفی تخلص کرتے تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی شیخ سیف الدین کی زندگی کے آخری دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شیخ اپنی حیات مستعار کی آخری علالت کے دنوں میں کچھ ایسی کیفیت سے دو چار ہوئے کہ ان پر خوف و دہشت کا غلبہ طاری ہو گیا اور وہ پریشان سے رہنے لگے۔ جب قرآن کی کوئی ایسی آیت سنتے جو اللہ کی رحمت و رافت کے مضمون پر مشتمل ہوتی تو چہرے پر مسرت کے آثار نمودار ہو جاتے۔ شیخ عبدالحق ان کے سامنے بلند آواز سے قرآن کی آیات تلاوت کرتے اور وہ سن کر بہت خوش ہوتے۔ ایک مرتبہ رات کو سعادت مند بیٹے نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ﴾ ❷

یہ آیت سن کر شیخ نے اظہار مسرت کیا اور بیٹے کو بہت دعائیں دیں۔ شیخ عبدالحق اس رات کی دعاؤں کے بارے میں لکھتے ہیں:

امیدوارم کہ مرا دعائے آں شب سرمایہ دنیا و آخرت شود۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(میں امید رکھتا ہوں کہ اس رات کی دعا میرے لیے دنیا اور آخرت کا سرمایہ ہو گی۔)

وقت رحلت قریب آیا تو مندرجہ ذیل کلمات و اشعار تحریر کر کے کفن کے ساتھ رکھنے کی ہدایت کی، اس لیے کہ ان میں اللہ سے عفو و مغفرت کی التجا کی گئی ہے اور اپنی بے عملی اور بے بسی کا اظہار کیا گیا ہے:

---

❶ اخبار الاخیار، ص ۳۰۲۔

❷ یہ آیت سورۂ حم السجدہ کی تیسویں آیت ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:
''جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے (یعنی توحید کا اقرار کیا) پھر اس پر جمے رہے، ان پر (رحمت کے) فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں) تم نہ تو ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور جس بہشت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اس کی خوشی مناؤ۔''

Marfat.com

دارم دلکے غمین بیا مرز کہ مپرس صد واقعہ در کمیں بیا مرز و مپرس
شرمندہ شوم اگر پرسی عملم اے اکرم الاکرمین بیا مرزومپرس

ان کے علاوہ دوشعر یہ ہیں:

قدمت علی الکریم بغیر زاد من الحسنات والقلب السلیم
فحمل الزاد اقبح کل شئی اذا کان القدوم علی الکریم [1]

قبر میں منکر ونکیر کے جواب کے لیے یہ الفاظ لکھنے کا حکم دیا:

ربی اللہ و دینی الاسلام۔ ونبی محمد الامی وشیخی الشیخ عبدالقادر الجیلانی۔

وفات کے وقت خوف وخشیت کی کیفیت ذوق و ذشوق میں بدل گئی تھی۔ عصر کا وقت تھا اور شیخ عبدالحق مسجد میں تھے۔ انھیں مسجد سے بلایا گیا تو چہرے پر فرحت وطرب اور تازگی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فرمایا:

بابا ایدانکہ مارا اکنواں اصلاً رنجے ومحنتے وکوفتے نیست۔ شوق درشوق درطرب درطرب است، ہر زحمتے و بیماری کہ دربدن مابود بدر رفتہ است، ولیکن ترا باید کہ مشغول شوی ودعا کنی کہ مرازودازیں جابر دارند۔ مرا مطلوبے کہ درتمام عمر بود، دست دادہ است مبادا بازایں حالت نماند۔ دائم دعامی کردم کہ آخردم دریا دخودداری و بشوق ازیں جابری۔ اکنوں جمال ایں مراد باحسن وجوہ جلوہ گرشدہ است۔ اگرہم دریں حالت پیش خود طلبد کمال لطف وعنایت اوباشد [2]۔

(بابا! جان لو کہ مجھے اس وقت بالکل کوئی رنج وفکر نہیں ہے، بلکہ شوق پر شوق اور خوشی پر خوشی طاری ہے۔ جو بھی تکلیف اور بیماری میرے بدن میں تھی، چلی گئی ہے۔ تم کو چاہیے کہ مشغول ہوکر یہ دعا کرو کہ اللہ مجھے جلد یہاں سے لے جائے۔ تمام عمر جو میرا مطلوب تھا، اب حاصل ہوگیا ہے۔ اب ایسا نہ ہو کہ وہ ہاتھ سے جاتا رہے۔ میں عمر بھر اللہ سے دعا کرتا رہا کہ آخر وقت میں ذوق وشوق کے ساتھ اس دنیا سے لے جائیو۔ اب اس مراد کا جمال ہزاروں حسن کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ اگر وہ اس حالت میں اپنے سامنے بلالے گا تو اس کا انتہائی لطف وکرم ہوگا۔)

شیخ سیف الدین نے ۲۷ رشعبان ۹۹۰ھ/ ۱۶ ستمبر ۱۵۸۲ء کو وفات پائی [3]۔

یہ ہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے آباواجداد کا مختصر تعارف اور ان کی علمی وعملی زندگی کا مجمل سا تذکرہ۔ اب خود شیخ عبدالحق کے حالات وسوانح ملاحظہ فرمایئے۔

---

[1] ان دوعربی شعروں کا ترجمہ یہ ہے:
میں کریم کے دربار میں بغیر کسی خرچ اور توشے کے حاضر ہوا ہوں۔ نہ نیکیاں پاس ہیں اور نہ قلب سلیم۔ مگر توشہ اور خرچ ساتھ لے جانا، اس صورت میں نامناسب بات ہے جب کہ ایک کریم اور بدرجہ غایت سخی کے پاس جانا مقصود ہو۔

[2] اخبار الاخیار، ص ۳۰۹۔

[3] اخبار الاخیار، ص ۳۰۱۔

Marfat.com

شیخ عبدالحق کی ولادت:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اسلام شاہ سوری کے عہد میں محرم ۹۵۸ھ/جنوری ۱۵۵۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید محمد جون پوری کی مہدوی تحریک زوروں پر تھی اور علمائے دین ان کے مذہبی افکار و تصورات کے بارے میں مختلف الخیال تھے۔ بعض حضرات ان کی تکفیر و تضلیل کر رہے تھے، بعض ان کو برسرِ حق ٹھہراتے تھے اور کچھ لوگ ان کے بارے میں خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔

اس زمانے کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدوی تحریک ایک اصلاحی دینی تحریک تھی۔ اس کے بانی سید محمد جون پوری کا مقصد احیائے شریعت، قیام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔ اس زمانے میں جو بدعات اور محدثات پھیلی ہوئی تھیں اور جن منکرات اور خلاف شرع امور کا زور تھا، ان کی جڑ کاٹنا اس تحریک کا بنیادی مقصد تھا۔ لیکن بعد کو اس کے غالی متبعین کے غلو کی وجہ سے اس کے بنیادی مقاصد میں زبردست تبدیلی پیدا ہوگئی اور خود یہی لوگ منکرات و محدثات کا شکار ہوگئے۔ تفصیل کا یہ محل نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ شیخ عبدالحق کی ولادت اس زمانے میں ہوئی، جب ہندوستان یا تو مختلف رجحانات کی آماج گاہ بن چکا تھا یا اس کی ذہنی و فکری پرورش کے اسباب پیدا ہو رہے تھے، جن میں ایک رجحان سید محمد جون پوری کی مہدوی تحریک کی شکل میں ارض ہند میں نمایاں طور سے ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت:

شیخ عبدالحق کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور ذہنی نشو و نما اپنے والد ماجد شیخ سیف الدین کی آغوش میں ہوئی۔ شیخ خود فرماتے ہیں:

شب و روز در کنار مرحمت و جوار عنایت ایشاں تربیت می یافتم [1]۔

(میں رات دن ان کی آغوش عاطفت میں تربیت حاصل کرتا تھا۔)

سب سے پہلے شیخ سیف الدین نے اس زمانے کے رواج کے مطابق بیٹے کو قرآن مجید پڑھانا شروع کیا۔ باپ سبق لکھتے تھے اور بیٹا پڑھتا تھا۔ چند روز بعد ذہین بیٹا اس قابل ہوگیا کہ خود ہی قرآن مجید پڑھنے لگا۔ معمول یہ تھا کہ پہلے خود قرآن کا کچھ حصہ پڑھتے اور بعد میں استاذ کو سنا دیتے۔ اس طرح دو تین مہینے میں پورا قرآن مجید ختم کرلیا۔ ساتھ ہی ساتھ والد بیٹے کو بزرگان دین کے اقوال و افعال سے بھی آگاہ کرتے اور بچے کی ذہنی سطح کے مطابق اس کو تصوف و طریقت کے بعض پہلوؤں سے متعلق بھی واقفیت بہم پہنچاتے۔ بہت ہی کم مدت میں کتابت و انشا کا سلیقہ بھی پیدا ہوگیا تھا۔ انھوں نے اپنے اس ہونہار بیٹے کو ابتدائی تعلیم خود

---

[1] اخبار الاخیار، ص ۳۱۰۔

Marfat.com

ہی دینا شروع کی تھی۔ فارسی نظم و اشعار کی ان کتابوں میں سے جو اس وقت مروج تھیں خود شیخ عبدالحق کے بقول شاید بوستان، گلستان کے چند اجزا اور دیوان حافظ پڑھایا ہو۔ پھر بچپن ہی میں قرآن مجید ختم کرنے کے بعد میزان الصرف سے مصباح اور کافیہ تک کتابیں پڑھیں۔ شیخ کی ذہانت و قابلیت کے جوہر عالم طفولیت ہی میں نمایاں ہونے لگے تھے، جس سے خوش ہو کر شیخ سیف الدین کہا کرتے تھے:

ان شاء اللہ تو زود دانش مندی شوی ❶۔

(ان شاء اللہ تم جلد ہی عالم ہو جاؤ گے۔)

شیخ سیف الدین نے تمام تر توجہ بیٹے کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دی تھی اور ہر وقت یہی شوق اور جذبہ ان کے دل میں موج زن رہتا تھا کہ میرا یہ بیٹا جلد از جلد عالم دین ہو جائے اور علم و فضل میں درجہ کمال کو پہنچے۔ بیٹے سے کہا کرتے تھے:

مرا حظے غریب دست دہد بتصور آں کہ حق تعالیٰ ترا بکمالے کہ من خیال کردہ ام برساند ❷۔

(مجھے اس سے نہایت خوشی ہوتی ہے جب میں یہ تصور کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس مرتبۂ کمال کو پہنچا دے جو میں اپنے نہاں خانہ خیال میں چھپائے ہوئے ہوں۔)

شیخ سیف الدین تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو بہت سی نصیحتوں سے بھی نوازتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ بے مقصد بحث مباحثے سے گریز کرو اور صرف حصول علم کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہراؤ۔ اگر کوئی صحیح بات کہے تو اسے فوراً تسلیم کر لو۔ اگر کوئی تمھاری بات نہیں مانتا تو اس سے جھگڑا نہ کرو۔ بس دو ایک مرتبہ بات سمجھا کر خاموش ہو جاؤ۔ شیخ کی یہ نصیحت کس درجہ عمدہ ہے، اس کا اندازہ ان کے اصل الفاظ سے ہوتا ہے:

باید کہ باہیچ کس در بحث علم نزاع نہ کنی، و بہ کلفت نرسانی۔ اگر دانی کہ حق بجانب دیگر است قبول کنی، و اگر نہ، دو سہ بار بگو، اگر قبول نکنند بگو کہ بندہ را چنیں معلوم است آں نوع نیز تواند بود کہ شما می گوئید، نزاع برائے چیست ❸۔

(تمھیں چاہیے کہ علمی بحث میں نہ کسی سے جھگڑا کرو اور نہ کسی کو تکلیف پہنچاؤ۔ اگر یہ سمجھو کہ دوسرا حق بجانب ہے تو اس کی بات مان لو اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کو دو تین بار سمجھاؤ۔ اور وہ نہ مانے تو کہو مجھے تو یہی معلوم ہے، ممکن ہے جو تم کہتے ہو، وہی صحیح ہو۔ جھگڑا کس بات کا ہے۔)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایک تو خود نہایت ذہین اور طباع طالب علم تھے۔ دوسرے ان کے والد انھیں ہر وقت طلب علم کا شوق دلاتے اور کسی دوسری طرف ان کا ذہن ملتفت نہ ہونے دیتے۔ انھوں نے اپنی

❶ اخبار الاخیار، ص ۳۱۱۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۳۱۱۔

❸ ایضاً، ص ۳۱۰۔

Marfat.com

تصنیف اخبار الاخیار میں اپنے طالب علمی کے دور کی کہانی تفصیل سے بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھ لی تھی۔ پندرہ سولہ سال کو پہنچے تو مختصر معانی اور مطول سے فارغ ہو چکے تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر کے ہوئے تو علوم عقلی و نقلی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا، جس کی سیر نہ کر چکے ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرے والد (شیخ سیف الدین) فرمایا کرتے تھے کہ ہر مروجہ علم میں سے مختصر طور پر پڑھ لو گے تو کافی ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس کے بعد تم پر برکت اور سعادت کے دروازے کھل جائیں گے اور بلا تکلف تمام علوم حاصل ہو جائیں گے۔ ان کے اس ارشاد کا اثر یہ ہوا کہ نہایت مختصر مدت میں تیزی کے ساتھ تحصیل علوم کی منزلیں طے ہو گئیں۔ یعنی مختصرات نحو مثلاً کافیہ، لب اور ارشاد وغیرہ کا کوئی حصہ یاد کرتے تو اس کے شروح و حواشی پڑھنے کے لیے طبیعت بے چین ہو جاتی۔ مطالعہ اس احتیاط اور محنت و شوق سے کرتے کہ تمام مطالب کتاب ذہن کی گرفت میں آ جاتے اور مزید سمجھنے کے لیے استاذ کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ فرماتے ہیں، اکثر ایسی کتابیں بھی پڑھ ڈالتا، جو نصاب میں داخل نہ تھیں۔ جو کتاب ہاتھ آ جاتی اول سے آخر تک پورے غور اور توجہ سے پڑھتا۔ میرا مطلب محض معلومات کا حصول اور علم میں اضافہ کرنا تھا[1]۔

شیخ کی تمام تر دلچسپیوں کا مرکز حصول علم تھا۔ کھیل کود اور دیگر غیر علمی امور سے ان کو زندگی کے کسی دور میں کبھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حتیٰ کہ حصول علم کے مقابلے میں آرام و راحت اور کھانے پینے کی بھی کوئی پروا نہ رہی تھی۔ اس ضمن میں ان کے اپنے الفاظ قابل ملاحظہ ہوں:

از ابتدائے ایام طفولیت نمی دانم کہ بازی چیست و خواب کدام و مصاحبت کیست، و آرام چہ و آسائش و سیر کجا۔

شب خواب چہ و سکوں کدامست — خود خواب بعاشقاں حرامست

ہرگز در شوق کسب و کار، طعام بوقت نخوردہ و خواب در محل نبردہ[2]۔

شیخ کے ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''میں بچپن ہی سے یہ نہیں جانتا کہ کھیل کود کیا شی ہے؟ نیند کیا ہے اور کسی کے ساتھ چلنا پھرنا کیا ہوتا ہے؟ آرام کے کیا معنی ہیں؟ آسائش کا کیا مطلب ہے اور سیر کیسی ہوتی ہے؟ تحصیل علم کے غلبۂ شوق کی بنا پر کھانا کبھی وقت پر نہیں کھایا اور نیند بھر کر کبھی نہیں سویا۔''

اس سے آگے شیخ نے حصول علم کے بارے میں اپنے بے پناہ شوق اور نظام اوقات کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ذیل میں ان کے الفاظ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

''میں جاڑے کی ٹھنڈی ہوا اور گرمی کے جھلسا دینے والے جھونکوں میں گھر سے روزانہ دو مرتبہ دہلی کے

---

[1] اخبار الاخیار، ص ۳۱۱، ۳۱۲۔

[2] اخبار الاخیار، ص ۳۱۲، ۳۱۳۔

Marfat.com

رسے میں جاتا تھا جو ہمارے مکان سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہوگا۔ دوپہر کو تھوڑی دیر گھر میں قیام کے وران ضرور تا چند لقمے کھالیتا...... میرے والدین بہت کہتے تھے کہ تھوڑی دیر کے لیے محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل لو اور وقت پر سو جاؤ۔ میں کہتا تھا، آخر کھیلنے سے مقصد دل کو خوش کرنا ہی تو ہے۔ میری طبیعت اس سے وش ہوتی ہے کہ کچھ پڑھوں یا لکھوں۔ عام طور پر ماں باپ بچوں کو پڑھنے اور مکتب جانے کی تاکید اور تنبیہ کیا کرتے ہیں، لیکن اس کے برعکس مجھے کھیل کود کی ترغیب دیتے تھے۔ کبھی مطالعہ کے دوران میں ایسا بھی ہوتا کہ صف رات گزر گئی ہے۔ میرے والد نے آواز دی، بابا! کیا کرتے ہو؟ میں سنتے ہی فوراً لیٹ جاتا کہ مبادا جھوٹ نہ بول بیٹھوں، اور کہتا، میں سوتا ہوں۔ آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ جب وہ مطمئن ہو جاتے تو پھر اٹھ بیٹھتا اور مشغول مطالعہ ہو جاتا❶۔

شیخ نے چھوٹی عمر میں سال، سوا سال کی محنت سے قرآن مجید بھی حفظ کر لیا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں علوم نقلی و عقلی پر عبور حاصل کر لیا تھا اور کتابت وانشا پردازی میں بھی مہارت پیدا کر لی تھی۔ ان کی عادت تھی کہ جو کتابیں اور ان کے شروح وحواشی ان کی نظر سے گزرتے انھیں باقاعدہ ضبط کتابت میں لے آتے۔ ان کا معمول تھا کہ رات کا زیادہ اور دن کا تھوڑا حصہ مطالعہ میں گزارتے اور رات کا تھوڑا اور دن کا زیادہ حصہ لکھنے میں صرف کرتے۔

اس کے علاوہ عبادت و ریاضت اور تہجد و شب خیزی کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ یعنی ایک طرف اگر شہراہ علم و مطالعہ پر گام زن ہیں تو دوسری طرف طریقت وتصوف کی دشوار گزار وادیوں کو بھی قطع کر رہے ہیں۔ ان دونوں سے قلبی لگاؤ کیوں تھا اور علم کے ساتھ ساتھ ریاضت و طریقت سے دلچسپی کس بنا پر تھی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ والد مکرم کی ہدایت تھی کہ محض علم کافی نہیں، اس کے ساتھ تصوف کی آمیزش بھی ضروری ہے۔ شیخ کے والد اس عالم کو جو راہ تصوف سے آشنا نہ ہو ''ملائے خشک'' سے تعبیر کرتے ہیں اور بیٹے کو محض اسی زمرے کا ایک فرد ہو کر رہ جانے سے منع فرماتے ہیں۔ شیخ لکھتے ہیں کہ اسی وجہ سے مجھے زندگی کے ابتدائی دور ہی میں حضور قلب اور طریقت سے طبعی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا:

از بدو فطرت بحکم وصیت پدر کہ می گفت بآں تا ملائے خشک و ناہموار نباشی، ہموارہ از عشق و محبت دمے می زنم و در طریق غربت و دردمندی قدمے می نہم❷۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی چھوٹی عمر ہی میں تکمیل علم کے مرحلے طے کر گئے تھے۔ اس کے بعد جب

❶ اخبار الاخیار، ص ۳۱۳۔

❷ ایضاً، ص ۳۱۴۔

Marfat.com

بیس سال کو پہنچے تو مسند تدریس پر فائز ہو گئے لیکن جیسا کہ ''بادشاہ نامہ'' میں عبدالحمید لاہوری نے اور ''شاہ جہان نامہ'' میں محمد صالح کنبوہ نے بیان کیا ہے، ہنگامہ تدریس کا یہ دور بہت مختصر ہے۔ وہ جلد ہی حجاز مقدس روانہ ہو گئے تھے ❶۔

سفر حجاز کا ذکر انھوں نے اخبار الاخیار میں بھی کیا ہے ❷۔ اور زاد المتقین میں بھی۔ ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء میں سفر بیت اللہ کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اور پھر اس ملک میں ٹھہرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ وہ ہندوستان میں اپنے آپ کو ''بے خانماں'' سمجھنے لگے اور دل میں ایک ''وحشت'' سی پیدا ہو گئی اور ذہن وقلب پر ''دیوانگی'' کی ایسی کیفیت رونما ہوئی کہ ارادۂ سفر کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ زاد المتقین میں اس کیفیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

درسن ست وتسعین وتسع مأۃ جاذبہ از غیب در رسید و وحشت در دل پدید آید چارہ نماند جز دیوانگی کردن وزاد ہمت بخیال سفر بربستن۔

یعنی ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء میں عالم غیب سے ایک جذبہ پیدا ہو گیا اور دل پر وحشت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر اس دیوانگی کی حالت میں سفر کے ارادے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا۔

جس زمانے میں شیخ نے دیار ہند سے کوچ کرنے اور سرزمین حجاز کو اپنا مسکن قرار دینے کا فیصلہ کیا، اس زمانے میں اس ملک پر مغل حکمران جلال الدین اکبر داد حکمرانی دیتا تھا اور یہاں کی دینی فضا پر تکدر کی وسیع چادر تنی ہوئی تھی۔ علمائے سو نے اکبر کے دل میں اسلامی امور اور دینی احکام کے خلاف نفرت اور عناد کی افسوس ناک کیفیت پیدا کر دی تھی، جس کے نتیجے میں اس سرزمین میں کسی صحیح العقیدہ عالم دین کا قیام ممکن نہ رہا تھا۔ شیخ بھی ان حالات سے متاثر ہوئے اور ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ ملا عبدالقادر بدایوانی لکھتے ہیں:

چوں وضع زمانہ وزمانیاں کہ ہمہ مخل و برمکارہ طبیعی مشتمل است دگرگوں شد و براوضاع آشنایاں اعتماد نماند، صحبت فلانی وفلانی راست نیامد وتوفیق رفتن بکعبہ شریفہ رفیق او شد، از دہلی بطریق جذبہ ہیچ چیز مقید نہ شدہ بگجرات رفت ❸۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

جب وقت اور اہل زمانہ کی وضع میں، جو اوقات میں مخل اور مکروہات طبعی پر مشتمل ہے فرق آیا اور ملنے والوں کے حالات قابل اعتماد نہ رہے اور فلاں وفلاں کی صحبت ورفاقت سازگار نہ رہی اور کعبہ شریف جانے کی توفیق رفیق حال ہوئی تو شیخ عبدالحق کے عالم جذبہ کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو سکی اور وہ دہلی سے گجرات روانہ ہو گئے۔

❶ بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۲۴۱، ۲۴۲۔ شاہ جہان نامہ، ج ۳، ص ۳۸۴۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۳۱۴۔

❸ منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۱۳۔

Marfat.com

ظاہر ہے یہاں ''صحبت فلانی وفلانی'' سے فیضی اور ابوالفضل مراد ہیں۔ ملا عبدالقادر نے ان کے نام کی صراحت کے بجائے ان ہی الفاظ کو کافی سمجھا ہے۔

مکہ معظّمہ میں شیخ عبدالوہاب کی خدمت میں حاضر ہو کر شیخ عبدالحق نے جس نہج سے بات کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ عبدالحق محدث اکبر بادشاہ اور اس کے امرا کے پاس بھی گئے تھے اور ان سے مل بھی چکے تھے، لیکن ان کی گرفت میں آنے سے اللہ نے ان کو محفوظ رکھا۔ اس لیے کہ ان کی تربیت علم وعبادت اور زہد وریاضت کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس کا ذکر انھوں نے المکاتیب والرسائل میں کیا ہے۔ ان کے عربی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔ شیخ عبدالوہاب سے کہتے ہیں:

''یا سیدی! میں وہ شخص ہوں، جس نے بچپن ہی سے تحصیل علم اور عبادت گزاری کی محنت وریاضت کے ماحول میں پرورش پائی ہے۔ میں نے کبھی لوگوں کی صحبت اور اختلاط کو اہمیت نہیں دی، اور جب اللہ کے فضل وکرم سے مجھے علم کا اچھا خاصہ حصہ میسر آ گیا، اور میں نے اپنی ضرورت کی تمام چیزیں یہاں سے مکمل کر لیں تو بعض اہل حقوق نے مجھے دنیا دار لوگوں کی طرف جانے کی دعوت دی۔ چنانچہ میں بادشاہ وقت اور امرائے دولت سے ملا۔ انھوں نے میری طرف بہت عنان توجہ مبذول کی۔ میرا مقام ومرتبہ بلند کیا اور یہ چاہا کہ میرے ذریعے اپنی جماعت میں اضافہ کریں اور مجھ کمزور وناتواں سے اپنی طاقت کو مضبوط ومستحکم بنائیں، لیکن اللہ نے مجھے ان سے محفوظ رکھا اور ان کے ساتھ نہ رہنے دیا۔ اس نے اپنے اس بندے کے دل میں ایک ایسا داعیہ اور جذبہ پیدا کیا کہ جس نے مجھے اس مقدس مقام پر پہنچا دیا[1]۔''

دینی اعتبار سے اکبری دور کے ہندوستان کے حالات شیخ عبدالحق اور دیگر اصحاب تقویٰ کے لیے نہایت ناسازگار اور روحانی لحاظ سے سخت تکلیف دہ تھے اور ان کے لیے وہاں ٹھہرنے کا اب کوئی امکان باقی نہ رہا تھا۔ ہندوستان کے نامور مؤرخ جناب خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''ابوالفضل اور فیضی نے اس دینی انتشار وابتری کی رہبری کی۔ شیخ عبدالحق کے فیضی سے ذاتی تعلقات تھے۔ دربار کے یہ حالات دیکھ کر ان کی طبیعت گھبرا اٹھی۔ اگر زمانہ سازی پر ان کی طبیعت ذرا بھی راضی ہو جاتی تو دولت وثروت، عزت وحشمت ان کے قدم چومتی۔ لیکن ان کا مذہبی شعور بیدار تھا اور وہ کسی قیمت پر اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کے لیے تیار نہ تھے۔ اکبر کا سیاسی اقتدار اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں مخالف تحریکوں کا نشوونما پانا ناممکن تھا۔ ان حالات میں ترک وطن کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی سمجھ میں نہ آیا، اور انھوں نے غیرت دینی سے مجبور ہو کر حجاز کی راہ لی[2]۔

---

[1] المکاتیب والرسائل، ص ۲۷۹۔

[2] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۹۵۔

Marfat.com

دہلی سے روانگی:

۹۹۵ھ/ ۱۵۸۷ء کے شروع میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے سفر حجاز کا عزم کیا اور دہلی سے روانہ ہوئے۔ ان کی پہلی منزل مالوہ تھی، مالوہ سے عازم گجرات ہوئے۔ گجرات پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز کا موسم گزر چکا ہے۔ چنانچہ سال بھر وہیں رہے اور ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء میں حجاز روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں اکبر کی طرف سے مالوہ کا حاکم مرزا کوکہ تھا۔ یہ اکبر کا رضاعی بھائی تھا۔ اخلاق حسنہ کا حامل اور بہت سے اوصاف وفضائل کا مالک تھا۔ شیخ نے اثنائے سفر میں اس کے پاس بھی قیام کیا۔ مرزا عزیز کوکہ کا لقب خان اعظم تھا۔ اکبر جب اس سے ناراض ہوتا تو کہا کرتا تھا کہ میرے اور عزیز کے درمیان دودھ کی نہر بہتی ہے، لہٰذا مجبور ہوں۔ جہاں گیر نے بھی تزک جہاں گیری میں عزیز کوکہ کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ سوانح و تاریخ اور تقریر وتحریر میں مہارت رکھتا تھا۔ لطیفہ بازی، بذلہ سنجی اور شعر گوئی میں بھی بہت مشہور تھا۔ شیخ کچھ عرصہ مالوہ میں عزیز کوکہ کے ہاں قیام پذیر رہے۔ مالوہ سے مانڈو تشریف لے گئے۔ وہاں گلزار ابرار کے مصنف محمد غوث شطاری مانڈوی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بقول خود شیخ کے "بافروغ دیدار سے بہت کچھ فیروزی اور فرخندگی کے فوائد حاصل کیے [1]۔ مانڈو سے احمد آباد پہنچے۔ احمد آباد میں ان دنوں طبقات اکبری کے مصنف مرزا نظام الدین احمد صوبے کے بخشی تھے۔ انھوں نے گرم جوشی سے شیخ کا استقبال کیا اور "بے حد التماس کر کے آئندہ موسم تک ٹھہرایا اور نہایت خواہش کر کے آپ کی خدمات انجام دیں [2]۔"

احمد آباد میں شیخ نے وہاں کے ایک جید عالم دین، صاحب تصنیفات کثیرہ اور بہت بڑے مدرس و معلم شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ/ ۱۵۹۰ء) کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان سے فیض حاصل کیا [3]۔

دہلی سے شیخ بلا کسی زادراہ کے احمد آباد پہنچے تھے۔ احمد آباد میں مرزا نظام الدین احمد بخشی نے، جو ان کے دیرینہ دوست تھے، ان کو اپنے یہاں ٹھہرایا۔ جب شیخ کے حجاز کو روانہ ہونے کا وقت آیا تو زادراہ اور جہاز کا انتظام کیا۔

شیخ محدث مکہ مکرمہ میں:

شیخ محدث رمضان المبارک سے کافی پہلے مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے۔ رمضان ۹۹۶ھ/ اگست ۱۵۸۸ء

---

[1] اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار، ص ۵۹۹۔

[2] ایضاً۔

[3] اخبار الاخیار، ص ۱۶۳۔

Marfat.com

میں انھوں نے محدثین مکہ معظمہ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درس لیا۔ پھر شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ اور استفاضہ کیا۔ ۹۹۹ھ/ ۱۵۹۱ء تک شیخ کا قیام مکہ مکرمہ میں رہا۔ تقریباً تمام عرصہ انھوں نے شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت ہی میں گزارا جو ہندوستان کے بہت بڑے علما میں سے تھے اور ۹۶۳ھ/ ۱۵۵۶ء سے مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے، جب کہ ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔

شیخ عبدالوہاب متقی:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شیخ عبدالوہاب متقی کے مختصر حالات درج کر دیے جائیں۔

شیخ عبدالوہاب کے والد کا اسم گرامی شیخ ولی اللہ اور مقام ولادت مانڈو تھا، جو ہندوستان کے علاقہ مالوہ کی قدیم حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ شیخ ولی اللہ مانڈو کے اعیان و اکابر میں سے تھے۔ مانڈو میں ان کو کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انھیں ترک وطن کر کے برہان پور جانا پڑا۔ یہ شیخ عبدالوہاب کے بچپن کا زمانہ تھا اور اس پُر آلام سفر میں یہ والد کے ساتھ تھے۔ عبدالوہاب ابھی کم سن ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس حادثے سے دل اس درجہ متاثر و مغموم ہوا کہ وطن کو خیر باد کہہ دیا اور خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کر لی۔ گجرات، دکن، لنکا، سراندیپ وغیرہ میں عرصے تک سرگرم سیاحت رہے۔ عام طور پر تین دن سے زیادہ کسی مقام پر نہ ٹھہرتے۔ البتہ اگر کوئی مرد خدا اور عالم دین مل جاتا تو مدت قیام میں کچھ توسیع ہو جاتی۔ اثنائے سفر میں نہ کسی سے کچھ طلب کرتے اور نہ اپنی ضرورت کے لیے کسی کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔ اس طرح بھوک پیاس کی بے پناہ شدتیں برداشت کرتے اور مختلف قسم کی جسمانی اور ذہنی تکلیفیں اٹھاتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ ان تکلیف دہ ایام سفر کا ذکر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے شیخ عبدالوہاب کی زبانی اخبار الاخیار میں کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

فرمودند کہ چند گاہ قوتِ ما آں بود کہ یارے می رفت، واستخوان ہائے ناکارآمدنی کہ قصابان می برتافتند برداشتہ می آورد، و پارۂ از کاہِ گندم کہ درمیان کشت زارہا افتادہ بودمی آورد، وآں استخوانہا رامی کوفتند وآں کاہ راشتہ و پاکیزہ می کردند، و درمیان دیگر کردہ درآب می جوشانیدند، و ہر کدام کاسہ ازاں صاف کردہ می خوردند، بعد از چند روز مردم شہر آ گاہ می شدند و طعامہا می آوردند، و دیگر ازاں جا انتقال می کردیم، و جائے دیگری رفتیم و زیادت بر سہ روز اقامت نمی کردیم ❶۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

”شیخ عبدالوہاب فرماتے ہیں۔ بار ہا ہمارا کھانا اس طرح ہوا کہ کوئی ساتھی جاتا اور وہ بے کار ہڈیاں جو قصاب اپنی دکان کے آگے پھینک دیتے ہیں، اٹھا لاتا، اور گیہوں کے بال جو کھیتوں میں پڑے رہتے تھے، چن لیتا۔ ان ہڈیوں کو کوٹ کر اور اس گھاس کو پاک صاف کر کے پکا لیا جاتا اور پھر سب ایک ایک پیالہ پی

❶ اخبار الاخیار، ص ۲۷۷۔

Marfat.com

لیتے۔ اس کے بعد جب شہر والوں کو ہمارے بارے میں معلوم ہو جاتا تو وہ کھانا لاتے تو ہم وہاں سے منتقل ہو کر دوسری جگہ چلے جاتے۔ کسی جگہ ہم تین دن سے زیادہ قیام نہ کرتے تھے۔"

اسی طرح شیخ عبدالوہاب متقی بھوک پیاس کی سختیاں برداشت کرتے اور سفر کے مصائب و آلام جھیلتے ہوئے جمادی الاولیٰ ۹۶۳ھ کو مکہ مکرمہ پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔ مکہ مکرمہ کی مسند تدریس پر اس زمانے میں مشہور ہندی عالم شیخ علی متقی (متوفی ۲/ جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ/ ۴/ نومبر ۱۵۶۷ء) متمکن تھے۔ ان کی شہرت علمی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور وہ شیخ عبدالوہاب کے والد گرامی شیخ ولی اللہ کے علم و فضل سے باخبر تھے۔ شیخ عبدالوہاب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر انھی کے ہو رہے اور ان کی زندگی کے آخری سانس یعنی ۲/ جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ/ ۴/ نومبر ۱۵۶۷ء تک ان سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔ تمام علوم کی تحصیل انھی سے کی اور ظاہری و باطنی علوم میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ ان کی وفات کے بعد مکہ معظمہ ہی کو اپنا مسکن ٹھہرا لیا۔ شیخ عبدالوہاب نہایت خوش خط تھے اور انتہائی صفائی اور احتیاط سے کتابت کرتے تھے۔ علاوہ ازیں زود نویس بھی تھے۔ شیخ علی متقی کی ایک کتاب جو بارہ ہزار سطور پر مشتمل تھی، شیخ عبدالوہاب نے بارہ راتوں میں اس کی کتابت مکمل کر لی تھی۔ تقویٰ و تدین، بدرجہ غایت جذبہ ذوق و شوق، زہد و سلوک سے شدید لگاؤ، بے حد اشتیاقِ حصولِ علم، استاذ سے بے پناہ عقیدت و محبت اور کتابوں کی تصحیح و کتابت میں انتہائی دلچسپی ان کے وہ اوصاف تھے جن کی وجہ سے شیخ علی متقی کو ان سے خاص تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا اور وہ انھیں انتہائی محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

شیخ عبدالوہاب کو مکہ معظمہ کے حلقہ علما و فضلا میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ دور دور سے لوگ ان سے علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ اس زمانے میں علوم شرعیہ پر عبور و استحضار میں بہت کم لوگ ان کا لگا کھاتے تھے۔ شیخ عبدالحق تحریر فرماتے ہیں:

می تواں گفت کہ دریں زمان بدانش ایشاں درعلوم شرعیہ کمتر کسے خواہد بود۔ قاموس لغت مبالغہ می تواں گفت کہ گویا ہمہ یادداشت وفقہ وحدیث نیز ہمیں حکم دارد، ومبادی علوم عربیت نیز زیادہ از قدر کفایت است۔ سالہا درحرم شریف درس ایں علوم گفتہ بودند[1]۔

(اس دور میں علوم شرعیہ پر عبور و مہارت میں بہت ہی کم لوگ ان کے مقابلے کے ہوں گے، وہ ایک زندہ قاموس تھے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ سب کچھ انھیں یاد تھا۔ فقہ اور حدیث میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ مبادی علوم عربیہ (یعنی صرف و نحو اور ادب وغیرہ) سے بھی کفایت سے زیادہ نظر رکھتے تھے۔ برسوں حرم شریف میں ان کی تدریس کا سلسلہ جاری رہا تھا۔)

شیخ عبدالوہاب متقی مختلف مسائل اور فقہی معاملات میں معتدل مزاج رکھتے تھے۔ بحث و مباحثہ سے

---

[1] اخبار الاخیار، ص ۲۷۲۔

Marfat.com

نھیں سخت نفرت تھی۔ اس زمانے کے صوفیا میں مسئلہ وحدت الوجود کا بڑا زور تھا اور توحید وغیرہ کے سلسلے میں عام طور پر یہ لوگ ابن عربی سے متاثر تھے۔ زیادہ تر فصوص الحکم اور اس موضوع کی دیگر کتابیں ان صوفیا کے زیر مطالعہ رہتی تھیں اور اپنے شاگردوں کو درساً درساً یہ کتابیں پڑھاتے بھی تھے۔ لیکن اس ضمن میں شیخ عبدالوہاب کا مسلک توقف وسکوت کا تھا۔ نہ وہ ان کتابوں کا درس دیتے، نہ ان سے اشتغال رکھتے، نہ ان کا انکار کرتے اور نہ ان کو برا کہتے۔ ان کی عادت ان فقہا کی سی نہیں تھی جو ان کتابوں پر طعن وتشنیع کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک ظاہراً و باطناً سنت پر عامل ہونا ضروری اور عقیدے کی مضبوطی لازمی ہے۔ صوفیا کی بعض مروج ومعروف کتابوں کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ ان کا مطالعہ تو کرنا چاہیے مگر یہ احتیاط رکھنی چاہیے کہ اپنے خاص انداز میں وہ جن اسرار ومعارف کا ذکر کرتے ہیں، اگر وہ حیطہ فہم میں نہ آئیں تو انھیں ترک کر دیا جائے۔ طبیعت میں خلجان اور تذبذب نہ پیدا کیا جائے۔ یہ مستحسن نہیں ہے کہ انھی کتابوں کے مطالعہ سے عقیدہ درست کرنے کی ابتدا کی جائے اور جو کچھ کسی سے سن لیا، اس کی پیروی شروع کر دی جائے۔ عقیدے کی مضبوطی اصل شی ہے۔ اس میں کسی قسم کا خلل نہیں آنا چاہیے۔

شیخ عبدالوہاب کسی کی تکفیر وتفسیق کرنے اور اس کو ملحد قرار دینے سے دامن کشاں رہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ جس نقطہ نظر کے حامل تھے، شیخ عبدالحق محدث نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

فرمودند کہ ہر کہ را بینید کہ بکلمہ اسلام اقراری کند ونماز وروزہ می کند از وے اگر امثال ایں کلمات چیزے صادر شود، معذور دارند، وتکفیر وتشنیع نکنند ونسبت بالحاد نکنند ❶۔

یعنی جس کو دیکھو، کلمہ پڑھتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے، نماز روزے کا پابند ہے، اس سے اگر ایسے کلمات صادر ہو جائیں تو اسے معذور سمجھو، اس کی تکفیر وتشنیع نہ کرو اور اس کو ملحد نہ جانو۔

شیخ ممدوح حصول علم کو انسان کے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کی افادیت ہر شخص کے لیے عام ہے:

علم بمنزلہ غذا است کہ ہمیشہ احتیاج باقی است ونفع آں عام ❷۔

(علم غذا کی مانند ہے، جس کی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے اور اس کی افادیت کا سلسلہ عام ہے۔)

ان کے نزدیک علم دین کی تحصیل، درس وتدریس، نماز، تلاوت قرآن مجید، اور ہر عمل خیر ذکر الٰہی ہے ❸۔

حلقہ باندھ کر اور دیگر انداز سے ذکر الٰہی میں مشغول ہونے کو شیخ عبدالوہاب متقی سنت قرار نہیں دیتے،

---

❶ اخبار الاخیار، ص ۲۷۱۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۲۷۲۔

❸ اخبار الاخیار، ص ۲۷۲۔

Marfat.com

بلکہ اسے مشائخ کا ایک طریق قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ذکر الٰہی لا الہ الا اللہ ہے۔

می فرمودند کہ ایں کیفیت حلقہ ذکر و بعضے اوضاع وانواع ذکر درویشاں می کنند، اگر چہ آں راسندے صحیح درسنت نبوی ﷺ نیست اما از مستحسنات مشائخ است...... واصل ذکر ہمیں لا الہ الا اللہ است ❶۔

یعنی فرماتے ہیں کہ ایک خاص انداز سے حلقہ باندھ کر ذکر کرنے کا ثبوت نبی ﷺ سے بہ سند صحیح نہیں ملتا۔ البتہ صوفیا و مشائخ اسے مستحسن قرار دیتے ہیں۔ اصل ذکر الٰہی کا لا الہ الا اللہ ہے۔

شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں:

ماہ رمضان ۹۹۶ھ/ اگست ۱۵۸۸ء کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مکہ مکرمہ میں شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشکوۃ شریف کا درس لینا شروع کیا۔ رمضان کے عشرۂ آخر میں ان کے ساتھ معتکف رہے۔ مناسک حج بھی انہی کے ساتھ ادا کیے اور پھر درس میں مشغول ہو گئے۔ ۲۳/ ربیع الثانی ۹۹۷ھ/ یکم مارچ ۱۵۸۹ء کو شیخ کی اجازت سے مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے اور آخر رجب ۹۹۸ھ/ ۲۵/ مئی ۱۵۹۰ء تک وہاں مقیم رہے۔ شیخ کو رسول پاک ﷺ کی ذات اقدس سے اس درجہ محبت تھی کہ جب دیار حبیب میں داخل ہوتے تو برہنہ پا ہو جاتے۔ ''در مدینہ برہنہ پا گردیدے۔'' مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس آ کر مشکوۃ کا درس مکمل کیا، جو شیخ عبدالوہاب سے لینا شروع کیا تھا۔ اس سے فارغ ہوئے تو شیخ نے فرمایا:

الحمدللہ! اب اس علم پر بدرجہ اتم عبور حاصل ہو گیا ہے۔ بلکہ اس قدر ہو گیا ہے کہ اس علم کی خدمت کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اب چند روز دوسرے امور میں مصروف ہونا اور خلوت اور ذکر الٰہی کی لذت سے بہرہ اندوز ہونا چاہیے۔

اس کے بعد ان کو آداب و اوضاع ذکر اور تقلیل طعام وغیرہ کی تعلیم دی۔ نیز تصوف کی کچھ کتابیں پڑھائیں۔ ''نهج السالك الى اشرف المسالك'' نام کی ایک کتاب بھی ان کو دی جو عربی میں تھی۔ شیخ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ایک اور کتاب جس کی خاص طور پر تعلیم دی، ''قواعد الطريقة فى الجمع بين الشريعة والحقيقة'' تھی۔ پھر عبادت و ریاضت کے کچھ طرق کی تلقین فرمائی، جن کا تعلق خلوت سے تھا۔ استاذ سے صحیح مسلم کی قرأت کی اجازت چاہی۔ اس سے فارغ ہو گئے تو شیخ کی طرف سے واپس ہندوستان جانے کا حکم ہوا۔

یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ قیام حجاز کے دوران میں فقہ حنفی کے متعلق شیخ عبدالحق دہلوی کے خیالات بدل گئے تھے اور وہ شافعی مذہب اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہو سکا ❷۔

❶ اخبار الاخیار، ص ۲۷۳۔

❷ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۱۱۔

Marfat.com

دیار ہند میں واپسی:

جب شیخ عبدالحق دہلوی مکہ معظّمہ میں شیخ عبدالوہاب متقی کے فیض صحبت سے ظاہری و باطنی علوم کی منزلیں طے کر چکے تو شیخ نے واپس ہندوستان جانے کا حکم دیا اور فرمایا:

بخانہ خود بروید کہ والدہ و فرزندان شما بسیار پریشان حال و بجانب شما نگران خواہند بود۔

(اب اپنے گھر جایئے کہ والدہ اور بچے آپ کی طرف سے پریشان حال اور آپ کے منتظر ہوں گے۔)

لیکن شیخ عبدالحق ہندوستان کے دینی اور مذہبی حالات سے سخت مایوس اور دل برداشتہ ہو چکے تھے اور یہاں آنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ استاذ کا فرمان سن کر عرض گزار ہوئے۔

فقیر را نیت اقامت ایں مقامات شریفہ بسیار است۔

(فقیر کے دل میں ان مقدس مقامات میں مقیم رہنے کی بہت ہی تمنا ہے۔)

اس موضوع پر مشفق استاذ اور سعادت مند شاگرد کے درمیان کافی گفتگو ہوئی۔ استاذ کا اصرار تھا کہ اپنے وطن ہندوستان واپس جائیں اور شاگرد ابھی جانے کو تیار نہ تھے۔ بالآخر استاذ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

ان شاء اللہ تعالیٰ خیریت است۔ استخارہ بکنید اکنوں در ظاہر خود خیریت منحصر است درآں کہ بخانہ خود روید۔

(ان شاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔ استخارہ کرلیں۔ اب بظاہر خیریت اسی میں نظر آتی ہے کہ اپنے وطن واپس چلے جایئے۔)

بہر حال شیخ عبدالوہاب کے پیہم اصرار سے شیخ عبدالحق محدث نے ہندوستان واپس جانے کا ارادہ کر لیا اور آخر شعبان ۹۹۹ھ/۱۲ر جون ۱۵۹۱ء کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی قبر پر دعا کے لیے طائف گئے۔ پھر رمضان کے آخر تک مکہ معظّمہ میں شیخ عبدالوہاب کی خدمت میں حاضر رہے۔ بعد ازاں شوال میں عازم ہند ہوئے اور ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۲ء کو واپس گھر پہنچے۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کے مذہبی تصورات نے الحاد کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہندوستان کی دینی فضا بادشاہ کے غیر دینی افکار سے آلودہ ہو چکی تھی۔ احکام شریعت اور سنت نبوی سے روگردانی کا دور دورہ تھا۔ دربار شاہی میں اسلامی شعار کی تضحیک ہوتی تھی اور دینی اقدار کو ماننے سے برملا انکار کیا جاتا تھا۔ علمائے سو نے مسائل و احکام شرعی میں حیلہ سازی کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ بلکہ ملا عبدالقادر بدایونی تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں:

حیل بنی اسرائیل پیش آں شرمند[1]۔

(بنی اسرائیل کی حیلہ سازیاں بھی ان کی حیلہ سازیوں کے آگے شرمندہ تھیں۔)

---

[1] منتخب التواریخ ج ۲، ص ۲۰۳۔

Marfat.com

ان روح فرسا حالات میں شیخ عبدالحق محدث مکہ معظمہ سے ہندوستان آئے۔ بلاشبہ یہ وہی حالات تھے، جس سے مایوس و بددل ہو کر انھوں نے اس ملک کو خیر باد کہا تھا اور حجاز روانہ ہوئے تھے۔ لیکن اب خود ان کی زندگی کی کیفیات بدل چکی تھیں، وہ علوم دینی کے سرمایہ سے پوری طرح بہرہ ور ہو گئے تھے اور ملک میں اسلام کی مخالفت اور رواج پذیر گمراہیوں کے سد باب کے لیے جس ساز و سامان کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس موجود تھا۔ چنانچہ آتے ہی دہلی میں مسند درس و ارشاد بچھائی اور ملک میں ہنگامۂ تدریس کا آغاز کیا۔ ہندوستان میں یہ پہلا مدرسہ تھا، جس میں قرآن و حدیث دونوں کی تعلیم کا سلسلہ عمدہ ترین نہج سے شروع کیا گیا اور شریعت اسلامیہ کی باقاعدہ تبلیغ و ترویج کی طرح ڈالی گئی۔ بلاشبہ اس دور کے ہندوستان میں دین کی نشر و اشاعت کا سب سے بنیادی اور سب سے مؤثر ذریعہ یہی ہو سکتا تھا کہ تدریس و تعلیم کے میدان میں کتاب و سنت کو علوم دینی کا مرکزی نقطہ نظر قرار دیا جائے، اور شیخ عبدالحق دہلوی نے اسی کو اختیار کیا۔ ساتھ ہی تصنیف و تالیف میں بھی سرگرم عمل ہوئے۔ اس کا ذکر انھوں نے خود بھی اخبار الاخیار میں کیا ہے اور بادشاہ نامہ میں عبدالحمید لاہوری نے بھی کیا ہے [1]۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیخ کا یہ مدرسہ اس پُرفتن دور میں شریعت اسلامی اور سنت نبوی ﷺ کا سب سے بڑا احصار تھا۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ شیخ نے ہندوستان آ کر خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔

شیخ عبدالحق اور شاہان ہند:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی سلیم شاہ سوری کے عہد میں پیدا ہوئے اور مغل حکمران شاہ جہان کے عہد میں اس کے سولھویں سال جلوس میں وفات پائی۔ اس اثنا میں یکے بعد دیگرے آٹھ فرماں روا تخت ہند پر متمکن ہوئے، جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ سلیم شاہ سوری: اس کو اسلام شاہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شیر شاہ سوری کا بیٹا تھا اور ہندوستان کا ایک منصف مزاج حکمران تھا۔ اس نے نو سال حکومت کی اور ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء میں وفات پائی۔

۲۔ مبارز خاں: یہ سلیم شاہ سوری کا عم زاد اور سالا تھا۔ سلیم کے بارہ سالہ بیٹے فیروز خاں کو قتل کر کے اور محمد شاہ عادل کا لقب اختیار کر کے حکمران بنا تھا۔ نہایت ظالم اور رذیل آدمی تھا۔ لوگ اس کو عدلی کہتے تھے اور یہ قتل ہو گیا تھا۔

۳۔ ابراہیم شاہ: یہ مبارز خاں کا زبردست حریف تھا۔ اس کے ساتھ جنگ کے بعد دہلی اور آگرہ وغیرہ کے علاقوں پر قابض ہو گیا تھا۔ اس کا انجام بھی قتل ہوا۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے اخبار الاخیار، ص ۳۱۳، ۳۱۴۔ بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۲۴۱، ۲۴۲۔

Marfat.com

۴۔ سکندر شاہ: یہ بھی سور خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کو نصیر الدین ہمایوں نے شکست دی اور ہمایوں دوبارہ ہندوستان کا بادشاہ بنا۔

۵۔ ہمایوں۔

۶۔ اکبر۔

۷۔ جہاں گیر۔

۸۔ شاہ جہان۔

یہ چاروں (نمبر ۵ تا ۸) ہندوستان کے مشہور مغل حکمران تھے اور تاریخ ہند میں خاص مرتبے کے مالک تھے۔

ان میں اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہان وہ بادشاہ ہیں، جن کا عہد حکومت شیخ نے اچھی طرح دیکھا تھا اور ان کے زمانے کے حالات کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا، لیکن اس مرد خدا کی ذہنی بلندی اور کمال خودداری ملاحظہ ہو کہ ملوک وسلاطین اور ارباب حکومت سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا اور عمر بھر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کیے رکھی۔ ہمیشہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مصروف رہے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز سے کبھی لگاؤ نہیں ہوا۔ وہ اپنے بارے میں کہا کرتے تھے:

حقی از گوشہ دہلی نہ نہم پا بیروں   خود گرفتیم کہ ملک گجراتم دادند

اس تنہا پسندی اور عزلت نشینی کی کچھ معقول وجوہ تھیں۔

ایک یہ کہ دربار اکبری میں دنیا دار علما نے جس طرح احکام شریعت اور دین صحیح کی مخالفت اور اس پر طنز وتشنیع کے اسباب فراہم کیے، اس سے صحیح العقیدہ اور حق پرست علما شدید روحانی پریشانی میں مبتلا تھے اور یہ بات ان کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ دربار سے منقطع رہنے ہی سے علم اور دین کے سرمائے کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ دربار شاہی سے تعلق قائم کرنے سے علمی معاملات اور دینی امور میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ علمی سرگرمیاں اور درباری وابستگیاں دو الگ الگ چیزیں ہیں، ان کا ایک جگہ جمع ہونا محال ہے۔

تیسرے یہ کہ شیخ طبعاً مدح سرائی اور مبالغہ آمیزی سے متنفر تھے اور دربار میں آمد ورفت رکھنے والوں میں مدح سرائی اور مبالغہ آمیزی کے اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔

شیخ محدث اور جہاں گیر بادشاہ:

عہد اکبری میں دین ومذہب کا جو حال ہوا، اس سے بہت سے دیگر اصحاب دل کی طرح شیخ کا دل بھی سخت مغموم تھا اور ان کا ضمیر بے حد اذیت محسوس کرتا تھا لیکن ملک کی زمام اقتدار جہاں گیر کے ہاتھ میں آئی تو حالات بہت ہی روبا صلاح ہو گئے تھے اور ارباب حکومت میں ایک خوش گوار ذہنی اور فکری تبدیلی رونما ہو گئی

Marfat.com

تھی۔ خود جہاں گیر نے بڑی حد تک اپنے باپ کے افکار و تصورات سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس لیے بادشاہ کے لیے شیخ محدث کے دل میں بھی خیر خواہانہ جذبات ابھر آئے اور اس پر شرعاً جو فرائض عائد ہوتے ہیں، ان سے اسے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ ''نورانیہ سلطانیہ'' کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا، جس میں ''قواعد وارکان سلطنت'' پر مفصل بحث کی۔ بعد ازاں شیخ نے جہاں گیر کے بیٹے شاہ جہان کے لیے ایسی چالیس احادیث جمع کیں، جن میں رسول اللہ ﷺ نے سلاطین کو پند و نصائح سے نوازا ہے۔ یہ رسالہ شیخ محدث نے ''ترجمة الاحاديث الاربعين فى نصيحة الملوك والسلاطين'' کے نام سے موسوم کیا۔

بہر حال اکبر کی وفات کے بعد ہندوستان کے مذہبی حالات بدل گئے تھے اور شیخ کے نزدیک اب فرماں روایانِ ہند کو صحیح دینی تعلیم سے روشناس کرانے کا وقت آ گیا تھا، لہٰذا انھوں نے جہاں گیر سے میل جول رکھنے اور اس سے تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس کے علاوہ جناب خلیق احمد نظامی یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''ممکن ہے، شیخ محدث کے رویہ میں اس تبدیلی کا سبب حضرت خواجہ باقی باللہ کی تعلیم ہو۔ خواجہ صاحب کا اصول یہ تھا کہ جھونپڑوں سے لے کر محلوں تک ارشاد و تلقین کا ہنگامہ برپا کرنا چاہیے اور سلاطین سے علیحدہ رہنے کی بجائے، ان کو متاثر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ❶۔''

جہاں گیر سے ملاقات:

جہاں گیر بادشاہ شیخ کو بڑے قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ان کے علم و فضل اور زہد و ورع سے بہت متاثر تھا۔ شیخ بھی اس کے اس جذبے اور اخلاص کی بے حد قدر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ دربار میں اس سے ملاقات کے لیے بھی گئے۔ جہاں گیر اپنے تزک میں مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کا ذکر کرتا ہے:

شیخ عبدالحق دہلوی کہ از اہل فضل و ارباب سعادت است، دریں آمدن دولت ملازمت دریافت، کتابے تصنیف نمودہ بود، مشتمل بر احوال مشائخ ہند، بنظر در آمدہ، خیلکے زحمت کشیدہ، مدتہاست کہ در گوشۂ دہلی بوضع توکل و تجرید بسر می بود، مرد گرامی است صحبتش بے ذوق نیست۔ بانواع مراحم دل نوازی کردہ رخصت فرمودم ❷۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

شیخ عبدالحق دہلوی جو اہل فضل اور اصحاب سعادت میں سے ہیں، میری یہاں آمد پر تشریف لائے۔ انھوں نے مشائخ ہندوستان کے حالات میں ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ میں نے اس کتاب کو دیکھا، اس

❶ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۴۶۔

❷ تزک جہاں گیری، ص ۲۸۵۔

Marfat.com

تصنیف میں انھوں نے بڑی محنت کی ہے①۔ وہ مدت سے دہلی کے ایک گوشے میں توکل و تجرید کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قابل احترام شخص ہیں۔ ان کی صحبت بے ذوق نہیں۔ میں نے ان کو بہت سی عنایات و نوازشات سے رخصت کیا۔

جہاں گیر اس دور میں شیخ کے علم و فضل، زہد و عبادت اور توکل و تجرید سے بہت متاثر تھا۔ اس نے ان کو ایک گاؤں بھی جاگیر کے طور پر پیش کیا، جس کا نام بکروالا تھا اور دہلی کے جنوب مغرب میں نو کوس کے فاصلے پر واقع تھا۔ شیخ نے پہلے تو یہ گاؤں قبول کرنے سے انکار کیا مگر جب بادشاہ کا اصرار بڑھا تو قبول فرما لیا۔

زندگی کے آخری دنوں میں جہاں گیر کے دل میں شیخ کے بارے میں کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی طرح شیخ احمد سرہندی کے ایک مرید خاص مرزا حسام الدین کے متعلق بھی بادشاہ کے دل میں کبیدگی کے آثار ابھر آئے تھے۔ سکینۃ الاولیا میں داراشکوہ اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

درو قتے کہ جہاں گیر بادشاہ در کشمیر بودند، بعضے مردمان سخنان غیر واقع از طرف شیخ عبدالحق دہلوی کہ امام محدثانِ وقت اند و مرزا حسام الدین کہ از مریدانِ باکمال شیخ احمد سہرندی بودہ اند، بعرض بادشاہ رسانیدند②۔

یعنی جس زمانے میں جہاں گیر بادشاہ کشمیر میں مقیم تھا۔ کچھ لوگوں نے محدثین عصر کے امام شیخ عبدالحق دہلوی اور شیخ احمد سرہندی کے مرید باکمال مرزا حسام الدین کے متعلق بے سروپا باتیں بادشاہ کے گوش گزار کیں۔

اس سے متاثر ہو کر جہاں گیر نے شیخ عبدالحق محدث اور مرزا حسام الدین، دونوں کو کشمیر بلا بھیجا۔ شیخ کے بیٹے نورالحق کو حکم ہوا کہ دہلی سے کابل چلے جائیں۔ شیخ عبدالحق یہ حکم سن کر لاہور پہنچے تو سخت پریشان تھے۔ حضرت میاں میر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھے تو اس کی وجہ دریافت کی۔ فرمایا اس بڑھاپے میں وطن اور بچوں سے جدا ہونے کے خیال سے پریشان ہوں۔ لیکن قدرت خداوندی ملاحظہ ہو کہ شیخ عبدالحق ابھی کشمیر نہ پہنچے تھے کہ جہاں گیر کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنے بیٹے نورالحق کے ساتھ واپس دہلی تشریف لے گئے۔

داراشکوہ کا کہنا ہے کہ یہ بے سروپا باتیں (سخنان غیر واقع) جو شیخ کے بارے میں جہاں گیر سے کی گئی تھیں، بالکل غلط اور محض بہتان تھیں۔ مگر اس نے ان بے سروپا باتوں کی جنھیں وہ ''سخنان غیر واقع'' سے تعبیر کرتا ہے، وضاحت نہیں کی۔ اس ضمن میں جناب خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ داراشکوہ نے ''سخنانِ غیر واقع'' کی وضاحت نہ کر کے شیخ محدث کی زندگی کے اس اہم حادثے کی نوعیت کو سمجھنے میں ایک محقق کے لیے دشواری پیدا کر دی ہے۔ ساتھ ہی مراۃ الحقائق کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے کہ (جہاں گیر کی بیوی) نور جہاں اور شیخ محدث کے درمیان بعض معاملات میں کشیدگی تھی۔ ممکن ہے اسی نے غلط باتوں اور ''سخنان غیر واقع'' سے جہاں

① اس کتاب سے شیخ کی مشہور تصنیف ''اخبار الاخیار'' مراد ہے۔

② حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ بحوالہ سکینۃ الاولیا (قلمی نسخہ) ص ۶۴، ۶۵۔

Marfat.com

گیر کے کان بھرے ہوں۔ مشہور ہے کہ ایک بار نور جہاں نے شیخ محدث کو محل میں آنے کی دعوت دی تھی، جس کے جواب میں شیخ نے کہا تھا کہ فقیر کا بادشاہوں یا بیگمات کے پاس کچھ کام نہیں ہے۔ فقیر کے لائق جو امر ہو، کہلا بھیجیے، اس کے انجام دینے میں حتی الامکان دریغ نہ ہوگا[1]۔

لیکن اس ضمن میں رود کوثر میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم نے جس نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے، وہ بھی لائق تذکرہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جہاں گیر نے تزک میں جس احترام سے شیخ عبدالحق کا ذکر کیا ہے، اس کے پیش نظر دارا شکوہ کا بیان مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ شاید شیخ سے باز پرس میں جہاں گیر کی شیعہ بیگم نور جہاں کی شکایتوں کو دخل ہو، لیکن شیعہ سنی مسئلے پر شیخ عبدالحق محدث کی رائے معتدلانہ تھی۔ شیعہ مؤرخ خافی خان ان کی نسبت لکھتا ہے: ''صد کتاب از علوم عقلی و نقلی تالیف فرمودہ۔ خصوص شرح مشکوٰۃ و تاریخ مدینہ کہ دراں ذکر حضرت ائمہ طاہرین و ظلم و تعدی مخالفین باظہار کمال حسن عقیدت نمودہ...... گویند بعد مراجعت از کعبۃ اللہ اکثر برزبان صداقت بیان ایں سخن جاری بود کہ تابہ بیت اللہ رفتہ مدتے مقیم گشتہ صرف اوقات برائے تحقیقات احادیث نمودہ، ندانستم کہ بیشتر احادیث مشہور وضعی است۔'' شیعہ سنی اختلاف کے بارے میں شیخ کا مسلک شاہ ولی اللہ کا تھا، حضرت مجدد الف ثانی کا نہ تھا۔ اس کی بنا پر حکومت سے چپقلش قرین قیاس نہیں۔ اگر دارا شکوہ کا بیان صحیح ہے تو ممکن ہے کہ جہاں گیر کے خلاف شاہ جہان نے جو بغاوت کی تھی، اس میں دوسرے راسخ العقیدہ مسلمانوں کی طرح شیخ محدث اور شیخ حسام الدین کی ہمدردیاں شاہ جہان کے ساتھ ہوں۔ بہر کیف شاہ جہان کی تخت نشینی نے یہ الجھن ختم کر دی اور عہد شاہ جہانی میں آپ کی قدر و منزلت میں اور اضافہ ہو گیا[2]۔

یاد رہے، دارا شکوہ نے سکینۃ الاولیا میں شیخ عبدالحق اور مرزا حسام الدین کے خلاف بادشاہ کے کانوں میں جن ''سخنان غیر واقع'' ڈالنے کا ذکر کیا ہے، وہ کسی اور تذکرے میں مذکور نہیں۔ اگر اس میں کوئی صداقت ہے تو اس کے نتیجے میں بادشاہ کی طرف سے انھیں کابل چلے جانے کا حکم دینے کی دو وجہیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ بادشاہ کی بیوی نور جہاں شیعہ تھی اور وہ دربار شاہی میں شیخ کے اثر و رسوخ کو برداشت نہ کرتی تھی۔ دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ شاہ جہان نے جب اپنے باپ جہاں گیر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اس میں شیخ اپنی ہمدردی کا مستحق شاہ جہان کو سمجھتے تھے، اس لیے قدرتی طور پر جہاں گیر کے دل میں اس سے کبیدگی پیدا ہوئی۔ مگر اندازہ یہ ہے کہ ''سخنان غیر واقع'' کا قصہ غالباً صحیح نہیں ہے، کیوں کہ شیخ اعتدال پسند عالم تھے، نہ تو انھیں شیعہ مسلک سے کوئی ایسی عداوت تھی جو معاملے کو یہاں تک پہنچا دے کہ بادشاہ انھیں علاقہ بدر ہونے کا حکم دینے پر مجبور ہو جائے اور نہ سیاست اور ملکی معاملات سے انھیں کوئی اتنی دلچسپی ہو سکتی تھی، وہ تو ایک گوشے میں بیٹھ کر

---

1. حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۴۹ بحوالہ مرآۃ الحقائق، ص ۸۷۔
2. رود کوثر، ص ۳۸۲۔

Marfat.com

تصنیف و تالیف اور تدریس و تعلیم کی خدمت انجام دینے والے بزرگ تھے، ان کی عمر بھی اس قسم کے ہنگاموں میں دخیل ہونے کے قابل نہ تھی۔ اس وقت وہ پچھتر (۷۵) سال سے زیادہ عمر کو پہنچ چکے تھے۔

شیخ کا مکان، مدرسہ اور کتب خانہ:

شیخ کے حالات بیان کرتے ہوئے جناب خلیق احمد نظامی نے ان کے مکان، مدرسے اور کتب خانے کے بارے میں بعض ضروری معلومات بہم پہنچائی ہیں اور درج ذیل سطور اسی سے مستفاد ہیں۔

شہر دہلی میں جو شیخ کا مولد و مدفن ہے، دہلی دروازے سے آگے، باغ مہدیاں کے قریب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا مکان، خانقاہ اور مسجد واقع تھی۔ اس خانقاہ کو خانقاہ قادریہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا تذکرہ خود شیخ نے مشکوٰۃ کی شرح میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

تم فی الخانقاہ القادری وھذا الفقیر یخدمہ ویکنسہ ویوقد سراجہ۔
کانماتم فی مجلس واحد۔

(یعنی یہ کتاب خانقاہ قادریہ میں ختم ہوئی، جس کی خدمت یہ فقیر کرتا ہے اور اس میں جھاڑو دیتا ہے اور اس کا چراغ روشن کرتا ہے۔ یہ کتاب ایک جلسہ میں ختم ہوئی۔)

شیخ کی خانقاہ کا کچھ حصہ انیسویں صدی کے آخر تک موجود تھا۔ منشی برکت علی حقی مصنف مرآۃ الحقائق نے اس کی زیارت کی تھی۔ مسجد کی اس زمانے میں مرمت کرائی گئی تھی۔ شیخ کے مکانات کی زمین کی پیمائش ان کے خاندان کے لوگوں نے کرائی تھی۔ کل رقبہ چھ بیگہ اور چند بسوہ تھا۔ شیخ کے خاندان کے افراد ہی اس پر قابض تھے۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ جس مدرسے میں شیخ نے تعلیم حاصل کی وہ کہاں تھا۔ اخبار الاخیار میں شیخ فرماتے ہیں، وہ ہمارے گھر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

ہر روز باوجود غلبہ برودت ہوائے زمستان وشدت حرارت تابستان، دوبار بمدرسہ دہلی کہ شاید از منزل مابُعد دو میل داشتہ باشد، میل می کردم۔ درمیانہ روز ادنیٰ وقفہ درغربت خانہ بسبب تناول چند لقمہ کہ سبب عادی قوام حرکت ارادیست واقع می شد، ومدتے پیشتر از وقت صبح بمدرسہ می رسیدیم و در سایہ چراغ جزومی کشیدیم[1]۔

(موسم سرما کی سخت ٹھنڈی ہواؤں اور موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ میں گھر سے روزانہ دو مرتبہ صبح اور دوپہر کو مدرسے جاتا۔ مدرسہ ہمارے مکان سے تقریباً دو میل دور تھا۔ دوپہر کو مدرسے سے لوٹ کر دوسروں کی طرح قوت ارادی اور حرکت جسمانی کو قائم رکھنے کی غرض سے صرف چند نوالے کھا لیتا۔ وقت صبح سے کچھ پہلے اٹھ کر چراغ کی روشنی میں دو جز پڑھتا اور پھر اول وقت مدرسے پہنچ جاتا۔)

---

1. مرآۃ الحقائق، ص ۱۰۳۔

Marfat.com

یہ مدرسہ پرانے قلعے کے قریب واقع تھا۔ مرأۃ الحقائق کے مصنف منشی برکت علی حقی اس کے متعلق درج ذیل تفصیلات بیان کرتے ہیں:

یہ مدرسہ بعمارت پختہ دو منزلہ مع مسجد، مقابل قلعہ کہنہ، لب سڑک دہلی و آگرہ واقع ہے یعنی دروازہ قلعہ کا بجانب غرب ہے اور اس مدرسہ کا بسمت شرق ہے۔ یہ مکان مدرسہ اب تک بدستور قائم ہے۔ سامنے دروازہ سے مسجد اس کی نظر آتی ہے، اور گرد صحن کے ہر چہار طرف مکانات بنے ہوئے ہیں، اور اس سے زیادہ تر پتہ یہ کہ سمت دکھن جو دیوار مکانات بالا کی ہے، اس میں چند دروازے باہر کی طرف ہیں کہ منجملہ ان کے کوئی دروازہ پتھر اور چونے سے مسدود شدہ ہے اور کوئی بدستور کشادہ ہے کہ یہ ہیئت پلوں سے جانے والوں کو دور سے دکھائی دیتی ہے اور جانب شمال متصل اس مدرسہ کے ایک ایسا ہی مکان عظیم الشان اسی زمانے کا بنا ہوا ہے اور اس کے دروازہ صدر پر سنگ سرخ لگا ہوا ہے [1]۔

شیخ کا کتب خانہ دیار ہند کا ایک عظیم کتب خانہ تھا اور بیش قیمت علمی ذخائر پر مشتمل تھا۔ ان کے بیٹے شیخ نور الحق اور خاندان حقی کے بعض دیگر حضرات وقت کے اکابر علما میں سے تھے۔ انھوں نے شیخ کے کتب خانے کی بھی حفاظت کی اور اپنے علمی ذوق کی بنا پر اس میں مزید اضافہ بھی کیا۔ لیکن اٹھارویں صدی عیسوی میں جب دہلی کی سیاسی فضا میں انقلاب و تغیر کی مہیب لہریں اٹھیں اور مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں نے ہنگامہ آرائی کا ایک وسیع سلسلہ شروع کر دیا تو معنوی اور علمی دولت کے یہ انمول خزانے بھی دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ شیخ نور الحق کے پوتے شیخ الاسلام شرح بخاری کی دوسری جلد کے خاتمے پر شیخ عبدالحق محدث کے کتب خانے کی بربادی کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

درہنگام تشتت بال و پریشانی حال از نہب و غارت خانہ درحملہ شہر کہنہ دہلی کہ باستیلاء کفار عتاۃ باتفاق طغاۃ ولغاۃ واقع شد وذہاب کتب خانہ قدیمہ وجدیدہ کہ بسیار ازاں دریں دیار کمیاب بود وبعضے ازاں بہ تصحیح وتحشیہ و تدریس شیخ المحدثین شیخ اجل محقق دہلوی بود، رحمۃ اللہ علیہ...... نماند درخانہ مگر چند کتب در گوشہ ہائے شکستہ افتادہ۔

یعنی دہلی کے قدیم شہر میں سرکش و باغی کفار کے غلبہ واستیلا کے زمانے میں جب عوام میں اضطراب و پریشانی پیدا ہوئی، قتل و غارت کے سلسلے دراز ہوئے اور سلب ونہب کا معاملہ انتہا کو پہنچ گیا تو شیخ المحدثین حضرت علامہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا کتب خانہ بھی اس کی نذر ہو گیا جو اس نواح میں سب سے بڑا کتب خانہ تھا۔ بعض کتابیں خود شیخ محدث کی تصحیح شدہ تھیں، بعض وہ تھیں جو تدریس کے وقت ان کے سامنے رہتی تھیں اور بعض ان کے حواشی اور تعلیقات سے مزین تھیں...... ان میں سے چند کتابیں باقی بچیں اور وہ بھی پھٹی ہوئی اور شکستہ حال میں۔

---

[1] مرأۃ الحقائق، ص ۱۰۳۔

Marfat.com

تصانیف وتالیفات:

شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے مصنف اور شارح تھے۔ اس ضمن میں اللہ کی مدد سے انھوں نے جو خدمات انجام دیں، وہ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ تصنیف و تالیف کے سلسلے کا آغاز انھوں نے طالب علمی ہی کے زمانے میں کر دیا تھا جو زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا۔ ان کی کل تصانیف کی تعداد ساٹھ ہے۔ بعض مؤرخین مثلاً عبدالحمید لاہوری ❶، محمد صالح کنبوہ ❷ اور خافی خان ❸ نے یہ تعداد سو (۱۰۰) سے زیادہ بتائی ہے، جو صحیح نہیں۔ شیخ نے اپنے ایک رسالے میں، جسے انھوں نے ''تالیف قلب الالیف بذکر فہرس التوالیف'' کے نام سے موسوم فرمایا ہے، اپنی تالیفات کی فہرست درج کی ہے۔ اس میں انچاس (۴۹) کتابوں کے نام مندرج ہیں، لیکن اس رسالے کی تالیف کے وقت سلسلہ تصنیف جاری تھا۔ چنانچہ اس کے آخر میں رقم طراز ہیں:

ہنوز سلسلۂ سخن دراز است و در فیض الٰہی باز۔ تا بکجا رسد و بکجا رساند۔

(ابھی سلسلہ تصنیف جاری اور طویل ہے اور باب فیض خداوندی کھلا ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے اور وہ اسے کہاں تک پہنچاتا ہے۔)

اس کے بعد مزید گیارہ کتابیں تصنیف کیں، یعنی کل ساٹھ ہو گئیں۔ جو حضرات سو سے زیادہ کتابیں بتاتے ہیں، وہ شیخ کی ایک کتاب ''الرکاتیب والرسائل'' کو اس تعداد میں شامل کرتے ہیں، جو چھوٹے بڑے اڑسٹھ رسائل پر مشتمل ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب مختلف رسائل و مسائل پر محیط ہے مگر درحقیقت یہ ایک ہی کتاب ہے جیسا کہ خود شیخ ممدوح نے اس کی وضاحت کی ہے:

ایں ہمہ را یک صحیفہ سازند و در یک جلد شیرازہ بہ بندد۔

(اسے ایک ہی کتاب سمجھا جائے اور تمام رسائل کی ایک ہی جلد بنائی جائے۔)

شیخ محدث کی تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ وہ تمام اصناف علم پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے اور اپنے نقطہ فکر کی وضاحت میں مرتبہ کمال پر فائز تھے۔ تفسیر، تجوید، حدیث، فقہ، عقائد، اخلاق، تصوف، سیرت، تاریخ، سیاست، منطق، فلسفہ، نحو وغیرہ تمام علوم میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ذیل میں موضوع کے اعتبار سے ان کی تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

تفسیر:

تفسیر قرآن سے متعلق شیخ نے مندرجہ ذیل تین کتابیں تحریر کیں:

---

❶ بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۳۴۱، ۳۴۲۔

❷ شاہ جہان نامہ، (عمل صالح) ج ۲، ص ۳۸۴۔

❸ منتخب اللباب، ج ا ص ۲۴۰۔

Marfat.com

تعلیق الہاوی علی تفسیر البیضاوی: یہ تفسیر بیضاوی یعنی علامہ عبداللہ بن عمر بیضاوی کی مشہور تصنیف "انوار التنزیل والاسرار التاویل" کے چند مقامات پر حواشی ہیں۔ شیخ نے ان حواشی کے ذریعے تفسیر بیضاوی کے بعض ضروری مقامات کی توضیح کی ہے اور ان کے خیال کے مطابق بیضاوی میں جو زائد اور مشکل مباحث تھے، ان کو نکال دیا ہے تاکہ حواشی کی افادیت میں مزید اضافہ ہو سکے۔ شیخ کو ان حواشی کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ انھیں بیضاوی کے بعض مقامات سے شدید اختلاف ہے جس کا اظہار وہ "نکات الحق" میں بایں الفاظ کرتے ہیں:

بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ در تفسیر قرآن و شرح احادیث ازیں باب قباحتہا بسیار کردہ، تجاوز اللہ عنہ۔ واگر آں مواضع را بشمارم سخن دراز گردد۔

(یعنی علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر قرآن اور تشریح احادیث میں بہت سی لغزشیں کی ہیں، اللہ انھیں معاف فرمائے۔ میں اگر ان مقامات کا شمار کرنے لگوں تو سلسلۂ گفتگو دراز ہو جائے۔)

افسوس ہے ان حواشی کا اب کوئی نسخہ دست یاب نہیں۔

شرح صدور تفسیر آیت النور: یہ سورۂ نور کی پینتیسویں آیت اللہ نور السموات والارض کی تفسیر ہے، جو ایک ہزار سے زائد سطور پر مشتمل تھی۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی اس کا قلمی نسخہ ۱۹۰۲ء تک شیخ محدث کی اولاد امجاد میں سے ایک بزرگ خان بہادر مولوی انوار الحق حقی دہلوی مرحوم کے کتب خانے میں دہلی میں موجود تھا❶۔ معلوم نہیں مرحوم کا کتب خانہ اب کہاں ہے اور کس حال میں ہے یا یہ تفسیر اس میں موجود ہے یا نہیں ہے۔

تحصیل الغنائم والبرکات بتفسیر سورۃ والعادیات: یہ سورہ والعادیات کے برکات وغنائم پر ڈھائی صفحے کا مختصر نوٹ ہے جو المکاتیب والرسائل میں شامل ہے۔

تجوید وقرأت:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی قرأت وتجوید میں بھی مہارت رکھتے تھے اور یہ علم انھوں نے شیخ عبدالوہاب متقی سے حاصل کیا تھا۔ اس موضوع میں ان کے درک وکمال کا یہ عالم تھا کہ اس میں دو کتابیں تصنیف فرمائیں جو درج ذیل ہیں:

درۃ الفرید فی قواعد التجوید: یہ کتاب اب نایاب ہے اور غالباً برصغیر کے کسی کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔ اس نام کی ایک تصنیف حافظ طاہر اصفہانی کی بھی ہے۔

شرح العقیدۃ الجزریہ: شیخ کی یہ کتاب بھی اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا ایک نسخہ جو بہترین خط میں لکھا ہوا ہے اور ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء کا مکتوبہ ہے، اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانہ میں موجود ہے❷۔

❶ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۲۔

❷ لباب المعارف العلمیہ، کتاب نمبر ۱۰۹۲۔

Marfat.com

حدیث:

شیخ کی بہت بڑی خدمت علم وہ ہے جو انھوں نے علم حدیث کی ترویج و اشاعت کے لیے انجام دی۔ اس باب میں اس پورے خطہ برصغیر میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ تمام تذکرہ نگاروں نے اس میدان میں ان کی تگ و تاز کا نمایاں الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ خافی خان کہتا ہے:

درکمالات صوری و معنوی و تحصیل علوم عقلی و نقلی، خصوص تفسیر و حدیث در ہندوستان ثانی نداشت ❶۔

یعنی (شیخ عبدالحق) صوری و معنوی کمالات اور علوم نقلی و عقلی کی تحصیل کے سلسلے میں بالخصوص تفسیر و حدیث میں ہندوستان بھر میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

فقیہ و محدث، بقیۃ السلف و حجۃ الخلف، جامع علوم ظاہر و باطن بود، علم حدیث بہ محروسہ ہندوستان از وشیوع یافتہ ❷۔

(وہ فقیہ و محدث، بقیۃ السلف، حجۃ الخلف، جامع علوم ظاہری و باطنی تھے۔ خطۂ ہند میں علم حدیث انہی کی مساعی سے اشاعت پذیر ہوا۔)

مآثر الکرام میں میر غلام علی آزاد بلگرامی علم حدیث سے متعلق ان کی خدمات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

بہ نشر علوم سیما علم شریف حدیث پرداختہ بہ نہجے کہ در دیار عجم احدے را از علمائے مقتدمین و متاخرین دست نداده است۔ ممتاز و مستثنیٰ گردید۔ در فنون علمیہ خاصۂ فن حدیث، کتب معتبرہ تصنیف کرد۔ چنانکہ علمائے زماں اعتنا بآں وزیدہ دستور العمل خود دارند ❸۔

(اشاعت علوم، خصوصاً علم حدیث شریف کے نشر و ذیوع میں پورے دیار عجم میں علمائے متقدین و متاخرین میں سے کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ سب سے ممتاز و مستثنیٰ تھے۔ تمام فنون علمیہ بالخصوص فن حدیث سے متعلق مستند اور لائق اعتماد کتابیں تصنیف کیں، جن کو علمائے عصر قابل اعتنا گردانتے اور اپنے لیے راہنمائے عمل قرار دیتے ہیں۔)

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی مشہور تصنیف تذکرہ میں رقم طراز ہیں:

مولانا جمال الدین کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے۔ اللہ نے ان کی عمر میں بڑی

---

❶ منتخب اللباب، ص ۵۵۱۔

❷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۹۔

❸ مآثر الکرام، دفتر ا ص ۱۸۸۔

Marfat.com

برکت دی اور ان کے درس و تصنیف نے ایک پورا سلسلہ تعلیم ملک میں عام کیا۔

مولانا مزید لکھتے ہیں:

حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دور علم و تعلم کے بانی ہوئے، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی، تصنیف و تراجم کی بنیاد ڈالی گئی۔ خود شاہ صاحب نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ پھر ان کے صاحب زادے شیخ الاسلام نور الحق نے صحیح بخاری کا۔

نواب صدیق حسن خان ان کے متعلق ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

شیخ عبدالحق دہلوی، فقیہ حنفی و علامہ دین حنیفی است، واما بمحدث مشہور است و ترجمہ او بر مشکوٰۃ و جز آں از مؤلفات نافعہ ممتعہ معروف...... دست گاہش در فقہ بیشتر از مہارت در علوم سنت سنیہ است، ولہٰذا جانب داری اہل رائے جانب او گرفتہ۔ معہذا جاہا حمایت سنت صحیحہ نیز نمودہ۔ طالب علم را باید کہ در تصانیف وے خذ ماصفا ودع ماکدر پیش نظر دارد❶۔

یعنی شیخ عبدالحق دہلوی فقیہ حنفی اور علامہ دین حنیفی ہیں۔ وہ محدث کی حیثیت سے مشہور ہیں اور ترجمہ مشکوٰۃ اور دیگر مؤلفات نافعہ و مفیدہ میں معروف......لیکن علوم سنت نبویہ میں مہارت کی نسبت فقہ میں زیادہ دست رس رکھتے ہیں۔ اس لیے اہل الرائے کے لیے جانب داری سے کام لیتے ہیں۔ تاہم بہت سے مقامات میں سنت صحیحہ کی حمایت بھی فرماتے ہیں۔ طالب علم کو چاہیے کہ ان کی تصانیف سے استفادہ کرتے وقت خذ ماصفا ودع ماکدر کے اصول کو پیش نظر رکھے۔

نواب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:

حق ایں است کہ شیخ عبدالحق رحمہ اللہ تعالیٰ در ترجمہ عربی بفارسی یکے از افراد ایں امت است۔ مثل او دریں کاروبار خصوصاً دریں روزگار احدے معلوم نیست❷۔

(حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے میں اس امت کے یگانہ روزگار فرد ہیں۔ اس معاملے میں بالخصوص اس عہد میں بجز ان کے کسی اور کا پتا نہیں چل سکا جو ان کا ہم سر ہو۔)

علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی فرماتے ہیں:

اول من نشر علم الحدیث بارض الھند تصنیفاً و تدریساً❸۔

(شیخ عبدالحق محدث دہلوی پہلے عالم دین ہیں، جنھوں نے تصنیف و تدریس کے ذریعے سرزمین ہند میں علم حدیث کی نشر و اشاعت کی۔)

❶ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار، ص ۱۱۲۔

❷ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار۔ ص ۱۱۲۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۱۔

Marfat.com

مولوی فقیر محمد جہلمی لکھتے ہیں:

آپ ہی ہیں جنھوں نے پہلے پہل حدیث کا علم، عرب سے لا کر اس سے ہندوستان کو منور کیا اور اپنی تصنیفات سے علم حدیث کو ہند کے ہر ایک خطہ وقطعہ میں پھیلایا❶۔

بہر حال علم حدیث کی ترویج و اشاعت میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور اس موضوع سے متعلق تیرہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں، جن میں بعض کتابیں بڑی ضخیم ہیں اور بعض مختصر! ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اشعۃ اللمعات شرح المشکوٰۃ: یہ فارسی زبان میں مشکوٰۃ شریف کی بڑی جامع اور مفصل شرح ہے۔ اس عظیم خدمت حدیث کا آغاز شیخ موصوف نے ۱۰۱۹ھ/۱۶۰۱ء کو دہلی میں کیا تھا، جس کا سلسلہ ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء تک جاری رہا۔ دیگر علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ چھ سال کی مسلسل محنت اور پیہم تگ وتاز کے بعد یہ اہم کام تکمیل کو پہنچا۔

اشعۃ اللمعات چار جلدوں پر محیط ہے، پہلی جلد میں ایک مقدمہ بھی ہے جو انتالیس (۳۹) صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مقدمہ، علم حدیث، محدثین اور اقسام حدیث پر مشتمل ہے اور نہایت عالمانہ اور محققانہ مواد اپنے دامن صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ مقدمے میں اختصار کے ساتھ امام بخاری، امام مسلم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابوداود، امام ترمذی، امام نسائی، ابن ماجہ، دارمی، دارقطنی، بیہقی، رزین، نووی، ابن جوزی کے حالات بیان کیے ہیں۔ معلومات کے اعتبار سے یہ مقدمہ چوں کہ خاص اہمیت وافادیت کا حامل ہے، اس لیے ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء کو مطبع اعظم جون پور سے اس کو علیحدہ بھی شائع کیا گیا۔

اس مقدمے کے علاوہ اشعۃ اللمعات کی پہلی جلد، مشکوٰۃ کی مندرجہ ذیل پانچ کتابوں کے ترجمے پر مشتمل ہے:

۱۔ کتاب الایمان، ۲۔ کتاب العلم، ۳۔ کتاب الطہارت، ۴۔ کتاب الصلوٰۃ، ۵۔ کتاب الجنائز۔

دوسری جلد میں مندرجہ تحت چھ کتابیں شامل ہیں:

۱۔ کتاب الزکوٰۃ، ۲۔ کتاب الصوم، ۳۔ کتاب فضائل القرآن، ۴۔ کتاب الدعوات، ۵۔ کتاب اسماء اللہ تعالیٰ، ۶۔ کتاب المناسک۔

تیسری جلد درج ذیل نو کتابوں کو محتوی ہے۔

۱۔ کتاب البیوع، ۲۔ کتاب العتق، ۳۔ کتاب الحدود، ۴۔ کتاب الامارت والقضاء، ۵۔ کتاب الجہاد، ۶۔ کتاب الصید والذبائح، ۷۔ کتاب الاطعمۃ، ۸۔ کتاب اللباس، ۹۔ کتاب الطب والرقی۔

چوتھی جلد میں دو کتابیں ہیں جو یہ ہیں:

❶ حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۹۔

Marfat.com

۱۔ کتاب الادب، ۲۔ کتاب الفتن:

لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح: یہ عربی زبان میں مشکوٰۃ کی شرح ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تسوید و تحریر کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب شیخ ممدوح اشعۃ اللمعات کی تصنیف میں مصروف تھے۔ اس اثنا میں بعض ایسے مباحث سامنے آئے جن کو فارسی میں منتقل کرنا مناسب نہ سمجھا، کیوں کہ فارسی اس دور کے عوام کی زبان تھی اور یہ وہ مباحث تھے، جن کی وضاحت عوام کے لیے بوجوہ خلاف مصلحت تھی، لہٰذا انھیں فارسی کے بجائے عربی کے قالب میں ڈھالا گیا۔ اس ضمن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ مختلف مباحث کی نزاکت کے پیش نظر فارسی اور عربی دونوں شرحوں کی تسوید شروع کی گئی اور عربی کی شرح فارسی سے پہلے مکمل ہوگئی[1]۔

لمعات التنقیح سے شیخ محدث ۲۴/ رجب ۱۰۲۵ھ/ ۲۸/ جولائی ۱۶۱۶ء کو فارغ ہوئے۔ اس شرح کی خوبی یہ ہے کہ اس میں بعض لغوی و نحوی مشکلات کی نہایت عمدگی سے عقدہ کشائی کی گئی ہے اور فقہی مسائل کی بہت سی پیچیدگیوں کو بہترین اسلوب سے حل کیا گیا ہے۔ اس کے آغاز میں ایک مقدمہ ہے جو بڑی جامعیت اور افادیت کا حامل ہے۔ یہ مقدمہ مولانا احمد علی سہارن پوری نے مشکوٰۃ کے متن کے ساتھ شائع کیا ہے۔

جمع الاحادیث الاربعین فی ابواب علوم الدین وترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین: یہ کتاب یعنی جمع الاحادیث الاربعین فی ابواب علوم الدین ان چالیس احادیث کا مجموعہ ہے، جن میں رسول اللہ ﷺ نے بادشاہوں اور حکمرانوں کو ہدایات و نصائح سے نوازا ہے۔ اور ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین، ان احادیث کے فارسی ترجمے کا نام ہے۔ یہ ترجمہ شیخ نے شاہ جہان کے لیے کیا تھا۔

جامع البرکات منتخب شرح المشکوٰۃ: اس کتاب کو شرح مشکوٰۃ کے خلاصے کی حیثیت حاصل ہے اور دو جلدوں پر محیط ہے۔ یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جو بقول شیخ ”شامل فوائد کثیرہ و عوائد عزیزہ“ ہے۔ اس کا انداز کیا ہے؟ شیخ فرماتے ہیں۔ ”در ہر باب یک دو تین حدیث ذکر کردہ و باقی احادیث بر مضامین آں اقتصار کردہ و اختصار نمودہ شدہ است[2]۔“

یہ کتاب ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے مولوی انوارالحق دہلوی مرحوم کے کتب خانے میں موجود تھے[3]۔

رسالہ اقسام حدیث: یہ عربی زبان میں علم حدیث سے متعلق ایک مفید رسالہ تھا۔ فہرست التوالیف میں شیخ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ مولوی انوارالحق دہلوی مرحوم کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ موجود تھا[4]۔

---

1. اشعۃ اللمعات، ج ۱، ص ۲۔
2. فہرس التوالیف۔
3. حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۰۔
4. ایضاً۔

Marfat.com

رسالہ شب برأت: شیخ محدث کا یہ رسالہ فارسی زبان میں تھا۔ فہرست التوالیف میں اس کا نام مذکور نہیں۔ گزشتہ صدی تک اس کا قلمی نسخہ شیخ کے خاندان میں موجود تھا[1]۔

ماثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ: یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ماہ محرم سے لے کر ماہ ذی الحجہ تک یعنی سال بھر کے قمری مہینوں میں کن دینی امور کی انجام دہی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ عاشورۂ محرم کے باب میں جو صحیح احادیث مروی ہیں، وہ اس میں درج کر دی گئی ہیں اور ان توہمات کی تردید کی گئی ہے جو محرم کے سلسلے میں مشہور عوام ہیں۔ مثلاً یہ جو کہا جاتا ہے کہ جو شخص یوم عاشورہ کو سرمہ لگائے گا اسے کبھی آشوب چشم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ یا یہ کہ اس دن غسل کرنے والا کبھی کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوتا، شیخ نے اس کتاب میں ان باتوں کو لغو اور باطل قرار دیا ہے۔ پھر جو احادیث حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تعلق رکھتی ہیں ان پر محدثانہ نقطہ نگاہ سے ناقدانہ بحث کی ہے۔ آخر میں حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے تعلقات کا ذکر فرمایا ہے۔ ماہ صفر کے بارے میں اس خیال کی تردید فرمائی ہے کہ یہ نامبارک اور منحوس مہینا ہے۔ شعبان، رمضان، شوال، ذی الحجہ کے ذکر میں روزہ، تراویح، عید الفطر، صیام شوال، حج اور عید الاضحیٰ وغیرہ کے متعلق مروی احادیث کو جمع کر دیا ہے۔ ماہ ربیع الاول کے مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے مختصر حالات درج کیے ہیں۔ ربیع الثانی کے ضمن میں اختصار کے ساتھ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح بیان فرمائے ہیں۔

یہ کتاب ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء کو کلکتہ سے اور ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء کو لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ ۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۲ء میں سبحان بخش شکار پوری نے ''اعمال ماثورہ'' کے نام سے اس کو مع ترجمہ دہلی سے شائع کیا تھا۔ اس کے قلمی نسخے بھی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

الاکمال فی اسماء الرجال: شیخ عبدالحق نے فہرس التوالیف میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ ڈاکٹر زبید احمد نے اپنی تصنیف ''دی کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو دی عربک لٹریچر'' میں حدیث سے متعلق عربی تصانیف کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ کتاب کتب خانہ دہلی اور کتب خانہ بانکی پور میں دست یاب ہے اور علی الترتیب اس کا نمبر ۱۰۵ اور ۳۲۷ ہے۔

اسماء الرجال والرواۃ المذکورین فی کتاب المشکوٰۃ: اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ان تمام رواۃ حدیث کا تذکرہ ہے، جن کا ذکر مشکوٰۃ میں آیا ہے۔ سب سے پہلے خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کے حالات حروف تہجی کی ترتیب سے معرض کتابت میں لائے گئے ہیں۔ شیخ کی یہ عمدہ ترین تصنیف اب تک اشاعت کے مراحل سے نہیں گزری۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بانکی لائبریری میں موجود ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی غالباً برصغیر کے دوسرے عالم ہیں، جنھوں نے اسماء الرجال کے موضوع پر

---

[1] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۰۔

Marfat.com

اس انداز کی کتاب تصنیف کی۔ اس سے پہلے صاحب مشارق الانوار امام حسن صغانی لاہوری (متوفی ۶۵۰ھ/ ۱۲۵۲ء) نے ''دارالسحابہ فی بیان مواضع وفیات الصحابہ'' تصنیف فرمائی۔ اس کتاب میں امام ممدوح نے ان مقامات کا ذکر کیا ہے، جہاں رسول اللہ ﷺ کے آٹھ سو کے قریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وفات پائی۔ اس میں صحابہ کے اسمائے گرامی بترتیب حروف ہجا لکھے گئے ہیں۔

شرح سفر السعادۃ: سفر السعادۃ علامہ مجد الدین فیروز آبادی کی تصنیف ہے جو لغت کی مشہور کتاب قاموس کے منصف تھے۔ علامہ موصوف باقاعدہ ہندوستان سے تعلق تو نہ رکھتے تھے، البتہ دو مرتبہ وارد ہند ہوئے تھے۔ پہلی بار فیروز شاہ تغلق کے عہد میں، دوسری مرتبہ محمود شاہ تغلق کے زمانے میں۔ ہندوستان کے شاہی درباروں میں اس عالم دین کی بے حد قدر افزائی ہوئی اور انھیں شاہانہ سرپرستی کا مستحق سمجھا گیا۔ حدیث کے موضوع پر سفر السعادۃ ان کی ایک قابل قدر تصنیف ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کی وہ احادیث جو عبادات اور زندگی کے ضروری مسائل سے متعلق ہیں، جمع کی گئی ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کتاب کی گوناگوں افادیتوں کے پیش نظر اس کی شرح لکھنا شروع کی تھی۔ لیکن چوں کہ علامہ فیروز آبادی خالص محدثانہ نقطہ فکر کے حامل ہیں اور صرف رسول اکرم ﷺ کے اقوال و افعال اور فرامین اقدس کو مشعل راہ اور مرکز دلیل ٹھہرانے کے حامی ہیں، اس کے مقابلے میں وہ آئمہ مجتہدین سے متعدد مسائل میں اختلاف بھی کرتے ہیں، اس لیے حضرت شیخ ان سے مختلف رجحان رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ (علامہ فیروز آبادی) ''در مبالغہ وافراط از حد اعتدال و جادۂ انصاف بیروں رفتہ است۔''

شیخ محدث سفر السعادۃ کے بارے میں یہ تو مانتے ہیں کہ اس کے مصنف کا مقصد رسول اکرم ﷺ کے اعمال مبارکہ کو حدیث کی روشنی میں ثابت کرنا ہے۔ ''مقصود وے دریں کتاب آنست کہ اعمال شریفہ حضرت نبویہ را از عبادات و عادات باحدیث اثبات کردہ، وتصحیح نمودہ و ہر دو انکار برآنچہ مخالف آں از مذاہب اربعہ واقع شدہ تصریح کردہ است۔'' لیکن ساتھ ہی رقم طراز ہیں۔ ''پس در شرح تائید مذاہب اربعہ خصوصاً مذہب حنفی و معارضہ کلام مصنف ادعائے صحت احادیث موافق مدعائے خود نمودہ، رقم رد و بطلان برخلاف آں کشیدہ است، کردہ شد۔''

بہرحال شیخ عبدالحق کی شرح سفر السعادۃ تین حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول میں ان احادیث اور ان کے اسناد و رجال پر بحث کی گئی ہے جو علامہ فیروز آبادی نے کتاب میں درج فرمائی ہیں۔ حصہ دوم میں مجتہدین کے فقہی رجحانات کو زیر بحث لایا گیا ہے، بالخصوص مذہب حنفی کے اصولوں کی حمایت کی گئی ہے، اور درحقیقت جیسا کہ خود شیخ فرماتے ہیں، سفر السعادۃ کی شرح لکھنے کا اصلی اور بنیادی باعث یہی ہے۔ حصہ سوم میں احکام شرعی کو بتفصیل بیان کیا گیا ہے۔

سفر السعادۃ کی یہ شرح شیخ نے پچھتر ۷۵ سال کی عمر میں لکھنا شروع کی تھی، انھیں خیال تھا کہ شاید وہ

Marfat.com

یہ اہم کام مکمل نہ کر پائیں اور اس کی تکمیل سے قبل ہی دنیا سے رخصت ہو جائیں، اس لیے اپنے بیٹے مولانا نورالحق کو اس کے مکمل کرنے کی وصیت فرمائی اور ساتھ ہی کام کی اہمیت کے پیش نظر ان کتابوں کی فہرست بھی درج کر دی جو شرح کرتے وقت ان کے پیش نگاہ تھیں۔ فہرست درج کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مولانا نورالحق کو کام کی تکمیل کے سلسلے میں کتابوں کی تلاش میں دقت نہ پیدا ہو:

''وصیت می کنم فرزند عزیز نور دیدۂ دانش وبینش نورالحق را کہ وجود ثانی ومقصود اولیٰ من است...... ایں مہم را صورت دہد ❶۔

شرح سفر السعادۃ ۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۶ء میں کلکتہ سے اور ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۵ء اور ۱۹۰۳ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے قلمی نسخے دنیا کی مختلف لائبریریوں مثلاً لندن کی انڈیا آفس لائبریری، حیدر آباد دکن، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، کلکتہ مدرسہ، پشاور اور بانکی پور کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ بانکی پور کا نسخہ خود حضرت شیخ محدث کے ہاتھ کا مکتوبہ ہے اور اس کے آخر میں یہ الفاظ درج ہیں:

ثم انہ کان تسوید ھذا الکتاب بین الصلوٰۃ من یوم الاثنین الرابع والعشرین من شھر جمادی الاولیٰ سنۃ ست عشر والف والحمدللہ۔ ثم تم انتساخ ھذہ النسخۃ و مقابلتھا علیٰ ید مولفہ الفقیر الی اللہ عبدالحق بن سیف الدین بن سعد اللہ سحرۃ یوم الثلاثاء ألسابع والعشرون من جمادی الاخریٰ سنۃ الف و ثلاث و ثلاثین من ھجرۃ سید الاولین والاخرین ❷۔

انڈیا آفس لائبریری لندن کا نسخہ خود مصنف کا تصحیح شدہ ہے۔ حیدر آباد (دکن) کا نسخہ ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء) کا ایشاٹک سوسائٹی کا ۱۰۸۷ھ کا اور کلکتہ مدرسہ کا ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء کا مکتوبہ ہے۔

شرح سفر السعادۃ کا ایک نسخہ مرزا مظہر جان جاناں رحمہ اللہ کے پاس تھا اور یہ وہ نسخہ تھا جو شیخ کے زیر درس رہ چکا تھا۔ مرزا صاحب اس نسخے کو نہایت احتیاط اور قدر سے رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کے ایک دوست فریدالدین نے یہ نسخہ عاریتاً مانگا تو مرزا صاحب نے ایک شخص محمد عظیم کے ہاتھ بھیج دیا مگر ساتھ ہی خط بھی لکھا کہ یہ نسخہ میرے نزدیک قابل احترام ہے کیوں کہ یہ مصنف کے درس میں رہ چکا ہے اور اس پر خود شیخ عبدالحق کے ہاتھ کے حواشی لکھے ہوئے ہیں۔ میں اس کی بے حد قدر کرتا ہوں، آپ بھی اس کی اسی طرح قدر کریں، جس کا یہ مستحق ہے۔ مرزا مظہر جانان جاناں کے الفاظ یہ ہیں:

نسخہ شرح سفر السعادۃ موجود است، امامیان ما وشما وعدہ آں نبود، ہرگاہ شما طلبید مستحق تر از شما کیست۔ آں را ہم حوالہ محمد عظیم کردیم۔ ایں نسخہ از درس مصنف گزشتہ وحواشی بدست مصنف دارد وخط شیخ عبدالحق را می شناسم۔ قدر آں را بدانید، وبآب وتاب نگاہ دارید چنانچہ ہست ❸۔

❶ ملاحظہ ہو شرح سفر السعادۃ: ص ۴،۲۔

❷ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۵، بحوالہ فہرست بانکی پور لائبریری، ج ۱۴، ص ۴۷۔

❸ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۵، بحوالہ کلمات طیبات، ص ۶۶۔

Marfat.com

تحقیق الاشارۃ فی تعمیم البشارۃ بالجنۃ: یہ شیخ کا مرتب کردہ ایک مجموعہ احادیث ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ کی وہ تمام احادیث جمع کر دی گئی ہیں، جن میں رسول اکرم ﷺ کی طرف سے کسی صحابی رسول کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ اس مجموعے کے آخر میں شیخ محدث نے وہ احادیث بھی درج کر دی ہیں جو اہل بیت رسول کے فضائل ومناقب سے متعلق ہیں۔ یہ احادیث انھوں نے ابن اثیر کی جامع الاصول اور علی متقی کی تصنیف کنز العمال سے جمع کی ہیں۔ ڈاکٹر زبید احمد ''دی کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو عربک لٹریچر'' میں لکھتے ہیں کہ اس کا ایک نسخہ دہلی کے ایک کتب خانے میں موجود ہے۔

ترجمۃ مکتوب النبی فی تعزیۃ ولد معاذ بن جبل: یہ رسول اللہ ﷺ کے اس تعزیتی مکتوب کا فارسی ترجمہ ہے جو حضور ﷺ نے اپنے مشہور صحابی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ان کے بیٹے کی وفات کے موقعے پر لکھا تھا۔ شیخ کی تصنیف المکاتیب والرسائل میں اس مکتوب کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے جو دو صفحوں پر مشتمل ہے [1]۔

فقہ:

علم فقہ سے متعلق شیخ محدث نے تین کتابیں تصنیف فرمائیں، جن کا مختصر تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے۔

فتح المنان فی تائید النعمان: یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور فقہ حنفی کی تائید میں ہے۔ اس میں شیخ نے مختلف عنوانات قائم کر کے احادیث جمع کی ہیں اور ان میں ائمہ اربعہ کے منضبط شدہ مسائل بیان کیے ہیں۔ آخر میں محاکمہ ہے اور مسائل فقہ کے سلسلے میں مآخذ ائمہ پر بحث ہے جس میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ماخذ فقہی کو دیگر ائمہ کے ماخذ پر ترجیح دی ہے۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں دست یاب ہے۔

الفوائد: یہ بھی فقہ اور عقائد کے بارے میں شیخ کا ایک رسالہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے۔

ہدایت الناسک الی طریق المناسک: یہ رسالہ مناسک حج اور آداب زیارت حرمین کے متعلق ہے۔

عقائد:

عقائد اسلام سے متعلق شیخ کی کتاب تکمیل الایمان وتقویۃ الامان ہے جو فارسی زبان میں ہے۔ اپنے موضوع میں یہ ایک جامع کتاب ہے، جس میں ایمان، اس کی نوعیت، عذاب قبر، جبر واختیار، بعثت، معراج، شفاعت، جنت ودوزخ، توبہ، استمداد از قبور، معجزات، اہل بیت وغیرہ عنوانات پر اہل سنت کے نقطہ نظر کو نہایت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور کئی دفعہ چھپی۔ ۱۸۷۳ء میں میر علی نے اس کا اردو ترجمہ ''سبیل الجنان'' کے نام سے کان پور سے شائع کیا تھا۔ ۱۸۸۱ء میں یہ دوسری مرتبہ طبع ہوئی۔

تکمیل الایمان کے قلمی نسخے برٹش میوزم، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد، انڈیا آفس لائبریری لندن،

---

[1] ملاحظہ ہو المکاتیب والرسائل، ص ۲۸۶ تا ۲۸۸۔

Marfat.com

بانکی پور لائبریری اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور وغیرہ میں موجود ہیں۔ بانکی پور میں اس کا ایک ایسا نسخہ بھی ہے جو خود مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا تصحیح شدہ ہے۔ [1]

تصوف:

تصوف کے مختلف گوشوں کے متعلق شیخ عبدالحق دہلوی نے دس کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

تنبیہ العارف بماوقع فی العوارف: یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ اس کی تصنیف کا پس منظر شیخ عبدالقادر جیلانی کا یہ قول ہے:

قدمی هذا علی رقبة کل ولی الله۔

کہ میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی نے عوارف المعارف میں اس قول پر اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر نے یہ بات بحالت سکر کہی تھی۔ شیخ عبدالحق نے تنبیہ العارف ماوقع فی العوارف میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی نے یہ بات بحالت صحو کہی تھی اور اللہ کے حکم کے مطابق کہی تھی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ رام پور لائبریری میں موجود ہے۔ رام پور کی فہرست کتب میں اس کا نام الرسالة فی بیان قول قدمی هذا علی رقبة کل ولی الله درج ہے۔

تحصیل التعرف فی معرفة الفقة والتصوف: یہ بھی عربی میں ہے۔ اس میں فقہ اور تصوف یا شریعت اور طریقت میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ مرأة الحقائق میں لکھا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ مولوی انوار الحق حقی کے کتب خانے میں موجود تھا۔

شرح فتوح الغیب: فتوح الغیب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ۷۸ مواعظ کا دلچسپ مجموعہ ہے جس میں دینی مسائل کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں بطریق تصوف بیان کیا گیا ہے۔ شیخ عبدالحق دہلوی نے ''شرح فتوح الغیب'' کے نام سے فارسی میں اس کی شرح قلم بند کی۔ یہ کتاب ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء کو مکمل ہوئی۔ ''شرح فتوح الغیب'' ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں ''فتوح الغیب'' کے متن کے ساتھ لاہور سے چھپی تھی۔ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے بھی شائع ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے بھی یورپ اور برصغیر کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔

ترجمہ غنیة الطالبین: غنیة الطالبین شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ اس میں شیخ نے بہت سے دینی مسائل بیان کیے ہیں، جن میں ایک بحث تہتر فرقوں کے متعلق ہے، جو بڑی علمی بحث ہے۔ شیخ عبدالحق نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔ معلوم نہیں یہ ترجمہ کہیں موجود ہے یا نہیں۔

---

[1] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۸۔

Marfat.com

انتخاب المثنوی المولوی المعنوی: یہ کتاب دو ہزار تین سو سطور پر مشتمل تھی۔ اب نایاب ہے۔

توصیل المرید الی المراد بہ بیان الاحزاب والاوراد: یہ فارسی زبان میں ایک رسالہ ہے جس میں ادعیہ و اوراد کے بارے میں محدثین اور مشائخ کے نقطہ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء کو یہ رسالہ مطبع مفید عام آگرہ سے چھپا تھا۔

مرج البحرین فی الجمع بیان الطریقین: اس میں قرآن و حدیث اور کتب تصوف کے حوالوں سے شریعت و طریقت، تصوف وفقہ اور علم و عقل کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ کتاب فارسی میں ہے اور تیرہ وصال پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء میں مطبع عبدالرحمٰن سے اور ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء کو مطبع محمدی کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ ''وصال السعدین'' کے نام سے مولوی غوث محمد فرخ آبادی نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ء کو مطبع نامی لکھنؤ میں چھپا۔ مولوی شیخ عبدالقادر نے ''شرح البحرین'' کے نام سے فارسی زبان میں اس کی شرح بھی سپرد قلم کی۔ بانکی پور لائبریری میں مرج البحرین فی الجمع بین الطریقین کا ایک ایسا قلمی نسخہ موجود ہے، جو خود شیخ عبدالحق محدث کا تصحیح شدہ ہے۔

نکات الحق والحقیقہ من باب معارف الطریقہ: یہ فارسی زبان میں ہے اور تصوف کے مختلف مسائل پر مشتمل ہے۔ ۱۸۹۱ء میں مولوی محمد یوسف مراد آبادی نے یہ کتاب مطبع احتشامیہ مراد آباد سے شائع کی تھی۔ لطائف الحق کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

جواب بعض کلمات شیخ احمد سرہندی: حضرت مجدد الف ثانی کے نام شیخ کا یہ ایک طویل مکتوب ہے۔

رسالہ وجودیہ: یہ شیخ محدث کا ایک رسالہ ہے جو مولوی انوار الحق حقی دہلوی کے کتب خانے میں موجود تھا[1]۔

اخلاق:

آداب و اخلاق کے موضوع پر شیخ محدث نے چار کتابیں تصنیف فرمائیں، جن کا تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے:

آداب الصالحین: یہ کتاب درحقیقت امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء علوم الدین کے چند ابواب کا فارسی زبان میں ایک خلاصہ ہے، جو چھپ چکا ہے۔ ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں نواب الدین خان دہلوی نے ''ہادی الناظرین'' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا۔ ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں یہ اردو ترجمہ دوسری دفعہ شائع ہوا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مولانا عبدالعزیز کی وساطت سے آداب الصالحین کا ایک ایسا قلمی نسخہ دیکھا تھا، جس کی تصحیح خود کتاب کے مصنف شیخ محدث دہلوی نے اپنے ہاتھ سے کی تھی[2]۔

---

[1] مرأۃ الحقائق، ص ۵۵۔

[2] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۸۔

Marfat.com

آداب اللباس: اس رسالے میں شیخ نے لباس کے بارے میں اتباع سنت کی تلقین فرمائی ہے اور اس لباس کی تفصیل بیان کی ہے جو شرعاً ممانعت اور کراہت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم، برلن لائبریری، اور بانکی پور وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ایک مرتبہ یہ رسالہ اردو ترجمے کے ساتھ چھپ بھی چکا ہے۔

آداب المطالعۃ والمناظرہ: یہ ایک مثنوی ہے جو شیخ نے طالب علمی کے زمانے میں آداب مناظرہ اور آداب گفتگو کے متعلق لکھی تھی۔ یہ مثنوی اب دست یاب نہیں۔

تسلیۃ المصاب لنیل الاجر والثواب: اس رسالے میں مصیبت کے وقت صبر کرنے اور اللہ سے اجرو ثواب حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

وظائف واوراد:

وظائف واوراد اور اعمال کے موضوع سے متعلق شیخ نے پانچ کتابیں تصنیف کیں جو یہ ہیں:

اجوبۃ الاثنا عشر فی توجیہ الصلوٰۃ علی سید البشر: اس کا ایک قلمی نسخہ مولوی انوار الحق حقی دہلوی کے کتب خانے میں ۱۹۰۲ء تک موجود تھا[1]۔

ترغیب اہل السعادات علی تکثیر الصلوٰۃ علی سید الکائنات: یہ فارسی زبان میں ایک مختصر رسالہ ہے اور درود شریف کی فضیلت سے متعلق ہے۔

رسالہ عقد انامل: یہ فارسی زبان میں انگلیوں پر اوراد کا شمار کرنے کے بارے میں ایک رسالہ ہے۔

مطلب الاعلیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ: اس رسالے میں اسمائے الٰہی کے خواص بیان کیے گئے ہیں: اس کا اردو ترجمہ مع متن کے مولوی قطب الدین نے محرم ۱۲۶۹ھ/ نومبر ۱۸۵۲ء کو مطبع مصطفائی لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔

منطق اور فلسفہ:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے منطق اور فلسفہ کے موضوع سے متعلق عربی زبان میں تین کتابیں قلم بند کیں۔

بناء المرفوع فی ترصیص مباحث الموضوع۔

درة البهيه فی اختصار الرسالة الشمسيه۔

شرح شمسيه۔

---

[1] حیات شیخ عبدالحق محدث بحوالہ مرآۃ الحقائق، ص ۴۸۔

Marfat.com

تاریخ:

تاریخ ایک نہایت اہم موضوع ہے۔ اس پر شیخ محدث تین کتابیں ضبط تحریر میں لائے، جو یہ ہیں:

جذب القلوب الی دیار المحبوب: یہ فارسی زبان میں مدینہ طیبہ کی تاریخ ہے اور مندرجہ ذیل سترہ ابواب کو محتوی ہے۔

اسمائے ایں بلدۂ عظیم۔
در ذکر فضائل ومحامدے کہ بہ احادیث وآثار بہ ثبوت رسیدہ۔
در اخبار سکان ایں بقعہ کرامت نشان در قدیم الزمان۔
در انبعاث باعثہ قدوم سید الکائنات بدیں بلدہ۔
در ہجرت نمودن سید المرسلین۔
در کیفیت عمارت مسجد نبوی۔
در میان تغیرات وزیارتہا کہ در مسجد شریف بعد از حضرت راہ یافتہ۔
در فضائل مسجد شریف وروضہ آنحضرت ﷺ۔
در ذکر عمارت مسجد قبا وبیان سائر مساجد نبوی۔
در ذکر بعض آثار متبرکہ کہ بشرف حضور فائض النور مشہور اند۔
در ذکر بعض اماکن شریفہ کہ درمابین مکہ ومدینہ مشہور ومعروف اند۔
فضائل مقبرۂ شریفہ۔
فضائل جبل احد وشہدا۔
فضائل زیارت حضرت سید الانام۔
در حکم زیارت قبر شریف۔
در آداب زیارت حضرت سید الانام واقامت در آں عالی مقام۔
فضائل وآداب صلوٰۃ بر سید کائنات۔

اس کتاب کی تالیف میں حضرت شیخ نے زیادہ تر سید نور الدین علی کی تصنیف ''وفاء الوفاء باخبار المصطفیٰ'' سے استفادہ کیا ہے۔ اس کی تسوید کا آغاز ۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء کو مدینہ منورہ میں کیا تھا اور اختتام ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء کو دہلی میں ہوا۔ اس بات کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

وابتدائے تسوید ایں حروف در سنہ ثمان وتسعین وتسع مآتہ در مدینہ منورہ بودہ وتوفیق تبییض آں در سنۃ احدی والف در بلدۂ دہلی یافتہ [1]۔

---

[1] جذب القلوب، ص ۶۔

جذب القلوب الی دیار المحبوب نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ کلکتہ، لکھنؤ اور دہلی سے کئی بار چھپی۔ سب سے پہلے متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۶ء میں مطبع انڈیمان سن کلکتہ سے ٹائپ میں شائع ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ''تاریخ مدینہ'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔

ہندوستان کی بانکی پور لائبریری کی زینت اس کتاب کا ایک ایسا قلمی نسخہ ہے، جو شیخ محدث کی وفات سے صرف چار سال پیشتر۔ ۹ رصفر ۱۰۴۸ھ/ ۱۲ رجون ۱۶۳۸ء کو نقل کیا گیا تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جو اچھی حالت میں ہے [1]۔

ذکر ملوک: یہ تاریخ سلاطین ہند ہے جو ذکر ملوک یا تاریخ حقی کے نام سے موسوم ہے۔ کتاب سلطان شہاب الدین محمد غوری سے جلال الدین اکبر کے چالیسویں سن جلوس تک کے حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کا آغاز قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتا ہے:

﴿اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ [2]

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم کے خیال کے مطابق یہ کتاب ''غالباً (شیخ محدث کے) قیام فتح پور سیکری کے زمانے میں شروع ہوئی'' جو اکبری حکومت کے پورے جاہ وجلال کا دور تھا اور اس کے چالیسویں سن جلوس یعنی شیخ محدث کے حجاز سے واپسی کے تین چار سال بعد (۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۶ء میں) پایہ تکمیل کو پہنچی، مگر اس میں فاضل مصنف نے اکبر کے خلاف کوئی بات نہیں لکھی۔ شیخ محدث فرماتے ہیں:

واز اول جلوس تا الآن کہ از مدت سلطنت عظمیٰ ودولت کبریٰ ایں شہنشاہ عالی نژاد عالم مدار اقالیم شاں زیادہ بر چہل سال رفتہ است۔

شیخ ممدوح کتاب کے آخری باب میں بادشاہ کی فتوحات اور حکومت کے قواعد وضوابط وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ باتیں قلم بند کرنا چاہتے تھے، مگر اس کی فرصت نہ ملی، تاہم اس کے بعد کچھ اضافے ہوتے رہے ہیں۔

ذکر ملوک ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ البتہ اس کے قلمی نسخے حیدر آباد دکن، مدراس، علی گڑھ وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ علی گڑھ کا نسخہ بڑا قدیم ہے اور ۱۰۳۰ھ/ ۱۶۲۱ء کا کتابت شدہ ہے۔ یعنی مصنف کی زندگی میں اس کی کتابت ہو چکی تھی۔

---

[1] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۹۴۔ بحوالہ فہرست مرتبہ براؤن، ص ۳۵۵۔

[2] یہ سورۂ آل عمران کی چھبیسویں آیت ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

اے اللہ! مالک کے، تو جس کو چاہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہے ملک چھین لیتا ہے۔ تیرے اختیار میں ہے سب بھلائی، بلاشبہ تو ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

Marfat.com

سیاست:

رسالہ نورانیہ سلطانیہ: یہ رسالہ تاریخی نوعیت کا نہیں بلکہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ اس کو ضبط تحریر میں لانے کا محرک شیخ کا یہ جذبہ صادقہ تھا کہ اس زمانے کا بادشاہ نورالدین جہاں گیر قواعد سلطنت، اس کے بنیادی احکام، اطوار و آداب اور ارکان واسباب سے باخبر ہو سکے۔ چنانچہ فہرس التوالیف میں شیخ اس کی وجہ تالیف کے بارے میں فرماتے ہیں:

در بیان قواعد سلطنت واحکام ارکان واسباب وآلات تحصیل آں واوضاع آداب ایں امر عظیم الشان مزین بہ اسم سامی سلطان الوقت وملک الزمان خلد اللہ ملکہ۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ ۱۹۴۷ء سے قبل دہلی میں سید ظہیر الحسن صاحب کے کتب خانے واقع قرول باغ میں دیکھا تھا۔ اور کسی کتب خانے میں اس کا کوئی قلمی نسخہ نہیں ہے۔

تذکرہ وسیرت:

سیرت وتذکرہ کے موضوع کے تحت شیخ کی مندرجہ ذیل سات تصانیف ہیں:

مدارج النبوۃ: اس میں رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے مفصل حالات بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب بارہ سو سے زائد صفحات کو شامل ہے اور ذیل کی ترتیب سے رسول اکرم کے سوانح اقدس کو پانچ حصوں میں منقسم کیا گیا ہے:

قسم اول: در ذکر فضائل وکمالات، اخلاق وصفات۔
قسم دوم: در ذکر نسب وولادت۔
قسم سوم: در ذکر وقائع سنوات از ابتدائے ہجرت تا وفات۔
قسم چہارم: در ذکر حدوث مرض وغسل وتکفین وغیرہ۔
قسم پنجم: در ذکر اولاد طاہرہ وازواج مطہرہ۔

مدارج النبوۃ اکبری عہد میں لکھی گئی اور ان حالات سے متاثر ہو کر لکھی گئی جن میں لوگوں کا روحانی تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذات ستودہ صفات سے منقطع ہو رہا تھا اور احکام شریعت اور امور سنت سے رغبت باقی نہ رہی تھی۔ اس دور میں شیخ محدث نے ضروری خیال فرمایا کہ ملک کے عوام وخواص کو رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے پاکیزہ واقعات سے روشناس کرایا جائے۔ یہ بات شیخ نے خود ہی بیان فرمائی [1]۔

مدارج النبوۃ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء میں فخر المطابع دہلی اور ۱۲۷۱ھ اور ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء میں مظہر العجائب

---

[1] ملاحظہ ہو مدارج النبوۃ، ج ۱، ص ۳۔

Marfat.com

پریس سے طبع ہوئی۔ علاوہ ازیں ۱۸۶۷ء اور ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ سے دو مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے بھی انڈیا آفس لائبریری لندن، جرمنی، برٹش میوزم لندن اور بانکی پور وغیرہ میں موجود ہیں۔ ''منہاج النبوۃ'' کے نام سے خواجہ عبدالمجید نے اس کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا جو چھپ چکا ہے۔

اخبار الاخیار: فارسی زبان میں علما و مشائخ ہند کا یہ مستند اور قابل اعتماد تذکرہ ہے اور اس موضوع میں اس کو بنیادی مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ برصغیر کے علمائے عظام اور مشائخ کرام کے واقعات و حالات لکھنے اور معلوم کرنے والا کوئی شخص اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اس کے مطالعہ سے شیخ کے وسعت معلومات کا پتا چلتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ بزرگان دین سے انتہائی عقیدت کے باوجود تحقیق و تفحص کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ اخبار الاخیار میں شیخ نے اپنے بعض اسلاف اور خود اپنے کچھ ذاتی واقعات بھی اختصار کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ان کی زندگی ہی میں اس کتاب کو اہل علم میں شہرت و قبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ جب یہ کتاب بادشاہ ہند جہاں گیر کے سامنے آئی تو اس نے اس کی بہت تعریف کی اور شیخ کی محنت و کاوش کو خراج تحسین پیش کیا[1]۔

یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۷ء میں مطبع محمدی سے ۱۳۰۹ھ اور ۱۳۳۲ھ اور ۱۹۱۴ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے بھی بوڈلین، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، برٹش میوزم لندن، کیمبرج یونیورسٹی اور بانکی پور وغیرہ کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔

احوال ائمہ اثنا عشر خلاصہ اولاد سید البشر: یہ بارہ اماموں کے حالات پر ایک رسالہ ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

انوار الجلیلہ فی احوال مشائخ الشاذلیہ: یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں ہے اور مشائخ سلسلہ شاذلیہ کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے۔

زبدۃ الآثار: یہ عربی زبان میں ہے اور شیخ نور الدین ابوالحسن بن یوسف (۶۴۴ھ - ۷۱۳ھ/ ۱۲۴۷ء سے ۱۳۱۴ء) کی تصنیف ''بہجۃ الاسرار'' کی تلخیص ہے۔ بہجۃ الاسرار شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات میں ایک قدیم اور مستند کتاب ہے۔ زبدۃ الآثار ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء میں بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا فارسی ترجمہ خود شیخ عبدالحق محدث نے داراشکوہ کی فرمائش پر کیا تھا۔

مطلع الانوار البہیہ فی الحلیۃ النبویۃ: اس میں رسول اکرم ﷺ کا حلیہ مبارک بیان کیا گیا ہے۔

علم نحو:

علم نحو سے متعلق شیخ کی دو کتابیں ہیں، جو یہ ہیں:

[1] دیکھیے تزک جہاں گیری، ص ۲۵۸۔

Marfat.com

حاشیۃ الفوائد الضیائیہ: نحو کی مشہور کتاب شرح جامی پر حاشیہ ہے۔

افکار الصافیہ فی ترجمۃ کتاب الکافیہ: یہ کتاب انھوں نے زمانہ طالب علمی میں، جب کہ وہ صرف پندرہ یا سولہ سال کی عمر کے تھے، کافیہ کے بعض مباحث کے بارے میں لکھی۔

ذاتی حالات سے متعلق:

شیخ نے بعض ایسی کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں، جن میں اپنے ذاتی حالات درج کیے ہیں اور ساتھ ہی بعض ان بزرگان دین کے کوائف بیان کیے ہیں، جن سے ان کے ذاتی مراسم تھے یا ان سے عقیدت اور محبت کے تعلقات استوار تھے۔ اس قسم کی کتابیں چار ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

اجازت الحدیث فی القدم والحدیث: اس میں شیخ نے اپنی اسناد حدیث تحریر فرمائی ہیں۔

تالیف قلب الالیف بذکر فہرس التوالیف: یہ ان کی تصانیف کی ایک فہرست ہے، جو انھوں نے خود مرتب کی تھی۔ آغاز کتاب میں دہلی کے چند شعرا اور مصنفین کے حالات بھی مندرج ہیں۔ یہ کتاب سب سے پہلے مطبع عزیزی رام پور میں چھپی۔ پھر ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ بعدازاں حیدر آباد دکن سے سید شمس اللہ قادری نے ”تذکرۂ مصنفین دہلی“ کے نام سے اس کا ابتدائی حصہ شائع کیا تھا۔

زادالمتقین الی طریق الیقین: اس میں شیخ علی متقی، شیخ عبدالوہاب متقی، اور ان شیوخ واساتذہ کے حالات درج ہیں، جن سے شیخ محدث نے مکہ مکرمہ میں استفاضہ واستفادہ کیا۔ علاوہ ازیں اپنے ذاتی واقعات بھی شامل کتاب ہیں۔ کتاب کے دیباچے میں شیخ نے وضاحت کی ہے کہ اس میں وہ واقعات بیان کیے گئے ہیں جو دو سال قیام مکہ کے دوران میں ان کے مشاہدہ یا سماعت میں آئے۔ الفاظ یہ ہیں:

تامدت دو سال وکسرے بحالت قیام مکہ معظّمہ آنچہ دیدم یا شنیدم ضبط کردم۔

یہ کتاب شیخ نے مکہ معظّمہ میں لکھنا شروع کی تھی مگر ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء میں ہندوستان آکر مکمل کی۔

وصیت نامہ: اس میں شیخ ممدوح نے اپنی وصیتیں درج فرمائی ہیں۔

خطبات:

فصول الخطب لنیل اعالی الرتب: اس میں شیخ نے اپنے خطبات جمع کیے تھے۔ غالباً خطبات کا یہ قیمتی مجموعہ اب نایاب ہے۔

مکاتیب:

کتاب المکاتیب: یہ شیخ کے ان ۶۸ مکتوبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے بعض اہم اور ضروری مسائل

Marfat.com

کے بارے میں خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ابوالمعالی، شیخ عبداللہ نیازی، نواب مرتضیٰ خاں، عبدالرحیم خان خاناں اور شیخ فرید کے نام تحریر کیے۔ ان کے علاوہ اس میں شیخ ابوالخیر اور فیضی وغیرہ کے نام بھی بعض مکتوبات درج ہیں۔ مکتوبات میں نہایت تفصیل اور شرح وبسط کے ساتھ بعض اہم امور کو مدار بحث ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ مجموعہ مکاتیب ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء کو مطبع مجتبائی دہلی میں چھپا۔ پھر ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء اسی مطبع سے اخبار الاخیار کے حاشیے پر شائع ہوا۔

صحیفة المودة: یہ شیخ کے دوستوں کے نام بصورت مثنوی مکتوبات کا ایک مجموعہ ہے۔ غالباً اس مثنوی کا اب کوئی نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔

شعروشاعری:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی بہت اچھے شاعر بھی تھے اور حقی تخلص کرتے تھے۔ کہنا چاہیے کہ شعروسخن کا یہ ذوق انھیں وراثت میں ملا تھا۔ ان کے والد شیخ سیف الدین سیفی، چچا شیخ رزق اللہ مشتاقی اور دادا شیخ فیروز بھی شاعرانہ ذوق رکھتے تھے اور شیخ موصوف کے خاندان میں یہ ذوق شیخ فیروز کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ شیخ عبدالحق اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

معنی حلویت وشعروظرافت درخانۂ ماازوے پیداشد۔

یعنی ہمارے خاندان میں لطافت کلام، شعروشاعری اور حلاوت وظرافت انہی (یعنی شیخ فیروز) کے عہد سے پیدا ہوئی۔

شیخ محدث کی رغبت شعر کے متعلق معارج الولایت کے مصنف رقم طراز ہیں:

درشعر نیز رغبتے تمام داشت...... وحقی تخلص خود رانہادے، چنانچہ درکتب ورسائل ایشاں اشعار ایشاں مکتوبست۔

یعنی (شیخ عبدالحق محدث) شعرگوئی میں کامل رغبت رکھتے تھے اور حقی تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی کتب ورسائل میں ان کے اشعار درج ہیں۔

نظام الدین بخشی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

زبان شعردارد:

شیخ عبدالحق شاعرانہ اسلوب کلام کے مالک تھے۔

شیخ کے چنداشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

حقی توزِ تاریخ و حکایات گوئی ۔۔۔ در راہ تتبع روایات مپوئی
در زاویۂ فقر نشستی، کارے ۔۔۔ جز ذکر خدا، نفی و اثبات مجوئی

Marfat.com

حقی زپے قصہ و افسانہ شدی چوں مردم روزگار فرزانہ شدی
دردلش ترازِ ذکر شاہاں چہ غرض مفتونِ سخن گشتی و دیوانہ شدی

مقصودِ اہل ذوق زِ ذکرِ گزشتگاں تنبیہ عبرت است چہ مسکیں چہ بادشاہ

حقا بیانِ شوق بپایاں نمی رسد کو تاہ از، قصہ دررو دراز را

دوش از کثرت اغیار نجاتم دادند رہ بسوئے حرم وحدتِ ذاتم دارند
حقی از گوشۂ دہلی نہ نہم پابیروں خود گرفتیم کہ ملک گجراتم دادند

چوں من میرم چہ حاصل گر لبت آرام جاں باشد
من از حسرت بمیرم، او بکام دیگراں باشد
بہر چوریکہ آں مہ می کند از جا مروحقی
کہ بد خوئے مرا شاید کہ مقصود امتحاں باشد

عجب ز اطوارِ خود پسندانست طور ما طور درد مندانست
ہیچ چیزے چو درد مندی نیست کہ در بوے خود پسندی نیست

صد شکر کہ از تشنگی غم رستم چو قطرہ بدریائے کرم پیوستم
برکشتی توفیق ازل بنشتم وزِ زمزم قدس چہرۂ دل شستم

ایں نامہ کہ پایۂ ترقی آمد شائستہ اقبال و ترقی آمد
جنبیدن خامہ در وقتِ تسویدِ حروف دردست، دل شکستۂ حقی آمد

شب فراق کو از ہجر یاری گریم بہانہ درد کنم، زار زاری گریم
بہر جا کہ بود ماتمے روم آنجا بدیں بہانہ زہجر نگار می گریم

Marfat.com

قاتلش در جلوہ آمد طاقتم برباد رفت — نرگش در خواب رفت و فتنہ رابیدار کرد
حال حقی برتو کے ظاہر شود زیرا کہ وے — حالتے دارد کہ نتواند بخود اظہار کرد

اے آنکہ ترا طالع مسعود بود — دانی کہ مرا از توچہ مقصود بود
یک فاتحہ از بہرِ من خستہ بخواں — تا عاقبت کارِ تو محمود بود

در خواب ہمیشہ باخیالِ تو خشم — در بیدارم بخط و خال تو خوشم
القصہ چہ در خواب و چہ در بیداری — اے مردم دیدہ با جمالِ تو خوشم

وفات:

شیخ عبدالحق نے چورانوے (۹۴) سال عمر پائی اور آخر دم تک تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ زندگی کے آخری دور میں بھی جسمانی اور روحانی طور پر اسی طرح صحت مند و توانا تھے، جس طرح کہ ابتدائی دور میں تھے۔ نہ کبھی درس و مطالعہ میں فرق آیا، نہ تدریس کے سلسلے کم ہوئے، نہ تحقیق و کاوش میں کمی واقع ہوئی، نہ قلم و قرطاس کی صحبتیں ماند پڑیں اور نہ وظائف و اوراد اور روزانہ کے معمولات میں خلل پیدا ہوا۔ اپنی گوناگوں علمی ضوفشانیوں سے سرزمین برصغیر میں روشنی کی ایک وسیع فضا پیدا کر کے ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ/ ۹ جون ۱۶۴۲ء کو وفات پائی اور دہلی میں دفن ہوئے۔ وصیت کے مطابق نماز جنازہ ان کے جلیل القدر صاحب زادے شیخ نورالحق نے پڑھائی۔

اولاد:

شیخ عبدالحق محدث کے تین بیٹے تھے۔ شیخ نورالحق، شیخ علی محمد اور شیخ محمد ہاشم۔ یہ تینوں اصحاب علم و فضل تھے، مگر شیخ نورالحق ان میں سب سے فائق اور بلند مرتبے کے مالک تھے۔ ان کے تفصیلی حالات ان شاء اللہ کتاب کے اصل مقام پر درج ہوں گے، یہاں اختصار کے ساتھ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ شیخ محدث اپنے اس فرزند کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے لیے ایک واقعہ لائق تذکرہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ میر سید طیب بلگرامی (جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے) ایک عالم و فاضل اور زاہد و متورع بزرگ تھے۔ "سبع سنابل" کے مصنف میر سید عبدالواحد بلگرامی کے فرزند اور جانشین تھے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کے اوصاف و کمالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

وے ذات مقدسی کہ اگر ثقلین باو ناز کنند می زیبد و اگر زمین و زمان برخود بالندمی شاید [1]۔

---

[1] مآثر الکرام، ص ۴۵۔

Marfat.com

یعنی وہ ایسی پاک باز شخصیت کے مالک ہیں کہ اگر دونوں جہان ان پر ناز کریں تو صحیح ہوگا اور اگر زمین اور اس پر بسنے والے ان پر خوش ہوں تو بجا ہوگا۔

وہ ایک فرشتہ صفت بزرگ تھے۔ آزاد بلگرامی ان کی تعریف میں سید کرم اللہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

اگر کسے خواہد، ملک را بر روئے زمین بہ بیند میر سید طیب را مشاہدہ کند ❶۔

(اگر کوئی شخص زمین پر فرشتہ دیکھنا چاہتا ہے تو میر سید طیب کو دیکھ لے۔)

میر سید طیب تدریس و تصنیف میں ماہر تھے۔ تفسیر بیضاوی اور ہدایہ پر انھوں نے عالمانہ حواشی تحریر کیے ہیں۔ میر موصوف اور شیخ عبدالحق دہلوی کے درمیان بڑے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے، جس کا تذکرہ میر غلام علی آزاد بلگرامی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

درمیان شیخ عبدالحق دہلوی قدس سرہ، حضرت میر محبتے و مودتے عظیم بود، شیخ عبدالحق بہ رعایت بزرگی او را شیخ طیب می گفت ❷۔

(شیخ عبدالحق اور حضرت میر کے درمیان انتہائی محبت و مودت کے مراسم قائم تھے۔ شیخ عبدالحق ان کی بزرگی کی وجہ سے انھیں شیخ طیب کہا کرتے تھے۔)

میر طیب کی فضیلت علم اور شیخ محدث پر ان کے اثر کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ ایک مرتبہ اپنے زمانۂ کبرسنی میں شیخ محدث کسی کتاب کا درس دے رہے تھے کہ ایک مقام پر رُک گئے اور فرمانے لگے، اگر میر سید طیب اس وقت موجود ہوتے تو اس مشکل مسئلہ کو آسانی سے حل کر دیتے۔ حسن اتفاق سے میر سید اسی وقت تشریف لے آئے۔ شیخ بہت خوش ہوئے اور خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد وہ مشکل ان کے سامنے بیان کی۔ میر ممدوح نے کتاب ہاتھ میں پکڑی اور تھوڑے سے تامل کے بعد متعلقہ مقام کی عبارت کچھ اس انداز سے پڑھی کہ مسئلہ خود بخود حل ہو گیا اور مشکل رفع ہوگئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ نور الحق آگرہ میں مقیم تھے اور منصب قضا پر فائز تھے۔ شیخ عبدالحق نے میر صاحب سے دریافت فرمایا ''کس راستے سے آئے ہیں؟'' انھوں نے بتایا ''براستہ آگرہ آیا ہوں۔'' فرمایا ''راستے میں نور الحق سے ملاقات ہوئی ہوگی۔'' میر صاحب نے جواب دیا: ''سفر میں کچھ ایسے مواقع پیش آئے کہ ان سے مل نہ سکا۔''

شیخ نے فرمایا:

ظاہراً ازیں کہ او مرتکب قضا شد، اعراض بہ عمل آمد ❸۔

یعنی بظاہر نہ ملنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ محکمہ قضا پر متعین ہے۔

---

❶ مآثر الکرام، ص ۴۵۔

❷ ایضاً، ص ۴۶۔

❸ مآثر الکرام، ص ۴۶۔

Marfat.com

پھر شیخ نور الحق کی ان الفاظ میں تعریف کی:

اگر چہ پسرِ من است اما بجائے پدر، اگر چہ شاگردِ من است اما بجائے استاد، اگر چہ مرید من است اما بجائے پیری دانم ①۔

(اگر چہ وہ میرا بیٹا ہے لیکن باپ کے بجائے ہے۔ اگر چہ میرا شاگرد ہے لیکن استاد کے بجائے ہے۔ اگر چہ میرا مرید ہے لیکن میں اسے پیر کے بجائے سمجھتا ہوں۔)

میر سید طیب نے شیخ کی یہ بات پوری توجہ سے سنی اور پھر اس طرح اٹھے اور باہر نکلے جیسے کسی ضرورت سے جاتے ہیں۔ مگر وہ اسی وقت آگرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور شیخ نور الحق سے ملاقات کر کے واپس دہلی آئے۔ شیخ کو معلوم ہوا تو ان کی اس اخلاقی رفعت سے بہت متاثر ہوئے اور میر صاحب سے انتہائی معذرت کی۔

معذر تہا بر زبان آورد ②۔

(بڑے ہی معذرت خواہانہ الفاظ استعمال کیے۔)

شیخ عبدالحق دہلوی کے دوسرے فرزند شیخ علی محمد بخاری دہلوی تھے، جو اپنے عصر کے فضلا میں سے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور اپنے والد ماجد سے کتب درسیہ کی تحصیل کی، شیخ علی محمد تصنیف و تالیف کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور تین کتابوں کے مصنف تھے، جن کے نام یہ ہیں:

خزائن الدرر: یہ عربی، فارسی، اور ترکی زبانوں کی لغت ہے۔

رسالہ احوال پنج پیران چشت: یہ خواجہ معین الدین چشتی، قطب صاحب، بابا فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیا اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے حالات پر مشتمل ہے۔

نجات المریدین: اس میں شیخ عبدالقادر جیلانی کے احوال و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

تیسرے فرزند شیخ محمد ہاشم دہلوی تھے، جو عالم باعمل اور عبد صالح تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی اور اپنے عالی مرتبت والد شیخ عبدالحق دہلوی سے علم حاصل کیا، طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے اور اس قدر استفادہ کیا کہ حدیث اور فقہ کے ماہر علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔

شیخ عبدالحق محدث کے یہ تینوں فرزند گیارھویں صدی ہجری کے معروف ہندی علمائے دین میں سے تھے۔

---

① مآثر الکرام، ص ۴۶۔

② مآثر الکرام، ص ۴۶۔

Marfat.com

مراجع ومصادر

فقہائے ہند کی اس جلد کی تصنیف میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ آئین اکبری: ابوالفضل۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۹۳ھ

۲۔ ابجد العلوم: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع صدیقیہ، بھوپال۔ ۱۲۹۵ھ

۳۔ اتحاف النبلا: نواب صدیق صدیق خاں۔ مطبع نظامی، کان پور۔ ۱۲۸۸ھ

۴۔ اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۳۲ھ

۵۔ اذکارِ ابرار، ترجمہ گلزارِ ابرار: تصنیف محمد غوثی شطاری مانڈوی۔ ترجمہ۔ فضل احمد جیوری۔ مطبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۳۲۶ھ

۶۔ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔

۷۔ الاعلام: خیر الدین زرکلی، طبع ثانی۔

۸۔ انشائے ابوالفضل: مطبوعہ لکھنؤ۔ ۱۲۶۸ھ

۹۔ انوار العارفین: حافظ محمد حسین مراد آبادی۔ مطبع نول کشور، لکھنوء۔ ۱۸۷۶ء۔

۱۰۔ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون: اسماعیل پاشا۔ مطبع بہیہ، استنبول۔ ۱۹۴۵ھ/ ۱۳۶۴ء۔

۱۱۔ بادشاہ نامہ: عبدالحمید لاہوری۔ تصحیح عبدالرحمٰن۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۶۷ء۔ ۱۸۷۲ء۔

۱۲۔ برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ: محمد اسحاق بھٹی۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۷۳ء۔

۱۳۔ بزم تیموریہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

۱۴۔ تاریخ برہان مآثر: سید علی طباطبائی ناشر مجلس مخطوطاتِ فارسیہ۔ حیدر آباد، دکن مطبع جامعہ، دہلی۔ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء۔

۱۵۔ تاریخ تحفۃ الکرام۔ جلد اول، دوم، سوم۔ مطبع حسینی اثناعشری، محلہ فراش خانہ وزیر گنج، لاہور۔ ۱۳۰۴ھ و مطبع ناصری۔

۱۶۔ تاریخ شیراز ہند جون پور: سید اقبال حسین۔ ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس جون پور (ہندوستان)، ۱۹۶۳ء۔

۱۷۔ تاریخ طاہری: سید طاہر محمد نسیانی ٹھٹھوی۔ سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد۔ سندھ ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء۔

۱۸۔ تاریخ فرشتہ: محمد قاسم فرشتہ۔ مطبع نول کشور، لکھنوء۔ ۱۹۳۳ء۔

۱۹۔ تاریخ کشمیر اعظمی: خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔ ناشر غلام محمد، نور محمد، تاجران کتب سری نگر۔ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء۔

۲۰۔ تاریخ معصومی: میر محمد معصوم بھکری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء۔

Marfat.com

۲۱۔ تحفۃ الکرام: میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ۔ کراچی۔ ۱۹۵۹ء۔
۲۲۔ تذکرہ: مولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبۂ احباب، لاہور۔
۲۳۔ تذکرۃ الابرار والاشرار: حضرت اخون درویزہ۔ ادارہ اشاعت سرحد۔ قصہ خوانی بازار پشاور۔
۲۴۔ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی: سید احمد قادری۔ ناشر، شاہ بکڈپو۔ پٹنہ (ہندوستان)
۲۵۔ تذکرہ علمائے ہند: مولوی رحمان علی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء۔
۲۶۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ): محمد ایوب قادری، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۱ء۔
۲۷۔ تزکِ جہاں گیری: مطبع نامی منشی نول کشور لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء۔
۲۸۔ تعلیمات مجددیہ: ملک حسن علی جامعی۔ انجمن اشاعت التوحید والسنۃ۔ شرق پور۔ ۱۹۶۵ء۔
۲۹۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع شاہ جہانی، بھوپال ۱۲۹۸ھ۔
۳۰۔ حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء۔
۳۱۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی: پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی۔ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء۔
۳۲۔ خزینۃ الاصفیاء: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نامی گرامی سراج پنڈت بیجناتھ۔ الموسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ۔ ۱۲۹۰ء۔
۳۳۔ خلاصۃ التواریخ: لالہ سجان رائے بٹالوی، بہ تصحیح ظفر احسن۔ مطبع جی اینڈ سنز، دہلی۔ ۱۹۱۸ء۔
۳۴۔ رودِ کوثر: ڈاکٹر شیخ محمد اکرام۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۷۵ء۔
۳۵۔ ذخیرۃ الخوانین: شیخ فرید بھکری۔ مقدمہ و تصحیح، ڈاکٹر سید معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی۔
۳۶۔ زبدۃ المقامات: خواجہ محمد ہاشم کشمی، مطبع نول کشور، کان پور۔ طبع اول ۱۸۹۰ء۔
۳۷۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع بمبئی ۱۳۰۳ھ۔
۳۸۔ سفینۃ الاولیا: داراشکوہ۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۸۴ء۔
۳۹۔ سنن ابی داؤد: امام سلیمان بن اشعث ابی داؤد سجستانی۔ اصح المطابع و کارخانہ تجارت، کراچی۔
۴۰۔ سیر المتاخرین: غلام حسین خاں طباطبائی۔ نول کشور لکھنؤ۔
۴۱۔ شرح سفر السعادہ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ نول کشور لکھنؤ۔ ۱۹۰۳ء۔
۴۲۔ طبقات اکبری: نظام الدین ہروی۔ طابع نول کشور، مطبع گرامی قدر اودھ اخبار لکھنؤ، ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء۔
۴۳۔ طرب الاماثل بتراجم الافاضل: مولانا ابوالحسنات عبدالحی حنفی لکھنوی۔ مطبع یوسفی لکھنؤ۔ ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء۔
۴۴۔ عالم گیر نامہ: منشی محمد کاظم بن محمد امین۔ کالج پریس، کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء۔
۴۵۔ عمل صالح، الموسوم بہ شاہ جہان نامہ: محمد صالح کنبوہ لاہوری۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔
۴۶۔ عون المعبود شرح سنن ابی داؤد: علامہ شمس الحق ڈھیانوی۔ مطبع انصاری، دہلی۔
۴۷۔ عہد جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے فرامین و اسناد: مطبوعہ ہندوستان۔ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء۔

Marfat.com

۴۸۔ فرحت الناظرین (شخصیات): محمد اسلم پسروری۔ ترجمہ و ترتیب۔ محمد ایوب قادری۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی۔ ۱۹۷۲ء۔

۴۹۔ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ مع التعلیقات البینۃ: مولانا ابوالحسنات عبدالحی حنفی لکھنوی۔ طبع اول، مصر ۱۳۲۴ھ۔

۵۰۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب: ذوالفقار احمد۔ مطبع فیض منبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۳۱۶ھ۔

۵۱۔ کشف الظنون۔ جلد اول، ثانی: حاجی خلیفہ۔ مطبع بہیہ استنبول۔ ۱۹۴۱ء/۱۳۶۰ھ۔

۵۲۔ مآثر الامرا۔ جلد اول، دوم، سوم: نواب صمصام الدولہ شاہنواز خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۸۸ء۔ ۱۸۹۰ء۔

۵۳۔ مآثر رحیمی۔ جلد اول، دوم سوم: ملا عبدالقادر نہاوندی۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء، ۱۹۳۱ء۔

۵۴۔ مآثر عالم گیری: محمد ساقی الملقب بہ مستعد خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، کلکتہ۔

۵۵۔ مآثر الکرام، جلد اول: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ۔ لاہور۔ ۱۹۷۱ء۔

۵۶۔ مرآۃ احمدی: مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر۔ مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۹۲۷ء۔

۵۷۔ مرآۃ العالم: بختاور خاں (قلمی نسخہ) پنجاب یونیورسٹی، لائبریری۔ لاہور۔

۵۸۔ معجم المؤلفین: عمر رضا کحالہ۔ المکتبہ العربیہ، دمشق۔ مطبعۃ الترقی، دمشق۔ ۱۹۵۷ء۔

۵۹۔ مفتاح التواریخ: منشی دانشور۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۲۸۴ھ۔

۶۰۔ منتخب التواریخ: عبدالقادر بدایونی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۲۸۴ھ و ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء۔

۶۱۔ منتخب اللباب، جلد اول، دوم: محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال کلکتہ۔ ۱۸۶۹ء۔

۶۲۔ نجات الرشید: عبدالقادر بدایونی۔ مقدمہ و حواشی، ڈاکٹر سید معین الحق۔ ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور۔ ۱۹۷۲ء۔

۶۳۔ نزہۃ الخواطر، جلد پنجم: علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ حیدرآباد، دکن ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء۔

۶۴۔ النور السافر فی اخبار القرن العاشر: عبدالقادر بن عبداللہ عیدروس۔ المکتبہ العربیہ بغداد۔ مطبعۃ الفرات، بغداد۔ ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء

۶۵۔ ہدیۃ العارفین فی اسماء المؤلفین وآثار المصنفین: اسماعیل پاشا بغدادی۔ مطبع بہیہ، استنبول۔ ۱۹۵۱ء۔ ۱۹۵۵ء۔

۶۶۔ ہفت اقلیم، جلد اول، دوم، سوم: امین احمد رازی۔ تصحیح و تعلیق، جواد فاضل۔ مطبوعہ تہران۔

۶۷۔ الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی: محمد بن یحییٰ المدعو بہ محسن تمیمی ثم بکسری۔ طبع ہند۔

Marfat.com

فقہائے ہند

گیارھویں صدی ہجری

حصہ دوم

Marfat.com

Marfat.com

ترتیب

◆	مقدمہ	۲۱۱
◆	جہاں گیر	۲۱۲
◆	تعلیم وتربیت	۲۱۳
◆	جہاں گیر کی بغاوت	۲۱۴
◆	تخت نشینی اور بارہ احکام	۲۱۵
◆	شرعِ محمدی کے نفاذ وتحفظ کی شرط	۲۱۷
◆	بیٹوں کی مخالفت	۲۱۸
◆	علمائے کرام سے محبت وعقیدت	۲۱۹
◆	خلافِ شرع رسوم سے نفرت	۲۲۰
◆	سفرِ کانگڑہ میں علمائے اسلام کی معیت	۲۲۲
◆	مطالعہ کتب کا شوق اور مدارسِ دینیہ کی تعمیر	۲۲۲
◆	قرآن مجید سے قلبی لگاؤ	۲۲۳
◆	اوراد و وظائف	۲۲۳
◆	ادب وشعر کا ذوقِ بلند	۲۲۴
◆	مے نوشی اور افیون خوری	۲۲۴
◆	ملکی مصالح	۲۲۴
◆	دورِ جہاں گیری کے علمائے کرام	۲۲۵
◆	شیخ محمد میر سے عقیدت وتعلق	۲۲۵
◆	برصغیر میں انگریز کا قدم	۲۲۶
◆	وفات	۲۲۷
◆	شاہ جہان	۲۲۸
◆	بغاوت اور اس کا پس منظر	۲۲۹
◆	داور بخش کی عارضی تخت نشینی	۲۳۱
◆	شاہ جہان کی تخت نشینی	۲۳۳
◆	اعیانِ دولت اور عمالِ حکومت کے نام فرنان	۲۳۳
◆	پابندیٔ نماز اور وظائف واوراد	۲۳۵
◆	عدل وانصاف	۲۳۷
◆	ایک نہایت قبیح رسم کا خاتمہ	۲۳۸
◆	ہندوؤں کے قبضے سے مسلمان عورتوں کی رہائی اور مساجد کی واگزاری	۲۳۹
◆	صوبہ کابل کی ایک انتہائی مذموم رسم ختم کرنے کا حکم	۲۳۹
◆	ہگلی کے فرنگیوں کی گوشمالی	۲۴۰
◆	بدعات کا خاتمہ اور ٹیکسوں کی معافی	۲۴۰
◆	بادشاہ کا فرض	۲۴۲
◆	اللہ کی عبودیت کا قرار	۲۴۲
◆	دورِ شاہ جہان کے علما ومشائخ	۲۴۲
◆	شجاعت اور فتوحات	۲۴۳
◆	علمی، ثقافتی اور تہذیبی ترقی	۲۴۳
◆	معزولی اور وفات	۲۴۴
◆	ع	
◆	۱۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی	۲۴۵
◆	حصول علم	۲۴۶

Marfat.com

♦	مسند درس وتدریس	۲۴۷
♦	عہد جہاں گیری میں	۲۴۸
♦	عہد شاہ جہان میں	۲۴۸
♦	وسعت علم وفضل وقبولیت عامہ	۲۴۹
♦	ہم عصر علما سے علمی مباحثے	۲۵۲
♦	مجدد الف ثانی سے تعلق خاطر	۲۵۴
♦	حضرت میاں میر سے ملاقات	۲۵۵
♦	تصانیف وحواشی	۲۵۵
♦	تفسیر بیضاوی	۲۵۶
♦	مولانا عبدالحکیم کا حاشیہ	۲۵۸
♦	حاشیہ کشاف	۲۶۱
♦	حاشیہ مقدماتِ تلویح	۲۶۱
♦	حاشیہ شرح عقائد نسفی	۲۶۲
♦	حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی	۲۶۵
♦	حاشیہ شرح شمسیہ	۲۶۸
♦	حاشیہ شرح مطالع الانوار	۲۷۰
♦	حواشی درکنار شرح حکمۃ العین	۲۷۲
♦	حواشی درکنار مراح الارواح	۲۷۳
♦	تکملہ حاشیہ عبدالغفور	۲۷۳
♦	حاشیۂ حاشیہ عبدالغفور	۲۷۵
♦	حاشیہ مطول	۲۷۵
♦	ترجمہ غنیۃ الطالبین	۲۷۷
♦	الدرۃ الثمینہ	۲۷۷
♦	بعض دیگر تصانیف	۲۷۹
♦	مسجد اور مدرسہ وغیرہ	۲۷۹
♦	وفات	۲۸۱
♦	تلامذہ	۲۸۴
♦	قاضی عبدالرحیم مراد آبادی	۲۸۴
♦	ملا عصمت اللہ سہارن پوری	۲۸۴
♦	مولوی محمد احمد قنوجی	۲۸۵
♦	ملا عبدالوہاب پسروری	۲۸۵
♦	مولوی محمد معظم	۲۸۵
♦	ملا عبدالعزیز عزت اکبرآبادی	۲۶۸
♦	ملا محمد افضل جون پوری	۲۸۷
♦	چندر بھان برہمن	۲۸۷
♦	میر سید اسماعیل بلگرامی	۲۸۷
♦	اولاد	۲۹۰
♦	۲۔ مولانا عبدالحکیم کشمیری	۲۹۲
♦	۳۔ مولانا عبدالحی بلگرامی	۲۹۲
♦	۴۔ مفتی عبدالحی سنبھلی	۲۹۲
♦	۵۔ شیخ عبدالخالق سہارن پوری	۲۹۲
♦	۶۔ مولانا عبدالدائم گوالیاری	۲۹۲
♦	۷۔ مفتی عبدالرحمٰن کابلی	۲۹۳
♦	۸۔ شیخ عبدالرحمٰن سنبھلی	۲۹۳
♦	۹۔ قاضی عبدالرحیم مراد آبادی	۲۹۳
♦	۱۰۔ مفتی عبدالرحیم سندھی	۲۹۳
♦	۱۱۔ مولانا عبدالرزاق بانڈی کشمیری	۲۹۴
♦	۱۲۔ مولانا عبدالرشید کشمیری	۲۹۴
♦	۱۳۔ قاضی عبدالرشید دہلوی	۲۹۴
♦	۱۴۔ شیخ عبدالستار برہان پوری	۲۹۵
♦	۱۵۔ مفتی عبدالسلام دیوی	۲۹۵
♦	۱۶۔ مفتی عبدالسلام لاہوری	۲۹۶
♦	اساتذہ	۲۹۷
♦	مسند تدریس اور تلامذہ	۲۹۸
♦	حاشیہ بیضاوی	۲۹۹
♦	کیا نافع المسلمین انہی کی تصنیف ہے؟	۳۰۰

Marfat.com

◆ ۱۷۔ قاضی عبدالسلام برہان پوری	۳۰۲
◆ ۱۸۔ شیخ عبدالشکور جون پوری	۳۰۲
◆ ۱۹۔ شیخ عبدالشکور منیری	۳۰۲
◆ ۲۰۔ قاضی عبدالشکور لاہوری	۳۰۳
◆ ۲۱۔ قاضی عبدالعزیز نصیر آبادی	۳۰۳
◆ ۲۲۔ شیخ عبدالعزیز الہ آبادی	۳۰۴
◆ ۲۳۔ شیخ عبدالغفور اجینی	۳۰۴
◆ ۲۴۔ قاضی عبدالنبی خاندیسی	۳۰۴
◆ ۲۵۔ شیخ عبدالفتاح چریاکوٹی	۳۰۵
◆ ۲۶۔ قاضی عبدالقادر پانی پتی	۳۰۵
◆ ۲۷۔ قاضی عبدالقادر لکھنوی	۳۰۶
◆ ۲۸۔ شیخ عبدالقادر حضرمی	۳۰۷
◆ ۲۹۔ شیخ عبدالقادر اُچی	۳۰۸
◆ ۳۰۔ شیخ عبدالقادر لاہوری	۳۰۹
◆ ۳۱۔ علامہ عبدالقادر اجینی	۳۰۹
◆ ۳۲۔ ملا عبدالقادر بدایونی	۳۰۹
◆ بدایونی کی ولادت	۳۱۰
◆ حصولِ علم	۳۱۱
◆ والد اور نانا کی وفات	۳۱۲
◆ امیر حسین خاں کی ملازمت	۳۱۲
◆ بیٹے اور بھائی کی وفات	۳۱۳
◆ واقعۂ عشق اور اس کی سزا	۳۱۳
◆ بدایوں میں آتش زدگی	۳۱۵
◆ ترکِ ملازمت	۳۱۵
◆ دربارِ اکبری میں	۳۱۶
◆ معرکۂ جہاد میں شرکت	۳۱۸
◆ فتح کی خوش خبری بدایونی کے ذریعے	۳۲۰
◆ حق گوئی و بے باکی	۳۲۲
◆ متعہ کی بحث	۳۲۶
◆ شاہ پسندوں سے بُعد	۳۳۲
◆ بدایونی حج کی سعادت نہ حاصل کر سکے	۳۳۴
◆ بیٹے کا نام بادشاہ نے رکھا	۳۳۴
◆ دوستوں کی جدائی کا غم	۳۳۵
◆ علمی و تصنیفی خدمات	۳۳۶
◆ شاعری	۳۴۹
◆ دورِ اکبری کا آئینہ	۳۴۹
◆ وفات	۳۵۰
◆ بدایونی کا مدفن اور اولاد	۳۵۱
◆ ۳۳۔ شیخ عبدالقادر بخاری اکبر آبادی	۳۵۱
◆ ۳۴۔ مفتی عبدالقدوس امروہی	۳۵۱
◆ ۳۵۔ ملا عبدالکریم پشاوری	۳۵۲
◆ ۳۶۔ مولانا عبدالکریم سلطان پوری لاہوری	۳۵۲
◆ ۳۷۔ مفتی عبدالکریم گجراتی	۳۵۳
◆ ۳۸۔ شیخ عبداللطیف سندھی	۳۶۳
◆ ۳۹۔ شیخ عبداللہ سندیلوی	۳۶۳
◆ ۴۰۔ سید شیخ عبداللہ حضرمی	۳۶۴
◆ ۴۱۔ شیخ عبداللہ حضرمی	۳۶۵
◆ ۴۲۔ مولانا عبداللہ لبیب سیالکوٹی	۳۶۷
◆ ۴۳۔ خواجہ عبداللہ دہلوی	۳۷۱
◆ ۴۴۔ مولانا عبداللہ سنبھلی	۳۷۲
◆ ۴۵۔ مولانا عبداللہ برہان پوری	۳۷۳
◆ ۴۶۔ قاضی عبداللہ بیجاپوری	۳۷۳
◆ ۴۷۔ علامی عبداللہ چلپی رومی	۳۷۳
◆ ۴۸۔ شیخ عبدالمجید امروہی	۳۷۴
◆ ۴۹۔ مولانا عبدالمجید لاہوری	۳۷۴
◆ ۵۰۔ خواجہ عبدالمنعم احراری	۳۷۵

Marfat.com

◆	۵۱۔ مولانا عبدالمومن لاہوری	۳۷۵
◆	۵۲۔ مولانا عبدالنبی اکبرآبادی	۳۷۵
◆	۵۳۔ مفتی عبدالنبی کشمیری	۳۷۶
◆	۵۴۔ شیخ عبدالواحد مندسوری	۳۷۷
◆	۵۵۔ شیخ عبدالوہاب متقی مکی	۳۷۸
◆	فقر و تجرید کی راہ پر	۳۷۸
◆	ورودِ مکہ مکرمہ اور شیخ علی متقی سے حصولِ فیض	۳۷۹
◆	صوفیا کی تصانیف کے بارے میں شیخ کا نقطۂ نظر	۳۸۲
◆	سماع اور قوالی کے بارے میں شیخ کا فرمان	۳۸۴
◆	علم و فضل	۳۸۵
◆	حصولِ علم ہی درحقیقت ذکر الٰہی ہے	۳۸۶
◆	مشائخ کے مروّجہ اندازِ ذکر کے بارے میں	۳۸۷
◆	ہندو جوگی کا قبولِ اسلام	۳۸۸
◆	ریاضت اور ترکِ سوال کا دور	۳۸۸
◆	شیخ کا موقف	۳۹۰
◆	حلقۂ تلامذہ	۳۹۱
◆	وفات	۳۹۲
◆	۵۶۔ قاضی عبدالوہاب گجراتی	۳۹۲
◆	۵۷۔ ملا عبدالوہاب پسروری	۳۹۳
◆	۵۸۔ شیخ عبدالوہاب قدوائی راج گیری	۳۹۴
◆	۵۹۔ خواجہ عبیداللہ دہلوی	۳۹۴
◆	۶۰۔ علامہ عثمان بوبکانی	۳۹۶
◆	۶۱۔ قاضی عثمان سندھی	۳۹۷
◆	۶۲۔ شیخ عثمان سارنگ پوری	۳۹۸
◆	۶۳۔ مولانا عطاءاللہ عثمانی جون پوری	۳۹۸
◆	۶۴۔ مولانا عطاءاللہ سہوانی	۳۹۸
◆	۶۵۔ ملا عصمت اللہ سہارن پوری	۳۹۹
◆	۶۶۔ مولانا علاءالملک حسینی مرعشی	۳۹۹
◆	۶۷۔ شیخ علم اللہ امیٹھوی	۴۰۰
◆	۶۸۔ سید علم اللہ شاہ بریلوی	۴۰۱
◆	عہد طفولیت	۴۰۵
◆	شادی، سلسلۂ ملازمت اور ترکِ دنیا	۴۰۶
◆	شیخ آدم بنوری کی بیعت و خلافت	۴۰۸
◆	رائے بریلی میں قیام	۴۰۸
◆	سفر حج	۴۰۹
◆	اتباعِ سنت اور عمل و ایثار کا بے پناہ جذبہ	۴۱۰
◆	علم و فضل	۴۱۱
◆	اسلامیت کی تصویر کامل	۴۱۲
◆	سماع و مزامیر اور بدعات کی مخالفت	۴۱۲
◆	فقر و تنگ دستی کی دعا	۴۱۴
◆	صبر و تحمل کی انتہا	۴۱۴
◆	ایک عجیب و غریب واقعہ	۴۱۵
◆	وفات	۴۱۵
◆	۶۹۔ قاضی علی بیجاپوری	۴۱۶
◆	۷۰۔ قاضی علی اکبر الہ آبادی	۴۱۷
◆	۷۱۔ شیخ علی پانی پتی	۴۱۹
◆	۷۲۔ خواجہ علی پنو کشمیری	۴۲۰
◆	۷۳۔ سید عمر حضرمی	۴۲۱
◆	۷۴۔ قاضی عمر اکبرآبادی	۴۲۲
◆	۷۵۔ قاضی عنایت اللہ بلگرامی	۴۲۲
◆	۷۶۔ مولانا عوض وجیہ سمرقندی	۴۲۲
◆	۷۷۔ قاضی عیسیٰ سندھی	۴۲۴
◆	۷۸۔ مفتی عیسیٰ گوپاموی	۴۲۷
◆	۷۹۔ قاضی عیسیٰ اکبرآبادی	۴۲۸

Marfat.com

غ	
۸۰۔ سید غضنفر گجراتی	۴۲۸
ف	
۸۱۔ سید فاضل سنبھلی	۴۲۹
۸۲۔ شیخ فتح محمد برہان پوری	۴۲۹
۸۳۔ شیخ فرخ نارنولی	۴۳۰
۸۴۔ میر سید فیروز بلگرامی	۴۳۰
ق	
۸۵۔ مولانا قاسم حسینی بیانوی	۴۳۱
۸۶۔ شیخ قطب الدین دہلوی	۴۳۱
۸۷۔ مرزا قلیچ محمد اندجانی	۴۳۱
۸۸۔ مولانا قیام الدین لاہوری	۴۳۳
ک	
۸۹۔ شیخ کمال الدین بیجاپوری	۴۳۴
۹۰۔ قاضی کمال الدین کشمیری	۴۳۴
۹۱۔ مفتی کمال محمد عباسی گجراتی	۴۳۴
ل	
۹۲۔ علامہ لطف اللہ کوروی	۴۳۵
م	
۹۳۔ مفتی مبارک جون پوری	۴۳۶
۹۴۔ شیخ مبارک ناگوری	۴۳۶
۹۵۔ مولانا محب اللہ سندھی برہان پوری	۴۴۱
۹۶۔ علامہ حکیم محمد مصری برہان پوری	۴۴۲
۹۷۔ شیخ محمد بیجاپوری	۴۴۲
۹۸۔ سید محمد عاملی	۴۴۲
۹۹۔ شیخ محمد غوثی مانڈوی	۴۴۳
۱۰۰۔ قاضی محمد نصیر آبادی	۴۴۴
۱۰۱۔ شیخ محمد سندھی	۴۴۴
۱۰۲۔ سید محمد جالندھری کالپوی	۴۴۵
۱۰۳۔ سید محمد حضرمی	۴۴۶
۱۰۴۔ شیخ محمد راندیری	۴۴۷
۱۰۵۔ سید محمد عاملی	۴۴۷
۱۰۶۔ شیخ محمد برہان پوری	۴۴۸
۱۰۷۔ مولانا محمد سندھی	۴۴۹
۱۰۸۔ قاضی محمد آصف الہ آبادی	۴۴۹
۱۰۹۔ شیخ محمد آفاق لکھنوی	۴۵۰
۱۱۰۔ قاضی محمد اسلم ہروی	۴۵۰
۱۱۱۔ سید محمد اشرف نہٹوری	۴۵۲
۱۱۲۔ علامہ محمد افضل جون پوری	۴۵۲
۱۱۳۔ قاضی محمد افضل لاہوری	۴۵۳
۱۱۴۔ قاضی محمد حسین جون پوری	۴۵۴
۱۱۵۔ مولانا محمد حسین کشمیری	۴۵۵
۱۱۶۔ مفتی محمد خلیل جون پوری	۴۵۵
۱۱۷۔ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری	۴۵۶
۱۱۸۔ قاضی محمد زاہد کابلی	۴۵۸
۱۱۹۔ شیخ محمد سعید سرہندی	۴۵۹
۱۲۰۔ شیخ محمد سعید ہندی	۴۶۰
۱۲۱۔ مفتی محمد شریف الہ آبادی	۴۶۰
۱۲۲۔ قاضی محمد شریف صدیقی گجراتی	۴۶۱
۱۲۳۔ علامہ محمد شفیع یزدی	۴۶۱
۱۲۴۔ مولانا محمد صادق جون پوری	۴۶۲
۱۲۵۔ مفتی محمد صادق جون پوری	۴۶۳
۱۲۶۔ شیخ محمد صادق گنگوہی	۴۶۴
۱۲۷۔ مولانا محمد صادق کشمیری	۴۶۴

Marfat.com

۱۲۸۔ شیخ محمد صالح سندھی	۴۶۵
۱۲۹۔ شیخ محمد طاہر لاہوری	۴۶۵
۱۳۰۔ مفتی محمد طاہر کشمیری	۴۶۶
۱۳۱۔ شیخ محمد عاشق ہندی	۴۶۶
۱۳۲۔ میر محمد علی کشمیری	۴۶۶
۱۳۳۔ مولانا محمد فاضل بدخشی	۴۶۷
۱۳۴۔ مولانا محمد قلی دہلوی	۴۶۷
۱۳۵۔ شیخ محمد معصوم سرہندی	۴۶۸
۱۳۶۔ مولانا محمد مومن ترمذی	۴۶۸
۱۳۷۔ قاضی محمد مودود جون پوری	۴۶۹
۱۳۸۔ مولانا محمد نافع اکبرآبادی	۴۶۹
۱۳۹۔ شیخ محمد نعمان بدخشی	۴۷۰
۱۴۰۔ شیخ محمد ہاشم دہلوی	۴۷۰
۱۴۱۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی	۴۷۱
۱۴۲۔ میر محمد ہاشم گیلانی	۴۷۱
۱۴۳۔ شیخ محمد یحییٰ سرہندی	۴۷۲
۱۴۴۔ مولانا محمد یعقوب بنانی لاہوری	۴۷۲
۱۴۵۔ سید محمود سندھی	۴۷۳
۱۴۶۔ شیخ محمود گجراتی	۴۷۳
۱۴۷۔ شیخ محمود فاروقی جون پوری	۴۷۴
۱۴۸۔ شیخ محمود سہارن پوری	۴۷۷
۱۴۹۔ مولانا محی الدین بہاری	۴۷۸
۱۵۰۔ قاضی مرتضیٰ بیجاپوری	۴۷۹
۱۵۱۔ سید مصطفیٰ بیجاپوری	۴۷۹
۱۵۲۔ شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی	۴۷۹
۱۵۳۔ خواجہ معین الدین کشمیری	۴۸۰
۱۵۴۔ شیخ منور لاہوری	۴۸۱
۱۵۵۔ شیخ مودود کالپوی	۴۸۴
۱۵۶۔ سید میراں بیجاپوری	۴۸۴
ن	
۱۵۷۔ شیخ ناصر الدین شیخ پوری	۴۸۵
۱۵۹۔ قاضی نصیر الدین برہان پوری	۴۸۵
۱۵۹۔ شیخ نظام الدین تھانیسری	۴۸۷
۱۶۰۔ سید نظام الدین سندھی	۴۸۸
۱۶۱۔ شیخ نظام الدین برہان پوری	۴۸۹
۱۶۲۔ سید نعمت اللہ فیروز پوری	۴۹۰
۱۶۳۔ مفتی نور الحق دہلوی	۴۹۱
۱۶۴۔ شیخ نور محمد سہارن پوری	۴۹۲
۱۶۵۔ شیخ نور محمد جون پوری	۴۹۲
۱۶۶۔ شیخ نور محمد پٹنی	۴۹۳
و	
۱۶۷۔ مفتی وجیہ الدین گوپاموی	۴۹۳
ہ	
۱۶۸۔ سید ہدایت اللہ حسنی نصیرآبادی	۴۹۵
ی	
۱۶۹۔ شیخ یسین بنارسی	۴۹۵
۱۷۰۔ مولانا یتیم اللہ احمد نگری	۴۹۶
۱۷۱۔ میر سید یحییٰ بلگرامی	۴۹۶
۱۷۲۔ شیخ یعقوب صرفی کشمیری	۴۹۶
۱۷۳۔ قاضی یوسف بلگرامی	۴۹۹
۱۷۴۔ مولانا یوسف لاہوری	۴۹۹
۱۷۵۔ مفتی یوسف کاشمیری	۴۹۹
۱۷۶۔ مولانا یونس کردی	۵۰۰
مراجع ومصادر	۵۰۱

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

مقدمہ

اللہ عز و جل کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کی نصرت و توفیق سے "فقہائے ہند" کی جلد چہارم کا (حصہ دوم) معزز قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ اس میں گیارھویں صدی ہجری کے ۷۶ فقہائے عظام اور علمائے کرام کے حالات و سوانح مندرج ہیں۔ اس سے قبل چوتھی جلد کے مقدمے میں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے بارے میں وہ معلومات درج کی گئی ہیں جو ہمارے موضوع سے مطابقت رکھتی تھیں۔ اب پانچویں جلد کے مقدمے میں جہاں گیر اور شاہ جہان کی زندگی کے دینی اور علمی پہلوؤں کی وضاحت کرنا اور یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ دونوں بادشاہان ہند علماء سے کس قدر روابط رکھتے تھے اور اپنے دور کے اصحاب علم اور ارباب فقہ کو کس درجہ اپنی محبت والفت کا مستحق گردانتے تھے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گیارھویں صدی ہجری میں دودمان مغلیہ کے یکے بعد دیگرے تین عظیم الشان حکمران تخت ہند پر جلوہ افروز ہوئے۔ ایک جلال الدین محمد اکبر جو ۹۶۳ھ سے ۱۰۱۴ھ/ ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ھ تک اکاون (۵۱) سال داد حکمرانی دیتا رہا۔ دوسرے نورالدین محمد جہاں گیر جس نے ۱۰۱۴ھ سے ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۰۵ء سے ۱۶۲۸ھ تک بائیس (۲۲) سال ارض ہند پر حکومت کی۔ تیسرے شہاب الدین محمد شاہ جہان جو ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۶۸ھ/ ۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۸ء تک اکتیس سال تخت فرماں روائی پر متمکن رہا۔ یہ عرصہ ایک سو چار سال پر محیط ہے۔ علمی اعتبار سے یہ مغل عہد کے ہندوستان کا نہایت ترقی یافتہ دور ہے۔ اس دور میں علوم وفنون اور تہذیب و ثقافت نے ارتقا کی بہت سی نئی منزلیں طے کیں، فہم وادراک کے قافلے جدید راہوں کی تلاش میں نکلے اور علما کی کثیر تعداد نے گلستان علم کی آب یاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں بعض وہ علمائے کرام بھی ہیں جنھوں نے ان تینوں بادشاہان ہند کے عہد کا کچھ نہ کچھ حصہ پایا اور مدت تک تصنیف و تالیف اور درس وافادہ کا غلغلہ بلند کیے رکھا۔ علما کی اس جماعت سے ان حکمرانوں کو خاص تعلق خاطر تھا اور وہ حسب مراتب ان کی قدر کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حکمرانوں کی خود اپنی حیات مستعار کے شب و روز علم وادب کے ماحول میں گزرے اور عرفان وادراک کی فضا میں بسر ہوئے تھے۔ ان سطور میں جو مقدمے کی شکل میں پیش کی جارہی ہیں، جہاں گیر اور شاہ جہان کی علمی زندگی کی نقاب کشائی کی جائے گی اور ان کے مذہبی و دینی رجحانات کو نمایاں کیا جائے گا۔ نیز علما و فقہا سے ان کے تعلقات کی صراحت کی جائے گی۔ ان شاء اللہ العزیز و علیه التکلان۔

لیجیے پہلے جہاں گیر اور پھر شاہ جہان کی زندگی کے دینی و علمی گوشوں کو نظر و بصر کے زاویوں میں لایئے۔ ہم کوشش کریں گے کہ واقعات کی پوری تصویر قارئین کی نگاہوں کے سامنے گھوم جائے۔

Marfat.com

جہانگیر

جہاں گیر، مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کا سب سے بڑا بیٹا اور بابر کی نسل کا چوتھا بادشاہ تھا جو چہار شنبہ کے روز ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ/ ۳۰ راگست ۱۵۶۹ء کو نواح آگرہ میں سیکری کے مقام پر ایک تارک الدنیا بزرگ کے گھر میں پیدا ہوا۔ اس بزرگ کا نام شیخ سلیم چشتی تھا۔ جہاں گیر کی ماں کا شاہی نام مریم زمانی تھا۔ وہ راجہ بہاڑا مل کی بیٹی تھی اور ہندوستان کے راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ جہاں گیر سے پہلے اکبر، اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ اس زمانے میں وہ مذہبی رجحانات کا حامل تھا اور اس کے ذہن وقلب پر اسلامی احکام واوامر کے اثرات چھائے ہوئے تھے۔ وہ فتح پور سیکری کے مشہور بزرگ شیخ سلیم بن بہاء الدین چشتی کا مرید تھا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ شیخ سلیم چشتی، شیخ فریدالدین گنج شکر کی اولاد سے تھے۔ اکبر نے شیخ سے بیٹے کی ولادت اور زندگی کی دعا کرائی۔ اللہ نے دعا قبول فرمائی اور بادشاہ کو بیٹا عطا کیا۔ بیٹے کا نام مرشد کے نام پر سلیم رکھا گیا۔ جہاں گیر اپنے تزک کے آغاز میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جس زمانے میں اس کے والد بزرگ وار کے دل میں بیٹے کی شدید آرزو کروٹ لے رہی تھی، ان دنوں نواحی آگرہ میں موضع سیکری کے ایک پہاڑ میں شیخ سلیم نامی ایک صاحب حال درویش فروکش تھے۔ وہ عمر کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے اور اس نواح کے لوگ ان سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ شہنشاہ اکبر چوں کہ بزرگوں کا بڑا معتقد تھا، لہٰذا شیخ سلیم کی خدمت میں بھی جاتا اور ان کی صحبت سے مستفیض ہوتا تھا۔ ایک روز جب کہ شیخ عالمِ بے خودی میں تھے، اکبر نے ان سے پوچھا، میرے کتنے بیٹے ہوں گے۔؟

فرمایا۔ بخشندۂ بے منت سہ پسر بہ شما ارزانی خواہد داشت۔

(اللہ تعالیٰ تمھیں تین فرزند عطا کرے گا۔)

اکبر نے کہا:

نذر نمودم کہ فرزندِ اول را بہ دامنِ تربیت وتوجہ شما انداختہ۔ شفقت ومہربانی شما را حامی وحافظ او سازم۔

(میں نے نذر مانی ہے کہ پہلا بیٹا آپ کے دامن تربیت اور التفاتِ توجہ میں دوں گا، اور آپ کی شفقت وعنایت کو اس کا حامی ومحافظ بناؤں گا۔)

شیخ نے بادشاہ کی یہ پیش کش قبول فرمائی اور کہا

Marfat.com

مبارک باشد' باہم ایشاں راہم نامِ خود ساختیم۔

(مبارک ہو' ہم اس بچے کو اپنا ہم نام بنائیں گے۔)

جہاں گیر کی ولادت' شیخ سلیم کے گھر میں ہوئی۔ چنانچہ وہ اس سے آگے خود لکھتا ہے۔:

چوں والدۂ مرا ہنگام وضع حمل نزدیک می رسد بخانۂ شیخ می فرستند تا ولادتِ من دراں جا واقع گردد' بعد از تولد نامِ مرا سلطان سلیم نہادند۔

(جب میری والدہ کے وضع حمل کا وقت قریب آیا تو ان کو شیخ کے مکان میں بھیج دیا گیا تا کہ میری ولادت وہیں ہو۔ ولادت کے بعد میرا نام سلیم رکھا گیا۔)

چوں کہ جہاں گیر کا نام اکبر کے مرشد کے نام پر سلیم رکھا گیا تھا' اس لیے نام کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے باپ نے بیٹے کو کبھی کسی حالت میں بھی نام لے کر نہیں پکارا۔

اما من از زبان مبارک پدر خود نہ در مستی و نہ در ہوشیاری شنیدم کہ مرا محمد سلیم یا سلطان سلیم مخاطب ساختہ باشند' ہمہ وقت شیخو بابا گفتہ سخن می کردند۔

(یعنی میں نے اپنے باپ کی زبان سے' نہ عالم مدہوشی میں' نہ حالت سرشاری میں مجھ کو محمد سلیم یا سلطان سلیم کے نام سے پکارتے نہیں سنا۔ وہ ہمیشہ مجھے شیخو بابا کہتے تھے۔)

جہاں گیر کی ولادت کے بعد اکبر نے سیکری کو مقامِ مبارک سمجھ کر اپنا دارالحکومت بنایا اور چودہ پندرہ سال میں اس پہاڑ اور جنگل میں ایک ایسا شہر آباد کر دیا جہاں ہر سو نوع بنوع باغات دکھائی دیتے اور ہر طرف دل کش عمارات نظر آتی تھیں۔ پھر فتحِ گجرات کے بعد اس کو فتح پور سیکری کے نام سے موسوم کیا[1]۔

تعلیم و تربیت:

جہاں گیر نے ابتدائی تربیت شیخ سلیم چشتی کے گھر میں پائی اور چار سال چار ماہ چار روز کا ہوا تو چہار شنبہ کے روز ۲۲ رجب ۹۸۱ھ/ ۱۷ نومبر ۱۵۷۳ء کو تعلیم کے لیے مکتب میں بٹھا دیا گیا[2]۔ اس کے اساتذہ میں مولانا محمد سعید ہروی المعروف بہ میر کلاں محدث اور مفتی صدر جہاں پھانی شامل ہیں۔ میر کلاں سے اس نے حدیث کی سماعت کی۔ اس کے ایک معلم و اتالیق قطب الدین محمد خاں تھے' جن کے بارے میں وہ خود لکھتا ہے کہ ''آں برگزیدۂ دین و دولت خلعت امتیاز پوشید[3]۔'' جہاں گیر ترکی زبان کا بھی عالم تھا۔ یہ زبان اس نے عبدالرحیم خانِ خاناں سے سیکھی۔ چہل حدیث کا درس اس نے شیخ عبدالنبی کی خدمت میں رہ کر لیا[4]۔

---

[1] تزک جہاں گیری' ص ۲' ۳

[2] مقدمہ تزک جہاں گیری' ص ۶

[3] تزک جہاں گیری' ص ۶

[4] ایضاً' ص ۱۰

Marfat.com

جلال الدین اکبر نے جہاں گیر کی تربیت کا عمدہ ترین اہتمام کیا اور ملک کے مشاہیر اساتذہ کو اس کی تعلیم پر مامور فرمایا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ شہنشاہ اکبر کا یہ جانشین اپنے دور کا عالم و فاضل شخص تھا۔ علما و فقہا سے اس کے مخلصانہ مراسم تھے۔ اصحاب تصوف و طریقت سے نہایت احترام سے پیش آتا تھا۔ شعرا و ادبا کی بڑی حوصلہ افزائی کرتا اور ارباب فن کی اس کے دل میں بدرجہ غایت قدر و منزلت تھی۔ قرآن و تفسیر، حدیث و فقہ، فلسفہ و حکمت اور دیگر مروجہ علوم سے اس کو گہرا لگاؤ تھا۔ بہترین شاعر تھا۔ اس کے دربار میں شعر و شاعری کی بالالتزام محفلیں جمتیں، شعرا اپنا کلام سناتے اور داد پاتے۔ جہاں گیر ان محفلوں میں شرکت کرتا اور ادبی مباحث میں حصہ لیتا۔ مشہور شعرا کے بے شمار اشعار اسے زبانی یاد تھے، وہ انھیں مناسب مواقع پر پڑھتا اور اونچے درجے کے نقاد کی طرح ان کے حسن و قبح کو تنقید کی میزان میں رکھتا۔

جہاں گیر کی بغاوت:

اکبر نے اگرچہ جہاں گیر کے لیے بہترین تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا، تاہم ایک مرحلے میں باپ بیٹے کے باہمی تعلقات میں سخت کشیدگی پیدا ہوگئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء میں اکبر کو شدید بیماری نے آگھیرا اور اس نے کرب و اذیت کے اس عالم میں بیٹے پر الزام عاید کیا کہ اس نے سازش کر کے مجھے زہر دے دیا ہے۔ پھر دونوں میں ذہنی بعد اس وقت نقطۂ عروج کو پہنچا جب ۱۰۰۸ھ/۱۶۰۰ء میں جہاں گیر نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے الہ آباد کے مقام پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اکبر نے بعض ذرائع سے مصالحت کی کوشش کی مگر جہاں گیر اس پر آمادہ نہ ہوا۔ حالات کی رفتار نے ایسا رخ اختیار کیا کہ ۱۰۱۰ھ میں وہ ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ آگرے کی طرف بڑھا۔ اکبر نے بھی دفاعی کارروائیاں شروع کیں اور اس کا لشکر شہزادے سے مقابلے کے لیے میدان کارزار میں نمودار ہوا۔ لیکن شہزادہ الہ آباد کی طرف واپس لوٹ گیا اور شاہی لقب اختیار کر کے باقاعدہ دربار قائم کر لیا۔ حالات میں زیادہ پیچیدگی پیدا ہوئی تو اکبر کے مرحوم وزیر بیرم خاں کی بیوہ سلیمہ سلطان بیگم درمیان میں پڑی اور مصالحت کی دوبارہ ایک صورت سامنے آئی، لیکن شہزادہ اس پر بھی قائم نہ رہا اور جلد ہی پہلی روش اختیار کر لی، اور الہ آباد جا کر پھر اپنا دربار قائم کر لیا۔

واقعات کا تیز رو کارواں اسی نہج پر آگے بڑھتا رہا۔ اس اثنا میں جہاں گیر اس قطعی نتیجے پر پہنچا کہ اکبر کا وزیر ابوالفضل ہی تمام مصیبتوں کا باعث ہے اور وہ اس کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرتا رہتا ہے۔ لہٰذا ابوالفضل کو درمیان سے ہٹانا ضروری ہے۔ ان دنوں ابوالفضل دکن میں مقیم تھا۔ اکبر نے ضروری مشوروں کے لیے اسے دارالحکومت میں طلب کیا۔ اس کی اطلاع جہاں گیر کو بھی پہنچ گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ ابوالفضل شہنشاہ کو میری مزید مخالفت پر آمادہ کرے گا اور معاملہ اور الجھ جائے گا۔ اب اس نے بندیلہ کے ایک سردار نرسنگھ دیو کو

Marfat.com

اس پر آمادہ کیا کہ جب ابوالفضل تمھارے علاقے سے گزرے تو اسے قتل کر دو' میں تمھیں بہت سی مراعات دوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نرسنگھ دیو کے ملازموں نے ابوالفضل کو قتل کر کے اس کا سر جہاں گیر کے پاس الہ آباد بھیج دیا۔ اس قتل کا اکبر کو بہت افسوس ہوا مگر وہ بیٹے کو کچھ نہ کہہ سکا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں گیر کو باپ کے مذہبی افکار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس نے کسی موقعے پر بھی ان افکار و تصورات کی حمایت نہیں کی جو اکبر کو سب سے زیادہ عزیز تھے۔ بلکہ واقعات کی مختلف کڑیاں ملائی جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکبر کے دینی تصورات کا مخالف تھا۔ اکبر ہندوستان کا بہت بڑا حکمران اور عظیم منتظم تھا۔ اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر ابوالفضل سے اگرچہ اب اکبر کے تعلقات اچھے نہ رہے تھے اور ابوالفضل کو اس کا شدید احساس بھی تھا تاہم اس کو قتل کر دینا امر سہل نہ تھا۔ جہاں گیر کی تعلیم و تربیت چوں کہ علمائے حق کی نگرانی میں ہوئی تھی' اس لیے وہ ان سے متاثر تھا اور اپنے باپ کے دینی افکار اور ابوالفضل اور اس کے باپ ملا مبارک اور بھائی شیخ فیضی نے اس سلسلے میں جو کردار ادا کیا' اس سے خوب واقف تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ مزید آگے بڑھے۔ باپ سے اختلاف کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی اور ابوالفضل کے قتل میں بھی یہ راز مضمر تھا۔ ملا مبارک اور فیضی پہلے وفات پا چکے تھے۔ ابوالفضل ہی باقی رہ گیا تھا۔ ہندوستان میں کسی شکل میں اسلامی فضا پیدا کرنے کے لیے اس کو راستے سے ہٹانا ضروری تھا۔

جہاں گیر کی تخت نشینی میں جن امرائے مملکت کا ہاتھ ہے اور جن شرائط پر اسے حکومت دی گئی' پھر برسر حکومت آتے ہی بارہ احکام پر مشتمل جو دستور العمل اس نے جاری کیا' اس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ جہاں گیر مذہبی اور دینی اعتبار سے باپ سے بالکل مختلف تھا اور اس کے دل میں اسلام کی روشنی موجود تھی۔

تخت نشینی اور بارہ احکام:

جہاں گیر پنجشنبہ کے روز ۱۴ جمادی الاولی ۱۰۱۴ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو چھتیس (۳۶) سال کی عمر میں اپنے والد جلال الدین اکبر کی وفات کے بعد دار الحکومت آگرہ میں نور الدین محمد جہاں گیر کے نام سے تخت نشینِ ہند ہوا اور برصغیر کی وسیع سلطنت کی زمام اختیار ہاتھ میں لی۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور امرا و وزرا اور ارکانِ سلطنت کو خلعات و انعامات اور ترقیات سے نوازا گیا۔ اس نے عدل و انصاف کے ساتھ کاروبارِ حکومت کا آغاز کیا۔ سید عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں:

وافتتح امره بالعدل والسخاء و قرب اليه العلماء وكان صحيح العقيدة خلافا لوالده[1]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۲۰

Marfat.com

(جہاں گیر نے اپنا سلسلۂ حکومت عدل و انصاف اور جود وسخا کے ساتھ شروع کیا۔ علمائے کرام اس سے قرب و تعلق رکھتے تھے اور وہ اپنے باپ (اکبر) کے برعکس صحیح العقیدہ مسلمان تھا۔)

جہاں گیر کی معدلت گستری کا یہ عالم تھا کہ اس نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی حکم جاری کر دیا کہ قلعے کے برج پر ایک زنجیر عدالت آویزاں کی جائے تاکہ جو فریادی اور مظلوم کسی وجہ سے شاہی دربار تک رسائی حاصل نہ کر سکیں، وہ اس زنجیر کو ہلا دیں تاکہ بادشاہ براہِ راست ان کی فریاد سن سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے حسب ذیل بارہ احکام جاری کیے:

۱۔ محصول چونگی اور محصول میر بحری معاف کر دیے جائیں اور جو بگاریں صوبوں کے جاگیردار اور عمال حکومت اپنے ذاتی مفاد کے لیے لوگوں سے لیتے ہیں، وہ ختم کر دی جائیں۔ اپنے اختیارات سے جن تکلیفوں اور مشقتوں میں وہ عوام کو مبتلا کرتے ہیں ان کا سلسلہ فوری طور پر بند کر دیا جائے۔

۲۔ جو راستے آبادیوں سے دور ہونے کی وجہ سے چوروں اور ڈاکوؤں کی زد میں ہیں اور مسافر ہر وقت خطرے میں گھرے رہتے ہیں، وہاں منزل بہ منزل سرائیں اور مسجدیں تعمیر کی جائیں، کنویں کھدوائے جائیں اور ان میں محافظ مقرر کیے جائیں تاکہ راہ گزر امن وامان سے اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔

۳۔ جو لوگ لاوارث فوت ہو جائیں، وہ مسلمان ہوں یا ہندو، ان کی متروکہ دولت سے مسجدیں، سرائیں اور نئے پل تعمیر کیے جائیں، کنوئیں اور تالاب کھدوائے جائیں۔ یا پرانے اور شکستہ پلوں کی مرمت کرائی جائے۔ یہ سب مصارف ان کی دولت کے شرعی مصارف ہوں گے۔

۴۔ ملک میں شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کی فروخت بند کر دی جائے۔

۵۔ سرکاری ملازمین اور سرکاری اہل کار کسی کے گھر میں قیام نہ کریں۔

۶۔ کسی کو ناک، کان کاٹنے کی سزا نہ دی جائے۔ (جہاں گیر کہتا ہے) میں خود بھی بارگاہِ الٰہی میں عہد کرتا ہوں کہ کسی کو یہ سزا نہ دوں گا۔

۷۔ سرکاری زمین کے منتظموں اور جاگیرداروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ رعایا کی زمین پر ظلم و تعدی سے قبضہ کر کے اس پر کاشت نہ کریں۔

۸۔ دیہات کے سرکاری عامل اور منتظم و ملازم وہاں بلا اجازت شادی نہ کریں۔

۹۔ بڑے بڑے شہروں میں شفا خانے قائم کیے جائیں اور ان میں جو طبیب متعین کیے جائیں ان کے اخراجات شاہی خزانے سے ادا کیے جائیں۔

۱۰۔ ہر سال ۷ اربیع الاول کو جو کہ جہاں گیر کی تاریخ ولادت ہے، اور ہفتے میں دو روز یعنی جمعرات اور ہفتے کو جانور ذبح نہ کیے جائیں۔

Marfat.com

۱۱۔ جلال الدین اکبر بادشاہ کے زمانے کے تمام عہدے دار بدستورِ سابق برقرار رہیں۔
۱۲۔ تمام قیدی جو مختلف قلعوں اور جیلوں میں محبوس و مقید ہیں، رہا کر دیے جائیں ❶۔

شرع محمدی کے نفاذ و تحفظ کی شرط:

تخت نشینی کے بعد جہاں گیر کے یہ بارہ احکام (احکام دوازدہ) ملک کے دستور العمل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں وہ ہندوستان میں کسی نہ کسی صورت میں اسلامی احکام نافذ کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو واقعہ ہے کہ اس کو اپنے باپ کے دین سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ اس سے تعلق کا اظہار کبھی اپنے چھتیس (۳۶) سالہ دور شہزادگی میں کیا اور نہ حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے بعد اس سے وابستگی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ بلکہ ''اکبر اینڈ دی جیوئس'' کا مصنف سی، ایچ، پین تو صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ ''جو امرائے سلطنت جہاں گیر کو وارث تخت ہند بنانا چاہتے تھے، ان کی بنیادی شرط یہ تھی کہ بادشاہ اس ملک میں شرع محمدی کا نفاذ و تحفظ کرے گا ❷۔

جن امرائے مملکت نے جہاں گیر کو بادشاہ ہند بنانے میں اہم کردار ادا کیا ان میں شیخ فرید بخاری جسے بعد میں نواب مرتضیٰ خاں کا خطاب ملا، پیش پیش تھا۔ درحقیقت دربار کے دو نامور رکن، اکبر کا جانشین، جہاں گیر کے بیٹے خسرو کو بنانا چاہتے تھے۔ ان دو میں سے ایک اکبر کا مشہور مصاحب عزیز خاں کوکہ تھا جو خان اعظم کے لقب سے ملقب تھا، اور دوسرا راجا مان سنگھ تھا۔ خسرو کی بیوی خان اعظم کی بیٹی تھی، راجا مان سنگھ کا بھی وہ رشتے دار تھا۔ ان دونوں نے خسرو کی تخت نشینی کے لیے کوشش بھی کی۔ لیکن شیخ فرید اور بعض دیگر مسلمان امرا نے اس کوشش کو کامیابی سے ہم کنار نہیں ہونے دیا۔ ان کی تگ و دو سے جہاں گیر ہی اکبر کا جانشین بنا اور انھوں نے جہاں گیر سے دو شرطوں پر پابند رہنے کا وعدہ لیا۔ ایک یہ کہ وہ ملک میں شرع محمدی کا نفاذ کرے گا، دوسرے یہ کہ اپنے بیٹے خسرو اور اس کے معاونوں سے کسی قسم کی سرزنش نہیں کرے گا۔ شہزادے نے ان شرائط کی پابندی کا حلف اٹھایا اور محافظوں کی خاص تعداد کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کو گیا ❸۔

بلاشبہ جہاں گیر نے بہت حد تک اپنے وعدے کا ایفا کیا۔ ملک میں اسلام اور علوم اسلامی کو ترقی دی۔ اس کے عہد میں بہت بڑا کام یہ ہوا کہ اکبر کے مذہبی افکار کا کوئی اثر اگر کہیں باقی بھی تھا تو اس کے عہد میں بالکل ختم ہو گیا۔

---

❶ تزک جہاں گیری، ص ۵
❷ اکبر اینڈ دی جیوئس، ص ۲۰۴
❸ اکبر اینڈ دی جیوئس، ص ۲۰۴

Marfat.com

بیٹوں کی مخالفت:

تخت نشین ہونے کے بعد خود جہاں گیر کو بھی بیٹوں کی طرف سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصے بعد ۱۰۱۵ھ/ ۱۶۰۶ء میں اس کے بیٹے خسرو نے بغاوت کا اعلان کیا۔ اگرچہ بعد میں مصالحت ہوگئی لیکن جہاں گیر نے بیٹے کے اس گستاخانہ اقدام کو کبھی معاف نہیں کیا۔ چنانچہ ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۲ء میں جب وہ برہان پور میں فوت ہوگیا تو جہاں گیر نے اطمینان کا سانس لیا' کیوں کہ اس کی ایک بڑی پریشانی ختم ہوگئی تھی۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ سکھوں کے پانچویں گورو ارجن دیو نے جہاں گیر کے خلاف بغاوت کے زمانے میں خسرو کی مدد کی اور اسے پناہ دی تھی' جس کی بنا پر شہنشاہ نے اسے موت کی سزا دی۔ اس واقعہ کے آئندہ سکھ مسلم تاریخ پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

اس سے کئی برس قبل ۱۰۱۶ھ/ ۱۶۰۷ء میں جب جہاں گیر کابل میں خیمہ زن تھا' اسے قتل کرنے کی سازش کی گئی' جسے اس نے ناکام بنا دیا۔ سازش کے چار سرغنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور شہزادہ خسرو کی' جو اس سازش کا اصل محرک تھا' بادشاہ کے حکم سے آنکھیں بے کار کر دی گئیں۔

۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۳ء میں جہاں گیر کو اپنے ایک اور بیٹے شہزادہ خرم کی (جو آگے چل کر شہاب الدین محمد شاہ جہان کے نام سے وارثِ تختِ ہند ہوا)' بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بغاوت کا باعث شہزادہ خرم اور ملکہ نور جہاں کے باہمی اختلافات تھے۔ نور جہاں سے جہاں گیر کی ۱۰۲۰ھ/ ۱۶۱۱ء میں شادی ہوئی تھی اور وہ اپنے حسن و خوبروئی اور عقل و دانش کی بنا پر حکومت کے دروبست پر تقریباً قابض ہوگئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شہزادہ خرم راستے سے ہٹ جائے تاکہ اس کے داماد شہریار کو' جو شاہ جہان کا سوتیلا بھائی تھا' تخت ہند پر متمکن کیا جا سکے۔ شہزادہ خرم کی بغاوت کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا اور اس نے ملک میں خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس سے شاہی وقار کو بڑا صدمہ پہنچا اور خزانہ تقریباً خالی ہوگیا۔ بغاوت کا یہ سلسلہ تین سال تک چلا۔ آخر مہابت خاں کی فوجی قوت نے جمادی الاخری ۱۰۳۵ھ/ مارچ ۱۶۲۶ء میں خرم کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

ان واقعات سے ہمیں حیران اور متعجب ہونے کی ضرورت نہیں' بادشاہوں کی تاریخ ہمیشہ تلوار کے قلم اور خون کی روشنائی سے انسانوں کی ہڈیوں پر رقم کی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں باپ بیٹے کے خلاف سینہ سپر ہے اور کہیں بیٹا باپ کی گردن پر تیغ کی دھار آزما رہا ہے۔ تاریخ کے یہ مختلف موڑ ہیں جو وہ ایک خاص انداز کے ساتھ کاٹتی رہتی ہے۔ ہمیں ان کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں' ہم اس ڈھیر میں سے فقط اپنے مطلب کی چند چیزیں تلاش کرنا چاہتے ہیں۔

Marfat.com

علمائے کرام سے محبت و عقیدت:

جہاں گیر سنی العقیدہ بادشاہ تھا اور اس کو علمائے وقت سے بے حد محبت و عقیدت تھی، اس کے بائیس سالہ دورِ حکومت میں جون پور، دہلی، لاہور، آگرہ، کشمیر، سیالکوٹ، ملتان، سرہند، برہان پور، ٹھٹھہ وغیرہ بلاد وامصار اور مختلف دیہات و قصبات میں متعدد علمائے کرام موجود تھے اور ان علاقوں کو فقہا و شعرا، صوفیا و اتقیا اور علما و صلحا کے مراکز کی حیثیت حاصل تھی۔ ان علما و فقہا میں سے جہاں گیر بالخصوص شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ذات گرامی، ان کے علم و فضل کی وسعت پذیری اور تقویٰ و تدین سے بڑا متاثر تھا۔ دہلی میں اپنے چودھویں سال جلوس میں اس نے شیخ عبدالحق سے ملاقات بھی کی، جس کا وہ اپنی تزک میں ذکر کرتا ہے [1]۔ حضرت مجدد الف ثانی کی صحبتِ کیمیا اثر سے بھی اس نے غیر معمولی روحانی اور مذہبی برکات حاصل کیے۔ ابتدا میں بعض درباری امرا کی فتنہ پرور گفتگو سے متاثر ہو کر وہ حضرت مجدد سے برگشتہ رہا، یہاں تک کہ اشتعال میں آکر ان کو گوالیار کے قلعے میں نظر بند بھی کر دیا مگر بعد میں انھیں رہا کر دیا تھا اور ان سے بدرجہ غایت محبت و مودت پیدا ہو گئی تھی۔

حضرت مجدد کی رہائی کے بارے میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ ایک روز جہاں گیر نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اس سے فرما رہے ہیں کہ جہاں گیر! تم نے ایک بڑے آدمی کو قید میں ڈال رکھا ہے۔ خواب دیکھنے کے فوراً بعد وہ بیدار ہوا اور حضرت کی رہائی کا حکم صادر کیا۔ انھیں اپنے پاس بلایا، معذرت طلب کی اور لطف و کرم سے پیش آیا۔ پھر ان کی ذات گرامی سے جہاں گیر کی شیفتگی اور عقیدت مندی یہاں تک پہنچی کہ زیادہ تر انہی کی خدمت میں رہنے لگا۔ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

> بادشاہ از محبان شیخ شد، بحدیکہ گاہی آں جناب را از خود جدا نمی کرد، شہزادہ خرم را و اصل حلقہ مریدان شیخ نمود، چنانچہ تا عہد شاہ جہان و عالم گیر بادشاہان باہمہ علما و وزرا داخل سلسلہ مجددیہ می شدند [2]۔

(جہاں گیر بادشاہ) کا شمار محبان شیخ مجدد میں سے ہوا، یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو حضرت سے جدا نہ کرتا تھا، شہزادہ خرم کو حضرت شیخ کے حلقۂ مریدین میں شامل کیا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ شاہ جہان اور عالم گیر کے عہد تک شاہان ہند اپنے تمام علما و وزرا کے ساتھ سلسلہ مجددیہ میں داخل ہوتے تھے۔)

حضرت مجدد سے جہاں گیر کے تعلق و شیفتگی کی یہ نوعیت تھی کہ وہ روزانہ مغرب کے بعد ان سے ملاقات کرتا اور ان ملاقاتوں اور باہمی مذاکرات کے نتیجے میں اس کے قلب و ذہن دین کی روشنی سے منور ہوئے۔ حضرت مجدد اپنے صاحب زادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کے نام اپنے مکتوب میں جن الفاظ میں

---

[1] دیکھیے: تزک جہاں گیری، ص ۲۸۵

[2] خزینۃ الاصفیا، ص ۲۸۳

Marfat.com

اس کا اظہار کرتے ہیں، ان کا ترجمہ لائق مطالعہ ہے۔

"الحمد لله و سلام علی عبادہ الذین اصطفی" اس طرف کے احوال اوضاع حمد کے لائق ہیں۔ (بادشاہ کے ساتھ) عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں۔ اللہ تعالی کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امور دینیہ اور اصول اسلامیہ میں قطعاً کسی قسم کی سستی اور مداہنت کا دخل نہیں ہے۔ اللہ تعالی کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے۔ بالخصوص آج رمضان کی سترھویں شب کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت، عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان، اس کے عذاب وثواب، رویت و دیدار کے اثبات، حضرت خاتم الرسل ﷺ کی نبوت کی خاتمیت، ہرصدی کے مجدد، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی اقتدا، تراویح کی سنیت، تناسخ کے ابطال، جنوں اور جنیوں کے احوال اور ان کے عذاب وثواب کے بارے میں بہت کچھ مذکور ہوا۔ بادشاہ بڑی خوشی سے سب باتیں سنتا رہا۔ اس اثنا میں اور بھی بہت سی باتوں کا ذکر ہوا۔ اقطاب، اوتاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیات وغیرہ کا تذکرہ بھی ہوا۔ اللہ تعالی کا احسان ہے کہ بادشاہ سب باتیں تسلیم کرتا رہا اور دوران گفتگو میں کوئی ایسا تغیر ظاہر نہیں ہوا جو برہمی پر دلالت کناں ہو۔ ان واقعات اور ملاقات میں شاید اللہ تعالی کی حکمت پوشیدہ ہوگی اور کوئی راز مخفی ہوگا۔

الحمد لله الذی هدنا لهذا وما کنا لنهتدی لو لا ان هدنا الله لقد جاء ت رسل ربنا بالحق۔

"دوسرے یہ کہ قرآن مجید بادشاہ کو سورہ عنکبوت تک ختم کرا چکا ہوں۔ جب رات کو اس مجلس (بادشاہی) سے اٹھ کر آتا ہوں تو تراویح میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ حفظ قرآن کی یہ اعلی دولت، اس پراگندہ حالی میں جو عین جمعیت قلب ہے، حاصل ہوئی۔ الحمد لله اولا واخرا"❶۔

جہاں گیر کے متعدد امرا و وزرا بھی حضرت مجدد کے عقیدت مندوں میں شامل تھے اور ان کے نام انھوں نے مکتوب بھی تحریر فرمائے۔ اس محبت و عقیدت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کے دل میں اسلامی شریعت کی فلاح و بہبود کا جذبہ بیدار ہوا اور اس کے ارکان دربار بھی ان سے بہت متاثر ہوئے۔

مشہور ہے کہ جہاں گیر کہا کرتا تھا کہ میرے پاس نجات کی ایک دستاویز ہے، اور وہ حضرت شیخ احمد سرہندی کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالی ہم کو جنت میں لے جائے گا تو ہم تیرے بغیر نہ جائیں گے۔

خلاف شرع رسوم سے نفرت:

جہاں گیر کے قلب و ذہن اور فکر و عمل کی دنیا بالکل بدل گئی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں میں ہندوؤں اور

---

❶ مکتوبات امام ربانی، دفتر سوم، مکتوب ۴۳

Marfat.com

غیر مسلموں سے میل جول کی وجہ سے جو غیر اسلامی رسوم وعوائد رواج پا گئے تھے' جہاں گیر ان کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس پر دکھ کا اظہار کرتا تھا۔ اس نے اپنے پندرھویں سال جلوس میں حضرت مجدد الف ثانی کو قلعہ گوالیار سے رہا کیا' اسی سال وہ کشمیر گیا' وہاں علاقہ راجوڑی کے مسلمانوں کی حالت دیکھی اور ان میں مروج غلط رسمیں اس کے علم میں آئیں تو بادشاہ کو بڑی ذہنی کوفت ہوئی۔ اس کا وہ تزک جہاں گیر میں جن الفاظ میں اظہار کرتا ہے' ان کا ترجمہ یہ ہے:

یہاں کے زمینداروں کو "راجا" کہتے ہیں۔ ان لوگوں کو سلطان فیروز نے دائرۂ اسلام میں داخل کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو راجا کہتے ہیں اور ابھی تک زمانۂ جہالت کی بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہ بدعات ان میں پوری طرح جاری اور مستمر ہیں۔ یہاں کسی ہندو عورت کا شوہر مر جائے تو وہ اس کے ساتھ ہی آگ میں جل جاتی ہے' اور مسلمان عورت کا شوہر فوت ہو جائے تو بیوی کو زندہ اس کی قبر میں دفن کر دیتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ اس علاقے کی ایک عورت کو انھی دنوں میں اس کے ہم عمر مردہ شوہر کے ساتھ زندہ درگور کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بعض لوگ بیٹی کو پیدائش کے وقت ہی قتل کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ ہندوؤں سے رشتے داری قائم کرتے ہیں۔ اپنی لڑکیاں ان کو دیتے ہیں اور ان کی لڑکیاں ان سے لیتے ہیں۔ نعوذ باللہ' ان بدعات کا ارتکار ہو رہا ہے۔ (اب سرکاری طور پر) حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص اس قسم کی بدعات کا ارتکاب کرے' اسے سزا دی جائے [1]۔

پھر آئندہ برس (سولھویں سال جلوس میں) بادشاہ فتح کانگڑہ کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کی غیر دینی حالت کو دیکھتا ہے تو سخت افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ کانگڑہ میں پہاڑ کے دامن میں ہندوؤں کا ایک بت خانہ ہے' جسے جوالا مکھی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس بت خانے میں مسلمان بھی جا کر بت پرستی کرتے اور نذرانے پیش کرتے تھے۔ جہاں گیر اپنے تزک میں اس کا ذکر خاصی تفصیل سے کرتا ہے' وہ لکھتا ہے:

قطع نظر از کفار کہ بت پرستی آئین آنہاست' گروہ گروہ از اہل اسلام مسافت بعید طے نمودہ' نذورات می آرند و پرستش ایں سنگ سیاہ می نمائندہ [2]۔

(قطع نظر کفار کے کہ بت پرستی ان کا مذہبی شیوہ ہے' گروہ در گروہ مسلمان بھی دور دراز کی مسافت طے کر کے وہاں آتے ہیں۔ نذریں پیش کرتے ہیں اور اس سنگ سیاہ کی پرستش کرتے ہیں۔)

اس سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کی غیر دینی اور خلاف شرع حرکات کے ارتکاب سے جہاں گیر کو سخت ذہنی اذیت پہنچتی تھی۔

---

1. تزک جہاں گیری' ص ۳۲۲۔
2. ایضاً' ص ۳۴۷۔

Marfat.com

سفر کانگڑہ میں علمائے اسلام کی معیت:

سولھویں سال جلوس میں جہاں گیر فتح کانگڑہ کی غرض سے روانہ ہوا تو علمائے اسلام بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ کون کون علما اس کے ہم رکاب تھے، تاہم اس کا تذکرہ وہ صراحت سے کرتا ہے۔ قلعہ کانگڑہ میں اذان اور شعائر اسلام کی بجا آوری کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

متوجہ سیر قلعہ کانگڑہ شدم و حکم کردم کہ قاضی و میر عدل و دیگر علمائے اسلام در رکاب بودہ، آنچہ شعار اسلام و شرائط دین محمدی است در قلعہ مذکور بعمل آورند۔ بتوفیق ایزد سبحانہ بانگ بنماز و خواندن خطبہ و کشتن گاؤ وغیرہ کہ از ابتدائے بناء ایں قلعہ تا حال نشدہ بود، ہمہ را در حضور خود بعمل آوردم۔ سجدات شکر ایں موہبت عظمی کہ ہیچ بادشاہے توفیق براں نیافتہ بود بتقدیم رسانیدہ۔ حکم فرمودم کہ مسجد عالی درون قلعہ بنا نہند (1)۔

(قلعہ کانگڑہ کی طرف عنان توجہ مبذول کی اور حکم دیا کہ قاضی، میر عدل اور دیگر علمائے اسلام ہم رکاب ہوں تاکہ اس قلعے میں شعائر اسلام اور شرائط دین محمدی پر عمل کیا جائے۔۔۔۔۔۔ چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توفیق سے نماز کے لیے اذان کہی گئی، خطبہ پڑھا گیا اور گائے ذبح کی گئی، دیگر احکام اسلام پر بھی عمل ہوا۔ یہ وہ امور دینی تھے، جن پر قلعے کی تعمیر سے لے کر آج تک اس قلعے میں عمل نہیں ہوا تھا۔ یہ سب امور میں نے اپنے سامنے ادا کرائے۔ اللہ کی اس عنایت عظیم پر شکر کے سجدے ادا کیے کہ اس سے قبل کسی بادشاہ کو اس کی توفیق نہ ہوئی تھی۔ اس میں مجھے ہی تقدم حاصل ہوا۔ میں نے حکم جاری کیا کہ قلعے کے اندر ایک عالی شان مسجد تعمیر کی جائے۔)

مطالعہ کتب کا شوق اور مدارس دینیہ کی تعمیر:

جہاں گیر کو مطالعہ کتب کا بہت شوق تھا۔ سرکاری کتب خانے کے علاوہ اس کا ایک اپنا شان دار ذاتی کتب خانہ تھا۔ اس کے مہتمم کا نام مکتوب خاں تھا۔ بادشاہ سفر میں بھی ضروری کتابیں ساتھ رکھتا تھا۔ تزک جہاں گیری میں یہ واقعہ مرقوم ہے کہ جب بادشاہ گجرات گیا تو وہاں کے مشائخ کو اپنے کتب خانے سے تفسیر حسینی، تفسیر کشاف اور روضۃ الاحباب پیش کیں۔

وہ اپنے بارھویں سال جلوس کے واقعات کے ضمن میں لکھتا ہے:

مشائخ گجرات را کہ بمشایعت آمدہ بودند مرتبہ دیگر خلعت و خرچی بااراضی مدد معاش دادہ رخصت فرمودم، و بہ ہر یک ازیں ہا کتابے از کتاب خانہ خاصہ مثل تفسیر کشاف و تفسیر حسینی و روضۃ الاحباب مرحمت شد و بر پشت آں کتب تاریخ آمدن گجرات و مرحمت نمودن کتاب مرقوم گشت (2)۔

---

(1) تزک جہاں گیری، ص ۳۴۶، ۳۴۷

(2) تزک جہاں گیری، ص ۲۲۰

Marfat.com

(مشائخ گجرات میرے پاس آئے تو میں نے ان کے مرتبے کے مطابق انھیں خلعت' مصارف اور مدد معاش کے لیے اراضی دے کر رخصت کیا۔ ساتھ ہی ان میں سے ہر ایک کو اپنے ذاتی کتب خانے سے تفسیر کشاف' تفسیر حسینی اور روضۃ الاحباب وغیرہ کتابیں پیش کیں' اور ان کتابوں کی پشت پر اپنی گجرات میں آمد اور کتاب دینے کی تاریخ تحریر کی۔)

جہاں گیر مدارس دینیہ کی تعمیر کا بھی شائق تھا۔ بقول خافی خاں اس کے لیے اس نے یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ کوئی امیر اور متمول شخص لاوارث فوت ہو جاتا تو اس کے مال واسباب میں سے مدارس اور خانقاہیں تعمیر کرتا تھا۔ تاریخ خان جہان کی روایت کے مطابق اس نے وہ تمام مدارس از سر نو آباد کیے جو گزشتہ تیس سالوں سے پرندوں اور چوپایوں کے مسکن بنے ہوئے تھے ❶۔

قرآن مجید سے قلبی لگاؤ:

جہاں گیر کو قرآن مجید سے قلبی لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے اپنے عہد کے ایک عالم دین شیخ محمد بن جلال حسینی گجراتی کو قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ ترجمہ لفظی ہو اور الفاظ قرآن سے ایک حرف بھی زائد نہ ہو۔ نیز تاکید کی کہ ترجمہ آسان اور عام فہم ہونا چاہیے۔ الفاظ اور زبان میں کسی قسم کا تصنع اور تکلف ہرگز نہ ہو ❷۔

معلوم نہیں اب یہ ترجمہ کہیں موجود ہے یا نہیں۔ غالباً یہ پہلا ترجمہ ہے جو برصغیر کے ایک عالم نے فارسی زبان میں کیا۔

اوراد و وظائف:

اس کی ایک تحریر بتاتی ہے کہ وہ اوراد و وظائف کا بھی قائل تھا۔ نیز وہ علما و صلحا کی صحبت میں بیٹھتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> بعلما و دانایان اسلامیہ فرمودم کہ مفردات اسمائے الٰہی را کہ دریا دگرفتن آسان باشد جمع نمائند تا آں را ورد خود سازم و در شبہائے جمعہ با علما و صلحا و درویشان و گوشہ نشینان صحبت می دارم ❸۔

---

❶ بزم تیموریہ' ص ۱۶۸

❷ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۱۲۱

❸ تزک جہاں گیری' ص ۱۰

Marfat.com

(میں نے علمائے اسلام اور فقہا کو حکم دیا ہے کہ وہ مفرد اسمائے الٰہی جمع کریں' کیوں کہ ان کو یاد رکھنا آسان ہے۔ میں ان کا وظیفہ کرنا چاہتا ہوں۔ جمعرات کو میں علما وصلحا اور درویشوں اور گوشہ نشینوں کی صحبت اختیار کرتا ہوں۔)

ادب وشعر کا ذوق بلند:

دودمانِ مغلیہ کا یہ بادشاہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ رحم دلی' حلم' نرم مزاجی اور عدل وانصاف اس کا خاصہ تھا۔ ظریف الطبع' بہترین شاعر' فصیح البیان اور ذکی وفطین تھا۔ تحریر وتقریر میں کامل مہارت رکھتا تھا۔ تزک جہاں گیری اس کی اپنی تصنیف ہے۔ اس کے مندرجات سے پتا چلتا ہے کہ وہ ادبیت وفصاحت میں مرتبہ کمال پر فائز تھا۔ انتخاب الفاظ میں بے حد محتاط تھا۔ منظر کشی میں کوئی اس کا حریف نہ تھا۔

تزک جہاں گیری کے علاوہ فارسی زبان میں ''پند نامہ'' کے نام سے اپنے بیٹوں کے لیے ایک رسالہ قلم بند کیا جو چند اوراق پر مشتمل ہے۔

مے نوشی اور افیون خوری:

بہت سی خوبیوں کے باوجود جہاں گیر میں کچھ ایسی عادتیں بھی تھیں' جو سراسر غیر اسلامی اور خلاف شرع ہیں۔ مثلاً وہ مے نوش اور افیون خور تھا' اور اس کا وہ برملا اظہار بھی کرتا ہے۔ اس کے قول وفعل کا تضاد ملاحظہ ہو کہ ایک طرف وہ خود اپنے ہی جاری کردہ دستور العمل اور بارہ احکام میں سے چوتھے حکم میں یہ اعلان کرتا ہے:

شراب ودر بہرہ وآنچہ از قسم مسکرات منہیہ باشد نہ سازند ونہ فروشند [1]۔

کہ شراب اور دیگر نشہ آور چیزیں جن سے شریعت میں روکا گیا ہے' نہ تیار کی جائیں اور نہ فروخت کی جائیں۔

لیکن خود شراب پیتا اور افیون کھاتا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں نشہ آور ہیں اور نشہ آور چیزوں سے شریعت نے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ زندگی کے آخری دور میں تو وہ کثرت سے مے نوشی کرنے لگا تھا' اور یہی عادتِ بد اس کی موت کا سبب بنی۔

ملکی مصالح:

جہاں گیر کے حالات میں اس کی رحم دلی اور منصف مزاجی کا خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن

---

[1] تزک جہاں گیری' ص ۵

Marfat.com

اس کے ساتھ ہی اس کے کردار کا یہ پہلو بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ اس نے خود اپنے بیٹوں پر سختیاں کیں اور بعض اہم شخصیتوں کی موت کا باعث بنا۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ ذاتی طور واقعی نرم دل اور متحمل مزاج تھا۔ عدل وانصاف میں بھی خاص شہرت کا حامل تھا۔ لیکن اتنے بڑے ملک کے بادشاہ اور حکمران کی حیثیت سے اس پر کچھ نازک ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی تھیں، جو ملک کے سیاسی مصالح کی بنا پر اسے بعض اوقات تشدد پر مجبور کرتی تھیں، اس لیے اگر اس کو کسی پر عملاً سختی اور تشدد کرنا پڑا ہے تو ممکن ہے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر ایسا کرنا اس کے نزدیک ضروری ہو۔

دور جہاں گیری کے علمائے کرام:

دور جہاں گیری کے علمائے کرام، فقہائے عظام، حکمائے عالی مقام اور شعرائے نام دار کے اسمائے گرامی کی فہرست بہت طویل ہے، ان میں سے جو حضرات ہمارے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے نام اور علمی کارنامے "فقہائے ہند" کی جلد چہارم میں مرقوم ہیں۔! ان میں حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا تذکرہ تو بار بار آتا ہے۔ ان کے علاوہ جن فضلائے عصر کی فہرست جہاں گیر نامہ وغیرہ نے بہم پہنچائی ہے، ان میں سے چند حضرات یہ ہیں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی، ملا عبداللطیف سلطان پوری، علامہ محمود جون پوری، ملا محمد فاضل کابلی، ملا حسن مراغی، قاضی نور اللہ شستری، میر شکر اللہ شیرازی، ملا روز بہان شیرازی، میر ابوالقاسم گیلانی، ملا عبدالرحمٰن گجراتی، ملا نفسیائے شستری، ملا باقر کشمیری، ملا مقصود علی، شیخ محمد یمنی [1]۔

شیخ محمد میر سے عقیدت و تعلق:

جہاں گیر کو جن مشائخ کرام اور علمائے عظام سے خاص عقیدت تھی، ان میں لاہور کے شیخ محمد میر بھی شامل ہیں، جنھیں اب میاں میر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جہاں گیر اپنے تزک میں بڑے احترام سے ان کا ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

چوں بعرض رسید کہ در لاہور شیخ محمد میر نام درویشے است ہندی الاصل، بغایت فاضل و مرتاض و مبارک نفس و صاحب حال، در گوشہ توکل و عزلت منزوی گشتہ از فقر غنی واز دنیا مستغنی نشستہ است۔ بنابریں خاطر حق طلب بے ملاقات ایشاں قرار نہ گیرد و بدیدن ایشاں رغبت افزود۔ چوں بہ لاہور رفتن متعذر بود رقعہ بخدمت ایشاں نوشتہ، شوق باطن را ظاہر ساختم، و آں عزیز باوجود کبرسن و ضعف بینہ تصدیعہ کشیدہ تشریف آورد و مدت ممتد تنہا با ایشاں نشستہ صحبت مستوفی داشتہ شد۔ الحق ذات شریف است و دریں عہد بغایت غنیمت و عزیز الوجود۔ ایں نیاز مند از خود برآمد، با ایشاں صحبت داشت و بسا سخنہا بلند از حقائق و معارف استماع افتاد۔ ہر چند خواستم

[1] جہاں گیر نامہ، ص ۲۷۹

Marfat.com

نیازے بگزارنم، چوں پایہ ہمت ایشاں راازاں عالی تریافتم خاطر باظہاراین مطلب رخصت نہ داد۔ پوست آہو سفید بہ جہت جائے نماز بایشاں گزرانیدم ❶۔

(مجھے جب پتا چلا کہ لاہور میں شیخ محمد میر نام کے ایک درویش سکونت پذیر ہیں، جو اصلاً ہندی ہیں، نہایت فاضل، پسندیدہ خو، شریف النفس اور صاحب حال بزرگ ہیں، توکل و عزلت کی زندگی بسر کرتے ہیں، فقر پر قانع اور دنیا سے بے نیاز ایک گوشے میں بیٹھے ہیں، تو طلب حق کی غرض سے ان سے ملاقات کے بغیر دل میں چین نہ آیا اور ان کی زیارت کا شوق بے قرار کرنے لگا۔ چنانچہ جب لاہور جانا مشکل ہو گیا تو ان کی خدمت میں رقعہ لکھا اور اپنے باطن کا اشتیاق ظاہر کیا۔ وہ عزیز القدر بزرگ باوجودیکہ کبر سنی کو پہنچ گئے تھے اور جسم پر کمزوری کے آثار نمایاں ہو گئے تھے، تکلیف سے تشریف لائے۔ بڑی دیر تک تنہائی میں ان کی خدمت میں بیٹھنے کا موقع ملا اور خوب صحبت رہی۔ بلاشبہ وہ اونچے مرتبے کی شخصیت ہیں، اور اس عہد میں ان کا وجود مسعود انتہائی غنیمت ہے۔ یہ نیاز مند خود باہر نکل کر ان سے ملا، ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوا، اور حقائق و معارف سے بھرپور باتیں سننے کا بہترین موقعہ میسر آیا۔ ہر چند چاہا کہ کوئی نذر پیش کروں، مگر جب ان کے مرتبے کو اس سے بلند تر پایا تو دل نے اس کے اظہار کی اجازت نہ دی۔ البتہ جائے نماز کی شکل میں سفید ہرن کی کھال پیش خدمت کی۔)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں گیر کے دل میں علما و مشائخ کی کیا قدر و منزلت تھی اور وہ کس عقیدت واحترام کے ساتھ ان سے ملتا تھا۔

برصغیر میں انگریز کا قدم:

جہاں گیر کا تذکرہ ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں تجارت کی غرض سے انگریز سب سے پہلے جہاں گیر ہی کے عہد میں آئے تھے۔ مختصر الفاظ میں واقعہ یوں ہے کہ ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کے عہد میں لندن کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے کا پہلا چارٹر ملا۔ کپتان ولیم ہاکنز ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا انگریز تاجر ہے جس نے ساحل ہند پر قدم رکھا۔ ۱۶۰۸ء میں اس کا جہاز ہیکٹر سورت کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ ہاکنز نے جہاں گیر کے دربار میں حاضر ہو کر انگلستان کے بادشاہ جیمز اول کا مکتوب اس کی خدمت میں پیش کیا۔ انگریزوں کی پہلی تجارتی کوٹھی ۱۶۰۸ء میں سورت میں تعمیر کی گئی۔ ۱۶۱۳ء میں بادشاہ جہاں گیر نے سورت، کھمبایت، گوگو اور احمد آباد میں کوٹھیاں بنانے کی اجازت دی۔ اسی سال انگریزوں کو سورت میں ایک فیکٹری قائم کرنے اور مغل دربار میں سفارت کے فرائض انجام دینے کی

❶ تزک جہاں گیری ، ص ۲۹۰

Marfat.com

سند حاصل ہوئی۔ بعد ازاں، مچھلی پٹم میں بھی انھوں نے ایک کارخانہ قائم کیا۔ سر طامس رو پہلا سفیر تھا جو شاہ انگلستان جیمس اول کی طرف سے شہنشاہ ہند جہاں گیر کے دربار میں آیا۔ شاہی دربار میں اس کی بڑی عزت و توقیر کی گئی۔ سفیر مذکور چار سال فرائض سفارت پر مامور رہا۔ اس اثنا میں اس نے ایک کتاب بھی لکھی، جس میں ہندوستان کے بادشاہ، یہاں کے سیاسی حالات اور دربار کی کیفیات قلم بند کیں۔ اس سے پہلے ولیم ہاکنز بھی ہندوستان میں موجود تھا۔ وہ بھی بادشاہ سے قریبی روابط رکھتا تھا، اس نے بھی یہاں کے حالات تحریر کیے، جن میں بادشاہ کو ظالم اور سفاک قرار دیا گیا ہے۔ ۱۶۱۵ء میں دو اور انگریز رچرڈ سٹیل اور جان کروتھر، اصفہان جاتے ہوئے دہلی سے گزرے تھے، انھوں نے بھی اپنی ڈائری میں بادشاہ پر سخت تنقید کی ہے اور یہاں کی رعایا کو مفلس لکھا ہے۔

جہاں گیر کے زمانے میں انگریز کے ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آنے، عہدہ سفارت پر فائز ہونے اور پھر یہاں کے حالات و کوائف کو قلم بند کرنے کا تذکرہ ہم نے چند الفاظ میں اس لیے کیا ہے کہ آئندہ چل کر اس سے برصغیر کی تاریخ کا رخ بالکل بدل گیا اور یہ خطۂ ارض سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے انقلاب و تغیر کے خوف ناک طوفانوں کی زد میں آ گیا۔ اگر اللہ نے توفیق عطا فرمائی اور زندگی باقی رہی تو ان واقعات کی تفصیل اس کتاب کی آئندہ جلدوں میں اس کے اصل مقام پر بیان کی جائے گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔ علیہ توکلنا و الیہ المنیب۔

وفات:

بہر حال بادشاہ ہند نور الدین محمد جہاں گیر میں اگرچہ اچھائیوں کے ساتھ بحیثیت انسان برائیاں بھی پائی جاتی تھیں لیکن مجموعی اعتبار سے وہ ایک اچھا حکمران تھا اور بہت سے اوصاف اس کی ذات میں سمٹ آئے تھے۔

شہنشاہ جہاں گیر کی موت حالت سفر میں واقع ہوئی۔ وہ کشمیر کے دورے پر تھا اور وہاں کے ایک مقام راجوڑی سے بھمبر جا رہا تھا کہ راستے میں چاشت کے وقت ہفتے کے روز ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ/ ۲۹ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو اٹھاون (۵۸) سال کی عمر پا کر اپنے جلوس سلطنت کے بائیسویں برس میں انتقال کر گیا۔ اس کی میت لاہور لائی گئی اور اسی شہر میں اسے دفن کیا گیا۔ مقام تدفین کا انتخاب اس کی بیوی نور جہاں نے کیا تھا جہاں اس نے اپنے خرچ سے ایک شان دار مقبرہ تعمیر کیا۔

اس زمانے کے سیاسی حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ بابر کی نسل کے اس چوتھے عظیم بادشاہ کی رسوم تعزیت شاہی روایات کے مطابق ادا نہ کی گئیں۔

Marfat.com

شاہ جہان

شاہ جہان چہار شنبہ کے روز ۲۸ ربیع الاول ۱۰۰۰ھ/۳ جنوری ۱۵۹۲ء کو لاہور میں پیدا ہوا' اور اس کا نام خرم رکھا گیا۔ شاہ جہان کی رگوں میں بھی جہاں گیر کی طرح راجپوت خون کی آمیزش تھی۔ اس کی ماں کا نام جودھا بائی تھا' اور وہ جودھ پور کے راجا بھگوان داس کی بیٹی تھی۔ شہزادہ چار سال چار ماہ چار دن کا ہوا تو خاندانی روایت کے مطابق حصول علم کے لیے مکتب میں داخل کرا دیا گیا' اور تحصیل علم سے بہرہ مند ہوا۔ لیکن یہ علم و ادراک کی کن منازل پر فائز تھا اور کس عالم سے کیا استفادہ کیا؟ اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ پھر چوں کہ اس کی کوئی تصنیف بھی نہیں ہے' اس لیے اس کی علمی گہرائی کا اندازہ بھی نہیں ہوسکتا۔ بابر کے تزک اور اس کی بعض دوسری علمی سرگرمیوں سے اس کے علم و فضل کی نشان دہی ہوتی ہے۔ جہاں گیر کا تزک بھی اس کے معلومات کا پتا دیتا ہے۔ اورنگ زیب کے رقعات اس کی فضیلت علمی کے شاہد ہیں' لیکن شاہ جہان کے بارے میں ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے کہ جس سے اس کے مرتبۂ علمی کا اندازہ ہو سکے۔ البتہ اس کے بعض فرمان بتاتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے مروجہ علوم میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اس کا انتخاب الفاظ اور اسلوبِ کلام عالمانہ اور پُر وقار ہے۔ پھر اس نے اپنے بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو جس نہج سے تعلیم دلائی' اپنے دور کے مشاہیر علما سے تعلقات استوار کیے اور ان کی قدر افزائی کی' دربار میں جن اہم مباحث کا اہتمام کیا اور ایرانی علما سے خالص فنی اور علمی نوعیت کی بحثوں میں علمائے ہند کو حصہ لینے پر مامور فرمایا' وہ سب واقعات اس کی علمی پختگی اور مذہبی گہرائی پر دلالت کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ جلال الدین اکبر کے دینی افکار بعض لوگوں کی موت کے ساتھ ہی مر گئے تھے۔ اس کی زندگی کا آخری دور تو اسے ایک اچھے خاصے مسلمان کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اگر بالفرض کوئی بات رہ بھی گئی تھی تو جہاں گیر نے اس کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ اس ضمن میں ہندوستان کے مشہور مورخ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے یہ الفاظ قابل مطالعہ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''جہاں گیر' ایک راجپوت شہزادی کا فرزند اور متعدد راجپوت شہزادیوں کا شوہر تھا۔ لیکن اس کے

Marfat.com

باوجود یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ وہ علما کی تعلیمات سے پوری طرح متاثر رہا۔ ایک بار وہ ابوالفضل سے ملنے گیا' دیکھا کہ اس کے گھر پر بہت سے کاتب' کلام پاک اور تفسیر کی کتابت کرنے میں مشغول ہیں۔ ابوالفضل ہی نے اکبر کو یہ یقین دلایا تھا کہ قرآن مجید الہامی کتاب نہیں' کلام رسول ہے۔ جہاں گیر اپنے باپ کی گم راہی کا سبب ابوالفضل ہی کو قرار دیتا تھا' اس لیے وہ کاتبوں سے تمام اوراق لے اکبر کے پاس لے گیا اور کہا کہ ابوالفضل کا مذہب' خلوت میں کچھ اور ہے اور جلوت میں کچھ اور۔! اور اپنی تزک میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ ابوالفضل کو قتل کرانے میں اس کے مذہبی جذبے کو بھی دخل تھا۔ جہاں گیر کے تعلقات حضرت مجدد سے شروع میں ضرور خراب رہے' لیکن جب اچھے ہو گئے تو وہ روزانہ ان سے مغرب کے بعد ملاقات کرتا' ان ملاقاتوں سے اس کے قلب کی تطہیر جس طرح ہوئی ہے' اس کا اعتراف حضرت مجدد صاحب نے اپنے مکتوبات میں کیا ہے ⓫۔''

جہاں گیر کے بعد جب شاہ جہان کا دور آیا تو حالات قطعی طور سے بدل گئے تھے اور ملک میں خالص اسلامی فضا پیدا ہو گئی تھی' جس کی چند جھلکیاں اختصار کے ساتھ آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہیں۔

بغاوت اور اس کا پس منظر:

جہاں گیر اپنے بیٹے شہزادہ خرم سے بہت متاثر تھا اور اس کو ہر لحاظ سے بادشاہت کے لائق سمجھتا تھا' اس لیے کہ شہزادہ خرم اوائل عمر ہی میں تدبر و شہامت کے جوہر سے آراستہ تھا۔ بہادری اور شجاعت میں بھی یکتا تھا اور ان تمام اوصاف سے متصف تھا' جن کا ایک حکمران میں پایا جانا شرط اولین ہے۔ خرم دکن کی مہم پر گیا اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو جہاں گیر نے اسے شاہ جہان کے خطاب سے سرفراز کیا' جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس کے بعد وہی وارثِ تختِ ہند ہوگا۔ لیکن واقعات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ شاہ جہان کو باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا پڑا۔ ایسا کیوں ہوا اور بیٹے نے باپ کے خلاف اتنا بڑا اقدام کیوں کیا؟ اس کا ایک خاص پس منظر ہے' شاہ جہان کے واقعات کے سلسلے میں جس کی وضاحت ضروری ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہم اپنے معزز قارئین کا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ مختصر الفاظ میں اس کی تفصیل یہ ہے۔

نور جہان جو جہاں گیر کی چہیتی بیوی تھی' عملاً تمام کاروبار سلطنت پر قابض ہو چکی تھی اور بادشاہ اس کی ہر بات مانتا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں مضبوط کرنے کے لیے ایک کام تو یہ کیا کہ اپنے بھائی آصف خاں کی بیٹی ممتاز محل کو شہزادہ خرم کے عقد میں دے دیا۔ دوسرے خود اپنی بیٹی جو اس کے پہلے شوہر شیر افگن سے تھی' جہاں گیر کے سب سے چھوٹے بیٹے شہریار سے بیاہ دی۔ شروع شروع میں نور جہاں' شہزادہ خرم کی حامی تھی' اس لیے کہ وہ اس کا بھتیج داماد تھا۔ دکن کی مہم میں اس نے فوجی نوعیت کے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور بے پناہ فتوحات

⓫ ہندوستان کے سلاطین' علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر۔ ص ۲۲

Marfat.com

حاصل کیں، اس سے اس کی جنگی قابلیت کا شہرہ تمام ملک میں پھیل گیا اور دشمن اس سے لرزنے لگے۔ یہ بات بادشاہ کے لیے انتہائی مسرت انگیز تھی اور وہ بہادر بیٹے کی عسکری تدبیروں سے بہت خوش تھا۔ مگر نور جہاں اس سے بگڑ گئی اور اس نے اپنی ہمدردیوں کا سارا وزن شہریار کے پلڑے میں ڈال دیا جو اس کا حقیقی داماد تھا۔ اس نے یہ منصوبہ تیار کرنا شروع کیا کہ شہزادہ خرم نظروں سے اوجھل ہو جائے اور اس کی جگہ شہریار کو اورنگِ حکومت پر متمکن کیا جائے۔ اس کے لیے اس نے جہاں گیر کو یہ پٹی پڑھائی کہ قندھار کا علاقہ حال ہی میں فتح کیا گیا ہے، اس کے انتظام وانصرام کی طرف فوری طور پر عنان توجہ مبذول کرنا انتہائی ضروری ہے، وہاں کسی بہت ہی قابل اور تجربہ کار جنگی ماہر کو متعین کرنا چاہیے اور میرے نزدیک شہزادہ خرم اس کے لیے نہایت موزوں رہے گا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا شخص وہاں کے انتظام پر قابو نہیں پا سکے گا۔ خرم بھی بڑی تیز نگاہ رکھتا تھا اور وہ نور جہاں کے ارادوں کو خوب سمجھتا تھا، چنانچہ بادشاہ نے اس کو قندھار جانے کے لیے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور ساتھ ہی بادشاہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ نے شاہی لشکر اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیا لیکن شہزادے نے حالات کا موازنہ کر کے اپنے آپ کو عساکر شاہی کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ سمجھا اور مانڈو کی طرف ہٹ گیا۔ وہاں اسے کامیابی نہ ہوئی تو دوسری طرف رخ کیا اور بہار اور بنگال کے علاقوں پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔ جہاں گیر نے شہزادہ پرویز اور مہابت خاں کو فوج دے کر مقابلے کے لیے بھیجا، تو خرم شکست کھا گیا، کیوں کہ اس بغاوت میں نہ کوئی قابل ذکر فوج اس کے ساتھ تھی اور نہ کوئی مشہور اور نامور جرنیل اس کا حامی تھا۔ وہ تقریباً تنہا تھا۔ پہلے تو مشرقی جانب کو مچھلی بندر کی طرف بھاگا، بعد کو دکن کا راستہ لیا۔ دکن میں ملک عنبر حکمران تھا، اس نے موقع غنیمت جان کر خرم کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑی تکریم سے پیش آیا۔ بالآخر جب شہزادے نے دیکھا کہ کامیابی کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں تو بادشاہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور معافی کا طالب ہوا۔ بادشاہ نے اس شرط پر معافی دی کہ خرم اپنے دونوں بیٹوں، داراشکوہ اور اورنگ زیب کو بطور یرغمال دربار شاہی میں بھیج دے ــــــــ خرم نے یہ شرط منظور کی اور باپ بیٹے میں مکمل صلح ہو گئی۔

ان دنوں دکن کا حکمران ملک عنبر تھا۔ اس کی طرف سے بغاوتوں اور شورشوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس کو ختم کرنے کے لیے جہاں گیر نے شہزادہ خرم کو ایک لشکر کے ساتھ روانہ کیا اور شاہ جہان کا خطاب مرحمت فرمایا۔ اس خطاب کے معنی اس کی ولی عہدی کے تھے۔ بادشاہ خود بھی اس کے پیچھے دکن پہنچا، مگر اس سے پہلے شاہ جہان اپنے زورِ شمشیر سے ملک عنبر کو شکست دے کر احمد نگر خالی کرا چکا تھا۔ بادشاہ گجرات ہوتے ہوئے آگرہ کو واپس آ گیا۔ دو سال بعد ملک عنبر نے پھر سر اٹھایا اور شاہ جہان نے اسے پھر شکست دی۔ اسی زمانے میں شہزادہ خسرو نے، جسے شاہ جہان نے بادشاہ سے سفارش کر کے قید سے رہائی دلائی تھی، وفات پائی۔

Marfat.com

شاہ جہان نے دو مرتبہ بغاوت میں ہزیمت اٹھانے کے بعد تیسری مرتبہ پھر باپ کے خلاف اعلان بغاوت کیا۔ یہ اس کی آخری بغاوت تھی۔ اب اس نے دارالسلطنت آگرہ پر قبضہ کرنے کا عزم کیا۔ اس کے لیے وہ دہلی کی طرف بڑھا اور دہلی سے نو میل کے فاصلے پر فرید آباد کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ جہاں گیر بادشاہ بھی ان دنوں دہلی میں مقیم تھا' چونکہ شاہ جہان نے یہ اقدام ناگہانی طور پر کیا تھا اور جہاں گیر اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا' اس لیے وہ پہلے تو گھبرایا اور پھر بروقت فوجی امداد پہنچ جانے کی وجہ سے اس کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ باپ ایک بڑی فوج کے ساتھ بیٹے کی سرکوبی کو نکلا' ادھر شاہ جہان بھی اپنے لشکر کی معیت میں نمودار ہوا۔ دونوں طرف کی فوجیں تغلق آباد کے مقام پر ایک دوسرے کے مقابلے پر اتریں۔ لیکن شہزادے کی فوج کا شیرازہ آناً فاناً منتشر ہو گیا اور وہ خود بھی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس شکست سے شاہ جہان نہایت بددل ہوا' اور اس کو تحیر اور پریشانی نے آگھیرا۔ آخر راہِ راست اختیار کی اور باپ کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھایا۔

ان تمام بغاوتوں کا پس منظر نور جہاں کا وہ خاص منصوبہ تھا' جس کے تحت وہ اپنے داماد شہریار کو ہندوستان کا بادشاہ بنانے پر تلی ہوئی تھی' اور جہاں گیر کے تیسرے بیٹے شاہ جہان کو تاج و تخت سے ہر حال میں محروم کر دینا چاہتی تھی۔ یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ شہریار بالکل نالائق تھا اور کاروبارِ حکومت کا قطعی اہل نہ تھا۔ اس کے مقابلے میں شاہ جہان لائق و دانا' عاقل و فہیم اور ہر اعتبار سے سزاوارِ تختِ ہند تھا۔

داور بخش کی عارضی تخت نشینی:

جہاں گیر کی وفات کے وقت اس کے دو بیٹے زندہ تھے۔ ایک شاہ جہان جو دکن میں مقیم اور اس کے انتظام میں مصروف تھا۔ دوسرا شہریار جو لاہور میں جہاں گیر کے پاس تھا اور اس کا چھوٹا بیٹا تھا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا نور جہاں ہر صورت میں شہریار کو ہندوستان کے تخت پر دیکھنا چاہتی تھی' اس لیے کہ وہ اس کا داماد تھا۔ لیکن نور جہاں کا بھائی آصف خاں' شہریار کی مخالفت پر کمربستہ تھا۔ وہ شاہ جہان کی بادشاہت کا متمنی تھا' کیونکہ آصف خاں کی بیٹی ممتاز محل شاہ جہان کے حبالۂ عقد میں تھی۔ آصف خاں نے جہاں گیر کی وفات کے فوراً بعد یہ تدبیر کی کہ داور بخش عرف بلاقی خاں کو جو جہاں گیر کا پوتا اور خسرو کا بیٹا تھا' تخت پر بٹھا دیا تاکہ تختِ ہند حکمران سے خالی نہ رہے اور ادھر دکن میں شاہ جہان کے پاس تیز رو قاصد بھیج دیے کہ وہ جلد سے جلد لاہور پہنچ کر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے۔ آصف خاں نے شاہ جہان کو یہ بھی کہلا بھیجا کہ عارضی طور پر داور بخش (مرزا بلاقی) کو تخت نشین کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی بلاتاخیر شاہ جہان دکن سے لاہور روانہ ہو گیا' لیکن اس نے فوری طور پر آصف خاں کو ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعے اپنے دستِ خاص سے یہ فرمان لکھ بھیجا:

دریں ہنگام کہ آسمان آشوب طلب و زمین فتنہ جو است' اگر داور بخش پسر خسرو و برادر او و

Marfat.com

شہریار و پسران شہزادہ دانیال را آوارہ صحرائے عدم ساختہ دولت خواہاں را از توزع خاطر و شورش دل فارغ سازند بہ صلاح وصواب د بہ قرین تر خواہد بود ❶۔

(یعنی اس وقت جب کہ آسمان آشوب طلب اور زمین فتنہ جو ہے' اگر خسرو کا بیٹا داور بخش اور میرے بھائی شہریار اور فرزندان شہزادہ دانیال (طہمورث اور ہوشنگ) کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تو ارباب حکومت کے دل اس سے مطمئن ہو جائیں گے۔ یہ کام نہایت احتیاط اور بہتر طریق سے انجام پذیر ہونا چاہیے۔)

چنانچہ چہارشنبہ کی شب' ۲۵ جمادی الاولی ۔۱۰۳۷ھ/۲۳ رجنوری ۱۶۲۸ء کو اس حکم کی پوری تعمیل ہوئی اور خاتمہ تزک جہاں گیری کے مصنف کے بقول:

شہریار و طہمورث و ہوشنگ پسران شہزادہ دانیال آوارہ صحرائے فنا ساختند و گلشن ہستی را از خس و خاشاک وجود شاں پرداختند ❷۔

(شہریار اور شہزادہ دانیال کے فرزندوں طہمورث اور ہوشنگ کو صحرائے فنا میں پھینک دیا گیا' اور گلشن ہستی کو ان کے وجود کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا گیا۔)

اس سے قبل لاہور میں آصف خاں اور داور بخش سے شہریار کی شدید جنگ ہوئی تھی' جس میں شہریار کو شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا' اسے گرفتار کر کے قلعہ لاہور میں نظر بند کر دیا گیا۔ "وشہریار در قلعہ لاہور متحصن گشتہ' در معنی بزندان درآمد ❸۔"

اس کے بعد کیا ہوا؟۔

اور ابعد از چندے حسب الحکم داور بخش ہر دو چشمش از نور باصرہ معدوم الفراغ ساختند۔

(اس واقعہ کے چند روز بعد داور بخش کے حکم سے اس کی دونوں آنکھیں نور بصارت سے محروم کر دی گئیں۔)

یہ حادثہ ۱۰۳۷ھ کو پیش آیا تھا' شہریار نے جو کہ طبع موزوں رکھتا اور ذوق شعری سے بہرہ مند تھا' اس پر یہ شعر کہے اور ۱۰۳۷ھ اس کی تاریخ نکالی۔

زنرگس گلاب از چہ نتواں کشید — کشیدند از نرگسانم گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ آں — بگو" کورشد دیدہ آفتاب"

۱۰۳۷ھ

❶ تزک جہاں گیری' ص ۴۳۸' ۴۳۹ - در بیان "جلوس داور بخش برادرنگ سلطنت -"
❷ ایضاً' ص ۴۳۹ -
❸ تزک جہاں گیری' ص ۴۳۸

Marfat.com

شاہ جہان کی تخت نشینی:

بہر حال شاہ جہان ہر ممکن عجلت کے ساتھ لاہور پہنچا اور والد کی وفات سے تین ماہ آٹھ روز بعد ۶ جمادی الاخری ۱۰۳۷ھ/۲ فروری ۱۶۲۸ء کو سینتیس (۳۷) سال کی عمر میں بمقام لاہور ہندوستان کے سریر فرماں روائی پر جلوہ افروز ہوا۔ چند روز لاہور میں قیام کیا، پھر دارالحکومت آگرہ کو روانہ ہو گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ شاہ جہان کی ولادت بھی لاہور میں ہوئی اور تاج شاہی بھی اسی شہر میں سر پر رکھا گیا۔

شاہ جہان کی حکومت کا آغاز اگرچہ خوں ریزی سے ہوا اور اس نے اپنے حقیقی بھائی، چچیرے بھائیوں، بھتیجوں اور ان کے ہم نواؤں کو، جن سے کسی وقت بھی مخالفت یا بغاوت کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا، سب کو ایک ایک کر کے ٹھکانے لگا دیا، تاہم اس کا اکتیس (۳۱) سالہ دورِ حکومت بڑے امن و امان کا دور ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ قتل و خوں ریزی عام طور سے بادشاہوں کی فطرت میں داخل رہی ہے اور ہر ایسا شخص ان کے نزدیک معتوب یا کم از کم مشکوک قرار پایا ہے، جس کی نقل و حرکت کو وہ اپنے مخصوص مفاد کے منافی سمجھتے تھے۔ پھر اس کا فیصلہ یا تو ان کی تلوار کرتی تھی یا عمر بھر کی سزائے زنداں ____! شاہ جہان نے بھی اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اسی فضا میں تربیت کی منزلیں طے کی تھیں۔ اگر اس نے اپنے رشتے داروں اور عزیزوں پر سختی کا برتاؤ کیا ہے تو انہی اثرات کے تحت کیا جو اسے خاندانی طور پر وراثت میں ملے تھے۔ اس کی تفصیلات سے کتب تاریخ بھری پڑی ہیں۔ اب بھی حکمران اس پرانی روایت پر عمل پیرا ہیں۔ اپنے سے اختلاف کرنے والوں پر مختلف مقدمے قائم کرتے ہیں، انھیں جیلوں میں ڈالتے ہیں، اقتدار سے دور رکھنے کے لیے ان پر کئی قسم کے الزامات عائد کرتے ہیں، انھیں پھانسیاں دیتے ہیں، لیکن یہ سب باتیں ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہمارا کام شاہ جہاں کے دورِ حکمرانی کے صرف علمی اور دینی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اپنے عصر کے علماء و فقہا اور مشائخ و صلحا سے اس کے روابط کس قسم کے تھے۔ اس نے اپنے زمانۂ حکومت میں کون سی ایسی اصلاحات کیں جو اسلامی احکام سے ہم آہنگ تھیں، کن غیر اسلامی رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اہل علم کو کس قدر و منزلت کا مستحق گردانا۔ آیئے اب خاندانِ مغلیہ کے پانچویں فرماں روائے ہند صاحبِ قران ثانی سلطان ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہ جہان کے کاروان حیات کے اس پہلو کا جائزہ لیں کہ ہمارا اصل موضوع یہی ہے۔

اعیان دولت اور عمال حکومت کے نام فرمان:

شاہ جہان زمانۂ شہزادگی میں بھی نیک خصال اور خوش اطوار تھا۔ پابند شریعت اور عامل کتاب و سنت تھا۔ علما و مشائخ کی صحبتوں میں بیٹھتا اور ان سے استفادہ کرتا بلکہ صحیح روایت کے مطابق وہ حضرت مجدد الف

Marfat.com

ثانی کے حلقۂ عقیدت میں داخل تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد اس کی ان خوبیوں میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ یہ کوشش کرتا کہ کوئی قدم کتاب وسنت کے خلاف نہ اٹھے۔ اس کی یہ خواہش ہوتی کہ نہ وہ ذاتی طور پر مرتکب معصیت ہو اور نہ رعایا کو اس کے طرزِ عمل سے کوئی تکلیف پہنچے۔ وہ ہرگز برداشت نہ کرتا تھا کہ اعیان دولت اور عمالِ حکومت میں سے کوئی کسی کے لیے اذیت رسانی کا باعث بنے۔ وہ حکومت کے ہر محکمے سے تعلق رکھنے والوں کو کتاب و سنت پر عامل دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ چترِ شاہی سر پر رکھتے ہی اس نے ہر صوبے کے قضاۃ‘ ارکانِ دولت اور عمالِ حکومت کے نام خطوط لکھے کہ حدود واحکام نوامیسِ الٰہی کا ہر حال میں لحاظ رکھا جائے اور کما حقہ‘ اس پر عمل کیا جائے۔ شریعت کے اوامر ونواہی کی اسی طرح پابندی کی جائے جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ہدایت فرمائی ہے۔ دین اسلام کے بارے میں ادب و اکرام اور تعظیم و احترام کے تمام تقاضوں کو ہر لحہ پیش نگاہ رکھا جائے۔ اس سلسلے میں کسی نوع کی گستاخی یا سوئے ادب کا ہرگز مظاہرہ نہ کیا جائے۔ مشتبہ چیزوں سے دامن کشاں رہا جائے۔ دین میں بے راہ روی اور بے اعتدالی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ وہ امور جو بظاہر ناپسندیدہ اور مکروہ ہیں یا جن میں کسی قسم کا اشتباہ پایا جاتا ہے یا جو افعال اصحابِ بدعت کے اوضاع واطوار سے ہم آہنگ ہیں‘ ان سے بہرصورت اپنے آپ کو محفوظ اور دور رکھا جائے۔ اکثر لوگوں نے بدعات کی متعدد اقسام کو اپنا رکھا ہے‘ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ انھیں کلی طور پر ترک کر دیں۔

اس سے آگے محمد صالح کنبو لکھتا ہے:

المنۃ للہ تعالیٰ و تقدس کہ اعلیٰ حضرت ظلِ سبحانی صاحب قران ثانی از مبداء احوال فرخندہ فال تا الحال‘ بروفق احکام کتاب و سنت اطاعت و طاعت پیشہ کردہ اند‘ و طریقہ مطابعت پیروی حضرت رسول ﷺ پیش گرفتہ ❶۔

(یعنی شاہ جہان بادشاہ نے شروع ہی سے اپنی زندگی کو کتاب وسنت کے احکام کے قالب میں ڈھالا اور اسی روش کو اپنایا‘ جو مبنی بر اسلام تھی۔ اس کا طریقہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی تھا۔)

اس پابند شریعت بادشاہ کے عہد میں برصغیر میں اسلام کو بڑی تقویت پہنچی اور بدعات ومحدثات کا زور ٹوٹا۔ سجدہ تعظیمی جو پہلے سے بادشاہ کے لیے مروج تھا‘ موقوف ہوا۔ مقدمات کے فیصلے شرع اسلامی کے مطابق ہونے لگے اور علما و مشائخ کی قدر ومنزلت میں بے حد اضافہ ہوا۔ اس نے جن امور خیر کی ترویج کی اور جن غلط رسوم کا خاتمہ کیا‘ محمد صالح کنبو لکھتا ہے کہ ان میں سے

”نہی سجدہ تعظیم است کہ از عہد حضرت عرش آشیانی مقرر و معہود شدہ بود ❷۔

❶ عمل صالح‘ ج ا‘ ص ۲۱۴

❷ عمل صالح‘ ج ا‘ ص ۲۱۵

Marfat.com

(یعنی ایک سجدہ تعظیمی ہے جو حضرت عرش آشیانی اکبر کے زمانے سے رائج تھا شاہ جہان نے اس سے لوگوں کو منع کر دیا۔)

خافی خاں اس سلسلے میں تفصیل سے کام لیتا ہے۔ وہ بہت سی اور چیزوں کا ذکر بھی کرتا ہے جو پہلے سے رواج پذیر تھیں اور بادشاہ شاہ جہان نے ان سے روک دیا۔ وہ کہتا ہے کہ شاہ جہان نے ملک کی زمام اختیار ہاتھ میں لیتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ بعض نامشروع امور کا سدباب کیا۔ مثلاً بادشاہ کی خدمت میں حاضری کے وقت یا اس کے پانی نوش کرتے وقت یا کوئی چیز عنایت کرتے وقت سجدہ کرنا ضروری تھا' شاہ جہان نے اس غلط رسم کو ختم کر دیا۔ اس نے زمین بوس ہونے کے بجائے چار مرتبہ سلام کہنے کا حکم جاری کیا۔ علما و فضلا' اصحاب کمال اور ارباب حال اور فقرا سے کہا کہ وہ بادشاہ سے ملاقات کے لیے آئیں تو صرف سلام مسنون یعنی السلام علیکم کہیں۔ رخصت کے وقت سورہ فاتحہ پڑھیں۔ اس نے رائج الوقت سکے' روپے اور اشرفی کے ایک طرف کلمہ توحید اور خلفائے راشدین کے نام کندہ کرانے اور دوسری طرف اپنا نام لکھنے کا حکم جاری کیا۔ اپنے والد گرامی نورالدین جہاں گیر بادشاہ کے نام ساتھ ''جنت مکانی'' کا لقب تحریر کرنے کا حکم دیا اور سن جلوس اکبری الٰہی اور سن شمسی کے بجائے ماہ قمری اور سال ہجری لکھنے کا فرمان جاری کیا[1]۔

پابندیٔ نماز اور وظائف و اوراد:

شاہ جہان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ جہاں گیر کے مرتبے کا عالم تو نہ تھا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برصغیر کا یہ حکمران بڑا نیک' خدا ترس' پرہیزگار اور علم پرور بادشاہ تھا۔ علما سے اس کے گہرے مراسم تھے اور وہ ان کی بدرجہ غایت عزت کرتا تھا' صوفیا و اتقیا سے اس کو بے پناہ محبت تھی۔ اس نے اپنے دور میں اسلام اور علم کی جو خدمت کی' اس سے قبل کسی مغل حکمران کو اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے اپنے اوقات شب و روز کو مختلف امور کی انجام دہی کے لیے باقاعدہ تقسیم کر رکھا تھا۔ اس میں سے ایک بڑا حصہ یاد خدا اور نماز کے لیے وقف تھا۔ ''عمل صالح'' کے درباری مصنف محمد صالح کنبو نے جن الفاظ میں اس کی تفصیل بیان کی ہے' ان کا ترجمہ یہ ہے۔

شاہ جہان نہایت عمدہ اوصاف کا حامل بادشاہ تھا۔ اس کے اوقات غفلت اور بے پروائی سے پاک اور غلط امور سے مبرا تھے۔ اس نے اپنے اوقات لیل و نہار کو اس انداز سے منقسم کر رکھا تھا کہ طلوع فجر سے دو گھڑی پیشتر بیدار ہو جاتا اور اللہ کے ذکر میں مصروف ہو جاتا۔ یہ وہ وقت ہے' جو اللہ کی رضا کے لیے مخصوص ہے اور اس میں عبادت الٰہی بہت بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ جو شخص اس وقت اپنے معبود حقیقی کو پکارتا ہے'

---

[1] منتخب اللباب حصہ اول' ص ۳۹۷

Marfat.com

اللہ اس کی دعا کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔ اس مبارک ساعت میں بادشاہ اس مسجد میں چلا جاتا جو اکبر آباد (آگرہ) کے ایک کونے میں تعمیر کی گئی تھی۔ نماز کے وقت تک وہ قبلہ رو ہو کر مصلے پر بیٹھا رہتا اور اللہ کی عبادت کرتا۔ (وروی توجہ بمسجد ے کہ درخلوت گاہ خطۂ اکبر آباد تعمیر پذیر رفتہ آوردہ تارسیدن وقت نماز رو بقبلہ بر سجادۂ طاعت می نشیند۔) نماز فجر کا وقت ہو جاتا تو پہلے دو رکعت سنت ادا کرتا' پھر باجماعت فرض پڑھتا۔ بعدازاں اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتا❶۔ اس سے فارغ ہوتا تو کاروبار سلطنت کی طرف عنان توجہ مرتکز کرتا۔ عمال حکومت کو ضروری مشورے دیتا اور ان کے مفوضہ فرائض کی انجام دہی کے بارے میں احکام صادر کرتا۔ فوج کا معائنہ کرتا اور اہل کاروں کے نام احکام و ہدایات جاری کرتا۔ ظہر کے وقت تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ ظہر کی نماز باجماعت مسجد میں پڑھتا۔ کھانا کھاتا اور قیلولہ کرتا❷۔ عصر کی نماز بھی جماعت کے ساتھ پڑھتا❸۔ علما کی مجلس منعقد کرتا اور پیش آمدہ مسائل کے بارے میں ان سے مشورے لیتا۔ مغرب کی نماز کے بعد اس کا وقت دینی اور دنیوی امور میں صرف ہوتا۔ (بعداز انقضائے وقت مغرب اوقات اشرف بکار دین و دنیا صرف می نمائیند❹۔ نماز عشا جماعت کے ساتھ ادا کرتا اور پھر محل میں چلا جاتا۔ (نماز عشا بجماعت ادا نمودہ بمحل تشریف می بردند۔❺)

شاہ جہان جب خواب گاہ میں جاتا' وہ دن کا وقت ہوتا یا رات کا' فصیح البیان اور شیریں کلام لوگ اس کے ساتھ ہوتے' جو اسے کتب سیر و تواریخ سے انبیا و اولیا' صحابہ و تابعین' ملوک و وزرا' حکما و علما اور عظیم المرتبت حضرات کے واقعات و حالات سناتے۔ گزشتہ بادشاہوں کے دستور العمل سے بھی اسے آگاہ کرتے۔ یہ واقعات وہ پردے کے پیچھے بیٹھ کر بیان کرتے۔ (درپس پردہ خواب گاہ❻) اس کا مطلب یہ ہے کہ محل کی خواتین بھی یہ باتیں سنتی تھیں۔

شاہ جہاں کا درباری مورخ عبدالحمید لاہوری تو اس کے تدین و تقوی کی انتہائی تعریف کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ وہ ہر وقت باوضو رہتا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

''اوقات شبا روزی آں قدوہ اصحاب طہارت بوضوی گزرد❼۔

❶ عمل صالح' ج ۱' ص ۲۰۱' ۲۰۲
❷ ایضاً' ص ۲۰۷
❸ ایضاً' ص ۲۰۸
❹ ایضاً
❺ ایضاً' ص ۲۰۹
❻ عمل صالح' ج ۱' ص ۲۰۹
❼ بادشاہ نامہ' ج ۱' ص ۱۳۷

Marfat.com

وہ مزید لکھتا ہے:۔

درادائے صلوٰۃ وصیام مکتوبہ بہ نہجے کہ در کتب فقہیہ حنفیہ واقع شدہ نہایت اہتمام بہ کار می دارند ❶۔

(وہ فرض نماز روزہ اسی طریقے سے اہتمام کے ساتھ ادا کرتا تھا' جس طرح کہ فقہ حنفیہ کی کتابوں میں مرقوم ہے۔)

عدل وانصاف:

دودمان مغلیہ کا یہ بادشاہ نہایت عادل اور منصف تھا۔ اس کے عہد میں ملک کے تمام صوبوں میں امن وامان قائم تھا۔ کسی صوبے یا علاقے کے عامل اور اہل کار کو کسی شخص پر ظلم وتعدی کی جرات نہ تھی۔ اور کسی مجرم کو سزا سے بچنا ممکن نہ تھا۔ بادشاہ عدل وانصاف کا دلدادہ تھا۔ رعایا خوش حال تھی اور کوئی کسی کو ہدف ستم نہ ٹھہرا سکتا تھا۔ جمیع خلائق کہ ودیعت کبریٰ خالق اند در مہد امن وامان مرفہ الحال باشند ❷۔

محمد صالح کنبوکی طرح ''بادشاہ نامہ'' کا مصنف عبدالحمید لاہوری بھی شاہ جہان کا درباری مورخ تھا۔ وہ اس کی انتہائی تعریف کرتا ہے۔ اس کی پابندیٔ شریعت اور نیکی کا زوردار الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے۔ ایک مقام پر لکھتا ہے:

سنت سنیہ الٰہی براں جاری است کہ ہرگاہ کار دین رو بہ اندراس نہد وشعار اسلام رخ بہ انطماس۔ بتائید ایزدی یکے از بندگانِ سعادت اندوز بروئے کار اید تا بہ آبیاریٔ مساعی جمیلہ گرد فتور از ساحت اسلام فرونشاند و بدستیاریٔ دین پروری ودیانت وری اساس شریعت را مشید گرداند' وچوں معابد اسلام رو بہ انہدام نہادہ بود ومبانی شریعت رخ بہ انعدام' ایزد کارساز وایں بادشاہ اسلام نواز کفر گداز را اورنگ آرائے اقبال گردانید۔ بنیادِ اسلام راچناں محکم ومرصوص ساخت کہ تا روزِ نشور گرد فتور بردامن دوام نہ نشیند ❸۔

(اللہ کا یہ قانون برابر جاری وساری ہے کہ جب احکام دین رو بزوال ہو جائیں اور شعار اسلام محو ہونے لگیں تو تائید ایزدی حرکت میں آتی ہے اور بندگان سعادت اندوز میں سے کوئی ایسا بندہ ظہور میں آجاتا ہے جو اپنی مساعی جمیلہ سے اسلام کے رخ انور پر مختلف فتنوں کی پڑی ہوئی گرد وغبار کو صاف کر دیتا ہے اور اساس شریعت کو مستحکم ومضبوط بنانے کے فرائض انجام دیتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں بھی جب معابد اسلام منہدم ہونے لگے اور شریعت کی بنیادیں ہلنے لگیں تو نصرت خداوندی نے اس اسلام نواز اور کفر گداز بادشاہ کو تخت

❶ عمل صالح' ج ۱' ص ۱۳۷

❷ عمل صالح' ج ۱' ص ۱۳۷

❸ بادشاہ نامہ' ج ۱' ص ۱۳۸

Marfat.com

حکمرانی عطا فرمایا' جس نے اسلام کی بنیاد کو اس طرح محکم و مرصوص بنا دیا کہ تا روز قیامت اس کے دامن تک فتنہ وفتور کی گرد نہیں پہنچ سکے گی۔)

یہ شاہ جہان کے ایک درباری مورخ کے الفاظ ہیں' جو اس میں ایک ''مجدد دین'' کے اوصاف کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ الفاظ یقیناً مبالغے سے خالی نہیں' کیوں کہ درباری مورخ اور شاہی مصنف' حکمرانوں کے لیے ہمیشہ اسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے آئے ہیں۔ اب بھی حکومتوں کے ترجمان سربراہانِ مملکت کے لیے بہت سے تعریفی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہ جہان بحیثیت مجموعی اونچے کردار کا بادشاہ تھا۔ نماز روزے کا پابند اور اسلام کی ترقی کا خواہاں تھا۔ دینی احکام و اوامر پر خود بھی کاربند رہتا اور ارکانِ دولت کو بھی اس کا پابند دیکھنا چاہتا تھا۔ ملک کی مضبوطی اور رعایا کی خوش حالی اس کا مطمحِ نظر تھا۔ علما و مشائخ کا قدردان تھا۔ ملک کے دور دراز حصوں سے بھی اگر اس کے علم میں یہ بات آجاتی کہ وہاں بدعات و محدثات اور خلاف شرع رسوم وعوائد نے قدم جما لیے ہیں تو ان کو ختم کرنے کی کوشش کرتا اور اپنی قلمرو سے غلط چیزوں کو مٹانے میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتا۔ چند واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں' جن سے واضح ہوتا ہے کہ وہ واقعی ''بادشاہ دین پناہ'' تھا۔ غیر اسلامی امور کا قلع قمع کرنا اور اسلام کی ترقی کے ذرائع بروئے کار لانا اس کے مقاصد حیات میں داخل تھا۔

ایک نہایت قبیح رسم کا خاتمہ:

خدمت شاہی میں عرض ہوا کہ علاقہ بھمبر ❶ کے مسلمان اپنی جہالت کی بنا پر ہندوؤں کو لڑکیاں دیتے اور ان سے لڑکیاں لیتے ہیں۔ ان کے درمیان یہ طے پایا ہے کہ جو ہندو لڑکی اپنے مسلمان سسرال میں مرے وہ دفن کی جائے اور جو مسلمان لڑکی ہندوؤں کے گھر فوت ہو' اسے جلایا جائے۔ اس اطلاع پر دربار شاہی سے یہ حکم ہوا کہ جس ہندو کے گھر میں مسلمان عورت ہو' اگر وہ ہندو اسلام قبول کر لے تو اس مسلمان عورت سے اس کا نکاح دوبارہ پڑھا جائے۔ ورنہ مسلمان عورت کو اس سے الگ کر دیا جائے۔ چنانچہ ''جوکو'' نام کا ایک زمیندار جس سے یہ فعل سرزد ہوا' اپنے تمام قبیلے کے ساتھ مسلمان ہوا' اور اسے ''راجا دولت مند'' کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ بادشاہ نے اس رسم قبیح کو ختم کرنے کا حکم دیا اور مسلمانوں کی جہالت دور کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے قاضی اور معلم مقرر کیے تاکہ وہاں احکام شریعت پر عمل کیا جائے اور شرعی عبادات انجام دینے کے صحیح طریقے بروئے کار لائے جائیں ❷۔

❶ یہ علاقہ اب آزاد کشمیر میں واقع ہے۔

❷ بادشاہ نامہ' ج ۲' ص ۵۷

Marfat.com

ہندوؤں کے قبضے سے مسلمان عورتوں کی رہائی اور مساجد کی واگزاری:

گزشتہ واقعہ کی طرح کا ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو:

جب بادشاہ کی سواری پنجاب کے قصبہ گجرات میں پہنچی تو وہاں کے سادات و مشائخ نے عرض کیا کہ یہاں کے بعض ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کو اپنے گھروں میں ڈال رکھا ہے۔ (ان کے الفاظ یہ ہیں: برخے از کفار نابکار حرائر و امائے مومنہ در تصرف دارند) اور ان میں سے بعض تو یہاں تک سرکشی پر اتر آئے ہیں کہ انھوں نے مسجدوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس پر بادشاہ نے شیخ محمد گجراتی کو جو علوم رسمیہ کے عالم اور نو مسلموں کے داروغہ تھے، حکم دیا کہ واقعہ کے ثبوت کے بعد مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضے سے آزاد کرائیں اور مسجدوں اور غیر مسلموں کی عمارتوں کو علیحدہ علیحدہ کرائیں۔ چنانچہ شیخ مذکور نے ستر مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضے سے نکالا اور جہاں جہاں ہندوؤں نے مسجدوں پر ناجائز تصرف کر رکھا تھا، تحقیق کے بعد انھیں واگزار کرایا، اور غیر مسلموں سے جرمانہ وصول کرنے کے بعد مسجدوں کو بحال کیا❶۔

صوبہ کابل کی ایک انتہائی مذموم رسم ختم کرنے کا حکم:

صوبہ کابل سے آمدہ خبروں اور وہاں کے گورنر لشکر خاں کی اطلاع سے پتا چلا کہ افغان آئین شرع کی بالکل پیروی نہیں کرتے۔ بلکہ انھوں نے ایک گمراہ پیر کے احکام کو (نعوذ باللہ) آیت و حدیث کا درجہ دے کر ملحدوں کے سے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ وہ بیویوں سے شرعی طور پر نکاح نہیں کرتے، بلکہ ایک گائے یا بیل ذبح کر کے اپنے ہم مشربوں کی ضیافت کرتے ہیں اور اس کے بعد بغیر کسی عقد نکاح کے ازدواجی تعلقات شروع کر دیتے ہیں۔ عورت کو طلاق دینا مقصود ہو تو وہ تین سنگریزے عورت کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور اس کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ بیوہ عورتیں ان کے رواج کے مطابق ترکے میں داخل ہیں اور میت کے وارث کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ چاہے تو ان سے نکاح کر لے اور چاہے کسی کو ہبہ یا فروخت کر دے۔ جو بدنصیب مسافر اس سرزمین میں جا پہنچتا ہے، اسے یہ لوگ حلال شکار قرار دیتے ہیں اور اسے فروخت کر کے آمدنی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یہ لوگ میت کے ورثے میں سے بیٹیوں کو حصہ نہیں دیتے اور قتل و انتقام اور رہزنی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کو بہت بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد بادشاہ کی طرف سے حکم ہوا کہ ''احکام تورہ و شریعت'' کے مطابق ان لوگوں کو زجر و تنبیہ کی جائے۔ چنانچہ بڑی سختی کے بعد جس میں کئی مرتبہ فساد اور بلوے تک نوبت آئی، آہستہ آہستہ ان لوگوں کی بدعتیں کم ہوئیں، لیکن بالکل رفع پھر بھی نہ ہوئیں۔ خافی خاں اس واقعہ کے پانچ سال بعد لکھتا ہے: چنانچہ تاحال آثار آں بدعتہائے مذموم دراں قوم باقیست ❷۔ یعنی اب بھی ان مذموم بدعتوں کے آثار اس قوم میں باقی ہیں۔

---

❶ شاہنامہ، ج ۲، ص ۵۷، ۵۸

❷ منتخب اللباب، حصہ اول، ص ۴۲۳، ۴۲۴۔

Marfat.com

ہگلی کے فرنگیوں کی گوشمالی:

آج سے کم وبیش ستر (۷۰) سال پیشتر ملک کی ارائیں برادری کے ترجمان ہفت روزہ ''(الراعی'' (لاہور) میں ''پابندیٔ شریعت اور شاہ جہاں'' کے عنوان سے پروفیسر علم الدین سالک مرحوم کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے شاہ جہان کی اسلامی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ''بادشاہ نامہ'' کی جلد اول کے حوالے سے ہگلی کے فرنگیوں سے متعلق ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ پروفیسر صاحب مرحوم لکھتے ہیں:۔

۱۰۴۲ھ/۱۶۳۳ء میں ہگلی کے فرنگیوں نے بنگال میں بڑا اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ نہ صرف وہاں کے سیاسی معاملات میں مداخلت کرتے تھے بلکہ لوگوں کو زبردستی عیسائی بھی بناتے تھے اور اپنے مذہب کی تبلیغ میں بے حد سختی سے کام لیتے تھے۔ دولت کا لالچ دے کر لوگوں کو ورغلاتے اور مسلمانوں کے ساتھ نہایت برا سلوک روا رکھتے تھے۔ یہ حالات شاہ جہان کے علم میں شہزادگی کے زمانے میں آئے تھے' اور جیسا کہ عمل صالح اور بادشاہ نامہ سے معلوم ہوتا ہے' شاہ جہان اسلام کا جھنڈا بلند کرنے اور کفر کو مٹانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے عزم کر لیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے بادشاہ بنا دیا تو وہ ان دیار کو ان گمراہ لوگوں سے ہمیشہ کے لیے پاک کر دے گا۔ چنانچہ تخت نشینی کے بعد جب اسے موقع ملا تو اس طرف توجہ مبذول کی اور ہگلی کے نصرانیوں سے ان کے غیر آئینی رویے کے بارے میں باز پرس کی۔ اس نے ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ھ میں تربیت خاں کو تحقیق حالات کے لیے بنگال بھیجا۔ مگر ہگلی کے فرنگیوں نے مصالحت کی طرف ہاتھ بڑھانے کے بجائے فسادات کو دعوت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک معمولی جھڑپ کے بعد ان کا سارا زور ٹوٹ گیا اور بہت سے فرنگی قید کر لیے گئے۔ یہ فرنگی ۱۱ محرم ۱۰۴۳ھ/ ۸ر جولائی ۱۶۳۳ء کو عنایت اللہ' قاسم خاں اور بہادر خاں کمبو کی نگرانی میں بنگالہ سے پایۂ تخت (آگرہ) میں لائے گئے۔ ان کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ ان کے پاس بت بھی تھے' جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ یہ سب لوگ بادشاہ کے حضور پیش کیے گئے۔ بادشاہ نے ارباب شریعت کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ انھیں اسلام کی دعوت دی جائے اور اسلامی احکام سے روشناس کرایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے تو اسلام قبول کر لیا مگر زیادہ افراد نے انکار کر دیا۔ جن لوگوں نے انکار کیا تھا' انھیں اس زمانے کے آئین کے مطابق امرائے دولت میں تقسیم کر دیا گیا۔

بدعات کا خاتمہ اور ٹیکسوں کی معافی:

۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء کو شاہ جہان کشمیر گیا۔ اس زمانے میں وہاں کا ناظم اعتقاد خاں تھا۔ بادشاہ کو معلوم ہوا کہ اعتقاد خاں رعایا پر بے حد جبر و تشدد کر رہا ہے۔ اس نے ملک میں بہت سی بدعتیں جاری کر رکھی ہیں' پھل دار درخت ضبط کر لیے ہیں' باغ اور جنگل اپنی تحویل میں لے لیے ہیں' زعفران کی چنائی میں لوگوں سے بیگار لیتا

Marfat.com

اور انھیں پریشان کرتا ہے۔ یہ باتیں سن کر شاہ جہان نے اعتقاد خاں کو منصب نظامت سے علیحدہ کر دیا اور اس کی جگہ ظفر خاں احسن کو کشمیر کا ناظم مقرر کیا اور حکم دیا کہ اعتقاد خاں پر الزامات کی فہرست تیار کر کے پیش کی جائے۔ جب فہرست الزامات سامنے آئی تو بادشاہ نہایت حیران اور خفا ہوا۔ اس نے اعتقاد خاں کے زمانے کی رائج کردہ تمام بدعات منسوخ کر دیں اور عوام کی آگاہی کے لیے ایک فرمان تیار کیا' جس کے الفاظ پتھر پر کندہ کیے گئے اور اسے جامع سکندری کے دروازے پر نصب کیا گیا۔ یہ فرمان شاہ جہان کی معدلت گستری' رعایا پروری' رحم دلی اور عوام کے حقوق کے تحفظ کی بیّن دلیل ہے۔ اس کے ابتدائی الفاظ قابل مطالعہ ہیں جو درج ذیل ہیں:

''ہماری سلطنت کا مقصد خلق خدا کی حاجت روائی ہے۔ علاقہ کشمیر میں بعض اس قسم کے امور کا ارتکاب ہو رہا تھا جو رعایا کے لیے موجب آزار اور باعث تکلیف تھے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ ان تمام امور کو منسوخ سمجھا جائے۔''

۱۔ اس فرمان کی رو سے زعفران چننے کے لیے لوگوں سے جو بیگار لی جاتی تھی' وہ حکماً بند کر دی گئی اور حکم ہوا کہ آئندہ سے مناسب اجرت پر مزدوروں سے کام لیا جائے۔

۲۔ رعایا کے لوگ سرکاری جنگلات سے ایندھن کاٹا کرتے تھے' اس کے لیے انھیں دو درم کے خردار دینا پڑتے تھے۔ اعتقاد خاں نے یہ رقم دگنی کر دی تھی۔ اب یہ ٹیکس بالکل معاف کر دیا گیا ہے۔

۳۔ اعتقاد خاں کے دور نظامت میں مانجیوں کو' وہ بوڑھے ہوں یا جوان' یا کم سن بچے' پچھتر (۷۵) درم سالانہ ادا کرنا پڑتے تھے' حالانکہ اس سے پہلے مانجیوں کے درمیان عمر کا امتیاز تھا۔ جوانوں سے ساٹھ' بوڑھوں سے بارہ اور بچوں سے چھتیس درم لیے جاتے تھے۔ شاہ جہان نے اعتقاد خاں کے اس نئے ٹیکس کو موقوف کر کے پہلا طریقہ بحال کر دیا۔

۴۔ ارض کشمیر کے ان دیہات کو جن کی شال کی پیداوار چار سو خردار سے زیادہ تھی' اور جن سے اعتقاد خاں ٹیکس وصول کرتا تھا' انھیں ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

۵۔ کشمیر کے صوبے دار (گورنر) ان افراد کو ملازم رکھتے تھے' جو لوگوں کے باغات میں جاتے اور بہترین پھلوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ جس باغ میں اچھا پھل دیکھتے' اسے صوبے دار کے لیے محفوظ کر لیتے۔ اس ظلم کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے پھلوں کی کاشت بند کر دی۔ اب اس سلسلے کو حکماً بند کر دیا گیا' کوئی ناظم اور گورنر اس حرکت کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا❶۔

پروفیسر علم الدین سالک مرحوم کے ستر (۷۰) سال پیشتر کے تحریر کردہ مضمون کی رو سے شاہ جہان کا یہ فرمان اب تک کشمیر کی جامع سکندری کے دروازے پر نصب ہے اور اس کے عدل و انصاف کی شہادت دے رہا ہے۔

❶ منتخب اللباب' ج ۱ ص ۱۵۰۔ عمل صالح' ج ۲' ص ۶۴۔ بادشاہ نامہ' ج ۱ حصہ دوم' ص ۵۷' ۵۸

Marfat.com

بادشاہ کا فرض:

شاہ جہان قدیم بادشاہوں کے واقعات سننے اور پڑھنے کا بہت شائق تھا۔ وہ ان کے غلط واقعات سے عبرت حاصل کرتا اور صحیح واقعات کو اپنے لیے مشعل راہ قرار دیتا۔ جب اس کے سامنے سلاطین روم، شاہان قزلباش، ملوک ایران اور فرماں روایان توران کے واقعات بیان کیے جاتے تو وہ لرز اٹھتا اور اس کے چہرے پر خاص قسم کے تاثرات نمایاں ہو جاتے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کسی بادشاہ کی کمزور رعایا اطمینان اور امن سے زندگی نہیں بسر کر سکتی تو وہ بادشاہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے۔ حکومت کا منصب جلیلہ اس سے چھین لینا چاہیے، وہ اس کا حق دار نہیں ہے۔ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ رعایا کے ہر پہلو پر نظر رکھے اور ان کے حقوق کی پوری پوری نگاہ داشت کرے۔

اللہ کی عبودیت کا اقرار:

پروفیسر علم الدین سالک نے اپنے مطبوعہ مضمون (الراعی) ''لاہور میں شیر خاں لودھی کی ''مرآۃ الخیال'' (صفحہ۴) کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب شاہ جہان کا تخت طاؤس تیار ہو گیا اور وہ اس پر بیٹھا تو فوراً نیچے اتر آیا۔ خشوع وخضوع سے دو رکعت نفل ادا کیے اور دیر تک سجدے میں پڑا رہا۔ سجدے سے سر اٹھایا تو حاضرین دربار سے مخاطب ہو کر کہا۔

''فرعون کا تخت آبنوس اور ہاتھی دانت کا تھا۔ اس نے اس پر بیٹھ کر خدائی کا دعویٰ کیا۔ اے حاضرین دربار! تم اس پر گواہ رہنا کہ میں اس مرصع تخت پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا اقرار کرتا ہوں۔''

شاہ جہان کی زندگی کے اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں، جو عمل صالح، بادشاہ نامہ، منتخب اللباب اور دیگر کتبِ تاریخ میں مرقوم ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اس عادل اور دین پناہ بادشاہ کے اکتیس سالہ دور حکومت میں پھیلے ہوئے مزید واقعات حوالہ قرطاس کیے جائیں مگر تنگ دامانی صفحات بار بار قلم کا دامن کھینچتی اور تفصیلات کی وادی میں جانے سے روکتی ہے۔

دور شاہ جہان کے علما و مشائخ:

دور شاہ جہانی میں متعدد علما و مشائخ اور فقہائے عظام دیار ہند میں رونق افروز تھے اور مختلف بلاد و قصبات میں ان کے درس و افادہ کی مسندیں آراستہ تھیں۔ اس کتاب میں بہت سے مقامات پر ان کا تذکرہ قارئین کرام کے مطالعہ میں آئے گا۔ شاہ جہان کے وزرا میں بھی جید علما شامل تھے، جن میں ایک علامی محمد افضل تھے، جو معقولات و منقولات کے جلیل القدر عالم تھے اور معاملاتِ سلطنت میں بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ شاہ

Marfat.com

جہان ان پر بڑا اعتماد کرتا تھا اور وہ فطانت و فراست میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان کے بعد علامی سعد اللہ خاں چنیوٹی کو اس منصب رفیع پر فائز کیا گیا۔ وہ بھی خطۂ ہند کے وسیع العلم بزرگ تھے اور ان کے علوم و معارف کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ معقول و منقول کی تفصیلات و جزئیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ فراوانی علم و فضل کے ساتھ ساتھ انتظام مملکت اور جنگ و حرب کا بھی وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ یورپین مورخین بھی ان کی تعریف پر مجبور ہیں، چنانچہ انفسٹن لکھتا ہے کہ ''ہندوستان میں جتنے وزرا گزرے ہیں، سعد اللہ خاں ان سب سے زیادہ لائق اور راست باز تھا''

بہر حال عہد شاہ جہانی کے علمائے کرام کی وسیع فہرست میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں:

شیخ میاں میر محمد سیوستانی لاہوری، سید محمد بخاری، شیخ بلاول قادری، مولانا محبّ علی سندھی، خواجہ خاوند محمود، ملا خواجہ بہاری، شیخ صادق برہان پوری، میاں شیخ پیر محمد، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مفتی نورالحق دہلوی، میر شکر اللہ شیرازی، علامی سعد اللہ خاں، ملا شفیعائی یزدی، ملا محمد فاضل بدخشی، مولانا عبدالسلام لاہوری، علامہ محمود جون پوری، مولانا عبداللطیف سلطان پوری لاہوری، مولانا محمد یعقوب لاہوری، مولانا عوض وجیہ سمرقندی، مفتی عبدالسلام دیوی، مولانا ابوالفتح ملتانی۔

شجاعت اور فتوحات:

تیمور کے خون میں شجاعت کی گرمی کے اثرات نمایاں طور سے نظر آتے ہیں۔ شاہ جہان اس وراثت تیموری کا بہت بڑا حصے دار تھا۔ بابر سے شاہ جہان تک پوری نسل تیموری بہادری اور شجاعت کا مرقع ہے، جس میں کسی ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنا مشکل ہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں بڑی فتوحات ہوئیں۔ اس نے کئی علاقائی سلطنتوں کو مسخر کیا، بہت سے اہم مقامات پر فوج کشی کی اور متعدد نئے صوبوں پر علم مغلیہ لہرایا۔ ان واقعات کی تفصیلات جو تاریخ نے بہم پہنچائی ہیں اگرچہ بڑی تحیر انگیز اور سبق آموز ہیں مگر ہمارے موضوع سے خارج ہیں، اس لیے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔

علمی، ثقافتی اور تہذیبی ترقی:

شاہ جہان کے عہد میں بے شک اکبر کی طرح سرکاری اہتمام میں کتابوں کی تصنیف و تراجم کی طرف توجہ نہیں دی گئی، مگر علما نے اپنے طور پر بہت کتابیں لکھیں اور بے حد علمی کام کیا۔ بہت سے حواشی و تعلیقات شاہ جہان کے نام معنون کیے اور اس میں اس نے علما کی بے حد حوصلہ افزائی کی۔ پھر خود اس نے جو ثقافتی اور تہذیبی

Marfat.com

نقوش برصغیر کی سرزمین میں ثبت کر دیے وہ ہمیشہ اس کی رفعت ذہن و فکر کی شہادت دیتے رہیں گے- مثلاً آگرے کا تاج محل، دہلی کی جامع مسجد، لال قلعہ، تخت طاؤس لاہور کا شالیمار باغ، اس کی ثقافتی اور تہذیبی سر گرمیوں کے عظیم شاہکار ہیں- علاوہ ازیں اس نے اس وسیع خطہ ارض میں بے شمار مسجدیں واگزار کرائیں، ہندوؤں کی نئی عبادت گاہوں کی تعمیر پر موقع و محل کے اعتبار سے نامناسب حد تک پابندیاں عائد کیں اور ان کے غرور و پندار کا زور توڑنے کی کوشش کی، تا کہ اس کے دادا جلال الدین اکبر کے زمانے سے جو سلسلہ چلا آ رہا تھا، وہ اپنے جائز اور مقررہ حدود سے آگے نہ بڑھ پائے-

معزولی اور وفات:

شاہ جہان کو اکتیس سال حکومت کرنے کے بعد شعبان کی آخری تاریخ ۱۰۶۸ھ/ ۲۲ رمئی ۱۶۵۸ء کو تخت فرماں روائی سے الگ کیا گیا اور شروع رمضان میں قلعہ آگرہ کو اس نے اپنا مسکن ٹھہرایا- معزولی سے آٹھ سال بعد دوشنبہ کے روز ۲۶ رجب ۱۰۷۶ھ/ ۲۳ رجنوری ۱۶۶۶ء کو اسی قلعے میں قید حیات سے رہائی پائی- اس کا یہ آٹھ سال کا عرصہ تلاوت قرآن مجید، اوراد و وظائف اور بعض جید علمائے کرام کی صحبت میں گزرا-

شاہ جہان کے آخری دور حیات کا تعلق چوں کہ اس کے بیٹے اورنگ زیب عالم گیر سے ہے، اس لیے اس کے ضروری کوائف ''فقہائے ہند'' کی جلد پنجم کے مقدمے میں اورنگ زیب عالم گیر کے حالات کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں-

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی- ساندہ لاہور

Marfat.com

گیارھویں صدی ہجری

ع

ا- مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی برصغیر پاک وہند کے آسمان علم وفضل کے درخشندہ ستارے تھے۔ انھوں نے مسند تدریس تو عہد جہاں گیری ہی میں آراستہ کر لی تھی لیکن شہرت و ناموری کی منزلیں عہد شاہ جہانی میں طے کیں۔ ان کی تصنیفات کو عالم اسلامی میں نہایت قدر واہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور پونے چار سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کی فضیلت وعظمتِ تحقیق کا جھنڈا آج بھی پوری شان وشوکت کے ساتھ علمی دنیا میں لہرا رہا ہے۔

ولادت:

مولانا ممدوح ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ عہد عالم گیری کے معروف مؤرخ بختاور خان (متوفی ۱۰۹۴ھ) نے مراۃ العالم میں ان کی تاریخ ولادت لفظ حفظ میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''تاریخ تولدش لفظ حفظ گفتہ اند۔'' (ح ۸ ف ۸۰ ظ ۹۰۰) بعض لوگوں نے ۹۶۸ھ بھی تحریر کی ہے' جسے بختاور خاں کے مقابلے میں صحیح نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کیونکہ بختاور خاں مولانا سیالکوٹی کے فرزند مولانا عبداللہ لبیب کے ہم عصر تھے اور انھیں بے حد عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ظاہر ہے انھوں نے مولانا سیالکوٹی کی زندگی سے متعلق معلومات خود مولانا عبداللہ لبیب سے حاصل کی ہوں گی' جنھیں بہر حال صحیح اور مستند مانا جائے گا۔ مولانا عبدالحکیم کے والد کا نام شمس الدین تھا' جیسا کہ عام طور پر وہ اپنی تصنیفات کے شروع میں ان الفاظ میں اس کا ذکر کرتے ہیں:

فیقول العبدالمسکین عبدالحکیم بن شمس الدین۔

Marfat.com

حصول علم:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے مولانا کمال الدین کشمیری سے اخذ علم کیا۔ مولانا کمال الدین کا سلسلۂ درس پہلے کشمیر میں جاری تھا۔ بعد کو سیالکوٹ منتقل ہو گئے تھے اور اسی شہر کو اپنا مرکز درس و افادہ قرار دے لیا تھا۔ مولانا کمال الدین اپنے عصر کے جید اور فحول علما میں سے تھے۔ پیکر زہد و تقوی اور عالم با عمل۔ علوم عقلیہ و نقلیہ پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ مولانا کمال الدین کے زمانے میں کشمیر کا گورنر حسین نامی ایک شخص تھا۔ ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء میں وہ کسی وجہ سے حسین سے ناراض ہو کر سیالکوٹ آ گئے تھے۔ طویل عرصے تک وہاں تدریس و تعلیم میں مصروف رہے۔ باشندگانِ لاہور کو بھی ان کی تدریس سے بہرہ اندوز ہونے کے مواقع میسر آئے اور یہاں بے شمار تشنگان علوم نے ان سے استفادہ کیا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے بھی ان سے تحصیل علم کی اور علامی سعد اللہ خاں نے بھی، جو بعد میں شاہ جہاں کے وزیر مقرر ہوئے، ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ مولانا کمال الدین نے ۱۰۱۷ھ/ ۱۶۰۸ء کو لاہور میں وفات پائی۔ ان کے ایک بھائی مولانا جمال الدین کشمیری تھے، وہ بھی وقت کے صاحب علم اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔

تذکرہ نگاروں نے اگرچہ مولانا کمال الدین کشمیری کے علاوہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے کسی اور استاد کا ذکر نہیں کیا، تاہم بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دیگر اساتذہ سے بھی اخذ علم کیا تھا۔ چنانچہ سید احمد قادری نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے تلامذۂ حدیث کے ضمن میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے رسالہ انسان العین کے حوالے سے لکھا ہے کہ غالباً مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی بھی شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے تلمیذ تھے [1]۔

شاہ ولی اللہ نے اپنی تصنیف "انسان العین فی مشائخ الحرمین" میں اپنے ان بعض اساتذہ کا ذکر کیا ہے، جن سے انھوں نے اسناد حدیث حاصل کیں، ان میں شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی بھی شامل ہیں، ان کے حالات لکھتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

خرقہ و اجازت از بزرگان بسیار گرفت ازاں جملہ شیخ عبداللہ لاہوری، اللبیب۔
ملا عبدالحکیم سیالکوٹی از وے روایت کند۔ عن شیخ عبداللہ اللبیب عن مولانا عبدالحکیم، وکتب شیخ عبدالحق محدث دہلوی بہمیں واسطہ از مولانا عبدالحکیم روایت کند و وے از شیخ عبدالحق اجازۃً وروایۃً [2]۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے اس بیان سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو شیخ

---

[1] تذکرۂ شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۵۸۔

[2] انسان العین فی مشائخ الحرمین۔ ص ۱۹۸، ۱۹۹۔

Marfat.com

عبدالحق محدث دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا' وہاں یہ حقیقت بھی منقح ہو جاتی ہے کہ خود شاہ صاحب بھی مولانا سیالکوٹی کے شجرۂ نسب علمی میں شامل ہیں۔ یعنی ان کی سند علمی اس طرح ہوگی ـــــ شاہ ولی اللہ دہلوی نے شیخ ابوطاہر محمد سے' انھوں نے شیخ عبداللہ لاہوری سے' انھوں نے شیخ عبداللہ لبیب سے اور انھوں نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے تحصیل کی۔

مسند درس وتدریس:

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے لاہور میں مسند درس کو رونق بخشی اور ان کی علمی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچی' جس سے متاثر ہو کر کثیر تعداد میں علما وطلبا ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہونے لگے۔ لالہ سجان رائے بٹالوی ان کے فیضان علم کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

وطلبۂ علم از ممالک دور ونزدیک در مدرسہ متبرکہ ایشاں رسیدہ فیض یاب شدند ❶۔

(یعنی طلبائے علم دور ونزدیک کے ممالک سے ان (مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی) کے مدرسہ مبارکہ میں پہنچتے اور دولت علم سے فیض یاب ہوتے تھے۔)

لاہور کے جس مدرسے میں مولانا نے درس وافادہ کا آغاز کیا' یہ وہی مدرسہ تھا جو مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے قائم کیا تھا اور یہ اس زمانے کا عظیم الشان مدرسہ تھا۔ اس میں مولانا موصوف کا تقرر سرکاری طور پر عمل میں لایا گیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اسی مدرسے کے دور تدریس میں وہ ''فاضل لاہوری'' کے عظیم لقب سے ملقب ہوئے ❷۔ سلم العلوم کے نامور شارح ملا حمد اللہ' ان کا قول پیش کرتے وقت انھیں' قال الفاضل اللاھوری' کے پر شکوہ الفاظ سے یاد فرماتے ہیں ـــــ اس مدرسے میں وہ خاصی مدت مصروف تدریس رہے اور اس اثنا میں ان سے متعدد علما وطلبا نے استفادہ کیا۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹ کے اس مدرسے کی مسند تدریس پر بھی فائز رہے' جس میں ان کے مرحوم استاد مولانا کمال الدین طلبا کو مستفید کرتے رہے تھے۔ مولانا کشمیری کی وہ مسجد جوان کی عظیم دینی درس گاہ تھی' اب بھی سیالکوٹ میں موجود ہے' اور ان کے لائق شاگرد مولانا عبدالحکیم کے مدرسے کے کچھ آثار بھی ہنوز باقی ہیں۔

ایک زمانے میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو اکبر آباد (آگرہ) کے اس سرکاری مدرسے میں مدرس اعلیٰ کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا' جس کی بنیاد جلال الدین اکبر نے رکھی تھی۔ اس مدرسے میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور مشہور شاعر قدسی ایک ہی وقت میں فرائض درس انجام دیتے تھے ❸۔

❶ خلاصۃ التواریخ' ص ۷۳۔

❷ ملاحظہ ہو روضۃ الادبا۔ ص ۱۴۳۔

❸ رود کوثر۔ ص ۳۹۱۔

Marfat.com

عہد جہاں گیری میں:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی علمی شہرت اگرچہ عہد جہاں گیری میں بھی حلقہ اہل علم میں کافی پھیل گئی تھی، مگر اس کا دائرہ محدود تھا، کیوں کہ اس زمانے میں مولانا ممدوح عزلت وانزوا کی زندگی بسر کر رہے تھے اور خاموشی سے خدمت علم میں مصروف تھے۔ سرکاری حلقے ان کی آواز سے آشنا نہ تھے۔ جہاں گیر کے عہد میں ان کا اسم گرامی اس عصر کے فضلا میں تو شامل تھا، جیسا کہ "اقبال نامہ جہاں گیری" میں ان کا نام "ذکر فضلا کہ معاصر زمان اشرف بودند" کے ذیل میں درج ہے، لیکن دارالسلطنت سے دور، سیالکوٹ میں اقامت گزین ہونے کی وجہ سے بادشاہ ان کے مرتبہ علم سے واقف نہ تھا۔ اس کی شہادت عبدالحمید لاہور کے ان الفاظ سے ملتی ہے:

درایام سعادت فرجام حضرت جنت مکانی بضروریاتِ معیشت در ساختہ عزلت گزین بود [1]۔

(یعنی سلطان جہاں گیر جنت مکانی کے عہد حکومت میں وہ اپنی معاشی ضرورتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے عزلت گزین ہی رہے۔)

فرحت الناظرین میں محمد اسلم پسروری نے بھی یہی لکھا ہے کہ جنت مکانی جہاں گیر کے زمانے میں مولانا عبدالحکیم معاشی لحاظ سے قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

درایام جنت مکانی بکم وبیش ساختہ بقناعت می گزرانید [2]۔

عہد شاہ جہان میں:

ہندوستان کے تخت حکومت پر شاہ جہان متمکن ہوا تو مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی قدر ومنزلت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ وہ کئی مرتبہ دہلی گئے۔ بارہا دربارِ شاہی میں پہنچے اور ہر مرتبہ گراں قدر عطایا و ہدایا سے سرفراز ہوئے۔ شاہ جہان ان کی اس درجہ قدر کرتا تھا اور اس کے عہد میں ان کو اتنا عروج حاصل تھا کہ اس نے دو مرتبہ ان کو سونے اور چاندی سے تلوایا اور دونوں مرتبہ چھ چھ ہزار روپے کے برابر ان کا وزن ہوا، اور بادشاہ نے یہ ساری رقم مولانا کی نذر کر دی۔ اس نے مولانا کے وطن سیالکوٹ میں کئی دیہات بھی بطور جاگیر ان کی خدمت میں پیش کیے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہایت اطمینان وسکون کی زندگی بسر کرنے لگے اور معاشی تفکرات سے آزاد ہو کر تصنیف وتالیف میں مصروف ہو گئے۔ وہ اپنے زمانے کے واحد عالم دین تھے جنھیں بادشاہ کی جانب سے ایک لاکھ روپے سالانہ ملتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو رفعت شان اور منفرد مقام اللہ کے فضل سے مولانا عبدالحکیم کو حاصل ہوا، سرزمین ہند میں اور کسی عالم دین کو اس دور میں حاصل نہیں ہوا۔

---

1. بادشاہ نامہ۔ ج ۱، حصہ ۲، ص ۳۴۱۔
2. فرحت الناظرین۔ ص ۷۳۔

Marfat.com

لم یبلغ احمد من علماء الھند فی وقتہ ما بلغ من الشأن والرفعۃ ولا انتھی واحد منھم الی ما انتھی الیہ جمیع الفضائل عن ید وحاز العلوم وانفرد❶۔

(علمائے ہند میں جس شان و رفعت کو وہ (مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی) پہنچے ان کے عصر میں دوسرا کوئی نہیں پہنچا اور جن فضائل سے وہ متمتع ہوئے اور کوئی شخص نہیں ہوا۔ انھوں نے علوم کو سمیٹ لیا اور اس سلسلے میں انفرادیت حاصل کی۔)

محمد صالح کنبو نے بھی ان کے علم و فضل اور وسعت معلومات کی بے حد تعریف کی ہے اور شاہ جہانی دور میں انھیں جس عزو شرف کا مستحق گردانا گیا' اس کا شان دار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے❷۔

وسعت علم و فضل اور قبولیت عامہ:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی وسعت علم کا تمام متقدین و متاخرین تذکرہ نویس صراحت کے ساتھ ذکر فرماتے اور ان کی فضیلت و عظمت اور تحقیق و کاوش کا واضح الفاظ میں اقرار کرتے ہیں۔ متقدین مؤرخین میں سے بعض کے اقتباسات اختصار کے ساتھ پہلے دیے جا چکے ہیں۔ متاخرین میں سے میر سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں۔

علامہ زماں و افتخارِ زمانیاں است۔ الحق در جمیع فنون درسی' مثل او از زمینِ ہند برنہ خاست۔ آ ثارِ دانش بایں کیفیت و کمیت و حسنِ قبول بر صفحۂ روزگار نہ گزاشت❸۔

(وہ (مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی) علامہ زمان اور فخر اہل زمان ہیں۔ تمام اصناف علوم درسیہ میں انھیں جو دسترس حاصل تھی' اس میں سر زمین ہند میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ ان کے آثارِ دانش کی کیفیت و کمیت اور دنیا میں حسن قبول کے اعتبار سے کوئی ان کا ثانی نہیں گزرا۔)

آزاد بلگرامی آگے چل کر ان کی علمی فیض رسانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ عرصہ جہان را بہ لوامع فیض مملو ساختہ❹۔

(انھوں نے خطہ ارض کو اپنے فیض علم و فضل کی ضیا پاشی سے بھر دیا۔)

جب شاہ جہان نے انھیں نقد روپے اور کئی گاؤں بطور جاگیر عطا کیے تو ان کی فکر معاش کا مسئلہ ختم ہو

---

❶ خلاصۃ الاثر۔ ج ۲' ص ۳۱۸۔

❷ تفصیل کے لیے دیکھیے: عمل صالح الموسوم بہ شاہ جہان نامہ۔ ج ۳' ص ۲۹۴' ۲۹۵۔

❸ مآثر الکرام دفتر اول' ص ۱۹۳

❹ مآثر الکرام دفتر اول۔ ص ۱۹۳

Marfat.com

گیا اور وہ اطمینان قلب اور سکون ذہن سے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں منہمک ہو گئے- آزاد بلگرامی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ملا بہ بحضور خاطر و فراغ مال در وطن مالوف اقامت داشت و تخم علم و فضل در سرزمین سینہ ہا و سفینہ ہا می کاشت- تصانیف در بلاد عرب و عجم سائر و دائر است ❶-

(مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے مالی پریشانیوں سے نجات حاصل کر کے دل کے کامل سکون کے ساتھ اپنے وطن مالوف سیالکوٹ میں اقامت اختیار کر لی اور لوگوں کے قلب و نظر کی زمین میں علم و فضل کی تخم ریزی میں مصروف ہو گئے- ان کی تصانیف بلاد عرب و عجم میں متداول و متعارف ہیں-)

اس کا ثبوت حافظ عبدالرحمٰن امرتسری کے ان الفاظ سے بھی ملتا ہے' جو انھوں نے اپنے سفر نامے میں تحریر کیے ہیں:

''عراق' شام اور استنبول کی متعدد درس گاہوں میں' مجھے آپ کی تصانیف' داخل درس دیکھنے کا موقع ملا- ہندوستان سے باہر بلاد اسلامیہ میں علمی حیثیت سے جو شہرت مولوی عبدالحکیم صاحب کو حاصل ہوئی' اسے کوئی مصنف حاصل نہیں کر سکا ❷-

مولوی رحمان علی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی علامہ زمان سرآمد اقران خود ❸-

(ملا عبدالحکیم سیالکوٹی' علامہ عصر اور اپنے معاصرین میں سب سے فائق تر تھے-)

مولانا عبدالحی حسنی لکھنوی فرماتے ہیں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی' اپنے استاذ مولانا کمال الدین کاشمیری کے فیض صحبت سے علم و فضل کے اونچے مرتبے کو پہنچ گئے تھے:

وصار عجبا فی استحضار المسائل وقوة العارضة وكثرة الدرس والافادة ❹-

(انھوں نے استحضار مسائل' قوت تحقیق اور کثرت درس و افادہ میں بہترین مقام حاصل کر لیا تھا-)

وہ مزید فرماتے ہیں کہ مولانا سیالکوٹی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے اور ان کی تصنیفات کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی:

---

❶ مآثر الکرام دفتر اول- ص ۱۹۳

❷ سیاحت نامہ- ص ۵۹

❸ تذکرۂ علمائے ہند- ص ۱۱۰-

❹ نزہۃ الخواطر- ج ۵' ص ۲۱۰-

Marfat.com

ویدرس ویضنف وتصانیفه کلها مقبولة عند العلماء محبوبة الیهم ولا سیما عند علماء بلاد الروم یتنا فسون فیها وهی جدیرة بذلك❶۔

(مولانا عبدالحکیم فرائض تدریس انجام دیتے اور مصروف تصنیف رہتے تھے اور ان کی تمام تصانیف حلقہ علما میں مقبول ہیں اور وہ انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' بالخصوص بلاد روم سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام ان کی تصانیف سے ایک دوسرے سے بڑھ کر رغبت رکھتے ہیں۔ اور یہ تصانیف اس قدر افزائی کی مستحق بھی ہیں۔)

بہر حال اپنے عہد کے علمائے عظام میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی بڑے بلند مرتبے کے حامل تھے۔ اہم دینی مسائل سے متعلق تمام ہندوستان میں ان کا فتویٰ جاری تھا اور کوئی اس سے جرأت انکار نہیں کر سکتا تھا' حتیٰ کہ بادشاہِ ہند اور عمالِ حکومت بھی ان کے فرمانِ شرعی سے انحراف نہ کرتے تھے۔

مفتی غلام سرور لاہوری اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

علمائے ہند را بر قول و فعل وے جائے اعتراض و حکام عہد را از حکم شرع کہ بفتویٰ وے جاری شدے جائے انکار و اعتراض نبودے❷۔

(ہندوستان کے علما کو ان کے قول و فعل پر مجال اعتراض نہ تھی اور حکامِ وقت کو ان کے صادر کردہ شرعی فتوے سے انکار و اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔)

محمد بن فضل اللہ محبی کا کہنا ہے کہ سلطان ہند شاہ جہان انہی کے مشورے سے احکام جاری کرتا تھا:

کان رئیس العلماء عند سلطان الهند خرم شاه جهان' لا اصدر الا عن رایه❸۔

(فرماں روائے ہند سلطان خرم شاہ جہان ان کو علما کے سربراہ قرار دیتا تھا اور ہر حکم ان کی رائے سے جاری کرتا تھا۔)

اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے جو ''سٹڈیز ان دی ہسٹری آف گجرات'' کے حوالے سے ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے ''ہسٹری آف مسلم سولیزیشن ان انڈیا اینڈ پاکستان'' میں نقل کیا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے گجرات کے زمانۂ گورنری میں احمد آباد کے ایک ناجائز تعمیر کردہ جین مندر کو گرا کر مسجد بنانے کا حکم دیا تھا۔ لیکن جب دارا شکوہ گجرات کا گورنر بنا تو اس نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے فتوے کے مطابق شاہ جہان کے حکم سے یہ عمارت دوبارہ بحیثیت مندر واگزار کر دی❹۔

اس فتوے سے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی رواداری' وسعت علم اور وسعت فکر کا پتا چلتا ہے۔

❶ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۱۰۔

❷ خزینۃ الاصفیا۔ ص ۹۸۴' ۹۸۵۔

❸ خلاصۃ الاثر۔ ج ۲' ص ۳۱۹۔

❹ ملاحظہ ہو ماہنامہ ''ثقافت'' لاہور بابت اپریل ۱۹۶۷ء' ص ۷۔

Marfat.com

ہم عصر علما سے علمی مباحث:

عہد شاہ جہان میں خطہ ہند کو علما وفضلا کے عظیم مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ شاہ جہان کی محبت علم و علما اور صفت جودت وسخا کا شہرہ سن کر ایران وروم کے اصحاب علم اور اہل فضل بھی کثیر تعداد میں وارد ہند ہو گئے تھے اور ان میں سے بیشتر کا تعلق وانسلاک براہ راست شاہ جہان اور شاہی دربار سے ہو گیا تھا۔ وہ زمانہ چوں کہ ہندوستان میں علوم عقلیہ کی ترویج وترقی کا زمانہ تھا' اس لیے مختلف عقلی موضوعات پر علما وفضلا کے درمیان مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ خود بادشاہ ان علما کی علمی مجالس میں شامل ہوتا اور ان کے مباحثوں میں دلچسپی لیتا تھا۔

ایران سے وارد ہند ہونے والی جماعت علما میں ایک بزرگ ملا شفیعا تھے' جو بہت بڑے عالم اور مشہور ایرانی فاضل تھے۔ انھیں ملا شفیعا یزدی کہا جاتا تھا۔ ان کا اصل نام محمد شفیع اور لقب دانشمند خاں تھا۔ یہ لقب ان کے علم وفضل کی بنا پر انھیں شاہ جہان بادشاہ کی طرف سے ملا تھا۔ فرحت الناظرین کے مصنف محمد اسلم پسروری ان کے حالات بیان کرتے ہوئے' انھیں ''یگانہ آفاق وسرآمد علمائے خراسان وعراق'' قرار دیتے ہیں [1]۔

ملا شفیعا یزدی' شاہ جہان کے عہد میں درحقیقت تجارت اور سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ مختلف ذرائع سے جب بادشاہ تک ان کے علم وفضل کی شہرت پہنچی اور یہ معلوم ہوا کہ وہ خراسان وعراق کے یگانہ روزگار علما اور ممتاز فضلا میں سے ہیں تو ان سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا' لیکن اس اثنا میں ملا شفیعا اپنا کام مکمل کر کے اور جس غرض سے یہاں آئے تھے' اس سے فارغ ہو کر عازم وطن ہونے والے تھے اور واپسی کے ارادے سے بندرگاہ سورت میں پہنچ گئے تھے۔ بادشاہ نے بہت ہی خواہش اور اعزاز واکرام کے ساتھ انھیں دربار میں طلب کیا اور ان کے امتحان اور مناظرے کے لیے سردار علما مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو دعوت دی۔ دونوں فضلائے عصر ایک دوسرے کے مقابلے پر اترے اور ایاك نعبدو ایاك نستعین کی تفسیر پر بحث شروع ہوئی۔ شاہ جہان کے فاضل وزیر علامی سعد اللہ خاں حکم قرار پائے۔ بڑی علمی گفتگو ہوئی' دونوں نے دلچسپ تفسیری اور فنی نکات بیان کیے۔ فرحت الناظرین کے لائق مصنف نے طوالت کی وجہ سے مناظرے کی تفصیلات حذف کر دی ہیں اور فریقین کے سوال وجواب ضبط تحریر میں لانے سے گریز کیا ہے۔

مختصر یہ کہ بادشاہ نے ملا شفیعا کے طرز گفتگو سے متاثر ہو کر' ان کو ملازمان شاہی کے زمرے میں شامل کیا اور پھر ان پر بے حد نوازشیں کیں اور انھیں دانش مند خان کے خطاب سے سرفراز کیا۔

ماثر الامرا میں بھی مختصر الفاظ میں اس مناظرے کی روداد بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان دونوں عالموں کے درمیان ایاك نعبدوایاك نستعین کی واؤ عطف کے بارے میں بڑی طویل گفتگو ہوئی۔ علامی

[1] فرحت الناظرین۔ ص ۱۴۴۔

Marfat.com

سعد اللہ خاں نے حکم کے فرائض انجام دیئے بالآخر دلائل کے اعتبار سے دونوں برابر رہے- علامی سعد اللہ خاں کہ در علم علم بود ممیز گشت و آخر ہر دو برابر ماندند ❶-

صاحب فرحت الناظرین محمد اسلم پسروری کے بقول: در تفسیر آیہ کریمہ (ایاك نعبدو ایاك نستعین) مباحثہ کردند و سخنانِ بلند و نکاتِ دلپذیر ازاں ہر دو دانشمند تحریر منصۂ ظہور آمد-

ملا شفیعا یزدی کے علاوہ اور بھی متعدد علما کے نام تذکروں میں مسطور ہیں، جن سے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی بعض علمی مسائل میں بحثیں رہتی تھیں، ان میں ایک ملا محمد فاضل تھے جو بڑے عالم، فقیہ اور مشہور مناظر تھے-

ملا فاضل محرر دانشمند، مدقق بود، و جدل و بحاثے اشتہار یافتہ، اکثر حواشی ملا عبدالحکیم سیالکوٹی را ردمی نوشت ❷-

(ملا فاضل، فقیہ مصنف اور گہرے علم و فکر کے مالک تھے- بحث و مجادلہ میں بڑے مشہور تھے- انھوں نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے اکثر حواشی کا رد تحریر کیا ہے-)

مولانا محمد میاں مرحوم نے اپنی تصنیف ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' میں ملفوظات عزیزیہ'' کے حوالے سے مولانا عبدالحکیم اور ملا محمد فاضل کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے، جو درج ذیل ہے:

ملا محمد فاضل بدخشاں میں پیدا ہوئے- علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل و مکمل ہو کر شاہ جہان بادشاہ کے پاس پہنچے اور مطالبہ کیا کہ ''ملک العلما'' کا منصب اور خطاب مجھے مرحمت فرمایا جائے- مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اس عہدہ و منصب پر فائز تھے- شاہ جہان نے کہا، آپ دونوں صاحب مناظرہ کرلیں، جس کو زیادہ قابل سمجھوں گا، اس کو ملک العلما'' بنادوں گا- ملا محمد فاضل صاحب نے بذات خود مولانا عبدالحکیم صاحب سے مناظرہ کرنے میں اپنی ہتک سمجھی- فرمایا کہ میرا کوئی شاگرد مولانا سے مناظرہ کرے گا- یہ کہہ کر دربار شاہی سے رخصت ہوئے اور سیدھے ہرات پہنچے- وہاں ابھی مرزا زاہد اپنے والد سے صَرف پڑھا کرتے تھے- ملا فاضل نے ذکی اور ذہین سمجھ کر ان کے والد صاحب سے اجازت چاہی کہ وہ خود ان کو تعلیم دیں گے- چنانچہ بہت بڑے عرصے میں مرزا زاہد کو عالم و فاضل کر کے اپنے ہمراہ دربار شاہ جہان میں لائے اور فرمایا یہ میرا شاگرد حاضر ہے، جو ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے مناظرہ کرے گا- مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے پہلی نظر میں تاڑ لیا کہ مرزا زاہد صاحب ''صرف'' میں کچے ہیں- بادشاہ کے سامنے ہی فرمایا، اس بچے سے صرف کے صیغوں کے سوا اور کیا پوچھ سکتا ہوں، اور پھر شافیہ کی ایک عبارت کا مطلب پوچھا- وہ عبارت مرزا زاہد کے ذہن میں نہ تھی- بولے کتاب دیکھ لوں- مولانا عبدالحکیم

---

❶ دیکھیے: فرحت الناظرین (شخصیات)- ص ۹۵، ۹۶ نیز ملاحظہ ہو- مآثر الامرا- ج ۲، ص ۳۲-

❷ تاریخ کشمیر اعظمی- ص ۱۴۴-

Marfat.com

صاحب نے فوراً فرمایا- ابھی تک کتاب کی ضرورت ہے؟ الغرض ملا فاضل اس مرتبہ بھی شکست کھا کر بے نیل مراد واپس ہو گئے ❶-

بلخ کے ایک فاضل بزرگ' بقول محمد صالح کنبوہ' "جلوہ طرازِ حسنِ کلام' فاضل عالی فطرت والا مقام" مولانا عوض وجیہہ سے بھی بعض مسائل میں مولانا عبدالحکیم کی گفتگو اور سوال و جواب کا ذکر بعض تذکروں میں ملتا ہے ❷-

مولانا سیالکوٹی کے ایک اور معاصر کشمیر کے ملا ابوالحسن المعروف بہ شاہم بابا تھے جو تحقیق علوم میں اپنے عہد کے عدیم المثال عالم تھے- بیضاوی کی عبارتوں کی عبارتیں قرآن کی طرح پڑھتے تھے- وہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حریف تھے اور بعض مسائل میں ان کے نقطہ نظر کی تردید کرتے تھے- اپنے زمانے کے علما کو خاطر میں نہ لاتے تھے-

واکثر مذکورات ملا عبدالحکیم را رد می کرد و گاہے التفات بجانب علمائے حاضر نمی کرد ❸-

اسی طرح ایک اور کشمیری عالم ملا باقر نارہ للو تھے' جو معقولات میں ملا باقر صباغ کے شاگرد تھے اور ہندوستان کے وہ عالم تھے جو مختلف مسائل میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور پورب و پنجاب کے علما کے افکار و خیالات پر باقاعدہ معارضہ کرتے اور ان کی تحقیق کو ہدفِ نقد و جرح ٹھہراتے تھے-

ملا باقر نارہ للو' در معقول شاگرد ملا باقر صباغ بودہ' و در ہندوستان با ملا عبدالحکیم و علمائے پنجاب و پورب معارضہ ہا کردہ' و آں ہا را ملزم می کرد ❹-

مجدد الف ثانی سے تعلق خاطر:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اپنے ہم عصر علما اور صوفیا کے پاس جاتے اور ان میں سے بعض کے ساتھ گہرے اور مخلصانہ تعلقات رکھتے تھے' جن میں ایک حضرت مجدد الف ثانی تھے- دونوں بزرگ ملا کمال الدین کشمیری کے شاگرد تھے اور ایک دوسرے کے علم و فضل کی وسعتوں کو جانتے اور تدین و تقویٰ کی حدود کو خوب سمجھتے تھے- مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے بارے میں تذکروں میں یہ بھی مرقوم ہے کہ وہ مجدد صاحب سے ملاقات کے لیے سرہند جایا کرتے تھے اور ان کے حلقہ ارادت و بیعت میں شامل تھے- ان کے لیے "مجدد الف ثانی" کا لفظ سب سے پہلے مولانا سیالکوٹی ہی نے استعمال کیا تھا- ایک مرتبہ تو وہ کئی دن سرہند میں مقیم رہے اور مجدد صاحب نے ان کو "آفتاب پنجاب" کا لقب عطا کیا- ان دونوں کے مخلصانہ مراسم کے بارے میں بہت سے واقعات متعدد تذکروں میں مندرج ہیں-

---

❶ علمائے ہند کا شاندار ماضی- ج ۱' ص ۴۶۶' ۴۶۷-

❷ ملاحظہ ہو: "معارف"- اعظم گڑھ- بابت مارچ ۱۹۶۳ء

❸ دیکھیے: تاریخ کشمیر اعظمی- ص ۱۴۴-

❹ ایضاً- ص ۱۴۸-

Marfat.com

حضرت میاں میر سے ملاقات:

لاہور کے مشہور صوفی بزرگ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی آمد و رفت تھی اور ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا- ایک ملاقات کا واقعہ پروفیسر امین اللہ وثیر نے دارا شکوہ کی سکینۃ الاولیا کے حوالے سے ماہنامہ ''ثقافت'' (لاہور) میں بیان کیا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز جہاں گیر حضرت میاں میر صاحب کی مجلس میں حاضر ہوا- مولانا سیالکوٹی بھی اس وقت وہاں موجود تھے- حضرت میاں میر نے بادشاہ کو خدا تک پہنچنے کے طریقے بتانا شروع کیے اور کہا کہ یہ وصل الی اللہ دو طریقوں سے ممکن ہے- اول جذبہ' جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ یک بارگی بندے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے- دوسرا سلوک' جو ریاضت' مجاہدہ اور کسی بزرگ کا دامن تھامنے سے حاصل ہو سکتا ہے- راہ سلوک کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ جب سالک پر عالم ملکوت کا کشف ہو جاتا ہے تو اس کا پیرا سے جنگلوں اور ویران جگہوں میں بھیج دیتا ہے تاکہ وہ تنہائی میں یادالٰہی میں مصروف رہے' اور یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ قرب حق کے حصول کے لیے مخلوق سے کنارہ کشی ضروری ہے- مولانا عبدالحکیم نے' جو ایک عالم باعمل تھے اور یہ جانتے تھے کہ بادشاہ حضرت میاں میر کا معتقد ہے اور مجلس میں موجود ہے' اس موقعے پر خاموشی اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا اور کہا: حضرت! آپ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے اگر یہ صحیح ہے تو یہ عین رہبانیت کی تعلیم ہے' اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا- مولانا عبدالحکیم نے جنگلوں کی تنہائی میں جا کر یادِ الٰہی میں مصروف ہو جانے پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا- اس سے نماز باجماعت فوت ہو جاتی ہے اور اس طرح ایک بنیادی سنت نبوی کا ترک لازم آتا ہے[1]-

تصنیفات و حواشی:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی ایک معروف تصنیف الدرۃ الثمینہ ہے- باقی مختلف مضامین پر مشتمل اہم درسی کتابوں پر حواشی ہیں' جو اپنی جگہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور حلقہ علما و طلبا میں قدر و منزلت کے نظر سے دیکھے جاتے ہیں- میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نزدیک ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) حاشیہ تفسیر بیضاوی (۲) حاشیہ مقدمات تلویح (۳) حاشیہ مطول (۴) حاشیہ شریفیہ (۵) حاشیہ شرح مواقف (۶) حاشیہ شرح عقائد تفتازانی (۷) حاشیہ حاشیہ خیالی' (۸) حاشیہ شرح شمسیہ (۹) حاشیہ حاشیہ عبدالغفور (۱۰) تکملہ حاشیہ عبدالغفور (۱۱) حاشیہ شرح مطالع (۱۲) حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی (۱۳) حواشی درکنار شرح حکمت العین (۱۴) حواشی درکنار شرح ہدایۃ الحکمہ (۱۵) حواشی درکنار مراح الارواح (۱۶) درۂ ثمنیہ' در اثبات واجب تعالیٰ-

[1] ''ثقافت'' (لاہور) بابت اپریل ۱۹۶۷ء ص ۱۰-

Marfat.com

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کی سطور میں، ان متون و متروح کا، جن کو مولانا ممدوح نے شرح و تحشیہ کے لیے منتخب فرمایا، مختصر الفاظ میں تعارف کرا دیا جائے۔

تفسیر بیضاوی:

تفسیر بیضاوی کا اصلی نام ''انوار التنزیل و اسرار التاویل'' ہے اور یہ قاضی ناصر الدین ابو الخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی (متوفی ۶۸۵ھ یا ۶۹۲ھ/۱۲۶۸ء یا ۱۲۹۳ء) کی تصنیف ہے۔ درحقیقت یہ محمود ابن عمر زمخشری (۵۲۸ھ/۱۱۳۴ء) کی تفسیر (جو تفسیر ''کشاف'' کے نام سے معروف ہے اور جس کا پورا نام ''الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل و عیون الاقاویل فی وجوہ التاویل'' ہے) کا اختصار ہے۔ زمخشری اگرچہ معتزلی تھا لیکن اس کی تفسیر کشاف اہل سنت کے حلقوں میں متداول اور مدارس میں سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی تھی۔ کشاف ایک ضخیم تفسیر ہے، متعدد اہل علم نے اس کے مختصرات لکھے، مگر ان میں شہرت اور قبولیت عامہ قاضی ناصر الدین بیضاوی کی انوار التنزیل و اسرار التاویل ہی کو حاصل ہوئی۔ اسی وجہ سے علما نے بیضاوی کی طرف خصوصیت سے عنان توجہ مبذول کی، اسے داخل نصاب کیا اور اس پر حواشی و تعلیقات تحریر کیے۔ نویں، دسویں، گیارھویں صدی ہجری میں اس پر متعدد علما نے حواشی لکھے۔

واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تفسیر بیضاوی کی ترویج دسویں صدی ہجری کے نصف میں ہوئی۔ اس سے پہلے اس ملک کے علما میں کشاف متداول تھی۔ دسویں صدی ہجری سے قبل خود ہندوستان میں دو تصویریں معرض تحریر میں آ چکی تھیں، ایک آٹھویں صدی ہجری میں اور دوسری نویں صدی ہجری میں!

آٹھویں صدی ہجری میں ''تفسیر تاتارخانی'' لکھی گئی جو فیروز تغلق (۷۵۲-۷۹۹ھ/۱۳۵۱ء-۱۳۹۷ء) کے عہد کے معروف عالم و فاضل امیر تاتارخاں کی مرتب کردہ تھی اور بڑی مفصل اور جامع تفسیر تھی۔

نویں صدی ہجری کے نصف اول میں ''تفسیر بحر مواج'' ضبط کتابت میں لائی گئی۔ یہ تفسیر جون پور کے نامور عالم دین، ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی (متوفی ۸۴۸ھ/۱۴۴۴ء) کے زور علم و تحقیق کا نتیجہ تھی۔ فارسی زبان کی اس تفسیر نے بہت جلد جماعت علما میں مقبولیت حاصل کر لی۔ لیکن یہ پورے قرآن کی تفسیر نہیں ہے۔

دسویں صدی ہجری میں ہندوستان میں بیضاوی کا رواج ہوا۔ اسی صدی میں محقق جلال الدین دوانی (متوفی ۹۰۸ھ/۱۵۰۳ء) کے شاگرد ارض ہند میں داخل ہوئے اور ان کی آمد کے بعد یہاں کے علما کو تفسیر بیضاوی سے لگاؤ پیدا ہوا۔ شیخ ابو الفضل خطیب گازرونی (۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء) محقق دوانی کے شاگرد تھے۔ وہ

Marfat.com

گجرات چلے آئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم تھے۔ شاہان گجرات نے ان کی بڑی سرپرستی کی اور عرصہ دراز تک احمد آباد میں مسند درس آراستہ کیے رکھی۔ انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا۔ غالباً یہ پہلے ہندی عالم تھے جنھوں نے یہ اہم علمی خدمت سرانجام دی۔ ان کے شاگردوں میں شیخ وجیہ الدین گجراتی (۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء) شامل ہیں، جو کثیر التصانیف اور کثیر الدرس عالم دین تھے۔ انھوں نے بھی اپنے استاد کی روایت کے مطابق بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا۔

علامہ جلال الدین دوانی کے ایک اور شاگرد خواجہ جمال الدین محمود تھے اور ان کے شاگرد امیر فتح اللہ شیرازی تھے، جنھوں نے خواجہ جمال الدین محمود کے علاوہ مولانا کمال الدین شیرانی، مولانا احمد کرد اور میر غیاث الدین منصور سے بھی پڑھا تھا۔ یہ پہلے ایران سے دکن تشریف لائے اور پھر جلال الدین اکبر کی طلب پر ہندوستان چلے آئے تھے۔ انھوں نے بھی تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا❶۔

امیر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد مولانا عبدالسلام لاہوری تھے، جو درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے اور تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتے تھے۔ انھوں نے بھی تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا❷۔

مولانا عبدالسلام لاہوری کے شاگردوں میں ایک عالم دین مولانا عبدالسلام دیوی تھے جو ہندوستان کے صوبہ یو۔ پی کے شہر دیوہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے بھی تفسیر بیضاوی کو حاشیہ نویسی کے لیے منتخب فرمایا❸۔

ان علمائے کرام کے علاوہ دیگر علمائے ہند میں سے شیخ عیسیٰ بن عثمان سندھی برہان پوری، شیخ صبغت اللہ بن روح اللہ حسینی گجراتی، شیخ شمس الدین بیجاپوری، شیخ طیب بن عبدالواحد بلگرامی، شیخ عبداللہ دہلوی، شیخ طاہر بن رضی ہمدانی، قاضی نور اللہ شوشتری، میر محمد ہاشم گیلانی اور قاضی محمد آصف اللہ آبادی نے تفسیر بیضاوی پر حواشی تحریر کیے۔

پھر شیخ یعقوب بن یوسف بنانی نے دہلی میں اور ملا حسین کوجو نے کشمیر میں تفسیر بیضاوی پر حواشی لکھے۔ ملا حسین کوجو کے حاشیہ کے بارے میں ''واقعات کشمیر'' کے مصنف کا کہنا ہے کہ یہ حاشیہ مختلف علوم کی روشنی میں لکھا گیا ہے، نہایت عمدہ ہے اور بہت سے فوائد علمیہ اور نکات عالیہ پر مشتمل ہے۔

ملا حسین کوجو، در انواع علوم مشار الیہ بودہ۔ حواشی او بر تفسیر بیضاوی فوائد و نکات عالیہ افادہ می کنند۔

---

❶ ''المعارف'' (لاہور) بابت مارچ ۱۹۶۸ء۔ حکیم فتح اللہ شیرازی کے حالات کے لیے دیکھیے، عمل صالح، ج ۳، ص ۳۰۳۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۶۰۔ مفتاح التواریخ، ص ۱۹۳، ۱۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۵۴، ۲۵۵۔ منتخب التواریخ، ص ۴۶۷، ۴۶۸۔ دربار اکبری، ص ۶۷۳ تا ۶۸۴۔

❷ مآثر الکرام، ص ۲۲۶۔ مولانا عبدالسلام لاہوری کے حدود علم و فضل کی وسعتوں کے لیے ملاحظہ ہو عمل صالح، ج ۳، ص ۳۰۰۔

❸ ایضاً، ص ۲۲۵، ۲۲۶۔

Marfat.com

کشمیری علما کے تذکروں سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں بیضاوی کو اس زمانے میں بہت ہی اہمیت حاصل تھی اور علما اس سے بے حد اعتنا کرتے تھے۔ بعض علما کو تو یہ باقاعدہ حفظ تھی، جن میں ملا ابوالحسن المعروف شاہم بابا خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ملا عبدالحکیم کا حاشیہ:

ہندی اہل علم کا یہ وہ دور تھا جب مدارس دینیہ میں تفسیر بیضاوی کا وہ باقاعدہ درس دینے لگے تھے اور اس پر تعلیقات و حواشی کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی جو مسند تدریس پر فائز تھے اور طلبا کو تفسیر بیضاوی پڑھاتے تھے، اس کی شرح ضبط کتابت میں لانے کا ارادہ کیا اور اس کے مشکل و مغلق مباحث کو سلجھانے کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی۔ لیکن کتاب چونکہ دقیق مسائل پر محیط ہے اس لیے مولانا کو معلوم تھا کہ شرح کے باوجود اس کی پیچیدہ گرہوں کی عقدہ کشائی ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کا اظہار وہ مقدمہ کتاب میں ان الفاظ سے کرتے ہیں:

ان التفسیر العتیق والبحر العمیق، المسمی بانوار التنزیل، للامام الهمام، قدوة علـمـاء الاسلام، سلطان المحققین برهان المدققین القاضی ناصر الـدین عبدالله البیضاوی قد استنهز العلماء بحل مشکلاته واسهر الاذکیاء احـداقهـم لفتح مغلقاته، الاانه لوجازة العبادات واحتوائه علی الاشارات، جل ان یکون شریعة لکل وارد، وان یطلع علیه الاواحد بعد واحد۔

(یعنی وہ تفسیر قدیم اور (علوم قرآنی کا) بحر عمیق، جو انوار التنزیل کے نام سے موسوم ہے اور محققوں کے بادشاہ اور دقیقہ سنجوں کی برہان قاضی ناصر الدین عبداللہ بیضاوی کی تصنیف ہے۔ علمائے نام دار اس کے مشکل مباحث کی عقدہ کشائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اذکیائے دوراں نے اس کے پیچیدہ مسائل کی وضاحت کے لیے اپنی آنکھوں کو شب بیداری کرائی۔ لیکن یہ کتاب اپنی عبارتوں کے ایجاز کی وجہ سے اور اشارات علمیہ پر محتوی ہونے کے باعث، اس سے کہیں بلند ہے کہ ہر اترنے والے کے لیے پانی کا گھاٹ بن جائے (یعنی ہر شخص کے فہم کی گرفت میں آ جائے) اور یکے بعد دیگرے سب لوگ اس کے دقائق و غوامض پر مطلع ہو جائیں۔)

مولانا سیالکوٹی چوں کہ بہت بڑے عالم اور وسیع المطالعہ شخص تھے، اس لیے انھیں ذاتی طور پر یقین کہ وہ تفسیر بیضاوی کے غوامض و مغلقات کے حل و کشود سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، لیکن ان سے تعلق ر

Marfat.com

والے اہل علم ان کے اس دعوے کو تسلیم کرنے سے متامل تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ صرف ان کی زبانی باتیں ہیں عملاً اس عظیم کام کی تکمیل بہت مشکل ہے۔ ان لوگوں نے مولانا ممدوح سے بیضاوی کے مغلقات کے بارے میں کچھ سوالات کیے اور ان کے جواب کے طالب ہوئے۔ مولانا نے ان کو تسلی بخش جواب دیے۔ تحریر فرماتے ہیں:

فقلت لهم ايها الخلان الدينية والاخوان الروحانية' انى انست نارا بوادى هذا الكتب' اتيكم منها بقبس لعلكم تصطلون فاستكشفوا منى بعض مظان لبسه فعرضت لهم ماورد فى خلده عند درسه من حل يفيد برد قلوب اولى الابصار وزيادات وقعت الظفرة عنها۔

(میں نے ان سے کہا' اے دینی دوستو اور روحانی بھائیو! میں نے اس کتاب کی وادی میں آگ دیکھی ہے۔ میں اس سے کچھ انگارے لاتا ہوں تاکہ تم اس سے تاپ سکو۔ اب انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ اس کے بعض ان مقامات کی وضاحت کروں' جہاں شکوک وشبہات کا خیال ہے۔ چنانچہ میں نے ان کے سامنے وہ فوائد علمی پیش کیے جو اس کتاب کا درس دیتے وقت میری سطحِ قلب پر ابھرے تھے۔ یہ ان مشکل مسائل کے ایسے حل تھے جس سے اہلِ علم اور اصحاب عقل کے دلوں کو ٹھنڈک اور تسکین پہنچتی ہے۔ یہ حل ان زیادات وافادات پر محیط تھے' جن پر مجھے دسترس ہوئی۔)

مولانا نے جب یہ دعویٰ کیا اور مغلقات کی توضیح وتشریح کے بارے میں ایک بات کہی تو ہر طرف کے اہل علم ان سے عرض کناں ہوئے کہ ان مقامات کی وضاحت فرمائی جائے۔ لیکن غربت وتنگ دستی اور مال و مکان کی تنگی احباب کی اس خواہش وتمنا کی راہ میں رکاوٹ بن گئی' جس کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فاقترحوا ان نتقيد هذه الا وابد تذكرة للاحباب النظار فعللتهم بتفرق البال وتشتت الحال' اذا كنت مطروحا بمكان قفر جل بضاعتى فيه فقر۔

(انھوں نے اصرار کیا کہ میں ان دقیق مسائل کو قلم بند کر دوں جو ہر شخص کے فکر وفہم کی گرفت میں آنے والے نہیں ہیں' تاکہ اہل نظر احباب کے لیے وہ ایک تذکرہ ثابت ہوں۔ لیکن میں نے ان سے عدم اطمینان قلب اور پراگندگی حال کا بہانہ کیا۔ کیوں کہ میں اس زمانے میں ایک بالکل خالی مکان میں پڑا ہوا تھا' جہاں میری سب سے قیمتی متاع فقر اور بے سروسامانی تھی۔)

مولانا ممدوح کی یہ سخت ذہنی پریشانی اور شدید مالی بدحالی کا زمانہ ہے اور ہندوستان میں یہ جہاں گیر کا عہد حکومت ہے' جب کہ بعض دیگر فضلائے عصر اور علمائے روزگار کی طرح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سرکار کی نظر

Marfat.com

عنایت کی سرحدوں سے باہر اور حکومت کے گوشۂ چشم التفات سے دور تھے۔ اسی لیے اپنی گوناگوں پریشانیوں کی وجہ سے تحشیہ بیضاوی تحریر کرنے سے قاصر اور اپنے ذی علم احباب کی درخواست کو شرف قبولیت بخشنے سے عاجز تھے۔ اس قسم کے خالص علمی کام دلجمعی اور سکون خاطر کے متقاضی ہوتے ہیں' لیکن وہ اس سے محروم تھے۔ جہاں گیر کے بعد شاہ جہان تخت ہند کا وارث بنا تو سرکاری سطح پر علما کے وقار و احترام میں بھی اضافہ ہوا۔ مولانا سیالکوٹی نے اس سے ملاقات کی تو وہ ان کے علم و فضل کی فراوانی سے بہت متاثر ہوا اور انھیں صلات و جوائز سے سرفراز کیا۔ اب وہ ذہنی طور پر بالکل مطمئن تھے' چنانچہ دوستوں کے تقاضوں کو عملی شکل دینے کے لیے میدان میں نکلے اور قلم ہاتھ میں پکڑا۔ فرماتے ہیں:

حتى جذب صنيعى وجمع شتات عمرى دولة السلطان...... ابو المظفر شهاب الدين محمد شاه جهان بادشاه...... وهدت بعين عنايته ملحوظا وبين اعين الناس مغبوطاً فعيت بى العلل وضاقت على الحيل' فشرعت فى جمع ما سمع به خاطرى العليل وذهنى الكليل...... جاداً فى تحقيق معانيه' بائعاً عن رموز مبانيه' مومىا فى اثنائه الى اجوبة شكوك الناظرين...... فجاء ت بعون الله كنزاً لا يحصىٰ فوائده' وبحرا لا يقضى فرائده۔

(تا آنکہ سلطان ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ...... کی دولت نے مجھے کھینچ لیا اور میرے انتشار طبع کو' اطمینان خاطر سے بدل دیا...... میں اس کی نظر عنایت میں سما گیا اور اعیان ملک میں محسود اقران بن گیا۔ اب حیلہ جوئی میرے لیے ناممکن ہوگئی اور بہانوں کے دائرے مجھ پر تنگ ہوگئے۔ پس میں نے وہ نکات و فوائد جمع کرنے شروع کیے جو میری بیمار طبیعت اور کمزور ذہن میں آئے تھے...... لیکن ان کی ترتیب و تدوین میں' میں نے تحقیق معانی کو پیش نگاہ رکھا اور ان کے بنیادی مسائل کو موضوع بحث ٹھہرایا۔ نیز اس تحریر میں قارئین کے شبہات کے جواب کی طرف اشارہ کناں رہا...... چنانچہ اللہ کی مدد سے ایسا خزانہ معرض ظہور میں آیا اور ذہن نے اگلا جو بے شمار فوائد پر مشتمل ہے اور ایسا سمندر سامنے نمودار ہوا' جس کے موتیوں کا ختم ہونا ناممکن ہے۔)

اس طرح پہلے پارے کی تفسیر کا حاشیہ مکمل کر کے انھوں نے شاہ جہان کو پیش کیا۔ لکھتے ہیں:

ثم لما فرغت من تسويد ما يتعلق بتفسير الجزء الاول...... جعلته عراضة لسدة السنية وتحفة لخدمة العلية۔

Marfat.com

(پھر جب میں پہلے پارے کی تفسیر سے متعلق تحشیہ سے فارغ ہوا...... تو اسے (شاہ جہان بادشاہ کے) آستانہ بلند کے لیے پیش کیا اور اس کی خدمت عالیہ کے لیے اسے تحفہ بنا دیا-)

شاہ جہان کے ملاحظہ میں آنے کے بعد انھوں نے تفسیر کے دوسرے جز کا حاشیہ لکھا اور عہد شاہ جہانی کی یہ عظیم خدمت معرض ظہور میں آئی- اس تحشیہ نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اسے مصر اور روم کے علما نے بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا- یہ حاشیہ ہندوستان میں بھی چھپ چکا ہے اور مصر میں بھی!

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے اس حاشیے کی خصوصیات یہ ہیں:

- تفسیر بیضاوی کے مشکل الفاظ کی لغوی ونحوی تشریح کی گئی ہے-
- ایسے جملے جو مغلق اور وضاحت طلب ہیں' انھیں واضح کیا گیا ہے اور ان کی پوری طرح صراحت فرمائی گئی ہے-
- ان احادیث کی' جو تفسیر بیضاوی میں درج ہیں' سند بیان کر دی ہے اور جن کا مختصر الفاظ میں ذکر ہے' ان کا پورا متن درج کر دیا ہے-

حاشیہ کشاف:-

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے زمخشری کی تفسیر کشاف کا حاشیہ بھی لکھا ہے' جو غیر مطبوعہ ہے اور جس کا قلمی نسخہ ہندوستان کی رام پور لائبریری میں موجود ہے-

حاشیہ مقدمات تلویح توضیح:

تلویح توضیح' اصول فقہ کی ایک اہم کتاب ہے- اس کا متن ''تنقیح الاصول'' ہے جو صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود المحبوبی (متوفی ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء) کی تصنیف ہے- بعد کو تنقیح الاصول کی شرح صدر الشریعۃ نے خود ہی لکھی' جس کو ''التوضیح فی حل غوامض التنقیح'' کے نام سے موسوم کیا- لیکن یہ شرح بجائے خود شرح طلب اور مزید وضاحت کی متقاضی تھی' اس لیے علما نے اس پر حواشی تحریر کیے- اس کی سب سے اہم اور پہلی شرح علامہ سعد الدین تفتازانی شافعی (متوفی ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء) نے ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء میں ''التلویح فی کشف حقائق التنقیح'' کے نام سے لکھی [1]- سب سے زیادہ مقبولیت اسی حاشیہ ''تلویح'' کو حاصل ہوئی- اور پھر بہت جلد اس حاشیہ نے اصول فقہ کی مستند درسی کتاب کی حیثیت اختیار کر لی اور اسے مدارس عربیہ کے اعلیٰ نصاب میں شامل کیا گیا' جسے اب بھی برصغیر کے مدارس میں باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے-

واقعات کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ہندوستان میں ''اصول بزدوی'' مروج تھی-

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: کشف الظنون' ج ۱' ص ۴۹۶-

Marfat.com

سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ-۷۵۲ھ/۱۳۲۵ء سے ۱۳۵۱ء) کے عہد میں ''حسامی'' کا ذکر بھی آتا ہے' جس پر عہد تغلق کے ایک ہندی عالم مولانا معین الدین عمرانی دہلوی نے حاشیہ تحریر کیا تھا❶- بعد ازاں ''المنار'' بھی مدارس میں آ گئی- چنانچہ آٹھویں صدی ہجری کے نصف ثانی میں جب سلطان فیروز شاہ تغلق نے دہلی کے حوض خاص پر مدرسہ تعمیر کیا تو اس میں سید یوسف بن سید جمال حسینی (متوفی ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) کو مدرس مقرر کیا جو دراصل ملتان کے باشندے تھے اور دہلی چلے گئے تھے- انھوں نے ''توجیہ الافکار'' کے نام سے ''المنار'' کی شرح سپرد قلم کی' جس کا تذکرہ شیخ عبدالحق دہلوی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

سید یوسف بن سید جمال الحسینی...... بر منار نیز شرح دارد مسمّٰی بتوجیہ الافکار❷-

تلویح توضیح کی ترویج مدارس ہند میں غالباً نویں صدی ہجری میں ہوئی' جب اس ملک کے علما علامہ سعد الدین تفتازانی سے تعلیم حاصل کر کے یہاں آئے- ہندوستان کے علما میں سب سے پہلے تلویح توضیح کا حاشیہ شیخ وجیہ الدین گجراتی نے کیا- اس کے دوسرے محشی شیخ یعقوب بن حسن صرفی کشمیری تھے جو نہ صرف کشمیر کے علما و فضلا میں بلکہ پورے ہندوستان میں بلند مرتبے کے حامل تھے- ان کے علاوہ شیخ نور الدین محمد صالح گجراتی' شیخ محمد عاشق چریا کوٹی اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے فرزند شیخ عبداللہ لبیب نے تلویح توضیح کے حواشی قلم بند کیے- متاخرین میں مولانا جمال بن رکن الدین گجراتی' شیخ امان اللہ بنارسی اور قاضی عبدالحق بن محمد اعظم کابلی کے نام اس کے حاشیہ نویسوں میں لائق تذکرہ ہیں-

تلویح توضیح کا معرکہ آرا حصہ ''مقدمات اربعہ'' کا ہے' جو ''حسن وقبح افعال'' کے مسئلے کی وضاحت سے متعلق ہے- یہ بحث اگرچہ مسئلہ جبر و اختیار کے بارے میں علم کلام سے تعلق رکھتی ہے' لیکن اصول فقہ میں بھی اس سے تعرض کیا گیا ہے-

ہندی علما نے پوری تلویح توضیح پر حواشی لکھے اور بڑی عمدگی سے اس خدمت علمی سے عہدہ برآ ہوئے- مگر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اس معاملے میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں- انھوں نے صرف تلویح توضیح کے مقدمات اربعہ کی تشریح کی اور اس اہم بحث کو اپنی کاوش فکر کا موضوع ٹھہرایا-

حاشیہ شرح عقائد نسفی:

عقائد و کلام ایک اہم موضوع ہے- اس پر بہت سی کتابیں ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں' جن میں ایک کتاب ''عقائد نسفی'' ہے- احناف میں اس کو بڑی قبولیت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے- اس کے مصنف علامہ نجم الدین عمر

---

❶ مآثر الکرام دفتر اول' ص ۱۶۷'۱۶۸-

❷ اخبار الاخیار- ص ۱۵۰-

Marfat.com

بن محمد النسفی (متوفی ۵۳۷ھ/۱۱۴۳ء) ہیں۔ متعدد علما نے اس کی شروح لکھیں، جن میں ایک شرح، جو "شرح عقائد نسفی" کے نام سے متداول ہے، علامہ سعد الدین تفتازانی نے لکھی اور بہت جلد مدارس عربیہ میں شامل ہو گئی۔ ہمارے ممدوح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس کی اہمیت واضح کی ہے اور لکھا ہے کہ علما نے شرح عقائد نسفی کے حواشی تحریر کیے اور اس میں جو امور وضاحت طلب ہیں، ان کو حل کیا۔

فاما طوا عنه الغواشی وکتبوا علیه الحواشی۔

(علما نے اس کی تہ میں چھپے ہوئے مطالب کو ظاہر کیا اور اس پر حاشیے لکھے۔)

برصغیر پاک و ہند میں شرح عقائد نسفی کا ذکر سب سے پہلے دسویں صدی ہجری کے واقعات کے ضمن میں عہد ہمایوں کے مشہور عالم مولانا حاتم سنبھلی (متوفی ۹۶۹ھ/۱۵۲۲ء) کے حالات میں ملتا ہے۔ وہ اس طرح کہ عہد ہمایوں میں جو علما مغل فاتحین کے ساتھ وارد ہند ہوئے، ان میں ایک ملا علاء الدین لاری تھے، جن کو اپنے علم و فضل پر اس قدر ناز تھا کہ کسی ہندی عالم کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انھوں نے شرح عقائد نسفی پر حاشیہ قلم بند کیا اور بڑے فخر کے ساتھ مولانا حاتم سنبھلی کو بغرض تبصرہ پیش کیا۔ مولانا حاتم سنبھلی نے یہ حاشیہ دیکھا تو اس پر ایسے دقیق اور وزنی اعتراض کیے کہ ملا علاء الدین لاری سے ان کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ یہ واقعہ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

چوں ملا علاء الدین لاری بدعویٰ تمام حاشیہ را کہ بر شرح عقائد نسفی نوشتہ، نزد میاں بردہ۔ بعد از مطالعہ چنداں تدقیق کردہ اند کہ ملا علاء الدین را ہیچ جواب نماند [۱۲]۔

(یعنی ملا علاء الدین لاری اپنے پورے دعوائے علم کے ساتھ وہ حاشیہ جو انھوں نے شرح عقائد نسفی پر لکھا تھا، میاں حاتم سنبھلی کے پاس لے گئے۔ انھوں نے مطالعہ کے بعد اس پر اس قدر دقیق علمی اعتراض وارد کیے کہ ملا علاء الدین ان کا کوئی جواب نہ دے سکے۔)

اس طرح شرح عقائد نسفی مدارس ہند میں آئی۔ پھر اس پر کئی علمائے ہند نے حواشی لکھے، جن میں مولانا علاء الدین لاری، شیخ نظام الدین بدخشی اور مولانا وجیہ الدین گجراتی کے نام زیادہ مشہور ہیں۔

اس پر ایک حاشیہ علمائے روم میں سے ایک عالم مولیٰ احمد بن موسیٰ الخیالی نے بھی لکھا تھا، جو اپنے محشی کے نام کی مناسبت سے حاشیہ خیالی کے نام سے معروف ہے۔ شرح عقائد نسفی کا یہ بہت عمدہ حاشیہ ہے، اور عربی مدارس کے علما و طلبا میں متداول و مشہور! دیگر ممالک کے علما کی طرح خطۂ ہند کے علما نے بھی اس کو مرکز توجہ ٹھہرایا۔ چونکہ یہ داخل نصاب ہو گیا تھا، اس لیے متعدد ہندی علما نے اس پر حواشی لکھے، جن میں گیارھویں صدی ہجری کے اصحاب علم میں سے مولانا عبدالسلام دیوی، شیخ محمد سعید سرہندی اور مفتی وجیہ الدین گوپاموی کے نام لائق تذکرہ ہیں۔

[۱۲] منتخب التواریخ۔ ج ۳، ص ۶۶۔

Marfat.com

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی اس کو اپنی کاوش فکر کے لیے منتخب فرمایا- اس پر علمائے روم نے بھی حواشی لکھے اور علمائے ہند نے بھی، لیکن طلبائے علم ان حواشی سے مطمئن نہ تھے- اس ضمن میں خود انہی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

لکن ما اتوا بما یروی الغلیل او یشفی العلیل، لما ان ابکاره آبیه عن خطبة کل عاذب و مخدراته محتجبة لا تنجلی لکل طالب-

(لیکن ان حاشیہ نویس علما نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو لوگوں کی علمی تشنگی دور کر سکتی یا بیماروں کو حقیقی شفا بخشنے کے قابل ہوتی، کیوں کہ کتاب کے گہرے مسائل کے نقاب میں چھپی ہوئی دوشیزہ ہر شخص کو پیغام شادی دینے سے انکار کرتی ہے اور اس کے پردوں میں مستور غوامض ہر طلب گار کے سامنے اپنا نقاب نہیں اٹھاتے-)

ان حواشی میں جو کمی رہ گئی تھی، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حاشیہ نے اس کو کما حقہٗ پورا کر دیا اور قاری کی سطح ذہن پر جو شبہات ابھر سکتے تھے، انھیں بطریق احسن رفع فرما دیا- لکھتے ہیں:

فصرفت برهة من عنفوان الشباب فی حل مبانیه وانتهبت فرصة عن اعین الزمان لتحقیق معانیه...... فحققت مقاصده وبینت مصادره و موارده...... مجیبا عن شبهة الناظرین فجاء بحمد الله تعالیٰ موافقاً للمامول وتم بعون الله تعالیٰ مطابقاً للمسئول-

(سو میں نے اپنے عنفوان شباب کا ایک حصہ اس کے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں صرف کر دیا اور اس کے تحقیق معانی کی غرض سے زمانے کی آنکھوں سے فرصت کے کچھ لمحات اڑا لیے...... اس کے مقاصد و مطالب کی گہرائی تک پہنچا اور اس کے مصادر و موارد بیان کیے...... کتاب پڑھنے والوں کے شبہات کا جواب دیا- اس طرح یہ کتاب توقع کے عین مطابق ہوگئی- الحمد للہ تعالیٰ- اللہ کی مدد سے کتاب دوستوں کی تمنا کے ہم آہنگ ہوگئی-)

حاجی خلیفہ نے بھی کشف الظنون میں مولانا سیالکوٹی کے حاشیہ بر حاشیہ خیالی کا ذکر کیا ہے اور اس کو بہترین حاشیہ قرار دیا ہے-

وعلی الخیالی حاشیة...... للملا عبدالحکیم بن شمس الدین الهندی السیالکوتی متوفی سنه سبع وستین والف وهی احسن الحواشی مقبولة عند العلماء[1]-

---

[1] کشف الظنون- ج ۲، ص ۱۱۴۸-

Marfat.com

(اور خیالی پر...... ملا عبدالحکیم بن شمس الدین ہندی سیالکوٹی نے حاشیہ تحریر کیا' جو ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء میں فوت ہوئے- خیالی کا یہ بہترین حاشیہ ہے اور علما میں مقبول و مشہور ہے-)

مولانا لکھتے ہیں کہ یہ حاشیہ انھوں نے بادشاہ ہند شاہ جہان کے نام معنون کیا-

حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوّانی:

قاضی عضد الدین الایجیؒ (متوفی ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء) کی عقائد میں ایک کتاب عقائد عضدی کے نام سے معروف ہے' جس کی بہت سے علما نے شرحیں لکھیں- ان میں ایک شرح محقق دوّانی یعنی علامہ جلال الدین دوانی (متوفی ۹۰۸ھ/۱۵۰۳ء) نے بھی لکھی جو "شرح عقائد جلالی" کے نام سے ہمارے مدارس میں متداول رہی ہے اور علما و طلبا اس سے استفادہ کرتے ہیں- بعد میں شرح عقائد جلالی پر علما نے حواشی تحریر کیے' جن میں خود محقق دوانی کے بعض جلیل القدر تلامذہ بھی شامل ہیں-

شرح عقائد جلالی جب برصغیر میں پہنچی اور علمائے ہند میں مروّج ہوئی تو اس پر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے حاشیہ لکھا اور وہی اس برصغیر کے پہلے عالم ہیں' جنھوں نے اس اہم کتاب کو تحشیہ کے لیے منتخب کیا- بعد ازاں دیگر علمائے ہند نے اس پر حواشی تحریر کیے-

حاشیہ شرح المواقف:

قاضی عضد الدین الایجی (متوفی ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء) کے متون میں علم الکلام سے متعلق "المواقف فی الکلام" کو ایک متن متین کی حیثیت حاصل ہے- اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس دور کے وہ سلاطین و ملوک جن کو اس کی عظمت کا علم تھا' متمنی تھے کہ اس کے فاضل مصنف' علم کلام کے اس عظیم شاہ کار کا انتساب اس کے نام کریں- ان سلاطین میں ہندوستان کا بادشاہ سلطان محمد تغلق بھی شامل ہے- چنانچہ سلطان محمد تغلق (متوفی ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) نے قاضی عضد الدین کو ہندوستان لانے اور ان کی کتاب "المواقف" کو اپنے نام معنون و منسوب کرانے کے لیے دہلی کے نامور فاضل مولانا معین الدین عمرانی کو شیراز بھیجا- شیخ عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں:

چنیں گویند کہ سلطان محمد تغلق کہ قاضی عضد را بہ دیار ہندوستان طلبیدہ و توشیح متن مواقف بنام خود التماس نمودہ' ہم مولانائے مذکور را فرستادہ بود[1]-

---

[1] اخبار الاخیار- ص ۱۴۴-

Marfat.com

(کہتے ہیں کہ سلطان محمد تغلق نے قاضی عضد الدین کو ہندوستان آنے کی دعوت دی اور ان کی کتاب المواقف کو اپنے نام معنون کرنے کی درخواست کی، اس کے لیے اس نے مولانا معین الدین عمرانی کو ان کے پاس بھیجا۔)

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی سبحۃ المرجان میں مولانا معین الدین عمرانی کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ تحریر کیا ہے:

ارسلہ السلطان محمد بن تغلق شاہ والی الھند المتوفی سنۃ اثنین وخمسین وسبعمائۃ الی القاضی عضد الدین الایجی بشیراز واتحف الیہ ھدایا غیر محصورۃ والتمس بالھند قدومہ[1]۔

(سلطان محمد تغلق (متوفی ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) نے مولانا معین الدین عمرانی کو بے شمار تحائف وہدایا دے کر قاضی عضد الدین ایجی کے پاس شیراز بھیجا اور ان سے ہندوستان تشریف لانے کی درخواست کی۔)

لیکن شیراز کے حکمران سلطان ابو اسحاق انجو کو پتا چلا تو اس نے اپنی پوری سلطنت قاضی عضد الدین کے سپرد کرنے کی پیش کش کی اور انھیں ہندوستان نہ آنے دیا۔ بعد ازاں قاضی موصوف نے اپنی تصنیف ''المواقف'' ابو اسحاق انجو کے نام معنون کر دی۔ حافظ شیرازی نے بھی والیٔ شیراز سلطان ابو اسحاق انجو کے عہد کے پانچ رتنوں کے ذکر میں اس کتاب اور اس کے مصنف کی تعریف کی ہے:

دگر شہنشہ دانش عضد در بینش   بنائے کار ''مواقف'' بنام شاہ پناہ

اس سے ''المواقف'' کی علمی قدر و قیمت اور سلاطین وقت کی اس سے بے پناہ رغبت و اعتنا کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

المواقف پر متعدد اہل علم نے حواشی و شروح لکھے جن میں ایک شرح میر سید شریف جرجانی کی ہے، جو محمد بن مبارک شاہ منطقی کے شاگرد تھے اور محمد بن مبارک نے براہ راست مصنف ''المواقف'' قاضی عضد الدین سے یہ کتاب پڑھی تھی۔ گویا میر سید شریف جرجانی کو صرف ایک واسطے سے قاضی موصوف کا شرف تلمذ حاصل تھا۔ یہ نہایت عمدہ شرح ہے جو مدارس عربیہ میں عرصے تک متداول رہی۔ اس پر بہت سے علما نے حواشی تحریر کیے، جن میں ہندی علما بھی شامل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدارس ہند میں ''شرح المواقف'' کا رواج دسویں صدی ہجری میں پڑا۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ سندھ کے حکمران شاہ حسین نے مولانا یونس سمرقندی (متوفی ۹۵۱ھ/۱۵۴۴ء) سے دیگر کتابوں کے علاوہ شرح المواقف کا درس بھی لیا تھا۔ دسویں صدی ہجری کے

---

[1] سبحۃ المرجان۔ ص ۳۷۔

Marfat.com

آخر میں ماوراء النہر کے ایک جلیل القدر عالم مولانا عبدالسمیع اندجانی وارد ہند ہوئے' وہ شرح المواقف اور حاشیہ مطالع کی تدریس میں خاص درک اور مہارت رکھتے تھے اور ان کتابوں کو بے حد پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ مولانا احمد جند کے شاگرد تھے۔ ان کا سلسلہ نسب صاحب ہدایہ تک پہنچتا ہے۔ ہفت اقلیم کے مصنف احمد امین رازی لکھتے ہیں:

قاضی عبدالسمیع از شاگردان مولانا احمد جند است و نسبتش بہ صاحب ہدایہ منتہی شود' و شرح مواقف و حاشیہ مطالع نیک می داند ❶۔

افاضل ہند میں سے متعدد حضرات نے شرح المواقف پر حواشی تحریر کیے' جن میں مولانا وجیہ الدین گجراتی' شیخ ہبۃ اللہ شیرازی اور مولانا عبدالوہاب کشمیری کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ ان کے بعد کے اہل علم میں سے میر محمد زاہد ہروی کابلی (متوفی ۱۱۱۱ھ/۱۷۰۰ء) نے جو مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے ہم عصر قاضی محمد اسلم ہروی (متوفی ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء) کے صاحب زادے تھے' شرح المواقف کے دوسرے موقف ''امور عامہ'' پر مبسوط و مفصل حاشیہ لکھا جو عرصے تک معقولات کے اعلیٰ درس میں داخل نصاب رہا۔

سید شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء) کی شرح المواقف پر ایک حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے لکھا اور واقعہ یہ ہے کہ فضلائے ہند میں سے اسی حاشیہ کو سب سے زیادہ قبولیت کا شرف حاصل ہوا۔ ہندوستان سے باہر کے اہل علم میں بھی اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا حاجی خلیفہ نے ہندی علما کے حواشی میں سے صرف مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حاشیہ کا ذکر کیا ہے۔

وعلی شرح المواقف للسید حاشیة لعبد الحکیم السیالکوتی اللاھوری ❷۔

(اور میر سید شریف جرجانی کی شرح مواقف پر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی لاہوری نے حاشیہ لکھا۔)

بیرون ہند میں اس حاشیہ کی مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ استنبول اور مصر میں شرح مواقف کے تین حاشیے طبع ہوئے ہیں' جن میں ایک حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ہے۔

لیکن مولانا سیالکوٹی کا حاشیہ شرح المواقف مکمل نہیں ہے' صرف موقف خامس (پانچویں موقف) تک ہے۔ مولانا ممدوح' مقدمہ حاشیہ میں خود وضاحت کرتے ہیں کہ یہ حاشیہ انھوں نے اپنے بیٹے مولانا عبداللہ لبیب کے لیے' جب کہ وہ یہ کتاب ان سے پڑھتے تھے' لکھا تھا۔ مولانا کے الفاظ یہ ہیں:

❶ ہفت اقلیم۔ ج ۲' ص ۳۱۴۔

❷ کشف الظنون۔ ج ۲' ص ۱۸۹۴۔

Marfat.com

هذه فوائد بل فرائد علقتها على شرح المواقف سيد المحقيقن وافضل المدقيقن عند قراءة قرة العين لهذا الغريب عبدالله الملقب باللبيب، تذكرة للاحباب وتحفة للاصحاب وعدة ليوم الحساب، واناالفقير المتمسك بالحبل المتين عبدالحكيم بن الشيخ شمس الدين۔

(یہ فوائد نکات جنھیں موتیوں سے تعبیر کرنا چاہیے، وہ (حواشی) ہیں، جو میں نے سید المحققین اور افضل المدققین (میر سید شریف جرجانی) کی شرح المواقف پر اس زمانے میں تحریر کیے تھے، جب مجھ غریب کی آنکھوں کی ٹھنڈک (میرا بیٹا) عبداللہ، جس کا لقب لبیب ہے، مجھ سے یہ کتاب پڑھتا تھا۔ میں نے ان حواشی کو اپنے احباب کے لیے ایک یادگار، رفقا کے لیے ایک تحفہ اور روز قیامت کے لیے توشہ بنایا ہے۔ اور میں فقیر دین کی مضبوط رسی کو پکڑنے والا عبدالحکیم بن شیخ شمس الدین ہوں۔)

حاشیہ شرح شمسیہ:

شمشیہ، علم منطق سے متعلق درجہ اعلیٰ کے درسی نصاب کا متن متین ہے، جس کا پورا نام ''الرسالۃ الشمسیہ فی قواعد المنطقیہ'' ہے۔ اس کے مصنف نجم الدین کاتبی ہیں، جو محقق طوسی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنی یہ تصنیف خواجہ شمس الدین وزیر کے نام معنون کی تھی، اسی وجہ سے یہ ''شمسیہ'' کے نام معروف ہوئی۔ اہل علم میں اس متن نے بڑی قبولیت حاصل کی اور علما نے اس کی شرحیں سپرد قلم کیں۔ ان شرحوں میں سب سے زیادہ مقبولیت قطب الدین رازی کی شرح کی ہوئی۔ ان کی شرح کا اصل نام ''تحریر المنطقیہ فی شرح الرسالۃ الشمسیہ'' ہے۔ مگر یہ شرح اپنے مصنف کے نام کی مناسبت سے ''قطبی'' کے نام سے معروف ہوئی۔

قطبی، اپنی تصنیف کے جلد ہی بعد داخل نصاب ہوگئی اور متعدد علمائے منطق نے اس پر حواشی تحریر کیے۔ لیکن علما وطلبا کے حلقے میں درجہ قبولیت صرف دو حاشیوں کو حاصل ہوا۔ ایک میر سید شریف جرجانی کے حاشیہ کو جو ''میر قطبی'' کے نام سے موسوم ہے اور دوسرے علامہ سعد الدین تفتازانی کے حاشیہ کو جو اپنے مصنف کے نام کی وجہ سے ''سعدیہ'' کہلاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ علمائے ہند قطبی سے، فیروز شاہ تغلق کے عہد میں، آٹھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں متعارف ہوئے۔ اور وہ اس طرح کہ فیروز شاہ تغلق نے دہلی میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس میں صدر مدرس مولانا جلال الدین رومی کو مقرر کیا تھا [1] جو صاحب قطبی قطب الدین رازی کے شاگرد تھے۔ ان کے سلسلہ تلمذ کا

[1] المعارف (لاہور) اپریل ۱۹۶۸ء، ص ۳۴۔

Marfat.com

ذکر شیخ عبدالحق دہلوی نے سید یوسف بن سید جمال حسینی کے حالات کے ضمن میں کیا ہے:

اوشاگرد مولانا جلال الدین رومی است کہ از تلامذۂ مولانا قطب الدین رازی شارح شمسیہ مطالع است ❶۔

(سید یوسف بن جمال حسینی) مولانا جلال الدین رومی کے شاگرد تھے، جو کہ مولانا قطب الدین رازی شارح شمسیہ ومطالع کے تلامذہ میں سے تھے۔)

خیال یہ ہے کہ مولانا جلال الدین رومی ہی اپنے استاد مولانا قطب الدین رازی کی یہ شرح شمسیہ (قطبی) ہندوستان لائے اور وہ یہاں کے مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہوئی اور علمانے اس سے اعتنا کیا۔ پھر دسویں صدی ہجری کے آغاز تک اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ نویں صدی ہجری کے آواخر میں علمائے ملتان، مولانا عزیز اللہ تلنبی اور مولانا عبداللہ تلنبی جب دہلی گئے تو مدارس ہند میں علم کلام کی شرح صحائف اور منطق کی شرح شمسیہ (قطبی) مروّج تھیں۔ انھوں نے دوسری کتابوں کا رواج ڈالا۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی مولانا عبداللہ تلنبی کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

آخرالامر از خرابی ملتان او و شیخ عزیز اللہ تلنبی رخت رحلت بہ دارالخلافہ دہلی کشیدند و علم معقول را دریں دیار مروّج ساختند، و پیش ازیں غیر شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نہ بود ❷۔

(بالآخر ہنگامہ ملتان کے دوران میں مولانا عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیز اللہ تلنبی جب رخت سفر باندھ کر (سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں) دارالسلطنت دہلی گئے تو ان دیار میں معقولات کی ترویج کی، ورنہ اس سے پہلے ہندوستان میں علم منطق کی شرح شمسیہ (قطبی) اور علم کلام کی شرح صحائف کے علاوہ کسی اور کتاب کا رواج نہ تھا۔)

چونکہ مدارس ہند میں شرح شمسیہ کو منطق کی اعلیٰ درجے کی نصابی کتاب سمجھا جاتا تھا، اس لیے علمائے ہند نے اس کو مرکز توجہ ٹھہرایا اور اس پر حواشی تحریر کیے، جن میں مولانا عبدالوہاب کشمیری، مولانا وجیہ الدین گجراتی، شیخ ہبۃ اللہ شیرازی اور قاضی نور اللہ شوستری کے حواشی قابل ذکر ہیں۔

لیکن "قطبی" اور "میر قطبی" پر ان علمائے گرامی قدر کے حواشی کے علاوہ ایک حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی لکھا، اور یہ حاشیہ اس زمانے میں لکھا جب ان کے بیٹے مولانا عبداللہ لبیب ان سے یہ کتابیں پڑھتے تھے۔ اس حاشیے نے فنی اعتبار سے بڑی شہرت پائی اور فاضل محشی نے اپنی دیگر تصانیف کی طرح اس کا انتساب بھی شاہ جہان بادشاہ کے نام کیا۔

---

❶ اخبار الاخیار۔ ص ۱۵۰۔

❷ مآثر الکرام دفتر اول، ص ۱۷۵، ۱۷۶۔

Marfat.com

اس حاشیے کی علمی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملا محبّ اللہ بہاری نے ''سلم العلوم'' میں قطبی کے کسی ہندی حاشیہ نویس کا حوالہ نہیں دیا' صرف اسی حاشیہ کو لائق التفات گردانا اور اس سے استفادہ کیا۔ سلم العلوم کے شارحین میں سے ملا حمد اللہ نے بالخصوص اپنی شرح میں متعدد مقامات پر ''فاضل لاہوری'' کا لفظ لکھ کر اس کی صراحت کی ہے اور ان کے افادات عالیہ کا ذکر کیا ہے۔

مولانا سیالکوٹی نے یہ حاشیہ سپرد قلم کرنے کی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ قطبی اور میر قطبی کے بعض حواشی اپنی شہرت کے باوجود بعض مقامات پر تشنہ تحقیق ہیں اور بعض اپنے اندر بلا مقصد طوالت لیے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے ان فضلا و علما کے حواشی ان کے نزدیک طلبا کے لیے زیادہ مفید مطلب اور لائق استفادہ نہ تھے' لہٰذا انھیں یہ حواشی تحریر کرنا پڑے [1]۔

حاشیہ شرح مطالع الانوار:

مطالع الانوار' قاضی سراج الدین محمود بن ابوبکر ارموی (متوفی ۶۸۹ھ/ ۱۲۹۰ء) کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ''حصے'' کو مصنف شہیر ''طرف'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ طرفِ اول منطق کے موضوع سے متعلق ہے' اور طرفِ ثانی' فلسفہ و حکمت کے مسائل پر محیط ہے۔ اس کے چار اجزا ہیں: جواہر' اعراض امور عامہ اور العلم الالٰہی۔!

مطالع الانوار کی شرح' قطب الدین رازی (متوفی ۷۶۶ھ/ ۱۳۶۵ء) نے ''لوامع الاسرار'' کے نام سے تحریر کی اور اس کا انتساب وزیر غیاث الدین کی طرف کیا۔ مطالع الانوار کی یہ شرح اہل علم میں بڑی مقبول ہوئی اور بہت سے فحول علما نے اس پر حواشی لکھے۔ قاضی نور اللہ شوستری کا کہنا ہے کہ ملا جلال الدین دوانی نے جو محقق جلال الدین کے عرف سے معروف ہیں' اس پر دو حاشیے لکھے تھے' ان میں سے ایک حاشیہ قدیم کہلاتا ہے اور دوسرا جدید۔!

لیکن سب سے زیادہ قبولیت کی نظر سے میر سید شریف جرجانی کے حاشیہ کو دیکھا گیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ میر شریف کا یہ حاشیہ' شرح مطالع الانوار کا دوسرا حاشیہ ہے۔ قدیم تریں (یا پہلا) حاشیہ مولی الحاج پاشا کا تھا [2]۔ کیونکہ میر شریف نے اس کے تقدم کا اعتراف بھی کیا ہے اور بعض مقامات پر مواخذہ بھی کیا ہے۔

میر سید شریف جرجانی کے بارے میں یہ واقعہ لائق تذکرہ ہے کہ وہ شرح مطالع الانوار خود اس کے مصنف (قطب الدین رازی) سے پڑھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے'

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ مجموعہ قطبی و حواشی قطبی۔ جلد ا' ص ۳ تا ۸۔

[2] المعارف لاہور۔ اپریل ۱۹۶۸ء۔ ص ۳۸۔

Marfat.com

مگر قطب الدین رازی بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ میں نوجوان طالب علم کے اعتراضات وایرادات کے دفاع وجواب کی ہمت نہ پائی‘ لہٰذا انھیں اپنے ایک شاگرد شمس الدین محمد بن مبارک شاہ کے پاس بھیج دیا اور فرمایا کہ ان سے پڑھنا‘ خود شارح (یعنی مجھ) سے پڑھنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ میر سید شریف جرجانی وہاں سے چلے اور شمس الدین محمد بن مبارک شاہ کے درس میں پہنچے۔ انھوں نے کہا‘ مستقل درس کے لیے تو وقت نہیں ہے‘ البتہ فلاں امیر زادہ یہ کتاب پڑھ رہا ہے‘ اس کے شریک درس ہو جاؤ۔ میر شریف نے اس کے ساتھ مل کر پڑھنا شروع کیا۔ درس میں تو وہ خاموش رہتے‘ لیکن شب کو مطالعہ کے لیے بیٹھتے تو بڑی محنت کرتے۔ ایک شب استاذ‘ مدرسہ اور طلبا کی دیکھ بھال کے لیے آئے۔ سید شریف کے حجرے کے قریب پہنچے تو انھیں پوری محنت سے مطالعہ میں مصروف اور مطالب کتاب میں مستغرق پایا۔ اندر سے کچھ اس طرح کی آواز آ رہی تھی:

قال الشارح کذاو قال الا ستاذ کذاو انا اقول کذا❶۔

(شارح کتاب (قطب الدین رازی) نے یہ کہا اور استاد نے یہ تقریر کی اور میں یہ کہتا ہوں۔)

استاذ مکرم‘ لائق شاگرد کے اس اسلوب مطالعہ سے اس درجہ متاثر اور خوش ہوئے کہ دوسرے روز سے مستقل سبق مقرر کر دیا۔ دوران طالب علمی ہی میں میر سید شریف نے شرح المطالع کا حاشیہ قلم بند کیا‘ اور اس حاشیہ نے فحول واکابر علما کے نزدیک اس درجہ شہرت وقبولیت پائی کہ انھوں نے اس حاشیہ پر حواشی تحریر کیے‘ جن میں میر مرتضی شریفی‘ مرزا جان شریفی اور دیگر علمائے عظام شامل ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ شرح مطالع الانوار سے ہندی علما‘ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں آشنا ہو چکے تھے‘ کیونکہ مدرسہ فیروز شاہی کے ایک مدرس (مولانا جلال الدین رومی) وہ بزرگ تھے جو خود مولانا قطب الدین رازی کے شاگرد تھے❷۔ غالباً یہ کتاب دیار ہند میں وہی لائے ہوں گے لیکن یہ مدارس ہند میں داخل نصاب کب ہوئی؟ اس سے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ سلطان شاہی بیگ (متوفی ۹۲۸ھ/۱۵۵۲ء) نے جو مغل حکمران ظہیر الدین بابر سے پہلے سندھ کا حاکم تھا‘ اور حکومت وسیاست کے ساتھ ساتھ‘ علم وفضل کی نعمت سے بھی مالا مال تھا‘ شرح مطالع پر تعلیقات قلم بند کی تھیں۔ بعد ازاں ۹۷۲ھ/۱۵۶۵ء میں مولانا عبدالسمیع اندجانی ہندوستان آئے تو اس کتاب کی ترویج واشاعت اور زیادہ ہوئی۔ اس لیے کہ ان کو شرح مواقف اور شرح مطالعہ کے درس وتدریس میں بڑی مہارت حاصل تھی۔

قاضی عبدالسمیع ۔۔۔۔ شرح مواقف وحاشیہ مطالع نیک می داند❸۔

---

❶ الشقائق النعمانیہ بر حاشیہ تاریخ ابن خلکان۔ ج ۱‘ ص ۲۳۹۔

❷ اخبار الاخیار۔ ص ۱۵۰۔

❸ ہفت اقلیم۔ ج ۳‘ ص ۴۴۳‘ ۴۴۴۔

Marfat.com

شرح مطالع، برصغیر کے حلقہ درس میں متداول ہوئی تو متعدد علمائے ہند نے اس پر حواشی لکھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بیٹے شیخ نورالحق دہلوی نے بھی حاشیہ لکھا۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی اس پر حاشیہ تحریر کیا، جس کا قلمی نسخہ ہندوستان کی بانکی پور لائبریری میں موجود ہے ❶۔

حواشی درکنار شرح حکمۃ العین:

حکمۃ العین، فلسفہ وحکمت سے متعلق علامہ نجم الدین کاتبی قزوینی کی تصنیف ہے۔ اس کی شرح ملا قطب الدین رازی نے شرح حکمۃ العین کے نام سے لکھی تھی۔ شرح حکمۃ العین جب نصابِ درسیہ میں آئی تو علما نے اس پر حواشی لکھے۔ علامہ جلال الدین دوانی نے بھی اس کا حاشیہ سپرد قلم کیا تھا۔ دسویں صدی ہجری میں شرح حکمۃ العین ہندوستان میں متداول ہوئی تو یہاں کے علما نے بھی اس کو مستحق التفات گردانا۔ اس پر ایک حاشیہ مولانا وجیہ الدین گجراتی نے لکھا ❷۔

ان کے شاگرد مولانا خوش حال تاشقندی نے بھی دیگر کتابوں کے علاوہ اس پر حاشیہ تحریر کیا۔ عبدالباقی نہاوندی لکھتے ہیں:

ملا خوشحال خلف صدق مولانا قاسم تاشقندی است۔۔۔ اوائل طالب علمی شرح ہدایہ وحکمۃ العین و شرح تجرید وحاشیہ قدیم وشرح چغمینی وتحریر اقلیدس حل نمودہ ❸۔

ان حضرات علمائے ہند کے علاوہ گیارھویں صدی ہجری میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس کو موضوع فکر ٹھہرایا اور اس پر حواشی تحریر فرمائے۔

حواشی درکنار شرح ہدایۃ الحکمۃ:

ہدایۃ الحکمۃ، اثیرالدین ابہری کی تصنیف ہے۔ یہ اگرچہ ایک صغیرالحجم رسالہ ہے، لیکن اپنے موضوع میں بڑا اہم ہے اور بہت سے علما نے اس کو شروح وحواشی کا مستحق گردانا۔ اس کی ایک شرح، علامہ جلال الدین دوانی کے تلمیذ رشید میر حسین میبذی نے لکھی، جو اس کے شارح کے نام پر "میبذی" کہلائی۔ پھر علما میں یہی میبذی (یعنی شرح ہدایۃ الحکمۃ) مروج ہوگئی۔ صدرائے شیرازی نے بھی ہدایۃ الحکمۃ کی شرح لکھی جو ان کے نام پر "صدرا" کہلاتی ہے۔

---

❶ المعارف لاہور- اپریل ۱۹۶۸ء- ص ۴۰-

❷ مآثر الکرام- ص ۱۸۱، ۱۸۲-

❸ مآثر رحیمی- ج ۳، حصہ اول، ص ۳۲، ۳۳-

Marfat.com

حلقہ علمائے برصغیر میں بھی میبذی (یعنی شرح ہدایۃ الحکمۃ) پڑھنے اور اس پر حواشی لکھنے کا رواج ہوا۔ ان حواشی میں مولانا محمد حسن علمی، مولانا مفتی نورالحق دہلوی بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور قاضی نوراللہ شوستری کے حواشی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس پر ایک مفید حاشیہ لکھا۔

حواشی در کنار مراح الارواح:

مراح الارواح، احمد بن علی بن مسعود کی تالیف ہے اور عربی زبان میں علم صرف سے متعلق ہے۔ یہ اگرچہ مختصر کتاب ہے لیکن بقول حاجی خلیفہ بڑی مفید ہے اور مدارس عربیہ میں متداول و مشہور ہے:

و هو مختصر نافع متداول❶۔

اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں علمائے روم اس کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور اس نواح میں یہ داخل نصاب تھی۔ اسی وجہ سے اس کی متعدد علما نے شرحیں لکھیں۔ ایک شرح، صحیح بخاری کے معروف شارح علامہ بدرالدین عینی نے لکھی۔ ہندوستان میں مراح الارواح کو بڑی وقعت حاصل ہوئی۔ حضرت علامہ نواب صدیق حسن خاں نے اپنے آخری ایام زندگی میں ''تصریف الریاح'' کے نام سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی اس کتاب کو لائق توجہ ٹھہرایا اور اس پر حواشی تحریر کیے۔

تکملہ حاشیہ عبدالغفور:

علم نحو کی بہت مشہور اور متداول کتاب ''کافیہ'' ہے۔ کافیہ شیخ جمال الدین ابوعمرو عثمان بن عمرو مالکی (متوفی ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء) کی تصنیف ہے، جو ابن حاجب مالکی کے نام سے معروف ہیں۔ یہ اپنے موضوع کا ایک مختصر متن ہے مگر نہایت بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ حاجی خلیفہ نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

وهي مختصر معتبرة شهرته مغنيته عن التعريف❷۔

(یہ ایک مختصر اور قابل اعتماد متن ہے، جس کی شہرت نے اسے تعریف سے بے نیاز کر دیا ہے۔)

کافیہ کو مدارس عربیہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور علما نے اس کی طرف بے حد التفات کیا۔ اہل علم نے جتنے شروح یا حواشی کافیہ پر تحریر کیے ہیں، دوسری کم ہی کتابوں پر کیے ہوں گے۔ ان سب کا استقصا مشکل ہے۔ مشاہیر شارحین میں سے شیخ رضی الدین محمد بن الحسن استرآبادی نحوی کی شرح کافیہ بڑی مشہور ہے۔

---

❶ کشف الظنون۔ ج ۲، ص ۱۶۵۱۔

❷ کشف الظنون۔ ج ۲، ص ۱۳۷۰۔

Marfat.com

علامہ جلال الدین سیوطی تو رضی کی اس شرح کافیہ کی انتہائی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح مسائل نحو کی جمع و تدوین اور تحقیق، رضی کی شرح کافیہ میں کی گئی ہے اور کسی کتاب میں نہیں کی گئی، بلکہ کتب نحو کی اکثر کتابوں میں اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف ہی نہیں ہوئی۔

کافیہ کے دوسرے مشہور شارح مولانا عبدالرحمٰن جامی متوفی ۸۹۴ھ ہیں، جن کی شرح کافیہ، ''الفوائد الفیائیہ'' نہایت شہرت کی حامل ہے اور اپنے شارح کے نام پر ''شرح جامی'' کے نام سے موسوم ہوگئی ہے۔ علما و طلبا میں شرح جامی کی قبولیت و تداول کا یہ عالم ہے کہ کافیہ کے ساتھ یہ باقاعدہ مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

علمائے ہند کو کافیہ سے شغف و تعلق شروع ہی سے رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، آٹھویں صدی ہجری کے ربع اول میں اس کی ترویج کا حلقہ بڑھا، جب شیخ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے مرید و تلمیذ اور صرف کی درسی کتاب ''زرادی'' کے مصنف شہیر مولانا فخر الدین زرادی نے اس کے مسائل کو حل کیا، لیکن اس کی باقاعدہ شرح لکھنے والے پہلے ہندی عالم دین ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی تھے جنھوں نے ''الارشاد'' کے نام سے اس کی شرح لکھی اور ''شرح ہندی'' کے نام سے معروف ہوئی۔ اس سے پہلے کے کسی ہندی شارح کافیہ کا نام تذکرہ و سوانح کی کتابوں میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی شرح کافیہ کو ہند اور بیرون ہند میں بڑی پذیرائی ہوئی اور اس نے ''شرح ہندی'' کے نام سے شہرت پائی۔ عرصے تک یہ اپنی گوناگوں افادیت کی وجہ سے علمائے روم و عجم کا موضوعِ تحشیہ بنی رہی۔ اس پر مولی توقانی، خطیب ابوالفضل گاذرونی اور میر غیاث الدین منصور نے حواشی تحریر کیے۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نواسے شیخ صفی الدین ردولوی نے بھی کافیہ کی شرح لکھی اور اسے ''غایۃ التحقیق'' کے نام سے موسوم کیا۔

کافیہ کی معروف شرح ''شرح جامی''، جس کا ذکر اوپر ہوا، مدارس عربیہ میں مروّج ہے، اور علما نے اس کو کافیہ ہی کی طرح لائق اعتنا جانا اور اس پر حواشی لکھے۔ سب سے اول اس پر ملا عصام الدین اسفرائینی نے حاشیہ لکھا اور بیشتر مقامات پر مولانا جامی کو ہدف اعتراضات ٹھہرایا۔ اس کا جواب مولانا جامی ہی کے ایک شاگرد مولانا عبدالغفور لاری (متوفی ۹۱۲ھ/۱۵۰۶ء) نے ایک حاشیہ کی شکل میں دیا اور کافیہ کا یہ حاشیہ ''حاشیہ عبدالغفور'' کہلایا۔ مگر وہ اسے مکمل نہ کر پائے [1]۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا یہ خاص موضوع تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو قابل التفات گردانا اور اس غیر مکمل حاشیہ کی تکمیل کی۔ اہل علم میں مولانا سیالکوٹی کی اس علمی کوشش کو ''تکملہ حاشیہ عبدالغفور'' کے نام سے شہرت نصیب ہوئی۔

---

[1] کشف الظنون۔ ج ۲، ص ۱۳۷۱، ۱۳۷۲۔

Marfat.com

حاشیہ حاشیہ عبدالغفور:

ملا جامی کے شاگرد مولانا عبدالغفور لاری نے اپنے حاشیہ میں ملا عصام الدین اسفرائینی کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو انھوں نے ملا جامی پر وارد کیے تھے۔ بعدازاں ان دونوں (ملا عصام الدین اور ملا عبدالغفور) پر بعض علما نے محاکمہ کیا' مثلاً مولی مصلح الدین لاری نے اپنے حاشیہ میں ان دونوں کے نقطہ فکر سے بحث کی۔ مولانا عیسی بن محمد صفوی ایجی (متوفی ۹۵۵ھ/۱۶۴۸ء) نے بھی ان پر محاکمہ کیا۔ ان کے بعد ابراہیم مامونی شافعی نے ملا عبدالغفور لاری کے حاشیہ پر حاشیہ لکھا۔ اس حاشیہ میں انھوں نے مولانا عیسی بن محمد صفوی سے استفادہ کیا تھا۔

کافیہ اور شرح جامی تو مدارس ہند میں بہت مروّج رہے ہیں اور علما نے ان سے بڑا استفادہ کیا ہے' لیکن حاشیہ عبدالغفور سے بھی وہ بے خبر نہ تھے' اس سے وہ مستفید ہوئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حاشیہ عبدالغفور پر حاشیہ صرف مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے تحریر کیا ہے' اور کسی عالم کا نام تذکروں میں مرقوم نہیں۔ پہلے انھوں نے تکملہ حاشیہ عبدالغفور لکھا' بعد میں حاشیہ' حاشیہ عبدالغفور سپرد قلم کیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا سیالکوٹی کو اس حاشیہ سے بہت رغبت تھی اور اسے وہ طلبا و علما کے لیے مفید سمجھتے تھے۔

حاشیہ مطول:

علامہ سراج الدین ابو یعقوب سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ/۱۲۶۹ء) نے صرف' نحو' بلاغت' عروض وغیرہ علوم ادب سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی' جس کا نام ''مفتاح العلوم'' ہے۔ حلقہ اہل علم میں یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی۔ اسے داخل درس کیا گیا اور متعدد علمائے مشاہیر نے اس پر شروح لکھیں' جن میں قطب الدین شیرازی' علامہ سعدالدین تفتازانی اور میر سید شریف جرجانی کی شروح بالخصوص لائق تذکرہ ہیں۔ علمائے ہند نے بھی اس کتاب کو شائستہ التفات ٹھہرایا اور مولانا معین الدین عمرانی دہلوی نے اس پر حاشیہ تحریر کیا❶۔ ان کے علاوہ شیخ حسین ناگوری نے جو شیخ حمید الدین ناگوری کی اولاد سے تھے' اس کی قسم ثالث کی ایک مفصل و مبسوط شرح سپرد قلم کی❷۔

بعدازاں علمائے عظام نے مفتاح العلوم کے مختصرات بھی تیار کیے۔ المواقف فی الکلام کے مصنف شہیر قاضی عضدالدین ایجی نے بھی ''فوائد غیاثیہ'' کے نام سے اسے مختصر کیا۔ یہ وہی فوائد غیاثیہ ہے' جس کی صاحب شمس بازغہ ملا محمود جون پوری نے ''فوائد'' کے نام سے شرح تحریر کی۔

❶ اخبار الاخیار۔ص ۱۴۴۔

❷ تفصیل کے لیے دیکھیے: الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۳۹۔ و اخبار الاخیار ص ۱۸۲۔

Marfat.com

علامہ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن بن عمر قزوینی شافعی المعروف بہ خطیب دمشق (متوفی ۷۳۹ھ/ ۱۳۳۹ء) نے سکا کی مفتاح العلوم کا ''تلخیص المفتاح'' کے نام سے اختصار کیا' جو اس کی القسم الثالث کا اختصار ہے اور معانی' بیان اور بدیع کے فنون کو محتوی ہے۔ تلخیص المفتاح نے علما وطلبا میں بہت جلد شہرت ومقبولیت حاصل کر لی اور متعدد علما نے اس کی شرحیں قلم بند کیں۔

علامہ سعد الدین تفتازانی نے بھی تلخیص المفتاح کو مرکز التفات ٹھہرایا اور اس کی یکے بعد دیگرے دو شرحیں لکھیں۔ ایک بڑی مفصل' جسے انھوں نے ''المطول'' کے نام سے موسوم کیا۔ یہ شرح ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں تکمیل کو پہنچی۔ دوسری اس سے مختصر' جو ''مختصر المعانی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ شرح ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء کو غجدوان میں مکمل ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں شہرت وتداول کے لحاظ سے بلند مرتبے کو پہنچیں۔ علما وطلبا نے ان کو بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا اور مدارس عربیہ کے اعلیٰ نصاب میں داخل کی گئیں۔ بہت سے علمائے عظام نے ان کو حواشی وتعلیقات کا موضوع ٹھہرایا ❶۔

مدارس ہند میں مطول کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی اور علما نے اس پر تحشیے لکھے۔ ہمارے ہاں عربی مدارس کے نصاب میں مطول ''ما انا قلت'' کی بحث تک پڑھائی جاتی ہے۔ برصغیر میں اس کتاب کا بہت رواج تھا اور علم وادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات' اس کا باقاعدہ اساتذہ سے درس لیتے تھے۔ اس کی اہمیت ومقبولیت کا اندازہ میر کے اس واقعہ سے ہوسکتا ہے جو ہندوستان کے مشہور عالم مولانا شبیر احمد خاں غوری نے ''ذکر میر'' کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اردو کے مشہور شاعر میر نے لکھا ہے کہ انھوں نے دہلی کے ایک استاد سے مطول پڑھی' اور اس کے بدلے میں وہ انھیں اپنا صبح کا ناشتہ حاضر خدمت کر دیا کرتے تھے ❷۔

متعدد معروف اور کبار علمائے ہند نے مطول پر حواشی تحریر کیے' جن میں شیخ طاہر بن رضی ہمدانی' مولانا وجیہ الدین گجراتی' قاضی نور اللہ شوستری اور مفتی وجیہ الدین گوپاموی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان سے بعد کے فضلائے ہند میں سے سید محمد بن محمد قنوجی' شیخ نور الدین بن محمد صالح گجراتی' مولانا نور الدین کشمیری' قاضی نجف علی بن عظیم الدین جھجری' قاضی عبدالنبی احمد نگری۔ شیخ فرید الدین احمد آبادی' شیخ جمال الدین بن رکن الدین گجراتی اور حکیم معز الدین خالص پوری کے حواشی کا پتا چلتا ہے ❸۔

گیارھویں صدی ہجری میں ہمارے ممدوح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس اہم کتاب کو فکر ونظر کا محور بنایا اور علوم بلاغت وفصاحت اور بیان وبدیع کے اس عظیم شہکار پر حاشیہ تحریر کیا۔

---

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: کشف الظنون۔ ج ۲' ص ۱۷۶۲ تا ۱۷۶۸۔

❷ المعارف (لاہور) مئی ۱۹۶۸ء۔ ص ۴۸

❸ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند۔ ص ۳۹۔

Marfat.com

ترجمہ غنیۃ الطالبین:

مولانا سیالکوٹی نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "غنیۃ الطالبین" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ انھوں نے لاہور کے ایک عارف باللہ بزرگ شیخ بلاول قادری لاہوری کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس کتاب کے ساتھ مولانا کے صاحب زادے مولانا عبداللہ لبیب کا خطبہ بھی شامل ہے۔

الدرۃ الثمینہ:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی فہرست تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر مروّجہ علوم کی مشہور درسی کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔ مستقل کتاب صرف ایک ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کا دور کتب درسیہ پر حواشی وتعلیقات اور تشریحات وتوضیحات کا تھا' اور اس دور میں یہ بہت بڑی علمی اور فنی خدمت متصور ہوتی تھی۔ اس ضمن میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے' ان میں کوئی ان کا ثانی نہیں ہے۔ دقیق مسائل کو وضاحت سے پیش کرنا اور ان کی زلف گرہ گیر کو حسن وخوبی سے سلجھانا' انہی کا کام تھا۔ ان کے ذہن رسا نے جن پیچیدگیوں کو حل اور جن علمی عقدوں کو وا کیا' وہ کوئی دوسرا نہیں کر سکا۔

گزشتہ سطور میں ان کے حواشی وتعلیقات کا تعارف کرایا جا چکا' اب ان کی ایک مستقل تصنیف "الدرۃ الثمینۃ فی علم الواجب تعالیٰ" کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا مقصود ہے ____ یہ ان کی ایک معرکہ آرا کتاب ہے۔ اسے الرسالۃ الخاقانیہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کی بیشتر کتابیں ان کے محسن و مربی اور قدردان' شاہ جہان بادشاہ کے نام منتسب ہیں۔ اس گراں مایہ تصنیف کا انتساب بھی برصغیر کے اسی مغل حکمران کی طرف ہے لہٰذا اس کا نام الرسالۃ الخاقانیہ رکھا گیا۔ کتاب کے آخر میں مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

لكن هذا اخر ما قصد نا ايراده فى هذه الرسالة الخاقانية۔

اس کی وجہ تالیف یہ ہے کہ فرماں روائے ایران شاہ صفی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہ عباس دوم اورنگ ایران پر متمکن ہوا تو بادشاہ ہندشاہ جہان نے شاہ صفی کی تعزیت اور شاہ عباس کی تخت نشینی پر مبارک باد پیش کرنے کی غرض سے اپنے ایک امیر جان نثار خاں کی قیادت میں ایک وفدِ سفارت' ایران روانہ کیا' جس میں محمد فاروق (مشرف) اور محبّ علی (وقائع نویس) شامل تھے۔ یہ تین رکنی وفدِ سفارت ایران پہنچا تو ایرانی امرا و علما سے ان کی طویل ملاقاتیں ہوئیں اور ان کے اعزاز میں مختلف علمی مجالس منعقد کی گئیں' جن میں ایرانی علما نے ان سے فلسفے کے بعض مباحث پر گفتگو کی۔ ایران کا وزیر اعظم اس زمانے میں خلیفہ سلطان اعتماد الدولہ تھا' جو بہت بڑا معقولی تھا' اس نے بھی ہندوستانی علما سے معقولات کے مسائل پر اپنے نقطہ فکر کا بے تکلفی سے اظہار کیا۔ مغلیہ دور کا ہندوستان بھی علوم عقلیہ کا گہوارہ تھا اور اس ملک میں اس وقت بڑے بڑے منطقی اور فلسفی موجود

Marfat.com

تھے۔ خود اس وفدِ سفارت کے ارکان میں محمد فاروق مشرف اور محبّ علی وقائع نویس فلسفہ وحکمت کے فاضل کامل تھے اور معقولات پر عبور میں ان کو بڑا غرہ تھا۔ مگر ایرانی وزیر اعظم نے ان پر ایسے سوالات کیے کہ یہ حیران رہ گئے۔ مثلاً اس نے کہا کہ امام غزالی نے قدم عالم، علم واجب تعالی اور نفیِ حشرِ اجساد کے بارے میں ابونصر فارابی اور ابن سینا کی تکفیر کی ہے۔ لیکن بعض علما ان مسائل میں تاویل سے بھی کام لیتے ہیں۔ فرمایئے آپ کی کیا رائے ہے۔؟

سفارت ہند کے ارکان، ایرانی وزیر کے ان فاضلانہ سوالات کا تسلی بخش جواب نہ دے سکے، جس سے علوم عقلیہ میں علمائے ہند کی عالمی شہرت کو دھچکا لگا۔ شاہ جہان ان دنوں کابل میں مقیم تھا۔ اس علمی ہزیمت کی خبر سن کر وہ متاثر تو ضرور ہوا، مگر وہ اتنی جلدی ایرانی علما کے مقابلے میں ہندوستانی علما کی شکست تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے اپنے وزیر علامی سعد اللہ خاں سے کہا کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو خط لکھا جائے کہ وہ مذکورہ بالا مسائل ثلاثہ سے متعلق ایک مختصر مگر جامع رسالہ لکھ کر شاہی دربار میں پیش کریں۔

سعد اللہ خاں نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو دس پندرہ دن کے اندر اندر رسالہ لکھنے کی فرائش کی، مگر مولانا نے خط پڑھتے ہی قلم ہاتھ میں پکڑا اور صرف ایک ہفتے میں ایسا عمدہ رسالہ قلم بند کر دیا جو مذکورہ مسائل پر پوری طرح حاوی تھا اور اپنے دامنِ صفحات میں ایسی جامعیت لیے ہوئے تھا، جو ایک ضخیم کتاب میں بھی مشکل سے پائی جاتی ہے۔

الدرۃ الثمینہ یا الرسالۃ الخاقانیہ دو ابواب پر منقسم ہے۔

باب اول علم باری تعالی سے متعلق اور اس مسئلے کی تشریح وتوضیح پر مشتمل ہے۔ یہ باب تین ابحاث پر محیط ہے۔ پہلی بحث اثبات باری تعالی کے بارے میں ہے۔ دوسری بحث میں کیفیت علم باری کی وضاحت سے تعرض کیا گیا ہے اور تیسری بحث میں علم باری تعالی کی عمومیت معرض بیان میں لائی گئی ہے۔

کتاب کا یہ حصہ نہایت علمی اور گہرا ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک فلسفہ وحکمت کی روشنی میں اثبات باری تعالی، کیفیت علم باری تعالی اور عمومیت علم باری تعالی کے اہم مسئلے کی توضیح کی گئی ہے۔

کتاب کے باب ثانی میں مولانا عبدالحکیم نے دوسرے مسائل یعنی حشر ونشر اجساد اور حدوث وقدوم عالم کو موضوع بحث ٹھہرایا ہے۔ اس سلسلے میں ابونصر فارابی اور ابن سینا کی تکفیر کے بارے میں امام غزالی کی رائے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ بعض دیگر فلاسفۂ اسلام اور اصحاب علم کے نظریات بھی بیان کیے ہیں۔ اس ضمن میں محقق دوانی اور امام رازی کی رائے بھی نقل کی ہے۔ بعد ازاں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

اقول تکفیر هم بانکار الحشر الجسمانی حق لانه مما نطق به الکلام المجید۔

(میں کہتا ہوں کہ حشر اجساد سے انکار کی بنا پر ان کی تکفیر ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ

Marfat.com

وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں خود قرآن مجید ناطق ہے۔)

اسی طرح نفی قدم عالم سے متعلق بھی قرآن مجید سے استدلال کرتے ہیں' اور فرماتے ہیں کہ یہ نظریات خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔

بعض دیگر تصانیف:

ان تصانیف وحواشی کے علاوہ ڈاکٹر زبید احمد اور منشی محمد الدین فوق کی کتابوں سے مولانا عبدالحکیم کی مندرجہ ذیل تصانیف کا پتا چلتا ہے۔

دلائل التجدید: یہ رسالہ حضرت مجدد الف ثانی کے دعویٰ تجدید کی تائید اور اثبات کے موضوع پر ہے۔ اس میں مولانا نے مستحکم دلائل سے ثابت کیا ہے کہ شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ کا دعوی صحیح ہے اور یہ دور مجدد الف ثانی کا متقاضی ہے اور وہ شیخ احمد سرہندی ہیں۔

حاشیہ علیٰ شرح تہذیب: منطق کی مشہور کتاب شرح تہذیب پر مولانا سیالکوٹی کا حاشیہ

القول المحیط: علم منطق کے بارے میں ایک رسالہ۔

سیالکوتی علی التصورات: یہ بھی علم منطق میں ہے۔

زبدۃ الافکار۔

حواشی علی الکشاف۔

حواشی علی الحسامی۔

مسجد اور مدرسہ وغیرہ:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ابتدائی دور غربت اور تنگ دستی کا تھا' لیکن شاہ جہان سے رابطہ پیدا ہو جانے کے بعد ان کے حالات بالکل بدل گئے تھے اور وہ امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہ جہان ان کے علم و فضل سے انتہائی متاثر اور ان کا بہت بڑا قدر دان تھا۔ اس نے ان کو اچھی خاصی جاگیر عطا کی۔ کئی مرتبہ نقد روپے اور انعام واکرام سے نوازا۔ سونے سے تلوایا اور پھر ان کے ہم وزن رقم جو چھ ہزار روپے بنتی تھی' ان کی خدمت میں پیش کی۔ چنانچہ سولھویں سال جلوس (۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) کے واقعات میں محمد صالح کنبو لکھتا ہے۔

جامع فضائل وہبی وکسبی مولانا عبدالحکیم سیالکوتی را بہ زر وزن کردہ' شش ہزار روپیہ ہم وزن آں گنج ہنر بدو مرحمت نمودند [1]۔

(یعنی (شاہ جہان نے) جامع فضائل وہبی وکسبی مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو سونے سے تلوایا اور پھر اس

[1] عمل صالح - ج ۲' ص ۳۴۹۔

Marfat.com

کے ہم وزن چھ ہزار روپے ان کو عنایت کیے۔)

مولانا ذوالفقار احمد کی روایت کے مطابق شاہ جہان نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو دو مرتبہ ترازو میں تولا اور جو روپیہ ان کے تول میں آیا' وہ انہی کو عطا کر دیا۔ ہر تول میں چھ ہزار روپے آئے۔ متعدد گاؤں بھی ان کو شاہ جہان نے جاگیر میں دیے ❶۔

مولانا سیالکوٹی نے یہ روپیہ بڑے اچھے کاموں میں خرچ کیا۔ اپنے مکان کے قریب ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا اور ساتھ ہی مسجد تعمیر کی۔ اس مدرسے میں وہ خود درس دیتے تھے اور ہند اور بیرون ہند کے علما و طلبا ان سے علم حاصل کرتے تھے۔ ان کے قیام اور مصارف کے مولانا خود ہی کفیل تھے۔ ان کی تعمیر کردہ مسجد اب بھی سیالکوٹ کے محلّہ میانہ پورہ میں موجود ہے۔ منشی محمد الدین فوق کے حسب تصریح لفظ ''میانہ'' پنجابی زبان میں مسجد کے ملا' امام' خطیب اور میاں کے لیے بولا جاتا ہے۔ چونکہ مدرسہ اور مولانا کے قیام کی وجہ سے طلبائے علم وہاں رہتے تھے' لہٰذا اس جگہ کا نام ''میانہ پورہ'' مشہور ہو گیا' اور یہ نام مولانا کے زمانے ہی سے چلا آ رہا ہے ❷۔

لالہ امین چند نے بھی یہی لکھا ہے۔

ان (مولانا عبدالحکیم) کا مدرسہ بڑا نامی گرامی تھا' چنانچہ اس موضع کا نام 'میانہ پورہ' انہی کے باعث مشہور ہے ❸۔

مفتی غلام سرور قریشی بھی یہی بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ محلّہ مولانا عبدالحکیم ہی کی وجہ سے (میانہ پورہ کے نام سے) مشہور ہے' اور اسے مولانا نے شاہ جہان کے عہد میں آباد کیا تھا ❹۔

منشی محمد الدین فوق لکھتے ہیں۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی مسجد کے قریب کچھ زمین خالی پڑی ہوئی تھی' (مشہور اہل حدیث عالم) مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی مرحوم کے والد مستری قادر بخش مرحوم نے کمیٹی سے خرید کر یہ جگہ مسجد کے نام وقف کر دی۔ ۱۹۱۹ء میں اس زمین کو صحن مسجد میں شامل کر کے مسجد کی توسیع کی گئی۔ ایک فوارہ اور حوض بھی تیار کیا گیا جو پانی سے لبریز رہتا تھا۔

مولانا نے مسافروں کی سہولت کے لیے ایک بہت بڑی کارواں سرائے اور حمام بھی تعمیر کرائے۔ منقول ہے کہ انگریزوں نے ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء میں اس عمارت کو خیراتی شفاخانے میں بدل دیا تھا ❺۔ موجودہ سول ہسپتال' اسی خیراتی شفاخانے اور ڈسپنسری کی عمارت میں بنایا گیا ہے۔

---

❶ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب۔ص ۱۹۸' ۱۹۹۔

❷ مولانا عبدالحکیم' سوانح۔ص ۴۴' ۴۵۔

❸ تواریخ سیالکوٹ۔ص ۲۹۴۔

❹ تاریخ مخزن پنجاب۔ص ۲۵۵۔

❺ سوانح۔ص ۴۵۔

Marfat.com

مولانا عبدالحکیم نے ایک شان دار باغ بھی بنایا تھا اور اس کے اردگرد مضبوط فصیل تعمیر کی تھی۔ منشی محمد الدین فوق کا بیان ہے۔

''راقم الحروف، ۱۹۲۰ء میں وہاں گیا۔ ایک دو آموں کے درخت نظر آئے۔ ایک کنواں جاری تھا اور اس کے ساتھ کچھ مزروعہ اراضی تھی۔ اس جگہ مولانا کی قبر بھی ہے۔ پوچھا مولانا کا باغ کہاں ہے؟ جواب ملا یہی باغ ہے، جہاں تم کھڑے ہو اور جہاں یہ کھیت نظر آرہے ہیں۔ اب نہ باغ ہے نہ فصیل نہ کوئی عمارت۔''

مولانا نے سیالکوٹ میں ایک خاصا بڑا تالاب بھی تعمیر کرایا تھا۔ کہا جاتا ہے اس تالاب کی تعمیر پر مولانا نے لاکھوں روپے خرچ کیے تھے اور اس میں براہ راست دریائے چناب سے ایک نہر کے ذریعے پانی لانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس سے ملحق کچھ عمارتیں، برجیاں اور پل وغیرہ بھی تھے۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں یہ سب کچھ برباد ہو گیا ____ اس تالاب کے سلسلے میں لالہ امین چند کے یہ الفاظ قابل ذکر ہیں۔

یہ وہی تالاب ہے کہ جو مولوی عبدالحکیم کے زمانے میں بنوایا تھا مگر مدت سے اٹ گیا تھا۔ اب بعد غدر جناب مسٹر پرنسپ صاحب بہادر کے ایما سے باہتمام سید قائم علی صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ چودھریانِ شہر نے تیار کرایا اور کچھ روپیہ سرکار نے بھی عطا کیا۔ گویا کل اس شہر میں یہی ایک تالاب ہے ❶۔

بعدازاں ایک زمانہ آیا کہ یہی تالاب سیالکوٹ کے مقامی بجلی گھر کے پانی کے ذخیرے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔

سیالکوٹ میں مولانا عبدالحکیم کی تعمیر کردہ عیدگاہ بھی ہے جو اب تک موجود ہے۔ اس میں شہر کے لوگ عید کی نماز پڑھتے ہیں اور اس کا انتظام مقامی انجمن اسلامیہ کے سپرد ہے۔ اس عیدگاہ کے چار دروازے تھے اور ہر دروازے پر بلند مینار تعمیر کیے گئے تھے۔ مرور ایام سے دیوار اکثر جگہ سے شکستہ ہو گئی۔ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں بعض مخیّر لوگوں نے روپیہ اکٹھا کیا اور عیدگاہ کی مرمت کرائی گئی ❷۔

وفات:

مولانا عبدالحکیم نے ۱۶ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ/۲۳ دسمبر ۱۶۵۶ء کو وفات پائی اور سیالکوٹ میں مدفون ہوئے ❸۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تاریخ وفات میں قدرے اختلاف ہے۔ بختاور خاں کا بیان ہے۔

دوازدہم ربیع الاول سنہ ہزار وشصت و ہفت در سیالکوٹ رحلت نمود ❹۔

---

❶ تواریخ سیالکوٹ۔ص ۲۹۴۔

❷ سوانح۔ص ۴۶۔

❸ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والارب۔ص ۱۹۸، ۱۹۹۔

❹ مراۃ العالم۔ ورق ۴۹۲ب۔

Marfat.com

(۱۲/ربیع الاول ۱۰۶۷ھ کو سیالکوٹ میں وفات پائی۔)

غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی دو تصانیف میں دو تاریخ ہائے وفات بیان کی ہیں۔ ماثر الکرام میں لکھتے ہیں۔

دواز دہم ربیع الاول (۱۰۶۷ء) سبع وستین والف طومار حیات پیچیدہ و در سیالکوٹ فون گردید ❶۔

(۱۲/ربیع الاول ۱۰۶۷/۱۹/دسمبر ۱۶۵۶ئھ کو ان کی کتاب حیات لپیٹی گئی اور وہ سیالکوٹ میں مدفون ہوئے۔)

سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں۔

توفی فی الثامن عشر من شهر ربيع الاول سنة سبع و ستين والف و دفن بسالكوت❷۔

(۱۸/ربیع الاول ۱۰۶۷ھ/۲۵/دسمبر ۱۶۵۶ء کو انتقال کیا اور سیالکوٹ میں دفن کیے گے۔)

علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی نے بھی یہی تاریخ وفات تحریر کی ہے۔ یعنی ۱۸ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ/۲۵/دسمبر ۱۶۵۶ء❸ اسماعیل پاشا❹ اور خیر الدین زرکلی نے بھی یہی تحریر کیا ہے❺۔ مولوی رحمان علی نے سن وفات تو ۱۰۶۷ھ ہی لکھا ہے البتہ تاریخ ۱۶ ربیع الاول (تاریخ شانزدہم ربیع الاول/۲۳/دسمبر ۱۶۵۶ء) تحریر کی ہے❻۔

لیکن محمد اسلم پسروری ان کی تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاول اور سال وفات ۱۰۶۷ھ/۱۹/دسمبر ۱۶۵۶ء لکھتے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں۔

آں قدوۂ افاضل دواز دہم ربیع الاول سن ہزار وشصت و ہفت کہ اول جلوس عالم گیری در سیالکوٹ رحلت نمود۔

حضرت نواب صدیق خاں رحمۃ اللہ علیہ بہت آگے چلے گئے ہیں۔ وہ ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء لکھتے ہیں۔

توفی فی سنته ۱۰۹۷ه / ۱۶۵۹ء ودفن ببلده❼۔

---

❶ ماثر الکرام۔ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

❷ سبحۃ المرجان۔ص ٦٦۔

❸ نزہۃ الخواطر۔ج ۵، ص ۲۱۱۔

❹ ہدیۃ العارفین۔ج ۱، ص ۵۰۴۔

❺ اعلام المولفین۔ج ۴، ص ۵۵۔

❻ تذکرۂ علمائے ہند۔ص ۱۱۰-۱۱۱۔

❼ ابجد العلوم۔ص ۹۰۲، ۹۰۳۔

Marfat.com

مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی رقم طراز ہیں۔

توفی فی نیف و ستین الف ❶۔

یعنی ۱۰۶۰ھ کے قریب فوت ہوئے۔

مولوی فقیر محمد جہلمی کے بقول ان کی وفات ۱۰۶۸ھ یا ۱۰۹۷ھ/ ۱۶۵۷ء یا ۱۶۸۶ء میں ہوئی ❷۔

محمد صالح کنبو نے ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء سن وفات لکھا ہے۔

درسال ہزار و شصت و ہفت ہجری متوجہ دارالبقا گردید ❸۔

(یعنی ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔)

دوسری جگہ محمد صالح کنبو نے شاہ جہان کے اکتیسویں سال جلوس (۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء) کے حالات میں بالکل واضح الفاظ میں لکھا ہے۔

ہفت دہم ربیع الثانی بعرض اشرف رسید کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کہ شرح فضل و کمالاتش را دفتری جداگانہ باید این مکان راحل اقامت خود ندانستہ دوازدہم ماہ مذکور رہگرائی عقبیٰ گردید ❹۔

(۱۷ ربیع الثانی (۱۰۶۷ھ/ ۲۳ جنوری ۱۶۵۷ء) کو بادشاہ (شاہ جہان) کو اس بات کی اطلاع پہنچی کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے جن کے فضل و کمال کی وضاحت کے لیے ایک الگ دفتر کی ضرورت ہے اس دنیا میں اقامت گزیں رہنا اپنے لیے مناسب نہ جانا وہ ۱۲ ماہ مذکور (ربیع الثانی) کو دار عقبیٰ کی طرف روانہ ہوگئے۔)

ہمارے نزدیک محمد صالح کنبو کی روایت زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے۔ کیوں کہ یہ مولانا سیالکوٹی کے معاصر ہیں اور ان کی بدرجہ غایت تکریم کرتے ہیں۔ اپنی تصنیف عمل صالح میں ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

حبر محقق، تحریر مدقق، سرآمد دانشوران واجب التعظیم۔

محمد صالح کنبو مولانا ممدوح کی بے حد قدر کرتے اور بہترین الفاظ میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ رقم طراز ہیں۔

بالجملہ آں صاحب فضائل صوری و معنوی حق عظیم بر سائیر ارباب فضائل ثابت کردہ در سال ہزار و شصت و ہفت ہجری متوجہ دارالبقا گردید ❺۔

---

❶ طرب الاماثل بتراجم الافاضل۔ ص ۲۲۳، ۲۲۴۔

❷ حدائق الحنفیہ۔ ص ۴۱۴، ۴۱۵۔

❸ عمل صالح۔ ج ۳، ص ۲۹۵۔

❹ ایضاً، ص ۲۰۵

❺ عمل صالح۔ ج ۳، ص ۲۹۵۔

Marfat.com

(یعنی مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے جوصوری و معنوی خوبیوں کے حامل تھے' تمام اصحاب علم اور ارباب فضل پر اپنا حق فوقیت ثابت کر دیا' ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء کو عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔)

حافظ عبدالرحمٰن امرتسری ہندوستان کی سیاحت کو نکلے تو سیالکوٹ بھی گئے۔ اپنے سیاحت نامہ سے سیالکوٹ کا ذکر کرتے ہوئے' مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی شخصیت' ان کے علم وفضل اور ان کے مدفن کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے الفاظ درج ذیل ہیں۔

''ہسپتال سے دوسو گز کے فاصلے پر مشہور فاضل مولوی عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی کا مقبرہ ہے۔ موجودہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں بڑی شان وشوکت کی عمارت تھی۔ مگر اب بالکل شکستہ ہوگئی ہے۔ مولوی صاحب شاہ جہان بادشاہ کے زمانے میں ایک زبردست عالم اور صاحب تصانیف گزرے ہیں۔ آپ نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم کے ہم سبق تھے۔ عراق' شام اور استانبول کی متعدد درس گاہوں میں مجھے آپ کی تصانیف داخل درس دیکھنے کا موقع ملا۔ اگرچہ نواب سعد اللہ خاں کو ہندوستان کی وزارت کا رتبہ حاصل تھا۔ مگر ہندوستان سے باہر بلاد اسلامیہ میں علمی حیثیت سے جو شہرت مولوی عبدالحکیم صاحب کو حاصل ہوئی' اسے کوئی ہندوستانی مصنف حاصل نہیں کر سکا۔ آپ کا انتقال ۱۰۶۷ھ۔ ۱۶۵۶ء میں اسی جگہ (سیالکوٹ میں) ہوا[1]۔''

تلامذہ:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے تصنیف وتالیف اور شروح وحواشی کی گرم بازاری کے ساتھ ساتھ تمام عمر ہنگامۂ تدریس بپا کیے رکھا اور متعدد فحول علما نے ان سے اخذ علم کیا' اختصار کے ساتھ ان میں سے چند حضرات کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

قاضی عبدالرحیم مرادآبادی:

قاضی عبدالرحیم بن عبدالرشید بہاری ثم مرادآبادی اپنے عصر کے مشاہیر علما میں سے تھے۔ فاضل کبیر اور دیارِ ہند کی نامور شخصیت تھے۔ نو سال سے زائد عرصہ مولانا سیالکوٹی کی خدمت میں رہے اور علم وفضل کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ مند ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مرادآباد کی مسندِ قضا پر متعین کیے گئے۔ طویل مدت تک اس خدمت پر مامور رہے اور ساتھ ہی درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان سے بہت سے علما نے حصول علم کیا۔ قاضی صاحب مرحوم کا حلقہ تلمذ مشاہیر علما پر مشتمل تھا۔

ملا عصمت اللہ سہارن پوری:

تذکرہ یاغستان کے مصنف نے ملا عصمت اللہ سہارن پوری کا شمار مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے تلامذہ میں کیا ہے۔ عالم کبیر' فاضل جلیل اور معروف فقیہ تھے۔ درس وتدریس ان کا اصل مشغلہ تھا۔ آخر عمر میں نابینا ہو

[1] سیاحت ہند (یعنی ہندوستان کا ہفت سالہ سفرنامہ) - ص ۵۹'۶۰ - مطبع رفاہ عام سٹیم لاہور - طبع اول ۱۹۰۹ء

Marfat.com

گئے تھے مگر بقول صاحبِ "تذکرہ علمائے ہند"۔

درباطن چشم بصیرتش روشن بود ❶۔

(ان کے باطن میں چشم بصیرت روشن تھی۔)

انھوں نے کافیہ کی شرح "الفوائد الضیائیہ" (یعنی شرح جامی) پر حاشیہ لکھا اور شرح خلاصہ الحیات تحریر کی بہت سے علما وطلبا کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

مولوی محمد احمد قنوجی:

مولانا سیالکوٹی کے تلامذہ کی طویل فہرست میں مولوی محمد احمد قنوجی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ یہ اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم تھے۔ عمر بھر تعلیم و تدریس میں مصروف رہے۔ کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں منطق کی کتاب صدرا کا حاشیہ لائق تذکرہ ہے۔

ملا عبدالوہاب پسروری:

عہد شاہ عالم کے مشہور عالم اور فرحت الناظرین کے مصنف محمد اسلم پسروری کے جد امجد ملا عبدالوہاب پسروری بھی مولانا سیالکوٹی کے شاگردوں میں شامل تھے۔ معروف فاضل اور عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ محمد اسلم پسروری نے اپنی تصنیف فرحت الناظرین میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ملا عبدالوہاب پسروری شاہ جہانی عہد کے عالم تھے اور شاہ جہان ان کے علم و فضل سے اس درجہ متاثر تھا کہ اس نے کئی مرتبہ ان کو وظائف و مناصب سے نوازا اور علامی نواب سعد اللہ خاں کی سعی و کوشش سے اپنے بیٹوں کے نام دو گاؤں شاہ جہان کی طرف سے قبول کیے۔ بعد میں شاہ جہان نے دو مزید دیہات کا اضافہ کر کے یہ تعداد چار تک بڑھا دی تھی۔ یہ دیہات کافی عرصہ ان کے خاندان کے تصرف میں رہے، مگر سکھوں کے دورِ ہنگامہ خیز میں ان کے قبضے سے نکل گئے۔

ملا عبدالوہاب پسروری نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے فقہ و اصول اور معانی و بیان کی کتابیں پڑھیں اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد تمام عمر درس علوم دینی میں صرف کر دی۔ ان سے بہت سے علما وطلبا نے استفادہ کیا۔

مولوی محمد معظم:

مولوی محمد معظم بن احمد صدیقی موضع بنہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے تحصیل کی اور علوم دینیہ میں اپنے معاصرین سے سبقت لے گئے۔ قرآن مجید مع تفسیر بیضاوی کے ان کو حفظ

❶ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۴۰۔

Marfat.com

تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے بہادر شاہ نے ان کو ان کے وطن بٹنہ کا قاضی مقرر کیا اور چند گاؤں بطور انعام عطا کیے۔ عمر بھر مسند تدریس اور منصب قضا پر متعین رہے۔ صاحب تصانیف بھی تھے۔ قرآن مجید کی تفسیر معرض تحریر میں لائے تھے، مگر وہ سکھوں کے دورِ استیلا میں نذر آتش کر دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں مثنوی مولانا روم کی شرح لکھی تھی۔

ملا عبدالعزیز عزت اکبر آبادی:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے شاگردوں میں ایک عالم دین ملا عبدالعزیز عزت اکبر آبادی تھے۔ یہ مولانا عبدالرشید کے بیٹے تھے، جن کا شمار اکابر علما میں ہوتا تھا۔ ملا عبدالعزیز عزت عنفوان شباب ہی میں حصول علم سے فارغ ہو کر درس و افادہ میں مصروف ہو گئے تھے اور اپنے وطن اکبر آباد (آگرہ) میں مسند تدریس پر فائز تھے۔ ان کی علمی خوبیوں کی بنا پر اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں اکثر ان کا تذکرہ رہتا اور بادشاہ ان کی تعریف کرتا۔ ان کے بعض رسائل و مسودات بھی بادشاہ کی نظر سے گزرے تھے، جنھیں دیکھ کر وہ ان سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے ان کو دربار میں طلب کر کے ''مورد انواع عاطفت'' فرمایا اور ''منصب عمدہ و خدمت عرضِ مکرر'' کا امتیاز بخشا۔ عالم گیر ان کا بہت احترام کرتا تھا اور اس کی ''توجہات روز افزوں'' ان کو حاصل تھیں ❶۔

ملا عبدالعزیز شاعر بھی تھے اور عزت تخلص کرتے تھے۔ مرأۃ العالم میں بختاور خاں کا بیان ہے کہ عالم گیر اپنی تخت نشینی کے اٹھارویں سال میں حسن ابدال میں اقامت پذیر تھا۔ ملا عبدالعزیز عزت اکبر آبادی بھی اس کے پاس موجود تھے۔ جب وہ بادشاہ سے اجازت لے کر لاہور پہنچے تو مندرجہ ذیل غزل لکھ کر بادشاہ کو حسن ابدال بھیجی۔

زِ درد دل چہ نگارم کہ جوش بے تابیست	زشوق جاں چہ نویسم کہ نامہ سیمابیست
شب فراق خیال کہ ریخت خون دلم	کہ باز اشک گلابی و دیدہ عنابیست
چگونہ شرح دہم حال دل کہ بے تابم	زیاد تاب رخش دل کتان و مہتابیست
نشستہ ایم دریں بحر تا خدا کند	بکشتی کہ زیک قطرہ آب گردابیست
نماند صورت رازِ دلم نہاں عزت	کہ دیدہ صفحۂ تصویر رنگ بیخوابیست

بختاور خاں نے اس غزل کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے:

گوہر ایں اشعار عربی و فارسی و ہندی کہ ازاں محیط فضل بساحل ادائی و رنگینی مضمون رسیدہ ہمہ آبدار و آویزۂ گوش مستعدان روزگار است ❷۔

---

❶ ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین۔ ص ۷۷۔ (اگست۔ نومبر ۱۹۵۳ء)

❷ مرأۃ العالم ورق ۴۹۴ الف۔

Marfat.com

ملا محمد افضل جون پوری:

ملا محمد افضل جون پوری، اپنے عصر کے علامہ زمان وافتخار زمانیاں تھے۔ فنون درسیہ میں مہارت رکھتے تھے، درسیات میں جو فضل وکمال ان کو حاصل تھا، وہ اس عہد کے علمائے جون پور میں اور کسی کو حاصل نہ تھا۔ معاصرین میں نہایت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور لوگوں کے دل ان کی عزت سے معمور تھے۔ جون پور سے لاہور آئے اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حلقۂ درس میں شمولیت کی۔ کئی سال ان کی خدمت میں رہے اور علوم مروّجہ سے فارغ ہو کر اپنے وطن جون پور کو مراجعت کی۔ جون پور میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس سے بے شمار تشنگانِ علوم نے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ یہ ہندوستان میں جہاں گیر کا عہد تھا۔ وہ ان کی بہت تکریم کرتا تھا، اور انھیں ''استاد الملک'' کے خطاب سے نوازا تھا۔ مدرسہ شاہی میں تدریس کے فرائض بھی ان کے سپرد تھے۔ ان کے لیے جاگیر بھی مقرر کی تھی ❶۔ ملا محمد افضل کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن کا تذکرہ ان کے اصل مقام پر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

چندر بھان برہمن:

مولانا سیالکوٹی کے شاگردوں کی طویل فہرست میں عہد شاہ جہانی کا ایک ممتاز ہندو شاعر وادیب چندر بھان تھا جو برہمن تخلص کرتا تھا اور چندر بھان برہمن کے نام سے معروف تھا۔ وہ لاہور کا باشندہ تھا۔ اس نے اپنی تصنیف ''چہار چمن'' کے تیسرے چمن میں اپنی زندگی کی بعض تفصیلات درج کی ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا تلمیذ ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس نے ابتدائی تعلیم مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے حاصل کی تھی۔ اس کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔

چہار چمن، تحفۃ الانوار، گلدستہ، نگارنامہ، تحفۃ الفصحا، مجموعۃ الفقراء، منشآت، دیوان فارسی۔ باختلاف روایات چندر بھان برہمن نے ۱۰۷۳ھ یا ۱۰۷۵ھ میں وفات پائی ❷۔

میر سید اسماعیل بلگرامی:

میر سید اسماعیل بلگرامی کا تذکرہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے کیا ہے اور ان کی فراوانی علم وفضل کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

---

❶ ماہ نامہ ''ثقافت'' لاہور۔ بابت جون ۱۹۶۷ء۔ بحوالہ تذکرۂ علمائے جون پور (قلمی)۔ از خیر الدین محمد الٰہ آبادی۔ ورق ۱۹ الف۔

❷ چندر بھان کے حالات کے لیے دیکھیے: عمل صالح۔ ج ۳، ص ۳۳۶ تا ۳۳۸ وص ۳۴۳، ۳۴۴۔

Marfat.com

سید، از فحول علما و جہابذۂ فضلا است، و بہ دو واسطہ شاگرد امیر فتح اللہ شیرازی۔ درعقلیات برہان ساطع بود و در نقلیات حجت قاطع۔ جم غفیر دانش آموزان را کامل و مکمل ساخت۔ و برحاشیۂ علامہ دوانی بر تہذیب المنطق حاشیہ مدون مستعدانہ نوشت، و با وصف علو مرتبہ دانش بسیار کوچک دل بزرگ ہمت بود، وید فیض رسانی طولے داشت، و علم موسیقی ہندی خوب می دانست و از مہرۂ دقائق ایں فن می زیست ❶۔

(یعنی سید اسماعیل بلگرامی کا شمار فحول علما اور نامور فضلا میں ہوتا ہے۔ وہ دو واسطوں سے امیر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد تھے۔ علوم عقلیہ میں برہان ساطع اور علوم نقلیہ میں حجت قاطع تھے۔ انھوں نے علما کی بہت بڑی جماعت کو علم و فضل میں کامل و مکمل کیا۔ علامہ جلال الدین دوانی کے حاشیہ تہذیب المنطق پر عمدہ حاشیہ لکھا۔ علم میں مرتبہ بلند پر فائز ہونے کے باوجود بہت نرم دل اور باہمت بزرگ تھے۔ ان کا دستِ فیض رسانی بہت لمبا تھا۔ ہندی علم موسیقی پر خوب عبور رکھتے تھے اور اس کی فنی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔)

سید اسماعیل بلگرامی نے سب سے پہلے مولانا عبدالسلام دیوی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے اکثر متداول کتبِ درسیہ کی تحصیل کی۔ اس کے بعد مزید تحصیل کے لیے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حصولِ علم کی اجازت چاہی۔ مولانا معذرت خواہ ہوئے اور فرمایا۔

از ہجوم طلبا گنجائش وقت علیحدہ نیست، مگر آنکہ سماعت سبق فلاں شخص اختیار افتد ❷۔

(طلبائے علم کے ہجوم کی وجہ سے علیحدہ وقت کی تو گنجائش نہیں ہے، البتہ (ایک طالب علم کا نام لے کر فرمایا۔) فلاں شخص کے سبق میں شمولیت کر کے سماعت کر سکتے ہو۔)

سید اسماعیل نے اسی کو مغتنم جانا اور خاموشی کے ساتھ سماعت درس کرنے لگے۔ دورانِ سبق کوئی بات نہ کرتے اور چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے۔ اسی طرح ایک مدت گزر گئی۔ ایک روز خود ہی استاد نے پوچھا۔

مدتہا گزشت۔ گاہے حرفے از شمار سر برنہ زد ❸۔

(عرصہ گزر گیا، تمھاری زبان سے ایک حرف بھی کبھی سننے میں نہیں آیا۔)

سید نے عرض کیا، موجود صورت میں تو سماعت ہی کو کافی سمجھوں گا۔ البتہ۔

اگر وقتے علیحدہ قسمت فقیر مقرر شود بقدر استعداد حرف تواں زد۔

(اگر فقیر کو علیحدہ وقت عطا فرمایا جائے تو بقدر استطاعت کچھ عرض کروں۔)

---

❶ مآثر الکرام، دفتر اول۔ ص ۲۲۳۔

❷ مآثر الکرام۔ دفتر اول۔ ص ۲۲۳۔

❸ ایضاً۔ ص ۲۲۴۔ ۱۲۵۱۴

Marfat.com

مولانا نے فرمایا' ان دنوں عصر اور مغرب کے درمیان فرصت ہے' تمھارے سبق کے لیے یہی وقت مقرر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے روز مستقل درس اور بحث کا آغاز کیا گیا۔ سلسلۂ گفتگو شروع ہوا تو شام ہوگئی۔ نماز مغرب سے فارغ ہو کر پھر مصروفِ درس ہو گئے' تا آنکہ عشا کی نماز کا وقت آ گیا۔ جب مولانا نے دیکھا کہ "سررشتۂ سخن" ختم ہونے کے آثار کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں تو فرمایا کل صبح صبح آ جاؤ۔ دوسرے تمام اسباق موقوف کر کے پہلے ہم اسی مسئلہ زیر بحث کی تحقیق کریں گے۔

دوسرے روز صبح کے وقت لائق شاگرد پھر مولانا کی خدمت میں پہنچا۔ دیگر تمام طلبائے مدرسہ بھی موجود تھے' چاشت سے دوپہر تک بحث ہوتی رہی اور متواتر تین روز تک سلسلۂ گفتگو جاری رہا۔ لیکن بحث کے سمٹنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مولانا نے ہونہار تلمیذ سے فرمایا۔

بارے حل ایں مقام بر شما ہم بہ نوعی ظاہر شد؟

(مسئلہ زیر بحث کا کوئی حل خود تم پر بھی ظاہر ہوا؟)

لائق شاگرد نے عرض کیا۔

یکے از محشیان دریں محل حاشیہ بہ قلم آوردہ' و حاشیہ کہ از تحریرات خودش بود برآوردہ۔

(فلاں حاشیہ نویس نے اس بارے میں یہ لکھا ہے' اور ساتھ ہی اپنا تحریر کردہ حاشیہ بھی استاد محترم کی خدمت میں پیش کر دیا۔)

استاد نے شاگرد کا یہ حاشیہ دیکھا تو۔

جواہر تحسین افشاند و فرمود مطلب حاشیہ بسیار دقیق و نازک واقع شدہ۔ اما عبارت خالی از اطناب نیست۔

(بہت خوش ہوئے' تحسین کی اور فرمایا' حاشیے کا مطلب بہت دقیق اور پیچیدہ ہے۔ مگر اصل عبارت بھی اطناب سے خالی نہیں ہے۔)

پھر شاگرد سے دریافت کیا۔

تحصیل شما از کجاست؟

(تم نے کہاں تحصیل علم کی ہے۔؟)

عرض کرد کہ از خدمت مولوی عبدالسلام دیوہ۔!

(عرض کیا دیوہ کے مولوی عبدالسلام کی خدمت میں رہ کر۔)

مولانا عبدالسلام دیوی چونکہ مولانا سیالکوٹی کے معاصر تھے اور علوم وفنون کے بہت ماہر بھی تھے' اس لیے قدرتی طور پر سید اسماعیل کا یہ جواب سن کر مولانا کے دل میں شبہ گزرا کہ ممکن ہے' مولانا عبدالسلام دیوی نے

Marfat.com

ان کے امتحان کی غرض سے اپنے اس شاگرد کو ان کے پاس بھیجا ہو۔ اور اس خیال کا اظہار سید موصوف سے کر بھی دیا۔ لیکن سید صاحب نے حلفاً کہا۔

ایں امر را اصلاً دخلی نیست، محض بہ ارادہ استفادہ در جناب عالی رسیدہ ام ❶۔

(اس معاملے میں قطعاً کسی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ میں تو محض استفادے کی غرض سے جناب کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا ہوں۔)

میر غلام علی آزاد کا بیان ہے کہ میر سید اسماعیل بلگرامی نے بقیہ تمام مروّجہ کتب درسیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی ہی سے پڑھیں اور انہی کے حلقہ تلمذ میں رہ کر سارے مدارج علمی طے کیے۔

سید اسماعیل، بلگرام کے رہنے والے تھے، عمر بھر مسند تدریس پر فائز رہے اور ہنگامہ درس و افادہ میں زندگی بسر کردی۔ "و روزگارے بہ تعلیم و تدریس گزراند ❷۔" کثیر التعداد علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ ۴؍ شوال ۱۰۸۸ھ کو بروز شنبہ وفات پائی ❸۔

اولاد:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے نامور فرزند مولانا عبداللہ تھے، جن کا لقب لبیب تھا۔ یہ اپنے جلیل القدر والد کی طرح بہت بڑے صاحب علم و فضل اور متدین و متقی بزرگ تھے۔ اپنے اخلاق و فضائل اور اوصاف و کمالات کی وجہ سے لوگوں میں "امام وقت" مشہور تھے۔ اس ضمن میں لالہ سجان رائے بٹالوی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

از افزونی حسن اخلاق و رہنمائی خلائق ایں بزرگ را امام وقت گفتندے ❹۔

(یعنی (مولانا عبداللہ لبیب) بے پناہ حسن اخلاق کے حامل ہونے کی وجہ سے اور لوگوں کو رشد و ہدیت کی تلقین کرنے کے باعث، عوام انھیں امام وقت گردانتے تھے۔)

مولانا عبداللہ لبیب نے معقولات و منقولات کا علم اپنے والد مکرم سے حاصل کیا تھا اور حدیث رسول ﷺ کی تحصیل شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند شیخ نور الحق دہلوی سے کی تھی ❺۔

❶ مآثر الکرام۔ دفتر اول۔ ص ۲۲۴۔

❷ ایضاً۔

❸ ایضاً۔ ص ۲۲۵۔

❹ خلاصۃ التواریخ۔ ص ۷۳۔

❺ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۵۳۔

Marfat.com

مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر مولانا عبداللہ لبیب کے علم و فضل کی فراوانی سے بہت متاثر تھا اور ان کی بے حد تکریم کرتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۵۷ء میں لاہور آیا تو مولانا ممدوح سے ملاقات کا متمنی ہوا' اور انتہائی اعزاز واکرام سے انھیں سیالکوٹ سے لاہور بلایا گیا۔ بادشاہ نے ان سے مل کر بہت خوشی کا اظہار کیا اور وہ تمام اعزازات جو ان کے والد مولانا عبدالحکیم کو حاصل تھے' ان کے لیے برقرار رکھے اور ان میں کچھ اضافہ بھی کیا۔ خلعت خاص' دو سو اشرفیاں اور ایک ہاتھی دے کر انھیں رخصت کیا۔

ایک روایت کے مطابق اورنگ زیب نے انھیں اجمیر بلایا اور اجمیر کی صدارت عظمیٰ پیش کرنا چاہی۔ مگر بقول بختاور خاں مولانا نے یہ کہہ کر بادشاہ کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ

الحال سنین عمر ستین رسیدہ' وقت ترک نوکری است نہ اختیار نوکری۔

(اب جب کہ عمر ساٹھ سال کو پہنچ گئی ہے' یہ ترک نوکری کا وقت ہے' نہ کہ نوکری اختیار کرنے کا۔)

علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی فرماتے ہیں کہ بادشاہ نے ایک خط کے ذریعے مولانا عبداللہ لبیب کو یہ پیش کش کی تھی۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا۔

ان الزمان زمان الفراق-

(کہ اب دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے۔)

مرآۃ العالم میں بختاور خاں کا بیان ہے کہ مولانا عبداللہ لبیب' گوشہ نشین عالم دین تھے اور اربابِ حکومت سے الگ تھلگ رہتے تھے۔

بحفظ کلام مجید و قلتِ اختلاط بار باب دول و رغبت طبع بانزوا و گوشہ نشینی بر والد ماجد خود مزیت داشت۔

(یعنی وہ قرآن مجید کے حفظ اور اصحاب حکومت سے عدم رغبت و قلت اختلاط کے اوصاف سے متصف تھے اور ارباب دولت سے ملنے کے بجائے علیحدگی و گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے تھے۔ اور اس سلسلے میں اپنے والد (مولانا عبدالحکیم) پر فوقیت رکھتے تھے۔)

اس عظیم المرتبت عالم نے اورنگ زیب عالم گیر کے چھبیسویں سال جلوس میں ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء کو وفات پائی۔ ان کے حالات اس کتاب کے اصل مقام پر بیان کیے جائیں گے۔ ان شاء اللہ۔

---

❶ نزہۃ الخواطر- ج ۵' ص ۲۵۳-

Marfat.com

۲۔ مولانا عبدالحکیم کشمیری

مولانا عبدالحکیم، مولانا عبدالکریم کشمیری کے بیٹے تھے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ کے فاضل تھے۔ طریقت سے بھی تعلق رکھتے تھے اور اس سلسلے میں کشمیر کے نامور عالم دین شیخ معین الدین نقشبندی کشمیری کے فیض یافتہ تھے۔ ''تذکرہ علمائے ہند'' میں انھیں عہد عالم گیری کے عالم بتایا گیا ہے ❶۔

۳۔ مولانا عبدالحی بلگرامی

مولانا عبدالحی بن ابوالفتح بن عبدالدائم عثمانی بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں کے علما سے علم حاصل کیا۔ پھر اپنے والد گرامی شیخ ابوالفتح کی مسند علم پر متمکن ہوئے۔ فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ کے جید عالم تھے۔ خلاصۃ الفقہ کے نام سے ایک مختصر سی کتاب بھی تصنیف کی جس میں حدیث اور فقہ کی روشنی میں سفر سے متعلق مسائل بیان کیے گئے ہیں ❷۔

۴۔ مفتی عبدالحی سنبھلی

مفتی عبدالحی سنبھلی، اپنے علاقے اور عہد کے کبار علما میں سے تھے۔ اپنے علم و فضل کی بنا پر سنبھل کے منصب افتا پر متمکن ہوئے اور عمر بھر اس منصب پر فائز رہے۔ علوم دینیہ سے متعلق بعض مفید کتابوں کے مصنف تھے ❸۔

۵۔ شیخ عبدالخالق سہارن پوری

شیخ عبدالخالق بن عبدالستار بن عبدالکریم انصاری سہارن پوری، سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور شیخ رکن الدین بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے تجوید سیکھی۔ پھر باقی علوم کی تحصیل کی۔ ان کا شمار اپنے دور کے فقہ، قرات اور تجوید کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ ۷ رجب ۱۰۲۰ھ/ ۵ ستمبر ۱۶۱۱ء کو وفات پائی ❹۔

۶۔ مولانا عبدالدائم گوالیاری

مولانا عبدالدائم بن عبدالحی بن عبدالغنی عباسی گوالیاری کا شمار ان حضرات میں ہوتا تھا جو فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اصول فقہ کے بارے میں ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کا نام ''اساس الاصول''

❶ تاریخ کشمیر اعظمی۔ ص ۱۶۹۔ تذکرۂ علمائے ہند۔ ص ۲۶۹۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ۲۱۲۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۱۲ بحوالہ شرائف اشرفی۔

❸ کمال محمد سنبھلی کی ''اسراریہ'' دیکھیے۔ اس میں ان کی تصنیفات کا ذکر ہے۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۱۳

❹ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۱۳ بحوالہ مرآۃ جہاں نما۔

Marfat.com

ہے۔ یہ کتاب انھوں نے مغل حکمران شاہ جہاں کے عہد میں تصنیف کی تھی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ رام پور (ہندوستان) کے کتب خانہ حامدیہ میں موجود ہے ❶۔

۷- مفتی عبدالرحمٰن کابلی

مفتی عبدالرحمٰن کابلی شیخ وقت اور عالم کبیر تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں' آگرہ میں فوج کے منصب قضا پر متعین تھے۔ پیکر صدق و صفا اور صاحب ورع و تقویٰ بزرگ تھے۔ بے حد عاقل وفہیم تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے حلقہ ارادت میں داخل تھے۔ حضرت مجدد آگرہ تشریف لے جاتے تو ان کے ہاں ضرور آمد ورفت رکھتے ❷۔

۸- شیخ عبدالرحمٰن سنبھلی

شیخ عبدالرحمٰن نقشبندی سنبھلی شیخ صالح اور فقیہ عصر تھے۔ شیخ تاج الدین سے اخذ طریقت کیا اور طویل عرصے تک ان کی صحبت میں رہے۔ خواجہ باقی باللہ سے بھی کسب فیض کیا۔ علم و معرفت میں یگانۂ روزگار تھے۔ اپنے شیخ کے حکم سے سنبھل کی مسند مشیخت پر فائز ہوئے اور خلق کثیر کو فیض پہنچایا۔ تقویٰ وعزیمت میں ہمیشہ اپنے شیوخ کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ ۷ شوال ۱۰۶۷ھ/ ۹ رجولائی ۱۶۵۷ء کو سنبھل میں وفات پائی ❸۔

۹- قاضی عبدالرحیم مرادآبادی

قاضی عبدالرحیم بن عبدالرشید بہاری مرادآبادی بہت بڑے فاضل' اپنے دور کے شیخ اور مشہور عالم تھے۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے کسب علم کیا اور نو سال سے زائد عرصہ ان کی خدمت میں رہے۔ پھر مرادآباد کے منصب قضا پر مامور کیے گئے اور ساتھ ہی طویل مدت تک وہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ سعد اللہ بلگرامی اور بہت سے اہل علم شامل ہیں ❹۔

۱۰- مفتی عبدالرحیم سندھی

مفتی عبدالرحیم بن عثمان بن یوسف صالح بدینی سندھی' شاہ جہان کے عہد میں ٹھٹھہ کے مفتی تھے۔ اپنے زمانے کے شیخ' عالم اور فقیہ تھے ❺۔

---

❶ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۱۳۔

❷ زبدۃ المقامات۔ ص ۳۵۴' ۳۵۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۱۴۔

❸ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۱۵' ۲۱۶۔ بحوالہ اسراریہ۔

❹ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۱۸۔

❺ تحفۃ الکرام۔ ص ۶۸۵۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۱۸۔

Marfat.com

۱۱- مولانا عبدالرزاق بانڈی کشمیری

مولانا عبدالرزاق بانڈی کشمیری، دیار کشمیر کے عالم و فاضل اور ذکی و فطین بزرگ تھے۔ ملا فاضل کے خواہر زادہ تھے، جنھوں نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے بعض حواشی پر تنقید کی ہے۔ مولانا عبدالرزاق کشمیری معقولات میں بے حد تیز تھے اور اس کے تمام گوشوں پر پوری نظر رکھتے تھے۔ شرح تجرید کا حاشیہ سپرد قلم کیا، جس کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ میری اس تالیف کو سمجھنا تو کجا بڑے بڑے عالم اس کو پڑھ بھی نہیں سکتے۔ شاہ جہان بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا اور کابل کے مدرسے میں منصب تدریس پر متعین کر دیا۔ اس اثنا میں کئی راتیں کتاب محاکمات کا رد لکھتے رہے، جس سے ذہن و دماغ پر اتنا شدید بوجھ پڑا کہ خلل دماغ کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہ کیفیت یہاں تک بڑھی کہ ایک مرتبہ حلق پر چھری مارلی، شاگردوں کو پتا چلا تو دوڑ کر آئے اور کپڑا باندھ کر زخم بند کیا۔ پھر اس کا علاج کرایا اور اللہ نے شفا عطا کی۔ بعد ازاں مدرسہ کابل کی تدریس سے مستعفی ہو کر واپس کشمیر آگئے تھے۔ کشمیر ہی میں وفات پائی [1]۔

۱۲- مولانا عبدالرشید کشمیری

ارض کشمیر کے یہ عالم دین، مولانا عبدالرشید کشمیری زرگر کے عرف سے معروف تھے۔ عالم کبیر، علامۂ عصر، شیخ وقت اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اس زمانے کا کشمیر علم و فضل کا مرکز تھا اور متعدد مقامات پر علمائے کشمیر کی مسانید تدریس بچھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ مولانا عبدالرشید ان کی خدمت میں گئے اور شیخ محمد بن افضل بن حیدر چرخی، ملا سلطان مانچو، قاضی عبدالرحیم اور دیگر اساتذۂ کشمیر سے تحصیل کی۔ طبیعت میں تصوف و طریقت کا شوق پیدا ہوا تو اس دور کے ایک کشمیری صاحب طریقت بزرگ شیخ محمد علی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفاضہ کیا۔ بعد ازاں خود درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا اور علما کی بہت بڑی جماعت ان کے علم و فضل سے مستفید ہوئی۔ عمر کے آخری دور میں سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں برہان پور کی فوجی چھاونی میں قاضیِ عساکر مقرر ہو گئے تھے۔ بے حد شیریں کلام تھے۔ مدلل اور پرزور تقریر کرتے تھے۔ اس کشمیری نژاد عالم دین نے برہان پور شہر میں وفات پائی [2]۔

۱۳- قاضی عبدالرشید دہلوی

گیارھویں صدی ہجری میں دہلی علمی لحاظ سے بڑا بارونق شہر تھا۔ اس میں علما کی کثیر تعداد جمع تھی، جن

---

[1] تاریخ کشمیر اعظمی-ص ۱۴۴- تذکرہ علمائے ہند-ص ۲۶۹- حدائق الحنفیہ-ص ۴۲۸- نزہۃ الخواطر-ج ۵، ص ۲۱۸، ۲۱۹-

[2] تاریخ کشمیر اعظمی-ص ۱۷۷- نزہۃ الخواطر-ج ۵، ص ۲۲۰، ۲۲۱- تذکرہ علمائے ہند-ص ۲۶۹-

Marfat.com

میں قاضی عبدالرشید دہلوی بھی شامل ہیں۔ یہ اپنے دور اور علاقے کے شیخ' فقیہ اور صوفی بزرگ تھے۔ شیخ عبدالعزیز بن حسن چشتی دہلوی کے احفاد میں سے تھے۔ شیخ محبّ اللہ الہ آبادی سے اخذ طریقت اور کسب علم کیا تھا۔ الہ آباد میں تین سال ان کی خدمت میں رہے۔ پھر سنبھل کے منصب قضا پر مامور کیے گئے۔ قضا کی نازک اور اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ سنبھل میں درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری تھا۔ متعدد اہل علم نے ان سے استفادہ کیا۔ فقط صاحب قال ہی نہ تھے' صاحب وجد و حال بھی تھے۔ جب درس حدیث کے دوران حال کی کیفیت غالب آ جاتی تو بے ساختہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور پھر روتے روتے گھگھی بندھ جاتی [1]۔

۱۴- شیخ عبدالستار برہان پوری

سرزمین برہان پور نے جن علما و فضلا کو جنم دیا' ان میں ایک شیخ عبدالستار بن عیسی بن قاسم بن یوسف ہیں' جنھیں عبدالستار سندھی بھی کہا جاتا ہے۔ عالم و فقیہ اور شیخ و زاہد تھے۔ فضل و کمال میں شہرت رکھتے تھے۔ برہان پور میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد شیخ عیسی سے تعلیم کا آغاز کیا۔ مروّجہ کتب درسیہ کی تحصیل انھی سے کی۔ ریاضی کی بعض کتابیں علامہ شکر اللہ شیرازی سے پڑھیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب علامہ ممدوح فارس سے آئے تھے اور برہان پور میں مقیم تھے۔ برہان پور میں کئی سال تک علامہ شکر اللہ شیرازی نے افاضہ و افادہ کی محفل گرم کیے رکھی۔ شیخ عبدالستار زہد و قناعت اور عفت و توکل میں بہت مشہور تھے۔ متواضع اور کثیر الفوائد عالم دین تھے۔ اپنے والد مرحوم سے اخذ طریقت بھی کیا اور اس سلسلے میں طویل عرصہ ان کی صحبت میں گزارا۔ والد کی وفات کے بعد مسند ارشاد پر متمکن ہوئے [2]۔

۱۵- مفتی عبدالسلام دیوی

مفتی عبدالسلام دیوی' موضع دیوہ کے رہنے والے تھے' جو ہندوستان کے صوبہ یوپی میں اعمال لکھنؤ میں واقع ہے۔ ان کا نسب نامہ یہ ہے: عبدالسلام بن ابوسعید بن حب اللہ بن احمد بن عبدالرحیم بن احمد فیاض بن محمد اعظم حسینی کرمانی دیوی۔ مفتی عبدالسلام دیوی' معقول اور منقول کے جامع تھے۔ نہایت ذکی اور ذہین عالم دین تھے۔ دیوہ کے مقام پر پیدا ہوئے جو اس دور میں لکھنؤ کے نواح میں معروف قریہ تھا۔ اب تک اس کو علم و تصوف کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ اپنے قصبے اور علاقے کے نامور علما سے علم حاصل کیا۔ پھر عازم لاہور ہوئے۔ اس زمانے میں لاہور میں مفتی عبدالسلام لاہوری کی مسند تدریس آراستہ تھی' ان کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور حصول علم کیا۔ یہاں تک کہ فقہ' اصول فقہ اور کلام میں اپنے اقران و معاصرین سے فوقیت لے

---

[1] نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۲۲۱۔ بحوالہ الاسراریہ۔

[2] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار۔ ص ۵۶۰' ۵۶۱۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۲۲۔

Marfat.com

گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد طویل عرصے تک لاہور ہی میں مسند تدریس پر فائز رہے۔ پھر شاہ جہان بادشاہ کی فوج میں منصب افتا پر متمکن ہوئے۔ ایک مدت تک اس منصب پر مامور رہے۔ بعدازاں کبر سنی کی بنا پر اس منصب سے معزول ہوگئے اور لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ لاہور میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا' جس سے بہت سے لوگ مستفید ہوئے۔

مفتی عبدالسلام دیوی' صاحب تصنیف بھی تھے۔ ان کی تصانیف و حواشی سے پتا چلتا ہے کہ وہ تفسیر' فقہ' منطق اور علم کلام میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں یہ کتابیں شامل ہیں۔

حاشیہ علیٰ حاشیہ خیالی' شرح منار الاصول' حاشیہ تفسیر بیضاوی' حاشیہ شرح الصحائف' حاشیہ علی ہدایۃ الفقہ' شرح تہذیب المنطق اور حاشیہ علی التحقیق۔

مولانا عبدالسلام دیوی کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہوسکا۔ علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی ''اکسیر'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انھوں نے ۱۰۳۹ھ/۱۶۳۰ء کو وفات پائی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے' کیوں کہ ''بادشاہ نامہ'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء کو زندہ تھے ❶۔

عمل صالح کے مصنف صالح محمد کنبو نے بھی شاہ جہان کے دسویں سال جلوس میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اس سال جلوس کا سن ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء ہے۔ ۱۰۴۶ھ میں سخت قحط پڑا تھا' جس میں لوگ بے حد تکلیف میں مبتلا ہوئے اور اشیائے صرف کی قیمتیں بہت بڑھ گئیں۔ شاہ جہان نے علمائے کرام' بزرگان دین اور اصحاب فضل و کمال سے دعا کی درخواست کی۔ چنانچہ نماز استسقا پڑھی گئی جس کے نتیجے میں بڑی بارش ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے قحط کی مصیبت دور فرما دی۔ جن حضرات سے بادشاہ نے دعا اور نماز استسقا کی درخواست کی تھی' ان میں سید جلال' قاضی محمد اسلم' مفتی عبدالسلام' شیخ مجیب علی سرہندی' مظہر بدائع اور شیخ ناظر شامل تھے ❷۔ یعنی ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں مفتی عبدالسلام دیوی زندہ تھے۔

بہرحال مفتی موصوف گیارھویں صدی ہجری کے ہندی علما میں اپنے علم و فضل اور نیکی و صالحیت کے اعتبار سے اونچے مرتبے کے حامل تھے ❸۔

۱۶۔ مفتی عبدالسلام لاہوری

گیارھویں صدی ہجری میں لاہور کو اہل علم اور اصحاب فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ عہد

❶ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۲۳۔

❷ عمل صالح۔ ج ۲' ص ۲۰۹۔

❸ ملاحظہ ہو عمل صالح۔ ج ۳' ص ۳۰۰۔ بادشاہ نامہ۔ ج ۱' ص ۳۴۲' ۲۴۳۔ مآثر الکرام۔ ج ۱' ص ۲۲۵' ۲۲۶۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۲۲' ۲۲۳۔ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۲۶۹۔

Marfat.com

برصغیر میں تین عظیم مغل حکمرانوں جلال الدین اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہان کا عہد تھا۔۔۔اس عہد میں لاہور میں جن علما و فضلا کی علمی سرگرمیوں اور تدریسی کوششوں کا سلسلہ زوروں پر تھا، ان میں مفتی عبدالسلام لاہوری کا نام نامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔ مفتی عبدالسلام لاہوری کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے؟ کب پیدا ہوئے؟ ان کے والد کا کیا نام تھا؟ تذکرہ نگاران سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ اپنے دور کے علامہ اور بہت بڑے فاضل تھے۔ کثرت درس وافادہ میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ صلاح وتقوی کے زیور سے آراستہ اور بلند مرتبے کے حامل تھے۔

تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق مفتی عبدالسلام نے نوے (۹۰) سال عمر پائی، کم وبیش ساٹھ سال تک لاہور میں ان کے درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا اور ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۸ء کو فوت ہوئے۔ اس حساب سے ان کا سال ولادت ۹۴۷ھ بنتا ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے ہندوستان کے تقریباً آٹھ بادشاہوں کا زمانہ پایا۔ یعنی (۱) ظہیر الدین بابر (۲) نصیر الدین ہمایوں (۳) شیر شاہ سوری (۴) سلیم شاہ سوری (۵) عادل شاہ سوری (۶) جلال الدین اکبر (۷) نور الدین جہاں گیر اور (۸) شاہ جہان کا ــــــ آخری تین بادشاہوں کا زمانہ تو ان کی بھرپور تدریسی ہنگامہ آرائیوں کا تھا۔

اساتذہ:

مفتی عبدالسلام لاہوری نے اپنے دور کے مشاہیر اساتذہ اور نامور فضلا سے استفادہ کیا، ان بزرگوں کا تعارف ذیل کی سطور میں کرایا جاتا ہے۔

۱۔ میر فتح اللہ شیرازی: یہ وہ بزرگ ہیں، جنھیں بیجاپور کے حکمران عادل شاہ نے بڑی کوشش سے شیراز سے دکن بلایا اور اپنے دربار سے منسلک کیا۔ اس کے قتل کے بعد وہ جلال الدین اکبر کی دعوت پر فتح پور سیکری آگئے تھے اور دربار اکبری سے انسلاک اختیار کر لیا تھا۔ معقولات میں اپنے عہد کے منفرد اہل علم تھے۔ منقولات میں بھی دست رس رکھتے تھے۔ حکمت وفلسفہ، منطق وہیئت، ہندسہ وریاضی، نجوم ورمل، حساب وطلسمات، نیرنجات اور جراثقال کے ماہر تھے۔ علاوہ ازیں عربی ادب، تفسیر اور حدیث پر نظر تھی۔ یہ وہی ماہر معقولات ہیں، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر تمام علوم عقلیہ، یعنی منطق وفلسفہ اور حکمت وغیرہ پر مشتمل کتابیں اس دنیا سے ناپید ہو جاتیں تو وہ اپنے حافظے کے زور سے ازسرنو ان علوم کو زندہ کر سکتے تھے۔ میر فتح اللہ شیرازی نے علامہ جلال الدین محقق دوانی، میر صدر الدین شیرازی، میر غیاث الدین منصور، میرزا جان میر اور دیگر علمائے متاخرین کی تصانیف کو علمائے ہند سے متعارف کرایا اور اس ملک کی درس گاہوں کے نصاب میں داخل کرایا[1]۔ اکبر ان کی انتہائی

[1] مآثر الکرام دفتر اول، ص ۲۲۸، ۲۲۹۔

Marfat.com

تکریم کرتا تھا۔ اس نے ان کو ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء میں قیام لاہور کے زمانے میں امین الملک کا خطاب عطا کیا تھا۔ مالی معاملات اور پیمائش زمین کے سلسلے میں وہ بے شمار معلومات رکھتے تھے۔ راجہ ٹوڈرمل بھی اس علم کا ماہر تھا۔ اکبر نے ٹوڈرمل کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ اس ضمن میں جوقدم اٹھانا چاہے' میر فتح اللہ شیرازی کے حکم سے اٹھائے۔ میر فتح اللہ شیرازی نے ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۹ء کو کشمیر سے اکبر کی واپسی کے زمانے میں ماندوجان کے مقام پر وفات پائی اور کوہ سلیمان میں مدفون ہوئے۔

۲۔ شیخ سعد اللہ لاہوری: یہ عہد اکبری کے مستند اور نامور علما میں سے تھے۔ ایک عرصے تک لاہور میں مسند تدریس پر متمکن رہے۔ انھیں تصوف وطریقت سے بھی لگاؤ تھا۔

۳۔ قاضی صدرالدین جالندھری لاہوری: یہ مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کے شاگرد تھے۔ متبحر اور فاضل بزرگ تھے۔ عہد اکبری میں لاہور کے منصب قضا پر بھی متعین رہے۔ بعد میں صوبہ گجرات کے علاقہ بہڑوچ کے قاضی مقرر ہوئے۔ انھوں نے ۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ء کو وفات پائی۔

۴۔ شیخ اسحاق بن کاکو: یہ بھی مفتی عبدالسلام لاہوری کے اساتذہ میں سے تھے۔ جامع جمیع علوم' متوکل علی اللہ' متورع اور صوفی بزرگ تھے۔ ہمیشہ مشغول عبادت رہتے ❶۔

مسند تدریس اور تلامذہ:

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مفتی عبدالسلام لاہوری نے لاہور میں مسند تدریس آراستہ کی اور درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ اپنے عہد میں وہ بے نظیر مدرس اور عدیم المثال عالم تھے۔ انھوں نے تقریباً ساٹھ سال تک علوم وفنون کی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور بہت سے تشنگان علوم نے ان سے اپنی علمی تشنگی بجھانے کا سامان فراہم کیا۔ کچھ عرصہ افواج شاہی میں مفتی کے فرائض بھی انجام دیے۔ ان کے علم وفضل کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا تھا۔ برصغیر پاک و ہند سے باہر بھی اہل علم میں ان کی علمی شہرت پہنچ چکی تھی اور وہ ان سے بہت متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ مشہور ماہر معقولات قاضی محمد اسلم ہروی کے بھتیجے میرک شاہ خراسان سے ہندوستان آئے تو لاہور میں مفتی عبدالسلام کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور کتب متداولہ کا اعادہ کیا۔ مفتی ممدوح کے فیوض علمی سے بہرہ اندوز ہوئے اور سند فراغت حاصل کرنے کے بعد سلطنت مغلیہ کے اہم مناصب پر فائز ہوئے' بالآخر منازل ترقی طے کرتے ہوئے عہد اورنگ زیب میں صدر کل یا صدر الصدور کے منصب بلند پر پہنچے۔ شیخ میرک ہروی نے ۱۰۷۱ھ/ ۱۶۶۱ء کو وفات پائی۔

شیخ محب اللہ بہاری بھی مفتی عبدالسلام لاہوری کے فیض یافتگان میں سے تھے۔ شیخ محب اللہ بہاری

❶ منتخب التواریخ۔ ج ۳' ص ۱۵۔

Marfat.com

برصغیر کے اصحاب تصوف میں منفرد حیثیت کے حامل تھے اور اس ضمن میں بعض ممتاز افکار کے مالک ___ ! انھوں نے ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

شاہ جہان کے وزیر اور معروف عالم علامی سعد اللہ تمیمی چنیوٹی بھی ان کے تلمیذ تھے۔

قاضی عبدالسلام دیوی بھی مفتی عبدالسلام کے شاگرد تھے۔ یہ مضافات لکھنو کے ایک مقام دیوہ سے حصول علم کے لیے لاہور آئے تھے۔ جلیل القدر عالم دین تھے۔ معقولات و منقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ طویل عرصے تک مفتی ممدوح کے حلقۂ درس میں شریک رہے اور ان سے مستفید ہوئے۔ شاہ جہانی دور میں افواج شاہی کے مفتی مقرر ہوئے۔ لیکن استاد کی طرح بالآخر لاہور میں درس و تدریس کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا اور تاحین حیات یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔

شیخ محمد میر عمری سیوستانی بھی مفتی عبدالسلام کے تلامذہ میں سے تھے۔ وہ ۹۵۷ھ/ ۱۵۵۰ء کو سیوستان میں پیدا ہوئے اور اپنے مرشد شیخ خضر سیوستانی کے حکم سے لاہور آئے اور مفتی عبدالسلام کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ جس زمانے میں شیخ محبّ اللہ بہاری لاہور آ کر مفتی عبدالسلام کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے' اس زمانے میں علامی سعد اللہ چنیوٹی اور شیخ محمد میر بھی مفتی ممدوح سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ لاہور کے مشہور بزرگ ہیں جو میاں میر کے نام سے معروف ہیں۔ ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء کو لاہور میں فوت ہوئے۔

مفتی ممدوح کے ایک لڑکے بھی تھے جن کا نام شیخ محمد مراد تھا۔ یہ بھی صاحب فضل اور ذی علم بزرگ تھے۔ عالم شاہ کے عہد تک زندہ تھے۔ جب شاہ عالم بادشاہ نے خطبہ جمعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ' کے نام کے ساتھ ''وصی'' کے لفظ کا اضافہ کرنے کا حکم دیا تو شیخ محمد مراد ان علما میں سے تھے' جنھوں نے اس حکم پر عمل کرنے سے صاف الفاظ میں انکار کر دیا تھا اور بادشاہ سے کہا تھا کہ اس کا یہ فرمان غلط اور ناقابل تسلیم ہے۔ اس کی پاداش میں بادشاہ نے ان کو قید کر دیا تھا۔

حاشیہ بیضاوی:

مفتی عبدالسلام لاہوری عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے' تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہیں کی۔ آخر عمر میں بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا۔ بختاور خاں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

درآخر عمر کہ پسر خود را بیضاوی درس می گفت و حاشیہ بر بیضاوی نوشت می فرمود' سخنان بسیار بر کتب متداولہ داشتم و بر اہل فضل عرض کردہ بودم' و در معرض قبول افتادہ بود' لیکن از کثرت درس فرصت نیافتم کہ در قید تحریر درآورم ❶۔

---

❶ مرآۃ العالم- ص ۵۳۵-

Marfat.com

(عمر کے آخری دور میں جب اپنے بیٹے کو بیضاوی پڑھاتے تھے اور بیضاوی پر حاشیہ تحریر فرمارہے تھے' فرمایا کرتے کہ میں نے کتب متداولہ پر بہت سی باتیں اپنی یادگار چھوڑی اور اہل علم کے سامنے پیش کی ہیں اور انھیں بارگاہ اصحاب فضل میں شرف قبولیت عطا ہوا ہے' مگر کثرتِ درس کے ہنگاموں سے فرصت نہ ملنے کی وجہ سے میں انھیں ضبط تحریر میں نہیں لاسکا۔)

لیکن عمر کے آخری دور میں جب حواس مختل ہو گئے اور قوت حافظہ ختم ہوگئی تو اس پر اظہار افسوس کرتے تھے کہ کیوں اپنے افکار علمی کو معرض کتابت میں نہ لائے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی ان کا یہ تاثر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

الحال کہ ضعف قویٰ مستولی گشت وقوت حافظہ رو بہ انحطاط آورد' ہمہ از خاطر برآمد۔ برفقدان ایں صور ذہنی تاسف می نمود ❶۔

(اب جب کہ قوائے جسمانی پر کمزوری غالب آ گئی ہے اور قوت حافظہ انحطاط پذیر ہوگئی ہے' تمام چیزیں ذہن سے نکل گئی ہیں۔ اس ذخیرۂ علم کے ذہن سے نکل جانے پر انھیں سخت افسوس ہوتا ہے۔)

مفتی عبدالسلام چونکہ ہمہ وقت درس وافادہ میں مصروف رہتے تھے' اس لیے تصنیف وتالیف کی طرف عنان توجہ مبذول نہ کر سکے۔ ان کی تصانیف میں ایک تفسیر بیضاوی کے حاشیہ کا پتا چلتا ہے جو انھوں نے آخر عمر میں اپنے بیٹے محمد مراد کی تعلیم کے زمانے میں لکھا تھا۔

کیا نافع المسلمین انہی کی تصنیف ہے؟

اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی میں فارسی زبان میں مسائل فقہ پر مشتمل ایک کتاب موجود ہے' جس کا نام "نافع المسلمین" ہے۔ اس کے دیباچے میں مصنف کتاب نے اپنا نام عبدالسلام بن عبدالعزیز لاہوری لکھا ہے۔ اپنے موضوع کی یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ اس میں مختلف فقہی مسائل کے اس انداز میں جواب دیے ہیں جس انداز میں ایک مفتی دیتا ہے۔ عربی میں بھی کثرت سے بعض باتیں بیان کی گئی ہیں۔ غیر فقہی مسائل و معارف کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ اس میں مندرج ہے۔ اس کتاب کا ایک مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں بھی موجود ہے ❷۔

ایشیاٹک سوسائٹی کے مرتب فہرست نے اس امکان کا اظہار کیا ہے کہ "نافع المسلمین" انہی مفتی عبدالسلام لاہوری کی تصنیف ہے' اور عبدالسلام بن عبدالعزیز لاہوری سے یہی مراد ہیں۔ قیاس یہی چاہتا ہے کہ یہ انہی کی تصنیف ہوگی۔

❶ مآثر الکرام دفتر اول' ص ۲۲۶۔

❷ فہرست مخطوطات شیرانی۔ ج ۳' ص ۳۰۶۔

Marfat.com

تذکرہ نویسوں نے مفتی عبدالسلام لاہوری کی بے حد تعریف کی ہے اور ان کے علم و فضل کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ نظام الدین ہروی ان کا ذکر "فحول علمائے لاہور" کے الفاظ سے کرتا ہے ❶۔

شاہ نواز نے انھیں مستند فاضل اور بلند مرتبت فقیہ قرار دیا ہے۔ ❷ بختاور خاں' ان کو "از فضلائے متبحرین بود۔" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ ❸ عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے:

حاوی معقول و منقول ملا عبدالسلام لاہوری مفتی کہ فنون ادبیہ و فقہ و اصول فقہ را نیکو دانستی ❹۔"

(مفتی عبدالسلام لاہوری فنون ادبیہ' فقہ اور اصول فقہ میں خوب مہارت رکھتے تھے اور معقول و منقول پر حاوی تھے۔)

صالح محمد کنبوان کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

جامع المعقول والمنقول ملا عبدالسلام لاہوری کہ در فنون تفسیر و فقہ ثانی و نظیر نداشت ❺۔

(معقول و منقول کے جامع ملا عبدالسلام لاہوری جن کا علوم تفسیر و فقہ میں کوئی ثانی اور نظیر نہ تھا۔)

علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی رقم طراز ہیں:

الشیخ الفاضل العلامة المفتی عبدالسلام الحنفی اللاهوری احد کبار العلماء، لم یکن له نظیر فی عصره فی کثرة الدرس والافادة❻۔

(شیخ' فاضل' علامہ' مفتی عبدالسلام حنفی لاہوری' کبار علما میں سے تھے۔ اپنے عصر میں کثرتِ درس و افادہ میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔)

مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

ملا عبدالسلام لاہوری' شاگرد میر فتح اللہ شیرازی فقیہ و مفسر بود ❼۔

(ملا عبدالسلام لاہوری' جو میر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد تھے' اپنے عہد کے مفسر اور فقیہ تھے۔)

مولوی فقیر محمد جہلمی ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

ملا عبدالسلام لاہوری' عالم اجل' فاضل اکمل' فقیہ جید' مفسر متقن بود ❽۔

---

❶ طبقات اکبری۔ ج ۲' ص ۴۶۹۔

❷ مآثر الامرا۔ ج ۳' ص ۵۱۸۔

❸ مرآۃ العالم۔ ص ۵۳۵۔

❹ بادشاہ نامہ۔ ج ۱' ص ۳۴۲۔

❺ شاہ جہان نامہ۔ ج ۳' ص ۳۸۳۔

❻ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۲۳۔

❼ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۲۰۔

❽ حدائق الحنفیہ۔ ص ۴۰۶۔

Marfat.com

(ملا عبدالسلام لاہوری، عالم اجل، فاضل اکمل، فقیہ جید، مفسر متقن تھے۔)

لاہور کے اس جلیل القدر عالم دین اور مفسر و فقیہ نے کم و بیش ساٹھ سال تک لاہور میں غلغلۂ تدریس بلند کیے رکھا اور اس طویل عہد میں بے شمار ہندی و غیر ہندی علما نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کی وفات ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۸ء کو ہوئی اور نوے (۹۰) برس عمر پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

۱۷- قاضی عبدالسلام برہان پوری

قاضی عبدالسلام سندھی برہان پوری، ارض سندھ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو نما پائی۔ بعض کتب درسیہ شیخ عباس بن جلال سندھی سے پڑھیں، باقی درسی کتابوں کی تکمیل حکیم عثمان بن عیسیٰ بوبکانی برہان پوری سے کی۔ شیخ وقت اور فاضل کبیر تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ برہان پور کے حکمران عادل شاہ نے ان کے فضل و کمال سے متاثر ہو کر انھیں برہان پور شہر کے منصب قضا پر مامور کر دیا تھا۔ عہدۂ قضا کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ علم فقہ پر عبور کا یہ عالم تھا کہ مختصر الوقایہ کی شرح سپرد قلم کی، جو روایات فقہی کی جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے ❶۔

۱۸- شیخ عبدالشکور جون پوری

شیخ عبدالشکور جون پوری، عالم صالح اور اپنے دور کے جلیل القدر بزرگ تھے۔ شیخ مبارک بن خیر الدین جون پوری کی اولاد سے تھے۔ شیخ نور اللہ جون پوری کے بعض تلامذہ سے علم حاصل کیا، پھر شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے کسب طریقت کیا۔ شیخ عبدالشکور جون پوری ہمیشہ مسند درس و افادہ پر متمکن رہے۔ بہت سے علما نے ان سے استفادہ کیا۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ مختصر الوقایہ کی شرح سپرد قلم کی، جس میں مسئلہ عشر بالعشر (دہ دردہ) بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ گیارھویں صدی ہجری کے اس عالم دین نے ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۰۷۲ھ/ یکم جنوری ۱۶۶۲ء کو وفات پائی ❷۔

۱۹- شیخ عبدالشکور منیری

شیخ عبدالشکور منیری بہاری، علاقہ بہار کے شہر منیر میں پیدا ہوئے اور عرصے تک اپنے شہر کے اہل علم سے علم حاصل کرتے رہے۔ پھر عازم جون پور ہوئے جو اس زمانے میں دیار ہند میں علم و فضل کا عظیم مرکز تھا، وہاں شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری اور دیگر علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے اور کتب متداولہ کی تحصیل کی۔ پھر

---

❶ افکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار- ص ۳۰۶ و ۴۴۵- نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۲۵-

❷ تاریخ شیراز ہند جون پور- ص ۱۸۷- تجلی نور ج ۲، ص ۵۴- نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۲۶-

Marfat.com

شیخ محمد رشید عثمانی سے اخذ طریقت کیا اور طویل عرصہ ان کی صحبت و ملازمت میں رہے یہاں تک کہ دعوت و ارشاد کے مرتبہ بلند پر فائز ہوئے۔ شیخ ممدوح نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور انھیں سند خلافت باقاعدہ لکھ کر عطا کی۔ بعدازاں اپنے شہر منیر چلے گئے اور درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔

شیخ عبدالشکور منیری بہاری' عالم وفقیہ' زاہد و قانع اور متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔ کبھی اصحاب دولت کے دروازے پر دستک نہیں دی اور دنیا اور ارباب دنیا کی طرف کبھی دھیان نہیں کیا۔ برصغیر کے اس نامور عالم وفقیہ نے شروع جمادی الاخری ۱۰۹۵ھ/ اپریل ۱۶۸۴ء کو منیر میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے ❶۔

۲۰- قاضی عبدالشکور لاہوری

قاضی عبدالشکور لاہوری' فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں یگانہ روزگار تھے۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے عہد کے علما میں سے تھے۔ عبادت گزار اور متقی عالم دین تھے۔ علما وصوفیا کی بڑی تکریم کرتے اور ان سے عقیدت سے پیش آتے۔ زیادہ وقت تلاوت قرآن، نوافل وعبادت اور اوراد و وظائف میں صرف کرتے۔ متین اور حلیم الطبع تھے۔ مستحقین اور یتامیٰ و مساکین کا بہت خیال رکھتے اور جو آمدنی ہوتی' ان پر خرچ کر دیتے۔ معاملہ فہم اور خوش اخلاق تھے۔ اکبر بادشاہ کی طرف سے علما پر ابتلا و آزمائش کا وقت آیا اور ان پر سختیاں ہونے لگیں تو بادشاہ نے بہت سے علما کو جو ملازمت شاہی میں داخل تھے' دور دراز مقامات میں منتقل کر دیا تھا' تاکہ ان کے اثر ورسوخ کے دائرے یا تو بالکل ختم ہو جائیں یا بہت ہی کم رہ جائیں' ان علما میں قاضی عبدالشکور کا نام بھی شامل ہے۔ بادشاہ نے ان کو جون پور کا قاضی مقرر کر کے بھیج دیا تھا۔ طویل عرصے تک یہ اس عہدہ پر فائز رہے۔ پھر جب بادشاہ' الہ آباد کے دورے پر گیا تو قاضی عبدالشکور بادشاہ کی خدمت میں آئے۔ اس نے ان کو اس عہدۂ قضا سے معزول کر کے ان کی جگہ قاضی زادہ رومی کو مقرر کر دیا' جو ایک بلند مرتبہ عالم دین تھے۔ اس منصب سے علیحدگی کے بعد قاضی عبدالشکور لاہوری نے ہر طرف سے منقطع ہو کر افادۂ عام کو اپنا مستقل مشغلہ قرار دے لیا اور ساری توجہ علما وطلبا کی تعلیم و تعلم پر مرکوز کر دی۔ نہایت قانع بزرگ تھے اور بہت قلیل آمدنی پر گزر بسر کرتے تھے' درس و تدریس میں انتہائی قلبی اطمینان محسوس فرماتے تھے ❷۔

۲۱- قاضی عبدالعزیز نصیر آبادی

قاضی عبدالعزیز بن فتح عالم بن محمد بن محمود شریف حسنی نصیر آبادی' امیر کبیر شیخ الاسلام قطب الدین محمد بن احمد مدنی کردی کی اولاد سے تھے۔ نصیر آباد میں پیدا ہوئے جو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر رائے بریلی

---

❶ نزہۃ الخواطر- ج ۵' ص ۲۲۶ بحوالہ گنج ارشدی-

❷ منتخب التواریخ ج ۳' ص ۱۰۶- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۲۶- تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۶۹

Marfat.com

کے مضافات میں واقع ہے۔ وہیں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں، یہاں تک کہ فتوی و تدریس کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو گئے۔ قابلیت کا یہ عالم تھا کہ شاہ جہان کے عہد میں اپنے بڑے بھائی ابومحمد بن محمد بن محمود نصیر آبادی کی نیابت کرتے ہوئے ان کی جگہ نصیر آباد کے منصب قضا پر متعین ہوئے۔ اپنے علاقے کے مشہور شیخ و عالم اور فقیہ تھے ❶۔

۲۲- شیخ عبدالعزیز الہ آبادی

شیخ عبدالعزیز الہ آبادی، فقیہ اور صالح عالم دین تھے۔ شیخ محبّ اللہ عمری کے خالہ زاد بھائی تھے۔ شیخ محبّ اللہ سے علم ظاہری اور تصوف و طریقت کی تحصیل کی، طویل عرصہ ان کی خدمت میں گزارا اور بہت استفادہ کیا۔ بعد ازاں الہ آباد سے عازم دہلی ہوئے اور وہاں شیخ باقی باللہ کے صاحب زادۂ گرامی شیخ عبداللہ سے ملاقات کی۔ دہلی ہی میں اسراریہ کے مصنف کمال محمد سنبھلی ان سے ملاقی ہوئے ❷۔

۲۳- شیخ عبدالغفور اجینی

شیخ عبدالغفور بن داؤد اجینی، فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ اجین کے باشندے تھے۔ اپنے عم بزرگ وار شیخ راجی محمد اجینی سے حصول علم کیا اور کافی عرصہ ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ اخذ طریقت بھی انہی سے کیا۔ قرآن مجید سے قلبی لگاؤ تھا، چنانچہ پہلے قرآن حفظ کیا اور پھر اس کے مشکلات و غوامض کے حل و کشود میں مصروف ہو گئے۔ ہر سال رمضان المبارک میں قرآن مجید اپنے ہاتھ سے لکھ کر کسی قرآن خواں درویش کو دیا کرتے تھے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا سفر بھی کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ ارض حجاز سے واپس ہندوستان آئے تو اس پر نہایت افسوس کا اظہار کرتے اور دل میں واپس حجاز جانے کی شدید آرزو رکھتے تھے۔ ہر صورت اور ہر حال میں لوگوں کے کام کاج اور ان کی سفارشات اور انھیں فائدہ پہنچانے کے لیے ساعی رہتے۔ نرم دل، حلیم الطبع اور بے حد متقی عالم دین تھے۔ ۱۰۰۵ھ/ ۱۵۹۷ء کو شہر اجین میں فوت ہوئے ❸۔

۲۴- قاضی عبدالغنی خاندیسی

قاضی عبدالغنی خاندیسی، فقہ و اصول اور قرات و تجوید کے جید علما میں سے تھے۔ صوبہ خاندیس کے

---

❶ نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۲۸-

❷ نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۲۹- بحوالہ اسراریہ

❸ اذکار ابرار- ص ۴۱۲، ۴۱۳- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۳۰-

Marfat.com

منصب قاضی القضاۃ پر فائز تھے۔ عالم جوانی ہی میں درس وافادہ میں مصروف ہو گئے تھے اور عرصہ دراز تک یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے۔ جب جوانی رخصت ہوگئی اور دور پیری میں داخل ہوئے تو صحیح بخاری کی شروح اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف کے مطالعہ کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔ اس ہندی عالم وفقیہ نے ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۱ء کو برہان پور میں وفات پائی ❶۔

۲۵- شیخ عبدالفتاح چڑیا کوٹی

شیخ عبدالفتاح بن مبارک عباسی چڑیا کوٹی ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء کو چڑیا کوٹ میں پیدا ہوئے۔ اپنے عصر کے مشاہیر اساتذہ سے اخذ علم کیا اور اس درجہ شہرت وناموری حاصل کی کہ اس دور کے مشاہیر فقہائے حنفیہ میں سے گردانے گئے۔ ''میراث نامہ'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو فارسی نظم میں ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

خدا را شکر کز تحریر نامہ مہذب گشت ایں میراث نامہ

اس عالم دین نے ربیع الاول ۱۰۵۷ھ/اپریل ۱۶۴۷ء کو وفات پائی ❷۔

۲۶- قاضی عبدالقادر پانی پتی

قاضی عبدالقادر پانی پتی ثم اجینی، پانی پت میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی، قاضی محمود پانی پتی کے بیٹے تھے۔ شیخ عبدالملک بن عبدالغفور پانی پتی سے اخذ علم کیا۔ تصوف سے دلچسپی ہوئی تو شاہ عبدالرزاق کی خدمت میں گئے اور ان سے کسب فیض کیا۔ ان کے مرید وخلیفہ ہوئے اور متصوفین فقہا میں شمار کیے گئے۔ عالم شباب میں عازم حج ہوئے اور تین مرتبہ اس مبارک سفر پر گئے۔ ان کے سفر حج کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اثنائے سفر میں متعدد مدارس اور مراکز علم میں پہنچے اور بہت سے لوگوں سے ملاقات کی، جنگلوں اور دریاؤں کو عبور کیا مگر کسی سے کسی قسم کی نہ مدد لی نہ روپے پیسے کی اعانت طلب کی۔ حج کے بعد اجین (مالوہ) میں سکونت اختیار کر لی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ بالآخر عزیزوں اور دوستوں کے اصرار پر مالوہ کے شہر سارنگ پور میں مقیم ہو گئے۔ سارنگ پور میں ان کے چچا منصب قضا پر فائز تھے۔ چچا کی وفات کے بعد ان کو وہاں عہدۂ قضا قبول کرنے کو کہا گیا۔ یہ عہدہ قبول تو کر لیا مگر بعد کو اس سے دست بردار ہو کر وہاں سے چلے گئے اور کسی دور دراز علاقے میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کے دوستوں نے تعاقب کیا۔ واپس لائے اور دس سال بعد پھر منصب قضا پر فائز کر دیا۔

❶ اذکار ابرار۔ ص ۴۵۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۳۰۔

❷ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۳۲۔

Marfat.com

غرض قاضی عبدالقادر پانی پتی عابد و زاہد اور دنیا سے بے زار قسم کے عالم دین تھے۔ دنیا کی ظاہری شان و شکوہ سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہمہ وقت ذکر الٰہی اور یاد خدا میں مصروف رہتے۔ فصیح البیان تھے۔ عربی اور فارسی کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے، جنھیں تقریر و تحریر میں برمحل اور مناسب مواقع پر پڑھتے اور لکھتے۔ صوفیا کی عبارتیں بھی خوب یاد تھیں۔

قاضی ممدوح بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ علم تفسیر پر نظر رکھتے تھے۔ آیات متشابہات کی تاویلات، ناسخ و منسوخ، آیات قرآن کے نزول کی تقدیم و تاخیر، مشکلات قرآنیہ کے حل و کشود، مجملات کے بیان، اعراب کی تخصیص و تعمیم اور شان نزول، قرآن کے استعارات اور حقیقت و مجاز کے عالم تھے۔ ہر جمعے کو شہر کی جامع مسجد میں تفسیر قرآن بیان فرمایا کرتے، جس میں مفسرین کے اقوال و آرا کے خوب حوالے دیتے۔ وفات کے دن بھی حسب معلوم مقررہ وقت پر سورہ مزمل کی تفسیر بیان کی۔ بعد ازاں بدن میں ایک لرزہ پیدا ہوا۔ کچھ وصیت کی اور دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء کو اجین میں انتقال کیا اور مورخین نے ”قاضی زندہ دل“ کے الفاظ سے تاریخ وفات نکالی ❶۔

۲۷- قاضی عبدالقادر لکھنوی

قاضی عبدالقادر لکھنوی فاضل وقت اور علامہ عصر تھے۔ شیخ سلطان بن اللہ داد کی اولاد سے تھے۔ ان کے آباو اجداد میں مولانا قطب الدین محدث بن مولانا خضر محدث ایسے برگزیدہ علما و فضلا کے اسمائے گرامی تذکروں میں مرقوم ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء کو لکھنؤ میں اور ایک روایت کے مطابق کسمنڈی میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں اعمال لکھنؤ میں ایک قریہ تھا۔ عبادت گزار اور متقی بزرگ تھے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو قرآن مجید حفظ کیا اور مزید حصول علم کے لیے لاہور روانہ ہوئے۔ لاہور کو اس عہد میں مرکز علم و فضل کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں مختلف علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے اور درجہ ممتاز پر فائز ہوئے۔

قاضی عبدالقادر لکھنوی مستغنی المزاج عالم تھے۔ دنیا اور اس کے مال و اسباب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جو آمدنی ہوتی غربا و مستحقین میں بانٹ دیتے۔ ان کا معمول تھا کہ عشا کی نماز کے بعد جب تک لوگ جاگتے یہ سوتے رہتے اور جب لوگ سو جاتے تو جاگ اٹھتے۔ پھر صبح تک نماز اور وظائف و اوراد میں مشغول رہتے۔ نماز چاشت کے بعد طلبا کو درس دیتے۔ اس ہندی عالم دین نے چالیس سال تک مسند درس و افادہ آراستہ کیے رکھی اور ان کی کوشش سے اللہ نے بے شمار علما و طلبا کو دولت علم سے بہرہ ور کیا۔ ان کی وفات ۲۷ شعبان ۱۰۷۶ھ/۲۲ فروری ۱۶۶۶ء کو لکھنؤ میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ کل بیاسی سال عمر پائی ❷۔

---

❶ اذکار ابرار ص ۴۶۱، ۴۶۲- نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۳۶، ۲۳۷-

❷ تذکرہ علمائے ہند- ص ۱۲۸- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۳۴-

Marfat.com

۲۸- شیخ عبدالقادر حضرمی

شیخ عبدالقادر بن شیخ عبداللہ عیدروس حضرموتی ہندی، ۲۰ ربیع الاول ۹۷۸ھ/۲۲/اگست ۱۵۷۰ء کو ہندوستان کے مشہور شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے اور ملک کے جید علما و فضلا سے تعلیم حاصل کی۔ شافعی المسلک فقیہ تھے اور اپنے دور کے نامور فاضل تھے۔ تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے۔ ان کی تصانیف میں بڑی عمدہ اور قابل قدر کتابیں شامل ہیں۔ النور السافر فی اخبار القرن العاشر بھی انہی کی تصنیف ہے جو عربی زبان میں تاریخ و رجال کی بہترین کتاب ہے اور کتب حوالہ میں سے ہے۔ اس کے حوالے ''فقہائے ہند'' کی کئی جلدوں میں متعدد مقامات میں دیے گئے ہیں اور معزز قارئین کے مطالعہ میں آچکے ہیں۔ ان کی تصانیف میں درج ذیل کتابوں کے نام تذکروں میں مرقوم ہیں:

(۱) الفتوحات القدسیه فی الخرقة العید روسیه۔ (۲) الحدائق الخضرة فی سیرة النبی و اصحابة العشره (۳) المنتخب المصطفی فی اخبار مولد المصطفی (۴) الدر الثمین فی بیان المهم من الدین۔ (۵) اتحاف الحضرة العزیزة بعیون السیرة الوجیزة۔ (٦) المنهاج الی معرفة المعراج۔ (٧) الانموذج اللطیف فی اهل بدر الشریف (٨) اسباب النجاة والنجاح فی اذکار المساء والصباح (٩) الحواشی الرشیقه علی العروة الوثیقه۔ (١٠) منح الباری بختم البخاری۔ (١١) تعریف الاحیاء لفضائل الانبیاء۔ (١٢) عقد اللآل بفضائل الآل (١٣) بغیة المستفید بشرح تحفة المرید۔ (١٤) النفحة العنبریه فی شرح بتین العدنیة (١٥) غایة القرب فی شرح نهایة الطلب (١٦) اتحاف اخوان الصفاء بشرح تحفة الظرفاء (١٧) صدق الوفاء بحق الافاء (١٨) النور السافر فی اخبار القرن العاشر۔ (١٩) الزهر الباسم من روض الاستاذ حاتم (٢٠) قرة العین فی مناقب الولی عمر بن محمد باحسین۔ (٢١) الروض الاریض والفیض المستفیض (یہ ان کے اشعار کا مجموعہ ہے۔)

شیخ عبدالقادر حضرمی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ بہترین شاعر بھی تھے۔

اس عالم دین اور عظیم مصنف نے ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۹ء کو احمد آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے [1]۔

[1] تذکرۂ علمائے ہند۔ ص ۱۲۹۔ حدائق الحنفیہ۔ ص ۴۰۶۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵ ص ۲۳۵، ۲۳۶۔ خلاصۃ الاثر۔ ج ۲ ص ۴۴۰۔

Marfat.com

۲۹- شیخ عبدالقادر اوچی

شیخ عبدالقادر پنجاب کے شہراچ کے باشندے اور شیخ حامد قادری اچی کے صاحب زادے تھے۔ والد کی وفات کے بعد بڑے بھائی شیخ موسیٰ سے سجادہ نشینی کے مسئلے پر جھگڑا ہوگیا تھا جو کئی سال چلتا رہا۔ بالآخر مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے پاس فتح پور سیکری چلے گئے تھے۔ بڑے عالم اور متقی بزرگ تھے۔ دعوت وارشاد ان کا اصل موضوع تھا۔ اکبر کے مذہبی خیالات میں تبدیلی آئی تو اس سے دور ہٹ گئے۔ اکبر بھی ان سے خوش نہ رہتا تھا۔ ایک رات بادشاہ نے شیخ سے کوکنار (پوست) پینے کو کہا۔ شیخ نے سخت لفظوں میں انکار کر دیا' اس سے بادشاہ کا مزاج اور بھی مکدر ہوگیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ رنج بادشاہ کو اس سے ہوا کہ ایک مرتبہ شیخ موصوف نے فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں نماز باجماعت سے فارغ ہوکر نفل پڑھنا شروع کر دیے۔ بادشاہ نے کہا:

شیخ نماز نفل در خانہ بگزارید۔

(شیخ نفل نماز گھر جا کر ادا کرو۔)

شیخ نہایت جرأت سے بولے:

پادشاہم! ایں ملک شما نیست کہ بحکم شما باشد۔

(بادشاہ! یہ جگہ تیری ملکیت نہیں ہے کہ تیرا حکم چلے۔ تم اس کے مالک نہیں' بادشاہ ہو۔)

اکبر کو ان الفاظ سے بڑی تکلیف پہنچی اور کہا "یہ شیخ کس قدر جاہل ہے۔" پھر حکم صادر ہوا:

چوں ملک از ما نمی خواہی در ملک ما ہم مباش۔

(اگر تم ہماری ملکیت نہیں مانتے تو ہمارے ملک میں نہ رہو۔)

شیخ اسی وقت اٹھے اور بادشاہ کی امداد واعانت کو ترک کر کے اپنے شہر اچ واپس چلے گئے۔ بھائی سے جھگڑا ختم کیا اور دعوت وارشاد میں مشغول ہو گئے۔

یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ شیخ عبدالقادر کے ایک بھائی شیخ موسیٰ (جن سے سجادہ نشینی کے بارے میں تنازع پیدا ہوگیا تھا) پہلے ہی زہد وعبادت اور مجاہدہ ومشیخت کی زندگی ترک کر کے اکبر کے دربار میں پہنچ گئے تھے اور اس سے تعلق پیدا کر کے سپاہ گری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ فوج میں ملازم ہو گئے تھے اور پانچ صدی امیروں کی صف میں چلے گئے تھے۔ اکبر کے افکار دینی میں بڑی تبدیلی آچکی تھی تاہم شیخ موسیٰ کا یہ حال تھا کہ دربار میں اگر نماز کا وقت آجاتا تو عین دیوان خانہ خاص وعام میں بادشاہ کی موجودگی میں خود اذان کہہ کر باجماعت نماز ادا کرتے اور کسی کو انھیں ٹوکنے یا کچھ کہنے کی جرات نہ ہوتی____ بعد میں شیخ موسیٰ کو بادشاہ کی طرف سے ملتان میں جاگیر مل گئی تھی اور وہ وہیں منتقل ہو گئے تھے [1]۔

[1] منتخب التواریخ - ج ۳' ص ۹۱ تا ۹۳ - نزہۃ الخواطر - ج ۵' ص ۲۳۳ -

Marfat.com

۳۰- شیخ عبدالقادر لاہوری

شیخ عبدالقادر بن محمد بن زین العابدین لاہوری بھی درحقیت اوچ کے باشندے تھے۔ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا نام شیخ اللہ بخش تھا۔ دونوں بھائی عالم باعمل، پرہیزگار اور باکمال بزرگ تھے۔ دونوں اکبر کے دربار سے منسلک تھے۔ اکبر نے نیا مذہب ایجاد کیا تو ان کا شمار اس کے مخالفوں میں ہونے لگا۔ بادشاہ نے شیخ اللہ بخش کو صدر کا عہدہ تفویض کرکے گجرات بھیج دیا۔ انھوں نے وہاں بڑی خدمات انجام دیں۔ بادشاہ نے ان کے لیے تین صدی کے منصب کا فرمان جاری کیا، مگر اس اثنا میں وہ گجرات ہی میں وفات پا گئے۔ رہے شیخ عبدالقادر تو ان کو بادشاہ نے مکہ معظمہ چلے جانے کا حکم دیا۔ ارض حجاز کا سفر ان دنوں بادشاہ کی طرف سے جلاوطنی کا حکم رکھتا تھا۔ ان دنوں گجرات کے نظم ونسق پر میرزا نظام الدین احمد اور خان خاناں بیرم خاں متعین تھے۔ شیخ عبدالقادر سفر حجاز کے سلسلے میں وہاں پہنچے تو ان لوگوں نے سامان سفر اور زادراہ تیار کیا۔ شیخ حج وزیارت سے فیض یاب ہو کر واپس آئے تو لاہور میں مقیم ہو گئے اور زہد وافادہ کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔ ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء کو لاہور میں وفات پائی ❶۔

۳۱- علامہ عبدالقادر اجینی

علامہ عبدالقادر اجینی کا مولد بغداد تھا۔ والد کی وفات کے بعد چچا کی نگرانی میں چلے گئے۔ بغداد سے وارد ہند ہوئے۔ پہلے بندرگاہ گوا میں اترے بعد میں گجرات کا عزم کیا۔ منطق وفلسفہ اور دیگر علوم مروجہ میں مہارت رکھتے تھے۔ ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں جلال الدین اکبر سے تعلق پیدا ہوا۔ بعض کتابوں پر تعلیقات وحواشی لکھے۔ ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء کو اجین میں فوت ہوئے ❷۔

۳۲- ملا عبدالقادر بدایونی

ملا عبدالقادر بدایونی، شیخ ملوک شاہ عمری بدایونی کے بیٹے تھے۔ شیخ ملوک شاہ کا شمار اپنے علاقے کے صالح علمائے دین میں ہوتا تھا۔ شیخ وقت مولانا حاتم سنبھلی (متوفی ۹۶۹ھ/۱۵۶۲ء) کے شاگرد تھے۔ ان سے کچھ کتابیں پڑھیں، لیکن تکمیل شیخ جلال الدین بدایونی سے کی۔ اخذ طریقت مولانا عبداللہ بدایونی سامانوی سے کیا۔ شیخ ممدوح نے ۲۷؍ رجب ۹۶۹ھ/۲؍ اپریل ۱۵۶۲ء کو بعارضہ اسہال آگرہ میں وفات پائی اور میت کو بساور میں لے جا کر دفن کیا گیا۔ ملا عبدالقادر نے ''جہان فضل'' تاریخ وفات نکالی۔

---

❶ منتخب التواریخ۔ ج ۳، ص ۱۰۱

❷ اذکار ابرار۔ ص ۵۴۸۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۳۲، ۲۳۳۔

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے' شیخ ملوک شاہ اچھے عالم تھے اوران کا کتب خانہ بھی تھا۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے جو عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ جس زمانے میں وہ حصول علم کے لیے سنبھل میں مقیم تھے' ہیموں بقال (ہیموں بنیا) نے سر اٹھایا اور اس کا لشکر لوٹ مار کرتا ہوا بساور پہنچا۔ اس کے ظلم وتشدد سے تمام بساور لٹ کر برباد ہو گیا۔ بدایونی افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اس لوٹ مار میں والد کا کتب خانہ بھی لٹ گیا۔ اس سے دوسرے برس قحط کی مصیبت آئی۔ اس میں مخلوق خدا کی بدحالی دیکھی نہ جاتی تھی۔ ہزاروں آدمی بھوک سے مر گئے۔ آدمی کو آدمی کھاتا تھا۔

شیخ ملوک شاہ کے بیٹے ملا عبدالقادر بدایونی اپنے عہد کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ دور اکبری کے مشاہیر اور نامور علما میں سے تھے۔ تاریخ ورجال' شعر وانشا اور فنون حکمیہ کے ماہر تھے۔ حدیث اور فقہ میں بھی دست رس رکھتے تھے۔ تاریخ میں یہ ملا عبدالقادر کے نام سے معروف ہیں اور لفظ ''ملا'' ان کے نام جز ہو گیا ہے۔ ''ملا'' اس دور میں ایک معزز لفظ تھا اور اس کا اطلاق بہت بڑے عالم اور فاضل شخص پر ہوتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عبدالقادر بدایونی اس کے صحیح منطوق اور جائز حق دار تھے!

بدایونی کی ولادت:

عبدالقادر بدایونی ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ/ ۲۱ر اگست ۱۵۴۰ء کو ہندوستان کی سابق ریاست جے پور (راجستان) کے قصبہ ٹوڈا میں شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے۔ اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں وہ شیر شاہ کے حسن انتظام اور عدل وانصاف کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ اس منصف مزاج بادشاہ کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اس ضمن میں بدایونی کے الفاظ یہ ہیں:

بحمد اللہ کہ در زمان ایں چنیں ملکے کما قال النبی علیہ السلام انا ولدت فی زمان الملك العادل' تولد صاحب ایں منتخب در ہفدہم شہر ربیع الثانی در سنہ سبع واربعین وتسعمائۃ واقع شد ❶۔

(جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری ولادت عادل بادشاہ (نوشیرواں) کے عہد میں ہوئی۔ الحمد للہ کہ صاحب منتخب التواریخ بھی ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ کو اس بادشاہ عادل (شیر شاہ سوری) کے عہد میں پیدا ہوا۔)

بدایونی کی ابتدائی زندگی بساور میں گزری جو ٹوڈا سے شمال مشرقی جانب اٹھارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

عبدالقادر بدایونی فاروقی النسل تھے۔ ان کا خاندان مالی اعتبار سے تو آسودہ حال نہ تھا۔ البتہ دوھیال اور ننھیال دونوں صاحب علم اور دین دار گھرانے تھے اور اس نعمت خداوندی کے بے حد قدر دان تھے۔

❶ منتخب التواریخ۔ ج ۱' ص ۳۶۳۔

Marfat.com

حصول علم:

بدایونی نے سلیم شاہ سوری کے زمانے میں سنبھل جا کر سید محمد مکی سے قرآن مجید پڑھا۔ سید محمد مکی قرأتِ سبعہ کے قاری تھے۔ ان سے قرات وغیرہ کی تکمیل کی اور خوش الحانی و تجوید سے قرآن پڑھنا سیکھا۔

بدایونی کے نانا کا نام مخدوم اشرف تھا۔ وہ عالم دین تھے اور عہد سلیم شاہ سوری میں ایک پنج ہزاری سردار فرید تارن کی فوج میں (جو علاقہ آگرہ میں بیانہ کے قریب بجواڑہ میں متعین تھا) ایک جنگی عہدے پر فائز تھے۔ ان کو اپنے نواسے (عبدالقادر) سے انتہائی محبت تھی۔ شفیق نانا نے کچھ عرصہ ذہین نواسے کو اپنے پاس رکھا اور صرف ونحو اور عربی علوم کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں۔

۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء میں جب بدایونی بارہ تیرہ سال کی عمر کے تھے، والد مکرم (شیخ ملوک شاہ) انھیں مولانا حاتم سنبھلی کی خدمت میں سنبھل لے گئے۔ ان کے مدرسے اور خانقاہ میں انھوں نے قصیدہ بردہ یاد کیا، وظائف وغیرہ کی اجازت حاصل کی اور تبرکاً فقہ کی کتاب کنزالدقائق کے چند سبق پڑھے۔ مولانا حاتم کے حلقۂ ارادت میں بھی داخل ہوئے۔ مولانا حاتم نے اپنے استاد شیخ عزیز اللہ تلنبی کی طرف سے بھی کلاہ اور شجرہ عنایت کیے تاکہ ہونہار شاگرد علم باطنی کے ساتھ علم ظاہری سے بھی بہرہ ور ہو جائے۔

ایک بزرگ شیخ سعد اللہ نحوی بیانوی (متوفی ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء) تھے۔ بیانہ کے رہنے والے تھے، فن نحو میں اپنے دور کے امام تھے۔ اس موضوع میں کوئی ان کا حریف نہ تھا، اسی سبب سے نحوی ان کے نام کا جز ہو گیا تھا۔ سلیم شاہ سوری کے عہد میں بدایونی اپنے نانا کی معیت میں شیخ سعد اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے علم نحو کی کتاب کافیہ کے چند سبق پڑھے۔ ۹۶۶ھ میں بدایونی اور ان کے والد شیخ ملوک شاہ آگرہ گئے۔ وہاں متعدد اصحاب علم اور ارباب کمال قیام پذیر تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ قاضی ابوالمعلی بخاری تھے، ان سے بدایونی نے شرح وقایہ کا کچھ حصہ پڑھا۔ قاضی ابوالمعالی بخاری، فروع و اصول میں یگانۂ روزگار تھے اور کبار فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ وہ ۹۶۹ھ/۱۵۶۲ء کو بعہد اکبر بادشاہ آگرہ گئے اور مسند درس بچھائی۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ کچھ کتابیں مفتی ابوالفتح بن عبدالغفور تھانیسری (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۹۷۶ھ/ ۲۹/اکتوبر ۱۵۶۸ء) سے پڑھیں اور ابتدائے عمر میں چند کتابوں کی تحصیل ابوالفضل اور فیضی کے والد ملا مبارک ناگوری (متوفی ۱۷ ذی القعدہ ۱۰۰۱ھ/۵/اگست ۱۵۹۳ء) سے کی۔ میر تقی بن فارغی شیرازی سے بھی بعض کتابیں پڑھیں۔ آگرہ میں مولانا مرزا سمرقندی سے شرح شمسیہ اور بعض دیگر کتابوں کی تکمیل کی۔

مولانا مرزا سمرقندی کے بارے میں بدایونی لکھتے ہیں کہ وہ انسانی شکل میں فرشتہ تھے۔ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے اور مدینہ منورہ سے ہو آئے تھے۔ علما و طلبا کی بہت بڑی تعداد ان سے فیض یاب ہوئی۔ منطق کی مشہور کتاب ''شرح شمسیہ'' امیر سید محمد کی تصنیف ہے، جو امیر سید علی ہمدانی کے بیٹے تھے۔ اور امیر

Marfat.com

سید علی ہمدانی وہ بزرگ ہیں، جن کی کوششوں سے خطہ کشمیر میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ بدایونی نے شرح شمسیہ کا کچھ حصہ اور تمام مختصرات مولانا مرزا سمرقندی سے پڑھی تھیں ❶۔

آگرہ میں بدایونی کو بہت سے لوگوں کی صحبت و رفاقت میں رہنے کے مواقع میسر آئے اور ہر قسم کے افراد سے ان کے تعلقات قائم ہوئے، جن میں علما' امرا' مؤرخین اور دربار اکبری کے مختلف فکر و خیال کے حامل لوگ شامل تھے۔ ان میں نظام الدین ہروی۔ (مصنف طبقات اکبری)' غیاث الدین قزوینی' کمال الدین حسین شیرازی' ابوالفضل اور فیضی وغیرہ قابل ذکر ہیں ___ انہی ایام میں فتح پور سیکری کے دور قیام میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے ملاقاتوں کا سلسلہ رہا اور ان کے علم و فضل اور زہد و تقوی سے بدایونی نہایت متاثر ہوئے ❷۔

والد اور نانا کی وفات:

بدایونی اپنے والد سمیت آگرہ میں تھے کہ ۲۷/ رجب ۹۶۹ھ/۲/ اپریل ۱۵۶۲ء کو آگرہ میں والد انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کی بدایونی نے ان اشعار سے تاریخ نکالی:

سردفتر افاضل دوراں ملوک شاہ آں بحر علم' معدن احسان و کانِ فضل
چوں بود در زمانہ جہانے زفضل ازاں تاریخ سال فوت وے آمد جہان فضل ❸

اس کے بعد بدایونی علاقہ سنبھل کے ایک مقام سہسوان میں تھے کہ نانا مخدوم اشرف کی وفات کی اطلاع پہنچی ❹ یعنی ایک سال میں یکے بعد دیگرے دو موتوں کے صدمے برداشت کرنا پڑے۔ ایک والد کی موت کا اور ایک نانا کی موت کا۔! نانا ان کے استاد بھی تھے اور بے حد مہربان و شفیق بھی۔! بدایونی ان کی موت سے بہت مغموم ہوئے اور حزن و ملال کی سیاہ گھٹائیں ان پر چھا گئیں۔ منتخب التواریخ میں اس سانحہ کا انھوں نے انتہائی افسوس کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

امیر حسین خاں کی ملازمت:

۹۷۳ھ/۱۵۶۶ء میں بدایونی علاقہ اودھ کے والی امیر حسین خاں کے پاس بٹیالہ پہنچے۔ بٹیالہ وہ مقام ہے جہاں امیر خسرو پیدا ہوئے تھے۔ یہ علاقہ امیر حسین خاں کی جاگیر میں شامل تھا۔ حسین خاں عامل

❶ منتخب التواریخ، ج ۳ ص ۱۱۲۔
❷ منتخب التواریخ۔ ج ۳' ص ۱۱۳ تا ۱۱۷۔
❸ منتخب التواریخ۔ ج ۲' ص ۵۳۔
❹ ایضاً۔ ص ۶۴

Marfat.com

سنت، علم پرور، علما دوست، پابند نماز با جماعت، ہمدرد خلائق صاحب اخلاق، درویش سیرت، پیکر جود وسخا اور متواضع امیر تھا۔ بدایونی نے اس پرہیز گار اور بہادر افغان کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس نے ہمایوں کی مراجعت ہند سے لے کر اکبر کے بائیسویں سال جلوس تک بڑی جاں نثاری اور وفاداری کا ثبوت دیا تھا اور تین ہزاری منصب سے سرفراز ہوا تھا۔ ۹۷۳ھ سے ۹۸۱ھ تک بدایونی اس کی جاگیر کی حفاظت و وکالت کے فرائض نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں علما و مشائخ کی مجلسیں خوب گرم رہیں اور قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صداؤں سے سیرابیٔ قلب و روح کے سامان فراہم ہوتے رہے [1]۔ اسی دوران میں ۹۷۵ھ کو وہ رخصت لے کر بدایوں گئے اور دوسری شادی کی، جس کا ذکر انھوں نے اگرچہ صرف ڈیڑھ سطر میں کیا ہے، لیکن بڑے پُرلطف انداز میں کیا ہے۔ پہلی شادی کا تذکرہ نہیں کیا۔ معلوم نہیں عقد ثانی کے وقت پہلی بیوی زندہ تھی یا وفات پا گئی تھی۔

بیٹے اور بھائی کی وفات:

کچھ عرصہ بعد بدایونی کو اللہ نے بیٹا عطا فرمایا۔ اس کا نام عبداللطیف رکھا۔ بیٹے کی پیدائش سے نہایت خوش ہوئے، لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ چھوٹی عمر میں بیٹا بھی فوت ہو گیا اور چھوٹا بھائی محمد بھی وفات پا گیا۔

بدایونی اس دوہرے صدمے کا بڑے افسوس کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

چھوٹے بھائی شیخ محمد کی میں نے جان کے برابر پرورش کی تھی، بلکہ میں اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ بڑے اخلاق حمیدہ کا مالک تھا۔ ایک اچھے گھرانے میں اس کی شادی کی۔ کیا خبر تھی کہ اس کار خیر میں ہزاروں حزن و ملال کی شر چھپی ہوئی ہے۔ اس کو ہم سے موت نے چھین لیا۔ اسی طرح نور چشم عبداللطیف جو ہنستا کھیلتا بچہ تھا، گود سے گور میں چلا گیا۔ وہ میری زندگی کا ہرا بھرا پودا تھا اور میں اپنے زمانے کا شہریار تھا۔ افسوس دونوں کو زمانے کی نظر کھا گئی اور ان کی موت نے مجھے اپنے ہی شہر میں پردیسی کر دیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون [2]۔

واقعہ عشق اور اس کی سزا:

بدایونی صاف گو مورخ ہیں، بعض دفعہ ایسی باتیں بھی بیان کر جاتے ہیں، بظاہر جنھیں لوگوں سے چھپانا چاہیے۔ اس ضمن میں نہ وہ اپنا لحاظ کرتے ہیں نہ دوسروں کا۔! اس سلسلے کا ایک واقعہ جو حسین خاں کے دوران ملازمت میں ۹۷۹ھ/۱۵۷۱ء کو پیش آیا، اور جوان کے عشق و محبت اور اس کے نتیجے سے تعلق رکھتا ہے، منتخب التواریخ میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

---

[1] منتخب التواریخ۔ ج ۲، ص ۱۳۶۔

[2] منتخب التواریخ۔ ج ۲ ص ۱۲۶، ۱۲۷

Marfat.com

''اس سال مجھے ایک ہولناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔ قصہ یہ ہوا کہ جب حسین خاں کو کانت و کولہ کی جاگیر دی گئی تو میں بھی تقدیر کا مارا کچھ عرصے تک اس کی ملازمت میں وہاں رہا۔ اس صوبے کی صدارت اور فقرا کی خدمت میرے سپرد کی گئی تھی۔ قنوج کے مضافات میں مکن پور کے مقام پر حضرت بدیع الدین شاہ مدار کا مزار ہے۔ میں اس کی زیارت کے لیے وہاں گیا۔ انسان کی سرشت میں غفلت و جہل ابوالبشر آدم سے وراثت میں چلی آ رہی ہے۔ میں نے بھی انسان کا کچا دودھ پیا ہے' خطا و نسیان سے بالاتر نہیں ہوں۔ میری آنکھوں پر بھی غفلت و جہالت کا پردہ پڑ گیا اور وہاں ایک خوبرو کے کرشمہ و ادا نے مجھے دام ہوس میں پھنسا دیا۔ ہوس کو عشق سمجھ بیٹھا۔ پھر جو کچھ بیتی سو بیتی۔ اس درگاہ میں مجھ سے بے ادبانہ حرکت سرزد ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کا خمیازہ مجھے اس دنیا ہی میں مل گیا۔ میرے ''معشوق'' کی قوم کے چند افراد نے حملہ کر کے مجھے زخمی کر دیا۔ میرے سر' ہاتھوں اور کندھے پر پے در پے تلوار کے نو زخم لگے۔ دوسرے زخم تو مندمل ہو گئے' لیکن سر کا زخم بہت گہرا تھا۔ تلوار ہڈی کو توڑتی ہوئی بھیجے تک پہنچ گئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کی رگ بھی کٹ گئی تھی اور انگلی لٹکنے لگی تھی۔ زندگی کے ختم ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی' مگر خدا کا شکر ہے کہ اتنے بڑے حادثے کو برداشت کر گیا۔

''قصبہ بانگر مئو میں ایک ماہر جراح نے علاج کیا اور ہفتہ بھر کے اندر ہی تمام زخم ٹھیک ہو گئے۔ اس بیماری اور مصیبت میں منت مانی کہ صحت یاب ہو جاؤں تو حج کروں گا۔ لیکن افسوس ایفائے عہد کی اب تک نوبت نہیں آئی۔ غرض کچھ صحت پانے کے بعد وہاں (قصبہ بانگر مئو) کانت و کولہ گیا۔ غسل صحت کے بعد پھر دوبارہ بیمار ہو گیا۔ حسین خاں نے' خدا اسے جنت نصیب کرے' باپ اور بھائی کی طرح میری خدمت کی۔ ان دنوں سخت سردی پڑ رہی تھی' لہٰذا زخم دوبارہ ہرا ہو گیا تھا۔ اس نے چوب گز [1] کا مرہم اور کھانے کو گزر کا حلوا تیار کرایا۔ میں وہاں سے بدایوں چلا گیا۔ وہاں طبیب نے سر کے زخم کو دوبارہ کھول کر مرہم پٹی کی۔ اس علاج میں ایسی تکلیف ہوئی کہ بس موت کے منہ میں جا کر نکلا۔ اسی دوران میں ایک دن کچھ نیند اور کچھ بیداری کے عالم میں ایک خواب دیکھا کہ سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں۔ وہاں باقاعدہ کچہری لگی ہوئی ہے' جس میں دیوانی کارندے اور محرر کام میں مصروف ہیں۔ چوکیداروں کی ایک جماعت شاہی اجلاس کی طرح ہاتھ میں چھڑیاں لیے ہوئے لوگوں کو ادھر ادھر ہٹانے اور مئودب رکھنے میں مصروف ہے۔ مجھے پیش کیا گیا تو ایک محرر ایک کاغذ ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھنے لگا۔ پھر کہا: ''یہ وہ شخص نہیں ہے۔'' اسی حالت میں میری آنکھ کھل گئی ـــــــ میں نے بچپن میں جو افواہ لوگوں سے سن رکھی تھی' اس موقعے پر مجھے اس کا یقین سا ہو گیا [2]۔''

---

[1] ایک درخت کا نام ہے جو ندی کے کنارے ہوتا ہے۔ عربی میں اسے طرفا اور ہندی میں جھاؤ کہتے ہیں۔

[2] منتخب التواریخ۔ ج ۲ ص ۱۳۶ تا ۱۳۸۔

Marfat.com

بدایوں میں آتش زدگی:

۹۷۹ھ/۱۵۷۱ء کو بدایوں میں آتش زدگی کا حادثہ پیش آیا۔ بدایونی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اسی سال بدایوں میں آتش زدگی کا ہولناک واقعہ رونما ہوا۔ اس حادثے میں اتنے ہندو اور اتنے مسلمان ہلاک ہوئے کہ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔ جلی ہوئی انسانی لاشوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کر دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان میت کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہت سے لوگ آگ کے خوف ناک شعلوں سے محفوظ رہنے کے لیے قلعے کی فصیل پر چڑھ گئے تھے لیکن بھڑکتی ہوئی آگ نے پیچھا نہ چھوڑا' وہاں بھی انھیں جا پکڑا۔ بہت سی عورتیں اور مرد فصیل پر سے دوسری طرف کود گئے' بہت سے گر کر مر گئے' جو بچ رہے' وہ معذور اور اپاہج ہو گئے۔ آگ بجھانے کے لیے لوگ جس قدر پانی ڈالتے تھے' اس کے شعلے اور بلند ہو جاتے تھے۔ گویا پانی بھی تیل کا کام کر رہا تھا۔

بدایونی مزید لکھتے ہیں:

''میں نے اس آتش زدگی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بلکہ اس کی تپش میرے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ اس حادثے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ دوآبہ کا ایک مجذوب بدایوں آیا۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ تنہائی میں اس نے مجھ سے کہا:

''اس شہر سے نکل جاؤ''

میں نے پوچھا: ''کیوں۔؟''

مجذوب نے جواب دیا: ''یہاں قدرت ایک کھیل کھیلنے والی ہے۔''

وہ عجب رند و مست معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا۔ لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا۔

چہ پرسی از بداؤں و زاحوال پریشانش — کہ آیاتِ عذاب النار نازل گشتہ در شانش[1]

ترک ملازمت:

آٹھ برس کی رفاقت کے بعد ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء کو بدایونی کا اپنے دوست اور دینی بھائی امیر حسین خاں سے بگاڑ پیدا ہو گیا اور بدایونی اس کی ملازمت ترک کر کے بدایوں چلے گئے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس سے بگاڑ یا اختلاف کی اصل وجہ کیا تھی۔ حسین خاں سیدھا سادا سپاہی اور مخلص مسلمان تھا۔ آقائی و ماتحتی کے تصور کو ذہن میں نہ لاتا تھا۔ اپنے مقام و مرتبہ کی پروا کیے بغیر بدایوں گیا اور بدایونی کی والدہ کی خدمت میں

[1] منتخب التواریخ۔ ج ۲ ص ۱۳۸، ۱۳۹

Marfat.com

حاضر ہوا۔ بدایونی سے معذرت کی اور ماں سے سفارش کا طالب ہوا۔ ہر چند کوشش کی کہ وہ واپس چلیں مگر نہ مانے اور اکبر کے شاہی دربار میں جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

اکبر کا دربار اس زمانے میں اصحابِ علم اور اربابِ کمال کا مرکز تھا۔ خود بادشاہ اس متاعِ گراں بہا کا بہت قدر دان تھا اور علما و فضلا کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ لیکن بعض اصحاب علم (مثلاً حاجی ابراہیم سرہندی وغیرہ) کا جو مجادلہ و مباحثہ میں بہت بے باک ہو گئے تھے' زور بھی توڑنا چاہتا تھا۔

دربار اکبری میں:

بدایونی نے جب اکبر بادشاہ کے دربار میں جانے کا پختہ ارادہ کر لیا تو ۹۸۱ء کے ماہ ذی الحجہ کے اواخر میں بدایوں سے آگرہ پہنچے۔ وہاں جمال خاں قورچی اور حکیم عین الملک سے ملاقات ہوئی' اور انہی کے ذریعے سے دربار شاہی میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔

حکیم عین الملک بہت بڑے طبیب اور جالینوس وقت تھے۔ شیریں کلام اور خوش اخلاق تھے۔ امراض چشم میں اپنے دور کے بے نظیر معالج تھے۔ اچھے شاعر تھے اور دوانی تخلص کرتے تھے۔ اسی بنا پر انھیں حکیم دوانی بھی کہا جاتا تھا۔ علامہ جلال الدین محمد دوانی کی اولاد سے تھے۔ بادشاہ کے مصاحب و ندیم تھے اور بادشاہ ان کی قدر کرتا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے علم و مطالعہ کی وسعتوں سے خوب آگاہ تھے۔ ۲۷ ذی الحجہ ۱۰۰۳ھ/۲۳/ اگست ۱۵۹۵ء کو فوت ہوئے۔

اسی طرح جمال خاں قورچی اکبر کے مصاحبین میں سے تھا اور پنج صدی عہدے دار تھا۔ بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخیل تھا۔ خوش مزاج اور ظریف الطبع تھا۔ وسیع القلب اور مخلص مسلمان تھا۔ بدایونی کی اقتدا میں نمازیں پڑھتا رہا تھا اور ان کے اسلوب قرأت سے بہت متاثر تھا۔ ان کی خوش الحانی کی تعریف کرتا تھا۔ ان کی علمی تقریریں کئی دفعہ سن چکا تھا اور ان کے طرزِ بیان کا مداح تھا۔ اس نے ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں وفات پائی۔

ان حضرات نے بدایونی کو بادشاہ کے حضور پیش کیا اور امامت نماز پر تقرر کی سفارش کی۔ چنانچہ بادشاہ نے بدایونی کو دربار شاہی سے منسلک کر لیا۔ بیستی کا منصب ملا اور فرائض امامت سپرد ہوئے۔ ہفتے کے سات دنوں میں سات امام نماز پڑھاتے تھے۔ ہر امام کے ذمے ایک دن کی امامت تھی۔ بدایونی کو بدھ کے روز کی امامت سونپی گئی۔ بدایونی رقم طراز ہیں:

اسی سال بادشاہ نے میرے خوش آواز ہونے کی وجہ سے' چہار شنبہ کے دن کی امامت میرے سپرد فرمائی اور مجھے سات اماموں میں داخل کیا' اور خواجہ دولت ناظر کو مقرر فرمایا کہ وہ اس دن اور رات میں پانچوں وقت حاضری کے لیے اسے یاد کرائے۔

Marfat.com

اس زمانے میں دربارِ اکبری میں علما کو کس عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ علم کو کیا وقعت حاصل تھی اور خود علما کا اپنا کیا انداز تھا۔ اس کے بارے میں خود بدایونی کے فارسی الفاظ کا ترجمہ پڑھیے:

''ان دنوں علم کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ پہلی ہی حاضری میں بادشاہ سے مخاطبت کا اعزاز حاصل ہوا' اور ہم نشینوں میں داخل کر لیا گیا۔ بادشاہی مجلس کے علما کا یہ حال تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی علمیت کا نقارہ بجانے کی فکر میں رہتے تھے' کسی دوسرے کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہ دیتے تھے۔ بلکہ بحث مباحثہ کر کے اس کو نیچا دکھانے اور خود سر بلند ہونے کی تدبیروں میں لگے رہتے تھے۔ میری جوانی کا عالم تھا۔ اللہ کی عنایت خاص سے قوتِ طبع' ذکاوتِ فکر اور فہم و جرات کے تمام سامان مہیا تھے۔ اس لیے جلد ہی ان علما میں سے اکثر پر چھا گیا۔''

بدایونی کے فارسی الفاظ ملاحظہ ہوں:

''وبعنایت الٰہی وبقوتِ طبع وذکائے فہم ودلیری کہ لازمہ عہد شباب بود براکثرے غالب می آید ❶۔''

''جب میں دربار میں حاضر ہوا تھا تو بادشاہ نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا کہ بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کا مزاج درست کر دے گا۔ بادشاہ چاہتا تھا کہ حاجی ابراہیم کو میدان علم میں شکست دی جائے۔''

دروقت ملازمت تعریف کردہ بودند کہ ایں فاضل بدایونی سرکوب حاجی ابراہیم سرہندی است ❷۔

چنانچہ میں نے حاجی ابراہیم سرہندی پر پے در پے سخت وار کیے اور اس کو بری طرح ہدف تنقید ٹھہرایا۔ میرا یہ انداز بادشاہ کو بہت پسند آیا اور مجھے اس کی برابر داد ملتی رہی۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے ہاں میری آمد و رفت نہ تھی۔ اس لیے وہ مجھ سے کچھ کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ مناظرے اور مباحثے کے وقت وہ میرے فریق مخالف کی حمایت کرتے تھے۔ لیکن بعد میں شیخ کی یہ پرخاش اور کبیدگی ختم ہو گئی' اور ہمارے باہمی تعلقات بڑے استوار ہو گئے۔ ان ہی دنوں ابوالفضل بھی کہ اس کے علم و عقل کا ستارہ اوج پر تھا' دربار اکبری میں باریاب ہوا' اور بڑے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا ❸۔

دربار اکبری میں جاتے ہی بدایونی نے علمائے دربار سے بحث و مجادلے کا سلسلہ شروع کر دیا اور اپنی حدتِ فکر' تیزیٔ طبع اور حاضر جوابی کی وجہ سے بہت جلد بادشاہ اور علما و امرا سے اپنے علم کا لوہا منوالیا' اور ان کا شمار اونچے مرتبے کے اہل علم میں ہونے لگا۔ بادشاہ تو ان کے علم و فضل اور فراوانیٔ معلومات سے اس درجہ متاثر ہوا کہ ان کے شامل دربار ہونے کے بعد جب وہ پہلے سفر پر روانہ ہونے لگا تو ان کو اپنے ہمراہ کیا اور علما کی اس جماعت میں شریک کیا جو سفر میں بادشاہ کے ہم رکاب رہتی تھی۔

---

❶ منتخب التواری - ج ۲' ص ۱۷۲-

❷ منتخب التواریخ - ج ۲' ص ۱۷۲' ۱۷۳-

❸ ایضاً

Marfat.com

دوران سفر میں جب بادشاہ کے سامنے بدایونی کے فکر ونظر کی مزید تہیں کھلیں اور اس کے علم وادراک کی وسعتوں کا اندازہ ہوا تو اس نے ان کو سنسکرت کی کتاب سنگھاسن بتیسی کو فارسی میں منتقل کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ آج ہی یہ کام شروع کر دو اور اس کا ایک ورق لکھ کر دکھاؤ۔ چنانچہ بادشاہ کے اس ارشاد پر عمل کیا گیا۔ اس نے ترجمے کا ایک صفحہ دیکھا تو نہایت خوش ہوا۔ بدایونی کے اس کام کی بہت تعریف کی اور ان کو خراج تحسین پیش کیا۔ سنگھاسن بتیسی کے ترجمے کی تفصیل آیندہ آ رہی ہے۔

جب تک بادشاہ نے اپنے آپ کو دائرۂ اسلام میں محصور رکھا اور وہ امور دینی کا پابند رہا' بدایونی کے اس سے اور اس کے بدایونی سے خوب مراسم رہے' لیکن جب سن جلوس کے تیئسویں سال کے اواخر (۹۸۵ھ) اور چوبیسویں سال کے اوائل (۹۸۶ھ) میں اس نے قبائے مذہب اوتار کر بے دینی کے دریا میں غوطہ زنی شروع کی اور فکر وعمل کے جادۂ مستقیم سے انحراف کر کے غیر دینی رجحانات کو مرکز توجہ ٹھہرالیا تو بدایونی اس سے کبیدہ خاطر ہو گئے اور دونوں ایک دوسرے سے ذہنی طور پر دور دور رہنے لگے۔ مگر سلسلۂ ملازمت اور تعلق دربار قائم رہا۔

معرکہ جہاد میں شرکت:

۹۸۴ھ کو بدایونی نے معرکہ جہاد میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔ اس کی تفصیل وہ خود ہی لکھتے ہیں' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۹۸۴ھ میں اکبر بادشاہ اجمیر میں تھا۔ بدایونی بھی شریک سفر تھے۔ بادشاہ نے مان سنگھ کے زیر کمان ایک بڑا لشکر رانا کیکا سے لڑائی کی غرض سے کوکندہ اور کونبھل میر کی مہم پر روانہ کیا۔ کئی بہادر سردار اور درباری امیر فوج میں شامل تھے' جن کے خیمے اجمیر سے تین کوس تک نصب تھے۔ بدایونی نے فوج کی شان وشوکت دیکھی تو بے اختیار ہو گئے اور دل میں جذبۂ جہاد نے جوش مارا۔ سیدھے صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی کے پاس پہنچے اور جہاد پر جانے کے لیے بادشاہ سے رخصت لینے کی درخواست کی۔ مگر اس ذریعے سے بات بنتی دکھائی نہ دی تو اپنے ہم سبق وہم درس میر غیاث الدین سے ملے' جس کا لقب نقیب خاں تھا۔ یہ شخص بڑا نیک تھا اور بدایونی کا دوست۔۔! اس نے کہا:

اگر ہندو سردارِ ایں لشکر نمی بود نخست کسے کہ رخصت می گرفت من بودم۔

(اگر امیرِ لشکر ہندو نہ ہوتا تو میں خود اس مہم میں جانے کے لیے بادشاہ سے اجازت طلب کرتا۔)

نقیب خاں کی بات بظاہر وزنی معلوم ہوتی ہے' کیوں کہ سپہ سالارِ لشکر مان سنگھ تھا۔ مگر بدایونی کا جواب بھی نہایت معقول ہے۔ فرماتے ہیں:

ماسردارِ خود بندگانِ حضرت رامی دانیم برمان سنگھ وغیرہ چہ کار داریم کہ کار بہ تصحیح نیت است۔

(میں نے نقیب خاں سے کہا' ہم اپنا امیر اکبر بادشاہ کو مانتے ہیں' جو مسلمان ہے اور کفار کے مقابلے

Marfat.com

میں فوج بھیج رہا ہے۔ مان سنگھ وغیرہ سے ہمیں کیا غرض۔ اصل شی نیت ہے' یہ درست ہونی چاہیے۔)

بہرحال بدایونی اور نقیب خاں بادشاہ کے پاس پہنچے۔ اس وقت وہ شیخ معین الدین اجمیری کے مرقد کے اونچے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ نقیب خاں نے بدایونی کے شریک جہاد ہونے کے لیے عرض کیا اور سفارش کی کہ انھیں اس نیک کام میں شمولیت کی اجازت دی جائے۔

بادشاہ نے کہا:

فرمودند کہ او بعہدۂ امامت متعین است چوں می رود؟

یہ تو امامت نماز کے منصب پر فائز ہیں۔ جنگ میں کیوں کر جاسکتے ہیں؟

اس نے عرض کیا: ''جہاد کی آرزو رکھتے ہیں۔''

یہ سن کر بادشاہ نے بدایونی سے دریافت کیا: ''بہت جی چاہتا ہے۔''؟

بدایونی نے جواب دیا: ''جی ہاں۔ بہت چاہتا ہے۔''

فرمایا: ''کیوں۔؟''

عرض کیا: ''اپنے عملوں کی سیاہی کو جاں نثاری کے ذریعے دھونا چاہتا ہوں۔''

ارشاد ہوا: ان شاء اللہ تعالیٰ خبر فتح خواہی آور۔

(ان شاء اللہ تعالیٰ فتح کی بشارت لے کر آؤ گے۔'')

یہ کہہ کر بادشاہ نے مراقبے میں سر جھکا کر پوری توجہ سے رخصت کی فاتحہ پڑھی۔ (دعا کی) بدایونی لکھتے ہیں کہ میں نے چبوترے پر ہاتھ بڑھا کر پابوسی کا ارادہ کیا' مگر بادشاہ نے پیر اوپر کھینچ لیے۔ وہ اجازت لے کر دیوان خانے سے باہر نکلے تو بادشاہ نے پھر بلایا۔ دونوں ہاتھ بھر کر اشرفیاں عطا کیں اور خدا حافظ کہا۔ اشرفیاں گنیں تو پینسٹھ تھیں۔

بعد ازاں بدایونی' جہاد پر جاتے وقت صدر الصدور شیخ عبدالنبی کی خدمت میں گئے۔ اب وہ بھی مہربان تھے۔ تاکید سے فرمایا: ''میدان جنگ میں دشمن کی فوج سے مقابلہ ہو تو مجھے دعائے خیر سے یاد رکھنا۔ حدیث نبوی کی رو سے یہ قبولیت دعا کا وقت ہوتا ہے۔ بھولنا نہیں ❶۔ بدایونی نے ''بہت اچھا'' کہہ کر شیخ سے دعا کی درخواست کی اور گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ بدایونی کا یہ سفر جہاد بڑا مبارک ثابت ہوا' اور وہی بادشاہ کے

---

❶ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے' جس کے الفاظ یہ ہیں:-

عن سهل بن سعد رضى الله عنه قال قال رسول اللهﷺ ثنتان لا يرد ان الدعاء عند النداء وعند الباس حين يلحم بعضهم بعضا- (مشکوٰۃ' باب فضل الاذان واجابة الموذن فصل ثانی)

(یعنی حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو وقت کی دعا بارگاہِ خداوندی سے مسترد نہیں کی جاتی- ایک اذان کے وقت کی اور دوسری جہاد کے وقت کی' جب فوجیں برسرپیکار ہوں-)

Marfat.com

پاس فتح کی خوش خبری لائے۔

اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح اور کافروں کو ہزیمت ہوئی۔ رانا بھاگ گیا۔ اس کے ایک قدآور ہاتھی کا نام ''رام پرشاد'' تھا۔ یہ ہاتھی کئی دفعہ بادشاہ نے رانا سے مانگا تھا' مگر اس نے نہیں دیا تھا۔ یہ ہاتھی بھی شاہی فوج کے قبضے میں آیا ___ امرائے فوج نے باہم مشورے سے طے کیا کہ فتح کی خوش خبری کے ساتھ یہ ہاتھی بھی بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

فتح کی خوش خبری بدایونی کے ذریعے:

اب سوال یہ درپیش تھا کہ یہ اہم کام کس کے سپرد کیا جائے جو فتح کی بشارت دینے بادشاہ کے حضور جائے۔ آصف خاں نے ملا عبدالقادر بدایونی کا نام پیش کیا اور کہا کہ یہ فقط ثواب کی غرض سے شامل جہاد ہوئے ہیں' انہی کو ہاتھی اور فتح نامہ کے ساتھ بادشاہ کے پاس بھیجنا چاہیے ___ یہاں بدایونی لکھتے ہیں کہ آصف خاں کی اس سفارش پر سپہ سالارِ فوج مان سنگھ نے کہا ''ابھی تو بہت سے اہم امور سر انجام دینا باقی ہیں' ان کو لشکر میں رہ کر ہر معرکے میں فوجیوں کی امامت کرنی چاہیے۔'' بدایونی نے جواب دیا۔ ''یہاں کی امامت کا اب وقت نہیں رہا۔ مجھے یہاں سے جا کر خود بادشاہ کی امامت کرنی ہے۔'' مان سنگھ اس جواب پر مسکرایا اور بہت خوش ہوا۔ اس نے تین سو سواروں کی حفاظت میں مذکورہ ہاتھی اور فتح نامہ دے کر اعزاز کے ساتھ بدایونی کو رخصت کیا اور خود بھی سیر و شکار اور مختلف مقامات پر حفاظتی چوکیاں اور تھانے قائم کرنے کے لیے بیس کوس تک ساتھ گیا۔

بدایونی نہایت تکریم کے ساتھ لشکر گاہ سے چلے اور مان سنگھ کے وطن ''انبیر'' کے راستے جو جے پور میں واقع ہے' فتح کا اعلان کرتے اور خود اپنے مولد قصبہ ٹوڈا سے ہوتے ہوئے دارالخلافہ فتح پور سیکری پہنچے۔ راستے میں جہاں جہاں سے بدایونی کا قافلہ گزرتا' لوگ بڑے احترام سے استقبال کو آتے۔ پورے اعزاز سے ٹھہراتے اور عزت سے رخصت کرتے انبیر سے پانچ کوس کے فاصلے پر تھے کہ ہاتھی دلدل میں پھنس گیا اور بڑی مشکل سے دیہات کے لوگوں نے مل کر باہر نکالا ___ یہ واقعہ بدایونی نے مسرت انگیز لہجے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

انبیر میں بدایونی کا یہ قافلہ تین چار روز مقیم رہا۔ وہاں سے قصبہ ٹوڈا کے راستے جو بدایونی کی جائے پیدائش ہے' بساور گئے' جہاں ان کا پورا خاندان آباد تھا۔ فتح پور سیکری پہنچے تو مان سنگھ کے والد راجہ بھگوان داس کی وساطت سے شاہی محل میں گئے۔ بادشاہ کو کورنش بجا لا کر امرائے لشکر کے عریضے اور ہاتھی پیش کیا۔ بادشاہ نے بدایونی سے کہا:

''امرا نے تمھاری تعریف لکھی ہے۔ سچ بتاؤ' کس فوج میں تھے اور کیا کارنامہ انجام دیا''؟

بدایونی نے جواب دیا: ''یہ ناچیز بادشاہوں کے حضور لرزاں و ترساں سچ ہی بولنے کا عادی ہے۔ بھلا کذب بیانی کس طرح کر سکتا ہے''؟

Marfat.com

اس کے بعد پورا واقعہ من وعن بیان کیا۔
بادشاہ نے دریافت کیا: ”تم بلا ہتھیار تھے یا مسلح“؟
کہا: ”زرہ پہنے ہوئے اور تلوار بدست تھا۔“
فرمایا: ”یہ چیزیں کہاں سے ملیں“؟
عرض کیا: ”سید عبداللہ خاں سے“!

بدایونی لکھتے ہیں: بادشاہ نے میری بڑی تعریف اور تحسین کی۔ ان دنوں شہنشاہ کے سامنے ہمیشہ اشرفیوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ دونوں ہاتھ میں اشرفیاں بھر کر انھیں عنایت کیں۔ گنی تو چھیانوے (۹۶) تھیں۔
پھر پوچھا: ”شیخ عبدالنبی سے مل چکے“؟
کہا: ”راستے کی گرد وغبار جھاڑتے ہوئے‘ سیدھا خدمت عالی میں حاضر ہوا ہوں۔ اس حالت میں ان سے کیسے مل سکتا تھا“؟

بعدازاں بادشاہ نے ایک عمدہ قسم کا نخودی دوشالہ بدایونی کو دیا کہ اسے لے جاؤ اور شیخ سے ملاقات کرو اور ان سے کہو کہ یہ دوشالہ ہم نے خاص آپ کے لیے اپنے کارخانے میں تیار کرایا ہے‘ اسے زیب تن کیجیے۔ بدایونی دوشالہ لے کر شیخ عبدالنبی کے پاس گئے اور جو کچھ بادشاہ نے کہا تھا‘ بتایا۔ شیخ بہت خوش ہوئے اور بدایونی سے پوچھا:

”آپ کو رخصت کرتے وقت میں نے کہا تھا کہ دشمن سے مقابلے کے وقت مجھے دعا میں یاد رکھنا۔“
بدایونی نے جواب دیا: ”اس وقت میں نے یہ دعا پڑھی تھی۔
اللھم اغفر للمؤمنين و المومنات‘ وانصر من نصر دين محمد و اخذل من خذل دين محمد عليه الصلوة والسلام۔“
شیخ نے کہا: یہ بھی کافی ہے۔
بدایونی کے الفاظ یہ ہیں:
شیخ خوش حال شدو پرسید کہ دروقت و داع گفتہ بودم کہ ہنگامے التقائے صفین بدعائے مارایاد آوری ـــــ گفتم دعا۔

اللھم اغفر اللمومنين والمونات وانصر من نصر دين محمد و اخذل من خذل دين محمد عليه الصلوة والسلام خود خواندہ بودیم۔ گفت ایں ہم کافی است ❶۔

---

❶ عربی کی اس دعا کا ترجمہ یہ ہے: اے اللہ! مومن مردوں اور مومن عورتوں کی مغفرت فرما‘ اور جو شخص محمد ﷺ کے دین کی مدد کرتا ہے‘ اس کی مدد فرما اور جو اس کے دین کی توہین کرتا ہے‘ اس کو ذلیل کر۔

Marfat.com

حق گوئی و بے باکی:

بدایونی حق گو اور بے باک عالم دین تھے۔ سچ کہنے میں حتی الامکان کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ اس ضمن میں دو واقعے قابل ذکر ہیں، جن سے ان کے علم و فضل کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مرزا سلیمان جو تیموری خاندان کا ایک اونچے درجے کا رکن تھا، فتح پور میں قیام پذیر ہوا۔ وہ نیک آدمی تھا اور اکبر اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ رات کو عبادت خانے بھی جاتا اور علما و مشائخ کی محفل میں بیٹھتا۔ عام طور سے اس پر وجد و حال کی کیفیت طاری رہتی تھی اور اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتا تھا۔ نماز باجماعت کا پابند تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ ایک روز میں نے نماز کی امامت کے بعد صرف دعا پڑھی، فاتحہ نہیں پڑھی۔ مرزا نے اعتراض کیا کہ ''آپ نے فاتحہ کیوں نہیں پڑھی''؟ میں نے جواب دیا: ''حضور ﷺ کے زمانۂ مبارک میں نماز کے بعد فاتحہ نہیں پڑھی جاتی تھی، بلکہ بعض روایات میں تو اس کو مکروہ بھی کہا گیا ہے [1]۔''

مرزا نے کہا:

مگر در ولایت علم و علما نہ بوند کہ می خوانند۔؟

(کیا ولایت (ایران) میں علم نہیں ہے یا علما نہیں ہیں کہ وہاں فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔؟'

میں نے کہا:

گفتم کہ مارا بکتاب کار است نہ بہ تقلید۔

(ہمارا تعلق تو اللہ کی کتاب سے ہے، تقلید سے نہیں ہے۔)

بادشاہ بھی اس وقت موجود تھا۔ اس نے کہا ''بحث نہ کرو، آئندہ پڑھ لیا کرو۔''

بدایونی کہتے ہیں: میں نے بادشاہ کا ارشاد مان لیا، لیکن فاتحہ پڑھنے کے مکروہ ہونے کی جو روایت مجھے معلوم تھی، وہ ان کے سامنے بیان ضرور کر دی [2]۔

سوال یہ ہے کہ ''فاتحہ'' کیا شی ہے؟ اس کے متعلق کچھ پتا نہیں چلا کہ یہ کیا ہے۔ کسی دور میں کچھ رسوم مروج ہو جاتی ہیں، اور پھر جب وہ ختم ہو جاتی ہیں تو ان کی صحیح تعریف کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بدایونی نماز کے بعد وہی ادعیہ پڑھنے کے قائل تھے جنھیں ادعیہ ماثورہ کہا جاتا ہے اور جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ مرزا سلیمان ان کے علاوہ کچھ اور بھی پڑھنے کے قائل تھے اور اسے فاتحہ سے تعبیر کرتے تھے، کیوں کہ علمائے روم میں اسے فاتحہ ہی کہا جاتا تھا۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اس ''فاتحہ'' کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

دوسرا واقعہ ایک برہمن کے قتل کے بعد اس دور میں پیش آیا جب بادشاہ اسلام اور احکام اسلام سے

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے: منتخب التواریخ۔ ج ۲، ص ۲۲۷ تا ۲۳۷

[2] منتخب التواریخ۔ ۲، ص ۲۱۶۔

Marfat.com

دور رہنے لگا تھا۔ اس سلسلے میں بادشاہ نے علما کی موجودگی میں بدایونی سے شاتم رسول (ﷺ) کے بارے میں استفسار کیا۔ انھوں نے نہایت جرات سے دربار میں مسئلے کی وضاحت کی ___ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قاضی، متھرا قاضی عبدالرحیم نے صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے پاس یہ استغاثہ بھیجا کہ ''یہاں کے مسلمان ایک مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے' لیکن یہاں کے ایک سرکش اور سرمایہ دار برہمن نے وہ تمام عمارتی سامان خود اٹھالیا اور مسجد کی جگہ پر اسی سامان سے ایک بت خانے کی تعمیر شروع کر دی۔ میں نے جب اس سے باز پرس کی تو اس نے لوگوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ پر سب وشتم کیا۔ اسلام کی اہانت کی اور مسلمانوں کے لیے سخت توہین آمیز الفاظ استعمال کیے۔''

ظاہر ہے' یہ معاملہ انتہائی سنگین نوعیت کا تھا اور ملک کے صدر الصدور کی حیثیت سے شیخ عبدالنبی کے لیے اس کی تحقیق کرنا ضروری تھا' چنانچہ شیخ نے اس برہمن کو طلب کیا' مگر وہ حاضر نہ ہوا۔ بالآخر معاملہ بادشاہ تک پہنچا تو اس نے دربار کی دو شخصیتوں ابوالفضل اور بیربر کو متھرا بھیجا۔ انھوں نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ قاضی عبدالرحیم کا بیان صحیح ہے۔ واپس آکر انھوں نے بادشاہ کو بتایا کہ متھرا کے اس برہمن نے مسجد کی جگہ بت خانہ بھی تعمیر کیا ہے' رسول اللہ ﷺ پر سب وشتم بھی کیا ہے' اسلام کے بارے میں نازیبا الفاظ بھی استعمال کیے ہیں اور مسلمانوں کی توہین بھی کی ہے۔ انھوں نے اس ہندو کو بھی بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اس برہمن کو تو جیل میں ڈال دیا گیا' مگر یہ سوال بڑی اہمیت اختیار کر گیا کہ اس جرم کی اس کو سزا کیا دی جائے؟ اس بارے میں علما کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا اور دوسرے نے تشہیر اور جرمانے وغیرہ پر زور دیا۔ بحث زیادہ طول پکڑ گئی تو شیخ عبدالنبی نے بادشاہ سے اس کے قتل کی اجازت طلب کی اور اس پر اصرار کیا۔ بادشاہ نے صاف لفظوں میں تو اجازت نہ دی البتہ یہ کہا کہ شرعی سزاؤں کا معاملہ آپ سے متعلق ہے' ہم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ شیخ نے مختلف مواقع پر بادشاہ سے کئی دفعہ اس کے قتل کے بارے میں کہا۔ مگر وہ برابر یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ شرعی سزاؤں کے سلسلے میں ہم دخل نہیں دینا چاہتے' اس کا تعلق آپ کی ذات اور علم سے ہے۔ برہمن اس جھگڑے میں مدتوں قید میں پڑا رہا۔ شاہی حرم میں ہندو عورتیں بھی تھیں' انھیں واقعہ کا پتا چلا تو وہ بادشاہ سے برہمن کی رہائی کے لیے سفارش کرنے لگیں۔ بادشاہ سب کچھ سنتا لیکن خاموش رہتا' کیونکہ اس کو شیخ کا بہت لحاظ تھا۔ نہ وہ صاف لفظوں میں اس کے قتل کی اجازت دیتا اور نہ رہائی کا حکم جاری کرتا تھا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد شیخ نے بادشاہ سے پھر برہمن کے قتل کے لیے کہا تو اس نے جواب دیا کہ ہم تو آپ سے کہہ چکے ہیں کہ جو مناسب سمجھتے ہیں کریں' ہم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بادشاہ کا یہ جواب سن کر شیخ نے برہمن کے قتل کا حکم دے دیا۔ مگر جب اسے قتل کر دیا گیا تو بادشاہ غضب ناک ہو گیا۔ ادھر شاہی حرم کی ہندو رانیوں اور دربار کے ہندو مصاحبوں نے ہنگامہ بپا کر دیا اور بادشاہ کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ آپ کی

Marfat.com

نرمی اور مہربانی سے یہ ملا اس قدر جری اور بے باک ہو گئے ہیں کہ آپ کے حکم اور منظوری کے بغیر ہی لوگوں کو قتل کرنے لگے ہیں ____ یہ وہ دور تھا جب بادشاہ مذہب سے دور ہوتا جا رہا تھا اور علما کے خلاف اس کی نفرت کے جذبات روز بروز تیز ہوتے جا رہے تھے۔ اس واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور معاملہ اس کی قوت برداشت سے باہر ہو گیا۔ چنانچہ ایک روز علما کی مجلس میں اس نے یہ مسئلہ پیش کیا اور دربار کے نئے نئے مفتیوں سے اس کے بارے میں رائے طلب کی۔ ہر ایک نے اپنی فکری اور ذہنی بساط کے مطابق اس اہم بحث میں حصہ لیا۔ کسی نے کہا، اس مقدمے میں نہ تو گواہوں پر کما حقہ جرح کی گئی، نہ ان کی پوری طرح تعدیل کی گئی، اور مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کیے بغیر قتل کا حکم جاری کر دیا گیا۔ کسی نے کہا، شیخ عبدالنبی اپنے آپ کو امام ابوحنیفہ کی اولاد میں شمار کرتے ہیں، حالانکہ امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے ماتحت کافر اگر رسول اللہ ﷺ کے خلاف بدزبانی کریں تو ان کی یہ حرکت نقض عہد اور ابرائے ذمہ کا باعث نہیں بن سکتی۔ یہ بات حنفی فقہ کی کتابوں میں وضاحت سے موجود ہے۔ حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ شیخ کو اپنے جدِ امجد کے مذہب سے اختلاف کی جرات کیوں کر ہوئی ____ غرض مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کرنا شروع کر دیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں، اس مجلس میں، جس میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، میں بھی موجود تھا اور بادشاہ سے کچھ دور تھا۔ دوران بحث میں اچانک دور سے بادشاہ کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ میری طرف متوجہ ہوا، میرا نام لے کر بلایا اور کہا:

فرمودند پیش بیا:

(آگے آؤ۔)

میں قریب گیا تو پوچھا۔

"کیا تم نے بھی یہ مسئلہ سنا ہے کہ اگر ایک شخص کے قتل پر ننانوے روایتیں ہوں اور رہائی کے لیے صرف ایک روایت ملتی ہو تو مفتی کو چاہیے کہ اس ایک روایت کو ترجیح دے ❶۔"

میں نے کہا: "ہاں ایسا ہی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

(ان الحدود والعقوبات تندرء بالشبهات۔" میں نے اس کا مطلب فارسی میں سمجھایا (کہ شبہات حدود اور سزاؤں میں کمی کر دیتے ہیں ❷۔")

میری یہ بات سن کر بادشاہ نے افسوس کے ساتھ پوچھا: "کیا شیخ عبدالنبی کو اس مسئلے کا علم نہ تھا۔ اس

❶ ایسی کوئی روایت ہمیں نہیں ملی، جس کے یہ الفاظ ہوں یا اس سے ملتے جلتے ہوں۔

❷ فقہ کی کتابوں میں عام طور پر یہی الفاظ ہیں، مگر کتب حدیث میں یہ الفاظ ہیں: ادرء وا الحدود بالشبهات۔ (شبہات پیدا ہو جائیں تو حدود میں ان سے کمی کرو۔)

Marfat.com

نے بیچارے برہمن کو قتل کر دیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟"

میں نے کہا: "شیخ خود بڑے عالم ہیں، وہ ضرور جانتے ہوں گے۔ اس روایت کے باوجود اگر انھوں نے حکم دیا ہے تو ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔"

بادشاہ نے سوال کیا: "کیا مصلحت ہو سکتی ہے"؟

میں نے جواب دیا: "فتنہ و فساد کی روک تھام اور عوام کی دلیری کا سد باب۔"

بدایونی لکھتے ہیں: میں نے اس سلسلے میں قاضی عیاض کی شفا کی ایک روایت جو میری نظر سے گزر چکی تھی، بیان کی۔ لیکن حاضرین مجلس میں سے بعض خبیث النفس لوگوں نے کہا:

قاضی عیاض مالکی است سخن او در دیار حنفی سند نیست

(قاضی عیاض مالکی مسلک کے حامل ہیں۔ ان کی بات حنفی ملک میں سند نہیں ہو سکتی۔)

ان کے اس اعتراض پر بادشاہ نے مجھ سے پوچھا: "تمھارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟" میں نے کہا: "وہ یقیناً مالکی ہیں، لیکن اگر کوئی محقق اور مفتی سیاسی مصلحت کی بنا پر ان کے فتوے پر عمل کرے تو شرعاً جائز ہے۔"

بدایونی کی یہ بات وہاں موضوع بحث بن گئی اور بحث خاصی طول پکڑ گئی۔ بادشاہ اس وقت بہت غصے میں تھا۔ بدایونی اس کے غصے کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

موئے سبلت شہنشاہی را دراں وقت مردم می دیدند کہ چوں موئے شیر برخاستہ بود، و از عقب سر مرا مانع از بحث می آمدند۔

(یعنی لوگوں نے دیکھا کہ شہنشاہ کی مونچھوں کے بال اس وقت شیر کے بالوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے ___ اور حاضرین مجلس پیچھے سے میرا دامن کھینچ کر مجھے بحث سے روک رہے تھے۔)

اتنے میں بادشاہ نے جھلا کر مجھ سے کہا:

فرمودند، ایں نامعقول است کہ می گوئی۔

(تم یہ نامعقول باتیں کر رہے ہو۔)

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

"میں فوراً تسلیم بجالایا اور واپس آ کر اپنی صف میں کھڑا ہو گیا۔ اس دن سے میں نے بادشاہ کی مجلس میں آگے بڑھنا اور کسی معاملے میں سبقت کرنا چھوڑ دیا اور بحث و مباحثہ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ بس کبھی کبھی کورنش بجالاتا اور اپنے کام میں مشغول ہو جاتا [1]۔

---

[1] منتخب التواریخ۔ ج ۳، ص ۷۹ تا ۸۳۔ شاتم رسول اللہ ﷺ کی سزا کے بارے میں مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو: فقہائے ہند۔ ج ۳، ص ۲۸۲ تا ۲۸۸۔

Marfat.com

متعہ کی بحث:

اکبر کے اکیسویں سال جلوس (۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء) کے بعض واقعات سے، جو خود بدایونی نے منتخب التواریخ میں تحریر کیے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کچھ مسائل میں اپنے علم و تحقیق کے زور سے بادشاہ کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ اس زمانے میں اکبر نے سب سے پہلے یہ مسئلہ پوچھا: ''کتنی آزاد عورتوں کو نکاح میں رکھنا جائز ہے''؟

علما نے جواب دیا: ''چار سے زائد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا منع ہے۔''

اکبر نے کہا: ''ہم تو جوانی میں اس کے پابند نہیں رہے، جتنی عورتوں کو چاہتے، نکاح میں لے لیتے تھے، خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام، اب اس کی تلافی کیسے ہوسکتی ہے؟''

اس سلسلے میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں بیان کیں۔

اکبر نے پھر کہا: ''ہم نے شیخ عبدالنبی سے سنا ہے کہ ایک مجتہد کے نزدیک تو نو عورتوں سے بھی نکاح کیا جاسکتا ہے۔''

علما نے کہا: ''ایک مجتہد ابن ابی لیلیٰ کا یہ رجحان ہے۔ بعض نے آیت مبارکہ:

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ [1] کے ظاہری مفہوم پر تو اٹھارہ عورتوں تک کو جائز ٹھہرا دیا ہے۔ لیکن یہ تمام روایات مرجوح ہیں، ان پر عمل کرنا جائز نہیں۔''

بادشاہ نے شیخ عبدالنبی سے دریافت کرایا تو انھوں نے جواب دیا: ''میں نے جو کچھ کہا تھا، اس سے کچھ اختلافات کا اظہار مقصود تھا، اس کے جواز کا میں نے فتویٰ نہیں دیا تھا۔''

شیخ عبدالنبی کا یہ جواب بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا، اور کہا: ''اس طرح تو شیخ نے ہم سے منافقت کی، اس وقت تو کچھ اور کہا تھا۔ اب کچھ اور کہہ رہا ہے۔''

بس اسی وقت سے شیخ عبدالنبی کی طرف سے اکبر کا دل پھر گیا۔ بادشاہ کے اصرار کو دیکھ کر علما نے اختلافی روایات جمع کر کے آخر یہ فتویٰ دیا کہ:

''متعہ کی صورت میں جتنی عورتیں چاہیں، نکاح میں رکھنا مباح ہے۔''

بدایونی اس سے آگے لکھتے ہیں:

''اور یہ امام مالک کے مسلک میں جائز ہے۔ شیعہ تو اس لڑکے کو جو متعہ میں پیدا ہوا ہو، دوسرے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ حالانکہ اہل سنت کا یہ طریق نہیں ہے۔ غرض اس موضوع پر بڑی بحثیں ہوئیں۔

[1] یہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: جو عورتیں تمہیں پسند آئیں، ان میں سے تم دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر سکتے ہو۔

Marfat.com

میر غیاث الدین نے (جو نقیب خاں کے لقب سے ملقب تھے) امام مالک کی کتاب موطا دکھائی اور بتایا کہ اس کی تو ایک حدیث میں صراحتاً متعہ کی ممانعت کی گئی ہے۔"

اس سے آگے متعہ کے جواز و عدم جواز کے بارے میں بدایونی کی پوری عبارت کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

"ایک رات انوپ تلاؤ کے حجرے میں بادشاہ کے پاس قاضی یعقوب، شیخ ابوالفضل، حاجی ابراہیم اور ایک دو اور عالم بیٹھے تھے۔ شیخ ابوالفضل نے علما کی مخالفت کرتے ہوئے وہ روایات جو اس کے والد ملا مبارک نے جواز متعہ کے بارے میں جمع کر کے دی تھیں، بیان کیں۔ بادشاہ نے مجھے (یعنی بدایونی کو) بھی بلایا اور پوچھا:

"تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو۔؟"

میں نے عرض کیا: "اس ضمن میں ان تمام مختلف روایات اور مسالک فقہی کا جھگڑا بس ایک بات پر ختم ہو جاتا ہے، اور وہ یہ کہ متعہ امام مالک اور علمائے شیعہ کے نزدیک بالاتفاق مباح ہے۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرام ہے۔ لیکن جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا باضابطہ حکم جاری کر دے تو اسی وقت امام ابوحنیفہ کے مذہب میں بھی بالاتفاق مباح ہو جاتا ہے۔ بس یہی ایک پتے کی بات ہے، اس کے علاوہ محض قیل وقال اور بحث و جدال ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ بادشاہ کو میری یہ بات بہت پسند آئی۔ مگر قاضی یعقوب نے مجھ سے بحث شروع کر دی اور بحث بہت طول پکڑ گئی۔ میں نے ان سے کہا جو مسئلہ مختلف فیہ ہو، وہ قاضی کے حکم کے بعد متفقہ ہو جاتا ہے۔ اپنے اس دعوے پر میں نے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مسئلے کو اور بعض دوسری مثالوں کو بطور دلیل پیش کیا۔ میں نے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا قصہ بھی بیان کیا کہ جب وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں بغداد گئے تو انھوں نے شافعی مذہب کے مطابق امام کی اقتدا میں سورہ فاتحہ پڑھی تھی۔ ان کے اس عمل کو علما نے ہدف طعن وتنقید ٹھہرایا تھا، مگر دہلی کے قاضیوں نے نہ صرف اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے موقف کی تائید کی، بلکہ اس کے مستحسن ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ جب میں نے یہ باتیں پوری وضاحت سے بیان کیں تو قاضی یعقوب کو اس کا قائل ہونا پڑا، اور بالآخر عاجز آ کر بادشاہ سے کہا:

"میں کیا کہوں، متعہ کا مباح ہونا مبارک ہو۔"

بادشاہ نے فرمایا: "اس مسئلے میں ہم قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی بناتے ہیں، اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں۔"

اسی وقت قاضی حسین کو قاضی بنایا گیا اور اس نے اپنے مذہب کے مطابق متعہ کے جواز کا حکم دے دیا۔"

اس کے ساتھ ہی بدایونی لکھتے ہیں:

"اب تمام پرانے اور بوڑھے علما، صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی، مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری اور قاضی یعقوب تک کے لیے یہ ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی، اور اسی روز سے ان کا زوال شروع ہو گیا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد اکبر نے مولانا جلال الدین ملتانی کو جو بہت بڑے عالم تھے اور جن کی مدد معاش

Marfat.com

روک دی گئی تھی، آگرہ سے بلا کر تمام ممالک محروسہ کا قاضی مقرر کر دیا، اور قاضی یعقوب کو بنگال کے منصب قضات پر متعین کر دیا۔ اسی دن اختلافات کا دروازہ کھل گیا، یہاں تک کہ دین میں اجتہاد کی نوبت آ گئی ❶۔

مسئلہ متعہ پر بدایونی نے اپنی تصنیف نجات الرشید میں بھی بحث کی ہے ❷۔ اور بحث ختم کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

ماحصل ہمہ مقدمات مذکورہ ایں است کہ متعہ نزد حنفی و شافعی مطلقاً حرام و نزد مالکی و شیعی بہ اتفاق حلال است۔ با آنکہ در کتاب موطا کہ تصنیف امام مالک رضی اللہ عنہ است، خلاف او وارد است۔ امام اگر چہ قاضی بہر مذہب کہ باشد بر مذہب امام مالک حکم بہ جواز متعہ کند، نزد ہمہ بہ اتفاق جائز باشد۔ و بے ایں صورت حق آں است کہ قائل بہ حرمت آں باید بود کہ موجب دلیری عوام و خلل در نسل می شود ❸۔

(ان تمام مقدمات مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ متعہ حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک مطلقاً حرام ہے اور مالکیہ اور شیعہ کے نزدیک بہ اتفاق حلال ہے، اگر چہ امام مالک کی تصنیف موطا میں اس (متعہ) کے خلاف لکھا گیا ہے۔ لیکن اگر قاضی، بے شک وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، امام مالک کے مذہب کے مطابق جوازِ متعہ کا فیصلہ دے دے تو سب کے نزدیک بہ اتفاق جائز ہو جائے گا۔ اس صورت پر عمل کیے بغیر صحیح بات یہ ہے کہ یہ حرام ہی رہے گا، کیوں کہ اس سے عوام میں دلیری پیدا ہوتی ہے اور نسل و نسب میں خلل پیدا ہوتا ہے۔)

اس ضمن میں بدایونی کی بالکل آخری سطریں یہ ہیں:

وایں بحث بہ تقریب استفسار خلیفہ زمان از علمائے عصر بہ تفصیل در رسالہ علاحدہ نوشتہ است۔ اگر استیعاب خواہند در آں جا بنگرند ❹۔

(یہ بحث جو خلیفہ وقت (اکبر) کے، اس دور کے علما سے استفسار کی صورت میں سامنے آئی، ایک علیحدہ رسالے میں تحریر کی گئی ہے۔ اگر تفصیل میں جانا مقصود ہو تو وہاں دیکھ لی جائے ❺۔)

دربار اکبری میں متعہ کے جواز و عدم جواز کی بحث کے سلسلے میں ہم نے بدایونی کی منتخب التواریخ کی

---

❶ منتخب التواریخ۔ ج ۲، ص ۲۰۷ تا ۲۱۱۔

❷ ملاحظہ ہو: نجات الرشید از ص ۴۳۴ تا ۴۳۸۔

❸ ملاحظہ ہو: نجات الرشید از ص ۴۳۸۔

❹ نجات الرشید۔ ص ۴۳۸۔

❺ بدایونی کا کوئی ایسا رسالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا، جس میں یہ بحث مفصل مرقوم ہو۔ منتخب التواریخ میں لکھا گیا ہے کہ نجات الرشید میں بحث کا خلاصہ موجود ہے۔ نجات الرشید میں کسی اور رسالے کا حوالہ دیا گیا ہے، جس کا نام مذکور نہیں۔ شاید اس رسالے سے منتخب التواریخ کی بحث مقصود ہو، کیونکہ یہ کتاب بادشاہ سے چھپ چھپا کر لکھی گئی تھی۔ نجات الرشید انہوں نے بادشاہ کو پیش کر دی تھی۔

Marfat.com

پوری عبارت درج کر دی ہے اور نجات الرشید کا ماحصل پیش کر دیا ہے۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ بادشاہ کو ''اجتہاد'' کی راہ پر لگانے میں بدایونی کے غلط استدلال کا بھی حصہ ہے۔ انھوں نے جس اسلوب بیان اور علم کلام سے جوازِ متعہ کا ثبوت پیش کیا' اور اپنی قوتِ بیانیہ سے متعہ کے عدم جواز کے حامی علما کو خاموش کرایا' اس سے یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس ضمن میں ملا مبارک' ابوالفضل اور بدایونی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ بدایونی نے اس کے جواز میں جو دلائل دیے ہیں' وہ سراسر غلط ہونے کے باوجود زیادہ مؤثر اور زوردار ہیں۔ بدایونی کا یہ کہنا بھی قطعی غلط ہے کہ امام مالک جوازِ متعہ کے قائل ہیں۔ پھر ان کی یہ بات بھی ہرگز قرین صحت نہیں کہ کسی ایک فقہی مسلک کے حامل قاضی کا حکم یا فیصلہ' اس کے مخالف کے لیے قابل تسلیم اور لائق عمل قرار پا جاتا ہے۔ فیصلہ وہی صحیح ہوگا جو کتاب وسنت کے مطابق ہوگا' اس کے علاوہ ہر فیصلہ غلط ہوگا' خواہ اسے کسی مسلک کا قاضی جاری کرے۔ علمی اور اصولی اعتبار سے یہ بات ناقابل اعتنا ہے کہ متنازعہ مسئلے میں کسی ایک مسلک کے قاضی کا فیصلہ' اس مسئلے کو جواز میں بدل دیتا ہے اور پھر اس پر سب کے لیے عمل کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

تعجب ہے' ایک طرف تو بدایونی لکھتے ہیں کہ امام مالک نے اپنی تصنیف مؤطا میں متعہ کی مخالفت کی ہے۔ دوسری طرف فرماتے ہیں کہ امام مالک کے پیروکار متعہ کے جواز کے قائل ہیں۔ بدایونی کا یہ تمام تر اندازِ استدلال غلط ہے۔

موطا حدیث کی شہرہ آفاق کتاب ہے۔ بعض علما کے نزدیک اسلوب وترتیب کے اعتبار سے یہ اس درجہ اونچے مرتبے کی کتاب ہے کہ صحاح ستہ میں داخل ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جو ائمہ اربعہ میں سے ایک مشہور امام ہیں اور عمل اہل مدینہ کے قائل ہیں' اس کتاب کے مرتب ومؤلف ہیں۔ انھوں نے کتاب النکاح کے ذیل میں ایک باب باندھا ہے' جامع مالا یجوز من النکاح۔ اس میں مختلف عنوانات کے تحت ان کا ذکر کیا ہے' جن سے نکاح جائز نہیں ہے۔ اسی ضمن میں نکاح المتعۃ ایک باب قائم کیا ہے۔ اس میں وہ سند کے ساتھ ایک حدیث درج کرتے ہیں' جس کے الفاظ یہ ہیں:

> عن علی ابن ابی طالب ان رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی عن متعة النساء یوم خیبر و عن اکل لحوم الحمرا الانسیته[1]۔
>
> (حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر کے موقعے پر عورتوں سے متعہ کرنے اور گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔)

اس کے ساتھ ہی امام مالک نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا وہ قول بھی نقل کیا ہے' جس میں انھوں نے متعہ کرنے والے کو قابل رجم قرار دیا ہے[2]۔

---

1. مؤطا امام مالک۔ص ۱۹۶
2. مؤطا' امام مالک۔ص ۱۹۶۔

Marfat.com

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی محدث رحمۃ اللہ علیہ' اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

اتفق العلماء علی تحریم المتعة وهو كالاجماع بين المسلمين وكانت مباحا فی اول الاسلام ثم نسخ❶۔

(علما کا متعہ کے حرام ہونے پر اتفاق ہے' اور یوں سمجھیے کہ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ ابتدائے اسلام میں یہ مباح تھا' بعد کو منسوخ کر دیا گیا۔)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام مالک کے نزدیک متعہ اسی طرح حرام ہے' جس طرح دوسرے مسالک اہل سنت کے نزدیک حرام ہے۔ جب مسلمانوں کا اس کی تحریم پر اجماع ہے تو مالکیہ کو اس سے مستثنیٰ کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے۔؟

صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

ان عليا رضی الله عنه قال لابن عباس ان النبی ﷺ نهى عن المتعة و عن لحوم الحمر الاهلية زمن خيبر❷۔

(حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ خیبر کے زمانے میں متعہ سے اور گھریلو گدھے کے گوشت سے منع فرما دیا۔)

حرمت متعہ کے بارے میں صحیح بخاری کے الفاظ بالکل صاف ہیں۔ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں خاصی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس ضمن میں قاضی عیاض کے' جو مالکی مسلک کے معروف عالم ہیں' یہ الفاظ بھی درج کیے ہیں:

وقال عياض ثم وقع الاجماع من جميع العلماء على تحريمها الا الروافض❸۔

(قاضی عیاض کہتے ہیں کہ پھر شیعہ کے سوا متعہ کی حرمت پر علما کا اجماع ہو گیا۔)

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نکاحِ متعہ کے جواز کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

واما ابن عباس فروی عنه انه اباحها وروی عنه انه رجع عن ذلك❹۔

---

❶ مسوی شرح مؤطا۔ ج ۲' ص ۱۹۶۔

❷ صحیح بخاری' کتاب النکاح: باب نہی النبی ﷺ عن نکاح المتعة اخیراً۔

❸ فتح الباری۔ ج ۹' ص ۱۳۸' طبع مصر۔

❹ ایضاً۔

Marfat.com

(رہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تو ان سے متعہ کی اباحت مروی ہے، اور یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔)

یعنی بعد کو متعہ کے عدم جواز کے قائل ہو گئے تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی، قرطبی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

وقال القرطبی الروایات کلھا متفقة علی ان زمن اباحة المتعة لم یطل و انه حرم، ثم جمع السلف و الخلف علی تحریمھا الا من لایلتفت الیه من الروافض[1]۔

(قرطبی کہتے ہیں، تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ اباحت متعہ کا زمانہ طویل نہ تھا۔ اسے حرام ٹھہرا دیا گیا تھا، پھر سلف و خلف کا اس کی تحریم پر اجماع ہو گیا تھا۔ مگر شیعہ نے حرمت متعہ کی طرف التفات نہیں کیا۔)

سلف و خلف کے اس عظیم و لاتعداد گروہِ علما میں ظاہر ہے کہ امام مالک اور ان کے مسلک کو ماننے والے تمام مالکیہ شامل ہیں ــــ اس ضمن میں حافظ ابن حجر مزید لکھتے ہیں کہ مالکیہ تو نکاح مؤقت کے سخت مخالف ہیں۔ وہ تو اس نکاح ہی کو باطل قرار دیتے ہیں، جو چند گھنٹوں یا چند دنوں کے لیے کیا جائے۔ ان کے الفاظ درج ذیل ہیں:

وقال ابن دقیق العید ماحکاه بعض الحنفیة عن مالك من الجواز، خطاء۔ فقد بالغ الما الکیة فی منع النکاح المئوقت، حتی ابطلوا توقیت الحل بسببه ۔ فقالوا لوعلق علی وقت لا بد من مجیئه، وقع الطلاق الأن۔ لانه توقیت للحل، فیکون فی نکاح المتعة ۔ قال عیاض واجمعوا علی ان شرط البطلان التصریح بالشرط[2]۔

(ابن دقیق العید کہتے ہیں کہ بعض حنفیہ نے امام مالک سے متعہ کا جو جواز بیان کیا ہے، وہ غلط ہے۔ مالکیہ تو نکاح مؤقت کی ممانعت میں بڑی شدت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تو اس کا مؤقت ہونا ہی اس کی حلت کو باطل ٹھہرا دیتا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر طلاق کو خاص وقت تک کے لیے معلق کر دیا جائے، جس کا آنا ضروری ہے۔ (یعنی عورت کو کہا جائے کہ کل شام کو تمھیں طلاق) تو ابھی طلاق واقع ہو جائے گی۔ کیوں کہ

---

1. فتح الباری۔ ج ۹، ص ۱۳۸، طبع مصر۔
2. ایضاً۔

Marfat.com

نکاح کو جو حلال ہے' مؤقت قرار دینا' نکاح متعہ کے حکم میں آتا ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں' اس بات پر علما کا اجماع ہے کہ نکاح کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کرنا ہی اس کے بطلان کی دلیل ہے۔)

بہر حال اہل سنت کے کسی امام کے نزدیک متعہ جائز نہیں ہے اور ان سب کا اس کی تحریم پر اجماع ہے۔ بدایونی کا یہ نقطہ نظر بھی غلط ہے کہ جہاں کوئی عالم جائے' وہیں کے علما کے فقہی مسلک کو اختیار کرے۔

شاہ پسندوں سے بُعد:

جس زمانے (۹۸۱ھ/۷۳-۱۵۷۳ء) میں بدایونی دربار اکبری میں پہنچے' اسی زمانے میں ملا مبارک کا بیٹا ابوالفضل بارگاہِ خسروی میں باریاب ہوا۔ اس سے پہلے شاعر کی حیثیت سے فیضی بھی دربار شاہی میں موجود تھا۔ اور بھی بہت سے علما کی بڑی تعداد' دربار سے منسلک تھی۔ ابوالفضل بڑی تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ باپ کی علمی مدد اور خود اپنے زور ذہانت سے دربار میں نمایاں نظر آنے لگا۔ اب بادشاہ کا دل چونکہ دینی اثرات اور مذہبی رجحانات سے روز بروز خالی ہو رہا تھا' اس لیے ابوالفضل نے علما کی تذلیل اور اسلامی تعلیمات کی توہین کا برملا سلسلہ شروع کر دیا' جس میں خود بادشاہ اور اس کے ہندو مصاحب بھی دلچسپی لینے لگے۔ لیکن بدایونی خالص مذہبی جذبات کے حامل تھے اور دینی تعلیمات کا اثر ان پر پوری طرح حاوی تھا' اس لیے وہ نہ صرف ابوالفضل وغیرہ سے متاثر نہیں ہوئے' بلکہ ان کی کھل کر مخالفت کی۔ انھیں ذہنی طور پر یہ شدید احساس تھا کہ ابوالفضل جیسے لوگ تو بادشاہ کے منظور نظر ہیں اور برابر ترقی کی منزل کی طرف گامزن ہیں' لیکن وہ (بدایونی) جو اتنے بڑے عالم' علوم مروجہ کے ماہر اور بادشاہ کے امام نماز ہیں' دربار میں کم حیثیت کے مالک ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟

یہی وجہ ہے کہ بدایونی کا قلم بہت تیز ہو گیا ہے اور دربار کے ہر امیر اور عالم پر اپنی تحریر میں طنز و استہزا کے تیر چلاتے دکھائی دیتے ہیں۔ چھوٹے کی قدر اور بڑے کی ناقدری سے انھیں شدید تکلیف ہوتی ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ نااہل کو آگے بڑھا دیا گیا ہے اور اہل کو پیچھے دھکیل دیا گیا ہے تو وہ سراپا احتجاج ہو جاتے ہیں اور نہایت دکھ کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ کئی سال کسی نہ کسی طریقے سے اکبر کے دربار سے منسلک رہے لیکن نہ کبھی بادشاہ کی زیادہ خوشامد کی' نہ ہر غلط بات میں اس کی تائید کی اور نہ ان امرا و علما سے ذہنی طور پر متفق ہو سکے' جنھوں نے ہر معاملے میں بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانے کو اپنے لیے فرض قرار دے لیا تھا۔

بدایونی اپنی ملازمت کے ابتدائی دور ہی میں بادشاہ اور اس کے امرا سے کچھ کبیدہ خاطر ہو گئے تھے اور ان سے دور دور رہنے لگے تھے' کیونکہ وہ اپنی نیکی اور افتادِ طبع کی بنا پر اس ماحول میں جو بعض لوگوں نے پیدا کر دیا تھا' اپنے آپ کو وابستہ نہیں کر سکے تھے۔ وہ کئی مرتبہ طویل رخصت لے کر گھر گئے اور پھر آ گئے۔ وہ عالم دین'

Marfat.com

ذہین وطباع اور بہترین مصنف ومترجم تھے' اس لیے بادشاہ کو ان کی ضرورت رہتی تھی۔ بادشاہ کو خوب معلوم تھا کہ وہ دربار کی ملازمت سے ناخوش ہیں اور اس کے پاس رہنے سے انھیں ذہنی تکلیف ہوتی ہے لیکن ان کی قابلیت کی وجہ سے وہ ان سے تعلق قائم رکھنے پر مجبور تھا۔ اس نے قاضی علی کی کوشش سے ہزار بیگھہ زمین بھی انھیں مدد معاش کے لیے دے دی تھی' مگر چونکہ وہ مستقل طور سے ملازمت نہیں کرتے تھے' لہٰذا اس میں سے بھی کچھ زمین واپس لے لی گئی۔ وہ منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں:

''میں عرصے سے ملازمت سے علیحدہ ہو کر گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ کے قیام اجمیر کے زمانے میں' قاضی علی نے مجھے بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور میری مدد معاش کے لیے ہزار بیگھہ اراضی کا وعدہ یاد دلایا۔ بادشاہ نے کہا: ''مجھے یاد ہے کہ اس کے متعلق جاری کردہ فرمان میں ملازمت پر قائم رہنے کی شرط تھی۔'' قاضی علی نے جواب میں کہا: ''جی ہاں! بشرط خدمت ان کو زمین دی گئی تھی۔'' بادشاہ نے کہا: ''اس سے پوچھو کیا کوئی ضعف وعارضہ لاحق تھا کہ اس نے ملازمت ترک کر دی۔'' قاضی خاں بدخشی نے فوراً جواب دیا: ''قسمت کا ضعف تھا۔'' اس موقعے پر تمام مقربین دربار نے سابقہ امامت کا حق سمجھ کر ___ سابقہ اس لیے کہ ان دنوں نماز باجماعت بالکل ہی ختم کر دی گئی تھی ___ (دریں ایام باجماعت و اذان کہ ہر پنج وقت برائے خاطر جماعت در دربار می گفتند برطرف شد ❶۔) میرے لیے سفارش کی۔ بادشاہ نے جواب دیا: ''ہم کسی کو ملازمت میں رہنے پر مجبور نہیں کرتے۔ اگر یہ ملازمت نہیں کرنا چاہتا تو اس کی زمین نصف ہو جائے گی۔'' میں نے فوراً ہی یہ بات قبول کر لی جو بادشاہ کو بڑی ناگوار گزری اور میری طرف سے رخ پھیر لیا۔ قاضی علی نے دوبارہ عرض کیا کہ ''آخر اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟'' اور اس پر بڑا اصرار کیا تو فرمایا: ''شیخ عبدالنبی سے پوچھا جائے کہ یہ ملازمت کی شرط کے بغیر کتنی اراضی کا مستحق ہو سکتا ہے۔'' شیخ سے پوچھا گیا تو انھوں نے مولانا اللہ داد امروہی مرحوم کے ذریعے کہلوایا کہ ''چونکہ عبدالقادر عیال دار آدمی ہے اور اس کے ذمے کافی اخراجات ہیں' لہٰذا میں حسب الحکم اس کے لیے آٹھ سو یا سات سو بیگھہ اراضی تجویز کرتا ہوں۔'' ___ مصاحبوں اور مقربوں کا خیال تھا کہ اب کوئی اور عرض داشت (جو ملازمت ترک کر دینے کے متعلق ہو) مناسب نہیں ہے' وہ سب مجھے ملازمت اختیار کر لینے پر مجبور کرنے لگے۔ مجبوراً میں دوبارہ اس ملازمت کے چکر میں پھنس گیا' جس سے بمشکل نجات حاصل ہوئی تھی۔ یہ سب سزا اس لیے بھگتنا پڑی کہ میں نے قبل ازیں بادشاہ کے بار بار حکم دینے کے باوجود داغ کی تجویز قبول نہیں کی تھی۔

بدایونی اگرچہ دربار شاہی سے کبیدہ خاطر ہو چکے تھے اور وہاں رہنا ان کے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا' بادشاہ اور بدایونی کے افکار وخیالات میں بڑا بعد پیدا ہو چکا تھا۔ تاہم ان کی قابلیت کی وجہ سے بادشاہ کو پھر ان

❶ منتخب التواریخ۔ ج ۲' ص ۳۱۴۔

Marfat.com

کی ضرورت پڑتی تھی اور وہ آ جاتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ بڑے غور و تامل کے بعد پانچ ماہ کی رخصت منظور ہوئی۔ خواجہ نظام الدین ہروی نے (جو بدایونی کے بہت مشفق اور قدر دان دوست تھے) بادشاہ سے عرض کی کہ ان کی والدہ وفات پا گئی ہیں، اہل خانہ کی تسکین و تسلی کے لیے وطن جانا ضروری ہے۔ للہٰذا رخصت عطا کی جائے۔ بادشاہ نے جانے کی اجازت تو دے دی مگر بہت ناخوش گوار انداز سے دی۔ سلام کے لیے صدر جہاں نے دو دفعہ بدایونی سے کہا۔ ''سجدہ بکن'' (بادشاہ کو سجدہ کرو)۔ یہ ان سے ہو نہ سکا تو بادشاہ نے رنجیدگی کے عالم میں کہا: ''جانے دو۔''

بدایونی حج کی سعادت نہ حاصل کر سکے:

۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء کے حالات میں بدایونی لکھتے ہیں کہ اس سال کے ماہِ رجب میں، جو خواجہ معین الدین اجمیری کے عرس کا زمانہ ہے، بادشاہ نے اجمیر کا عزم کیا۔ جب سواری ٹوڈا کے مقام پر پہنچی تو شاہ ابوتراب، جو شیراز کے اکابر سادات میں سے تھے اور سلاطینِ گجرات کے شیخ و مرشد تھے، ملاقات کے لیے آئے۔ میرٹھ کے قریب پہنچے تو بادشاہ نے شاہ ابوتراب کو حجاج کا امیر مقرر کیا اور حکم دیا کہ حاجیوں کا ایک قافلہ ترتیب دیا جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کا خواہاں ہوں، اس قافلے میں شامل ہو سکتا ہے۔ گجرات کے اعتماد خاں کو کثیر رقم دے کر شاہ ابوتراب کے ساتھ جانے کا حکم جاری کیا۔ بدایونی لکھتے ہیں، میرے دل میں شوق حج نے کروٹ لی اور شیخ عبدالنبی کی خدمت میں گیا، ان سے عرض کیا کہ میرے لیے بھی بادشاہ سے حج پر جانے کی اجازت لے دیں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

کیا آپ کی والدہ زندہ ہیں۔''؟

میں نے کہا: ''ہاں زندہ ہیں!''

کہا: ''آپ کا کوئی بھائی یا ایسا رشتے دار ہے جو آپ کے بعد ان کی خدمت کرتا رہے؟''

عرض کیا: ''نہیں، صرف میں ہی ان کا ذریعہ خدمت ہوں!''

فرمایا: ''اگر آپ والدہ سے اجازت لے لیں تو بہتر ہوگا۔''

غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور اب میں اس محرومی پر حسرت و افسوس کرتا رہتا ہوں۔

بیٹے کا نام بادشاہ نے رکھا:

ذہنی بُعد اور اختلاف کے باوجود بدایونی کے دل میں بادشاہ کا احترام موجود تھا۔ گھریلو معاملات میں بھی وہ اس سے مشورے کو ضروری قرار دیتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام بادشاہ سے پوچھ کر رکھا۔ لکھتے ہیں:

Marfat.com

میں لشکر کے ساتھ ریواڑی کے ضلع میں تھا کہ وطن سے بیٹے کی ولادت کی اطلاع موصول ہوئی۔ نہایت خوشی ہوئی اور جذبات مسرت سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا‘ اشرفی نذر کی اور نام کے لیے عرض کیا۔ ’’فرمایا‘‘ ’’تمھارے باپ اور دادا کا کیا نام ہے؟‘‘ عرض کی۔ ’’ملوک شاہ بن حامد شاہ۔‘‘ ان دنوں ’’یا ھادی‘‘ کا وظیفہ بادشاہ کے ورد زباں تھا۔ فرمایا۔ ’’اس کا نام عبدالہادی رکھو۔‘‘ حافظ محمد ابن خطیب بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے ہر چند کہا کہ نام رکھنے کے بھروسے پر نہ رہو‘ حافظوں کو بلاؤ اور لڑکے کی درازیٔ عمر کے لیے قرآن پڑھوا کر دعا کراؤ۔ میں نے ان کی بات کی پروا نہ کی۔ آخر چھ مہینے کے بعد لڑکا فوت ہو گیا۔ خدا میرے لیے اس کے ثواب کو ذخیرہ آخرت بنائے اور اسے قیامت کے دن میرا شفیع کرے [1]۔

دوستوں کی جدائی کا غم:

اس کے بعد وہ دور آیا کہ بدایونی شاہی مجالس سے اس قدر متنفر ہو گئے کہ بہت دور دور رہنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کوئی ضروریات انھیں دربار میں کھینچ لاتی تھیں اور کبھی ان کی علمی قابلیت کی وجہ سے خود بادشاہ ان کو بلانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں جن درباری علما کے وہ شدید مخالف تھے‘ اور جن سے ان کی بحثوں کا سلسلہ دربار میں اور دربار سے باہر جاری رہتا تھا‘ ان میں ابوالفضل اور فیضی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ دونوں بھائی بدایونی کے علم و فضل کے بہت مداح تھے‘ اور بادشاد بدایونی سے ناراض ہو جاتا تو یہ ان کی بادشاہ سے سفارش بھی کرتے تھے۔ اس کا ذکر خود بدایونی اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں کرتے ہیں:

درباری علما میں ملا نظام الدین ہروی‘ بدایونی کے مخلص و مشفق دوست تھے۔ اور ان کے بے حد بہی خواہ۔ بدایونی نے ان کی شفقتوں اور بادشاہ سے سفارشوں کا کئی مقام پر تذکرہ کیا ہے۔

درباری علما ایک بڑی جماعت پر مشتمل تھے اور مختلف مسائل سے متعلق ان کی مخالفانہ و موافقانہ بحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بدایونی کے آخری زمانے میں ان میں سے زیادہ تر علما وفات پا چکے تھے۔ برایونی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

’’اس تاریخ سے اب تک کہ دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے‘ مباحثہ و مجادلہ کرنے والوں کی اس جماعت میں جو سو سے زیادہ افراد پر مشتمل تھی‘ محقق و مقلد کوئی بھی تو نظر نہیں آتا ہے۔ سب کے چہروں پر موت اپنا سیاہ نقاب ڈال چکی ہے۔ اللہ کا یہ فرمان بلاشبہ صحیح ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ وہ محفلیں اجڑ گئیں ہیں‘ اور ایک میں سوگوار رہ گیا ہوں۔ جب ان کی یاد آتی ہے تو میری غم زدہ آنکھیں حیرت و افسوس کے ساتھ خون کے

---

[1] منتخب التواریخ۔ ج ۲‘ ص ۲۵۲۔

Marfat.com

آنسو روتی ہیں، اور دل نالہ وفریاد کرنے لگتا ہے۔ کاش! وہ لوگ کچھ دن اور زندہ رہتے کہ بہرنوع اس قحط الرجال میں ان کا وجود بڑا غنیمت تھا۔ اب کس سے بات کریں۔ مبادلۂ خیالات کا لطف تو ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ اب مجھ ناکارہ وافتادہ کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ان کی جدائی کے داغ سے جلتا اور دل ہی دل میں آہ وفریاد کرتا رہوں:

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند ـــ دریائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنگ شراب در مجلس عمر ـــ یکہ لحظہ زما پیشترک مست شدند

علمی و تصنیفی خدمات:

بدایونی کی علمی و تصنیفی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ انھوں نے دربار اکبری میں آنے سے پہلے بھی تصنیفی خدمات انجام دیں، دربار میں آنے کے بعد اکبر کے حکم سے بھی ترجمہ وتالیف میں نام پیدا کیا اور پھر زندگی کے آخری وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اکبر سے انسلاک کے بعد انھوں نے بادشاہ کے حکم سے سب سے پہلے سنگھاسن بتیسی کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ۹۸۲ھ کے ماہ صفر کی آخری تاریخ کو اکبر نے فتح بنگالہ کے ارادے سے کوچ کیا۔ اس سفر میں بدایونی بھی اکبر کے ساتھ تھے۔ واپسی پر ۶ جمادی الاولیٰ ۹۸۲ھ/ ۲۱ راگست ۱۵۷۴ء کو شاہی لشکر جون پور پہنچا اور ایک مہینا تین دن وہاں مقیم رہا۔ ۹ جمادی الاخری کو دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ اس سفر میں بادشاہ کے سامنے بدایونی کی علمی قابلیت کے مزید جوہر کھلے، اور ان کی وسعت معلومات کا پتا چلا تو وہ اور بھی متاثر ہوا۔ جمادی الاخریٰ ہی کی کسی تاریخ کو جب قافلۂ شاہی کا نزول شیر گڑھ کے قصبے میں ہوا تو بادشاہ نے بدایونی کو شرف مخاطبت سے نوازا اور حکم دیا کہ سنگھاسن بتیسی کا فارسی میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ کتاب بتیس کہانیوں پر مشتمل ہے، جو مالوہ کے راجہ بکرماجیت کے حالات سے متعلق ہیں۔ اصل کتاب سنسکرت زبان میں ہے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کر کے اسے طوطی نامہ کے اسلوب پر نظم ونثر میں ترتیب دیا جائے اور ایک ورق کا ترجمہ نمونے کے طور پر آج ہی پیش کیا جائے۔ ایک صاحب علم برہمن کو بھی مدد کے لیے مقرر کیا۔ چنانچہ بدایونی نے اسی دن پہلی کہانی کا ایک ورق ترجمہ کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ نے بہت تعریف کی۔ کتاب کا ترجمہ مکمل ہو گیا تو اس کا نام ''نامہ خردافزا'' رکھا۔ یہ اس کا تاریخی نام ہے۔ کیونکہ کتاب میں اس کا تصنیفی اور تاریخی پس منظر بھی شامل ہے۔ بادشاہ نے کتاب پسند کی اور کتب خانہ شاہی میں داخل ہوئی۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے جو بدایونی نے منتخب التواریخ میں چھتیسویں سال جلوس (۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء) کے واقعات کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ شاہی کتب خانے سے ''نامہ خردافزا'' کا نسخہ گم ہو گیا تھا' سلیمہ سلطان نے اس سلسلے میں بدایونی کو کئی دفعہ یاد فرمایا اور بدایوں میں ان کو بلانے کے لیے قاصد بھیجے۔ مگر وہ کچھ ایسی

Marfat.com

الجھنوں میں گرفتار تھے کہ نہ جاسکے۔ آخر بادشاہ نے حکم دیا کہ بدایونی کی مدد معاش موقوف کر دی جائے اور اسے زبردستی بدایوں سے دربار میں لایا جائے۔ لیکن اس موقعے پر مرزا نظام الدین احمد نے دوستی کا حق ادا کیا۔ ابوالفضل نے بادشاہ سے سفارش کی اور ہر بار یہی کہا کہ کوئی مشکل ضرور درپیش ہوگی، جس کی وجہ سے وہ نہیں آسکے اور بدایوں میں بیٹھے ہیں:

۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء کو دکن کا ایک پڑھا لکھا برہمن شیخ بھاون دربار میں پہنچا اور اپنی مرضی سے اسلام قبول کر کے بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ نے بدایونی کو حکم دیا کہ ''اتھربن بید'' کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ ہندوؤں کا چوتھا وید ہے اور اس کے بعض احکام اسلام سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ترجمے کے سلسلے میں ایک پنڈت کی خدمات بھی بدایونی کے سپرد کیں۔ کام شروع کیا گیا تو کتاب کی بعض نہایت پیچیدہ عبارتیں سامنے آئیں، جنھیں بدایونی بھی سمجھنے سے قاصر تھے اور ان کی صحیح تعبیر وہ پنڈت بھی نہیں کر پاتا تھا۔ جب یہ مشکل بادشاہ کے سامنے پیش کی گئی تو اس نے یہ کام پہلے تو فیضی کے سپرد کیا اور بعد کو حاجی ابراہیم سرہندی کو اس پر مامور فرمایا۔ لیکن وہ بھی اس کا بہتر ترجمہ نہ کر سکے۔

اس چوتھے وید (اتھربن بید) کے احکام میں ایک حکم یہ ہے کہ جب تک ایسی عبارت، جس میں کئی لام آتے ہیں، مثلاً لاالہ الا اللہ نہ پڑھی جائے، نجات نہیں ہوگی۔ ایک حکم میں چند شرائط کے ساتھ گائے کا گوشت مباح قرار دیا گیا ہے۔ ایک جگہ میت کو دفن کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جلانے سے روکا گیا ہے۔

اس وید کے یہ احکام بحث میں بیان کر کے شیخ بھاون نے ہندوستان کے بہت سے برہمنوں کو لاجواب کر دیا تھا اور اسی سے متاثر ہو کر اس نے اسلام قبول کیا تھا۔

۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء کے واقعات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

بادشاہ ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء میں پنجاب کا دورہ کر کے دہلی پہنچا۔ وہاں سے اجمیر گیا اور عرس میں شامل ہوا۔ دوسرے دن آگرہ کا قصد کیا۔ صبح کے وقت ٹوڈا میں منزل ہوئی، تو میں بساور سے استقبال کے لیے پہنچا ہوا تھا۔ حاضر ہو کر اپنی تصنیف ''کتاب الاحادیث'' پیش خدمت کی۔ یہ کتاب فضیلت جہاد اور تیراندازی کے اجر و ثواب کے موضوع سے متعلق ہے۔ کتاب کتب خانہ شاہی میں داخل ہوئی۔

۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کو بادشاہ نے کہا کہ ہجرتِ رسول اکرم ﷺ پر ہزار سال پورے ہو چکے ہیں۔ اب تاریخ کی ایک ایسی کتاب لکھی جائے، جس میں گزشتہ ہزار سال کے تمام شاہان اسلام کے واقعات و حالات درج ہوں اور تاریخ کی یہ کتاب دوسری کتب تواریخ کے غلط واقعات کی ناسخ اور تردید کناں ہو۔ اس کا نام ''تاریخ الفی'' رکھا جائے اور اس میں ''سن'' کے ساتھ بجائے لفظ ''ہجری'' کے ''رحلت'' کا لفظ لکھا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے لے کر اس زمانے (یعنی ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء) تک کے حالات معرض تحریر

Marfat.com

لانے کے لیے سات اشخاص کو مامور کیا گیا' جن میں ایک ملا عبدالقادر بدایونی تھے۔ بدایونی کو جن سنین کے واقعات ضبطِ کتابت میں لانے کا کام سپرد ہوا' ان میں خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات بھی تھے۔ ایک شب یہ مسودہ بادشاہ کے ملاحظہ میں تھا۔ جب بادشاہ پڑھتے پڑھتے حضرت عمر کے حالات کے ضمن میں کوفہ شہر کی تعمیر' قصر امارت کے انہدام' حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی حضرت ام کلثوم سے حضرت عمر کے نکاح اور شہر نصیبین کی فتح اور وہاں سے بڑے بڑے بچھوؤں کے نکلنے کے واقعات پر پہنچا تو ان مندرجات پر بحث شروع کر دی اور خاصی ردوقدح کی۔ آصف خاں ثالث یعنی مرزا جعفر نے اس بحث میں بادشاہ کی تائید کی جو بالکل غلط تھی۔ البتہ ابوالفضل اور غازی خاں بدخشی نے ان واقعات کو صحیح قرار دیا اور تاریخی حیثیت سے مبنی بر صحت ٹھہرایا۔ اس موقعے پر اکبر نے بدایونی سے ان واقعات کے ماخذ کے بارے میں بھی سوال کیا اور پوچھا کہ ''تم نے یہ حالات کہاں سے لیے ہیں؟'' انھوں نے جواب دیا: ''میں نے کچھ اپنی طرف سے بنا کر تو نہیں لکھا' جو کچھ کتابوں میں پڑھا ترتیب دے دیا۔'' اکبر نے اسی وقت شاہی کتب خانے سے روضۃ الاحباب اور سیرت کی کچھ کتابیں منگوائیں اور نقیب خاں سے کہا کہ وہ تحقیق کر کے ان واقعات کی صحت و عدم صحت کے بارے میں بادشاہ کو مطلع کرے۔ کتابیں دیکھ کر اس نے تمام واقعات کے صحیح ہونے کی تصدیق کی اور بدایونی کو بادشاہ کی بے جا گرفت سے نجات حاصل ہوئی۔

بہرحال مختلف لوگوں نے اور بعد میں آصف خاں نے ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء تک کے حالات ''تاریخ الفی'' میں جمع کیے۔ پھر ۱۰۰۰ھ کو بادشاہ نے لاہور میں بدایونی کو اس کے تمام مسودات کے مقابلے' تصحیح اور سنین میں جو تقدیم و تاخیر ہوگئی تھی' اس کو درست کرنے کا حکم دیا۔ ایک سال تک بدایونی یہ کام کرتے رہے۔ انھوں نے اس اثنا میں پہلی دو جلدیں مکمل کیں' تیسری جلد کا کام آصف خاں کے سپرد کیا گیا۔ آئین اکبری میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ اس کتاب کا دیباچہ اس (ابوالفضل) نے لکھا۔

۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کے واقعات میں ایک اہم واقعہ ''مہا بھارت'' کے ترجمے کا ہے جو پہلی مرتبہ اکبر کے عہد میں فارسی میں ہوا۔ ''مہا بھارت'' ہندوؤں کی ایک قدیم مذہبی کتاب ہے۔ اس کا سن تصنیف تو صحیح طور سے معلوم نہیں' البتہ اس کے مصنف کا نام پنڈت دیاس جی ہے۔ یہ کتاب قدیم ہند کے واقعات' آریوں کے عقائد' ان کے طرز حکمرانی' معاشرت' سماجی حالات' متعدد قصوں' عجیب و غریب کہانیوں' نصیحتوں' اخلاق و آداب' علوم و معتقدات' ہندو مذہب کے رسوم و عقائد اور اس کے نہج عبادات کا مکمل مرقع ہے' اور اس ضمن کی تمام تفصیلات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کرشن جی کے اپدیش کا جو ''بھگوت گیتا'' کے نام سے مشہور ہے' ماخذ یہی کتاب ہے۔ کورو پانڈوؤں کی جنگ کا اصل ماخذ بھی ''مہا بھارت'' ہی ہے۔ یہ جنگ دہلی کے قریب کوروکشیتر کے مقام پر لڑی گئی تھی' جس میں کرشن جی کی مدد سے ارجن نے کوروؤں کو شکست دی تھی۔ بعض ہندوؤں کا کہنا ہے کہ اس

Marfat.com

کتاب میں جنگ کے جو کوائف درج ہیں، وہ ساڑھے چار ہزار سال پیشتر وقوع پذیر ہوئے تھے۔ بعض کے نزدیک ان پر اسی ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ہندو اس کتاب کے لکھنے اور پڑھنے کو عبادت سمجھتے ہیں اور ان کے مذہبی نقطہ نظر سے اس کے تمام مندرجات قابل اعتماد اور لائق اعتنا ہیں۔

بدایونی اکبر پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بادشاہ کو مہابھارت کے ترجمے کا خیال اس لیے آیا کہ انہی دنوں اس نے شاہنامہ باتصویر لکھوایا تھا، اور امیر حمزہ کا قصہ بھی سترہ جلدوں میں باتصویر مرتب ہو کر پندرہ برس کے عرصے میں تیار ہوا تھا۔ اس پر کافی روپیہ بھی خرچ ہوا تھا۔ قصہ ابومسلم اور جامع الحکایات وغیرہ بھی کئی بار سن اور لکھوا چکا تھا۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ یہ سب فرضی قصے، شاعری کی باتیں اور شاعروں کی تراشیں ہیں۔ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یوں ہی ان کتابوں کو شہرت حاصل ہوگئی ہے۔ البتہ ہندی کتابیں جو عبادت گزار عقل مند لوگوں نے لکھی ہیں، وہ صحیح واقعات پر مشتمل ہیں اور بالکل درست ہیں۔ ہندوؤں کی عبادات و اعتقادات اور مذہب کا سرچشمہ اور ماخذ بھی یہی ہیں، لہٰذا کیوں نہ اپنے نام سے ان کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کرا دیا جائے۔ یہ واقعات اب تک فارسی میں بیان نہیں ہوئے۔ قارئین کے لیے یہ دلچسپ بھی ہوں گے اور نئے بھی۔ پھر جیسا کہ مقدمۂ کتاب میں درج ہے، ان میں دین و دنیا کی سعادت بھی ہے اور ذریعہ شان و شوکت بھی۔ اس سے اموال و اولاد میں بھی اضافہ ہوگا۔

چنانچہ ان امور کے پیش نظر خود بادشاہ نے بھی ذاتی طور پر ان کے لیے وقت دینے کا فیصلہ کیا اور ہندو پنڈتوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ ''مہابھارت'' کی تعبیر و ترجمانی میں تعاون کریں۔ پہلے تو بادشاہ نے یہ کیا کہ نقیب خاں کی مدد سے رات کو اس کے مضامین سمجھتا رہا اور اس کے معنی فارسی میں لکھواتا رہا۔ پھر تیسری شب بدایونی کو بلایا اور حکم دیا کہ وہ نقیب خاں کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کریں۔ اس کے بعد بدایونی لکھتے ہیں:

''تین چار مہینے میں اس مجموعہ خرافات کے اٹھارہ فنون میں سے، جن میں اٹھارہ ہزار عالم کا تذکرہ کیا گیا ہے، صرف دو فن (پرب) لکھے جا سکے۔ نہ معلوم مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوا تھا کہ اس ترجمے سے پالا پڑا، اور بادشاہ کے طرح طرح کے اعتراضات سننے اور برداشت کرنا پڑے۔ اس کام میں بجز طعن و تعریض کے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ بعد میں ایک حصہ ملا شیری اور نقیب خاں نے مکمل کیا اور ایک حصے کی حاجی سلطان تھانیسری نے تکمیل کی۔ اس کے بعد فیضی کو اس کی نظم و نثر مرتب کرنے کا حکم دیا۔ وہ دو فن (پرب) سے آگے نہ پڑھ سکا۔ پھر حاجی سلطان تھانیسری نے دو حصے اور لکھے اور جو فروگزاشتیں پہلی دفعہ رہ گئی تھیں، انھیں درست کیا۔ اس طرح کتاب کے سو جز کھینچ کھانچ کر مکمل ہوئے۔ بادشاہ کو اصل کتاب اور ترجمے کی مطابقت میں کچھ ایسا اصرار تھا کہ مکھی کا داغ (نقطہ مگس) بھی چھوٹنے نہ پائے۔''

بدایونی اس ضمن میں طنز کے تیر چلاتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

Marfat.com

''حاجی سلطان تھانیسری کو اس شدید محنت و مشقت کا کیا صلہ ملا؟ کچھ عرصے بعد کسی بہانے انھیں بھکر کی طرف جلاوطن کر دیا گیا ـــــ مہابھارت کا ترجمہ بتانے والوں میں سے اکثر کورو اور پانڈو سے جا ملے ہیں اور جو باقی اس دنیا میں رہ گئے ہیں، خدا ان کو نجات دے اور توبہ کی توفیق عطا کرے۔ مجھے بھی اللہ تعالیٰ اس معاملے میں معافی عطا فرمائے۔''

اس سے آگے رقم طراز ہیں:

''اکبر نے اس ترجمے کا نام ''رزم نامہ'' رکھا اور دو باتصویر نسخے تیار کرائے۔ جب یہ تیار ہو گئے تو امرا کے نام حکم جاری کیا گیا کہ وہ اس پر ہاتھ رکھ کر برکت حاصل کریں۔ ابوالفضل نے اس کفرنامے پر دو جز کا خطبہ لکھا۔''

بختاور خاں نے ''مرآۃ العالم'' میں لکھا ہے کہ ملا صاحب کو خدمت مذکور کے صلے میں ایک سو پچاس اشرفی اور دس ہزار تنکہ سیاہ انعام ہوئے [1]۔

جلوس سلطانی کے چالیسویں سال (۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء) کے واقعات بیان کرتے ہوئے ''مہابھارت'' کے ترجمے کے سلسلے کا بھی بدایونی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

اس سال کے رجب کی ۹/ تاریخ کو نوروز تھا، اور جلوس سلطانی کے چالیسویں سال کا آغاز ہوا تھا۔ نوروز سے دو دن پہلے بادشاہ نے بدایونی کو دیوان خاص و عام کے جھروکے میں بلایا اور براہِ راست بدایونی سے کہنے کے بجائے ابوالفضل کو مخاطب کر کے فرمایا:

''ہم تو عبدالقادر کو صوفی مشرب نوجوان سمجھتے تھے، لیکن اس نے اپنے آپ کو ایسا متعصب فقیہ ثابت کیا ہے کہ کوئی تلوار اس کی رگ تعصب کو کاٹ نہیں سکتی۔''

ابوالفضل نے پوچھا: ''کس کتاب میں اس نے کوئی ایسی بات لکھ دی ہے کہ آپ اس کے متعلق اس رائے کا اظہار فرماتے ہیں۔''

اکبر نے کہا: ''اسی ''رزم نامہ'' یعنی ''مہابھارت'' میں کل رات ہم نے اس کی ایک تحریر پر نقیب خاں کو بھی گواہ بنایا ہے۔''

ابوالفضل نے کہا: ''اس سے غلطی ہو گئی۔''

اس وقت آگے بڑھ کر بدایونی نے وضاحت کی۔ ''کم ترین تو فقط ایک مترجم ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ جو کچھ ہندی کے عالموں نے ترجمانی کی تھی، میں نے اس کا اسی طرح ترجمہ کر دیا۔ اگر اپنی طرف سے میں نے کچھ بڑھایا ہو تو یقیناً میں قصوروار ہوں۔''

---

[1] دربار اکبری - ص ۴۵۰-

Marfat.com

ابوالفضل نے بھی اس کی تائید کی اور بادشاہ خاموش ہو گیا۔

بدایونی لکھتے ہیں: ''بادشاہ کے اس اعتراض کا سبب یہ تھا کہ (مہا بھارت کے ترجمہ) ''رزم نامہ'' میں میں نے ایک حکایت نقل کی تھی کہ ایک پنڈت نے عالم نزع میں حاضرین کو نصیحت کی کہ انسان کو چاہیے کہ غفلت و جہالت کو ترک کر کے سب سے پہلے اپنے صانع حقیقی (خالق حقیقی) کو پہچانے' علم و حکمت کا راستہ اختیار کرے اور علم بے عمل پر جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا' بھروسا نہ کرے۔ حسن عمل کو اختیار کر کے تاحدِ امکان جھگڑوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے اور اس بات پر کامل یقین رکھے کہ ہر فعل کی باز پرس ہو کر رہے گی۔ اس موقعے پر میں نے یہ مصرع لکھ دیا تھا۔

ہر عمل اجرے و ہر کردہ جزائے دارد

''بس یہ عبارت اور مصرع تھا جو بادشاہ کو کھٹکا اور اس نے اس کو منکر نکیر کے سوال جواب' حشر و نشر' آخرت کے حساب اور میزان پر محمول کیا۔ یہ بات چونکہ اس کے عقیدۂ تناسخ کے خلاف تھی' جس کے سوا وہ کسی چیز کو صحیح نہیں سمجھتا تھا' لہٰذا اس نے مجھ پر ملا پن اور متعصب فقیہ کا الزام لگایا۔''

اس سے آگے بدایونی رقم طراز ہیں:

''یہ بات چل نکلی اور مجھے اچھا موقع مل گیا۔ چنانچہ میں نے مقربانِ شاہی کو اچھی طرح سمجھانا شروع کیا کہ ہندوستان کے تمام لوگ نیکی اور بدی کے اچھے اور برے انجام کے قائل ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو ایک محرر جو بندوں کے اعمال زندگی بھر لکھتا رہتا ہے' اس کی نیکی اور بدی کے تمام اندراجات بادشاہِ عدل کے پاس لے جاتا ہے' اور پھر نیکی اور بدی کی کمی بیشی کے مطابق اس کا بارگاہ عدل سے بدلہ دیا جاتا ہے' اسی کے نتیجے میں اس کو جنت یا دوزخ میں ڈالا جاتا ہے۔''

۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں بادشاہ نے بدایونی کو ہندوؤں کی مشہور کتاب ''رامائن'' کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ کہتے ہیں' یہ کتاب تصنیف کے لحاظ سے ''مہا بھارت'' سے بھی پہلے کی ہے' جو بالمیک رشی کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی مقدس اور قدیم کتابوں میں اس کا بڑا درجہ ہے۔ پچیس ہزار اشلوک پر مشتمل ہے۔ ہر اشلوک پچیس حروف کا ہے۔ کتاب اودھ کے راجہ رام چندر کی داستان ہے' جسے عام طور پر رام کہا جاتا ہے۔ ہندو اس کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں اور قدرت الٰہی کا ظہور سمجھ کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں اس کی کہانی یہ ہے کہ لنکا کے جزیرے پر راون نام کا ایک دیو حکومت کرتا تھا' جس کے دس سر تھے۔ وہ رام کی بیوی سیتا پر عاشق ہو گیا اور اسے اغوا کر کے لنکا لے گیا تھا۔ رام نے اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرے کا رخ کیا۔ بے شمار بندروں اور ریچھوں کا لشکر تیار کیا اور سمندر پر چار کوس کا پل باندھا۔ بعض بندروں کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ اس فاصلے کو ایک ہی چھلانگ میں طے کر گئے تھے اور بعض پل پر سے چلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ بدایونی لکھتے ہیں: ''غرض ایسی بہت سی خرافات اس کتاب میں درج ہیں۔'' وہ مزید لکھتے ہیں: ''بہر حال رام

Marfat.com

چندر ایک بندر پر سوار ہو کر اس پل پر سے گزرا اور ایک ہفتے تک جنگ کر کے راون کو اس کے اہل و عیال سمیت قتل کر دیا اور لنکا کا جزیرہ اپنے بھائی کے حوالے کر کے اپنے شہر واپس آ گیا۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ رام چندر نے ہندوستان پر دس ہزار سال حکومت کر کے وفات پائی ___ ظاہر ہے ''رامائن'' کے یہ مندرجات صحیح نہیں ہیں' محض افسانہ اور خیالی داستانیں ہیں۔''

اس سے آگے لکھتے ہیں:

''ماہ جمادی الاولی ۹۹۷ھ/ مارچ ۱۵۸۹ء میں' میں نے رامائن کا ترجمہ مکمل کر کے بادشاہ کو پیش کیا۔ یہ ترجمہ چار سال میں ختم کیا تھا اور اس کے دو نسخے مرتب کیے تھے۔ ترجمے کے آخر میں یہ شعر لکھا تھا:

ماقصہ نوشتیم بہ سلطان کہ رساند جاں سوختہ کردیم بہ جاناں کہ رساند

بادشاہ کو یہ شعر بہت پسند آیا اور پوچھا: ''ترجمہ کتنے اجزا میں مکمل ہوا۔؟'' میں نے عرض کیا ''پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً ستر اجزا میں اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ ایک سو بیس اجزا میں۔'' بادشاہ نے حکم دیا کہ ''مصنفوں کے دستور کے مطابق اس کا دیباچہ بھی لکھ دو۔'' دیباچے کی چونکہ زیادہ ضرورت نہ تھی' اس لیے میں ٹال گیا۔ اب میں اپنے نامہ سیاہ سے جو میرے نامہ اعمال کی طرح داغ دار ہے' خدا کی پناہ چاہتا ہوں' لیکن نقل کفر' کفر نیست' پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ یہ کتاب جو میں نے کراہتاً بادشاہ کے حکم سے مجبور ہو کر لکھی ہے' میرے لیے لعنت کا باعث نہ بن جائے۔ اللہ ہی مجھے معاف کرے اور اپنی پناہ میں رکھے۔''

رامائن کے ترجمے کا بدایونی کو کیا صلہ ملا؟ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

انہی دنوں (۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں) بادشاہ کو خیال آیا کہ رامائن کے ترجمے کا کچھ صلہ مجھے دیا جائے۔ چنانچہ ایک دن ___ میرا نام لے کر کہا: ''یہ نوجوان بدایوں کا رہنے والا ہے' اس کی مدد معاش ہم بغیر کسی قصور کے جان بوجھ کر بساور سے منقطع کر کے بدایوں میں مقرر کر دیتے ہیں ___''

۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں بادشاہ نے بدایونی کو ''تاریخ کشمیر'' کو سادہ و آسان فارسی زبان میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ ''تاریخ کشمیر'' سنسکرت کی کتاب ''راج ترنگی'' کا ترجمہ ہے۔ ''راج ترنگی'' کشمیر کے ایک حکمران سلطان زین العابدین کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ اس کے مصنف کا نام کلہانا ہے۔ بعد ازاں اکبر کے حکم سے علاقہ کشمیر کے قصبہ شاہ آباد کے ایک عالم ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے جو فاضل بزرگ اور جامع معقول و منقول تھے' اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ بعد میں اکبر کے حکم سے بدایونی نے اس کو سادہ اور آسان فارسی زبان میں لکھا۔ یہ کام دو مہینے میں مکمل ہوا۔ آخر میں یہ شعر تحریر کیا:

درعرض یک دو ماہ بتقریب حکم شاہ این نامہ شد چو خط پری پیکراں سیاہ

یہ نسخہ کتب خانہ شاہی میں داخل کیا گیا اور پھر باقاعدہ ایک ایک جز کی صورت میں بادشاہ کے سامنے پڑھا گیا۔

Marfat.com

اسی زمانے (۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء) میں حکیم ہمام نے شہاب الدین عبداللہ یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ/ ۱۲۲۹ء) کی تصنیف ''معجم البلدان'' کی بادشاہ کے سامنے بہت تعریف کی اور تجویز پیش کی کہ اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ کتاب بڑی عجیب وغریب حکایات اور مفید معلومات ومضامین پر مشتمل ہے۔ بادشاہ نے دس بارہ عراقی اور ہندوستانی اہل علم کو جمع کر کے اس کے مختلف اجزا ان میں تقسیم کیے۔ بدایونی کے حصے میں دس جز آئے۔ ان اجزا کا ترجمہ انھوں نے ایک مہینے میں کر دیا اور سب سے پہلے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

اس حسن خدمت کو ذریعہ بنا کر بدایوں جانے کے لیے درخواست کی' جو منظور ہوئی۔

۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں بدایونی نے ''نجات الرشید'' تصنیف کی۔ یہ کتاب حالت سفر میں لکھی گئی جو قرآن' حدیث اور فقہ کی روشنی میں شعائر اسلام اور بعض دینی مسائل پر مشتمل ہے۔ تصوف کے کچھ مسائل بھی اس میں شامل ہیں۔ بزرگانِ دین کے بعض واقعات بھی درج کتاب ہیں۔ کتاب کے بعض مضامین سے اختلاف کی گنجائش ہے' تاہم بڑی محنت سے لکھی گئی ہے۔ اچھی ضخیم کتاب ہے اور بہت سے معلومات پر محیط ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی کئی مہینے سے دربار سے غیر حاضر تھے' اس لیے بادشاہ ان سے خفا تھا۔ خفگی کیوں کر دور ہوئی؟ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

سینتیسویں سال جلوس (۱۰۰۰ھ/۱۵۹۲ء) کے حالات میں بدایونی لکھتے ہیں کہ میں ماہ ذی الحجہ میں بدایوں سے حسب الحکم لشکر میں حاضر ہو گیا۔ بھمبر میں منزل ہوئی تو حکیم ہمام نے عرض کیا:

''عبدالقادر کورنش بجالانا چاہتا ہے۔''

بادشاہ نے پوچھا: ''وہ وعدے کے خلاف کتنا عرصہ غیر حاضر رہا؟''

حکیم نے جواب دیا: ''پانچ مہینے!''

بادشاہ نے پوچھا: ''غیر حاضری کی کیا وجہ تھی؟''

لوگوں نے کہا: ''بیمار ہو گیا تھا۔''

تصدیق کے لیے بدایوں کے اکابر وزعما کا محضر اور حکیم عین الملک کا عریضہ بھی پیش کیا گیا۔ لیکن جب بادشاہ نے یہ تمام کاغذات پڑھ لیے تو فرمایا:

''بیماری مسلسل پانچ مہینے تک نہیں رہتی ____ '' اور مجھے کورنش بجالانے کی اجازت نہیں دی۔

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

اب میں شرمندہ ورنجیدہ اور غم زدہ ہو کر شہزادہ دانیال کے لشکر میں' جسے رہتاس میں متعین کیا گیا تھا جا کر ٹھہر گیا' اور رسول اللہ ﷺ پر درود وصلوۃ بھیجتا رہا۔ اس اثنا میں قصیدہ بردہ کا وظیفہ کر کے اور خدا سے گڑگڑا کر دعائیں کیں جو بالآخر فضل خداوندی سے قبول ہوئیں۔ میرے پہنچنے کے پانچ ماہ بعد جب لشکر کشمیر سے لاہور پہنچا تو بادشاہ نے میری طرف عنانِ توجہ اور نظر عنایت فرمائی اور ایک ضخیم کتاب ''جامع رشیدی'' کے ترجمے کے

Marfat.com

لیے خلوتِ شاہی میں میر نظام الدین احمد کے ساتھ میرا نام بھی میری غیبوبت میں تجویز فرمایا' اور مجھے حاضری کا حکم ہوا۔ اس طرح کشمیر سے واپسی کے بعد ۱۷ ربیع الثانی ۱۰۰۰ھ/۲۲ جنوری ۱۵۹۲ء کو کورنش کی اجازت دی گئی۔ میں نے حاضر ہو کر ایک اشرفی نذر کی۔ بادشاہ نے بڑی مہربانی فرمائی اور ساری خفگی آسانی سے رضامندی میں بدل گئی۔ بادشاہ نے ابوالفضل کے مشورے سے بدایونی کو جامع رشیدی کے انتخاب و ترجمہ کا حکم دیا۔ انھوں نے اس انتخاب میں عباسی' مصری اور اموی خلفا کے شجرے کو جس کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ اور پھر ان سے درجہ بدرجہ تمام انبیا اور آدم علیہ السلام تک جا کر منتہی ہوتا ہے' عربی سے فارسی میں ترجمہ کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس انتخاب اور ترجمے کتب خانہ شاہی میں داخل کیا۔

جلوس سلطانی کے چالیسویں سال (۱۰۰۳ھ/۲۹ مئی ۱۵۹۵ء) کے رمضان المبارک کی آخری تاریخ) کو بادشاہ نے ابوالفضل سے کہا' کہ اگرچہ فاضل بدایونی اجمیر کی خدمت بھی خوب کر سکتا ہے' مگر ہم ترجمے کے لیے اسے اکثر کتابیں دے دیتے ہیں' یہ خوب لکھتا ہے اور ہمارے خاطر خواہ لکھتا ہے۔ اسے جدا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ابوالفضل نے بھی اور دیگر امرا نے بھی اس کی تصدیق کی۔ اسی دن بادشاہ نے بدایونی کو حکم دیا کہ کشمیر کے بادشاہ سلطان زین العابدین نے جس افسانہ ہندی کا بحر الاسما کے نام سے فارسی میں ترجمہ کرایا تھا اور اس کا بیشتر حصہ باقی رہ گیا تھا' اس کی تکمیل کرو۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحر الاسما' سنسکرت کی ایک کہانی ''کتھا ساگر'' کا ترجمہ ہے)۔ چنانچہ یہ کام شروع کر دیا گیا اور اس کتاب کی آخری جلد کا ترجمہ' جو ساٹھ اجزا کی ضخامت کو محیط تھا' پانچ مہینے میں مکمل ہو گیا۔ اس اثنا میں بادشاہ نے ایک شب خواب گاہِ خاص میں اپنے تخت کے قریب بدایونی کو بلایا اور تمام رات صبح تک ہر باب کی حکایتیں سنتا رہا۔ پھر حکم دیا کہ بحر الاسماء کی پہلی جلد کا ترجمہ' جو سلطان زین العابدین نے کرایا تھا' قدیم اور غیر متعارف فارسی زبان میں ہے' اس کو مروجہ اور مانوس فارسی زبان میں منتقل کر دو اور اپنے اس ترجمے کے مسودے کو حفاظت سے رکھو۔ بدایونی نے حسب الحکم یہ کام شروع کر دیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر نہایت مہربانی سے دس ہزار تنکہ اور گھوڑا انعام میں عطا فرمایا۔ بدایونی کہتے ہیں۔ میں نے کہا ''ان شاء اللہ یہ کتاب ان ہی دو تین مہینے میں بحسن و خوبی مرتب ہو جائے گی۔''

بدایونی کی ایک نہایت اہم اور معروف تصنیف ''منتخب التواریخ'' ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں لکھنا شروع کی تھی۔ اس میں سبکتگین کے عہد سے لے کر ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۶ء تک کے شاہان ہند کے حالات (کہیں قدرے مفصل اور کہیں مجمل) مرقوم ہیں۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے حالات اس میں بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اکبر کے مذہبی افکار پر کھل کر بحث کی ہے اور اس کو سخت الفاظ میں نشانہ تنقید بنایا ہے۔ اس دور کے علما و مشائخ' اکبر کے ندما و مصاحبین اور درباری شخصیتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور جن لوگوں نے بادشاہ کو گمراہی کے راستے پر لگایا اور جن افراد نے اس سلسلے میں اس کی تائید یا مخالفت کی' ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

Marfat.com

پھر اس ضمن میں جن لوگوں نے بادشاہ سے کسی قسم کی مراعات حاصل کیں اور جن کو مخالفت کی وجہ سے کسی نوع کی سزائیں دی گئیں ان کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ اس میں نہ بادشاہ کی کوئی بات مخفی رکھی ہے اور نہ اس کے مویدین ومخالفین کے بارے میں کسی قسم کی رعایت سے کام لیا ہے۔ جو بات دیکھی یا سنی حوالہ قرطاس کر دی۔ اس باب میں جو واقعہ بیان کرتے ہیں' سخت طنزیہ انداز میں کرتے ہیں۔ محرم ۱۰۰۴ھ/ستمبر ۱۵۹۵ء میں کچھ لوگ اکبر کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ ان ایام کے واقعات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''انہی دنوں چند اشخاص' اخلاص چہارگانہ کے مریدوں میں داخل ہوئے۔ داڑھیوں کی صفائی کی۔ ان میں بعض تو ایسے عالم تھے کہ اپنے آپ کو فاضل اجل سمجھتے تھے۔ بعض خرقہ پوش خاندانی مشائخ تھے۔ وہ دعوی کرتے تھے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد ہیں' اور یہ کہ ان کے شیخ طریقت کا ارشاد ہے کہ بادشاہ ہند سے لغزش ہوئی ہے' تم ہی جا کر ان کو بچا سکو گے وغیرہ وغیرہ۔'' بدایونی ایسے لوگوں کا خوب مضحکہ اڑاتے ہیں' اور لکھتے ہیں۔ ''موتراش چند'' ان کی تاریخ نکلی۔

لیکن اپنے جن رفیقوں اور ساتھیوں پر وہ بھرپور طنز کرتے ہیں' ان کی وفات اور دائمی جدائی پر انتہائی افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ کاروان حیات کے پرانے رفقائے سفر کے خیمے اس دنیا سے اکھڑ رہے ہیں اور موت ان کو ایک ایک کر کے اس عالم فانی سے ہمیشہ کے لیے دوسرے جہان میں لے جارہی ہے تو قلم دریائے غم کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے اور انتہائی افسردہ دلی کا شکار ہو جاتے ہیں ___ ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء کے اواخر میں لکھتے ہیں:

''دو اور قلبی دوست دنیا سے رخصت ہو گئے۔ شیخ یعقوب کشمیری صرفی جو بادشاہ سے رخصت لے کر وطن گئے تھے' وہیں موت کی آغوش میں چلے گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

یاراں ہمہ رفتند و در کعبہ گرفتند   ماست قدم بر درِ خمار بما ندیم
ازنکتہ مقصود نشد فہم حدیثے   لا دین ولا دنیا بیکار بما ندیم

''۲۷ ذی الحجہ کو حکیم عین الملک بھی سفر آخرت اختیار کر گئے [1]۔''

اپنے ہم صحبت لوگوں کی موت پر حزن وملال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سبحان اللّٰہ! دیکھتا ہوں کہ تمام دوست احباب اس رفاقت وصحبت سے بے راز ہو کر ایک ایک کر کے منزلِ آخرت کو روانہ ہو گئے اور جو باقی ہیں' وہ روانہ ہو رہے ہیں۔ ہم اسی سیاہ دلی اور پریشان حالی میں انجام سے غافل ہو کر بے ہودگی میں عمر برباد کر رہے ہیں:

---

[1] حکیم عین الملک بادشاہ کی طرف سے راجی خاں کے پاس ایلچی بن کر گئے۔ وہاں سے ہنڈیہ گئے جو ان کی جاگیر تھی۔ وہیں وفات پائی۔ حکیم صاحب اور جمال خاں قورچی کی وساطت سے بدایونی دربار اکبر میں پہنچے تھے۔

Marfat.com

اے دل چو آگہی کہ فنا درپے بقاست　　ایں آرزوے دور و درازاز پے چراست
باروز گار عہد تو بستی، نہ روزگار　　پس ایں نفیر چیست کہ ایام بے وفاست

''محرم ۱۰۰۴ھ/ستمبر ۱۵۹۵ء میں حکیم حسن گیلانی نے بھی وفات پائی۔ نہایت درویش نہاد، مہربان اور مخلص آدمی تھے:

بے خاراگر گلے میسر بودے　　ہر دم بہ جہاں لذت دیگر بودے
زیں کہنہ سرائے زندگانی مارا　　خوش بودے، اگر نہ مرگ بردر بودے

اسی سال ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ/۵ / اکتوبر ۱۵۹۵ء کو فیضی نے انتقال کیا۔ اس کی موت کا ذکر بدایونی جن فارسی الفاظ میں کرتے ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے۔

ملک الشعرا شیخ فیضی متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مثلاً ضیق النفس، استسقاء ورم، خونی قے وغیرہ کئی امراض نے اس کو گھیر رکھا تھا۔ چھ مہینے تک وہ ان امراض کی سختیاں برداشت کرتا رہا۔ آخر ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ/ ۵ / اکتوبر ۱۵۹۵ء کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ فیضی کو کتوں کے ساتھ بڑا انس تھا اور وہ رات دن کتوں میں گھرا رہتا تھا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ سکرات موت کے وقت اس کے منہ سے کتے کی آواز نکل رہی تھی۔ فیضی اسلام کا قطعی منکر اور بے دینی کا سخت حامی تھا۔ چنانچہ مرنے سے پہلے تک وہ ایک عالم شریعت سے بیہودہ اور کافرانہ باتیں کرتا رہا۔ اس کی تاریخ وفات ہے ___ ''وے فلسفی و شیعی و دہری'' ___ ایک دوسرے تاریخ ہے ___ ''قاعدہ الحاد شکست'' ___ فیضی کے نزع کے وقت بادشاہ سلامت آدھی رات کو اس کے پاس گئے اور اس کا سر اپنے ہاتھوں میں تھام کر آوازیں دیں کہ ''شیخ جیو، ہم حکیم علی کو ساتھ لے کر آئے ہیں، تم آخر بات کیوں نہیں کرتے۔'' لیکن فیضی اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جب دوبارہ بادشاہ نے آواز دی تو اپنی پگڑی زمین پر گرا دی۔ اس کے بعد شیخ ابوالفضل کو تسلی دے کر بادشاہ وہاں سے چلا گیا۔ اسی وقت خبر ملی کہ وہ جاں نثار رخصت ہو گیا۔

چند روز بعد حکیم ہمام بھی دنیا سے منہ موڑ گئے۔ ان سے دوسرے روز کمالائے صدر بھی رخت سفر باندھ گئے۔ بدایونی لکھتے ہیں، ان کی موت واقع ہوتے ہی دونوں کے گھروں پر بادشاہی پہرے دار بیٹھ گئے اور مال خانے مقفل کر دیے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کے مردے بھی کفن کے کپڑے کے محتاج ہو گئے۔

یہ جلال الدین اکبر کے جلوس تخت کا چالیسواں سال ہے اور یہیں تک کے حالات منتخب التواریخ میں مرقوم ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف سے بدایونی جمعہ کے روز ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ کو فارغ ہوئے۔ کتاب ختم کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔ اردو ترجمہ:

''میرے سودائی قلم نے دیوانہ وار ہر آشنا اور اجنبی کا دامن پکڑنے کی کوشش کی ہے اور اپنے جنون

Marfat.com

کے ہر قطرے کو صفحہ قرطاس پر ثبت کر دیا۔ نہ معلوم میرے بعد آنے والے اس نقش زاغ پا کو دیکھ کر کیا کہیں گے اور کیا رائے قائم کریں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ میرے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو میں نے دوسروں کے ساتھ کیا۔

مرا تو عہد شکن خواندهٔ و می ترسم
کہ باتو روزِ قیامت ہمیں عتاب رود

تاہم مجھے توقع ہے کہ نکتہ شناس اس بات کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ میری یہ تمام تر آفرین ونفرین شرع مبین کی حمایت اور دین متین کی طرف داری کے لیے ہے ___ اگر دوسروں کو بھی دینی خدمت کا درد اسی طرح دامن گیر ہو جائے اور وہ میرا احتساب کرنا چاہیں تو بسم اللہ میں ان پر قربان، جو میرے عیوب سے مجھے آگاہ کریں۔ ورنہ وہ شرم سے گریبان میں منہ چھپالیں۔

”اصل میں دیکھا جائے تو میرا یہ بلند پرواز و تیز منقار قلم علامت قرب قیامت کے دابتہ الارض کی مانند ہے، جو اس آخری زمانے کے لوگوں کی پیشانیوں پر ”یہ مسلم“ ___ ”وہ کافر“ کے نشان لگاتا گیا، اور کسی کو رحمت کا مستحق اور کسی کو لعنت کا سزاوار ٹھہراتا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی عرب کے مشرکوں اور قریش کے سرداروں پر لعنت بھیجی ہے ___

”ارباب تصنیف و اصحاب تالیف کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنی اچھی بری کاوشوں کو قلم بند کر کے اہل زمانہ پر بڑا احسان جتاتے ہیں، اور اپنی تصنیف کو کسی نہ کسی کے نام منسوب کر کے اپنے اغراض و منافع کی راہ نکال لیتے ہیں۔ میں اس روش کے خلاف کسی طمع اور توقع کے بغیر اپنے سے بعد میں آنے والوں کے لیے ایک تحفہ چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ لوگ جو ہمارے دور کے حالات و حقائق سے آگاہ ہونے کے متمنی ہوں، اس سے استفادہ کر سکیں:

اگر شراب خوری جرعۂ فشاں برخاک
ازاں گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک

”اس انتخاب (یعنی منتخب التواریخ) کی ترتیب کا بنیادی سبب یہی ہے کہ موجودہ زمانے میں احکام دین میں جس طرح تغیر و تبدل کیا جا رہا ہے، اس کی گزشتہ ہزار سال میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہر وہ شخص جو دو حرف لکھنے پڑھنے کی استطاعت رکھتا ہے، وہ اصحاب اقتدار کی خوشامد یا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لا علمی کی بنا پر یا دیگر فاسد اغراض کی وجہ سے حق پوشی سے کام لینے لگا ہے اور دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے، باطل کو حق بنا کر پیش کرنے اور کفریات و لغویات کو خیرات و حسنات ثابت کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ (البقرہ:۱۶)

(یہی وہ لوگ ہیں، جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لے لی ہے، لیکن ان کی یہ

Marfat.com

تجارت فائدہ مند نہ ہوگی)

''یہ وہ باطل امور اور خرافات ولغویات ہیں کہ آئندہ نسلوں کے لوگ انھیں دیکھ کر سخت تذبذب اور تردد میں پڑ جائیں گے' اس لیے میں نے جو کہ ان معاملات سے بخوبی آگاہ ہوں بلکہ اس گورکھ دھندے میں مبتلا رہا ہوں' ضروری سمجھا کہ اپنے ان مشاہدات وروایات کو' جو چشم دید حقائق پر مبنی ہیں' کسی قسم کے ظن وتخمین کا نتیجہ نہیں ہیں' قلم بند کر دوں۔

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

تاکہ یہ چیز میری سابق بے ہودہ نگاری کا کفارہ ہو جائے اور اہل اسلام پر میری اس خدمت کا حق ثابت ہو جائے:

مگر صاحب دلے روزی برحمت
کند درکار ایں مسکیں دعائے

مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ یہ مسودہ ایک بیاض کی حیثیت رکھتا ہے' جس میں چند معلومات درج کر دی گئی ہیں۔ اس پر مستقل تصنیف یا تالیف کے بھاری بھر کم نام کا اطلاق نہیں ہو سکتا ___ اب تو اللہ سے دعا اور مناجات کا وقت ہے اور بس۔

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردم بگوہر شناس

___ ''میں نے بروز جمعہ ۲۳ جمادی الاخری ۱۰۰۴ھ/۱۳ر فروری ۱۵۹۶ء کو اپنے راہوارِ قلم کی باگیں کھینچ لیں اور جو کچھ لکھا گیا اسی کو کافی سمجھا۔ بطور تعمیہ یہ قطعہ تاریخ کہا گیا ہے:-

شکر للہ کہ باتمام رسید
منتخب از کرم ربانی
سال تاریخ زدل جستم گفت
انتخابی کہ ندارد ثانی

منتخب التواریخ کی تصنیف کے ٹھیک دس سال بعد ۱۳ جمادی الاخری ۱۰۱۴ھ/۱۴ر اکتوبر ۱۶۰۵ء کو جلال الدین اکبر کا انتقال ہوا۔ لیکن خود بادشاہ کو یا اس کے کسی مصاحب اور درباری کو اس کتاب کا علم نہیں ہو سکا۔ اس عرصے میں یہ مسودہ بالکل محفوظ صورت میں بدایونی کے وارثوں کے قبضہ وتحویل میں رہا۔ جہاں گیر کے عہد میں اس کتاب نے شہرت پائی۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بقول یہ کتاب جہاں گیر'' بادشاہ نے بھی دیکھی ❶۔'' اور ایک حکم کے ذریعے بدایونی کی اولاد اور وارثوں کو گرفتار کر کے دربار میں طلب کیا اور فرمان جاری کیا کہ بدایونی

❶ دربار اکبری-ص ۴۶۱-

Marfat.com

نے اس کتاب میں میرے باپ (اکبر) کو بدنام کیا ہے، لہٰذا اس کے بیٹے اور دیگر متعلقین کو قید میں ڈالا جائے اور اس کا گھر لوٹ لیا جائے۔ لیکن بدایونی کی اولاد نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہم خوردسال تھے، ہمیں اس کتاب اور اس کے مندرجات کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ چنانچہ جہاں گیر نے کتب فروشوں سے بھی مچلکے لیے کہ وہ کتاب نہ خریدیں گے نہ بیچیں گے۔ جہاں گیر کی اس خفگی اور سختی کی وجہ سے اس عہد یا اس کے متصل بعد تاریخ کی جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سے کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

البتہ خافی خاں جس نے شاہ جہان سے محمد شاہ تک کا زمانہ دیکھا ہے، تعجب کے ساتھ لکھتا ہے کہ جہاں گیر بادشاہ کے اس تشدد کے باوجود دارالخلافہ میں کتب فروشوں کی دکانوں پر سب سے زیادہ بدایونی کی کتاب ہی نظر آتی ہے۔

شاعری:

ملا عبدالقادر بدایونی شاعر بھی تھے اور قادری تخلص کرتے تھے، ان کی بعض نظمیں محمد حسین آزاد نے دربارِ اکبری میں نقل کی ہیں۔ مرثیے بھی درج کیے ہیں۔ اپنے چھوٹے بھائی شیخ محمد کی وفات پر انھوں نے جو مرثیہ لکھا وہ بڑا موثر اور درد میں ڈوبا ہوا ہے، لیکن بقول آزاد: ''ملا صاحب کی زبان میں نظم کا ڈھب ایسا نہیں جیسا نثر کا۔''

دورِ اکبری کا آئینہ:

ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ کو دورِ اکبری کے آئینے کی حیثیت حاصل ہے، جس میں اس زمانے کے تمام واقعات کو بخوبی دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ بدایونی کے یہ حالات ان کی اسی تصنیف سے لیے گئے ہیں۔ یہ حالات کسی ایک جگہ مرقوم نہیں بلکہ ضخیم فارسی کتاب کے مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے ہیں، جو جمع کر کے ان صفحات میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ ان کا تذکرہ اگرچہ ان کے عہد سے بہت بعد کی بعض دیگر کتابوں میں موجود ہے مگر نہایت مختصر اور مجمل صورت میں [1]۔

تاریخ کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جس شخص نے عہدِ اکبری کے واقعات اس درجہ مفصل طور سے بیان کیے اور اس دور کے علما و فضلا کو اتنی تفصیل سے بعد میں آنے والوں سے متعارف کرایا اور ان کی علمی، مذہبی، دینی اور درباری زندگی کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا، اس کا صحیح تعارف کرانے اور اس کے سوانح ضبطِ تحریر میں لانے کی کسی کو توفیق نہ ہوئی ___ بدایونی دورِ اکبری کا چشم دید گواہ اور عینی شاہد ہے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اس کی اس کتاب کے

[1] مثلاً دیکھیے: مآثر الکرام دفتر اول۔ ص ۳۷ تا ۳۹۔ تذکرۂ علمائے ہند۔ ص ۱۲۷۔ دربار اکبری۔ ص ۴۱۹ تا ۴۶۲۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۳۷ تا ۲۴۰۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور۔ ج ۴، زیر لفظ بدایوانی۔ ص ۱۴۳، ۱۴۴۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ ص ۲۴۵ تا ۲۴۷۔

Marfat.com

مندرجات کی صحت کو مشکوک ٹھہرایا جائے ___ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں علم وعلما کے اعتبار سے جلال الدین اکبر کا عہد نہایت زرخیز تھا۔ اکبر کے مذہبی افکار سے قطع نظر (جو ایک خاص دور سے تعلق رکھتے ہیں) یہ ماننا پڑے گا کہ جتنا علمی اور ثقافتی کام اس عہد میں ہوا اور کسی بادشاہ کے عہد میں نہیں ہوا' اور برصغیر کی قدیم کتابوں کے جس قدر تراجم اس زمانے میں ہوئے' اور کسی زمانے میں نہیں ہوئے۔ بدایونی کی منتخب التواریخ جہاں اکبر کے مذہبی افکار و رجحانات کی وضاحت کرتی ہے' وہاں اس دور کی علمی' تہذیبی اور ثقافتی خدمات کی بھی پوری طرح عکاس ہے، عہد جہاں گیری اور اس عہد کے معاً بعد کے مؤرخین اور تذکرہ نویسوں نے بدایونی کا ذکر نہ کر کے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا' اور یہ ان کی خاص مصلحتوں کا نتیجہ ہے' ورنہ اس کی یہ کتاب تو جہاں گیر کے عہد ہی میں کتب فروشوں کی دکانوں پر آ گئی تھی۔

وفات:

اسی سال یعنی ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۶ء کو بدایونی نے کتاب ختم کی اور اسی سال کے آخر میں خود ان کی اپنی کتابِ حیات ختم ہو گئی۔ بدایونی نے کل ستاون برس عمر پائی اور اس مختصر عمر میں لیل و نہار کی بے شمار گردشوں کا مشاہدہ کیا اور بہت سے تغیر و انقلاب سے دوچار ہوئے۔ علم و تصنیف اور ترجمے کا بہت کام کیا۔ اپنے وطن ___ بدایوں ___ سے انھیں بڑا پیار تھا۔ بار بار رخصت لے کر وطن جاتے۔ انھیں معلوم تھا کہ بادشاہ ان کی رخصتوں پر ناراض ہوتا ہے مگر وہ اس کی پروا نہ کرتے۔ زندگی کے آخری دنوں میں بھی وطن گئے' وہیں وفات پائی اور وہیں پیوند خاک ہو گئے:

آخر گل اپنی خاک درمیکدہ ہوئی پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

بدایونی بڑے باکمال آدمی تھے۔ کمال خوب صورتی سے انھوں نے یہ کتاب لکھی اور عمدہ انداز سے اس میں اپنے معاصرین کا تذکرہ کیا' اور ان کی موت پر قلم کے ذریعے خون کے آنسو بہائے۔ لیکن افسوس ہے' بدایونی کی شان کے مطابق کسی نے ان کا افسوس نہ کیا۔ وہ اپنی کتاب میں مُردوں کو زندہ کر گئے' مگر ان کے عہد میں یا اس سے کچھ بعد خود ان کا تذکرہ کسی نے اس اسلوب سے نہ کیا کہ جس سے ان کی خوبیاں اجاگر ہو سکیں۔ حالات نے نہ ان کی زندگی میں ان کا ساتھ دیا' نہ ان کے بعد کچھ عرصے تک ان سے توافق کی کوئی صورت پیدا ہو سکی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمال و عمدگی کو عام طور پر وہ درجہ نہیں دیا جاتا' جس کا وہ درحقیقت مستحق ہوتا ہے۔ بدایونی نے بلاشبہ شہرت پائی لیکن موت کے کچھ عرصہ بعد۔! حالات آہستہ آہستہ ایسے قالب میں ڈھلے کہ اس دور کی صحیح تصویر کو سامنے لانے کے لیے صرف انھی کی کتاب ___ منتخب التواریخ ___ کو بنیادی اور اصل مآخذ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

Marfat.com

بدایونی کا مدفن اور اولاد:

ملا عبدالقادر بدایونی بدایوں کے قریب مدفون ہیں۔ ان کے مدفن اور اولاد کے بارے میں آج سے سو برس پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے دربارا کبری میں خوشگو کے تذکرے کے حوالے سے لکھا تھا:

(بدایونی) باغ انبہ واقع عطاپور نواح بدایوں میں دفن ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ اس وقت یہ نام اور مقام ہوں گے۔ اب شہر سے دور ایک کھیت میں تین چار قبریں ہیں، ان پر تین چار درخت آم کے ہیں، اور یہ ملا کا باغ کہلاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انہی میں ملا صاحب کی قبر بھی ہے۔ غالبًا خوشگو کے بعد یہ مقام کبھی ملا کا باغ بھی کہلایا ہوگا۔ عطاپور اور باغ انبہ کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ البتہ جس محلے میں ان کے گھر تھے اب بھی لوگوں میں زبان زد ہے، اور پتنگی ٹیلہ کہلاتا ہے۔ سید بارہ میں ہے، مگر ٹیلہ یا گھر کا اثر آثار کچھ نہیں۔ وہاں کے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ (ملا عبدالقادر بدایونی کی) اولاد کا سلسلہ ایک بیٹی پر ختم ہو گیا تھا اور اس کی نسل خیر آباد علاقہ اودھ میں باقی ہے[1]۔

ملا عبدالقادر بدایونی کے واقعات سے متعلق ضروری مواد ان صفحات میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے اور بھی بعض باتیں ان کی تصنیف منتخب التواریخ میں مرقوم ہیں، مگر خوف طوالت سے انھیں ترک کر دیا گیا ہے۔

۳۳۔ شیخ عبدالقادر بخاری اکبر آبادی

شیخ عبدالقادر بخاری اکبر آبادی، اپنے عصر کے فاضل کبیر اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ اکبر آباد (آگرہ) میں ان کا درس و افادے کا سلسلہ جاری تھا۔ طریقت و تصوف سے بھی تعلق تھا اور مشائخ قادریہ میں سے گردانے جاتے تھے۔ ان سے علما و مشائخ کی ایک بڑی جماعت نے استفادہ و استفاضہ کیا: ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء کو اکبر آباد میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے[2]۔ اسلامی ہند کے گیارھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

۳۴۔ مفتی عبدالقدوس امروہی

مفتی عبدالقدوس بن عبدالغفور بن عبدالملک حسینی امروہی، ہندوستان کے صوبہ یو۔ پی کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ عالم باعمل تھے۔ ان کے والد مفتی عبدالغفور امروہی بھی عالم دین تھے۔ مفتی عبدالقدوس نے علم فقہ کی تحصیل انہی سے کی، اور ان کی وفات کے بعد ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کو مسند افتا پر متمکن

---

[1] دربارا کبری۔ ص: ۴۶۱۔

[2] خزینۃ الاصفیا۔ ص ۱۵۲۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۴۰۔

Marfat.com

ہوئے۔ ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ غالباً وفات بھی اسی سال ہوئی' اسی سال ان کے بیٹے مفتی محمد شاہد ان کی جگہ مسند افتا پر بیٹھے ❶۔

۳۵- ملا عبدالکریم پشاوری

ملا عبدالکریم بن اخوند درویزہ پشاوری' شیخ اور عالم وفقیہ تھے۔ واعظ اور مبلغ علمائے دین میں سے تھے۔ طریقت سے بھی تعلق تھا اور اس سلسلے میں شیخ علی غواص ترمذی سے فیض یافتہ تھے' ان کے والد اخوند درویزہ بھی ان ہی سے مستفیض تھے۔ جامع طریقت وحقیقت تھے۔ ان کے والد اخوند درویزہ پشاوری بھی بہت بڑے عالم تھے۔ ❷ دادا کا نام اخون گدا تھا' یہ بھی عالم تھے' لیکن ملا عبدالکریم تو علم وفضل میں اونچے مرتبے کے حامل تھے۔ خلاصۃ البحر میں انھیں ''محقق افغانستان'' کا خطاب دیا گیا ہے۔ ان کے والد بزرگ وار اخوند درویزہ کی تصنیفات میں سے ایک کتاب مخزن الاسلام ہے' اس کے دو باب جو حقائق و معارف سے متعلق ہیں' انہی ملا عبدالکریم پشاوری کے تصنیف کردہ ہیں۔ ان ابواب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ صاحب دل بزرگ تھے' اونچے ذوق وشوق کے حامل اور روحانی مرتبے پر فائز تھے۔ والد محترم کی طرح ظاہری اور باطنی علوم سے آراستہ تھے اور انہی کی طرح شعر بھی کہتے تھے۔ اشعار میں انھوں نے اخوند کریمیہ کا لقب اختیار کیا ہے' اور زیادہ تر اسی لقب سے مشہور ہیں۔

ملا عبدالکریم پشاوری اپنے والد اخوند درویزہ کی طرح بہت بڑے مبلغ و واعظ بھی تھے۔ انداز وعظ وتبلیغ موثر اور میٹھا تھا۔ باپ کی طرح ان سے بھی بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا اور تعلیم دین سے آراستہ ہوئے۔ گیارھویں صدی ہجری میں افغانوں میں انھوں نے اسلام کی بے حد تبلیغ کی اور لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو احکام دین سے روشناس کرایا۔ عہد شاہ جہانی میں یہ دونوں باپ بیٹا ___ اخوند درویزہ اور ملا عبدالکریم پشاوری ___ افغان قبائل میں اسلام کے نامور داعی اور دین حق کے مبلغ تھے۔

ملا عبدالکریم پشاوری نے ۱۰۷۲ھ کو وفات پائی اور یوسف زئی علاقے میں مدفون ہوئے ❸۔

۳۶- مولانا عبدالکریم سلطان پوری لاہوری

گیارھویں صدی ہجری میں برصغیر کے دوسرے بلاد وامصار کی طرح لاہور بھی علم وفضل کا مرکز تھا۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۴۱۔ بحوالہ نخبۃ التواریخ۔

❷ تفصیل کے لیے دیکھیے: فقہائے ہند۔ ج ۴' ص ۱۶۵ تا ۱۷۵۔

❸ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۳۱۔ حدائق الحنفیہ۔ ص ۴۱۷۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۴۲۔ خزینۃ الاصفیا۔ ص ۴۷۹۔ ادبیات سرحد۔ ص ۱۵۳۔ رود کوثر۔ ص ۴۱۹۔ معارج الولایت۔ ج ۲، ص ۱۳۶۔

Marfat.com

اس میں جن علمائے کرام کے درس و افادہ کا سلسلہ جاری تھا' ان میں مولانا عبدالکریم بن عبداللہ بن شمس الدین سلطان پوری لاہوری کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ یہ درحقیقت سلطان پور کے رہنے والے' جو مشرقی پنجاب کے علاقہ کپورتھلہ میں ایک قصبہ ہے۔ بعد کو لاہور چلے گئے تھے' اس لیے دونوں شہروں کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ سلطان پوری بھی کہلائے اور لاہوری بھی۔!

مولانا عبدالکریم سلطان پوری' دسویں صدی ہجری کے مشہور عالم مولانا عبداللہ سلطان پوری کے صاحب زادہ گرامی قدر تھے۔ مولانا عبداللہ نے ہندوستان کے چار عظیم الشان بادشاہوں ــــــ نصیر الدین ہمایوں' شیر شاہ سوری' سلیم شاہ سوری اور جلال الدین اکبر ــــــ کا زمانہ پایا تھا۔ ان بادشاہوں کے نزدیک ان کو بڑی عزت و منزلت حاصل تھی اور ان کے عہد میں یہ صدر الاسلام اور شیخ الاسلام کے منصب رفیع پر فائز رہے تھے۔ بہت بڑے عالم اور ملک کی عظیم شخصیت تھے۔ جلال الدین اکبر کے عہد میں ان کو زوال ہوا' اور اسی عہد میں انتقال کیا ❶۔

مولانا عبدالکریم سلطان پوری نے کتب درسیہ اپنے والد بزرگ وار مولانا عبداللہ سلطان پوری سے پڑھیں اور طریقت کے منزلیں شیخ نظام الدین بن عبدالشکور تھانیسری کی خدمت میں رہ کر طے کیں۔ مولانا عبدالکریم لاہوری اپنے والد کی وفات کے بعد لاہور میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے لاہور میں یہ فقہ و اصول کے جید عالم اور علوم عربیہ کے ماہر استاد تھے۔ شیخ وقت اور صالح بزرگ تھے۔ دو مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ پہلی مرتبہ اپنے والد مولانا عبداللہ سلطان پوری کے ساتھ' دوسری مرتبہ ان کی وفات کے بعد۔!

تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ فصوص الحکم کی فارسی زبان میں شرح لکھی۔ ایک رسالہ ''اسرار العجیبہ'' کے نام سے سپرد قلم کیا جو افکار و اشغال پر مشتمل ہے۔

مولانا عبدالکریم سلطان پوری لاہوری نے ۲۷ر رجب ۱۰۴۵ھ/ ۲۷ر دسمبر ۱۶۳۵ء کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

۳۷- مفتی عبدالکریم گجراتی

عبدالکریم بن محب الدین بن علاء الدین خرقانی نہروالی گجراتی مفتی بہاء الدین ابوالفضائل مکی' دو شنبہ کے روز ۱۹ شوال ۹۶۱ھ/ ۱۷ر ستمبر ۱۵۵۴ء کو علاقہ گجرات کے شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے۔ یہ درحقیقت نہروالا

❶ ان کے حالات میں تفصیل کے لیے دیکھیے: فقہائے ہند- ج ۳۔

❷ خزینۃ الاصفیا- ص ۴۷۰ ۱۷ '۴- تذکرہ علمائے ہند- ص ۱۳۱- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۲۳۔

Marfat.com

کے باشندے تھے، جو صوبہ گجرات کا ایک شہر ہے۔ ان کا گھر نہروالا میں علم وفضل کا مرکز اور طریقت وتصوف کا گہوارہ تھا۔ ان کے جدامجد علامہ علاؤالدین نہروالی دسویں صدی ہجری کے اعیان ہند میں سے تھے۔

مفتی عبدالکریم اپنے والد گرامی شیخ محبّ الدین کے ساتھ مکہ مکرمہ گئے اور وہیں نشوونما پائی۔ بڑے ہوئے تو اپنے عم محترم مفتی قطب الدین نہروالی سے وابستہ ہو گئے۔ ان سے علم فقہ کی تحصیل کی اور بعض دیگر علوم کی کتابیں پڑھیں۔ شیخ عبداللہ سندھی اور علامہ شہاب الدین احمد ابن حجر ہیثمی سے صحیح بخاری پڑھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کے علمی جوہر چمکے اور حلقہ اہل علم میں اپنے عصر کے منفرد عالم اور صاحب فضل وکمال قرار پائے۔ اسی وجہ سے ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء کو مکہ مکرمہ کی مسند افتا پر متمکن ہوئے۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کے لگ بھگ منصب خطابت بھی ان کے سپرد ہوا، اور مکہ معظّمہ کے مدرسہ سلطانیہ مرادیہ کے ناظم بھی مقرر کیے گئے۔

مفتی عبدالکریم گجراتی صاحب تصنیف بھی تھے۔ انھوں نے بعض نہایت عمدہ کتابیں لکھیں، جن میں صحیح بخاری کی شرح بھی شامل ہے، جو ''النہر الجاری علی البخاری'' کے نام سے موسوم ہے۔ افسوس ہے، لائق شارح یہ کتاب مکمل نہ کر پائے۔ دوسری اہم کتاب "الاعلام باعلام بيت الله الحرام" ہے۔ یہ اس موضوع سے متعلق تاریخ کی ایک مختصر سی کتاب تھی جو ان کے چچا مفتی قطب الدین محمد نہروالی نے سپرد قلم کی تھی، مفتی عبدالکریم نے اس میں بہترین اضافے کیے اور بہت سی عمدہ باتیں شامل کیں۔ اس کے بعد اس نام سے یہ کتاب اہل علم کے سامنے آئی۔ یہ کتاب کتب حوالہ میں سے ہے اور اپنے موضوع میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی تصنیف سے وہ یک شنبہ کے روز ۱۹/شعبان ۱۰۰۰ھ/۲۱/مئی ۱۵۹۲ء کو فارغ ہوئے۔

مفتی عبدالکریم گجراتی کو تحقیق مسائل اور فہم وادراک میں امام کی حیثیت حاصل تھی۔ حافظہ تیز اور ذہن اخاذ تھا۔ زبان میں بے حد اثر تھا۔ تحمل اور نرمی سے بات کرتے تھے۔ مطالعے کا دائرہ وسیع تھا۔ فقہ کے عالم، اس کے احکام وقواعد سے باخبر اور مسائل فقہ میں مختلف ائمہ کی آرا اور اختلافی گوشوں سے آگاہ تھے۔

ادب میں دسترس رکھتے تھے اور اس کے نکات وغوامض کی زلف گرہ گیر کو سلجھانے اور اس کی باریکیوں کی عقدہ کشائی میں اپنے دور کے معروف عالم تھے۔ اخبار ووقائع، احوال علما اور تاریخ ورجال پر بھی نظر تھی اور اس سلسلے کے بے شمار واقعات متحضر تھے۔ گفتگو کرتے اور زبان کو حرکت دیتے تو مسائل کی پیچیدہ گرہیں کھلتی چلی جاتیں۔

اس ہندی عالم نے چہار شنبہ کے روز ۱۵/ذی الحجہ ۱۰۱۴ھ/۱۳/اپریل ۱۶۰۶ء کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور قبرستان جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے[1]۔

---

[1] خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر- ج ۳، ص ۸- نیز دیکھیے: الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام- نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۴۴، ۲۴۵-

Marfat.com

ان کے استاد مفتی قطب الدین محمد نہر والی لاہوری:

مفتی عبدالکریم گجراتی کے حالات کی مناسبت سے یہاں ان کے استاد محترم مفتی قطب الدین محمد کے حالات بھی درج کیے جاتے ہیں' جو عثمانی سلاطین کے محبوب عالم دین تھے۔ ان کے حالات پروفیسر ظہور احمد اظہر (اورینٹل کالج لاہور) نے ماہنامہ "المعارف" لاہور (بابت جون ۱۹۷۰ء) میں تحریر کیے تھے' وہیں سے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

لاہور کے مردم خیز خطے نے عربی زبان اور اسلامی علوم کے جن نامور فضلا کو جنم دیا' ان میں سے ایک مولانا مفتی قطب الدین محمد لاہوری بھی تھے۔ وہ علوم الحدیث کے نامور' ثقہ اور مستند امام اور اسلامی تاریخ اور علوم اسلامیہ کے جلیل القدر عالم ہونے کے علاوہ عربی ادب کے ماہر اور ایک عمدہ شاعر بھی تھے۔ مفتی صاحب کا شمار بجا طور پر امام حسن صغانی لاہوری اور اس قبیل کے دیگر جلیل القدر علما و فضلا میں کیا جا سکتا ہے' جو لاہور میں پیدا ہوئے اور پھر علوم و معارف کی تلاش میں دیار عرب گئے اور عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم کی تاریخ میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔

مفتی قطب الدین محمد ۹۱۷ھ (۱۵۱۱ء) میں لاہور میں پیدا ہوئے ❶ اور یہیں اپنے والد مولانا ابوالعباس علاء الدین احمد نہر والی سے عربی و اسلامی علوم کی متداول کتابوں کی ابتدا کی۔ پھر ان کے ہمراہ حجاز چلے گئے' جہاں ایک طویل مدت تک ان کا خاندان مکہ مکرمہ میں تدریس اور افتا کے اعلیٰ منصب پر فائز رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کا خاندان خالص عربی خاندان تھا جو عدن سے ہجرت کر کے بلاد گجرات میں وارد ہوا اور وہاں کے مشہور شہر نہر والا میں مقیم ہو گیا تھا۔ ان کے بزرگوں کے نام یہ ہیں۔ مفتی قطب الدین محمد بن علاء الدین احمد بن شمس الدین محمد بن محمود قاضی خاں بن بہاء الدین بن یعقوب بن اسماعیل بن علی بن القاسم بن محمد بن ابراہیم بن اسماعیل حنفی خرقانی لاہوری ثم مکی' جو القطب النہر والی یا قطب الدین نہر والی کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے۔ مفتی قطب الدین محمد کے پردادا شیخ محمود الملقب بہ قاضی خاں قاضی کے منصب پر فائز تھے' پھر نا معلوم اسباب کی بنا پر ان کے والد لاہور آ گئے' اور یہاں سے حجاز چلے گئے تھے ❷۔

یوں تو مفتی قطب الدین کے آبا و اجداد علم و فضیلت کے مالک تھے ہی مگر ان کے والد کو یہ خصوصی شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے عہد کے ثقہ اور مستند محدث تھے۔ اسی طرح ان کی والدہ ماجدہ خسران بنت شیخ شمس الدین محمد بن عمرو الانصاری الشافعی بڑی زاہدہ و پاک دامن خاتون تھیں اور اپنے عہد کے ثقہ راویان حدیث میں شمار ہوتی تھیں ❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر۔ ج ۴' ص ۲۸۶۔ فہرس الفہارس۔ ج ۲' ص ۳۰۲۔

❷ نزہۃ الخواطر۔ ج ۴' ص ۲۸۶۔ فہرس الفہارس۔ ج ۲' ص ۳۰۲۔ نیز دیکھیے: Huart A History of Arabic Literature, P.377

❸ فہرس الفہارس۔ ج ۲، ص ۳۰۰

Marfat.com

مفتی قطب الدین کے والد علاء الدین احمد بن محمد نہروالی ثم مکی اپنے عہد کے جلیل القدر محدث اور عالم تھے۔ صاحب فہرس الفہارس نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں "خاتمة المحدثین ومفتی المسلمین ❶ کے القاب سے یاد کیا ہے۔ وہ ۸۷۰ھ/۱۴۶۶ء میں نہر والہ صوبہ گجرات میں پیدا ہوئے اور اپنے عہد کے علما سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ پھر نہر والہ سے لاہور آئے اور یہاں سے حجاز تشریف لے گئے، جہاں انھوں نے شیخ عزالدین عبدالعزیز اور دیگر علمائے حجاز سے حدیث کی سند لی اور ایک مدت تک مکہ میں احمد شاہ گجراتی کے مدرسے میں تدریس کے منصب پر فائز رہے۔ مفتی قطب الدین نے خود اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ بیت اللہ کے جوار میں قیام کے دوران ان کا یہ معمول تھا کہ یوم النحر کو جمرۃ العقبہ میں رمی کرنے کے بعد فوراً مکہ آجاتے۔ حطیم میں بیت اللہ کے سامنے بیٹھ جاتے۔ طواف کرنے والوں کو دیکھتے جاتے اور نماز مغرب تک اسی حالت میں بیٹھے رہتے۔ پھر مغرب کی نماز کے بعد سعی کرتے اور منی کو لوٹ جاتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ہر سال اولیاء اللہ میں سے کوئی نہ کوئی حج کو ضرور آتا ہے۔ وہ اس موقعے پر سب سے افضل کام کرے گا اور وہ ہے یوم النحر کے شروع میں طواف زیارت کرنا۔ میں اسی لیے یہاں بیٹھ جاتا ہوں تاکہ میں ان میں سے کسی کو طواف کرتے ہوئے دیکھ لوں یا ان کی نظر مجھ پر پڑے جو میرے لیے برکت اور سعادت کا باعث ہو ❷۔ شیخ علاء الدین آخر عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے۔ مگر انھوں نے پھر بھی یہ معمول ترک نہ کیا۔ ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء میں ان کی وفات ہوئی۔ بقول صاحب 'نزہۃ الخواطر' وہ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے ❸۔

ایسے والدین کے ہاں جو بچہ پیدا ہوگا، اس کے علم وزہد اور تقوی وفضیلت کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ مفتی قطب الدین نے اپنے والدین کے علاوہ دیار عرب کے دوسرے جلیل القدر فضلا سے علوم اسلامیہ کی سند لی جن میں شیخ احمد محبّ الدین بن محمد العقیلی النویری المکی، شہاب الدین احمد بن موسیٰ المغربی المصری، زین الدین علی القرمانی، جمال الدین محمد الخرقانی، عبدالعزیز بن جمال الدین العباسی القطبی الشافعی، شیخ عبدالحق سنباطی المصری، محمد بن محمد بن عبدالرحمٰن الحطاب المالکی اور شیخ عبدالرحمٰن بن علی الربیع الشیبانی الزبیدی شامل ہیں ❹۔

مفتی قطب الدین کے اساتذہ میں سے ایک حافظ نورالدین ابوالفتوح احمد بن عبداللہ الطاؤسی

---

❶ فہرس الفہارس - ۲: ۳۰۲ -

❷ الاعلام بالاعلام بیت اللہ الحرام -

❸ نزہۃ الخواطر - ج ۴، ص ۲۶

❹ تفصیل کے لیے دیکھیے: نزہۃ الخواطر - ج ۴ ص ۲۸۵ - النور السافر - ص ۲۱۲، ۲۳۶ - البدر الطالع - ۱: ۳۳۶ - الاعلام - ۷: ۲۸۷ - شذرات الذہب - ۸: ۲۸۵ -

Marfat.com

الشیرازی الخرقانی بھی ہیں، جو معمر محدثین یعنی طویل عمر پانے والے محدثین میں سے تھے اور خراسان کے ان صوفیا کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جو "طائفہ طاؤسیہ خرقانیہ" کہلاتا تھا ❶۔ حافظ ابوالفتوح نامور صوفی اور محدث تھے۔ انھوں نے شیخ بابا یوسف ہروی سے حدیث سنی تھی جو "سہ صدہا" یعنی تین سو سالہ کے لقب سے مشہور تھے۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں ان کا تذکرہ اکثر ملتا ہے۔ مفتی قطب الدین لاہوری نے حافظ ابوالفتوح سے اپنے والد کے واسطے سے بھی روایت کی ہے اور براہ راست بھی۔ انھیں اس طریق اسناد حدیث پر بڑا فخر تھا، کیونکہ اس طرح وہ تساعی حدیث کا راوی ہونے کا شرف حاصل کرتے ہیں اور تساعی حدیث وہ ہے جس میں ایک محدث اور آنحضرت ﷺ کے درمیان آٹھ واسطے ہوں اور نواں وہ خود محدث ہو۔ اس سند کا متصل سلسلہ یوں ہے: قطب الدین محمد لاہوری عن الحافظ ابی الفتوح عن شیخ یوسف ہروی عن محمد بن شاد بخت الفارسی عن یحیی بن عمار الختلانی عن محمد بن یوسف الفربری عن محمد بن اسماعیل البخاری صاحب الجامع الصحیح ❷۔

مفتی صاحب نے تحصیل علوم کی خاطر مصر کا سفر بھی کیا تھا۔ اس سفر کے دوران انھوں نے جلال الدین سیوطی کے تلامذہ سے اکتساب فیض کیا۔ اسی طرح قاضی زکریا انصاری اور حافظ عبدالحق سنباطی سے بھی حدیث کی سند حاصل کی۔ یہ دونوں حافظ ابن حجر عسقلانی کے مشہور شاگرد تھے ❸ سفر مصر کے دوران مفتی قطب الدین کو ایک اور اہم شخصیت سے ملاقات اور اجازت روایت کا شرف حاصل ہوا اور وہ تھے المتوکل الثالث محمد بن یعقوب العباسی جو بنو عباس کے ان برائے نام خلفا میں سب سے آخری خلیفہ تھے جو سقوط بغداد کے بعد مصر کے مملوکوں کے زیر اثر ایک مدت تک مسند خلافت پر فائز رہے اور بالآخر سلطان سلیم ثانی کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے تھے۔ یہ محمد بن یعقوب خلیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ ادیب، عالم اور اچھے شاعر بھی تھے ❹۔

مفتی صاحب نے اپنے سفر مصر اور عباسی خلیفہ متوکل ثالث محمد بن یعقوب سے اپنی ملاقات کے کوائف اپنی کتاب الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ❺ میں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"سلطنت عثمانیہ کے عہد تک اس عباسی خلافت کا نام باقی رہا اور خلیفہ یعقوب جس کا نام المستمسک باللہ تھا، سلطان سلیم خاں عثمانی کے عہد تک زندہ تھا۔ اگرچہ بوڑھا ہو گیا تھا اور بینائی جاتی رہی تھی۔ مستمسک باللہ

---

❶ دیکھیے: فہرس الفہارس-۲:۴۶۷، ۳۰۴-

❷ نزہۃ الخواطر-۴:۲۸۶-فہرس الفہارس-۲۹۹-الاعلام-ص ۴ بعد

❸ شذرات الذہب-۸:۹، ۱۷-فہرس الفہارس-۲:۳۰۰-

❹ تاریخ ابن ایاس-۴:۱۴۰-الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام-ص ۱۸۴-

❺ ۱۸۴ بعد-

Marfat.com

۹۶۷ھ/۱۵۶۰ء میں فوت ہو گیا تو اس کے بعد اس کا بیٹا محمد بن یعقوب جانشین مقرر ہوا اور متوکل علی اللہ لقب اختیار کیا۔ سلطان سلیم نے جب مصر فتح کر کے چرکسی مملوکوں کا خاتمہ کر دیا تو متوکل کو اپنے ساتھ استنبول لے گیا۔ سلطان کی وفات کے بعد متوکل کو مصر آنے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں اپنی وفات تک وہ مصر میں مقیم رہا۔ مفتی قطب الدین کے بقول متوکل عالم و فاضل اور شاعر تھا۔ اس کے یہ دو شعر ہیں۔

لم یبق من محسن یرجی ولا حسن ولا کریم الیہ مشتکی الحزن

وانما ساد قوم غیر ذی حسب ماکنت او ثران یمتد بی زمنی

(نہ کوئی محسن باقی رہا جس سے کہ اچھائی کی امید ہو سکے اور نہ کوئی شریف باقی رہا ہے جس سے کہ رنج والم کا شکوہ کر سکیں۔

اب تو حال یہ ہے کہ غیر شریف لوگ سردار بن گئے ہیں' اس لیے مجھے ہرگز گوارا نہ تھا کہ میری عمر لمبی ہو۔)

خلفیہ سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مفتی صاحب لکھتے ہیں (۱) ''۹۴۳ھ/ ۱۵۳۷ء میں جب میں حصولِ علم کی خاطر مصر گیا تو میں ان (متوکل ثالث) سے بھی ملا اور ان سے بہت کچھ اخذ کیا۔ اس زمانے میں مصر میں بڑے بڑے عالم و فاضل لوگ موجود تھے اور مشائخ کرام کی برکات بھی وہاں عام تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے مصر ایک دلہن ہے جو آفتاب و مہتاب اور ستاروں کے جھرمٹ میں رواں ہے:

ثم انقضت تلک السنون و اہلہا فکانہا و کانہم احلام

(پھر وہ زمانہ بھی بیت گیا اور اہل زمانہ بھی۔ اب یوں لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک خواب تھا۔)

مفتی قطب الدین ترکوں کے محبوب عالم دین تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ترکوں کے دلوں میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے خلوص و محبت کے جو جذبات پائے جاتے ہیں' ان کا ایک بہت بڑا سبب ہمارے علمائے دین تھے، جنھوں نے ہر مرحلے پر عثمانی ترکوں کی امداد و حمایت کو اپنے ایمان کا جزو سمجھا۔ ہر مشکل میں ان کے ساتھ رہے اور ان کی زبانی' قلمی اور مالی معاونت کرتے رہے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ ''ہندی'' علما جو ترکی خلافت کے زمانے میں حرمین میں جا کر مقیم ہو گئے اور سلاطین آل عثمان کی خیر خواہی اور فتح و نصرت کے لیے ہر وقت دست بدعا رہے۔ مفتی قطب الدین بھی علما کے اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ترکوں کے دلوں میں جو قدر و منزلت پنہاں تھی' اس کا اندازہ امام شوکانی ایسے جلیل القدر محدث اور مورخ کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے مفتی قطب الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھے ہیں: ''ترکوں کے ہاں انھیں بہت بڑی عزت اور منزلت حاصل تھی۔ ترک زعما و قائدین میں سے جب بھی کوئی حج کو آتا تو ان سے ملے بغیر واپس نہ لوٹتا۔ وہ مفتی صاحب کے مقابلے میں اور کسی عالم کو پسند نہ کرتے تھے۔ اور انھیں بڑے بڑے عطیات

---

(۱) الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام۔ ص ۱۸۵۔

Marfat.com

سے نوازتے تھے۔ وہ ان گراں قدر عطیات سے نفیس قسم کی کتابیں خریدتے اور ضرورت مندوں کو دیتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس جو ذخیرۂ کتب جمع ہوگیا تھا شاید ہی کسی اور عالم کے پاس ہو[1]۔"

خود مفتی صاحب کو ترکوں سے قلبی لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہوسکتا ہے:[2] حق و صداقت کی تلواریں صرف چار ہیں۔ ان کے علاوہ ہر تلوار آتش جہنم کے قابل ہے۔ ایک وہ شمشیر رسالت جو مشرکین کے خلاف اٹھی۔ دوسری وہ شمشیر صدیقی جو مرتدین و مانعین زکوۃ کے خلاف نیام سے باہر آئی۔ تیسری شمشیر علوی جو باغیوں کی سرکوبی کے لیے بے نیام ہوئی۔ چوتھی شمشیر حق وہ ہے جو مسلمانوں کا قصاص لینے کے لیے نیام سے نکالی جائے اور آل عثمان کی تلواریں ان چار اصناف سے باہر نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ روز اول سے آج تک کفار و مشرکین کے خلاف مصروف جہاد ہیں۔ ملحدوں اور باغیوں کے سرکچل رہے ہیں۔ اور دین اسلام کے شعائر اور مسلمانوں کی حفاظت و دفاع میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالی ان کی سلطنت کا سایہ مسلمانوں پر عام کرے۔ ان کے ذریعے اہل سنت کی تائید کرے اور ان کے سبب تمام ملحدین و مرتدین کا قلع قمع ہو۔ تمام فرق اسلامیہ کو یہ دعا کرنی چاہیے کیوں کہ یہ سلاطین آل عثمان اسلام کے ستون، دین متین کو قائم کرنے والے اور دنیا میں اسے عام کرنے والے ہیں۔ اس سلطنت شریفہ کے لیے دعا کرنا اصل میں تمام اہل اسلام کے لیے دعا کرنا ہے۔ اللہ تعالی کے دین کو عزت و سربلندی بخشنے اور سیدنا محمد ﷺ کے پیغام کی نصرت و امداد کرنے کے مترادف ہے۔"

ترک سلاطین سلیمان اعظم، سلطان سلیم خاں ثانی اور سلطان مراد خاں سے مفتی صاحب کے تعلقات رہے اور ان کی طرف سے انھیں وقتاً فوقتاً انعامات ملتے رہے۔ ۹۴۳ھ/۱۵۳۷ء میں جب وہ استنبول گئے تو سلیمان اعظم کے دربار میں باریابی حاصل ہوئی[3]۔ سلطان مراد خاں سے تو ان کے بڑے گہرے روابط تھے۔ اس نے اپنے عہد سلطنت میں بیت اللہ کی تعمیر و اصلاح کی طرف توجہ دی۔ مکہ معظمہ میں ایک اسلامی درس گاہ قائم کی اور مفتی صاحب کو مسند صدارت کا اعزاز بخشا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے ذاتی ملابس میں سے دو قیمتی شالیں ہدیۃً بھیجیں اور ایک سو دینار مقرر کیے[4]۔

ترک وزرائے اعظم میں سے ایاس پاشا، سنان پاشا، لطفی پاشا اور علی پاشا کے ساتھ مفتی قطب الدین صاحب کے ذاتی مراسم تھے۔ ۹۴۳ھ/۱۵۳۷ء میں جب انھیں استنبول کا پہلا سفر پیش آیا تو ایاس پاشا اس وقت سلیمان اعظم کا وزیر اعظم تھا، اور مفتی صاحب کے والد مولانا احمد علاء الدین سے خط و کتابت رکھتا تھا۔ استنبول میں قیام کے دوران اس نے مفتی صاحب کی بڑی قدر و منزلت کی اور خلیفہ سے ان کی ملاقات

[1] البدر الطالع -۲:۵۷-

[2] الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام -ص ۳۸۸-

[3] الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام -ص ۲۹۹-

[4] الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام -ص ۴۱۶-

Marfat.com

بھی کرائی۔ ❶ سنان پاشا تو مفتی صاحب کا محبوب رہنما تھا۔ اس نے کئی ایک ممالک فتح کیے تھے، جن میں تونس اور یمن بھی شامل تھے۔ ❷ لطفی پاشا بہت بڑا فقیہ اور عالم تھا۔ ۹۴۹ھ/۱۵۴۳ء میں جب وہ حج کے لیے آیا تو مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی اور ترکی زبان میں اپنی کتاب شرح فقہ اکبر انھیں دکھائی اور ساتھ ہی درخواست کی کہ اس شرح کو فارسی اور عربی زبانوں میں ڈھال دیا جائے۔ مفتی صاحب نے یہ کام بطیب خاطر انجام دیا اور انعام سے نوازے گئے۔ ❸ ۹۶۵ھ/۱۵۵۸ء میں جب مفتی صاحب دوسری مرتبہ استنبول گئے تو اس وقت علی پاشا وزیر اعظم تھا۔ ملاقات کے دوران اس نے مفتی صاحب کو اپنی بعض فتوحات کے واقعات سنائے۔ اس پر انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ جس طرح قدیم سے مسلم سلاطین کی فتوحات کو تاریخ میں محفوظ کیا جاتا رہا ہے اس طرح ان عثمانی فتوحات کو بھی ایک کتاب میں محفوظ کر دینا ضروری ہے کیونکہ گردش ایام کے ساتھ یہ واقعات انسانی یادوں سے محو ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ عربی دیوان الانشا کے سربراہ مولانا علی چلپی الحمیدی کو اس کام پر مامور کیا گیا مگر مفتی صاحب کو افسوس ہے کہ یہ کام تکمیل پذیر نہ ہو سکا ❹۔

مفتی قطب الدین ایک مدت تک مکہ مکرمہ میں درس و تدریس اور روایت حدیث میں مشغول رہے۔ مکہ مکرمہ میں احمد شاہ والیٔ گجرات کے قائم کردہ مدرسہ میں انھوں نے پڑھا بھی اور پڑھایا بھی۔ وہ سلیمان اعظم کے مکہ مکرمہ میں قائم کردہ مدرسہ سلیمانیہ میں بھی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور جب سلطان مراد خاں کا زمانہ آیا تو اس نے جہاں ان کے مشاہرے میں اضافہ کیا وہاں مکہ مکرمہ کا مفتی اعظم بھی مقرر کیا۔ اپنی وفات تک وہی یہ دونوں فریضے انجام دیتے رہے۔ مفتی صاحب کی وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شوکانی ❺ نے ان کی تاریخ وفات ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء بتائی ہے اور لکھا ہے کہ ان کی تاریخ وفات اس جملے سے نکلتی ہے: "قدمات قطب الدين اجل علماء مكة۔" النور السافر کے مصنف نے بھی تاریخ وفات یہی لکھی ہے۔ ❻ ڈاکٹر زبید احمد ❼ اور جرجی زیدان ❽ نے بھی اسی کا تتبع کیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۹ء میں جب سلطان مراد نے اہل مکہ کے لیے انعامات و عطیات ارسال کیے تو مفتی صاحب کو اپنے ذاتی توشہ

---

❶ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام۔ ص ۲۹۹۔

❷ ایضاً۔ ص ۳۶۶۔

❸ ایضاً۔ ص ۳۰۰۔

❹ ایضاً۔ ص ۳۰۴۔

❺ البدر الطالع۔ ۲: ۵۸۔

❻ النور السافر۔ ص ۳۸۳۔

❼ Contrribution of India to Habic Literature. p.444

❽ تاریخ اداب اللغۃ العربیۃ۔ ۳: ۳۳۱۔ دیکھیے فہرس الفہارس ۲: ۳۰۲۔

Marfat.com

خانے میں سے دو شالیں بھی ارسال کی تھیں اور اس کا ذکر کرتے ہوئے مفتی صاحب نے اپنی تاریخ مکہ (الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ص ۴۱۶) میں اس بات کو مفصل طور پر بیان کیا ہے اور صاحب نزہتہ الخواطر (۲۸۹:۴) نے بھی اس بیان پر اعتماد کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مفتی قطب الدین لاہوری کی وفات ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۹ء میں ہوئی ❶۔

مفتی صاحب کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ دسویں صدی ہجری میں جو عظیم محدثین ہوئے ہیں' ان میں مفتی قطب الدین لاہوری ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اس دور میں حدیث کی جو اعلیٰ سند انھیں نصیب تھی' وہ اور کسی عالم کو حاصل نہ تھی۔ اور جو طریقہ انھوں نے حدیث کی روایت کا اخذ کیا وہ ابن حجر کی نظروں سے بھی اوجھل تھا اور اس پر مفتی قطب الدین کو بجا طور پر فخر تھا ❷۔ ان سے علما کی جس کثیر تعداد نے حدیث اخذ کی ہے' ان میں مولانا عبداللہ بن سعد اللہ لاہوری ثم مدنی' احمد الشناذی' محمد ابن العجل اور نورالدین ابن مطیر ایسے جلیل القدر محدثین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مراکش' تونس' الجزائر' مصر' عراق' شام' حجاز' ترکی' یمن اور برصغیر پاک و ہند کے بے شمار علما نے ان سے علم حدیث کی سند حاصل کی ❸۔

اس میں شک نہیں کہ مفتی قطب الدین کی اصل شہرت زیادہ تر ایک جلیل القدر محدث اور بلند پایہ فقیہ کی حیثیت سے تھی' لیکن بایں ہمہ وہ عربی زبان کے اچھے شاعر بھی تھے۔ اگرچہ ان کی شاعری نعت رسول (ﷺ)' ترک سلاطین اور وزرا کی مدح وستائش اور بعض دوستوں کے مرثیوں تک محدود تھی' مگر ان کی شاعری میں فصاحت و بلاغت اور لفظی اسلوب کے محاسن کے ساتھ معانی و افکار کی گہرائی اور ندرت کی چاشنی بھی موجود ہے۔ اس بات کا احساس خود مفتی صاحب کو بھی تھا۔ چنانچہ ترکوں کی فتوحات کے متعلق اپنی تاریخ البرق الیمانی فی فتح العثمانی کا آغاز انھوں نے اپنے ایک قصیدے سے کیا ہے۔ اس قصیدے کا ذکر وہ ایک جگہ ان الفاظ میں کرتے ہیں ❹۔

وکنت صدرت ذلك التاريخ بقصيدة طنانة من نظمى الطنان' سادت بها الركبان و تلقتها بالقبول ادباء علماء البلدان احببت ايرادها ههنا لبلاغتها عند علماء البيان و فصحاء اللسان' تسابق الفاظها و معانيها لى الآذان والا ذهان تسابق افراس الرهان يعد كل

❶ دیکھیے الاعلام ۶:۲۳۴۔ از خیر الدین زرکلی۔

❷ فہرس الفہارس ۲:۳۰۱۔

❸ تفصیل کے لیے دیکھیے: الامداد۔ ص ۵۷۔ الامم۔ ص ۴۔ ۵۔ قطف الثمر۔ ص ۱۳۔ اتحاف الاکابر۔ ص ۶۱۔ نزہتہ الخواطر۔ ج ۴: ۲۸۶ بعد۔ فہرس الفہارس ۲: ۲۹۹ بعد

❹ الاعلام باعلام بیت اللہ۔ ص ۳۶۶۔

Marfat.com

بيت منها بديوان و تسحب كل كلمة منها اذيال البلاغة على سحبان۔
(میں نے اپنی اس کتاب تاریخ کا آغاز اپنے ایک پرشکوہ قصیدے سے کیا ہے۔ یہ وہ قصیدہ ہے جسے قافلے لے کر دنیا کے ہر گوشے میں پہنچے اور جسے ہر جگہ کے ادبا و علما نے شرف قبولیت بخشا ہے۔ میں نے اس قصیدے کو یہاں نقل کرنا پسند کیا ہے کیونکہ علمائے بیان اور فصحائے لسان کے ہاں یہ بلند درجہ رکھتا ہے اور اس کے الفاظ گوش و ہوش کی طرف یوں سبقت کرتے ہیں جس طرح میدان مقابلہ میں دوڑنے والے گھوڑے۔ اس قصیدے کا ہر شعر دیوان کا درجہ رکھتا ہے اور ہر لفظ سحبان وائل کی بلاغت کو مات کرتا ہے۔)
اس قصیدے میں سلطان سلیم خاں کی مدح کے ساتھ سنان پاشا کو یمن کی فتح پر خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ مطلع یہ ہے۔

لك الحمد يا سوى فى السر والجهر
على عزة الاسلام والفتح والنصر

(اے خدا خفیہ و علانیہ حمد و ستائش تیرے ہی لیے ہے کہ تو نے اسلام کو عزت، فتح اور نصرت عطا کی۔)
سلطان سلیم کی مدح میں یہ دو شعر قابل ذکر ہیں:

شهنشاه سلطان الملوك جميعهم — "سليم" كريم اصله اطيب النحر
عماديلوذ المسلمون بظله — وسد منيع الانام من الكفر

(شہنشاہ یعنی دنیا کے تمام بادشاہوں کا بادشاہ سلیم جو بڑا کریم النفس ہے اور پاک نہاد ہے وہ ایک ستون ہے جس کے سایہ میں مسلمان پناہ لیتے ہیں اور ایک محفوظ بند ہے جو لوگوں کو کفر سے بچاتا ہے۔)
مفتی صاحب کے اشعار منتشر شکل میں موجود ہیں اور زیادہ تر ان کی اپنی تصانیف البرق الیمانی اور الاعلام میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے اشعار کے منتخب نمونے دیے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ عبدالقادر بن عبداللہ عیدروس (صاحب النور السافر) نے تو ان کے کلام کے بڑے نادر نمونے جمع کر دیے ہیں ❶۔

مفتی قطب الدین لاہوری نے کوئی ایک درجن کے قریب تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے ایک مکہ مکرمہ کی مفصل و مکمل تاریخ ہے۔ اس میں ضمنی طور پر کئی اہم تاریخی حوادث بھی قلم بند کر دیے گئے ہیں جو ایک نہایت ہی قیمتی تاریخی مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کا نام الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ہے اور یہ دو مرتبہ چھپ چکی ہے۔ دوسری اہم کتاب ترکوں کے غزوات و فتوحات کی تاریخ ہے اور اس کا نام ہے 'البرق الیمانی فی الفتح العثمانی' جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی اور اس کا خلاصہ چھپ چکا ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ مفتی

❶ النور السافر۔ ص ۳۸۳۔

Marfat.com

صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں اور ابھی تک تحقیق و اشاعت کی منتظر ہیں۔ (۱) منتخب التاریخ فی التراجم(۲) ابتہاج الانسان(۳) التماثل و المحاضرۃ بالابیات المفردۃ النادرۃ(۴) گراز الاسماء(۵) تحفۃ الاصحاب ونزہۃ ذوی الالباب(۶) الھدایۃ الرحمانیۃ الی طریقۃ السادۃ الخرقانیۃ(۷) تاریخ فتح تونس(۸) الفوائد النیۃ فی الرحلۃ المدینۃ والرومیۃ ❶۔

۳۸- شیخ عبداللطیف سندھی

شیخ عبداللطیف بدینی سندھی' فقہ واصول اور علوم عربیہ کے فاضل تھے۔ اچھے شاعر بھی تھے۔ ہر چھ ماہ بعد سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں جاتے اور اس کی خدمت میں ایک خاص قسم کی نرم ونفیس چٹائیوں کا جوڑا بطور تحفہ پیش کرتے۔ اس کے بدلے میں بادشاہ کی طرف سے بڑا اعزاز پاتے' جو ان کے علمی وقار کے مطابق ہوتا۔ ان کی حیثیت بادشاہ کے قابل احترام دوست کی تھی۔ جب بوڑھے ہو گئے تو اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے اس دوست کی کبر سنی اور ضعیفی کی بنا پر ان کا معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا تا کہ وہ اپنے وطن میں سکون کی زندگی بسر کریں اور کسی کی احتیاج باقی نہ رہے ❷۔

۳۹- شیخ عبداللہ سندیلوی

شیخ عبداللہ سندیلوی' ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر سندیلہ کے باشندے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن بہلول بن چاند بن جنید بن محمد بن برہان الدین بن عزالدین محمود بن نجم الدین احمد بن شمس الدین عثمان ہروی سندیلوی۔ شیخ عبداللہ نماز عصر کے وقت دوشنبہ کے روز ۱۲ ربیع الثانی ۹۰۴ھ/ ۲۷ نومبر ۱۴۹۸ء کو علاقہ اودھ کے شہر سندیلہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی نو سال کے بچے تھے کہ مخدوم شیخ صفی ساقی پوری کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے' اور سولہ سال کی عمر کو پہنچے تو حصول علم کا شوق دل میں موجزن ہوا' جو انھیں صوبہ یوپی کے ایک علمی مرکز گوپا مئو لے گیا۔ وہاں شیخ اللہ داد بن سعد اللہ عثمانی گوپاموی کی مسند تدریس آراستہ تھی' ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے اور ان سے صرف ونحو کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ گوپامئو سے بدایوں گئے اور بدایوں سے دہلی کا عزم کیا۔ دہلی میں شیخ معزالدین بخاری کے ہاں سکونت اختیار کی۔ وہاں مدرسہ دہلی میں لب' الارشاذ اور کافیہ کا درس لیا۔ دہلی سے حصار کا رخ کیا' وہاں مولانا برہان الدین ملتانی سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر ان کے ساتھ ہی گجرات روانہ ہو گئے اور اکثر علوم کی کتابیں اور تفسیر قرآن انہی سے پڑھیں۔ شرح

---

❶ ماہنامہ "المعارف" لاہور بابت ماہ جون ۱۹۷۰ء۔ مضمون پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

❷ تحفۃ الکرام- ص ۴۸۳- نزہۃ الخواطر- ج ۵'ص ۲۴۸-

Marfat.com

مواقف، شرح مقاصد اور ریاضی کے کچھ رسالوں کی تکمیل کے لیے مولانا وجیہ الدین علوی گجراتی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ ہدایۃ الفقہ، اصول بزدوی اور عضدی شیخ مبارک گوالیاری سے پڑھیں۔ حدیث اور اصول حدیث کا علم شیخ عبدالاول حسینی دولت آبادی سے حاصل کیا۔ فصوص اور اس کی شروح کی سند شیخ مصطفیٰ رومی سے لی۔

شیخ عبداللہ سندیلوی نے چوبیس سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم کی تحصیل سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد اخذ طریقت کا شوق پیدا ہوا تو شیخ محمد غوث شطاری گوالیاری کی خدمت میں گئے۔ شیخ محمد غوث نے اس کی سند اجازت ان کو ذی الحجہ کے مہینے میں ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء کو گجرات میں مرحمت فرمائی۔ دو سال تک وہ اس مسند پر فائز رہے اور مسترشدین کو فیض پہنچاتے رہے۔ بعد ازاں حرمین شریفین کا قصد کیا اور پانچ سال مدینہ منورہ میں اقامت گزین رہے۔ ان کی زندگی کے یہ پانچ سال زہد و عبادت اور معاملات دنیا سے علیحدگی وانزوا میں گزرے۔ اس اثنا میں وہ ہر سال سعادت حج سے بہرہ ور ہوتے رہے۔ پانچ سال کے قیام حجاز کے بعد مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور احمد آباد میں اقامت اختیار کی۔ وہاں شادی کی اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے شروع کر دیا جو پندرہ سال احمد آباد میں جاری رہا۔ پھر گوالیار چلے گئے اور تمام امور سے منقطع ہو کر قناعت و عفاف اور توکل و استغنا کی زندگی بسر کرنے لگے۔ کبھی امرا و اغنیا کے دروازے پر نہیں گئے اور نہ کسی دینوی معاملے میں کسی سے ملنے کی ضرورت محسوس کی۔

شیخ عبداللہ سندیلوی کے بیٹے شیخ عبدالنبی سندیلوی اکبر آبادی تھے، جو عالم و فاضل بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے والد گرامی ـــــ شیخ عبداللہ سندیلوی ـــــ کے ملفوظات اپنی کتاب جامع الکلم میں درج کیے ہیں۔

شیخ عبداللہ سندیلوی کی تصانیف یہ ہیں: سراج السالکین، کنزالاسرار فی اشغال الشطار، شرح رسالہ غوثیہ، اورادِ صوفیہ، انیس المسافرین، اسرار الدعوۃ، رسالۃ الصوفیہ۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم نے ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۰۱۰ھ/ ۹ دسمبر ۱۶۰۱ء کو آگرہ میں وفات پائی ❶۔

۴۰۔ سید شیخ عبداللہ حضرمی

سید شیخ عبداللہ حضرمی کا نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ بن حسین بن محمد بن علی بن احمد بن عبداللہ بن محمد بافقیہ حسینی حضرمی۔ یہ شافعی المسلک فقیہ تھے اور اپنے عصر کے کبار علمائے دین اور مشاہیر فضلائے کرام میں سے تھے۔ تریم میں پیدا ہوئے، عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو قرآن مجید حفظ کیا اور قرأت کی مشہور کتاب جزری زبانی

❶ اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار)۔ ص ۴۵۴ تا ۴۵۷۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۴۹، ۲۵۰۔

Marfat.com

یاد کی۔ اپنے والد گرامی ___ شیخ حسین ___ سے فقہ کی مروجہ کتابیں پڑھیں۔ علم حدیث اور علوم ادبیہ کی اکثر کتابوں کے لیے شیخ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن شہاب الدین کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ فقہ کی بعض کتابوں کی تحصیل شیخ عبدالرحمٰن بن علوی بافقیہ سے کی۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد اساتذہ سے اخذ علم اور کسب فیض کیا۔ متعدد مشائخ سے تصوف کی تعلیم حاصل کی اور اس سلسلے میں بلند مرتبے کو پہنچے۔ بعدازاں علوم ادبیہ میں بالخصوص مہارت پیدا کی اور اس ضمن میں بڑی شہرت پائی۔ اپنے نواح کے علما و مشائخ سے استفادہ کے بعد عازم ہند ہوئے۔ اس سفر میں بہت سے ارباب فضل اور اصحاب کمال ان کے ساتھ تھے۔ پھر ''کنور'' شہر کا قصد کیا۔ وہاں سید کبیر بن محمد بن عمر بافقیہ اور دیگر اصحاب علم کی مسند درس آراستہ تھی' ان سے اخذ علم کیا۔ اس اثنا میں ان کی علمی قابلیت کے جوہر چمکے اور شہرت کا دائرہ وسیع ہوا۔ وہاں کے وزیر عبدالوہاب کو ان کی وسعت علم کا پتا چلا تو ان سے بھی ملاقات کی۔ یہ شیخ عبداللہ کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ وزیر عبدالوہاب ان کے علم و فراست سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی اور وزارت میں اپنا معاون مقرر کیا۔ شیخ عبداللہ نے مسند تدریس بچھائی اور علما و طلبا کی ایک جماعت ان کے گرد جمع ہوگئی۔ اب ان کی شہرت اس نواح کے مشرق و مغرب میں پھیل گئی اور مسلمانوں نے ان کی علمی و تدریسی قابلیت سے بہت استفادہ کیا۔ شیخ موصوف بڑے حاضر جواب اور مناظر تھے۔ تحقیقی مباحث میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر پاتا تھا۔

شیخ عبداللہ کئی کتابوں کے مصنف اور شارح بھی تھے۔ مثلاً شرح الاجرومیہ' شرح الملحہ' ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں نظم و نثر میں کئی عمدہ رسالے تصنیف کیے۔

عابد و زاہد' راسخ العقیدہ' عالی ہمت اور صاحب صلاح و تقویٰ بزرگ تھے۔ زبان میں بڑا اثر تھا۔ میٹھے اور پیارے انداز سے بات کرتے' ہر لفظ میں دل میں اتر جاتا' حسن اخلاق کے حامل اور عذوبت کلام کے مالک تھے۔ ہمیشہ خوش رہتے اور ہر شخص پر احسان کرتے' بے حد سخی تھے' کھلے دل سے لوگوں پر خرچ کرتے اور استعمال کی قسم قسم کی چیزیں انھیں عنایت فرماتے' شان دار محل میں رہتے اور عمدہ گھوڑے پر سوار ہوتے۔ لوگوں کو فائدہ پہنچانے میں مشہور تھے' وقت کا زیادہ حصہ طلبا کو علم سکھانے میں صرف کرتے۔ رات کو بھی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ غرض یہ شافعی المسلک فقیہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وفات کے وقت منصب وزارت پر فائز تھے (1)۔

۴۱- شیخ عبداللہ حضرمی

یہ ایک اور سید شیخ عبداللہ حضرمی ہیں جن کا سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن زین بن محمد بن عبدالرحمٰن بن زین ابن محمد مولی عبدید حضرمی۔ یہ بھی مسلکاً شافعی تھے اور اپنے دور کے اجل فقیہ تھے۔

---

(1) خلاصۃ الاثر- ج ۳' ص ۳۹- نزہۃ الخواطر- ج ۵' ص ۲۵۰' ۲۵۱-

Marfat.com

ان کا مولد تریم ہے۔ کچھ بڑے ہوئے تو پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر طلب علم کی طرف متوجہ ہوئے اور جزری، عقیدہ غزالیہ، اربعین نوویہ ملحجہ، قطر اور الارشاد حفظ کیں، اور یہ تمام محفوظات اور حفظ شدہ کتابیں اس زمانے کے فاضل علما کو سنائیں۔ قاضی احمد بن حسین سے علم فقہ حاصل کیا اور ایک عرصے تک ان کی خدمت میں حاضر رہے، یہاں تک کہ ان سے تکمیل کی منزلیں طے کیں اور بہت سے علمی فوائد و فیوض حاصل کیے اور متعدد علوم پڑھے، مثلاً تفسیر اور حدیث کی تحصیل انہی سے کی۔ کچھ علوم شیخ ابوبکر عبدالرحمٰن سے پڑھے۔ ان کے بھائی شیخ محمد ہادی سے حدیث اور تصوف کا علم حاصل کیا۔ ان کے مشائخ و اساتذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں شیخ عبدالرحمٰن بن محمد عیدروس اور شیخ عبدالرحمٰن بن علوی بافقیہ وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

شیخ عبداللہ حضرمی نہایت قوی الحافظہ اور بے حد ذہین عالم و فقیہ تھے۔ علوم مروجہ کا کوئی گوشہ ان کے حافظے کی گرفت سے باہر نہ تھا۔ علم فقہ میں ان کے اقران و معاصرین میں سے کوئی ان کا مدمقابل نہ تھا۔ ان کی علمی جامعیت، دینی حزم و احتیاط اور تحقیقی حیثیت کے پیش نظر ان کے کئی اساتذہ و مشائخ نے انھیں افتاو تدریس کی اجازت دے دی تھی۔ وہ مسند درس پر متمکن ہوئے تو تشنگانِ علوم کی ایک بڑی تعداد نے ان سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ وہ فروع و اصول میں بدرجہ غایت عبور رکھتے تھے، بڑے محقق اور زیرک عالم تھے، لیکن ان کا علم ان کی عقل پر حاوی تھا۔ یعنی وہ کوئی ایسی بات نہ کرتے جو علم و تحقیق کے ترازو پر پوری نہ اترتی ہو۔ خلافیات کے تمام پہلوؤں پر ان کی نظر تھی اور اپنے دور کے بہت بڑے مناظر تھے۔ چنانچہ بعض اہم اور پیچیدہ مسائل کی توجیہ و تعبیر میں ان کے اور اس عصر کے ایک اور عالم و شیخ، قاضی عبداللہ بن ابوبکر خطیب کے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہو گیا تھا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں کے درمیان مناظرے اور مباحثے کا سلسلہ شروع ہو گیا، جو کافی عرصے تک جاری رہا اور یہ مناظرے اور مباحثے بسا اوقات دن کے علاوہ رات کو بھی منعقد ہوتے۔

شیخ عبداللہ حضرمی، دینی معاملات پر عمل کرنے میں نہایت سخت تھے۔ رشد و ہدایت اور صلاح و تقوی میں بہت مشہور تھے۔ ریا اور دکھاوے سے متنفر تھے۔ بصیرت قلبی سے بہرہ ور تھے۔ حلیم الطبع اور نرم طبیعت تھے۔ دنیوی منافع اور اس کے ساز و سامان سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔

یہ جلیل القدر شافعی المسلک فقیہ اپنے وطن تریم سے ہندوستان آئے۔ یہاں کے علما و صوفیہ کے فیوض سے اپنا دامن بھرا، اور جو کچھ استفادہ یا استفاضہ کر سکتے تھے، کیا۔ چنانچہ سید عمر بن عبداللہ باشیبان کے بابِ عالی پر علوم تصوف اور ادب کے حصول کے لیے دستک دی اور پھر انہی سید عمر بن عبداللہ باشیبان نے ان سے علوم شرعیہ حاصل کیے۔ بعد ازاں سید عمر نے ان سے اپنے یہاں قیام کرنے کی درخواست کی، اور وہ عرصے تک ان کے ہاں مقیم رہے۔ اس اثنا میں بہت سے ہندی اصحابِ تحقیق نے ان سے اخذ علم کیا۔

وہاں سے بیجا پور کا عزم کیا۔ بیجا پور میں شیخ ابوبکر بن حسین بافقیہ کی مسند رشد و صلاح بچھی ہوئی تھی،

Marfat.com

ان سے علوم طریقت وحقیقت کی تحصیل فرمائی۔ پھر وہیں درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ بیجا پور ہی میں وفات پائی۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس اجل شافعی فقیہ کی تاریخ ولادت ووفات کا علم نہیں ہوسکا❶۔

۴۲- مولانا عبداللہ لبیب سیالکوٹی

مولانا عبداللہ بن مولانا عبدالحکیم بن شمس الدین سیالکوٹی' ارض ہند کے مشاہیر اور ممتاز علما میں سے تھے۔ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے' گھر میں علم کی نہر جاری تھی' اس سے خوب سیراب ہوئے۔ ان کے والد گرامی قدر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ہنگامۂ درس وتدریس زوروں پر تھا اور دور دراز کے علما وطلبا کی بہت بڑی جماعت ان کے حلقۂ درس میں شامل تھی۔ مولانا عبداللہ بھی اس میں شریک ہو گئے اور باپ کی فراوانیٔ علم سے خوب استفادہ کیا۔ مولانا عبدالحکیم نے متعدد درسی کتابوں پر انہی کے لیے حواشی تحریر کیے۔ علم حدیث شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند ارجمند اور گیارھویں صدی ہجری کے مقتدر عالم دین مفتی نورالحق دہلوی سے حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود سلسلۂ درس جاری کیا' جس سے بے شمار طالبان علم کے سینے علم کی روشنی سے منور ہوئے۔ کتابیں تصنیف کیں' کئی درسی کتابوں پر حواشی تحریر کیے اور اس باب میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ ہند اور بیرون ہند میں اپنے فضل وکمال میں بڑی شہرت پائی اور خلق کثیر کو علوم مروجہ کے مختلف گوشوں سے بہرہ مند کیا۔

مولوی رحمان علی ان کے علم وادراک کی وسعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

ملا عبداللہ سیالکوٹی بن ملا عبدالحکیم بگرد آوری علوم از پدر فائق برآمده❷۔

(مولانا عبداللہ سیالکوٹی وسعت علوم میں اپنے باپ مولانا عبدالحکیم سے فوقیت رکھتے تھے۔)

محمد صالح کنبو' جو شاہ جہان کے دور کا مورخ ہے' مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے تذکرے میں ان کے بیٹے مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے خلف الصدق مولانا عبداللہ سیالکوٹی ہیں' جو تمام علوم کے جامع' مکارم اخلاق کے حامل' بہترین اوصاف کے مالک' عمدہ خصائل سے بہرہ ور اور لائق ستائش عادات واطوار سے متصف ہیں۔ الفاظ یہ ہیں:

مولانا عبداللہ خلف الصدق آں حضرت است کہ جامع جمیع علوم است وصاحب مکارم اخلاق وکرائم اعراق ومحاسن شمائل ومحامد خصائل❸۔

---

❶ خلاصۃ الاثر- ج ۳' ص ۲۰۴- نزہۃ الخواطر- ج ۵' ص ۲۵۱ تا ۲۵۳-

❷ تذکرۂ علمائے ہند- ص ۲۶۸-

❸ عمل صالح (شاہ جہان نامہ) ج ۳' ص ۹۵-

Marfat.com

مغل حکومت کے آخری دور (بارھویں صدی ہجری) کے مصنف محمد اسلم پسروری (جو ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۴ء میں زندہ تھے۔) اپنی مشہور تصنیف فرحت الناظرین میں شان دار الفاظ میں مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا ذکر کرتے ہیں۔ محمد اسلم پسروری خود بھی عالم تھے اور ان کے پردادا ملا عبدالوہاب پسروری (متوفی ۱۰۵۹ھ/ ۱۶۴۹ء) بھی بہت بڑے عالم، پرہیز گار، جامع معقول و منقول اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے شاگرد تھے۔ محمد اسلم پسروری کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

ملا عبداللہ، علمائے عصر کے سردار ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے فرزند تھے۔ علوم کی تحصیل، مشکلات کے حل، دقائق کی تحقیق اور حقائق کی تشخیص جس طرح ہونی چاہیے، اسی طرح وہ اس میں مشغول ہوئے۔ قرآن مجید کے حفظ اور صلاح وتقوی نے ان کے فضائل وکمالات میں اضافہ کر دیا تھا۔ ترک تعلق، گوشہ نشینی اور ارباب دول سے کم آمیزی میں وہ اپنے باپ (ملا عبدالحکیم) سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کی تصانیف میں حاشیہ ہدایہ بہت مشہور ہے۔

جس زمانے میں عالم گیر (بادشاہ) لاہور کے معاملات میں مشغول تھا، اس نے ملا (عبداللہ) کو نہایت اعزاز واحترام سے طلب کیا، اور وہ مدد (معاش) جو ان کے والد (ملا عبدالحکیم) کے لیے مقرر تھی، اس سے زیادہ سرخیل علما (ملا عبداللہ) کے لیے مقرر فرمادی [1]۔

سلطان اورنگ زیب عالم گیر، مولانا عبداللہ سیالکوٹی کی انتہائی تکریم کرتا تھا، جس کا اندازہ سلطان کے وقائع نگار محمد ساقی مستعد خاں کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب ''مآثر عالم گیری'' میں ان کے لیے استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے تین مقامات پر مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا ذکر کیا ہے، اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ایک اورنگ زیب کے انیسویں سال جلوس میں، دوسرے پچیسویں سال جلوس میں اور تیسرے چھبیسویں سال جلوس میں۔!

سلطان اورنگ زیب عالم گیر کا انیسواں سال جلوس ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء میں پڑتا ہے۔ اس سال بادشاہ نے حسن ابدال کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس نے ۱۵ شوال ۱۰۸۶ھ/ ۲۳ دسمبر ۱۶۷۵ء کو حسن ابدال سے کوچ کیا۔ وہاں سے چل کر پہلا قیام کالا باغ میں ہوا۔ کالا باغ سے روانہ ہو کر ۵ ذیقعدہ کو لاہور پہنچا اور باغ فیض بخش میں نزول اجلال ہوا۔ اب تک بادشاہ کی مولانا عبداللہ سیالکوٹی سے ملاقات نہ ہوئی تھی، کیوں کہ مولانا موصوف امرا وسلاطین سے ملنے اور ان کے دربار میں جانے کے عادی نہ تھے۔ بادشاہ کو مولانا کے علم وفضل کی وسعت کا علم ہو چکا تھا اور وہ علم وعلما کا بے حد قدر دان بھی تھا۔ لہٰذا اس کے دل میں مولانا سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا، اور پیغام بھجوایا کہ وہ لاہور میں اسے ملاقات کا موقع دیں۔ یہ دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ بادشاہ علم پرور کے قیام لاہور کے دنوں میں یہ ملاقات کئی مرتبہ ہوئی اور بادشاہ ان کے علم وفضل اور تقوی وتدین سے بہت متاثر ہوا۔ وطن واپس جاتے وقت انھیں انعام واکرام اور خلعتِ خاص سے بھی نوازا۔ محمد ساقی مستعد خاں اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

---

[1] فرحت الناظرین (شخصیات) اردو ترجمہ۔ ص ۱۰۴، ۱۰۵۔

Marfat.com

قدوۃ الافاضل مولوی عبداللہ سیالکوٹی پسر ملا عبدالحکیم مرحوم کہ فقر را بہ افضل ہم نشین دارد و مکارم اخلاق را با محامد آداب قرین۔ تا حال بہ ملاقات تمام حسنات خلاصہ مکونات خرسندی نیندوختہ بود۔ از حسن ابدال احکام شوق پیام بنام آں اعزّ انام رفتہ بود کہ بعد تشریف شریف بہ لاہور از وطن بدانجا بیاید۔ مولوی پیش از ورودِ لشکر دو سہ روز بہ لاہور رسید و چند مرتبہ بہ ادراک صحبت فیض خاصیت احتیاط اندوز گردید۔ خلعت و دو صد مہر و مادہ فیل یافتہ بہ اعزاز و احترام تمام بہ مسکن خود مرخص شد ❶۔

(یعنی ملا عبدالحکیم مرحوم سیالکوٹی کے بیٹے مولوی عبداللہ سیالکوٹی جو علما و فضلا کے سردار تھے اور فقر و درویشی کی زندگی بسر کرتے تھے' اخلاق واعمال کے اعتبار سے ان کا اسلوب حیات ایک بہترین نمونہ تھا۔ وہ ابھی تک بادشاہ عالی مقام کی ملاقات کے شرف سے سرفراز نہ ہوئے تھے۔ بادشاہ نے اس معزز و محترم عالم کے نام حسن ابدال سے پیامِ شوقِ ملاقات بھیجا کہ لاہور پہنچنے پر وہ اپنے وطن (سیالکوٹ) سے تشریف لا کر اس سے ملاقات کریں۔ چنانچہ مولوی عبداللہ لشکر شاہی کے ورودِ لاہور سے دو تین روز پہلے ہی یہاں پہنچ گئے اور چند مرتبہ خدمت شاہی میں حاضر ہو کر صحبت فیض اثر سے بہرہ اندوز ہوئے۔ بادشاہ نے ان کو خلعت خاص' دو سو اشرفیاں اور مادہ فیل عطا فرما کر وطن جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔)

دوسری جگہ محمد ساقی مستعد خاں نے مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا ذکر عالم گیر کے پچیسویں سال جلوس (۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء) کے واقعات بیان کرتے ہوئے بالکل آخر میں کیا ہے۔ آخر شعبان ۱۰۹۲ھ/۳ر ستمبر ۱۶۸۱ء کو مولانا عبداللہ سیالکوٹی نے اپنے ایک شاگرد کو جو واقعہ نگار تھا' شرف اسلام کے لیے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ بادشاہ نے اس کی طرف خصوصیت سے عنانِ توجہ مبذول فرمائی' اور وہ اپنی وفا شعاری وحسن کارکردگی کی بنا پر بادشاہ کا منظور نظر ہوا۔ یہاں تک کہ امورِ خانہ اس کے سپرد کیے گئے۔ الفاظ یہ ہیں:

واقعہ نگار از شاگردان اسوہ فضلا ملا عبداللہ سیالکوٹی' روز مبارک یک شنبہ کہ بوساطت مومی الیہ بشرف اسلام تحصیل سعادت نمودہ' بایں نام خاص اختصاص گرفتہ منظور نظر تربیت است' بمشرفی ابتیاع خانہ مقرر شد ❷۔

---

❶ مآثر عالم گیری۔ ص ۱۴۸' ۱۴۹۔

❷ مآثر عالم گیری۔ ص ۲۲۰۔ مآثر عالم گیری کے لفظ ''بشرف اسلام'' سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا یہ واقعہ نگار شاگرد غیر مسلم ہوگا' جس کو مشرف بہ اسلام ہونے کے لیے انھوں نے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا اور پھر وہ اپنے عمل و کردار کی وجہ سے بادشاہ کے نزدیک انتہائی قابل اعتماد قرار پا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ''بشرف اسلام'' کتابت کی غلطی ہو' اصل لفظ ''بشرف سلام'' (بغیر الف) ہو۔ اسے سلام نیاز مندانہ کے لیے مولانا نے بادشاہ کے حضور بھیجا ہو۔ اردو ترجمہ دیکھا تو وہاں بھی ''شرف اسلام'' ہی مرقوم ہے۔ اس پوری عبارت کا ترجمہ یہ ہے:
ایک واقعہ نگار ملا عبداللہ سیالکوٹی کا شاگرد یک شنبہ کے روز اپنے استاد گرامی کے واسطے سے شرف اسلام کے لیے حاضر ہوا۔ جہاں پناہ نے اس شخص کو اخلاص کیش کا خطاب عطا فرما کر' مشرف ابتیاع خانہ مقرر فرمایا۔ قبلہ عالم اس کے حال پر بے حد توجہ فرماتے ہیں۔ (اردو ترجمہ۔ ص ۲۴۱)

Marfat.com

اورنگ زیب عالم گیر کے درباری وقائع نگار محمد ساقی مستعد خاں نے مآثر عالم گیری میں تیسرے مقام پر مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا ذکر جلوس عالم گیری کے چھبیسویں سال (۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء) کے واقعات بیان کرتے ہوئے کیا ہے۔ یہ ۳۰ر رجب ۱۰۹۳ھ/ ۲۵ر جولائی ۱۶۸۲ء کی تاریخ ہے، جب بادشاہ کو مولانا کی وفات کی اطلاع دی گئی۔ ان کی وفات کی خبر سن کر بادشاہ بڑا مغموم ہوا، اور اس فاضل نواز و معارف پرور شاہ ہند نے مولانا کے چاروں بیٹوں اور ان کی پاک باز بیوہ کے نام ان کو الگ الگ خلعتِ تعزیت روانہ کیے اور وظائف میں اضافہ فرمایا۔ اس موقع پر محمد ساقی مولانا مرحوم کے علم و فضل کی کھل کر وضاحت کرتا ہے اور یہ واقعہ بھی بیان کرتا ہے کہ بادشاہ نے اپنے مقرب خاص بختاور خاں کے ذریعے خود اپنے قلم سے اس مضمون کا خط لکھ کر مولانا سے درخواست کی تھی کہ وہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری ﷫ کی خانقاہ کی صدارت کا عہدہ قبول فرمالیں، مگر انھوں نے کبرسنی کی بنا پر معذرت کر دی۔ اس سلسلے کی پوری عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔

''جہاں پناہ کے حضور معروضہ پیش ہوا کہ فاضل اجل، عارف اکمل ملا عبداللہ بن ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے رحلت فرمائی۔ شہریار فاضل نواز و بادشاہ معارف پرور نے ملائے مرحوم کے ہر چہار پسر اور ان کی زوجہ عفیفہ کے لیے خلعت تعزیت ارسال فرما کر ان کے وظائف میں بھی اضافہ فرمایا۔ حضرت ملائے مذکور اپنے زمانے کے مشہور فاضل و عارف اور جامع شریعت و طریقت تھے۔ عمر کے آخری دور میں ملا صاحب پر جذبہ فقر غالب آ گیا تھا اور دنیا کے ساتھ آخرت کے بھی سرمایہ دار ہو گئے تھے۔ قبلہ عالم (بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر) اپنی پایہ شناسی سے اس طرح کے جامع فضل و کمال حضرات کی ہمیشہ قدردانی فرماتے ہیں۔ جہاں پناہ نے اجمیر کے زمانہ قیام میں ارادہ فرمایا کہ حضرت ملا عبداللہ کو اجمیر کی خدمت صدارت عطا فرمائیں۔ چنانچہ قبلہ عالم نے اپنے قلم خاص سے فرمان تحریر فرما کر بختاور خاں کے حوالے کیا، جو مقرب سلطان ہے اور اپنی فقر دوستی کی وجہ سے ہمیشہ عرفا اور بادشاہ کے درمیان (ملاقات اور خط و کتابت کا) ذریعہ بنتا ہے۔ بادشاہ نے یہ فرمان تحریر کر کے بختاور خاں کو یہ بھی حکم دیا کہ وہ ملا صاحب کو یہ فرمان روانہ کر کے خود ذاتی طور پر بھی خط کے ذریعے اس خدمت کے قبول کرنے کی درخواست کرے۔

''ملا عبداللہ کو (بادشاہ کا) فرمان اور (بختاور خاں کا) خط وصول ہوئے، اس بے نیاز عارف نے جواب میں بختاور خاں کو لکھا کہ:

زمان فراق است۔ نہ اوان تحصیل شہرہ در آفاق۔ بہ امتثال حکم جہاں مطاع بحضور کرامت ظہوری رسد۔

(یعنی یہ کوچ کا زمانہ ہے، نہ کہ دنیا میں شہرت و ناموری حاصل کرنے کی خواہش کا وقت۔ تاہم بندہ بادشاہ کے حسب الحکم حاضر ہوتا ہے۔)

مولانا مرحوم کا یہ خط بادشاہ کو دکھایا گیا تو

Marfat.com

بندگانِ حضرت راایں حرف از آں ممتاز دانشوراں پسند افتاد۔

(بادشاہ کو اس ممتاز عالم دین کا جواب بہت پسند آیا۔)

فاضل مرحوم اپنی تحریر کے مطابق اجمیر تشریف لے گئے اور اثنائے قیام اجمیر میں کئی مرتبہ بادشاہ سے ملے۔ بعدازاں بادشاہ سے وطن واپس جانے کی اجازت طلب کی' اور وطن (سیالکوٹ) پہنچنے کے چند ماہ بعد دار آخرت کو روانہ ہو گئے۔ اللھم اغفر لہ۔

کوتاہی امل بہ ہمیں عقدہ بند بود　　افسانہا بہ بستن مژگان تمام شد (1)

مولانا عبداللہ سیالکوٹی نے چند کتابیں تصنیف کیں اور متعدد درسی کتابوں پر حواشی تحریر کیے' مثلاً التصریح علی التلویح، یہ اصول فقہ کی کتاب ہے۔ انھوں نے ابتدائے کتاب سے مقدمات رابعہ تک اس پر حواشی لکھے۔ تفسیر سورہ فاتحہ اور حقائق التوحید کے بارے میں اورنگ زیب عالم گیر کے کہنے سے ایک رسالہ تحریر کیا۔

برصغیر کے اس نامور و ممتاز عالم وفقیہ نے ماہ رجب ۱۰۹۳ھ/ جولائی ۱۶۸۲ء میں وفات پائی۔

۴۳- خواجہ عبداللہ دہلوی

خواجہ عبداللہ دہلوی' حضرت مجدد الف ثانی کے مرشد شہیر حضرت خواجہ عبدالباقی (باقی باللہ) نقشبندی کابلی دہلوی کے چھوٹے لڑکے تھے، جو اپنے والد گرامی کی وفات سے تقریباً دو سال پہلے ۶/ رجب ۱۰۱۰ھ/ ۲۱/ دسمبر ۱۶۰۱ء کو پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی خواجہ عبیداللہ دہلوی (جو حضرت خواجہ باقی باللہ کی دوسری بیوی سے تھے) چار مہینے کے تھے۔ خواجہ عبداللہ کی ولادت پر عظیم المرتبت باپ نے اظہار مسرت میں متعدد اشعار کہے اور بیٹے کی صالحیت و تقویٰ کے لیے اللہ سے دعائیں مانگیں۔ خواجہ عبداللہ نے اپنے والد کے مرید خاص شیخ حسام الدین دہلوی (متوفی صفر ۱۰۴۳ھ/ اگست ۱۶۳۳ء) کی نگرانی میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ابتدائی درسی کتابیں شیخ شاکر محمد اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے پڑھیں۔ پھر عازم سرہند ہوئے۔ وہاں حضرت مجدد الف ثانی کا درس و تدریس اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری تھا' ان سے کچھ کتابیں پڑھیں اور فیض طریقت حاصل کیا۔ خاصی مدت ان کی صحبت میں رہے اور بڑا استفاضہ کیا۔ پھر دہلی واپس گئے' وہاں شیخ حسام الدین اور شیخ اللہ داد نے شرف اجازہ سے نوازا۔ بعدازاں خواجہ ممدوح نے خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔

خواجہ عبداللہ دہلوی عالم کبیر' شیخ وقت' نامور فاضل اور مشہور صوفی تھے اور خواجہ خرد کے عرف سے معروف تھے۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی خواجہ عبیداللہ دہلوی (یعنی خواجہ کلاں) کی نسبت حضرت مجدد سے زیادہ استفادہ کیا اور ان سے علم کلام کی بعض کتابیں' مثلاً شرح مواقف وغیرہ اور صوفیا کے بعض رسائل پڑھنے کا موقع ملا۔ خود فرماتے ہیں کہ انھیں حضرت مجدد سے "اجازت عمل طریقہ و اجازت تعلیم ہا" حاصل تھی۔ کئی مرتبہ

(1) مآثر عالم گیری- ص ۲۲۸ تا ۲۳۰-

Marfat.com

شیخ مجدد سے ملاقات کے لیے دہلی سے سرہند گئے۔ ایک دفعہ لاہور میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت مجدد ان سے بہت الطاف فرماتے تھے۔ اس ضمن میں ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

ایں فقیر چند مرتبہ از وطن مالوف بخدمت ایشاں در سرہند و یک بار در لاہور مشرف شدہ و ہر بار چندگا درخدمت بسر بُردہ۔ الطاف بسیاری فرمودند' و امیدواری چنانست کہ آں الطاف سبب نجاتِ اخروی گردد۔ اجازتِ عمل طریقہ واجازت تعلیم ہا نیز فرمودند' و بشارت ہامی دادند۔

(یعنی یہ فقیر کئی مرتبہ اپنے وطن دہلی سے ان کی خدمت میں سرہند گیا اور ایک دفعہ لاہور جا کر شرف زیارت سے بہرہ یاب ہوا۔ ہر مرتبہ کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہا۔ وہ مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ امیدوار ہوں کہ یہی الطاف و مہربانی نجات اخروی کا باعث ہو گی۔ اجازت طریقہ و عمل اور کئی قسم کی تعلیمات سے نوازا اور کئی بشارتیں بھی دیں۔)

خواجہ عبداللہ کے مزاج میں وجد و حال کی کیفیت زیادہ تھی' اس لیے کسی کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرنے سے گریز کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ان کے والد شاہ عبدالرحیم دہلوی' خواجہ عبداللہ کی خدمت میں رہا کرتے تھے اور وہ ان پر مہربانی بھی فرماتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم نے ان سے حاشیہ خیالی کے چند سبق بھی پڑھے تھے۔ لیکن جب انھوں نے خواجہ سے بیعت کے لیے درخواست کی تو طرح دے گئے اور فرمایا' مجھ سے بعض بے قاعدگیوں کا صدور ہوا ہے' لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے علاقہ بیعت کی وجہ سے آپ کو کوئی ضرر پہنچے اور ساتھ ہی مشورہ دیا کہ حضرت آدم بنوری کے کسی خلیفہ کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو جائیں۔

خواجہ عبداللہ دہلوی تصنیف و تالیف کے ذوق سے بھی بہرہ مند تھے۔ چنانچہ تفسیر بیضاوی اور بعض کتب درسیہ پر تعلیقات و حواشی سپرد قلم کیے۔ ایک کتاب زاد المعاد لکھی' شیخ حسام الدین کے مناقب میں ایک رسالہ تحریر کیا۔ میراث کے موضوع سے متعلق بھی ایک رسالہ تصنیف فرمایا۔ محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ پر تعلیقات لکھیں۔ اور بھی کئی رسائل لکھے اور کتابیں تالیف کیں۔ ان کا یہ تصنیفی کام تقریباً محفوظ ہے۔ بقول شیخ محمد اکرام "شاید ان کا مکمل مجموعہ انڈیا آفس لائبریری (ذخیرہ دہلی) میں موجود ہے۔"

اس صوفی عالم و فقیہ نے بدھ کے روز ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۰۷۴ھ/ ۱۵ دسمبر ۱۶۶۳ء کو وفات پائی [1]۔

۴۴- مولانا عبداللہ سنبھلی

مولانا عبداللہ سنبھلی کا سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن عبدالعظیم بن منور بن منصور بن شیخ عبداللہ بن عثمان حسینی مودودی امروہی ثم سنبھلی' شیخ صالح اور عالم و فقیہ تھے۔ تصوف اور معرفت الٰہیہ میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ شیخ تاج الدین نقشبندی سنبھلی کی اولاد سے تھے [2]۔

1. زبدۃ المقامات- ص ۶۶ تا ۷۰- نزہۃ الخواطر- ج ۵- ص ۲۵۵- رود کوثر ص ۲۱۳ تا ۲۱۵-
2. نزہۃ الخواطر- ج ۵' ص ۲۵۴- بحوالہ نخبۃ التواریخ۔

Marfat.com

۴۵- مولانا عبداللہ برہان پوری

مولانا عبداللہ برہان پوری کا سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن عبدالنبی بن نظام الدین بن محمد ماہ بن صفی الدین عمری چشتی گجراتی ثم برہان پوری' گیارھویں صدی ہجری کے متقی اور پرہیزگار ہندی عالم و فقیہ تھے۔ صاحب فضل و کمال اور صاحب دعوت و ارشاد تھے۔ ۲۹ محرم ۱۰۹۸ھ/۵ دسمبر ۱۶۸۶ء کو برہان پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

۴۶- قاضی عبداللہ بیجاپوری

قاضی عبداللہ گجراتی بیجاپوری' اپنے دور کے شیخ اور صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ حدیث اور فقہ کے متبحر علما میں سے تھے۔ علامہ وجیہ الدین گجراتی سے اخذ علم کیا اور عرصے تک باقاعدہ ان سے فیض یاب ہوتے رہے۔ پھر بیجاپور تشریف لے گئے۔ وہاں کی مسند قضا پر متمکن ہوئے اور مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ بیجاپور میں مدفون ہیں ❷۔

۴۷- علامہ عبداللہ چلپی رومی

علامہ عبداللہ رومی' دیار ہند کے مشہور صاحب علم تھے اور چلپی کی نسبت سے معروف تھے۔ بہت بڑے عالم اور فاضل وقت تھے۔ علوم ظاہری اور معارف باطنی سے بہرہ ور تھے۔ صوفیا کے اونچے طبقے کی اصطلاحات سے پوری طرح باخبر تھے۔ دراصل روم (ترکستان) کے باشندے تھے۔ شاہ جہان بادشاہ کے زمانے میں وارد ہند ہوئے اور فقیرانہ ہیئت میں دہلی میں رہنے لگے۔ شاہ جہان کے وزیر علامی سعداللہ خاں تھے' جو خود بھی صاحب علم و فضل تھے اور اصحاب علم کے انتہائی قدردان بھی تھے۔ انھیں علامہ عبداللہ چلپی کے بارے میں پتا چلا تو ان سے ملاقات کی اور ان کی ضروریات کے کفیل ہوئے۔ علامی سعداللہ خاں ان کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ انھوں نے ان کا باقاعدہ وظیفہ بھی مقرر کیا جو اپنی جیب خاص سے انھیں دیتے تھے۔ شاہ جہان کو علامہ عبداللہ چلپی کی علمی وسعت کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں تو اس نے ان کا یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ چونکہ علامہ عبداللہ چلپی جلیل القدر عالم تھے' بہت دور کے ملک روم (ترکی) سے ہندوستان آئے تھے اور فقیروں اور درویشوں کی سی سادہ زندگی بسر کرتے تھے' اس لیے شاہ جہان ان سے بہت متاثر ہوا۔ پھر وہ چونکہ ذاتی طور پر علما و فضلا کا قدردان تھا اور صوفیا کی دل سے تکریم کرتا تھا' اس لیے بھی علامہ چلپی کا احترام اس کے دل میں جاگزین ہو گیا تھا۔

---

❶ تاریخ برہان پور۔

❷ روضۃ الاولیا۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۵۷۔

Marfat.com

شاہ جہان کی جگہ اس کا لائق و عالم بیٹا اورنگ زیب عالم گیر تخت ہند پر بیٹھا تو وہ بھی علما کی قدر و منزلت میں باپ کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔ اس نے علامہ چلپی کو اور بھی اعزاز و قبولیت سے نوازا۔ اس زمانے میں اورنگ زیب کی کوشش اور حکم سے فتاویٰ ہندیہ جسے فتاویٰ عالم گیری کہا جاتا ہے' عربی زبان میں زیر ترتیب تھا' اور علمائے ہند کی ایک بڑی جماعت جو اجلّا فقہا پر مشتمل تھی' سرکاری طور سے اس اہم خدمت پر متعین تھی۔ نیک اطوار بادشاہ نے علامہ چلپی کو فتاویہ ہندیہ کے فارسی ترجمے پر مامور کیا۔

بہرحال علامہ عبداللہ چلپی رومی' تمام مروجہ علوم و فنون پر گہری نظر رکھتے تھے۔ حکمت و تصوف کے موضوع سے متعلق کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے اسلامی ہند کی یہ ایک نادرۂ روزگار شخصیت تھے ❶۔

۴۸۔ شیخ عبدالمجید امروہی

شیخ عبدالمجید بن معروف بن خداوند بن گلاب بن یحییٰ علوی امروہی' ۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء کو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو نما پائی۔ بڑے ہوئے تو حصول علم کی غرض سے نارنول کا عزم کیا۔ وہاں شیخ نظام الدین بن اللہ داد بن عبدالکریم نارنولی کے مدرسے میں حاضری دی اور کتب درسیہ پڑھیں۔ شیخ نظام الدین نارنولی سے اخذ طریقت بھی کیا اور کافی مدت ان سے منسلک رہے۔ تحصیل علم و طریقت کے بعد اپنے شہر امروہہ تشریف لے گئے اور وہاں کی مسند مشیخت پر فائز ہوئے۔

شیخ عبدالمجید امروہی اپنے عصر کے عالم و فقیہ اور زاہد و عابد بزرگ تھے۔ ان سے بہت سے تشنگان علوم نے استفادہ کیا' جن میں ان کے برادر کبیر فیض اللہ بھی شامل ہیں۔ شیخ عبدالمجید نے "الذکر الاعلی فی شرح اسماء اللہ الحسنی" کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی' جس میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی شرح کی گئی ہے۔ اس عالم دین نے ۱۱ ربیع الثانی ۱۰۴۶ھ/۲ ستمبر ۱۶۳۶ء کو امروہہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے ❷۔

۴۹۔ مولانا عبدالمجید لاہوری

مولانا عبدالمجید بن مفتی محمد لاہوری' عالم و فقیہ' عبادت گزار اور اللہ کے صالح بندے تھے۔ لاہور کے

---

❶ انفاس العارفین ص ۵۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۵۸' ۲۵۹۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۲۴۔ بزم تیموریہ ص ۲۴۳۔ ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ (جنوری ۱۹۴۷ء) ص ۵۲ تا ۵۴۔

❷ نخبۃ التواریخ۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵۔ ص ۲۵۹۔

Marfat.com

اس جلیل القدر عالم نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو عربی زبان میں ایک خط لکھا تھا' جس میں روح اور نفس کے تعلق کی وجہ' ان کے عروج و نزول کی کیفیت اور روح اور جسدی اعتبار سے فنا اور بقا کے بارے میں سوال کیا تھا' حضرت مجدد نے ان کو اس کا جواب لکھا تھا❶۔

۵۰-خواجہ عبدالمنعم احراری

خواجہ عبدالمنعم دیار ہند کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے پوتے تھے' اس لیے عبدالمنعم احراری کی نسبت سے معروف ہوئے۔ والد کا اسم گرامی خواجہ عبداللہ تھا۔ نہایت نیک' شیخ وقت اور فقیہ تھے۔ اس دور کے کبار اور مشاہیر ہندی مشائخ میں گردانے جاتے تھے۔ مغل حکمران شاہ جہان ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ سلیم پور کے نواح میں کئی گاؤں اس نے بطور جاگیر ان کو عطا کیے تھے۔ یہ اپنی اسی جاگیر میں رہتے تھے' اور وہیں ان کا سلسلہ فیض جاری تھا۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ انداز کلام نہایت پیارا اور موثر تھا۔ جس شخص نے اس عالم دین کی صحبت اختیار کر لی' وہ کندن بن گیا انھوں نے ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰ء کے لگ بھگ وفات پائی❷۔

۵۱-مولانا عبدالمومن لاہوری

مولانا عبدالمومن لاہوری کی کنیت ابوالمراد تھی۔ والد کا نام محمد اور دادا کا نام طاہر تھا۔ صالح اور پرہیز گار عالم تھے۔ حدیث' فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ ان کا ایک مختصر رسالہ ہے جو اپنے اندر بڑی لطافت لیے ہوئے ہے۔ اس کا نام القصر المتین من الحصن والحصین ہے۔ اس کی تصنیف سے وہ جمعہ کی رات ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۰۰۴ھ/ ۱۸ر جنوری ۱۵۹۶ء کو آگرہ میں فارغ ہوئے۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

الحمد لله احمد الله علی ماهدانا و ماكنا لنهتدی لو لا ان هذنا الله❸-

۵۲-مولانا عبدالنبی اکبرآبادی

مولانا عبدالنبی اکبرآبادی' گیارھویں صدی ہجری کے دیار ہند کے نامور شیخ' فاضل کبیر اور معارف الہیہ میں مشہور تھے۔ شیخ عبداللہ سندیلوی ثم اکبرآبادی کے فرزند تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ مولانا عبدالحی انصاری لکھنوی نے اپنی تصنیف ''طرب الاماثل بتراجم الافاضل'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

---

❶ نزہۃ الخواطر-ج۵ص۲۵۹

❷ زبدۃ المقامات-ص۲۷۶-

❸ خزینۃ الاصفیا-نزہۃ الخواطر-ج۵'ص۲۶۰-

Marfat.com

۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں مجھے مولانا عبدالنبی کی کتاب فواتح الانوار شرح لواح الاسرار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ کتاب خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔ اس کے آخر میں مولانا ممدوح نے اپنی تصانیف کی ایک فہرست درج کی ہے، جن کے نام یہ ہیں۔ ذریعۃ النجاۃ شرح المشکوٰۃ، شرح الفصوص و شرح ترجمہ الفصوص، مختصر الفوائح المسمی بالروائح شرح اللوائح، شوارق اللمعات شرح اللمعات، شرح خلاصۃ العشق، شرح جام جہاں نما، شرح الغیبہ، شرح شرح نخبۃ الفکر، شرح معماء لمیر حسین، شرح الجواہر الخمسہ، شرح کلید مخازن، شرح تحفۃ حل الوودود، شرح علی حاشیۃ السید علی العضدی المسمیٰ بفیض الخبیر، رسالہ فی تعریف الفقر، رسالہ کشف الجواہر، رسالہ فی اسم الذات، رسالہ لطائف العشر فی حقیقۃ البشر، رسالہ فی المعراج، رسالہ فی شرح خیر الاسماء عبداللہ و عبدالرحمٰن، رسالہ کنوز الاسرار فی اشعار الشطار، جوامع کلم الصوفی، مقامات العارفین، فتوحات المغیبہ، حدائق الانشا، رسالہ فی الناسخ والمنسوخ المسمیٰ دستور المفسرین، بحر الکرم شرح عین العلم، حاشیہ علی شرح الجامی من مبحث الحال الی المجرورات، سواطع الالہام شرح تہذیب الکلام، شرح حدیث معراج المومنین، شرح حدیث "کنت کنزاً مخفیا"، رسالہ دستور السعادہ فی بیان الولایہ، فیض القدوس منتخب نقد النصوص، مطالع الانوار الخفی شرح اجوبۃ الولی، جواہر الاسرار، شرح فصوص الفارابی، فیض الملک المبین شرح حق الیقین، حاشیہ علی نقد النصوص، لوامع الانوار فی مناقب السادۃ الاطہار، رسالہ فی السماع، رسالہ فی جواب اسئلۃ الفاضل النارنولی، شرح جواب ابن سینا، جو کہ ابوالخیر مولانا ابوسعید کے مکتوب کے جواب میں لکھا۔ مواہب الٰہی شرح اصول ابراہیم شاہی، شرح ارشاد النحو للقاضی شہاب الدین دولت آبادی، روح الارواح شرح الحکمۃ الاشراقیہ، رسالہ فی ایمان فرعون، رسالہ فی خلوات الوجود، رسالہ ناسخ التناسخ، شرح حضرات الخمس وغیرہ۔ ان کی تصانیف میں سے کشف الانوار شرح جواہر الاسرار فارسی میں ہے، جو علم دعوت سے متعلق ہے۔ اس میں شیخ محمد غوث گوالیاری کی جواہر خمسہ کے جوہر ثالث کی شرح کی گئی ہے۔ کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ منك العون فی الا بتداء والانتہاء یا کریم ❶۔

۵۳- مفتی عبدالنبی کشمیری

مفتی عبدالنبی کشمیری، مشہور عالم و فقیہ مفتی یوسف کشمیری کے بیٹے تھے۔ شیخ وقت اور اپنے دور کے نامور عالم تھے۔ ان کا شمار اپنے علاقے اور زمانے کے کبار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ خلافیات میں ماہر اور فقہی مسالک میں اختلافی رجحانات و آرائے ائمہ سے پوری طرح آگاہ تھے۔ علم فقہ اپنے والد گرامی مفتی یوسف کشمیری سے حاصل کیا اور اس میں خوب مہارت پیدا کی اور اس درجہ کمال کو پہنچے کہ روایات فقہی کی جزئیات و افتا کے استخراج میں یگانہ روزگار ہوئے۔ ان کی بالغ نظری اور فقہی عظمت کا موافق و مخالف سب نے لوہا مانا ہے ❷۔

❶ طرب الاماثل بتراجم الافاضل۔ ص ۲۲۷ تا ۲۲۹۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۶۱، ۲۶۲۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۳۴، ۱۳۵۔

❷ حدائق الحنفیہ ص ۴۲۸۔ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۴۸۔ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۶۲۔

Marfat.com

۵۴- شیخ عبدالواحد مندسوری

شیخ عبدالواحد مندسوری کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالواحد بن محمد بن عبدالکریم بن ابراہیم بن نعمت اللہ بن سالار بن وحید الدین یوسف چندیری مندسوری۔ شیخ عبدالواحد مندسوری نے بعض درسی کتابیں سید عبدالاول شیرازی کے شاگرد شیخ محمد سے پڑھیں۔ باقی کتب درسیہ کی تحصیل مشہور فاضل شیخ مبارک گوالیاری سے کی۔ ذکر واذکار کے مختلف طریقے بھی ان سے اور شیخ عبداللہ بن بہلول شطاری اکبر آبادی سے سیکھے' یہاں تک کہ ان حضرات کی تعلیم وصحبت سے تمام علوم مروجہ بالخصوص دعوت وتبلیغ اور فقہ وتصوف میں درجۂ بلند کو پہنچے۔ صاحب وجد وحال بھی تھے۔ دنیا اور اس کے مال ومتاع سے بے نیاز رہتے تھے۔ ''تارک الماء'' مشہور تھے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے ستائیس سال پانی نہیں پیا تھا___ ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء کے آخر میں گلزار ابرار کے مصنف محمد غوثی شطاری ان سے ملے۔ ایک رات ان کے ہاں رہے اور تصوف وطریقت کے سلسلے میں باتیں ہوئیں۔ ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء کو فوت ہوئے [1]۔

برصغیر پاک وہند کے بعض بزرگوں کے حالات میں اس قسم کے واقعات بھی بیان کیے جاتے ہیں کہ انھوں نے اتنے سال پانی نہیں پیا تھا' اتنے سال کھانا نہیں کھایا تھا' اتنے سال کنویں میں الٹے لٹکے رہے تھے' ان کی آنکھوں میں اس قدر جلال تھا کہ آدمی اس کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہو جاتا یا مرجاتا تھا' وہ کئی کئی مہینے متواتر روزے رکھتے تھے' ایک ایک رات میں ہزار ہزار نفل پڑھ لیتے تھے' ایک دن میں قرآن مجید ختم کر لیتے تھے اور ساتھ ہی دیگر عبادات___ فرائض وسنن___ بھی ادا کرتے تھے' وغیرہ وغیرہ۔ یاد رہے' اس قسم کی مشقتیں اور تکلیفیں اسلام ہرگز کسی کو دینا نہیں چاہتا۔ اسلام دین سہل ہے۔ تکلف اور مشقت کا مذہب نہیں ہے۔ پھر ان میں سے بعض چیزیں خلاف شرع ہیں اور بعض بالکل ناممکن ہیں۔ وہ پاک باز حضرات اس نوع کی باتیں کس طرح کر سکتے تھے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان ناممکن الوقوع امور کو ''کرامات'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ سب سے بڑی اور اصل کرامت خود اسلام اور اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ جو چیزیں شرعاً ناجائز ہیں یا جن کا عمل میں آنا ناممکن ہے' ان کو ان ہستیوں کی طرف منسوب کرنا نہ اسلام کی کوئی خدمت ہے اور نہ اس سے ان بزرگوں کی شان میں اضافہ ہوتا ہے' بلکہ اس سے ان کی ذات گرامی اور خود اسلام پر جو ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا' نقد وتنقید کی راہیں کھلتی ہیں۔ کوئی مان سکتا ہے کہ پورے ستائیس سال تک پانی نہ پیا جائے اور انسان زندہ رہے۔ خود رسول اللہ ﷺ تو پیاس اور بھوک کے وقت ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگ لیتے تھے' یہ حضرات علمائے کرام جو نبی ﷺ کے اطاعت گزار تھے' کیوں کر بھوک پیاس میں رہنے کو دینی حکم تصور کر سکتے تھے۔

---

[1] اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار)- ص ۴۸۷- نزہۃ الخواطر- ج ۵' ص ۲۶۴' ۲۶۵-

Marfat.com

۵۵- شیخ عبدالوہاب متقی مکی

شیخ عبدالوہاب متقی مکی' دسویں اور گیارھویں صدی ہجری کے بہت بڑے ہندی عالم و فاضل' محدث وفقیہ اور صاحب ورع و تقوی بزرگ تھے۔۹۰۲ھ/۱۴۹۷ء کو' ہندوستان کے علاقہ مالوہ کے قدیم دارالسلطنت مانڈو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ ولی اللہ تھا۔ شیخ ولی اللہ کا شمار مانڈو کے اعیان واکابر اور روسا و امرا کے طبقے میں ہوتا تھا۔ لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا اور انقلاب و تغیر کی ایسی لہریں چلیں کہ انھیں مانڈو کی سکونت ترک کر کے برہان پور جانا پڑا، اور پھر اسی شہر کو اپنا وطن ٹھہرا لیا۔ برہان پور میں اللہ نے انھیں اسی عزت و احترام اور اکرام و شہرت سے نوازا جس سے وہ زمانہ ماضی میں اپنے قدیم وطن مانڈو میں سرفراز تھے۔ برہان پور جانے کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی زمانے میں شیخ ولی اللہ کی اہلیہ محترمہ (شیخ عبدالوہاب کی والدہ ماجدہ) بھی وفات پا گئیں۔ یعنی شیخ عبدالوہاب کم سنی ہی میں والدین کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے اور ایک یتیم بچے کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔

جب ان کے والد (شیخ ولی اللہ) نے مانڈو سے ترک وطن پر مجبور ہو کر برہان پور کی راہ لی تو اس سفر بے چارگی میں عبدالوہاب ان کے ساتھ تھے۔ اس میں ان کو بہت سی مشکلات سے گزرنا اور اثنائے راہ میں کئی قسم کے مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کا ذکر ان کے شہرہ آفاق شاگرد و مرید شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے استاد کی زبانی اپنی تصنیف اخبار الاخیار میں کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

یک بارے در صغرسن ہمراہ والد خود بتقریب بعضے حوادث کہ در دیار مندو حدوث یافتہ بود در بیابانہا افتادہ وراہ گم کردہ بودیم' وہیچ چیز از جنس وطعام وشراب ہمراہ نماند' گرسنگی برما غلبہ کردہ۔ چنانچہ عادت اطفال باشد کہ در گریہ آمدیم' والد دل داری می داد و می گفت کہ صبر کن طعام در پیش است ❶۔

(یعنی مانڈو میں کچھ حوادث سے دوچار ہو جانے کی وجہ سے' میں ایک مرتبہ بچپن میں والد کے ساتھ جنگلوں میں تھا کہ ہم راستہ بھول گئے۔ کھانے پینے کی کوئی چیز پاس نہ تھی' بھوک کی شدت بڑھی' تو بچوں کی عادت کے مطابق' میں نے رونا شروع کر دیا۔ والد نے تسلی دی اور فرمایا صبر کرو کھانا آگے ہے۔)

فقر و تجرید کی راہ پر:

والد اور والدہ کی وفات کے بعد اللہ نے شیخ عبدالوہاب کی دست گیری کی اور وہ طلب حق کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ فقر و تجرید کی راہ کو اپنایا اور سفر و سیاحت کی زندگی اختیار کر لی۔ نواح گجرات' علاقہ دکن کے اطراف و اکناف' سیلون' لنکا اور جزائر سراندیپ میں گھومنے پھرنے لگے۔ اس دوران میں ان کا معمول یہ تھا کہ

❶ اخبار الاخیار-ص ۲۶۹

Marfat.com

تین دن سے زیادہ کہیں قیام نہ کرتے، البتہ تحصیل علم کی غرض سے یا مشائخ وصلحا سے استفادے کی خاطر بقدر ضرورت کہیں اقامت پذیر ہو جاتے ____ لیکن اس اثنا میں کس مقام پر کس عالم دین سے استفادے کی منزلیں طے کیں؟ کس شیخ اور صاحب طریقت کے باب عالی پر استفاضے کے لیے دستک دی، اور کہاں کتنا عرصہ ٹھہرنے کے مواقع میسر آئے؟ افسوس ہے اس کی تفصیلات ہماری نظر سے نہیں گزریں۔ ہمارا زیادہ تر اعتماد اس سلسلے میں ان کے تلمیذ رشید شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار پر ہے۔ انھوں نے ان کے ان اسفارِ دشت وصحرا کا صرف ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے، بعض واقعات بھی بیان کیے ہیں، مگر تفصیلات سے تعرض نہیں فرمایا۔ لہٰذا اگر قارئین گرامی قدر کو اس ضمن میں تشنگی کا احساس ہو تو ہم ان سے معذرت کرتے ہوئے عرض کریں گے کہ اس کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔ لیکن جیسا کہ واقعات کے تسلسل سے پتا چلتا ہے، بلاشبہ وہ علم وفضل کی اچھی خاصی مقدار سے متمتع تھے اور حسن خط کی صفت سے بھی متصف تھے۔ ان کے والد بھی چونکہ عالم دین تھے، ان سے بھی انھوں نے آغاز عمر میں ضرور استفادہ کیا ہوگا۔ وہ انھیں بعض بزرگوں کی صحبت اختیار کرنے اور مواقع میسر آنے کی صورت میں ان سے فیض حاصل کرنے کی بھی تلقین کرتے تھے، مثلاً شیخ علی متقی سے استفادہ واستفاضہ کی تلقین انھی نے کی تھی۔

ورودِ مکہ مکرمہ اور شیخ علی متقی سے حصولِ فیض:

دیار ہند کے مختلف مقامات کی سیاحت اور صحرا نوردی کے بعد شیخ عبدالوہاب نے مکہ معظمہ کا عزم فرمایا۔ اس وقت شیخ ممدوح کا عنفوانِ شباب تھا، عمر بیس سال سے کم تھی اور چہرہ ابھی موئے لحیہ سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ شیخ محدث کے الفاظ میں:

وہم درعنفوان شباب کہ سال عمر بہ بست نہ رسیدہ بوذ و ملتحی نہ شدہ بودند کہ بمکہ معظمہ آمدند ❶۔

(یعنی شیخ کی جوانی کا عالم تھا، قافلہ عمر بیس سال کی منزل میں داخل نہ ہوا تھا اور داڑھی کے بال نہ اگے تھے کہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔)

مکہ معظمہ میں اس دور میں دیار ہند کے مشہور عالم وفاضل اور معروف بزرگ شیخ علی متقی کی مسند علم و عرفان آراستہ تھی اور حلقہ اصحاب نظر وفکر میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ شیخ عبدالوہاب کے والد گرامی سے بھی ان کی ملاقات وشناسائی تھی۔ انھیں شیخ عبدالوہاب کی آمد کی اطلاع ملی تو خود ان کی قیام گاہ پر ملاقات کے لیے تشریف لائے اور کمال شفقت سے اپنے ساتھ قیام کرنے کی استدعا کی۔

پیش ایشاں آمدند و مہربانی ہا نمودند و استدعائے صحبت فرمودند ❷۔

❶ اخبار الاخیار۔ ص ۲۶۹۔

❷ اخبار الاخیار۔ ص ۲۶۹۔

Marfat.com

(ان کے ہاں آئے۔ بڑی مہربانیوں سے نوازا اور اپنے ہاں رہنے کی درخواست کی۔)

یہ الفاظ واضح کرتے ہیں کہ شیخ علی متقی اپنی بے پناہ مقبولیت اور وسعت علم و معارف کے باوصف جس نوجوان (عبدالوہاب) کے پاس آئے، وہ کوئی معمولی درجے کا نہ تھا' بلکہ کم عمری ہی میں اس نے معرفت و طریقت کے بہت سے اہم مراحل طے کر لیے تھے۔ پھر جب شیخ علی متقی نے شیخ عبدالوہاب کی تحریر دیکھی اور یہ معلوم ہوا کہ وہ انتہائی خوش خط بھی ہیں تو اصرار کیا کہ وہ ضرور ان کے ہاں تشریف لے جائیں اور ان کی کتابوں کی کتابت و تصحیح کی خدمت انجام دیں' کیوں کہ اس زمانے میں وہ اپنی کئی تصانیف کی کتابت کرانا چاہتے تھے اور بعض مسودات کو بہترین خط میں لکھوانے کی فکر میں تھے۔ لیکن اس پہلی مجلس میں تو شیخ عبدالوہاب نے کمال بے نیازی سے ان کی یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا' البتہ بعد کو ان کے ہاں قیام پر رضامند ہو گئے۔

ایشاں بہ مقتضائے استغنائے ذاتی و بے نیازی کہ مسافراں راو مجرداں رامی باشد' در مجلس اول اجابت دعوت شیخ نہ کردند و گفتند کہ ان شاء اللہ تعالیٰ بہ بینم' تا نصیب چیست۔ در آخر بہ مشاہدۂ فضل و کمال و استقامت احوال حضرت شیخ اختیار صحبت نمودند۔ و سابقاً والد بزرگ وار ایشاں نیز وصیت کردہ بود کہ اگر ترا توفیقِ سلوکِ راہِ حق دست دہد' ملازمت شیخ علی متقی و امتثال ایشاں اختیار کنی' و از صحبت فلاں و امثال دی۔ و یکے از شیخانِ زمانہ رانام بردند کہ بہ دعوت اسماو تسخیر ملوک مشہور بود' پرہیز نمائی ❶۔

(شیخ عبدالوہاب نے اپنے اس ذاتی استغنا اور کمال بے نیازی سے کام لیتے ہوئے' جو مسافروں اور مجردوں کا خاصہ ہے' پہلی مجلس میں شیخ علی متقی کی دعوت قبول نہ کی' اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ ان شاء اللہ دیکھتے ہیں' قسمت میں کیا لکھا ہے۔ لیکن بالآخر شیخ کے علم و فضل اور استقامت حال کا مشاہدہ کر کے ان کی خدمت میں قیام کی منظوری دے دی۔ علاوہ ازیں انھیں اپنے والد (شیخ ولی اللہ) کی یہ وصیت بھی یاد تھی کہ اگر تمھیں راہِ حق کے سلوک کی توفیق میسر آئے تو شیخ علی متقی اور ان کی طرح کے بزرگوں کی صحبت ضرور اختیار کرنا' اور فلاں فلاں بزرگوں کی معیت و ملازمت سے استفادہ کرنا____ ان بزرگوں کے ساتھ ایک ایسے بزرگ کا نام بھی لیا تھا' جو دعوتِ اسما میں معروف اور تسخیرِ ملوک کے سلسلے میں مشہور تھا' اس کے بارے میں فرمایا تھا کہ اس شخص کی صحبت سے پرہیز رکھنا۔)

شیخ عبدالوہاب پیکر زہد و عبادت تھے اور صالحیت' پاک بازی اور تقوے میں بہت معروف تھے۔ ان کا خط نستعلیق نہایت خوب صورت تھا' لیکن شیخ علی متقی نے انھیں خط نسخ میں مشق کرنے کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ وہ اس خط میں حسن و زیبائی پیدا کریں' کیونکہ قرآن مجید اسی خط میں ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے اور صلحائے امت کی عادت و روش بھی یہی رہی ہے کہ وہ خط نسخ میں لکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالوہاب نے خط نسخ میں بھی بہت

❶ اخبار الاخیار۔ص ۲۶۹۔

Marfat.com

جلد مہارت حاصل کر لی اور پھر اسی خط میں شیخ علی متقی کی تصانیف و تالیفات کی کتابت اور تصحیح و مقابلے میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے شیخ کی متعدد کتابوں کو زیورِ کتابت سے آراستہ کیا۔ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔

برائے شیخ کتابت بسیار کردند بحدے کہ تصور آں از حیطۂ حصر خارج بود ❶۔

(انھوں شیخ علی متقی کی اتنی بہت سی کتابوں کو کتابت کا جامہ پہنایا کہ ان کو حیطۂ شمار میں لانا حد امکان سے باہر ہے۔)

کتابت کے بارے میں شیخ عبدالوہاب متقی کا کمال یہ تھا کہ وہ نہایت زود نویس بھی تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ شیخ علی متقی نے بارہ ہزار اشعار پر مشتمل اپنی ایک کتاب انھیں دی۔ اس کی کتابت انھوں نے بارہ راتوں میں مکمل کر دی۔ وہ ایک ہزار شعر ایک رات میں لکھ لیتے تھے۔ اس کے علاوہ دن کو شیخ کی دوسری کتابوں کی کتابت کرتے تھے۔ بہر حال شیخ علی متقی کی زیادہ تر کتابوں کی ترتیب اور اصلاح و تصحیح شیخ عبدالوہاب متقی کی سعی مسلسل سے تکمیل پذیر ہوئی۔

واکثر ترتیب واصلاح تو الیف شیخ بردست ایشاں بود۔

شیخ عبدالوہاب متقی مکہ معظمہ میں دوسرے اصحاب تصانیف کی کتابوں کی تصحیح و کتابت بھی کرتے تھے اور ان دیارِ پاک میں ان کے اخراجات کا یہی ذریعہ تھا۔ اس زمانے میں ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں شدید قحط پڑا، اور لوگ فقر و فاقہ کی زد میں آ گئے تو ان دونوں استاد اور شاگرد کو بھی اس سے دوچار ہونا پڑا۔ ان دنوں شیخ عبدالوہاب ایک دوسرے صاحب علم کی کتابوں کی کتابت کرتے تھے اور اس سے جو اجرت حاصل ہوتی، اس سے ان دونوں بزرگوں کی گزر بسر کا سلسلہ چلتا تھا۔ قحط سالی کے ان ایام میں سب سے ارزاں چیز ایک سبزی تھی جو بڑے بینگن کی قسم کی تھی۔ یہ اسے سستے داموں خرید لیتے اور اس میں تھوڑا سا نمک ڈال دیتے، جس سے وہ اچار کی شکل میں بدل جاتی۔ پھر تھوڑی تھوڑی مقدار میں یہ بزرگ اسے روزانہ تناول کرتے۔

شیخ عبدالوہاب متقی، اپنے مرشد شیخ علی متقی کے بے حد فرماں بردار تھے، ہر آن ان کی خدمت میں مصروف رہتے اور دنیا کی کسی بات کو شیخ علی متقی کی بات پر ترجیح نہ دیتے۔ شیخ علی متقی بھی ان کا بڑا احترام کرتے اور اپنا بھائی قرار دیتے تھے۔ فرمایا کرتے:

وبرادر کہ در راہِ خدا یافتیم عبدالوہاب بود ❷۔

(میں نے اللہ کی راہ میں ایک بھائی پایا ہے جو عبدالوہاب ہے۔)

یہ دونوں بزرگ اصحابِ ثروت اور مال دار لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے ہاں آمد و

❶ اخبار الاخیار۔ ص ۲۶۹۔

❷ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۰۔

Marfat.com

رفت سے پرہیز کرتے تھے۔انھوں نے یہ بات دل میں عقیدے کی طرح بٹھالی تھی کہ مال و دولت پر فقرو درویشی کو بہرحال ترجیح حاصل ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے تعلق رکھنے والوں کو دنیا داروں کی مصاحبت ومجالست سے ہرصورت میں بچنا چاہیے۔ شیخ علی متقی نے شیخ عبدالوہاب کو اپنے حلقہ ارادت میں داخل کرتے وقت اس بات کا اقرار لیا تھا اور فرمایا تھا کہ عالم فقر کو عالم دولت پر مقدم گرداننا اور یہ بات دل میں ہمیشہ جمائے رکھنا۔اس ضمن میں شیخ عبدالوہاب کے الفاظ یہ ہیں:

چوں شیخ مارا مریدی ساختند اول از ما بہ تفضیل فقر بر غنا اقرار گرفتند وگفتند بریں اعتقاد باشید و ما نیز ہم بریں عقیدہ ایم۔ بعدازاں دست بیعت بما دادند ❶۔

(جب شیخ مجھے اپنے دائرۂ ارادت میں داخل فرمانے لگے تو پہلے یہ اقرار لیا کہ دولت پر فقر کو فضیلت حاصل ہے' اور فرمایا یہ عقیدہ دل میں ہمیشہ مستحکم رکھنا۔ اس پر اقرار و وعدہ کے بعد بیعت کے لیے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ چنانچہ میرا اب تک یہی عقیدہ ہے۔)

شیخ عبدالوہاب نے جمادی الاولیٰ ۹۶۳ھ/ مارچ ۱۵۵۶ء کو شیخ علی متقی کی بیعت کی' اور پھر ان کی وفات' یعنی ۶ جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ/ ۸/ نومبر ۱۵۶۷ء تک پورے بارہ سال ان کی خدمت و مصاحبت میں رہے۔ جب وہ شیخ علی متقی کی خدمت میں گئے' اس وقت شیخ علی متقی کی عمر تقریباً چونسٹھ سال تھی۔

شیخ علی متقی سے ان کی گرویدگی و شیفتگی اس انتہا کو پہنچی اور وہ ان کے زہد و تقویٰ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بالآخر انہی کے رنگ میں رنگے گئے' اور استاد و مرشد کے لقب ____ ''متقی'' ____ سے ملقب ہوئے اور پھر یہی لقب استاد کی طرح ان کے نام کا بھی مستقل جز بن گیا۔ رحمہما اللہ تعالیٰ۔

قیام مکہ مکرمہ کے دوران شیخ عبدالوہاب متقی کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ علم و عمل میں مشغول رہے۔ افادۂ طلبا' غربا و فقرا کی امداد' مخلوق خدا کو نصیحت و موعظت اور زہد و عبادت کی تلقین ان کا شب و روز کا معمول تھا۔ مصر' شام اور یمن کے علمائے عظام اور اصحابِ تقویٰ سے ان کے تعلقات اس نوعیت کے تھے کہ یہ سب لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

صوفیا کی تصانیف کے بارے میں شیخ کا نقطہ نظر:

شیخ عبدالوہاب متقی معتدل مزاج صوفی اور عالم دین تھے۔ بعض فقہا کی طرح وہ صوفیا پر طعن و تشنیع کرنے کے عادی نہ تھے' نہ ان کی تصانیف کو ہدف تنقید ٹھہراتے اور نہ ان کے افکار و خیالات کی تردید کرتے۔ اس ضمن میں وہ خاموشی کو ترجیح دیتے تھے۔ مثلاً ابن العربی کی فصوص الحکم یا اس قسم کی دیگر کتابوں کے بارے میں وہ کسی کو کوئی رائے نہ دیتے تھے۔ نہ اس نوع کی کتابیں خود پڑھتے' نہ کسی کو پڑھاتے اور نہ ان کے مطالعہ

❶ اخبار الاخیار-ص ۲۷۰-

Marfat.com

سے کسی کو منع فرماتے۔ البتہ اگر کوئی پوچھتا تو کہتے کہ پہلے اپنا عقیدہ طریق اہل سنت کے مطابق درست اور پختہ کرلو پھر بے شک ہر قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ فرمایا کرتے' حقائق و اسرار سے متعلق کتابوں کے ان مشکل مقامات پر' جو عقل و فہم کی گرفت میں نہ آسکیں اور ان کی کوئی معقول توجیہ حیطہ فہم میں نہ آسکے' پریشان ہونے اور رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ دل میں کوئی وسوسہ ڈالنے اور خلجان پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسے مقامات پر بالکل نہ رکیے اور بلا تکلف آگے نکل جایے۔ پھر ایک موقعے پر شیخ عبدالوہاب نے جو پتے کی بات کہی' وہ یہ ہے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی درج ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

نہ آنکہ اعتقاد را ابتدا از ہمیں کتب راست کنند۔ واز ہر کس ہر چہ بشنوند تابع شوند' می فرمودند باید کہ ہر چہ بہ شنوند اگر چہ سخن باطل باشد زود بہ انکار و تعصب پیش نیایند' اول خود بہ شنوند کہ چہ می گوید' و فہم سخن نیک درروند کہ قائل آں چہ مقصود دارد۔ بعد ازاں اگر توانند آن را موافق حق سازند' وگرنہ رد کنند۔ واگر ایں را نہ توانند ازسر آں بگزرند' و خلل در عقیدہ خود نہ یندازند ❶۔

(یعنی اس قسم کی کتابوں کے مندرجات سے اپنے عقیدے کو درست کرنے کا آغاز کرنا یا اصلاح عقائد کا ذریعہ ٹھہرانا مناسب نہیں۔ ہر شخص کی بات سن کر' اس سے تاثر پذیری اچھی چیز نہیں ہے۔ جو شخص جو بات کہتا ہے' اس کو غور سے سنو۔ از راہ تعصب' عجلت سے کام لے کر اسے باطل قرار نہ دو۔ پہلے پوری بات سن لو' اس میں سے جو موافق حق ہو' اسے قبول کر لو' باقی رد کر دو۔ اور اگر تم اپنے اندر قوت برداشت نہیں پاتے تو اس قسم کے لوگوں کی باتیں سننے ہی کی ضرورت نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ اپنے عقیدے میں کسی نوع کا خلل نہ پیدا ہونے دو۔)

شیخ عبدالوہاب متقی کے نزدیک راہِ سلوک پر قدم زن ہونے کے لیے ابن العربی کے افکار و خیالات اور فصوص الحکم کے اندراجات سے رہنمائی حاصل کرنا شرطِ اول نہیں ہے۔ بلکہ عمل و کردار کو سنوارنا اور عاملین سنت کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے۔ وہ عقیدے کی اصلاح اور باطن کی پاکیزگی کے لیے بنیادی ذریعہ سنت پر عمل کی دیواریں استوار کرنے کو قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کلمہ طیبہ پڑھتا ہے' اس نے اسلام قبول کر لیا ہے' مسلمان ہونے کا اقرار کرتا ہے' باقاعدہ نماز ادا کرتا اور روزے رکھتا ہے' اسلام کے اوامر و نواہی کو مانتا اور اسے ذریعۂ نجات ٹھہراتا ہے' اس کے قول و عمل کا وہی معیار اور پیمانہ ہے جو کتاب و سنت کی رو سے صحیح ہے' تو اس پر اگر ذوق و حال اور جذب و ادراک کی کیفیت طاری ہو جائے اور اس سے ایسی چیزوں کا صدور ہو جائے جو اس کیفیت میں بعض دفعہ صادر ہو جاتی ہیں تو اسے مطعون نہیں ٹھہرانا چاہیے' اس کی تکفیر نہیں کرنا چاہیے۔ اور اسے ملحد نہیں قرار دینا چاہیے ___ البتہ اس کے برعکس جو شخص ارکان اسلام پر عامل نہیں

---

❶ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۱۔

Marfat.com

ہے، وہ اگرچہ کتنا بھی مدعی توحید ہو اور ادراک وسلوک اور ذوق وحال کے کتنے بھی نکات بیان کرتا ہو اور اس سے دوچار ہونے کا دعوے دار ہو، وہ پکا ملحد اور بے دین ہے۔ اس کی باتوں سے فوراً انکار کر دینا چاہیے۔ وہ یقیناً منکر اسلام اور مخالف کتاب وسنت ہے ❶۔

سماع اور قوالی کے بارے میں شیخ کا فرمان:

شیخ عبدالوہاب متقی رحمۃ اللہ سماع اور قوالی کو ناجائز قرار دیتے تھے۔ اپنے کسی مرید کو اس کی اجازت نہ دیتے، اور اس باب میں ان مشائخ کی، جو قوالی کے جواز کے قائل ہیں، سختی سے تردید کرتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں ان کے اس نقطہ نظر کو خصوصیت سے اجاگر کیا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں مشائخ کرام اور بزرگان دین کے بارے میں یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ وہ قوالی کو جائز سمجھتے، بلکہ بعض حالات میں ضروری قرار دیتے ہیں، اس لیے ہم شیخ محدث دہلوی کی پوری فارسی عبارت درج کرنا چاہتے ہیں، تا کہ اس ضمن میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان سے خصوصیت سے سماع کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ یہ عبارت جو شیخ محدث کے استفسار اور شیخ عبدالوہاب متقی کے جواب پر مشتمل ہے، مندرجہ ذیل ہے، اس کے نیچے اس کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔

وطریقہ ایشاں در سماع نیز نزدیک ہمیں طریق است۔ از مرید بہ تعمل آں راضی نیستند و بر فعل مشائخ منکر اند۔ ایں فقیر عرض کرد کہ در دیار ما ایں رسم سماع عجائب متعارف شدہ است، واگر کسے از وے اجتناب کند و براہ انکار رود او را بتمامہ خلق مخالف باید شد، وہمہ مردم بوی از مر آں بدمے شوند، و بہ مخالف مشائخ اور ا اتہام کنند، کسے چہ کار کند۔ فرمودند اگر احیاناً با یارانِ موافق و اہل معنی و ہم سرگاہی غزلے یا جگرے شنیدہ شود باکے نیست۔ عرض کردم کہ آں جا اجتماعہا کنند و اہل و نااہل و فاسق و صالح واز ہر جنس مردم جمع شوند و چنیں و چناں کنند، براں وجہے کہ در دیار ہندوستان مشاہدہ فرمودہ باشند، ایں چہ حکم است۔ فرمودند ایں چنیں خود اصلاً جائز نہ باشد و نباید کرد، واجتناب ازاں از واجبات وقت طالب حق است۔ دریں صورت قطعاً مساہلہ ومسامحہ نہ کردند ❷۔

(سماع وقوالی کے بارے میں بھی ان کا یہی طریق تھا، (یعنی جس طرح وہ ارکان اسلام کی پابندی نہ کرنے والے صاحب ذوق وحال کو ملحد و بے دین گردانتے تھے، اسی طرح قوالی کے دلدادہ لوگوں کو بھی غیر دینی راہ پر گام فرسا قرار دیتے تھے) وہ اپنے کسی مرید کو سماع کی اجازت نہ دیتے تھے اور اس ضمن میں مشائخ کے عمل کی نکیر فرماتے تھے۔ (شیخ عبدالحق محدث دہلوی کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے ان سے عرض کیا کہ ہمارے ملک (برصغیر ہندوستان) میں رسم قوالی عجیب طریقے سے متعارف اور عام ہو گئی ہے۔ اگر کوئی شخص قوالی سننے سے

---

❶ اخبار الاخیار، ص ۱۷۱۔

❷ اخبار الاخیار۔ ص ۱۷۱، ۲۷۲۔

Marfat.com

انکار یا پرہیز کرتا ہے تو سب لوگ اس کی مخالفت پر اتر آتے ہیں' اسے برا مانتے ہیں اور مشائخ کا حوالہ دے کر اسے متہم ٹھہراتے ہیں۔ آپ فرمایئے' ایسے موقعے پر کوئی کیا کرے۔؟ فرمایا۔ اگر کبھی ہم خیال اصحاب جمع ہوں' یا اصحاب معنی کا مجمع ہو اور ہم مشرب دوست مل بیٹھے ہوں تو پھر قوالی میں مقررہ شدہ شرائط کے ساتھ کوئی غزل سنی جائے تو مضائقہ نہیں۔ اس پر میں (عبدالحق دہلوی) نے عرض کیا کہ ہندوستان میں قوالی کے بارے میں یہ قاعدہ رواج پذیر ہے کہ مجلس قوالی میں ہر قسم کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں' جن میں اہل و نا اہل اور فاسق و صالح افراد موجود ہوتے ہیں' اور جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا' ادھر ادھر کی ہر قسم کی باتیں کرتے ہیں' ایسی مجلسِ قوالی کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ جواب میں فرمایا' ایسی مجلس قوالی قطعاً جائز نہیں۔ طالب حق کے لیے ضروی ہے کہ اس سے پرہیز کرے۔ جب کبھی ایسی صورت حال پیدا ہو تو اس میں ہرگز مسامحت یا چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے۔ (یعنی اس میں خود بھی شامل نہیں ہونا چاہیے اور دوسروں کو بھی شامل ہونے سے روکنا چاہیے۔)

قوالی کے عدم جواز کے سلسلے میں شیخ عبدالوہاب متقی کے یہ الفاظ بالکل صاف ہیں' ان میں کسی قسم کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

شادی:

اپنے مرشد واستاد شیخ علی متقی کی زندگی میں شیخ عبدالوہاب انہی کی خدمت میں رہے اور ان کی کتابوں کی ترتیب وتصحیح اور نقل وکتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے علاوہ مطالعہ کتب' تعلیم وتعلم اور ذکر وشغل کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں انھوں نے شادی نہیں کی۔ شیخ کی وفات کے بعد بھی وہ عرصے تک مجرد رہے۔ جب عمر چالیس اور پچاس سال کے درمیان پہنچی تو شادی کی۔ شادی سے پہلے کتابت وتصحیح اور نذرانوں وغیرہ کی جو رقم ان کے پاس تھی' وہ سب فقرا و مستحقین میں تقسیم کر دی۔ البتہ اپنے ذاتی استعمال کے کپڑے' کچھ غلہ اور کتابیں پاس رکھیں۔ شادی کے بعد اہل وعیال کے حقوق کا ہر لمحہ خیال رکھا اور دیگر حقوق پر انھیں ترجیح دی۔ اس کے ساتھ ہی فقرا' غربا اور مستحقین کی مدد میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہندوستان کے جو لوگ ارضِ حجاز میں جاتے' ان کی بے حد امداد کرتے' ان کے لیے کھانا' ضروری سامان' لباس اور رقم وغیرہ کا بھی کھلے دل سے انتظام فرماتے۔

علم وفضل:

شیخ عبدالوہاب متقی گیارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر ہندی عالم تھے' حافظے کا یہ عالم تھا کہ لغت کی مشہور کتاب قاموس انھیں زبانی یاد تھی۔ حدیث' فقہ اور علم فلسفہ کی اکثر کتابیں ازبر تھیں۔ عربی ادبیات کے ماہر تھے۔ برسوں حرم شریف میں حدیث' فقہ' عربی ادب اور کتب فلسفہ کا درس دیتے رہے۔ مشکل سے مشکل مسائل کی پیچیدہ گرہیں فوراً کھول دیتے۔ اللہ نے انھیں بے شمار خوبیاں عطا فرمائی تھیں۔ بڑھاپے میں ضعف

Marfat.com

بصارت کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا' اور خانہ نشین ہو گئے تھے۔ تاہم کسی نہ کسی صورت میں افادے کا سلسلہ بدستور جاری رکھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ان کے علم و فضل کی بے حد تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ ہمہ گیر عالم دین تھے اور ہر موضوع کی کتابوں پر کامل عبور رکھتے تھے۔

می تواں گفت کہ دریں زمان بدانش ایشاں در علوم شرعیہ کم تر کسے خواہد بود ❶۔

(یعنی کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ زمانے میں (شیخ عبدالوہاب متقی) جیسا علوم شرعیہ کا ماہر کوئی کم ہی ہو گا۔)

حصول علم ہی درحقیقت ذکر الٰہی ہے:

شیخ عبدالوہاب متقی فرمایا کرتے تھے کہ علم' غذا کی مانند ہے' جس کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ اس کا نفع عام ہے۔ علم کی مثال دوا سے بھی دی جا سکتی ہے' جو ایک ذریعہ علاج ہے۔ یعنی جس طرح جسمانی امراض کا علاج دوا کے ذریعے کیا جاتا ہے' اسی طرح روحانی اور قلبی بیماریوں کا علاج علم کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ طالب کو چاہیے کہ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر عالم خلوت میں فراغت قلب اور حضورِ خاطر کرے۔ بالخصوص رمضان المبارک کے عشرۂ آخر میں اور ذی الحجہ کے عشرۂ اول میں خلوت گزیں ہو کر ذکر و شغل اور عبادت میں مصروف رہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ باقی دنوں میں حصولِ علم میں مشغول اور پڑھنے پڑھانے میں منہمک رہے۔ کچھ لوگوں نے شیخ ممدوح سے سوال کیا کہ مشائخ جو اس بات کی ترغیب دیتے رہے ہیں کہ ہمیشہ اور ہر آن ذکر الٰہی میں مشغول رہنا چاہیے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ اس سوال کا انھوں نے نہایت عمدہ جواب دیا فرمایا:

ہر کہ با عمل خیر مشغول است' دائم در ذکر است' نماز گزاردن ذکر است' و تلاوت قرآن ذکر است' درسِ علومِ دینیہ ذکر است۔ وہ ہر چہ عمل خیر است' ذکر است' ایں دائم است ❷۔

(جو شخص امور خیر میں مشغول ہے' وہ درحقیقت ہمیشہ ذکر الٰہی میں رہتا ہے۔ نماز ادا کرنا ذکر ہے' تلاوت قرآن ذکر ہے' علوم دین کا درس و تدریس ذکر ہے' اور ہر اچھا کام جس پر دوام کیا جائے' ذکر ہے۔)

آگے چل کر فرمایا:

روش سلف متقدمین ہمیں ست کہ تثبت بہ انواعِ اعمالِ خیر و تہذیب اخلاق و نشرِ علوم می کردند ❸۔

---

❶ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۲۔

❷ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۲۔

❸ ایضاً۔

Marfat.com

(ہمارے اسلاف کا یہ طریقہ رہا کہ ہمیشہ ہر قسم کے اچھے کاموں مثلاً تہذیب اخلاق اور اشاعت علوم وغیرہ میں مصروف رہتے۔)

شیخ عبدالوہاب متقی حصولِ علم کی ہمیشہ ترغیب دیتے رہے اور ان کے نزدیک درحقیقت یہی ذکر الٰہی ہے' اس سے روگردانی ان کے نقطہ نظر کے مطابق صحیح نہیں۔ اس ضمن میں ان کے یہ الفاظ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ فرماتے ہیں:

علم از اں قبیل نیست کہ ہیچ کس ترک آن فرمایند سعی وتصحیح نیت باید کرد ❶۔

(یعنی علم وہ شے نہیں ہے' جسے ترک کر دیا جائے۔ بلکہ یہ وہ دولت بے بہا ہے' جس کے ذریعے بہتر امور کی انجام دہی کے لیے جدوجہد کی جائے اور قلب ونیت کے زاویوں کو صحیح سمت پر رکھا جائے۔)

ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ جس انداز سے بعض درویش دعوتِ حق دیتے ہیں' یہ وصول حق کا طریقہ ہے یا نہیں۔؟

فرمایا ممکن ہے' یہ بھی ایک طریقہ ہو' لیکن اس قسم کے داعیان حق بہتر اور عمدہ اخلاق کے حامل نہیں ہوتے۔ ان میں سے اکثر کج خلق ہوتے ہیں' جو لوگوں کی طرف سے پہنچائی گئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو! غلط آدمی جلد ہی مکافاتِ عمل کی زد میں آ جاتا ہے اور برے کام کا بدلہ پا لیتا ہے۔ داعیانِ حق کو خوش اخلاق اور شائستہ مزاج ہونا چاہیے' اور اس دل گردے کا مالک ہونا چاہیے کہ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والے مصائب وآلام کو برداشت کر سکے ❷۔

مشائخ کے مروجہ انداز ذکر کے بارے میں:

شیخ عبدالوہاب متقی نے اس ذکر الٰہی کے بارے میں بھی اظہار رائے کیا ہے' جو مشائخ وصوفیا ایک خاص انداز سے حلقہ باندھ کر کرتے ہیں اور جو متعدد مقامات میں اب رواج پا گیا ہے۔ اس مروّجہ اسلوبِ ذکر کے بارے میں وہ وضاحت سے کہتے ہیں کہ یہ سنت نبوی ﷺ سے ثابت نہیں ہے' تاہم بعض صوفیا کا یہ ایک طریقہ ہے' جسے وہ مستحسن قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ کے الفاظ یہ ہیں:

ایں کیفیت حلقہ ذکر وبعضے اوضاع وانواع ذکر کہ درویشاں می کنند' اگرچہ آں راسندے صحیح درسنت نبوی ﷺ نیست' اما از مستحسنات مشائخ است ❸۔

---

❶ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۲۔

❷ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۳۔

❸ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۳۔

Marfat.com

(یعنی حلقہ باندھ کر ذکر الٰہی کی ان کیفیتوں اور اس سلسلے کی بعض ان شکلوں کی جو درویشوں اور صوفیوں میں رواج پذیر ہیں، رسول اللہ ﷺ کی سنت میں تو کوئی صحیح سند موجود نہیں ہے، مگر یہ مشائخ کا ایک اسلوب ہے جو ان کے مستحسنات میں سے ہے۔)

ہندو جوگی کا قبول اسلام:

شیخ ممدوح کا انداز تبلیغ اسلام بڑا حکیمانہ تھا اور ان کی ہر بات میں ایک خاص اثر تھا۔ ان کی صحبت سے بے شمار مسلمانوں نے اسلام میں رسوخ حاصل کیا اور متعدد غیر مسلم حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں ایک ہندو جوگی کا ذکر بھی اخبار الاخیار میں مرقوم ہے۔ اس کے قبولِ اسلام کا واقعہ جن فارسی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، ان کا ترجمہ یہ ہے:

ایک دن جنگم جوگی کی ریاضت و تصوف کا تذکرہ شیخ عبدالوہاب متقی کی مجلس میں ہوا تو فرمایا کہ دورانِ سیاحت میں ہماری بھی ایک جوگی سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بہت ریاضتیں کرتا اور خوارقِ عادات کا اظہار کرتا تھا۔ مجھ سے وہ کہا کرتا تھا کہ میرے پاس سونے کا ایک قلعہ ہے۔ تم (عبدالوہاب) اگر میرے ساتھ ریاضت کرو تو میں تمھیں اس طلائی قلعے کے اندر لے جاؤں گا۔ شہر کے مرد وزن کا ہجوم اس کے پاس رہتا، وہ لوگ ہر قسم کے تحفے تحائف، کھانے پینے کی مختلف چیزیں اور نقدی کی صورت میں مال و دولت اس کو پیش کرتے، لیکن وہ جوگی کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھتا۔ اسی وقت سب چیزیں لوگوں میں تقسیم کر دیتا۔ میں نے اس کو اسلام کی کچھ باتیں سنائیں تو اس نے بڑے شوق اور توجہ سے سنیں۔ چونکہ اس نے طلائی قلعہ دکھانے کا کئی بار مجھ سے وعدہ اور تذکرہ کیا تھا، لہٰذا میں نے خاص طور پر اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ مگر وہ ایفائے عہد نہ کر سکا اور پریشان سا رہنے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میری یہ بات سننے کے بعد اپنے روزمرہ کے جوگی گری کے معمولات میں مشغول ہو جاتا تھا۔ بالآخر اس نے اسلام قبول کر لیا اور میرے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا[1]۔

ریاضت اور ترک سوال کا دور:

شیخ عبدالوہاب متقی ابتدائے عمر میں جب کہ وہ بیس سال کی عمر کو بھی نہیں پہنچے تھے، شدید ریاضتوں کے عادی تھے۔ وہ جنگل میں نکل جاتے اور ریاضت میں مشغول ہو جاتے۔ ان کی زندگی کا یہ وہ دور تھا جب انھوں نے اپنے چند ساتھیوں سمیت سخت سے سخت ضرورت کے موقعے پر بھی ترک سوال اور کسی سے کوئی چیز نہ مانگنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس ضمن میں اخبار الاخیار کے حوالے سے شیخ ممدوح کے دو واقعے ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

[1] اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۷۔

Marfat.com

ایک مرتبہ درویشوں کی ریاضت' ترک سوال اور غذا و خوراک سے دامن کشاں رہنے کے سلسلے میں شیخ عبدالوہاب متقی نے اپنا ایک واقعہ یوں بیان کیا کہ ایک زمانے میں ہماری غذا کی یہ کیفیت تھی کہ ہم دو آدمی تھے' ہم میں سے کوئی ایک قصائی کی دکان سے وہ ہڈیاں اٹھا لاتا' جنھیں قصائی گوشت اتار کر پھینک دیتا تھا۔ پھر کھیتوں میں جا کر گیہوں کے تنکے چن کر لاتا۔ ہم ان ہڈیوں اور گیہوں کے تنکوں کو اچھی طرح پانی سے دھو کر اور ان کی مٹی اتار کر دیگچے میں ابال لیتے اور پھر اس شوربے کا ایک ایک پیالہ پی لیتے۔ ارد گرد کے لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ ہماری غذا یہ ہے تو وہ ہمارے لیے انواع و اقسام کے کھانے لانے لگے' مگر ہم وہاں سے چلے گئے تاکہ لوگ ہمیں کچھ نہ دے سکیں۔ اس کے بعد ہم نے یہ معمول بنا لیا کہ تین دن سے زیادہ کہیں قیام نہ کرتے تھے ❶۔

ان کا ایک اور واقعہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی' ان کے ایک دوست کی زبانی مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

فقیر از یکے از یاران ایشاں شنیدہ است کہ می گفت' یک بارے در ایام قحط' در مسجدے با یک یارِ دیگر نشستہ بودند۔ در یک گوشہ مسجد ایشاں مشغول بودند و در گوشہ دیگر آں یار دیگر۔ وقرار دادہ بودند کہ با یک دیگر سخن نہ کنند و از کسے طعام نہ طلبند۔ بست روز بریں حالت گزشتہ بود کہ ہیچ چیز از طعام نہ خوردہ بودند۔ شخصے حلوا فروش طعام در میان ایں دو کس می نہاد و می رفت۔ ہیچ کدام از ایشاں آں طعام را نہ خورد۔ چوں مکرر شد دیگر آں مرد حلوائی لقمہ می کرد و در دہان ایشاں می نہاد و می خوردند ❷۔

(یعنی شیخ عبدالوہاب متقی کے ایک دوست نے انھیں (شیخ عبدالحق محدث کو) بتایا کہ ایک مرتبہ زمانہ قحط میں شیخ عبدالوہاب اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک مسجد میں مقیم تھے۔ مسجد کے ایک گوشے میں یہ (عبدالوہاب) اور دوسرے گوشے میں وہ (ان کا دوست) عبادت الٰہی میں مصروف تھے۔ دونوں نے باہم عہد کر رکھا تھا کہ نہ آپس میں ہم کلام ہوں گے اور نہ کسی سے کھانے کو کچھ طلب کریں گے۔ بیس دن اسی طرح گزر گئے' کسی نے کھانا نہ کھایا۔ اکیسویں دن ایک حلوا فروش نے دونوں کے درمیان کھانا رکھا اور چلا گیا۔ لیکن دونوں نے اس میں سے کچھ نہ کھایا۔ پھر دوسری مرتبہ بھی یہی ہوا۔ یہاں تک کہ تیسری مرتبہ اس حلوائی نے خود اپنے ہاتھ سے لقمے بنا کر دونوں کو کھلائے۔)

یہاں قدرتی طور سے یہ سوال سطح ذہن پر ابھرتا ہے کہ کیا یہ طریق عبادت اور نہج ریاضت اسلامی اسلوب عبادت سے ہم آہنگ ہے؟ ذکر و سلوک کا یہ مشقت انگیز انداز قرآن و سنت سے ثابت ہے؟ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل سے اس کی تائید ہوتی ہے؟ آثار صحابہ یا عمل صحابہ (رضوان اللہ علیہم) سے یہ منقول ہے؟

---

❶ اخبار الاخیار–ص ۲۷۷۔

❷ اخبار الاخیار–ص ۲۷۸۔

Marfat.com

تابعین و تبع تابعین کے خیر القرون میں اس کا کہیں سراغ ملتا ہے؟ ائمہ حدیث وفقہ نے اس نہج عبادت کی تصریح کی ہے اور اسے قرین صواب اور مطابق قرآن وحدیث قرار دیا ہے؟۔ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہے۔

مگر ہم یہاں اس بحث سے تعرض نہیں کرنا چاہتے۔ صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ طریق عبادت بہت بعد کی ایجاد ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا عمل تو یہ تھا کہ آپ بھوک پیاس کے وقت کھانے پینے کی چیزیں کسی دوسرے شخص سے مانگ لیتے تھے۔ صحابہ کرام بھی اپنی ضروریات کا اظہار بے تکلفی سے ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ ان کے بعد وہ بزرگان دین بھی جنھیں سلف صالحین کے مقدس لقب سے ملقب کیا جاتا ہے' اشیائے ضروریہ کے آپس میں لین دین میں نہ صرف کوئی قباحت محسوس نہ کرتے تھے' بلکہ اس کو نیکی سمجھ کر ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ حدیث وفقہ کے اس پورے ذخیرے میں جو آج باقاعدہ مرتب و مدون شکل میں ہمارے سامنے ہے' کہیں اس قسم کی عبادت کا پتا نہیں چلتا' جو بعض مشائخ وصوفیا سے منقول ہے۔

لیکن ان صوفیائے کرام اور مشائخ عظام کے اس طرز عبادت میں علیحدگی وانزوا' امور دنیا سے بے تعلقی اور اصحاب دولت سے انقطاع کا جو پہلو موجود ہے' وہ بہرحال فائدے سے خالی نہیں۔ اس میں ان کی خود اپنی ذاتی ضروریات سے بے نیازی' اونچا پن' بے پناہ قوتِ برداشت' حرص و آز دنیوی سے کنارہ کشی اور ارباب سلطنت سے بے اعتنائی کا بہت ہی بلند تصور پایا جاتا ہے۔ پھر اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں جہاں جاذبِ نظر اور باعث کشش بے شمار بوقلموں چیزیں ہر سو پھیلی ہوئی ہیں' اللہ کے نیک بندوں کا ایک ایسا گروہ موجود ہے' جس نے مفادات عاجلہ کو ترک کر کے اپنے آپ کو صرف اللہ کے حوالے کر رکھا ہے۔ ان کا تمام وقت ذکر الٰہی میں گزرتا ہے اور وہ ہر طرف سے منقطع ہو کر عبادت الٰہی کے لیے وقف ہو گئے ہیں۔

شیخ کا موقف:

یہ بحث اس وقت ہمارے دائرۂ موضوع سے خارج ہے۔ ضمناً چند باتیں نوک قلم پر آ گئی ہیں۔ اس موقعے پر ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اکثر مروّجہ معمولات میں شیخ عبدالوہاب متقی کا موقف اپنے اندر اعتدال و توازن لیے ہوئے تھا۔ وہ محض اختلاف عمل کی بنا پر کسی پر فتوی لگانے کے عادی نہ تھے' اگرچہ وہ خود وجد وحال اور جذب وسلوک کی بعض ان کیفیات کے مخالف تھے جو صوفیا کے ایک طبقے میں پائی جاتی ہیں' تاہم ان کے صدور کو وہ الحاد و زندیقیت کی حد تک نہیں لے جاتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان صوفیا کو ملحد قرار دیتے تھے جو عمل کے اعتبار سے طریق اہل سنت سے ہٹے ہوئے ہوں اور خلاف اسلام امور کے مرتکب ہوتے ہوں۔ پھر وحدت الوجود کے وہ شدید مخالف تھے' جب کہ اس دور کے اکثر صوفیا و مشائخ اس کے حامی تھے۔ وہ شیخ محمد غوث گوالیاری کے بھی مخالف تھے' کیوں کہ وہ وحدت الوجود کے حامی تھے اور اسی بنا پر شیخ عبدالوہاب

Marfat.com

کے والد شیخ ولی اللہ مانڈوی نے ان کی صحبت سے ان کو گریزاں رہنے کی وصیت کی تھی۔ شیخ عبدالوہاب نے ابن العربی کی کتابوں کے بارے میں بعض مواقع پر سکوت اختیار کیا ہے اور بعض مواقع پر لوگوں کو ان کے مطالعہ سے منع بھی کیا ہے۔

سکوت ان اہل علم کے لیے اختیار فرمایا ہے، جن کا مطالعہ وسیع ہو، اور وہ عقائد اہل سنت میں راسخ ہوں، خلاف شرع امور سے ان کے متاثر ہونے کا کوئی اندیشہ نہ ہو ____ اور منع ان لوگوں کو کیا ہے جو ابھی تصوف و سلوک یا علم کی ابتدائی منزل میں ہوں، عقیدہ وفکر کے اعتبار سے زیادہ پختگی اور رسوخ کے حامل نہ ہوں، اور ان کے دوائر مطالعہ بھی محدود ہوں۔

حلقۂ تلامذہ:

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا، شیخ عبدالوہاب بیس سال سے بھی کم عمر میں مکہ مکرمہ پہنچ گئے تھے۔ یہ ماہ جمادی الاولیٰ ۹۶۳ھ/ مارچ ۱۵۵۶ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں وہاں ایک بہت بڑے ہندوستانی عالم شیخ علی بن حسام الدین متقی گجراتی قیام فرما تھے۔ ان سے سلسلۂ ارادت استوار کیا، علم ومعرفت سے بہرور ہوئے اور ان سے اور وہاں کے دیگر علما و مشائخ سے سند حدیث حاصل کی۔ بارہ سال یعنی شیخ علی متقی کی وفات (۲ر جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ/۴ر نومبر ۱۵۶۷ء) تک ان کی خدمت میں رہے۔

مکہ مکرمہ میں شیخ عبدالوہاب متقی نے خود بھی درس وافادہ کا سلسلہ شروع کیا، جس سے علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے استفادہ کیا۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے اصحاب علم اور ارباب ورع وتقویٰ ان سے بہت متاثر تھے۔ وہ ان کی اصلاحی اور تبلیغی سرگرمیوں سے بھی اثر پذیر تھے، زہد واتقا کی وجہ سے بھی ان کی قدر کرتے تھے اور علوم ومعارف میں مہارت کی بنا پر بھی وہ ان کے مداح تھے۔

شیخ عبدالوہاب متقی کے ارشد اور مشہور تلامذہ ومعتقدین میں سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا اسم گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔ وہ ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء کو حجاز پہنچے اور ۹۹۹ھ/ ۱۵۹۱ء تک وہاں مقیم رہے۔ تقریباً یہ تمام عرصہ شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں گزرا۔ علم کی تکمیل کی اور احسان وسلوک کی راہوں سے آشنا ہوئے۔ شیخ متقی سے مشکوۃ کا درس لیا، کچھ اور کتابیں بھی پڑھیں۔ صحیح مسلم کی قرأت کی اجازت بھی لی۔ پھر فرمایا۔

اکنوں عزیمت ہندوستان بکنید۔

(اب ہندوستان جانے کا عزم کرو۔)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے قیام مکہ مکرمہ کے دوران شیخ عبدالوہاب متقی سے بڑا استفادہ کیا اور علم حدیث کا زیادہ تر درس انہی سے لیا۔ اس کا تذکرہ خود شیخ عبدالحق اپنی کتاب تالیف قلب الالیف میں ان الفاظ

Marfat.com

میں کرتے ہیں اور اپنے عظیم القدر استاد کی بے حد تعریف فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

تمامئہ کتب احادیث وسائر علوم دینیہ از علمائے آں عالی مقام علیہم رحمتہ اللہ الملک العلام خصوصاً از حضرت شیخ اجل واکرم، اوحد واعدل عبدالوہاب متقی قدس اللہ روحہ واوصل الینا فیوضہ وفتوحہ بہ تلقین ذکر وایثار خلوت و برکت مشرف وفائز شد، ونعمتہا و بشارتہا از خدمت وے درحصول انوار وآثار نتائج وثمرات برکت والتزام مقام صدق واستقامت در نشر علوم دینی وحصول مواہب یقینی مشرف ومبشر گشتہ، برجوع وعود بوطن مالوف مامور ومکلف شد۔

(یعنی تمام کتب احادیث اور علوم دینیہ حجاز کی مقدس سرزمین کے علمائے کرام سے حاصل کیے۔ بالخصوص حضرت شیخ عبدالوہاب متقی قدس اللہ روحہ سے ذکر الٰہی وغیرہ کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہوا۔ ان کی صحبت بابرکت سے بہت سی نعمتیں حاصل کیں اور حصول انوار و برکات اور علوم دینی کی نشر واشاعت میں استقامت کے بارے میں کئی قسم کی بشارتیں سننے کے بعد وطن مالوف (ہندوستان) کو واپس لوٹا۔)

وفات:

بہر حال شیخ عبدالوہاب متقی اس برصغیر کے جلیل القدر عالم دین، عظیم المرتبت محدث وفقیہ اور نامور سالک وصوفی تھے۔ وہ چھتیس سال مکہ مکرمہ میں اقامت گزیں رہے اور اتنی ہی مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ❶۔

۵۶- قاضی عبدالوہاب گجراتی

قاضی عبدالوہاب احمد آبادی گجراتی، ''مجمع البحار'' کے مصنف شیخ محمد بن طاہر بن علی پٹنی کی اولاد سے تھے، اور اپنے زمانے کے شیخ اور عالم وفقیہ تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں اپنے مولد ''موگی پٹن'' کے جو احمد نگر کے نواح میں واقع تھا، قاضی مقرر ہوئے اور مدت تک اس منصب پر فائز رہے۔ جب عالم گیر بلاد دکن کا والی مقرر ہو کر آیا تو اس سے قرب وتعلق پیدا ہو گیا، پھر ملک کی زمام حکومت اس کے ہاتھ میں آئی تو اس نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں ہندوستان کی مسند قاضی القضاۃ پر مامور کیا۔ اورنگ زیب عالم گیر ان کی بہت توقیر کرتا اور ان پر اعتماد کرتا تھا۔ وہ اس ملک کے عظیم المرتبت قاضی القضاۃ تھے۔ ان سے پہلے کوئی قاضی ان کے درجے کو نہیں پہنچا۔ ان کی ہیئت وشخصیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تمام امرائے مملکت ان سے لرزتے

❶ شیخ عبدالوہاب متقی کے حالات کے لیے دیکھیے: اخبار الاخیار- ص۲۶۹ تا ۲۷۸- خزینۃ الاصفیا ج ۱، ص ۱۳۸ تا ۱۴۰- تاریخ برہان پور ص ۱۲۰- حدائق الحنفیہ ص ۳۹۲ تا ۳۹۴- تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۹- تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان ص ۳۶۸ تا ۳۷۰- رود کوثر ۳۵۲، ۳۵۳- نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۶۶، ۲۶۷- حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۰۲ تا ۱۱۱-

Marfat.com

تھے۔ شرعی احکام کے اجرا اور فیصلوں کے نفاذ میں نہایت سخت تھے۔ صدق و دیانت اور صالحیت میں منفرد حیثیت کے مالک تھے، مگر اس کے باوجود لوگ ان پر رشوت ستانی کا الزام بھی لگاتے تھے ___ ان کی وفات ۱۸ رمضان ۱۰۸۶ھ/ ۲۶ نومبر ۱۶۵۷ء کو دہلی میں ہوئی ❶۔

۵۷- ملا عبدالوہاب پسروری

ملا عبدالوہاب پسروری، فرحت الناظرین کے مصنف محمد اسلم انصاری پسروری کے جدّ امجد تھے۔ اپنے عہد کے مشہور فاضل اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ عقل و دانش، تبحر علمی اور کثرت معلومات میں مشہور تھے۔ ضرورت مندوں کے کام آتے اور لوگوں کے کام کاج کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کرتے چھوٹے بڑے کے سامنے کسر نفسی اور تواضع ان کی عادت تھی۔ اکثر متداول کتابیں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے پڑھیں، جن کا سلسلہ درس ان کے زمانے میں زوروں پر تھا۔ علم فقہ، اصول فقہ اور معانی میں دست گاہ رکھتے تھے۔ متوکل علی اللہ اور فقیر منش تھے۔ علوم دینی کی نشر و اشاعت ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ مغل حکمران شاہ جہان کئی مرتبہ ان کی خدمت میں گیا اور انھیں مناصب و وظائف سے نوازنا چاہا۔ بالآخر شاہ جہان کے وزیر علامی سعد اللہ خاں کی کوشش سے جو خود بھی بہت بڑے عالم دین اور علم پرور تھے، ملا عبدالوہاب نے اپنے بیٹوں کے لیے دو گاؤں بطور جاگیر قبول کیے۔ بعد ازاں بادشاہ نے ان کے بیٹوں کو چار گاؤں عطا کیے، جو سکھوں کے ہنگامے تک ان کے قبضے میں رہے۔ ملا عبدالوہاب پسروری نے ۱۰۵۹ھ/ ۱۶۴۹ء میں انتقال کیا ❷۔

صاحب ''فرحت الناظرین'' محمد اسلم پسروری نے اپنی اس کتاب کے ایک اور مقام پر ان کا ذکر ''قاضی عبدالوہاب پر سروری'' کے عنوان سے کیا ہے اور سال وفات ۱۰۸۶ھ لکھا ہے۔ مصنف کے فارسی الفاظ یہ ہیں۔

قاضی عبدالوہاب پر سروری ❸ 'جدِ ماجد راقم' عالم متبحر' جامع معقول و منقول چندے بقضائے لشکر عالم گیر قیام داشت' پیوستہ باستفادہ و افادہ طلبائے علم می ورزد و سلسلۂ ارادت خود در قادریہ داشت۔ ۱۰۸۶ھ در ماہ رمضان فوت شد ❹۔

---

❶ مآثر الامرا ج ا، ص ۲۳۲ تا ۲۳۸- ج ۳، ص ۴۹۳- منتخب اللباب ص ۲۱۶، ۲۴۷- مآثر عالم گیری ص ۱۴۴- یاد ایام ص ۷۷-۷۸- بزم تیموریہ- ص ۲۴۷ تا ۲۴۹- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۱۱، ۱۱۲- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۶۷، ۲۶۸

❷ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۱۰، ۱۱۱-

❸ اس زمانے میں ''پسرور'' کو ''پر سرور'' لکھتے تھے-

❹ فرحت الناظرین ورق ۷۷ لباب، نسخہ بوڈلین لائبریری-

Marfat.com

(یعنی قاضی عبدالوہاب پسروری راقم (مصنف فرحت الناظرین) کے جد بزرگ وار، متبحر عالم اور علوم معقول و منقول کے جامع تھے۔ کچھ عرصہ اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے لشکر میں منصب قضا پر مامور رہے۔ طلبائے علوم کو تدریس و افادہ ان کا مشغلہ تھا۔ تعلقِ ارادت سلسلہ قادریہ سے تھے۔ ماہ رمضان المبارک ۱۰۸۶ھ (نومبر ۱۶۷۵ء) میں فوت ہوئے۔)

۵۸- شیخ عبدالوہاب قدوائی راج گیری

شیخ عبدالوہاب قدوائی راج گیری نواب منعم خاں، فاضل کبیر اور شیخ وقت تھے۔ علومِ نحو و صرف، علم لغت، اصول اور کلام میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان مضامین سے متعلق بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں علم صرف کی مفتاح الصرف، علم کلام کی بحر المذاہب اور عقائد کی کتاب الصدرہ شامل ہیں۔ ان کی کتاب بحر المذاہب کا ایک قلمی نسخہ رام پور (ہندوستان) کے کتب خانہ حامدیہ میں موجود ہے، جو ۱۰۲۹ھ/۱۶۲۰ء کا مکتوبہ ہے [1]۔

۵۹- خواجہ عبیداللہ دہلوی

خواجہ عبیداللہ دہلوی، حضرت خواجہ عبدالباقی نقشبندی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے لڑکے تھے۔ یہ وہی خواجہ عبدالباقی ہیں جو خواجہ باقی باللہ کے لقب سے معروف ہیں، اور گیارھویں صدی ہجری کے دیار ہند کے مشہور بزرگ اور حضرت مجدد الف ثانی کے مرشد ہیں۔

حضرت خواجہ باقی باللہ ۵ ذی الحجہ ۹۷۱ھ/۱۴ر جولائی ۱۵۶۴ء کو کابل میں پیدا ہوئے۔ والدین نے محمد رضی الدین نام رکھا۔ لیکن بڑے ہو کر باقی باللہ، یا محمد باقی باللہ یا عبدالباقی کے اسمائے گرامی سے شہرت پائی۔ والد کا نام قاضی عبدالسلام تھا، جو اپنے علاقے کے اہل علم میں سے تھے۔ انھوں نے لائق بیٹے کی تعلیم و تدریس کی طرف خاص طور سے توجہ مبذول کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھیں ملا صادق حلوائی کی خدمت میں بھیجا گیا۔ ملا حلوائی اس عہد اور علاقے کے نامور فاضل اور بہترین شاعر تھے۔ وہ درحقیقت سمرقند کے باشندے تھے۔ حج بیت اللہ کو گئے اور واپس آئے تو اکبر کا چھوٹا بھائی مرزا حکیم جو اس وقت کابل کا حکمران تھا، انھیں کابل لے آیا اور وہاں انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ خواجہ باقی باللہ بھی کابل آ گئے اور ملا حلوائی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد جب وہ کابل کی سکونت ترک کر کے ماوراء النہر تشریف لے گئے تو خواجہ باقی باللہ بھی ان کے ساتھ تھے۔

خواجہ باقی باللہ نے علوم مروّجہ بڑی تیزی سے حاصل کرنا شروع کیے۔ ان کے اعزہ و اقارب حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر متعین تھے اور چاہتے تھے کہ خواجہ بھی تکمیل علم کے بعد کسی اچھے عہدے پر فائز ہو جائیں، لیکن

[1] ابجد العلوم ص ۹۳۴- نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۶۸-

Marfat.com

تعلیم ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ان کی طبیعت زہد و عبادت اور طریقت و تصوف کی طرف منعطف ہوگئی۔ چنانچہ افغانستان اور ماوراء النہر کے بعض صوفیا و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر تزکیہ نفس میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں عالم جوانی ہیں برصغیر پاک و ہند کا رخ کیا اور دہلی میں اقامت اختیار کی۔ جلد ہی ان کے تقویٰ و تصوف کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس زمانے میں اس ملک پر جلال الدین اکبر دادِ حکمرانی دیتا تھا۔ برصغیر کے بہت سے علما و فضلا، متعدد مشائخ و صوفیا اور کچھ امرا و وزرا ان کے حلقۂ بیعت وارشاد میں داخل ہوئے۔ دیارِ ہند کے اس عظیم صوفی اور صاحب طریقت بزرگ نے صرف چالیس سال عمر پائی اور ۲۵ جمادی الاخری ۱۰۱۲ھ/ ۲۰ نومبر ۱۶۰۳ء کو دہلی میں انتقال کیا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کی دو بیویوں سے دو بیٹے تھے، جو ان کی وفات سے دو سال پیشتر تقریباً چار مہینوں کے فرق سے پیدا ہوئے۔ بچوں کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد حضرت خواجہ نے اپنے جلیل القدر مرید حضرت مجدد الف ثانی کی عنان توجہ اس طرف مرتکز کرائی کہ مجھ پر ضعف بدن غالب آ گیا ہے اور امید حیات کم رہ گئی ہے۔ آپ ان خرد سال بچوں کا خیال رکھیں۔ ان لڑکوں میں سے ایک کا نام جو بڑے تھے، عبید اللہ تھا، اور دوسرے کا نام عبداللہ۔!

عبید اللہ، یکم ربیع الاول ۱۰۱۰ھ/ ۲۰ر اگست ۱۶۰۱ء کو پیدا ہوئے، اور ان کا نام سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار کے نام پر رکھا گیا۔ یہ اپنے دوسرے بھائی خواجہ عبداللہ سے کچھ دن عمر میں بڑے تھے، اس لیے خواجہ کلاں کے عرف سے معروف ہوئے۔ ان کی ولادت پر خواجہ باقی باللہ نے بے حد خوشی کا اظہار کیا، ان کی ولادت، اذان اور نام کے بارے میں کئی اشعار لکھے۔ شیخ حسام الدین کی نگرانی میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ان سے اور شیخ اللہ داد دہلوی سے اخذ علم اور کسب طریقت کیا۔ تکمیل علم کے بعد اپنے دور کے علما و فقہا اور مشائخ میں شمار ہوئے۔ علم تاریخ اور علم انساب میں بھی بہرۂ کامل رکھتے تھے۔ تصوف و طریقت سے بھی بہت شغف تھا اور علم انشا میں بھی قدرت حاصل تھی۔ مطالعہ کتب ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ ایک کتاب احوال صحابہ و تابعین سے لے کر اپنے دور کے مشائخ تک کے حالات میں لکھی۔ ''احوال صحابہ و تابعین و تبع تابعین و مشائخ دین تاوقت خودنوشتہ۔'' مجدد الف ثانی کے لڑکے شیخ محمد معصوم سرہندی کے نام حقائق و معارف کے سلسلے میں کچھ مکتوب تحریر کیے۔

لیکن ان کی یہ کتابیں اب کہیں نہیں ملتیں۔ شیخ محمد اکرام افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں۔

''ان کتابوں میں سے ہمیں ایک بھی دست یاب نہیں ہوئی۔ لیکن انڈیا آفس لائبریری (ذخیرۂ دہلی) میں خواجہ کلاں کی ایک اہم تصنیف ''مبلغ الرجال'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ چھوٹے سائز کے ۱۱۸ اوراق ہیں۔ اس کا مقصد تصنیف اس انتشار کو رفع کرنا تھا جو ''آرائے اہل فکر و نظر و اقوال کشف و شہود'' کی وجہ سے ''معرفت حقیقت

Marfat.com

عالم'' کے متعلق پیدا ہو گیا تھا۔ کتابچے کا کافی حصہ قرامطہ وملاحدہ کے بیان میں ہے۔ اکبر ابوالفضل اور شیخ مبارک پر بڑی نکتہ چینی کی ہے۔ بعض صوفیا کی تصانیف اور ان صوفیا کی جو قلت ادراک کی وجہ سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے شکایت کی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کا ذکر اپنے والد کے ''اعظم الخلفا'' کے الفاظ سے کیا ہے۔''

خواجہ عبیداللہ دہلوی نے تریسٹھ سال عمر پا کر ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۰۷۳ھ/ ۱۹ر دسمبر ۱۶۶۲ء کو دہلی میں داعی اجل کو لبیک کہا❶۔

۶۰- علامہ عثمان بوبکانی سندھی

علامہ حکیم عثمان بن عیسیٰ بن ابراہیم صدیقی بوبکانی سندھی' اعمال سیوستان کے ایک گاؤں ''بوبکان'' میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو نما پائی۔ بعد ازاں حصول علم کی غرض سے عازم گجرات ہوئے۔ وہاں فقہ' اصول فقہ اور علوم عربیہ کی تحصیل قاضی محمود مورپی اور علامہ وجیہ الدین علوی گجراتی سے کی۔ منطق اور فلسفہ کے لیے شیخ حسین بغدادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء کو برہان پور کا قصد کیا۔ یہ وہ دور تھا' جب کہ وہ علوم مروّجہ' یعنی فقہ واصول' علوم عربیہ' منطق وفلسفہ اور طب وغیرہ میں مہارت پیدا کر چکے تھے۔ برہان پور اور اس نواح کا امیر اس زمانے میں محمد شاہ فاروقی تھا۔ وہ ان سے انتہائی احترام سے پیش آیا۔ ان کی فراوانی علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں تدریس وافتا کی مسند پیش کی' جس پر یہ ستائیس سال متعین رہے۔ اس دوران میں ان سے بہت سے اہل علم نے استفادہ کیا' جن میں قاضی نصیر الدین بن سراج محمد برہان پوری (متوفی ۱۰۳۱ھ /۱۶۲۲ء) قاضی عبدالسلام سندھی' شیخ صالح سندھی اور شیخ یوسف بنگالی کے داماد شیخ سکھ جی شامل ہیں۔ گلزار ابرار کے مصنف محمد غوثی مانڈوی کا شمار بھی ان کے حلقہ تلامذہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ان سے علم ہیئت اور حکمت وفلسفہ کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ علامہ حکیم عثمان سندھی جہاں معقولات ومنقولات کے بہت بڑے عالم تھے اور علوم شرعیہ میں دست گاہ رکھتے تھے' وہاں نہایت متقی اور زاہد وعابد بھی تھے۔ ان کے علم وفضل اور ورع وتقویٰ کی بنا پر لوگوں کے دل میں ان کی بے حد منزلت تھی۔ ان کے معتقدین کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ مشتبہات سے پرہیز کرتے' اور نماز نہایت اہتمام اور سکون سے پڑھتے۔ مشتبہات سے دامن کشاں رہنے اور احتیاط کا یہ عالم تھا کہ پورے چالیس سال کسی کے گھر سے کھانا نہیں کھایا کہ مبادا کوئی ناجائز چیز حلق سے نیچے اتر جائے۔

قلم وقرطاس سے بھی تعلق تھا۔ صحیح بخاری کی ایک شرح سپرد قلم کی اور تفسیر بیضاوی کا حاشیہ لکھا۔ برہان پور میں تین فاروقی حکمرانوں کا زمانہ دیکھا۔ ہر بادشاہ نے ان کی قدر کی۔ محمد شاہ فاروقی ان کے تقرر سے ایک سال بعد فوت ہو گیا۔ اس کے بعد راجہ علی خاں عادل شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی ان کے

---

❶ زبدۃ المقامات ص ۶۱ تا ۶۶- مآثر الکرام ص ۹۱' ۹۲- رود کوثر ص ۲۱۳- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۶۹

Marfat.com

منصب و وظیفہ کو اضافے کے ساتھ برقرار رکھا۔ ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۷ء میں بہادر خاں بادشاہ ہوا۔ وہ اگرچہ نہایت سنگین حالات میں حکمران ہوا تھا، لیکن ان کے احترام میں کوتاہی نہیں کی۔

۱۰۰۸ھ/۱۶۰۰ء میں علامہ عثمان سندھی نے برہان پور کی سکونت ترک کر کے، اس نواح کے ایک گاؤں میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ گاؤں انھیں بطور وظیفہ و جاگیر عطا ہوا تھا۔ وہاں پہنچے تو مغل حکمران جلال الدین اکبر نے تسخیر خاندیس کے عزم سے خود اقدام کیا اور اس کے لشکر کی آمد کی اطلاع ملی۔ اس وقت برہان پور کی طرف واپس جانا خلاف مصلحت گردانا اور چند روز کے لیے وہاں کے جنگل ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ اکبر کے حملے کی وجہ سے ملکی نظام معطل ہو چکا تھا۔ ایک روز اچانک رہزنوں اور ڈاکوؤں کا ایک گروہ ادھر آنکلا۔ صبح کا وقت تھا۔ ڈاکو ننگی تلواریں اور نیزے لہراتے ہوئے آئے۔ علامہ عثمان سندھی کا قافلہ سترہ افراد پر مشتمل تھا، جو سب ان کے اعزہ و اقارب، حسب و نسب میں بلند مرتبہ اور علوم دین سے آراستہ تھے۔ ڈاکوؤں کے اس سرکش گروہ نے علامہ عثمان سمیت سب کو قتل کر دیا اور خون سے بھری ہوئی جانمازیں ان کے کفن ہوئیں۔

علامہ حکیم عثمان علم و فضیلت کی نعمت سے بہرہ ور، تدین و تقویٰ کی صفت سے متصف اور تصنیف و تالیف کی دولت سے مالا مال تھے۔ شکستہ خاطر، عجز و لینت کے پیکر، اسباب دینوی اور اصحاب دنیا سے دور، پرہیز گاری کی کامل تصویر اور حلیم الطبع تھے۔ برصغیر کے اس عظیم المرتبت عالم دین نے ماہ شعبان ۱۰۰۸ھ/فروری ۱۶۰۰ء میں درجہ شہادت حاصل کیا❶۔

۶۱- قاضی عثمان سندھی

قاضی عثمان سندھی، علاقہ سندھ کے موضع دربیلہ کے رہنے والے تھے۔ نیکی و عفت سے بہرہ یاب اور فضل و صلاح سے سعادت اندوز تھے۔ عالم و فقیہ اور شیخ وقت تھے۔ عمر بھر درس و افادہ میں مصروف رہے اور زاہد و عابد کی حیثیت سے زندگی بسر کی۔ متداول علوم کی تمام اقسام میں مہارت رکھتے تھے۔ صفات حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ سے موصوف تھے۔ کبر سنی میں بھی تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ بے حد متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ عمدہ اوصاف میں اپنے معاصرین سے فائق تر تھے۔ دینوی مفاد سے کوئی علاقہ نہ رکھتے، کسی شخص سے کوئی نذرانہ یا عطیہ قبول نہ کرتے۔ علما و طلبا کی ایک جماعت ہمیشہ ان کے یہاں رہتی۔ سب کے قیام و طعام اور سکونت کا خود انتظام کرتے۔ اپنے قول و فعل اور عمل و حرکت سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچاتے۔ جو کچھ پاس ہوتا خدمت دین میں خرچ کر دیتے، کوئی چیز بچا کر نہ رکھتے۔ اس عالم دین اور فقیہ سندھ کی وفات ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء کو ہوئی❷۔

---

❶ اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار) ص ۴۴۵، ۴۴۶- تذکرۂ علمائے سندھ ص ۲۱۶ تا ۲۲۱- تحفۃ الکرام ص ۴۶۱- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۷۰، ۲۷۱-

❷ تاریخ معصومی ص ۳۳۱- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۷۱-

Marfat.com

۶۲- شیخ عثمان سارنگ پوری

شیخ عثمان سارنگ پوری، شیخ منجھن بن عبداللہ بن خیر الدین لکھنوتوی مالوی سارنگ پوری کے بیٹے تھے۔ سرزمین مالوہ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ منجھن اور دیگر علمائے عصر سے اخذ علم کیا۔ چونکہ علم وفضل کی گود میں آنکھیں کھولیں اور ورع وتقویٰ کے ماحول میں پرورش پائی تھی، اس لیے بچپن ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے اور فقہ واصول اور علوم عربیہ میں مہارت پیدا کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مسند درس وافادہ پر متمکن ہوئے۔ کثیر الدرس، کثیر الافادہ اور صالح عالم دین تھے ❶۔

۶۳- مولانا عطاء اللہ عثمانی جون پوری

مولانا عطاء اللہ عثمانی اصفہانی جون پوری کے والد کا نام حبیب اللہ تھا۔ ان کے آباد اجداد درحقیقت اصفہان سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں برصغیر میں آ کر جون پور کے قریب ایک گاؤں موضع گھوسی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں یہ ایک مرکزی قریہ تھا اور اہل علم کی ایک جماعت یہاں آباد تھی۔ جون پور، ہندوستان کے صوبہ یوپی کے علمی مرکز اعظم گڑھ سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ مولانا عطاء اللہ کی ولادت اپنے گاؤں گھوسی میں ہوئی اور وہیں تربیت کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔ اس دور میں جون پور کو علم وتحقیق اور علما وفضلا کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور وہاں گیارھویں صدی ہجری کے نامور فاضل علامہ محمود عمری جون پوری (متوفی ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء) کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ مولانا عطاء اللہ اس میں داخل ہوئے اور علامہ ممدوح سے اخذ علم کرنے لگے۔ ان کے علاوہ دیگر علما سے بھی استفادہ فرمایا۔ حصول علم کے بعد سلوک وطریقت کی راہ پر قدم زن ہوئے اور اس ضمن میں شیخ عبدالقدوس بن عبدالسلام جون پوری سے استفاضہ کیا۔ مولانا عطاء اللہ عثمانی اپنے زمانے کے فاضل کبیر اور شیخ تھے۔ پرہیزگار، متدین اور عبادت گزار تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ۵ ربیع الثانی ۱۰۶۳ھ/۲۳ فروری ۱۶۵۳ء کو لکھنؤ میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

۶۴- مولانا عطاء اللہ سہسوانی

مولانا عطاء اللہ بن محمد ہاشم بن عبدالشکور حسینی مودودی سہسوانی، سہسوان کے علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، دادا، اور چچا سب اصحاب علم اور ارباب فضل تھے۔ خاندانی وقار ووجاہت اور علمی شان وشکوہ کی بنا پر یہ گھرانا خاص عزت وتکریم کا حامل تھا، اور لوگ ان کے سب افراد کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

❶ اذکار ابرار ص ۳۷۱- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۷۲-

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۷۴- بحوالہ اصول المقصود-

Marfat.com

اس خاندان کے ایک بزرگ مولانا عطاء اللہ تھے‘ جو اپنے صاحب علم چچا شیخ صدر الدین محمد الحاکم کے شاگرد رشید اور مرید خاص تھے۔ چچا کی وفات کے بعد انہی کی مسند خلافت و درس پر فائز ہوئے۔ شیخ صالح اور نامور فقیہ تھے۔ صوری و معنوی فضائل کے حامل تھے۔ حلقہ درس و ارادت بڑا وسیع تھا‘ دور دراز علاقوں سے علما و طلبا استفادے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ اپنے اوصاف گوناگوں کی بنا پر مرجع خلائق اور مقتدائے عالم تھے۔ غزا و جہاد کے جذبے سے بھی سرشار تھے‘ چنانچہ کئی مرتبہ طلبا و مریدین کو ساتھ لے کر جہاد فی سبیل اللہ کا شرف حاصل کیا اور میدان کارزار میں کفار و مشرکین کو شکست دی۔ اعلائے کلمۃ اللہ اور اشاعت اسلام ان کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا۔ اس کے لیے تیغ و سناں سے بھی کام لیا اور وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ کثیر تعداد میں ہندو اور دیگر غیر مسلم ان کے ہاتھ پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور متعدد منکرین و مشرکین نے ان کی کوشش سے قبولیتِ دین حق کی سعادت حاصل کی۔ ایک بزرگ شیخ نور الدین سنبھلی نے اپنی کتاب ''اسرار العارفین'' میں ان کے حالات و سوانح‘ کمالات و فضائل اور علمی و عملی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

مدت تک یہ کیفیت رہی کہ کبھی جذب و سکر کا غلبہ ہو گیا اور کبھی سلوک و طریقت نے زور باندھا۔ ان کیفیات کے زمانے میں وہ زیادہ تر آبادی سے دور نکل جاتے اور کسی جنگل میں جا کر گوشہ تنہائی میں بیٹھ جاتے‘ وہاں یک سوئی سے ریاضت و عبادت میں مشغول ہو جاتے۔

بارعب اور پُر جلال عالم تھے۔ ان کو دیکھ کر لوگوں پر ایک خاص تاثر پیدا ہوتا اور مرعوبیت چھا جاتی۔ برصغیر کے شہر سہسوان کے اس عالم دین نے نوے (۹۰) برس کی عمر پا کر ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء کو جنت کی راہ لی ❶۔

۶۵- ملا عصمت اللہ سہارن پوری

ملا عصمت اللہ سہارن پوری دیار ہند کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ فاضل اور فقیہِ متبحر تھے۔ عمر کے آخری دور میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔ لیکن چشم بصیرت ہمیشہ روشن رہی۔ پوری زندگی خدمت علم اور درس و تدریس میں گزار دی۔ بہترین تصانیف کے مصنف تھے‘ جن میں شرح خلاصۃ الحساب اور حاشیہ فوائد ضیائیہ۔ (یعنی شرح ملا جامی) شامل ہیں۔ ۱۰۳۹ھ/۱۶۳۰ء میں فوت ہوئے ❷۔

۶۶- مولانا علاء الملک حسینی مرعشی

مولانا علاء الملک بن علامہ نور اللہ حسینی مرعشی‘ گیارھویں صدی ہجری کے شیخ اور صاحب فضل و کمال

❶ حیوۃ العلما ص ۱۷‘ ۱۸- نزہۃ الخواطر ج ۵‘ ص ۲۷۵-

❷ مآثر الکرام ص ۱۹۴‘ ۱۹۵- سبحۃ المرجان ص ۵۲- ابجد العلوم ص ۹۰۰- تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۰- قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب- ص ۱۹۷- حدائق الحنفیہ- ص ۴۰۷-

Marfat.com

بزرگ تھے۔ اپنے والد علامہ نوراللہ حسینی مرعشی سے اخذ علم کیا اور طویل عرصہ ان کی خدمت میں رہے۔ پھر شیراز چلے گئے اور علما کی ایک بڑی جماعت سے مختلف علوم وفنون کی تحصیل کی۔ بعد ازاں وارد ہند ہوئے اور مغل حکمران شاہ جہان سے تعلق وقرب پیدا ہوا۔ شاہ جہان دین دار، علم دوست اور علما کا قدردان بادشاہ تھا۔ اس نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے محمد شجاع کا معلم مقرر کر دیا اور یہ اس کے ساتھ بنگال چلے گئے۔

مولانا علاء الملک حسینی مرعشی' تصنیف و تالیف سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے' چنانچہ مختلف عنوانات پر کئی کتابیں تصنیف کیں' جن کے نام یہ ہیں: منطق میں کتاب مہذب' الہیات میں انوارالہدیٰ' اثبات واجب تعالیٰ کے موضوع پر الصراط الوسیط ❶۔

۶۷- شیخ علم اللہ امیٹھوی

شیخ علم اللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: علم اللہ بن عبدالرزاق بن خاصہ بن خضر صالحی امیٹھوی' ۲۷ر جمادی الاولیٰ ۹۵۴ھ/ ۱۵ر جولائی ۱۵۴۷ء کو شہر امیٹھی (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد گرامی شیخ عبدالرزاق سے جو عالم و فاضل بزرگ تھے' علم حاصل کیا۔ امیٹھی ہی کے ایک اور عالم شیخ نظام الدین عثمانی امیٹھوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ پھر عازم حجاز ہوئے اور ارض مقدس میں اٹھارہ سال قیام فرما رہے۔ وہاں کے مشائخ و اساتذہ سے حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی' یہاں تک کہ حدیث' فقہ اور دیگر علوم مروّجہ میں فائق تر گردانے گئے۔

ہندوستان واپس آئے تو برہان پور پہنچے۔ وہاں عادل شاہ فاروقی داد حکمرانی دیتا تھا۔ اس نے نہایت عزت واحترام سے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس کی درخواست پر وہاں طویل عرصے تک مقیم رہے۔ ایک روایت کے مطابق اس اثنا میں جب کبرسنی کو پہنچے تو ۱۰۲۲ھ میں دوبارہ حج کے ارادے سے نکلے' لیکن جا نہ سکے۔

مولانا علم اللہ امیٹھوی کا یہ دلچسپ واقعہ تمام تذکروں میں مرقوم ہے کہ ان کے داماد قاضی نصیرالدین برہان پوری ان سے فقہ کی کچھ کتابوں کا درس لیتے تھے۔ قاضی نصیرالدین عامل بالحدیث تھے۔ وہ حدیث کے مقابلے میں فقہ اور قیاسِ مجتہد کو نہیں مانتے تھے۔ جب کوئی ایسی صورت پیش آتی اور مقابلہ فقہ اور حدیث کا ہوتا تو قاضی نصیرالدین حدیث کو ترجیح دیتے اور فقہ وقیاس کو ماننے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیتے' لیکن شیخ علم اللہ امیٹھوی اس کے برعکس امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے احتجاج کرتے اور اس کو حجت گردانتے۔ ایک روز دورانِ درس میں کچھ ایسا ہی معاملہ سامنے آیا تو قاضی نصیرالدین نے امام ابوحنیفہ کے قول کے مقابلے میں حدیث پیش کی اور کہا کہ امام صاحب بھی ایک انسان تھے اور میں بھی ایک انسان ہوں' وہ معصوم تو نہیں تھے' حدیث کے مقابلے میں آخر ان کے قول کو کیوں راجح قرار دیا جائے۔ اس پر شیخ علم اللہ نے طیش میں آ کر تلوار نکال لی اور ان کو قتل

❶ صبح صادق۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۷۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۷۵' ۲۷۶۔

Marfat.com

کرنے پر اتر آئے' لیکن نصیرالدین جان بچا کر بھاگ اٹھے' شیخ نے بیجاپور تک ان کا تعاقب کیا۔

عبدالباقی نہاوندی نے بھی مآثر رحیمی میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ علم اللہ امیٹھوی کے داماد قاضی نصیرالدین برہان پوری' قیاس وفقہ اور قول امام ابوحنیفہ پر حدیث رسول اللہ ﷺ کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ حدیث' علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل موضوع ہے ❶۔ اس پر شیخ علم اللہ نے ان کو کافر قرار دیا اور فتویٰ جاری کیا کہ انھیں قتل کر دیا جائے اور آگ میں جلا دیا جائے۔ ساتھ ہی اس فتوے کی توثیق کے لیے علما کا محضر بھی ترتیب دے دیا۔ علما نے شیخ علم اللہ کی تصدیق کی اور محضر پر مہریں ثبت کر دیں۔ ظاہر ہے یہ معاملہ انتہائی سنگین نوعیت کا تھا۔ اس زمانے میں اس علاقے کا امیر عبدالرحیم خانِ خاناں تھا۔ اس نے قاضی نصیرالدین کی مدد کی' اور زیرِ نزاع مسئلہ مغل حکمران جہاں گیر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جہاں گیر نے شیخ علم اللہ امیٹھوی اور قاضی نصیرالدین برہان پوری دونوں کو طلب کیا۔ لیکن قاضی نصیرالدین تو حجاز چلے گئے اور شیخ علم اللہ بیجاپور تشریف لے گئے۔ بیجاپور میں وہ ابراہیم عادل شاہ سے منسلک ہو گئے۔

بہر حال شیخ علم اللہ امیٹھوی دین دار' پرہیز گار' عابد' زاہد' متورع اور متبحر عالم تھے۔ وہ عمر بھر درس و تدریس میں مصروف رہے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ عبدالرحیم خان خاناں ان کا بے حد اکرام کرتا تھا اور ان کے ہاں جانے اور استفادہ کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی وقت ان سے مفارقت ہو۔ ان کی سفارشیں قبول کرتا اور عطیات وصلات سے نوازتا۔

روضۃ الاولیا کی روایت کے مطابق شیخ علم اللہ امیٹھوی نے ۱۱/ ذی الحجہ ۱۰۲۴ھ/ ۱۲/ دسمبر ۱۶۱۵ء کو وفات پائی۔ بعض لوگوں نے ''استاد اہل حدیث'' سے تاریخ نکالی۔ انھیں بیجاپور میں دفن کیا گیا ❷۔

۶۹-سید علم اللہ شاہ بریلوی

سید علم اللہ شاہ بریلوی رحمہ اللہ' برصغیر کے عظیم القدر خاندان کے فرزند تھے۔ اکتیسویں پشت میں ان کا سلسلۂ نسب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ چوتھی پشت میں یہ باشندگانِ پاک و ہند کے عظیم محسن اور مجاہد اسلام حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ کے جدامجد ہیں۔ ان کے خاندان کا ہر رکن نیکی و پاک بازی میں منفرد تھا۔ سید علم اللہ شاہ کے حالات بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار

---

❶ اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں۔ ملا علی قاری ہروی اس کے متعلق لکھتے ہیں: قال الدميری والعسقلانی لا اصل له وكذا قال الزركشی - و سكت عنه السيوطی - (موضوعات الکبری ص ۴۸۔ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۵ء)

❷ اذکار ابرار ص ۵۷۸' ۵۷۹۔ مآثر رحیمی ج ۳ ص ۲۰ تا ۲۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۷۶' ۲۷۷۔

Marfat.com

کے ساتھ ان میں سے بعض بزرگوں کا تعارف کرا دیا جائے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ سید موصوف کس اونچے خانوادے کے رکن رکین تھے۔ نیز پتا چل سکے کہ یہ خاندان کس طرح ہندوستان میں آیا اور ان میں سے کس شخص نے پہلے پہل اس ملک میں سکونت اختیار کی۔

سید رشید الدین:

سید علم اللہ کے آباو اجداد میں پندرھویں پشت میں ایک بزرگ سید رشید الدین تھے۔ غالبًا اس خاندان کے یہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے مع اہل وعیال مدینہ منورہ کی سکونت ترک کی اور بغداد کو اپنا مسکن بنایا۔ ترک مدینہ اور اقامت بغداد کی اصل وجہ کیا تھی؟ اس کا علم نہیں ہو سکا۔ سید رشید الدین نے بغداد ہی میں وفات پائی اور حطیرۂ شیخ عبدالقادر جیلانی میں دفن ہوئے۔

سید قطب الدین محمد:

سید رشید الدین کے بیٹے سید قطب الدین محمد تھے۔ والد کی وفات کے بعد وہ بغداد سے اٹھ کر غزنی پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں ٹھہرے۔ بعد ازاں ۶۰۷ھ/۱۲۱۱ء کو اقربا و مریدین کی ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان چلے آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم ہو چکی تھی اور تخت دہلی پر سلطان شمس الدین ایلتتمش متمکن تھا۔ سلطان نے سید قطب الدین سے بڑے اعزاز و اکرام کا برتاؤ کیا، لیکن وہ دہلی میں نہیں ٹھہرے، پورب کو روانہ ہو گئے۔ نواحِ کڑا میں ایک وسیع علاقہ فتح کیا اور اس میں اقامت اختیار کر لی۔ اس خاندان کے شجروں میں انھیں "امیر کبیر" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ قیام غزنی کے باعث انھیں 'الغزنوی' اور سکونت کڑا کی بنا پر "الکردی" کی نسبت سے پکارا جاتا ہے اور "امیر سید قطب الدین محمد الغزنوی الکردی" کے الفاظ کے ساتھ ان کا نام لکھا جاتا ہے۔

صاحب نزہۃ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھوی ان کا ذکر "الامیر الکبیر" بدر المنیر شیخ الاسلام، قطب الدین محمد بن احمد المدنی لکردی" کے الفاظ سے کرتے ہیں:

اس خاندان کے یہ پہلے بزرگ ہیں جو وارد ہند ہوئے اور اس ملک میں باقاعدہ توطن اختیار کیا۔ سید قطب الدین محمد نے ۶۲۷ھ/۱۲۳۰ء کو وفات پائی۔

سید قطب الدین کی اولاد:

سید قطب الدین محمد کے تین بیٹے تھے۔ بڑے سید نظام الدین، منجھلے سید قوام الدین، چھوٹے سید تاج الدین۔ سید نظام الدین کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں ہو سکا، البتہ سید قوام الدین کے حالات میں مذکور ہے کہ وہ

Marfat.com

علم و عمل میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے اور اپنے عصر میں سرتاجِ سادات کے مرتبے پر فائز تھے۔ ان کے تدین اور علم و عمل سے متاثر ہو کر سلطان قطب الدین ایلتتمش نے اپنی ایک بیٹی ان کے عقد میں دے دی تھی ❶۔

تذکرۃ الابرار میں سید تاج الدین کا ذکر بھی بڑے احترام سے کیا گیا ہے اور انھیں ''مشہور بہ سراج شہید'' لکھا گیا ہے۔

ضیاء الدین برنی نے'' تاریخ فیروز شاہی'' میں ان حضرات کا تذکرہ بڑی عقیدت سے کیا ہے۔ برنی کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

سید السادات سید تاج الدین، شیخ الاسلام سید قطب الدین کے بیٹے تھے۔ خود سید تاج الدین کے بیٹے کا نام بھی قطب الدین تھا، اور پوتے سید اعز الدین تھے۔ یہ دونوں بدایوں کے منصب قضا پر فائز رہے۔ خود سید تاج الدین کئی برس تک اودھ کے عہدۂ قضا پر متعین رہے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے انھیں اودھ کی قضا سے معزول کر کے بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ سید تاج الدین مرحوم و مغفور بڑے بلند مرتبہ سید تھے ❷۔

سید قطب الدین محمد کے بڑے بیٹے سید نظام الدین تھے۔ سید نظام الدین کے بیٹے کا نام سید رکن الدین تھا۔ سید رکن الدین کڑا کے قاضی تھے۔ ضیاء الدین برنی نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ برنی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

سید تاج الدین کے بھتیجے سید رکن الدین تھے، جو کڑا کے قاضی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جامع فضائل پیدا کیا (باری تعالیٰ سید رکن الدین را جامع فضائل آفریدہ بود۔) وہ کشف و کرامت سے بہرہ مند تھے ____ ان کی عمر ترک و تجرید اور اعطا و ایثار میں گزری۔ تاریخ فیروز شاہی کے مؤلف نے سید تاج الدین اور سید رکن الدین رحمہما اللہ دونوں سے ملاقات کی سعادت حاصل کی اور ان کی پابوسی کے آداب بجالایا۔ (شرائط پابوس ایشاں بجا آوردہ) میں نے ان جیسے بلند مرتبہ سید بہت کم دیکھے ہیں۔ خدا نے جو عمدہ اور روشن اوصاف انھیں عطا کیے یا جس حشمت و عزت سے انھیں نوازا، وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ❸۔

قاضی سید محمود:

اس عالی گھرانے کے ایک فرد سید قطب الدین ثانی تھے جو چھٹی پشت میں سید علم اللہ کے اجداد میں سے تھے۔ یہ کڑا کی سکونت ترک کر کے جائس چلے گئے تھے۔ ان کی اور ان کی زوجہ محترمہ کی وفات جائس ہی میں ہوئی۔ انھوں نے جائس میں ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ ان کے لڑکے سید علاء الدین تھے، علاء الدین بھی جائس

❶ تذکرۃ الابرار ص ۱۶۱۔

❷ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۸، ۳۴۵۔

❸ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۹۔

Marfat.com

میں سکونت پذیر رہے۔ لیکن پوتے سید محمود کو نصیر آباد میں عہدۂ قضا پر متعین کیا گیا تو وہ جائس سے نصیر آباد منتقل ہو گئے۔ نصیر آباد کا محلّہ قضیانہ انہی کا آباد کردہ ہے۔ شروع شروع میں اس محلے کو محلّہ قاضی محمود کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔

قاضی سید احمد:

قاضی سید محمود کی وفات کے بعد نصیر آباد کا منصب قضا ان کے بیٹے قاضی سید احمد کے سپرد ہوا۔ وہ دینی اور شرعی معاملات میں نہایت غیرت مند اور باحمیت تھے۔ ایک مرتبہ ایک قریبی رشتے دار کا مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ انھوں نے شریعت کی روشنی میں اس کا فیصلہ کر دیا۔ یہ فیصلہ رشتے دار کے خلاف تھا۔ وہ فیصلہ سن کر غصے میں آ گیا اور ایسے الفاظ زبان سے نکالے جن سے شریعت کی اہانت کا پہلو نکلتا اور حکم شرعی سے اظہار برات ہوتا تھا۔ قاضی سید احمد نے یہ الفاظ سنے تو منصب قضا سے استعفا دے دیا اور اہل و عیال سمیت نصیر آباد سے نکل کر رائے بریلی چلے گئے۔ پھر زندگی بھر نصیر آباد کا رخ نہیں کیا۔ فرماتے تھے جس آبادی میں حکم شریعت سے بے زاری کا اظہار کیا گیا ہو وہاں ٹھہرنا کسی ایمان دار کو زیب نہیں دیتا۔

سید فتح عالم:

قاضی سید احمد کے استعفا کے بعد نصیر آباد کا عہدۂ قضا سید فتح عالم بن سید محمد بن سید محمود نے سنبھالا۔ مولانا غلام رسول مہر کے بقول ''خاندان میں غالباً وہی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے مغل دربار سے علاقۂ خاص پیدا کیا۔ ان کے فرزند سید ابو محمد، شہزادہ مراد بخش ابن شاہ جہان کے ہاں دیوانی کی خدمت پر مامور تھے ❶۔

سید فضیل:

قاضی سید احمد نے نصیر آباد سے نقل مکانی کے بعد زندگی کے بقیہ ایام رائے بریلی میں گزارے۔ لیکن ان کے بیٹے سید معظم اپنے خاندان کے لوگوں میں پھر نصیر آباد چلے گئے تھے۔ سید معظم کے دو بیٹے تھے۔ سید فضیل اور سید اسحاق۔ دونوں زہد و عبادت کے پیکر تھے۔ بالخصوص سید فضیل بہت بڑے عالم اور تصوف و طریقت میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ ان کے شب و روز کا بیشتر حصہ ضرورت مندوں اور کمزور لوگوں کی خدمت میں صرف ہوتا۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ ہر ایک کے دروازے پر جا کر دستک دیتے اور پوچھتے کہ کوئی کام ہو تو بتاؤ میں کر دوں۔ خدمت خلق میں وہ اس حد تک آگے بڑھے ہوئے تھے کہ کسی کو ایندھن کی بھی ضرورت ہوتی تو بازار سے خرید کر اپنے سر پر اٹھا کر لاتے۔ یہ خدمات انجام دینے کے بعد طلبا کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہو

❶ سید احمد شہید ص ۳۳۔

Marfat.com

جاتے۔ علاوہ ازیں درویشوں اور عقیدت مندوں کے کام میں ان کی مدد کرتے۔

ایک مرتبہ برادری کے افراد بعض خاندانی جھگڑوں کے فیصلے کی غرض سے جمع ہوئے۔ سید فضیل بھی اس اجتماع میں شریک تھے۔ مختلف لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مختلف تجویزیں پیش کیں۔ ان تجویزوں پر بحث ہونے لگی تو سید فضیل نے کہا: ''جو فیصلہ بھی کیا جائے' شریعت حقہ کے مطابق کیا جائے اور اللہ کے حکم کو معیارِ فیصلہ قرار دیا جائے۔'' بعض افراد نے ان کی اس تجویز کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔ اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر سید فضیل اسی وقت مجلس سے اٹھ کر چلے گئے۔ گھر پہنچے سامان سفر باندھا اور دن غروب ہونے سے پہلے پہلے نصیر آباد سے نکل گئے۔ فرمایا جہاں شریعت حقہ کا احترام نہ کیا جاتا ہو وہاں مسلمان کے لیے بود و باش حرام ہے۔ ان کے جد امجد سید احمد نے تو نصیر آباد کو چھوڑ کر دس میل کے فاصلے پر رائے بریلی میں سکونت اختیار کر لی تھی' لیکن سید فضیل نے پورے ملک ہند ہی کو خیر باد کہہ کر ارض حجاز کا رخ کر لیا۔ مکہ مکرمہ گئے اور حج ادا کرنے کی بعد مدینہ منورہ میں اقامت گزین ہو گئے۔ اواخر ذی الحجہ ۱۰۳۲ھ/ اکتوبر ۱۶۲۳ء کو اسی خاک پاک کی آغوش میں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ بعض اصحاب نے تاریخ وفات اللہ کے اس فرمان وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ سے نکالی۔

سید فضیل کی شادی قاضی سید فتح عالم کی بیٹی صاحب النسا سے ہوئی تھی۔ سید ممدوح کی وفات کے وقت ان کے بڑے بیٹے سید داؤد بہت کم سن تھے۔ دو یا تین برس کے۔! چھوٹے بیٹے سید علم اللہ باپ کی وفات سے دو مہینے چودہ دن بعد پیدا ہوئے۔ یہی سید علم اللہ ہیں' جو گیارھویں صدی ہجری کے وہ عالی مرتبت ہندی عالم تھے' جن کا عہد عالم گیری میں زہد و تقویٰ میں کوئی حریف نہ تھا اور اتباع سنت نبوی ﷺ میں جن کا کوئی مثل نہ تھا۔ یہی وہ عظیم شخصیت ہیں' جو چوتھی پشت میں برصغیر پاک و ہند کے مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد تھے۔ آئندہ سطور میں ہم انہی کے حالات بیان کریں گے۔

سید علم اللہ کی ولادت اور عہد طفولیت:

سید علم اللہ' ۱۲ ربیع الاول ۱۰۳۳ھ/ ۲۴ دسمبر ۱۶۲۳ء کو نصیر آباد کے محلہ قضیانہ میں صبح کے وقت پیدا ہوئے۔ ان کے والد (سید فضیل) جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا' ہجرت کر کے حجاز تشریف لے گئے تھے اور مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ سید علم اللہ کی والدہ نصیر آباد ہی میں مقیم تھیں' ان کی ولادت باپ کی وفات سے دو مہینے چودہ دن بعد ہوئی۔ کچھ مدت بعد والدہ بھی انتقال کر گئیں۔ اب یہ دو کم سن یتیم بھائی تھے۔ ایک داؤد' دوسرے علم اللہ۔! دونوں کی تربیت کی ذمہ داری دیوان سید ابو محمد نے قبول کی جو ان کے حقیقی ماموں تھے۔ سید ابو محمد کو ان سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ اپنے بچوں پر بھی ان کو ترجیح دیتے تھے۔ خود شاہ علم اللہ اکثر اس کا ذکر کرتے اور فرمایا کرتے کہ میری اولاد کے لیے ضروری ہے کہ سید ابو محمد کی تکریم

Marfat.com

اور حسنِ سلوک کو زندگی کا لازمی حصہ بنالیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ بات میرے لیے مسرت کا باعث ہوگی۔

مولانا غلام رسول مہر نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جو سید علم اللہ کی پیدائش سے قبل ظہور میں آیا۔ وہ واقعہ ایک خاندانی روایت کے طور پر مشہور ہے' جو یہ ہے کہ سید فضیل نے سید علم اللہ کی پیدائش سے پہلے خواب دیکھا تھا کہ گھر میں مٹی کے ایک طشت کے نیچے آفتاب چھپا ہوا ہے اور اس کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی ہیں۔ آخر آفتاب آہستہ آہستہ طشت سے باہر نکل آیا اور بلند ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر کے در و دیوار اور اطراف و جوانب اس کی ضیا گستری سے بقعہ نور بن گئے ❶۔

منقول ہے کہ سید علم اللہ کی ولادت کو اس خواب کی تعبیر قرار دے دیا گیا۔ ان کے وجود سے سنن رسول ﷺ کی ترویج و تجدید کے اسباب پیدا ہوئے' احکام شریعت کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کے مواقع میسر آئے' اتباع سنت کا آفتاب درخشاں ہوا اور اسلام کے احکام و فرامین کی دور دور تک روشنی پھیلی۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ اس خاندان میں ترویج اسلام اور اشاعت دین کی جو روایت شروع سے چلی آرہی ہے' وہ اب تک مختلف شکلوں میں قائم ہے۔

سید علم اللہ کے زمانۂ طفولیت کا ایک واقعہ جب کہ وہ پانچ برس کے لگ بھگ تھے' اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز وہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ادھر سے شیخ بندگی نظام الدین کے فرزند' شیخ بندگی جعفر امیٹھوی کا گزر ہوا۔ شیخ کی نظر شاہ علم اللہ پر پڑی تو رک گئے اور دیر تک انھیں دیکھتے رہے۔ ارادت مندوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا' اس بچے کی پیشانی سے تجلّیٔ اعظم کے نور کی موجیں اٹھ رہی ہیں۔ امید ہے اس کے فیوض سے ایک جہان منور ہوگا۔

شادی' سلسلہ ملازمت اور ترک دنیا:

اب سید علم اللہ کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوتا ہے۔ عمر بلوغ میں قدم رکھا تو شیخ ہاشم جائسی کی بیٹی سے شادی ہوئی۔ اب تک ماموں سید ابو محمد کفیل تھے' جو شاہ جہان کے دربار میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ شادی کے بعد انھوں نے ملازمت کے لیے لاہور بلالیا۔ تذکرۃ الابرار کی روایت کے مطابق سید ابو محمد دو تین مرتبہ انھیں شاہی دربار میں لے کر گئے' لیکن ملازمت کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ بار بار کی یہ آمد و رفت سید علم اللہ کی طبعِ غیور پر گراں گزری اور ان کا قلب صفا دنیا کی اس ظاہری عز و جاہ سے متنفر ہوگیا۔ سوچا کہ دنیا کے سلاطین و ملوک کے دروازوں پر حاجب اور دربان بیٹھے ہوئے ہیں' ان سے ملاقات کے خاص آداب اور اوقات مقرر ہیں' کبھی شرف باریابی حاصل ہوتا ہے' کبھی نہیں ہوتا۔ کیوں نہ انسان ان سے کنارہ کشی اختیار کر کے اس مالک

---

❶ سید احمد شہید ص ۳۵۔

Marfat.com

حقیقی کے باب عالی پر مستقل طور سے بیٹھ جائے جو ہر شاہ و گدا اور امیر و غریب کے لیے ہر آن کھلا رہتا ہے۔ نہ وہاں کسی حاجب و دربان کی ممانعت کا خطرہ اور نہ آنے جانے کے اوقات و آداب مقرر۔! چنانچہ ہر چیز ترک کی۔ ننگے پاؤں اور ننگے سر باہر نکل آئے اور اعلان کر دیا کہ میرا سامان جو شخص چاہے لے جائے۔

یہ تو تھی ''تذکرۃ الابرار'' کی روایت۔ اب ''وقائع احمدی'' کی روایت سنیے۔ ''وقائع احمدی'' میں مرقوم ہے کہ سید علم اللہ سواروں میں ملازم ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ موکب شاہی موسم سرما میں لاہور پہنچا۔ رات کا وقت تھا اور شدید بارش ہو رہی تھی۔ شاہ جہان بادشاہ نے اپنے ایک معتمد کو بھیجا کہ وہ جا کر دیکھے کہ اس وقت پہرے پر کون کون موجود ہے۔ معتمد نے ہر جگہ گھوم پھر کر دیکھا' صرف ایک مقام پر ایک پہرے دار کھڑا نظر آیا جو موسلا دھار بارش میں گھوڑے پر سوار تھا۔ نیزہ ہاتھ میں تھا اور قرآن پڑھ رہا تھا۔ نام پوچھا تو بتایا۔ ''علم اللہ۔''

دوسرے روز بادشاہ نے سید علم اللہ کو بلایا اور فرض شناسی و مستعدی پر خوش نودی کا اظہار فرمایا۔ جب سید ممدوح کو معلوم ہوا کہ خوش نودی کا یہ اظہار موسلا دھار بارش میں پہرے پر حاضر رہنے کا نتیجہ ہے تو معاً دل میں خیال آیا کہ دنیا کا بادشاہ اگر منصبی خدمت گزاری پر خوش ہو سکتا ہے تو مالک حقیقی کی خدمت گزاری کو اگر شیوہ وشعار بنا لیا جائے تو وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہوگا' اور خدمت گزار کو مستحق اجر و انعام ٹھہرائے گا۔ چنانچہ اسی وقت ملازمت ترک کر دی' مال و اسباب لوگوں کو دے دیا اور فقر و درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔

یہ دو روایتیں ہیں۔ ان میں سے کسی کو صحیح مان لیجیے' نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے وہ یہ کہ سید علم اللہ شاہ آغاز شباب ہی میں دینوی ترقی و ترفع کے بہترین وسائل سے دست کش ہو گئے تھے اور فقر و انزوا کی زندگی اختیار کر لی تھی۔

لیکن دیوان سید ابو محمد کو لائق اور جوان بھانجے کے اس اقدام سے بڑی پریشانی ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بھانجا انھیں بچوں سے زیادہ عزیز تھا اور وہ اسے حالت فقیری میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خود ان کا شمار دربار شاہی کے امرا میں ہوتا تھا۔ اتنے بڑے عزیز کا اس طرح فقر و درویشی اختیار کر لینا' زمانے کے عام تصور کے مطابق ان کے لیے باعث عزت نہ تھا۔ فوراً بھانجے کے پاس پہنچے۔ بہت سمجھایا' زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا لیکن وہ نہ مانے' اپنے دل میں قطعی اور آخری فیصلہ کر کے جو قدم اٹھا چکے تھے اسے واپس لینے پر تیار نہ ہوئے۔ دوسروں نے بھی سمجھایا' لیکن اپنی بات پر قائم رہے۔

اب سید علم اللہ نے اپنی ذاتی شان و شکوہ ختم کرنے اور انکسار و مسکنت کی راہ پر گامزن ہونے کی مشق شروع کی جو راہِ حق میں وصولِ کمال کی منزلِ اولیں ہے۔ انھوں نے یہ معمول بنا لیا کہ روزانہ علی الصبح باہر نکل جاتے' جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور سر پر اٹھا کر اپنے ماموں ___ دیوان سید ابو محمد ___ کے لشکر میں فروخت کرتے۔ جتنے پیسے ملتے' ان میں سے کچھ پیسے اپنے کھانے پر صرف کرتے' باقی محتاجوں میں بانٹ دیتے۔

Marfat.com

شیخ آدم بنوری کی بیعت وخلافت:

یہ منزل طے کرنے کے بعد پیر طریقت کی تلاش شروع ہوئی۔ شیخ آدم بنوری کی خدمت میں پہنچے اور ان کی صحبت میں طریقت وسلوک کی منزلیں طے کیں اور اخذ علم کیا۔ اب ''ولایت خاصہ واخص وخاص الخاص'' کے منصب سے سرفراز تھے۔

شیخ آدم بنوری نے خلعت دے کر وطن جانے کا حکم دیا' اور فرمایا: ''اس جانب ولایت کے چراغوں میں تمھاری حیثیت شمع کی سی ہوگی' بلکہ ستاروں کے درمیان آفتاب کا درجہ پاؤ گے۔''

سید علم اللہ اپنے والد گرامی کی طرح حرمین شریفین جانے کا ارادہ رکھتے تھے' بیوی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ شیخ سے اس کی اجازت چاہی تو دے دی۔ ساتھ ہی فرمایا: ''لیکن شرط یہ ہے کہ اہل اللہ میں سے اگر کوئی راستے میں روک لے تو رک جانا اور وہیں اقامت اختیار کر لینا۔''

رائے بریلی میں قیام:

سید علم اللہ' شیخ آدم بنوری سے رخصت لے کر نصیر آباد پہنچے اور بیوی سے کہا میں اپنے لیے فقر وانزوا اور ترک وتجرید کی راہ منتخب کر چکا ہوں' اگر تمھیں میرے نقطہ نظر سے اتفاق ہے تو گھر کا تمام مال واسباب محتاجوں اور ضرورت مندوں کو دے دو۔ نیک بخت بیوی نے بلند مرتبہ شوہر کے عمل وعقیدہ سے پورے اتفاق کا اظہار کیا اور بلا تامل ان کے حکم کی تعمیل کی۔ قریبی رشتے داروں نے اپنے اموال واملاک میں سے ایک ایک حصہ الگ کر کے سید علم اللہ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے یہ عطیہ بھی مسکینوں کو دے دیا۔ منقول ہے کہ چار مرتبہ یہی صورت پیش آئی۔ بالآخر اعزہ واقارب اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی چیز انھیں اس خیال سے دینا بے سود ہے کہ یہ خود اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

اب سید موصوف نے حجاز جانے کا ارادہ کیا اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر نصیر آباد سے رخصت ہو گئے۔ پہلی منزل رائے بریلی میں ہوئی۔ وہاں کچھ دن اپنے خالہ زاد بھائی کے ہاں ٹھہرے۔ سید علم اللہ کا معمول تھا کہ رات کے آخری حصے میں بیدار ہو کر سئی ندی پر تشریف لے جاتے۔ وہیں عالم تنہائی اور لوگوں سے علیحدگی میں نماز تہجد ادا کرتے۔ رائے بریلی ہی میں ایک مجذوب اہل اللہ شیخ عبدالشکور جائسی سے ملاقات ہوئی۔ انھیں جب پتا چلا کہ سید علم اللہ ہجرت حجاز کے ارادے سے جا رہے ہیں تو سخت اصرار کر کے روک لیا۔ اس وقت سید ممدوح کو اپنے شیخ طریقت آدم بنوری کا یہ فرمان بھی یاد آ گیا کہ اللہ کا کوئی نیک بندہ راستے میں روک لے تو رک جانا۔ چنانچہ رائے بریلی میں قیام پر رضا مند ہو گئے۔ یہ مقام ان کے لیے نیا اور غیر مانوس نہ تھا۔ ان کے جد امجد نے بھی یہاں عمر گزاری تھی اور کچھ عزیز بھی رہ رہے تھے۔ ایک مقامی زمیندار کو ان کے ارادۂ قیام کا علم ہوا تو آبادی سے باہر سئی

Marfat.com

ندی کے کنارے دس بیگھے زمین ہبہ کر دی۔ یہی جگہ آگے چل کر دائرۂ علم اللہ یا تکیہ علم اللہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سید احمد شہید پیدا ہوئے اور اسی جگہ انھوں نے زندگی کے ابتدائی چالیس برس گزارے۔

معلوم ہوتا ہے' شیخ عبدالشکور جائسی اور سید علم اللہ کے درمیان گہرے مخلصانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ شیخ جائسی' سید موصوف سے بہت متاثر تھے اور وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سید ممدوح بھی ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے تھے۔

شیخ عبدالشکور ہی نے تکیہ کی جگہ تجویز کی۔ سید علم اللہ کے مکان اور مسجد کے مقامات بھی انہی نے متعین کیے۔ رائے بریلی کے ایک محلے کا نام لوہانی پور ہے' یہیں کے ایک زمیندار دولت خاں نے دس بیگھے زمین دی تھی۔ سید علم اللہ نے اسی زمین میں چھپر ڈال کر سکونت کا انتظام کیا اور کچی مسجد تعمیر کی۔

سفر حج:

اقامت رائے بریلی سے کئی سال بعد سید علم اللہ حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ سفر حج میں ان کے تیسرے بیٹے ابوحنیفہ بھی ساتھ تھے جو ان دنوں بارہ برس کے تھے۔ تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق یہ بائیس آدمیوں کا قافلہ تھا جو سعادتِ حج کی غرض سے رائے بریلی سے روانہ ہوا۔ بندرگاہ تک ان لوگوں نے تمام سفر پیدل اور ننگے پاؤں طے کیا۔ عقیدت مندوں نے سواریوں کی پیش کش کی' لیکن سید صاحب نے کوئی سواری قبول نہ کی۔ اپنا ضروری سامان' جو قرآن مجید' جائے نماز' وضو کا لوٹا اور بستر وغیرہ پر مشتمل تھا' سید ممدوح خود اٹھاتے تھے۔ تمام سفر میں کسی کو کسی قسم کی تکلیف دینا گوارا نہ کی ____ مردان حق کا یہ قافلہ بندرگاہ پر پہنچا تو ان کے تدین وللٰہیت' اسلام سے بے پناہ محبت وشیفتگی اور کمال اتباع سنت کو دیکھ کر جہاز کے مالکوں کے تاثر و گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ ان سب لوگوں کو مفت لے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا اور بائیس روپے فی کس کے حساب سے پورے قافلے کا کرایہ ادا کیا۔ مناسک حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ گئے۔

دیار رسول ﷺ سے ان کی بے انتہا محبت کا اندازہ لگایئے کہ ہندوستان کے سفر میں اس لیے جوتا نہ پہنا کہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے جا رہے ہیں' تا حد امکان عجز وادب کے ظاہری تقاضوں کو بھی پورا کرنا چاہیے۔ حجاز کی ارض مقدس میں پہنچے تو اس بنا پر جوتا پہننا مناسب نہ جانا کہ اس پاک سرزمین کو رسول اللہ ﷺ کی خرام گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس پر ننگے پاؤں ہی چلنا چاہیے۔

قیامِ مدینہ منورہ کے ایام میں سید علم اللہ نماز کے بعد جنگل میں چلے جاتے اور لکڑیاں کاٹ کر لاتے' انھیں فروخت کر کے جتنے پیسے ملتے' ان میں اپنے اخراجات پورے کرتے۔ ان کی ترک دنیا اور عجز وسادگی کی وجہ سے مشائخ حرمین' انھیں ''مثیل ابی ذر'' کے لقب سے پکارتے تھے۔ یہ حج انھوں نے غالباً ۱۰۶۸ھ یا ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء یا ۱۶۵۹ء میں کیا۔

Marfat.com

دوسری مرتبہ ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء میں عازم حج ہوئے۔ اس مرتبہ حرم شریف کا نقشہ طول وعرض کے تعین کے ساتھ کاغذ پر کھینچ کر ساتھ لائے اور اسی نقشے کے مطابق رائے بریلی کے دائرے میں مسجد تعمیر کرائی۔ البتہ حرم کے احترام کے خیال سے مسجد کے طول وعرض میں چند انگشت کی کمی کر دی۔ مسجد کی بنیاد میں تبرک وتیمن کی غرض سے آب زمزم ڈالا۔ مسجد کی تعمیر ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء کو مکمل ہوئی۔ تاریخ تکمیل ''قبلتہ ثان'' سے نکلتی ہے۔

اتباع سنت اور عمل وایثار کا بے پناہ جذبہ:

سید علم اللہ شاہ اتباع سنت کا نہایت شدید جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے۔ احکام شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ اس میں ان کی استقامت کا یہ حال تھا کہ کسی چھوٹے بڑے کی کوئی پروانہ کرتے۔ قرآن وحدیث کے ہر حکم سے محبت اور ہر برائی سے نفرت تھی۔ ہر معاملے یعنی کھانے پینے' اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے' جاگنے سونے' بات چیت' لوگوں سے میل جول اور رسم وراہ قائم رکھنے میں ہمیشہ اتباع سنت اور پیروی شریعت پیش نگاہ رہتی۔ ان کی طبیعت بن گئی تھی کہ عزیمت کی باتوں پر عمل کرتے اور رخصت وجواز سے فائدہ نہ اٹھاتے۔ اعزہ واقارب اور معتقدین ومریدین کو بھی اسی کی تاکید کرتے۔ تواضع اور سادگی کا بہترین نمونہ تھے۔ ہر چھوٹے بڑے کو سلام کرنے میں سبقت لے جانے کے لیے کوشاں ہوتے۔ اس باب میں جو مسنون طریقہ ہے' اسی کی پابندی فرماتے۔ ہاتھ اٹھا کر یا گردن جھکا کر سلام کو مکروہ اور خلاف شریعت گردانتے۔ لباس میں انتہائی محتاط اور پابندِ سنت تھے۔ روئی والا چغہ کبھی نہیں پہنا' اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی نہیں پہنا تھا۔ کسی سے مخاطب ہوتے تو بڑے احترام سے نام لیتے۔ ان کے سامنے اصل معیارِ تعلق اور پیمانہ محبت صرف اطاعت رسول ﷺ اور اتباع سنت تھا۔ کسی سے محبت کرتے تو اللہ کی رضا جوئی کے لیے اور بغض رکھتے تو اللہ کی خوش نودی کی غرض سے۔ الحب للہ والبغض للہ پر عامل تھے۔ کوئی شخص کسی خلاف سنت فعل کا مرتکب ہو جاتا تو جب تک اس سے توبہ ورجوع نہ کر لیتا اور اللہ سے معافی نہ مانگ لیتا' اس سے ملنا ترک کر دیتے' خواہ وہ کتنا ہی قریبی عزیز اور رشتے دار ہوتا۔

بدعات ومحدثات کے سخت مخالف تھے۔ اہل بدعت کے سلام کا بالکل جواب نہ دیتے' نہ ان سے ملتے' نہ ان کے ہدایا وتحائف قبول کرتے۔ ان کو شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور لوگوں کو تلقین فرماتے کہ ان سے تعلقات قائم نہ کریں۔ ان کی اتباعِ سنت اور تنفرِ بدعت کی عام شہرت تھی۔ لاہور کے شیخ میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید شیخ عبدالحمید ابدال تھے' جن کا حلقۂ ارادت بڑا وسیع تھا۔ ابدال صاحب کے ایک مرید نے سید علم اللہ کے بارے میں پوچھا تو ابدال صاحب نے فرمایا:

''اے عزیز! حضرت سید (علم اللہ) اتباعِ سنت اور پیروی رسالت ﷺ میں اس عہد کے یگانہ مرد ہیں۔ اسلاف میں بھی ان جیسے بہت کم لوگ گزرے ہیں۔ سیّد ہونے کی وجہ سے ان کو فرزندی کا رتبہ حاصل تھا۔ پھر محبوبیت کا منصب ملا۔ یہ بلند درجے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئے۔''

Marfat.com

گھر کے کام خود انجام دینے کی کوشش کرتے یا کم از کم ان میں شریک ہوتے' مثلاً جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے' پانی لاتے' کھانا پکانے میں گھر والوں کی مدد کرتے یہاں تک کہ جھاڑو دیتے اور گھر کی صفائی کرتے۔

کسی کام کے لیے کسی کو حکم نہ دیتے' خود کرنا شروع کر دیتے۔ دوسرے دیکھ کر خود ہی اس میں شریک ہو جاتے۔ شریک کار ہونے والے کو منع بھی نہ کرتے۔ اس سلسلے میں بہت سی باتیں تذکروں میں مذکور ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ چھپر بنانا چاہتے تھے' خود ہی بنانا شروع کر دیا۔ مسجد کے لیے چونے کی ضرورت تھی' خود ہی زمین کھود کر روڑی نکالنے لگے۔ بازار سے ضروری استعمال کی چیزیں خریدنے جاتے تو سب چیزیں اپنے سر پر اٹھا کر لاتے۔ دوسرے کو بالکل تکلیف نہ دیتے۔

تقسیم اشیا میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے۔ پورا خیال رکھتے کہ نہ کوئی چیز کسی کو زیادہ ملے' نہ کم۔ سب کا حصہ برابر اور مساوی ہو' اسی لیے کھانا اکٹھا تیار کراتے' پھر سب گھر والوں' عزیزوں اور عقیدت مندوں کو برابر تقسیم کر دیتے۔ یہ بظاہر چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے' لیکن درحقیقت بڑی اہم اور بنیادی بات ہے۔ اس سے کئی قسم کے شکوک کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سید علم اللہ اس میں انتہائی احتیاط فرماتے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ کسی نے چار یا چھ سنگترے پیش کیے' ان کو تقسیم کرنے سے بات نہیں بنتی تھی۔ سید موصوف نے ان کا عرق نکلوا کر کھانے میں ڈال دیا' تاکہ کوئی اس سے محروم نہ رہے اور تقسیم میں برابری کا اصول مجروح نہ ہو۔

شیر خور بچوں کی ماؤں کا بھی پورا خیال رکھتے۔ ان کو خشک چیزیں دے دیتے تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق پکا کر کھالیں۔ ہدایا قبول کرنے میں بڑے محتاط تھے۔ غریبوں اور مقروضوں سے کبھی تحفہ اور ہدیہ نہیں لیا۔ جن ارباب دولت اور اصحاب ثروت کے اقربا و اعزہ غریب ہوتے' ان سے بھی کوئی چیز نہ لیتے۔ فرماتے "قرض کی ادائیگی اور ذوی الارحام کی امداد تم پر فرض ہے۔ پہلے فرض پر عمل کرو' پھر دوسروں کو دو۔ دوسروں کو دینا زیادہ سے زیادہ نفل کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرائض کو ترک کرنے والوں کی نفلی عبادت کیوں کر درجہ مقبولیت کو پہنچ سکتی ہے؟"

ایک مرتبہ سئی ندی میں طغیانی آئی اور سید صاحب کا مکان پانی میں ڈوب کر منہدم ہو گیا۔ ایک مرید نے مکان کی تعمیر کے لیے پانچ سو روپے کی رقم بطور ہدیہ پیش کی۔ سید ممدوح نے تمام رفقا کو جمع کیا اور کہا کہ اگر اپنے ہاتھ سے مکان بنانے کے لیے تیار ہو جاؤ تو یہ رقم تمھاری عام ضرورتوں پر خرچ ہو گی ورنہ مزدوروں اور اجیروں کو دے دی جائے گی۔ رفقا نے بہ طیب خاطر سب کام خود کرنے کا فیصلہ کیا۔ سید صاحب بھی برابر کام میں مصروف رہے۔ مٹی کھودتے' گارا تیار کرتے اور سب کے ساتھ برابر ٹوکریاں اٹھاتے۔

علم و فضل:

علم و فضل کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ علوم شرعیہ اور معارف الٰہیہ سے پوری طرح باخبر تھے۔ عارف باللہ اور عالم ربانی تھے۔ تمام انواع خبر اور اقسام علوم سے بہرہ ور تھے۔ قرآن' حدیث' فقہ اور باقی علوم متداولہ و

Marfat.com

مروّجہ پر عبور رکھتے تھے۔ قانع و عفیف، عابد و زاہد اور مرقع صلاح و تقویٰ تھے۔ سفر و حضر میں کثرت سے صدقات و خیرات اور ایثار کا مظاہرہ کرتے۔ باوجود اس کے کہ خود تنگ دست ہوتے اور فقر و غربت کی زندگی بسر کرتے لیکن اصحاب حوائج کی نہایت صدق و اخلاص سے مدد کرتے۔

اللہ نے انھیں خوب صورتی سے بھی نوازا تھا۔ بہت ہی وجیہ اور حسین تھے۔ قد و قامت کے نعمت بھی حاصل تھی۔ نور ایمان کی باطنی تزیین کے ساتھ ساتھ ظاہری اعتبار سے بھی حسن و زیبائی سے مزین تھے۔ جب دن کو باہر نکلتے لوگوں کا ہجوم جمع ہو جاتا اور حصولِ برکت غرض سے وہ ہاتھوں کو چومنے کی کوشش کرتے، مگر سید صاحب اس حرکت کو گوارا نہ کرتے اور سختی سے روک دیتے۔ جب کوئی ان کی تعریف کرتا تو اظہارِ خفگی فرماتے اور جب نصیحت کی جاتی تو خوش ہوتے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مصروف رہتے اور خلافِ شرع امور کی نہایت سختی سے نکیر کرتے۔ شیخ جلیل، عالم کبیر اور زبردست مبلغ دین تھے۔

اسلامیت کی تصویر کامل:

اپنے اعمال و افعال اور اخلاق و کردار میں اسلامیت کی کامل تصویر تھے۔ انہی امور پر عمل کرتے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ اپنے بیٹوں کا نکاح کیا تو اسی مقدار میں مہر مقرر کیا جس کا رسول اللہ ﷺ سے ثبوت ملتا ہے اور وہی شیوہ اختیار کیا جو احادیث میں مذکور ہے۔ بیٹیوں کے نکاح میں بھی یہی معیار سامنے رکھا۔ پھر نکاح کے بعد انھیں پیدل رخصت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اسی طرح رخصت فرمایا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس ضمن میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، جو یہ ہے کہ ایک بیٹی کی نسبت اپنے چچازاد بھائی سید ہدایت اللہ کے بیٹے سید عبدالرحیم سے ہوئی تھی۔ وہ نصیر آباد میں رہتے تھے۔ سید علم اللہ شاہ نے بیٹی کے نکاح اور رخصتی کا فیصلہ کیا تو خود نصیر آباد گئے۔ رشتے داروں سے ملے۔ پھر سید عبدالرحیم سے کہا: میاں وضو کر کے آیئے تاکہ نکاح کر دیا جائے۔ رشتے داروں نے اس طریق نکاح سے اختلاف کیا اور کہا کہ نکاح کے لیے باقاعدہ تاریخ مقرر کر کے برادری کو جمع کرنا چاہیے، اور جوڑے جامے تیار ہونے چاہئیں، لیکن سید صاحب موصوف نے چپ چاپ نکاح پڑھوایا اور بیٹی کو رخصت کر دیا[1]۔

سماع و مزامیر اور بدعات کی مخالفت:

سماع و مزامیر، قوالی اور غنا وغیرہ کے سخت مخالف تھے۔ اس سلسلے کے چند واقعات لائق تذکرہ ہیں۔

ایک مرتبہ مشہور عالم و شیخ پیر محمد سلونی رائے بریلی تشریف لائے۔ ان کی مجلس میں عام طور پر سماع کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ انھوں نے سید علم اللہ سے ملاقات کا وقت مانگا۔ سید موصوف نے جواب دیا کہ آپ باہر

[1] سید احمد شہید ۴۲۔

Marfat.com

سے آئے ہیں، ملاقات کے لیے مجھے حاضر ہونا چاہیے تھا، لیکن چونکہ آپ کے ہاں سماع و مزامیر اور قوالی کا سلسلہ جاری ہے لہٰذا معذرت خواہ ہوں۔ نہیں آ سکتا۔

ایک دفعہ مشہور عالم و فاضل اور بہت سی علمی و فنی کتابوں کے مصنف ملا جیون امیٹھوی نے سماع کے موضوع پر مناظرہ شروع کر دیا۔ سید علم اللہ نے اعتراضات کیے تو ملا موصوف بہ ایں علم و فضل جواب نہ دے سکے۔

پہلے یا دوسرے سفرِ حج میں ایک مقام پر قیام پذیر ہوئے اور نماز جمعہ کے لیے مسجد میں گئے۔ وہاں ایک پیر چلہ کشی میں مشغول تھا اور گرد و نواح کے لوگوں میں اس کی نیکی اور خدا رسیدگی کی بڑی شہرت تھی۔ سید علم اللہ بھی اس سے ملنے کے آرزومند تھے اور خیال تھا کہ نماز کے بعد مسجد میں ضرور ملاقات ہوگی۔ لیکن پیر صاحب نماز جمعہ میں شامل نہ ہوئے۔ سید علم اللہ نماز کے بعد اپنی قیام گاہ پر چلے آئے اور اس پیر کے مریدوں سے کہا جو شخص نماز کے لیے باہر نہ نکلا اور اس نے کسی شرعی عذر کے بغیر قطعی فرض ترک کر دیا، اس کا منہ دیکھنا ہرگز روا نہیں اور اس کے ساتھ ملاقات سراسر خطا ہے [1]۔

غرض سید صاحب بدعات کی سخت تردید کرتے اور غیر شرعی امور کے مرتکب سے کوئی علاقہ نہ رکھتے، اگرچہ دینوی اعتبار سے وہ کتنا بھی بڑا آدمی ہوتا۔

کمال احتیاط:

کسی کا ہدیہ لینے اور نذر قبول کرنے سے سید علم اللہ کمال احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جب تک یقین نہ ہو جاتا کہ جو مال دیا جا رہا ہے، وہ شک و شبہ سے خالی ہے اور چیز دینے والا پابند شرع ہے، کوئی چیز قبول نہ فرماتے۔ اس ضمن کا ایک واقعہ یہ ہے کہ رائے بریلی کے محلہ لوہانی پور کے ایک زمیندار کا نام پیر خاں تھا۔ یہ شخص سید علم اللہ سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے سید صاحب کی خدمت میں آم پیش کیے۔ فرمایا یہ آپ کا اور آپ کے بھائیوں کا مشترکہ مال ہے۔ اگر آپ اپنا حصہ تقسیم کرا کے لاتے تو میں ضرور لے لیتا، اب نہیں لے سکتا۔ پیر خاں نے عرض کیا، بھائیوں کے حصے کا میں ذمہ دار ہوں۔ وہ آم دے کر تھوڑی دور گیا ہوگا کہ سید صاحب نے آدمی بھیج کر اسے واپس بلایا اور کہا:

میں جب سے راہِ فقر پر قدم زن ہوا ہوں، بارگاہ باری تعالیٰ میں ہمیشہ دعا مانگتا رہا ہوں کہ مجھے حرام اور مشتبہ مال سے محفوظ رکھا جائے۔ آپ کا ہدیہ مالِ مشتبہ ہے۔ میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔

نتائج الحرمین کی روایت ہے کہ شیخ آدم بنوری سے جن حضرات نے کسب فیض کیا، ان میں سید علم اللہ کا اسم گرامی تو شامل ہے ہی، ان کے علاوہ شیخ محمد سلطان بلیادی اور شیخ عثمان شاہ جہان پوری بھی اسی خوش بخت جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ عثمان کو سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے ہاں خاص عزت و احترام کے مستحق

[1] سید احمد شہید ص ۴۲۔

Marfat.com

سمجھا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ شیخ عثمان نے شیخ محمد سلطان اور سید علم اللہ کی تنگ دستی کے بارے میں سلطان اورنگ زیب عالم گیر کو خط لکھا اور امداد کی سفارش کی۔ عالم گیر نے خط دیکھتے ہی شیخ سلطان کی خانقاہ کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ سید علم اللہ وظیفہ قبول نہیں کریں گے' اس لیے حکم دیا کہ جس مال سے خود ہمارے لیے کھانے کا انتظام ہوتا ہے' اس میں سے دو سو روپے بہ طور ہدیہ سید علم اللہ کو بھیج دیے جائیں۔ سید صاحب کو بے شک معلوم تھا کہ یہ ہدیہ رزق حلال سے آیا ہے اور بھیجنے والا وہ بادشاہ ہے' جس سے بڑھ کر صاحب تقویٰ بادشاہ کم از کم ہندوستان کے تخت حکومت پر کوئی نہیں بیٹھا۔ لیکن اس کے باوجود ہدیہ واپس کر دیا۔ یہ ان کی شانِ استغنا اور احتیاط کی انتہا تھی۔!

فقر و تنگ دستی کی دعا:

لوگ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے فارغ البالی اور وسعت مال و دولت کی دعا مانگتے ہیں' لیکن سید علم اللہ کا طرز عمل اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اکثر اپنی اولاد کے لیے اللہ سے فقر و تنگ دستی کی دعا مانگتے تاکہ وہ لوگ اس جہان فانی کے عارضی آرام و آسائش اور دینوی نعم و زخارف کی محبت میں الجھ کر دین و شریعت اور صلاح و تقویٰ کی راہ ترک نہ کر دیں۔ چنانچہ اس خاندان میں اگر کسی کے گھر ضرورت کی عام چیزیں نہ ہوتیں اور فقر و احتیاج کی نوبت آ جاتی تو تنگی کی اس حالت کو اس طرح تعبیر کیا جانے لگا تھا کہ "فلاں گھر میں شاہ علم اللہ تشریف فرما ہیں [1]۔"

یعنی ان کی اصطلاح میں تنگ دستی اور شاہ علم اللہ لازم و ملزوم ہیں اور ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

صبر و تحمل کی انتہا:

سید علم اللہ بہ درجہ غایت صابر و شاکر اور انتہا درجے راضی بہ قضا رہنے والے تھے۔ ان کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے سید ابو حنیفہ تھے۔ بڑے متقی' پابند شرع اور پاک باز تھے۔ ان اوصاف کی وجہ سے بلند مرتبہ باپ کو بڑے محبوب تھے۔ عین عالم جوانی میں بتیس برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ رات کا وقت تھا۔ سید صاحب نے گھر کے تمام افراد کو قضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کی تلقین فرمائی۔ نہ کوئی رویا' نہ کوئی حرف شکایت کسی کی زبان پر آیا۔ رات بالکل خاموشی میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو سید صاحب نے اطمینان کے ساتھ فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا فرمائی۔ نماز کے بعد ایک شخص سے کہا کہ رات میاں ابو حنیفہ فوت ہو گئے' ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا چاہیے۔

جوان اور سعادت مند بیٹے کو دفن کر چکے تو فرمایا' الحمد للہ' میاں ابو حنیفہ اس دنیا سے دولت ایمان کے

[1] مخزن احمدی' ص ۴۲۔

Marfat.com

ساتھ رخصت ہوئے ہیں۔ گھر میں ایک بوڑھی عورت روزانہ چرخا چلایا کرتی تھی۔ سوت کاتنے کے سوا اس کا کوئی کام نہ تھا۔ سید ابوحنیفہ کی وفات کے دن اس نے افسوس میں اپنا کام بند رکھا۔ سید علم اللہ گھر گئے تو چرخا بند تھا' فرمایا' یہ کام کیوں بند کیا ہے؟ بڑھیا نے کہا' ایسا نیک اور جوان بیٹا دنیا سے اٹھ گیا ہے' چرخے کا ہوش کیسے رہ سکتا ہے۔؟ فرمایا' یہ سب قضا وقدر کے معاملے ہیں' اللہ کے حکم میں کون دم مار سکتا ہے۔ سب کی زندگی چند روزہ ہے۔ ہمیں خدا کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔ اپنا کام بند نہ کرو۔

ایک عجیب وغریب واقعہ:

مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیا میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے حوالے سے سید علم اللہ کے بارے میں ایک عجیب وغریب واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ علامہ سیالکوٹی فرمایا کرتے تھے کہ سید علم اللہ نے مجھے (عبدالحکیم کو) ایک مرتبہ ایک روپیہ عطا کیا۔ میں نے وہ روپیہ تبرک کے طور پر ایک تھیلی میں رکھ لیا۔ کئی سال وہ روپیہ میرے پاس رہا۔ جب تک وہ روپیہ موجود رہا' تھیلی میں سے روپے ختم نہیں ہوئے۔

وفات:

عمر کے آخری حصے میں غذا بہت کم کر دی تھی' چنے کی دال کا تھوڑا سا پانی اور چند دانے چاول کے کھاتے۔ حبّ رسول اللہ ﷺ کے جذبے میں یہ دعا کرتے کہ اتنی ہی عمر ہو' جتنی کہ رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمائی گئی تھی۔ ۸/ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ/ ۲۵/ اکتوبر ۱۶۸۵ء کو دوشنبہ کے روز رائے بریلی میں فوت ہوئے۔ باسٹھ برس' آٹھ مہینے اور چھبیس دن کی عمر پائی۔ تاریخ وفات ''دوست بفردوس رسید'' نکلی۔

سلطان اورنگ زیب عالم گیر کو سید علم اللہ سے بڑی عقیدت تھی۔ انہی دنوں اس نے خواب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے رحلت فرمائی اور فرشتے آپ کے جنازۂ مبارک کو آسمان پر لے گئے۔ اس خواب سے عالم گیر سخت پریشان ہوا۔ ملاجیون سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا' غالباً سید علم اللہ فوت ہو گئے۔ چنانچہ خواب کی تاریخ لکھی گئی۔ پھر وقائع نویس کی اطلاع سے تصدیق ہو گئی کہ واقعی سید علم اللہ نے اسی روز انتقال کیا۔ بادشاہ نے ملاجیون سے پوچھا کہ آپ نے یہ تعبیر کس دلیل کی بنا پر کی تھی؟ کہا' صرف اس بنا پر کہ سید علم اللہ اتباعِ سنت کا اس قدر کامل ترین نمونہ تھے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی وفات کا مطلب یہ تھا کہ سنت کا ایک نہایت پاکیزہ اور عمدہ ترین نمونہ دنیا سے اٹھ گیا۔

اولاد:

سید علم اللہ کی شادی سید ہاشم جائسی کی صاحب زادی بی بی صالحہ سے ہوئی تھی۔ اس سیدہ سے چار

Marfat.com

بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹیوں میں سے ایک بیٹی کا نام سیدہ حنیفہ تھا۔ ان کی شادی سید عبدالرحیم بن سید ہدایت اللہ (بن سید اسحاق برادر سید فضل) سے ہوئی۔ دوسری حلیمہ تھیں، جو سید محمد جعفر بن سید قطب عالم سے بیاہی گئیں۔

چار بیٹوں کے نام یہ تھے: سب سے بڑے سید آیت اللہ، دوسرے سید محمد ہدیٰ، تیسرے سید ابوحنیفہ اور چوتھے سید محمد۔! سید ابوحنیفہ، بتیس سال کی عمر پا کر سید علم اللہ کی زندگی ہی میں ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۷ء میں وفات پا گئے تھے۔ سید آیت اللہ نے ۱۲/رجب ۱۱۱۶ھ/۳۰/اکتوبر ۱۷۰۳ء کو انتقال کیا۔

سید محمد ہدیٰ نے ربیع الاول ۱۱۲۰ھ/مئی ۱۷۰۸ء کو رحلت فرمائی۔

سید محمد، دائرۂ علم اللہ کی سکونت ترک کر کے شہر رائے بریلی کے اس حصے میں جا آباد ہوئے تھے جو قلعے کے نام سے موسوم تھا۔ والدہ کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وہیں ایک دائرہ بنا لیا تھا، ایک مسجد بھی تعمیر کر لی تھی۔ ان کی والدہ سیدہ بی بی صالحہ اپنے جلیل القدر شوہر (سید علم اللہ) کے بارہ برس بعد ۱۱/صفر ۱۱۰۸ھ/۳۰/اگست ۱۶۹۶ء کو عازم فردوس ہوئیں۔ خود سید محمد نے ۲۴/ربیع الثانی ۱۱۵۵ھ/۱۷/جولائی ۱۷۴۲ء کو جنت کی راہ لی۔

ان سب کے حالات ان شاء اللہ اپنے اپنے مقام پر بیان ہوں گے۔ یہ نہایت پاک باز اور بلند مرتبت حضرات تھے۔

سید علم اللہ نے وصیت کی تھی کہ میرے بعد کسی بیٹے کی دستار بندی نہ کی جائے۔ یعنی کسی کو خلیفہ یا جانشین نہ بنایا جائے۔ سجادہ آرائی کا جو سلسلہ عام طور پر رائج تھا، اس سے سخت متنفر تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے خاندان میں یہ سلسلہ جاری نہ ہو۔ چنانچہ اسی پر عمل ہوا۔ اس گھرانے کے بہت سے افراد نے اپنے حلقے سے باہر جا کر بھی کسب فیض کیا۔ اگر کسی شخص نے خود ان میں سے کسی سے مستفیض ہونے کی خواہش ظاہر کی تو اس کی تمنا بھی پوری کر دی۔ لیکن باقاعدہ گدی بنا کر یا سجادہ نشین ہو کر کسی نے افادہ و افاضہ کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔ اسی طرح دینوی مال و دولت اور عزوجاہ کی طلب کو بھی کسی نے شیوہ نہ بنایا اور نہ اس کے لیے کوئی سرگرداں ہوا۔ اگر دولت ملی تو اسے غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ دیا[1]۔

۶۹- قاضی علی بیجاپوری

قاضی علی بن اسد اللہ بن عبداللہ بن وجیہ الدین علوی گجراتی بیجاپوری۔ عالم کبیر، شیخ عصر اور علامۂ وقت تھے۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ ان کے والد اسد اللہ بھی عالم و فاضل تھے، دادا عبداللہ بھی یگانہ روزگار اور

[1] سید علم اللہ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: تذکرۃ الابرار۔ مخزن احمدی۔ وقائع احمدی۔ نتائج الحرمین۔ بحر زخار۔ مہر جہاں تاب۔ خزینۃ الاصفیا۔ سیرت السادات۔ اعلام الہدیٰ۔ سیرت عطیہ۔ سید احمد شہید سیرت۔ سید احمد شہید۔

Marfat.com

صاحب علم تھے اور پر دادا وجیہ الدین بھی دیار ہند کے منفرد عالم، ممتاز محقق اور بلند مرتبہ مصنف تھے۔ یعنی کئی پشتوں سے یہ خاندان علم و تحقیق اور زہد و اتقا کا مرکز چلا آ رہا تھا اور بے شمار علما و فضلا ان سے کسب فیض اور اخذ علم کر چکے تھے۔ تدین و تقویٰ میں بھی ان کا درجہ بہت اونچا تھا۔ عباد و صلحا کی بہت بڑی جماعت ان سے شرف فیض حاصل کر چکی تھی۔

قاضی علی گجرات میں پیدا ہوئے۔ وہیں پرورش پائی اور اسی شہر کے فحول علما اور نامور فضلا سے تحصیل کی۔ یہاں تک کہ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں اونچے درجے کو پہنچے اور اقران و معاصرین میں بڑی شہرت پائی۔ اصلاً گجرات کے رہنے والے تھے، لیکن سلطان ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں اپنے برادر کبیر میران بن اسد اللہ کے ساتھ بیجا پور منتقل ہو گئے تھے، اس لیے بیجا پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ والیٔ بیجا پور سلطان ابراہیم عادل شاہ نے ان کی بڑی تکریم کی اور منصب قضا پر متعین کیا۔ بیجا پور میں ایک عظیم الشان مدرسہ قائم فرمایا جس سے علما و طلبا کی کثیر تعداد مستفید ہوئی۔ ان کے مشہور تلامذہ میں شیخ ابوتراب بیجا پوری (متوفی ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء) سید محمد، قاضی برہان الدین، قاضی ابراہیم زبیری، ابراہیم بن عبدالمجید بیجا پوری وغیرہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ چونکہ ان سے اس عہد کے کثیر اصحابِ علم اور نامور حضرات نے علم حاصل کیا تھا، لہٰذا ''استاذ الاولیا'' کے لقب سے ملقب ہوئے۔

اس جلیل القدر ہندی عالم و فقیہ نے ۵ ذی العقدہ ۱۰۷۰ھ/۳/جولائی ۱۶۶۰ء کو بیجا پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

۷۰- قاضی علی اکبر الہ آبادی

قاضی علی اکبر الہ آبادی گیارھویں صدی ہجری کے نامور ہندوستانی شیخ اور معروف عالم و فقیہ تھے۔ فقہ اور اصول فقہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ مروّجہ علوم عربیہ کے رموز و نکات سے کامل آگاہی رکھتے تھے۔ شاہ جہان کے وزیر اور معتمد خاص علامی سعد اللہ خاں کے ندیم و جلیس تھے۔ سعد اللہ خاں ان کی جامعیت علم و ادراک سے بہت متاثر تھا۔ اس کا فرزند اکبر لطف اللہ خاں طویل عرصے تک ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل رہا جو باپ کی طرح فضل و کمال اور شجاعت و بسالت کا مرقع تھا۔ علوم و معارف کے مختلف گوشوں میں عبور رکھتا تھا۔ علامی سعد اللہ خاں کے بعد اسے شاہ جہان نے اپنی تربیت میں لے لیا تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر نے زمامِ سلطنت ہاتھ میں لی تو درجہ بدرجہ اس کو بہت ترقی دی۔ عالم گیر کا یہ معتمد علیہ امیر تھا۔ ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء کو فوت ہوا۔ لطف اللہ خاں نے قاضی علی اکبر الہ آبادی سے بڑا فیض حاصل کیا اور ان کے حسن تربیت سے اکثر علوم میں

❶ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۶- نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۸۰، ۲۸۱-

Marfat.com

مہارت پیدا کی۔

علامی سعد اللہ خاں سے تعلق کی بنا پر قاضی علی اکبر الہ آبادی کو سعد اللہ خانی کہا جاتا تھا' اور وہ ''سید قاضی علی اکبر الہ آبادی سعد اللہ خانی'' کے نام سے موسوم تھے۔

قاضی علی اکبر کی وسعت معلومات کی شہرت سلطان اورنگ زیب عالم گیر تک پہنچی تو اس نے ان کو اپنے بیٹے محمد اعظم کا اتالیق مقرر کر دیا۔ پھر جب اس پر ان کی قابلیت کے مزید جوہر کھلے اور ان کی دقت نظر' احتضار علوم اور ورع و اتقا کا علم ہوا تو لاہور کے محکمہ قضا پر مامور فرمایا۔ وہ پوری زندگی اسی عہدۂ رفیعہ پر فائز رہے۔ قضا کے منصب جلیلہ میں بڑے اونچے کردار کے حامل تھے۔ اس عظیم ذمہ داری کو نبھانے میں ہمیشہ عظمت کا ثبوت دیا۔ ان کی نگاہِ احتساب بڑی تیز تھی۔ لوگوں پر کڑی نگرانی رکھتے' حدود و تعزیزات کے اجراء میں صاحب عزیمت اور مستقل مزاج تھے۔

اس باب میں ان کے عزم و استقلال کی بنا پر بعض امرائے سلطنت ان سے ناراض رہتے' لیکن بادشاہ عالم گیر کی ہیبت اور دبدبے کی وجہ سے کسی کو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور ہاتھ بڑھانے کی جرات نہ تھی۔ اسی اثنا میں امیر قوام الدین اصفہانی کو لاہور کا والی مقرر کیا گیا۔ نظام الدین اس شہر کا کوتوال تھا۔ قوام الدین اصفہانی نے کوتوال شہر نظام الدین کو اشارہ کیا کہ قاضی علی اکبر پر قابو پایا جائے۔ چنانچہ کوتوال نے اپنے خاص آدمیوں کی طاقت سے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا اور قاضی علی اکبر اور ان کے بھانجے سید فاضل کو قتل کر دیا۔ جب ان کے قتل کے حادثہ محزنہ کی اطلاع بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کو ہوئی تو اس نے قوام الدین اور نظام الدین کوتوال کو ان کے مناصب سے الگ کر دیا۔ بعد ازاں کوتوال کو قاضی علی اکبر کے ورثا کے حوالے کر دیا گیا' انھوں نے اسے قصاص کے طور پر قتل کر دیا۔ پھر بادشاہ نے قاضی شیخ الاسلام فتی کو حکم دیا کہ امیر قوام الدین کے مقدمے کا شریعت کے مطابق فیصلہ کیا جائے' لیکن قاضی علی اکبر کے ورثا نے ان کو معاف کر دیا۔

مآثر عالم گیر میں بھی اس حادثے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''دارالسلطنت لاہور کے واقعہ نگار نے اطلاع دی کہ قاضی شہر سید علی اکبر' اپنی دیانت اور طبیعت کی سختی کی وجہ سے کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا تھا۔ قاضی مذکور کے بھانجے سید فاضل کا طرز عمل اس کے برعکس تھا۔ وہ اپنی کم عقلی کی وجہ سے دست دراز اور بدزبان تھا۔ لاہور کے حکام یعنی ناظم اور کوتوال شہر اس کے ہاتھ اور زبان سے تنگ آ گئے تھے۔ انھوں نے مجبور ہو کر اس کی جان لینے کی ٹھانی۔ قاضی علی اکبر نے بھی اس فتنہ و آشوب میں امیر قوام الدین ناظم لاہور کے ہاتھوں بے حد ذلت اور رسوائی کے ساتھ جان دی۔

''ناظم لاہور قوام الدین اور کوتوال نظام الدین دونوں شاہی خدمت و خطاب سے برطرف کیے گئے۔ نظام الدین کوتوال تو لاہور ہی میں ختم ہوا' اور قوام الدین کو حضور شاہی میں طلب کیا گیا۔ قوام الدین کے بجائے شہزادہ محمد اعظم پنجاب کے ناظم مقرر ہوئے اور طرّہ مرصع کے عطیے سے سرفراز فرمائے گئے۔ لطف اللہ خاں کو

Marfat.com

صوبے کی نیابت عطا ہوئی اور اس امیر کے تغیر سے ابونصر خاں کو خدمت عرض مکرر پر متعین فرمایا گیا۔

"قوام الدین اجمیر میں آستانہ والا پر حاضر ہوا۔ محکمہ شرعیہ میں اس کے خلاف مقدمہ دائر ہوا' اور روزانہ عدالت میں ذلیل و خوار ہونے لگا۔ بالآخر سید علی اکبر مرحوم کے بیٹے نے' اعزۂ دربار کی سفارش سے مطالبہ قصاص کا دعویٰ واپس لے لیا۔ قوام الدین کو خود ہی اپنی حالت پر رحم آیا اور اس نے جلد ہی دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔"

قاضی علی اکبر مصنف بھی تھے' مختلف علوم و فنون پر ان کی گہری نظر تھی۔ فارسی زبان کی مشہور درسی کتاب "فصول اکبری" اور عربی زبان میں "اصول اکبری" اور اس کی شرح' ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں علم صرف کی ہیں۔

قاضی سید علی اکبر کو اس عہد کے علمائے ہند کی اس بلند مرتبت جماعت میں شمولیت کا فخر حاصل تھا' جن کو عالم گیر نے فتاویٰ ہندیہ (فتاویٰ عالم گیری) کی تدوین و ترتیب پر متعین کیا تھا۔

برصغیر کے یہ عالم و فقیہ ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء میں قتل کیے گئے ❶۔

۱۷- شیخ علی پانی پتی

شیخ علی بن محمود بن عبدالصمد انصاری پانی پتی' عبدالقادر کے عرف سے معروف تھے۔ عالم و فقیہ اور زاہد و متقی تھے۔ فضل و صلاح کے اوصاف سے متصف تھے۔ اپنے چچازاد بھائی شیخ عبدالملک بن عبدالغفور پانی پتی اور شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی سے اخذ علم کیا۔ پھر کسب فیض کے لیے مختلف بلاد و امصار کے سفر پر روانہ ہوئے۔ للّٰہیت و تدین کا اندازہ کیجیے کہ تین مرتبہ ارض حجاز اور بیت المقدس کا عزم فرمایا۔ برصغیر کے شہرہ آفاق عالم و فقیہ شیخ علی بن حسام الدین متقی سے بھی فیض حاصل کیا۔ مختلف مقامات میں گھومے پھرے اور بہت سی عبادت گاہوں کی سیر کی' لیکن کسی کو تکلیف نہیں دی۔ نہ کسی سے روپیہ پیسا لیا' نہ کپڑے کا سوال کیا' نہ کسی سے کھانا کھایا اور نہ قیام و سکونت کی درخواست کی۔ مدت تک شہر اجین میں مقیم رہے۔ اجین سے سارنگ پور کا قصد فرمایا' وہاں ان کے عم محترم قاضی کے عہدے پر مامور تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ منصب بلند ان کے سپرد ہو گیا تھا لیکن طبیعت کسی جگہ جم کر بیٹھنے پر آمادہ نہ ہوتی تھی۔ چلنے پھرنے اور آزادی سے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ لہٰذا یہ

❶ مآثر الامرا- ج۳' ص ۹۹ تا ۱۰۱- مآثر عالم گیری' ص ۱۷۱' ۱۷۲- مفتاح التواریخ' ص ۲۸۱- فرحت الناظرین (شخصیات)' ص ۱۲۸' ۱۲۹- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۸۱' ۲۸۲- بزم تیموریہ' ص ۱۵۰- "معارف" اعظم گڑھ (بابت ماہ جنوری ۱۹۴۷ء ص ۵۴' ۵۵- تذکرہ علمائے ہند- ص ۱۷۱- برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ' ص ۳۰۰ تا ۳۰۳- تذکرہ مصنفین درس نظامی' ص ۱۵۵-

Marfat.com

منصب ان کی طبع خاطر کے مطابق نہ تھا۔ کئی مرتبہ اس سے دست کش ہوئے' اور جب جی چاہتا ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہو جاتے اور ایک شہر سے دوسرے شہر کو مسکن ٹھہرا لیتے۔ جہاں جاتے لوگ عقیدت سے پیش آتے اور وہاں سے جانے نہ دیتے۔

بہترین واعظ اور ناصح تھے' آواز میں بے پناہ اثر تھا۔ فصاحت و بلاغت کے اونچے درجے پر فائز تھے۔ جو بات زبان سے نکلتی لوگوں کے دلوں میں اترتی چلی جاتی اور وہ بے حد متاثر ہوتے۔ اللہ کے سوا کسی سے سوال نہ کرتے۔ عربی اور فارسی کے اس انداز سے اشعار پڑھتے اور ان کی توضیح فرماتے کہ لوگ وجد میں آ جاتے۔

قرآن مجید کے مفسر تھے۔ اس کے مشکل مقامات اور ناسخ و منسوخ وغیرہ کی نہایت عمدگی سے وضاحت فرماتے۔ پھر شان نزول' قرآن کی عبارات و استعارات' اعجاز و ایجاز' تخصیصِ اعراب' مجملات' مقامات تذکیر و موعظت' واقعات و قصص' فضائل' اس کے اجمال و تفصیل' متشابہات و محکمات' حروف مقطعات اور وحی وغیرہ' ایسے اہم مسائل پر اس اسلوب سے گفتگو فرماتے کہ سامعین اش اش کر اٹھتے۔ انداز بیان درد میں ڈوبا ہوا' جو بات زبان سے ادا ہوتی وہ قلب کی گہرائی سے نکلتی' اس سے اثر کا دائرہ اور بھی بڑھ جاتا۔

ہفت روزہ سلسلہ موعظت و تذکیر جاری تھا' جو جمعے کے روز سارنگ پور کی جامع مسجد میں منعقد ہوتا۔ پورا وعظ خاص ترتیب کے ساتھ قرآن مجید سے کہتے۔ وفات کے دن سورہ مزمل کی تفسیر بیان کی۔ بدن میں لرزا پیدا ہوا' کچھ وصیت فرمائی اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۰۱۱ھ/۱۵۹۳ء کو پیش آیا❶۔

۲۷-خواجہ علی پنو کشمیری

خواجہ علی کشمیری' کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو نما پائی۔ جلیل القدر کشمیری عالم شیخ یعقوب صرفی اور شیخ شمس الدین کشمیری کے شاگرد تھے۔ شیخ حمزہ کی صحبت میں بھی رہے اور ان سے استفاضہ کیا۔ ان بزرگوں سے کسب فیض اور اخذ علم کے بعد حرمین شریفین گئے۔ حج و زیارت کا شرف حاصل کیا اور شیخ شہاب الدین احمد ابن حجر ہیثمی مکی سے علم حدیث کی تحصیل کی۔ پھر کشمیر واپس آ کر درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا۔ خلق کثیر ان کے چشمہ علم سے سیراب ہوئی۔

خواجہ زین الدین علی کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے اہل علم اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے ارض کشمیر کے نامور فقہا میں ہوتا تھا۔ عہد جہاں گیری کے عالم تھے۔ اپنے مسکن سے متصل محلہ رانیواری میں دفن ہوئے❷۔

---

❶ اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار)' ص ۴۶۲' ۴۶۳-نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۸۴-

❷ حدائق الحنفیہ-ص ۴۲۶-تاریخ کشمیر اعظمی-ص ۱۳۴' ۱۳۵-تذکرۂ علمائے ہند-ص ۱۷۱-نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۸۷-

Marfat.com

۳۷- سید عمر حضرمی

سید عمر کا سلسلہ نسب یہ ہے: عمر بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عمر بن محمد بن احمد بن ابوبکر باشیبان حضرمی۔ شافعی المسلک فقیہ اور استاذ تھے۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اسی ملک کے علما وفضلا سے تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد تریم گئے۔ وہاں جید علمائے کرام کی مسند آراستہ تھی اور تشنگانِ علوم کی ایک جماعت حصول علم میں مشغول تھی' سید عمر حضرمی بھی اس میں شامل ہو گئے' چنانچہ شیخ عبداللہ بن شیخ اور ان کے فرزند شیخ زین العابدین سے اخذ علم کیا' قاضی عبدالرحمٰن بن شہاب الدین سے فقہ کی تعلیم حاصل کی' شیخ ابوبکر بن شہاب الدین اور ان کے دونوں اصحاب علم بھائیوں (شیخ احمد بن شہاب الدین اور شیخ محمد ہادی) سے دیگر علوم دینیہ پڑھے۔ پھر بھی تشنگی علوم ومعارف پوری نہ ہوئی تو حجاز مقدس کا رخ کیا۔ عرصہ دراز تک مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اقامت گزین رہے اور اس اثنا میں ان دیار پاک کے علمائے عظام کی ایک جماعت سے فیض یاب ہوئے' جن میں سید عمر بن عبدالرحیم بصری' شیخ احمد بن ابراہیم علان' شیخ عبدالرحمٰن خطیب اور دیگر فضلائے کرام کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اکثر مشائخ کی طرف سے خرقۂ خلافت بھی عطا ہوا اور بیشتر نے بیعت وارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی۔

حجاز مقدس سے پھر عازم تریم ہوئے۔ شادی کی اور سلسلۂ تدریس کا آغاز فرمایا۔ تریم میں کچھ عرصہ قیام اور درس وافادہ کے بعد دیار ہند کی راہ لی۔ اس زمانے میں سورت کی بندرگاہ بڑی مشہور تھی' وہاں مقیم ہوئے اور سید محمد بن عبداللہ العیدروس کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو بہ ایں علم وفضل وہیں جا کر استفادہ کیا اور عام طریقہ تعلیم کے مطابق باقاعدہ ان کے حلقہ تلامذہ میں شمولیت کی' بہت سے علوم میں مستفید ہوئے۔ ملک عنبر نے بھی جو ایک حبشی نژاد امیر اور وزیر تھا' حاضر خدمت ہو کر ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعد ازاں ملک عنبر برسر اقتدار آیا تو سید عمر حضرمی ان کے پاس آ گئے اور اس کی وفات تک مصروف درس وافادہ رہے۔

ملک عنبر کی وفات کے بعد سلطان عادل شاہ کے ہاں بیجاپور چلے گئے۔ عادل شاہ نے ان کی بڑی تکریم کی اور اعزاز وانعام سے سرفراز کیا۔ کئی سال بیجاپور میں مقیم رہے۔ پھر بلکام شہر میں توطن اختیار کر لیا اور لوگوں کی علمی نفع رسانی میں مصروف ہو گئے۔ طلبا کی بڑی جماعت نے ان سے استفادہ کیا۔ طلبا کی خود کفالت کرتے اور انھیں کتابیں مہیا کرتے' کھلے دل کے ساتھ مال وزر عطا کرتے' قیام وطعام کا انتظام فرماتے' پہننے کے لیے کپڑے عنایت کرتے' غرض ان کے تمام مصارف کے خود ذمہ دار تھے۔

سید عمر حضرمی کا چشمۂ فیض طویل عرصے تک جاری رہا' جس سے علما وطلبا کے جم غفیر نے فیض حاصل کیا۔ حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے' رعب اور شہامت وجلال کے مالک تھے۔ بیجاپور کی سکونت ترک کرنے کے بعد تادمِ زندگی بلکام شہر میں اقامت اختیار کیے رکھی۔ ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء میں وفات پائی[1]۔

---

[1] خلاصۃ الاثر۔ ج ۳' ص ۲۱۴' ۲۱۵۔

Marfat.com

۷۴- قاضی عمر اکبر آبادی

قاضی عمر بن حامد اکبر آبادی' شیخ اور عالم وفقیہ تھے- قاضی ناصر الدین عمر کے نام سے معروف تھے- مولانا ابو حامد ہارونی اور مفتی ابوالفتح تھانیسری وغیرہ اساتذہ سے تحصیل کی- فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود درس وافادے کا سلسلہ شروع کیا- فقہ واصول کے متبحر علما میں سے تھے- ابتدا میں سماعِ غنا کے مخالف تھے اور اس سے منع کرتے تھے' لیکن بعد میں سماع کے قائل ہو گئے تھے اور خود سماع کرنے لگے تھے-۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء میں فوت ہوئے ❶-

۷۵- قاضی عنایت اللہ بلگرامی

قاضی عنایت اللہ صدیقی بلگرامی' بلگرام کے مشہور اور نامور عالم قاضی اللہ دادا صدیقی کے فرزند تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ گھر میں علم کی نہر جاری تھی اور بہت بڑے عالم باپ کے بیٹے تھے۔ ابتدا سے انتہا تک تمام کتب درسیہ والد ماجد سے پڑھیں۔ فضیلت علمی سے بہرہ ور ہوئے اور تحقیق وکاوش کے اعلیٰ مرتبے کو پہنچے۔ یہاں تک کہ بلدۂ بلگرام کی مسندِ افتا کو زینت بخشی اور اس منصب علیا کے تمام لوازم بہ وجہ احسن انجام دیے۔ سید طیب بن عبدالواحد بلگرامی سے صدق دلانہ مودت رکھتے تھے' سید طیب دہلی گئے تو قاضی عنایت اللہ کی درخواست کے موجب شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملے اور قاضی ممدوح کے لیے شیخِ محدث سے شرف اجازہ اور سلسلے کے بزرگان کرام کا شجرہ حاصل کیا ❷-

قاضی عنایت اللہ بلگرامی گیارھویں صدی ہجری کے عالم وفقیہ تھے' لیکن ان کی تاریخ ولادت ووفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۷۶- مولانا عوض وجیہ سمرقندی

مولانا عوض وجیہ سمرقندی' مضافاتِ سمرقند کے ایک قریہ میں پیدا ہوئے' جس کا نام ''اخسیکت'' ہے۔ اسی مقام پر نشوونما پائی۔ میر عوض تاشقندی سے علم حاصل کیا اور فقہ کی تعلیم سے بہرہ مند ہوئے۔ خاصا عرصہ ان کی صحبت و ملازمت اختیار کیے رکھی۔ اپنے دور کے شیخ' عالم کبیر اور فقیہ نام دار تھے۔ صاف ذہن' بلند فطرت' فہیم وفطین' روشن ضمیر' قوی الحفظ' عالی فکر اور اونچے دل و دماغ کے عالم تھے۔ معقول ومنقول میں اپنے تمام اقران ومعاصرین سے فائق تر تھے۔ طویل مدت تک بلخ میں درس وافادہ کی مسند پر فائز رہے اور بے شمار لوگوں

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۸۹' ۲۹۰ بحوالہ اخبار الاصفیا-

❷ مآثر الکرام ص ۲۱۹- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۲۹۰-

Marfat.com

کو فائدہ پہنچایا۔ شاہ جہان بادشاہ نے اپنے بیسویں سال جلوس (۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء) کے اواخر میں بلخ فتح کیا تو مولانا عوض وجیہ سے ملاقات ہوئی۔ اس پادشاہِ دین پناہ کے نیک افکار و خیالات اور جذبۂ دین داری سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ بادشاہ پر بھی ان کی ذکاوت و فطانت اور دقتِ نظر کا بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ وہ ہندوستان تشریف لے آئے۔ بادشاہِ خوش اطوار نے ان کو مفتی لشکر کے منصب اعلیٰ پر مامور کیا۔

شاہ جہان کی معزولی کے بعد اس کا بیٹا اورنگ زیب عالم گیر سریر آرائے سلطنت ہند ہوا تو اس نے بھی ان کی نہایت تکریم کی۔ ان کے مرتبہ علم و فضل کا عملاً اعتراف کیا اور ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں محتسب کا عہدہ پیش کیا۔ دولت تیموری میں مولانا عوض وجیہ پہلے آدمی تھے، جنھیں احتساب کا محکمہ سپرد کیا گیا۔ ان کا کام اس بات کی نگرانی کرنا تھا کہ کوئی فواحش کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہے؟ کسی نے حدود شریعت سے قدم باہر تو نہیں نکال لیے ہیں اور منہیات کی وادی میں داخل نہیں ہو گیا ہے؟ حلال اور حرام امور میں امتیاز کی شرعی پابندیوں کو نظر انداز تو نہیں کر دیا گیا ہے؟ کہیں مسکرات کا استعمال تو نہیں ہو رہا ہے؟ ان امور پر وہ کڑی نگاہ رکھتے تھے اور جو لوگ حدود شرعی سے تجاوز کرتے، انھیں باقاعدہ سزا دی جاتی تھی۔

مولانا عوض وجیہ کی شخصیت اور خدمت کی بنا پر انھیں خلعت خاص عطا کیا جاتا اور پندرہ ہزار روپے سالانہ دیے جاتے۔ بعد ازاں اس کے عوض میں یک ہزاری منصب اور ایک صد گھڑ سوار کا منصب عطا ہوا۔

مولانا ممدوح بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے نزدیک بڑے معتمد علیہ تھے۔ ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۵ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ اس اثنا میں ان سے کسی ایسی خطا کا ارتکاب ہو گیا کہ بادشاہ نے انھیں معزول کر دیا، ان کی جگہ خواجہ قادر کو یہ منصب تفویض ہوا۔ منصب احتساب سے معزولی کے بعد وہ اپنے گھر میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گئے اور درس و افادہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء میں بادشاہ ان سے پھر خوش ہو گیا اور لغزش معاف کر دی۔ پہلا منصب بحال کر دیا اور اپنے بیٹے محمد اعظم کا اتالیق بھی مقرر کیا۔ پھر زندگی بھر ان سے لوگ نفع اندوز ہوتے رہے۔

بے شبہ مولانا عوض وجیہ متقی اور پرہیزگار عالم تھے۔ احکام شرع کے پابند تھے، عوام کو اتباع سنت کی راہ مستقیم پر چلانے اور قائم رکھنے اور بدعات کا خاتمہ کرنے میں ہر آن ساعی رہتے۔ اس میں قطعی مبالغہ نہیں کہ اس دور میں مولانا موصوف جیسا متبع سنت محتسب کوئی نہیں ہوا۔ ان کے فضل و کمال کا اس عہد کے تمام تذکرہ نگار واضح الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔

دور مغلیہ کے اس عالم و فقیہ نے ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء میں وفات پائی [1]۔

---

[1] عمل صالح (الموسوم بہ شاہ جہان نامہ) ج ۳، ص ۳۰۱۔ عالم گیر نامہ، ص ۳۹۲۔ مآثر عالم گیری ص ۱۷۳، ۱۷۴۔

Marfat.com

۷۷- شیخ عیسیٰ سندھی

شیخ عیسیٰ سندھی کا سلسلہ نسب یہ ہے: عیسیٰ بن قاسم بن یوسف بن رکن الدین بن معروف بن شہاب الدین المعروف الشہابی الجندی السندی الہندی البراری عیسیٰ القادری۔ لقب عین العرفا اور کنیت ابوالبرکات تھی۔ شیخ عیسیٰ کو مسیح الاولیا کے لقب سے بھی ملقب کیا جاتا ہے اور شیخ عیسیٰ جند اللہ بھی کہا جاتا ہے۔

شیخ عیسیٰ کے آباواجداد اصلاً علاقہ سندھ کے قصبہ پاتری کے رہنے والے تھے۔ یہ قصبہ خود انہی کے بزرگوں نے آباد کیا تھا۔ اس خاندان کے بزرگ اپنے علاقے میں عزت وتکریم کے حامل تھے اور ان کا شمار اس عہد کے متبحر علمائے دین، یگانہ روزگار مفسرین، نامور محدثین اور مشہور اولیائے کرام میں ہوتا تھا۔ مغل حکمران نصیرالدین ہمایوں کی لشکرکشی سے جب ملک سندھ میں افراتفری پھیلی اور شورش و بدامنی کا دور دورا ہوا تو شیخ عیسیٰ کے والد شیخ قاسم اور ان کے چچا شیخ طاہر محدث اپنے متعلقین و مریدین اور اعزہ واقربا کے ساتھ ۹۵۰ھ/ ۱۵۴۳ء میں وطن مالوف (پاتری سندھ) سے ہجرت کر گئے۔ یہ لوگ پہلے احمد آباد (گجرات) گئے اور پھر وہاں سے ایلچ پور (برار) پہنچے۔ اس سفر میں ان کو سخت تکلیف دِہ حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ شیخ عیسیٰ کے چچا شیخ طاہر اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور محدث تھے۔ زہد وتقویٰ کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ ان کے علم وفضل اور تدین واتقا کی شہرت تغال خاں تک پہنچی جو ان دنوں ملک برار کے نظم ونسق کا مالک تھا۔ اس نے بے حد اصرار اور نیازمندی سے شیخ طاہر محدث سے برار تشریف لانے کی استدعا کی۔ جب یہ خاندان تغال خاں کی التجا پر ایلچ پور پہنچا تو اس علم دوست حاکم نے ان کی شان کے شایاں ان کا خیرمقدم کیا اور نہایت عزت وتوقیر سے پیش آیا۔ اس نے شیخ طاہر کو وہاں کے دارالعلوم کی مسند پیش کی۔ نقد روپے کے علاوہ زرخیز اراضی کا ایک گاؤں بطور جاگیر نذر کیا۔ شیخ طاہر نے گاؤں اور گھریلو معاملات کی ذمہ داری اپنے چھوٹے بھائی شیخ قاسم (شیخ عیسیٰ کے والد) کے سپرد کی اور خود درس تدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔

کچھ عرصہ بعد ۵ ذی الحجہ ۹۶۲ھ/ ۲۰/اکتوبر ۱۵۵۵ء شب یک شنبہ کو شیخ قاسم کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ اس روز شیخ قاسم گھر پر موجود نہ تھے، سفر پر تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی شیخ طاہر محدث نے نومولود کا نام عیسیٰ رکھا۔ عیسیٰ نام رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ شیخ طاہر کے چچا کا نام عیسیٰ تھا، جو اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور نامور بزرگ تھے۔ اس نام کی معنوی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس نومولود عیسیٰ کو بھی علم وفضل اور ورع وتقویٰ کی دولت سے نوازا۔

شیخ قاسم سفر سے واپس آئے تو انھیں بیٹے کی ولادت کی خوش خبری سنائی گئی اور بتایا گیا کہ نومولود کا نام عیسیٰ رکھا ہے۔ شیخ قاسم بیٹے کا نام سلیمان رکھنا چاہتے تھے، اس لیے کہ جب ان کی بیوی حاملہ تھیں تو بعض

Marfat.com

پرہیزگار اور نیک لوگوں نے یہ خواب دیکھا تھا کہ شیخ قاسم کے گھر حضرت سلیمان علیہ السلام تشریف لائے ہیں' لیکن انھوں نے بڑے بھائی (شیخ طاہر) کے احترام میں بیٹے کا نام نہیں بدلا۔

شیخ عیسیٰ سندھی نے مذہبی ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور علم و فضل کی گود میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور علوم متداولہ کے حصول کی طرف عنان توجہ مبذول کی۔ گھر کی فضا خالص علمی تھی اور ان کے عم محترم شیخ طاہر کی مسند درس آراستہ تھی۔ شیخ عیسیٰ نے ملا اسماعیل سے قرآن مجید پڑھا جن کا اس دور میں تعلیم قرآن میں کوئی ثانی نہ تھا۔ شیخ طاہر محدث سے حدیث و فقہ کی تکمیل کی' شیخ مبارک سندھی سے اصول فقہ اور علم کلام کی تحصیل فرمائی۔ شیخ عثمان بوبکانی سے علوم عقلی و نقلی حاصل کیے۔ شیخ فتح اللہ شیرازی سے علوم ریاضی اور عروض سیکھے۔ شیخ ابراہیم قاری سے جو مرغ لاہوتی کے لقب سے ملقب تھے' تجوید و قرأت میں جبرائیلی لہجے کی تعلیم حاصل کی۔ غرض اس عہد کے اجلا و فضلا اور مشہور اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے تمام علوم مروّجہ اخذ کیے اور درجہ کمال کو پہنچے۔ تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس سلسلے میں شیخ لشکر محمد عارف کی خدمت میں پہنچے' ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور طریقت کے غوامض و نکات کی عقدہ کشائی کی۔ عمر بھر ریاضت و مجاہدہ' درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعے سے لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے۔

شیخ عیسیٰ سندھی متوکل علی اللہ عالم تھے اور دینوی آسائش و نعمت پر فقر و فاقہ کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ اس ضمن کے بہت سے واقعات میں سے دو واقعے قابل ذکر ہیں' جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ عنفوان شباب میں جب شیخ عیسیٰ مرشد طریقت کی تلاش میں اکبر آباد (آگرہ) تشریف لے جا رہے تھے تو اثنائے سفر میں اجین (مالوہ) میں قیام پذیر ہوئے اور شیخ عبدالکریم بن شیخ عیسیٰ کی خانقاہ میں بطور مہمان ٹھہرے۔ اتفاق سے ان دنوں حاکم مالوہ مع امرا و وزرا کے وہاں فروکش تھا۔ اجین کے مشائخ نے اس خیال سے شیخ عیسیٰ کی ملاقات حاکم مالوہ سے کرانا چاہی کہ انھیں کچھ مالی فوائد حاصل ہو جائیں' لیکن شیخ نے یہ گوارا نہ کیا کہ علم و تقویٰ کی نعمتِ بے بہا کو ایک دنیا دار فرماں روا کے حضور پیش کریں اور اس سے مادی منفعت کے طالب ہوں۔ وہ دوسرے ہی دن اجین سے رخصت ہو گئے۔

۲۔ عبدالرحیم خان خاناں جو عالم و فاضل حاکم تھا اور علما کی انتہائی قدر کرتا تھا' ایک مرتبہ رات کو شیخ کی خانقاہ میں آیا۔ اس وقت خانقاہ میں علما و مشائخ کی مجلس گرم تھی۔ خان خاناں بھی اس میں شریک ہوا۔ یہ دلچسپ مجلس نصف رات تک جاری رہی۔ رخصت ہوتے وقت خان خاناں نے تین یا چار سو روپے شیخ کی نذر کیے۔ شیخ کی عادت تھی کہ روپیہ پیسا کبھی اپنے پاس نہ رکھتے۔ نذرانہ اور فتوحات وغیرہ کی رقم ایک معتمد خلیفہ شیخ محمد سندھی کی تحویل میں رہتی تھی' وہ خانقاہ کے مستحق افراد کو مناسب حصے سے رقم تقسیم کرنے پر مامور تھے۔ یہ رقم جب شیخ کو ملی تو شیخ محمد سندھی وہاں موجود نہ تھے' دریافت کرنے پر پتا چلا کہ وہ گھر جا کر سو گئے ہیں۔ شیخ نے اسی

Marfat.com

وقت انھیں بلانے کا حکم دیا۔ وہ آئے تو پہلے اس بے وقت طلبی پر ان سے معذرت خواہ ہوئے۔ پھر رقم ان کے حوالے کی، تب اطمینان کا سانس لیا اور نیند آئی۔

شیخ عیسیٰ سندھی انیس برس کے تھے کہ والد محترم (شیخ قاسم سندھی) نے ۵ محرم ۹۸۱ھ/ ۸ مئی ۱۵۷۳ء کو ایلچ پور میں وفات پائی۔ انھیں وہیں سپرد خاک کیا گیا۔ اسی اثنا میں اس خاندان کے محسن اور برار کے حاکم تغال خاں کا انتقال ہوا۔ تغال خاں کے انتقال کے بعد علاقہ برار کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کا نظم ونسق ختم ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب اس علاقے میں اس خاندان کو علم وفضل اور زہد وعرفان کے اعتبار سے بڑی شہرت حاصل تھی۔ اس کی فیض رسانیوں کا دائرہ دور تک پھیل چکا تھا اور علما وفضلا اور خواص وعوام میں یہ خانوادہ بحر العلوم کی حیثیت سے متعارف تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان کی ایک اور علاقائی سلطنت خاندیس تھی، جس کا دارالحکومت برہان پور تھا۔ اس سلطنت کے حکمران خدمت علم اور علما دوستی میں بہت مشہور تھے۔ جس زمانے کے حالات ہم پڑھ رہے ہیں، اس زمانے میں خاندیس کی زمام حکومت عادل شاہی خاندان کے ہاتھ میں تھی، جو نسلاً فاروقی خاندان تھا۔ عادل شاہی حکمران عرصے سے شیخ عیسیٰ کو برہان پور تشریف لانے کی دعوت دے رہا تھا۔ سقوط برار کے بعد شیخ طاہر محدث اور شیخ عیسیٰ اپنے سندھی اعزہ ومتعلقین کے ساتھ برہان پور چلے گئے۔ بادشاہ نے ان کا پُر جوش خیر مقدم کیا اور عزت واحترام سے ٹھہرایا۔ سندھ کے جو لوگ اس نواح میں آباد تھے، وہ بھی مختلف علاقوں اور قصبوں سے اٹھ کر برہان پور منتقل ہو گئے اور ایک وسیع محلہ سندھی باشندوں سے آباد ہو گیا جو ان کی وطنی نسبت کی بنا پر سندھی پورہ کہلایا۔

برہان پور کو اس عہد میں علم وعلما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ مشہور عالم شیخ یوسف بنگالی کا سلسلۂ درس وہاں جاری تھا۔ شیخ طاہر محدث بھی علوم دینیہ کی تدریس میں مصروف ہو گئے۔ شیخ عیسیٰ سندھی جو کتب درسیہ سے فارغ ہو چکے تھے، بایں علم وفضل شیخ یوسف بنگالی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور جلد ہی فراغت حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ شیخ طاہر کے مشورے سے ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۵ء کو آگرہ روانہ ہوئے اور وہاں سے گوالیار کا قصد کیا۔ وہ ان دیار کے علما وفضلا اور اصحاب تصوف وطریقت سے بھی مستفیض ہوئے۔

غرض شیخ عیسیٰ سندھی نے اپنے عصر کے مختلف ارباب علم وفن سے استفادے کے بعد برہان پور میں خود مسند تدریس بچھائی اور بے شمار تشنگان علوم نے ان کے چشمہ فیض سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ ان کے تلامذہ اور فیض یافتہ حضرات کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ ان کے بیٹوں نے بھی ان سے کسب علم کیا۔

شیخ عیسیٰ سندھی بہ یک وقت مفسر بھی تھے اور محدث بھی، فقیہ بھی تھے اور اصولی بھی، مصنف بھی تھے اور صوفی بھی، صاحب طریقت بھی تھے اور بہت بڑے عالم دین بھی، کامیاب مدرس بھی تھے، اور بہترین مفتی بھی۔ ان

Marfat.com

کی تگ وتاز علمی کا سلسلہ ہمہ گیر تھا اور ان سب اصناف علم میں ان کو کامل درک حاصل تھا جو ان دنوں مروّج تھے۔

وہ بہت بڑے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں: روضۃ الحسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی، شرح اسماء اللہ الحسنی میں ایک اور رسالہ عین المعانی کے نام سے لکھا۔ رسالہ حواس خمسہ، شیخ عبدالکریم الجیلی کی انسان الکامل پر حاشیہ، قصیدہ بردہ کی شرح فارسی زبان میں، تصوف کے انداز میں ایک کتاب قبلۃ المذاہب الاربعہ، عبدالرحمٰن جامی کی فوائد ضیائیہ یعنی علم نحو کی شہرہ آفاق کتاب شرح جامی پر حاشیہ۔ ایک کتاب اپنے بیٹے عبدالستار کے لیے لکھی جس کو فتح محمدی کے نام سے موسوم کیا۔ ایک کتاب تفسیر قرآن کے بارے میں فتح محمد کے لیے لکھی۔ علم نحو کی مشہور کتاب مائۃ عامل کی شرح تحریر کی، جسے تمیم کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب انھوں نے ایک اہل علم سید علی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ ایک رسالہ عقد الانامل کے بارے میں تالیف کیا۔ علاوہ ازیں شرح رباعتین اور ترجمہ اسرار الوحی تصنیف کیں۔ ایک اور کتاب انوار الاسرار فی حقائق القرآن و معارفہا لکھی۔ یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے جو ایک ضخیم اور مبسوط کتاب ہے۔ اس کا اسلوب زیادہ تر متصوفانہ ہے اور سلوک و معرفت کے طریق پر لکھی ہے۔ اس کے بعض مقامات کی وضاحت اسلاف کرام کی عام روش سے ہٹ کر کی گئی ہے۔ مثلاً اعوذ باللہ من الشیطن الرحیم. کی تفسیر بیان کرتے ہوئے شیطان کو ''اس بعد'' سے تعبیر کیا گیا ہے ''جو بندے اور اللہ کے درمیان کسی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔'' اس تفسیر میں اس قسم کی متعدد باتیں بیان کی گئی ہیں جو اسلاف کے نقطہ نظر سے صحیح نہیں، اور کتاب وسنت سے جن کی تائید نہیں ہوتی۔

شیخ عیسیٰ سندھی نے ۱۴ شوال ۱۰۳۱ھ/۱۲ راگست ۱۶۲۲ء کو برہان پور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے [1]۔

۷۸- مفتی عیسیٰ گوپاموی

مفتی عیسیٰ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عیسیٰ بن آدم بن محمد بن خواجہ بن شیخ بن محمد بن احمد صدیقی شہابی گوپاموی۔ شیخ نظام الدین اللہ دیا خیر آبادی کی نسل سے تھے۔ ۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء کو گوپامئو میں پیدا ہوئے اور اپنے والد مکرم شیخ آدم اور شیخ نظام الدین عثمانی امیٹھوی سے تحصیل علم کی اور علما وفقہا میں گردانے گئے۔ ان کے والد (شیخ آدم) گوپامئو کی مسند افتا پر فائز تھے۔ والد کی وفات کے بعد یہ مسند ان کے بیٹے (مفتی عیسیٰ) کے حصے میں آئی۔ مفتی عیسیٰ کی شادی شیخ جعفر بن شیخ نظام الدین عثمانی امیٹھوی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی، جن کے بطن سے تین بیٹے متولد ہوئے۔ ان بیٹوں میں ایک مفتی وجیہ الدین تھے اور یہی سب سے بڑے عالم تھے۔ مفتی عیسیٰ گوپاموی نے ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۲۲ھ/۳۰ رجنوری ۱۶۱۴ء کو وفات پائی [2]۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: اذکار ابرار ص ۵۰۸ تا ۵۳۶۔ برہان پور کے سندھی علما المعروف بہ تذکرۂ اولیائے سندھ ص ۳۱ تا ۱۰۳۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۵۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۹۵ تا ۲۹۹۔ تاریخ برہان پور ص ۱۳۶، ۱۳۷۔ تذکرۂ صوفیائے سندھ ص ۱۵۶ تا ۱۶۴۔

[2] نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۹۹۔

Marfat.com

۷۹- قاضی عیسیٰ اکبرآبادی

قاضی عیسیٰ بن ابوالفتح بن عبدالغفور بن شرف الدین عمری تھانیسری اکبرآبادی۔ اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ اپنے والد مفتی ابوالفتح تھانیسری (متوفی ۸؍ جمادی الاولیٰ ۹۷۶ھ/ ۲۸؍ نومبر ۱۵۶۸ء) سے علم فقہ کی تحصیل کی اور اپنے عصر کے نامور علما وفقہا اور اصولیین میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء کو جہاں گیر کے عہد میں منصب قضا پر متمکن ہوئے [1]۔

غ

۸۰- سید غضنفر گجراتی

گیارھویں صدی ہجری کا ہندوستان علم تحقیق کے لحاظ سے بڑا پُر ثروت تھا۔ اس صدی میں برصغیر کے مختلف علاقوں میں بے شمار علما وفقہا اور مفسرین ومحدثین پیدا ہوئے، جنھوں نے بھرپور علمی خدمات انجام دیں۔ ان میں سرزمین گجرات کے ایک عالم سید غضنفر بن سید جعفر حسینی نہروالی گجراتی بھی تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے عظیم المرتبت اساتذہ اور جلیل القدر علما سے اخذ علم کیا تھا، جن میں شیخ عبدالرحمٰن جامی کے بھانجے شیخ محمد امین، شیخ محمد سعید بن مولانا خواجہ کوہی خراسانی اور شیخ تاج الدین عبدالرحمٰن بن مسعود بن شمس الدین گاذرونی کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں۔

سید غضنفر حسینی گجراتی، شیخ وعلامہ، محدث اور جید عالم تھے۔ ان کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے مشہور علمائے حدیث وفقہ اور ماہرین علوم عربیہ میں ہوتا تھا۔

سید غضنفر حسینی نے حصول علم کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور ان سے بہت سے علما وطلبا نے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ ابوالمواہب احمد بن علی عباسی شناوی، مفتی حرم مکہ مکرمہ شیخ عبدالرحمٰن بن عیسیٰ عمری مرشدی اور شیخ امام عبدالقادر بن محمد بن یحییٰ حسینی طبری مکی قابل ذکر ہیں۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس عالم وفقیہ کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا علم نہیں ہوسکا [2]۔

---

1. نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۰۰- بحوالہ اخبار الاصفیا-
2. تذکرہ علمائے ہند- ص ۲۷۲- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۰۱-

Marfat.com

ف

۸۱- شیخ فاضل سنبھلی

شیخ فاضل بن امجد نقشبندی سنبھلی عالم وفقیہ تھے اور فقہ واصول کے ماہر علما میں سے تھے۔ طریقت و سلوک سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ اور شیخ تاج الدین عثمانی سنبھلی سے فیض یافتہ تھے۔ ایک مدت تک ان سے وابستہ رہے یہاں تک کہ علم ومعرفت میں ماہر کامل ہو گئے۔ حصول علم وطریقت کے بعد اپنے آپ کو درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا تھا۔ علوم دینیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کا اندازِ تدریس یہ تھا کہ علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ تلامذہ کو طریقت وصلاح سے بھی مستفید فرماتے تھے۔

اس صاحب تصوف عالم وفقیہ نے ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء کے بعد سنبھل میں وفات پائی ❶۔

۸۲- شیخ فتح محمد برہان پوری

شیخ فتح محمد برہان پوری اپنے عصر کے محدث اور عالم وفقیہ تھے اور شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی کے لائق بیٹے تھے۔ کنیت ابوالمجد تھی اور لقب عبدالرحمن تھا۔ عارف باللہ اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے۔ مشائخ صوفیا اور علمائے مشہورین میں سے تھے۔ اس متبحر وصوفی عالم نے اپنے والد سے اخذ علم کیا اور انہی سے طریقت سیکھی۔ حصول علم اور اخذ طریقت کے بعد درس وافادہ میں مشغول ہو گئے۔ طویل عرصے تک برہان پور میں ہنگامۂ درس برپا کیے رکھا۔ پھر سرزمین حجاز کا رخ کیا اور سعادتِ حج سے بہرہ یاب ہوئے۔ بعدازاں وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

متعدد کتب ورسائل کے مصنف تھے جن میں ایک رسالہ مراتب العوالم الخمسہ کے بارے میں لکھا اور ایک رسالہ وحدت الوجود سے متعلق تحریر کیا۔ شیخ علی بن شہاب الدین حسینی ہمدانی کے لیے ستر احادیث کی تخریج کی۔ ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء میں مفتاح فتوح العقائد تصنیف کی۔ ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء میں فتوح الاوراد لکھی۔ ایک کتاب عربی زبان میں فقہ کے متعلق تصنیف کی جس کا نام فتح المذاہب الاربعہ رکھا۔ سلوک میں فتح الطریقہ معرض تصنیف لائے۔ ایک رسالہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی تحقیق نسب کے سلسلے میں تصنیف کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی رسائل تصنیف کیے۔

شیخ فتح محمد برہان پوری نے مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر لی تھی فوت بھی اسی مقدس سرزمین میں ہوئے ❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۰۲، ۳۰۳ بحوالہ اسراریہ۔

❷ تاریخ برہان پور ص ۱۳۷، ۱۳۸- تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۰- نزہۃ الخواطر- ج ۵ ص ۳۰۴

Marfat.com

۸۳- شیخ فرخ نارنولی

شیخ فرخ نارنولی' شیخ نظام الدین چشتی نارنولی کے پوتے تھے۔ نارنول میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والد اور دادا سے اخذ علم کیا' یہاں تک کہ ان کا شمار علما وفقہا کی جماعت میں ہونے لگا۔ والد اور دادا کے بعد مسندِ مشیخت پر متمکن ہوئے۔ نہایت بارعب اور بلند مرتبہ شیخ تھے۔ معارفِ الٰہیہ میں یگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۷ء کو نارنول میں فوت ہوئے ❶۔

۸۴- میر سید فیروز بلگرامی

میر سید فیروز بن عبدالواحد بن ابراہیم بن قطب الدین حسینی واسطی بلگرامی۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سید عبدالواحد بلگرامی سے علم حاصل کیا۔ سید عبدالواحد بھی اگرچہ صاحب علم وفضل بزرگ تھے لیکن مہارتِ فنون اور کمال علم میں سید فیروز' باپ سے بہت آگے تھے۔ فقہ اور دیگر علوم مروّجہ میں جو درک بیٹے کو حاصل تھا' باپ کو حاصل نہ تھا۔ سید فیروز کے بڑے بھائی سید طیب (متوفی ۵/ربیع الاول ۱۰۶۶ھ/۲۲/ دسمبر ۱۶۵۵ء) تھے' والد کی وفات کے بعد مسند مشیخت سید طیب نے سنبھالی اور سید فیروز درس وافادہ' خدمت خلق' فقرا ومساکین کی مدد اور مسافروں کی اعانت میں مشغول ہو گئے۔ نہایت سخی تھے اور بذل واعطا ان کا معمول تھا۔ جود وسخا کا یہ عالم تھا کہ ایسی چار سو جوان لڑکیوں کی شادی کی اور اپنی گرہ سے مناسب جہیز عطا کیا جن کے والدین غربت کی وجہ سے اس کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ تقریباً سو برس کی عمر پائی اور ہمیشہ لوگوں کی خدمت کو اپنا معمول بنائے رکھا۔ ۵ محرم ۱۰۶۶ھ/۲۴/اکتوبر ۱۶۵۵ء کو بلگرام میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔

لائق اور فاضل بھائی کی وفات سے میر سید طیب نہایت مغموم ہوئے' لیکن ان کی تدفین کے بعد چہرے پر انتہائی خوشی اور شگفتگی کے آثار ابھر آئے۔ لوگوں نے متعجب ہو کر اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

برادر من با من وعدہ کرد کہ غم مخور بعد از شصت روز بہ من ملحق می شوی۔

(میرے بھائی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ غم نہ کرو' چھ دن کے بعد مجھ سے آملو گے۔)

چنانچہ ٹھیک چھ دن بعد میر سید طیب بھی اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو تشریف لے گئے ❷۔

❶ نزہۃ الخواطر- ج ۵' ص ۳۰۵ بحوالہ اسراریہ-

❷ مآثر الکرام دفتر اول ص ۴۳' ۴۴- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۰۹-

Marfat.com

ــــــ ق ــــــ

۸۵- مولانا قاسم حسینی بیانوی

مولانا قاسم بن ابوالقاسم حسینی بیانوی' شیخ' فاضل اور محدث تھے۔ حدیث وفقہ اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ شیخ ابراہیم بن داؤد مانک پوری اکبرآبادی کے شاگرد تھے' تمام عمر اپنے استاد مکرم (شیخ ابراہیم) سے وابستہ رہے۔ شیخ ابراہیم کی وفات کے بعد ان کی جگہ درس وافادہ کی مسند پر متمکن ہوئے ❶۔

۸۶- شیخ قطب الدین دہلوی

شیخ قطب الدین بن عبدالعزیز بن حسن بن طاہر جون پوری دہلوی' قطب العالم کے لقب سے مشہور تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور تربیت کی منزلیں وہیں طے کیں۔ اخذ طریقت شیخ جاتین سہنوی سے کیا' جوان کے والد شیخ عبدالعزیز کے شاگردوں میں سے تھے۔ بعدازاں عازم مالوہ ہوئے اور شیخ منور بن عبدالمجید لاہوری سے علم حاصل کیا۔ تکمیل علم کے بعد دہلی کو مراجعت کی اور طویل عرصے تک درس وتدریس میں مصروف رہے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

شیخ قطب الدین دہلوی فاضل کبیر تھے۔ فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ مدت مدید تک تشنگانِ علوم کی علمی تشنگی بجھانے میں مصروف رہے۔ ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء کو فوت ہوئے ❷۔

۸۷- مرزا قلیچ محمد اندجانی

مرزا قلیچ خاں' اصلاً اندجان کے باشندے تھے اور عہد اکبری کے ایک سربرآوردہ سردار تھے۔ اکبر کے بیٹے شہزادہ دانیال کی شادی مرزا قلیچ خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ قلیچ خاں امیر کبیر اور فاضل وعلامہ تھے۔ خیرو صلاح کے اوصاف سے متصف اور فضل وکمال کی نعمت سے بہرہ ور تھے۔ شہنشاہِ ہند جلال الدین اکبر اس امیر کی خوبیوں سے واقف ہوا تو اس نے ان کو ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں قلعہ سورت کا محافظ مقرر کر دیا۔ ۹۸۵ھ/۱۵۵۷ء میں گجرات کے عہدۂ امارت پر مامور کیا۔ ۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء میں وزارت کا منصب جلیلہ عطا کیا۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں علاقہ مالوہ کی امارت سے سرفراز کیا۔ ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں سنبھل کے نواح میں جاگیر عنایت کی اور لاہور میں اقامت گزیں ہونے کا حکم دیا اور فرمان جاری کیا کہ راجہ ٹوڈرمل وزیر خراج اور راجہ بھگونت داس کے ساتھ مل کر اس نواح کے اہم امور انجام دیے جائیں۔ پھر راجہ ٹوڈرمل کی وفات کے بعد مرزا قلیچ محمد کو

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۱۰ بحوالہ اخبار الاصفیا۔

❷ ایضاً' ص ۳۱۱ بحوالہ اسراریہ۔

Marfat.com

وزارت خراج پر مامور کیا اور ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء میں کابل کا والی مقرر کیا۔ لیکن تھوڑی مدت بعد اس عہدے سے معزول کر دیا۔ ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۷ء میں اکبر نے انھیں اپنے بیٹے دانیال کا اتالیق بنا دیا۔ مگر دانیال چونکہ ان کا داماد تھا' اس لیے اس منصب سے جلد ہی الگ ہو گئے اور بادشاہ کی خدمت میں آ گئے۔ ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۹ء میں بادشاہ نے ان کو اکبر آباد (آگرہ) کا منصب حفاظت عطا کیا۔ ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۱ء کو پنجاب کی ولایت کے عہدے پر مامور کیا۔ اس کے ساتھ ہی کابل کی ولایت بھی عطا کی۔

اکبر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جہاں گیر سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے مرزا قلیچ خاں کو گجرات کے منصب تولیت سے نوازا۔ پھر ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء کو پنجاب کا والی مقرر کیا اور ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء میں کابل کی ولایت عطا کی۔ غرض قلیچ خاں ملک کے مختلف علاقوں کی صوبے داری پر متعین رہے اور اکبر کے آخری ایام میں کئی سال تک پنجاب کے عہدۂ گورنری پر فائز رہے۔ بڑے بہادر' جرات مند' متدین اور عالم دین امیر مملکت تھے۔ لاہور کی گورنری کے زمانے میں روزانہ مدرسے جاتے اور اور کئی گھنٹے طلبا کو تفسیر' حدیث اور فقہ کا درس دیتے۔ علوم شرعی کی نشر و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ان سے متاثر ہو کر لاہور کے بہت سے لوگوں نے حصولِ علم کو اپنا مقصد ٹھہرا لیا تھا اور وہ اپنے مقاصد کے حل کے لیے علوم میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے۔ قلیچ خاں کے تدین اور علوم شرعیہ میں انہماک کے بارے میں مآثر الامرا کے درج ذیل الفاظ لائق مطالعہ ہیں:

قلیچ خاں صلاح و تقویٰ بسیار داشت و در تسنن متعصب بود' و ہمیشہ بدرس علوم و افادۂ طلب اشتغال می نمود۔ گویند در صوبہ داری لاہور یک پاس بدرس فقہ و تفسیر و حدیث در مدرسہ قیام می ورزید و بہ اقصیٰ غایت در ترویج علوم شرعیہ می کوشید۔ مردم آں جا بہ امید روشناسی و انجاح مطالب غلوے تمام بہ تحصیل علوم کردند ❶۔

(یعنی قلیچ خاں انتہائی صلاح و تقویٰ کے حامل اور اتباع سنت میں نہایت سخت تھے۔ ہمیشہ درس علوم اور افادہ طلبا میں مشغول رہتے۔ کہتے ہیں' لاہور کی گورنری کے زمانے میں تفسیر' حدیث اور فقہ کے درس میں کافی وقت صرف کرتے اور مدرسے جا کر اشاعت علوم شرعیہ کے لیے انتہائی کوشش اور سرگرمی کا اظہار فرماتے۔ لاہور کے لوگ بھی ان سے متاثر ہو کر اپنے حصول مقاصد کی غرض سے تحصیل علوم میں سرگرم ہوئے۔)

پرتگیز مشنری بھی اپنے انداز خاص میں قلیچ خاں کے اسلام کی زوردار الفاظ میں شہادت دیتے ہیں۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

پرتگیز مشنری بھی لکھتے ہیں کہ وہ بڑا پکا مسلمان تھا۔ پرتگیز مشنری اس کے ڈر سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ اس نے لاہور کے ہندوؤں کی شکایت پر جس گھر میں عیسائی پادری رہتے تھے' وہ ان سے خالی کرا لیا اور مشنریوں سے وہ تمام مراعات چھین لیں' جن کی اکبر نے سیاسی مصلحتوں یا مذہبی رواداری سے اجازت دے رکھی تھی ❷۔

❶ مآثر الامرا

❷ رود کوثر' ص ۲۰۵۔

Marfat.com

حضرت مجدد الف ثانی بھی اس امیر کی پابندیٔ شرع کی تعریف کرتے ہیں اور لاہور میں قلیچ خاں نے ترویج دین اور اشاعت علوم کی جو کوششیں شروع کر رکھی تھیں' ان کا بہترین الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔ حضرت مجدد کا قلیچ خاں سے اگرچہ بالمشافہ تعارف نہیں تھا' لیکن وہ ان کی علمی و دینی سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

ثانیاً اظہار محبت گزاری ایشاں می نماید کہ در بلدۂ معظّمہ لاہور بہ وجود ایشاں بسیارے از احکام شرعیہ دریں طورِ زمانہ رواجے پیدا کردہ است' وتقویت دین و ترویج ملت دراں بقعہ حاصل گشتہ است۔

(دوسری بات یہ ہے کہ ان سے اس بنا پر اظہار محبت کرنا چاہیے کہ لاہور کے عظیم شہر میں ان کے وجود سے احکام شرعیہ کی بہت ہی ترویج ہوئی اور اس خطے میں تقویت دین اور نشر و اشاعت اسلام کے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔)

غرض قلیچ خاں دور اکبری کے نیک' صاحب تقویٰ اور عالم و فاضل امیر تھے۔ معقولات و منقولات پر عبور رکھتے تھے۔ تفسیر' حدیث اور فقہ کے ماہر تھے اور ان مضامین پر مشتمل کتابوں کا باقاعدہ مدرسے جا کر طلبا کو درس دیتے تھے۔ کتب درسیہ کئی مرتبہ باقاعدہ پڑھ چکے تھے اور علما و فضلا کی ایک بڑی جماعت ان سے مستفید ہو چکی تھی۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔

امیر قلیچ خاں شاعر بھی تھے۔ ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

عاشق ہوس وصال در سر دارد　　صوفی روقی و خرقہ در بر دارد

من بندہ آں کسم کہ فارغ زہمہ　　دائم دلِ گرم و دیدۂ تر دارد

امیر قلیچ خاں نے اسی (۸۰) سال سے زائد عمر پا کر ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء کو عہد جہاں گیر میں انتقال کیا ❶۔

۸۸- مولانا قیام الدین لاہوری

خطۂ لاہور علم و فضل کے اعتبار سے ہمیشہ زرخیز رہا ہے۔ گیارھویں صدی ہجری میں بھی اس میں بڑے بڑے علما و فضلا موجود تھے' جن میں مولانا قیام الدین بن نظام الدین لاہوری کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ ممدوح جلیل القدر عالم' فاضل وقت اور شیخ عصر تھے۔ فقہ' اصول فقہ اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ طبقۂ علما میں بے حد قدر و منزلت کے حامل تھے۔ قوتِ حفظ اس درجہ تیز تھی کہ جو بات ایک مرتبہ پردۂ سماع سے ٹکرا جاتی' وہ کبھی ذہن سے نہ نکلتی۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں علوم مروّجہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تھے۔ ان کا مولد و مدفن لاہور ہے۔ ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء میں فوت ہوئے ❷۔

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: مآثر الامرا- بادشاہ نامہ- عمل صالح (شاہ جہان نامہ)- اذکار ابرار- نزہۃ الخواطر ج ۵- منتخب اللباب- رود کوثر-

❷ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۱۴-

Marfat.com

ـــ ک ـــ

۸۹- شیخ کمال الدین بیجاپوری

شیخ کمال الدین بن فخر الدین بیجاپوری فاضل کبیر تھے اور اصول و کلام کے جید علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے شیخ ابن حجر مکی کی "الصواعق المحرقہ" کا "البراہین القاطعہ" کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ انھوں نے دلاور خاں وزیر کے حکم سے ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء میں کیا تھا۔ دلاور خاں والیٔ بیجاپور سلطان ابراہیم عادل شاہ کا وزیر تھا ❶۔

۹۰- قاضی کمال الدین کشمیری

قاضی کمال الدین بن موسیٰ کشمیری مولانا جمال الدین کشمیری کے بھائی اور برصغیر پاک و ہند کے فحول علما میں سے تھے۔ اپنے دور کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء میں کشمیر سے سیالکوٹ منتقل ہو گئے تھے۔ وہاں تمام عمر درس و افادہ کو اپنا مشغلہ بنائے رکھا، یہاں تک کہ فقہ، اصول فقہ، منطق و حکمت، علم کلام اور دیگر علوم و فنون میں ان کی مہارت کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا۔ نہایت ذکی اور سریع الحفظ تھے، بہترین مدرس تھے، طلبائے علم ان کے انداز تدریس سے بہت متاثر تھے۔ ہر وقت مطالعہ کتب میں مستغرق رہتے اور بڑی محنت سے طلبا کو پڑھاتے۔ ان کے شاگردان کے اسلوبِ درس سے بہت مطمئن تھے۔ جن حضرات نے ان سے اخذ علم کیا، ان میں برصغیر پاک و ہند کے مشاہیر علما و فضلا شامل ہیں۔ مثلاً مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علما نے ان سے استفادہ کیا۔

قاضی کمال الدین کشمیری نے ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء کو لاہور میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے ❷۔

۹۱- مفتی کمال محمد عباسی گجراتی

مفتی کمال محمد عباسی گجراتی کی ولادت ہندوستان کے صوبہ گجرات کے شہر احمد آباد میں ہوئی اور وہیں تربیت پائی۔ اس زمانے میں احمد آباد میں علامہ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء) کا سلسلۂ درس زوروں پر تھا اور نہ صرف علاقہ گجرات میں بلکہ پورے برصغیر میں ان کے علم و فضل کی شہرت تھی۔ کمال محمد عباسی نے ہوش سنبھالا تو ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے اور طویل مدت تک ان سے وابستہ رہے، تا آنکہ علوم و

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۱۶ بحوالہ محبوب الالباب۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۱۹۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۷۳۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۱۶۔

Marfat.com

فنون کی تمام مروّجہ اصناف میں اپنے اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے اور فقہ واصول اور علوم عربیہ کے جید علما میں گردانے گئے۔ اپنے دور کے شیخ اور عالم کبیر ہوئے۔ علوم ظاہری سے فراغت کے بعد طریقت کی طرف متوجہ ہوئے۔ حدیث کی سند اس عہد کے مشہور عالم شیخ عبدالملک بنانی احمد آبادی (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء) سے حاصل کی۔ ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں احمد آباد سے نکلے اور ارض مالوہ کے شہر اجین چلے گئے۔ وہیں سکونت اختیار کرلی، کالپی کے شیخ اولیا بن سراج الدین کی صاحب زادی سے نکاح کیا اور اجین کی مسند افتا پر فائز ہوئے۔ ساتھ ہی سلسلہ تدریس بھی شروع کردیا۔ پورے تیس سال وہاں افتا و تدریس کی مسند پر فائز رہے۔

مفتی کمال محمد عباسی کا معمول تھا کہ جب رات کا تیسرا حصہ باقی رہ جاتا تو بیدار ہو جاتے۔ غسل کرتے، نماز تہجد پڑھتے اور قرآن مجید کے خاصے حصے کی تلاوت فرماتے۔ پھر ماثورہ اوراد و وظائف میں مصروف ہو جاتے اور بہ آواز بلند اللہ کا ذکر کرتے۔ نماز فجر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن شروع ہو جاتی جو نماز اشراق تک جاری رہتی۔ نماز اشراق کے بعد مسند درس پر بیٹھ جاتے۔ زوال آفتاب تک طلبا کو درس دیتے۔ پھر دوپہر کا کھانا کھاتے، کھانے میں طلبا کی جماعت بھی شریک ہوتی۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرتے۔ پھر ظہر کی نماز کے بعد مسند افتا آراستہ کرتے اور عصر تک فتاویٰ نویسی کا کام جاری رہتا۔ عصر کے بعد بھی فتووں کا سلسلہ چلتا۔ مغرب کی نماز کے بعد اپنے تلامذہ کی طرف متوجہ ہو جاتے اور عشا تک ان سے علمی گفتگو فرماتے۔ عشا کے بعد اپنے حجرے میں چلے جاتے اور ان کتابوں کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے جو دوسرے دن طلبا کو پڑھانا ہوتیں۔ یہ کام رات کے ثلث اول تک جاری رہتا۔ پھر گھر تشریف لے جاتے۔ یہ ان کی شب و روز کی تقسیم اوقات تھی۔ یہ طریق عمل پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوا اور چون (۵۴) سال کی عمر تک جاری رہا۔

اس نامور عالم وفقیہ نے دوشنبہ کے روز ۱۰ شعبان ۱۰۱۳ھ/۲۲ دسمبر ۱۶۰۴ء کو رات کے وقت وفات پائی ❶۔

ل

۹۲- علامہ لطف اللہ کوروی

علامہ لطف اللہ کوروی اپنے علاقے اور دور کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے فحول ہندی علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تمام مروّجہ علوم وفنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بالخصوص فقہ واصول اور علوم عربیہ میں مہارت حاصل تھی۔ شیخ جمال اولیا چشتی کوروی کے شاگرد تھے۔ خود ان کا اپنا حلقہ تلامذہ بھی بڑا وسیع

❶ اذکار ابرار، ص ۴۶۴، ۴۶۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۱۶، ۳۱۷۔

Marfat.com

تھا۔ ان سے جن حضرات نے کسب علم کیا' ان میں شیخ احمد بن ابوسعید امیٹھوی (یعنی مشہور عالم و مفسر ملا جیون) قاضی علم اللہ کچندوی اور شیخ علی اصغر قنوجی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ کی علمی، تدریسی اور تصنیفی سرگرمیوں سے اس برصغیر میں علم و فضل کو بڑی ترقی ہوئی اور مختلف اصنافِ علم کی نشر و اشاعت کے وسیع ذرائع معرضِ عمل میں آئے ❶۔

—— م ——

۹۳۔ مفتی مبارک جون پوری

مفتی مبارک بن ابوالبقا بن محمد درویش حسینی جون پوری کی جائے ولادت جون پور ہے۔ تربیت بھی جون پور میں پائی۔ شیخ ابوالبقا کے یہ سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ اپنے والد شیخ ابوالبقا جون پوری کے تلمیذ شیخ علی محمد سے حصول علم کا آغاز کیا اور ان سے علوم عربیہ کی تحصیل کی۔ پھر عازم الہ آباد ہوئے اور وہاں کے علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دہلی گئے اور ملوک و امرا سے تقرب پیدا کیا۔ اپنے شہر کے منصب افتا پر متمکن ہوئے۔ اس عہد کے شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔ جون پور میں درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا اور عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کے چشمۂ فیض سے بہت سے علما نے اپنی علمی پیاس بجھائی۔

اس عالم دین نے ۲۰ رمضان ۱۰۹۸ھ/۲۰/جولائی ۱۶۸۷ء کو سفر آخرت اختیار کیا ❷۔

۹۴۔ شیخ مبارک ناگوری

شیخ مبارک بن خضر ناگوری' ارض ہند کے جید عالم اور مشہور فاضل تھے۔ ان کے اجداد میں سے پانچویں پشت میں ایک بزرگ شیخ موسیٰ تھے جو دیار یمن سے نکلے اور دنیا کے مختلف مقامات کی سیاحت پر روانہ ہوئے۔ اثنائے سیاحت میں بڑے بڑے عجائب کا مشاہدہ کیا اور اسی عالم غربت میں نویں صدی ہجری میں اعمالِ سیوستان کے ایک قصبے ''ریل'' میں آئے۔ وہاں توطن اختیار کیا اور متاہل زندگی اختیار کرنے لگے۔ شیخ مبارک کے والد شیخ خضر نے دسویں صدی ہجری کے آغاز میں سیاحت ہند شروع کی اور شہر ناگور کو جو ہندوستان کے مشہور شہر اجمیر کے شمال مغرب میں واقع ہے' اپنا مسکن ٹھہرایا۔

شیخ مبارک کی ولادت ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء کو ناگور میں ہوئی۔ شعور کی منزل میں داخل ہوئے تو گجرات کے شہر احمد آباد کا قصد کیا۔ احمد آباد اس عہد میں علم و فضل کا مرکز تھا اور متعدد علمائے مشاہیر کی تدریسی سرگرمیاں

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۱۹۔

❷ تاریخ شیراز ہند' جون پور' ص ۲۸'۲۹۷۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۱۹' ۳۲۰۔

Marfat.com

وہاں جاری تھیں، جن میں خطیب ابوالفضل گاذرونی اور مولانا عماد الدین محمد طارمی لائق تذکرہ ہیں۔ ان سے تحصیل علم میں مشغول ہوگئے اور بحث و اشتغال علمی میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ علوم و فنون کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوئے اور فتویٰ و تدریس کی صلاحیت سے بہرۂ وافر پایا۔

شیخ مبارک ناگوری بے حد ذکی اور ذہین تھے۔ صغرسنی ہی میں علمی مجلسوں اور تحقیقی محفلوں میں شریک ہونے لگے تھے۔ مباحثہ و مجادلہ میں تیز اور مناظرے میں حاضر جواب تھے۔ ان کے اسلوب بحث اور انداز گفتگو سے کبار علما اور اعیان ملک حیران ہوتے تھے۔ ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء کو اکبر آباد (آگرہ) گئے اور درس و افادہ کی مسند پر فائز ہوئے۔ کم و بیش پچاس سال سرگرم تدریس رہے۔ علم و عمل، تحقیق و کاوش، زہد و ورع، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ ان کی مجلس موعظت و تذکیر اور حلقہ تدریس و تعلیم کے وقار کا یہ عالم تھا اور وہ اس درجہ رعب و دبدبہ کے مالک تھے کہ امرائے مملکت میں سے کسی کو اس میں سرخ یا ریشمی لباس پہن کر آنے کی جرات نہ ہوتی۔ نہ کوئی ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہن کر ان کے سامنے آسکتا، نہ کسی کو ان کی موجودگی میں تہہ بند ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کی ہمت تھی اور نہ کسی قسم کی غیر شرعی حرکت کا مرتکب ہوسکتا تھا۔ اس زمانے میں وہ سماع کے بھی شدید مخالف تھے۔ اگر راہ چلتے بھی غنا کی آواز کانوں میں پڑ جاتی تو راستہ بدل لیتے اور ہر طریقے سے اس خلاف شرع حرکت سے دامن بچانے کی کوشش کرتے۔ مگر آخر میں غنا و سماع کی طرف راغب ہوگئے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ غنا و مزامیر کے سوا چین نہ آتا تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ کے مختلف مقامات پر ان کی بہت سی قلبی اور عملی کیفیات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان پر کئی قسم کے دور آئے اور وہ متعدد حالتوں سے دوچار ہوئے۔ وہ ایک زمانے میں مہدویت سے بھی متاثر ہوئے اور مدتِ مدید تک شیخ علائی سے وابستہ رہے۔ مغل حکمران جلال الدین اکبر کے عہد حکومت کے ابتدائی دور میں طریقہ نقشبندیہ پھیلا تو اس سے ہم آہنگ ہوگئے اور مشائخ ہمدان کی طرف انتساب شروع کر لیا، اور جب دیکھا کہ امورِ مملکت میں ایرانیوں کا اثر و رسوخ بڑھ گیا ہے اور حکومت کے اہم اور کلیدی محکمے ان کے قبضے میں آگئے ہیں تو ان کی طرف ملتفت ہوگئے۔ غرض بعد میں ان کے رجحانات میں بڑی تبدیلی آگئی تھی اور ان کے قلب و ذہن کی حالت میں بہت تغیر رونما ہو گیا تھا، جو قطعی ناپسندیدہ اور غیر شرعی تھا۔

شیخ مبارک ناگوری کی زندگی کا ابتدائی دور بلاشبہ ایک مبلغ شریعت، ناہی عن المنکر و امر بالمعروف کا دور تھا، لیکن بعد میں ان کی زندگی کے لیل و نہار بالکل بدل گئے تھے۔ جلال الدین اکبر کو الحاد کی راہوں پر لگانے اور علمائے دربار کی مخالفت پر آمادہ کرنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اکبر نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی اور اس کی ابتدائی زندگی ایک اچھے مسلمان کی زندگی تھی، لیکن بعد میں جو حالات پیدا ہوئے اور بادشاہ نے جو غلط اور سراسر غیر اسلامی اقدامات کیے، ان کے جواز کے لیے شیخ مبارک اور ان کے بیٹوں ابوالفضل اور فیضی نے راہ ہموار کرنے میں زبردست کردار ادا کیا۔ ان واقعات و حوادث کے چشم دید گواہ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کی

Marfat.com

تمام تفصیلات بیان کر دی ہیں اور اس عہد کے علما و مشائخ کی زندگیوں کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

''منتخب التواریخ ایک ایسا مرقع ہے، جس میں اس عہد کے تمام ارباب عمائم و اصحاب خرقہ وسجادہ کی تصویریں اپنے اصلی بھیس میں نظر آ جاتی ہیں، اور دیکھ کر عبرت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے مدعیان علم و زہد کو بھی دنیا پرستی نے چین سے بیٹھنے نہ دیا اور راہِ حق پرستی میں استقامت نصیب نہ ہوئی ❶۔''

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی صدر الصدور بھی اگر چہ مبرا عن الخطا نہ تھے، لیکن ان کے خلاف اکبر کو برانگیختہ کرنے کی ذمہ داری سے ملا مبارک اور ان کے بیٹے بری نہیں ہو سکتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جو مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی پر شدید تنقید کرتے ہیں، رقم طراز ہیں:

''ایک عرصے کے بعد جب حالات بدلے اور ملا مبارک کے خاندان کو عروج ہوا تو انھوں نے ان لوگوں کے زور کو توڑنا چاہا اور اس کی تدبیر یہ نظر آئی کہ مذہبی تعصب کی شدت کو کسی طرح کم کیا جائے۔ چنانچہ حکمت و تحقیقِ جدید کے نام سے آزاد خیالی و مطلق العنانی کی ہوائیں چلنے لگیں ❷۔

بادشاہ کو ''خلیفۃ الزمان'' قرار دینے کا محضر بھی ملا مبارک اور ان کے بیٹوں نے تیار کیا۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

''خاندان ملا مبارک (یعنی ابوالفضل و فیضی) نے مولویوں کا زور توڑنے کے لیے ایک تدبیر یہ کی کہ ۹۸۷ھ/ ۱۵۷۹ء میں اپنے والد ملا مبارک سے ایک محضر تیار کرایا۔ مضمون یہ تھا کہ بادشاہ خلیفۃ الزمان اور امام عہد واجب الاطاعت ہے، اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ مسائل مختلف فیہا میں حسبِ ضرورتِ وقت اجتہاد کرے، اور اس کا اجتہاد واجب العمل ہے ❸۔''

اس محضر پر علمائے دربار میں سے کسی نے طوعاً اور کسی نے کرہاً اپنی اپنی مہریں ثبت کر دیں۔ عبدالقادر بدایونی علما کی اس جماعت میں شیخ مبارک کو بہت بڑا عالم قرار دیتے ہیں۔ اور ۹۸۷ھ/ ۱۵۷۹ء کے وقائع میں لکھتے ہیں۔ ''شیخ مبارک کہ اعلم علماء زمان بود ❹۔

محضر تیار کرنے کا پس منظر یہ ہے کہ جن دنوں صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی نے متھرا کے ایک برہمن کو مسجد کے بجائے شوالہ تعمیر کرنے اور رسول اللہ ﷺ پر سب و شتم کرنے کے جرم میں قتل کیا تھا، انہی دنوں شیخ مبارک کسی وجہ سے بادشاہ کی خدمت میں آئے۔ بادشاہ نے ان سے بعض ان مسائل کے بارے میں گفتگو

❶ تذکرہ، ص ۴۰۔

❷ تذکرہ، ص ۴۴۔

❸ ایضاً۔

❹ منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۲۷۰۔

Marfat.com

کی جو اکثر پیش آتے رہتے تھے اور علما کا ذکر بھی کیا۔ شیخ مبارک کے' جو پہلے سے صدر الصدور شیخ عبدالنبی سے کدورت رکھتے تھے اور ذہنی طور پر ان سے بہت دور تھے' موقع ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے علما کی مخالفت کی اور کہا کہ بادشاہ عادل خود مجتہد ہے۔ اختلافی مسئلے میں حالات کے مطابق حضور جو مناسب سمجھیں اور قرین مصلحت جانیں' حکم جاری فرما سکتے ہیں۔ علمائے دین کا رویہ صحیح نہیں ہے۔ کسی مسئلے میں ان سے رائے لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بادشاہ نے اتنے بڑے عالم کے منہ سے یہ بات سنی تو بہت خوش ہوا' اور کہا:

ہر گاہ شما استاد ما باشید' وسبق پیش شما خوانده باشیم۔ چرا مارا از منت ایں ملایاں خاص نمی سازید۔

(یعنی آپ ہمارے استاد بن جائیے' ہم آپ سے سبق پڑھیں گے۔ کسی طرح ہمیں ان ملانوں سے نجات دلائیے۔)

دیر تک اکبر اور شیخ مبارک کے درمیان اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر یہ تجویز ٹھہری کہ آیات و احادیث کی روشنی میں ایک تحریر لکھی جائے' جس کا مفاد یہ ہو کہ امام عادل اختلافی مسئلے میں اپنی رائے سے' مصلحت وقت اور تقاضائے حالات کے مطابق جو چاہے کر سکتا ہے۔ علما و مجتہدین کی رائے پر اس کی رائے کو بہر حال ترجیح حاصل ہو گی۔ چنانچہ اس کا مسودہ خود شیخ مبارک نے تیار کیا۔ مسودہ تیار ہو چکا تو دربار کے تمام علما' اصحاب فتویٰ اور قضاۃ کو بلایا گیا اور انھیں مسودہ پڑھ کر سنایا گیا۔ کوئی اس کا مخالف تھا اور کوئی موافق' لیکن طوعاً و کرہاً سب نے اس پر مہریں ثبت کر دیں۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اس کے مخالف تھے' مجبوراً انھیں بھی اس کی تصویب کرنا پڑی۔ اس صورت حال سے شیخ مبارک بے حد خوش تھے اور وہی صدر محفل تھے۔ ان کے حریف علما بے بس تھے اور عوام الناس کی صف میں ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اس محضر کی عبارت بعینہ یہ ہے:

مقصود از تشیید ایں مبانی و تمہید ایں معانی آں کہ چوں ہندوستان صنت عن الحدثان' بمیامن معدلت سلطانی و تربیت جہاں بانی' مرکز امن و امان و دائرۂ عدل و احسان شدہ' طوائف انام از خواص و عوام خصوصاً علمائے عرفان شعار و فضلائے دقائق آثار کہ ہادیان بادیہ نجات و سالکان مسالک اولوا العلم درجات اند' از عرب و عجم رو بدیں دیار نہادہ توطن اختیار نمودند۔ جمہور علمائے فحول کہ جامع فروع و اصول و حادی معقول و منقول اند' و بہ دین و دیانت و صیانت اتصاف دارند' بعد از تدبیر وافی و تامل کافی در غوامض معانی آیہ کریمہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الا مر منکم و احادیث صحیح' ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل۔ من یطع الامیر فقد اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی' و غیر ذلک من الشواھد العقلیۃ و دلائل النقلیۃ' قرار دادہ حکم نمودند کہ مرتبۂ سلطان عادل عنداللہ زیادہ از مرتبہ مجتہد است' وحضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علی العالمین ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ابداً اعدل و اعلم و اعقل باللہ اند۔ بنابریں اگر در مسائل دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بہ ذہن صائب و فکرِ ثاقب خود یک جانب را از اختلافات' بجہت تسہیل معیشت بنی آدم و

Marfat.com

مصلحت انتظام عالم اختیار نمودہ بہ آں جانب حکم فرمایند، متفق علیہ می شود و اتباع آں برعموم برایا و کافۂ رعایا لازم و متحتم است۔ و ایضاً اگر بہ موجب رائے صواب نمائے خود حکمے را از احکام قرار دہند کہ مخالف نصے نباشد و سبب ترفیہ عالمیاں بودہ باشد، عمل برآں نمودن برہمہ کس لازم و متحتم است و مخالفت آں موجب سخط اخروی و خسران دینی و دینوی است۔ و ایں مسطور صدق و فور حسبۃ للہ و اظہاراً لا جرائے حقوق الاسلام بہ محضر علمائے دین و فقہائے مہدبین تحریر یافت۔ وکان ذالک فی شہر رجب ۹۸۷ھ/ستمبر ۱۵۷۹ء سبع و ثمانین و تسع مائتہ۔

(''یعنی اس تمہید و تشریح کا خلاصہ یہ ہے کہ ملک ہندوستان آفات سے محفوظ رہے، سلطان جہاں پناہ کے عدل و انصاف اور تدبیر و انتظام سے دارالامن بن چکا ہے اور ہر جگہ خواص و عوام بالخصوص عرب و عجم کے علما و فضلا یہاں آکر مقیم ہو چکے ہیں۔ بنابریں تمام علما نے بڑے غور و فکر کے بعد اس آیۃ کریمہ: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں کہ ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل۔ من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعصی الامیر فقد عصانی۔ وغیرہ عقلی و نقلی دلائل و شواہد کی بنا پر یہ حکم لگایا ہے کہ سلطان عادل کا مرتبہ اللہ کے نزدیک مجتہد کے مرتبے سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا حضرت سلطان الاسلام امیر المومنین ظل اللہ ابوالفتح جلال الدین اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ، عوام کی سہولت اور مملکت کے انتظامی مصالح کی خاطر، اگر دین کے ان مسائل میں جو مجتہدین کے نزدیک اختلافی ہوں، کسی بھی ایک صورت کو تجویز کر کے اس کے مطابق احکام جاری فرمائیں تو ان کی تجویز و حکم کو متفق علیہ تصور کیا جائے گا اور اس کی اطاعت و پیروی تمام رعایا پر لازمی اور قطعی ہو گی۔ نیز سلطان عالم پناہ کوئی بھی ایسا قانون اور حکم نافذ فرمائیں جو عوام کے لیے باعث سہولت ہو اور نصِ شرع کے مغائر نہ ہو، اس پر عمل درآمد ہر شخص پر ضروری اور قطعی ہو گا، اور اس کی مخالفت عذاب اخروی اور خسران دینی و دینوی کا باعث ہو گی۔ یہ سطور حقوق اسلام کے اجرا کی غرض سے حسبتہً للہ علمائے دین اور فقہائے مہدبین کے محضر سے ماہ رجب ۹۸۷ھ/ستمبر ۱۵۷۹ء کو ضبط تحریر میں لائی گئیں۔'')

شیخ مبارک ناگوری نے بلاشبہ اکبر کو خلاف شرع راستے پر لگایا اور غلط امور میں اس کی رہنمائی کی۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے دور کے بہت بڑے عالم تھے، فقہ و اصول میں مہارت رکھتے تھے۔ علوم عربیہ کے دقائق و غوامض کی گرہ کشائی میں انھیں عبور حاصل تھا۔ تصوف کے رموز سے آگاہ تھے، فن شعری میں یکتا تھے، قرآن مجید کی دس قرائتوں کے عالم تھے اور شاطبی کا درس دیتے تھے۔ کثیر المطالعہ تھے اور ہر آن درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے۔ حافظہ نہایت تیز تھا اور قوت ادراک میں لاثانی تھے۔ جو چیز ایک مرتبہ حافظے کی گرفت میں آجاتی وہ نکلنے نہ پاتی۔ آخر عمر میں جب بصارت ضائع ہو گئی اور مطالعہ کتب سے معذور ہو گئے تو تفسیر قرآن لکھنا شروع کی، جو چار ضخیم مجلدات میں ختم ہوئی، اس کا نام ''منبع نفائس العیون۔'' [1] رکھا۔ زندگی کے

[1] مآثر الکرام میں میر سید غلام علی آزاد نے اس تفسیر کا نام ''منبع عیون المعانی'' لکھا ہے لیکن اس تفسیر کا پورا نام ''منبع العیون المعانی و مطلع شموس الثانی'' ہے۔

Marfat.com

آخری ایام میں ابن الفارض کا تائیہ، بصیری کا قصیدہ بردہ، قصیدہ کعب بن زہیر اور دیگر قصائد پڑھتے رہتے تھے، جو انھیں زبانی یاد تھے۔

شیخ مبارک ناگوری نے ۱۷ ذی القعدہ ۱۰۰۱ھ/ ۵ / اگست ۱۵۹۳ء کو وفات پائی❶۔

۹۵-مولانا محبّ علی سندھی برہان پوری

مولانا محبّ علی بن صدر الدین محمد بن علی بیگ ٹھٹھوی سندھی، ایک فقیہ اور شاعر بزرگ تھے۔ اصلاً کوہستان برکہ کے ایک قبیلے کے فرد تھے جو چغتائی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے جد امجد علی بیگ بابر کے ساتھ وارد ہند ہوئے اور مرتبۂ شہادت پایا۔ ان کے والد صدر الدین محمد مغل حکمران ہمایوں کے ساتھ بلاد سندھ میں گئے اور ٹھٹھہ میں فروکش ہوئے۔ وہیں محبّ علی کی ولادت ہوئی۔ ابھی کم عمر تھے کہ والد وفات پا گئے اور محبّ علی نے حصول علم کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔ اس سلسلے میں بے حد محنت اور کوشش کا ثبوت بہم پہنچایا اور اکثر علوم متداولہ اور فنون مروّجہ میں درجہ کمال کو پہنچے۔ جب عبدالرحیم خان خاناں نے سندھ فتح کیا اور اس کی ملاقات اس عالم دین سے ہوئی تو وہ ان کے علم و فضل اور فکر و تدبر سے بہت متاثر ہوا اور اپنے ساتھ دارالحکومت آگرہ لے گیا۔ عرصے تک اس عالم اور علم دوست امیر کی مصاحبت و ملازمت میں رہے۔ پھر برہان پور کی راہ لی۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال کی تھی۔ مدت تک برہان پور میں اقامت اختیار کیے رکھی۔ برہان پور سے حج بیت اللہ کے ارادے سے روانہ ہوئے لیکن سورت پہنچے تو وہاں شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری (متوفی ۲ رمضان المبارک ۱۰۲۹ھ/ ۲۲ / جولائی ۱۶۲۰ء) سے ملاقات ہوئی۔ وہیں ٹھہر گئے اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ بعدازاں حرمین شریفین کا عزم فرمایا اور سعادتِ حج و زیارت سے بہرہ ور ہوئے۔ وہاں سے واپس مراجعت کی تو برہان پور کو مسکن بنایا۔

مغل بادشاہ شاہ جہان اس عالم و فقیہ کو اپنے ساتھ دارالحکومت آگرہ لے گیا تھا۔ تمام عمر اس کے پاس رہے۔ شیخ و فقیہ، عالم دین اور بہترین شاعر تھے۔ ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۱ء کے قریب فوت ہوئے❷۔

❶ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اکبر نامہ- منتخب التواریخ کے مختلف مقامات- مآثر الکرام ج ۱، ص ۱۸۳، ۱۸۴- بوستان اخبار ص ۱۴۷ تا ۱۵۳- دربار اکبری، ص ۳۲۸ تا ۳۵۸- حدائق الحنفیہ ص ۱۹۴- بزم تیموریہ، ص ۸۰- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۲۰، ۳۲۱- تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۷۴-

❷ عمل صالح، ج ۳، ص ۳۸۱، ۳۸۳- بادشاہ نامہ، ج ۳، ص ۳۳۵، ۳۳۶- مآثر رحیمی، ج ۳، حصہ اول، ص ۴۸۹ تا ۵۱۶- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۲۲- تحفۃ الکرام ص ۵۹۵- برہان پور کے سندھی اولیا، ص ۲۲۸ تا ۲۵۹-

Marfat.com

۹۶- علامہ حکیم محمد مصری برہان پوری

علامہ محمد مصری برہان پوری، شیخ وقت، عالم کبیر اور طبیب تھے۔ متعدد فنون کے ماہر تھے۔ بالخصوص فن طب کی علمی اور عملی جزئیات میں عبور رکھتے تھے۔ فقہ اور اصول فقہ سے باخبر تھے۔ بہترین اوصاف کے مالک، عذوبت لسان کی صفت سے متصف، حاضر جواب، ظریف الطبع اور نرم گفتار۔ فارسی کے عمدہ مزاحیہ شاعر۔ بعض امراض کا اس انداز سے علاج کرتے کہ عقل حیران رہ جاتی۔

محمد بن عمر آصفی کا کہنا ہے کہ ان کا نام حکیم بیبرس مصری تھا۔ غالباً بلاد مصر سے ہندوستان آئے اور احمد نگر میں داخل ہوئے اور فن طب کے ماہر کی حیثیت سے ملوک وسلاطین کا تقرب حاصل کیا۔ عرصے تک مرتضیٰ نظام شاہ کے شاہی طبیب کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں چنگیز خاں وزیر کو زہر کھلا کر مار دیا گیا تو مرتضیٰ نظام شاہ نے ان کو اپنا وزیر بنا لیا، لیکن یہ منصب بہت کم مدت کے لیے ان کے پاس رہا۔ کچھ دنوں بعد وزارت سے معزول کر دیے گئے۔ پھر ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں جب مرتضیٰ نظام شاہ قتل ہو گیا تو احمد نگر سے احمد آباد چلے گئے۔ احمد آباد میں خان اعظم عزیز کوکہ نے ان کو خوش آمدید کہا اور بڑے احترام سے پیش آیا۔ اس نے ان کو جلال الدین اکبر کے دربار میں اکبر آباد۔ (آگرہ) بھیج دیا۔

شیخ فیضی کا علاج انہی نے کیا تھا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ خود کہا کرتے کہ موت کے سامنے سب عاجز و بے بس ہیں۔ اگر طب سے عمر میں اضافہ ہو سکتا تو کوئی طبیب اس دنیا سے رخصت نہ ہوتا۔ کہتے ہیں ۱۰۰۸ھ/۱۶۰۰ء کو برہان پور میں انھیں زہر کھلا کر مار دیا گیا تھا❶۔

۹۷- شیخ محمد بیجا پوری

شیخ محمد بن ابوالمعالی بن علم اللہ صالحی امیٹھوی، قاضی اعز الدین بیجا پوری کے نام سے معروف تھے۔ شیخ اور عالم وفقیہ تھے اور نامور فقہا واصولیین میں گردانے جاتے تھے۔ سلطان محمد عادل شاہ کے عہد میں بیجا پور کے منصب قضا پر متعین ہوئے اور تمام عمر اس منصب پر فائز رہے❷۔

۹۸- سید محمد عاملی

سید محمد بن احمد بن محمد عاملی، مسلکاً شیعہ تھے۔ فاضل و عالم اور فقیہ تھے۔ شیخ بہاء الدین عاملی کے معاصرین میں سے تھے۔ کشمیر چلے گئے تھے اور وہیں توطن اختیار کر لیا تھا۔ کشمیر ہی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے❸۔

---

❶ منتخب التواریخ، ص ۱۶۵- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۲۹، ۳۳۰-

❷ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۳۰ بحوالہ روضۃ الاولیا-

❸ نجوم السماء، ص ۴۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۳۱

Marfat.com

۹۹- شیخ محمد غوثی مانڈوی

شیخ محمد بن حسن بن موسیٰ غوثی گجراتی مانڈوی کی تاریخ ولادت ۱۱ رجب ۹۶۲ھ/ یکم جون ۱۵۵۵ء ہے۔ جائے ولادت مانڈو ہے۔ قرآن مجید شیخ کمال الدین قرشی سے پڑھا۔ پھر فارسی کے کچھ رسائل و کتب کی تعلیم حاصل کی۔ گیارہ سال کے تھے کہ والد وفات پا گئے۔ سترہ سال کو پہنچے تو والدہ نے شادی کر دی' لیکن حصول علم کا شغل جاری رکھا اور شادی اس راہِ صواب میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ علم نحو اور علوم عربیہ کی تحصیل شیخ برہان الدین کالپوی سے کی۔ بعدازاں کشف المنار اور اصول فقہ کی مشہور کتاب تلویح کا درس سید شاہ محمد سے لیا۔ پھر عازم آگرہ ہوئے' اور پانچ سال وہاں مقیم رہے۔ ۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ء میں سفر گجرات پر روانہ ہوئے۔ وہاں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کا غلغلۂ درس بلند تھا' اس میں داخل ہو گئے اور اکثر کتب درسیہ کی تکمیل فرمائی۔ برہان پور میں حکیم عثمان بن عیسیٰ سندھی سے فنون ریاضی پڑھے۔ ۹۹۴ھ/ ۱۵۸۶ء میں مانڈو واپس آ گئے۔

شیخ محمد غوثی گیارھویں صدی ہجری کے عالم دین اور مستقیم الحال صوفی تھے۔ شیخ صدر الدین محمد برودوی سے مستفیض تھے اور ان کے خلیفہ شیخ محمود بن جلال گجراتی سے منسلک۔ تذکرۂ رجال کی مشہور کتاب "گلزار ابرار" کے مصنف تھے۔ یہ کتاب ۶۱۲ علما و مشائخ کا مستند تذکرہ ہے۔ جن حضرات کے اس میں حالات درج ہیں' ان میں کچھ بزرگوں سے شیخ محمد غوثی خود ملے ہیں۔ یہ تذکرہ جہانگیر بادشاہ کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اس کا نقش اول ۹۹۸ھ/ ۱۵۹۰ء میں تیار ہوا۔ پھر ۱۰۱۰ھ/ ۱۶۰۲ء تک اس میں اصلاح و اضافہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کا زیادہ تر حصہ ۱۰۲۰ھ اور ۱۰۲۲ھ/ ۱۶۱۱ء اور ۱۶۱۳ء کے درمیان معرض کتابت میں لایا گیا۔ یعنی ۹۹۸ھ سے ۱۰۲۰ھ (۱۵۹۰ء سے ۱۶۱۱ء) تک مصنف اس کی تکمیل و تصحیح اور اضافہ و اصلاح میں مصروف رہے۔

گلزار ابرار فارسی زبان میں ہے۔ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے لینڈ سینا' ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ' کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن اور برٹش میوزم میں موجود ہیں۔ اجین (ہندوستان) کے ایک صاحب علم منشی اللہ یار خاں کے پاس بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ کراچی کے سید سخاوت علی خسرو کا ذاتی کتب خانہ بھی اس کے ایک قلمی نسخے سے مزین ہے۔

۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں ایک ہندی عالم جناب فضل احمد نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا' جو اسی سال مطبع مفید عام آگرہ میں چھپا تھا۔ اصل فارسی کتاب چوں کہ دست یاب نہیں ہے' لہٰذا جو لوگ برصغیر کے فقہا و علما اور مشائخ و اولیا کے حالات کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں' ان میں زیادہ تر یہ ترجمہ ہی متداول ہے اور وہ اپنی تصنیفات میں اسی کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ ترجمہ "اذکار ابرار" (۱۳۲۶ھ) کے تاریخی نام سے موسوم ہے۔ یہی ترجمہ ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء میں اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔

Marfat.com

شیخ محمد بن حسن غوثی مانڈوی نے چھ سو سے زائد علما و مشائخ کے حالات تحریر کیے' لیکن افسوس ہے' خود ان کی زندگی کے کوائف بہت ہی کم میسر ہیں ❶۔

۱۰۰- قاضی محمد نصیر آبادی

قاضی محمد بن عبدالعزیز بن فتح بن محمد بن محمود حسنی نصیر آبادی۔ نصیر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ قاضی پیر علی کے نام سے معروف تھے۔ شیخ' فقیہ اور عالم تھے۔ اپنے دور کے کبار فقہا میں سے تھے۔ اپنے والد قاضی عبدالعزیز سے' جو بہت بڑے عالم اور نصیر آباد کے منصب قضا پر متعین تھے' علم فقہ حاصل کیا ـــــ پھر مزید حصول علم کی غرض سے مختلف بلاد و امصار میں گئے اور علمائے اعلام کی ایک بڑی جماعت سے مستفید ہوئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد اپنے والد مرحوم کی جگہ نصیر آباد کی مسند قضا سنبھالی اور تمام عمر اس پر متمکن رہے ❷۔

۱۰۱- شیخ محمد سندھی

شیخ محمد بن عبداللہ سندھی کا مولد برہان پور ہے' پرورش بھی وہیں ہوئی۔ منطق و حکمت کی کتابیں حکیم عثمان بوبکانی سے پڑھیں۔ فقہ و اصول کا علم شیخ طاہر بن یوسف سندھی (متوفی ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۶ء) سے حاصل کیا۔ نقد النصوص' شرح منازل السائرین اور شرح گلشن راز کی تحصیل شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی سے کی۔ شرح المواقف کا کچھ حصہ بھی انہی سے پڑھا۔ اخذ طریقت شیخ لشکر محمد عارف سے کیا۔ یہاں تک کہ علم و معرفت' تدین و صالحیت' فقہ و اصول اور علوم مروّجہ میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ طویل مدت تک برہان پور میں مقیم رہے اور وہاں درس و افادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔

جلال الدین اکبر بادشاہ نے ناراض ہو کر ایک مرتبہ ان کو جیل میں بھی ڈال دیا تھا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب اکبر نے علاقہ خاندیس پر فوج کشی کی تو وہاں کا فاروقی بادشاہ اپنے امرائے سلطنت اور عمائد مملکت کے ساتھ برہان پور کے قلعہ اسیر میں جا بیٹھا۔ بادشاہ اور ارکان حکومت کا خیال تھا کہ اکبر اس قلعے کو مسخر نہیں کر سکتا' لیکن اکبر بھی ارادے کا مضبوط تھا۔ اس نے بہت بڑی فوج جمع کر دی اور نواح خاندیس میں پھیلا دی۔ گیارہ مہینے اکبر اپنی کثیر فوج کے ساتھ وہاں خیمہ زن رہا اور باوجود انتہائی کوشش کے قلعے پر قبضہ نہ کر سکا۔ اکبر کے دل میں یہ بات جم گئی کہ برہان پور کے صوفیا اور مشائخ اپنے بادشاہ کی رد بلا کے لیے وظیفے پڑھتے اور دعائیں مانگتے ہیں' اسی لیے برہان پور کی چھوٹی سی حکومت کو اس کی اتنی بڑی فوج شکست نہیں دے سکی اور سب

---

❶ ان کے مختصر حالات کے لیے دیکھیے: اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار)' ص ۶۱۱ تا ۶۲۴ - مقدمہ "اذکار ابرار"' مطبوعہ اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور - نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۳۹-

❷ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۴۱-

Marfat.com

لوگ اطمینان کے ساتھ اپنے شہر میں بیٹھے ہیں۔ چنانچہ اس نے وہاں کے بزرگوں کو نشانہ بنایا اور اکثر کو گرفتار کر کے قید و بند میں ڈال دیا۔ جو بزرگان دین زیادہ اثر و رسوخ کے مالک تھے اور ان کو گرفتار کرنے میں بغاوت پھوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا' انھیں کسی اور طریقے سے مبتلائے اذیت کیا۔ یہ ایک عظیم آزمائش اور فتنے کا دور تھا۔ شیخ عثمان بوبکانی پہلے ہی ابتلا کے ڈر سے برہان پور چھوڑ چکے تھے۔ بعض دیگر مشائخ بھی احمد آباد اور سورت چلے گئے تھے۔ لیکن شیخ محمد سندھی وہاں موجود تھے۔ اکبر انھیں گرفتار کر کے اپنے ساتھ آگرہ لے گیا اور شاہ برہان پور کی خیر خواہی کا الزام عائد کر کے حوالہ زنداں کر دیا۔ عرصے تک وہ جیل میں رہے۔ پھر بعض لوگوں کی سفارش سے انھیں رہا تو کر دیا گیا مگر برہان پور جانے کی اجازت نہ دی اور اپنے ایک امیر قلیچ خاں کے حوالے کر دیا۔ قلیچ خاں بڑا عالم و فقیہ اور نیک امیر تھا۔ علما کا بے حد قدردان تھا' وہ شیخ محمد سندھی کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے بہت متاثر ہوا۔ ہر وقت انھیں اپنے ساتھ رکھتا۔ اس اثنا میں وہ لاہور کی مہم پر روانہ ہوا تو شیخ کو بھی ساتھ لے گیا۔ کئی سال اسی طرح کے حالات رہے۔ شیخ محمد سندھی قلیچ خاں کی کمان میں کفار سے جنگ کر رہے تھے کہ غرہ جمادی الاخری ۱۰۱۳ھ/ اکتوبر ۱۶۰۴ء کو راجپوتوں کی لڑائی میں شہید ہو گئے[1]۔

۱۰۲-سید محمد جالندھری کالپوی

سید محمد جالندھری کالپوی کا سلسلہ نسب یہ ہے: محمد بن ابو سعید بن بہاء الدین بن عماد الدین بن اللہ بخش بن سیف الدین بن مجد الدین بن شمس الدین بن شہاب الدین بن عمر بن حامد بن احمد زاہد حسینی سدانوی کالپوی۔ عالم کبیر تھے' ان کا شمار علمائے ربانیین میں ہوتا تھا۔ اصلاً ترمذ کے صحیح النسب سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اجداد کرام میں سے کوئی بزرگ پنجاب کے شہر جالندھر میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ بعد ازاں سید محمد کے والد سید ابو سعید روزگار کے سلسلے میں جالندھر کی سکونت ترک کر کے کالپی چلے گئے تھے۔

سید محمد ۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۸ء کو شہر کالپی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ابو سعید' بیٹے کی ولادت سے قبل ہی بلاد دکن میں چلے گئے تھے اور کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔ محمد نے والد کی غیر موجودگی میں اپنی نیک بخت ماں کی گود میں پرورش پائی۔ سات برس کے تھے کہ ایک عالم حدیث شیخ محمد یونس شہر کڑھ سے کالپی آ کر فروکش ہوئے۔ محمد بن ابو سعید نے ان سے حصولِ علم کا آغاز کیا اور علم بیان و معانی کی مشہور کتاب مطول تک ان سے درسی کتابیں پڑھیں۔ انہی سے سند حدیث حاصل کی۔ پھر عازم جاجمو ہوئے۔ وہاں مولانا جاجموی سے بعض کتابوں کا درس لیا۔ بعد ازاں کورگئے۔ وہاں شیخ جمال بن مخدوم کوردی کی مسند درس آراستہ تھی' ان سے باقی کتب درسیہ پڑھیں۔ پھر انہی سے اخذ طریقت کیا۔ اخذ علم اور کسب طریقت کے بعد اپنے شہر کالپی کا قصد کیا

---

[1] اذکار ابرار' ص ۴۶۵- برہان پور کے سندھی علما' ص ۳۳۴ تا ۳۳۹- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۴۱-

Marfat.com

اور درس و افادہ کی طرح ڈالی۔ عرصے تک خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔ پھر اپنے اعزہ واقارب میں شادی کی غرض سے وارد جالندھر ہوئے۔ جالندھر سے آگرہ گئے' وہاں امیر ابوالعلا حسینی اکبر آبادی سے ملے۔ ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر اخذ فیض کیا۔ اس کے بعد دس سال تک درس و افادہ میں مشغول رہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ لوگوں سے بالکل منقطع ہو گئے اور علیٰحدگی کی زندگی اختیار کر لی۔ تعلیم و تدریس اور بحث و اشتغال کی دلچسپیاں ختم کر دیں۔ اپنے آپ کو گھر کی چاردیواری میں محصور کر لیا اور لوگوں سے میل جول کا سلسلہ قطعی ختم کر دیا۔ اب انھیں یا تو گھر میں دیکھا جاتا تھا یا مسجد میں' اور کہیں نہ جاتے۔

آخر عمر میں ہمیشہ روزے سے رہنے لگے تھے۔ صرف انہی دنوں میں افطار کرتے جن دنوں میں اللہ نے روزے رکھنے کو حرام قرار دیا ہے۔ چھ سال یہ کیفیت رہی' اس کے بعد وفات پا گئے۔ شیخ محمد بن ابوسعید کالپوی جالندھری' صاحب تصنیف بھی تھے۔ وہ مختلف عنوانات کے تحت بہت سی کتابیں ضبط تحریر میں لائے' جن میں ایک سورہ یوسف کی تفسیر ہے۔ ایک عربی زبان میں کتاب الروائح ہے۔ ایک رسالہ تحقیق روح سے متعلق ہے' ایک رسالہ عربی میں وحدت الوجود کے بارے میں ہے۔ ایک کتاب فارسی زبان میں سلوک کے موضوع پر ارشاد السالکین ہے۔ ایک اور رسالہ فارسی میں مبحث فنا کے سلسلے میں ہے۔ ایک رسالہ عقائد صوفیا کے متعلق ہے۔ ایک رسالہ واردات کے متعلق ہے اور عربی میں ہے۔ سلوک کے باب میں ایک اور عمدہ رسالہ ہے۔ ایک رسالہ مراتب فنا اور وصول الی اللہ کے بارے میں فارسی زبان میں ہے۔

شیخ محمد بن ابوسعید اپنے دور کے عالم و فاضل' فقیہ اور صوفی بزرگ تھے۔ ۲۶/ شعبان ۱۰۷۱ھ/۱۶/ اپریل ۱۶۶۱ء کو پینسٹھ (۶۵) سال کی عمر پا کر فوت ہوئے اور کالپی میں دفن کیے گئے [1]۔

۱۰۳۔ سید محمد حضرمی

سید محمد بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ عیدروس حضرمی ثم ہندی سورتی۔ مشاہیر علمائے کاملین میں سے تھے۔ علم و عمل کے اعتبار سے اپنے وقت کے امام تھے۔ کردار و گفتار' زہد و تقویٰ اور تحقیق و کاوش میں یگانۂ روزگار تھے۔

۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء کو تریم میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید پڑھا اور حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ اپنے والد کی گود میں تربیت پائی اور ان سے متعدد علوم کی تحصیل کی۔ سید محمد بن حسن' محمد بن اسماعیل فقیہ اور سید عبدالرحمٰن بن شہاب سے علم فقہ حاصل کیا۔ پھر حدیث کی سماعت کے لیے علما کی ایک جماعت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علم تصوف کے حصول کے لیے بھی بہت سے علما سے منسلک رہے۔ ان کے تمام مشائخ ان کی

---

[1] مآثر الکرام ص ۱۷۱ تا ۱۷۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۲۷' ۳۲۸ بحوالہ ضیا محمدی۔

Marfat.com

تعریف کرتے اور ان کے فضل و کمال کی شہادت دیتے ہیں۔ اپنے عم محترم شیخ عبدالقادر سے بھی انھوں نے کسب فیض کیا اور انھوں نے ان کے والد شیخ عبداللہ کو مبارک باد کا خط لکھا اور ان کے اس بیٹے (سید محمد) کے علم و فضل کی ہمہ گیری اور زہد و ورع میں انفرادیت کو ان کے لیے قابل فخر قرار دیا۔ ان دنوں سید محمد کے دادا شیخ بن عبداللہ احمد آباد میں تھے' انھیں پوتے کے فضل و کمال کا پتا چلا تو ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں انھیں احمد آباد بلا لیا۔ احمد آباد پہنچ کر اپنے جد امجد سے بہت سے علوم حاصل کیے اور اس مرتبہ علمی کو پہنچے' جس پر اس دور کے بہت سے کبار مشائخ نہیں پہنچ پائے تھے۔

غرض سید محمد حضرمی دیار ہند میں آبسے تھے اور اپنے دور کے جلیل القدر عالم وفقیہ تھے۔ پہلے وہ احمد آباد میں قیام پذیر ہوئے تھے' اس کے بعد سورت چلے گئے تھے اور اسی شہر کو اپنا وطن قرار دے لیا تھا۔ اس ملک کا حکمران طبقہ بھی انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ علم و فضل کی فراوانی کے علاوہ جود و سخا میں بھی مشہور تھے۔ اس عالم وفقیہ نے ساٹھ سال کی عمر پا کر ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء کو سورت میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ❶۔

۱۰۴۔ شیخ محمد راندیری

شیخ محمد بن علی حمید شافعی اشعری عیدروسی راندیری سورتی' صالح عالم دین تھے۔ ان کا شمار مشائخ صوفیا میں ہوتا تھا۔ سید عمر بن عبداللہ باشیبان سے اخذ طریقت کیا۔ پھر ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء میں سفر حج پر روانہ ہوئے۔ حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کر کے ارض ہند میں آئے اور سورت میں اقامت اختیار کی۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے' جن میں اللمعان بتکفیر من قال بخلق القران' صوارم الصدیق لقطع الزندیق اور دخیق المحمدیہ فی طریق الصوفیہ شامل ہیں۔ آخر الذکر کتاب کو صاحب نزہۃ الخواطر علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی نہایت عمدہ کتاب قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ حضرت سید نواب صدیق حسن قنوجی کے صاحب زادے سید نور الحسن کے کتب خانے میں موجود تھا۔

شیخ محمد راندیری کی وفات کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ میں نے کتاب کی پشت پر شیخ محمد ابوبکر حنفی احمد آبادی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ تحریر پڑھی ہے کہ شیخ محمد راندیری نے ہفتے کے روز ۲۱/ذی الحجہ ۱۰۶۸ھ/۹/ستمبر ۱۶۵۸ء کو وفات پائی ❷۔

۱۰۵۔ سید محمد عاملی

دیار ہند کے گیارھویں صدی ہجری کے ایک بزرگ سید شریف محمد بن علی حسینی عاملی تھے' جو اس دور

❶ خلاصۃ الاثر ج ۴' ص ۲۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۴۱ تا ۳۴۳۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۴۹' ۳۵۰۔

Marfat.com

کے مشہور شیعہ فاضل اور فقیہ تھے۔ اپنے معاصرین واقران میں ان کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ان کے علم وفضل کا بڑا شہرہ تھا۔ بہ یک وقت فقیہ' نحوی اور شاعر تھے۔ تمام اصناف علم سے باخبر تھے۔ نیکی اور صالحیت کے جوہر سے آراستہ تھے۔ کشمیر میں رہنے لگے تھے اور اسی خطۂ ارض کو اپنا مسکن ٹھہرالیا تھا❶۔

۱۰۶- شیخ محمد برہان پوری

شیخ محمد بن فضل اللہ بن صدر الدین جون پوری ثم برہان پوری' شیخ وامام اور عالم دین تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ صغرسنی ہی میں باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے۔ شیخ صفی الدین گجراتی سے خرقہ طریقت زیب تن کیا۔ پھر ارض حجاز کو روانہ ہوئے اور بارہ سال وہاں مقیم رہے۔ شیخ علی بن حسام الدین متقی مکی ان دنوں مکہ مکرمہ میں مقیم تھے اور ان کا سلسلۂ درس صلاح جاری تھا' اس میں شامل ہو گئے اور فیض حاصل کیا۔ پھر احمد آباد کا قصد کیا' وہاں شادی کی اور شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے۔ بارہ سال ان کی خدمت وصحبت میں رہے۔ بعد ازاں شیخ محمد ماہ بیر پوری سے اخذ طریقت کیا۔ پھر شیخ ابو محمد بن خضر تمیمی سے تصوف وسلوک کی منزلیں طے کیں۔ شیخ ابو محمد خضر تمیمی ان حضرات میں سے تھے' جنھوں نے ان کے والد شیخ فضل اللہ برہان پوری سے کسب فیض کیا تھا۔ ان تمام منزلوں کو عبور کرنے کے بعد برہان پور کو اپنا مسکن ٹھہرایا اور درس وافادہ میں منہمک ہو گئے۔ نہایت عبادت گزار' یاد خدا میں مصروف رہنے اور اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ ہمیشہ تفسیر' حدیث فقہ اور دیگر علوم دینی کی تدریس وتعلیم میں مشغول رہتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ علم وعمل' زہد وعبادت اور ورع وتقویٰ میں امام کی حیثیت رکھتے تھے اور پورے ہندوستان میں مشہور تھے۔ جس مرتبۂ بلند کو پہنچے' دوسرا کوئی نہیں پہنچ سکا۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ دن کے آخری حصے میں اپنے آپ کا محاسبہ کرتے۔ روزانہ جو کام کیا ہوتا وہ بھی ضبط تحریر میں لاتے۔ ہر وقت اللہ کے خوف میں رہتے اور موت کی توقع رکھتے۔ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں اس موضوع سے متعلق ایک رسالہ بھی لکھا جس کا نام "التحفة المرسله الی النبی ﷺ" پھر "الحقیقة الموافقة للشریعه" کے نام سے اس کی ایک لطیف شرح سپرد قلم کی۔ اس کے علاوہ ایک کتاب الهدية المرسلة الی النبی ﷺ تصنیف کی' ایک اور کتاب الوسیلة الی النبی ﷺ لکھی' اس میں قاضی عیاض کی شفا اور ترمذی کی شمائل کی تلخیص کی گئی ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ مولانا جامی کی مشہور کتاب لوائح کی شرح لکھی۔ ایک رسالہ اس موضوع پر لکھا کہ امرد کی امامتِ نماز مکروہ ہے۔ معراج کے بارے میں بھی ایک رسالہ تصنیف کیا۔

---

❶ نجوم السما' ص ۹۵- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۴۴-

Marfat.com

شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری نے دوشنبہ کے دن ۲ / رمضان المبارک ۱۰۲۹ھ / ۲۲ / جولائی ۱۶۲۰ء کو وفات پائی۔ برہان پور میں مدفون ہیں ❶۔

۱۰۷- مولانا محمد سندھی

مولانا محمد بن یوسف ٹھٹھوی سندھی، بہت بڑے فاضل تھے۔ علوم حکمیہ اور فنون ادبیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ فقہ اور اصول پر بھی گہری نظر تھی۔ علم جفر، تکسیر اور اعداد سے خوب آگاہ تھے۔ جہاں گیر بادشاہ کا وزیر مطلق ابوالحسن آصف جاہ جو جہاں گیر کی بیوی نور جہاں کا بھائی تھا، شیخ محمد بن یوسف ٹھٹھوی کا شاگرد اور عقیدت مند تھا۔ ابوالحسن آصف جاہ منطق و حکمت، تاریخ و رجال اور شعر و انشا کا عالم تھا اور یہ علوم اس نے انھی شیخ محمد بن یوسف سندھی سے حاصل کیے تھے۔ وہ ان کی انتہائی قدر کرتا اور بے حد تکریم سے پیش آتا تھا۔ انھیں مال و منال سے بھی نوازتا تھا۔ دیگر امرائے مملکت کے نزدیک بھی انھیں قدر و منزلت حاصل تھی۔ شیخ محمد بن یوسف نے علاقہ سندھ میں قضا و افتا اور احتساب وغیرہ کے سلسلے کی خدمات شرعیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔

پھر جب بادشاہِ ہند کے دربار میں مہابت خاں کا اثر و رسوخ بڑھا اور آصف جاہ کی طرف سے طبیعت میں تکدر پیدا ہوا تو ایسے تین آدمی قتل کر دیے گئے جو آصف جاہ سے گہرا تعلق رکھتے تھے اور ان کے بارے میں یہ شبہ تھا کہ وہ آصف جاہ کے معاون خاص ہیں اور اسے فتنہ بپا کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان میں مولانا محمد بن یوسف سندھی کا نام بھی شامل تھا۔ مولانا موصوف نے کبر سنی میں قرآن مجید حفظ کیا تھا اور ہر وقت اس کی تلاوت میں مصروف رہتے تھے۔ چلتے پھرتے ان کا یہی مشغلہ تھا۔ تلاوت کی وجہ سے چونکہ ہونٹ ہلتے رہتے تھے، اس لیے آصف جاہ کے مخالفوں اور مہابت خاں کے حامیوں نے یہ یقین کر لیا کہ مولانا محمد سندھی دم اور دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ مہابت خاں کا ستارہ گردش میں آئے اور بادشاہ کے نزدیک جو عزت و احترام اسے حاصل ہے، وہ ختم ہو جائے۔ اس بنا پر ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء میں انھیں قتل کر دیا گیا ❷۔

۱۰۸- قاضی محمد آصف الہ آبادی

قاضی محمد آصف صدر پوری ثم الہ آبادی، فاضل اور علامہ وقت تھے۔ علوم حکمیہ میں ماہر کامل تھے۔ ہندوستان کے شہر خیر آباد کے نواح میں ایک گاؤں صدر پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ مفتی عبدالسلام اعظمی دیوی اور دیگر علمائے عصر سے اخذ علم کیا۔ حصول علم کے بعد الہ آباد کی مسند قضا پر متمکن ہوئے اور الہ آبادی

❶ خلاصۃ الاثر، ج ۴، ص ۱۱۰- اذکار ابرار، ص ۵۹۷، ۵۹۸- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۵۲، ۳۵۳-

❷ مآثر الامرا (اردو ترجمہ) ج ۳، ص ۳۱۴- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۵۶-

Marfat.com

کہلائے۔ ساتھ ہی سلسلہ تدریس بھی جاری رکھا اور دیار ہند کے بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا' جن میں شیخ محمد افضل بن عبدالرحمٰن عباسی الہ آبادی بھی شامل ہیں۔ انھوں نے قاضی محمد آصف سے شرح المطالع اور شرح حکمۃ العین کا کچھ حصہ پڑھا۔ تفسیر بیضاوی کا درس بھی لیتے رہے۔

قاضی محمد آصف' تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے' چنانچہ مبحث وجود میں محقق دوانی کے رسالے کا رد لکھا۔ تفسیر بیضاوی پر تعلیقات سپرد قلم کیں ❶۔

۱۰۹- شیخ محمد آفاق لکھنوی

شیخ محمد آفاق لکھنوی' شیخ صالح اور صوفی المشرب فقیہ اور عالم تھے۔ ہندوستان کے صوبہ بہار میں پٹنہ کے قریب ایک گاؤں ''تلاوہ'' میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اور فقر و فاقہ کی راہ پر گامزن ہوئے۔ گوپا مئو گئے' وہاں مفتی وجیہ الدین گوپاموی کا سلسلۂ درس جاری تھا' ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ پھر لکھنؤ کا عزم کیا اور شیخ پیر محمد لکھنوی سے فیض طریقت حاصل کیا اور طویل عرصے تک ان کی مصاحبت میں رہے ___ شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد ان کی جگہ خود درس و افادہ میں سرگرم عمل ہوئے۔ تکلفات کو بالکل پسند نہ کرتے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۲۲ ربیع الثانی ۱۰۸۹ھ/۳ جون ۱۶۷۸ء کو وفات پائی ❷۔

۱۱۰- قاضی محمد اسلم ہروی

قاضی محمد اسلم ہروی' ملا خواجہ کوہی اولاد سے تھے جو خراسان کے مشاہیر مشائخ اور نامور علما میں سے تھے اور شیخ محمد سعید حنفی خراسانی المعروف بہ میر کلاں محدث کے والد تھے۔ میر کلاں بادشاہ ہند جہاں گیر کے استاد تھے۔ قاضی محمد اسلم ہرات میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ کابل آئے اور بعض علوم کی تحصیل کی۔ عہد جہاں گیری کے آغاز میں حصول علم کی غرض سے لاہور کا قصد کیا اور مولانا محمد فاضل بدخشی لاہوری اور شیخ بہلول لاہوری سے درسی کتابیں پڑھیں' جو اس دور کے فحول علما اور صنادید فضلا میں سے تھے۔ تکمیل علم کے بعد عازم آگرہ ہوئے اور جہاں گیر سے تقرب پیدا کیا۔ چونکہ یہ مولانا میر کلاں کی اولاد سے تھے اور بادشاہ کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا' اس لیے بادشاہ نے ان کی بڑی قدر تکریم کی اور کابل کے منصب قضا سے سرفراز کیا۔ کافی عرصہ اس اہم منصب پر فائز رہے۔ پھر قاضی لشکر مقرر کر دیے گئے۔ جہاں گیر کے بعد اس کا بیٹا شاہ جہان تخت ہند پر متمکن ہوا تو اس نے ان کے اعزاز میں اور بھی اضافہ کیا۔ اس نے پانچ وقت کی نمازوں، جمعے اور عیدین کا امام مقرر کر دیا۔ ساتھ ہی

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۵۶' ۳۵۷۔

❷ تذکرہ علمائے ہند' ص ۱۸۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۵۷

Marfat.com

منصب یک ہزاری سے نوازا۔ اس نے اس حد تک ان کی تکریم کی کہ ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں ان کو چاندی سے تلوایا اور جو رقم ان کے وزن کے برابر آئی' وہ عنایت کی۔ یہ رقم چھ ہزار پانچ سو روپے کی تھی۔

قاضی محمد اسلم ہروی فاضل وقت اور اپنے دور کے جلیل القدر عالم تھے۔ منطق وحکمت میں بالخصوص عبور رکھتے تھے اور اس میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ تیس سال تک قاضی لشکر رہے اور کمال دیانت اور وقار کے ساتھ یہ عظیم خدمت انجام دی۔ اس اثنا میں کسی کو ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ جہاں گیر بھی ان کے علم و فضل اور دیانت وتقوی سے بہت متاثر تھا اور شاہ جہان بھی ان کی فضیلت علمی اور کام سے انتہائی خوش تھا۔ لیکن بعد میں شاہ جہان کے دل میں ان کی پہلی سی منزلت باقی نہ رہی تھی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک مرتبہ (۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء میں) یہ گھوڑے پر سوار تھے' گھوڑا بدکا اور یہ نیچے آ گرے' خاصی چوٹیں آئیں' تین مہینے صاحب فراش رہے۔ علاج ہوتا رہا اور تندرست ہو گئے۔ ان کے صحت یاب ہونے کے بعد بادشاہ نے اپنے ایک امیر مملکت فراست خاں کو جو حج بیت اللہ کے سلسلے میں بادشاہ کی طرف سے نظامت کے عہدے پر فائز تھا' ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کی رقم دے کر حج پر جانے کا حکم دیا۔ یہ رقم مکہ مکرمہ کے امیر اور وہاں کے دیگر اشراف وامرا کی خدمت میں پیش کرنا تھی۔ بادشاہ نے فراست خاں سے کہا کہ وہ قاضی محمد اسلم ہروی کو بھی سفر حج میں اپنے ساتھ لے جائے۔ فراست خاں نے قاضی موصوف سے کہا تو وہ حج کو جانے پر رضا مند نہ ہوئے اور جو عذر پیش کیے وہ بظاہر معقول نہ تھے۔ شاہ جہان بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے برا مانا اور قاضی موصوف کو اپنے منصب سے الگ کر دیا اور دس ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ ان کی جگہ قاضی خوش حال کو پورے ہندوستان کے قاضی کا منصب عطا کیا۔

ایک روایت کے مطابق قاضی محمد اسلم ہروی نے لاہور میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔ دوسری روایت کے مطابق کابل میں انتقال کیا۔ ان کا سال وفات ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء ہے ❶۔

منتخب اللباب میں خافی خاں نے ان کا نام قاضی محمد سلیم تحریر کیا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ میں یہاں قاضی خوشحال کا تعارف بھی کرا دیا جائے جو قاضی محمد اسلم ہروی کے بعد منصب قضا پر مامور ہوئے۔ یہ دراصل مضافات کابل کے باشندے تھے۔ آگرہ میں شاہ جہان بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دہلی کے قاضی مقرر کر دیے گئے۔ جب قاضی محمد اسلم عہدہ قضا سے

❶ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مآثر الکرام' ص ۱۹۵ تا ۱۹۸۔ عمل صالح' ج ا' ص ۴۴۳۔ ج ۲' ص ۲۰۹' ۳۴۷' ۴۲۳۔ ج ۳' ص ۲۸۹' ۳۶۷۔ بادشاہ نامہ' ج ۳' ص ۳۳۳۔ ابجد العلوم' ص ۹۰۳' ۹۰۴۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب' ص ۲۰۰' ۲۰۱۔ سبحۃ المرجان' ص ۶۷۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۵۷' ۳۵۸۔ تذکرہ علمائے ہند' ص ۱۷۸۔ منتخب اللباب' ج ا' ص ۷۰۲۔ حدائق الحنفیہ' ص ۴۱۲۔ بزم تیموریہ' ص ۲۱۴' ۲۱۵۔

Marfat.com

معزول ہوئے تو انھیں دہلی کا قاضی مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد قاضی لشکر مقرر ہوئے۔ پھر اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ بنا تو قاضی عبداللطیف کو لشکر کا قاضی بنادیا اور قاضی خوش حال کو لاہور کا منصب قضا تفویض ہوا۔ چند سال وہ لاہور کے قاضی رہے۔ ان کے حسن سلوک اور دیانت داری سے خواص وعوام سب خوش تھے۔ موت کا پیغام آیا تو آواز آئی۔

﴿يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ O ارْجِعِيْ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ (الفجر: ۲۷، ۲۸)

اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کی طرف واپس ہو اس طرح سے کہ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔"

اور روح عالم علوی کو پرواز کر گئی ❶۔

۱۱۱- سید محمد اشرف نہٹوری

سید محمد اشرف کا سلسلہ نسب یہ ہے: محمد اشرف بن محمد سعید بن محمد معروف بن داؤد بن خیر الدین جون پوری نہٹوری۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں منفرد تھے۔ ان کا مولد نہٹور ہے۔ نشو ونما بھی اسی شہر میں ہوئی۔ وہیں شیخ تاج الدین سنبھلی کی صاحب زادی سے شادی کی۔ پھر عہد شاہ جہانی میں امروہہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی ❷۔

۱۱۲- علامہ محمد افضل جون پوری

علامہ محمد افضل کا سلسلہ نسب یہ ہے: محمد افضل بن محمد حمزہ بن محمد سلطان بن فرید الدین بن بہاء الدین عثمانی جون پوری، شیخ عثمان ہارونی کی نسل سے تھے۔ عالم کبیر، علامہ وقت اور شیخ تھے، مختلف علوم میں یگانۂ روزگار اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع تھے۔

علامہ محمد افضل کے والد محمد حمزہ بلاد مازندران کے ایک مقام دماوند کے رہنے والے تھے۔ وہ وہاں سے چلے اور اعمال اودھ میں ردولی کے مقام پر سکونت پذیر ہو گئے۔ ردولی میں ۱۷ رمضان ۹۷۷ھ/۲۳ فروری ۱۵۶۹ء کو محمد افضل کی ولادت ہوئی۔ محمد حمزہ اچھے عالم تھے، انھوں نے اپنے اس بیٹے کو ابتدائی تعلیم خود ہی دی۔ بعض درسی کتابیں بھی خود ہی پڑھائیں۔ اس اثنا میں محمد افضل کو بھی علم سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور عمر کی کچھ منزلیں بھی طے کر لی تھیں، لہٰذا مزید تعلیم کے لیے ردولی سے دہلی کا قصد کیا۔ دہلی اس زمانے میں علم وفضل کا مرکز تھا اور مختلف جلیل القدر علما و فضلا کا سلسلہ درس جاری تھا، جن میں شیخ طاہر لاہوری کے تلمیذ شیخ حسین عمری،

❶ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۲۰۷، ۲۰۸- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۱۴۳-

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۵۹ بحوالہ نخبۃ التواریخ-

Marfat.com

شیخ عبداللہ سلطان پوری کے شاگرد شیخ ابوحنیفہ اور دیگر علمائے مشاہیر کی تدریسی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور علما و طلبا کی بڑی تعداد ان سے استفادہ کر رہی تھی محمد افضل بھی ان کے حلقہ درس میں شریک ہو گئے اور کسب علم کرنے لگے' یہاں تک کہ بحث واشتغال میں مرتبہ بلند کو پہنچے اور علوم متداولہ میں منفرد حیثیت کے حامل ہوئے۔

علامہ محمد افضل کے حفظ و اتقان اور جامعیت علم و ادراک کا یہ عالم تھا کہ بیس سال کی عمر میں درس و افتا کی مسند بلند پر متمکن ہو گئے تھے اور ان کا شمار اکابر علما میں ہونے لگا تھا۔ جون پور ایک عرصے سے علمی شہرت کا شہر تھا اور وقت کے جید علما اور نامور فضلا کا مسکن رہ چکا تھا۔ جس زمانے کے حالات کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں' اس زمانے میں بھی عظیم المرتبت علما و مشائخ وہاں موجود تھے اور ان کا سلسلۂ درس اور چشمۂ فیض وہاں جاری تھا۔ علامہ محمد افضل بھی جون پور روانہ ہو گئے اور مستقل طور سے وہاں اقامت اختیار کر لی' اس کے بعد وہ جون پوری کہلائے۔ جون پور میں انھوں نے شیخ عبدالقدوس جون پوری سے اخذ طریقت کیا اور درس و افادہ میں سرگرم عمل ہو گئے۔ ان سے فلسفہ وحکمت کی مشہور اور انتہائی کتاب ''شمس البازغہ'' کے مصنف علامہ محمود فاروقی جون پوری اور فن مناظرہ کی درسی کتاب ''رشیدیہ'' کے نامور مؤلف شیخ محمد رشید عثمان جون پوری نے اخذ علم کیا۔ ان کے علاوہ خلق کثیر ان کے علم وفضل کی ہمہ گیری سے مستفید ہوئی۔

علامہ محمد افضل جون پوری نہایت پاک باز' حسن اخلاق کے مالک' متقی اور سلیم الطبع تھے۔ ان کے علم و تدریس کی وجہ سے جون پور نے بڑی شہرت پائی۔ ان کے شاگرد علامہ محمود فاروقی جون پوری بڑے فاضل بزرگ تھے اور استاد (علامہ محمد افضل) کو ان سے بے حد محبت تھی۔ ان کے یہ لائق شاگرد استاد کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ علامہ محمد افضل نے ان کی وفات پر انتہائی حزن و ملال کا اظہار کیا اور بے حد مغموم رہنے لگے۔ غم و اندوہ کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چالیس روز تک مسکرائے بھی نہیں' بالآخر چالیس روز کے بعد خود بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی تاریخ وفات ۱۹ / ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ / ۲ / مارچ ۱۶۵۲ء ہے۔ چوراسی (۸۴) سال سے زائد عمر پائی۔ جون پور کے محلہ چوچک پور میں دفن کیے گئے ❶۔

۱۱۴۳- قاضی محمد افضل لاہوری

قاضی محمد افضل حنفی لاہوری' شیخ اور عالم تھے۔ ان کا شمار فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ شیخ ابوتراب بن نجیب الدین شیرازی سے اخذ طریقت کیا تھا۔ قاضی محمد افضل سے خلق کثیر فیض یاب ہوئی۔ ۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۱ء کو لاہور میں فوت ہوئے ❷۔

❶ سبحۃ المرجان' ص ۵۴- تذکرہ علمائے ہند' ص ۱۸۱- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۵۹- تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۱۱' ۱۲' ۱۷- ابجد العلوم ص ۹۰۲-

❷ خزینۃ الاصفیا' ص ۹۸۸- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۶۱-

Marfat.com

۱۱۴- قاضی محمد حسین جون پوری

قاضی محمد حسین ہندوستان کے مشہور مرکز علم و تحقیق جون پور کے باشندے تھے۔ ان کا شمار اپنے دور کے بڑے بڑے علما و فقہا کے زمرے میں ہوتا تھا۔ فقہ و اصول میں انھیں بہرۂ وافر حاصل تھا۔ شاہ جہان بادشاہ کے عہد حکومت میں جون پور کے منصب قضا پر متمکن ہوئے۔ اورنگ زیب عالم گیر تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے اوائل عہد حکومت میں انھیں الہ آباد منتقل کر دیا اور وہاں کی مسند قضا ان کے سپرد کی۔ اس کے بعد ان کے منصب میں اضافہ کر کے فوج کے محکمہ احتساب پر متعین کر دیا گیا۔

قاضی محمد حسین جون پوری علمائے برصغیر کی اس بلند بخت جماعت میں شامل تھے، جنھوں نے ''فتاویٰ ہندیہ'' یعنی فتاویٰ عالم گیری کی تدوین و تصنیف میں تحقیق و کاوش کے جوہر دکھائے۔ فرحت الناظرین کے مصنف محمد اسلم انصاری پسروری نے ان کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے:

از علم و ہنر بہرۂ وافر داشت ❶۔

(یعنی قاضی محمد حسین جون پوری علم و فن کے بہرۂ وافر سے سعادت اندوز تھے۔)

تذکرہ علمائے ہند میں ان کے تذکرہ و تعارف کے سلسلے میں یہ الفاظ مرقوم ہیں:

قاضی محمد حسین جون پوری از علم و فضل نصیبے وافر داشت۔ در عہد شاہ جہانی قاضی جون پور بود، در اوائل عہد عالم گیر بہ قضائے الہ آباد ممتاز شدہ۔ و در سن ہفتم جلوس عالم گیر بہ حضور آمدہ۔ بہ اضافۂ منصب و احتساب لشکر سرفراز گردید و در تالیف فتاویٰ عالم گیری بسے سعی نمودہ ❷۔

(قاضی محمد حسین جون پوری علم و فضل میں حصۂ وافر رکھتے تھے۔ شاہ جہان کے عہد حکومت میں جون پور کے قاضی تھے۔ عالم گیر کے آغازِ عہدِ بادشاہت میں الہ آباد کے قاضی مقرر ہوئے اور ساتویں سال جلوس میں عالم گیر کے حضور آئے۔ اضافۂ منصب سے سرفراز کیے گئے اور محتسب لشکر کی حیثیت سے ان کا تقرر کیا گیا۔ فتاویٰ عالم گیری کی تالیف میں بڑی علمی اور تحقیقی کوششیں کیں۔)

مآثر عالم گیری سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی محمد حسین جون پوری کی وفات ۱۰۸۰ھ/ ۱۶۶۹ء میں ہوئی۔ کیوں کہ جلوس عالم گیری کے تیرھویں سال یعنی ۱۰۸۰ھ/ ۱۶۶۹ء کے واقعات کے ضمن میں لکھا گیا ہے کہ:

''قاضی محمد حسین کے انتقال کی وجہ سے سید احمد خاں پسر سید محمد قنوجی کو خدمت احتساب عنایت ہوئی۔ جو اہل دربار، حضور شاہی میں ہاتھ سر پر رکھ کر آداب بجالانے کے لیے جھکتے تھے، ان کو حکم ہوا کہ مسنون طریقے پر سلام کیا کریں ❸۔''

---

❶ فرحت الناظرین، ص ۸۴۔

❷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷۵۔

❸ مآثر عالم گیری، ص ۹۴۔

Marfat.com

نزہۃ الخواطر میں ان کی وفات کے متعلق یہ الفاظ مرقوم ہیں:

مات فی الثالث عشر من جلوس عالمگیر علی سریر الملك نحو ست و سبعین والف❶۔

(یعنی عالم گیر کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے تیرھویں سال ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء کے قریب فوت ہوئے۔)

نزہۃ الخواطر میں مرقوم یہ سال وفات صحیح نہیں معلوم ہوتا' کیوں کہ عالم گیر کا تیرھواں سال جلوس ۱۰۷۶ھ نہیں' ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء ہے۔ اس حساب سے ان کا سن وفات ۱۰۸۰ھ ہونا چاہیے۔

۱۱۵-مولانا محمد حسین کشمیری

مولانا محمد حسین کشمیری' شیخ اور فاضل بزرگ تھے' مشاہیر علما میں سے گردانے جاتے تھے۔ پٹنہ (عظیم آباد) کے منصب افتا پر متعین تھے' سلسلہ تدریس بھی جاری تھا۔ عرصے تک اقلیم ہند کے اس شہر کی مسند درس وافتا پر فائز رہے۔ معارف دینیہ کے مختلف گوشوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور اس موضوع کے مشکل اور اہم مسائل کی عمدہ انداز سے عقدہ کشائی کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں صبح صادق کے مصنف مرزا محمد صادق اصفہانی شامل ہیں۔ اس کا ذکر انھوں نے خود ہی اپنی کتاب (صبح صادق) میں کیا ہے۔ مولانا محمد حسین کشمیری نے ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء کو سفر آخرت اختیار کیا❷۔

۱۱۶-مفتی محمد خلیل جون پوری

جون پور کے ایک جید عالم دین مفتی محمد خلیل بن شمس الدین صدیقی برونوی جون پوری تھے' جو شیخ وقت اور فقیہ عصر تھے۔ ان کے والد مفتی شمس الدین صدیقی برونوی جون پوری (متوفی ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء) بھی فحول علما اور صنادید وقت میں سے تھے' ان کے علم وفضل سے متاثر ہو کر بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے انھیں اپنے بیٹے پرویز کا اتالیق مقرر کیا تھا اور وہ عرصے تک الہ آباد اور جون پور کے مفتی رہے تھے۔ یہی مفتی شمس الدین جون پوری ہیں، جن کے سامنے صاحب ''شمس البازغہ'' علامہ محمود عمری جون پوری اور صاحب ''رشیدیہ'' شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری نے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل کیا تھا۔ مفتی محمد خلیل نے بھی اپنے والد سے اخذ علم کیا اور مرتبہ فضیلت کو پہنچے۔ اس زمانے میں ظاہری علوم کے ساتھ باطنی علوم کا حصول بھی ضروری تھا اور

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۶۴۔

❷ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۶۶' ۳۶۷۔ بحوالہ صبح صادق۔

Marfat.com

علمائے دین تصوف وطریقت سے بھی بہرہ ور ہوتے تھے' مفتی محمد خلیل نے بھی اس طرف توجہ کی اور رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری سے (جو ان کے پھوپھی زاد بھائی تھے) کسب طریقت کیا۔ حصول علم کے بعد اپنے بھائی مفتی محمد صادق بن مفتی شمس الدین کی جگہ مسند افتا کو زینت بخشی اور عمر بھر اس منصب پر متمکن رہے۔ ساتھ ہی درس وتدریس میں بھی سرگرم رہے۔ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم دین تھے۔ لوگوں کی بڑی تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ جمعرات کے روز ۲۹ رذی الحجہ ۱۰۷۹ھ/ ۲۰ رمئی ۱۶۹۹ء کو جون پور میں فوت ہوئے اور اپنے بھائی محمد صادق جون پوری کے قبرستان میں دفن کیے گئے ❶۔

۱۱۷- شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری

ان کا پہلا نام محمد رشید تھا اور وہ اسی نام کو پسند کرتے اور مراسلات ومکاتبات میں لکھتے تھے' تذکرہ نگاروں میں سے بعض حضرات انھیں عبدالرشید عثمانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور بعض محمد رشید عثمانی کے نام سے! چونکہ شیخ ممدوح خود اپنے آپ کو محمد رشید لکھتے ہیں' اس لیے ہم بھی انھیں اسی نام سے موسوم کریں گے۔

شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری گیارھویں صدی ہجری کے اقلیم ہند کے ممتاز عالم دین' نامور فقیہ اور مشہور مصنف تھے۔ تحقیق وتدقیق اور علوم میں بالغ نظری اور جامعیت میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ عالم کبیر' علامہ دوراں اور شیخ وقت تھے۔ عدیم النظیر فقیہ اور بے مثال اصولی تھے۔ تصوف وسلوک میں بھی خاص انفرادیت کے حامل تھے۔ مشہور بزرگ شیخ کبیر سری بن مفلس سقطی عثمانی کی اولاد سے تھے۔

شیخ محمد رشید عثمانی ۱۰ ذی القعدہ ۱۰۰۰ھ/ ۸ راگست ۱۵۹۲ء کو موضع ''برونہ'' میں پیدا ہوئے جو اعمال جون پور میں ایک قریہ تھا۔ ان کی والدہ معروف عالم وصوفی شیخ نورالدین بن عبدالقادر صدیقی برونوی کی صاحب زادی تھیں۔ محمد رشید نے ننھیال میں پرورش پائی تھی اور کم عمری ہی میں حصول علم سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ قرآن مجید اپنے قابل احترام نانا شیخ نورالدین صدیقی برونوی سے پڑھا' کتابت بھی انہی سے سیکھی' علم صرف کی کچھ کتابیں اور علم نحو کی لب' الارشاد اور کافیہ کی تعلیم بھی انہی سے حاصل کی۔

مختلف مروجہ علوم وفنون کی کتابیں شیخ قاسم' شیخ مبارک مرتضیٰ' شیخ نور محمد مداری' شیخ محی الدین بن عبدالشکور' شیخ حبیب اسحاق' شیخ جمال کاکوروی' مولانا محمد لاہوری' شیخ عبدالعزیز' سید عبداللہ' مفتی شمس الدین برونوی اور شیخ محمد افضل عثمانی جون پوری وغیرہ سے پڑھیں۔ یہ حضرات اس دور کے جید علمائے کرام اور مشہور فضلائے عظام تھے' جو ملک کے مختلف مقامات میں سرگرم درس وتدریس تھے۔ سند حدیث شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحب زادۂ گرامی مفتی نورالحق دہلوی سے لی۔ ان سے صحیح بخاری' مصابیح اور مشکوٰۃ کا درس لیا۔ شیخ

❶ تجلی نور' ج ۲' ص ۶۷- تاریخ شیراز ہند جون پور' ص ۱۷۱- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۶۷-

Marfat.com

ممدوح نے تمام مروّج اور متداول علوم ملک کے عظیم القدر اساتذہ سے حاصل کیے اور ہر علم میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ ذہن بے حد رسا پایا تھا اور قوت اخذ بڑی مضبوط تھی۔ تمام علوم کے مختلف گوشے خاص ترتیب اور بہترین انداز کے ساتھ حافظے میں محفوظ تھے۔

اس زمانے میں علمائے کرام بعض مروّج سلاسل تصوف کے مطابق علم طریقت بھی حاصل کرتے تھے اور مشہور صوفیا میں سے رّوحانی رشد و ہدایت کے لیے کسی بڑے صوفی کے دروازے پر دستک دیتے تھے۔ شیخ محمد رشید جون پوری نے بھی اخذ طریقت کیا۔ ان کے والد گرامی شیخ مصطفیٰ عثمانی جون پوری بہت بڑے عالم دین اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ہونہار بیٹے نے زمانہ طفولیت ہی میں عظیم باپ کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کر لی تھیں اور خرقہ طریقت حاصل کر لیا تھا، لیکن آگے چل کر وہ اس طرح علمی و تحقیقی ہنگاموں میں سرگرم ہوئے کہ صرف اذکار و اشغال کو مرکز التفات ٹھہرا لینا ممکن نہ رہا اور عنانِ توجہ حصولِ علم ہی کی طرف مرکوز رکھی۔

یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک شیخ طریقت طیب بن معین بنارسی (متوفی ۸ شوال ۱۰۴۰ھ/ ۳۰ر اپریل ۱۶۳۱ء) سے بنارس کے قریب ایک گاؤں ''منڈواڈیہ'' میں ان کی ملاقات ہوئی۔ ایک روز ان کے پاس رہے اور علمی بحث و اشغال کو ترک کر کے مستقل طور پر سلوک و طریقت کی وادیوں میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر کی، لیکن شیخ طیب نے اس سے اتفاق نہ کیا اور بہ دستور علمی و تحقیقی مساعی کو جاری رکھنے پر زور دیا۔ چنانچہ شیخ محمد رشید دوبارہ جون پور آ گئے اور اپنے آپ کو مزید حصولِ علم کے لیے وقف کر دیا۔ جب علم کی تمام اصناف میں پختہ ہو گئے تو شیخ طیب کی خدمت میں دوبارہ منڈواڈیہ گئے اور باقاعدہ اخذ طریقت کیا۔ شیخ طیب نے ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۱ء میں ان کو اپنا خلیفہ بنایا اور وثیقۂ خلافت مرحمت کیا۔

شیخ محمد رشید جون پوری نے طویل مدت تک ہنگامہ درس و افادہ بپا کیے رکھا، لیکن بعد میں اسے ترک کر کے مطالعہ کتب حقائق میں مشغول ہو گئے۔ بالخصوص شیخ محی الدین ابن عربی کی تصانیف کو مطمحِ نظر ٹھہرایا اور اس میں یہاں تک آگے نکل گئے کہ ابن عربی کی جو عبارات بظاہر محل طعن نظر آتی ہیں، ان کو محامل حسنہ پر محمول کرتے اور ثابت کرتے کہ وہ اپنے اندر درحقیقت اچھائی اور عمدگی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔

شیخ محمد رشید بڑے خوددار اور بلند کردار عالم تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ امرا و اغنیا کے دروازوں پر جانے سے احتراز کرتے اور ان سے میل جول اور اختلاط کو علمی وقار کے منافی سمجھتے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب بادشاہ ہندشاہ جہان کو ان کے علم و ادراک کی ہمہ گیری اور جامعیت کا علم ہوا تو اس نے اپنی علم پروری اور علما دوستی کی بنا پر ان سے ملنا چاہا اور ایک مکتوب کے ذریعے اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی مگر اس بوریا نشین عالم نے ہندوستان کے عظیم بادشاہ کو ملنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ وہ کسی بادشاہ یا امیر مملکت کے ہاں جانے کے لیے اپنے زاویہ اور خانقاہ سے باہر قدم نہیں نکالیں گے۔

Marfat.com

شیخ محمد رشید کتاب و سنت کی روشنی میں بعض امور پر سختی سے عامل تھے۔ مثلاً سری نمازوں میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھتے تھے، فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان تھوڑی دیر اضطجاع کرتے یعنی دائیں جانب لیٹتے تھے۔ وفات سے پہلے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ موجودہ زمانے کے رواج کے مطابق موت کے بعد انھیں عمامہ نہ پہنایا جائے، نہ ایصال ثواب کی غرض سے کوئی چارپایہ ذبح کر کے اس کا گوشت پکایا اور تقسیم کیا جائے، نہ تین دن سے زیادہ افسوس کیا جائے اور نہ پختہ قبر بنائی جائے، مٹی کی کچی قبر بنائی جائے۔

شیخ ممدوح اونچے مرتبے کے مصنف بھی تھے۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کتابیں تصنیف کیں۔ خالص علمی اور فنی کتابیں بھی لکھیں اور تصوف و سلوک کے بارے میں بھی کچھ کتابیں یادگار چھوڑیں۔ ان کی تصانیف میں ایک کتاب ''رشیدیہ'' ہے جو فن مناظرہ سے متعلق ہے۔ اس کتاب کو اہل علم میں بڑی شہرت و قبولیت حاصل ہوئی، اسے باقاعدہ کتب درسیہ میں شامل کیا گیا۔ علما نے اسے اعتنا و تلقی سے نوازا اور تعلیق و تحشیہ اور تدریس و تعلیم کے لیے منتخب کیا۔ شرح ہدایۃ الحکمۃ اور شیخ اکبر کی اسرار الخلوق پر شرح سپرد قلم فرمائی۔ عربی زبان میں خلاصۃ النحو کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ فارسی زبان میں زاد السالکین اور مقصود الطالبین ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں شرح مختصر عضدی پر حواشی لکھے۔ علم نحو کی مشہور درسی کتاب کافیہ کا فارسی زبان میں حاشیہ لکھا۔ ابن عربی کے کلام کے بعض حصوں کا محکوم مربوط کے نام سے ترجمہ کیا۔ بہت سے اشعار پر مشتمل ان کا ایک دیوان بھی ہے۔ شمسی تخلص کرتے تھے۔ شیخ محمد رشید کے ملفوظات بھی ہیں جو شیخ نصرت جمال ملتانی نے گنج ارشدی میں جمع کیے ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ مودود بن محمد حسین جون پوری نے بھی ان کے ملفوظات کا ایک مجموعہ تیار کیا۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس عظیم المرتبت عالم نے تراسی (۸۳) سال عمر پا کر جمعۃ المبارک کے روز ۹ رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ/ ۱۹ دسمبر ۱۶۷۲ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

ان کی وفات بھی عجیب طرح واقع ہوئی۔ فجر کی سنتوں سے فارغ ہو کر فرض پڑھنے لگے تھے کہ تکبیر تحریمہ میں داعی حق کا بلاوا آ گیا[1]۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

۱۱۸- قاضی محمد زاہد کابلی

قاضی محمد زاہد کابلی، شیخ فاضل اور علامہ تھے۔ بادشاہ ہند جہاں گیر کے عہد میں کابل کے قاضی مقرر ہوئے اور اس کے بیٹے شاہ جہان کے عہد تک اس اہم منصب پر فائز رہے۔ بہت بڑے عالم، فقہ و اصول اور

[1] عمل صالح، ج ۳، ص ۲۹۱- مآثر الکرام دفتر اول، ص ۱۹۱، ۱۹۲- سبحۃ المرجان ص ۶۶، ۶۷- تجلی نور، ج ۱، ص ۱، ۲، ۷- ابجد العلوم، ص ۹۰۳- خزینۃ الاصفیا، ص ۴۷۳، ۴۷۴- قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب، ص ۱۹۹، ۲۰۰- تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۱۹- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۶۷ تا ۳۷۰- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۸۴، ۸۵- حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۸- تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۶۴۶ تا ۶۴۸- برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، ص ۳۰۳ تا ۳۰۵۔

Marfat.com

علوم عربیہ کے ماہر اور دیگر فنون مروجہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ متقی اور متورع تھے۔ ہر وقت خدمت علم میں مصروف رہتے۔ ساتھ ہی طلبا کو طریقہ ظاہری کی تلقین فرماتے اور صلاح وتقوی کا درس دیتے ــــ شاہ جہان کے تیسرے سال جلوس میں فوت ہوئے' جو ۱۰۳۹ھ/۱۶۳۰ء بنتا ہے ❶۔

۱۱۹- شیخ محمد سعید سرہندی

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے صاحب زادے خواجہ محمد صادق تھے جو عین عالم جوانی میں بعارضہ طاعون وفات پا گئے تھے۔ دوسرے خواجہ محمد سعید تھے' تیسرے بیٹے کا اسم گرامی شیخ محمد معصوم تھا۔ یہ حضرت مجدد کے دوسرے خلیفہ' عروۃ الوثقیٰ اور قیوم ثانی تھے۔ سب سے چھوٹے بیٹے شیخ محمد یحییٰ تھے جو شاہ جیو کے عرف سے معروف تھے۔

شیخ محمد سعید ماہ شعبان ۱۰۰۵ھ/مارچ ۱۵۹۷ء میں سرہند میں پیدا ہوئے اور بعض کتب درسیہ اپنے بڑے بھائی شیخ محمد صادق سے پڑھیں۔ زیادہ تر کتابیں شیخ محمد طاہر لاہوری سے پڑھیں۔ اپنے والد حضرت مجدد الف ثانی سے بھی تحصیل کی۔ ان سے اور شیخ عبدالرحمٰن رمزی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ طویل عرصے تک اپنے والد محترم سے وابستہ رہے اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ شیخ مجدد نے آخر عمر میں ان کو طریقت وسلوک کی منزلیں طے کرانے کی غرض سے درس و تدریس کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرا یہ بیٹا علمائے راسخین میں سے ہے۔ انھیں خرقہ طریقت و خلافت عطا کیا اور ''خازن رحمت'' کے لقب سے ملقب فرمایا۔ لیکن والد کی وفات کے بعد شیخ محمد سعید مسند مشیخت سے علیحدہ ہو گئے تھے اور یہ خدمت اپنے چھوٹے بھائی شیخ محمد معصوم کے سپرد کر دی تھی۔ اس کے بعد ارض حجاز گئے اور حج وزیارت کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ پھر ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں واپس ہندوستان تشریف لائے اور تدریس وتلقین میں مصروف ہو گئے۔

شیخ محمد سعید سرہندی اپنے عظیم باپ حضرت مجدد الف ثانی کے تربیت یافتہ تھے اور عالم و فاضل' محدث وفقیہ اور شیخ و مصلح تھے۔ تصنیف وتالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ مشکوۃ کا حاشیہ سپرد قلم کیا اور جن احادیث کو ائمہ حنفیہ اپنا مآخذ قرار دیتے ہیں' ان کی تحقیق اور مسائل حنفیہ کے اثبات میں بے حد محنت کی ــــ اس ضمن میں زبدۃ المقامات میں مرقوم ہے۔

مشکوٰۃ المصابیح کہ دراں بہ تحقیق صحت وقوت آں احادیث کہ ماخذ ائمہ حنفیہ است' غایت سعی مبذول داشتہ اند ❷۔

ایک رسالہ تشہد میں عدم رفع سبابہ کے موضوع پر لکھا۔ اس مسئلے میں مذہب حنفیہ کی تائید کی

❶ عمل صالح' ج۱' ص ۲۴۸' ۲۴۹- بادشاہ نامہ' ج۲' ص ۳۴۳- نزہۃ الخواطر' ج۵' ص ۳۷۱-

❷ زبدۃ المقامات' ص ۳۱۰-

Marfat.com

ہے۔ شرح عقائد کے حاشیہ خیالی پر ایک حاشیہ تحریر کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کتابیں تصنیف کیں۔ مختلف اہم علمی شخصیتوں اور ارباب حکومت کے نام مکتوبات تحریر کیے۔ بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے نام بھی کئی خطوط لکھے۔ مکتوبات کا مجموعہ ''مکتوبات سعیدیہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

بہرحال شیخ محمد سعید سرہندی اپنے دور کے نامور عالم اور مشہور صاحب سلوک بزرگ تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور دیگر علوم متداولہ کے ماہر تھے۔ درس و تدریس میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ تفسیر بیضاوی، عضدی اور شرح حکمۃ العین وغیرہ باقاعدہ طلبا کو پڑھاتے تھے۔ ۲۷ر جمادی الاخریٰ ۱۰۷۰ھ/ ۲۹ر فروری ۱۶۶۰ء کو فوت ہوئے ❶۔

۱۲۰- شیخ محمد سعید ہندی

شیخ الحاج محمد سعید ہندی، اپنے عصر کے فاضل اور علامہ تھے، تحقیق و تدقیق مسائل میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ متورع اور متقی عالم دین تھے۔ معارف الٰہیہ کے ماہر تھے۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور بعض علماء نے عمامہ اور طیلسان پہننے کا جو التزام کر رکھا تھا، اس کی پروا نہ کرتے تھے، نہ اس قسم کے تکلفات کے عادی تھے۔ احتیاط اور تورع کا یہ عالم تھا کہ اپنے والد کے گھر کا کھانا نہیں کھاتے تھے، اس لیے کہ وہ بادشاہ کی سلک ملازمت میں منسلک تھے اور یہی خدمت شاہی ان کی آمدنی کا ذریعہ تھی۔ والد کی وفات کے بعد ان کو مال وراثت کا حصہ ملا۔ اسی وقت سفر حجاز پر روانہ ہو گئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ ہندوستان واپس آئے تو درس و افادہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ملوک و سلاطین کے درباروں میں بالکل نہ جاتے اور علمی و تدریسی کام میں مشغول رہتے۔ اس زمانے میں شاہ جہان تخت ہند پر متمکن تھا۔ وہ ان کا بہت معتقد اور ان کے فضل و کمال کا مداح تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ان سے ملنا چاہا اور علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کو انھیں بلانے کے لیے بھیجا مگر انھوں نے دربار میں جانے اور بادشاہ سے ملنے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، بیضاوی کے کئی اجزا پر حاشیہ لکھا ❷۔

۱۲۱- مفتی محمد شریف الہ آبادی

مفتی محمد شریف حسینی الہ آبادی کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین

---

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: زبدۃ المقامات، ص ۳۰۸ تا ۳۱۵- حضرات القدس- تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۹۰، ۲۷۵- حدائق الحنفیہ، ص ۴۱۷- رود کوثر، ص ۳۳۳ تا ۳۳۶- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۳۶، ۳۳۷- خزینۃ الاصفیا، ص ۶۳۸، ۶۳۹- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۵۲ تا ۵۴-

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۷۲-

Marfat.com

میں ہوتا تھا۔ شہر الہ آباد کے منصب قضا پر متمکن تھے۔ جامع صفات عالم اور منبع فیوض شیخ تھے۔ علم و عمل، صلاح و تقوی، ورع و عفاف اور حسن اخلاق کے حامل تھے۔ دینی و شرعی معاملات میں صلابت ان کی خصوصیت تھی۔ احکام الٰہی کے اجرا میں جری اور بے خوف تھے۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی مداہنت اور نرمی کے قائل نہ تھے۔ بڑے سے بڑے سخت گیر اور ظالم حکمران کے سامنے بھی اللہ کے فرمان بلا جھجک بیان کرتے اور اس کی سختی کو بالکل خاطر میں نہ لاتے ____ ماہ صفر ۱۰۳۵ھ/نومبر ۱۶۲۵ء میں الہ آباد میں فوت ہوئے اور وہیں اپنے گھر میں دفن کیے گئے ❶۔

۱۲۲- قاضی محمد شریف صدیقی گجراتی

قاضی محمد شریف بن محمد فرید صدیقی گجراتی، حنفی المسلک تھے۔ علاقہ گجرات کے شیخ، فاضل اور عالم کبیر تھے۔ فقہ و اصول کے ماہر علما میں سے تھے۔ گجرات کی مسند درس و افادہ پر فائز تھے۔ شیخ احمد بن سلیمان گجراتی (متوفی ۱۶ شعبان ۱۰۲۴ھ/۳۱ راگست ۱۶۱۵ء) نے اکثر کتب درسیہ انہی سے پڑھیں ❷۔

۱۲۳- علامہ محمد شفیع یزدی

علامہ محمد شفیع یزدی، کتب رجال اور تذکروں میں ملا شفیعا یزدی کے نام سے معروف ہیں۔ یہ اقلیم ہند کے مشہور فضلا میں سے تھے۔ ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء کو شاہ جہان بادشاہ کے زمانے میں تجارت اور سیاحت کی غرض سے بحری راستے سے ہندوستان آئے اور سورت میں داخل ہوئے۔ آتے ہی ملک کے حلقۂ علما میں مشہور ہو گئے۔ جب ان کے فضل و کمال کی شہرت بادشاہ تک پہنچی اور اسے پتا چلا کہ شفیعا یگانۂ روزگار اور عراق و خراسان کے نامور علما میں سے ہیں تو وہ واپس وطن جانے کے لیے سورت کی بندرگاہ میں پہنچ چکے تھے۔ بادشاہ نے سفر خرچ اور زادراہ کے لیے پانچ ہزار روپے دے کر آدمی بھیجے۔ بہت ہی خواہش اور اعزاز کے ساتھ اپنے ہاں بلایا اور بے حد احترام و تکریم سے پیش آیا۔ بڑی نوازشیں کیں اور مال و دولت سے نوازا۔

اس زمانے میں حکمرانوں کو علما کے درمیان مباحثوں اور مناظروں کی مجلسیں منعقد کرانے کا بہت شوق تھا۔ شاہ جہان چونکہ خود صاحب علم و فضل تھا، اس لیے اس نے دیار ہند کے جن بڑے بڑے علما سے ذاتی تعلقات استوار کر رکھے تھے، ان میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو اولیں درجہ حاصل تھا۔ مولانا سیالکوٹی ممتاز عالم اور نہایت محقق و مدقق بزرگ تھے۔ بادشاہ نے ملا شفیعا یزدی کے امتحان اور مناظرے کے لیے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو بلایا۔ بلاشبہ دونوں بے مثال فاضل تھے۔ مجلس مباحثہ شروع ہوئی۔ دونوں کے درمیان سورہ فاتحہ کی

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۷۴۔ وفیات الاعلام از شیخ محمد یحییٰ عباسی۔

❷ مرآۃ احمدی، ج ۲، ص ۶۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۷۵۔

Marfat.com

آیت: ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ کی تفسیر پر گفتگو کا آغاز ہوا۔ حکم اور ثالث علامی سعد اللہ خاں کو مقرر کیا گیا جو شاہ جہان کے وزیر اور برصغیر کے جلیل القدر عالم اور نامور فاضل تھے۔ دونوں فضلائے عصر کے درمیان معیاری گفتگو ہوئی اور دلچسپ علمی نکتے بیان کیے گئے۔

شاہ جہان بادشاہ نے ملا شفیعا یزدی کے اسلوب کلام اور انداز تقریر کو بہت پسند کیا اور ان کی جامعیت علم سے متاثر ہو کر مقربین دربار میں شامل فرمایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بڑی نوازشیں ہوئیں اور فراوانئ معلومات کی بنا پر دانشمند خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ تین ہزاری منصب اور بخشی گری کی خلعت سے نوازے گئے۔ ان کے مناصب میں برابر اضافہ ہوتا رہا' پانچ ہزاری منصب کو پہنچے۔ شاہ جہان کے آخری ایام حکومت میں ملا محمد شفیعا یزدی ان مناصب اور خدمت شاہی سے الگ ہو گئے تھے اور دہلی میں گھر کے گوشۂ عافیت میں بیٹھ گئے تھے۔

شاہ جہان کے بعد اورنگ زیب عالم گیر تخت نشین ہوا تو ملا شفیعا یزدی پھر جلوہ گر ہوئے اور عالم گیر کی نوازشہائے پیہم کے مستحق قرار پائے۔ ۱۰۷۸ھ/ ۱۶۶۷ء کو امیر بخشی گری کے عہدے پر فائز کیے گئے اور تا زندگی یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ علاوہ ازیں مسلسل چار ہزاری اور پانچ ہزاری منصب کو پہنچے۔ بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے ان سے بعض علمی اور دینی کتابیں پڑھیں۔ امام غزالی کی احیاء علوم الدین شروع سے آخر تک پوری پڑھی۔ گویا یہ اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے استاد تھے۔

علامہ محمد شفیعا یزدی (دانشمند خاں) کے علم و فضل اور بحر تحقیق میں غواصی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندو' عیسائی اور افرنگی اہل علم کثیر تعداد میں ان کی خدمت میں آتے' ان کی جامعیت علم سے مستفید ہوتے اور مختلف علوم و فنون کے بارے میں مذاکرات کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس طرح ان کا حلقہ تعارف اور دائرۂ اثر بہت بڑھ گیا تھا اور وہ اہل علم کے لیے مرکز و مرجع کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ فلسفہ' تاریخ اور عمرانیات میں بالخصوص وسیع المعلومات اور کثیر المطالعہ تھے اور مختلف زبانوں کے جید عالم اور بہت بڑے فاضل۔!

ارض ہند کے اس نامور حکیم و مفکر اور ممتاز عالم دین نے ۱۰ ربیع الاول ۱۰۸۱ھ/ ۱۸ جولائی ۱۶۷۰ء کو عہد عالم گیری میں وفات پائی ❶۔

۱۲۴۔ مولانا محمد صادق جون پوری

مولانا محمد صادق بن ابو البقا بن محمد درویش حسینی واسطی جون پوری کی جائے ولادت اور مقام نشو و نما

❶ عمل صالح' ج ۳' ص ۲۹۸' ۲۹۹۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۹۵' ۹۶۔ مآثر عالم گیری' ص ۹۶۔ مآثر الامرا' ج ۲ (اردو ترجمہ)' ص ۲۹ تا ۳۱۔ بزم تیموریہ' ص ۲۲۶' ۲۲۷۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۲۷۵' ۲۷۶۔ برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ' ص ۲۵۳' ۲۵۴۔

Marfat.com

جون پور ہے۔ اپنے والد شیخ ابوالبقا سے تحصیل کی اور اونچے مرتبے کے علما وفضلا میں شمار ہوئے۔ بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر سے تقرب حاصل ہوا تو اس نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے محمد معظم کا معلم مقرر کر دیا۔ شہزادہ محمد معظم عرصہ تک ان سے تعلیم حاصل کرتا رہا۔ پھر جب وہ وارث ہند ہوا تو انھیں جہاں گیر نگر (ڈھاکہ) میں ایک قطعۂ اراضی عنایت کیا اور وہ وہاں سے (ڈھاکہ) چلے گئے۔

علوم وفنون پر ان کی گہری نظر تھی، چنانچہ ''شرح زنجانی'' اور ''شرح مائۃ عامل'' کتابیں لکھیں۔ فن مناظرہ میں ''الآداب الصادقہ'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور (ہندوستان) میں موجود ہے۔ فن مناظرہ کی ایک اور کتاب ''العضدیہ'' پر حاشیہ تحریر کیا____ اس عالم دین نے ڈھاکہ میں وفات پائی، جس کو اس زمانے میں ''جہاں گیر نگر'' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا[1]۔

۱۲۵- مفتی محمد صادق جون پوری

مفتی محمد صادق بن شمس الدین صدیقی برونوی جون پوری، جلیل القدر عالم تھے۔ انھوں نے بعض کتب درسیہ اپنے والد مکرم مفتی شمس الدین صدیقی برونوی جون پوری (متوفی ۱۰۴۷ھ/ ۱۶۳۷ء) سے پڑھیں۔ زیادہ تر درسی کتابوں کی تعلیم کے لیے علامہ محمود عمری جون پوری (متوفی ۹ر ربیع الاول ۱۰۶۲ھ/ ۹ر فروری ۱۶۵۲ء) کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیے، اور اپنے عصر اور علاقے کے مشاہیر علما وفقہا میں سے گردانے گئے۔ بحث واشغال میں انتہائی محنت سے کام لیتے تھے، علم کی تمام شاخوں سے بہرہ ور تھے۔ فتویٰ اور تدریس کی اعلیٰ صلاحیتیں ان میں پائی جاتی تھیں، اسی بنا پر اپنے رفیع القدر والد مفتی شمس الدین صدیقی جون پوری کی جگہ مسند افتا پر فائز کیے گئے۔

شیخ محمد صادق جون پوری، ورع وتقویٰ کے زیور سے آراستہ، قناعت وعفاف کی دولت سے مالا مال اور عبادت وتدین کے پیکر تھے۔ ہمیشہ سرگرم درس وافادہ رہتے۔ مدرسہ اور مسجد کے سوا اور کہیں نہ جاتے۔ کسی سے کوئی شی بطور نذرانہ یا تحفہ قبول نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ ان کے والد مفتی شمس الدین جون پوری کے ایک شاگرد، رکن الدین نے جو مدت کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور شائستہ خاں کے ندیموں میں سے تھے، ایک کشمیری شال تحفۃً پیش کی۔ یہ شال وہ اپنے شہر سے خاص جذبۂ عقیدت کے ساتھ ان کے لیے لائے تھے، مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا:

ومن دلق را بہ اطلس شاہاں نمی خرم۔

(میں اپنی گدڑی میں اس شاہی اطلس سے زیادہ خوش ہوں۔ فقیر کو گدڑی کافی ہے۔)

زہد وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ مشہور عالم اور اپنے استاد علامہ محمود عمری جون پوری کے پیچھے نماز نہ پڑھتے

---

[1] تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۲۹، ۳۰۷۔ تجلی نور، ج ۲، ص ۶۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۷۶۔

Marfat.com

تھے' کیوں کہ علامہ محمود فلسفہ اور اس کے متعلقات میں انتہائی غلو اور انہماک رکھتے تھے۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ جون پور کے امیر شہر نواب اللہ وردی خاں نے ان کو ایسے کاغذات پر مہر افتا ثبت کرنے کا حکم دیا' جن کے مندرجات غیر مشروع تھے' مفتی محمد صادق نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ امیر کو بڑا غصہ آیا اور انتقام لینے کے لیے بات دل میں رکھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ اللہ وردی خاں ایک سفر میں انھیں ساتھ لے گیا اور کشتی میں سوار کیا' خود بھی اسی کشتی میں سوار ہوا۔ کشتی جب وسط دریا میں پہنچی تو وہی کاغذات نکالے اور جبراً مہر تصدیق ثبت کرانا چاہی۔ مفتی ممدوح نے مجبوراً مہر امیر مذکور کے حوالے کر دی' لیکن جب امیر کاغذات پر مہر ثبت کرنے لگا تو کوشش کے باوجود مہر نمایاں نہ ہوئی۔ امیر نہایت شرمندہ ہوا اور ان کے ورع وتقویٰ کا اعتراف کیا۔

مفتی محمد صادق جون پوری نے ۴؍ ذی الحجہ ۱۰۶۸ھ/ ۲۲؍ اگست ۱۶۵۸ء کو جون پور میں وفات پائی ❶۔

۱۲۶۔ شیخ محمد صادق گنگوہی

شیخ محمد صادق بن فتح اللہ حنفی گنگوہی' دیار ہند کے مرکز علم وفضل بلدۂ گنگوہ کے باشندے تھے اور کبار مشائخ چشتیہ میں سے تھے۔ ولادت اور نشوونما گنگوہ ہی میں ہوئی' اپنے عم محترم شیخ ابوسعید گنگوہی سے اخذ طریقت کیا۔ ان کے بعد مسند ارشاد سنبھالی۔ بہت سے حضرات نے ان سے حصول علم اور کسب فیض کیا۔ اپنے زمانے کے شیخ صالح اور نامور فقیہ تھے۔ ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۷ء کو گنگوہ میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔ خزینۃ الاصفیا میں سن وفات ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۷ء مرقوم ہے اور نزہۃ الخواطر میں ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء۔ ❷!

۱۲۷۔ مولانا محمد صادق کشمیری

مولانا محمد صادق بن مولانا کمال الدین کشمیری' اپنے عصر اور شہر کے شیوخ میں سے تھے۔ دیار کشمیر اور خطہ ہند کے معروف عالم و مدرس مولانا کمال الدین کشمیری سیالکوٹی کے فرزند تھے۔ جامع علوم عقلیہ ونقلیہ اور مرتبہ تحقیق وتدقیق پر فائز تھے۔ فروع مذاہب پر عمیق نظر رکھتے تھے۔ منطق وحکمت اور طب کے ماہر تھے' فصیح البیان تھے اور مسائل شرعیہ کی عمدہ انداز سے وضاحت کرتے تھے۔ جہاں گیر بادشاہ نے ان کے علم وفضل کا شہرہ سنا تو دربار شاہی میں باریاب کیا اور اکابر علما کی صف میں جگہ دی۔ جب علمائے اہل سنت اور علمائے شیعہ کے

❶ تاریخ شیراز ہند جون پور' ص ۳۹ے ۴۰۷۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۱۷۷۔

❷ خزینۃ الاصفیا' ص ۴۵۹' ۴۶۰۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۱۷۷' ۱۷۸۔

Marfat.com

درمیان مباحثہ و معارضے کا سلسلہ شروع ہوا تو اہل سنت کی طرف سے شیعہ عالم ملا حبیب اللہ سے مناظرے کے لیے علمائے اہل سنت نے انہی مولانا محمد صادق کو منتخب کیا' اور دلائل کے زور سے اپنے حریف ملا حبیب اللہ کو خاموش کرا دیا۔ مولانا محمد صادق کشمیری ''ملا محمد صادق دانا'' کے عرف سے معروف تھے۔ کشمیر میں وفات پائی۔

مناظرے کا یہ واقعہ مولوی فقیر محمد جہلمی نے حدائق الحنفیہ میں نقل کیا ہے اور اس کے حوالے سے علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی نے بھی مولانا محمد صادق کشمیری کی طرف منسوب کیا ہے' جب کہ تاریخ کشمیر اعظمی کے مصنف شہیر خواجہ محمد اعظم کا کہنا ہے کہ جہاں گیر سے مولانا کمال الدین کشمیری کے فرزند مولانا محمد رضا نے تعلقات استوار کیے تھے' وہی ''حکیم دانا'' کے عرف سے معروف تھے اور شیعہ عالم ملا حبیب اللہ سے مناظرہ بھی انہی نے کیا تھا۔

صاحب تاریخ کشمیر اعظمی نے مولانا محمد صادق کا ذکر ''خواجہ محمد صادق سوز'' کے نام سے کیا ہے' انھیں کشمیر کے اکابر علما میں سے گردانا ہے اور لکھا ہے کہ وہ فقرا اور صوفیا کی صحبت میں رہنے لگے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کی مصاحبت بھی اختیار کر لی تھی۔ حضرت مجدد نے دو ایک مکتوب بھی ان کے نام تحریر فرمائے تھے۔ طبع موزوں رکھتے تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے ❶۔

ہمارے خیال میں اس سلسلے میں تاریخ کشمیر کے مصنف شہیر کی روایت کو ترجیح دینی چاہیے۔ مگر ہم نے یہاں دونوں روایتیں بیان کر دی ہیں۔

۱۲۸- شیخ محمد صالح سندھی

شیخ محمد صالح بن ابراہیم سندھی ثم لاہوری' شیخ صالح اور فقیہ نامور تھے۔ علم و معرفت کے یگانۂ روزگار مشائخ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بعض درسی کتابوں کی تحصیل مفتی رزق اللہ سے اور اکثر کتابوں کی دیگر علمائے مشاہیر سے کی۔ پھر خواجہ باقی باللہ کے فرزند خواجہ عبداللہ سے وابستگی اختیار کر لی اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ لاہور میں اقامت گزین رہے۔ حسن اخلاق کے مالک تھے۔ اہل علم میں بڑے مشہور اور مقبول تھے ❷۔

۱۲۹- شیخ محمد طاہر لاہوری

شیخ محمد طاہر بلدۂ لاہور کے مشاہیر افاضل میں سے تھے۔ خطۂ لاہور میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں تربیت پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور علمائے لاہور سے تحصیل علم کی۔ حصول علم کے بعد شیخ اسکندر بن عماد کیتھلی سے

❶ تاریخ کشمیر اعظمی' ص ۱۳۳' ۱۳۴- حدائق الحنفیہ' ص ۴۲۸- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۱۷۸-

❷ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۱۸۰ بحوالہ اسراریہ-

Marfat.com

بیعت ہوئے۔ بعدازاں شیخ عبدالاحد سرہندی کی صحبت اختیار کی۔ پھر ان کے نامور فرزند حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے منسلک ہوئے اور اخذ طریقت کیا۔ لاہور ہی کو مسکن ٹھہرائے رکھا اور درس وافادہ میں مشغول رہے۔ ان کے سلسلۂ درس و تدریس کی بڑی شہرت تھی۔ مجدد الف ثانی کے بیٹوں ــــــ شیخ محمد صادق، شیخ محمد سعید اور شیخ محمد معصوم سرہندی ــــــ نے بھی ان سے اخذ علم کیا۔ علما کی کثیر تعداد ان سے مستفید ہوئی۔

شیخ محمد طاہر لاہوری، قانع وعفیف اور متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔ عمر بھر گھر کی چاردیواری میں بیٹھ کر استفادے کا سلسلہ جاری رکھا، کبھی کسی صاحب ثروت اور امیر مملکت کے دروازے پر دستک نہیں دی۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابوں کی کتابت و تصحیح اور تحشیہ نویسی میں مصروف رہتے۔ ان کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی وہی ذریعہ اکل وشرب تھا ــــ لاہور کے اس پیکر زہد وتقویٰ عالم وفقیہ نے ۲۰ محرم ۱۰۴۰ھ / ۱۹ / اگست ۱۶۳۰ء کو لاہور میں وفات پائی ❶۔

۱۳۰- مفتی محمد طاہر کشمیری

مفتی محمد طاہر کشمیری اپنے عصر اور خطۂ کشمیر کے عالم وفقیہ اور شیخ تھے۔ فقہ، اصول اور علوم عربیہ میں منفرد شخصیت تھے۔ خطۂ کشمیر کے منصب افتا پر متعین تھے ❷۔

۱۳۱- شیخ محمد عاشق ہندی

شیخ محمد عاشق بن عمر ہندی، فضل وکمال میں مشہور تھے۔ مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری سے حدیث پڑھی۔ عالم اور فقیہ بزرگ تھے۔ صاحب تصنیف بھی تھے۔ شمائل ترمذی کی بڑی لطیف اور عمدہ شرح لکھی۔ ۱۰۳۳ھ / ۱۶۲۴ء کو فوت ہوئے ❸۔

۱۳۲- میر محمد علی کشمیری

میر محمد علی بن محمد نازک حسینی قادری کشمیری، شیخ صالح اور خیر وفضل سے متصف فقہائے ہند میں سے تھے۔ ارض کشمیر میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور اپنے والد گرامی قدر شیخ محمد نازک سے علم فقہ حاصل کیا۔

❶ زبدۃ المقامات، ص ۳۴۰- خزینۃ الاصفیا، ص ۵۸۵ تا ۵۸۷- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۸۱- تحقیقات چشتی، ص ۲۹۰ تا ۲۹۴-

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۸۲-

❸ حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۴- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۸۲، ۳۸۳-

Marfat.com

سلسلۂ قادریہ کے مطابق ان سے اخذ طریقت بھی کیا۔ پھر عازم سرہند ہوئے۔ اس زمانے میں مجدد الف ثانی کے فرزند شیخ محمد معصوم سرہندی کی مسند رشد و ہدایت آراستہ تھی' ان سے طریقہ نقشبندیہ کے مطابق کسب فیض کیا۔ بعد ازاں کشمیر کو مراجعت فرمائی اور خود ارشاد و ہدایت کی مسند بچھائی' ان سے بہت سے مشائخ کرام نے استفاضہ کیا۔۔۔ ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء کو سرزمین کشمیر میں فوت ہوئے ❶۔

۱۳۳۳۔ مولانا محمد فاضل بدخشی

مولانا محمد فاضل بدخشی لاہوری' عین القضاۃ ہمدانی کی اولاد سے تھے۔ روستاق کے باشندے تھے جو اعمال بدخشاں میں واقع ہے' اسی علاقے کے مختلف مقامات کے علما سے علم حاصل کیا۔ پھر کابل گئے جہاں مولانا محمد صادق حلوائی کا سلسلۂ درس جاری تھا' ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعد ازاں عازم توران ہوئے' وہاں اس عہد کے مشہور فاضل مرزا جان شیرازی اور ان کے تلمیذ رشید ملا کوسج سرگرم تدریس تھے' بہت سی کتابوں کی ان سے تحصیل کی۔ پھر وارد ہند ہوئے اور لاہور تشریف لائے۔ لاہور میں شیخ جمال الدین تلوی لاہوری کا ہنگامہ درس و افادہ بپا تھا' ان سے تفسیر اور اصول وغیرہ کی کتابیں پڑھیں اور علم و فضل کے مرتبہ بلند کو پہنچے۔ تخت ہند پر اس زمانے میں نورالدین محمد جہاں گیر متمکن تھا۔ مولانا محمد فاضل نے اس سے ملاقات کی۔ اس نے ان کے علم و فضل کی وجہ سے صوبہ پنجاب کی صدارت مرحمت فرمائی۔ اس کے لشکر کے میر عدل مقرر ہوئے۔ شاہ جہان بادشاہ کے آٹھویں سال جلوس تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر غالباً ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء کو اس خدمت سے استعفا دے دیا اور بادشاہ کی طرف سے جو وظیفہ ملتا تھا یا جو قطعہ اراضی حاصل تھا' اسی پر قانع ہو گئے۔

درس و تدریس ان کا اصل مشغلہ تھا۔ فاضل کبیر اور علامہ عصر تھے۔ کتابوں پر گہری نظر تھی۔ علما و طلبا کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء کو لاہور میں وفات پائی اور اسی شہر میں مدفون ہوئے ❷۔

۱۳۳۴۔ مولانا محمد قلی دہلوی

مولانا محمد قلی بن رستم نقشبندی کا مولد و مسکن دہلی ہے۔ شیخ عبدالباقی (باقی باللہ) کے نامور فرزند شیخ عبداللہ سے اخذ علم اور کسب طریقت کیا۔ طویل مدت تک ان سے منسلک رہے۔ شیخ صالح اور متورّع عالم دین تھے۔ ''سراج المشکوٰۃ'' ان کی تصنیف ہے' جس میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ''اشعۃ اللمعات'' کے فوائد و نوادر جمع کیے گئے ہیں۔ ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۰ء کو فوت ہوئے ❸۔

❶ خزینۃ الاصفیا' ص ۹۸۹۔ نزہۃ الخواطر ص ۳۸۳۔

❷ باشاہ نامہ' ج ۲' ص ۳۴۰۔ عمل صالح' ج ۳' ص ۲۹۹۔ مرآۃ العالم (قلمی)۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۸۴۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۲۰۶۔ مآثر الامرا' ج ۱' ص ۴۸۳۔

❸ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۸۶ بحوالہ اسراریہ۔

Marfat.com

۱۳۵-شیخ محمد معصوم سرہندی

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ کے سب سے بڑے بیٹے شیخ صادق تھے جو عالم جوانی میں بہ عارضہ طاعون وفات پا گئے تھے۔ بہت نیک، متقی اور عالم دین تھے۔ دوسرے بیٹے شیخ محمد سعید تھے، جو شعبان ۱۰۰۵ھ/ مارچ ۱۵۹۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء کو وفات پا گئے۔ ان کا مرتبہ علم وفضل اور مقام زہد و تقویٰ بہت بلند تھا۔ تیسرے فرزند شیخ محمد معصوم تھے، جو ۱۱ شوال ۱۰۰۷ھ (یا ۱۰۰۹ھ/ ۲۷/اپریل ۱۵۹۹ء یا ۱۶۰۱ء) کو متولد ہوئے۔ نہایت زاہد، متقی اور پرہیز گار تھے۔ علم وفضل کی دولت سے بھی بہرۂ وافر رکھتے تھے۔ علوم و معارف، انداز بیان، اسلوب کلام، تدین وتورّع، ہر بات میں اپنے جلیل القدر والد (شیخ احمد سرہندی) سے مشابہ تھے۔ چھوٹی عمر میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ گھر میں تصوف وطریقت کا چشمہ بہ رہا تھا، جس سے لاتعداد لوگ فیض پا رہے تھے، شیخ محمد معصوم نے بھی حصول علم واخذ فیض کا اولین سلسلہ گھر سے شروع کیا۔ بعض درسی کتابیں اپنے برادر کبیر شیخ محمد صادق سے پڑھیں اور زیادہ کتابوں کا درس اپنے عظیم المرتبت والد اور شیخ محمد طاہر لاہوری سے لیا۔

مجدد الف ثانی نے اپنے اس بیٹے کو تقویٰ و تدین اور علم وفضل کے مقامات عالیہ پر فائز ہونے کی بشارت دی تھی۔ باپ کی وفات کے بعد مسند ارشاد پر بیٹھے۔ حج وزیارت کی سعادت حاصل کی اور عرصے تک مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ حج کے بعد واپس ہندوستان آئے اور درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ زیادہ تر تفسیر بیضاوی، مشکوۃ، ہدایہ، عضدی اور تلویح پڑھاتے تھے۔

شیخ محمد معصوم سرہندی کی مساعئ فیض وہدایت کا سلسلہ بہت وسیع تھا۔ ان کی علمی وروحانی تگ وتاز سے جہالت کے اندھیرے ختم ہوئے اور علم کی روشنی پھیلی، بدعات کا زور ٹوٹا اور سنت کی راہیں نمایاں ہوئیں۔ کئی لاکھ افراد ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے اور اللہ ورسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کی اتباع کرنے لگے۔ ان کے مکتوبات بھی ہیں جو تین مجلدات میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے والد کے مکتوبات کی طرح تصوف کے اسرار و لطائف اور شریعت کے احکام واوامر کو متضمن ہیں۔

شیخ محمد معصوم نے ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ/ ۷/اگست ۱۶۶۸ء کو سرہند میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

۱۳۶-مولانا محمد مومن ترندی

مولانا محمد مومن بن عبداللہ حسینی ترندی، مشہور خطاط، بہت بڑے فاضل، بہترین شاعر اور فقہ واصول کے جید عالم تھے۔ شاہ جہاں بادشاہ نے ان کی قابلیت وصلاحیت کی بنا پر اپنے پوتے شہزادہ سلیمان بن داراشکو

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: زبدۃ المقامات، ص ۳۱۵ تا ۳۲۶-فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۵۴ تا ۵۷

Marfat.com

کا معلم مقرر کیا۔ جب کبرسنی کو پہنچ گئے اور اسی (۸۰) سال کی عمر ہو گئی تو اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ان کا ایک دیوان شعری بھی ہے۔ اس عالم وفقیہ نے ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء کو عہد عالم گیری میں وفات پائی ❶۔

۱۳۷- قاضی محمد مودود جون پوری

قاضی محمد مودود بن محمد حسین جون پوری' ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں حصول علم کو مرکز توجہ ٹھہرالیا۔ حصول علم کے بعد صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری سے اخذ طریقت کیا اور ایک ضخیم کتاب کی صورت میں ان کے ملفوظات بھی جمع کیے' ملفوظات کی جمع وترتیب کا سلسلہ ۴رصفر ۱۰۷۴ھ/ ۲۸راگست ۱۶۶۳ء کو شروع کیا تھا' جو ۵رربیع الثانی ۱۰۷۵ھ/ ۱۶راکتوبر ۱۶۶۴ء میں ختم کیا۔ جلیل القدر عالم اور مشہور فاضل تھے۔ فقہ' اصول فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ اپنے والد شیخ محمد حسین جون پوری کی زندگی ہی میں بادشاہ کی طرف سے جون پور کے محکمہ قضا پر متعین ہونے کی درخواست کی گئی' لیکن اس منصب کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ باپ کو پتا چلا تو بیٹے کو ڈانٹا اور دھمکی دی کہ اگر بادشاہ کی جانب سے پیش کردہ منصب قضا قبول نہ کیا تو وہ انھیں گھر سے نکال دیں گے اور قطع تعلق کر لیں گے۔ قاضی محمد مودود نے باپ کے دباؤ میں آکر قضا کا عہدہ قبول تو کر لیا لیکن جب بادشاہ کے حضور پیش ہوئے تو وہ مراسم تعظیم ادا نہ کیں جو بادشاہوں کے سامنے ادا کی جاتی تھیں' سنت کے مطابق سلام کیا۔ پھر جب باقاعدہ عہدۂ قضا سنبھال لیا تو چونگی محصول کی وصولی ختم کر دی۔ حدود جون پور میں مال پر جو ٹیکس لیے جاتے تھے' وہ معاف کر دیے اور یہ سب بادشاہ ہند سے باقاعدہ اجازت لے کر کیا۔ جون پور میں مسجدیں تعمیر کیں۔ ہر مسجد میں امام' موذن اور خادم مقرر کیے اور انھیں معقول تنخواہیں اور وظیفے دینے کا فیصلہ کیا۔ قاضی محمد مودود نے ایک کام یہ کیا کہ موذنوں کو جمعے کی پہلی اذان کہنے سے منع کر دیا۔ لیکن اس ممانعت کی بہ ظاہر کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

قاضی محمد مودود جون پوری نے ۶رشوال ۱۰۷۸ھ/ ۱۰رمارچ ۱۶۶۸ء کو الہ آباد میں وفات پائی ❷۔

۱۳۸- مولانا محمد نافع اکبرآبادی

مولانا محمد نافع اکبرآبادی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے مصاحب وندیم بختاور خاں کے لیے فارسی زبان میں ''خلاصۃ الخانیہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی' جو مسائل فقہیہ پر مشتمل تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے عالم اور فقیہ تھے ❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۰ بحوالہ مراۃ العالم۔

❷ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۱' ۳۹۲- بحوالہ گنج ارشدی۔

❸ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۳ بحوالہ مراۃ العالم

Marfat.com

۱۳۹۔ شیخ محمد نعمان بدخشی

شیخ محمد نعمان بن شمس الدین بن جلال الدین بن حمید الدین حسینی بدخشی کا شمار اپنے عہد کے کبار مشائخ نقشبندیہ اور جلیل القدر فقہا میں ہوتا تھا۔ ان کے والد شیخ شمس الدین بھی فضل وتقویٰ میں یگانۂ روز گار اور مشاہیر بدخشاں و ماوراء النہر میں سے تھے۔ دادا شیخ جلال الدین اور پردادا حمید الدین بھی فضل و کمال کے جامع اور علم وادراک میں وحید الدہر تھے۔

شیخ محمد نعمان کی ولادت ۹۷۷ھ/ ۱۵۸۹ء کو بدخشاں میں ہوئی۔ منقول ہے کہ ان کی ولادت سے پیشتر ان کے والد شیخ محمد نعمان نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کو خواب میں دیکھا کہ انھوں نے ان کو ایک سعادت مند فرزند کے تولد کی خوش خبری سنائی ہے اور فرمایا کہ حضرت امام کے نام کی مناسبت سے اس کا نام نعمان رکھا جائے۔ ان دنوں شیخ شمس الدین سخت مالی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ بیٹا پیدا ہوا تو نعمان نام رکھا۔ نعمان نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو اپنے علاقے کے فضلائے نام دار کی خدمت میں حاضری دی اور علم حاصل کیا۔ حصول علم کے بعد عنفوان شباب ہی میں شیخ عبداللہ بلخی سے بیعت ہو گئے۔ اس زمانے میں ہندوستان کو علم وفضل، زہد وتقویٰ اور تصوف وطریقت میں بڑی شہرت حاصل تھی اور برصغیر میں بے شمار اصحاب کمال کا سلسلۂ فیض جاری تھا۔ بہت سے شائقین علم وسلوک عرب وعجم کے متعدد ممالک سے یہاں آتے اور علم وعرفان کے مختلف گوشوں سے بہرہ یاب ہوتے۔ انھی بلند بخت حضرات میں شیخ محمد نعمان بھی تھے جو بدخشاں سے وارد ہند ہوئے۔ سب سے پہلے دہلی گئے اور خواجہ عبدالباقی (باقی باللہ) نقشبندی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے فیض حاصل کیا۔ کافی عرصہ ان کی صحبت و ملازمت میں گزارا۔ ان کی وفات کے بعد شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی سے منسلک ہو گئے جو خواجہ باقی باللہ ہی کے فیض یافتہ تھے۔ مجدد الف ثانی سے علم ومعرفت پر عبور حاصل کیا اور بلند مرتبے کو پہنچے۔ پھر ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء کو عازم برہان پور ہوئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء کو (ایک روایت کے مطابق ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۵۰ء کو) اکبر آباد (آگرہ) میں فوت ہوئے ❶۔

۱۴۰۔ شیخ محمد ہاشم دہلوی

شیخ محمد ہاشم دہلوی، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ کے بیٹے تھے۔ مشہور عالم اور محدث وفقیہ تھے۔ علمائے باعمل اور اللہ کے صالح بندوں میں سے تھے۔ مولد ومنشا دہلی ہے، جس کو برصغیر میں مرکز علم کی

❶ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: زبدۃ المقامات، ص ۳۲۶ تا ۳۴۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۳۔

Marfat.com

حیثیت حاصل تھی۔ اپنے والد گرامی شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے تعلیم حاصل کی اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے۔ یہاں تک کہ حدیث اور فقہ میں ماہر کامل ہوئے۔ ان کے ایک بھائی مفتی نورالحق دہلوی تھے' وہ بھی علم وعمل میں یگانہ روزگار تھے۔ فہرس التوالیف میں ان کے مرتبہ علمی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا:

جوہر طبع او بجودت وسلامت وقوت در علم خصوصاً بعلم شریف حدیث موصوف وممتاز است ❶۔

۲۴۱-خواجہ محمد ہاشم کشمی

خواجہ محمد ہاشم کشمی اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے استاد تھے۔ ان کا مولد ومنشا سرزمین بدخشاں کا ایک قریہ ''کشم'' ہے۔ اپنے علاقے کے علمائے کرام سے علم حاصل کیا اور حدیث' فقہ اور دیگر علوم مروجہ میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ بعدازاں ہندوستان آئے اور برہان پور گئے۔ وہاں شیخ محمد نعمان بدخشی کا سلسلۂ فیض جاری تھا' اس میں شامل ہو گئے۔ ان سے اخذ طریقت کیا۔ پھر ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء کو سرہند گئے' وہاں حضرت مجدد الف ثانی کا چشمہ علم وطریقت جاری تھا' عرصے تک ان سے استفاضہ کناں رہے' ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۴ء میں ان سے سند حدیث حاصل کی اور تلقین ذکر کی اجازت سے بہرہ ور ہوئے۔ اس کے بعد برہان پور کو مراجعت فرمائی اور وہاں سکونت اختیار کی۔

خواجہ محمد ہاشم کشمی سے کثیر التعداد حضرات نے استفادہ کیا۔ فارسی زبان میں ''زبدۃ المقامات'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی' جس میں حضرت خواجہ باقی باللہ' ان کے فرزندان گرامی' خلفائے عالی مقام' شیخ عبدالاحد سرہندی' حضرت مجدد الف ثانی' ان کی اولاد' ان کے خلفا اور فیض یافتہ حضرات کے حالات بیان کیے ہیں۔ اپنے موضوع میں یہ ایک دلچسپ اور پُراز معلومات کتاب ہے اور اس دور کے تذکرۂ رجال میں حوالے کے طور پر اس کا نام آتا ہے۔ یہ کتاب مطبع نامی منشی نول کشور واقع کان پور میں باہتمام منشی بھگوان دیال' جنوری ۱۸۹۰ء میں پہلی مرتبہ طبع ہوئی۔

۱۴۲-میر محمد ہاشم گیلانی

میر محمد ہاشم بن محمد قاسم حسینی گیلانی' شیخ' فاضل اور علامہ تھے۔ کبار علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے متعدد علما سے مختلف علوم کی تحصیل کی۔ علوم حکمیہ مرزا ابراہیم ہمدانی اور نصیر الدین حسین شیرازی سے حاصل کیے۔ حدیث' فقہ اور علوم عربیہ کے لیے شیخ محمد عربی محدث' شیخ عبدالرحیم حسانی اور شیخ علی نبیرہ علامہ عصام الدین اسفرائنی کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ بارہ سال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اقامت گزیں رہے اور وہاں کے مختلف علما وفضلا سے مستفید ہوئے۔ شیخ حکیم علی گیلانی سے فنونِ ریاضی اور علم طب کی تحصیل کی۔

❶ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی' ص ۲۵۶-تذکرۂ شیخ عبدالحق محدث دہلوی' ص ۲۷۰-نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۴-

Marfat.com

اس کے بعد احمد آباد میں مقیم ہو گئے اور درس و افادہ کا غلغلہ بلند کیا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کے تخت حکومت پر شاہ جہان بادشاہ متمکن تھا۔ میر محمد ہاشم گیلانی کی شہرتِ علمی اس کے کانوں میں پہنچی تو اس نے ان کو احمد آباد کی صدارت پیش کی۔ عرصے تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر شاہ جہان نے ان کو اپنے بیٹے اورنگ زیب عالم گیر کا معلم مقرر کر دیا۔

میر محمد ہاشم گیلانی تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ جس زمانے میں وہ اورنگ زیب کو تعلیم دینے پر مامور تھے' اس زمانے میں تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا اور شاہ جہان کے نام معنون کیا۔ تحریر اقلیدس کے مقالہ تاسعہ پر بھی حواشی سپرد قلم کیے۔ اس عالم و فقیہ' ماہر معقولات و منقولات اور ممتاز طبیب نے اسی (۸۰) سال عمر پا کر ۱۰۶۱ھ/ ۱۶۵۱ء کو اورنگ آباد میں انتقال کیا[1]۔

۱۴۳- شیخ محمد یحییٰ سرہندی

شیخ محمد یحییٰ سرہندی حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند تھے۔ ۱۰۲۷ھ/ ۱۶۱۸ء میں پیدا ہوئے اور اپنے دو بھائیوں شیخ محمد سعید اور شیخ محمد معصوم سے اخذ علم کیا۔ تدقیق و فقاہت کے مرتبے کو پہنچے اور درس و افادہ کا سلسلہ شروع فرمایا۔ علمائے ربانی میں سے تھے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کے بیٹے خواجہ عبیداللہ کی صاحب زادی سے شادی ہوئی۔ حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ ۲۷ جمادی الاخریٰ ۱۰۹۸ھ/ ۳۰ اپریل ۱۶۸۷ء کو اکہتر سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

ایک روایت کے مطابق سال پیدائش ۱۰۲۴ھ/ ۱۶۱۵ء اور سال وفات ۱۰۹۶ھ/ ۱۶۸۵ء ہے[2]۔

۱۴۴- مولانا محمد یعقوب بنانی لاہور

مولانا ابو یوسف محمد یعقوب بنانی لاہوری' گیارھویں صدی ہجری کے دیار لاہور کے مشہور شیخ و عالم اور معروف محدث و فقیہ تھے۔ فنون حکمیہ میں بھی ماہر تھے۔ مولد و منشا لاہور ہے۔ اپنے عصر کے ممتاز اساتذہ سے علم حاصل کیا اور علوم و فنون میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ شاہ جہان بادشاہ نے ان کو فوج کے میر عدل کے عہدے پر مامور کیا۔

معقولات و منقولات کے جامع اور فروع و اصول کے ماہر تھے۔ مدرسہ شاہ جہانیہ کی مسند درس پر فائز تھے۔ بے شمار اصحاب علم نے ان سے استفادہ کیا۔ حدیث میں درک حاصل تھا۔ "الافق المبین فی اخبار

[1] بادشاہ نامہ' ج اول' ص ۳۴۵- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۵- بزم تیموریہ' ص ۲۱۶- مقالات یوم عالم گیر' ص ۲۲- مراۃ العالم-

[2] البانع الجنی- مشائخ مجددیہ' ص ۲۲۲' ۲۲۳- ہدیہ احمد' ص ۸۶' ۸۷- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۳۵- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۵۸-

Marfat.com

المقربین" کے طبقہ تاسعہ میں رزق اللہ ان کی فراوانی علم وفضل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں نے ان کو اثنائے درس میں دیکھا کہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی پر شدید تنقید کرتے تھے۔

مولانا یعقوب بنانی لاہوری بہت بڑے مصنف اور شارح بھی تھے۔ان کی تصانیف یہ ہیں: الخیر الجاری شرح صحیح البخاری، المعلم شرح صحیح الامام مسلم، المصفی شرح الموطا، شرح تہذیب الکلام، شرح حسامی، شرح شرعۃ الاسلام، اساس العلوم (علم صرف میں) حاشیہ رضی، حاشیہ عضدی اور حاشیہ بیضاوی۔ درسی کتابوں کے ان شروح و حواشی اور تعلیقات سے ان کی وسعت علم اور کثرتِ مطالعہ کا پتا چلتا ہے۔ کتب درسیہ اور علوم مروجہ میں انہماک کا یہ عالم تھا کہ دور عالم گیری میں لشکر کے میر عدلیہ تھے، لیکن درس و افادہ کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہونے دیا، ہمیشہ اس میں مشغول رہے۔اس کا اندازہ مندرجہ بالا کتب درسیہ پر ان کی تعلیقات وشروح سے بہ آسانی ہو جاتا ہے۔

لاہور کے اس عظیم عالم وفقیہ اور محدث نے ۱۰۹۸ھ/ ۱۶۸۷ء کو وفات پائی ❶۔

۱۴۵- سید محمود سندھی

سید محمود بن عبدالباقی بن محمود بن ابوسعید حسینی سبزواری ثم سندھی، اپنے عصر کے عالم وفقیہ تھے اور اللہ کے نیک بندوں اور باعمل علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علم وکمال اور فضل وتقویٰ میں بے نظیر تھے۔ ان کے والد شیخ عبدالباقی بلاد سندھ کے شیوخ میں سے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد شیخ محمود نے مسند مشیخت سنبھالی اور ۱۰۲۰ھ/ ۱۶۱۱ء کو انتقال کیا ❷۔

۱۴۶- شیخ محمود گجراتی

شیخ محمود بن محمد حسن عمری چشتی احمد آبادی گجراتی۔ احمد آباد میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اپنے والد شیخ محمد حسن عمری سے جو عالم وفاضل بزرگ تھے، تعلیم حاصل کی۔ طویل مدت تک ان کی خدمت ومصاحبت میں رہے، ان سے اخذ طریقت بھی کیا، یہاں تک کہ اپنے علاقے اور عصر کے فقیہ صالح تسلیم کیے گئے۔ والد کی وفات کے بعد مسند مشیخت کو زینت بخشی اور بے شمار تشنگانِ علوم کو مستفید فرمایا۔ ۹ ربیع الثانی ۱۰۴۰ھ/ ۵ نومبر ۱۶۳۰ء کو احمد آباد میں فوت ہوئے ❸۔

---

❶ عمل صالح، ج ۳، ص ۳۰۱- مآثر عالم گیری، ص ۱۲۰، ۱۲۴، ۱۶۰- انفاس العارفین ص ۷۸ تا ۷۹- بزم تیموریہ، ص ۲۴۴- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۲۳- "نقوش" لاہور نمبر، ص ۵۰۸- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۴۳۹، ۴۴۰-

❷ تحفۃ الکرام، ص ۶۱۱- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۹۷-

❸ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۹۷ بحوالہ محبوب ذی المنن-

Marfat.com

۱۴۷- شیخ محمود فاروقی جون پوری

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی سبحۃ المرجان میں شیخ محمود فاروقی جون پوری کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولا ریب انه لم يظهر بالهند مثل فاروقيين احمد هما فى الحقائق و هو مولانا الشيخ احمد السرهندى والثانى فى العلوم الحكمة والادبية و هو الملا محمود الجون پورى۔

(یعنی سرزمین ہند میں دو ایسی فاروقی النسل شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں کہ کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ایک شیخ احمد سرہندی جو حقائق و معارف میں فقید المثال تھے' دوسرے شیخ محمود جون پوری جن کا علوم حکمیہ وادبیہ میں کوئی حریف نہ تھا۔)

لیکن صاحب نزہۃ الخواطر عبدالحیٔ حسنی لکھنوی ان میں تیسرے فاروقی النسل ہندی کا اضافہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

اقول و ثالثهم الشيخ ولى الله بن عبدالرحيم العمرى الدهلوى فانه كان عديم النظير فى الفلسفة الالهية۔

(ان میں تیسرے فاروقی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں' جن کی فلسفۂ الٰہیات میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔)

ان سطور میں اختصار کے ساتھ فاروقی نسل کے جید عالم اور معقولات و منقولات کے وحید العصر فاضل' شیخ محمود جون پوری کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ شیخ محمود ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء کو کشور ہند کے مرکز علم و فضل جون پور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ محمد جون پوری کی نگرانی میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ شیخ محمد جون پوری اپنے علاقے کے بلند پایہ عالم تھے۔ لائق بیٹے نے درسی کتابیں انہی سے پڑھیں۔ اس زمانے میں جون پور کی مسند تدریس پر شیخ محمد افضل عثمانی جون پوری متمکن تھے۔ شیخ محمود نے ان کی طرف رجوع کیا اور منطق و حکمت کی مروج و متداول کتابیں ان کے حلقہ درس میں پڑھیں' یہاں تک کہ فضیلت علمی کے مرتبۂ علیا کو پہنچے اور اپنے تمام اقران سے فوقیت لے گئے۔ سترہ سال کی عمر میں درسیات از بر ہو چکی تھیں۔ ذکاوت و فطانت' حدتِ ذہن وفکر اور قوت حفظ وادراک کا یہ عالم تھا کہ اصناف علوم کے ہر گوشے پر گہری نظر تھی۔ صغرسنی ہی میں بڑی بڑی علمی مجلسوں اور فکری محفلوں میں جانے لگے تھے۔ وہاں کبار و مشاہیر علما سے ہم کلام ہوتے' اہم اور پیچیدہ مسائل پر ان سے مباحثے کرتے اور زورِ استدلال سے سب پر چھا جاتے۔ ان کی روانئ کلام اور قوت استدلال سے جون

Marfat.com

پور کے علما و فضلا اور اعیان و اکابر انتہائی متحیر ہوتے۔ اس عہد میں علوم حکمیہ اور معارف ادبیہ میں انھیں جو عبور و استحضار تھا' اس میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ یوں تو تمام اصناف علم پر عبور رکھتے تھے' لیکن فلسفہ و حکمت اور منطق و کلام میں تو بالخصوص ماہر کامل تھے' گیارھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں انھیں عالم کبیر اور امام شہیر کی حیثیت حاصل تھی۔ فلسفہ و حکمت کی جزئیات کی وضاحت میں مجتہد کے مرتبے پر فائز تھے۔

محمد یحیٰ بن محمد امین عباسی الہ آبادی وفیات الاعلام میں لکھتے ہیں کہ معانی' بیان اور فلسفہ و منطق میں ارضِ ہند کا کوئی عالم شیخ محمود جون پوری کے مرتبے کو نہیں پہنچا۔ ایک مرتبہ ملک میں رصد گاہ تعمیر کرنے کا جذبہ دل میں بیدار ہوا' اور اس موضوع پر شاہ جہان بادشاہ سے گفتگو کے لیے اکبر آباد (آگرہ) گئے۔ اس سے بات کی' منصوبے کے تمام پہلو اس کے سامنے رکھے اور رصد گاہ کی ضرورت و اہمیت کو واضح کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کو اس عظیم اور مفید ترین منصوبے کی تکمیل کے لیے آمادہ کر لیا اور رصد گاہ کی تعمیر کے مسئلے پر وہ سنجیدگی سے غور کرنے لگا' لیکن اس کے ایک وزیر نے اس منصوبے کی مخالفت کی اور کہا کہ بلخ کی مہم درپیش ہے اور اس کے لیے بہت سے روپے کی ضرورت ہے۔ وزیر کی اس بات سے معاملہ ختم ہو گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شیخ محمود جون پوری نے رصد گاہ کے لیے جو زمین تجویز کی تھی' کہتے ہیں یہ وہی زمین تھی جو اس سے قبل بعض حکما اس کام کے لیے منتخب کر چکے تھے۔

علامہ شیخ محمود کو تعمیر رصد گاہ کے سلسلے میں اپنی ناکامی اور شاہ جہان بادشاہ کے وزیر کی مخالفانہ گفتگو سے بہت مایوسی ہوئی۔ وہ واپس جون پور آ گئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں شاہ جہان کے بیٹے شہزادہ شجاع نے ان کی طرف رجوع کیا' وہ انھیں اپنے ساتھ بنگال لے گیا اور ان سے علوم حکمیہ اور فنون فلسفہ کی تحصیل کی۔ نواب شائستہ خاں (یعنی ابوطالب بن ابوالحسن اکبر آبادی) نے ان سے الفرائد المحمودیہ پڑھی' علاوہ ازیں شیخ نورالدین جعفر جون پوری۔ ''الآداب الباقیہ'' کے مصنف شیخ عبدالباقی صدیقی اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

شیخ محمود جون پوری اور شیخ محمد رشید جون پوری' دونوں شیخ محمد افضل جون پوری کے شاگرد تھے۔ دونوں ایک ہی شہر کے رہنے والے تھے اور دونوں کے علم و فضل کی وسعت اور جامعیت سے شیخ محمد افضل بہت خوش تھے' اور ان عظیم الشان شاگردوں کا استاد ہونا ان کے لیے باعث فخر تھا۔ ان کا ارشاد ہے:

وقتے کہ علامہ تفتازانی و جرجانی از عالم رفتہ اند کسے اجتماع فاضل بہ ایں فضیلت در یک شہر نشان نہ دادہ۔

(یعنی جب سے علامہ سعد الدین تفتازانی (متوفی ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء) اور سید شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء) اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے ہیں' ایک شہر میں اس قسم کی فضیلت کے حامل فضلا کا اجتماع نہیں ہوا۔)

Marfat.com

شیخ محمد افضل کی مراد شیخ محمود جون پوری اور شیخ محمد رشید جون پوری سے تھی کہ ایک ہی وقت میں دونوں جون پور میں موجود تھے اور خدمت علم انجام دیتے تھے۔

جس زمانے میں شیخ محمود جون پوری بنگال میں مقیم تھے اور شہزادہ شجاع کو درس دیتے تھے' اس زمانے میں بنگال ہی میں ان کی ملاقات مشہور بزرگ شیخ نعمت اللہ بن عطاء اللہ فیروز پوری متوفی ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء سے ہوئی' ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے اور ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں ان سے اخذ طریقت کیا۔

شیخ محمود نہایت حاضر جواب تھے لیکن کبھی ایسی بات زبان سے نہ نکالتے جس سے بعد میں رجوع کرنا پڑے۔

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں:

مدت العمر قولے از و سر برنہ زد کہ ازاں رجوع کردہ باشد' ہرگاہ سائلے مسئلہ می پرسید' اگر دل حاضری بود بہ جواب می پرداخت' والا می گفت دریں وقت خاطر متوجہ جواب نیست۔

(عمر بھر میں کبھی ایسی بات نہیں کی جس سے رجوع کرنے کی نوبت آئے۔ اگر طبیعت حاضر ہوتی' سائل کے ہر علمی سوال کا جواب دیتے۔ ورنہ فرماتے کہ اس وقت طبیعت آمادۂ جواب نہیں ہے۔)

شیخ ممدوح کا جہاں درس و افادے کا سلسلہ جاری تھا' وہاں وہ تصنیف و تالیف کے بھی ماہر تھے اور قلم میں بڑا زور تھا۔ علم فلسفہ میں شمس البازغہ ان کی شہرہ آفاق کتاب ہے اور وہ کتاب ہے جس کی وجہ سے فلسفہ و حکمت کے بڑے بڑے مراکز میں اسلامی ہند کی علمی سرگرمیوں کو ممتاز مقام عطا ہوا۔ یہ کتاب درس نظامیہ میں پڑھائی جاتی ہے اور علما و طلبا میں متداول ہے۔ حلقہ اہل علم میں اس سے بے حد اعتنا کیا گیا۔ ملا حسن' مولانا محمد یوسف اور مولانا عبدالحکیم وغیرہ اصحاب حکمت نے اس پر حواشی لکھے۔ اس کے علاوہ معانی و بیان اور بدیع میں قاضی عضد الدین ایجی کی کتاب فوائد غیاثیہ پر جو بڑی مشہور کتاب ہے' الفرائد کے نام سے شرح قلم بند کی اور اسے الفرائد شرح الفوائد کے نام سے موسوم کیا۔ اس کتاب پر ممدوح نے نہایت عمدہ تعلیقات و حواشی لکھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ محمود فصاحت و بلاغت اور بدیع و معانی میں کس درجہ تبحر رکھتے تھے۔ ایک کتاب شیخ محب اللہ الہ آبادی کی التسویہ کے جواب میں حرز الایمان کے نام سے تصنیف کی۔

شیخ محمود جون پوری نے ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ/ ۹ فروری ۱۶۵۲ء کو جون پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

شیخ موصوف کی وفات کے وقت ان کے استاد شیخ محمد افضل جون پوری زندہ تھے۔ انھیں لائق شاگرد کی موت کا پتا چلا تو نہایت حزن و ملال کا اظہار کیا اور اس درجہ غم و الم میں مبتلا ہوئے کہ چالیس دن تک لب آشنائے تبسم نہیں ہوئے۔ بالآخر چالیس روز بعد ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ/ ۲۰ مارچ ۱۶۵۲ء کو اپنے اس جلیل القدر شاگرد سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

Marfat.com

گیارھویں صدی ہجری کا ہندوستان علمی و تحقیقی لحاظ سے بے حد زرخیز اور پر ثروت تھا۔ مختلف مقامات میں فحول علمائے کرام کے تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس کے وسیع سلسلے جاری تھے۔ اس دور میں خاندان مغلیہ کے یکے بعد دیگرے تین عظیم الشان حکمران تخت نشین ہند ہوئے' جلال الدین اکبر' نورالدین محمد جہاں گیر اور شہاب الدین شاہ جہان۔ انھوں نے اس ملک کی بڑی علمی خدمت کی۔ اس کی تہذیب اور ثقافت کو خوب ترقی دی اور برصغیر میں علم و تحقیق کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا جس سے اب تک لوگ متمتع ہو رہے ہیں۔ جن علمائے عالی مقام' فضلائے عظام اور فقہائے نام دار نے اس صدی میں علم و فضل' زہد و تقویٰ اور تصوف و طریقت میں ارتقا و تقدم کی منزلیں طے کیں' ان میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی' شیخ عبدالحق محدث دہلوی' علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی' مولانا محمد فاضل لاہوری' مولانا محمد یعقوب صرفی کشمیری' شیخ محمود جون پوری' مولانا محمد افضل جون پوری' صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری' شیخ معین الدین کشمیری' مولانا عبدالسلام لاہوری' مولانا کمال الدین کشمیری' مولانا جمال الدین کشمیری' مولانا عبداللہ سیالکوٹی' شیخ عیسیٰ سندھی' شیخ اسماعیل لاہوری' علامی سعد اللہ چنیوٹی لاہوری' قاضی اللہ داد بلگرامی' شیخ بلال لاہوری اور مولانا جان محمد لاہوری وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

علمائے کرام اور فقہائے عظام کے علاوہ اصحاب طریقت اور ارباب تصوف کی بھی بہت بڑی جماعت اس عہد میں برصغیر پاک و ہند کے مختلف بلاد و امصار اور قصبات و دیہات میں موجود تھی [1]۔

۱۴۸- شیخ محمود سہارن پوری

شیخ محمود بن مصطفیٰ بن عبدالستار انصاری سہارن پوری کی ولادت و تربیت ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر سہارن پور میں ہوئی۔ پہلے علم نحو اور دیگر علوم عربیہ کی تحصیل کی' پھر اپنے دور کے اساتذہ سے علم فقہ حاصل کیا۔ حصول علم کے بعد گنگوہ کا قصد کیا۔ وہاں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے بیٹے شیخ رکن الدین گنگوہی کا سلسلۂ فیض جاری تھا' ان سے اخذ طریقت کیا۔ علم اور طریقت سے فارغ ہو کر حجازِ مقدس کا عزم فرمایا' سعادت حج سے بہرہ ور ہوئے اور مدینہ منورہ گئے۔ عرصے تک مختلف بلاد و امصار کی سیر و سیاحت کرتے رہے۔ اس اثنا میں بہت سے مشائخ و علما سے ملاقات ہوئی' ان کی صحبت اختیار کی اور کسب فیض فرمایا۔ بعد ازاں اپنے شہر سہارن پور آ گئے تھے۔

شیخ محمود انصاری سہارن پوری اللہ کے برگزیدہ بندوں اور صالح مشائخ میں سے تھے۔ ۵ ذی الحجہ ۱۰۵۰ھ/ ۷ر مارچ ۱۶۴۱ء کو فوت ہوئے [2]۔

---

[1] شیخ محمود جون پوری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: عمل صالح' ج ۳' ص ۳۴۲- تجلی نور' ج ۲' ص ۴۸ تا ۵۱- تاریخ شیراز ہند جون پور' ص ۶۸۸ تا ۶۹۰- مآثر الکرام' دفتر اول ص ۱۸۹ تا ۱۹۱- وفیات الاعلام- قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب' ص ۱۹۸- تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۲۱- حدائق الحنفیہ' ص ۴۱۲' ۴۱۳' ۴۱۳- ابجد العلوم' ص ۹۰۱' ۹۰۲- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۷ تا ۳۹۹- سبحۃ المرجان' ص ۵۳ تا ۶۳- رود کوثر' ص ۳۳۶- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۳۴' ۱۳۵-

[2] نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۹ بحوالہ مرآۃ جہاں نما-

Marfat.com

۱۴۹-مولانا محی الدین بہاری

مولانا محی الدین بن عبداللہ بہاری' ملا موہن بہاری کے عرف سے معروف تھے۔ ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر ''بہار'' کے نواح میں متولد ہوئے' نشوونما بھی اسی گاؤں میں پائی۔ حصول علم کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ نو سال کی عمر کے تھے کہ قرآن مجید حفظ کر لیا۔ ان کے والد مولانا عبداللہ بہاری بھی صاحب علم بزرگ تھے۔ حفظ قرآن کے بعد ان سے درسی کتابیں پڑھنا شروع کیں اور سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ پھر اپنے شہر میں درس وافادے کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس دور کے مشاہیر فقہا میں گردانے گئے۔ کچھ عرصہ شائقین علم کو پڑھاتے اور مستفید کرتے رہے۔ بعد ازاں دہلی گئے اور شاہ جہان بادشاہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ان کی علمی قابلیت سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے اورنگ زیب کا معلم مقرر کر دیا۔ بارہ سال اس خدمت علمی پر مامور رہے۔ پھر تصوف وطریقت کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اور شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کے پوتے شیخ حیدر کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ اس کے بعد اپنے شہر بہار واپس چلے گئے اور سب اطراف سے منقطع ہو کر زہد وعبادت کی زندگی اختیار کر لی۔ اس اثنا میں علم نحو کی انتہائی کتاب ''کافیہ'' کی مبحث غیر منصرف تک فارسی زبان میں شرح سپرد قلم کی۔ حقائق ومعارف کے انداز ہی میں مبحث غیر منصرف تک عربی زبان میں ''کافیہ'' کی ایک شرح شیخ ابوالبقا نے لکھی ہے۔

گنج ارشدی میں شیخ غلام ارشد جون پوری لکھتے ہیں کہ مولانا محی الدین بہاری شیخ محمد افضل جون پوری کے شیوخ میں سے تھے۔ وہ ایک مرتبہ جون پور تشریف لائے اور شیخ محمد افضل کے ہاں گئے۔ شیخ اس وقت درس دے رہے تھے اور طلبا کی جماعت ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے مولانا محی الدین کے اعزاز میں درس بند کرنے کا ارادہ کیا لیکن مولانا نے روک دیا اور فرمایا کہ ان کی موجودگی میں سلسلۂ درس جاری رکھا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری طلبا کی جماعت میں شیخ محمد افضل سے درس لے رہے تھے اور مولانا محی الدین بہاری شیخ محمد رشید کی استعداد علمی سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ غالباً یہ اس بنا پر تھا کہ شیخ محمد رشید کی شہرت زمانۂ طالب علمی ہی میں اہل علم میں پہنچ گئی تھی۔ مولانا محی الدین بہاری نے دوران درس میں کسی مسئلے میں شیخ محمد رشید سے مذاکرہ ومباحثہ شروع کر دیا۔ شیخ نے ان کو اس انداز سے جواب دیا اور اس نہج سے بحث میں حصہ لیا کہ قریب تھا کہ مولانا کو خاموش کرا دیں' مگر شیخ محمد افضل نے اپنے لائق شاگرد کو خاموش رہنے کا حکم دیا اور وہ خاموش ہو گئے۔

مولانا محی الدین بہاری نے ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء کو وفات پائی ❶۔

---

❶ مآثر الکرام' دفتر اول ص ۲۴۱' ۲۴۲- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۰۰' ۴۰۱-

Marfat.com

۱۵۰- قاضی مرتضیٰ بیجاپوری

قاضی مرتضیٰ بن محمود نائطی بیجاپوری کا لقب رضی الدین تھا۔ اپنے عصر کے نامور عالم وفقیہ اور شیخ تھے۔ ان کے والد محمود نائطی بندرگاہ گوا کے قاضی تھے۔ والد کی وفات کے بعد ۹۹۳ھ میں یہ منصب لائق بیٹے کو ملا۔ قاضی ممدوح مصنف بھی تھے، فن صنائع و بدائع سے متعلق سلطان ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں ''تحفۃ الفقیر'' کے نام سے ایک مفید کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب لکھ کر بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ کو بطور تحفہ پیش کی، بادشاہ نے اسے بہت پسند کیا❶۔

۱۵۱- سید مصطفیٰ بیجاپوری

سید مصطفیٰ بن ہاشم بن برہان الدین علوی گجراتی بیجاپوری کا مولد ومنشا بیجاپور ہے۔ ان کے والد سید ہاشم بیجاپوری عالم و فاضل بزرگ تھے، بیٹے نے انہی سے اخذ علم اور کسب طریقت کیا۔ طویل عرصے تک ان کی مصاحبت میں رہے، علمائے ربانی اور فضلائے مشاہیر میں گردانے گئے۔ والد کے بعد مسند مشیخت کے وارث بنے۔ عوام وخواص میں مقبول اور حسن اخلاق میں مشہور تھے۔ ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء کے لگ بھگ بیجاپور میں فوت ہوئے❷۔

۱۵۲- شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی

شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی کا نسب نامہ یہ ہے: مصطفیٰ بن عبدالحمید بن بن راجو بن سعدی بن عارف بن عبدالواسع بن منجھلی بن ہدی بن عبدالملک بن منتھن بن نصیرالدین بن بخشی ــــ شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی کو لوگ شیخ رومی عثمانی برونوی کے لقب سے پکارتے تھے۔ شیخ سری بن مفلس سقطی عثمانی کی اولاد سے تھے، جو مشہور ولی اور متقی بزرگ تھے۔ شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی اپنے دور کے عالم وفقیہ اور پرہیزگار بزرگ تھے، اور صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ/۱۹ر دسمبر ۱۶۷۲ء) کے والد تھے۔ یہ دراصل ''سکلائی'' کے باشندے تھے جو علاقہ اودھ میں اعمال امیٹھی میں ایک قریہ تھا۔ شیخ مصطفیٰ نے موضع سکلائی میں نشوونما پائی اور شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی (متوفی ۲۶ رذی القعدہ ۱۰۱۱ھ/۲۷ر اپریل ۱۶۰۳ء) سے بیعت ہوئے۔ پھر حصول علم کا شوق پیدا ہوا اور اپنے علاقے کے علما سے تحصیل کی۔ بعد ازاں ان کے مرشد شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی نے جون پور جانے کی اجازت مرحمت فرمائی اور وہ جون پور چلے گئے۔ جون پور

❶ تاریخ النوائط، ص ۳۰۵- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۰۳۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۰۶ بحوالہ محبوب ذی المنن۔

Marfat.com

علمائے عظام کا مرکز تھا اور مختلف علما و مشائخ کے درس و تدریس اور تصوف و طریقت کے سلسلے جاری تھے' شیخ مصطفیٰ بھی ان سے منسلک ہو گئے۔ وہاں کے اساتذہ سے علم حاصل کیا اور شیخ قیام الدین بن قطب الدین جون پوری سے خرقہ طریقت عطا ہوا۔ پھر امیٹھی کا قصد کیا اور کافی عرصہ وہاں مقیم رہے۔ امیٹھی سے موضع برونہ منتقل ہو گئے جو اس زمانے میں اعمال جون پور میں ایک گاؤں تھا۔ برونہ کے نامور بزرگ شیخ نورالدین بن عبدالقادر صدیقی برونوی کی صاحب زادی سے شادی کی اور اللہ نے اس سے اولاد عطا کی۔ پھر ایک وقت آیا کہ اہل وعیال کو برونہ میں چھوڑا اور خود علاقہ بنگال کے ایک شہر ''پرینہ'' چلے گئے' وہاں اقامت اختیار کر لی' مدفن بھی وہی ہے۔ ان کے بیٹے شیخ محمد رشید جون پوری نے جو سرزمین برصغیر کے بہت بڑے عالم اور صاحب تصانیف مشہور تھے' اپنے نانا شیخ نورالدین برونوی کے ہاں تربیت حاصل کی اور ابتدائی کتابیں (بعض انتہائی بھی' جیسا کہ شیخ محمد رشید جون پوری کے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے) انہی سے پڑھیں ____ شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی' فقیہ' زاہد' متورّع اور متوکل علی اللہ تھے۔ مشتبہات سے دامن کشاں رہتے تھے۔ انھوں نے ۲۰/ ذی الحجہ ۱۰۷۶ھ/ ۱۳/ جون ۱۶۶۶ء کو پرینہ میں وفات پائی ❶۔

۱۵۳- خواجہ معین الدین کشمیری

خواجہ معین الدین نقشبندی کشمیری کا سلسلہ نسب یہ ہے: معین الدین بن خاوند محمود بن ضیاء الدین بن میر محمد بن تاج الدین بن علا الدین عطار بخاری نقشبندی کشمیری۔ خواجہ معین الدین کشمیری خطۂ کشمیر کے ممتاز بزرگ حضرت خواجہ خاوند محمود (متوفی ۱۲/ شعبان ۱۰۵۲ھ/ ۲۶/ اکتوبر ۱۶۴۲ء) کے فرزند تھے۔ خواجہ خاوند محمود کبار مشائخ نقشبندیہ میں سے تھے۔ ماوراء النہر اور اس کے گردونواح میں بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے اور ان کے ارادت مند دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ شاہ جہان بادشاہ کے عہد میں کابل سے ہندوستان آئے اور کشمیر میں سکونت اختیار کی۔ کئی مرتبہ لاہور' دہلی اور آگرہ گئے' ملوک و امرائے سلطنت سے ملے اور اپنے تدین کی وجہ سے ان کے نزدیک انتہائی عزت و اکرام کے مستحق قرار پائے۔ کشمیر میں ترویج اسلام کی اور ہزاروں لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے ❷۔

خواجہ معین الدین کشمیری' انہی خواجہ خاوند محمود کے بیٹے تھے' جن کا شمار مشائخ نقشبندیہ اور فقہائے کشمیر میں ہوتا تھا۔ ان کا مولد و منشا کشمیر ہے۔ گھر میں علم کے چشمے بہہ رہے تھے۔ اپنے والد گرامی خواجہ خاوند محمود سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں اور فقہ کی کچھ تعلیم حاصل کی۔ مزید حصول علم کی غرض سے دہلی گئے' وہاں شیخ عبدالحق

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۰۷۔

❷ عمل صالح' ج ۳' ص ۳۸۴- نیز ملاحظہ ہو' تاریخ کشمیر اعظمی' ص ۱۳۸ تا ۱۴۰-

Marfat.com

محدث دہلوی کی تدریسی سرگرمیاں جاری تھیں' ان کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور کافی عرصہ وہاں رہ کر حدیث وفقہ کی کتابیں پڑھیں' یہاں تک کہ اپنے عہد کے جید عالم اور نامور فقیہ گردانے گئے۔ بعدازاں کشمیر واپس آئے اور مسند مشیخت کو زینت بخشی۔ علم وفضل کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ اس عہد کے بڑے بڑے کشمیری اصحاب علم اور ارباب طریقت ان کی خدمت میں آتے اور استفادہ کرتے۔ ان علمائے کرام میں ملا محمد طاہر کشمیری خلف مولانا حیدر کشمیری' علامہ ابوالفتح کلو' ملا یوسف مدرس' مفتی محمد طاہر' مولانا عبدالغنی اور مولانا مفتی شیخ احمد وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ حضرات علمائے عظام تھے' جو علوم شریعت کے ماہر اور مبلغ تھے اور احکام شرعیہ میں خواجہ معین الدین کشمیری سے طالب فتویٰ ہوتے تھے۔ یعنی وضاحت مسائل شرعیہ اور افتا میں خواجہ ممدوح علمائے کشمیر کے مرکز ومرجع تھے۔ خطۂ کشمیر کے ارکان دولت' ارباب حکومت اور خواص وعوام سب اس سلسلے میں ان سے رجوع کرتے تھے۔

خواجہ معین الدین کشمیری نے کشمیری مسلمانوں میں اتباع شریعت اور ترویج سنت کا جذبہ پیدا کیا۔ بدعات کو ختم کرنے اور خلاف شرع رسوم کو مٹانے میں بے حد کوششیں کیں۔ وہ زاہد وعابد اور متقی ومتورّع عالم و فقیہ تھے۔ مصنف بھی تھے' فتاویٰ نقشبندیہ اور کنز السعادات' مسائل فقہ میں ان کی تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں سیر وسلوک سے متعلق ایک رسالہ ''رضوانی'' لکھا۔ مرأۃ القلوب' سید خیر البشر اور مرأۃ طیبہ بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ان کی دو ضخیم تفسیریں بھی ہیں۔ ایک زبدۃ التفاسیر عربی میں اور دوسری شرح القرآن فارسی میں۔!

خواجہ ممدوح نے ماہ محرم ۱۰۸۵ھ/اپریل ۱۶۷۴ء میں کشمیر میں وفات پائی [۱]۔

۱۵۴- شیخ منوّر لاہوری

شیخ منور بن عبدالحمید بن عبدالشکور بن سلیمان بن اسرائیل لاہوری' علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے۔ شیخ سعد اللہ بن ابراہیم لاہوری ان کے خالو تھے' جو اپنے وقت کے جید عالم اور متقی بزرگ تھے' انہی سے اخذ علم کیا اور مرتبہ عالی کو پہنچے۔ قوت حفظ وادراک نہایت تیز تھی۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں علوم متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہوگئے تھے۔ قرات وتجوید پر عبور رکھتے تھے اور قرات سبعہ کے عالم تھے' حسن صورت اور حسن سیرت کے زیور سے آراستہ تھے۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر ان کی فراوانی علم وفضل سے بہت متاثر تھا' ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء میں اس نے ان کو مالوہ کے منصب صدارت پر مامور کیا۔ جب وہ مالوہ کے شہر سارنگ پور پہنچے تو وہاں علما وفضلا

---

[۱] تاریخ کشمیر اعظمی' ص ۱۶۷' تا ۱۶۹- تذکرہ علمائے ہند' ص ۲۲۹- حدائق الحنفیہ ص ۴۲۱- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۰۶- ۴۰۷- رود کوثر' ص ۱۴۰- ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ- مارچ ۱۹۶۷ء۔

Marfat.com

اور اصحاب طریقت وسلوک کی ایک جماعت موجود تھی' انھوں نے جوش اور مسرت سے انھیں خوش آمدید کہا اور بڑی تکریم سے پیش آئے۔ دس سال سارنگ پور میں قیام رہا۔ منصب صدارت کے ساتھ ساتھ وہاں غلغلۂ تدریس بھی بلند کیے رکھا۔ اس اثنا میں بے شمار شائقین علم وعرفان نے ان سے استفادہ کیا اور شہرت علمی پورے ملک میں پھیل گئی۔

شیخ منور ارض لاہور کے وہ عالم کبیر ہیں' جن کا ذہن رسا' تفسیر' حدیث' فقہ' منطق وحکمت اور تمام علوم مروجہ کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اکبر کے سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہونے سے پہلے چوالیس سال اقلیم علم میں سیاحت کناں رہے اور درس وتدریس کو بنیادی مشغلہ قرار دیے رکھا۔

امیر فتح اللہ شیرازی (متوفی ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء)' ان کے علم وفضل کے بہت مداح تھے۔ یہ شیراز میں پیدا ہوئے تھے۔ مسلکاً شیعہ تھے اور علوم حکمیہ کے متبحر عالم تھے' بیجاپور کے بادشاہ علی عادل شاہ کی دعوت پر ہندوستان آئے اور اس کے پاس بیجاپور میں قیام پذیر ہوئے۔ اس کے قتل کے بعد ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء میں آگرہ گئے اور جلال الدین اکبر بادشاہ سے ملاقات ہوئی۔ اکبر نے ان کی بڑی پذیرائی کی۔ ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں منصب صدارت عطا کیا اور امین الملک کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ پھر عضدالدولہ کا خطاب دیا۔ بعد ازاں عضدالملک کے لقب سے نوازا اور دیوان وزارت میں داخل کیا۔ اپنے دور کے فحول علما اور مشاہیر حکما میں سے تھے۔ جب یہ اکبر کے فرمان کے مطابق آگرہ گئے تو شیخ منور لاہوری بھی وہیں سکونت فرما تھے۔ ایک روز منطق و حکمت کے موضوع پر شیخ منور سے گفتگو ہوئی تو بہت سے فکری عقدے حل ہوئے اور متعدد علمی گوشوں سے پردے اٹھے۔ خوش ہو کر شیراز کے اس عظیم عالم نے فرمایا ''سیر ہند کرتے ہوئے مدت گزر گئی' اس طویل عرصے میں آج پہلا موقع ہے کہ شیراز کی مہک علمی دماغِ آرزومند میں پہنچی۔''

حکیم شمس الدین علی گیلانی' اکبر کی عنایاتِ شاہی سے حکیم الملک کے خطاب سے سرفراز تھے اور مولانا شاہ محمد شاہ آبادی سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں شیخ منور لاہوری کے بیٹے شیخ کبیر کا بیان ہے کہ ایک روز بادشاہ کے حضور عرض گزار ہوئے کہ تفسیر بیضاوی اور دیگر منتہی کتابوں پر ان کے استاد مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے ایسے اعتراضات کیے ہیں کہ علمائے وقت ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں' اور شاہ آبادی عالم اس باب میں سب پر غالب ہیں۔ حکیم گیلانی نے شہنشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ علما کی مجلس منعقد کر کے ان کے اعتراضات وایرادات سے متعلق گفتگو کی جائے۔ چنانچہ اکبر نے جو پہلے ہی اس قسم کی مجالس کے انعقاد کا متمنی رہتا تھا' اس کا انتظام کیا اور مجلس علما میں علم وعقل کا دنگل شروع ہوا۔ قرآن کی آیت: ﴿وَاِذَا بْتَلٰی اِبْرٰهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ کی تفسیر پر حکیم موصوف نے مولانا شاہ آبادی کا اعتراض پیش کیا۔ قاضی صدر الدین لاہوری ثالث مقرر ہوئے۔ شیخ منور نے اس انداز سے اس آیۂ کریمہ کی وضاحت کی اور اس اسلوب سے اعتراض کا جواب دیا کہ حاضرین مجلس حیران رہ گئے۔ قاضی صدر الدین نے شیخ کو داد دیتے ہوئے کہا کہ شیخ

Marfat.com

منور نے قاضی ناصر الدین بیضاوی کی عبارت کی اس حسن وخوبی سے وضاحت کی ہے اور اس عمدگی سے اعتراض کا جواب دیا ہے کہ اگر خود بیضاوی موجود ہوتے تو شیخ کی نگاہِ دور بین کی تحسین فرماتے۔

دس سال کے بعد ۹۹۵ھ/ ۱۵۸۷ء میں اکبر نے شیخ منور کو سارنگ پور (مالوہ) کے عہدۂ صدارت سے معزول کیا اور ان کی جگہ عضد الدولہ میر فتح اللہ شیرازی کو صدر مقرر کر کے بھیجا۔ میر شیرازی وہاں پہنچے تو شیخ منور سے بعض علمی نکات پر بحث شروع ہوئی۔ شیخ منور نے مقدمہ طوالع کی شرح ان کو دکھائی جس کی عبارت بڑی مشکل اور الجھی ہوئی تھی۔ میر فتح اللہ نے جواب کے لیے ایک دن کی مہلت مانگی۔ دوسرے دن پھر گفتگو شروع ہوئی تو فرمایا میں نے اس پر کچھ مسودہ تیار کیا ہے' جس سے مسئلہ زیر بحث کی عقدہ کشائی ہوتی ہے۔ کسی شخص کو میرے ساتھ بھیجیے تا کہ میں اسے صاف کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ شیخ منور کا فرستادہ دو تین منزل تک ان کے ساتھ گیا اور بغیر جواب لیے واپس آ گیا۔

بہر حال شیخ منور لاہوری بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ اکبر نے ۹۹۵ھ/ ۱۵۸۷ء میں ان کو سارنگ پور کی صدارت سے معزول کر کے قلعہ گوالیار میں محبوس کر دیا' پانچ سال قید و بند میں مبتلا رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے بڑا تصنیفی کام کیا۔ چنانچہ "الدرر النظیم فی ترتیب الآی وسور القران الکریم" کے نام سے قرآن کی تفسیر لکھی۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تفسیر قرآن حکیم "البحر المواج" کو جو فارسی زبان میں ہے' عربی میں منتقل کیا۔ ایک کتاب "حدائق البیان شرح علیٰ بدیع البیان" سپرد قلم کی۔ شرح طوالع لکھی' بوصیری کے قصیدہ بردہ کی شرح قلم بند کی۔ ایک رسالہ "الحق الصریح فی اثبات عدم قبول التوبۃ الساب النبی ﷺ" تحریر کیا۔ یہ رسالہ انھوں نے مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری کے جواب میں لکھا تھا۔ عبداللہ سلطان پوری نے ایک رسالے میں رسول اللہ ﷺ پر سب وشتم کرنے والوں کی قبولیت توبہ کا اثبات کیا ہے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی "الارشاد" کی شرح بھی لکھی' نیز شیخ حسن صغانی لاہوری (متوفی ۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء) کی حدیث کی مشہور کتاب "مشارق الانوار" کی شرح سپرد قلم فرمائی۔

شیخ منور پانچ برس قلعہ گوالیار میں قید رہے۔ اس مدت میں انھوں نے اپنی تفسیر "الدرر النظیم فی ترتیب الآی سور القران الکریم" اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی (متوفی ۲۵ رجب ۸۵۹ھ/ ۲۷ /اکتوبر ۱۴۴۵ء) کی تفسیر "البحر المواج" کو عربی کے قالب میں ڈھال لیا تھا' اور دونوں تفسیروں کا مسودہ مکمل کر لیا تھا۔ اب وہ نظر ثانی اور تصحیح کرنا چاہتے تھے کہ فرماں روائے ہند جلال الدین اکبر کے غیظ وغضب کا پارہ اور چڑھ گیا اور وہ تمام کتابیں جو جیل میں لکھی تھیں' اور کم وبیش ڈیڑھ ہزار اجزا پر مشتمل تھیں' ایک ایک ورق کر کے چھین لی گئیں اور کتب خانہ شاہی میں جمع کر دی گئیں۔ افسوس ہے وہ سب کتابیں ضائع ہو گئیں' صرف ایک کتاب تفسیر قرآن "الدرر النظیم فی ترتیب الآی و سور القران الکریم" محفوظ رہ سکی' جو کسی طرح قید خانے میں مصنف کے پاس رہ گئی تھی۔

Marfat.com

اس اثنا میں بادشاہ کا غصہ اور بڑھا تو حکم صادر ہوا کہ شیخ منور کو قلعہ گوالیار سے دارالحکومت آگرہ میں لایا جائے' اس حکم کی تعمیل کی گئی اور زندگی کے جو چند روز باقی رہ گئے تھے' نہایت تنگی اور تاریکی میں بسر کیے۔ بالآخر ۱۲/ ذی القعدہ ۱۰۱۱ھ (۱۳/ اپریل ۱۶۰۳ء) کو اس عالم کون و فساد سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ موت کے بعد مرکز علم و تحقیق لاہور کے اس جلیل القدر عالم و فقیہ اور مفسر و محدث کو غربا اور فقرا کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ بعد ازاں ماہ محرم ۱۰۱۵ھ/ مئی ۱۶۰۶ء میں ان کے فرزندان گرامی کسی مناسب تدبیر سے رفیع المرتبت باپ کی میت کو خاکِ آگرہ سے نکال کر لاہور لے آئے' اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیا ❶۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بادشاہ کی ناراضی کی اصل وجہ کیا تھی۔ دس سال مالوہ کی صدارت پر مامور رہے۔ اس عرصے میں بادشاہ ان سے خوش رہا۔ ۹۹۵ھ/ ۱۵۸۷ء میں میر فتح اللہ شیرازی کو اس منصب پر مامور کیا۔ ان سے شیخ کی علمی بحثیں رہیں' وہ شیخ کی رفعت علمی سے بہت متاثر تھے۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ ناراضی کی بنیاد کیا شی تھی۔ ہو سکتا ہے' اکبر کی تبدیلیٔ مذہب سے انھیں اختلاف ہو' وہ اس پر نکتہ چینی کرتے ہوں اور دربار کے کسی شخص نے ان کے خلاف اکبر کے کان بھر دیے ہوں۔ بہر کیف وجہ ناراضی پردۂ راز میں ہے۔

۱۵۵- شیخ مودود کالپوی

شیخ مودود بن اولیا بن سراج حنفی کالپوی' علم و مشیخت کی گود میں پلے بڑھے اور اپنے والد گرامی شیخ اولیا کے ساتھ سعادتِ حج حاصل کی۔ شیخ علی متقی کے خلیفہ شیخ عبدالوہاب بن ولی اللہ متقی برہان پوری سے حدیث کا درس لیا۔ عرصے تک ان کی خدمت میں رہے اور حدیث کے ماہر علما میں شمار ہوئے ❷۔

۱۵۶- سید میران بیجاپوری

سید میران بن اسد اللہ بن عبداللہ بن وجیہ الدین علوی بیجاپوری کا مولد و منشا گجرات ہے۔ گجرات کے علمائے عظام سے اخذ علم کیا اور نامور فقہا و علما میں شمار کیے گئے۔ زہد و مجاہدہ میں بھی ممتاز تھے۔ حصولِ علم کے بعد گجرات سے بیجاپور چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں وہاں کا حکمران ابراہیم عادل شاہ تھا۔ بیجاپور میں درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا اور اسی عظیم کارِ خیر میں عمر صرف کر دی۔

جمادی الاولیٰ ۱۰۵۵ھ/ جولائی ۱۶۴۵ء کو بیجاپور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ❸۔

---

❶ اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار) ص ۴۷۲ تا ۴۷۵- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۱۱' ۴۱۲-

❷ اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار) ص ۳۴۸' بضمن یاد شیخ اولیا- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۱۳-

❸ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۱۵-

Marfat.com

ـــــ ن ـــــ

۱۵۷- شیخ ناصر الدین شیخ پوری

شیخ ناصر الدین شیخ پوری، عالم وفقیہ تھے اور خواجہ کلاں بن نصیر الدین جھونسوی الہ آبادی کے سلسلۂ طریقت سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ تاج الدین جھونسوی سے اخذ علم و معرفت کیا اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے، تا آنکہ مرتبہ مشیخت کو پہنچے۔ شیخ طیب بن معین بنارسی سے بھی شرف اجازہ حاصل کیا۔ جمعتہ المبارک کے دن غرۂ ربیع الاول ۱۰۶۸ھ/ دسمبر ۱۶۵۷ء کو فوت ہوئے ❶۔

۱۵۸- قاضی نصیر الدین برہان پوری

قاضی نصیر الدین بن قاضی سراج محمد برہان پوری، شیخ و عالم اور محدث وفقیہ تھے۔ حدیث وفقہ اور علوم عربیہ میں اس درجہ عبور رکھتے تھے کہ اس دور میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ حدیث ورجال پر پوری نظر تھی۔ متبع کتاب وسنت اور پابند احکام شرعیہ تھے۔ حصول علم اپنے والد گرامی قاضی سراج محمد (متوفی ۳ شعبان ۱۰۱۰ھ/ ۱۷ر جنوری ۱۶۰۲ء) سے کیا۔ شیخ عثمان بن عیسیٰ سندھی (متوفی شعبان ۱۰۰۸ھ/فروری ۱۶۰۰ء) سے بھی تحصیل کی۔ طویل عرصہ ان کی خدمت میں گزارا اور بہت مستفید ہوئے، حتیٰ کہ اپنے تمام معاصرین سے سبقت لے گئے۔ بحث ومناظرہ میں تیز تھے اور علمی وتحقیقی مباحث میں درک کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ جب کہ صرف اٹھارہ برس کی عمر تھی، فلسفہ وحکمت اور ہیئت وریاضی کے نامور فاضل علامہ شکر اللہ شیرازی (متوفی ۱۸ رمضان ۱۰۴۸ھ/ ۱۳ر جنوری ۱۶۳۹ء) سے پنجہ آزما ہو گئے اور دلائل کے زور سے انھیں خاموش کرا دیا۔

قاضی نصیر الدین برہان پوری ان علمائے کرام میں سے تھے جو حدیث کو قیاس مجتہد پر ترجیح دیتے تھے اور ارشاد رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں قول امام کو ہرگز نہ مانتے تھے۔ وہ صاف لفظوں میں کہا کرتے تھے کہ اگر ایک طرف رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہو اور دوسری طرف امام ابوحنیفہ کا قول ہو تو ترجیح بہرحال فرمان رسول اکرم ﷺ کو حاصل ہوگی، امام ابوحنیفہ کا قول حدیث کے مقابلے میں رد کر دیا جائے گا۔ وہ ہر صورت میں اپنے اس موقف پر قائم رہتے اور کسی کی کوئی پروا نہ کرتے۔ یہ بھی فرمایا کرتے کہ حدیث "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" موضوع ہے۔ ان کے سسر شیخ علم اللہ بیجاپوری (متوفی ۱۱ ذی الحجہ ۱۰۲۴ھ/۲۱ر دسمبر ۱۶۱۵ء) اس سلسلے میں انتہائی سخت اور ان کے مخالف تھے۔ اپنے داماد قاضی نصیر الدین کی یہ بات بالکل نہ مانتے تھے، لیکن قاضی نصیر الدین بے جھجک ان کے سامنے اس قسم کی باتیں کرتے رہتے۔ ایک مرتبہ شیخ علم اللہ بیجاپوری نے قول

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۴۱۶- بحوالہ گنج ارشدی۔

Marfat.com

امام ابوحنیفہ سے استدلال کیا تو قاضی نصیر الدین نے مخالفت کی اور اس کے مقابلے میں حدیث پیش فرمائی۔ شیخ علم اللہ نہ مانے تو قاضی ممدوح نے کہہ دیا کہ "ھو رجل و انا رجل" (امام ابوحنیفہ بھی انسان ہیں اور میں بھی انسان ہوں) یعنی اصل شی جو ہمارے لیے قابل حجت ہے، وہ حدیث رسول ہے نہ کہ قول امام، جس میں امکان خطا موجود ہے۔ اس پر شیخ علم اللہ نے غصے میں آ کر تلوار کھینچ لی اور اپنے داماد قاضی نصیر الدین کو قتل کرنے کے لیے ان کے پیچھے دوڑے۔ لیکن قاضی نے بھاگ کر جان بچائی۔ شیخ نے ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور حکم دیا کہ انھیں آگ میں جلا دیا جائے۔ ساتھ ہی علما کا محضر طلب کر لیا، تمام علما نے ان کے فتوے پر تصدیق کی مہریں ثبت کر دیں۔ البتہ دو جلیل القدر عالموں شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری (متوفی ۲ر رمضان ۱۰۲۹ھ/ ۱۲ر جولائی ۱۶۲۰ء) اور شیخ عیسی بن قاسم سندھی (متوفی ۱۴ شوال ۱۰۳۱ھ/ ۱۲ر اگست ۱۶۲۲ء) نے اس کی تصویب و تصدیق نہیں کی۔

اس موقعے پر عبدالرحیم خان خاناں نے ان کی امداد کی، معاملہ جب بہت نازک صورت اختیار کر گیا تو ہندوستان کے بادشاہ جہاں گیر کو اطلاع دی گئی۔ اس نے قاضی نصیر الدین اور شیخ علم اللہ دونوں کو لشکر گاہ میں بلایا، لیکن بادشاہ کی خدمت میں جانے کے بجائے، شیخ علم اللہ تو بیجا پور چلے گئے اور وہاں کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ سے منسلک ہو گئے اور قاضی نصیر الدین نے حجاز کا عزم فرمایا۔ اس موقعے پر عبدالرحیم خان خاناں نے ان کی مدد کی اور حجاز جانے کے لیے سفر خرچ عطا کیا۔ قاضی نصیر الدین پانچ سال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔

قاضی نصیر الدین برہان پوری حجاز سے واپس آ رہے تھے کہ ان کا جہاز فرنگیوں کے قبضے میں آ گیا۔ فرنگیوں سے قاضی ممدوح کی گفتگو ہوئی تو وہ ان کی فہم و فراست اور کمالات علمی سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھیں اپنے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ دربار میں پہنچے تو قاضی موصوف نے فرنگی بادشاہ کو سلام نہ کیا۔ فرنگیوں نے پوچھا کہ آپ سلام و آداب کیوں بجا نہیں لائے؟ فرمایا بادشاہ کے لیے جو تمھارے ہاں اسلوب آداب مروج ہیں، وہ اسلام میں نہیں ہیں۔ کچھ عرصہ وہاں محصور رہے۔ اس کے بعد رہا کر دیے گئے اور ۱۰۲۴ھ/ ۱۶۱۵ء میں ابراہیم عادل شاہ کی سلطنت میں بندرگاہ وائل میں داخل ہوئے۔ ابراہیم عادل شاہ کو اپنے ملک میں ان کی آمد کی اطلاع ملی تو تین میل آگے بڑھ کر استقبال کیا اور انتہائی اعزاز کے ساتھ اپنے دارالحکومت میں لایا۔

کچھ عرصہ بعد ہندوستان کے بادشاہ جہاں گیر کو ان کی تشریف آوری اور بیجا پور میں سلطان ابراہیم عادل شاہ کے پاس قیام کا پتا چلا تو حکیم ہمام کے بیٹے حکیم خوشحال کو ان کی خدمت میں بھیجا اور تاکید کی کہ ہر حال میں آگرہ کے لشکر گاہ میں لے کر آئیں۔ قاضی نصیر الدین کو اس کا علم ہوا تو وہ بیجا پور سے برہان پور چلے گئے اور اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ گھر سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اسی اثنا میں شہزادہ شاہ جہان آگرہ سے دکن جاتے ہوئے برہان پور پہنچا تو قاضی ممدوح کو یاد فرمایا۔ قاضی صاحب نے پہلے تو شہزادے کے پاس جانے سے انکار کیا، لیکن بعد میں لوگوں کے کہنے سے چلے گئے۔ مگر آداب بادشاہت بجا

Marfat.com

نہیں لائے۔ شہزادے نے بھی اس کی پروا نہیں کی۔ بڑی عزت سے پیش آیا اور کہا کہ ہم آپ سے ملاقات کے بہت مشتاق تھے۔ قاضی نصیر الدین نے پوچھا' کس بنا پر؟ کہا' آپ کے کمالات علمی سنتے تھے۔ قاضی ممدوح نے جواب دیا' اب مجھ میں وہ کیفیت باقی نہیں رہی۔ قاضی کے اس جواب سے اگرچہ مجلس میں کچھ تکدر کے آثار پیدا ہوئے' لیکن بادشاہ نے اس کو اہمیت نہ دی اور معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔

شہزادہ شاہ جہان نے قاضی نصیر الدین سے عرض کیا کہ اس کے والد جہاں گیر بادشاہ ان سے ملاقات کے بہت خواہاں ہیں' وہ ہر حال میں آگرہ تشریف لے جائیں۔ بڑے اصرار کے بعد وہ آگرہ کو روانہ ہوئے۔ ابھی دربار شاہی میں نہیں پہنچے تھے کہ بادشاہ کی سواری باغ سے محل کی طرف جا رہی تھی۔ قاضی نصیر الدین نے سلام کرنا چاہا تھا کہ بادشاہ کی نظر ان پر پڑ گئی۔ وہ دوڑ کر آیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر بغل میں لے لیا۔ کچھ روز آگرہ میں رہے۔ اس کے بعد اپنے شہر برہان پور چلے گئے اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔

قاضی نصیر الدین کا حلقہ تلمذ بڑا وسیع تھا۔ جن علما نے ان سے کسب علم کیا' ان میں فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کے سربراہ اور اورنگ زیب عالم گیر کے استاد شیخ نظام الدین برہان پوری بھی شامل ہیں' جو بڑے عالم و فقیہ تھے۔

قاضی نصیر الدین برہان پوری نے ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء کو وفات پائی[1]۔

۱۵۹- شیخ نظام الدین تھانیسری

شیخ نظام الدین بن عبدالشکور عمری بلخی تھانیسری عالم و فقیہ اور زاہد و عابد تھے' مشائخ چشتیہ میں سے تھے' علم و عمل کے جامع اور ریاضت و مجاہدہ کے دلدادہ تھے' شیخ جلال الدین عمری تھانیسری (متوفی ۹۸۹ھ/۱۵۹۹ء) سے اخذ علم کیا جو ان کے چچا اور سسر تھے' ان کے بعد مسند مشیخت پر فائز ہوئے۔ ۱۰۰۷ھ کو سفر حج پر روانہ ہوئے۔ دوران سفر میں برہان پور پہنچے تو شیخ عیسیٰ سندھی نے اعیان و اکابر کے ساتھ برہنہ پا ان کا استقبال کیا۔ کچھ عرصہ برہان پور میں ٹھہرایا اور مستفید ہوئے۔ ۱۰۲۰ھ کو واپس ہندوستان آئے' واپسی پر بیجاپور سے گزرے تو وہاں کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا' اور بے حد احترام سے پیش آیا۔ بعدازاں اپنے وطن تھانیسر گئے اور درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔

جب شہزادہ خسرو نے اپنے باپ جہاں گیر بادشاہ کے خلاف بغاوت کی اور برسر پیکار ہوا تو وہ تھانیسر سے گزرتے ہوئے شیخ نظام الدین سے بھی ملا' جس کی وجہ سے جہاں گیر کے دل میں شیخ کے متعلق اپنی مخالفت کا

---

[1] مآثر رحیمی' ج ۳' حصہ اول' ص ۲۰ تا ۲۲- تاریخ برہان پور' ص ۱۵۳' ۱۵۴- تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۳۸' ۲۳۹- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۱۷' ۴۱۸-

Marfat.com

شبہ پیدا ہوا اور اس کا دل غصے سے بھر گیا' چنانچہ اس نے ہندوستان سے ان کی جلاوطنی کا حکم صادر کیا اور وہ بلخ چلے گئے' بلخ میں مدتِ مدید تک درس و افادہ میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ خود والیٔ بلخ سلطان امام قلی ازبک ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔ وہ ہفتے میں ایک مرتبہ ان کی خدمت میں آتا اور فیض حاصل کرتا۔

شیخ نظام الدین تھانیسری مصنف اور شارح بھی تھے۔ غزالی کی شرح سوانح' عراقی کی شرح لمعات' رسالہ حقیقیہ' رسالہ بلخیہ وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ تفسیر نظامی کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ اس عالم وفقیہ نے ۲۶ر شوال ۱۰۲۴ھ/ ۸ر نومبر ۱۶۱۵ء کو (ایک روایت کے مطابق ۱۰۲۶ھ/ ۱۶۱۷ء کو) بلخ میں انتقال کیا❶۔

۱۶۰-سید نظام الدین سندھی

سید نظام الدین بن نور محمد بن شکر اللہ بن ظہیر الدین بن شکر اللہ حسینی ٹھٹھوی سندھی' فقہ و اصول کے نامور علما میں سے تھے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو دہلی گئے اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین میں بھر پور حصہ لیا۔ تدوین فتاویٰ کے بعد سلطان اورنگ زیب عالم گیر سے فوجی منصب کے طالب ہوئے۔ مگر بادشاہ نے یہ درخواست قبول نہ کی' کیوں کہ وہ علما کو فوجی خدمات پر مامور نہ کرتا تھا۔ اس کے بدلے میں اورنگ زیب عالم گیر نے ان کا سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا' لیکن وہ اس وظیفے پر خوش نہ تھے اور تادم وفات دار الحکومت ہی میں رہے۔

تذکرہ علمائے ہند کی روایت کے مطابق سید نظام الدین ٹھٹھوی علم فقہ اور دیگر علوم میں عالم اجل اور ماہر تھے۔ جذبۂ رغبت طبع کی بنا پر دہلی تشریف لے گئے اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین میں شامل ہو کر فقہ کے بہت سے مشکل اور پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی کی۔

سید شیخ نظام الدین ٹھٹھوی' سندھ کے ایک بلند پایہ علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے' ان کے آبا و اجداد شیراز کے رہنے والے تھے' جنھوں نے بعد کو ہرات میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس خاندان کے ایک بزرگ قاضی شکر اللہ تھے جو حدیث' فقہ' اصول اور علوم عربیہ کے جید علما میں سے تھے اور تدین واتقا سے بہرہ ور۔

قاضی شکر اللہ ۹۰۶ھ/ ۱۵۰۱ء میں ہرات سے قندھار منتقل ہوئے۔ اکیس سال وہاں مقیم رہنے کے بعد ۹۲۷ھ/ ۱۵۲۱ء میں سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں تشریف لائے۔ اس زمانے میں سندھ کا حکمران شاہ بیگ تھا' اس نے ان کی خداداد صلاحیتوں اور حسن سیرت سے متاثر ہو کر انھیں ٹھٹھہ کی مسند قضا پر مامور کر دیا۔ اس منصب کی ذمہ داریوں کو انھوں نے نہایت وقار و احترام اور دبدبہ و طنطنہ کے ساتھ انجام دیا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ شاہ بیگ کے بعد اس کا بیٹا شاہ حسن تخت سندھ کا وارث بنا تو اس نے بعض تاجروں سے چند گھوڑے

❶ تذکرہ علمائے ہند' ص ۲۴۱' ۲۸۸- حدائق الحنفیہ ص ۴۰۱' ۴۰۲- خزینۃ الاصفیا' ص ۴۶۳ تا ۴۶۶- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۱۸' ۴۱۹- علمائے ہند کا شاندار ماضی' ج ۱' ص ۴۵۱ تا ۴۵۵-

Marfat.com

خریدے اور ان کی قیمت ادا کرنے میں عمداً تساہل اور تاخیر سے کام لیا۔ تاجروں نے ناامید ہو کر قاضی شکر اللہ سے رجوع کیا اور ان کی عدالت میں بادشاہ کے خلاف مدعی بن کر حاضر ہوئے۔ قاضی موصوف نے مدعی علیہ بادشاہ کو عدالت میں طلب کیا۔ بادشاہ' قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا تو اسے مدعی تاجروں کے ساتھ کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا۔ دعویٰ پیش ہوا' قاضی کے سوال پر مدعی علیہ بادشاہ نے تاجروں کے موقف کی تصدیق کی اور قیمت ادا نہ کرنے کا اقرار کیا۔ قاضی نے تاجروں کے حق میں فیصلہ دیا اور سلطان نے تاجروں کو قیمت ادا کر دی۔

فیصلے کے بعد قاضی شکر اللہ اپنی جگہ سے اٹھے۔ قاعدے کے مطابق آداب سلطانی بجا لائے اور بادشاہ کو اپنے پاس بٹھایا۔ اب بادشاہ نے تلوار نکالی جو اس نے قبا میں چھپا رکھی تھی اور اسے قاضی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: ''یہ تلوار میں نے آپ کے لیے رکھی تھی' اگر آپ صحیح فیصلہ نہ کرتے اور میرے لحاظ و آداب میں اپنے مقام و منصب کا خیال نہ رکھتے تو اس تلوار سے آپ کی گردن اڑا دیتا۔'' اس کے بعد بادشاہ اس فیصلے پر اظہار مسرت کرتے ہوئے عدالت سے باہر نکل گیا۔

اس نے تاجروں کو صرف اس بنا پر قیمت ادا کرنے میں تاخیر کی تھی کہ وہ قاضی شکر اللہ کو اپنے بارے میں آزمانا چاہتا تھا اور اسے یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ قاضی صحیح فیصلہ کرتا ہے یا نہیں۔ اس واقعہ سے کچھ عرصہ بعد قاضی شکر اللہ منصب قضا سے الگ ہو گئے اور لوگوں سے منقطع ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

تحفۃ الکرام میں تاریخ طاہری کے حوالے سے یہ سارا واقعہ بیان کر کے لکھا ہے کہ قاضی شکر اللہ نے بھی بادشاہ کی بات سن کر مسند کے نیچے سے برہنہ تلوار نکالی اور اسے دکھائی اور کہا: ''میں نے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ مبادا بادشاہ خلاف شرع قدم اٹھائے اور کوئی شخص اس کو ٹوکنے کی جرات نہ کرے' اگر یہ صورت حال پیدا ہوئی تو میں خود اس تلوار سے سیاست شرعی بجا لاؤں گا۔''

قاضی سید شکر اللہ کی نسبت سے میر سید نظام الدین کا خاندان ٹھٹھہ میں سادات شکر اللہی کے نام سے موسوم ہوا۔ اس خانوادہ کے تقریباً تمام افراد علم و فضل اور مرتبہ دینی کی وجہ سے یگانہ روزگار ہیں۔ اب بھی ان کا خاندان اپنے قدیم محلے میں آباد ہے [1]۔

۱۶۱- شیخ نظام الدین برہان پوری

شیخ نظام الدین برہان پوری' اکابر علمائے حنفیہ اور مشہور فقہائے ہند میں سے تھے۔ ان کا شمار ان خوش بخت اہل علم میں ہوتا ہے' جو علوم میں تبحر کامل تھے' اور جنھوں نے تحریر مسائل' نقل احکام اور محاسن فتویٰ نویسی

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے۔ تحفۃ الکرام' ص ۵۹۲ و ۶۰۰۔ تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۸۸۔ نزہۃ الخواطر ج ۴' ص ۱۳۸' ۱۳۹۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۱۹' ۴۲۰۔ ماہنامہ ''معارف'' (اعظم گڑھ) بابت ماہ جون ۱۹۴۷ء مضمون ''فتاویٰ عالم گیری کے دو سندھی مولفین اور ان کے اجداد''۔ برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ' ص ۲۷۷ تا ۲۷۹۔

Marfat.com

میں خاص طور سے نام پیدا کیا۔ ان کو قاضی نصیر الدین محدث برہان پوری سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ جس زمانے میں عالم گیر اپنے والد شاہ جہان بادشاہ کی طرف سے بلاد دکن میں والی کی حیثیت سے متعین تھا' اس زمانے میں اس نے شیخ نظام الدین کو اپنے ساتھ وابستہ کر کے اپنے خاص ندیموں اور مشیروں میں شامل کر لیا تھا۔ بعد ازاں جب وہ بادشاہ بنا اور ہندوستان کی عنان حکومت ہاتھ میں لی تو فتاویٰ عالم گیری (فتاویٰ ہندیہ) کی تدوین و ترتیب کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس نے دیگر فقہائے حنفیہ کی خدمات حاصل کر کے اس کا اہتمام شیخ نظام الدین کے سپرد کر دیا۔ اور ان فقہا میں سے چار کو اس طرح ان کے نائب مقرر کیا کہ فتاوے کے چار حصے کر کے ان چار فقہا میں تقسیم کر دیے' ان میں سے ایک قاضی محمد حسین جون پوری محتسب' دوسرے سید علی اکبر سعد اللہ خانی' تیسرے شیخ حامد جون پوری اور چوتھے مفتی محمد اکرم لاہوری تھے۔

شیخ نظام الدین برہان پوری نے اس خدمت جلیلہ کی انجام دہی کے لیے اپنی تمام مساعی وقف کر دیں' یہاں تک کہ اس ضخیم و مبسوط فتاویٰ کو دو سال کی مختصر مدت میں مرتب کر دیا۔ اس کے نتیجے میں عالم گیر نے ان کے منصب میں بڑا اضافہ کیا اور ان تمام تکلفات شاہی اور مروجہ درباری تسلیمات سے جو بادشاہ کے ہاں حاضری کے وقت ضروری تھیں اور جنھیں کورنش سے تعبیر کیا جاتا تھا' انھیں مستثنیٰ قرار دے دیا۔

عالم گیر کے نزدیک شیخ نظام الدین برہان پوری' علمی اعتبار سے اس قدر اونچا مرتبہ رکھتے تھے کہ وہ ان سے ہفتے میں تین دن امام غزالی کی احیاء علوم الدین اور فتاویٰ عالم گیری اور بعض کتب سلوک سے متعلق مذاکرہ کرتا۔

شیخ نظام الدین پورے چالیس سال عالم گیر سے وابستہ رہے اور اسی (۸۰) سال سے زائد عمر پائی۔ ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء میں فوت ہوئے۔ ان کے ایک بیٹے عبداللہ تھے' جنھوں نے اپنے باپ (شیخ نظام الدین برہان پوری) سے اخذ علم کیا اور اپنے عصر میں بڑی فضیلت و تکریم کے مستحق قرار پائے ❶۔

۱۶۲- سید نعمت اللہ فیروز پوری

سید نعمت اللہ بن عطاء اللہ نارنولی فیروز پوری کا لقب جلال الدین تھا۔ عالم کبیر اور فاضل وقت تھے۔ مولد و منشا نارنول ہے۔ بڑے ہوئے تو حصول علم کے لیے مختلف بلاد و امصار کی خاک چھانی' جون پور بھی گئے اور شیخ محمد افضل عثمانی جون پوری سے علم ہیئت پڑھا۔ پھر ازدواجی زندگی اختیار کی اور فیروز پور میں متوطن ہوئے۔ فیروز پور (مضافات کوڑ) میں سیف خاں نے انھیں کچھ زمین عطا کر دی تھی۔ شاہ جہان بادشاہ کا بیٹا شاہ شجاع جب باپ کی طرف سے بنگال کا والی بنا تو ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا تھا اور شہزادے کی

❶ عالم گیر نامہ' ص ۱۰۸۷- تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۴۲- مراۃ العالم' ص ۲۷۴- مآثر عالم گیری' ص ۵۲۹' ۵۳۰- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۴۲۰- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۰۱' ۱۰۲- تاریخ برہان پور' ص ۱۵۴- انفاس العارفین' ص ۲۴- برصغیر میں علم فقہ' ص ۲۶۹ تا ۲۷۷-

Marfat.com

بیعت اور خود ان کے زہد و تقویٰ کی بنا پر لوگوں میں انھیں بے حد مقبولیت اور شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ پھر جب شجاع شکست کھا گیا اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں بھاگ گیا تو زمامِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ نے انھیں پانچ ہزار روپے نقد مرحمت فرمائے۔

شیخ نعمت اللہ فیروز پوری متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں قرآن مجید کی ایک تفسیر ہے جو تفسیر جلالین کے انداز میں ہے۔ یہ تفسیر صرف چھ مہینے کی مختصر مدت میں لکھی اور ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء میں مکمل کی۔ ایک ترجمہ قرآن ہے جو جہاں گیر کے لیے لکھا اور اس کی طرف منسوب کیا۔ اس کا نام "تفسیر جہاں گیری" ہے۔

اس ہندی عالم دین نے ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء کو وفات پائی ❶۔

۱۶۳- مفتی نور الحق دہلوی

مفتی نور الحق دہلوی، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے فرزند کبیر تھے۔ ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، تعلیم و تربیت عظیم المرتبت باپ ہی کی آغوش میں پائی۔ شیخ و امام، عالم و عامل اور محدث و فقیہ تھے۔ کبار و مشاہیر مشائخ ہند میں سے تھے۔ علم حدیث اور دیگر علوم باپ ہی سے حاصل کیے۔ شیخ محدث کی زندگی ہی میں اکبر آباد (آگرہ) کے منصب قضا پر فائز ہو گئے تھے۔ بات یہ ہے کہ شاہ جہان زمانہ شہزادگی سے ان کی فضیلت علمی اور استعداد و قابلیت سے آگاہ اور اس کا معترف تھا۔ تخت نشین ہوا تو انتہائی اصرار سے یہ خدمت ان کے سپرد کی، اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے یہ خدمت نہایت دیانت و خوبی سے انجام دی۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

حق ایں منصب نازک نوعے کہ باید بہ تقدیم رساند

(حق یہ ہے کہ اس نازک منصب کی ذمہ داریوں کو انھوں نے خوب نباہا۔)

مفتی نور الحق زیادہ عرصہ اس منصب شاہی سے وابستہ نہیں رہے۔ انھوں نے زندگی کا بہت بڑا حصہ باپ کی جگہ مسند درس پر ہی گزارا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی وفات کے بعد منصب قضا سے دست کش ہو گئے تھے اور زمام تدریس ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس سلسلے میں عمل صالح کے الفاظ ہیں:

پس از رحلت آں جناب، نور الحق خلف الصدقش کہ در علم و فضل شہرۂ آفاق بود مدت مدید صدر آرائے مدرسہ استفادہ گشتہ۔

(شیخ محدث کی وفات کی بعد ان کے خلف الصدق مفتی نور الحق، جو علم و فضل میں شہرۂ آفاق تھے، طویل مدت تک مسند درس پر فائز رہ کر لوگوں کو مستفید فرماتے رہے۔)

شیخ محدث کو اپنے اس عظیم فرزند سے انتہائی محبت تھی اور وہ مختلف مجالس اور خطوط میں اس کا اکثر

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۲۳، ۴۲۴- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۶۶ تا ۶۸- گنج ارشدی- مرأۃ العالم-

Marfat.com

اظہار بھی کرتے تھے' وہ انھیں اپنے ''وجود ثانی'' سے تعبیر کرتے اور ان کے علم وفضل کے مداح تھے۔

مفتی نور الحق کو تصنیف وتالیف سے بہت دلچسپی تھی۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔

تیسیر القاری شرح صحیح البخاری:۔ یہ شرح فارسی میں لکھی اور اورنگ زیب عالم گیر کے نام سے منسوب کی۔ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں مطبع علوی محمد علی حسن خاں لکھنؤ سے شائع ہوتی تھی۔ شرح شمائل ترمذی' تفسیر سورۃ الفاتحہ' حاشیہ علی شرح الجامی' شرح عضدی' شرح مطالع الانوار' شرح ہدایۃ الحکمۃ' شرح قران السعدین' رسالہ در بیان رویا' محی القلوب' زبدۃ التواریخ۔ ایک رسالہ تشہد میں انگشت شہادت اٹھانے کے بارے میں لکھا۔

فرحت الناظرین میں ہے کہ شیخ نور الحق دہلوی نے صحیح بخاری کی مکمل شرح لکھی اور احادیث کی مشکلات اور پیچیدگیوں کو حل کیا۔ امام ابوحنیفہ کے مذہب (حنفی) کی تقویت کے لیے انھوں نے بہت کوشش اور جدوجہد کی اور اس مذہب کی مخالف احادیث کی مستحسن تاویلات فرمائیں۔

مفتی نور الحق شاعر بھی تھے اور مشرقی تخلص کرتے تھے۔ فرحت الناظرین کی روایت کے مطابق انھوں نے تحفۃ العراقین کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی۔ اور ایک دیوان بھی تھا جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ یہ مثنوی اور دیوان اب دست یاب نہیں ہیں۔

اس جلیل القدر ہندی عالم وفقیہ اور شیخ ومحدث نے ۹ر شوال ۱۰۷۳ھ/ ۷ر مئی ۱۶۶۳ء کو نوے (۹۰) سال کی عمر پا کر داعی اجل کو لبیک کہا اور دہلی میں اپنے باپ کے احاطہ قبرستان میں دفن ہوئے [1]۔

۱۶۴- شیخ نور محمد سہارن پوری

شیخ نور محمد بن محمود انصاری سہارن پوری' سہارن پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ شیخ عزیز اللہ بن رکن الدین گنگوہی سے علم فقہ کی تحصیل کی۔ عالم وفقیہ اور صالح بزرگ تھے۔

۲۰ر ربیع الاول ۱۰۹۱ھ/ ۱۰ر اپریل ۱۶۸۰ء کو ان کا انتقال ہوا [2]۔

۱۶۵- شیخ نور محمد جون پوری

شیخ نور محمد بن نصیر الدین انصاری جون پوری' جمعۃ المبارک کی رات ۱۷ر جمادی الاخریٰ ۹۷۵ھ/ ۲ر دسمبر

[1] عمل صالح' ج ۳' ص ۲۹۶- مآثر الکرام دفتر اول' ص ۱۸۸' ۱۸۹- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۶۸ تا ۷۱- حدائق الحنفیہ ص ۴۱۸- سبحۃ المرجان' ص ۵۳- ابجد العلوم' ص ۹۰۱- خزینۃ الاصفیا' ص ۹۸۹- تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۴۶- اتحاف النبلاء' ص ۴۲۶' ۴۲۷- حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی' ص ۲۵۷ تا ۲۶۱- تذکرۂ شیخ عبدالحق محدث دہلوی' ص ۳۱۱ تا ۳۱۳- قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب' ص ۱۹۸-

[2] نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۲۸ بحوالہ مرآۃ جہاں نما-

Marfat.com

۱۶۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ سن رشد کو پہنچے تو اپنے والد گرامی شیخ نصیر الدین انصاری جون پوری (متوفی ۴ جمادی الاخری ۱۰۷۶ھ/ ۱۹ دسمبر ۱۶۶۵ء) اور دیگر علما سے اخذ علم کیا۔ تا آنکہ بلند علمی مرتبے کو پہنچے اور قرأت و تجوید میں کمال حاصل کیا۔ فقہ میں بھی مہارت پیدا کی اور جون پور میں زاویہ شیخ بدیع الدین کی مسجد میں خطابت پر مامور ہوئے۔

شیخ نور محمد کا خطابت و سلوک کے علاوہ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری نے ان سے کافیہ کے کچھ سبق پڑھے تھے۔

شیخ نور محمد تقریباً پچاسی سال کی عمر پا کر ۲۹ رجب ۱۰۵۹ھ/ ۲۹ جولائی ۱۶۴۹ء کو راہی ملک بقا ہوئے[1]۔

۱۶۶- شیخ نور محمد پٹنی

شیخ نور محمد حنفی نقشبندی پٹنی عالم و فقیہ اور صاحب فضل و صلاح تھے۔

وقت کے معروف اساتذہ سے اخذ علم کیا۔ کشور ہند کے متعدد خدا دوست حضرات سے ملے اور بلند مرتبت مشائخ امجاد سے مستفیض ہوئے۔ بعد میں حضرت مجدد الف ثانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے اور اذکار و اشغال اور تصوف و معرفت کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ حضرت مجدد نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور واپس وطن جانے کی اجازت فرمائی۔ انھوں نے دریائے گنگا کے کنارے سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں ایک مسجد تعمیر کر لی تھی۔ ان سے بہت سے اہم لوگوں نے استفاضہ کیا[2]۔

۱۶۷- مفتی وجیہ الدین گوپاموی

مفتی وجیہ الدین بن عیسیٰ بن آدم بن محمد صدیقی گوپاموی، شیخ جعفر بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی کی اولاد سے تھے۔ ممتاز عالم، تیز ذہن اور صاف دل بزرگ تھے۔ تقریر نہایت عمدہ کرتے تھے۔ علم معانی و بیان میں اپنے دور کے عدیم المثال عالم تھے۔ ولادت یک شنبہ کے روز ۲ رجب ۱۰۰۵ھ/ ۹ فروری ۱۵۹۷ء کو اودھ کے مشہور مرکز علم گوپامؤ میں ہوئی۔ اپنے جد امجد شیخ جعفر اور دیگر علمائے عصر سے تعلیم حاصل کی۔ علم و تحقیق کی گود میں پرورش پائی اور تصوف و طریقت کے ماحول میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ان کے والد مفتی عیسیٰ بن آدم گوپاموی (متوفی ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۲۳ھ/ ۲۰ جنوری ۱۶۱۵ء) بہت بڑے عالم اور گوپامؤ کی مسند افتا پر فائز تھے اور دور جہاں گیری کے نامور عالم تھے۔ والد کی وفات کے بعد یہ مسند افتا ان کے حصے میں آئی۔ ان کے دادا شیخ آدم بن محمد صدیقی گوپاموی (متوفی ۱۰۰۱ھ/ ۱۵۹۳ء) بھی گوپامؤ کے مفتی تھے اور ان کی وفات کے بعد ان

1. تجلی نور، ج ۲، ص ۶۰- تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۲۳، ۲۴، ۷- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۴۲۸
2. زبدۃ المقامات، ص ۳۵۱ تا ۳۵۴- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۲۹۔

Marfat.com

کے بیٹے شیخ عیسی اس منصب پر متعین ہوئے۔

مفتی وجیہ الدین صدیقی گوپاموی کی وسعت فکر ونظر اور علم فقہ میں عبور کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل تھے۔انھوں نے فتاویٰ عالم گیری کے چوتھے حصے کی تکمیل کی۔ یہ اہم خدمتِ علمی انجام دینے کے لیے دس فقہائے کرام ان کے زیر نگرانی کام کرتے تھے۔

مفتی وجیہ الدین نے اشاعت علم کی غرض سے اپنے وطن گوپامئو میں سلسلۂ درس شروع کر رکھا تھا' جس میں دور دراز سے شائقین علم استفادے کے لیے آتے تھے۔جن حضرات نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا' ان میں شیخ محمد آفاق لکھنوی (متوفی ۲۲ر ربیع الثانی ۱۰۸۹ھ/۳ر جون ۱۶۷۸ء) قاضی عصمت اللہ بن عبدالقادر فاروقی اور دیگر بے شمار اہل علم شامل ہیں۔

فتاویٰ عالم گیری کی تدوین وتالیف میں شرکت کے علاوہ مفتی ممدوح نے اور بھی کئی تصنیفی کام کیے' مثلاً حصن حصین کی شرح' خیالی اور مطول پر حواشی وتعلیقات' تصوف وسلوک سے متعلق رسائل حلقۂ اہل علم میں مشہور ہیں ___ علم معانی اور علم بیان میں خصوصاً درک حاصل تھا۔اس کی شہادت میں فرحت الناظرین کے یہ الفاظ قابل ذکر ہیں:

خصوصاً در علم معانی وبیان عدیم المثال عصر بود۔

(علم معانی اور بیان میں بالخصوص اپنے وقت کے بے مثال عالم تھے۔)

فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب وتدوین میں انھوں نے جو محنت کی اس کا ثبوت ''معارف'' (اعظم گڑھ) کی مندرجہ ذیل عبارت سے مل سکتا ہے۔مرقوم ہے:

''زمخشری کی قسطاس'' کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش خاں لائبریری (پٹنہ) کا لکھا ہوا موجود ہے۔اس پر شیخ وجیہ الدین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت ہے۔کاتب اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''عبارت منقول از دستخط مولانا وجیہ الدین رئیس علمائے فتاویٰ عالم گیری''

عبارت کا یہ آخری ٹکڑا واضح کرتا ہے کہ فتاویٰ عالم گیری کی تالیف میں مفتی وجیہ الدین گوپاموی کا بہت بڑا حصہ تھا اور وہ اس میں کوئی ممتاز حیثیت رکھتے تھے' اگرچہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

یہ بزرگ خاندانی لحاظ سے صاحبِ افتا تھے۔ان کے والد شیخ عیسی بھی مفتی تھے جو اپنے والد مفتی آدم کی وفات کے بعد مسند افتا پر فائز ہوئے تھے۔کچھ دن داراشکوہ کے مقربین میں بھی شامل رہے۔جلوس عالم گیری کے نویں سال عالم گیر کے حضور پہنچے اور منصب سے سرفراز ہوئے۔۵ر جمادی الاخریٰ ۱۰۸۳ھ/۱۸ر ستمبر ۱۶۷۲ء کو دہلی میں وفات پائی اور اپنے اصل وطن گوپامئو میں دفن کیے گئے [1]۔

---

[1] فرحت الناظرین' ص ۸۵- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۳۱ تا ۱۳۴- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۳۰' ۴۳۱- ''معارف'' (اعظم گڑھ) دسمبر ۱۹۴۶ء

Marfat.com

ہ

۱۶۸- سید ہدایت اللہ حسنی نصیر آبادی

سید ہدایت اللہ بن اسحاق بن معظم بن احمد بن محمود بن علا حسینی نصیر آبادی۔ نصیر آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے بڑے بھائی سید احمد بن اسحاق حسینی نصیر آبادی (متوفی ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۷ء) سے اخذ علم کیا۔ طویل عرصہ ان کی خدمت میں رہے' یہاں تک کہ فقہ واصول اور علوم عربیہ میں ماہر کامل ہوئے۔

سید ہدایت اللہ نصیر آبادی' سید قطب الدین محمد بن احمد حسنی مدنی کی اولاد سے تھے اور اپنے وقت کے عالم وفاضل بزرگ تھے۔ صاحب نزہۃ الخواطر علامہ سید عبدالحی حسنی لکھنوی اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرا (سید عبدالحی حسنی) کا سلسلۂ نسب سات واسطوں سے سید ہدایت اللہ تک پہنچتا ہے۔ انھوں نے سید ہدایت اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قلمی رسالہ بھی دیکھا ہے جو خراج کے موضوع سے متعلق تھا[1]۔

ی

۱۶۹- شیخ یاسین بنارسی

شیخ یاسین کا سلسلۂ نسب یہ ہے: یاسین بن احمد بن محمد بن عبدالرحیم بن اوحد الدین صدیقی جون پوری ثم بنارسی' ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء کو نواح بنارس کے ایک گاؤں ''منڈواڈیہ'' میں پیدا ہوئے اور شیخ طیب بن معین بنارسی (متوفی ۸ر شوال ۱۰۴۲ھ/ ۸ر اپریل ۱۶۳۳ء) کی مہد علم وتصوف میں تربیت پائی۔ صرف' نحو (ارشاد تک) اور فقہ (کنز تک) ان سے کتابیں پڑھیں۔ پھر جون پور چلے گئے۔ وہاں سات یا آٹھ سال مقیم رہے۔ اس عرصے میں جون پور کے دو اعاظم رجال ___ شیخ محمد افضل جون پوری (متوفی ۱۹ر ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ/ ۲۰ر مارچ ۱۶۵۲ء) اور شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ر رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ/ ۱۹ر دسمبر ۱۶۷۲ء) ___ سے نحو' منطق' فلسفہ' فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ شیخ محمد رشید جون پوری سے سند حدیث بھی حاصل کی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۲۳ر ربیع الثانی ۱۰۵۲ھ/ ۱۱ر جولائی ۱۶۴۲ء) کے فرزند کبیر مفتی نور الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۳ء) سے بھی حدیث کی سند لی۔ حتیٰ کہ اپنے وقت کے عالم وفقیہ ہوئے۔

بعد ازاں شیخ طیب کی خدمت میں گئے اور ان سے وابستگی اختیار کی اور ذکر وتلقین کا درس لیا۔ شیخ طیب نے ۱۰۴۰ھ میں انھیں وثیقہ خلافت لکھ کر دیا اور موضع ''کوڑہ'' جانے کو کہا۔ کوڑہ جا کر بھی حصول علم میں

[1] نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۳۳۔

Marfat.com

مشغول رہے وہاں شیخ جمال اولیا گوروی (متوفی ۲۹ رمضان ۱۰۴۷ھ/ ۴ فروری ۱۶۳۸ء) سے ہدایہ کے کچھ حصے اور تفسیر بیضاوی کا درس لیا۔ پھر منڈواڑیہ کو معاودت فرمائی لیکن ان کے شیخ اور استاد شیخ طیب وہاں پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ تمام عمر افادہ وعبادت میں صرف کر دی اور بے شمار مشائخ وعلما کو مستفید فرمایا❶۔

۱۷۰- مولانا یتیم اللہ احمد نگری

مولانا یتیم اللہ بن جمال بن حسین حسنی حسینی قادری احمد نگری۔ شیخ عبدالوہاب بن شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد سے تھے۔ مقام ولادت اعمال احمد نگر کا ایک گاؤں "پتری" ہے، تربیت بھی وہیں پائی، کبار اساتذہ سے علم حاصل کیا اور عالم وفقیہ ہوئے۔ ان کے والد بھی عالم دین تھے اور درس وتدریس میں مشغول رہتے تھے۔ حصول علم کے بعد مولانا یتیم اللہ نے بھی باپ کی جگہ یہی سلسلہ شروع کیا۔ "گلزار ابرار" کے مصنف شیخ محمد بن حسن غوثی ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۵ء میں احمد آباد میں ان سے ملے تھے۔ اس کے پانچ سال بعد ۱۰۰۸ھ یا ۱۰۰۹ھ/ ۱۶۰۰ء یا ۱۶۰۱ء میں فوت ہوئے❷۔

۱۷۱- میر سید یحییٰ بلگرامی

میر سید یحییٰ بن عبدالواحد بن ابراہیم بن قطب الدین حسینی بلگرامی کی ولادت ۲ ذی القعدہ ۹۸۵ھ/ ۱۱ جنوری ۱۵۷۸ء کو ہوئی اور علم ومعرفت کے ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے والد گرامی میر سید عبدالواحد بلگرامی (متوفی ۳ رمضان المبارک ۱۰۱۷ھ/ یکم دسمبر ۱۶۰۸ء) سے علم حاصل کیا اور فضل وکمال کو پہنچے پھر درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔ اپنے وقت کے شیخ اور عالم وفقیہ تھے۔ نیک، متقی زاہد وعابد، قانع اور متوکل علی اللہ تھے۔ قرآن مجید کے حافظ تھے۔ تلاوت اس انداز سے کرتے کہ سامعین پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ انسانی شکل میں فرشتہ تھے، دنیا اور اس کے مال واسباب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ سلوک وطریقت سے متعلق ایک کتاب "میزان الاعمال ومعیار الاحوال" کے نام سے تصنیف کی۔ بلگرام میں فوت ہوئے اور اپنے باپ میر سید عبدالواحد بلگرامی کے قریب دفن کیے گئے❸۔

۱۷۲- شیخ یعقوب صرفی کشمیری

مولانا یعقوب بن شیخ حسن صرفی کشمیری گنائی عاصمی، خطۂ کشمیر کے عالم کبیر، ممتاز شیخ اور فاضل بزرگ

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۴۴ بحوالہ گنج ارشدی۔

❷ اذکار ابرار، ص ۲۳۱ بضمن یاد شیخ جمال بتھری۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۳۵

❸ مآثر الکرام، ص ۴۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۳۸۔

Marfat.com

تھے۔ ۹۰۸ھ/۱۵۰۳ء کو کشمیر میں پیدا ہوئے۔ فطانت وفراست اور زیرکی و بزرگی کے آثار صغر سنی ہی میں ہویدا تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ حصول علم کے لیے اپنے دور کے جلیل القدر علما کی خدمت میں حاضری دی۔ صرف ونحو اور فقہ کی کتابیں مولانا رضی الدین کشمیری سے پڑھیں۔ منطق، فلسفہ وحکمت اور معانی و بیان کا علم شیخ بصیر الدین سے حاصل کیا اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ شعر وعروض کے لیے مولانا عبدالرحمٰن جامی کے شاگرد شیخ محمد آنی سے استفادہ کیا۔ حصول علم کے بعد اخذ طریقت کا شوق پیدا ہوا اور سمرقند کی راہ لی۔ وہاں شیخ حسین خوارزمی کے حلقۂ طریقت میں داخل ہوئے اور کچھ عرصہ ان کے پاس مقیم رہے۔ پھر واپس اپنے وطن کشمیر آ گئے اور سلسلۂ تدریس شروع کیا۔ اس کے بعد عازم حجاز ہوئے اور سعادت حج حاصل کی۔ مدینہ منورہ گئے۔ حجاز کے علمائے عظام سے استفادہ کیا اور شیخ ابن حجر ہیثمی مکی سے کتب حدیث کا درس لیا۔ حجاز مقدس سے بغداد کا عزم فرمایا اور وہاں کے مشائخ کرام سے مستفیض ہوئے۔ بغداد سے اپنے وطن کشمیر آئے اور طویل مدت تک کشمیر میں اقامت گزین رہے۔ اس اثنا میں بہت سے علما وطلبا کو مستفید فرمایا۔ دوبارہ پھر دل میں سفر حجاز کے شوق نے کروٹ لی اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ حجاز سے واپسی پر تفسیر، حدیث اور فقہ کی بہت سی نفیس کتابیں ساتھ لائے، اور انھیں علمائے کشمیر میں مروّج کیا۔ اب کشمیر میں باقاعدہ درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا اور بے شمار تشنگان علوم کی علمی تشنگی بجھائی۔ اکابر واعاظم رجال ہند میں سے جو حضرات ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، ان میں حضرت شیخ مجدد الف ثانی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

شیخ یعقوب صرفی کشمیری گیارھویں صدی ہجری کے بہت بڑے ہندی عالم تھے، اور تمام اصناف علوم، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علوم عربیہ، فلسفہ وحکمت، معانی و بیان اور صرف ونحو پر عبور رکھتے تھے۔ عظیم المرتبت مصنف بھی تھے۔ یہ کتابیں ان کی تصانیف میں شامل ہیں: تفسیر قرآن حکیم جو نامکمل رہی، شرح صحیح بخاری، مغازی النبوۃ، حاشیہ توضیح وتلویح، مسلک الاخیار، کتاب مناسک حج، روائح، وامق وعذرا، رسالہ اذکار، لیلیٰ مجنوں، مقامات مرشد، مولانا عبدالرحمٰن جامی کی جواہر خمسہ کا جواب، شرح رباعیات وغیرہ۔

عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں مولانا یعقوب کی شخصیت اور علم وفضل کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ہمایوں بادشاہ اور شہنشاہ جلال الدین اکبر کو ان سے بڑی عقیدت تھی، ان دونوں بادشاہوں سے ان کو گفتگو اور مصاحبت کا شرف حاصل تھا۔ اکبر کے تو بڑے منظور نظر اور مکرم ومحترم تھے، طبعاً فیاض اور ایثار پیشہ تھے۔

شیخ یعقوب صرفی شاعر بھی تھے، لیکن بدایونی اپنے خاص انداز سے ان کی شعر گوئی پر میٹھی اور تیکھی تنقید کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں: ان کے مرتبے کے لحاظ سے شعر گوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی لیکن اس وادی میں بھی ان کا عمل دخل تھا۔

Marfat.com

بہر حال شیخ یعقوب صرفی دور اکبری کے علمائے عظام میں سے تھے اور جامعیت علم کی بنا پر ہر طبقے کے اہل علم میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ خود شاہ ہند جلال الدین اکبر ان کی بہت تکریم کرتا تھا۔ عبدالقادر بدایونی سے ان کو خاص تعلق خاطر تھا۔ انھوں نے بدایونی کے نام چند خط بھی لکھے' جو منتخب التواریخ میں درج ہیں۔ بدایونی بھی ان کی توصیف کرتے اور احترام سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں شیخ یعقوب صرفی حجاز سے واپس کشمیر پہنچے' وہاں شیعہ سنی جھگڑے زوروں پر تھے۔ جب یعقوب چک نے قاضی موسیٰ کو شیعہ طریقے سے خطبہ نہ پڑھنے پر شہید کرا دیا اور اہل سنت کے لیے حالات بہت ناساز گار ہو گئے' تو شیخ یعقوب' بابا داؤد کو ساتھ لے کر اکبر کے پاس لاہور پہنچے اور کشمیری عوام کی طرف سے دعوتِ حملہ دی۔ اکبر تو اس موقعے کا پہلے سے منتظر تھا۔ اس نے اپنی فوجیں بھیجیں اور اکتوبر ۱۵۸۶ء کو کشمیر مملکت مغلیہ کا حصہ ہو گیا۔

اس کے آگے وہ لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد اکبر اور شیخ کے درمیان خاص روابط استوار ہو جانا عجب نہیں۔

اکرام صاحب مزید رقم طراز ہیں کہ ''شیعہ سنی مسئلے پر شیخ یعقوب کے جو شدید احساسات تھے' اس کا اندازہ ان اقدامات سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے قاضی موسیٰ کی شہادت پر شروع کیے۔ لیکن اس کی مثالیں اس سے پہلے بھی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد اپنی کتاب ''پاکستان میں فارسی ادب'' (جلد اول) میں لکھتے ہیں کہ شیخ یعقوب صرفی کے سری نگر میں ایک استاد تھے' ملا بصیر' بڑے بڑے صاحب عظمت بزرگ ان کے حلقۂ تلمذ میں شریک تھے۔ مثلاً شیخ داؤد خاکی۔ لوگوں نے مشہور کیا کہ ملا بصیر بھی مائل بہ تشیع ہیں' تو شیخ صرفی ان کے مدرسے سے اٹھ آئے۔''

مجدد الف ثانی' شیخ یعقوب صرفی کے تلمیذ تھے اور وہ شیعہ کے مخالف تھے۔ انھوں نے ''رد روافض'' ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ اس ضمن میں شیخ محمد اکرام مرحوم بطور استفسار تحریر فرماتے ہیں کہ ''کیا (حضرت مجدد میں) اس نقطہ نظر کے پیدا کرنے یا اسے تقویت دینے میں ان (حضرت مجدد) کے مرشد اور استاد شیخ یعقوب صرفی کا اثر بھی کار فرما تھا[1]۔''

بہر حال شیخ یعقوب صرفی اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ انھوں نے پنجشنبہ کے روز' بعد نماز عشاء ۱۲/ ذی القعدہ ۱۰۰۳ھ/ ۹/ جولائی ۱۵۹۵ء کو وفات پائی[2]۔

---

[1] رود کوثر' ص ۲۲۵' ۲۲۶۔

[2] منتخب التواریخ' ج ۳' ص ۱۴۲ تا ۱۴۹۔ تاریخ کشمیر اعظمی' ص ۱۱۰' ۱۱۱۔ تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۵۵۔ حدائق الحنفیہ' ص ۳۹۴' ۳۹۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۴۳۸' ۴۳۹۔

Marfat.com

۱۷۳-قاضی یوسف بلگرامی

قاضی یوسف بن ابوالمکارم بن ابوالفتح بن عبدالدائم عثمانی بلگرامی کا مولد بلگرام ہے۔ بڑے ہوئے تو کچھ عرصے تک اپنے شہر بلگرام ہی میں حصول علم میں مصروف رہے' بعدازاں عازم الہ آباد ہوئے اور شیخ محبت اللہ الہ آبادی سے کتب درسیہ پڑھیں۔ اپنے دور کے عالم وفقیہ تھے۔ قاضی یوسف کے والد قاضی ابوالمکارم بلدۂ بلگرام کے عہدۂ قضا پر متعین تھے۔ والد کی وفات کے بعد شاہ جہان کے نویں سال جلوس میں قاضی یوسف کو ان کی جگہ قاضی بنایا گیا۔ داراشکوہ نے سولہ سوالوں پر مشتمل ایک رسالہ لکھ کر شیخ محبّ اللہ الہ آبادی کو بھیجا تھا' اس کا جواب عربی اور فارسی میں قاضی یوسف بلگرامی نے رسالے کی شکل میں تحریر کیا اور اس کا نام "ہدیۃ السلطانیہ" رکھا۔

قاضی یوسف بلگرامی نے ۵/ذی القعدہ ۱۰۸۴ھ/ یکم فروری ۱۶۷۴ء کو بلگرام میں وفات پائی ❶۔

۱۷۴-مولانا یوسف لاہوری

مولانا یوسف لاہوری' عالم کبیر اور علامہ عصر تھے۔ ہمیشہ مصروف عمل رہتے۔ کثرت درس و افادہ' وعظ و تذکیر' صلاح وتقویٰ اور تفسیر وتوضیح مسائل میں اس وقت کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ مولانا جمال الدین تلوی لاہوری کے تلمیذ تھے۔ بادشاہ نامہ میں عبدالحمید لاہوری لکھتے ہیں کہ پچاس سال تک لاہور میں سرگرم تدریس رہے۔ (قریب پنجاہ سال بافادہ پرداخت) پچاس سال کی اس طویل مدت میں لاتعداد علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ تفسیر قرآن' حلو کلام اور حسن بیان میں بے مثال تھے۔ حسن اخلاق اور حسن سیرت کے زیور سے آراستہ تھے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں اسی (۸۰) سال عمر پا کر فوت ہوئے۔

مرآۃ العالم کی روایت کے مطابق اوائل عمر میں کچھ عرصے تک خدمت سلطانیہ کو ترجیح دیتے رہے' لیکن بعد کو یہ سلسلہ ترک کر دیا تھا اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر درس وافادہ کو مطمح نظر ٹھہرالیا تھا۔ اس خدمت علمی کے لیے انھوں نے مرکز علم لاہور کو منتخب فرمایا۔ بارہ سال یہ خدمت انجام دی۔ اس اثنا میں بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا' جن میں شیخ عبداللطیف سلطان پوری اور علامی سعد اللہ خاں وزیر کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں ❷۔

۱۷۵-مفتی یوسف کاشمیری

مفتی یوسف کشمیری' مفتی یوسف چچک کے نام سے معروف تھے۔ بے مثال عالم اور بے نظیر فقیہ

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۴۴۰' ۴۴۱ بحوالہ شرائف عثمانی۔

❷ بادشاہ نامہ ج ۲' ص ۳۴۲- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۲۰۰- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۴۴۱-

Marfat.com

تھے۔ مباحثہ و معارضہ میں ایسے تیز اور حاضر جواب کہ کوئی انھیں زیر نہ کر سکا۔ اس دور کے علما میں سے ملا فاضل اور ملا عبدالرزاق کشمیری بالخصوص ان کے علمی کمالات کے معترف تھے اور کسی بحث میں انھیں مغلوب نہ کر سکتے تھے۔ اکثر خواجہ خاوند محمود بخاری کشمیری کی خدمت وصحبت میں رہتے اور ان سے دقائق علم فقہ اور مشکلات تفسیر قرآن کے سلسلے میں استفادہ کرتے۔ فقرا و مشائخ سے بڑی محبت سے پیش آتے۔ نہایت تواضع اور انکسار سے ملتے اور ان کی خدمت کو بڑی سعادت سمجھتے۔

مفتی یوسف چچک کے فرزند ملا عبدالنبی تھے' وہ بھی اپنے وقت میں دیارِ کشمیر کے فقیہ اور جلیل القدر عالم تھے ❶۔

۱۷۶-مولانا یونس کردی

مولانا یونس بن ابو یونس حسینی کردی' گیارھویں صدی ہجری میں کشورِ ہند کے فحول علما میں سے تھے۔ محدث وفقیہ تھے۔ ہمیشہ حدیث' فقہ اور فنون عربیہ کے درس وتدریس میں مشغول رہتے۔ زہد وقناعت اور اتباع سنت میں مرتبہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ اپنے وطن کڑہ سے کالپی منتقل ہو گئے تھے۔ سید محمد بن ابو سعید حسینی ترمذی نے مطول تک ان سے درسی کتابیں پڑھیں اور حدیث کی سند حاصل کی ❷۔

❶ تاریخ کشمیر اعظمی' ص ۱۴۸- تذکرہ علمائے ہند' ص ۲۵۷- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۴۱' ۴۴۲-

❷ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۴۲- بحوالہ ضیاء محمدی-

Marfat.com

مراجع ومصادر

فقہائے ہند کی اس جلد چہارم حصہ دوم کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ آئین اکبری: ابوالفضل۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۹۳ء

۲۔ آثار بدایوں: حافظ فضل اکبر بدایونی۔ وکٹوریہ پریس، بدایوں۔ ۱۹۱۵ء/ ۱۸۷۸ء۔

۳۔ ابجد العلوم: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع صدیقیہ، بھوپال۔ ۱۲۹۵ھ۔

۴۔ اتحاف النبلا: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع نظامی، کان پور۔ ۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۱ء۔

۵۔ اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء۔

۶۔ اخبار الصنادید: حکیم نجم الغنی رام پوری۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۸ء۔

۷۔ ادبیات سرحد: رضا ہمدانی۔ نیا مکتبہ، پشاور۔ ۱۹۵۵ء

۸۔ ادبیات سرحد: فارغ بخاری۔ نیا مکتبہ، پشاور۔ ۱۹۵۳ء

۹۔ اذکار ابرار: (ترجمہ گلزار ابرار) تصنیف محمد غوثی شطاری مانڈوی۔ ترجمہ فضل احمد جیوری، مطبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء۔

۱۰۔ اذکار الابرار: شاہ محمد تقی حیدر۔ شاہی پریس، لکھنؤ۔ ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء۔

۱۱۔ الاعلام: خیر الدین زرکلی۔

۱۲۔ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام: مفتی قطب الدین محمد نہروالی المکی۔ لیٹرگ بروکلیس۔ ۱۸۵۹ء

۱۳۔ اقبال نامہ جہاں گیری: مرزا محمد عرف معتمد خاں بخشی۔ نول کشور، لکھنؤ۔

۱۴۔ اکبر اینڈ دی جیوٹس: سی ایچ، پین۔ طبع لندن۔ ۱۹۲۶ء

۱۵۔ اکبر نامہ: ابوالفضل۔ مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ۔

۱۶۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبع احمدی دہلی،

۱۷۔ انفاس العارفین: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۷ء

Marfat.com

۱۸۔ انوار العارفین: حافظ محمد حسین مراد آبادی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۷۶ء

۱۹۔ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون: اسماعیل پاشا۔ مطبع بہیہ، استنبول ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۵ء

۲۰۔ بادشاہ نامہ: عبدالحمید لاہوری۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۶۷ء۔ ۱۸۷۶ء

۲۱۔ البدر الطالع: امام محمد بن علی شوکانی۔ طبع قاہرہ، مصر۔ ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۱۹ء

۲۲۔ برصغیر میں علم فقہ: محمد اسحاق بھٹی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ ۱۹۷۳ء

۲۳۔ برہان پور کے سندھی اولیا المعروف بہ تذکرہ اولیائے سندھ: سید محمد مطیع اللہ راشد برہان پوری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی طبع اول۔ ۱۹۵۷ء

۲۴۔ بزم تیموریہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

۲۵۔ بوستان اخبار: سعید احمد ماہروی مطبوعہ آگرہ۔ ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء۔

۲۶۔ التاج المکلل: نواب صدیق حسن خاں۔ المطبعۃ الہندیۃ العربیہ۔ بمبئی۔ طبع ثانی۔ ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء

۲۷۔ تاریخ برہان پور۔ خلیل الرحمٰن برہان پوری۔ مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء۔

۲۸۔ تاریخ برہان مآثر: سید علی طباطبائی۔ ناشر مجلس مخطوطات فارسیہ، حیدر آباد دکن۔ مطبع جامعہ، دہلی۔ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء

۲۹۔ تاریخ تحفۃ الکرام: جلد اول، دوم، سوم، مطبع حسینی اثنا عشری، محلہ فراش خانہ، وزیر گنج، لاہور۔ ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء و مطبع ناصری۔

۳۰۔ تاریخ شیراز ہند جون پور: سید اقبال حسین۔ ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس، جون پور، ۱۹۶۳ء

۳۱۔ تاریخ طاہری: سید طاہر محمد نسیانی ٹھٹھوی۔ سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد، سندھ ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء

۳۲۔ تاریخ کشمیر اعظمی: خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔ ناشر غلام محمد نور محمد، تاجران کتب سری نگر۔ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء

۳۳۔ تاریخ مشاہیر چشت: خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی۔ ۱۹۵۳ء

۳۴۔ تاریخ معصومی: میر محمد معصوم بھکری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی ۱۹۵۹

۳۵۔ تاریخ النوائط: نواب عزیز جنگ بہادر۔ مطبوعہ عزیز المطابع، حیدر آباد دکن۔ ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء۔

۳۶۔ تجلی نور المعروف بہ تذکرہ مشاہیر جون پور: نور الدین زیدی۔ مطبع اعظم المطابع، جون پور، ۱۸۸۹ء

۳۷۔ تحفۃ الکرام: میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۳۸۔ تحقیقات چشتی: نور احمد چشتی۔ پنجابی ادبی اکیڈیمی، لاہور۔ ۱۹۶۴ء

۳۹۔ تذکرہ: مولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبہ احباب، لاہور۔

۴۰۔ تذکرۃ الابرار والاشرار: حضرت اخون درویزہ۔ ادارہ اشاعت سرحد، قصہ خوانی بازار، پشاور۔

۴۱۔ تذکرہ صوفیائے سندھ: اعجاز الحق قدوسی۔ اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

Marfat.com

۴۲۔ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی: سید احمد قادری۔ ناشر شاہ بک ڈپو پٹنہ۔

۴۳۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ: محمد الدین فوق۔ گلزار محمدیہ اسٹیم پریس لاہور۔ ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء

۴۴۔ تذکرہ علمائے ہند: مولوی رحمان علی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۴۵۔ تذکرہ مشائخ بنارس: ابوالاثر عبدالسلام۔ ندوۃ المعارف بنارس۔ ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء۔

۴۶۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری: محمد علی حیدر۔ مطبع اصح المطابع لکھنؤ۔ ۱۹۲۷ء

۴۷۔ تذکرہ مؤرخین: بنی احمد سندیلوی۔ مطبع سلیمانی بنارس۔ ۱۹۲۶ء

۴۸۔ ترخان نامہ: سید میر محمد بن سید جلال ٹھٹھوی۔ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ۔ ۱۹۶۴

۴۹۔ تزک جہاں گیری: مطبع نامی منشی نول کشور لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۵۰۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع شاہ جہانی بھوپال۔ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء۔

۵۱۔ ''ثقافت'' ماہ نامہ لاہور۔ بابت ماہ اپریل اور جون ۱۹۶۷ء

۵۲۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ مطبوعہ دمشق۔ ۱۹۵۸ء

۵۳۔ جہاں گیر نامہ: خواجہ ابوالحسن۔ مطبع نامی منشی نول کشور لکھنؤ۔ ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء

۵۴۔ حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء

۵۵۔ حدیقۃ الاولیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۷۷ء

۵۶۔ حیات العلماء: سید عبدالباقی سہوانی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء۔

۵۷۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی: خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین دہلی۔ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء

۵۸۔ خزانہ عامرہ: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۵۹۔ خزینۃ الاصفیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نامی گرامی سراج پنڈت بیج ناتھ الموسوم بہ ثمر ہند لکھنؤ۔ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء۔

۶۰۔ خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر (محمد امین بن فضل اللہ المحبی۔ مکتبہ خیاط بیروت لبنان۔

۶۱۔ خلاصۃ التواریخ: لالہ سجان رائے بٹالوی۔ بہ تصحیح ظفر احسن۔ مطبع جی اینڈ سنز دہلی۔ ۱۹۱۸ء

۶۲۔ دربار اکبری: محمد حسین آزاد۔ دارالاشاعت پنجاب۔ مطبع رفاہ عام لاہور۔ ۱۸۹۸ء

۶۳۔ دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی: ابن حسن ترجمہ عبدالغنی نیازی۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۵۸ھ

۶۴۔ دہلی اور اس کے اطراف: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ انجمن ترقی اردو دہلی۔ ۱۹۵۸ء

۶۵۔ ذخیرۃ الخوانین: شیخ فرید بھکری۔ مقدمہ و تصحیح ڈاکٹر سید معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی۔

۶۶۔ ''الراعی'' (ہفت روزہ لاہور) بابت ۱۹۴۳ء مضمون پروفیسر علم الدین سالک

۶۷۔ الرسالۃ الخاقانیہ: پروفیسر امین اللہ وثیر۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور۔ فروری ۱۹۶۵ء

Marfat.com

۶۸۔ رقعات ابوالفضل: مطبع نول کشور، لکھنؤ۔

۶۹۔ رقعات عالم گیری: مطبع نول کشور، لکھنؤ۔۱۹۲۴ء

۷۰۔ رود کوثر: ڈاکٹر شیخ محمد اکرام۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔۱۹۷۵ء

۷۱۔ روضۃ الاولیا: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع اعجاز صفدری۔ حیدر آباد دکن۔۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء۔

۷۲۔ زبدۃ المقامات: خواجہ محمد ہاشم کشمی۔ مطبع نول کشور، کان پور۔ طبع اول۔۱۸۹۰ء

۷۳۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع بمبئی۔۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء۔

۷۴۔ سرو آزاد: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع مفید عام، آگرہ۔۱۹۱۰ء

۷۵۔ سفینۃ الاولیا: داراشکوہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔۱۸۸۴ء

۷۶۔ سوانح عبدالحکیم سیالکوٹی: محمد الدین فوق۔ برقی پریس، لاہور۔۱۹۲۴ء

۷۷۔ سیاحت ہند: حافظ عبدالرحمٰن امرتسری۔ مطبوعہ رفاہ عام پریس، لاہور۔۱۹۰۹ء

۷۸۔ سید احمد شہید: غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور۔۱۹۵۴ء

۷۹۔ سیرت سید احمد شہید: ابوالحسن علی ندوی۔

۸۰۔ سیر الاولیا: محمد مبارک علوی معروف بہ امیر خرد کرمانی۔ مطبع محب ہند، دہلی۔۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء۔

۸۱۔ سیر المتاخرین: غلام حسین خاں طباطبائی۔ نول کشور، لکھنؤ۔

۸۲۔ شذرات الذہب: ابوالفلاح عبدالحی بن العماد حنبلی۔ طبع قاہرہ، مصر۔۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء۔

۸۳۔ صحیح بخاری: امام محمد بن اسماعیل۔ طبع کراچی۔

۸۴۔ طبقات اکبری: نظام الدین ہروی۔ طابع نول کشور۔ مطبع گرامی قدر اودھ اخبار، لکھنؤ۔۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء

۸۵۔ طرب الاماثل بتراجم الافاضل: مولانا ابوالحسنات عبدالحی حسنی لکھنوی۔ مطبع یوسفی، لکھنؤ۔۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء

۸۶۔ عالم گیر نامہ: منشی محمد کاظم بن محمد امین۔ کالج پریس، کلکتہ۔۱۸۶۸ء

۸۷۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی: مولانا محمد میاں۔ مطبوعہ دہلی۔

۸۸۔ عمل صالح (الموسوم بہ شاہ جہان) محمد صالح کمبو (جلد اول و دوم، طبع دوم ۱۹۶۷ء۔ جلد سوم، طبع دوم۔۱۹۷۲ء)

۸۹۔ عہد اسلامی کا ہندوستان: ریاست علی ندوی۔ ادارۃ المصنفین، پٹنہ۔۱۹۵۰ء

۹۰۔ عہد جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے فرامین واسناد: مطبوعہ ہند، ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء

۹۱۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری: جلد ۹، حافظ ابن حجر عسقلانی۔ طبع مصر۔

۹۲۔ فرحت الناظرین (شخصیات): محمد اسلم پسروری۔ ترجمہ وترتیب، محمد ایوب قادری، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی۔۱۹۷۲ء

Marfat.com

۹۳۔ فقہائے ہند جلد سوم۔ محمد اسحاق بھٹی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ ۱۹۷۶ء

۹۴۔ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ: مولانا ابوالحسنات عبدالحی حنفی لکھنوی، مطبوعہ مصر، طبع اول۔ ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء۔

۹۵۔ قاموس الاعلام: شمس اللہ قادری۔ حیدر آباد دکن۔ ۱۹۳۵ء

۹۶۔ قاموس المشاہیر: جلد اول، دوم، سوم نظام الدین حسین نظامی بدایونی۔ نظامی پریس، بدایوں۔ ۱۹۲۴ء۔ ۱۹۲۶ء

۹۷۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب: ذوالفقار احمد۔ مطبع فیض منبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء

۹۸۔ کشف الظنون: جلد اول، ثانی، حاجی خلیفہ۔ مطبع بہیہ، استنبول۔ ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء

۹۹۔ گجرات کی تمدنی تاریخ: سید ابوظفر ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۶۲ء

۱۰۰۔ گلزار اولیا: مظفر حسین۔ مطبع سبحانی، حیدر آباد دکن۔ ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء

۱۰۱۔ لطائف قدوسی: (ملفوظات شیخ عبدالقدوس گنگوہی) مرتب، شیخ رکن الدین گنگوہی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۴ء

۱۰۲۔ مآثر الامرا: جلد اول، دوم، سوم، صمصام الدولہ شاہ نواز خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۸۸ء۔ ۱۸۹۰ء

۱۰۳۔ مآثر رحیمی: جلد اول، دوم، سوم، ملا عبدالباقی نہاوندی۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء، ۱۹۳۱ء

۱۰۴۔ مآثر عالم گیری: محمد ساقی الملقب بہ مستعد خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ

۱۰۵۔ مآثر الکرام: (دفتر اول) غلام علی آزاد بلگرامی۔ مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ لاہور۔ ۱۹۷۱ء

۱۰۶۔ مرأت احمدی: مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر۔ مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۹۲۷ء

۱۰۷۔ مرأت العالم: بختاور خاں (قلمی نسخہ) پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور۔

۱۰۸۔ المسوی شرح موطا: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ طبع دہلی۔

۱۰۹۔ مشاہیر کشمیر: منشی محمد الدین فوق۔ کریمی پریس۔ لاہور۔

۱۱۰۔ مشکوۃ المصابیح: ولی الدین۔ طبع کراچی۔

۱۱۱۔ ''معارف'' (ماہ نامہ) اعظم گڑھ۔ بابت ماہ جون ۱۹۴۷ء

۱۱۲۔ ''المعارف'' (ماہ نامہ) لاہور۔ بات ماہ جون ۱۹۷۰ء

۱۱۳۔ معجم المولفین: عمر رضا کحالہ۔ مطبعتہ الترقی، دمشق۔ ۱۹۵۷ء

۱۱۴۔ مفتاح التواریخ: منشی دانشور۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۲۸۴ھ

۱۱۵۔ منتخب التواریخ: جلد اول، دوم، سوم، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء ___ نیز دیکھیے، مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۲۸۴ء

۱۱۶۔ منتخب اللباب: جلد اول، دوم، محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۶۹ء

۱۱۷۔ مئورخین ہند: شمس اللہ قادری۔ تاریخ آفس۔ حیدر آباد دکن۔ ۱۹۳۳ء

۱۱۸۔ موضوعات الکبیر: ملا علی قاری حنفی ہروی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۱۵ھ

Marfat.com

۱۱۹۔ موطا: امام مالک۔ کتب خانہ دارالاشاعت' کراچی۔ ۱۹۷۱ء

۱۲۰۔ نجات الرشید: عبدالقادر بدایونی۔ مقدمہ وحواشی' ڈاکٹر سید معین الحق۔ ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب' لاہور۔ ۱۹۷۲ء

۱۲۱۔ نجوم السمائی تذکرۃ العلما: مرزا محمد علی۔ مطبع جعفری لکھنؤ۔ چاپ عکسی آفسٹ' طبع قم۔ ۱۳۹۶ھ

۱۲۲۔ نزہۃ الخواطر: (جلد پنجم) سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ' حیدرآباد دکن۔ ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء

۱۲۳۔ نگارستان فارس: محمد حسین آزاد۔ آزاد بک ڈپو' لاہور۔

۱۲۴۔ النور السافر فی اخبار القرن العاشر: عبدالقادر بن عبداللہ العیدروس۔ المکتبۃ العربیہ' بغداد۔ مطبعۃ الفرات' بغداد۔ ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء

۱۲۵۔ واقعات دارالحکومت دہلی: (حصہ اول) بشیرالدین احمد دہلوی۔ شمسی مشین پریس' آگرہ۔ ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء

۱۲۶۔ ہدیۃ العارفین فی اسماء المولفین وآثار المصنفین: اسماعیل پاشا بغدادی مطبع بہیہ' استنبول ۱۹۵۱ء ۱۹۵۵ء

۱۲۷۔ ہفت اقلیم: جلد اول' دوم' سوم' امین احمد رازی۔ تصحیح وتعلیق' جواد فاضل۔ مطبوعہ تہران۔

۱۲۸۔ ہندوستان کے سلاطین' علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر: سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دارالمصنفین' اعظم گڑھ۔ ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء

۱۲۹۔ یاد ایام: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ مطبع انسٹی ٹیوٹ' علی گڑھ۔ ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء

۱۳۰۔ الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی: محمد بن یحییٰ المدعو بہ محسن تمیمی ثم بکسری۔ طبع ہند۔

Marfat.com

فقہائے ہند

بارھویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

بہ اشتراک

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور فون: ۰۳۰۰ ۸۸۹۸۶۳۹

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ

۲۰۱۳ء/۱۴۳۴ھ

نام کتاب: ———— فقہائے ہند

مصنف: ———— محمد اسحاق بھٹی

اہتمام: ———— محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

بہ اشتراک دار النوادر

مطبع: ———— شفیق پریس

حروف خوانی: ———— محمد سعید بھٹی

کمپوزنگ: ———— محمود فرید

صفحات: ———— ۵۲۸

سرورق: ———— ضیاء الرحمٰن

جلد ساز: ———— بنیامین

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ

اردو بازار، لاہور فون: 37320318، 37239884

ای میل: Kitabsaray@hotmail.com

نئی کتاب

فضلی بک سپر مارکیٹ

اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔

فون: 32212991-32629724

Marfat.com

ترتیب

مقدمہ	۵۱۵
اورنگ زیب عالم گیر	۵۱۵
ولادت اور تعلیم وتربیت	۵۱۶
شجاعت اور بہادری	۵۱۷
پہلی باقاعدہ معرکہ آرائی	۵۱۸
دکن کی صوبے داری	۵۱۸
شاہ جہاں کی خفگی اور صلح	۵۱۹
گجرات کی نظامت	۵۱۹
بلخ وبدخشاں کی مہم	۵۲۰
ملتان کی ولایت اور قندھار کی مہم	۵۲۱
دوسری دفعہ نظامت دکن	۵۲۳
داراشکوہ کا کردار اور بھائیوں کا ردِعمل	۵۲۴
بعد کے مختصر حالات	۵۲۷
شاہ جہان کا طرزِ عمل اور عالم گیر کی اطاعت شعاری	۵۲۹
اورنگ زیب کی تخت نشینی	۵۳۳
تخت نشینی میں علمائے کرام کا حصہ	۵۳۴
نظم ونسق اور اصلاحات کا نفاذ	۵۳۵
بعض قبائل کی شورشوں کا انسداد	۵۳۷
سکھ اور ان کے ہنگامے	۵۳۷
جسونت سنگھ کی بے وفائی اور عالم گیر کا عفو وکرم	۵۳۸
دکن کی فتح اور مرہٹوں کی سرکوبی	۵۳۹
سرمد کا قتل	۵۴۳
اوصاف وکمالات کی ایک جھلک	۵۴۵
سخاوت اور غریب پروری	۵۴۹
بُردباری اور متحمل مزاجی	۵۵۰
اصلاحی اقدامات	۵۵۰
نیکی اور تدین	۵۵۱
قرآن مجید سے شغف ومحبت	۵۵۲
علم فقہ میں درک اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین	۵۵۳
عالم گیر کا کتب خانہ	۵۵۷
عہد عالم گیری کے علمائے کرام	۵۵۸
فنونِ لطیفہ اور تعمیرات	۵۵۹
عالم گیر کے اساتذہ	۵۵۹
بزرگانِ سرہند سے تعلق خاص	۵۶۱
قرآنِ مجید کی کتابت کا سلسلہ	۵۶۴
عدل وانصاف	۵۶۴
خبر رسانی کا اہتمام	۵۶۵
بادشاہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا حق	۵۶۶
چاندی کے بجائے چینی کی دوات	۵۶۶
جیب خاص کے مصارف میں کمی	۵۶۶
ملکی آمدنی میں اضافہ	۵۶۷
مسلسل جدوجہد	۵۶۷
ادبیت اور حسن بیان	۵۶۸

Marfat.com

◆	عبادت گزاری اور شریعت کی پاس داری	۵۶۹
◆	دورِ آخر کا ایک رقت انگیز واقعہ	۵۶۹
◆	آخری دور اور تجہیز و تکفین کی وصیتیں	۵۷۰
◆	وفات	۵۷۰
◆	خلد آباد میں تدفین	۵۷۱
◆	لیکن ایک بات	۵۷۱
◆	اورنگ زیب کے بعد	۵۷۳
◆	الف	
◆	۱۔ سید آل محمد بلگرامی	۵۷۵
◆	۲۔ سید آیت اللہ رائے بریلوی	۵۷۶
◆	۳۔ مفتی ابوالبرکات دہلوی	۵۷۷
◆	۴۔ قاضی ابوبکر مدراسی	۵۷۷
◆	۵۔ شیخ ابوالحسن دیلوری	۵۷۸
◆	۶۔ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر	۵۷۸
◆	۷۔ شیخ ابوالحسن سندھی صغیر	۵۷۹
◆	۸۔ مولانا ابوالحسن کشمیری	۵۷۹
◆	۹۔ مولانا ابوالخیر جون پوری	۵۸۰
◆	۱۰۔ سید ابوسعید بریلوی	۵۸۰
◆	۱۱۔ سید ابوسعید کالپوی	۵۸۱
◆	۱۲۔ مفتی ابوسعید گوپاموی	۵۸۲
◆	۱۳۔ شیخ ابوالطیب سندھی	۵۸۲
◆	۱۴۔ مولانا ابوالفتح کانی کشمیری	۵۸۳
◆	۱۵۔ مفتی ابوالفتح کلوکشمیری	۵۸۳
◆	۱۶۔ قاضی ابوالفرح گجراتی	۵۸۳
◆	۱۷۔ مولانا ابوالقاسم سندھی	۵۸۴
◆	۱۸۔ سید ابواللیث رائے بریلوی	۵۸۴
◆	۱۹۔ مفتی ابومحمد سہسوانی	۵۸۴
◆	۲۰۔ مفتی ابوالوفا کشمیری	۵۸۵
◆	۲۱۔ شیخ احمد صدیقی امیٹھوی۔ ملا جیون	۵۸۵
◆	۲۲۔ شیخ احمد گوپاموی	۵۸۸
◆	۲۳۔ شیخ احمد رفاعی	۵۸۸
◆	۲۴۔ شیخ احمد نائطی مدراسی	۵۸۹
◆	۲۵۔ شیخ احمد عثمانی لکھنوی	۵۸۹
◆	۲۶۔ شیخ احمد ہرکامی	۵۹۰
◆	۲۷۔ قاضی احمد جون پوری	۵۹۰
◆	۲۸۔ حاجی احمد دہلوی	۵۹۰
◆	۲۹۔ قاضی احمد حماد فتح پوری	۵۹۱
◆	۳۰۔ شیخ احمد عبدالحق لکھنوی	۵۹۱
◆	۳۱۔ قاضی احمد علی سندیلوی	۵۹۱
◆	۳۲۔ شیخ احمد اللہ خیر آبادی	۵۹۲
◆	۳۳۔ مولانا احمد اللہ پانی پتی	۵۹۲
◆	۳۴۔ شیخ اسماعیل غوری پشاوری	۵۹۳
◆	۳۵۔ شیخ اشرف قلی جائسی	۵۹۳
◆	۳۶۔ شیخ افضل راجیندروی	۵۹۳
◆	۳۷۔ مولانا اکبریار کشمیری	۵۹۴
◆	۳۸۔ شیخ اکرم الدین گجراتی	۵۹۴
◆	۳۹۔ شیخ اللہ بخش گوپاموی	۵۹۵
◆	۴۰۔ شیخ اللہ داد گوپاموی	۵۹۵
◆	۴۱۔ شیخ امام الدین جون پوری	۵۹۵
◆	۴۲۔ مولانا امان اللہ کشمیری دہلوی	۵۹۵
◆	۴۳۔ حافظ امان اللہ بنارسی	۵۹۶
◆	۴۴۔ مولانا امین الدین کنتوری	۵۹۶
◆	۴۵۔ مولانا امین الدین مدراسی	۵۹۷
◆	۴۶۔ مولانا امین الدین جون پوری	۵۹۷
◆	۴۷۔ مولانا انگنون جون پوری	۵۹۸
◆	۴۸۔ مولانا اوغلان خراسانی	۵۹۸

Marfat.com

ب

◆ ۴۹۔ شیخ باسط علی قلندر الہ آبادی ۵۹۸
◆ ۵۰۔ شیخ بدرالدین جون پوری ۵۹۹
◆ ۵۱۔ شیخ بدر رفاعی ۵۹۹
◆ ۵۲۔ شیخ بدر عالم ساداموی ۶۰۰
◆ ۵۳۔ شیخ بہلول برکی ۶۰۰

ت

◆ ۵۴۔ مفتی تابع محمد لکھنوی ۶۰۰
◆ ۵۵۔ میر تاجو کشمیری ۶۰۱

ج

◆ مرزا جان جاناں دہلوی ۶۰۱
◆ خودنوشت حالات ۶۰۲
◆ مرزا کے بعض آباواجداد ۶۰۵
◆ اساتذہ اور مرشد ۶۰۷
◆ ملوک وامرا سے کنارہ کشی ۶۰۷
◆ اخذ وقبولِ نذر کے پیمانے ۶۰۸
◆ اتباعِ سنت کا شدید جذبہ ۶۰۹
◆ مرزا صاحب شاہ ولی اللہ کی نظر میں ۶۱۰
◆ حدیث ہی کو مدارِ عمل ٹھہراتے ۶۱۱
◆ رفع سبابہ اور فاتحہ خلف الامام ۶۱۲
◆ عمل بالحدیث کی تاکید ۶۱۲
◆ انتقالِ مذہب اور تقلید کے سلسلے میں ۶۱۴
◆ ہندو مذہب کے بارے میں ۶۱۸
◆ بلندیٔ اخلاق اور بلندیٔ کردار کی تلقین ۶۲۱
◆ سیاسی حالات ۶۲۳
◆ شعروشاعری ۶۲۳
◆ اُردو کلام ۶۲۴
◆ وفات ۶۲۵
◆ نماز کے لیے بے چینی ۶۲۶
◆ تدفین ۶۲۷
◆ مرزا صاحب کا وصیت نامہ ۶۲۷
◆ نجف خاں ۶۲۸
◆ ۵۷۔ مولانا جاراللہ سایئنپوری ۶۳۰
◆ ۵۸۔ مولانا جان محمد لاہوری ۶۳۰
◆ ۵۹۔ شیخ جلال الدین گجراتی ۶۳۱
◆ ۶۰۔ مولانا جلال الدین مچھلی شہری ۶۳۱
◆ ۶۱۔ شیخ جمال الدین گجراتی ۶۳۲

ح

◆ ۶۲۔ مولانا حامد جون پوری ۶۳۳
◆ ۶۳۔ شیخ حبیب اللہ بہاری ۶۳۳
◆ ۶۴۔ قاضی حبیب اللہ تاج پوری ۶۳۴
◆ ۶۵۔ شیخ حبیب اللہ قنوجی ۶۳۴
◆ ۶۶۔ سید حسن دہلوی عُرف رسول نما ۶۳۵
◆ ۶۷۔ قاضی حسن سعید جون پوری ۶۳۶
◆ ۶۸۔ قاضی حیدر کشمیری ۶۳۶

خ

◆ ۶۹۔ خواجہ میر درد دہلوی ۶۳۷
◆ خواجہ نقشبند ۶۳۷
◆ برصغیر میں آمد ۶۳۸
◆ تعلیم وتربیت ۶۳۹
◆ بادشاہ کو سرزنش ۶۴۰
◆ عُسرت اور تنگ دستی ۶۴۰
◆ تصانیف ۶۴۱
◆ وفات ۶۴۶
◆ اولاد ۶۴۷
◆ شاگرد ۶۴۷

Marfat.com

♦	۷۰۔ قاضی خلیل اللہ حیدر آبادی	۶۴۸
♦	۷۱۔ شیخ خوب محمد گجراتی	۶۴۸
♦	۷۲۔ قاضی خیر اللہ جون پوری	۶۴۸
♦	د	
♦	۷۳۔ سید درگاہی بلگرامی	۶۴۹
♦	۷۴۔ مفتی درویش محمد بدایونی	۶۴۹
♦	ر	
♦	۷۵۔ شیخ رحمت اللہ لکھنوی	۶۵۰
♦	۷۶۔ شیخ رحمت اللہ کشمیری	۶۵۰
♦	۷۷۔ مولانا رستم علی قنوجی	۶۵۰
♦	ز	
♦	۷۸۔ شیخ زین العابدین سرہندی	۶۵۱
♦	س	
♦	۷۹۔ سید سعد الدین بلگرامی	۶۵۲
♦	۸۰۔ مولانا سعد الدین کشمیری	۶۵۲
♦	۸۱۔ سید سعد اللہ سلونی	۶۵۳
♦	۸۲۔ شیخ سلطان محمد کرمانی	۶۵۴
♦	۸۳۔ سید سلطان مقصود کالپوی	۶۵۴
♦	۸۴۔ شیخ سیف اللہ بخاری دہلوی	۶۵۴
♦	ش	
♦	۸۵۔ مفتی شرف الدین لکھنوی	۶۵۵
♦	۸۶۔ شیخ شکر اللہ جون پوری	۶۵۵
♦	۸۷۔ شیخ شمس الدین جون پوری	۶۵۶
♦	۸۸۔ قاضی شہاب الدین گوپاموی	۶۵۶
♦	۸۹۔ قاضی شیخ الاسلام گجراتی	۶۵۷
♦	ص	
♦	۹۰۔ شیخ صبغت اللہ سرہندی	۶۵۹

♦	ض	
♦	۹۱۔ سید ضیاء اللہ بلگرامی	۶۶۰
	ط	
♦	۹۲۔ سید طفیل محمد اترولوی بلگرامی	۶۶۱
♦	۹۳۔ سید طیب بلگرامی	۶۶۲
♦	ظ	
♦	۹۴۔ سید ظریف حسینی عظیم آبادی	۶۶۳
♦	ع	
♦	۹۵۔ شیخ عبد الباسط سندھی	۶۶۴
♦	۹۶۔ سید عبد الجلیل حسینی بلگرامی	۶۶۴
♦	۹۷۔ سید عبد الحکیم لاہوری	۶۶۶
♦	۹۸۔ شاہ عبد الرحیم دہلوی	۶۶۷
♦	مفتی شمس الدین	۶۶۷
♦	مفتی کمال الدین	۶۶۷
♦	مفتی قطب الدین	۶۶۸
♦	شیخ عبد المالک	۶۶۸
♦	قاضی بدھا	۶۶۸
♦	قاضی قاسم	۶۶۸
♦	قاضی قادن	۶۶۹
♦	شیخ محمود	۶۶۹
♦	شیخ احمد	۶۶۹
♦	شیخ منصور اور شیخ حسین	۶۶۹
♦	شیخ معظم	۶۷۰
♦	شیخ وجیہ الدین	۶۷۰
♦	ولادت اور دیگر حالات	۶۷۰
♦	بادشاہوں کی مجالس میں حاضری سے گریز	۶۷۱

Marfat.com

◆	مسائل فقہی پر تعامل	۶۷۳
◆	قبولیت دعا	۶۷۳
◆	شوقِ شعری	۶۷۵
◆	اہل اللہ اور مجاذیب سے ملاقات	۶۷۵
◆	مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد	۶۷۶
◆	علمی مباحث	۶۷۷
◆	شاہ صاحب سے ملا عبداللہ چلپی کی بیعت	۶۷۹
◆	فتاویٰ عالم گیری میں حصہ	۶۸۰
◆	انتقال	۶۸۲
◆	۹۹۔ شیخ عبدالرحیم حسینی بیجاپوری	۶۸۳
◆	۱۰۰۔ قاضی عبدالرسول سہالوی	۶۸۳
◆	۱۰۱۔ شیخ عبدالصمد چریا کوٹی	۶۸۴
◆	۱۰۲۔ قاضی عبدالصمد عثمانی جون پوری	۶۸۴
◆	۱۰۳۔ مولانا عبدالصمد دیوی	۶۸۵
◆	۱۰۴۔ مولانا عبدالفتاح صمدانی	۶۸۵
◆	۱۰۵۔ مولانا عبدالقادر گجراتی	۶۸۵
◆	۱۰۶۔ شیخ عبدالقادر پٹنی مکی	۶۸۶
◆	۱۰۷۔ شیخ عبدالقادر لاہوری	۶۸۶
◆	۱۰۸۔ سید عبدالکریم حسینی قنوجی	۶۸۶
◆	۱۰۹۔ شیخ عبدالکریم صدیقی بلگرامی	۶۸۷
◆	۱۱۰۔ قاضی عبدالکریم کشمیری	۶۸۷
◆	۱۱۱۔ مخدوم قاضی عبداللطیف ٹھٹھوی	۶۸۷
◆	۱۱۲۔ شیخ عبداللہ حسنی لاہوری	۶۸۸
◆	۱۱۳۔ سید عبداللہ سندیلوی	۶۸۸
◆	۱۱۴۔ قاضی عبداللہ گجراتی	۶۹۰
◆	۱۱۵۔ مولانا عبداللہ میٹھوی	۶۹۰
◆	۱۱۶۔ مولانا سید عبداللہ بلگرامی	۶۹۱
◆	۱۱۷۔ مولانا عبدالمقتدر بہاری	۶۹۱
◆	۱۱۸۔ مفتی عبدالمومن کشمیری	۶۹۲
◆	۱۱۹۔ قاضی عبدالنبی عثمانی احمد نگری	۶۹۲
◆	۱۲۰۔ مولانا عبدالولی طرخانی کشمیری	۶۹۳
◆	۱۲۱۔ میر سید عبدالوہاب منور آبادی	۶۹۳
◆	۱۲۲۔ شیخ عتیق اللہ جالندھری	۶۹۴
◆	۱۲۳۔ قاضی عثمان احمد عثمانی بلگرامی	۶۹۴
◆	۱۲۴۔ قاضی عصمت اللہ فاروقی لکھنوی	۶۹۴
◆	۱۲۵۔ شیخ عصمت اللہ سہارن پوری	۶۹۵
◆	۱۲۶۔ شیخ عطاء اللہ دہلوی	۶۹۸
◆	۱۲۷۔ شیخ علی اصغر قنوجی	۶۹۸
◆	۱۲۸۔ مفتی علیم اللہ گوپاموی	۶۹۹
◆	۱۲۹۔ سید عنایت اللہ بلگرامی	۶۹۹
◆	۱۳۰۔ شیخ عنایت اللہ سندھی	۶۹۹
◆	۱۳۱۔ سید عنایت اللہ بالاپوری	۷۰۰
◆	۱۳۲۔ شیخ عنایت اللہ شال کشمیری	۷۰۰
◆	۱۳۳۔ شیخ عنایت اللہ قادری لاہوری	۷۰۰
◆	غ	
◆	۱۳۴۔ شیخ غلام اخی عثمانی بلگرامی	۷۰۱
◆	۱۳۵۔ سید غلام حسین اورنگ آبادی	۷۰۱
◆	۱۳۶۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی	۷۰۲
◆	واسطی سادات کی بلگرام میں آمد	۷۰۲
◆	سید غلام علی کی ولادت اور تعلیم و تربیت	۷۰۴
◆	سیر و سیاحت	۷۰۵
◆	قصد حج	۷۰۵
◆	نواب آصف جاہ کے دربار میں	۷۰۷
◆	میدانِ جنگ میں	۷۰۸
◆	حج کو روانگی	۷۰۹
◆	شیخ محمد فاخر سے ملاقات	۷۰۹

Marfat.com

♦	مکہ مکرمہ میں حاضری	۷۰۹
♦	مدینہ منورہ میں آمد	۷۱۰
♦	مولانا شیخ محمد حیات سندھی سے اجازۂ حدیث	۷۱۱
♦	مکہ مکرمہ کو روانگی	۷۱۲
♦	مراجعت ہند	۷۱۲
♦	حج ثانی کا خیال اوراس کا ترک	۷۱۵
♦	برہان پور اور حیدر آباد وغیرہ کے سفر	۷۱۶
♦	جوان بیٹے کا انتقال	۷۱۶
♦	تصانیف	۷۱۷
♦	آزاد کی شاعری پر اہل علم کی تنقیدات	۷۲۴
♦	چند واقعات ولطائف	۷۲۶
♦	ضبط وتحمل	۷۲۹
♦	فقیرانہ زندگی	۷۲۹
♦	مال ودولت سے بے نیازی	۷۳۱
♦	فقر کی بہترین راہ	۷۳۳
♦	حسان الہند	۷۳۴
♦	معاصرین سے علمی صحبتیں اور ادبی لطیفے	۷۳۴
♦	دکن میں مستقل سکونت	۷۳۷
♦	سفر آخرت کی تیاری	۷۳۸
♦	وفات	۷۳۸
♦	۱۳۷۔ قاضی غلام مصطفیٰ انصاری لکھنوی	۷۳۹
♦	۱۳۸۔ سید غلام نبی بلگرامی	۷۳۹
♦	ف	
♦	۱۳۹۔ قاضی فتح علی قنوجی	۷۴۰
♦	۱۴۰۔ مولانا فخر الدین مانک پوری بلگرامی	۷۴۰
♦	۱۴۱۔ مولانا فخر الدین دہلوی	۷۴۱
♦	۱۴۲۔ شیخ فرخ شاہ سرہندی	۷۴۱
♦	۱۴۳۔ سید فرید الدین بلگرامی	۷۴۲
♦	۱۴۴۔ مولانا فصیح الدین پھلواروی	۷۴۳
♦	۱۴۵۔ سید فضل اللہ کالپوی	۷۴۵
♦	۱۴۶۔ شیخ فضل اللہ پرینوی	۷۴۶
♦	۱۴۷۔ مولانا فضل اللہ بہاری	۷۴۶
♦	۱۴۸۔ سید فیروز جائسی	۷۴۷
♦	۱۴۹۔ خواجہ فیض الحسن سورتی	۷۴۷
♦	ق	
♦	۱۵۰۔ سید قاسم دہلوی	۷۴۷
♦	۱۵۱۔ مولانا قطب الدین شہید سہالوی	۷۴۸
♦	شہادت	۷۴۹
♦	مولانا سے عداوت اور قتل کی وجہ	۷۵۳
♦	بادشاہ کا فرمان اور قاتلوں کا انجام	۷۵۴
♦	بادشاہ کی طرف سے مکان کا عطیہ	۷۵۴
♦	تصانیف	۷۵۵
♦	۱۵۲۔ سید قطب الدین شمس آبادی	۷۵۷
♦	۱۵۳۔ سید قطب الدین اورنگ آبادی	۷۵۷
♦	۱۵۴۔ شیخ قطب الدین سرہندی	۷۵۸
♦	۱۵۵۔ مولانا قطب الدین عباسی الہ آبادی	۷۵۸
♦	۱۵۶۔ سید قطب احمد حیدر آبادی	۷۵۹
♦	۱۵۷۔ قاضی قل احمد سترکھی	۷۵۹
♦	۱۵۸۔ سید قمر الدین اورنگ آبادی	۷۵۹
♦	ک	
♦	۱۵۹۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی	۷۶۰
♦	۱۶۰۔ سید کلیم اللہ مکی	۷۶۱
♦	۱۶۱۔ شیخ کمال الدین سندھی	۷۶۲
♦	۱۶۲۔ شیخ کمال الدین فتح پوری	۷۶۲
♦	مراجع ومصادر	۷۶۳

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

اورنگ زیب عالم گیر:

فقہائے ہند کی چوتھی جلد کے مقدمے میں مغل خاندان کے تیسرے حکمران جلال الدین اکبر کے ضروری حالات بیان کیے گئے ہیں اور اس کی زندگی کے مذہبی اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھی جلد کے دوسرے حصے کے مقدمے میں اکبر کے فرزند نورالدین جہاں گیر کی حیاتِ مستعار کے ان واقعات سے قارئین کرام کو روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے جو کتاب کے مندرجات کی مناسبت سے ہمارے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اسی جلد میں شہاب الدین شاہ جہان کی سرگزشت حیات کے بعض گوشوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

اب آیے پانچویں جلد کے مقدمے میں دودمان مغلیہ کے چھٹے حکمران ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب عالم گیر کے حالات وسوانح کی تلاش کے لیے تاریخ کے دروازے پر دستک دیتے اور اس کے چند علمی کارناموں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ نیز اس نے جواں مردی اور شجاعت کے جو نقوش برصغیر کی سرزمین پر چھوڑے، انھیں نمایاں کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

قمری حساب سے یہ بارھویں صدی ہجری کا زمانہ ہے اور اس صدی کے برصغیر میں جن علمائے کرام اور فقہائے عظام نے علمی و تصنیفی خدمات سرانجام دیں کتاب میں ان کا تذکرہ کیا جائے گا۔ جن حضرات کے حالات زیادہ دست یاب ہیں، ان کا کچھ تفصیل سے اور جن کے واقعاتِ زندگی سے ہم زیادہ مطلع نہیں ہو سکے، ان کا ذکر اختصار سے کیا جائے گا۔ آئندہ سطور میں بہ صورت مقدمہ پہلے اورنگ زیب عالم گیر کے کوائف حیات اور اس کے بعد اس کے عہد کے علما و فقہا کی خدمات گوناگوں کا تذکرہ ملاحظہ فرمایے۔

اورنگ زیب عالم گیر کا عہد حکومت پچاس برس سے زیادہ عرصے کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس لیے مقدمے میں اس کے متعلق مرقوم واقعات تقریباً ساٹھ صفحات میں پھیل گئے ہیں۔ لیکن تمام واقعات بے حد دلچسپ ہیں۔

Marfat.com

ولادت اور تعلیم وتربیت:

اورنگ زیب عالم گیر اتوار کی رات ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ (۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء) کو ''دوحد'' کے مقام پر پیدا ہوا جو گجرات اور مالوہ کی سرحد پر اجین سے سو میل اور بڑودہ سے ستر میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ شاہ جہان اس وقت ولی عہد تھا اور جہاں گیر ملک عنبر کو شکست دے کر آگرہ کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں گیر نے نومولود کا نام اورنگ زیب رکھا اور کلیم ہمدانی نے ''آفتاب عالم تاب'' سے تاریخ نکالی۔ شاہ جہان کا اورنگ زیب تیسرا بیٹا اور اس کے چودہ بچوں میں سے بہ اعتبار ترتیب چھٹا بچہ تھا۔ ماں کا نام ارجمند بانو تھا جو آصف جاہ ابوالحسن طہرانی کی بیٹی تھی اور ممتاز محل کے عرف سے معروف تھی۔

اورنگ زیب کی عمر چار سال کے لگ بھگ تھی کہ ۱۰۳۱ھ (۱۶۲۱ء) میں شاہ جہان نے جہاں گیر کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اس بغاوت کا پس منظر در حقیقت نور جہاں کا وہ طرز عمل تھا جو اس نے شاہ جہان کے بارے میں اختیار کر رکھا تھا اور اس کی وجہ سے لائق بیٹا عظیم باپ سے بددل ہو گیا تھا۔ بغاوت کے دنوں میں شاہ جہان نہایت پریشانی کے عالم میں اہل وعیال سمیت ہندوستان کے مختلف علاقوں بہار، بنگال، اڑیسہ اور دکن وغیرہ میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اس اثنا میں باغی شہزادے کا کئی بار شاہی فوج سے مقابلہ بھی ہوا، مگر شہزادے نے ہر بار شکست کھائی۔ بالآخر اسے باپ کے حضور جھکنے اور معافی مانگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جہاں گیر نے بیٹے کی غلطی معاف کی اور اسے بالا گھاٹ کی نظامت پر مامور کیا۔ رہتاس اور اسیر گڑھ کے دو قلعے بھی عطا کیے۔ لیکن یہ شرط عائد کی کہ شاہ جہان اپنے دو بیٹوں دارا شکوہ اور عالم گیر کو بطور یرغمال جہاں گیر کے پاس لاہور بھیجے گا۔ شاہ جہان کو شہنشاہ کی یہ شرط ماننا پڑی۔ شہزادہ شجاع پہلے ہی جہاں گیر کے پاس تھا۔ یہ واقعہ ۱۰۳۵ھ (جون ۱۶۲۶ء) کا ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کی عمر اس وقت کم وبیش آٹھ سال کی تھی۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ دو سال بعد ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں جہاں گیر لاہور میں وفات پا گیا اور شہاب الدین محمد شاہ جہان ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ رسم تاج پوشی اکبر آباد (آگرہ) میں ادا کی گئی۔ اس موقعے پر آصف جاہ نے شاہ جہان کے حکم سے تینوں شہزادوں کو لاہور سے اپنے ساتھ لیا اور اکبر آباد پہنچا۔ ان کی ماں ممتاز محل اکبر آباد سے روانہ ہو کر سکندرہ کے مقام پر بیٹوں سے آ کر ملی اور نہایت مسرت کا اظہار کیا۔ دوسرے دن شہزادوں نے بادشاہ کے حضور نذریں پیش کیں اور بادشاہ نے جوش محبت سے انھیں گلے لگایا۔ شہزادوں کی آمد پر دربار میں دوبارہ تقریب مسرت منعقد کی گئی اور اورنگ زیب کو ایک لاکھ روپے نقد عطا کیے گئے اور پانچ سو روپیہ روزینہ مقرر ہوا۔ اس وقت اس کی عمر دس سال ہو گئی تھی۔

شاہ جہان کے زمانۂ شہزادگی کا بہت بڑا حصہ گوناگوں مصروفیات میں گزرا تھا، اس لیے وہ بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دے سکا تھا۔ اب وہ تخت حکومت پر بیٹھا تو اس اہم مسئلے کو موضوع فکر

Marfat.com

ٹھہرایا اور شہزادوں کی تعلیم کے لیے مختلف مشہور اور بہترین اساتذہ مقرر کیے۔ ہمارا دائرہ گفتگو چوں کہ اورنگ زیب عالم گیر تک محدود ہے، اس لیے ان سطور میں ہم صرف اسی کے اساتذہ کا ذکر کریں گے۔ اس کے اساتذہ کرام میں مولانا عبداللطیف سلطان پوری، مولانا محمد ہاشم گیلانی، شیخ محی الدین بہاری، محمد صالح، سعد اللہ خاں اور سید محمد قنوجی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اس کے ایک استاذ ملا شفیعائے یزدی تھے، جو اقلیم ہند کے نامور فاضل تھے اور نواب دانش مند خاں کے لقب سے ملقب تھے۔ ان کا شمار اس عہد کے جلیل القدر علما اور رفیع المرتبت فضلا میں ہوتا تھا۔ ان سے شہزادے نے علوم متداولہ اور فنونِ مروجہ کی باقاعدہ تحصیل کی۔

اس زمانے میں حاجی قاسم اور شیخ علی بن محمد مقیم مشہور خطاط تھے اور خط نستعلیق، خط نسخ اور خط شکستہ میں عدیم المثال تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے ان کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تہہ کیا اور خطوط متعارفہ میں مہارت پیدا کی۔ اورنگ زیب اس قدر اونچے درجے کا خوش نویس تھا کہ سریر آرائے سلطنت ہونے سے پہلے اپنے ہاتھ سے قرآن مجید کی کتابت کی اور اس کی تذہیب وتجلید پر سات ہزار روپے خرچ کر کے اسے مدینہ منورہ بھجوایا۔ اسی طرح علم نحو کی مشہور کتاب الفیہ ابن مالک کی کتابت کی اور اسے حاجی عبدالرحمٰن مفتی کے ہاتھ مکہ مکرمہ ارسال کیا۔

اورنگ زیب تصوف وسلوک میں بھی دلچسپی رکھتا تھا اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند گرامی شیخ محمد معصوم سرہندی سے بیعت تھا۔ سلسلۂ طریقت میں وہ شیخ محمد معصوم کے نامور بیٹے شیخ سیف الدین سرہندی کے حلقے میں داخل تھا اور اپنے والد سلطان شاہ جہان کے حکم سے شیخ موصوف کے ساتھ کامل وابستگی اختیار کر لی تھی۔

شجاعت اور بہادری:

تیمور کے خون میں شجاعت اور بہادری کے جوہر تلاش کرنے نکلیں تو اس کے اثرات ہر مقام پر نمایاں نظر آئیں گے اور معلوم ہوگا کہ بابر سے شاہ جہان تک ہر شخص جواں مردی کا مرقع اور بسالت کا پیکر ہے۔ لیکن تاریخ کے اوراق سے واقعات کی تہوں کو کھولا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ علامہ شبلی کے بقول عالم گیر اس خاندانی ''وراثت کا سب سے بڑا حصے دار ہے۔'' اکبر مست ہاتھیوں کو عین حالت لڑائی میں سونڈ سے پکڑ کر ایک دوسرے سے پیچھے ہٹا دیتا تھا۔ شاہ جہان نے زمانہ شہزادگی میں تلوار کی ضرب سے شیر کے ٹکڑے کر دیے تھے، لیکن عالم گیر کی شجاعت کے خدوخال اس سے بھی نمایاں تر ہیں۔ وہ صرف چودہ برس کا بچہ تھا کہ ایک موقعے پر اس کا باپ شاہ جہان ہاتھیوں کی لڑائی کے تماشے سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اچانک ایک ہاتھی عالم غیظ وغضب میں فوج پر ٹوٹ پڑا اور آناً فاناً میدان صاف ہو گیا۔ لیکن چودہ سالہ عالم گیر پہاڑ کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا اور ہاتھی

Marfat.com

سے گتھم گتھا ہو گیا۔ ہاتھی نے غضب ناک ہو کر اس کے گھوڑے کو سونڈ میں پکڑ کر دور پھینک دیا۔ عالم گیر دھڑام سے زمین پر گرا۔ اس کی رگ شجاعت جوش میں آئی، نہایت غصے سے اٹھا اور پورے زور سے آگے بڑھ کر ہاتھی پر تلوار کی ایسی شدید ضرب لگائی کہ ہاتھی زخمی ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ شاہ جہان خرو سال بیٹے اور مست ہاتھی کا یہ معرکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھی پیچھے ہٹا تو شہزادے کو بلا کر سینے سے لپٹا لیا اور اس پر موتی اور جواہر نچھاور کیے [1]۔ مورخین نے اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دربار شاہ جہانی کا ملک الشعرا ابوطالب کلیم بھی اس موقعے پر موجود تھا۔ اس نے یہ سارا واقعہ نظم کر دیا ہے۔

پہلی باقاعدہ معرکہ آرائی:

اورنگ زیب کی پہلی باقاعدہ معرکہ آرائی بندھیل کھنڈ کے راجا ججھر سنگھ سے ہوئی۔ یہ راجا ایک عرصے سے حکومت کے خلاف سرگرم عمل تھا۔ جب اس کی دست درازیاں حد سے بڑھ گئیں اور سخت باغیانہ رویہ اختیار کر لیا تو شاہ جہان نے اس کی سرکوبی کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت اورنگ زیب کی عمر اٹھارہ سال کے قریب تھی۔ بادشاہ نے اس اہم فوجی خدمت کے لیے اس کا انتخاب کیا اور ۱۶۳۵ء میں نوجوان شہزادے کی سرکردگی میں راجا مذکور کی سرزنش کے لیے ایک لشکر روانہ کیا۔ اورنگ زیب کچھ عرصہ اس مہم میں مصروف عمل رہا اور بہت سے جنگی کارنامے انجام دیے۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور شہزادے کے مناصب میں اضافہ کیا۔

دکن کی صوبے داری:

اورنگ زیب بندھیل کھنڈ کی مہم سے فارغ ہوا تو ۳ ذوالحجہ ۱۰۴۵ھ (۲۹ اپریل ۱۶۳۶ء) کو اسے دکن کی صوبے داری پر مامور کیا گیا۔ دکن کے حالات انتہائی خراب تھے اور ان کے درپے اصلاح ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب آٹھ سال اس نواح میں مقیم رہا اور وہاں کے سیاسی اور فوجی معاملات کو درست کرنے میں نہایت سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ آٹھ سال کے اس طویل عرصے میں وہ صرف چار مرتبہ دہلی آیا۔ پہلی مرتبہ یکم ذوالحجہ ۱۰۴۶ھ (۱۶ اپریل ۱۶۳۷ء) کو شادی کے لیے، دوسری مرتبہ ۱۵ رمضان ۱۰۴۹ھ (۳۰ دسمبر ۱۶۳۹ء) کو باپ کی زیارت اور ملاقات کے لیے، تیسری مرتبہ ۱۹ ذوالحجہ ۱۰۵۱ھ (۱۱ مارچ ۱۶۴۲ء) کو۔ اس موقعے پر بھی اس کی آمد کا مقصد شہنشاہ کی زیارت اور سلام تھا۔ چوتھی مرتبہ وہ ۱۵ ربیع الاول ۱۰۵۴ھ (۱۲ مئی ۱۶۴۴ء) کو دہلی آیا۔ اس دفعہ وہ اپنی بہن جہاں آرا بیگم کی عیادت کے لیے آیا تھا جو شاہ جہان کی سترھویں سالگرہ (۲۷ محرم ۱۰۵۴ھ۔ ۲۶ مارچ ۱۶۴۴ء) کے موقعے پر کپڑوں میں آگ لگنے سے جھلس گئی تھی۔ اورنگ زیب کا اس مرتبہ شان دار استقبال کیا گیا اور اسے بے حد اعزاز و احترام کا مستحق گردانا گیا۔

---

[1] یہ واقعہ تاریخ کی مختلف کتابوں میں مرقوم ہے۔

Marfat.com

شاہ جہان کی خفگی اور صلح:

لیکن اورنگ زیب کو دہلی آئے ابھی بیس پچیس روز ہوئے تھے کہ شاہ جہان کسی بات پر اس سے ناراض ہوگیا اور یہ ناراضی یہاں تک بڑھی کہ بادشاہ نے دربار شاہی میں اس کی آمد و رفت بند کر دی، اس کے احکام پر عمل درآمد روک دیا گیا اور اسے دکن کی نظامت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اگر چہ مورخین نے شہنشاہ کے اس بہت بڑے اقدام کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں عالم گیر نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے، ان سے اس کے حاسدوں کے دل میں ایک جلن پیدا ہوگئی تھی اور وہ شاہ زادے کی مخالفت پر اتر آئے تھے اور اس کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے۔ حکمران چوں کہ اس قسم کی باتیں سننے اور ان پر اعتماد کرنے کے عام طور پر عادی ہوتے ہیں، لہٰذا مخالفین اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور بادشاہ کو لائق بیٹے کی مخالفت پر کمربستہ کر دیا۔

اس شکر رنجی میں تقریباً پانچ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ سات ماہ بعد جہاں آرا بیگم کو افاقہ ہوا تو اس نے غسل صحت کیا اور اس پُر مسرت موقعے پر دربار میں ایک جشن منانے کا اہتمام کیا گیا۔ اب شاہ جہان کے دل میں شفقت پدری نے جوش مارا اور جہاں آرا کو عالم گیر کے پاس بھیجا۔ اس کی تقصیر معاف ہوئی۔ باپ بیٹے میں دوبارہ مصالحت کی فضا پیدا ہوئی۔ شہزادے پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں وہ اٹھالی گئیں۔ منصب میں اضافہ کیا گیا اور بیٹے کو خلعتِ شاہانہ سے سرفراز فرمایا گیا۔

یہ باپ اور بیٹے کے درمیان پہلی شکر رنجی تھی۔ مستقبل میں جو واقعات رونما ہوئے ان سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں اصل ہاتھ دارا شکوہ کا تھا۔

گجرات کی نظامت:

اب عالم گیر کو دوبارہ دکن کی نظامت تو نہ مل سکی، البتہ ۲۹ ذوالحجہ ۱۰۵۴ھ (۱۶ فروری ۱۶۴۵ء) کو گجرات کی زمامِ نظامت عطا کی گئی۔

گجرات بعض اعتبارات سے بڑا اہم علاقہ تھا۔ تجارت وصنعت اور زرخیزی و سرسبزی میں بڑا مشہور تھا۔ اس کے علاوہ اس میں ہندوؤں کی آبادی بہت زیادہ تھی۔ کاٹھیاواڑ، احمد آباد اور سومنات جیسے اہم مقامات اس میں واقع تھے۔ جب اورنگ زیب عالم گیر کو اس کی نظامت تفویض ہوئی، یہ علاقہ لوٹ مار، قتل و غارت اور سلب ونہب کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ اس کی اصلاح کرنا اور انتہائی بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن عالم گیر اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اس میں بھی کامیاب رہا۔ اس نے ذہانت اور جرات سے کام لے کر پورے علاقے میں پھیلی ہوئی بدنظمی کو ختم کر دیا اور اس نواح کے فسادیوں، چوروں اور لٹیروں کو اس

Marfat.com

طرح محاصبے کی زنجیر میں جکڑا اور اس طرح ان کا چاروں طرف سے تعاقب کیا کہ وہ قطعی طور سے بے بس اور مغلوب ہو گئے اور نتیجتاً پورے صوبے میں امن وامان کا شامیانہ تن گیا۔

بلخ و بدخشاں کی مہم:

یہ وہ وقت تھا جب عالم گیر سخت آزمائش کے دور سے گزر رہا تھا۔ بادشاہ اس کے کام میں بار بار روکاوٹیں ڈالتا اور مختلف طریقوں سے اس کی اصلاح احوال کی مساعی میں سدِ راہ ہوتا تھا۔ چنانچہ نظامت گجرات کے سلسلے میں بھی یہی ہوا، اسے یہاں کی عنانِ اختیار ہاتھ میں لیے دو سال بھی نہیں ہوئے تھے اور اس کی اصلاحی کوششیں ابھی کامیابی سے ہم کنار ہونے ہی لگی تھیں کہ ۳ شعبان ۱۰۵۶ھ (۴ ستمبر ۱۶۴۶ء) کو شاہ جہان کا حکم موصول ہوا کہ گجرات کی نظامت حاکم مالوہ شائستہ خاں کے سپرد کر کے فوراً لاہور پہنچو، تمھیں اب بلخ اور بدخشاں کی مہم پر بھیجنا مقصود ہے۔

یہ وہ علاقہ تھا، جہاں شہزادہ مراد بخش کی سرکردگی میں پچاس ہزار فوج روانہ کی گئی تھی، لیکن اس علاقے اور اس کے ماحول سے وہ جلد ہی اکتا گیا تھا اور بلا اجازت واپس آ کر شہنشاہ کو استعفا پیش کر دیا تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بلخ، بخارا اور بدخشاں مغلوں کے ممالک محروسہ میں شامل نہ تھے، لیکن کسی زمانے میں یہ علاقے امیر تیمور کی مملکت کا حصہ رہ چکے تھے، اس لیے ہندوستان کے مغل حکمرانوں کی یہ شدید خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان علاقوں کو زیرِ نگیں کیا جائے۔ شاہ جہان کے زمانے میں اس خواہش کی تکمیل کے لیے حالات ساز گار ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بلخ و بخارا وغیرہ کا اصل حاکم جس کا نام امام قلی خاں تھا، ایک نیک خصال شخص تھا۔ وہ بتیس برس حکومت کرنے کے بعد مدینہ منورہ چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی نذر محمد خاں حکمرانی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ لیکن اپریل ۱۶۴۵ء میں نذر محمد خاں اور اس کے بیٹے عبدالعزیز خاں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں عبدالعزیز نے باپ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔ نذر محمد خاں بیٹے کے مقابلے میں بے بس ہو گیا تو شاہ جہان سے خط کے ذریعے اس علاقے پر حملہ آور ہونے اور مداخلت کرنے کی استدعا کی۔ شاہ جہان نے جو ایک عرصے سے موقعے کی تاک میں بیٹھا تھا، پہلے تو جون ۱۶۴۶ء میں مراد بخش اور علی مردان خاں کو اور پھر ۱۵ محرم ۱۰۵۷ھ (۱۰ فروری ۱۶۴۷ء) میں اورنگ زیب عالم گیر کو اس مہم پر روانہ کیا۔ اورنگ زیب نے پچیس ہزار فوج لے کر لاہور سے کوچ کیا اور ایک مہینے میں (۱۴ صفر ۱۰۵۷ھ/ ۱۲ مارچ ۱۶۴۷ء) کو پشاور پہنچا۔ پشاور سے چل کر وہ کابل میں اترا۔ یہ فاصلہ بھی تقریباً ایک مہینے میں طے ہوا۔ وہ کابل سے آگے بڑھا اور ازبکوں کو شکست دیتا ہوا بلخ جا پہنچا۔

اس جنگ میں اورنگ زیب نے نہایت بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ثابت قدمی اور دلیری اس کا بہت بڑا وصف تھا، جو اس جنگ میں بھی نمایاں نظر آتا تھا۔ تاریخ نے جو واقعات اس ضمن میں بہم پہنچائے ہیں، ان میں

Marfat.com

ایک واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے اور یہی واقعہ ہے، جس نے لڑائی کا فیصلہ کر دیا۔ عین اس وقت جب کہ معرکۂ کارزار گرم تھا، نماز کا وقت آ گیا۔ عالم گیر ہر صورت میں نماز ادا کرنا چاہتا تھا، لیکن جو امرائے جنگ اس کے ہم رکاب تھے، انھوں نے روکنے کی کوشش کی اور اپنے عظیم جرنیل کو لڑائی کے مہیب خطرات سے آگاہ کیا، لیکن اس نے کسی کی ایک نہ مانی۔ وہ فریضہ نماز ادا کرنے کے لیے گھوڑے سے اترا اور پورے اطمینان کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس کے مدمقابل عبدالعزیز خاں والی بخارا کو اس واقعہ کا علم ہوا تو بے ساختہ پکار اٹھا۔

با چنیں کسے در افتادن بر افتادن است ❶

(ایسے شخص سے لڑنا اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنا ہے۔)

یہ کہہ کر اس نے لڑائی بند کرنے کا اعلان کر دیا اور صلح کی پیش کش کی، چنانچہ شاہ جہان کے مشورے سے جو اس زمانے میں کابل میں بیٹھا محاذ جنگ کی نگرانی کر رہا تھا، رمضان ۱۰۵۷ھ (اکتوبر ۱۶۴۷ء) میں عبدالعزیز خاں سے صلح کر لی گئی ___ اورنگ زیب کے بعض نقاد مورخ جو یہ کہا کرتے ہیں کہ اس نے باپ کی اسارت کے جرم اور بھائیوں کے قتل کے فعلِ قبیح کو چھپانے کے لیے اپنے ''معصیت آلود چہرے'' پر نیکی اور خدمت دین کا خول چڑھا لیا تھا، یہ واقعہ ان کی تردید کے لیے کافی ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اورنگ زیب عالم گیر نے تقویٰ اور تدین کی راہ صرف تخت حکومت پر متمکن ہونے کے بعد ہی اختیار نہیں کی، وہ زمانہ شاہ زادگی میں بھی جب کہ فرماں روائی کی منزل بہت دور تھی، نہایت متدین، نیک کردار اور پابند احکامِ شرع تھا۔ اور یہ واقعہ اس کی بین دلیل ہے

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اورنگ زیب اس صلح سے مطمئن نہیں تھا، وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن شاہ جہان کی مداخلت اور حکم سے اسے مجبوراً وہیں گھوڑے کی لگام کھینچنا اور قدم روکنا پڑے۔

ملتان کی ولایت اور قندھار کی مہم:

بلخ اور بدخشاں کی مہم سے واپسی کے بعد ۲۹ صفر ۱۰۵۸ھ (۱۵ / مارچ ۱۶۴۸ء) میں عالم گیر کو ملتان کا والی مقرر کیا گیا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد ۱۸ محرم ۱۰۵۹ھ (۲۲ جنوری ۱۶۴۹ء) میں قندھار کی پہلی مہم تفویض کی گئی۔ آگے چلنے سے پہلے قندھار کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ ۱۵۹۵ء میں اسے جلال الدین اکبر نے فتح کر کے اسے مغلیہ سلطنت میں شامل کیا تھا لیکن ۱۶۲۲ء میں صفویوں نے اسے مغلوں کے قبضے سے آزاد کرا لیا تھا۔ ۱۶۳۸ء میں علی مراد خاں کی ہمت و مدد سے پھر مغلوں کے تسلط میں آ گیا۔ اس کے بعد عباس شاہ صفوی دوم نے اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ شاہ جہان کو اس کی اطلاع پہنچی تو اس نے عالم گیر کے نام حکم جاری کیا کہ اس کو اور سعد اللہ خاں کو قندھار کی مہم تفویض کی گئی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں اس فوجی خدمت کی انجام دہی

❶ مآثر عالم گیری: ص ۵۳۱

Marfat.com

کے لیے روانہ ہوئے۔ مگر ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی صفوی فوج نے قندھار پر قبضہ کر لیا تھا تاہم عالم گیر اور سعد اللہ خاں نے پیش قدمی جاری رکھی اور قندھار کا محاصرہ کر لیا۔ کئی مہینے کے بعد محاصرہ اٹھانا پڑا اور عالم گیر واپس ملتان آ گیا۔

کچھ عرصے کے بعد عالم گیر کو دوبارہ قندھار کی مہم پر جانے کا حکم ہوا۔ اس نے جاتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس اثنا میں خود شاہ جہان بھی کابل پہنچ گیا تھا۔ تین مہینے محاصرہ جاری رہا، لیکن شاہ جہان چوں کہ عالم گیر سے ناخوش تھا اس لیے اس کے کام میں برابر مداخلت کرتا اور غیر جنگی نوعیت کی ہدایات دیتا رہا۔ یہ ہدایات اور مشورے وہ اپنے نامور وزیر سعد اللہ خاں کے ذریعے جاری کرتا تھا۔ جنگی وسائل کی کمی کے باعث یہ محاصرہ بھی بادشاہ کے حکم سے اٹھا لیا گیا۔ عالم گیر نے قندھار فتح کرنے کے لیے شہنشاہ سے ایک اور موقع ملنے کی درخواست کی لیکن یہ درخواست ٹھکرا دی گئی۔ اس دوران دارا شکوہ بھی برابر بادشاہ کو عالم گیر کے خلاف برانگیختہ کرتا رہا۔ اب قندھار کی تیسری مہم کا آغاز دارا شکوہ کی کمان میں ہوا۔ کئی مہینے شہر کا محاصرہ جاری رہا۔ لیکن اس میں بھی ناکامی ہوئی۔

یہ واقعات بہت سی تفصیلات و جزئیات اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں، جنھیں ہم اپنے موضوع سے خارج قرار دے کر قلم زد کرتے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عالم گیر چار سال کے لگ بھگ ملتان کا اور ڈھائی سال تک ملتان اور سندھ دونوں کا والی رہا۔ درمیان میں اگرچہ دو مرتبہ وہ قندھار کی مہم پر بھی گیا لیکن اپنے دور ولایت میں ان علاقوں میں اس نے بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ اس عرصے میں مرکزی حکومت کی طرف سے نہ اسے کوئی قابل ذکر مدد ملی اور نہ کسی موقعے پر اس کی قدر افزائی ہوئی بلکہ ہر معاملے میں حوصلہ شکنی کی گئی اور اس کے راستے میں مشکلات کے کانٹے بچھائے گئے۔ مخالفوں نے بہت سی غلط باتوں کو اس کے دامن میں ٹانکنے کی کوشش کی مثلاً یہ کہ اس نے بعض لوگوں کے گھروں کو آگ لگا کر تباہ کر دیا ہے۔ ساحل سمندر پر اپنا ایک تجارتی جہاز تیار کر لیا ہے جس کو اپنی ذاتی آمدنی کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور یہ کہ وہ مرکز سے رابطہ توڑنا چاہتا ہے۔ لیکن اس مرد مجاہد نے کسی بات کی پروا نہیں کی اور محدود وسائل کے باوجود برابر اپنے علاقوں کی ترقی کے لیے کوشاں رہا۔ شاہ جہان نے بھی اس کو تلخ اور سخت خط تحریر کیے اور اس کے ترقیاتی منصوبوں میں قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالیں، مگر اس لائق اور باہمت بیٹے نے شہنشاہ کو ہر خط کا توازن اور ادب سے جواب دیا اور اس کے قلم اور زبان نے کبھی حد اعتدال سے باہر قدم نہیں رکھا۔

ان تمام معاملات میں اس کا اصل مخالف بڑا بھائی دارا شکوہ تھا جو ہر وقت بادشاہ سے اس کے خلاف غلط سلط باتیں کرتا رہتا تھا۔ ادھر بادشاہ کی حالت یہ تھی کہ وہ بے شک بڑا فہیم، جری اور نیک تھا لیکن عالم گیر کے متعلق دارا شکوہ کی ہر بات کو صحیح قرار دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ عدل و قسط کے تقاضوں سے گویا محروم ہو چکا تھا۔

Marfat.com

دوسری دفعہ نظامت دکن:

اسی اثنا میں عالم گیر کو دوسری دفعہ دکن کی نظامت پر مامور کیا گیا۔ بادشاہ کی طرف سے تاکید کی گئی تھی کہ وہ فوراً ملتان سے دکن پہنچے۔ یہ حکم اس کو ماہ شعبان ۱۰۶۲ھ (جولائی ۱۶۵۲ء) میں موصول ہوا جس کی رو سے اس نے ۱۲ رمضان (۷ اگست) کو بادشاہ کی خدمت میں حاضری دی اور ۲۲ رمضان (۱۷ اگست) کو عازم دکن ہوا۔ ۹ ستمبر کو دریائے سندھ عبور کیا۔ ۱۷ نومبر کو دہلی سے گزرا۔ ۲۸ نومبر کو آگرے پہنچا۔ اس طرح ۱۵ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ (۱۵ فروری ۱۶۵۲ء) کو اس نے برہان پور میں پڑاؤ کیا۔ اس کو کثرت باراں کا نتیجہ قرار دیجیے یا عالم گیر کی سست رفتاری سے تعبیر کیجیے۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ یہ سفر اس نے تقریباً آٹھ مہینے میں طے کیا۔

اس طویل سفر کے دوران کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے عالم گیر کا کردار بادشاہ کی نظر میں مشکوک قرار پا گیا۔ ان میں ایک واقعہ یہ ہوا کہ جب عالم گیر آگرے سے گزر رہا تھا تو اس کی ملاقات اپنے بڑے بھائی شجاع سے ہوئی۔ قندھار کی تگ و تاز کے زمانے میں شجاع کو بھی دکن سے بلایا گیا تھا، لیکن داراشکوہ نے کچھ ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ وہ آگرے سے آگے نہیں جا سکا تھا۔ اس بات کا اسے شدید احساس تھا۔ مستقبل میں جو واقعات رونما ہوئے، ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ ملاقات بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس میں دونوں بھائیوں نے آئندہ کے لیے آپس میں دوستی کا پیمان باندھا ہوگا۔ غالباً اس کو مزید پختہ کرنے کی غرض سے عالم گیر کے بیٹے سلطان محمد کی شجاع کی بیٹی سے نسبت بھی قرار پا گئی۔ دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ جب عالم گیر برہان پور پہنچا تو وہاں اپنے خالو سیف الدین کے ہاں مقیم ہوا۔ اس بہانے وہاں ہیرا بائی نامی ایک خاتون سے شادی کی جو بعد میں زین آبادی محل کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ وہ واقعات تھے جو شاہ جہان کو سخت ناگوار گزرے۔ چنانچہ ان کے بارے میں اس سے جواب طلبی ہوئی۔ بیٹے نے باپ کو سب باتوں کا تفصیل سے جواب دیا اور تلخی احوال کے باوجود دکن کی عنانِ نظامت ہاتھ میں لی۔

دکن کے سیاسی، انتظامی اور اقتصادی حالات نہایت ابتر تھے اور عالم گیر ہر گوشے کی اصلاح کرنا چاہتا تھا، لیکن داراشکوہ نے اس کے خلاف جو سازشوں کا جال بچھا رکھا تھا، وہ قدم قدم پر اس کے راستے میں زبردست رکاوٹ ثابت ہو رہا تھا۔ اسی وجہ سے شاہ جہان بار بار اس کو آگے بڑھنے سے روکتا تھا۔ تعجب یہ ہے کہ جو احکام خود جاری کرتا تھا، انہی پر عمل نہیں ہونے دیتا تھا۔ دکن کی ریاستیں سرکشی پر اتر آئی تھیں اور عالم گیر کے نزدیک ان کا سر کچلنا ضروری تھا۔ عالم گیر چاہتا تھا کہ دکن کے شر پسند عناصر کو اتنی سخت سزا دی جائے کہ وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکیں۔ لیکن شاہ جہان کی طرف سے ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور یہ ریاستیں دہلی کی مرکزی حکومت کے زیر نگیں نہ آ سکیں۔ عالم گیر کو اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہونے کا شدید احساس اور بے حد افسوس تھا۔ اس سلسلے میں اپنے بعض خطوط میں جو اس نے بادشاہ اور جہاں

Marfat.com

آرا بیگم کے نام لکھے، اس بات کا شکوہ بھی کیا ہے۔

اسی اثنا میں ۲۷ ذیقعدہ ۱۰۶۷ھ/۲۷ اگست ۱۶۵۷ء کو شاہ جہان سخت بیمار ہو گیا اور اس کے چاروں بیٹوں، دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب عالم گیر اور مراد بخش کے درمیان وراثت تخت کے سلسلے میں شدید تصادم کی فضا پیدا ہو گئی۔

دارا شکوہ کا کردار اور بھائیوں کا ردعمل:

دارا شکوہ مذہب اور عقیدے میں عام مسلمانوں سے بہت حد تک مختلف تصورات کا حامل تھا۔ وہ اگرچہ علومِ اسلامی سے آگاہ اور فنونِ مروجہ سے بہرہ ور تھا، تاہم اس کے افکار و رجحانات شرعی احکام سے ہم آہنگ نہ تھے اور وہ عملی اور ذہنی اعتبار سے سخت انتشار اور تضادات کا شکار تھا۔ اس کے نزدیک قرآنِ مجید اور بھگوت گیتا میں کوئی فرق نہ تھا۔ ایک اپنشد کا بھی اس نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ بزرگانِ دین کے حالات میں بھی اس نے سفینۃ الاولیا اور سکینۃ الاولیا کے نام سے کتابیں تصنیف کیں۔ ایک طرف وہ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق ارادت رکھتا تھا تو دوسری جانب ہندو جوگی لال داس کے حلقۂ عقیدت سے بھی وابستہ تھا۔ یعنی مسلمان صوفیا اور ہندو جوگی دونوں عبادت اور بھگتی میں اس کے نزدیک یکساں درجہ رکھتے تھے۔

دارا شکوہ کے ان عقائد و نظریات کی بنا پر علمائے دین اور متبعین شریعت اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور حکومت کے دروبست پر اس کے تسلط سے انھیں سخت اختلاف تھا۔ لیکن حیرت انگیز تعجب کی بات ہے کہ شاہ جہان فہیم و فریس اور متبع سنت ہونے کے باوجود ملکی معاملات میں اسی کی رائے کو لائق اعتنا اور قابل عمل قرار دیتا تھا۔ شاہ جہان کے ایام مرض میں بھی یہی ہوا۔ شاہ جہان حبس بول کے عارضے میں مبتلا ہو کر کاروبارِ حکومت چلانے کے قابل نہ رہا تو دارا شکوہ نے موقع مناسب پا کر عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

شاہ جہان کی بیماری کی خبر نہایت تیزی کے ساتھ پورے ملک میں پھیل گئی تھی، بلکہ بعض مقامات میں اس کی موت کی افواہ بھی گردش کرنے لگی تھی۔ اس قسم کی افواہوں کے پھیلنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ دارا شکوہ نے باپ کے واقعۂ مرض کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی اور ملک کے انتظام و انصرام پر خود قابض ہو گیا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ دکن، گجرات اور بنگال کے تمام راستے بند کر دیے اور مختلف اہم ٹھکانوں پر سخت پہرے بٹھا دیے تا کہ نہ کوئی راز کی خبر باہر جا سکے اور نہ مراد بخش، شجاع اور اورنگ زیب میں سے کوئی بھائی دہلی کی طرف کوچ کر سکے۔ ان کے جو وکلا د سفرا دربار میں متعین تھے، ان سے بھی ضمانت لی کہ وہ دربار کی کوئی خبر انھیں نہ بھیجیں گے۔ بعض کے گھر بار بھی لوٹ لیے۔ ایک اقدام اس نے یہ کیا کہ مراد بخش اور اورنگ زیب میں اختلاف پیدا کرنے کی غرض سے برار کا وہ علاقہ جو اورنگ زیب کی ولایت دکن میں شامل تھا، مراد کو دے دیا اور قاسم خاں اور جودھ پور کے راجا جسونت سنگھ کو فوج کی بھاری جمعیت کے ساتھ مالوہ کی طرف روانہ کیا۔ ان واقعات سے جو شاہ جہان کی

Marfat.com

بیماری کے فوراً بعد رونما ہوئے، دارا شکوہ کی طرف سے بھائیوں کے دلوں میں کئی قسم کے شبہات پیدا ہو گئے اور انھوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔

شجاع اس زمانے میں بنگال میں مقیم تھا۔ اس نے راج محل کے مقام پر ''ابوالفوز ناصرالدین محمد تیمور ثالث، سکندر ثانی، شاہ شجاع غازی'' کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ دارا شکوہ نے باپ کو زہر دے دیا ہے اس لیے وہ بڑے بھائی سے لڑنے کے لیے عازم آگرہ ہوا۔ ۲۴ ربیع الثانی ۱۰۶۸ھ (۱۹ جنوری ۱۶۵۸ء) کو وہ بنارس کے قریب پہنچا۔ یہاں بہادر پور کے نواح میں شاہی فوج سے جس کی کمان سلیمان شکوہ اور جے سنگھ کر رہے تھے، اس کا مقابلہ ہوا، اور شکست کھائی۔ یہ واقعہ ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۰۶۸ھ (۱۶ فروری ۱۶۵۸ء) کو پیش آیا۔

مراد بخش ان دنوں گجرات میں تھا۔ اس نے احمد آباد کو دارالحکومت قرار دے کر مروّج الدین کے لقب سے گجرات میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور غازی مراد بخش کے نام سے اپنا الگ سکہ بھی جاری کر لیا، نیز دارا شکوہ کو ایک تہدید آمیز خط لکھا اور لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کی فوجی طاقت چوں کے کم تھی اس لیے دکن میں اورنگ زیب عالم گیر کو مسلسل اور متعدد خطوط لکھے جن میں امداد اور اتحاد کی التجا کی۔

سلطنت مغلیہ کے لیے یہ انتہائی نازک وقت تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر ان دنوں دکن میں مقیم تھا اور نہایت تذبذب اور تحیر کی کیفیت اس پر طاری تھی۔ وہ بے حد محتاط اور گہرا آدمی تھا، اس لیے عجلت میں کوئی قدم اٹھانا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ یہ البتہ اسے یقین تھا کہ بادشاہ فوت نہیں ہوا زندہ ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ بادشاہ کو اس معاملے میں دارا شکوہ کی حمایت نہیں کرنی چاہیے اور جو زیادتیاں وہ کر رہا ہے اس کا بہر حال ازالہ ہونا چاہیے لیکن افسوس ہے اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور چند روز میں شاہی فوجیں مالوہ کے علاقے میں گھس گئیں۔ ان فوجیوں کا ارادہ پہلے مراد بخش کو شکست دینے اور اس کے بعد دکن پہنچ کر اورنگ زیب عالم گیر سے نبرد آزما ہونے کا تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر نے جب یہ دیکھا کہ حالات بگڑ رہے ہیں اور مراد بھی اس سے طلب امداد کے لیے انتہائی مضطرب ہے تو اس نے مراد کی درخواست قبول کر لی اور اپنی فوج کو آگرے کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ اورنگ زیب کا لشکر دریائے نربدا عبور کر کے آگے بڑھا تو اجین کے مقام پر مراد کی فوجیں بھی اس سے آملیں۔ راجا جسونت سنگھ کو جب اس کا پتا چلا تو اس نے بھی اپنی فوجوں کو حرکت دی اور عالم گیر کے پڑاؤ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر خیمہ گاڑ دیا۔ اورنگ زیب نے شاہی فوج کے سپہ سالار کو یہ پیغام بھیجا کہ ہمارا مقصد لڑائی کا بازار گرم کرنا نہیں ہے، ہم اپنے باپ شہنشاہ ہند سے ملنے اور ان کی عیادت کے لیے آگرے جانا چاہتے ہیں، لہٰذا ہمارا راستہ نہ روکو اور اپنا سفر جاری رکھنے دو۔ لیکن جسونت سنگھ نے عالم گیر کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور سپری ندی کے گھاٹوں کی ناکہ بندی کر کے سخت پہرے بٹھا دیے تاکہ عالم گیر اور مراد کی فوجیں ندی عبور نہ کر سکیں۔ عالم گیر نے اس موقعے پر نہایت تحمل کا ثبوت دیا اور پہرے داروں سے متصادم

Marfat.com

ہونے سے گریز کرتے ہوئے بندھیلہ سرداروں کی مدد سے چند میل کا چکر کاٹ کر ندی کو عبور کیا۔ یہ صورت حال جسونت سنگھ اور شاہی فوجوں کو سخت ناگوار گزری اور دھرمٹ کے مقام پر دونوں جانب کی فوجوں کے درمیان شدید جنگ ہوئی جس میں عالم گیر اور مراد فتح یاب ہوئے اور شاہی فوج کو کامل ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بہت سے سردار اور سپاہی مارے گئے اور قاسم خاں اور جسونت سنگھ نے میدان جنگ سے فرار ہو کر جان بچائی۔ عالم گیر نے اس فتح کی یادگار کے طور پر اسی میدان میں ایک قصبہ آباد کیا جو فتح آباد کے نام سے مشہور ہوا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ راجا جسونت سنگھ جب عالم گیر کی فوج سے شکست کھانے کے بعد بھاگ کر وطن پہنچا تو اس کی بیوی نے اس کو اپنے قریب آنے سے سختی کے ساتھ روک دیا اور پھر تمام عمر اس سے ہم بستر نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے شوہر راجا جسونت سنگھ سے صاف لفظوں سے کہا کہ میدان جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگنے والا میرے ہم صحبت ہونے کے قابل نہیں رہا [1]۔

جنگ کے اس نتیجے سے آگرے میں سخت اضطراب اور ہیجان پیدا ہو گیا اور شاہی حلقوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ شاہ جہان آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے دہلی جا رہا تھا کہ اس غیر متوقع خبر سے رک گیا۔ اب اس نے بھائیوں کے درمیان صلح کرانے اور ان کی دشمنی کو ختم کرانے کی کوشش کی، لیکن دارا کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دارا اپنی شکست فاش سے پریشان ضرور تھا لیکن صلح ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ مراد اور عالم گیر کی افواجِ قاہرہ اب تیزی کے ساتھ آگرے کی طرف بڑھ رہی تھیں اور دارا ان کے ساتھ فیصلہ کن لڑائی کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ حریف کی فوجوں پر ضرور فتح پائے گا۔ چنانچہ شاہ جہان کی شدید مخالفت کے باوجود وہ ایک لاکھ سپاہ کی معیت میں آگرے سے نکلا اور مخالفوں کو میدان جنگ میں شکست دینے کا عزم لے کر روانہ ہوا۔

ادھر عالم گیر اور مراد بھی اپنی جاں باز اور آزمودہ کار فوج کے ساتھ دارالسلطنت آگرے کی طرف بڑھ رہے تھے اور دریائے چنبل عبور کر چکے تھے۔ مئی کا مہینا تپ رہا تھا۔ گرمی شباب پر تھی کہ دارا شکوہ کی فوج نے آگرے سے روانہ ہو کر ساموگڑھ کے مقام میں پڑاؤ کیا جو آگرے سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۲۶ شعبان ۱۰۶۸ھ (۱۹ مئی ۱۶۵۸ء) کو فریقین کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں اتریں اور زبردست لڑائی ہوئی۔ یہ لڑائی واقعی فیصلہ کن ثابت ہوئی اور دارا کو اس میں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔

یہاں اس لڑائی کی تاریخ کا یہ بیان لائق تذکرہ ہے کہ مراد نے اس معرکے میں نہایت ثابت قدمی سے حصہ لیا اور جرات و دلیری کا پورا ثبوت دیا۔ اس کے ہاتھی کا ہودہ تیروں سے چھن گیا اور وہ خود لہولہان ہو گیا۔ لیکن پہاڑ کی طرح ڈٹا رہا اور برابر دشمن پر تیر برساتا رہا۔ یہ ہودہ فرخ سیر کے زمانے تک یادگار کے طور پر قلعے میں محفوظ رہا۔ جب سادات بارہ کی سرکشی حد سے بڑھی تو عالم گیر کی بہن بادشاہ بیگم نے یہ ہودہ دکھلا کر

[1] منتخب اللباب: ج ۲ ص ۴۲

Marfat.com

کہا کہ یہ تیموری نسل کی یادگاریں ہیں❶۔

داراشکوہ ساموگڑھ کے میدان میں شکست کھانے کے بعد آگرے کی طرف بھاگا اور شرم کے مارے شاہ جہان کے پاس نہیں گیا۔ شاہ جہان نے ضروری مشوروں کے لیے اسے بار بار بلایا لیکن وہ باپ سے ملے اور مشورہ کیے بغیر اسی رات اہل وعیال کے ساتھ آگرے سے نکلا اور لاہور کے ارادے سے دہلی روانہ ہو گیا۔

بعد کے مختصر حالات:

یہ دنیا دارالمکافات ہے۔ یہاں ہر نیکی کی جزا اور ہر برائی کی سزا ملنی ضروری ہے۔ یہ ایک عالم گیر اور دائمی اصول ہے کہ خیر کا صلہ ثواب کی صورت میں اور معصیت کا بدلہ عقاب کی شکل میں ظہور میں آتا ہے۔ اس اصول میں تقدیم یا تاخیر تو ہو سکتی ہے لیکن یہ ختم بالکل نہیں ہو سکتا۔ اورنگ زیب اور داراشکوہ یا اورنگ زیب اور شاہ جہان کے سلسلے میں یہی اصول رونما ہوا۔ قدرت کی کرشمہ سازیاں دیکھیے کہ وہی اورنگ زیب جس کے لیے کل دارالسلطنت کے دروازے بند تھے، آج وہی اورنگ سلطنت کا مالک بنا۔ اور اس داراشکوہ کے لیے جو باپ کو بے بس کر کے مملکت کے سیاہ سفید پر قابض تھا، آگرے کے دارالحکومت میں ایک رات گزارنا بھی ناممکن ہو گیا۔ وہ پہلے دہلی گیا۔ وہاں سے پنجاب کا رخ کیا اور لاہور سے ملتان اور ملتان سے سندھ ہوتا ہوا گجرات کی طرف بھاگا۔ اس کے تعاقب میں خود اورنگ زیب بھی پنجاب گیا اور اسے کبھی چین کا موقع نصیب نہ ہوا۔

جس زمانے میں داراشکوہ گجرات پہنچا، اس زمانے میں وہاں کا والی شاہ نواز خاں تھا، اس کی بیٹی دلرس بانو اورنگ زیب کے عقد میں تھی۔ ساموگڑھ کی لڑائی کے بعد اورنگ زیب عالم گیر نے سسر کو نظر بند کر دیا تھا کیوں کہ اس کی ہمدردیاں فریق مخالف کے ساتھ تھیں، لیکن بعد میں حالات اعتدال پر آئے تو اس کو گجرات کا ناظم مقرر کر دیا گیا۔ اب داراشکوہ گجرات پہنچا تو شاہ نواز خاں نے دارا کی حمایت اور اورنگ زیب کی مخالفت شروع کر دی۔ اسی اثنا میں راجا جسونت سنگھ نے جو اس سے قبل دھرمٹ کے میدان میں اورنگ زیب اور مراد سے بری طرح ہزیمت اٹھا چکا تھا دارا کو اجمیر آنے کی دعوت دی اور راجستھان کے راجپوتوں کی مدد کا یقین دلایا۔ اس سے دارا کی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس نے اجمیر کا عزم کیا۔ ادھر اورنگ زیب کو صورت حال کا علم ہوا تو وہ بھی ۲۷ جمادی الاخری ۱۰۶۹ھ (۱۱ مارچ ۱۶۵۹ء) کو ایک لشکر کے ساتھ اجمیر کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں فریقوں کے درمیان اجمیر کے نواح میں دیواری کے مقام پر گھمسان کا رن پڑا۔ تین دن لڑائی جاری رہی۔ نتیجتاً دارا کو پھر شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ اس لڑائی میں شاہ نواز خاں بھی شریک تھا جو میدان جنگ میں مارا گیا۔ دارا نے وہاں سے پھر راہ فرار اختیار کی مگر چند روز بعد اورنگ زیب دہلی واپس آ گیا۔

اس لڑائی میں ہزیمت اٹھانے کے بعد داراشکوہ سندھ کے راستے عازم ایران ہونا چاہتا تھا تاکہ

---

❶ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر: ص ۷۹

Marfat.com

ہمایوں کی طرح ایران کی مدد سے دوبارہ حصول سلطنت کی کوشش کی جائے۔ اس منصوبے کے تحت وہ بنوں کے قریب پہنچا تھا کہ ایک بلوچ سردار ملک جیون نے پکڑ کر اسے شاہی حکام کے حوالے دیا۔ یہ واقعہ ۱۲ شوال ۱۰۶۹ھ (۳ جون ۱۶۵۹ء) کو پیش آیا۔ بنوں سے ۲۰ ذوالحجہ ۱۰۶۹ھ (۲۹ اگست ۱۶۵۹ء) کو اسے دہلی لایا گیا۔ اس کے عقائد کی بنا پر علما نے اس پر کفر و الحاد کا فتویٰ جاری کیا، جس کی پاداش میں اگلے روز ۲۱ ذوالحجہ ۱۰۶۹ھ (۳۰/ اگست ۱۶۵۹ء) کو اسے قتل کر دیا گیا۔

یہ تو تھا دارا شکوہ کا انجام۔ اب مراد بخش کے بارے میں سنیے اس پر کیا بیتی۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا دارا شکوہ نے دارالسلطنت میں بیٹھ کر جو طرز عمل اختیار کیا تھا اس پر سب بھائی نالاں تھے۔ مراد بخش نے گجرات میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا اور اپنے نام کا سکہ اور خطبہ بھی جاری کر دیا تھا۔ اس نے اورنگ زیب عالم گیر سے جو ان دنوں دکن کا والی تھا آگرے کی طرف کوچ کرنے کی غرض سے خط و کتابت بھی کی تھی اور اسی کی تحریک اور پیہم درخواستوں کی بنا پر اورنگ زیب نے آگرے کا قصد کیا تھا۔ اورنگ زیب نے مراد کے قصد آگرہ کی درخواست قبول کرتے ہوئے اسے یہ عہد نامہ لکھ کر دیا تھا کہ اگر وہ (اورنگ زیب عالم گیر) حصول سلطنت میں کامیاب ہو گیا اور مراد بخش آخر وقت تک وفادار رہا تو اسے کابل، کشمیر، شمالی پنجاب اور سندھ کے علاقے دے دیے جائیں گے۔ بلاشبہ مراد بڑا بہادر اور جری تھا اور دھرمٹ اور ساموگڑھ میں نہایت شجاعت اور جواں مردی سے لڑا تھا، لیکن طبیعت کا تیز اور عجلت پسند تھا۔ مے نوش اور عیاش تھا۔ معرکہ ساموگڑھ کے بعد جب زمام سلطنت عالم گیر کے ہاتھ میں آئی تو مراد نے بہت ہی عجلت پسندی کا ثبوت دیا اور در پردہ عالم گیر کی مخالفت کرنے لگا۔ خفیہ طور پر شاہ جہان سے خط و کتابت شروع کر دی۔ ساتھ ہی اورنگ زیب عالم گیر کے امرائے سلطنت کو لالچ دے کر اپنی حمایت پر کمر بستہ کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا، نیز اورنگ زیب کو وہ وعدے یاد دلائے جو اس کے ساتھ کیے گئے تھے۔ اورنگ زیب نے اسے ہر چند سمجھایا کہ ابھی حالات اعتدال پر نہیں آئے لڑائی اختتام کو نہیں پہنچی اور کش مکش کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن اس نے ایک نہ مانی اور عالم گیر کو برابر پریشان کرتا رہا۔ آخر تنگ آ کر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے سلیم گڑھ میں اور بعد کو گوالیار کے قلعے میں محبوس کر دیا گیا اور وہیں ۲۱/ ربیع الاول ۱۰۷۲ھ (۴/ دسمبر ۱۶۶۱ء) کو شاہی دیوان علی قلی خاں کے قصاص میں اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا۔

باقی رہا تیسرا بھائی شجاع، تو اس نے حالات کی ابتری سے فائدہ اٹھانے کے لیے بنگال سے تازہ دم فوج کے ساتھ آگرے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ عالم گیر ان دنوں دارا شکوہ کے تعاقب میں پنجاب میں سرگرم عمل تھا۔ اسے شجاع کے ارادوں کی اطلاع پہنچی تو فوراً پیچھے مڑا اور الٰہ آباد کے قریب جا کر پڑاؤ کیا۔ ادھر شجاع بھی اپنی فوجوں کے ہم رکاب وہاں پہنچ چکا تھا۔ دونوں کے درمیان الٰہ آباد کے جوار میں کھجوہ کے مقام پر لڑائی کا آغاز ہوا اور ۱۰/ ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ (۲۶/ دسمبر ۱۶۵۸ء) کو شجاع نے عالم گیر کے ہاتھوں بری طرح

Marfat.com

شکست کھائی اور راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ وہ بے شمار ساز و سامان اور اسلحہ جنگ کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا، سب وہیں چھوڑ گیا۔ میر جملہ اور عالم گیر کا بیٹا شہزادہ سلطان محمد اس کے تعاقب میں گئے لیکن سلطان محمد سے شجاع کی بیٹی منسوب تھی لہٰذا وہ چچا کے ساتھ جا ملا۔ اس کے نتیجے میں وہ سزاوار عتاب قرار پایا اور گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ میر جملہ نے انتہائی شجاعت کا ثبوت دیا اور شجاع کو بنگال سے نکال کر دم لیا۔ شجاع نے بنگال سے نکل کر پہلے تو آسام کے راجا کے ہاں پناہ لی، پھر اس سے مخالفت ہو گئی تو ارکان بھاگ گیا۔ بعد ازاں غالباً جنوری ۱۶۶۱ء میں وہاں کے پہاڑی قبائلیوں کے ہاتھوں مارا گیا[۱]۔

شاہ جہان کا طرز عمل اور عالم گیر کی اطاعت شعاری:

شاہ جہان کے چار بیٹے تھے دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب عالم گیر اور مراد بخش۔ اورنگ زیب بہ ترتیب عمر چاروں بھائیوں میں تیسرے درجے پر تھا، لیکن قابلیت و استعداد، بہادری، جواں مردی، دوراندیشی، جفاکشی، علم و عرفان، مردم شناسی، کردار کی پختگی، بلند حوصلگی اور انتظامی نقطۂ نظر سے سب سے فائق تر تھا۔ اس نے ملک کے دور دراز علاقوں میں نظم و نسق کی عظیم ذمہ داریوں پر فائز رہ کر وسیع تجربات حاصل کر لیے تھے اور ایام شہزادگی ہی میں منجھے ہوئے سیاست دانوں اور باتدبیر حکمرانوں کے تمام اسالیب فکر کو اپنا لیا تھا۔ وہ انتہائی ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک، متحمل مزاج اور محتاط حکمران تھا۔ جذبات کو قابو رکھنا اور دل کی بات کسی کو نہ بتانا اس کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ اس کی ذہنی اور فکری استعداد اس درجہ تیز تھی کہ ایسے تمام معاملات کو نہایت عجلت سے حیطۂ فہم میں لے آتا جو حصولِ مقاصد میں اس کے لیے مفید ہو سکتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب شاہ جہان اپنے چاروں بیٹوں کے بارے میں سوچتا تو ہر پہلو سے عالم گیر ہی کو ان پر ترجیح دیتا اور اس کے عزم و حزم اور گوناگوں صلاحیتوں کا صاف الفاظ میں اعتراف کرتا وہ خوب جانتا تھا کہ اس کا کون بیٹا کس درجے کا ہے۔

شاہ جہان آئندہ کاروبار حکومت کے سلسلے میں بہت فکر مند رہتا تھا اور بعض مقربین خاص سے اس کا ذکر بھی کرتا چنانچہ ایک مرتبہ اس نے علی مردان خاں اور اپنے وزیر اعظم سعد اللہ خاں کو خلوت میں بلایا اور خاص طور سے اس موضوع پر گفتگو کی۔ ان سے کہا کہ میں اس معاملے میں بڑا فکر مند ہوں۔ آپ اللہ کے لیے فقرا و صلحا کے ساتھ مل کر دعا کریں کہ ہماری مملکت کا مستقبل بہتر ہو اور میرے بیٹوں کو بارگاہ خداوندی سے عمل خیر کی توفیق نصیب ہو۔ اس کا ذکر خود عالم گیر نے اپنے ایک خط میں کیا ہے جو اس نے اپنے ایک بیٹے کے نام لکھا۔ آگے چل کر وہ اس نتیجے کا ذکر کرتا ہے، جس پر شاہ جہان اپنے بیٹوں کے بارے میں پہنچا تھا اور جس کا تذکرہ اس نے خود علی مردان خاں اور سعد اللہ خاں سے ان الفاظ میں کیا۔

---

[۱] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ۔ مقالہ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر۔ از شیر محمد گریوال: ج ۱۸، ص ۷۵۔

Marfat.com

بعضے اوقات اندیشہ عاطر راہ می یابد کہ مہین پور خلافت اگر چہ اسباب شان وشوکت وسامان تجمل و صولت ہمہ دارد لیکن عدو نیکوان و دوستِ بداں واقع شدہ۔ شجاع غیراز سیر چشمی وصفے نہ دارد و مراد بخش مجہول الکیفیت بہ اکل وشرب ساختہ دائم الخمر است، مگر فلانی این عاجز فانی ذی عزم ومآل اندیش بہ نظرمی آید اغلب کہ متحمل امر خطیر ریاست تواند شد ❶۔

(یعنی بعض دفعہ میرے دل میں یہ خطرات پیدا ہوتے ہیں کہ داراشکوہ اگر چہ حکومت کے آداب شان وشوکت اور اصول تجمل وتہور سے آگاہ ہے، لیکن اس میں یہ برائی راسخ ہو چکی ہے کہ نیک لوگوں کا دشمن اور بدکردار لوگوں کا دوست ہے۔ شجاع سیر چشمی کے علاوہ کسی وصف سے بہرہ ور نہیں۔ مراد بخش ہر معاملے کی کیفیت سے محروم اور ہر آن کھانے پینے میں مگن اور ہر وقت شراب نوشی میں مشغول رہتا ہے۔ بعد ازاں اس عاجز فانی (اورنگ زیب عالم گیر) کا نام لے کر کہا کہ وہ صاحب عزم اور دور اندیش ہے۔ مجھے یقین ہے وہ حکومت کے اس بارگراں کا متحمل ہوگا۔)

بہر حال شاہ جہان ایک مردم شناس بادشاہ تھا اور اورنگ زیب کو "ذی عزم ومآل اندیش" سمجھتا تھا۔ لیکن افسوس ہے، بقول شیخ محمد اکرام "اپنی حکومت کے آخری پندرہ بیس سالوں میں اس نے اورنگ زیب سے کوئی قدر دانی کا برتاؤ نہیں کیا ❷۔" اس زمانے کے احکام وخطوط پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ اورنگ زیب کے بارے میں باپ کا طرز عمل نہ صرف پدرانہ شفقت ومحبت سے خالی تھا بلکہ سراسر معاندانہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس سے باز پرس کی جاتی۔ اسے امرا کے سامنے ڈانٹ دیا جاتا اور اس کے لائق فخر کارناموں کو بھی ناقابل تعریف قرار دیا جاتا۔ یہاں تک کہ مغلیہ سلطنت کی توسیع اور ملک میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے گولکنڈہ اور بیجاپور وغیرہ میں اس نے خود بادشاہ کے حکم سے جو نمایاں کارنامے انجام دینا شروع کیے، ان میں رکاوٹ ڈالی گئی اور دوسروں کی نظر میں اسے لائق ملامت بلکہ ذلیل ٹھہرایا گیا۔

یہ سلسلہ یہاں تک دراز ہوا کہ سامو گڑھ کی لڑائی کے بعد جو واقعات پیش آئے، ان میں بھی اورنگ زیب عالم گیر کے بارے میں شاہ جہان کا طرز عمل بڑا حیران کن بلکہ افسوس ناک رہا۔ شاہ جہان قلعہ آگرہ میں بیمار پڑا تھا اور نہایت تکلیف کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ داراشکوہ نے اس کو عضو معطل قرار دے کر معاملاتِ سلطنت سے الگ کر دیا تھا۔ شاہ جہان کے بار بار روکنے اور یقین دلانے کے باوصف کہ تم عالم گیر کے مقابلے میں نہ نکلو، میں خود جا کر حالات پر قابو پالوں گا، دارا نے اس کی ایک نہ مانی۔ اب سامو گڑھ میں عالم گیر کو فتح حاصل ہوئی اور اس نے ہندوستان کی وسیع مملکت کے دروبست پر قبضہ کیا تو شاہ جہان نے مبارک باد کا پیغام بھیجا اور ایک مرصع تلوار بھیجی جس پر عالم گیر کا خطاب کندہ تھا۔ اس نے بیٹے سے ملاقات کے اشتیاق کا اظہار بھی کیا اور

❶ رقعات عالم گیری: ص ۱۹، ۲۰۔

❷ رود کوثر: ص ۴۵۴۔۴۵۵۔

Marfat.com

میں آنے کی دعوت دی۔ عالم گیر کی بہن جہاں آرا بیگم بھی آئی جو عالم گیر کی شدید مخالف اور دارا کی حامی تھی۔ عالم گیر نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس نے بھی بھائی کو باپ سے ملاقات کے لیے مجبور کیا۔ عالم گیر کا دل صاف اور ضمیر مطمئن تھا۔ لہٰذا باپ کی خدمت میں حاضر ہونے اور ملاقات وسلام کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے امراو مقربین نے اس کو روکا اور ممکنہ خطرات سے آگاہ کیا تو وہ سوچنے لگا۔ اس سے آگے واقعات عالم گیری کا مصنف عاقل خاں جو امرائے عالم گیری میں سے تھا، جن الفاظ میں شاہ جہان کے اصل ارادوں کی وضاحت کرتا ہے، وہ بڑے افسوس ناک ہیں۔ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ شاہ جہان ملاقات کے بہانے عالم گیر کو گرفتار کر کے داراشکوہ کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ عاقل خاں کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

''عین اس وقت کہ عالم گیر خیر خواہانِ دولت کی باتیں سن کر سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ اچانک ناہر دل خاں چیلہ پہنچا۔ شاہ جہان نے خود اپنے ہاتھ سے داراشکوہ کے نام خط لکھ کر بڑی احتیاط سے اس کے حوالے کیا تھا کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہونے پائے اور وہ یلغار کرتا ہوا دہلی پہنچ کر داراشکوہ سے اس کا جواب لائے۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ تم (داراشکوہ) مطمئن ہو کر دہلی میں ٹھہرو، آگے نہ جاؤ، ہم یہیں تمام قصے کا فیصلہ کیے دیتے ہیں۔

اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

داراشکوہ خاطر خود را جمع کردہ در شاہ جہان آباد ثبات قدم ورزد واز آں جا پیشتر نہ گزرد کہ ما دریں جا مہم را فیصل می فرمائیم۔

عاقل خاں اس سے آگے لکھتا ہے:

ایں فرمان مصدق ومصداق قول خیر خواہاں آمدہ۔

(یعنی داراشکوہ کے نام شاہ جہان کے اس خط نے اورنگ زیب عالم گیر کے بہی خواہوں کی بات کی حرف بحرف تصدیق کر دی۔)

مآثر الامرا کے مصنف نے یہ واقعہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ناہر دل خاں چیلہ نے جو خط عالم گیر کی خدمت میں پیش کیا، اس میں شاہ جہان نے داراشکوہ کو جو الفاظ لکھے تھے ان کا مطلب یہ تھا کہ

مضمون آں کہ او لشکر با فراہم آوردہ در دہلی ثبات قدم ورزد، ما دریں جا مہم را فیصل می فرمائیم ❶۔

(یعنی مضمون خط یہ تھا کہ وہ (داراشکوہ) اپنی فوج کے ساتھ دہلی میں قیام کرے، ہم اس مہم کا یہیں (آگرہ میں) فیصلہ کر دیں گے۔)

اتفاق سے جنگ کے ان ایام میں ایک یورپی مورخ ڈاکٹر برنیر ہندوستان میں موجود تھا اور تمام

❶ مآثر الامرا: ج ۲ ص ۶۹۷

Marfat.com

واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے تھے۔ اپنے سفرنامے میں اس نے تفصیل سے ان واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر برنیر کا پیرایۂ بیان اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ عالم گیر کا مخالف تھا، لیکن اس کے قلم نے بعض مقامات پر اصل حقائق کی بھی نشان دہی کر دی ہے۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں ''اس کے بیان سے اجمال کی گرہ کھل جاتی ہے'' وہ لکھتا ہے:

شاہ جہان نے ایک معتبر خواجہ سرا کو اورنگ زیب کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ بے شک دارا شکوہ نے جو کچھ کیا نا مناسب تھا (اس سے آگے) اس کی بے سمجھی اور نالائقی کی باتیں یاد دلا کر کہا کہ ''تم پر تو ہم ابتدا ہی سے دلی شفقت رکھتے تھے۔ پس تم کو ہمارے پاس جلد آنا چاہیے تاکہ ہمارے مشورے سے ان امور کا انتظام کیا جائے جو افراتفری کے باعث خراب اور ابتر پڑے ہیں۔'' لیکن اس محتاط شہزادے (عالم گیر) نے بدگمانی سے بادشاہ پر اعتماد کر کے قلعے میں جانے کی دلیری نہ کی، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ بیگم صاحبہ (یعنی عالم گیر کی بہن جہاں آرا بیگم) کسی وقت بادشاہ سے جدا نہیں ہوتی۔ وہ اس کے مزاج پر اس قدر حاوی ہے کہ جو کچھ چاہتی ہے وہی ہوتا ہے، اور یہ پیغام اس کا ایک چکمہ ہے۔ اس نے تاتاری عورتوں میں سے جو محل سرا کے چوکی پہرے پر متعین رہتی ہیں، کچھ قوی ہیکل اور مضبوط مسلح عورتیں اسی مقصد کے لیے مقرر کر رکھی ہیں کہ جب عالم گیر قلعے میں داخل ہو تو فوراً اس پر ٹوٹ پڑیں[1]۔

لین پول لکھتا ہے:

اس جال میں جو شاہ جہان نے اپنے بیٹے کے پھانسنے کے لیے بچھایا، خود شاہ جہان ہی اس میں پھنس گیا[2]۔

بہر حال شاہ جہان نے مملکت ہند کی کئی اہم شخصیتوں کے نام عالم گیر کو دام تزویر میں پھانسنے کے لیے لکھا، ایک خط مہابت خاں کے نام بھی تحریر کیا جو اس زمانے کا نامور سپہ سالار تھا اور کابل میں مقیم تھا۔ لیکن عالم گیر کا رویہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تفصیل سے بات کرنا چاہتا تھا اور اگر اس کی غلطی ثابت ہو جائے تو عفو و درگزر کا متمنی تھا۔ مگر شاہ جہان کی تمام تر ہمدردیاں اب بھی دارا سے وابستہ تھیں۔ اس کی اصل وجہ جہاں آرا بیگم تھی، جو شاہ جہان کو سب سے زیادہ عزیز تھی اور وہ دارا کی زبردست حامی تھی۔ شاہ جہان نے عالم گیر کے خلاف شجاع کو بھی ہندی زبان میں ایک خفیہ خط لکھا اور برابر کوشاں رہا کہ کسی طرح عالم گیر کی فتح شکست میں بدل جائے اور دارا تخت حکومت پر متمکن ہو جائے۔ جب عالم گیر باپ سے بالکل مایوس ہو گیا تو قلعہ آگرہ پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ بہ الفاظ دیگر یہ شاہ جہان کی تخت ہند سے معزولی کا اعلان تھا۔

عالم گیر کا حوصلہ اور دل گردہ دیکھیے کہ شاہ جہان کی مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود اپنے بیٹے شہزادہ محمد

---

[1] سفرنامہ ڈاکٹر برنیر اردو ترجمہ: ج ۱، ص ۱۱۴۔

[2] ترجمہ لین پول، ص ۴۵۔

اعظم کو شاہ جہان کی خدمت میں عفو تقصیر کے لیے بھیجا اور پانچ سو اشرفیاں اور چار ہزار روپے نذر کیے۔ بعد ازاں باپ کے لیے قلعے میں ہر قسم کے آرام و راحت کے سامان مہیا کر دیے۔ ڈاکٹر برنیر بھی عالم گیر کا سخت مخالف ہونے کے باوصف صاف لفظوں میں اس کی شہادت دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

غرضیکہ اورنگ زیب کا برتاؤ شاہ جہان کے ساتھ مہربانی اور ادب سے خالی نہ تھا۔ وہ حتیٰ الامکان اپنے بوڑھے باپ کی ہر طرح سے خاطر داری کرتا اور نہایت کثرت سے اس کی خدمت میں تحفے تحائف بھیجتا رہتا۔ سلطنت کے اہم معاملات میں اس کی رائے اور مشورے مثل پیرو مرشد کی ہدایت کے طلب کرتا۔ اس کے عریضوں سے جو اکثر باپ کو لکھا کرتا تھا، ادب اور فرماں برداری ظاہر ہوتی ہے۔ عالم گیر کے اس طرز عمل سے شاہ جہان کی گردن کشی اور اس کا غصہ یہاں تک ٹھنڈا پڑ گیا کہ وہ معاملات سلطنت میں بیٹے کو ضروری باتیں تحریر کرنے لگا، بلکہ اپنے باغی فرزند کی سب گستاخانہ حرکتیں معاف کر کے اس کے حق میں دعائے خیر بھی کی[۱]۔

بہر کیف شاہ جہان کی معزولی اور قلعہ آگرہ پر پہرہ بٹھانے کے بعد بھی اورنگ زیب عالم گیر ہمیشہ باپ کا اطاعت شعار رہا اور اس کے ساتھ نہایت مؤدبانہ سلوک روا رکھا۔

شاہ جہان نیک اور باعمل بادشاہ تھا اور بدو شعور ہی سے علما کی صحبت و رفاقت میں رہنے کا عادی تھا، قلعہ آگرہ میں بھی اس نے اس روایت کو قائم رکھا۔ یہاں اس نے دیار ہند کے بہت بڑے عالم و فاضل اور فقیہ نام دار سید محمد قنوجی (متوفی ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء) کو اپنے پاس بلایا، تاکہ علوم و معارف میں اس سے بحث و مذاکرے کا سلسلہ جاری رہے اور بوقت ضرورت مسائل دینی میں ان سے رجوع کیا جائے۔ وہ شاہ جہان کی وفات تک اس کے ساتھ رہے۔ تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ کے انتظامات میں بھی وہ باقاعدہ شامل تھے۔ مسائل فقہیہ میں وہ اس درجے کے صاحب فضل و کمال تھے کہ عالم گیر نے فتاویٰ عالم گیری کے مدونین کی عالی قدر جماعت میں ان کو شریک کیا۔

اورنگ زیب کی تخت نشینی:

گزشتہ سطور میں ساموگڑھ کی لڑائی کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کی تخت نشینی کے واقعہ کو وہیں چھوڑ کر پہلے اختصار کے ساتھ اس کے بھائیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مجملاً شاہ جہان کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔ اب اس کی تخت نشینی اور بعد کے ضروری وقائع و حالات بیان کیے جاتے ہیں

اورنگ زیب یکم ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ (۲۳ جولائی ۱۶۵۸ء) کو باغ اغرآباد (دہلی) میں جو بعد کو شالامار باغ کہلایا، جمعہ کے دن تخت ہند پر متمکن ہوا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس برس کی تھی۔ فرہنگ رشیدی کے مصنف سید عبدالرشید نے قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ سے تاریخ نکالی

---

[۱] ترجمہ سفرنامہ ڈاکٹر برنیر، ج ۱، ص ۲۸۹۔

Marfat.com

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔

ملا شاہ نے ''ظل الحق'' سے تاریخ نکال کر یہ رباعی کہی۔

صحنِ دلِ من چوں گلِ خورشید شگفت
حق ظاہر شد دغبار باطل را رفت
تاریخ جلوس شاہ حق آگہ را
''ظل الحق'' گفت الحق ایں را حق گفت

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ تخت نشینی کے موقعے پر ایک صاحب نے نو شعر کہے، ان کے ہر مصرعے سے ۱۰۶۸ھ کے عدد نکلتے تھے [1]۔

تخت نشینی میں علمائے کرام کا حصہ:

اورنگ زیب عالم گیر دین دار بادشاہ تھا۔ علما و مشائخ کا قدر دان تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھتا اور ان سے شرعی مسائل دریافت کرتا تھا۔ اس کے برعکس بڑے بھائی داراشکوہ کی دینی اور مذہبی حالت نہایت قابل اعتراض اور احکام اسلام کے منافی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علما و مشائخ نے اہم کردار ادا کیا اور پوری کوشش کی کہ یہی شخص آئندہ ہندوستان کی مسند حکومت پر متمکن ہو۔ چنانچہ نواب سعد اللہ خاں نے بھی جو شاہ جہان کے بہ درجہ غایت معتمد علیہ وزیر اعظم، انتہائی فہیم اور بہت بڑے عالم دین تھے، کئی دفعہ دربار میں شاہ جہان اور سب امرائے سلطنت کے سامنے اورنگ زیب کی حمایت کی، اس سلسلے میں داراشکوہ ان پر ناراض بھی ہوا، لیکن انھوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ جب نواب سعد اللہ خاں نے ۲۶ جمادی الاخری ۱۰۶۶ھ/ ۱۱راپریل ۱۶۵۶ء کو وفات پائی تو بعض لوگوں نے داراشکوہ پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس نے ان کو زہر دے دیا ہے۔

تخت نشینی کے بعد اورنگ زیب نے حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے دونوں صاحب زادوں خواجہ محمد معصوم اور شیخ محمد سعید کو دربار شاہی میں تشریف لانے کی دعوت دی تھی، جو انھوں نے قبول فرمائی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ کئی بار اس کے دربار میں گئے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے چھوٹے صاحب زادے شیخ محمد یحییٰ سے بھی عالم گیر نے ملاقات کی۔ شیخ محمد معصوم کے صاحب زادے شیخ سیف الدین سرہندی سے بھی اورنگ زیب عالم گیر عقیدت رکھتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ شاہ زادگی میں خواجہ محمد معصوم کے صاحب زادے خواجہ محمد اشرف اور بھتیجے شیخ سعد الدین اس کے پاس دکن میں مقیم تھے اور جب وہ داراشکوہ کے مقابلے کو نکلا تو خواجہ محمد اشرف اس کی فوج میں شریک تھے۔ خواجہ محمد معصوم حج کو گئے تو

[1] ماہ نامہ ''المعارف'' لاہور، مارچ ۱۹۶۸ء: ص ۷

Marfat.com

مدینہ منورہ میں اورنگ زیب کی کامیابی کی دعا کی۔ پھر انھوں نے ایک مکتوب میں اس کو جہاد کا مشورہ بھی دیا تھا اور لکھا تھا کہ اللہ کی راہ میں ایک گھڑی کا جہاد حرم مکہ میں حجر اسود کے پاس لیلۃ القدر کے قیام سے افضل ہے۔

بہر حال اس بات کے متعدد ثبوت ملتے ہیں کہ خواجہ محمد معصوم نے اورنگ زیب کو جہاد کی تلقین کی اور اس کی مجاہدانہ سرگرمیوں پر خوشی کا اظہار فرمایا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اورنگ زیب ان کا بے حد معتقد تھا اور اس خاندان کے تمام حضرات سے دلی عقیدت رکھتا تھا۔

دیار ہند کے مشہور محدث شیخ طاہر پٹنی کے پوتے شیخ عبدالوہاب نے فتویٰ جاری کیا تھا کہ شاہ جہان مرض اور ضعف کی وجہ سے امور سلطنت انجام دینے سے معذور ہو گیا ہے، لہٰذا دارالحکومت پر اورنگ زیب کی فوج کشی شرعاً جائز ہے۔

قصور کے افغانوں نے شیخ آدم کے خلیفہ عبدالخالق کی خدمت میں اورنگ زیب عالم گیر کی کامیابی کے لیے دعا کی درخواست کی۔ پھر یہ بھی منقول ہے کہ اس سے پہلے شیخ آدم بنوری نے اپنی وفات سے قبل اپنے مریدوں کو اورنگ زیب کی حمایت کرنے کی نصیحت فرمائی تھی۔ یہ بھی تذکروں میں مرقوم ہے کہ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے اخلاف میں سے شیخ الاسلام خواجہ عابد نے جن کا شمار ماوراء النہر کے جید علما میں ہوتا تھا، اورنگ زیب کی حمایت کی تھی اور وہ دارا کے خلاف لڑائی میں شریک تھے

گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اس زمانے کے علما و مشائخ داراشکوہ کے سخت مخالف تھے اور اس کے مذہبی رجحانات کی شدت سے نکیر کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں وہ اورنگ زیب عالم گیر کے پورے زور اور دلائل سے حامی تھے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر کو تاج شہنشاہی پہنانے میں ہندوستانی علما و مشائخ نے بھرپور حصہ لیا[1]۔

نظم و نسق اور اصلاحات کا نفاذ:

اورنگ زیب عالم گیر کا دور حکمرانی بڑا طویل ہے۔ اس نے قمری حساب سے ہندوستان پر پچاس سال دو ماہ اور ستائیس دن حکومت کی۔ مورخین ہند نے اس کے پچاس سالہ دور حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے پچیس سال ہندوستان کے مختلف علاقوں کی بغاوتیں فرو کرنے اور اصلاحات کے نفاذ میں گزرے۔ آخری پچیس سال دکن کے حالات کی اصلاح اور وہاں کے بگڑے ہوئے نظم و نسق کو بہتر بنانے میں صرف ہوئے[2]۔

عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس نے ہندوستان کے تمام صوبوں اور علاقوں کے ذمہ دارانہ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ماہ نامہ ''المعارف'' بابت ماہ اگست ۱۹۶۸ء: ص ۲۲ تا ۲۹۔ مضمون ''اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علما و مشائخ کا کردار'' از پروفیسر محمد اسلم۔

[2] مقالہ محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر: ص ۷۵۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، از شیر محمد گریوال۔

Marfat.com

مناصب پر بہترین صلاحیتوں کے حامل افراد مقرر کیے اور انھیں ہر لحاظ سے مستعد اور چوکس رہنے کی ہدایات جاری کیں۔ دکن کا عہدۂ نظامت شائستہ خاں کے سپرد کیا گیا اور بنگال کی صوبے داری میر جملہ کے حوالے کی گئی۔ ان دونوں کا شمار نہایت قابل اور منتظم امرائے مملکت میں ہوتا تھا اور جن علاقوں کے نظم و نسق پر انھیں مامور کیا گیا، وہ بھی بے حد اہمیت کے علاقے تھے۔

بنگال میں شجاع کا اثر و رسوخ کارفرما تھا، وہاں کا وہ والی رہ چکا تھا اور باپ کے ایام مرض میں اس نے وہاں اپنی بادشاہت کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ اسی لیے عالم گیر نے میر جملہ کو بنگال کا ناظم مقرر کر کے شجاع کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ وہ اتنا بہادر جرنیل ثابت ہوا کہ شجاع کو دھکیلتا کوچ بہار کی ریاست میں داخل ہو گیا۔ وہاں کے راجا نے مغل شہزادوں کی باہمی جنگ کے زمانے میں بغاوت کر کے ملک کے مشرقی علاقوں میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ میر جملہ نے اس فتنے کو پوری قوت سے دبایا اور کوچ بہار کا مضبوط قلعہ اس سے چھین لیا۔ اس موقعے پر میر جملہ کے نامور ساتھی قاضی سید صادق نے راجا کے محل کی چھت پر چڑھ کر بلند آواز سے اذان دی۔ راجا نے نہایت سراسیمگی کی حالت میں وہاں سے راہِ فرار اختیار کی اور بھوٹان میں جا کر پناہ لی۔ میر جملہ نے پیش قدمی جاری رکھی اور دریائے برہم پتر عبور کر کے آسام کا علاقہ فتح کیا اور اسے پہلی مرتبہ مغل حکومت کا باج گزار بنایا۔ وہ بے حد دلیر اور جفاکش جرنیل تھا اور ہندوستان کی منتہائے حد سے آگے نکل کر چین تک تگ و تاز کرنے کا خواہاں تھا، لیکن موسمی اور جغرافیائی حالات نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ کوچ بہار کے راجا سے وفاداری کا عہد و پیمان لے کر اور بہت سے علاقے فتح کر کے جہاں گیر نگر (ڈھاکہ) کی طرف واپس آ رہا تھا کہ ۳۱ مارچ ۱۶۶۳ء کو خضر پور کے مقام پر وفات پا گیا۔

اس کے بعد بنگال کا ناظم شائستہ خاں کو مقرر کیا گیا۔ یہ بھی بڑا لائق، منتظم اور مشہور جنگ جو تھا۔ اس نے بہت سے باغیوں اور سرکشوں کا مقابلہ کیا اور ان کی اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے زمانے میں مخالفین حکومت سے کئی دریائی معرکے بھی ہوئے اور یہ سب میں کامیاب رہا۔ چٹا گانگ کے مضبوط و مستحکم قلعوں پر بھی اس کے دور نظامت میں مغل شہنشاہیت کے جھنڈے لہرائے گئے۔ اس نے بنگال کی شورشوں کو ختم کرنے اور انتظامی امور کو درست کرنے کے علاوہ بہت بڑا کام یہ کیا کہ اس علاقے میں متعدد مسجدیں تعمیر کرائیں، دینی مدارس قائم کیے، پل بنوائے، آمد و رفت کے لیے شاہ راہوں کا انتظام کیا اور مختلف مقامات پر سرائیں تعمیر کرائیں۔ پھر اس زمانے میں عام استعمال کی چیزوں کے نرخ بڑھ رہے تھے، ان کی قیمتوں پر کنٹرول کیا۔ غرض شائستہ خاں کا دور نظامت اہل بنگال کے لیے خوش حالی، سکون اور ارزانی کا دور تھا۔

اسی زمانے میں ملک کے دوسرے سرے پر علاقہ کشمیر کے ناظم حکومت نے مشرق کی طرف فوج کشی کی اور لداخ، تبت اور بلتستان کے سرحدی علاقے زیر نگیں کیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وادیٔ کشمیر بیرونی حدیں پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو گئیں۔

Marfat.com

بعض قبائل کی شورشوں کا انسداد:

عالم گیر امن پسند بادشاہ تھا اور پورے ملک کو دارالامن بنا دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ دور دراز کے علاقوں پر بھی وہ پوری نظر رکھتا تھا۔ ملک کے کسی حصے میں کوئی شورش یا گڑ بڑ پیدا ہوتی تو فوراً اس کو دبا دیتا۔ پنجاب اور کابل کے درمیانی علاقوں میں کچھ ایسے قبائل آباد تھے، جو بعض اوقات بدنظمی پھیلانے کی سعی کرتے، لیکن عالم گیر اس کے انسداد کے لیے مؤثر قدم اٹھاتا۔ چنانچہ ۱۶۶۷ء میں یوسف زئی اور ۱۶۷۲ء میں آفریدی قبائل کے لوگوں نے انتظامی امور میں خلل انداز ہونے کی کوشش کی تو عالم گیر نے بلا تامل اس اہم مسئلے کو شائستہ التفات ٹھہرایا اور مقامی انتظامیہ کو حکم دیا کہ ہر ممکن طریقے سے اس شورش کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن جب فتنہ زیادہ پھیل گیا اور مقامی حکومت بے بس ہوگئی تو ایک نامور فوجی جرنیل امین خاں کی سرکردگی میں فوج کو حرکت میں لانے کے احکام نافذ کیے۔ معاملہ چوں کہ زیادہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ اس لیے خود عالم گیر نے بھی پنجاب کا عزم کیا اور حسن ابدال میں آ کر خیمہ زن ہوا۔ وہ ڈیڑھ سال وہاں مقیم رہا۔ اس اثنا میں مختلف مقامات پر فوجی چوکیاں قائم کیں اور فتنہ وفساد کے دروازے بند کر دیے۔

سکھ اور ان کے ہنگامے:

ابتدا میں سکھ ملکی سیاسیات سے بے تعلق رہے تھے اور اپنے خاص طریقے کے مطابق صرف مذہبی امور کی بجا آوری میں مشغول رہتے تھے، لیکن ان کے پانچویں گرو ارجن دیو نے جن کی مذہبی رہنمائی کا دور ۱۵۸۱ء سے ۱۶۰۶ء تک کے عرصے کو محیط ہے، سیاست میں دخل اندازی کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۶۰۶ء میں جہاں گیر کے مقابلے میں اس کے بیٹے شہزادہ خسرو نے علم بغاوت بلند کیا تو گرو ارجن دیو نے خسرو کی حمایت کی تھی جس کی وجہ سے ۱۶۰۶ء ہی میں جہاں گیر نے ان کو قتل کرا دیا تھا۔ اس کے بعد جب دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان تخت نشینی کے مسئلے پر لڑائی ہوئی تو وہ سکھوں کے ساتویں گرو ہر رائے کا زمانہ تھا۔ گرو ہر رائے اس لڑائی میں دارا شکوہ کے حامی تھے۔ لیکن اورنگ زیب چوں کہ وسیع القلب بادشاہ تھا، لہٰذا اس نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی اور درگزر سے کام لیا۔ پھر آٹھویں گرو ہرکشن کے انتخاب کے مسئلے پر جھگڑا ہوا تو اس میں بھی اورنگ زیب نے کسی قسم کا حصہ نہیں لیا۔

لیکن ۱۶۷۴ء میں جب سکھوں کا نواں گرو تیغ بہادر سکھوں کی مذہبی رہنمائی کی گدی پر بیٹھا تو اس نے سخت باغیانہ طرز عمل اختیار کیا اور پنجاب اور کشمیر کے علاقوں میں وسیع پیمانے پر لوٹ مار اور غارت گری شروع کر دی۔ چنانچہ ۱۶۷۵ء میں اسے بغاوت کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد دسویں گرو جنھیں آخری گرو بھی کہا جاتا ہے، گرو گوبند سنگھ کی رہنمائی کا زمانہ آیا۔ انھوں نے اپنے پیروانِ مذہب کو مغل حکومت کے

Marfat.com

خلاف خوب مشتعل کیا اور سکھ قوم کو خالصہ کے نام سے موسوم کر کے ایک باقاعدہ فوجی تنظیم کی شکل دے دی۔ مختلف مقامات پر کئی مضبوط قلعے تعمیر کرائے اور اسی (۸۰) ہزار افراد پر مشتمل ایک بہت بڑی فوجی جمعیت تیار کر لی۔ پھر ان کی اشتعال انگیز سرگرمیوں کا سلسلہ اس قدر وسعت اور خطرناک صورت اختیار کر گیا کہ حکومت کو امن قائم رکھنے کے لیے مجبوراً کوئی اہم قدم اٹھانے کے مسئلے پر غور کرنا پڑا۔ نتیجتاً فوج حرکت میں آئی اور میدان مقابلہ میں سکھوں کو شکست فاش ہوئی۔ گرو گوبند سنگھ کے دو بیٹے گرفتار ہو کر قتل ہوئے۔ خود گرو نے حکومت کی وفاداری کا عہد کیا اور بادشاہ نے احترام کے ساتھ انھیں دکن آنے کی دعوت دی۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ عالم گیر کا انتقال ہو گیا۔ عالم گیر کے جانشین بہادر شاہ نے بھی گرو صاحب کا احترام قائم رکھا اور فوج میں عہدے دار مقرر کیا۔ لیکن ۱۷۰۸ء میں کسی پٹھان نے ذاتی عداوت کی بنا پر انھیں قتل کر دیا۔

جسونت سنگھ کی بے وفائی اور عالم گیر کا عفو و کرم:

جودھ پور کے راجا جسونت سنگھ کا اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے۔ یہ اورنگ زیب عالم گیر کا شدید مخالف اور دارا شکوہ کا سخت حامی تھا۔ یہ وہی جسونت سنگھ ہے جو دھرمت کی سخت لڑائی میں اورنگ زیب سے شکست کھا کر بھاگ گیا تھا اور گھر گیا تو بیوی نے اپنے قریب آنے سے سختی سے روک دیا تھا۔ یہ واقعہ خافی خاں نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور راجپوت عورتوں کے مزاج کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ نہایت غیور اور باحمیت ہوتی ہیں۔ میدان جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگ جانے والے مرد کو وہ انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور اس کے ساتھ قربت اور صحبت سے انکار کر دیتی ہیں۔ چنانچہ جسونت سنگھ جب میدان جنگ سے فرار ہو کر گھر گیا تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ خافی خاں لکھتا ہے:

زنِ کلاں او کہ دختر راجا چتر سال بود شوہر را مطعون ساختہ، ترک ہم خوابی با او نمود و اکثر در وقت کلمہ و کلام زبان بر طعن و کنایہائے ملامت انجام آشنا می ساخت [1]۔

(یعنی اس کی بڑی بیوی نے جو راجا چتر سال کی بیٹی تھی، شوہر کو مطعون ٹھہرایا اور اس سے ہم بستری کا سلسلہ ختم کر دیا۔ وہ جب اس سے بات کرتی تو اشاروں کنایوں سے اسے ہدف ملامت ٹھہراتی۔)

ہندوستان کا بادشاہ بننے کے بعد اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کو نہ صرف کوئی سرزنش نہیں کی بلکہ ہمیشہ بہترین سلوک کا مستحق سمجھا اور ملک کے اہم مناصب پر مامور کیا۔ اس نے کئی دفعہ بے وفائی کی اور بادشاہ کو دھوکا دیا، لیکن بلند اخلاق بادشاہ نے ہر بار اس کی تقصیر معاف کی۔ آخر میں اس کو کابل کا والی مقرر کیا جو خالص مسلمان آبادی کا علاقہ تھا۔ وہ کئی سال کابل کے اس اہم عہدے پر فائز رہا اور ۲۲ شوال ۱۰۸۹ھ/ ۲۷ نومبر ۱۶۷۸ء) کو جمرود کے قریب فوت ہوا۔

---

[1] منتخب اللباب: حصہ دوم، ص ۴۳۔

Marfat.com

جسونت سنگھ سے اورنگ زیب نے جو حسن سلوک روا رکھا، وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس سے بادشاہ کے کردار کی بلندی اور اس کے حلم کی پوری تصویر واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس کا دل تعصب سے پاک اور بغض و عناد سے خالی تھا۔ رحم دلی، عفو و کرم اور مخالف سے درگزر کرنا اس کی فطرت میں داخل تھا۔

دکن کی فتح اور مرہٹوں کی سرکوبی:

اورنگ زیب عالم گیر کو دکن کے معاملات سے بے حد دلچسپی تھی۔ زمانہ شاہ زادگی میں بھی وہ کئی سال تک اس علاقے کا والی رہ چکا تھا اور معرکۂ تخت نشینی کے موقعے پر بھی دکن ہی سے روانہ ہوا تھا۔ زمام حکومت ہاتھ میں لی تو زندگی کے آخری پچیس سال بھی دکن کی فتح اور اس میں اصلاحات کے نفاذ میں گزارے۔

دکن کے حالات، وہاں مرہٹوں کی آمد، ان کی دست درازیاں، مغل حکومت سے تصادم، عہد شکنی، دربار مغلیہ میں معذرت خواہانہ انداز، پھر ان سے مغل حکمرانوں کا نرم رویہ وغیرہ۔ یہ واقعات تاریخ کے ایک طالب علم کے لیے نہایت دلچسپ ہیں اور منتخب اللباب، مآثر عالم گیری، مآثر الامرا، خزانۂ عامرہ اور سیر المتاخرین وغیرہ کتب تاریخ میں تفصیل سے مرقوم ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ اس موقعے پر ہم ان تمام امور سے صرف نظر کر کے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مرہٹوں نے دکن کی مسلمان ریاستوں میں توسل پیدا کر کے اور ملازمتیں اختیار کر کے ایک مؤثر اور مضبوط طاقت فراہم کر لی تھی، اور باقاعدہ ایک فوجی تنظیم قائم کر لی تھی۔ مختلف مقامات پر فوجی اور عسکری نوعیت کے متعدد قلعے بھی تعمیر کر لیے تھے جن میں وسیع پیمانے پر جنگی اسلحہ جمع تھا۔ وہ مغل حکومت کے لیے مستقل خطرہ بن گئے تھے۔ ان کی دست درازیاں یہاں تک پہنچ گئی تھیں کہ مغلوں کے علاقوں کو بھی تاراج کرنے لگے تھے۔ لوٹ مار، قتل و غارت اور رہزنی ان کا پیشہ بن گیا تھا اور دکن کی کمزور ریاستیں ان کے سامنے بے بس و مجبور ہو گئی تھیں، بلکہ مغل حکومت کے خلاف ان کی امداد کرتی تھیں۔ یہ صورت حال امن عامہ کے لیے انتہائی تباہ کن ثابت ہو رہی تھی۔ بلا امتیاز مذہب و ملت ملک کے ہندو اور مسلمان سب ان سے پریشان تھے اور وہ سب کو اپنا نشانۂ ستم بناتے تھے۔

ظاہر ہے اورنگ زیب عالم گیر جیسا عادل و منصف اور رحم دل و منتظم بادشاہ اس تکلیف دہ صورت حال کو ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اسے مجبوراً فوجی کارروائی کرنا پڑی اور مرہٹوں کے استیصال کے ساتھ ساتھ دکن کی ریاستوں کا بھی خاتمہ کرنا پڑا، کیوں کہ ایک کا سلسلہ دوسرے سے وابستہ تھا اور دونوں کی طاقت کو ختم کرنا عین مصلحتِ ملکی تھا۔

مرہٹوں کی تاریخ کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کا ابتدائی تعلق راجپوتانے سے تھا۔ بعد میں ان کے آبا و اجداد میں سے بعض لوگ دکن کی ریاست میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اس خاندان کا ایک شخص

Marfat.com

مالوجی تھا۔ یہ شخص مسلمان اصحاب رشد وہدایت سے بہت عقیدت رکھتا تھا اور شاہ شریف کا مرید تھا جو احمد نگر میں مدفون ہیں۔ مالوجی کے دو بیٹے تھے۔اس نے شاہ شریف سے تعلق ارادت کی بنا پر ان کے نام شاہ جی اور شریف جی رکھے جو درحقیقت مسلمانوں کے نام ہیں۔ یہی شاہ جی آگے چل کر ساہوجی کے لقب سے مشہور ہوا اور یہی وہ ساہوجی ہے جو سیواجی مرہٹہ کا باپ تھا۔مغل حکمرانوں کی تاریخ حرب وضرب کے ضمن میں ساہوجی مرہٹہ اور سیواجی مرہٹہ کے نام بار بار آتے ہیں۔

سیواجی مرہٹہ کے بارے میں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی حیثیت ایک ڈاکو اور لٹیرے کی تھی۔ کمزور علاقوں میں چھاپے مارنا اور وہاں کے باشندوں کو ہراساں کر کے زیر کرنا اس کا پیشہ تھا۔ ریاست بیجاپور کے حکمران عادل شاہ کے زمانے میں اس کی تخریبی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں تھیں۔ کیوں کہ عادل شاہ کی بیماری کی وجہ سے پوری ریاست میں ابتری اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی اور رشوت خور اہل کاروں نے سیواجی کو بہت سی جاگیروں کی جعلی سندیں لکھ کر دے دی تھیں۔اس نے دکن کے اس علاقے پر تصرف حاصل کر لیا تھا جو بیجاپور کی حکومت میں داخل تھا۔

عالم گیر اپنے دور شاہ زادگی میں بھی جب وہ دکن کا والی تھا، اس افراتفری کو ختم اور اس علاقے کو فتح کرنا چاہتا تھا تاکہ ابتری اور لوٹ مار کا قطعی طور سے سد باب ہو جائے لیکن دارالحکومت آگرہ میں حالات نے کچھ ایسی انگڑائی لی کہ اسے مجبوراً اپنے دکن کے مرکزی مقام اورنگ آباد میں واپس آنا پڑا۔

اس کے بعد ملک کے سیاسی معاملات میں حیرت ناک تغیر کی لہر اٹھی۔شاہ جہان کو شدتِ مرض نے گھیر لیا اور وہ مسلوب الاختیار ہو گیا۔داراشکوہ نے بھائیوں کے استیصال اور سلطنت پر متصرف ہونے کا فیصلہ کر لیا۔مراد نے صوبہ گجرات میں اپنے نام کا خطبہ وسکہ جاری کر لیا۔شجاع نے جو بنگال کے منصب ولایت پر متعین تھا، وہیں اپنی بادشاہت کا اعلان جاری کر دیا اور پھر حکومت پر قبضہ کرنے کی غرض سے دارالسلطنت آگرہ کی طرف بڑھنے لگا۔سیواجی کے لیے اب میدان صاف تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کو کھل کھیلنے کے لیے اس سے زیادہ کوئی موقع نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔وہ ہر طرف ہاتھ بڑھانے اور نظر دوڑانے لگا۔ بہت سے قلعے تعمیر کرائے اور جزیروں میں رسائی حاصل کر کے بحری قوت کے سامان فراہم کیے۔اس نے مغل شاہ زادوں کی باہمی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر مرہٹوں کی ایک زبردست فوج تیار کر لی اور رفتہ رفتہ ریاست بیجاپور کے متعدد اضلاع پر قابض ہو گیا۔اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، مغلیہ حدودِ حکومت میں بھی دست تصرف دراز کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ستم رانیاں یہاں تک بڑھیں کہ سورت اور اس کے نواح کی بندرگاہوں پر قبضہ کر کے حجاج کے قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا [1]۔ یہ جرات نسل تیموری کے شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے لیے قطعاً ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ عالم گیر نے مملکت ہند پر قبضہ کرنے کے بعد سیواجی کے ساتھ وہی سلوک کیا جس کا وہ مستحق تھا۔

[1] منتخب اللباب: ج ۲،ص ۱۱۵۔

Marfat.com

سیواجی کے بارے میں تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ جس طرح وہ غارت گری اور قتل وخوں ریزی میں بہت بے باک تھا، اسی طرح پرلے درجے کا مکار، فریبی، عہد شکن اور دغا باز بھی تھا۔ پھر انتہائی چاپلوس اور بزدل بھی تھا۔ اس کی بزدلی اور مکاری کی مثالیں دیتے ہوئے منتخب اللباب اور مآثر عالم گیری کے مصنفوں نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جب اس نے بیجاپور کے اکثر اضلاع پر قبضہ کرلیا تو اس کے حکمران علی عادل شاہ نے افضل خاں سپہ سالار کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ افضل خاں نے سیواجی کا محاصرہ کرلیا۔ سیوا نے عاجز آ کر مکر و فریب سے کام لیا۔ اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور عفو تقصیر کی درخواست کی۔ ساتھ ہی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں افضل خاں سے ملاقات کے بعد اس کے ہم رکاب ہو کر علی عادل شاہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں تاکہ براہ راست اپنی معروضات پیش کرسکوں اور معافی مانگ سکوں۔ شرط یہ قرار پائی کہ ملاقات کے وقت کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہوگا اور دونوں خالی ہاتھ ہوں گے۔ چنانچہ افضل خاں عہد کے مطابق خالی دست گیا، لیکن سیوا آستین میں چھرا چھپائے ہوئے تھا۔ بغل گیر ہوتے ہی اس نے افضل خاں کا کام تمام کردیا[1]۔

فریب دہی اور عہد شکنی سیواجی کے کردار کا لازمی جز بن گئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ مغلیہ سلطنت کا کوئی جرنیل اور ذمہ دار رکن اس کو لائق اعتماد نہیں گردانتا تھا۔ جب تیموری حدود مملکت میں سیواجی کی دست درازیاں حد سے متجاوز ہوگئیں تو عالم گیر نے اس کی روک تھام کے لیے مہاراجا جے سنگھ کو جو ریاست جے پور کا راجا اور مغل حکومت میں سپہ سالاری کے منصب پر فائز تھا، فوج دے کر بھیجا۔ فوج کا ہراول دلیر خاں کو مقرر کیا۔ جے سنگھ بڑا زیرک جرنیل تھا۔ وہ سیوا کی سرکوبی کے لیے پونہ میں داخل ہوا اور ہر جانب فوجیں پھیلا دیں۔ دلیر خاں نے صرف سات ہزار فوج کے ساتھ پانچ مہینے کی مدت میں سیوا کے تمام مقبوضہ علاقے پامال کر ڈالے۔ سیوا کا دارالسلطنت راج گڑھ تھا۔ اس کے ننھیال بھی اسی نواح میں رہتے تھے۔ دلیر خاں کی فوج نے جب ادھر کا رخ کیا اور آگے بڑھنے لگی تو سیوا اس تصور سے گھبرا اٹھا کہ یہ مقامات بھی فتح ہوگئے تو تمام اہل وعیال یا تو قتل ہو جائیں گے یا قیدی بنا لیے جائیں گے، چنانچہ اس نے صلح واطاعت کے لیے سلسلۂ جنبانی شروع کیا۔

اسی اثنا میں جب سیواجی کے ایک قلعے کا محاصرہ کر کے اس کا ایک برج توپوں سے اڑا دیا گیا تو دلیر خاں نے فوج کو قلعے کے دوسرے برج پر چڑھا دیا اور حکم دیا کہ اسے مسمار کردیا جائے۔ اس قلعے میں دوسرے لوگوں کے علاوہ سیوا کے متعدد اہل خانہ اور رشتے دار بھی محصور تھے۔ اس نے جب دیکھا کہ تھوڑی دیر میں قلعہ فتح ہونے اور حریف کے قبضے میں آنے کو ہے تو مجبور ہو کر صلح کی التجا کی۔ لیکن راجا جے سنگھ کو سیوا کی مکاریوں کا علم تھا اور اس کی باتوں پر اعتماد نہ تھا، اس نے حکم دیا کہ حملہ تیز کردیا جائے اور یورش کے سامان مزید بڑھا دیے جائیں۔ اتنے میں خبر پہنچی کہ سیوا خالی ہاتھ قلعے سے نکل کر آرہا ہے۔ اس کے قابل اعتماد چند برہمن بھی ساتھ ہیں۔ راجا جے سنگھ کو جب یقین ہوگیا کہ سیوا عجز وزاری کی حالت میں آرہا ہے تو اجازت دے دی، اور جن

[1] منتخب اللباب: ج ۲، ص ۱۸۲۔

Marfat.com

لوگوں کو اس کے استقبال کے لیے بھیجا، ان کے ساتھ چند مسلح راجپوت بھیجے اور سیوا سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ یہ بھی کہلا بھیجا کہ اگر خلوص دل کے ساتھ آتا ہے تو بے ہتھیار آئے ورنہ واپس چلا جائے۔ سیوا خالی ہاتھ اور بے ہتھیار آیا۔ راجا جے سنگھ کے پاس گیا اور نہایت سماجت کی اور عجز وانکسار کے ساتھ وفاداری اور عہد پر قائم رہنے کی قسمیں کھائیں۔ یہاں تک کہ سیوا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

بہ طریق بند ہائے ذلیل مجرم رو بدیں درگاہ آوردہ ام، خواہی بہ بخش وخواہی بہ کش [1]۔

(یعنی نہایت ذلت کے ساتھ ادنیٰ گناہ گار غلاموں کی طرح حاضر ہوں۔ اب آپ کو اختیار ہے ماریے، یا چھوڑ دیجیے۔)

جے سنگھ نے اٹھ کر گلے لگایا اور وفاداری کا اطمینان ہو جانے کے بعد دلیر خاں کو قلعے کا محاصرہ اٹھانے کا حکم دیا۔ قلعے کا پھاٹک کھلا تو سات ہزار مرد اور عورتیں باہر آئے جنھیں امان دی گئی۔ دلیر خاں کی طرف سے تلوار، کچھ اسلحہ اور دو عربی گھوڑے مع ساز طلائی کے سیوا کو عنایت کیے گئے۔ پھر جب دلیر خاں نے سیوا کا ہاتھ جے سنگھ کے ہاتھ میں دیا تو جے سنگھ نے خلعت، گھوڑا اور ہاتھی عطا کیا۔ دلیر خاں نے اپنے ہاتھ سے سیوا کی کمر میں تلوار باندھی، لیکن اس نے تھوڑی دیر کے بعد تلوار کھول کر رکھ دی اور کہا کہ میں بغیر ہتھیار کے خدمت کروں گا۔ بڑے بڑے قلعے بھی مغل حکومت کو پیش کیے۔

شاہی دربار کو جے سنگھ نے سیوا کی اطاعت گزاری کی اطلاع دی تو وہاں سے فرمان اور خلعت بھیجا گیا۔ سیوا کو خلعت اور فرمان قبول کرنے کے آداب سکھائے گئے۔ چنانچہ وہ فرمان کے استقبال کے لیے تین میل تک پا پیادہ گیا اور خلعت کے سامنے آداب بجالایا۔ سیوا جی کے لڑکے اور دیگر رشتے داروں کو بھی عالم گیر نے مختلف مواقع پر بہت سے اونچے خطابات واعزازات سے نوازا اور حکومت کے بلند منصب عطا کیے مگر یہ سب لوگ مسلسل بے وفائی کرتے رہے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر نے جب جے سنگھ کو سیوا جی کے استیصال کے لیے بھیجا تو بیجا پور کے حکمران کو بھی سیوا کے مقابلے کے لیے فوجیں بھیجنے کی درخواست کی تھی لیکن حاکم بیجاپور اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اور مغلوں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے خفیہ طور پر سیوا جی کی حمایت کرتا رہا۔ اسی طرح حیدر آباد کے حکمران نے بھی یہی وتیرہ اختیار کیا۔ گولکنڈہ کے حکمرانوں نے بھی شاہی علاقوں پر غارت گری کرنے کے لیے مرہٹوں کی پوری اعانت کی۔

بہرحال نہ تو مرہٹے بار بار وفاداری کی یقین دہانی کے باوجود دغابازی اور باغیانہ سرگرمیوں سے باز آئے اور نہ دکن کی ریاستوں کے حکمرانوں نے مخالفانہ رویہ ترک کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ عالم گیر کو مجبوراً دونوں پر یلغار کرنا پڑی۔

---

[1] منتخب اللباب: ج ۲، ص ۱۸۲۔

Marfat.com

مرہٹوں کے بارے میں یہ بات ذہن میں رہے کہ شاہ جہان کے زمانے میں انھوں نے پوری قوت حاصل کر لی تھی، دکن سے مدراس تک وسیع علاقے ان کے تسلط میں چلے گئے تھے۔ سیکڑوں مضبوط اور سر بفلک قلعوں پر ان کا قبضہ تھا۔ یہ ایک جدید قوم کی شکل میں ابھر رہے تھے اور ان کا یہ عین عروج و شباب کا زمانہ تھا۔ اسی حالت میں عالم گیر نے ان سے مقابلہ کیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ یہ کہ عالم گیر کی زندگی ہی میں سیوا مر گیا۔ پھر اس کا ایک بیٹا سنبھا مارا گیا۔ دوسرا بیٹا رام راج آوارگی اور صحرا نوردی کی نذر رہا۔ مرہٹوں کے مشہور سپہ سالار سنتا کا سر کٹ کر دربار میں پہنچا۔ غرض سب علم برداران بغاوت ایک ایک کر کے مٹا دیے گئے۔ تمام قلعوں پر عالم گیر نے قبضہ کر لیا اور علامہ شبلی نعمانی کے الفاظ میں دکن سے لے کر مدراس تک سناٹا چھا گیا۔ جس زمانے میں مرہٹوں کا استیصال ہو رہا تھا اور دکن کی ریاستوں کو مغل حکومت کے زیر تسلط لانے کی مہم زوروں پر تھی، عالم گیر خود اس زمانے میں دکن میں بیٹھا تمام معرکوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس کی عمر بیاسی برس کی ہو چکی تھی تاہم اس بوڑھے مگر جوان ہمت بادشاہ نے بعض نہایت مشکل معرکوں کی خود کمان کی اور تمام قلعے ایک ایک کر کے فتح کر لیے۔ ہندوستان کے وسیع ملک میں کوئی اس کا حریف نہ تھا اور کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔

سرمد کا قتل:

اورنگ زیب کے ابتدائے عہد سلطنت کا ایک اہم واقعہ سرمد کے قتل کا ہے۔ سرمد اصلاً یہودی تھا اور یہودیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو ربیین کہلاتے ہیں، بعد میں مسلمان ہو گیا تھا اور ایران کے جلیل القدر فضلا سے علم حاصل کیا تھا۔ وہ تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا اور سندھ کے راستے ٹھٹھے سے ہوتا ہوا دہلی پہنچا۔ سرمد اچھا شاعر بھی تھا۔ اصحاب تصوف سے وہ بالخصوص تعلق رکھتا تھا۔ دہلی میں داراشکوہ سے اس کے مراسم پیدا ہوئے اور ایک صوفی اور ولی کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس زمانے میں شاہ جہان تخت حکومت پر جلوہ افروز تھا۔ سرمد کا شہرۂ ولایت بادشاہ تک پہنچا تو اس نے عنایت خاں آشنا کو سرمد سے ملنے اور اس کے کشف و کرامات کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ عنایت خاں آشنا نے وہاں بجز برہنگی کے کچھ نہ پایا اور واپس آ کر سرمد کے کشف پر طنز کرتے ہوئے بادشاہ کے حضور یہ شعر پڑھا۔

برسرمد برہنہ کرامات تہمت است
کشفے کہ ظاہر است از و کشف عورت است

۱۶۵۸ء میں عالم گیر، اورنگ ہند پر متمکن ہوا اور ملک میں شرعی قوانین و احکام کی تنفیذ کا سلسلہ شروع کیا تو اس کے نزدیک سرمد کا حالت عریانی میں رہنا خلاف شرع فعل اور قابل سزا جرم تھا۔ شہنشاہ نے ملا عبدالقوی کو سرمد کے پاس بھیجا کہ اسے کپڑے پہننے کی تاکید کی جائے۔ ملا ممدوح نے سرمد سے پوچھا کہ ''عریاں کیوں رہتے ہو؟'' سرمد نے بے ساختہ جواب دیا ''شیطان قوی است'' اور ساتھ ہی ایک رباعی پڑھی۔

Marfat.com

ہوسکتا ہے ملا عبدالقوی کو اپنے نام کی مناسبت سے ''شیطان قوی است'' کے الفاظ ناگوار گزرے ہوں۔

عریانی و برہنگی کے علاوہ سرمد نے ایک رباعی میں معراج سے بھی انکار کیا ہے۔ وہ اور بھی بہت سے خلاف شرع امور کا مرتکب تھا اور اس کا برملا اعلان و اعتراف کرتا تھا۔ لیکن اورنگ زیب نے جو کہ طبع محتاط رکھتا تھا، شاید ان باتوں کو سزا کے لیے کافی نہ سمجھا۔ اس نے علما کو سرمد کے پاس بھیجا کہ وہ کلمہ طیبہ پڑھے۔ علما کے سامنے سرمد نے فقط لا الہ پڑھا، اس سے آگے کچھ نہ کہا۔ علما نے اعتراض کیا اور کلمہ کے اس جزوِ اول کو اللہ کے وجود کی نفی کا اعلان قرار دیا۔ سرمد نے کہا ابھی تو میں حالت نفی میں مستغرق ہوں، مرتبہ اثبات تک نہیں پہنچا۔ وہاں پہنچوں گا تو الا اللہ بھی کہوں گا۔

اس پر علما نے فتویٰ دیا کہ فقط لا الہ کہنا کفر ہے۔ اگر سرمد توبہ کرے تو بہتر ورنہ واجب القتل ہے۔ سرمد اپنی بات پر قائم رہا اور توبہ نہ کی۔ چنانچہ دوسرے دن قتل کرنے کے لیے اسے دہلی کی جامع مسجد کے سامنے لایا گیا۔ کہتے ہیں اس وقت وہ نہایت خوش و خرم تھا۔ جلاد آیا تو سرمد اسے دیکھ کر مسکرایا اور کہا۔

فدائے تو شوم بیا بیا کہ بہر صورتے کہ می آئی، من ترا خوب می شناسم۔

(میں تم پر قربان۔ آؤ آؤ۔ تم جس شکل میں بھی آؤ گے، میں تمھیں خوب پہچانتا ہوں۔)

یہ کہہ کر مندرجہ ذیل شعر پڑھا اور تلوار کے نیچے گردن رکھ دی۔

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم
دیدم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

شیخ محمد اکرام سرخوش کے تذکرے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سرخوش بیان کرتا ہے کہ ایک دن میں اور ناصر علی سرہندی اور مرزا عبدالقادر بیدل دہلی کی جامع مسجد میں حوض کے کنارے بیٹھے شعر خوانی کر رہے تھے کہ ادھر سے سرمد کا گزر ہوا۔ ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور یہ شعر پڑھا۔

عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوۂ دہم دار و رسن را

اس کے جلد ہی بعد وہ قتل ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ اس کے قتل کے اصل اسباب کیا تھے؟ صرف مذہبی تھے یا اس کی تہہ میں سیاست بھی کار فرما تھی؟ بلاشبہ عالم گیر خلاف مذہب باتوں کو پسند نہ کرتا تھا اور ملک کو منافی اسلام امور سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن ہر دور میں سرمد جیسے بے شمار مجذوب اور کتنے ہی فاتر العقل لوگ گلی کوچوں میں ننگ دھڑنگ گھومتے نظر آتے ہیں اور کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں۔ اسلام کا انکار کرنے والوں اور خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والوں کا بھی کوئی شمار نہیں۔ یقیناً اورنگ زیب کے زمانے میں بھی ایسے لوگ ہوں گے۔ اتنے بڑے ملک میں ایک سرمد ہی تو نہیں ہوگا، جس کی خلاف اسلام باتوں سے بادشاہ کو اتنا غصہ آیا کہ اسے قتل کر ڈالا۔

Marfat.com

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ داراشکوہ کی اس سے مصاحبت تھی اور اس کی مجلس میں کئی اور ملنگ اور مجذوب بھی آتے جاتے ہوں گے، جو عالم گیر کے خلاف باتیں کرتے ہوں گے۔

مآثرالامرا کے مصنف کا کہنا ہے کہ اگر سچ پوچھا جائے تو قتل کا اصل سبب داراشکوہ کی مصاحبت تھی۔

شیخ محمد اکرام مرحوم ایک اور تذکرہ نگار کے حوالے سے لکھتے ہیں

گویند کہ او بہ داراشکوہ نیز بسرّ ے داشت و اکثر اوقات نیز بہ ماتم عالم گیر مشغوف بود، لہٰذا بہ قتل رسید۔ واللہ اعلم بحقیقۃ حال ❶۔

(یعنی کہا جاتا ہے کہ سرمد سے داراشکوہ کے بھی تعلقات تھے۔ دونوں راز کی باتیں کرتے اور عالم گیر کے ماتم میں مشغول رہتے تھے، اس لیے وہ قتل ہوا۔ اصل حقیقت کا علم اللہ ہی کو ہے۔)

مولانا ابوالکلام آزاد نے سرمد کے حالات میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، ان کا خیال بھی یہی ہے کہ سرمد کے قتل کے اصل اسباب سیاسی تھے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

''ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خون ریزیاں جو پولیٹکل اسباب سے ہوئی ہیں، انھیں مذہب کی چادر اڑھا کر چھپایا گیا ہے۔''

بہر حال اصل حقیقت تو اللہ کو معلوم ہے، ہمارے سامنے دونوں باتیں ہیں یہ بھی کہ عالم گیر کی غیرت دینی اور حمیت مذہبی سرمد کی خلاف شریعت باتوں کو برداشت نہ کر سکی اور اسے قتل کرا دیا۔ یہ بھی کہ سرمد اور دارا شکوہ کے باہمی تعلقات بہت گہرے تھے، جس سے فتنہ و فساد کے پھیلنے اور عالم گیر کے خلاف ایک محاذ قائم ہونے کا خطرہ تھا۔ اتفاق سے اس کی مذہبی حالت بھی قابل اعتراض اور لائق عقوبت تھی، لہٰذا اسے قتل کر دیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اوصاف و کمالات کی ایک جھلک:

تیمور کے جانشینوں میں اورنگ زیب عالم گیر وہ حکمران ہے جس کے گونا گوں کمالات کی فہرست بڑی دراز ہے، اس کی زندگی کے شب و روز بے شمار خصوصیات سے مملو ہیں اور کتنے ہی حیرت انگیز واقعات ہیں جو قطار باندھے سامنے کھڑے ہیں اور ہر واقعہ زیب قرطاس بننے کے لیے بے قرار ہے۔ قلم حیران ہے کہ کس کا انتخاب کرے اور کس کو چھوڑے۔ عالم گیر کی طویل حیات مستعار کے تمام لیل و نہار کو شدید آزمائشوں اور بوقلموں امتحانوں کی آماج گاہ سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس مرد آہن کی بے پناہ ہمت کی داد دیجیے کہ ہر امتحان میں پورا اترتا اور ہر آزمائش میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس نے مرہٹوں کو زیر کیا۔ دکن کی تسخیر کی، آسام پر علم اقتدار لہرایا۔ تبت کی انتہائی سرحدوں پر تسلط جمایا اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام باغی طاقتوں کو

❶ رود کوثر: ص ۴۳۷۔

Marfat.com

بیخ و بن سے ہلا ڈالا۔ اس کے عہد اقتدار میں ہندوستان کی سلطنت مغلیہ جن فتوحاتِ ملکی اور وسعت حدود سے آشنا ہوئی، اس کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں ناپید ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر کے اوصاف و کمالات اور شجاعت و بہادری کے متعدد واقعات گزشتہ صفحات میں درج ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور بہت سی باتیں ابھرا ابھر کر سامنے آ رہی ہیں جو معرض تحریر میں آنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ہر چند کہ اختصار سے کام لیا جا رہا ہے اور ہر مقام پر عنان قلم کھینچ کھینچ کر چلنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم بعض واقعات بیان کرنا ضروری ہیں۔ ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

۱۔ اورنگ زیب کی بہادری اور قابلیت کی ایک بہت بڑی امتحان گاہ جنگ تخت نشینی کے موقع پر ساموگڑھ کا میدان تھا۔ داراشکوہ اور عالم گیر کی فوجیں نہایت شدت سے لڑ رہی تھیں اور گھمسان کا رن پڑا تھا۔ دارا کے ہاتھی پر حملہ ہوا تو وہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ فوج نے سمجھا کہ شہزادہ مارا گیا اور وہ تتر بتر ہو گئی۔ بعض مورخین کا فیصلہ ہے کہ دارا کی یہی غلطی اس کی ہزیمت کا باعث بنی۔ عالم گیر کو بھی جب وہ کھجوہ کے مقام پر شجاع سے نبرد آزما تھا، یہی صورت حال پیش آئی۔ عالم گیر ہاتھی پر بیٹھا شجاع کے مقابلے میں دادِ شجاعت دے رہا تھا کہ ناگہاں اس کے ہاتھی پر ایک مست اور طاقت ور جنگی ہاتھی نے حملہ کر دیا۔ یہ نہایت نازک موقع تھا۔ اس وقت اگر بادشاہ کا ہاتھی بھاگ اٹھتا تو اس کی ساری فوج منتشر ہو جاتی، لیکن عالم گیر کی جرأت مردانہ اور قوت فیصلہ دیکھیے کہ ہاتھی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوا دیں تاکہ وہ گھبرا کر بھاگ نہ سکے۔

۲۔ جب اورنگ زیب اور داراشکوہ کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر اتریں تو اورنگ زیب کے ہم رکاب صرف پچیس تیس ہزار کی نفری تھی، ادھر داراشکوہ ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار کی جرار پیدل فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا۔ جب جنگ میں تیزی آئی اور کشتوں کے پشتے لگنے لگے تو تاریخ گواہ ہے کہ عالم گیر کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی رہ گئے تھے۔ اس انتہائی نازک وقت میں عالم گیر نے جس شجاعت اور دلیری کا مظاہرہ کیا، اس کو لین پول کا قلم ان الفاظ میں رقم کرتا ہے۔

جنگ کی حالت انتہائی نازک شکل اختیار کر گئی تھی اور قریب تھا ... ب ہزیمت سے دوچار ہو جائے کیوں کہ اس کے چیدہ چیدہ رسالے بھی پسپا ہو چکے تھے اور وہ میدان میں تنہا کھڑا تھا۔ مشکل سے ایک ہزار آدمی اس کے گرد ہوں گے اور ان کو بھی دارا کے حملوں کا انتظار تھا۔ اس سے زیادہ استقلال اور رستمانہ شجاعت کے امتحان کا چشم فلک نے کبھی موقع نہ دیکھا ہو گا۔ لیکن اورنگ زیب کے بدن میں بجائے پٹھوں کے فولاد کے تار تھے۔ صرف اس کی شجاعت تھی، جس نے ایک ہزار افراد کو ایک لاکھ سے زائد فوج پر فتح دی۔

۳۔ بڑھاپا اور کمزوری بھی اس کے عزم و ہمت میں ضعف کے آثار پیدا نہ کر سکے۔ ستارا کے مقام پر مرہٹوں نے جب ایک سرنگ کو اڑا دیا اور بڑی تعداد میں مغل فوج تباہ ہوئی تو عالم گیر کی عمر اس وقت بیاسی برس کی ہو چکی تھی۔ پتا چلا تو جھٹ گھوڑے پر سوار ہوا اور مقام حادثہ پر پہنچا۔ فوجیوں کی لاشیں اپنی نگرانی میں

Marfat.com

نکلوائیں۔اس حادثہ جانکاہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ مرہٹوں پر حملے کی تیاری شروع کر دی اور خود فوج کی کمان کرنے کا فیصلہ کیا۔امرائے فوج بڑی مشکل سے شہنشاہ کو فیصلہ واپس لینے پر آمادہ کر سکے۔

۴۔ سیواجی مرہٹہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سنبھاجی باپ کا جانشین ہوا تو اس نے برہان پور پر اچانک حملہ کر کے وہاں کی آبادی کو ہدف ظلم بنایا، نہایت سفاکی اور بے دردی سے شہر کو لوٹا اور پھر اس میں آگ لگا دی۔برہان پور کے علما و مشائخ اس سے انتہائی پریشان ہوئے اور ایک محضر تیار کر کے عالم گیر کی خدمت میں بھیجا۔اس محضر میں انھوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ یہ ملک دارالحرب ہو گیا ہے۔عالم گیر نے علما کا یہ محضر پڑھا تو بے حد افسوس اور تاسف کا اظہار کیا اور جواب میں انھیں لکھا کہ مرہٹوں کی بیخ کنی کے لیے میں خود فوج لے کر آ رہا ہوں۔

۵۔ رام راج مرہٹہ کی موت کے بعد اس گروہ کے لوگ شاہی علاقوں سے نکل گئے تھے لیکن ان میں سے کچھ کوکن وغیرہ کی خطرناک اور تنگ و تاریک وادیوں میں جا چھپے تھے۔ان کے کلی استیصال کے لیے ان پر فوج کشی ضروری تھی۔شہنشاہ اورنگ زیب نے باوجودیکہ اسی سال سے متجاوز ہو چکا تھا، اس مہم کی قیادت خود اپنے ہاتھ میں لی اور نہایت ہمت و استقلال سے مرہٹوں کو تاراج اور ان کے مشہور قلعوں کو مسخر کرنے کے لیے نکلا۔یہ قلعے چاروں طرف سے خطرناک اور مہیب غاروں اور خندقوں سے گھرے ہوئے تھے۔بعض دو دو میل کی بلندی پر واقع تھے۔ان میں ایک نہایت مضبوط قلعہ راج گڑھ کا تھا جسے سیواجی کا پایۂ تخت کہنا چاہیے۔اس قلعے کا پھیلاؤ بارہ میل کا تھا۔راستے انتہائی دشوار گزار اور پُر پیچ تھے۔کئی کئی دن کے مسلسل سفر سے بہ مشکل ایک ایک کوس کا فاصلہ طے ہو پاتا تھا۔بسنت گڑھ، ستارا، تورنا، کھیسنا، پرنالہ اور بھوسان گڑھ وغیرہ کے تمام قلعے اسی قسم کے تھے۔انھیں مرہٹوں کے مرکز کہا جاتا تھا۔اورنگ زیب نے یہ قلعے ایک ایک کر کے فتح کیے۔اس کے بعد یا تو مسمار کر دیے گئے یا ان میں شاہی فوج بٹھا دی گئی۔

۶۔ یہ اورنگ زیب کا عالم پیری کا واقعہ تھا۔دور شہزادگی کا یہ واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب وہ بلخ کی مہم پر عبدالعزیز خاں کے خلاف محاذ آرا تھا، تو عین حالت جنگ میں نماز ظہر کا وقت آ گیا۔دشمن کی فوجیں ہر طرف سے تیر برسا رہی تھیں، لیکن یہ استقلال کا پیکر اور بہادری کا پتلا کمال اطمینان سے گھوڑے سے اترا، وضو کیا، نماز کی صف آراستہ کی، باجماعت فرض ادا کیے اور حضور قلب کے ساتھ سنت اور نفل پڑھے۔عبدالعزیز والی بلخ نے یہ منظر دیکھا تو یہ کہہ کر لڑائی سے دست بردار ہو گیا کہ ایسے شخص سے لڑنا ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔

۷۔ عالم گیری فوج کے سب سے دلیر اور بہادر سپاہی بارہ کے سادات مانے جاتے تھے۔اسی وجہ سے یہ لوگ بہت خود سر اور مغرور ہو گئے تھے۔انھوں نے اہل دربار اور معززین کو زدو کوب کیا۔عالم گیر نے یہ مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا، لیکن سادات بپھر گئے اور کہا کہ ہم اپنا فیصلہ خود کریں گے۔عالم گیر سادات بارہ کی یہ گستاخانہ حرکت اور محکمہ قضا کی توہین برداشت نہ کر سکا۔غصے سے آستینیں چڑھا لیں اور کہا جو

Marfat.com

لوگ میری تلوار کی دھار دیکھ چکے ہیں، وہ شریعت کے مقابلے میں ایسے الفاظ منہ سے نکالتے ہیں، ان سے کہہ دو سب مل کر آئیں۔ اس کے بعد انھیں انتظامی اور فوجی ذمے داریوں سے برطرف کر دیا۔ سادات کا سب غرور خاک میں مل گیا۔

۸۔ شہزادہ اکبر کو جو اورنگ زیب کا چوتھا بیٹا تھا، راجپوتوں نے اسے بادشاہ بننے کا چکمہ دیا اور اس سلسلے میں اس کی حمایت کی قسمیں کھائیں۔ نادان شہزادہ باپ کی مخالفت اور بغاوت پر اتر آیا۔ ستر ہزار کے لگ بھگ لشکر جرار اس کی کمان میں تھا۔ عالم گیر کو پتا چلا تو بیٹے کی بغاوت فرو کرنے کو نکلا۔ صرف ایک ہزار افراد اس کے ساتھ تھے، جنھیں ستر ہزار کے مقابلے میں فوج کہنا لفظ فوج کا مذاق اڑانا ہے۔ شہنشاہ کی فوجیں اس وقت دور دراز مقامات پر فرائض خدمت انجام دے رہی تھیں۔ حالات ایسے تھے کہ انھیں بلانا مناسب نہ تھا۔ عالم گیر کی جبین استقلال پر ذرا شکن نہیں پڑی اور وہ بالکل نہیں گھبرایا۔ کامل اطمینان سے میدان میں نکلا اور شہزادے کی ستر ہزار فوج کو ایک ہزار افراد سے پسپا کر دیا۔ بعد ازاں شہزادہ اکبر ادھر ادھر کے چکر کاٹنے کے بعد سمندر کے راستے سے ایران چلا گیا تھا اور وہیں ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) میں فوت ہوا۔

۹۔ عالم گیر کو تلوار اور قلم دونوں سے برابر کا تعلق تھا اور دونوں کو اس کی اطاعت گزاری پر فخر تھا۔ اگرچہ محمد حسین آزاد کو عالم گیر کی تعریف کرنے سے تکلیف ہوتی ہے تاہم بقول شبلی ”آزاد کو بھی بادل ناخواستہ“ یہ لکھنا پڑا کہ ”اس کی تحریریں دیکھ کر اسے تعجب آتا ہے کہ جس طرح اورنگ سلطنت زیر قدم رکھتا تھا اسی طرح کشور سخن بھی زیر قلم ہے۔“

۱۰۔ اورنگ زیب عالم گیر کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ روزانہ دو تین مرتبہ دربار عام منعقد کرتا تھا جس میں ہر چھوٹا بڑا آدمی بغیر کسی جھجک اور روک ٹوک کے آسکتا اور اپنی حاجت بیان کر سکتا تھا۔ وہ ہر شخص کی بات توجہ سے سنتا، ان کی عرضیاں خود وصول کرتا اور اپنے ہاتھ سے ان پر حکم لکھتا تھا۔ عام طور پر وہ کھڑے ہو کر رعایا کی باتیں سنتا تھا۔ علامہ شبلی نے اس ضمن میں الفنسٹن کے حوالے سے ڈاکٹر جیلی کریری کا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا ہے، جس میں وہ کہتا ہے کہ میں نے عالم گیر کو دیکھا کہ وہ اٹھتر (۷۸) برس کی عمر کو پہنچ گیا تھا، صاف و سفید ململ کی پوشاک پہنے ہوئے عصائے پیری کے سہارے امیروں کے جھرمٹ میں کھڑا تھا۔ اس کی پگڑی میں زمرد کا بڑا ٹکڑا اٹکا ہوا تھا۔ وہ دادخواہوں کی عرضیاں لیتا جاتا اور بلا عینک پڑھ کر اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا جاتا تھا۔ اس کے ہشاش بشاش چہرے سے صاف مترشح ہوتا تھا کہ وہ اپنی مصروفیت سے نہایت شاداں و فرحاں ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر نے بادشاہ ہونے کے بعد جب دکن کی باغی ریاستوں اور سفاک مرہٹوں کے استیصال کا منصوبہ بنایا اور وہاں رہ کر معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو اس کی عمر پینسٹھ سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ جوانی نے رخت سفر باندھ لیا تھا اور بڑھاپا تیزی سے قبضہ جما رہا تھا۔ لیکن اس نے بے حد جرات سے کام لیا اور عمر کے آخری حصے میں تمام سنگین حالات پر انتہائی عقل مندی اور دلیری سے قابو پایا۔

Marfat.com

سخاوت اور غریب پروری:

اورنگ زیب عالم گیر بلاشبہ ہندوستان کا عظیم بادشاہ تھا۔ کشور کشا اور جنگ جو۔۔۔ اس کے رعب و دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ دور دراز علاقوں میں بیٹھے ہوئے سرکش لوگ بھی اس سے لرزتے تھے۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ اس کے اندر انسان کا دل تھا اور دل میں خدا ترسی اور رحم کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ رعایا کے لیے انتہائی مشفق اور سخی تھا۔ اس سلسلے کے بہت سے واقعات مآثر عالم گیری، عالم گیر نامہ اور اس زمانے کی دیگر کتابوں میں مرقوم ہیں۔

مآثر عالم گیری کے مصنف محمد ساقی مستعد خاں نے جلوس عالم گیری کے سترھویں سال ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۴ء) کے واقعات میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ جب اورنگ زیب حسن ابدال گیا تو وہاں کے باغ میں قیام پذیر ہوا۔ باغ کی دیوار کے ساتھ ایک ضعیف بڑھیا کا مکان تھا، جس میں اس نے ایک پن چکی لگا رکھی تھی اور پن چکی کو پانی باغ سے آتا تھا۔ ملازمین شاہی نے پانی روک لیا اور پن چکی بند ہوگئی۔ بادشاہ کو پتا چلا تو فوراً پانی کھلوا دیا۔ رات کو جب کھانے پر بیٹھا تو اپنے خادم ابوالخیر کے ہاتھ بڑھیا کے لیے کھانا اور پانچ اشرفیاں بھیجیں اور کہا کہ میری طرف سے بڑھیا کو سلام کہو اور اس سے معذرت کرو کہ ہماری وجہ سے تم کو جو تکلیف ہوئی ہے اس کی معافی چاہتا ہوں۔ نیک خصال شہنشاہ نے اس پیغام پر ہی اکتفا نہیں کیا، صبح ہوئی تو پالکی بھیج کر بڑھیا کو بلایا اور حرم سرا میں بھیجا۔ بیگمات شاہی کے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ بڑھیا غریب اور تنگ دست ہے۔ اس کی دو غیر شادی شدہ لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔ بادشاہ نے دو سو روپے عنایت کیے اور مستورات نے زر و جواہر دیے۔ دو تین دن کے بعد بڑھیا کو پھر بلایا اور لڑکی کی شادی کے لیے دو ہزار روپے عطا کیے۔ محل کی عورتوں اور شاہزادوں نے روپے اور اشرفیاں دیں۔ چند روز کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ غریب بڑھیا امیر ہو چکی تھی۔

اورنگ زیب عالم گیر کی غریب پروری اور مستحقین کے لیے اس کی عطا و اعانت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ علامہ شبلی کے زمانے میں ندوۃ العلما لکھنؤ کے ارباب حل وعقد نے ایک مرتبہ بنارس میں ندوہ کی علمی نمائش گاہ قائم کرنے کا اہتمام کیا۔ اس نمائش گاہ میں کثرت سے سلاطین تیموریہ کے عہد کے فرامین بہم پہنچائے گئے تھے۔ ان میں دو ثلث سے زیادہ عالم گیر کے فرامین تھے اور یہ تمام فرامین کسی عالم یا درویش کی جاگیر یا مدد معاش کے متعلق تھے۔ اہل علم کے وظائف کے سلسلے کے اکثر فرامین وہ تھے جو عالم گیر کے دربار سے جاری ہوئے تھے ❶۔

عالم گیر نے ملک کے ہر حصے میں راہ گیروں کے لیے مسافر خانے اور سرائیں تعمیر کرائیں اور اس

---

❶ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر: ص ۱۱۷۔

Marfat.com

طرح کا اہتمام کیا کہ حالت سفر میں راستوں میں لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ نیز کنوئیں کھدوائے کہ پانی کی قلت باقی نہ رہے۔ بہت سے مرکزی مقامات پر غلہ خانے قائم کیے کہ قحط کے زمانے میں غربا و مستحقین کو مفت غلہ تقسیم کیا جائے۔

بردباری اور متحمل مزاجی:

مآثر عالم گیری میں ایک واقعہ مندرج ہے، جس سے بادشاہ کی بردباری اور حلم ولینت کا ثبوت ملتا ہے۔ سولھویں سال جلوس ۱۰۸۳ھ/ مارچ ۱۶۷۳ء میں اورنگ زیب نماز عید الاضحیٰ سے فارغ ہو کر واپس آرہا تھا کہ ایک شخص نے لکڑی پھینک کر ماری جو بادشاہ کے زانوں پر لگی۔ بادشاہ کے گرز بردار اس شخص کو پکڑ کر حضور میں لائے، لیکن حلیم الطبع شہنشاہ نے اس کو چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ غور کیجیے یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، ہمارے اس دور جمہوریت میں بھی اس قسم کے واقعات کو بہت اہم سمجھا جاتا ہے اور ایسی حرکت کرنے والے کے پورے کردار اور ماضی کے واقعات کی تفتیش کے لیے ایک خاص عملہ مامور کر دیا جاتا ہے۔ تین چار سو سال پیشتر کے دور مطلق العنانی میں تو یہ انتہائی عظیم حادثہ تھا، لیکن اورنگ زیب نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اورنگ زیب کے حالات میں مرقوم ہے کہ بادشاہ جامع مسجد سے واپس آرہا تھا کہ ایک شخص تلوار لہراتے ہوئے اس کی طرف دوڑا۔ لوگوں نے اسے فوراً گرفتار کر لیا اور قتل کر دینا چاہا۔ لیکن رحم دل بادشاہ نے ایسا کرنے سے منع کیا اور اس کے لیے آٹھ آنے یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

قیاس کہتا ہے کہ حملہ آور کا بیان لیا ہوگا اور وہ بے کار اور نادار ہوگا اسی لیے بادشاہ نے اس کا یومیہ وظیفہ مقرر کیا۔ لیکن یہ قیاس اگر صحیح بھی ہو تو حکمران کے قتل سے اقتصادی مسئلہ حل تو نہیں ہو جاتا۔ اس بحث سے قطع نظر بتانا صرف یہ ہے کہ یہ واقعہ نہایت سنگین نوعیت کا تھا مگر عالی ظرف بادشاہ نے نہ صرف کسی قسم کی باز پرس اور تحقیق و تفتیش کی ضرورت محسوس نہیں کی، الٹا حملہ آور کو معاف کر کے باقاعدہ اس کا روزینہ لگا دیا۔

اصلاحی اقدامات:

اورنگ زیب عالم گیر نے تخت ہند پر متمکن ہوتے ہی بہت سے اصلاحی اقدامات کیے اور ان متعدد رسوم کو ختم کیا جو اسلام کے منافی تھیں اور پہلے سے جاری تھیں۔ ان کی جگہ ایسی چیزیں نافذ کیں جو شریعت اسلامی سے ہم آہنگ تھیں۔ مثلاً مغلیہ عہد میں سکوں پر کلمہ طیبہ کندہ کیا جاتا تھا اور یہ سکہ ہر قسم کے پاک اور ناپاک ہاتھوں میں گردش کرتا تھا۔ اس سے کلمہ طیبہ کی حرمت مجروح ہوتی تھی، لہٰذا عالم گیر نے ملکی سکے پر کلمہ طیبہ لکھنا ممنوع قرار دے دیا۔ اس نے شمسی تقویم کے بجائے قمری اور ہجری تقویم کو مروج کیا۔ جشن نوروز جو عالم گیر سے پہلے شان و شوکت سے منایا جاتا تھا اور اس میں امرا و وزرا بادشاہ کو مختلف قسم کے نذرانے پیش کرتے تھے،

Marfat.com

دور عالم گیری میں یہ بھی بند ہوا۔ بھنگ اور چرس کی کاشت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی اصلاح اور عادات واطوار کی تطہیر کے لیے محکمہ احتساب قائم کیا گیا اور قصبات و بلاد میں محتسب مقرر کیے گئے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے، معاشرتی برائیوں کے ارتکاب سے روکتے، مے نوشی، قمار بازی اور دیگر منہیات سے سختی کے ساتھ منع کرتے اور امور خیر کی تلقین و تبلیغ کرتے تھے۔ پھر غلاموں کی خرید و فروخت کا بھی سد باب کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ درباری سلام کے تمام غیر شرعی طریقے ختم کر کے صرف مسنون طریق سلام یعنی السلام علیکم کہنے کا حکم جاری کیا گیا۔ یہ حکم بھی جاری ہوا کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو السلام علیکم کہا کریں۔ اس نے مدارس جاری کیے اور ان میں قابل مدرس مقرر کیے۔

علاوہ ازیں اورنگ زیب نے ایک اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ دربار میں رقص و سرود کی محفلوں کے انعقاد کا سلسلہ سرے سے ختم کر دیا اور رقاصوں اور مغنیوں کو مناسب وظیفے دے کر دربار کی اس خدمت سے سبک دوش کر دیا۔ شعرا کی سرکاری سرپرستی بھی ختم کر دی اور دربار میں طویل عرصے سے ملک الشعرا کا جو منصب چلا آ رہا تھا، وہ بھی باقی نہ رہنے دیا۔ سرکاری اہتمام میں تاریخ نویسی بھی بند کر دی اور سرکاری مورخین کو سرکاری سرپرستی سے آزاد کر دیا گیا۔ بادشاہ کے ماتھے پر تلک لگانے، اس کے لیے زمین بوس ہونے اور جھروکے کے درشن وغیرہ سے بھی ممانعت کے احکام جاری کر دیے گئے۔

ولادت اور تخت نشینی کے مواقع کی تقریبات سادہ طریقے سے منانے کا حکم دیا گیا۔ بادشاہ کو سونے چاندی میں تولنے کی رسم بھی موقوف کر دی گئی۔ امرائے دربار کے لیے زیورات اور ریشمی لباس ممنوع قرار دیا گیا۔ شوہر کی وفات کے موقعے پر ہندو عورتوں میں ستی کی رسم جو عرصہ دراز سے چلی آ رہی تھی، سختی کے ساتھ بند کر دی گئی۔ اورنگ زیب کے تخت نشین ہونے کے وقت ملک میں تقریباً اسی (۸۰) ٹیکس وصول کیے جاتے تھے جو راہ داری، پنڈاری اور دریائے گنگا اور جمنا میں نہانے وغیرہ کے بالکل ناروا قسم کے ٹیکس تھے، وہ یک قلم منسوخ کر دیے گئے۔ یہ ٹیکس حکومت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھے۔ صرف راہ داری ٹیکس سے حکومت کو پچیس لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی تھی۔

اورنگ زیب نے ایک اہم اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ مسلمانوں سے زکوۃ کی وصولی لازمی قرار دی اور ہندوؤں پر جزیہ عائد کیا۔

نیکی اور تدین:

ہندوستان کے اس شہنشاہ کو علمی لحاظ سے عالم دین کہنا چاہیے۔ یہ متعدد مروجہ علوم و فنون میں مہارت رکھتا تھا۔ فقہ حنفی میں بالخصوص درک حاصل تھا۔ اس کا قول ہم دوشِ عمل اور کردار ہم سرِ شریعت محمدی تھا۔ ورع و تقویٰ میں ممتاز، نماز باجماعت کا پابند، تہجد گزار اور قائم اللیل تھا۔ اگر دہلی میں مقیم ہوتا نماز جمعہ بالالتزام وہاں

Marfat.com

کی جامع مسجد میں پڑھتا۔ تراویح کا التزام کرتا اور رمضان کے عشرۂ آخر میں اعتکاف کرتا، ہر سوموار، جمعرات اور جمعہ کو روزے رکھتا۔ اس کے علاوہ جن ایام میں رسول اللہ ﷺ سے روزے رکھنا ثابت ہے، ان میں باقاعدہ روزے رکھتا۔ رمضان کے روزوں کا تو اس درجہ اہتمام کرتا کہ شدید گرمیوں میں بھی اس ماہ مبارک کے روزے اس سے قضا نہ ہوتے۔ زکوٰۃ ادا کرتا اور غربا و مساکین کی کھل کر امداد کرتا۔ اپنی ملکی اور انتظامی مجبوریوں کی بنا پر خود تو حج بیت اللہ کی سعادت حاصل نہ کر سکا البتہ بہت سے لوگوں کو ہر سال اپنے خرچ سے حرمین شریفین بھیجتا۔ قرآن مجید کی کثرت سے تلاوت کرنا اس کا معمول تھا۔ بیواؤں، یتیموں اور بے سہارا مردوں اور عورتوں کو معقول رقمیں عطا کرتا۔ وظائف بہ کثرت پڑھتا اور ادعیہ ماثورہ یعنی جو دعائیں کتب حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی و منقول ہیں، ورد زبان رکھتا۔ سنن ونوافل کی پابندی کرتا اور ہمیشہ باوضو رہتا۔ غیر شرعی لباس سے خود بھی اجتناب کرتا اور امرائے مملکت اور وزرائے سلطنت کو بھی اس سے سختی کے ساتھ روکتا، منہیات سے دامن کشاں رہتا۔ مساجد میں جاتا اور ملک میں مسجدوں کی آبادی و تعمیر کا اہتمام کرتا۔ مساجد میں امام مقرر کیے جاتے اور انتظام کے لیے انھیں خرچ دیا جاتا۔ علما و مشائخ کی صحبت میں بیٹھتا اور ان سے مستفید و مستفیض ہوتا۔ اس کھانے پینے کے شاہانہ تکلفات سے مجتنب رہتا۔ خوراک بہت سادہ اور کم کھاتا۔ الغرض اس کی زندگی اسلام کے قالب میں ڈھلی ہوئی تھی اور ہندوستان کا یہ عظیم بادشاہ دین محمدی کا مطیع و فرماں بردار تھا۔

قرآن مجید سے شغف ومحبت:

قرآن مجید سے بہ درجہ غایت شغف و تعلق خاطر رکھتا تھا۔ بعض سورتیں تو ابتدا ہی سے حفظ تھیں، سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد پورا قرآن مجید حفظ کیا۔ کسی نے ابتدائے حفظ کی تاریخ سورۂ اعلیٰ کی اس آیت سے نکالی۔ سنقرئك فلا تنسى (۱۰۷۱ھ)❶۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی تاریخ نہیں ہوسکتی تھی۔ قرآن پورا حفظ کر لیا تو لوح محفوظ (۱۰۷۲ھ) تاریخ ہوئی۔

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ حفظ قرآن کی نہایت دلچسپ تاریخ مرزا روشن ضمیر نے کہی جو شاہ جہان کے عہد میں بخشی اور عالم گیر کے زمانے میں بندرگاہ سورت کے امین تھے۔

محی الدین و مصطفیٰ حافظ تو صاحب سیفی ومرتضیٰ حافظ تو
تو حافظ شرع و حافظ تو شارع تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو

غالباً سات ہزار روپے انھیں بطور انعام ملے ❷۔

---

❶ یہ سورہ الاعلیٰ کی آیت نمبر ۶ ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں: ''اے پیغمبر ﷺ ہم آپ کو قرآن مجید اچھی طرح پڑھا دیں گے۔ پھر آپ اسے بھولیں گے نہیں۔''

❷ المعارف لاہور، بابت ماہ مارچ ۱۹۶۸ء۔

Marfat.com

حدیث رسول سے محبت:

حدیث رسول ﷺ سے بھی اس شہنشاہ ہند کو نہایت شغف و محبت تھی۔ اگرچہ اس زمانے کے ہندوستان میں کتب حدیث کی زیادہ نشر و اشاعت نہیں ہوئی تھی، لیکن جو کتابیں میسر آتیں، اورنگ زیب ان سے پورا استفادہ کرتا اور حدیث کی معرفت اور آگاہی کے لیے کوشاں ہوتا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ تخت نشین سلطنت ہونے سے پہلے کتاب الاربعین مرتب کی، جس میں رسول اللہ ﷺ کی چالیس حدیثیں جمع کیں۔ پھر مسند نشین مملکت ہونے کے بعد بھی چالیس احادیث پر مشتمل ایک اربعین مرتب کی۔ بعد ازاں دونوں اربعین کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور ان پر تعلیقات و فوائد تحریر کیے۔

علم فقہ میں درک اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین:

اورنگ زیب عالم گیر مسائل فقہیہ میں عبور رکھتا اور اس کی جزئیات کا ماہر تھا۔ فقہ کے متعلق اس کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ دیار ہند کے علمائے کرام کی ایک عظیم جماعت سے ''فتاویٰ ہندیہ'' مرتب کرایا جو فتاویٰ عالم گیری کے نام سے مشہور ہے۔ یہ فتاویٰ عربی زبان میں ہے اور چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ ترتیب و تالیف کے بعد یہ فتاویٰ بہت سے لوگوں نے نقل کیا اور اس کے متعدد نسخے مختلف اسلامی ممالک حجاز، مصر، شام اور روم وغیرہ میں پہنچے اور شائع و ذائع ہوئے اور وہاں کے علمائے دین واصحاب افتا نے اس سے استفادہ کیا۔

فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین کے بعد عالم گیر نے اپنے تمام ممالک محروسہ میں حکم جاری کر دیا تھا کہ عدالتی فیصلوں میں اسی کو سامنے رکھا جائے اور اسی کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ اس کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں میں اہل علم قاضی مقرر کیے تاکہ وہ شریعت کی روشنی میں فیصلے صادر کریں اور اس ضمن میں کسی نوع کی مداہنت کا ثبوت نہ دیں۔ ہر معاملے میں دیانت دارانہ تحقیق و تفتیش کے بعد صحیح نقطہ نظر تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

مضامین و مندرجات کے اعتبار سے فتاویٰ عالم گیری فقہ کی نہایت مفصل کتاب ہے جو مختلف اوقات میں ہندوستان کے مختلف مقامات لکھنؤ اور کلکتہ وغیرہ کے مطابع میں زیور طبع سے آراستہ ہوتی رہی۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اس کے ایک حصے کا قلمی نسخہ بھی موجود ہے، جس کا نمبر ۸۹۵۲ ہے۔ یہ نسخہ ۱۴۱۱ اوراق پر محیط ہے اور بہترین خط نسخ میں ہے۔ یہ نسخہ مندرجہ ذیل مضامین کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

کتاب الدعویٰ، کتاب الاقرار، کتاب العلم، کتاب المضاربۃ، کتاب الودیعہ، کتاب العاریہ، کتاب الھبۃ، کتاب الاجارہ، کتاب المکاتب، کتاب الولاء، کتاب الاکرا، کتاب الحجر، کتاب الماذون، کتاب الغصب۔

اسلامی ہند میں فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین بہت بڑی علمی اور فقہی خدمت تھی جو ایک نیک

Marfat.com

دل اور صاحب علم حکمران کی سعی سے برصغیر کے نامور فقہا کی ایک منظم جماعت کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس اہم کام کا جس انداز سے آغاز ہوا، جس نہج سے یہ مختلف مراحل سے گزرا اور پھر جس اسلوب سے یہ تکمیل پذیر ہوا، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ کہنا چاہیے کہ اس کے مرتبین نے مسائل فقہ کا ایک دل آویز گلستاں سطح کاغذ پر سجا دیا ہے اور صفحات قرطاس پر مباحث بوقلموں کی ایک فکر انگیز جنت بسا دی ہے۔ اس میں عبادات اور معاملات کے ہر پہلو کو پوری وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور ہر مسئلے کے ہر گوشے کو کتب فقہ کے حوالوں سے منقح کیا گیا ہے۔ کسی حصے میں بھی حتی الامکان تشنگی باقی نہیں رہنے دی گئی۔

فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب وہی ہے جو دیگر کتب حدیث وفقہ کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ بہت مفصل اور مبسوط ہے۔ نئے مضامین باقی کتابوں کی طرح ''کتاب'' کا عنوان قائم کر کے شروع کیے گئے ہیں۔ پھر سوائے کتاب اللقیط، کتاب اللقطہ، کتاب الاباق اور کتاب المفقود کے باقی تمام عنوانات میں الگ الگ باب مقرر کیے گئے ہیں اور ہر باب میں ''فصل'' کے تحت کچھ ذیلی عنوانات قائم کر کے مسئلہ زیر بحث سے متعلق بہت سے ضمنی مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔ مثلاً کتاب الطہارت سات ابواب پر مشتمل ہے، جنھیں باب اول، باب ثانی، باب ثالث، باب رابع، باب خامس، باب سادس، باب سابع کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پھر ہر باب کے تحت کچھ فصول ہیں جنھیں فصل اول، فصل ثانی، فصل ثالث کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔

فتاویٰ عالم گیری میں جو مسائل معرض بیان میں آئے ہیں، دو وجہ سے بالخصوص انھیں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ایک وجہ یہ کہ یا تو وہ راجح اور مفتیٰ بہ ہیں یا ظاہر الروایت کے ہیں۔ یعنی فقہ حنفی کی ان چھ معروف کتابوں سے ماخوذ ہیں، جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہیں، اور جنھیں ظاہر الروایت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور وہ ہیں، جامع الکبیر، جامع الصغیر، المبسوط، الزیادات، السیر الکبیر اور السیر الصغیر۔ یہ کتابیں علمائے فقہ حنفیہ میں بہت بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور فقہ حنفی کی عمارت ان ہی کتابوں کی بنیاد پر استوار ہے۔

اس کی فقہی اہمیت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ فقہ کی تمام اہم اور قابل ذکر کتابوں کا نچوڑ ہے اور اس کے مآخذ ومراجع فروع فقہ میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

فتاویٰ عالم گیری اپنے اندر جو خصوصیات رکھتا ہے اور جن اوصاف کا حامل ہے، ان کی وجہ سے وہ فقہ حنفیہ کی دوسری تمام کتابوں سے ممتاز ہے، اور وہ خصوصیات واوصاف مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس کی ترتیب وتدوین صرف ایک شخص یا دو چار علما کی علمی کوششوں کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ علمائے دین اور فقہائے کرام کی ایک بڑی اور ممتاز جماعت کی مساعی جمیلہ سے معرض تصنیف میں آیا۔ عالم گیر نے جن علمائے کرام کو اس کی ترتیب وتدوین کے لیے منتخب کیا، وہ اس دور کے علمی میدان میں اپنا کوئی حریف نہ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں زہد وتقویٰ اور تدین وورع میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ انھوں

Marfat.com

نے بہ درجہ غایت عرق ریزی سے یہ فریضہ انجام دیا۔ پھر چوں کہ یہ علمائے فقہ کی ایک پوری جماعت کی تگ و تازِ علمی کا نتیجہ ہے، اس لیے اس میں فقہ احناف کے لحاظ سے غلطی کا امکان کم ہے اور ہر مسئلہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

۲۔ اسلامی ہندوستان میں علم فقہ کی یہ پہلی مفصل و مبسوط کتاب ہے، جو ایک دین دار بادشاہ کی ذاتی سعی و محنت سے لکھی گئی اور اس پر عمل کی دیواریں تعمیر کی گئیں۔ پھر یہ کتاب کئی دفعہ کتابت و طباعت کی منزلوں سے گزری۔ فارسی اور اردو زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے تاکہ اس کے مشمولات و مندرجات سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں۔ اس کتاب کے علاوہ بھی مختلف حکمرانوں کے دور میں فقہا نے فتاوے ترتیب دیے جو اس دور کے حکمرانوں کے نام منسوب ہوئے۔ لیکن یا تو وہ ایک ''قلمی کتاب'' سے آگے کی منزل کو نہ پہنچ سکے یا پھر ان میں سے کوئی فتاویٰ ایک قدم آگے بڑھ کر طباعت کے مرحلے سے گزرا بھی تو کما حقہ، شہرت نہ پا سکا۔ لیکن فتاویٰ عالم گیری اس باب میں سب سے فوقیت لے گیا اور علمی دنیا میں ایک اونچے مقام پر پہنچا۔

۳۔ اس میں فقط حصۂ عبادات ہی کو اہمیت نہیں دی گئی، اس کا حصۂ معاملات بھی متعدد ضروری تفصیلات و جزئیات پر محیط اور اہم مسائل کو محتوی ہے۔ مثلاً قضا، تجارت، بیوع، شفعہ، قصاص اور حدود وغیرہ کے احکام تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

۴۔ اس میں ہر مسئلے کے اصل ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہے اور اگر اصل کتاب (جس کا حوالہ دیا گیا ہے) سامنے نہیں ہے اور مسئلہ دوسری کتاب سے نقل ہوا ہے تو ناقلا عن فلان کا لفظ لکھ کر اصل ماخذ کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

بہر حال اپنے مآخذ فقہی، مصادر علمی اور خصوصیات گوناگوں کے اعتبار سے یہ فتاویٰ خاص اہمیت کا حامل ہے۔

فتاویٰ عالم گیری کی تصنیف و ترتیب کا آغاز کب ہوا اور کتنی مدت میں یہ اہم کام پایۂ تکمیل کو پہنچا؟ اس ضمن میں قطعیت اور یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ منشی محمد کاظم نے اپنی کتاب ''عالم گیر نامہ'' میں جو اورنگ زیب کے پہلے دس سالہ دورِ حکومت کے واقعات پر مشتمل ہے، فتاویٰ عالم گیری کی جمع و تالیف کا تذکرہ کتاب کے آخری یعنی دسویں سن جلوس میں کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس فتاویٰ کی تدوین اس وقت شروع ہوئی جب اورنگ زیب کو تخت ہند پر متمکن ہوئے دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور شہنشاہ کی عمر پچاس سال کو پہنچ گئی تھی اور سن ہجری ۱۰۷۷ھ یا ۱۰۷۸ھ/ ۱۶۶۷ء تھا۔ لیکن اس کی ترتیب کا سلسلہ کتنے سال چلا اور یہ اہم کام کب اختتام کو پہنچا، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔

عام طور پر مشہور ہے (جس کا صحیح ثبوت ہمیں نہیں ملا) کہ فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین پر دو

Marfat.com

سال کی مدت صرف ہوئی۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اس کی تالیف کا آغاز ۱۰۷۷ھ یا ۱۰۷۸ھ میں ہوا اور تکمیل ۱۰۸۰ھ یا ۱۰۸۱ھ میں ہوئی۔ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین میں بہت سے فقہائے ہند شامل تھے اور نیک اطوار بادشاہ نے اس کے لیے متعدد حضرات کی خدمات حاصل کی تھیں۔ لیکن ہمیں اٹھائیس فقہا کے اسمائے گرامی کا علم ہو سکا ہے۔ اس کی ترتیب کا اہتمام شیخ نظام برہان پوری کے سپرد تھا جو منقولات و معقولات کے ماہر تھے اور فقہ کے مختلف گوشوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ بادشاہ ان کی بے حد قدر کرتا تھا۔ جن علماء و فقہا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کے لیے مامور و منتخب کیا گیا تھا، اس میں بھی ان کا مشورہ شامل تھا اور یہی اس گروہِ فقہا کے سربراہ اور مہتمم تھے۔ بادشاہ اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود فتاویٰ کی ترتیب میں پوری دلچسپی لیتا تھا۔ شیخ نظام برہان پوری جو فقہ میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے، روزانہ ایک صفحہ یا دو صفحے بادشاہ کے سامنے پڑھتے اور بادشاہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک مسئلے کو کامل توجہ سے سنتا۔ الفاظ دیکھتا۔ عربی عبارات پر غور کرتا۔ استنباط مسائل کو سمجھتا اور کاتبوں کی غلطیاں خود درست کرتا۔ اس سے اس کی فقہ میں مہارت کا پتا چل سکتا ہے۔

فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین نہایت محنت اور جاں فشانی سے یہ خدمت انجام دیتے تھے اور انھیں شاہی خزانے سے اس کا معاوضہ دیا جاتا تھا اور کتابیں بھی مہیا کی جاتی تھیں۔

اورنگ زیب اس فتاویٰ کی اشاعت کے لیے بہت کوشاں رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ ذخیرۂ فقہ صرف عربی زبان تک محدود نہ رہے بلکہ اس عہد کے ہندوستان کی اصل علمی زبان (فارسی) میں بھی اسے منتقل کیا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے اس کی نگاہِ انتخاب مشہور ترکی عالم عبداللہ چلپی پر پڑی۔ سرزمین ترکستان کا یہ عالم دین اورنگ زیب کے باپ شاہ جہان کے عہد حکومت میں فقیروں کے لباس میں ہندوستان آیا اور دہلی میں اقامت گزیں ہوا۔ اس کا رابطہ شاہ جہان کے وزیر اعظم سعد اللہ خاں سے پیدا ہوا تو وہ اس کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا اور اس کا باقاعدہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر شاہ جہان سے ملاقات ہوئی تو اس نے اس پیکر علم کو یومیہ وظیفے کا مستحق گردانا۔ شاہ جہان کے بعد اورنگ زیب عالم گیر وارث تخت ہند ہوا تو اس نے ان کو اپنی نوازشہائے شاہانہ اور عنایاتِ خسروانہ کے لیے مختص کر لیا اور فتاویٰ عالم گیری کے فارسی ترجمے پر مامور کیا۔

فتاویٰ عالم گیری کے دوسرے فارسی مترجم قاضی القضاۃ نجم الدین کاکوروی ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۵ ربیع الاول ۱۱۵۷ھ/ ۱۷ اپریل ۱۷۴۴ء اور تاریخ وفات ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۲۹ھ/ ۴ اپریل ۱۸۱۴ء ہے۔ یہ بھی ارض ہند کے بہت بڑے عالم اور عظیم فقیہ تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور شارح تھے۔ انھوں نے فتاویٰ عالم گیری کی کتاب الجنایات تک کا مع فارسی شرح کے ترجمہ کیا۔ موصوف نے یہ خدمت لارڈ سر جان شور (۱۷۹۳ء-۱۷۹۸ء) کے مشورے سے سرانجام دی تھی۔

افسوس ہے فتاویٰ عالم گیری کے پہلے فارسی ترجمے کا، جس کا خود اورنگ زیب عالم گیر نے حکم دیا تھا، کوئی پتا نہیں چلتا۔ البتہ اس کا دوسرا ترجمہ جو مع شرح کے قاضی نجم الدین نے کتاب الجنایات تک کیا تھا، موجو

Marfat.com

ہے۔ یہ ترجمہ کلکتہ اور لکھنؤ کے مطبعوں میں کئی بار چھپ بھی چکا ہے لیکن ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد دکن) میں ''ترجمہ فتاوئ عالم گیری'' کے نام سے اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ''کتاب الحدود والسرقۃ'' کے نام سے موجود ہیں۔ پٹنہ لائبریری کے نسخے پر کتاب اور مصنف کا نام درج نہیں۔ البتہ اس کی پشت پر ''کتاب الحدود'' مرقوم ہے۔ لیکن بقول مرتب یہ ترجمہ قاضی نجم الدین کے ترجمے سے حرف بحرف مطابقت کرتا ہے، اس لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ وہی ترجمہ ہے۔

فتاوئ عالم گیری کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور اتفاق ملاحظہ ہو کہ قبول و تداول کے لحاظ سے یہ ترجمہ اصل عربی کتاب سے فوقیت لے گیا ہے۔ یہ ترجمہ مشہور عالم دین مولانا سید امیر علی ملیح آبادی مرحوم (متوفی ماہ رجب ۱۳۳۷ھ/ اپریل ۱۹۱۹ء) نے کیا تھا، جو مفسر قرآن اور کئی علمی کتابوں کے مصنف اور شارح و مترجم تھے۔ یہ ترجمہ منشی نول کشور (لکھنؤ) نے کرایا تھا اور سب سے پہلے اسی مطبع میں شائع ہوا تھا۔ فاضل مترجم نے اس پر ایک مبسوط اور مفصل مقدمہ بھی سپرد قلم کیا جو بے شمار معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں اصل عربی کتاب کی نسبت اہل علم میں یہی اردو ترجمہ زیادہ متداول اور رواج پذیر ہے۔

مولانا سید امیر علی ملیح آبادی، حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی (متوفی ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ/ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء) کے شاگرد اور مولانا ابوالکلام آزاد کے رفیق خاص اور نامور عالم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے استاذ تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے [1]۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اورنگ زیب عالم گیر چاہتا تھا کہ اس کے ملک ہندوستان (اور دیگر اسلامی ملکوں) میں فتاوئ عالم گیری کے مطابق کاروبارِ حکومت چلایا جائے، دیگر ملکوں کو تو چھوڑیے خود اپنے ملک میں بھی وہ اس کے مطابق حکومت نہ چلا سکا۔ کہیں بھی اس پر عمل نہ ہوا، نہ عدالتوں میں نہ دیگر محکموں میں۔

عالم گیر کا کتب خانہ:

شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر بے حد علمی ذوق کا مالک تھا۔ اس کا اپنا ایک ذاتی کتب خانہ تھا جو ساڑھے تین سو سال پیشتر کے ہندوستان کے حالات کے مطابق بڑا وسیع اور مختلف علوم و فنون سے متعلق بہت سی کتابوں پر مشتمل تھا۔ فتاوئ عالم گیری کی ترتیب و تدوین پر جو علمائے کرام اور فقہائے عظام مقرر ہوئے وہ زیادہ تر اسی کتب خانے سے مدد لیتے تھے۔ ''عالم گیر نامہ'' کا مصنف لکھتا ہے کہ یہ کتب خانہ اطراف و اکناف عالم سے فراہم کیا گیا ہے اور اس میں بلند پایہ مستند کتابیں اور ہر موضوع کی مبسوط و مفصل تصانیف موجود ہیں۔

[1] فتاوئ عالم گیری کی جمع و تدوین اور اس کے مرتبین و مترجمین کے مفصل حالات نیز اس کے مشمولات و مندرجات کے لیے ملاحظہ ہو، راقم السطور کی کتاب ''برصغیر میں علم فقہ'' از صفحہ ۲۴۵ تا ۲۶۴۔ شائع کردہ کتاب سرائے الحمد مارکیٹ اردو بازار، لاہور

Marfat.com

علمائے وقت تحقیق وتدقیق اور غور انیق کے لیے اس کتب خانے کی طرف رجوع کرتے ہیں ❶۔

اس سے آگے وہ رقم کرتا ہے کہ جو علمائے کرام ترتیب فتاویٰ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، ان کے علمی مرتبے کے مطابق ان کے وظائف وعطایا کا انتظام بھی کیا گیا ہے اور ان کے لیے بادشاہ کے کتب خانہ خاص سے کتابیں بھی مہیا کی جاتی ہیں ❷۔

عالم گیر کا یہ کتب خانہ اس کے آباو اجداد کے زمانے سے چلا آرہا تھا اور مغلیہ خاندان کا ہر بادشاہ اپنے ذوق علمی کی روشنی میں انتہائی شوق سے اس کو ترقی دیتا اور اس میں اضافہ کرتا تھا۔ عالم گیر کے والد شاہ جہان کو بھی کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور یہی شوق عالم گیر کو بھی ورثے میں ملا اور اس نے اپنے پیش رووں کے کتب خانے میں مزید توسیع کی۔ چنانچہ ''ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے'' کے فاضل مصنف سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب میں ''کتب خانے'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، جس میں انھوں نے شاہانِ ہند اور شاہانِ مغلیہ کے کتب خانوں کے بارے میں خاصی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ ''عالم گیر کا کتب خانہ'' کے ضمنی عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ عالم گیر نے اپنے پہلے حکمرانوں کے کتب خانے کو مزید ترقی دی۔ الفاظ حسب ذیل ہیں:

''سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اس کتب خانے کو اور زیادہ ترقی ہوئی۔ اس کا ناظم محمد صالح تھا جو عیسیٰ خاں ترخان (سندھ) کا دوسرا لڑکا ہے اور مہتمم مہابت خاں کا پوتا منصور مقرر ہوا۔ اس کو مکرمت خاں کا خطاب بادشاہ نے عطا فرمایا۔ ۱۰۶۹ھ/ ۱۶۵۹ء میں اس کے مہتمم سید علی حسینی ہوئے، جیسا کہ ایک کتاب (قرآن شریف) کی مہر سے ظاہر ہوتا ہے جو اس وقت رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے ❸۔''

عہد عالم گیری کے علمائے کرام:

اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کو علم وفضل اور تحقیق وکاوش کے لحاظ سے عہد زریں سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس عہد میں بے شمار علمائے کرام، فقہائے عالی مقام اور مشائخ عظام سرزمین ہند میں موجود تھے۔ ان حضرات کے جگہ جگہ مدارس قائم تھے جن میں کثیر تعداد میں تشنگان علوم اپنی علمی تشنگی بجھاتے تھے۔ پھر مشائخ کی خانقاہیں تھیں، جن سے لوگ روحانی فیوض حاصل کرتے تھے۔ خود بادشاہ علما و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوتا

❶ عالم گیر نامہ: ص ۱۰۸۶۔

❷ ایضاً: ص ۱۰۸۷۔

❸ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے: ص ۲۸۰، ۲۹۱۔ بحوالہ ماہ نامہ ''معارف'' (اعظم گڑھ) جلد ۱۴، ص ۴۲۲۔

Marfat.com

اور ان سے علمی اور روحانی مسائل دریافت کرتا تھا۔ وہ ان کا بے حد قدر دان اور ان کی انتہائی تعظیم کرتا تھا۔ اس عہد کے علما و مشائخ کے اسمائے گرامی ''فقہائے ہند'' کی مختلف جلدوں میں مرقوم ہیں۔

فنون لطیفہ اور تعمیرات:

عالم گیر اپنے اسلاف کی طرح فنون لطیفہ اور تعمیرات سے بھی پوری دلچسپی رکھتا تھا۔ کئی بڑی بڑی عمارتیں، مشہور مسجدیں، متعدد سرائیں اور بہت سے مدرسے اس کے عہد کی تعمیرات میں شامل ہیں۔ مثلاً قلعہ آگرہ میں حصار شیر حاجی تعمیر کی گئی، اسی قلعے میں سنگ مرمر کی ایک خوب صورت مسجد خطیر رقم سے بنائی گئی جو آٹھ سال میں تیار ہوئی، دہلی کے لال قلعے میں سنگ مرمر کی ایک مسجد تعمیر ہوئی جو موتی مسجد کہلاتی ہے۔ بنارس میں ایک شان دار مسجد بنائی گئی۔ اسی طرح لاہور کی عظیم الشان مسجد جو بادشاہی مسجد کے نام سے موسوم ہے، اورنگ زیب کے ذوق تعمیر کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ سنگ مرمر کی یہ مسجد ۱۰۸۷ھ/ ۱۶۷۶ء میں فدائی خان کوکہ کی نگرانی میں کئی لاکھ روپے کے خرچ سے مکمل ہوئی۔ اس کے علاوہ حصار، دہلی، متھرا، آگرہ، گوالیار، احمد آباد، بنگال، لاہور اور کشمیر وغیرہ میں بہت سی عمارات اس کے عہد کی یادگار اور مغل فن تعمیر کا زندہ نقوش ہیں۔

عالم گیر کے اساتذہ:

شاہ جہان کو اہل علم سے خاص دل بستگی تھی اور اس کا دربار علما کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں دور دور سے اصحاب کمال کو دعوت دی جاتی اور مختلف مسائل میں مباحث کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس نے شہزادوں کی تعلیم کا بھی نہایت عمدہ انتظام کیا تھا۔ پھر اورنگ زیب چوں کہ ذاتی طور پر بھی شائق علم اور گرویدۂ علما تھا، اس لیے اس نے خود بھی متعدد مشاہیر اصحاب علم سے استفادہ کیا۔ اس کے اساتذہ کا ابتدائی سطور میں ذکر ہو چکا ہے۔ اب ذیل میں اختصار کے ساتھ ان کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

۱۔ مولانا عبداللطیف سلطان پوری: عالم گیر کے یہ استاذ محترم جلیل القدر عالم تھے اور معقولات و منقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۷ء میں فوت ہوئے۔ مرآۃ العالم کی روایت کے مطابق ۱۰۴۳ھ/ ۱۶۳۴ء کو وفات پائی۔

۲۔ مولانا محمد ہاشم گیلانی: تفسیر، حدیث، فقہ اور امور دینیہ میں ماہر اور علوم حکمیہ میں کامل تھے۔ بارہ سال حجاز کی مقدس سرزمین میں قیام پذیر رہے۔ اسی (۸۰) سال عمر پا کر ۱۰۶۱ھ/ ۱۶۵۱ء کو اورنگ آباد میں انتقال کیا۔

۳۔ شیخ محی الدین بہاری: اورنگ زیب کے یہ استاذ ارض ہند کے مشاہیر فقہا میں سے تھے اور ملا موہن بہاری کے عرف سے معروف تھے۔ نہایت طباع اور تیز فکر تھے۔ چوراسی سال عمر پا کر ۱۰۶۸ھ/

Marfat.com

۱۶۵۸ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔

۴۔ علامہ محمد شفیع یزدی: یہ شفیعائے یزدی کے نام سے مشہور ہیں۔ اقلیم ہند کے نامور فضلا میں سے تھے اور نواب دانش مند خاں کے لقب سے ملقب تھے۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۰۸۱ھ/ ۱۸ جولائی ۱۶۷۰ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔

۵۔ سید محمد قنوجی: اورنگ زیب عالم گیر کے یہ استاذ جید عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل تھے۔ بادشاہ ان کا بے حد احترام کرتا تھا اور ہفتے میں تین روز امام غزالی کی احیاء علوم الدین، کیمیائے سعادت اور فتاویٰ عالم گیری کے بارے میں ان سے مذاکرہ کرتا اور ان کے علم وفضل سے مستفید ہوتا۔ شاہ جہاں بھی ان کا بے حد مداح تھا۔ شاہ جہاں نے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بتیسویں سال انھیں اپنے پاس بلایا اور پھر زندگی کے آخری سانس تک اس پیکر علم کو اپنے پاس رکھا۔ آگرہ کے قلعے میں اس کی نظر بندی کے ایام میں یہ اس کے پاس تھے۔ اس کی تجہیز و تکفین میں بھی شریک رہے۔ اس کی وفات کے بعد عالم گیر سے وابستگی اختیار کی۔ ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۹۰ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

۶۔ علامی سعد اللہ خان: شاہ جہان کے وزیر اعظم تھے۔ علم وفضل اور وسعت معلومات میں یگانۂ روزگار تھے۔ عقل وفکر اور فہم سیاست میں ممتاز تھے۔ اصلاً پنجاب کے قصبہ چنیوٹ کے باشندے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عرصے تک لاہور کی مسجد وزیر خاں میں علوم دینیہ کا درس دیتے رہے۔ ۱۷ رمضان المبارک ۱۰۵۰ھ/ ۲۱ دسمبر ۱۶۴۰ء کو شاہ جہان کے دربار میں گئے۔ وہ ان کی قابلیت سے بے حد متاثر ہوا اور بہت سے مناصب عطا کیے۔ ۲۶ جمادی الاخریٰ ۱۰۶۶ھ/۱۱ اپریل ۱۶۵۶ء کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔

۷۔ شیخ احمد معروف بہ ملا جیون امیٹھوی: بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ملا جیون بھی اورنگ زیب عالم گیر کے استاذ تھے۔ تفسیر احمدی، نور الانوار اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ملا جیون ۹ ذیقعدہ ۱۱۳۰ھ/ ۲۳ ستمبر ۱۷۱۸ء کو ۸۳ سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔

۸۔ شیخ عبد القوی: یہ بھی عالم گیر کے استاذ تھے اور اس اعزاز پر نازاں تھے۔

۹۔ حاجی قاسم خوش نویس: ان کا ذکر ''عالم گیر نامہ'' میں عالم گیر کے ساتویں سال جلوس (۱۰۷۴ھ/ ۱۶۶۴ء) کے واقعات میں کیا گیا ہے۔ بہترین خوش نویس تھے۔ عالم گیر نے ان سے خط نسخ سیکھا۔

۱۰۔ شیخ علی خطاط: دور مغلیہ کے فاضل بزرگ اور اس زمانے کے نامور خطاط تھے۔ شاہ جہان نے انھیں عالم گیر کا اتالیق مقرر کیا اور جواہر رقم کے لقب سے نوازا۔ عالم گیر نے ان سے خط نستعلیق کی مشق کی۔ اچھے شاعر بھی تھے۔ عالم گیر نے تخت نشین ہونے کے بعد ان کو اپنے کتب خانے کا مہتمم بنا دیا تھا۔

Marfat.com

۱۱۔ شیخ سیف الدین سرہندی: اورنگ زیب عالم گیر کے مرشد تھے اور وہ ان کا انتہائی معتقد تھا۔ شیخ محمد معصوم سرہندی کے بیٹے اور حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مشہور تھے۔ ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں بمقام سرہند پیدا ہوئے اور ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۰۹۶ھ/۱۳/اپریل ۱۶۸۵ء کو صرف سینتالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

۱۲۔ شیخ محمد معصوم سرہندی، حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند رشید تھے۔ نہایت متقی اور عبادت گزار۔ ۱۱/ شوال ۱۰۰۷ھ یا ۱۰۰۹ھ/ ۲۷/اپریل ۱۵۹۹ء یا ۱۶۰۱ء کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ اورنگ زیب ان سے بیعت تھا اور ان کو بے حد لائق احترام گردانتا تھا۔ شیخ ممدوح نے ۹/ربیع الاول ۱۰۷۹ھ/۷/ اگست ۱۶۶۸ء کو سرہند میں وفات پائی۔

بزرگان سرہند سے تعلق خاص:

بزرگان سرہند سے عالم گیر کو خاص تعلق ارادت اور بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ خود بھی ان کا مرید تھا اور دوسروں کو بھی ارادت کے لیے ان کے پاس بھیجتا تھا۔ اس کا ثبوت بہت سے واقعات سے ملتا ہے جن میں ایک واقعہ مآثر عالم گیری میں اس طرح درج ہے کہ ایک مرتبہ عالم گیر کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میں بادشاہ کا مرید ہونے کے لیے بنگالہ کے دور دراز ملک سے آیا ہوں۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے مسکرا کر جیب سے کچھ نقدی نکالی اور ملازمین سے کہا کہ یہ شخص ہمارے فیض سے جس چیز کا امیدوار ہے، وہ یہی ہے، یہ اسے دے دو۔ لیکن اس شخص نے بادشاہ کا عطیہ پھینک دیا اور مایوس ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ قریب ہی شاہی خیمے نصب تھے، دریا میں پیراک کود پڑے، اسے نکالا تو بادشاہ نے ہندی کا ایک شعر پڑھ کر کہا کہ اس شخص کو میاں محمد نافع سرہندی کے پاس لے جاؤ اور انھیں کہو کہ اسے مرید کر کے سرہندی ٹوپی اس کے سر پر رکھیں[1]۔

اورنگ زیب عالم گیر ہندوستان کا وہ شہنشاہ تھا جو متبع سنت اور خادم اسلام تھا۔ علما و فقہا کی صحبتوں میں بیٹھتا اور ان سے مستفید ہوتا۔ اگر کسی مسئلے کا اسے علم نہ ہوتا اور اسے بتا دیا جاتا تو بے حد خوش ہوتا اور فوراً اس پر عمل کرتا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا وہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے بزرگوں کا نہایت عقیدت مند تھا اور ان کو اکثر دربار میں تشریف لانے کی تکلیف دیتا۔ خاندان مجددیہ کے بزرگوں میں ایک بزرگ شیخ سیف الدین سرہندی تھے، جو حضرت مجدد کے پوتے اور خواجہ محمد معصوم سرہندی کے فرزند رشید تھے۔ ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء میں پیدا ہوئے اور ۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۰۹۶ھ/ ۲۰ اپریل ۱۶۸۵ء کو صرف سینتالیس سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ یہ درجہ غایت نیک اور متقی تھے۔ بہت بڑے عالم و فاضل اور فقیہ تھے۔ ایک مرتبہ اورنگ زیب نے خواجہ محمد معصوم کو

[1] مآثر عالم گیری: ص ۲۳۳۔۲۳۴۔

Marfat.com

خط لکھا جس میں درخواست کی کہ مہربانی کر کے وعظ و نصیحت کے لیے کسی بزرگ کو دہلی بھیجا جائے۔ چنانچہ خواجہ ممدوح نے بادشاہ کے اس خط کو درخور اعتنا گردانا اور اپنے بیٹے شیخ سیف الدین سرہندی کو اس کے پاس دہلی بھیجا۔ بادشاہ نے نہایت تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا اور قلعے میں تشریف لانے کی درخواست کی۔ شیخ ممدوح جب بادشاہ اور امرا و وزرا کی معیت میں دہلی کے لال قلعے میں داخل ہونے لگے تو دیکھا کہ صدر دروازے پر دو ہاتھیوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، جن پر دو فیل بان سوار ہیں۔ شیخ وہیں رک گئے اور قلعے میں جانے سے انکار کر دیا۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس گھر میں تصویر ہو، اس میں رحمت کا فرشتہ داخل نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو گھر رحمت خداوندی سے محروم ہے، سیف الدین اس میں نہیں جا سکتا۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ہاتھی اور فیل بانوں کی تصویریں توڑ دی گئیں اور شیخ قلعے میں داخل ہوئے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ تذکروں میں مذکور ہے کہ شیخ سیف الدین دہلی گئے تو ایک روز بادشاہ نے ان کو باغ حیات کی سیر کو جانے کی درخواست کی۔ شیخ سیر کرتے کرتے تالاب پر پہنچے تو اس میں سونے کی مصنوعی مچھلیاں پڑی تھیں، جن کی آنکھوں پر جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ شیخ انھیں دیکھ کر نہایت کبیدہ خاطر ہوئے اور فرمایا جب تک ان مچھلیوں کو توڑا نہیں جائے گا میں یہاں نہیں بیٹھوں گا۔ باغ کے محافظوں نے تالاب کی خوب صورتی میں کمی واقع ہونے کے خیال سے مچھلیوں کو توڑنے میں تامل کیا، لیکن بادشاہ نے شیخ کی نصیحت کے مطابق اسی وقت مچھلیاں تڑوا ڈالیں اور کہا کہ مچھلیوں کی نسبت خاطر شیخ ہمارے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔

شیخ واپس سرہند تشریف لے گئے تو بادشاہ نے خواجہ محمد معصوم کو شکریے کا خط تحریر کیا اور شیخ سیف الدین کے پند و مواعظ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تحسین کی۔ خواجہ ممدوح نے بھی بادشاہ کو جواب میں مکتوب ارسال کیا، جس میں رقم فرمایا کہ

الحمدلله والمنة کہ فقیر زادہ منظور نظر و قبول گشتہ و اثر صحبت بحصول انجامیدہ واز امر معروف و نہی منکر کہ شیوہ فقیر زادہ است اظہار شکر و رضا مندی نمودہ بودند، شکر خداوندی جل شانہ بریں عطیہ بجا آور دو سبب از دیاد دعا گوئی نمودہ آمد، چہ نعمتے است کہ بایں ہمہ طمطراق بادشاہی و دبدبہ سلطانی کلمہ حقہ بسمع قبول افتد و گفتہ نامرادے موثر شود۔

(یعنی اللہ کا بے پایاں شکر ہے کہ فقیر زادہ کو منظور نظر اور لائق التفات سمجھا گیا اور اس کے اثر صحبت کو نتیجہ خیز قرار دیا گیا۔ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا فقیر زادے کی فطرت میں داخل ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے اس نعمت عظمیٰ سے اسے بہرہ مند فرمایا۔ یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آپ نے طمطراق بادشاہی اور دبدبۂ سلطانی کے باوجود کلمہ حق سنا اور اسے تسلیم کیا۔)

یاد رہے یہ تصویریں وغیرہ اورنگ زیب سے پہلے سے چلی آ رہی تھیں، ورنہ خود اسے ذاتی طور پر اس قسم کا کوئی شوق نہ تھا۔

Marfat.com

ہندو امرا اور منصب داروں کی تعداد میں اضافہ:

اورنگ زیب چوں کہ پابند شریعت اور شیدائی اسلام تھا، اس لیے عدل و انصاف اور عفو و کرم کو سب سے مقدم گردانتا تھا۔ یہ قدرتی بات ہے جو شخص جتنا پکا مسلمان ہوگا، اتنا ہی رحم دل اور دوسروں کا خیر خواہ ہوگا، کیونکہ اسلام اپنے متبعین کو یہی تعلیم دیتا ہے۔ بالخصوص حکمران کو وہ اس سلسلے میں زیادہ ہدایات سے نوازتا ہے۔ اسی بنا پر اورنگ زیب نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی ہندو رعایا کو بے حد مراعات دیں اور ان کے متعدد افراد کو باقاعدہ امرائے حکومت میں شامل کیا۔ جن ہندو امرا نے اسے قدم قدم پر دھوکا دیا تھا، انھیں بھی مہربانیوں کا مستحق ٹھہرایا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ مغل عہد کے ہندوستان میں ہندوؤں کی طاقت کے تین اہم اور مشہور مرکز تھے۔ جے پور، جودھ پور اور اودے پور۔ جے پور اور جودھ پور نے مرکزی حکومت کی کلی طور پر اطاعت قبول کر لی تھی۔ لیکن بابر سے لے کر شاہ جہان تک اودے پور کی یہ حالت رہی کہ حملہ ہوا تو گردن جھکا لی اور خطرہ ٹلا تو پھر سرکشی پر اتر آیا۔ جے پور کا رئیس راجا جے سنگھ تھا۔ یہ مغل حکومت کا کامل وفادار تھا اور جودھ پور کا حکمران راجا جسونت سنگھ تھا۔ یہ دونوں راجے مغل حکومت کے حلقۂ امرا اور طبقۂ ملازمین میں شامل تھے۔ اودے پور کے مہارانا جگت سنگھ کی موت کے بعد اس کا بیٹا مہارانا راج سنگھ اس کا قائم مقام ہوا۔ اس نے وفات پائی تو اورنگ زیب کی طرف سے اس کے بیٹے اندر سنگھ کو دو ہزاری منصب اور بہادر سنگھ کو ایک ہزاری و پانصدی منصب عطا ہوا تھا۔

جسونت سنگھ کے بارے میں گزشتہ سطور میں بتایا جا چکا ہے کہ اس نے اورنگ زیب کے ساتھ بار بار غداری کی مگر فراخ دل بادشاہ نے ہر مرتبہ اس کو معاف کیا۔ جب عالم گیر کا اپنے بھائی شجاع سے معرکہ پیش آیا تو شجاع کے مقابلے میں جسونت سنگھ کو فوج کا حاکم مقرر کر کے بھیجا۔ لیکن جسونت سنگھ نے اس کمینگی کا ثبوت دیا کہ شجاع سے سازش کر کے رات کی تاریکی میں نصف شب کو عالم گیر کی فوج سے نکل کر اپنی تمام فوج کے ساتھ جو مجموعی لحاظ سے آدھی تھی، شجاع سے جا ملا۔ اس کی فوج نے شاہی مال اسباب اور خزانے پر بھی دست درازی کی، جس کے نتیجے میں نہایت ابتری اور افراتفری پھیل گئی۔ یہ بڑا نازک موقع تھا، جس پر عالم گیر نے انتہائی فہم و فراست سے قابو پایا اور جبین استقلال پر شکن تک نہیں پڑی۔ بعد ازاں اس کو سیوا جی کے مقابلے میں بھیجا تو اس وقت بھی غداری سے باز نہ آیا، مگر عالم گیر کا دل گردہ دیکھیے کہ اس نے نہ صرف اسے کوئی سزا نہ دی بلکہ اس کے خواست گار معافی ہونے پر ہر مرتبہ اسے معاف کیا اور منصب و خطاب اور جاگیر سے نوازا۔

اورنگ زیب عالم گیر نہایت فراخ حوصلہ بادشاہ تھا۔ وہ رعایا کے ہر شخص کو خواہ ہندو یا مسلمان لائق اعتماد قرار دیتا اور مملکت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کرتا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

Marfat.com

کے مقالہ نگار پروفیسر شیر محمد گریوال کی تحقیق کے مطابق شہنشاہ اکبر کے عہد میں جسے ہندوؤں کا بہت بڑا خیر خواہ بلکہ محافظ سمجھا جاتا ہے، ہندو امرائے مملکت کی تعداد باون (۵۲) تھی اور اورنگ زیب کے عہد میں جسے مذہبی اعتبار سے ''متعصب'' قرار دیا جاتا ہے، یہ تعداد اکسٹھ تک پہنچ گئی تھی۔ اکبر کے دور حکومت میں ہندو منصب داروں کی تعداد چونسٹھ تھی، لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں ایک سو اسی (۱۸۰) ہوگئی تھی، تقریباً تین گنا بڑھ گئی۔

پھر اورنگ زیب عالم گیر نے ہندوؤں کے مندروں اور عبادت خانوں کی بھی پوری حفاظت کی۔ البتہ متھرا، بنارس، کھنڈیلہ اور بعد میں ادے پور کے وہ بت خانے جن میں مسلمانوں کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں اور جو اسلامی حکومت کے خلاف بغاوتوں کا مستقل مرکز بن گئے تھے، منہدم کرادیے گئے تھے۔ انہدام کی نوبت اس وقت آئی جب متھرا وغیرہ کے نواح میں ہندوؤں نے بے حد شورش بپا کی اور وہاں کے فوج دار عبدالنبی خاں کو قتل کر دیا۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے تو اورنگ زیب کیا کوئی حکومت سازشوں اور بغاوتوں کے لیے نہ مذہبی مقامات کے استعمال کی اجازت دے سکتی ہے اور نہ کسی مخالف حکومت اڈے کے قیام کو برداشت کر سکتی ہے۔

قرآن مجید کی کتابت کا سلسلہ:

اورنگ زیب عالم گیر اپنے اوضاع و اطوار میں دیگر بادشاہوں سے بالکل ایک ممتاز نوعیت کا بادشاہ تھا۔ وہ نہایت خوش خط تھا۔ خط نسخ میں بالخصوص مہارت رکھتا تھا۔ قرآن مجید کی کتابت کا اسے بہت شوق تھا۔ دو قرآن مجید اپنے قلم سے لکھ کر حرمین شریفین بھیجے۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے مشاغل کے ساتھ ساتھ غالباً قرآن مجید کی کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ اس کے ہاتھ کے کتابت شدہ قرآن کے نسخے مختلف انداز میں بعض ذرائع سے لوگوں میں فروخت ہوتے رہتے تھے۔ یہ رقم الگ رکھی جاتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق بادشاہ ٹوپیاں سی کر بھی فروخت کرتا تھا۔

عدل وانصاف:

شہنشاہ جہاں گیر کے پوتے اورنگ زیب عالم گیر کی ذات میں عدل وانصاف اور معدلت گستری کی خصوصیات بڑی نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس کے عہد حکومت کا یہ روشن کارنامہ ہے، جس میں اپنے بیگانے، غریب و امیر اور دوست و دشمن سب ایک ہی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا ذکر وہ خود ایک خط میں کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ معاملات انصاف میں شہزادوں کو رعایا کے عام آدمیوں کے برابر سمجھتا ہوں۔

لین پول اورنگ زیب کے انصاف کی بڑی تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ مغل اعظم عدل کا دریائے

Marfat.com

اعظم ہے۔ اس سلسلے میں اس کی نظر بڑی ہمہ گیر ہے۔ کوئی شخص اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ شہنشاہ کے حضور سفارش اور منصب و امارت کو اہمیت دینے کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی بھی وہ اس مستعدی اور توجہ سے بات سنتا ہے، جس طرح کہ بڑے سے بڑے حاکم اور امیر کی۔

اس کے عدل وانصاف کے بہت سے واقعات میں سے یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ مرزا کام بخش، عالم گیر کا نہایت چہیتا بیٹا تھا۔ اس کے رضاعی بھائی پر قتل کا الزام عائد ہوا۔ عالم گیر نے عدالت میں تحقیقات کا حکم دیا۔ کام بخش نے بھائی کی حمایت کی۔ بادشاہ کے علم میں یہ بات آئی تو اس نے کام بخش کو دربار میں طلب کیا۔ کام بخش اپنے اس رضاعی بھائی کو بھی دربار شاہی میں ساتھ لے گیا، کیوں کہ وہ اس کو اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ رضاعی بھائی کے ساتھ کام بخش کو بھی قید کردیا جائے۔ چنانچہ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی اور دونوں کو جیل بھیج دیا گیا۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شہنشاہ اورنگ زیب انتہائی نرم خو اور کشادہ دل تھا۔ دیوان عدالت میں ہر فریادی کو آنے اور اپنا مدعا پیش کرنے کی اجازت تھی۔ وہ ہر شخص کی فریاد نہایت اطمینان اور غور سے سنتا۔ بعض لوگ اپنا مدعا بیان کرنے اور مطالبات پیش کرنے میں تیز کلامی اور مبالغہ آرائی سے بھی کام لیتے، لیکن عالم گیر کی پیشانی پر کبھی شکن نہ پڑتی، نہ زبان سے کسی قسم کی خفگی کا اظہار ہوتا۔ بعض درباریوں اور مصاحبوں نے عرض بھی کیا کہ مستغیث جسارت اور عجلت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کی انھیں اجازت نہیں دینی چاہیے۔ بادشاہ جواب دیتا کہ تلخ کلمات سننے سے ہمارے ملکۂ تحمل کو تقویت پہنچتی ہے۔

خبر رسانی کا اہتمام:

آج سے ساڑھے تین چار سو سال پہلے کے برصغیر کے بلاد وامصار دور و دراز فاصلوں پر واقع تھے اور آبادی کا سلسلہ وہ نہ تھا جو آج نظر آرہا ہے۔ اس میں خبر رسانی اور مخابرت کے ذرائع بہت محدود تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے اس شعبے کو بڑی وسعت دی۔ اس نے ملک کے حالات سے باخبر اور رعایا کے معاملات سے مطلع رہنے کے لیے واقعہ نگاری اور پرچہ نویسی کے محکمے کو اس دور کی صورت حال کے مطابق انتہائی ترقی کی منزل میں پہنچا دیا۔ بلاشبہ اس محکمے میں دیانت دار افراد کی ضرورت ہے، راشی اور خود غرض لوگ ملک کی بربادی اور حکومت کی تباہی کا موجب ہوسکتے ہیں، لیکن اورنگ زیب چوں کہ اس خطرے سے خوب آگاہ تھا اس لیے اس نے اس کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی بے حد نگرانی کی اور نہایت احتیاط سے کام لیا۔ وہ کمال حکمت عملی سے وقائع نگاروں کو ہدایات دیتا اور اپنی گرفت میں رکھتا تھا۔

پرچہ نویسی اور مخابرت کے عمدہ انتظام کی وجہ سے اس وسیع برصغیر کے ہر حصے اور ہر گوشے کی تمام خبریں باقاعدہ بادشاہ کو پہنچتی تھیں۔ وقائع نگار بادشاہ کو تمام حالاتِ ملک سے باخبر رکھتے تھے اور بادشاہ لوگوں کی فلاح و بہبود اور ملک کی ترقی کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے شہزادوں، عاملوں، صوبے داروں اور مختلف محکموں کے سربراہوں کی

Marfat.com

غلطیوں کی نشان دہی کرتا اور واقعہ نگار کے حوالے سے حالات کی اصلاح کی طرف انھیں توجہ دلاتا تھا۔ اس کا نظام مخابرت اس درجے حیرت انگیز طور پر وسیع تھا کہ اگر طول طویل فاصلے پر بھی کسی سوداگر یا راہ گزر کی کوئی چیز ضائع ہو جاتی تو اس کی اطلاع ممکن عجلت سے بادشاہ کو پہنچ جاتی اور وہ وہاں کے عامل یا حاکم سے سخت باز پرس کرتا۔

رعایا کے کوائف سے بادشاہ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اس کی نظر عمیق ہر چھوٹے بڑے واقعہ پر حاوی تھی۔ نہ کوئی بہ ظاہر معمولی واقعہ اس کی نگاہ تیز سے اوجھل تھا اور نہ کوئی بڑا اور اہم معاملہ اس کے علم و آگاہی سے مخفی۔ وہ اپنی عظیم مملکت کی ہر بات سے باخبر رہتا اور کامل غور و فکر کے بعد ان کے بارے میں مناسب ہدایات و احکام جاری کرتا۔

بادشاہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا حق:

دنیا کے بادشاہوں کی طویل قطار پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ اس گروہ میں عالم گیر وہ تنہا بادشاہ ہے، جس نے اپنی مملکت میں یہ حکم جاری کیا کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ بادشاہ کی طرف سے کسی معاملے میں حق تلفی ہوئی ہے یا بادشاہ نے غیر شرعی اقدام کیا ہے تو وہ بلا تامل عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ اسے بادشاہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ پھر اس نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ رعایا کے نادار اور غریب لوگوں میں مراحلِ تحقیق کے مصارف ادا کرنے کی استطاعت نہیں ہوتی، اس لیے شرعی وکیل مقرر کر دیے جائیں جو اس قسم کے مقدمات کی تحقیق میں ان کی پوری مدد کریں۔ بہ الفاظ واضح بادشاہ پر یہ نالش کا حق تھا جو اس نے ملک کی رعایا کے ہر فرد کو دے دیا تھا۔

چاندی کے بجائے چینی کی دوات:

اورنگ زیب نے حتیٰ الامکان احکام اسلام سے ہم آہنگ ہو کر حکمرانی کے فرائض انجام دیے۔ اس نے غیر شرعی لباس کی ممانعت کر دی اور سلطنت کے تمام تکلفات کو ترک کر دیا۔ اس سے پہلے بادشاہ چاندی کی دوات استعمال کرتے تھے، اس نے چاندی کی دوات کے بجائے چینی کی دوات لانے کا حکم دیا۔ انعام کی رقمیں بھی چاندی کی سینیوں میں رکھ کر پیش کی جاتی تھیں، اس نے ڈھال میں رکھ کر لانے کا حکم جاری کیا۔ ہندوستان کے اس خوش خصال بادشاہ نے زربفت وغیرہ کے خلعت بھی بند کر دیے۔

جیب خاص کے مصارف میں کمی:

سابق بادشاہوں کے زمانے میں بادشاہ کی جیب خرچ کے لیے کروڑوں روپے کی آمدنی کے علاقے مخصوص ہوتے تھے، جن سے بادشاہ کے ذاتی مصارف ادا ہوتے تھے۔ عالم گیر نے یہ سلسلہ ختم کر کے چند گاؤں

Marfat.com

اور چند نمک سار اپنے مصارف کے لیے مخصوص کر لیے تھے۔ باقی تمام علاقے اور مال و اسباب کو بیت المال کی ملکیت قرار دے دیا تھا۔

عالم گیر کی زندگی کا اسلوب بالکل سادہ اور زاہدانہ تھا۔ ایک یورپین سیاح نے ۱۶۶۵ء میں اسے دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اورنگ زیب بہت نحیف و نزار ہو گیا تھا اور اس کی کمزوری میں اس کی روزہ داری نے اور اضافہ کر دیا تھا[1]۔

عالم گیر کی جیب خاص کے مصارف میں یہ حیرت انگیز کمی اور اکل و شرب اور رہن سہن کا یہ انداز اس کی اتباع شریعت کا بین ثبوت ہے۔

ملکی آمدنی میں اضافہ:

عالم گیر نے بہت سے ان ٹیکسوں کو جو پہلے سے چلے آ رہے تھے، رعایا پر ناروا بوجھ اور شرعی طور پر ناجائز قرار دے کر منسوخ کر دیا تھا۔ لیکن اس نے مال گزاری کا کچھ ایسا عمدہ نظام مرتب کیا اور بندوبست اراضی میں کچھ ایسی بہترین ترامیم اور اصلاحات جاری کیں کہ محاصل سلطنت میں پہلے سے کئی گناہ زیادہ اضافہ ہو گیا۔ مثلاً اکبر کے زمانے میں ایک کروڑ نوے لاکھ پونڈ اور شاہ جہان کے زمانے میں دو کروڑ ستائس لاکھ پچاس ہزار پونڈ وصول ہوتے تھے، مگر عالم گیر کے عہد میں یہ آمدنی بڑھ کر چار کروڑ پونڈ تک پہنچ گئی۔

یہاں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عالم گیر کے دور حکومت میں کئی نئے علاقے فتح کر کے حدود مغلیہ میں شامل کر لیے گئے تھے، مثلاً حیدر آباد، بیجاپور، آسام، چاٹ گام اور تبت کے علاقے زیر نگین ہوئے لہٰذا محاصل سلطنت میں اضافہ ضروری تھا۔

جواب یہ ہے کہ ان تمام مفتوحہ ملکوں کی آمدنی دس بارہ کروڑ روپے سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ اضافہ صرف عالم گیر کے اصلاحی اقدام اور بندوبست اراضی کی عمدگی کے باعث ہوا۔

مسلسل جدوجہد:

اورنگ زیب کی زندگی مسلسل جدوجہد اور پیہم تگ و تاز کا نام ہے۔ وہ عمر کے آخری دور میں بھی گھوڑے کی پیٹھ پر رہا اور ہتھیار کھول کر اطمینان سے نہیں بیٹھا۔ مملکت کا استحکام، فتنہ و فساد کا سد باب، ملک کا امن و امان، رعایا کی فلاح و بہبود اور باشندگان سلطنت کی ترقی و خوش حالی اس کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اسی مقصد کی تکمیل اور اسی فرض کی انجام دہی کے لیے وہ عساکر شاہی کی قیادت کرتے ہوئے عمر بھر پہاڑوں اور جنگلوں میں پھرتا اور ندی نالوں کو عبور کرتا رہا۔ اتنے بڑے ملک کا وہ شہنشاہ ایسے ایسے مقامات میں گیا جہاں کسی

[1] اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر: ص ۱۱۶۔

Marfat.com

ادنیٰ حکمران نے بھی حالت امن میں قدم نہ رکھا ہوگا۔ بلند و بالا محلات وقصور کے اس مالک نے گرمیاں سردیاں اور برساتیں کپڑے کے نازک خیموں میں گزار دیں۔ اس سراپا جہاد اور پیکر سعی و ہمت کو گرد وغبار سے اٹے ہوئے خیمے سب سے زیادہ عزیز تھے۔ فتح و کامرانی کا مژدہ آتا تو ہرگز اظہار فخر نہ کرتا بلکہ بلا توقف بارگاہ خداوندی میں سربسجود ہو جاتا۔ امرائے مملکت اور حاکمان فوج ہدیہ تبریک پیش کرنے کے لیے حاضر خدمت ہوتے تو چہرے پر کبھی فاتحانہ تمکنت نمایاں نہ ہوتی۔ اگر کسی طرف سے ناخوش گوار اطلاع آتی تو بھی چہرہ غم و اندوہ کی کیفیت سے آشنا نہ ہوتا۔ صبر وسکون اور ضبط وثبات اس کا سرمایۂ حیات تھا اور اپنے اوقات شب وروز کو اس نے فرائض وواجبات کے ایک خاص سلسلے میں باندھ رکھا تھا۔

ادبیت اور حسن بیان:

اورنگ زیب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس کے رقعات اس کے شاہد ہیں جنھیں ادبیت اور حسن بیان کا بے مثال مرقع کہنا چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے جملے نہایت بصیرت افروز اور پند ونصائح کا دل آویز مجموعہ ہیں۔ مناسب مواقع پر وہ قرآن کی آیات، رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور مختلف شعرا کے اشعار بڑی خوب صورتی اور عمدگی سے درج کرتا ہے۔ قدیم وجدید شعرا کے بے شمار شعر اس کے حافظے میں محفوظ تھے۔ خود بھی شاعر تھا۔ یہ رباعی اسی کی ہے۔

دیروز پے گلاب می گردیدم پژمردہ گلے برسر آتش دیدم
گفتم کہ چہ کردہ ای کہ مے سوزندت گفتا کہ دریں دمے خندیدم

اورنگ زیب کی شعر وشاعری سے دلچسپی اور ادبیت کے سلسلے میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ زندگی کے آخری دور (۱۷۰۵ء) میں دکن کی متواتر ومسلسل مہموں میں وہ بیمار ہوگیا۔ عمر کم وبیش نوے سال کو پہنچ گئی تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی تمام مشاغل حکمرانی بہ دستور جاری تھے۔ اس زمانے میں میر عبدالکریم جس کو امیر خاں کا خطاب عطا ہوا تھا، بادشاہ کا مقرب اور محرم خاص بن گیا تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اس بیماری کے دنوں میں ایک روز میں پلنگ کے قریب گیا تو بادشاہ سلامت پر ضعف ونقاہت کا غلبہ تھا اور آہستہ آہستہ یہ شعر پڑھ رہا تھا:

بہ ہشتاد ونود چوں در رسیدی بسا سختی کہ از دوراں کشیدی
وزانجا چوں بہ صد منزل رسانی بود مرگے بہ صورت زندگانی

میر خاں کہتا ہے، یہ شعر سن کر میں نے عرض کیا حضرت سلامت! شیخ نظام گنجوی نے یہ شعر اس بیت کی تمہید میں کہے تھے:

پس آں بہتر کہ خود را شاد داری دراں شادی خدارا یاد داری

یہ بیت سنا تو فرمایا پھر پڑھو۔ کئی مرتبہ پڑھوا کر کہا، لکھ دو۔ اگلی صبح بادشاہ سلامت کی بیماری ختم ہوچکی

Marfat.com

تھی۔ وہ صحت یاب ہو کر دیوان مظالم میں آ بیٹھے اور فرمایا تمھارے شعر نے ہمیں صحت کامل کی منزل میں پہنچا دیا اور جان ناتواں میں دوبارہ طاقت آ گئی۔

اس شعر میں خدا کو یاد رکھنے اور خوش رہنے کی تلقین ہے اور یہی تلقین اس نیک دل اور دین دار بادشاہ کے لیے دستاویز صحت بن گئی۔

عبادت گزاری اور شریعت کی پاس داری:

لین پول کے بقول مغلوں کی تاریخ میں عالم گیر سب سے پہلا بادشاہ تھا جو پکا مسلمان تھا۔ ممنوعات و مکروہات سے خود بھی پرہیز کرتا اور دوسروں کو بھی اس سے روکتا تھا۔ عبادت گزاری، عدل گستری، شریعت کی پاس داری، اصابت رائے اور شجاعت میں کوئی بادشاہ اس کی مثل نہ تھا۔ قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں یہ خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کا خواہاں تھا اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا لیکن انتظامی معاملات کی پیچیدگیوں اور مختلف حریف طاقتوں کی بے جا مداخلتوں نے اس کا پورا موقع فراہم نہ ہونے دیا۔

اورنگ زیب نے لمبی عمر پائی مگر اللہ نے اسے ہر قسم کی سنگین بیماریوں سے محفوظ رکھا اور حواس خمسہ میں باقاعدہ اعتدال قائم رہا۔ ایک روایت کے مطابق سماعت میں کسی قدر خلل آ گیا تھا مگر اس کا بھی کسی کو احساس نہ ہوتا تھا۔

دور آخر کا ایک رقت انگیز واقعہ:

مبارک اللہ واضح نے جو ارادت خاں کے خطاب سے سرفراز تھا اپنے تذکرے میں عالم گیر کے دور آخر کے بعض واقعات قلم بند کیے ہیں۔ اس کے حوالے سے مولانا غلام رسول مہر نے ایک نہایت رقت انگیز واقعہ نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے

شہنشاہ اورنگ زیب کے انتقال سے ایک سال اور چند ماہ پیشتر ارادت خاں منڈو و مالوا کا قلعہ دار اور فوج دار مقرر ہوا تھا۔ رخصتی ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو بادشاہ نے خود خواب گاہ کا پردہ ہٹا کر اسے اندر بلا لیا اور فرمایا۔

''اب ہمارے اور تمھارے درمیان جدائی ہے۔ ملاقات کہاں ہو گی۔ تمھارے متعلق ہم سے دانستہ یا نادانستہ کوئی نامناسب امر پیش آیا تو اسے معاف کر دو اور تین مرتبہ کہو معاف کیا۔ اسی طرح تم نے ہماری بہت خدمت کی ہے، اگر دانستہ یا نادانستہ تم سے کوئی تقصیر ہو گئی ہو گی تو ہم بھی اسے معاف کرتے ہیں۔''

ارادت خاں کہتا ہے کہ شہنشاہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر شدتِ گریہ گلوگیر ہو گئی اور میرے حلق سے آواز نہیں نکلتی تھی، تاہم حضرت کے انتہائی اصرار پر میں نے حالت گریہ ہی میں تین مرتبہ ''معاف کیا'' کہا خود شہنشاہ بھی آب دیدہ ہو گیا اور دعائے خیر کے بعد مجھے رخصت کیا[1]۔

---

[1] ماہ نامہ ''المعارف'' (لاہور) بابت ماہ مارچ ۱۹۶۸ء۔

Marfat.com

آخری دور اور تجہیز و تکفین کی وصیتیں:

جنوری ۱۷۰۶ء میں اورنگ زیب احمد نگر پہنچ گیا تھا، جسے وہ اپنی آخری منزل بتاتا تھا۔ شہر سے دو میل باہر خیمہ نصب تھا۔ یہ اس کی حیات مستعار کا آخری سال تھا۔

مورخین کہتے ہیں کہ آخری ایام زندگی میں شہزادہ کام بخش اور شہزادہ محمد اعظم بھی احمد نگر میں باپ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ کام بخش کو اس نے بیجاپور کا والی مقرر کر کے بھیجا اور محمد اعظم کو اس کے اپنے صوبے میں جانے کا حکم دیا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد بخار نے شدت اختیار کر لی۔ تاہم عالم گیر تین چار روز تک باقاعدہ نماز باجماعت ادا کرتا رہا۔ اس اثنا میں حمید الدین خاں نے نجومیوں کی تجویز کے مطابق عرض داشت پیش کی کہ اس موقعے پر ایک ہاتھی اور ایک بیش قیمت دانہ الماس بطور تصدق دینا چاہیے۔ صاحب تقویٰ بادشاہ نے اس عرض داشت پر تحریر کیا کہ ہاتھی تصدق کرنا ستارہ پرست ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ الماس اور ہاتھی تصدق کرنے کے بجائے چار ہزار روپے مستحقین میں تقسیم کرنے کے لیے قاضی القضاۃ کو دیے جائیں۔ ساتھ ہی بہ صورت وصیت لکھا کہ

۱۔ وفات کے بعد اس خاک سار کو جلد سپرد خاک کر دیں تابوت کے تکلف میں نہ پڑیں۔

۲۔ ٹوپیاں سینے کی اجرت سے چار روپے دو آنے عیسیٰ بیگ محل دار کے پاس موجود ہیں، اس سے کفن خریدا جائے۔

۳۔ تین سو پانچ روپے کتابت قرآن کی اجرت کے ہیں، وہ میری موت پر فقرا و مساکین میں بانٹ دیے جائیں۔

۴۔ میرا سر ننگا رکھا جائے، اس لیے کہ خدا کی بارگاہِ جلال میں ننگے سر جانے سے امید ہے کہ رحم و کرم کا مستحق ٹھہروں گا۔

وفات:

شہنشاہ اورنگ زیب کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کاش اس کی وفات جمعہ کے روز ہو۔ جو شخص جمعہ کے دن فوت ہوتا اس پر بادشاہ رشک کرتا۔ ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) کو جمعہ کا دن تھا۔ فجر کی نماز جماعت کے ساتھ بیٹھ کر پڑھی۔ نماز فجر کے بعد حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ کاش یوم رحلت جمعہ ہو۔ اشراق کی نماز بھی ادا کی۔ پھر بادشاہ غسل خانے میں گیا۔ غسل خانے سے پلنگ پر آیا۔ ہمیشہ باوضو رہنا اس کا معمول تھا۔ اگر کسی وجہ سے فوری طور پر پانی میسر نہ ہوتا تو پانی آنے تک تیمّم کر لیتا۔ پلنگ پر آنے کے بعد تیمّم کے لیے ابھی پہلی ضرب لگا کر چہرے پر ہاتھ پھیرے تھے کہ روح تنگ نائے بدن سے نکل کر اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔ مبارک اللہ واضح کے بقول اس کے بعد بھی انگشت ہائے مبارک ایک ساعت

Marfat.com

تک معمول کے مطابق عقد انامل میں مصروف رہیں۔

احمد نگر آنے کے ایک سال ایک مہینا اور چند روز بعد وفات پائی۔

خلد آباد میں تدفین:

شہزادہ محمد اعظم باپ کی وفات کی خبر سنتے ہی راستے سے لوٹ کر احمد نگر پہنچ گیا اور انتہائی حزن وملال اور سوز ومحبت کے ساتھ والد کا نام لے لے کر روتا رہا۔ اپنی بہن زینت النسا بیگم اور دوسری خواتین کو تسلی دی اور صبر کی تلقین کی۔ وصیت کے مطابق جنازہ تیار کرایا۔ تھوڑی دور تک کندھا دیا۔ پھر جنازہ تدفین کے لیے شیخ زین العابدین کے مرقد کے قریب بھیج دیا۔ وفات کے بعد عالم گیر کا لقب ''خلد مکان'' قرار پایا۔ جہاں شہنشاہ کو دفن کیا گیا وہ مقام ''روضہ خلد آباد'' کے نام سے موسوم ہے۔

ہندوستان کے اس عدیم المثال شہنشاہ نے اکانوے (۹۱) سال تیرہ دن عمر پائی اور پچاس سال دو ماہ اور ستائیس دن حکومت کی۔ احمد نگر میں انتقال کیا اور اورنگ آباد سے بارہ کوس کے فاصلے پر ''روضہ خلد آباد'' میں دفن ہوا۔ وصیت کے مطابق اس کی تجہیز وتکفین نہایت سادہ طریقے سے ہوئی۔ اس کی قبر پر بھی کوئی عالی شان عمارت نہیں ہے۔

یہاں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔

ایک یہ کہ عالم گیر کی تاریخ ولادت ''آفتاب عالم تاب'' کے لفظ سے نکلی تھی۔ جس تاریخ کو اس پر چتر شاہی سایہ فگن ہوا، وہ اس نے خود ''آفتاب عالم تاب'' سے نکالی اور تاریخ وفات میر سید عبدالجلیل بلگرامی نے ''فی آفتاب عالم تاب'' سے نکالی۔ یعنی آفتاب عالم تاب کا زوال۔ ''آفتاب'' اور ''عالم تاب'' کے الفاظ کو عالم گیر سے خاص مناسبت رہی۔

دوسرے یہ کہ ماہ ذی قعدہ کو بھی عالم گیر کے بارے میں ایک خصوصیت حاصل ہوگئی۔ وہ اسی مہینے میں ۱۵ ذی قعدہ ۱۰۲۷ھ (۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء) کو پیدا ہوا۔ غرہ ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ (۲۳ جولائی ۱۶۵۸ء) کو باغ اغر آباد (دہلی) میں جو بعد میں شالا مار باغ کہلایا تخت حکومت پر بیٹھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ اسی مہینے میں ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) کو جمعہ کے دن فوت ہوا۔

لیکن ایک بات:

گزشتہ صفحات میں اورنگ زیب عالم گیر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی اختصار کے ساتھ نشان دہی کر دی گئی ہے جس سے اس کے شب وروز کے متعدد گوشے نکھر کر قلب ونظر کے زاویوں میں آجاتے ہیں۔ بے شک وہ نہایت عاقل وفہیم، مردم شناس، کشور کشا، جرات مند اور عابد ومتدین حکمران تھا۔ زبردست منتظم اور مملکت کے تمام نشیب وفراز پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ بڑے ٹھنڈے دل ودماغ کا مالک اور انتہائی بردبار اور

Marfat.com

حلیم الطبع تھا۔ قرآن کی تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم مروّجہ کا عالم تھا اور اپنے دور کے علما و فقہا اور مشائخ و صوفیا کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھتا اور ان سے مستفید و مستفیض ہوتا تھا۔ متبع سنت اور حامیٔ دین متین تھا۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ انسان تھا اور اس کے ساتھ ہی پہلے شہزادہ اور پھر شہنشاہ تھا۔ معصوم ہرگز نہ تھا۔ غلطیاں اس سے بھی سرزد ہو سکتی تھیں اور ہوئیں۔

اس نے باپ کو نظر بند اور بھائیوں کو قتل کر کے تاج شاہی سر پر سجایا تھا۔ اس کی وجہ جواز بھی پیش کی جا سکتی ہے اور دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ جن حالات سے اسے دوچار کر دیا گیا تھا، ان کا تقاضا یہی تھا کہ وہ وہی قدم اٹھاتا جو اس نے اٹھایا، وہ اس میں حق بہ جانب تھا اور اسے یہی کچھ کرنا چاہیے تھا۔ خود اس کے خلاف بھی تو باپ اور بھائیوں کی طرف سے یہی کچھ کیا گیا تھا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ کامیاب ہو گیا اور باپ اور بھائی اپنے تمام منصوبوں میں ناکام رہے، مگر یہ بات ایک عام آدمی کی سمجھ سے بالا ہے کہ جب بھائی قتل ہو گئے اور خاندان میں کوئی اس کا حریف اور مدعیٔ سلطنت باقی نہ رہا تو باپ کو نظر بند رکھنے کی آخر کیا وجہ تھی؟ اس کا باپ شاہ جہاں بھی بہت منتظم، مصلح، قاطع بدعت، متبع سنت اور علما و مشائخ کا عقیدت مند تھا۔ ایام نظر بندی میں بہ ظاہر کوئی لائق اعتراض امر اس میں باقی نہ رہا تھا۔ وہ حکومت سے معزول ہونے کے بعد آٹھ سال زندہ رہا اور اس تمام عرصے میں عظیم القدر باپ کو پابندِ صوم و صلوٰۃ بیٹے نے نظر بند ہی رکھا۔ موت بھی اسی حالت میں آئی۔ عالم گیر کے بھائی واقعی امور سلطنت چلانے کے اہل نہ تھے۔ لیکن ان کو راستے سے ہٹانے کے بعد باپ کو بہ دستور محبوس رکھنا معلوم نہیں کیوں ضروری سمجھا گیا۔ اگر اسے رہا کر دیا جاتا تو یہ عالم گیر کا کوئی غیر سیاسی یا غیر اسلامی، غیر مدبرانہ فعل متصور نہ ہوتا۔ ہمیں مان لینا چاہیے کہ عالم گیر کا یہ فعل اس کے تدین و تقویٰ سے ہم آہنگ اور احترام والد سے ہم رنگ نہ تھا۔

اگر چہ شاہ جہان کو قلعے میں تمام سہولتیں میسر تھیں، تاہم وہ محبوس تھا۔ آٹھ سال کے طویل عرصے میں نہ کبھی وہ خود قلعے سے باہر نکلا اور نہ اسے نکالا گیا۔ اس کو موت نے رہائی دلائی اور اس کا جنازہ ہی باہر آیا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جنازہ بھی غیر معروف راستے سے راز داری کے ساتھ باہر لایا گیا۔

بہر حال یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ بادشاہوں کی تاریخ ہمیشہ اسی ڈگر پر چلتی رہی ہے جو عام طور سے تلوار کے قلم اور لہو کی روشنائی سے لکھی گئی ہے۔ وہ جو کچھ کرتے تھے اپنی صواب دید کے مطابق کرتے تھے۔ ان کے سامنے ملک کے استحکام کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کا استحکام بھی ہوتا تھا۔ اس میں نہ باپ بیٹے کو معاف کرتا تھا اور نہ بیٹا باپ کی پروا کرتا تھا۔ اس صورت حال کو ہم واقعات کے بہاؤ کے فطری نتائج یا تاریخ کے خطرناک موڑ سے تعبیر کر سکتے ہیں اور تاریخ کے خونی پہیے ہمیشہ گردش میں رہتے ہیں۔ انھیں کوئی طاقت کبھی روک نہیں سکتی۔ ان کا معاملہ اب اللہ کے ساتھ ہے اور وہ غفور رحیم ہے۔ ہماری نقد و جرح یا تنقید و تعریف ان واقعات و حوادث کو ہرگز متاثر نہیں کر سکتی جو تاریخ کے سینے میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو چکے ہیں۔

Marfat.com

اورنگ زیب کے بعد:

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر دودمانِ مغلیہ کا قابل فخر اور لائق صد ستائش فرزند تھا۔ یہ ہندوستان کا وہ حکمران تھا، جس نے اس وسیع ملک کی سرحدوں کو مزید ہم کنار وسعت کیا اور اس کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں۔ وہ خلیفہ نہ تھا لیکن اس کے جذبۂ دینی کی داد دینی چاہیے کہ نظام مملکت کو ہم دوش خلافت کرنے کے لیے ہر آن کوشاں رہا۔ وہ اسلام کا مبلغ اور دین کا داعی تھا۔ اس نے اپنے پیش رووں کی ان تمام رسوم و عادات کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا تھا جو احکام شرع سے مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ اس کی ذاتی زندگی ایک درویش کی زندگی کا پیکر حسین تھی۔ اس کے کارنامے تاریخ ہند کا ایک زریں باب بن گئے۔ اس کے اصول حکمرانی روشنی کا مینار تھے، لیکن افسوس ہے اس کے نااہل اخلاف نے ان کی پاسبانی نہ کی اور بے رحم مورخوں کو اپنے لائق اسلاف پر طعنہ زن ہونے کے مواقع بہم پہنچائے۔ ملک میں ہنگامہ آرائی کی ایسی فضا پیدا کر دی جو قتل و غارت پر منتج ہوئی اور پھر بابر کا یہ مفتوحہ ملک نہایت ذلت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اورنگ زیب کی وفات کے وقت اس کے تین بیٹے زندہ تھے۔ سب سے بڑا محمد معظم، اس سے چھوٹا محمد اعظم، اور سب سے چھوٹا کام بخش۔! باپ نے زندگی کے آخری دنوں میں وصیت کے ذریعے سے سلطنت ہند ان تینوں میں تقسیم کر دی تھی۔ بڑا لڑکا محمد معظم جو باپ کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ اول کے لقب سے بادشاہ ہوا، اس وصیت پر عمل کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کا بھائی محمد اعظم اس کے لیے تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ ہوئی، جس میں محمد اعظم اور اس کے دو لائق بیٹے بیدار بخت اور والا جاہ مارے گئے۔ محمد معظم سب سے چھوٹے بھائی کام بخش کو بھی باپ کی وصیت کے مطابق اس کا علاقہ دینے پر آمادہ تھا، بلکہ کچھ زیادہ بھی دینے پر رضا مند تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس نے بھی یہ بات منظور نہ کی۔ بالآخر معرکۂ کارزار گرم ہوا اور کام بخش شدید زخم کھانے کے بعد وفات پا گیا۔

آگے چل کر مغل بادشاہوں میں تخت نشینی کے مسئلے پر پیہم خون ریزیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہت سے قابل امرائے سلطنت مارے گئے اور رفتہ رفتہ ملک کے نظم و نسق کے تمام رشتے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔ اس کی مناسب تفصیلات آئندہ جلدوں کے مقدمات میں بیان کی جا رہی ہیں۔

بندۂ عاجز
محمد اسحاق بھٹی
اسلامیہ کالونی۔ ساندہ۔ لاہور

Marfat.com

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بارھویں صدی ہجری

الف

ا۔ سید آل محمد بلگرامی

سید آل محمد بن برکت اللہ حسینی واسطی بلگرامی ثم مارہروی ''سبع سنابل'' کے فاضل مصنف شیخ عبدالواحد بلگرامی (متوفی ۳ رمضان المبارک ۱۰۱۷ھ/ یکم دسمبر ۱۶۰۸ء) کی نسل سے تھے۔ پنجشنبہ کے روز ۱۹ رمضان ۱۱۱۱ھ/ ۲۸ فروری ۱۷۰۰ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی سید برکت اللہ بلگرامی مارہروی (متوفی ۱۰ محرم ۱۱۴۲ھ/ ۲۵ جولائی ۱۷۲۹ء) ''صاحب البرکات'' کے لقب سے ملقب تھے اور عالم و فاضل بزرگ تھے۔ لائق بیٹے نے پدر بزرگ وار سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور اخذ طریقت بھی انہی سے کیا۔ ان کے سایۂ عاطفت میں تربیت باطنی کی بہت سی منزلیں طے کیں اور خرقہ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ والد کی وفات کے بعد اپنے آبائے کرام کے سجادۂ خلافت پر متمکن ہوئے۔ اتباع شریعت مطہرہ میں راسخ اور عمل و عقیدہ میں پابند سنت محمدیہ (علیہ الف الف تحیہ وسلام) تھے۔ ہمیشہ مطالعہ کتب میں مصروف رہتے اور اپنے وقت کا کوئی لمحہ غیر دینی کاموں میں صرف نہ کرتے۔ ان کے والد محترم سید برکت اللہ بلگرامی نے تصوف و معرفت پر جو کتابیں تصنیف کی تھیں، ان کا مطالعہ خصوصیت سے کرتے۔ ازالہ امراض قلبی میں مسیحا کی حیثیت رکھتے تھے اور سرگشتگانِ وادیٔ شوق سے انتہائی نرمی اور حلم سے بات کرتے۔ ہندوستان کے شہر مارہرہ میں سکونت پذیر تھے اور اس نواح کے اکثر لوگوں کو ان کے کوس مشیخت نے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ حدود شریعت کے جادۂ مستقیم سے کبھی ادھر ادھر قدم نہ رکھتے۔

برصغیر کے اس صوفی عالم و فقیہ نے ۱۵ رمضان المبارک ۱۱۶۴ھ/ ۲۷ جولائی ۱۷۵۱ء کو مارہرہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ سید میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان اشعار میں تاریخ وفات نکالی۔

چراغ آل عبا شمع دود مان علا   فزود جلوۂ او رونق حریم بہشت
افادہ کرد بہ من سال رحلتش ہاتف   نصیب آل محمد بود نعیم بہشت ❶

۱۱۶۴ھ

❶ ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۱۱۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۔

Marfat.com

۲۔ سید آیت اللہ رائے بریلوی

سید آیت اللہ حسنی نصیر آبادی ثم بریلوی، سید علم اللہ بریلوی (متوفی ۸ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ/ ۲۶ اکتوبر ۱۶۸۵ء) کے فرزند کبیر اور صالح عالم دین تھے۔ شجاع اور جواں مرد بھی تھے۔ علوم دینیہ اور تحصیل فقہ کے لیے اپنے والد گرامی قدر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ حفظ قرآن کی نعمت بھی حاصل کی۔ قرآن مجید سے انتہائی شغف تھا۔ ایک مرتبہ نصیر آباد گئے ہوئے تھے کہ ہلال رمضان طلوع ہوا۔ والد گرامی نے پیغام بھیجا کہ رائے بریلی آجائیں اور نماز تراویح میں قرآن سنائیں۔ نصیر آباد میں ان کے عم محترم دیوان سید احمد فروکش تھے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ جب تک ہمیں پورا قرآن نہ سناؤ گے، ہرگز رائے بریلی جانے نہ دوں گا۔ سید آیت اللہ نے پہلی ہی رات تراویح کی دو رکعتوں میں انتیس پارے ختم کر دیے اور باقی رکعتوں میں تیسواں پارہ تمام کر دیا۔ اس طرح عم محترم کی خواہش پوری کر کے یکم رمضان کو باپ کے حکم کی تعمیل میں رائے بریلی پہنچ گئے۔

آغاز شباب میں جہاد کا بڑا شوق تھا۔ اسی جذبہ شوق کے تحت چند اقربا کو ساتھ لے کر ناظم گورکھ پور کے پاس ملازم ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ ایک جاگیردار کی سرکشی یہاں تک پہنچی کہ اس نے گورکھ پور پر حملہ کر دیا۔ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ سید آیت اللہ نماز کے لیے مسجد جا رہے تھے کہ ناظم گورکھ پور فوج لے کر اس سرکش جاگیردار کے مقابلے کے لیے نکل پڑا، سید آیت اللہ نے فرمایا پہلے جمعہ ادا کر لینا چاہیے، پھر لڑیں گے۔ ناظم بولا جب تک آپ جمعہ سے فارغ ہوں گے دشمن اپنا کام ختم کر کے چلتا بنے گا۔ آپ پیرزادہ ہیں، نماز ادا فرمائیں اور دعا کریں۔ ہم تو سب سے پہلے دشمن کا قلع قمع کریں گے۔

سید آیت اللہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ مسجد میں گئے اور اطمینان سے جمعہ پڑھا۔ پھر اپنے ساتھیوں کو لے کر لڑائی کے لیے نکلے تو دیکھا کہ ناظم کا لشکر باغی جاگیردار کے مقابلے میں شکست کھا کر پسپا ہوتا ہوا شہر کے قریب پہنچ گیا ہے۔ سید آیت اللہ نے لشکر کو روکا اور جب دیکھا کہ یہ لوگ ہمت ہار چکے ہیں تو اپنی جماعت کو ساتھ لیا اور تلواریں سونت کر بجلی کی طرح دشمن کی صفوں میں جا گرے اور انھیں سراسیمہ وار بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس لڑائی میں سید ممدوح کے بہنوئی سید عبدالرحیم اور دو بھائی شریک تھے۔ سید عبدالرحیم نے اس معرکے میں جام شہادت نوش کیا۔

سید آیت اللہ رائے بریلوی نے آخری عمر میں ناظم کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔

ایک دفعہ بعض خاندانی جھگڑوں کے فیصلے کے لیے سید آیت اللہ کو فرماں روائے ہند اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں دکن جانا پڑا۔ ایک بھائی دو بیٹے اور چند خادم ساتھ تھے۔ امور متنازعہ فیہ کا فیصلہ کرا کے واپس آرہے تھے کہ راستے میں بیمار پڑ گئے، یکایک حالت غیر ہو گئی، استحضار کا وقت قریب آیا تو سورہ زلزال پڑھی اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ رفقائے سفر نے خیال کیا کہ آرام فرما رہے ہیں۔ ایک امیر جوان کے والد سید

Marfat.com

علم اللہ بریلوی کا ارادت مند تھا مزاج پرسی کے لیے آیا۔ کیفیت سنی تو کہنے لگا سید صاحب تو ابدی نیند سو گئے ہیں۔ کپڑا منہ سے ہٹا کر دیکھا تو واقعی جاں بحق ہو چکے تھے۔ یہ ۱۲ رجب ۱۱۱۶ھ (۳۰ اکتوبر ۱۷۰۴ء) کا واقعہ ہے۔ غسل و تکفین کے بعد میت کو تابوت میں ڈال کر رائے بریلی پہنچایا گیا اور وہیں والد ذی منزلت کے پہلو میں دفن ہوئے ❶۔

سید آیت اللہ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ چوتھی پشت میں سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (شہادت ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ/ ۶ مئی ۱۸۳۱ء) کے اجداد میں سے تھے۔

۳۔ مفتی ابوالبرکات دہلوی

مفتی ابوالبرکات کا سلسلۂ نسب یہ ہے: ابوالبرکات بن حسام الدین بن سلطان بن ہاشم بن رکن الدین بن جمال الدین بن سماء الدین دہلوی۔ مفتی ممدوح کبار فقہاے حنفیہ اور دیار ہند کے جلیل القدر علما میں سے تھے۔ دارالحکومت دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو و نما پائی اور حصول علم کے بعد اسی شہر کی مسند افتا پر فائز ہوئے۔ پھر عہد عالم گیری میں منصب قضا پر مامور کیے گئے۔ ''مجمع البرکات'' کے نام سے ان کی ایک تصنیف بھی ہے جو مسائل فقہ پر محیط ہے اور دو ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب کا آغاز الحمد للہ الذی نور قلوب الموحدین بنور التوحید و الایمان کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کا مقصد تصنیف، مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی فقہی روایات کو خاص ترتیب کے ساتھ یک جا کرنا تھا تاکہ لوگوں کو ان مسائل سے علم و آگاہی میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور وہ آسانی کے ساتھ صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔ اس ضمن میں ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

لما کانت الروایات اشتاتاً متفرقۃ جمعتها جمعا لیسهل الوقوف بها و رتبتها لیتیسر الاطلاع علیها فی هذا المختصر۔

مجمع البرکات کی تصنیف سے وہ ۹ ذی الحجہ ۱۱۱۶ھ/ ۲۳ مارچ ۱۷۰۵ء کو فارغ ہوئے۔

مفتی ابوالبرکات دہلوی کو فقہ و اصول سے خاص لگاؤ تھا اور ان کا شمار اس علم کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ انھیں یہ شرف حاصل ہے کہ وہ فتاویٰ ہندیہ (فتاویٰ عالم گیری) کے مرتبین کی جماعت میں شامل تھے ❷۔

۴۔ قاضی ابوبکر مدراسی

قاضی ابوبکر مدراسی، شافعی المسلک تھے۔ اپنے عصر اور علاقے کے بہت بڑے شیخ اور نامور عالم اور فقیہ تھے۔ ان کی فراوانی علم کی بنا پر نواب آصف جاہ نے ۱۱۵۷ھ/ ۱۷۴۴ء میں انھیں بلاد کرناٹک کا قاضی القضاۃ

❶ سید احمد شہید، ص ۴۷، ۴۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲، ۱۔

❷ شمس التواریخ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۰۸، ۳۰۹۔

Marfat.com

مقرر کر دیا تھا۔ شمس پلی میں نواب مذکور نے ان کو قطعہ زمین بھی عطا کر دیا تھا، جس سے انھیں بارہ ہزار روپے کی سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ نواب کے نزدیک وہ بڑی قدر و منزلت کے مالک تھے [1]۔

۵۔ شیخ ابوالحسن ویلوری

شیخ ابوالحسن ویلوری کا نسب نامہ یہ ہے: ابوالحسن بن عبداللطیف بن ابوالحسن بن عبداللطیف بن ولی اللہ بن عبداللطیف بن محمد بن عبدالحق بن قطب الدین بن عبدالفتاح عسکری احمد آبادی گجراتی ثم ویلوری مدراسی۔ ۱۱۱۷ھ/ ۱۷۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ نہایت صالح عالم دین تھے۔ رفاہ عامہ کے کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ ویلور میں مسجد، سرائے اور مکان تعمیر کیا۔ فقہ و عقائد اور تصوف میں مہارت رکھتے تھے۔ اس موضوع پر کتابیں بھی تصنیف کیں، لیکن ان کتابوں کے بارے میں پتا نہیں چل سکا کہ ان کے نام کیا تھے اور اب کہاں ہیں۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸ء کو فوت ہوئے [2]۔

۶۔ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر

شیخ ابوالحسن نور الدین محمد بن عبدالہادی سندھی، عالم کبیر علامۂ وقت اور امام فی العلوم تھے۔ اصلاً سندھی تھے۔ لیکن مدینہ منورہ میں سکونت گزین ہو گئے تھے۔ اقلیم سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی، پھر تستر چلے گئے، وہاں کے علما و شیوخ کی ایک جماعت سے تحصیل کی اور حدیث و فقہ اور دیگر علوم کی تمام اصناف میں بلند مرتبے کو پہنچے۔ تستر سے مدینہ منورہ کا عزم کیا اور وہاں قیام پذیر ہوئے اور مختلف علما سے اخذ علم کیا، جن میں شیخ محمد بن عبدالرسول برزنجی، شیخ ابراہیم بن حسن کورانی مدنی اور دیگر مشائخ حجاز شامل ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدینہ شریف میں خود مسند تدریس آراستہ کی اور فضل و ذکا اور صلاح و تقویٰ کے اونچے مقام سے سرفراز ہوئے۔ دوران تدریس میں کئی بہترین کتابیں تصنیف فرمائیں، جن میں الحواشی الستة علی الصحاح الستة بالخصوص قابل ذکر ہے۔ صحاح ستہ پر انھوں نے حواشی سپرد قلم کیے۔ البتہ جامع ترمذی کا حاشیہ مکمل نہیں کر پائے۔ مسند امام احمد بن حنبل پر بھی نفیس اور مفید حاشیہ لکھا۔ ابن ہمام کی فتح القدیر پر بھی کتاب النکاح تک حاشیہ تحریر کیا۔ ابن قاسم کے حاشیہ جمع الجوامع پر ''الآیات البینات'' کے نام سے حاشیہ سپرد قلم کیا۔ امام نبوی کی ''اذکار'' پر بھی حاشیہ قلم بند کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی مفید حواشی تحریر کیے۔

شیخ ابوالحسن سندھی کبیر نے ۱۲ شوال ۱۱۳۸ھ/ ۲ جون ۱۷۲۶ء کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ ایک روایت کے مطابق ۱۱۳۶ھ/ ۱۷۲۴ء کو فوت ہوئے۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵ بحوالہ اساس کرناٹک۔

[2] حدیقۃ المرام۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۔

Marfat.com

مدینہ منورہ میں اس جلیل القدر عالم کی وفات پر بڑے حزن و ملال کا اظہار کیا گیا۔ بے شمار لوگوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ خواتین نے بھی ان کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا اور گھروں سے جنازہ جاتے ہوئے دیکھا۔ دکان داروں نے فرطِ غم سے دکانیں بند کر دیں۔ حکومت کے ولات و عمال نے میت کو کندھا دیا۔ میت کو مسجد نبوی میں لایا گیا، وہیں نماز جنازہ پڑھی اور پھر اس عظیم سندھی الاصل عالم کو جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیا گیا ❶۔

۷۔ شیخ ابوالحسن سندھی صغیر

شیخ ابوالحسن بن محمد صادق سندھی صغیر۔ یہ صغیر کے نام سے اس لیے مشہور ہوئے کہ شیخ ابوالحسن نور الدین محمد کبیر کے نام سے التباس نہ ہو۔ اپنے دور کے امام، عالم، محدث اور شیخ تھے۔ ارض سندھ میں پیدا ہوئے اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور طویل عرصے تک ان سے اخذ علم میں مصروف رہے۔ علوم سے فراغت کے بعد اسی سرزمین میں خود سرگرم تدریس ہوئے۔ ان کے عصر میں کثرت درس و افادہ میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ متعدد عمدہ کتابیں بھی تصنیف فرمائیں جن میں شرح جامع الاصول اور مختار الاطوار فی اطوار المختار لائق تذکرہ ہیں۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۸۷ھ/ ۱۰ استمبر ۱۷۷۳ء کو مدینہ منورہ میں فوت ہوئے ❷۔

۸۔ مولانا ابوالحسن کشمیری

مولانا ابوالحسن کشمیری علامہ وقت اور فاضل کبیر تھے۔ اپنے علاقے کے مشہور شیخ تھے۔ حنفی المسلک تھے اور شاہم بابا کے عرف سے معروف تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ استحضار مسائل اور جزئیات فقہ پر عبور میں اپنے تمام معاصرین سے فائق تر تھے۔ حلاوت کلام اور عذوبت لسان میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ حفظ و ادراک اور اخذِ علوم میں اس نواح میں کوئی ان کا مدمقابل نہ تھا۔ تفسیر بیضاوی اور تعلیقات العصام کی عبارتوں کی عبارتیں متحضر تھیں۔ علمائے عصر سے مناظرہ و مباحثہ کے وقت قرآن مجید کی آیات کثرت سے پڑھتے۔ تفسیر بیضاوی اور دیگر کتب درسیہ پر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے جو تعلیقات سپرد قلم کی ہیں، ان کو ہدف تنقید ٹھہراتے۔ ان کی علمی اور فنی غلطیوں کی نشان دہی کرتے اور پورے علمی اعتماد اور دلائل سے ان کو غلط قرار دیتے۔ بارھویں صدی ہجری کے اس نامور کشمیری عالم و فقیہ کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا پتا چل سکا ہے کہ یہ مغل حکمران شاہ جہاں کے عہد کے صاحب علم بزرگ تھے ❸۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵، ۶۔ بحوالہ سلک الدرر و تاریخ الجبرتی۔

❷ تحفۃ الکرام، ص ۱۷۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۔

❸ حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۷۔ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۴۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۷۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۱۔ روضۃ الابرار، ص ۲۵۔

Marfat.com

۹۔ مولانا ابوالخیر جون پوری

مولانا ابوالخیر بن قاضی ثناء اللہ فاروقی جون پوری، شیخ وقت، صالح عالم دین اور نامور فقیہ تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ ہوش سنبھالا تو حصول علم میں مشغول ہو گئے اور اس ضمن میں مختلف بلاد و امصار کا سفر کیا۔ متعدد علما سے تحصیل کی، علوم سے فارغ ہونے کے بعد خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔ زہد و عفاف اور تدین و قناعت کا پیکر تھے، عبادت گزار اور درس و تدریس میں کثیر الاشتغال تھے۔ ان کے علم و فضل کی وجہ سے انھیں ملک کا منصب افتا پیش کیا گیا۔ لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ علوم و فنون پر عبور و مہارت کا یہ عالم تھا کہ شرح عقائد تفتازانی اور شرح عقائد دوانی پر حواشی تحریر کیے۔

مولانا ابوالخیر جون پوری نے ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء کو جون پور میں وفات پائی اور اسی شہر میں اپنے والد قاضی ثناء اللہ جون پوری کے مدفن کے قریب دفن کیے گئے ❶۔

۱۰۔ سید ابو سعید بریلوی

سید ابو سعید بریلوی، سید علم اللہ بریلوی کے پڑپوتے اور سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجداد میں سے تھے۔ مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: سید ابو سعید بن محمد ضیا بن آیت اللہ بن سید علم اللہ رائے بریلوی۔ نہایت متقی بزرگ تھے۔ بارھویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے صلحائے امت اور علمائے ربانیین میں سے تھے۔ رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ مولانا عبداللہ امیٹھوی سے علم حاصل کیا۔ عالم شباب ہی میں اپنے عم محترم سید محمد صابر سے بیعت کر لی تھی۔ اپنے والد مکرم کے خلیفہ محمد یونس سے بھی استفادہ کیا۔ اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق پیدا کیا اور ان سے سلوک کی تکمیل کر کے خلافت کا منصب پایا۔ شاہ ولی اللہ، ان کے بھائی شاہ اہل اللہ، شیخ محمد عاشق پھلتی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی سے خط کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ بعض مکاتیب ''کلمات طیبات'' میں چھپ چکے ہیں۔ مکاتیب کا ایک مجموعہ مکتوب العارف کے نام سے سید ابوالقاسم ہسوی نے مرتب کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے سید ابو سعید کو اپنے مکتوبات میں جن الفاظ و القاب سے مخاطب فرمایا، وہ سید ابو سعید کی علو شان اور جلالت منصب کا بہت بڑا وثیقہ ہیں۔ مثلاً

- سیادت و نجابت مآب، حقائق و معارف آگاہ میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔
- خلاصہ دودمان نجابت میر سید ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ
- حقائق و معارف آگاہ، سیادت و نجابت دستگاہ، سلالۃ الاکابر میر ابو سعید۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۳۰ محرم ۱۱۷۶ھ (۳۱ اگست ۱۷۶۲ء) کو فوت ہوئے۔ اس وقت خاندان علم

---

❶ تجلی نور، ج ۲ ص ۱۰۵۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۵۳۔ ۷۵۴، ۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۸۔

Marfat.com

اللّٰہی میں سے سید نعمان ان کے پاس تھے۔ انھوں نے سید ابو سعید کو یہ حزن افزا خبر جن الفاظ میں پہنچائی۔ ان کا ترجمہ یہ ہے:

"حضرت صاحب قدس سرہ آپ سے بہت خوشنود تھے اور آپ کے حال پر ان کی توجہات عالیات بیان میں نہیں آسکتیں۔ اکثر اوقات آپ کے حالات دریافت فرماتے رہتے تھے۔ شاید آپ سے آخری ملاقات کی آرزو تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا: سید ابو سعید آنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، جلد پہنچ جائیں تو بہت اچھا ہو۔"

شیخ محمد عاشق پھلتی سے تفسیر، حدیث، فقہ اور کتب تصوف کی سند و اجازہ کا شرف حاصل تھا۔ نیز یہ علوم طلبا کو پڑھانے کی بھی اجازت تھی۔ علم نحو اور علم صرف کے درس کی اجازت سے بھی بہرہ مند تھے۔

سید ابو سعید بارعب، سخی، مہمان نواز اور غریب پرور تھے۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ کہیں سے آیا۔ جب تک پورے کا پورا مستحقین میں بانٹ نہ دیا گھر میں قدم نہ رکھا۔ اطرافِ مدراس میں ارادات مندوں کا وسیع حلقہ موجود تھا۔ ان کے خلفا میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

میر عبدالسلام بدخشانی، شیخ محمد مراد انصاری مکی، مولانا جمال الدین بن محمد صدیق قطب، مولانا عبداللہ آفندی، شیخ عبداللطیف حسینی مصری، شیخ عبدالقادر خالص پوری اور حاجی امین الدین بن حمید الدین کاکوروی۔

سید ابو سعید نے حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ ابوالحسن سندھی صغیر کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ ان سے مصابیح کا درس لیا اور چھ مہینے قیام فرما رہے۔ پھر مکہ مکرمہ گئے۔ وہاں شیخ محمد میر داد انصاری سے جزریہ پڑھا، طائف بھی گئے۔ ہندوستان واپس آئے تو مدراس میں ٹھہرے۔ کافی عرصہ وہاں مقیم رہے۔ اس اثنا میں بے شمار اہل علم اور اصحاب سلوک نے ان سے استفادہ کیا۔

سید ابو سعید نے ۹ رمضان المبارک ۱۱۹۳ھ (۲۰ ستمبر ۱۷۷۹ء) کو اپنے وطن رائے بریلی میں وفات پائی۔ پسماندگان میں دو بیٹے تھے اور چار بیٹیاں۔ بیٹیوں میں سے ایک کا نام نا جبیہ یا یافیہ تھا۔ یہ سید احمد شہید بریلوی ﷫ کی والدہ تھیں۔ بیٹوں میں سے سید ابواللیث، سید شہید کے حقیقی ماموں تھے جو حج سے واپسی پر کوڑیال بندر پہنچے تو بیمار ہوئے، وہیں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

۱۱۔ سید ابو سعید کالپوی

سید ابو سعید بن فضل اللہ بن احمد بن محمد بن ابو سعید حسینی ترمذی کالپوی، مشاہیر مشائخ ہند میں سے تھے۔ صالح اور متدین عالم دین تھے۔ کالپی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت حاصل کی۔ اپنے والد شیخ فضل اللہ سے اخذ علم کیا، انھی سے علم فقہ کی تحصیل کی اور ان کی وفات کے بعد مسند مشیخت پر فائز ہوئے۔ والیٔ فرخ آباد نواب غضنفر جنگ ان سے بیعت تھے، امرا اور اعمال حکومت میں بڑی عزت و منزلت کے حامل تھے۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۰ تا ۱۲۔ سید احمد شہید، ص ۵۰، ۵۱۔

Marfat.com

سید ابوسعید کالپوی علمی اعتبار سے بڑے اونچے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے دادا سید احمد اور پردادا سید محمد کالپوی بھی اجل علمائے برصغیر میں سے تھے۔ خاندانی اثراتِ علم اور آبائی علامات تصوف و صالحیت سے پوری طرح بہرہ یاب تھے۔ فارسی کے شاعر بھی تھے۔ لیکن ان کا شمار کم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ عرفان تخلص کرتے تھے۔ اس نیک بخت عالم و فقیہ نے ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۵ء میں وفات پائی ❶۔

۱۲۔ مفتی ابوسعید گوپاموی

مفتی ابوسعید کا نسب نامہ یہ ہے: ابوسعید بن علیم اللہ بن عبید اللہ بن عیسیٰ بن آدم شہابی گوپاموی ۱۷ ذی الحجہ ۱۰۸۴ھ/ ۱۵ مارچ ۱۶۷۴ء کو پیدا ہوئے۔ اور اپنے والد مکرم شیخ علیم اللہ گوپاموی سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ اپنے وقت کے شیخ اور عالم و فقیہ گردانے گئے۔ اصحاب دین اور اربابِ عمل علما میں سے تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد گوپاموی کی مسند افتا پر فائز ہوئے اور درس و افادہ کا منصب سنبھالا۔ مولوی وہاج الدین گوپاموی اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء کو فوت ہوئے ❷۔

۱۳۔ شیخ ابوالطیب سندھی

شیخ ابوالطیب محمد بن عبدالقادر سندھی، شیخ صالح تھے اور علمائے محدثین میں سے گردانے جاتے تھے۔ ولادت اور نشو و نما علاقہ سندھ میں ہوئی اور انہی دیار میں علم حاصل کیا۔ بعد ازاں عازم حجاز ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں شیخ حسن بن علی عجیمی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے حدیث پڑھی۔ صحاح و سنن کی کتابوں کے لیے انہی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ علم حدیث کی اکثر کتابیں علامہ طاہر بن ابراہیم بن حسن کورانی مدنی کی شراکت میں پڑھیں۔ شیخ محمد سعید کوکبی قرشی سے بھی تحصیل کی۔ شیخ احمد البنا سے سند و اجازہ کا شرف حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عمر بھر درس و افادہ میں مصروف رہے۔ صدق و صلاح کے جوہر سے آراستہ تھے۔ جامع ترمذی کی عربی زبان میں شرح لکھی اور علم فقہ کی کتاب درمختار پر حاشیہ سپرد قلم کیا۔

شیخ ابوالطیب سندھی کا حلقہ تلامذہ بڑا وسیع تھا' ان میں شیخ عبدالرحمٰن بن عبدالکریم انصاری مدنی' شیخ عبداللہ بن ابراہیم البری مدنی' شیخ محمد بن علی شروانی مدنی' شیخ یوسف بن عبدالکریم مدنی اور علمائے عظام کی بہت بڑی جماعت شامل ہے ❸۔

---

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، در ترجمہ میر سید احمد بن میر سید محمد کالپوی، ص ۷۹ تا ۸۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۲۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۲۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۴۔

Marfat.com

۱۴۔ مولانا ابوالفتح کانی کشمیری

مولانا ابوالفتح بن عارف بن مولانا احمد کانی کشمیری، دیار کشمیر کے نامور فقیہ تھے، تمام عمر درس و افادہ میں سرگرم عمل رہے۔ طریقت و تصوف سے بھی تعلق تھا۔ یہ علم شیخ محمد چشتی اور شیخ محمد مراد نقشبندی سے حاصل کیا تھا۔ متبع سنت اور قاطع بدعت تھے۔ نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ ۱۱۴۹ھ/ ۱۷۳۶ء میں فوت ہوئے ❶۔

۱۵۔ مفتی ابوالفتح کلو کشمیری

ارض کشمیر کے یہ ایک اور عالم دین تھے جو مفتی ابوالفتح کے نام سے معروف تھے۔ ان کی شہرت ''کلو'' کے عرف سے تھی۔ علم فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔ معقول و منقول کے جید علما میں سے تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ مولانا حیدر بن فیروز چرخی کشمیری سے اخذ علم کیا اور استدلال و استنباط مسائل میں شہرت پائی۔ فقہ و اصول، علوم عربیہ اور استخراج مسائل میں اس مرتبۂ بلند کو پہنچے کہ اس نواح میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ آخر عمر میں کشمیر کے منصب افتا پر مامور ہو گئے تھے۔ شیعہ کے رد میں نہایت تیز تھے۔ ان کے عقائد کی مخالفت میں ''سیف السابین'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ مختلف کتب درسیہ پر تعلیقات لکھیں۔

مفتی ابوالفتح کلو کشمیری نے ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۹ء میں وفات پائی اور سلطان زین العابدین کشمیری کے مقبرے میں دفن کیے گئے ❷۔

۱۶۔ قاضی ابوالفرح گجراتی

قاضی ابوالفرح گجراتی شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ سرزمین گجرات کے مشاہیر اہل علم میں سے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اپنے علم فضل کی وجہ سے قاضی عبداللہ بن محمد شریف گجراتی کی جگہ احمد آباد کی مسند قضا پر فائز ہوئے، عرصہ تک اس منصب جلیلہ پر متمکن رہے۔ ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء کو عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم کے عہد میں معزول کیے گئے اور ان کی جگہ قاضی ابوالخیر کو قاضی مقرر کیا گیا۔ پھر وہ بھی جہاں دار شاہ کے عہد میں معزول ہوئے اور ان کی بجائے قاضی اطہر کو یہ منصب عطا ہوا۔ بعد ازاں انھیں بھی علیحدہ کر دیا گیا اور ان کی بجائے قاضی خیر اللہ کا تقرر عمل میں لایا گیا ❸۔

❶ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵، ۱۶۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۸۰۔ روضۃ الابرار، ص ۶۱، ۶۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۱۶۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۲۵۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۲ ص ۳۵۸۔

❸ مرآۃ احمدی، ص۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۱۶۔

Marfat.com

۱۷۔ مولانا ابوالقاسم سندھی

مولانا ابوالقاسم بن مفتی داؤد ٹھٹھوی سندھی، علاقہ سندھ کے مشہور فاضل بزرگ تھے۔ فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ درس وافادہ میں سرگرم رہتے تھے۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ اورنگ زیب عالم گیر کو ان کے علم وفضل کی وسعت کا پتا چلا تو اس نے محکمہ دارالقضا میں وکیل شرعی مقرر کر دیا۔

مولانا ابوالقاسم سندھی نے ۱۱۱۳ھ/ ۱۷۰۱ء میں وفات پائی اور ان کے ایک شاگرد مخدوم رحمت اللہ نے ذهب العلم من السند تاریخ وفات نکالی❶۔

۱۸۔ سید ابواللیث رائے بریلوی

سید ابواللیث بن ابوسعید بن محمد ضیا بن آیت اللہ بن شیخ علم اللہ رائے بریلوی۔ یہ سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی ماموں تھے اور فضل وصلاح کے زیور سے آراستہ۔ اپنے جدامجد اور دیار ہند کے معروف بزرگ سید علم اللہ رائے بریلوی کے زاویہ میں رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت وتعلیم کی منزلیں طے کیں۔ اپنے والد مکرم سید ابوسعید بریلوی سے علم فقہ حاصل کیا۔ حصول علم کے بعد طریقت وتصوف کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ منزل بھی باپ کی نگرانی میں طے کی۔ پھر ارشاد وتلقین میں ان کی مسند پر بیٹھے۔ بعد ازاں ارض حجاز کا قصد کیا اور حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔ پھر مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور طویل عرصے تک مدراس میں مقیم رہے۔ وہیں وفات پائی۔ ان کی قبر ساحل سمندر پر کوڑیال بندر میں ہے❷۔

۱۹۔ مفتی ابومحمد سہسوانی

مفتی ابومحمد بن محمد عاقل بن محمد فاضل بن عبدالشکور حسینی مودودی سہسوانی، شیخ صالح اور عالم وفقیہ تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے اوائل میں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں پیدا ہوئے، علمی گھرانے کے فرزند اور دودمان فضل وکمال کے رجل رشید تھے۔ علوم معقول ومنقول اور فروع واصول میں درجہ امامت پر فائز تھے۔ صوری ومعنوی کمالات میں مشہور فی الانام تھے۔ علوم دینیہ، تفسیر وحدیث، فقہ وکلام اور اصول میں مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ احیائے سنت، رد بدعت اور وعظ وارشاد میں نہایت تیز تھے۔ تحصیل علوم وفنون اپنے والد گرامی قدر سید مفتی محمد عاقل سہسوانی سے کی اور پھر ان کی وفات کے بعد ان کی جگہ مسند تدریس پر متمکن ہوئے۔ بہت سے لوگوں کو اپنے علم وعرفان سے متمتع فرمایا۔ عہد محمد شاہ میں پچیس سال تک فرائض شرعی انجام

❶ تحفۃ الکرام، ص ۲۷۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۱۶، ۱۷۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۶۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۔ سید احمد شہید، ص ۵۱۔

Marfat.com

دیتے رہے۔ مفتی ابومحمد کے نام کے کئی شاہی پروانے اور فرامین جن پر شاہی مہر چسپاں ہے، حیات العلما کی روایت کے مطابق جو ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء میں طبع ہوئی، سن مذکور تک ان کے گھر میں موجود تھے۔ ان وثیقوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ ان سے مخلصانہ اور عقیدت مندانہ تعلق رکھتا تھا اور ان کے زہد و تقویٰ اور علم کا معترف تھا۔

مفتی سید ابومحمد سہوانی نے ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء کے پس و پیش وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے خواجہ سید نظر محمد سہوانی مسند افتا پر متمکن ہوئے ❶۔

۲۰۔ مفتی ابوالوفا کشمیری

مفتی ابوالوفا اپنے عصر کے معروف عالم و شیخ تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ مولانا محمد اشرف چرخی اور شیخ امان اللہ بن خیر الدین کشمیری سے اخذ علم کیا اور استخراج مسائل فقہی میں شہرت پائی۔ عنفوان شباب ہی میں کشمیر کے صدر الصدور اکبر یار خاں گوجاری کی وساطت سے مغل حکمران شاہ عالم بہادر کے دربار میں حاضر ہوئے۔ شاہ عالم بہادر نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر کشمیر کے منصب افتا پر مامور کیا اور جاگیر عطا کی۔ بڑی تحقیق و کاوش سے چار ضخیم جلدوں میں مسائل فرعیہ فقہیہ جمع کیے۔ ایک رسالہ خصائص نبویہ ﷺ میں ''انوار النبوۃ'' کے نام سے تصنیف کیا۔ معارضہ و مباحثہ میں بڑے تیز تھے۔ کشمیر کے اس عالم و فقیہ نے ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء میں وفات پائی ❷۔

۲۱۔ شیخ احمد صدیقی امیٹھوی ___ ملا جیون

شیخ احمد بن ابوسعید بن عبید اللہ بن عبدالرزاق بن خاصۂ خدا، دیار ہند کے عالم کبیر اور مشہور فقیہ تھے۔ ملا جیون کے لقب سے مشہور تھے۔ ''جیون'' ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں زندگی۔ شیخ عبداللہ مکی کی اولاد سے تھے۔ منقول ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب حضرت صالح علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے۔ نسباً صدیقی، مذہباً حنفی، اصلاً مکی، نسلاً صالحی اور مولداً امیٹھی تھے۔

ملا جیون منگل کے روز ۲۵ شعبان ۱۰۴۷ھ/۲ جنوری ۱۶۳۸ء کو امیٹھی میں پیدا ہوئے جو صوبہ یوپی کا مشہور شہر ہے۔ علم و فضل کی گود میں تربیت پائی اور اپنے والد مکرم شیخ ابوسعید کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔ نہایت ہونہار طالب علم تھے۔ حافظہ اس درجہ تیز تھا کہ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ پھر کتب درسیہ کی تقدیم و تاخیر کا لحاظ کیے بغیر حصول علم میں مشغول ہوئے۔ تیرہ سال کی عمر کو پہنچے تو والد وفات پا گئے اور اکثر کتب درسیہ شیخ محمد صادق سترکھی سے اور بعض مولانا لطف اللہ کوروی سے پڑھیں۔ بائیس سال کی عمر میں

❶ حیات العلما، ص ۱۸، ۱۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۸، ۱۹۔ روضۃ الابرار، ص ۶۸۔

Marfat.com

فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ پھر اپنے شہر امیٹھی میں سلسلۂ تدریس شروع کر دیا۔ چالیس سال کو پہنچے تو عازم اجمیر ہوئے۔ اجمیر سے دہلی کا قصد کیا۔ کافی عرصہ وہاں مقیم رہے اور درس و افادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ پچپن سال کی عمر میں حرمین شریفین گئے اور فریضہ حج ادا کیا۔ خاصی مدت وہاں اقامت گزین رہے۔ جب واپس ہندوستان آئے تو ساٹھ سال کو پہنچ گئے تھے۔ چھ سال بلاد دکن میں اورنگ زیب عالم گیر کی فوجی چھاونیوں میں مقیم رہے۔ ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں دوبارہ سرزمین حجاز تشریف لے گئے اور مناسک حج ادا کیے۔ ایک مرتبہ والد کی طرف سے اور دوسری مرتبہ والدہ کی جانب سے۔ وہاں نہایت غور و فکر اور متعدد شروح سے مراجعہ و مطالعہ کے بعد صحیحین کا درس بھی دیا۔ ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۵ء میں وطن (امیٹھی) واپس آئے۔

شیخ یٰسین بن عبدالرزاق قادری سے خرقہ تصوف حاصل کیا۔ اب کی مرتبہ دو سال امیٹھی میں اقامت پذیر رہے۔ پھر دہلی چلے گئے۔ اس وقت طلبائے علم کی ایک جماعت ان کے ساتھ تھی۔ کافی عرصہ دہلی میں مقیم رہے۔ اس اثنا میں اورنگ زیب عالم گیر کا بیٹا شاہ عالم دکن سے واپس لوٹا تو ملا جیون نے اجمیر پہنچ کر اس کا استقبال کیا اور اس کے ساتھ لاہور گئے۔ لاہور بھی کافی عرصہ قیام رہا۔ شاہ عالم کی موت کے بعد پھر دہلی چلے گئے اور تادمِ واپسیں وہیں مقیم رہے۔ فرخ سیر سے بھی تقرب رہا۔

ملا جیون سے بے شمار علما و طلبا نے استفادہ کیا۔ لوگوں کی نفع رسانی میں بدرجہ غایت کوشاں رہتے اور بادشاہ سے ان کی سفارشیں کرتے۔ کسی دور میں نہ عوام سے علیحدگی اختیار کی اور نہ درس و افادہ کا سلسلہ منقطع کیا۔ حتی کہ وفات کے روز بھی شام کو باقاعدہ طلبا کو درس دیا۔

اورنگ زیب عالم گیر ملا جیون کا بہت احترام کرتا اور عقیدت سے پیش آتا تھا۔ اسی طرح شاہ عالم بہادر شاہ بھی انھیں لائق اکرام گردانتا اور ان سے حسن ظن کا اظہار کرتا تھا۔

ملا جیون بہت سی عمدہ اور مشہور کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے درج ذیل کتابیں خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔

تفسیر احمدی: اسے تفسیرات احمدیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی یہ تفسیر عربی زبان میں ہے۔ اس میں فقہی انداز سے آیات احکام کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کا آغاز انھوں نے ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء میں کیا تھا، جب کہ صرف سولہ سال کی عمر کے تھے۔ اس زمانے میں مشہور درسی کتاب ''حسامی'' پڑھتے تھے۔ ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں اس کی تکمیل سے فارغ ہوئے۔ اس وقت ''شرح المطالع'' کا درس لیتے تھے۔ یہ کتاب اپنے شہر امیٹھی میں لکھی۔ پھر فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۵ء میں اس کی تصحیح کی۔ اس وقت ان کی عمر ستائیس سال تھی۔ یہ حضرت ممدوح کی مشہور تفسیر ہے، لیکن فاضل مصنف بعض مقامات میں لغزش فکر کا شکار ہو گئے ہیں اور توجیہ مسائل میں کتاب و سنت کے واضح احکام کی پابندی کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

نور الانوار: شیخ ابوالبرکات نسفی (۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) کی تصنیف منار الانوار کو اصول فقہ میں متن متین کی

Marfat.com

حیثیت حاصل ہے۔ ملا جیون نے ''نورالانوار'' کے نام سے اس کی شرح قلم بند کی۔ اس کا پورا نام ''نورالانوار فی شرح المنار'' ہے۔ یہ ایک متداول کتاب ہے اور مدارس میں مروج اور درس نظامیہ میں شامل ہے۔ خاصی ضخیم ہے اور خالص علمی وفنی نوعیت کی کتاب ہے۔ فاضل مصنف نے یہ قیام مدینہ منورہ کے زمانے میں تصنیف کی تھی۔ ان کے اشہب قلم کی تیزی اور فکر وذہن کی بے پناہ روانی کا اندازہ کیجیے کہ اس کی تصنیف کا آغاز انھوں نے یکم ربیع الاول ۱۱۰۵ھ/ ۲۱ اکتوبر ۱۶۹۳ء کو کیا اور ۷ جمادی الاولیٰ ۱۱۰۵ھ/ ۲۵ دسمبر ۱۶۹۳ء کو کتاب مکمل کر لی۔ یعنی صرف دو مہینے سات دن میں اتنی ضخیم کتاب کی تصنیف سے فارغ ہو گئے تھے۔ یہ کتاب علما وطلبا میں بڑی مقبول ہے اور تعلیق وتدریس میں اہل علم نے اس سے بہت اعتنا کیا ہے۔ حلقۂ علما میں جو تلقی وقبولیت اس کتاب کو حاصل ہوئی، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ یہ اب تک باقاعدہ داخل نصاب ہے۔ یہ کتاب بھی عربی میں ہے۔

السوانح: یہ کتاب مولانا عبدالرحمٰن جامی کی لوائح کے انداز کی ہے۔ قیام حجاز کے زمانے کی تصنیف ہے جب کہ وہ دوسری مرتبہ ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء میں وہاں تشریف لے گئے تھے۔

مناقب الاولیا: یہ کتاب مشائخ وعلما کے حالات وسوانح پر مشتمل ہے جو انھوں نے کبرسنی کے دور میں امیٹھی میں لکھی۔ اس میں خود ان کے اپنے حالات وکوائف بھی درج ہیں۔ اس کا تتمہ اپنے بیٹے عبدالقادر کے لیے تحریر کیا۔

آداب احمدی: یہ تصوف کے موضوع پر ہے اور سیر وسلوک کے بعض کوائف وواردات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ملا جیون کی یہ صغرسنی کے دور کی تالیف ہے۔

دیوان حافظ کی طرح ایک دیوان شعری لکھا جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

مثنوی معنوی کے انداز واسلوب میں پچیس ہزار اشعار قلم بند کیے۔

جمعہ اور عیدین کے خطبات تحریر کیے۔ اپنے جد بزرگ وار شیخ عبیداللہ اور بڑے بھائی شیخ علم اللہ امیٹھوی کی تصانیف کو مرتب کیا۔ سفر حجاز پر روانہ ہوئے تو قصیدہ بردہ کے نہج پر ایک قصیدہ لکھا جو دو سو بیس اشعار کو محتوی ہے۔

جب بندرگاہ سورت پہنچے تو ایک عجیب وغریب قلبی کیفیت طاری ہوئی۔ بعد ازاں پہلے قصیدے کی طرح عربی ہی میں انتیس قصیدے اور لکھے۔ اپنے بارے میں یہ باتیں انھوں نے خود اپنی کتاب مناقب الاولیا میں تحریر کی ہیں۔

شیخ احمد امیٹھوی عرف ملا جیون بارھویں صدی ہجری میں دیار ہند کے وہ عالم وفقیہ تھے جو ذہانت وفطانت، اخذ وادراک اور حفظ وسماعت میں نہایت تیز تھے۔ بے شمار علما نے ان سے علم حاصل کیا اور بلند مرتبے کو پہنچے۔ ان کی کتاب ''نورالانوار'' تمام برصغیر کے مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے اور اصول فقہ کی مشہور کتاب ہے۔

Marfat.com

یہ عالم وفقیہ تراسی (۸۳) سال کی عمر پا کر منگل کی رات ۹ ذی القعدہ ۱۱۳۰ھ/ ۲۳ ستمبر ۱۷۱۸ء کو دہلی میں فوت ہوئے اور میر محمد شفیع دہلوی کے زاویہ میں دفن کیے گئے۔ پھر پچاس دن کے بعد ان کی میت کو ان کے شہر امیٹھی میں منتقل کیا گیا اور اپنے مدرسے میں دفن کیا گیا❶۔

۲۲۔ شیخ احمد گوپاموی

شیخ احمد بن ابومنصور الخطیب گوپاموی عالم وفقیہ تھے اور اکابر فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولد ومنشا گوپامؤ ہے۔ ان کے والد گرامی شیخ ابوالمنصور گوپاموی مشہور عالم وقت تھے۔ ان سے اور نامور عالم وفقیہ شیخ احمد امیٹھوی عرف ملا جیون سے اخذ علم کیا اور بحث واشتغال میں مرتبہ کمال کو پہنچے، یہاں تک کہ فقہ واصول اور علوم عربیہ میں ماہر کامل ہوئے۔ ان کے علم وفضل اور مہارت فقہ کا شہرہ اورنگ زیب عالم گیر تک پہنچا تو اس نے ان کو فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل کر لیا۔ ایک روپیہ یومیہ اور کچھ غلہ ان کا وظیفہ مقرر ہوا، جس کا عالم گیر کی طرف سے باقاعدہ ایک تحریری دستاویز کی صورت میں عہد کیا گیا۔ اس دستاویز پر ۱۱/ ذی القعدہ ۱۰۷۸ھ/ ۱۱ اپریل ۱۶۶۸ء کی تاریخ مرقوم ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ان کے لیے یہ وظیفہ شیخ وجیہ الدین گوپاموی کی تصدیق سے مقرر کیا گیا۔

منقول ہے کہ شیخ احمد گوپاموی نے اپنے استاد شیخ احمد امیٹھوی (ملا جیون) کے ساتھ حجاز مقدس کا سفر بھی کیا تھا۔ حج وزیارت سے سعادت اندوز ہوئے اور پھر اسی ارض پاک میں وفات پائی۔ یاد رہے ملا جیون نے دو مرتبہ حجاز کا سفر کیا تھا، پہلی مرتبہ ۱۱۰۳ھ میں جب کہ پانچ سال وہاں اقامت گزیں رہے۔ دوسری مرتبہ ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء میں۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شیخ احمد ابوالمنصور ان کے ساتھ پہلی مرتبہ حجاز گئے یا دوسری مرتبہ۔

شیخ احمد گوپاموی کی تاریخ ولادت اور سن وفات کا علم نہیں ہو سکا❷۔

۲۳۔ شیخ احمد رفاعی

شیخ احمد بن عبدالرحیم بن محمد بن صالح حسنی رفاعی کا شمار معروف رجال فضل وصلاح میں ہوتا ہے۔ ہندوستان کے مشہور شہر سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت حاصل کی۔ گھر میں علم کی شمع روشن تھی اور والد

❶ مناقب الاولیا۔ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۰۶، ۲۰۷۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۶۵، ۳۶۶۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۷۔ سبحۃ المرجان، ص ۷۹۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۶۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۵۔ معجم المطبوعات العربیہ، ج ۲، ص ۱۱۶۴، ۱۱۶۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹ تا ۲۱۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۶۵۸ تا ۶۶۲۔ بزم تیموریہ، ص ۲۲۴، ۲۲۵۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۱۰ تا ۳۱۲۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب، ص ۲۰۴، ۲۰۵۔ رود کوثر ص ۴۷۵، ۴۷۶۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱، ۲۲۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۰۹۔ ۳۱۰۔

Marfat.com

گرامی شیخ عبدالرحیم مشہور علما میں سے تھے، علم فقہ انہی سے حاصل کیا اور جید و متقی علما و فقہا میں سے گردانے گئے۔
شیخ احمد رفاعی نے ۱۲ شعبان ۱۱۱۲ھ/۱۱ جنوری ۱۷۰۱ء کو وفات پائی ❶۔

۲۴۔ شیخ احمد نائطی مدراسی

شیخ احمد بن عبداللہ نائطی کو شیخ نظام الدین مدراسی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء کو پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو حصول علم میں مصروف ہو گئے۔ حدیث و فقہ اور علوم عربیہ وغیرہ کی کتابیں اس دور کے مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ تحصیل علم کے بعد محمد پور کے منصب صدارت پر فائز ہوئے۔ نہایت ذکی، امین و متین اور بہترین اخلاق کے مالک تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سرور الصدور ترجمہ معرب الزبور، فیض الجلیل ترجمہ انجیل، فتح الوہاب المجید ترجمہ القول السدید، فیض الوہاب شرح خلاصۃ الحساب، فارسی زبان میں ہیں۔ انباء الاذکیا تحسیب الطیب والنساء الی سید الانبیا اور وقائع نہضۃ بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں عربی میں ہیں۔ وقائع نہضۃ ناصر جنگ کی لڑائی کے بارے میں ہے جو اس کے بھتیجے مظفر جنگ سے ہوئی۔

شیخ احمد بن عبداللہ نائطی مدراسی نے ۲۲ رمضان المبارک ۱۱۸۹ھ/۱۶ نومبر ۱۷۷۵ء کو وفات پائی ❷۔

۲۵۔ شیخ احمد عثمانی لکھنوی

شیخ احمد بن غلام نقشبند بن عطاء اللہ عثمانی لکھنوی، فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ ان کے والد شیخ غلام نقشبند لکھنوی عالم و فاضل بزرگ تھے۔ لائق بیٹے نے انہی سے اخذ علم کیا۔ پھر شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کی خدمت میں گئے، ان سے بھی استفادہ فرمایا۔ ان کے والد شیخ غلام نقشبند، شیخ پیر محمد سلونی کے مدرسے میں فرائض تدریس انجام دیتے تھے، ان کی وفات کے بعد بیٹے نے یہ مسند سنبھالی۔ مسند مشیخت کو بھی زینت بخشی۔ رسالہ قطبیہ کی روایت کے مطابق بہت سے علما و طلبا ان سے مستفید ہوئے۔ بحر زخار میں مرقوم ہے کہ شیخ احمد عثمانی لکھنوی نے پینتیس سال تک درس و افادہ کا ہنگامہ گرم کیے رکھا۔ شیخ احمد نے ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے شیخ قطب الہدیٰ باپ کی مسند مشیخت پر فائز ہوئے ❸۔

---

❶ حدیقۃ احمدیہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۔

❷ تاریخ النوائط، ص ۵۲۱، ۵۲۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۲، ۲۳۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴ بحوالہ تذکرہ النبلا

Marfat.com

۲۶۔ شیخ احمد ہرکامی

شیخ احمد بن مسعود حسینی ہرکامی، ہدیۃ کے عرف سے معروف تھے اور اپنے دور کے فاضل اور علامہ تھے۔ علم نحو اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ ہرکام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے عم محترم شیخ معز الدین بن شیخ محمد شفیع ہرکامی سے علم حاصل کیا، پھر درس و افادہ کی مسند پر متمکن ہوئے۔ بہت سی کتب و رسائل کے مصنف تھے جن میں ایک رسالہ میراث سے متعلق ہے جو ''الوجیز'' کے نام سے موسوم ہے۔ ایک رسالہ ''حساباً یسیرا'' کے نام سے علم حساب کے بارے میں ہے۔ یہ دونوں رسالے ۱۱۰۲ھ میں تصنیف کیے۔ ان رسالوں کے متن کی شرح بھی سپرد قلم کی۔ ''نادر البیان'' کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ علم نحو کے موضوع پر لکھا۔ یہ رسالہ کبرسنی میں امیر غلام احمد خاں اور اپنے بیٹے خلیل الرحمٰن کے لیے قلم بند کیا تھا۔ ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں ''باہر البیان'' کے نام سے اس کی شرح لکھی۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی رسالے ضبط تحریر میں لائے۔

شیخ احمد ہرکامی نے ۱۹ شوال ۱۱۷۵ھ/۱۳ مئی ۱۷۶۲ء کو وفات پائی ❶۔

۲۷۔ قاضی احمد جون پوری

قاضی احمد بن ابو احمد عثمانی جون پوری مشہور شیخ اور معقولات و منقولات کے جلیل القدر عالم تھے۔ اپنے جد امجد یوسف بن حامد عثمانی جون پوری سے کسب علم کیا اور اصحاب کمال علما کی جماعت میں گردانے گئے۔ اپنے عصر کے نامور عالم اور صاحب فتویٰ بزرگ تھے۔ استحضار مسائل اور جزئیات فقہیہ میں یگانہ روزگار تھے۔ شہر کوڑہ جہان آباد میں عہدہ قضا پر مامور ہوئے اور عمر بھر فرائض قضا انجام دیتے رہے۔ اسی شہر میں وفات پائی۔ جون پور میں ان کی میت لے جائی گئی اور وہاں کے محلّہ چاچک پور میں دفن کیے گئے ❷۔

بارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم کی ولادت اور وفات کی تاریخ کا پتا نہیں چل سکا۔

۲۸۔ حاجی احمد دہلوی

حاجی احمد بن ابو احمد دہلوی فاضل کبیر اور محدث جلیل تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان سے علم حدیث کی تکمیل کی۔ پھر شیخ فخر الدین بن نظام الدین دہلوی سے منسلک ہوگئے۔ طویل عرصے تک ان کی صحبت و ملازمت اختیار کیے رکھی۔ ان سے اخذ طریقت بھی کیا۔ بعد ازاں عازم حجاز ہوئے اور حج و زیارت سے بہرہ مند ہو کر مراجعت فرمائے ہند ہوئے ❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۵۔

❷ تجلی نور ج ۲، ص ۴۶۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۱۷۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۵

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۵

Marfat.com

۲۹۔ قاضی احمد حماد فتح پوری

قاضی احمد حماد بن جان محمد بن محمد دولت انصاری سہالوی ثم فتح پوری اپنے وقت کے شیخ اور عالم وفقیہ تھے اور بارھویں صدی ہجری میں دیار ہند کے فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ فتح پور میں پیدا ہوئے۔ وہیں تربیت پائی اور اپنے عم محترم علامہ کمال الدین بن محمد دولت فتح پوری سے علم حاصل کیا۔ ان کے والد قاضی جان محمد فتح پور کے منصب قضا پر متعین تھے، ان کی وفات کے بعد فاضل بیٹے (قاضی احمد حماد) کو ان کی جگہ قاضی مقرر کیا گیا۔ نیک اور صاحب ورع عالم دین تھے۔ ستر سال سے زائد عمر پا کر فوت ہوئے ❶۔

۳۰۔ شیخ احمد عبد الحق لکھنوی

شیخ احمد عبد الحق بن محمد سعید بن شیخ شہید قطب الدین محمد انصاری سہالوی لکھنوی، ۱۹ یا ۲۷ رجب ۱۱۰۳ھ/ ۲۷ مارچ یا ۴ر اپریل ۱۶۹۲ء کو قصبہ سہالی میں پیدا ہوئے۔ اسی تاریخ کو ان کے جد امجد شیخ قطب الدین محمد انصاری نے وفات پائی تھی۔ کچھ بڑے ہوئے تو لکھنؤ آئے اور اپنے عالم و فاضل چچا شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے، ان سے تحصیل علم کی اور اپنے تمام اقران و معاصرین سے فوقیت لے گئے۔ درس وافتا کی مسند پر فائز ہوئے اور اپنے استاد شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کی زندگی ہی میں اکابر علما میں شمار ہونے لگے۔ اس عصر کے اکابر فضلا اور علمائے متبحرین و مشہورین میں سے تھے۔

شیخ احمد عبد الحق لکھنوی تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور تحشیہ نویسی میں بھی ماہر تھے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی محب اللہ عثمانی بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) کی منطق کی مشہور کتاب ''سلم العلوم'' کی مبسوط و مفصل شرح لکھی۔ میر زاہد کے حاشیہ الرسالہ پر حاشیہ تحریر کیا۔ نیز میر زاہد نے جلال الدین دوانی کی ''شرح التہذیب'' اور ''شرح المواقف'' پر جو حواشی لکھے ہیں ان پر حواشی قلم بند کیے۔

شیخ احمد عبد الحق انصاری لکھنوی نے ۹ ذی الحجہ ۱۱۸۷ھ/ ۲۱ فروری ۱۷۷۴ء کو لکھنؤ میں وفات پائی ❷۔

۳۱۔ قاضی احمد علی سندیلوی

قاضی احمد علی بن فتح محمد سندیلوی اپنے دور کے شیخ اور علامہ تھے۔ بالخصوص منطق اور فلسفے کے ماہرین میں سے تھے۔ صوبہ یوپی کے مشہور شہر سندیلہ میں پیدا ہوئے۔ وہیں تربیت پائی اور اپنے سسر شیخ حمد اللہ بن شکر اللہ سندیلوی (متوفی ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء) سے (جو دیار ہند کے بہت بڑے ماہر منطق و حکمت تھے) علم حاصل

❶ اغصان الانساب ص۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۷۔

❷ تذکرۂ علمائے فرنگی محلی، ص ۲۳ تا ۲۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۸۔

Marfat.com

کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سندیلہ کی مسند قضا پر متعین ہوئے، ہر وقت مطالعہ کتب میں مشغول اور تدریس طلبا میں مصروف رہتے۔ منطق وحکمت کی بعض درسی کتابوں پر تعلیقات وحواشی تحریر کیے۔ مثلاً ''الرسالہ'' پر سید زاہد کے حاشیہ پر حاشیہ لکھا۔ شرح تہذیب اور شرح المواقف پر بھی حواشی تحریر کیے۔ قاضی محبّ اللہ بہاری کی سلم العلوم کی ایک بسیط ومفصل شرح قلم بند کی۔ میراث کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا۔

ان شروح وتعلیقات کے علاوہ قاضی احمد علی سندیلوی نے تدریسی خدمات بھی انجام دیں اور بہت سے علما وطلبا نے ان سے مختلف کتابوں کا درس لیا۔ ان کے شاگردوں میں شیخ حمد اللہ سندیلوی کے بیٹے شیخ حیدر علی شامل ہیں۔

قاضی احمد علی سندیلوی نے ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء میں سندیلہ میں وفات پائی ❶۔

۳۲۔ شیخ احمد اللہ خیر آبادی

شیخ احمد اللہ بن صفت اللہ حسینی رضوی خیر آبادی، اپنے علاقے اور عصر کے عالم کبیر تھے۔ ان کا شمار فقہ، اصول، کلام، اور علوم عربیہ کے ماہرین میں ہوتا ہے۔

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر خیر آباد میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت حاصل کی، صغرسنی ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ اپنے والد محترم شیخ صفت اللہ سے پڑھتے رہے، ان سے علم نحو، بعض علوم عربیہ اور فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ حدیث بھی ان ہی سے پڑھی۔ پھر فتح پور کا عزم کیا۔ وہاں علامہ کمال الدین بن محمد دولت فتح پوری (متوفی ۱۴ محرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵ اگست ۱۷۶۱ء) کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے اور مختلف علوم میں ان سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں اپنے شہر خیر آباد کو مراجعت کی اور درس وافادہ میں مصروف ہو گئے۔ ان سے بہت سے علما وطلبا نے تحصیل کی۔

شیخ احمد اللہ خیر آبادی نے یکم رجب ۱۱۶۷ھ/۲۴ اپریل ۱۷۵۴ء کو خیر آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

۳۳۔ مولانا احمد اللہ پانی پتی

مولانا احمد اللہ پانی پتی قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے بیٹے اور شاگرد اور مرزا مظہر جان جاناں دہلوی کے مرید تھے۔ حدیث وفقہ کے ماہر اور عابد وزاہد تھے۔ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء کو عالم جوانی میں انتقال کیا ❸۔

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۸۔

❷ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۸۹ در ترجمہ حاجی صفت اللہ خیر آبادی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۹۔ مقامات مظہری، ص ۶۸۔

❸ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۶۸۷۔

Marfat.com

۳۴۔ شیخ اسماعیل غوری پشاوری

شیخ اسماعیل غوری نقشبندی پشاوری مشہور مشائخ میں سے تھے اور اپنے زمانے کے عالم اور زاہد وفقیہ بزرگ تھے۔ سیر وسیاحت کے شائق تھے اور علما و مشائخ سے ملاقات اور استفادے کو اپنے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔ بہت سے طویل سفر کیے۔ متعدد ممالک میں گئے اور وہاں کے اصحاب علم اور ارباب تصوف سے مستفید ہوئے۔ پہلے حجاز مقدس کا عزم کیا اور حج و زیارت کی نعمت حاصل کی۔ وہاں سے بغداد، بخارا، کربلا، بسطام اور یمن گئے۔ ان علاقوں اور ملکوں میں مشائخ کرام کی ایک بڑی جماعت سے ملے اور ان سے اخذ فیض کیا۔ پھر ہندوستان کو معاودت کی اور شیخ سعدی بخاری لاہوری (متوفی ۳ ربیع الاول ۱۱۰۸ھ/ ۲۱ ستمبر ۱۶۹۶ء) سے تحصیل طریقت فرمائی اور ان سے منسلک ہوئے۔

شیخ اسماعیل غوری تجارت کرتے اور اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔ ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء کو پشاور میں فوت ہوئے [1]۔

۳۵۔ شیخ اشرف قلی جائسی

شیخ اشرف قلی بن عبدالسبحان بن مبارک بن جلال بن مبارک اشرفی جائسی فاضل وعلامہ تھے اور فقہ واصول، کلام اور علوم عربیہ کے علمائے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ عمر بھر سلسلۂ درس وافادہ جاری رکھا۔ شیخ نظام الدین بن قطب الدین سہالوی لکھنوی نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور فقہ واصول اور علم کلام کی تحصیل کی [2]۔

شیخ اشرف قلی جائسی کی ولادت ووفات کی تاریخ کا پتا نہیں چل سکا۔

۳۶۔ شیخ افضل راجیندروی

شیخ افضل کا سلسلہ نسب یہ ہے: افضل بن امین بن فاضل بن ابراہیم بن خوندمیر حسینی رفاعی راجیندروی، معروف علما وصلحا اور نامور مشائخ میں سے تھے۔ مولد ومنشا راجیندری ہے، جو مدراس کے علاقہ ارکاٹ میں واقع ہے۔ شیخ شیخن اورنگ آبادی سے اخذ طریقت کیا اور ایک مدت تک ان سے وابستہ رہے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں مشہور کتابیں مرآۃ العارفین، معدن الجواہر، تحفۃ الصالحین، شرح فقہ الاکبر اور شرح نام حق ہیں۔ موخر الذکر دو کتابیں مسائل فقہ سے متعلق ہیں۔ ایک رسالہ وحدت الوجود کے بارے میں لکھا۔ مثنوی

---

[1] خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۶۵۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۳، ۳۴۔

[2] تاریخ جائس، نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۴۔

Marfat.com

معنوی، فصوص الحکم، لوائح اور لمحات کا درس بڑے شوق اور وجد آفرین انداز میں دیتے تھے۔ ۱۵ رمضان ۱۱۹۳ھ/ ۲۶ ستمبر ۱۷۷۹ء کو راجیندری میں فوت ہوئے❶۔

۳۷۔ مولانا اکبر یار کشمیری

مولانا اکبر یار کشمیری دیار کشمیر کے شیخ و فاضل اور علوم عربیہ میں یگانہ تھے۔ ان کے والد مولانا خیر الدین کشمیری عالم وقت تھے، ان سے اخذ علم کیا۔ پھر عازم دہلی ہوئے۔ وہاں شیخ القراء عبد الخالق دہلوی سے قرأت و حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اخذ طریقت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی اور دیگر مشائخ سے کیا۔ ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء میں وفات پائی❷۔

۳۸۔ شیخ اکرم الدین گجراتی

شیخ اکرم الدین بن محی الدین بن قاضی عبدالوہاب احمد آبادی گجراتی، فاضل بزرگ تھے اور معقول و منقول کے ماہر تھے۔ مولد و منشا احمد آباد ہے۔ شیخ نورالدین بن محمد صالح گجراتی سے اخذ علم کیا۔ اپنے والد شیخ محی الدین گجراتی کی وفات کے بعد ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۹ء میں گجرات کے منصب صدارت پر متمکن کیے گئے اور پھر تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم نے ان کو سیف الاسلام خاں کا لقب دیا تھا۔ ان کی قابل ذکر اور بہترین خدمات میں سے احمد آباد کا مدرسہ ہدایت بخش ہے۔ اس کی تعمیر پر انھوں نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے خرچ کیے۔ ۱۱۰۲ھ/ ۱۶۹۱ء کو اس کی تعمیر کا آغاز کیا اور ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء کو تکمیل ہوئی۔ بعض لوگوں نے تکمیل کی تاریخ قرآن کی اس آیت سے نکالی۔

اسس علی التقوی من اول یوم۔

بعد ازاں ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء کو اس مدرسے کی عمارت میں مزید اضافہ کیا۔ ایک صاحب نے اس کی ان الفاظ میں تاریخ نکالی: مدرسة فیها الهدی للغلمین۔

طلبا کے مصارف کی غرض سے اعمال پٹن میں مدرسے کے لیے دو گاؤں وقف کیے اور ایک گاؤں نواح جاناپانیر میں وقف کیا۔ اس طرح شیخ اکرم الدین گجراتی نے مدرسہ ہدایت بخش کے نام پر تین گاؤں وقف کیے اور کثیر رقم اس کی تعمیر پر خرچ کی۔ یہ ان کی بہت بڑی دینی، علمی اور اسلامی خدمت تھی❸۔

---

❶ محبوب ذی المنن، ص ۹۶ تا ۹۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۵۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۵۔ روضۃ الابرار، ص ۶۲، ۶۳۔

❸ مرآۃ احمدی، ص ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۔

Marfat.com

۳۹۔ شیخ اللہ بخش گوپاموی

شیخ اللہ بخش بن عبدالحی بن عبدالقادر عمری قنوجی ثم گوپاموی عالم و فاضل اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ ہمیشہ علما وطلبا کو پڑھانے اور درس و افادہ میں مصروف رہتے ❶۔

۴۰۔ شیخ اللہ داد گوپاموی

شیخ اللہ داد گوپاموی بہت بڑے عالم، نہایت متقی اور اللہ کے صالح بندے تھے۔ شیخ اللہ بخش گوپاموی کے بیٹے تھے۔ اصول بزدوی پر مفید تعلیقات قلم بند کیں ❷۔

۴۱۔ شیخ امام الدین جون پوری

شیخ امام الدین بن سعد الدین بن نور الدین جعفر جون پوری ۱۰۷۷ھ/ ۱۶۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ بعض کتب درسیہ اپنے جدامجد شیخ نور الدین جعفر سے اور اکثر اپنے والد گرامی شیخ سعد الدین سے پڑھیں۔ توضیح تلویح کا درس شیخ محمد افضل عباسی الہ آبادی سے لیا۔ کسب طریقت بھی انھی سے کیا، یہاں تک کہ اپنے علاقے کے عالم وفقیہ اور فنون عربیہ اور علوم دینیہ کے ماہر قرار پائے۔ شیخ محمد افضل عباسی الہ آبادی سے انھیں انتہائی تعلق خاطر تھا۔ سال کے بارہ مہینوں کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، چھ مہینے جون پور میں قیام کرتے اور چھ مہینے شیخ محمد افضل کی خدمت میں الہ آباد رہتے۔ شیخ محمد یحییٰ بن محمد امین عباسی الہ آبادی (صاحب وفیات الاعلام) سے بھی رابطہ رکھتے تھے۔

شیخ امام الدین جون پوری، شاعر بھی تھے۔ انھوں نے فارسی میں نہایت اچھے شعر کہے۔ علاوہ ازیں عابد و زاہد، صلاح و تقویٰ کے زیور سے آراستہ اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ماہ رجب ۱۱۲۶ھ/ جولائی ۱۷۱۴ء میں فوت ہوئے ❸۔

۴۲۔ مولانا امان اللہ کشمیری دہلوی

مولانا امان اللہ بن خیر الدین کشمیری شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ صغرسنی ہی میں علومِ درسیہ سے فراغت حاصل کر لی تھی اور محبوب اقران ہو گئے تھے۔ دیار کشمیر کے کبار علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حسن اخلاق کے مالک

---

❶ تذکرۃ الانساب، مصطفےٰ علی خان گوپاموی، ص ۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۶۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۔

❸ وفیات الاعلام، ص ۔ تجلی نور، ج ۲، ص ۵۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۲۰، ۲۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۷، ۳۸۔

Marfat.com

تھے۔ کشمیر میں درس وافادہ کی مسند بچھائی اس لیے کشمیری کہلائے۔ پھر عازم دہلی ہوئے اور وہاں عہدہ صدارت پر متعین کیے گئے۔ لہٰذا دہلوی مشہور ہوئے۔ شیخ الاسلام کے منصب سے سرفراز ہوئے۔ کتب درسیہ پر تعلیقات و حواشی تحریر کیے اور اپنے وقت کے جید علما میں گردانے گئے۔ ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء میں پانی پت اور کرنال کے درمیان نادر شاہ درانی سے جو معرکۂ قتال گرم ہوا تھا، اس میں قتل کیے گئے ❶۔

۴۳۔ حافظ امان اللہ بنارسی

حافظ امان اللہ بن نور اللہ بن حسین بنارسی عالم کبیر اور شیخ وقت تھے۔ فقہ واصول اور علم کلام کے ماہر تھے۔ مولد ومنشا بنارس ہے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور حصولِ علم کی غرض سے عازم سفر ہوئے۔ کتب درسیہ شیخ محمد ماہ دیوکامی، شیخ قطب الدین حسینی شمس آبادی اور دیگر علما واساتذہ سے پڑھیں۔ پھر اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں لکھنؤ کی مسند صدارت پر مامور ہوئے۔ صاحب ''سلم'' اور ''مسلم'' قاضی محب اللہ بہاری سے ان کے مباحث ومناظرات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مصنف وشارح بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں اصول فقہ کے موضوع پر ایک کتاب ''المفسر'' ہے۔ پھر ''المحکم الاصول'' کے نام سے اس کی شرح سپرد قلم کی۔ تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا۔ علاوہ ازیں عضدی، تلویح، حاشیۃ القدیم، شرح المواقف، شرح عقائد (جلال الدین دوانی) اور رشیدیہ (شیخ محمد رشید جون پوری) پر حواشی اور شروح لکھے۔ صاحب ''الافق المبین'' سید محمد باقر حسینی اور صاحب ''الشمس البازغہ'' علامہ محمود جون پوری پر حکمت وفلسفہ کے بعض مسائل میں انھوں نے محاکمہ تحریر کیا۔ نیز شیخ محبّ اللہ الہ آبادی کی ''تسویہ'' کی شرح قلم بند کی۔

حافظ امان اللہ بنارسی نے ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۱ء کو بنارس میں وفات پائی ❷۔

۴۴۔ مولانا امین الدین کنتوری

مولانا امین الدین بن مولانا بدیع الدین بن عطاء اللہ بن محمد شریف حسینی کنتوری، عالم وفقیہ اور اللہ کے صالح بندے تھے۔ کنتور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی، شیخ نظام الدین سہالوی سے اخذ علم اور کسب طریقت کیا۔ شیخ صفت اللہ حسینی خیر آبادی محدث سے سند حدیث حاصل کی۔ اپنے والد مولانا بدیع الدین کنتوری کی ایک کتاب عطاء الایمان کی شرح لکھی۔

❶ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲، ۴۴۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۸، ۳۹۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۷۔ روضۃ الابرار، ص ۶۰، ۶۱۔

❷ سبحۃ المرجان، ص ۷۸۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۷۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۶، ۴۳۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۹۔ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۰۲، ۲۰۳۔ تذکرہ مشائخ بنارس، ص ۳۹، تا ۴۲۔

Marfat.com

مولانا امین الدین کنتوری کے تین بیٹے تھے اور تینوں عالم تھے۔ ان کے نام یہ تھے: فائق علی، عبد الواسع، عبد الجامع ❶۔

۴۵۔ مولانا امین الدین مدراسی

مولانا امین الدین بن سیف الدین بن نظام الدین صدیقی مدراسی، اہل کمال بزرگ تھے اور مدراس کے علمائے مشاہیر میں گردانے جاتے تھے۔ ۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے اور بعض کتب درسیہ اپنے علاقے کے نامور اساتذہ سے پڑھیں۔ پھر لکھنؤ گئے، وہاں مولانا نظام الدین بن قطب الدین انصاری سہالوی کا ہنگامہ درس جاری تھا اس میں شامل ہو کر اخذ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وطن کو مراجعت کی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا، جن میں شیخ محمد غوث بن ناصر الدین شافعی مدراسی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

مولانا امین الدین مدراسی اپنے علاقے اور زمانے کے جید عالم تھے۔ مروجہ علوم و فنون پر گہری نظر رکھتے تھے۔ کثیر الدرس اور کثیر الفوائد بزرگ تھے۔ ۶ رمضان المبارک ۱۱۹۵ھ/ ۲۶ راگست ۱۷۸۱ء کو رامنات میں فوت ہوئے اور حظیرہ امان اللہ خاں میں بلدۂ ویلور میں دفن کیے گئے ❷۔

۴۶۔ مولانا امین الدین جون پوری

مولانا امین الدین بن غیاث الدین محمود عمری جون پوری۔ اپنے علاقے اور عہد کے شیخ و فاضل بزرگ تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ ۲۵ رجب ۱۰۷۲ھ/ ۶ مارچ ۱۶۶۲ء کو جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بعض درسی کتابیں صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری کے بیٹے شیخ محمد ارشد جون پوری سے پڑھیں اور اکثر کتابوں کی تکمیل دیگر اساتذۂ عصر سے کی۔ بحث و اشتغال میں درجہ کمال کو پہنچے۔ فقہ اور دیگر علوم دینیہ کے علاوہ ہیئت، ہندسہ، حساب، اصطرلاب اور مواریث وغیرہ بہت سے فنون و مباحث میں مہارت رکھتے تھے۔ حصول علم کے بعد مسند تدریس پر فائز ہوئے۔

مولانا امین الدین جون پوری سے بہت سے علما و طلبا نے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں شیخ غلام رشید بن محب اللہ جون پوری بھی شامل ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، ان کی تصانیف میں ایک کتاب ''وسیلۃ النجات'' ہے، جسے تذکرۂ مشائخ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں محمد رشید جون پوری سے لے کر شیخ معین الدین اجمیری تک کے حالات مندرج ہیں۔ ایک کتاب ''المقتبیات'' ہے جو شیخ عبد الحق محدث

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۹، ۴۰ بحوالہ بحر زخار۔

❷ حدیقۃ المرام، ص۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۰۔

Marfat.com

دہلوی کی ''اشعۃ اللمعات'' کی تلخیص ہے۔ایک ''منتخبات گنج ارشدی'' ہے۔''شرح المعمول'' پر حاشیہ سپردقلم کیا۔ان کے علاوہ اور بھی بعض کتب و رسائل تحریر کیے۔

مولانا امین الدین جون پوری ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء تک زندہ تھے ❶۔

۴۷۔مولانا انکنون جون پوری

مولانا انکنون صدر جہان حنفی جون پوری، شیخ اور عالم کبیر تھے۔معقولات و منقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔جون پور کے منصب صدارت پر فائز ہوئے اور نصف عمر تک یہ خدمت انجام دی۔صالحیت، تدین اور عفت میں یگانہ تھے۔قضا کے سلسلے میں بہترین کردار اور شہرت کے مالک تھے۔مباحثہ و مناظرہ سے انتہائی دلچسپی رکھتے تھے اور درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے۔خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا ❷۔

۴۸۔مولانا اوغلان خراسانی

مولانا اوغلان حسینی خراسانی مسلکا حنفی تھے۔شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے عالم تھے۔خراسان کے باشندے تھے۔اپنے تلمیذ غازی الدین خاں کے ساتھ ہندوستان آئے اور اورنگ زیب عالم گیر سے تقرب پیدا کیا۔عالم گیر نے ان کی علمی قابلیت سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے کام بخش کا معلم مقرر کر دیا تھا۔اس کے بعد ارتقا و ترقی کی مختلف منزلیں طے کرنے لگے۔۱۰۹۶ھ/ ۱۶۸۵ء میں عرض مکرر کا منصب عطا ہوا اور سیادت خاں کے لقب سے سرفراز کیے گئے۔پھر دیوانِ خاص کے ناظر بنا دیے گئے۔بعد ازاں ہندوستان کی صدارتِ عظمیٰ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے، لیکن بہت تھوڑے دن اس منصب پر متمکن رہے اور ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء میں وفات پا گئے ❸۔

—— ب ——

۴۹۔شیخ باسط علی قلندر الہٰ آبادی

شیخ باسط علی قلندر کا سلسلۂ نسب یہ ہے: باسط علی بن محمد ماہ بن فیروز بن سالم بن قاسم بن ناصر بن بہاء الدین نقوی نیساپوری کنتوری ثم الہ آبادی۔شیخ باسط علی اعمال الہ آباد کے ایک گاؤں بدگدھا میں پیدا

❶ تذکرۃ العلما، ج ۲،ص ۹۷۔تاریخ شیراز ہند جون پور،ص ۴۸۷۔نزہۃ الخواطر، ج ۶،ص ۴۰، ۴۱۔

❷ تذکرۃ العلما، ج ۲،ص ۹۷۔تاریخ شیراز ہند جون پور،ص ۴۸۷۔نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۴۱۔

❸ مآثر عالم گیری،ص ۲۷۲، ۵۱۸۔نزہۃ الخواطر، ج ۶،ص ۴۱۔

Marfat.com

ہوئے۔ چند ابتدائی کتابیں پڑھیں اور شیخ اللہ دیہ احمد لاہر پوری سے بیعت ہو گئے۔ ایک سال ان کی خدمت میں رہے۔ پھر شیخ نے ان کو حصول علم کا حکم دیا اور وہ ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۲ء میں خیر آباد چلے گئے۔ وہاں شیخ صفت اللہ خیر آبادی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے۔ پانچ سال ان کے حلقۂ تلمذ میں رہے۔ ان سے ہدایۃ الفقہ، شرح المواقف مع حاشیہ سید زاہد اور باقی کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ سند حدیث بھی انہی سے لی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن الہ آباد تشریف لے گئے اور درس وافادہ کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔ ان سے بہت سے علما وطلبا نے استفادہ کیا، جن میں شیخ عبدالقادر عمادی جون پوری، شیخ محمد کاظم قلندر کا کوروی اور خلق کثیر شامل ہے۔

شیخ باسط علی الہ آبادی مشہور مشائخ عصر، معروف علمائے وقت اور نامور فقہا میں سے تھے۔ انھوں نے ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ/۲۳ نومبر ۱۷۸۲ء کو الہ آباد میں وفات پائی❶۔

۵۰۔ شیخ بدرالدین جون پوری

شیخ بدرالدین جون پوری اپنے دور کے نامور عالم وفقیہ تھے۔ شیخ کبیر الدین انصاری کی اولاد سے تھے، جن کا سلسلۂ نسب شیخ الاسلام اسماعیل تک منتہی ہوتا ہے۔ علم طریقت شیخ پیر محمد لکھنوی سے حاصل کیا۔ تصوف وطریقت اور شعر وشاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ ان کے اشعار میں سے چند شعر یہ ہیں ؎

گفتم بطبیب از درد نہاں　　گفتا کہ زغیر دوست بر بند زباں
گفتم کہ غذا گفت ہمیں خون جگر　　گفتم پرہیز گفت از ہر دو جہاں

قومی ہمہ نیستی زہستی نگر ند　　جمعی ہستی ز نیستی باز خرند
آنہاں کہ زہست ونیست آسان گزرند　　بینا تر و آشنا تر و آسودہ تراند

شیخ بدرالدین جون پوری نے یکم ربیع الاول ۱۱۱۱ھ/ ۱۷ اگست ۱۶۹۹ء کو بہتر سال عمر پا کر جون پور میں انتقال کیا❷۔

۵۱۔ شیخ بدر رفاعی

شیخ بدر بن غالب بن یعقوب بن شعبان حسینی رفاعی، گلبرگہ کے رہنے والے تھے۔ صالح عالم دین تھے۔ محدث وفقیہ، عارف وصوفی اور کمالاتِ ظاہری وباطنی سے متصف تھے۔ ۱۴ شعبان ۱۱۰۸ھ/ ۲۶ فروری ۱۶۹۷ء کو گلبرگہ (ہندوستان) میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے❸۔

❶ اصول المقصود، ص ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۳۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۴، ۴۵۔ بحوالہ گنج ارشدی۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۵، ۴۶۔ بحوالہ مہر جہاں تاب۔

Marfat.com

۵۲۔ شیخ بدر عالم ساداموی

شیخ بدر عالم بن محمد باقر قدوائی ساداموی نے بعض کتب درسیہ حافظہ محمد قاسم بن عبدالکریم بجنوری سے اور زیادہ تر دیگر اساتذہ سے پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حافظ محمد قاسم سے اخذ طریقت کیا اور ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہے۔ پھر خود مسند ارشاد بچھائی۔ فقیہ، مجاہد، مرتاض اور صاحب کشوف و کرامات تھے۔ شیخ غلام یحییٰ بہاری اور دوسرے حضرات نے ان سے فیض حاصل کیا۔ ۴ شعبان ۱۱۸۰ھ/ ۵ جنوری ۱۷۶۷ء کو ساداموئیں وفات پائی جو ہندوستان کے صوبہ یوپی میں ایک قریہ ہے ❶۔

۵۳۔ شیخ بہلول برکی

شیخ بہلول برکی جالندھری، فاضل بزرگ تھے اور علاقہ جالندھر کی اس افغان برادری سے تعلق رکھتے تھے جو برکی کہلاتے ہیں۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ اس زمانے میں جالندھر کو دیار پنجاب میں علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور وہاں سید عبدالرشید، سید کبیر اور سید عتیق اللہ کے درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے، شیخ بہلول نے انہی سے استفادہ کیا۔ پھر شیخ محمد سعید بن محمد یوسف انبالوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے اخذ طریقت کیا اور مستفیض ہوئے۔ بعد ازاں لاہور کا قصد کیا اور شیخ بلاق لاہوری سے طریقہ قادریہ میں حصولِ فیض کیا۔

شیخ بہلول جالندھری کو تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں فوائد الاسرار، احوال نامہ، شرح دیوان حافظ شامل ہیں۔ شیخ بہلول برکی شاعر بھی تھے۔ ان کا ایک دیوان شعری موجود ہے۔ ۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۷ء کو جالندھر میں فوت ہوئے ❷۔

ت

۵۴۔ مفتی تابع محمد لکھنوی

مفتی تابع محمد بن مفتی محمد سعید حسینی لکھنوی، شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو و نما پائی۔ کچھ کتابیں اپنے والد مفتی محمد سعید سے پڑھیں۔ پھر شیخ احمد بن ابوسعید امیٹھوی معروف بہ ملا جیون کے

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۶، بحوالہ بحر زخار۔

❷ خزینۃ الاصفیا، ص ۴۹۸۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۳۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۸۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی بہ ضمن لفظ برکی۔

Marfat.com

سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ علم و فضل میں ماہر کامل ہوئے اور اللہ نے فتویٰ و تدریس کی صلاحیت سے بہرہ یاب کیا۔ ان کے والد مفتی محمد سعید حسینی لکھنؤ کے منصب قضا پر متعین تھے۔ والد کی وفات کے بعد مفتی تاج محمد نے یہ مسند سنبھالی۔ فقہ حنفی میں عبور حاصل تھا، ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء میں اس موضوع پر "السراج المنیر" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

منك الهداية و اليك النهاية يا من نوّر بعلم الفقه قلوب اولی الالباب۔

سید عبدالحی حسنی لکھنوی تحریر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہے[1]۔

۵۵۔ میر تاجو کشمیری

میر تاجو حسینی کشمیری، حنفی مسلک کے حامل تھے۔ شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ خواجہ حیدر چرخی کشمیری اور خواجہ محمد ٹوپی گر کشمیری کے شاگرد تھے۔ طویل عمر پا کر ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں انتقال کیا۔ زندگی کے آخری دم تک فقر و قناعت کی کیفیت طاری رہی اور علوم دینیہ کی تدریس میں مشغول رہے[2]۔

ـــــ ج ـــــ

۵۶۔ مرزا جان جاناں دہلوی

علمی اور فکری لحاظ سے زرخیز اور پُر ثروت ارض ہند نے جن نامور اصحاب علم اور مقتدر ارباب کمال کو جنم دیا، ان میں مرزا جان جاناں جو تاریخ میں مرزا مظہر جان جاناں کے نام سے معروف ہیں، ایک رفیع المرتبت عالم دین تھے۔ ان کے والد کا اسم گرامی مرزا جان، دادے کا نام عبدالسبحان اور پردادے کا نام محمد زمان علوی تھا۔ مرزا نسباً علوی تھے۔ انیس واسطوں سے ان کا سلسلۂ نسب محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں وہ اس برصغیر کے شیخ و امام، عالم و محدث، فقیہ اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔

مرزا جان جاناں کے والد مرزا جان مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کے منصب دار تھے اور دکن میں متعین تھے۔ اورنگ زیب دکن میں تھا کہ انھوں نے ملازمت شاہی ترک کر دی اور تمام ساز و سامان غربا و فقرا میں تقسیم کر دیا۔ پچیس ہزار روپے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے بچا کر رکھے تھے۔ ایک دوست کو ضرورت پڑی تو وہ

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۹۔

[2] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۹۱۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۵۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۰۔

Marfat.com

اس کو دے دیے۔ مرزا جان حکومت کے منصب و جاہ سے الگ ہونے کے بعد اکبر آباد (آگرہ) جا رہے تھے کہ علاقہ مالوہ میں کالا باغ کے مقام پر قیام کیا اور وہیں جمعہ کی شب ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۱۱ھ/۲۰ فروری ۱۷۰۰ء (ایک روایت کے مطابق ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۲ء) کو ان کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی۔ اس کی اطلاع بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کو پہنچی تو اس نے نومولود کا نام مرزا جان کے نام کی مناسبت سے جانِ جان رکھا اور کہا۔

پسر جانِ پدرمی باشد ازیں وجہ نامش جانِ جان مقرر کرویم

(بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے اس لیے ہم نے ان کا نام جانِ جان قرار دیا۔)

جانِ جان بعد میں بدل کر جان جاناں ہو گیا۔ اس نام نے اتنی شہرت پائی اور اس درجہ مقبولیت حاصل کی کہ خود مرزا صاحب بھی اپنے خطوط میں یہی نام (یعنی جانِ جاناں) لکھنے لگے۔ شمس الدین حبیب اللہ ان کا لقب تھا اور مظہر تخلص کرتے تھے۔ پورا نام شمس الدین حبیب اللہ مرزا مظہر جانِ جاناں تھا۔

مرزا جانِ جاناں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ آغوش پدری میں تربیت پائی۔ شفیق باپ نے ہونہار بیٹے کو آداب و اخلاق، فنون سپاہ گری اور دیگر مروجہ علوم و فنون کی تعلیم دی۔ چند فارسی رسائل بھی پڑھائے۔

مرزا صاحب نے قرآن مجید مع قرات و تجوید کے قاری عبد الرسول دہلوی سے پڑھا جو شیخ القرا عبد الخالق مصری کے تلمیذ تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچے تو والد وفات پا گئے۔ ان کے بعد حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تحصیل کی۔ ان علوم سے فارغ ہونے کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور بے شمار لوگوں کو مستفید فرمایا۔ پھر طریقت و تصوف کی طرف عنان توجہ مبذول کی اور نقشبندی سلسلے کے ایک بزرگ شیخ نور محمد بدایونی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ چار سال ان سے کسب فیض کرتے رہے اور ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء میں خرقہ و اجازت سے بہرہ مند ہوئے۔ شیخ نور محمد بدایونی سے مرزا صاحب کو انتہائی عقیدت تھی۔ ان کی وفات کے بعد ایک اور بزرگ حافظ سعد اللہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ بارہ سال ان کی خدمت میں رہے۔ ان کے انتقال کے بعد شیخ محمد عابد سنامی سے بیعت ہوئے۔ ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں مرزا ممدوح نے خود سلسلۂ رشد و ہدایت کا آغاز کیا۔

خود نوشت حالات:

مرزا صاحب نے تین مقامات پر اپنے مختصر حالات لکھے ہیں۔ ایک جگہ کسی صاحب کے خط کے جواب میں، دوسرے اپنے فارسی دیوان کے دیباچے میں اور تیسرے میر سید غلام علی آزاد بلگرامی کی فرمائش پر ان کی تصنیف ''سرو آزاد'' کے لیے۔ یہ مرزا صاحب اور ان کے اجدادِ کرام کا بہت ہی مختصر سا تعارف ہے اور وہ بھی نہایت انکسار کے ساتھ۔ ان تینوں مقامات کا اردو ترجمہ یہاں دیا جا رہا ہے۔ ایک خط کے جواب میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ درج ذیل ہے۔

Marfat.com

''برخوردار! تم نے دوبارہ التماس کی ہے کہ فقیر اپنا حسب ونسب لکھے۔ چوں کہ اس میں کوئی خاص فائدہ نہیں تھا، اس لیے میں نے تغافل کیا۔ اب جب کہ (تمھاری) منت سماجت حد سے بڑھ گئی ہے تو مختصر طور پر تحریر کیا جاتا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے، حقیقت میں تو اس فقیر کے سرمایۂ وجود کا آغاز ایک قطرۂ آب اور انجام ایک مشت خاک ہے۔ اور اس عالم اعتبار میں خاک سار کی نسبت کا سلسلہ چھبیس واسطوں سے حضرت محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ فقیر کے اجداد میں سے ایک بزرگ (جن کا نام امیر کمال الدین تھا) آٹھویں صدی ہجری میں کسی وجہ سے (ترک وطن کر کے) طائف سے ترکستان آ گئے تھے۔ انھوں نے اس علاقے کے ایک حاکم (جو قبیلۂ الوس قاقشان کا سردار تھا) کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اس حاکم کا کوئی لڑکا نہ تھا۔ لہٰذا اس علاقے کی حکومت کا تعلق ان کی اولاد سے ہو گیا۔ جب ہمایوں بادشاہ نے مملکت ہندوستان کو سرکش پٹھانوں سے نجات دلائی تو وہ اس خاندان کے دو بھائیوں محبوب خاں اور بابا خاں کو ساتھ لایا، جن کا سلسلہ تین پشت پر امیر کمال الدین سے ملتا تھا۔ ان دونوں کا حال عہد اکبری کی تاریخوں میں مرقوم ہے۔ ان بزرگوں کا مادری نسب نامہ امیر صاحب قران (تیمور لنگ) کے خاندان تک پہنچتا ہے اور فقیر کا سلسلہ چار واسطوں سے بابا خاں تک منتہی ہوتا ہے۔ خان مذکور (بابا خاں) نے عہد اکبری میں بغاوت کی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں میرے والد بھی کم منصبی کی سزا میں گرفتار تھے۔ انھوں نے عمر کا بڑا حصہ اورنگ زیب عالم گیر کی خدمت میں گزارا۔ آخر ترک دنیا کی دولت سے مفتخر اور ممتاز ہوئے اور سلسلۂ قادریہ کے ایک بزرگ سے استفاضہ کیا۔ میرے والد نے ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء میں اس دنیا سے رحلت کی۔ فقیر کی ولادت ۱۱۱۳ھ/ ۱۷۰۲ء میں ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا۔ بیس سال کی عمر میں کمر ہمت باندھ کر دنیا سے ہاتھ اٹھا لیا اور فقر کی راہ میں ریاضت شروع کی۔ علوم متعارفہ والد کے زمانے میں پڑھے اور کتب حدیث حاجی محمد افضل سیال کوٹی کی خدمت میں پڑھیں جو شیخ المحدثین شیخ عبداللہ بن سالم مکی کے شاگرد تھے۔ قرآن مجید شیخ القراء شیخ عبدالخالق شوقی کے شاگرد حافظ عبدالرسول دہلوی سے پڑھا۔ طریقہ نقشبندیہ کا خرقہ اور اجازت مطلقہ جناب سید السادات نور محمد بدایونی سے حاصل کی، جن کا سلسلہ دو واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ ایک عمر ان کی خدمت میں گزاری۔ ان کی وفات کے بعد اس طریقے کے متعدد مشائخ سے استفادہ کیا اور پھر مدت تک فیض آشیانہ حضرت شیخ الشیوخ محمد عابد سنامی کے آستانہ پر جبہ سائی کی۔ ان کا سلسلہ بھی دو واسطوں سے حضرت مجدد سے ملتا ہے۔ ایک عرصے تک ان کی خدمت کر کے قادریہ سہروردیہ اور چشتیہ طریقوں کا خرقہ اور اجازت ان سے حاصل کی۔ آج تک کہ ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء ہے، ان بزرگوں کے حکم کے مطابق تیس سال سے طالبان خدا کی تربیت کر رہا ہوں۔ خدا خاتمہ بالخیر کرے۔۔۔۔۔۔ ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء۔

دیباچۂ دیوان فارسی میں لکھتے ہیں۔

''حمد وصلوۃ کے بعد فقیر جانِ جاناں، متخلص بہ مظہر پسر جان، جانی تخلص کہ علوی نسب و ہندی مولد و

Marfat.com

حنفی مذہب اور نقشبندی مشرب ہے، اپنے احوال دوستوں کی خدمت میں پہنچاتا ہے۔ سولہ سال کی عمر میں یہ خاک سار یتیم ہوگیا۔ اور بیس سال کی عمر میں درویشوں میں شامل ہوگیا۔ تیس سال تک مدرسہ اور خانقاہ میں جاروب کشی کی۔ باقی زندگی بھی اسی شغل شریف میں گزار دی۔ اللہ کی دی ہوئی ہمت اور توفیق سے پوری زندگی، دست طلب کو دنیا کی گندگی سے آلودہ نہیں کیا اور پائے سعی کو اس راہ میں نہ رکھا۔ آج کہ ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء ہے اور میری عمر ساٹھ سال ہے، بیس سال سے کنج عزلت میں پناہ گزین ہوں اور حضرات مشائخ کے احکام کے مطابق انسانوں کے نسخۂ وجود کی تصحیح میں مشغول ہوں، جن کی ذات کے فرد باطل میں ہزاروں غلطیاں ہیں۔ عہدِ جوانی میں شورِ عشق کی تحریک پر جو کہ جوانی کے خمیر کا نمک ہے، نالہائے دردمندوں کیے تھے، جس لیے شاعری میں میرا نام آ گیا۔ والاہمتی کی وجہ سے اجزائے مسودات ومواد کلیات اکٹھا نہ کیا۔ بہت سا سرمایہ سخن برباد ہو گیا۔ باقی میں ارباب نقل و روایت نے نمایاں تصرف کر کے غلط کلام کو رواج دے دیا۔ کور سوادوں نے جو آنکھوں سے محروم تھے، انصاف کو پس پشت ڈال دیا۔ شاعری پر اعتراضات کیے اور مغز سخن کو نہ پہنچ پائے۔ ان اعتراضات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوئی۔ اس کم فرصتی کے زمانے میں جب کہ موت کا خوف بہت زیادہ ہے اور یہ طویل سفر درپیش ہے، ان اعتراضات کا جواب میرے بس میں نہیں تھا۔ ایک نوجوان سراپا جان نے اس کلام کو ترتیب دینے اور تصحیح کرنے کے لیے کہا۔ بہت تلاش وجستجو کے بعد بیس ہزار اشعار میں سے تقریباً ایک ہزار ملے اور وہ بھی بے ترتیبِ ردیف، اور اکثر غزلیں ناتمام ہاتھ آئیں۔ اس مجموعے کے علاوہ جو کچھ سامنے آئے، اسے (میرے اشعار سے) خارج سمجھا جائے۔ ہاں وہ تازہ کلام جو کہنے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے اور جو کلام قدیم مسودات میں سے ملے اس میں شامل کر لیا جائے۔ بیس سال پہلے فقیر کے کچھ اشعار ایک عزیز فراہم کر کے میرے پاس لایا تھا اور اس پر کچھ لکھنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے چند سطریں لکھ دی تھیں، اب اسے قابل اعتبار نہ سمجھا جائے۔ کیوں کہ وہ تمام اشعار بھی اسی میں شامل ہیں والسلام علیٰ من اتبع الهدیٰ."

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی تصنیف ''سرو آزاد'' کے لیے مرزا صاحب سے ان کے حالات طلب کیے تو مندرجہ ذیل سطور لکھ کر ارسال فرمائیں۔ ترجمہ ملاحظہ ہو

فقیر جانِ جاناں متخلص بہ مظہر پسر مرزا جان، تخلص جانی، نسباً علوی، مولداً ہندی، مذہباً حنفی، مشرباً نقشبندی ہے۔ ظاہری نشو ونما اکبر آباد میں ہوئی اور باطنی تربیت شاہ جہاں آباد میں حضرت سید نور محمد بدایونی نقشبندی مجددی کی خدمت میں ہوئی۔ سلسلۂ نسب اٹھائیس ❶ واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر منتہی ہوتا ہے۔

''اس فقیر کے جد اعلیٰ امیر کمال الدین نویں ❷ صدی ہجری کے ابتدا میں طائف کے علاقے سے نکل

---

❶ اس سے پہلے چھبیس واسطے لکھا جا چکا ہے۔ قرین صحت معلوم نہیں کیا ہے، چھبیس یا اٹھائیس۔

❷ پہلے گزر چکا ہے کہ ایک مکتوب میں مرزا صاحب نے آٹھویں صدی ہجری تحریر کیا ہے۔ معلوم نہیں، صحیح کیا ہے؟

Marfat.com

کر ترکستان کے علاقے میں آباد ہو گئے اور اس ملک کے بعض فرماں رواؤں کے ساتھ زندگی گزاری۔ ان کی بہت زیادہ اولاد تھی۔ ان میں سے امیر مجنوں اور امیر بابا اس زمانے میں ہندوستان آئے جب ہمایوں بادشاہ نے ملک فتح کیا۔ اس کے بعد سلاطین مغلیہ کی خدمت اور رفاقت اس خاندان کا شعار رہا ہے۔ (میرے والد) مرزا جان جن کا سلسلۂ نسب چھٹی پشت پر امیر بابا سے اور بارھویں پشت پر امیر کمال الدین سے ملتا ہے، عہد اورنگ زیب بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ میں منصب [1] عالی ترک کر کے گوشہ گیر ہو گئے تھے۔ بچپن ہی سے اس خاک سار کو ہوس جاہ و مال نے پریشان نہیں کیا۔ اس امید پر کہ دوسری دنیا میں چشم بصیرت وا ہو سکے، حصول ضروریات کے بعد اس فقیر نے خود کو فقرا کے دامن سے وابستہ کر لیا اور نقش قدیم کی طرح ان کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ لہٰذا اس فقیر کا دماغ ضعف قوی کا شکار ہے۔ اس میں تدبیر اسباب کی تاب نہیں رہی، تجرید و تعزیر اختیار کر لی ہے۔ گل کی طرح تمام زندگی ایک ہی لباس میں گزار دی۔ شور عشق کی تحریک سے جو کہ اس کے خمیر کا نمک ہے، کبھی کبھی فریاد کے لیے لب کھولتا ہے۔ چوں کہ اس کا نالہ موزوں ہوتا ہے، اس لیے احباب جوہر شناسی کی وجہ سے انھیں اشعار سے تعبیر کرتے ہیں، ورنہ اپنی بے سرمائیگی کے پیش نظر غایت انصاف کی بنا پر اس نے دکان سخن نہیں لگائی۔"

مرزا کے بعض آبا و اجداد:

مرزا صاحب کے خود نوشت مختصر حالات میں متعدد حضرات کے نام آئے ہیں۔ ان کے بعض آبا و اجداد کے بھی اور بعض اساتذہ و مرشدین کے بھی۔! مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اختصار کے ساتھ ان کے حالات بھی بیان کر دیے جائیں۔ ان کے آبا و اجداد میں امیر مجنوں، امیر بابا اور خود مرزا کے والد مکرم مرزا جان کے نام دکھائی دیتے ہیں اور مرشدین و اساتذہ میں حاجی محمد افضل سیالکوٹی اور سید نور محمد بدایونی کے۔! ان کا مختصر تذکرہ درجِ ذیل ہے۔

۱۔ امیر مجنوں خان کا نام ان لوگوں میں شامل ہے جو ہندوستان پر ہمایوں کے حملے کے زمانے میں اس کے ساتھ ہندوستان آئے۔ ہمایوں کی وفات کے وقت مجنوں خاں نارنول کا جاگیر دار تھا۔ بعد میں حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ مجنوں خاں دہلی آ گیا اور اکبر بادشاہ نے اسے مانک پور کی جاگیر عطا کر دی۔ مجنوں خاں امیر بابا کا بھائی تھا۔ اس نے بہت سے اہم معرکوں میں حصہ لیا۔ ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء میں جب جون پور کے صوبے دار علی قلی خاں نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اس کی سرکوبی کے لیے بادشاہ خود فوج لے کر آگے بڑھا۔ مجنوں خاں دائیں بازو کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس معرکے میں شاہی فوج فتح یاب ہوئی۔

۹۷۶ھ/۱۵۶۹ء میں اکبر نے اسے تسخیر کالنجر پر مامور کیا۔ مجنوں خاں فوج لے کر گیا تو کالنجر کے حاکم رام چندر نے مقابلے میں آنے کی جرات نہیں کی اور بغیر جنگ کے ہتھیار ڈال دیے، اس سے اکبر کے دل میں

[1] اس سے پہلے مرزا صاحب نے خود لکھا ہے: "میرے والد بھی کم منصبی کی سزا میں گرفتار تھے۔"

Marfat.com

امیر مجنوں خاں کا احترام بہت بڑھ گیا۔ ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں جب شاہی فوج نے بنگال فتح کیا تو مجنوں خاں اور بابا خاں کو گھوڑا گھاٹ کی جاگیر عنایت کی اور مجنوں خاں کو سہ ہزاری منصب داروں میں شامل کیا۔ ۹۸۹ھ/ ۱۵۸۱ء ہی میں مجنوں خاں کا انتقال ہو گیا ❶۔ مجنوں خاں کی وفات کے بعد گھوڑا گھاٹ کی جاگیر کا حق دار اس کا بیٹا جباری خاں تھا۔ لیکن اکبر نے تمام جاگیر بابا خاں کو دے دی تھی۔

بابا خاں بھی عہد اکبری کے امرا میں شامل تھا۔ اکبر کے زمانے میں گجرات کا صوبے دار مظفر خاں تھا۔ اس نے ''آئین داغ'' نافذ کیا تھا۔ اس آئین کی رو سے ضروری تھا کہ تمام جاگیر دار اپنی فوج بھیج کر سوار کا حلیہ لکھوائیں اور گھوڑے کے چہرے یا پچھلی ٹانگوں پر ایک داغ لگوائیں۔ لوگوں کی اکثریت اس قانون کے خلاف تھی۔ بابا خاں داغ کے لیے اپنے سوار بھیجتا تو مظفر خاں کے کارندے رشوت طلب کرتے۔ بابا خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ میں ستر ہزار روپے خرچ کر چکا ہوں لیکن ابھی تک سو گھوڑے بھی نہیں داغے گئے۔ مظفر خاں کے مظالم سے تنگ آ کر جب معصوم خاں کابلی نے بغاوت کی تو مجنوں خاں کا لڑکا جباری خاں اور بابا خاں دونوں باغیوں میں شامل ہو گئے۔ مظفر خاں ٹانڈہ میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ وہ باغیوں کے ہاتھوں مارا گیا اور باغیوں نے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ فتح کے بعد منصب اور خطاب تقسیم ہوئے تو بابا خاں نے اپنے لیے خانِ خاناں کا خطاب اختیار کیا۔ اس کامیابی کے بعد بابا خاں بیمار پڑ گیا اور پھر اسی بیماری میں اس کی وفات ہوئی۔ اکبر نے جب باغیوں پر قابو پا لیا تو مجنوں خاں کے بیٹے جباری خاں کو گرفتار کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد جباری خاں نے بغاوت میں شمولیت پر اظہار ندامت کیا تو اکبر نے اسے رہا کر دیا۔

اس بغاوت کے نتیجے میں بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے اس خاندان کے لیے حکومت کے اعلیٰ مناصب بند کر دیے۔ اس سے طویل عرصے بعد اورنگ زیب عالم گیر کا دور آیا تو صرف مرزا مظہر جانِ جاناں کے والد مرزا جان جانی کا نام مغلیہ حکومت کے منصب داروں میں شامل ہوا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی ملازمت کی کیا نوعیت تھی۔ وہ اعلیٰ مناصب کے لوگوں میں شامل تھے یا کم حیثیت کے ملازمین میں۔

مرزا کے والد مرزا جان اورنگ زیب کے شاہی ملازمین میں سے تھے۔ ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۹ء میں وہ اورنگ زیب کے ساتھ دکن میں مقیم تھے۔ اسی سال انھوں نے ملازمت ترک کی اور مال و اسباب فقرا و مساکین کو دے دیا۔ منقول ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی کے لیے پچیس ہزار روپے بچا کر رکھے تھے۔ ایک دن انھیں معلوم ہوا کہ ایک دوست کو روپے کی ضرورت ہے، ساری رقم اسے دے دی۔

مرزا جان کی قناعت اور توکل کے بارے میں کئی واقعات مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار انھوں نے گھر میں کدو کی بیل لگائی۔ ملازمہ نے کہا یہ بیل تو آپ نے لگا لی ہے ایسا نہ ہو کہ گھر میں کسی وقت تنگ دستی کی

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: اکبر نامہ، ج ۲، ص ۳۵۷۔ آئین اکبری، ج ۱، ص ۲۲۳۔ مآثر الامرا، ج ۳ ص ۲۰۹ تا ۲۱۱۔ تذکرہ ہمایوں و اکبر، ص ۲۴۱۔

Marfat.com

نوبت فاقے تک پہنچ جائے اور آپ اس بیل کے پتے کھانے لگیں۔ یہ بات شیوۂ توکل اور روحِ قناعت کے خلاف ہوگی۔ مرزا جان نے ملازمہ کی یہ بات سنی تو اسے معرفت الٰہی پر محمول کیا اور بیل جڑ سے اکھاڑ دی۔

مرزا جان سلسلۂ قادریہ سے منسلک تھے اور شاہ عبدالرحمٰن قادری سے بیعت تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور جانی تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے نہ تصوف میں شہرت پائی نہ شاعری میں۔ گم نامی کی زندگی بسر کی۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا اور صوفیا کے تذکروں میں نہ ان کے حالات ملتے ہیں نہ کلام کا پتا چلتا ہے ❶۔

اساتذہ اور مرشد:

مرزا صاحب نے کتب حدیث حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھیں۔ حاجی صاحب موصوف حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند گرامی شیخ محمد معصوم کے خلیفہ تھے۔ عالم اور متقی بزرگ تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی ان سے علم حدیث کی سند حاصل کی تھی۔ کتابوں کے اس قدر شائق تھے کہ کسی طرف سے جو آمدنی ہوتی اس سے کتابیں خرید لیتے۔ ایک مرتبہ کسی نے پندرہ ہزار روپے پیش کیے، انھوں نے اس تمام روپے کی کتابیں خرید لیں۔ ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء کو دہلی میں فوت ہوئے اور مقبرہ خواجہ باقی باللہ میں دفن کیے گئے۔

سید نور محمد بدایونی سے مرزا صاحب نے فیض طریقت حاصل کیا تھا۔ سید ممدوح سلسلۂ نقشبندیہ کے ممتاز بزرگوں میں سے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے، شیخ سیف الدین بن شیخ محمد معصوم کے فیض یافتہ اور خلیفہ تھے۔ دیگر حضرات سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ عابد و زاہد اور متبع سنت نبوی تھے۔ ۱۱ ذیقعدہ ۱۱۳۵ھ/۱۲ اگست ۱۷۲۳ء کو دہلی میں وفات پائی اور بستی نظام الدین اولیا میں دفن ہوئے۔

ملوک و امرا سے کنارہ کشی:

مرزا صاحب خوش شکل، خوب رو، وجیہ اور بارعب عالم دین تھے۔ نہایت مہذب، بااخلاق اور درویش منش بزرگ تھے۔ دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے اور اس کو رفع کرنے کی پوری کوشش کرتے۔ متوکل علی اللہ، مستغنی المزاج اور پیکر زہد و عبادت تھے۔ امرا و حکام اور اربابِ ثروت سے دور رہتے اور ان سے ملنے اور تحفے قبول کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے۔ اگر کوئی کچھ پیش کرتا تو صاف لفظوں میں انکار کر دیتے۔ ایک امیر نے رہنے کے لیے ایک حویلی اور خانقاہ اور غربا و مساکین کے لیے کچھ ذرائع خدمت پیش کیے، مگر مرزا صاحب نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ جب مکان اور مال و متاع چھوڑ کر ہی دنیا سے جانا ہے تو اپنا ہو یا دوسرے کا، سب برابر ہے۔ ہر شخص کی روزی خدا کے ہاتھ میں ہے، جو ہر حالت میں بقدر حصہ پہنچتی ہے۔

ایک مرتبہ ہندوستان کے مغل حکمران محمد شاہ نے اپنے وزیر قمر الدین خاں کی وساطت سے پیغام بھجوایا

---

❶ ملاحظہ ہو: معمولات مظہریہ، ص ۱۵۔ مقامات مظہری، ص ۱۴ تا ۱۷۔

Marfat.com

کہ خدا نے ہمیں وسیع ملک عطا کیا ہے، جو علاقہ آپ مناسب سمجھیں قبول فرمائیے

مرزا صاحب نے جواب دیا قل متاع الدنیا قلیل ❶. متاع ہفت اقلیم قلیل فرمودہ است، نزد شما ہفتم حصہ آں قلیل، یک اقلیم ہندوستان است، پیش شما چیست کہ سرہمت فقرا بقبول آں فرود آید ❷۔

(یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا کہ (اے رسول اکرم) دنیا کا مال واسباب بہت قلیل ہے۔ اللہ نے تو متاع ہفت اقلیم کو بھی قلیل قرار دیا ہے۔ آپ کے پاس تو اس قلیل کا بھی بہت کم حصہ ایک ہندوستان ہے۔ آپ کس بل بوتے پر یہ کہتے ہیں کہ فقرا اسے قبول کریں۔)

مرزا مظہر جانِ جاناں کے صبر و استغنا اور توکل کے بارے میں اس قسم کے بہت سے واقعات ان کے حالات میں مرقوم ہیں۔

اخذ وقبول نذر کے پیمانے:

انھوں نے تمام عمر مکان نہیں بنایا۔ ہمیشہ دوسروں کے مکان میں کرایہ پر یا عاریتاً مقیم رہے۔ خود کھانا نہیں پکاتے تھے، ضرورت کے وقت کھانا پکا ہوا لے آتے اور کھا لیتے۔ لباس کا یہ عالم تھا کہ کبھی دو جوڑے نہیں سلائے، ہمیشہ ایک جوڑا رکھا۔ میلا ہوا تو دھولیا۔ کسی کی نذر قبول نہیں کرتے تھے۔ البتہ اس ضمن میں انھوں نے چھ پیمانے مقرر کر رکھے تھے، کوئی اس معیار پر پورا اترتا تو اس کی نذر قبول فرما لیتے۔

۱۔ نذر پیش کرنے والا بلند کردار آدمی ہو۔

۲۔ امرا اور اہل دنیا سے اختلاط اور میل جول نہ رکھتا ہو۔

۳۔ مجموعی طور پر صالح اور متقی انسان ہو۔

۴۔ حلال اور حرام کی تمیز رکھتا ہو اور پھر اس پر عامل بھی ہو۔

۵۔ غصب ونہب سے متنفر اور لوٹ مار سے کنارہ کش رہتا ہو۔

۶۔ جو کچھ دینا ہو اس میں خلوص قلب کار فرما ہو۔

فرمایا کرتے کہ تحفے اور ہدیے کو ٹھکرا دینا اگرچہ ممنوع ہے، تاہم قبول کرنا بھی ضروری نہیں۔ میں اپنے انہی رفقا اور متعلقین کا تحفہ قبول کرتا ہوں، جن کے بارے میں یقین ہو کہ اخلاص اور احتیاط سے پیش کر رہے ہیں۔ میں اغنیا کا تحفہ قبول نہیں کرتا۔ ان کے تحائف وہدایا عام طور سے مشتبہ اور مشکوک ہوتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اغنیا حقوق العباد کا خیال نہیں رکھتے، لہٰذا ان سے تحفہ قبول کرنا قیامت کے روز اللہ کے دربار میں

❶ یہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۷۷ کے الفاظ ہیں۔ ترجمہ یہ ہے: ”(اے رسول اللہ ﷺ!) فرما دیجیے کہ دنیا کا مال ومتاع چند روزہ ہے۔“

❷ مقامات مظہری، ص ۳۴۔

Marfat.com

باز پرس کا باعث بن سکتا ہے۔

اس ضمن میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک مرتبہ نظام الملک نے ان کی خدمت میں تیس ہزار نقد روپے پیش کیے۔ آپ نے قبول نہیں فرمائے اور کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ نظام الملک نے عرض کیا، اگر آپ کو ذاتی ضرورت نہیں تو مجھ سے لے کر مسکینوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیجیے۔ فرمایا میں تمھارا خازن نہیں ہوں۔ اگر تقسیم کرنا چاہتے ہو تو میرے گھر سے باہر جا کر خود ہی تقسیم کر دو۔

مرزا مظہر جان جاناں، بارھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے عجوبۂ روزگار عالم دین تھے۔ ذکاوت وفطانت، زہد وورع، قوتِ ادراک، اتباع سنت، ذکر الٰہی اور اقتضائے آثار سلف میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ وہ مشائخ وصوفیا کے رسوم وعوائد کے پابند نہ تھے۔ نہ ان کی مجالس میں جانے کے عادی تھے اور نہ خود اپنا ہی کوئی خاص حلقۂ تصوف وطریقت قائم کیا۔

اتباع سنت کا شدید جذبہ:

مرزا مظہر جان جاناں کے زمانے کے حالات پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ہر طرف انحطاط ہی انحطاط اور زوال ہی زوال تھا۔ سلطنت مغلیہ کا اقتدار تقریباً ختم ہو چکا تھا اور اس کے عروج کا آفتاب لب بام آ گیا تھا۔ بادشاہ اور امرا ورؤسا سب عیش وعشرت میں مبتلا تھے۔ صوفیا اور علما میں سے بھی بعض لوگ منصب اصلاح کو ترک کر چکے تھے۔ عقائد صحیحہ کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ تعلیم قرآن اور اتباع سنت کا احساس تک بھی بہت سے ذہنوں میں باقی نہ رہا تھا۔ اس ماحول میں واقعی ایک مصلح کی ضرورت تھی، اور مرزا مظہر جان جاناں نے اس ضمن میں جو خدمات انجام دیں، وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین ہیں۔ وہ اتباع کتاب وسنت کا اس درجہ التزام کرتے تھے کہ اس دورِ انحطاط میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک مرتبہ ان کے والد مرزا جان انھیں اپنے پیر ومرشد شاہ عبدالرحمٰن قادری کے پاس لے گئے۔ شاہ مذکور اس وقت سکر وسماع کی حالت میں تھے۔ اس حالت میں انھوں نے عصر اور مغرب کی نمازیں نہیں پڑھیں۔ مرزا صاحب نے شاہ عبدالرحمٰن کی یہ حالت دیکھ کر دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر والد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو کہا تو انکار کر دیں گے۔ مگر خیریت گزری کہ والد نے بیٹے کو بیعت کے لیے نہیں کہا۔

مرزا صاحب ممدوح کی پوری زندگی اتباع سنت نبوی ﷺ کی واضح مثال تھی۔ وہ سلام کرنے میں بھی سنت رسول (ﷺ) کو ملحوظ رکھتے تھے۔ شاہ غلام علی لکھتے ہیں:

مردم را بآداب سلام موافقِ سنتِ رسولِ خدا تاکید می نمودند، واز دست بر سر داشتن وخم شدن منع می فرمودند❶۔

---

❶ مقامات مظہری، ص ۳۵۔

Marfat.com

(لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق سلام کرنے کی تاکید کرتے، اور سلام کے لیے سر پر ہاتھ رکھنے اور جھکنے سے منع فرماتے۔)

مرزا صاحب جس طرح خود متبع سنت نبوی تھے، اسی طرح اپنے عقیدت مندوں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ وہ ان ہی لوگوں کو پسند فرماتے، جو اللہ اور رسول کے احکام کے پابند تھے۔ اپنے مریدوں سے کہا کرتے:

ایمان مجمل کہ ایمان آوردم بخدا و رسولِ خدا و آنچہ پیغمبر از خدا آوردہ است، دوست دارم، دوستانِ خدا ورسول را، و بے زارم از دشمنانِ خدا ورسول۔ بہ جہت نجات کافیست ❶۔

(میں اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور اس چیز پر جو رسول اللہ ﷺ اپنے خدا کی طرف سے لے کر آئے، ایمان لایا ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے پیار کرنے والوں سے پیار کرتا ہوں اور ان کے دشمنوں سے بے زار ہوں۔ بس نجات کے لیے یہی کافی ہے۔)

مرزا صاحب کی اتباع سنت کی وجہ سے لوگ ان کو مرکز محبت ٹھہراتے، ان کا احترام کرتے اور کثیر تعداد میں ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوتے۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ روہیلوں کی بہت بڑی تعداد ان کے مریدین میں شامل تھی۔ جس قدر روہیلے ان کے مرید تھے، شاید ہی کسی دوسرے بزرگ کے ہوں۔

مرزا صاحب شاہ ولی اللہ کی نظر میں:

مرزا جان جاناں کے علم و فضل اور اتباع سنت کی وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ان کا انتہائی احترام کرتے تھے اور ان کی نظر میں مرزا صاحب بہ درجہ غایت قدر و منزلت کے حامل تھے۔ ایک مکتوب میں شاہ صاحب انھیں ان الفاظ سے مخاطب فرماتے ہیں:

''بنام مرزا صاحب خدائے عز و جل آں قیم طریقہ احمدیہ و داعی سنت نبویہ را دیر گاہ داشتہ مسلمین را متمتع و مستفید گرداند ❷۔

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں:

”مرزا صاحب متع الله المسلمين با فادات قيم الطريقة الاحمديه دردى رياض الطريقة بتوجيهات النفس الزكيه❸۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے دور کے عظیم عالم تھے۔ وہ مرزا صاحب کی عظمت کا اعتراف

---

❶ مقامات مظہری، ص ۳۶۔

❷ کلمات طیبات، ص ۱۵۸۔

❸ ایضاً، ص ۱۵۹۔

Marfat.com

نہایت شان دار الفاظ میں کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

آنچہ قدر ایشاں ما مردم می دانیم شما چہ دانید، احوال مردم ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشا فقیر است، و بلاد عرب را نیز دیدہ ام و سیر نمودہ۔ احوال مردم ولایت از ثقاتِ آں جا شنیدہ ایم و تحقیق کردہ ایم عزیزے کہ بر جادۂ شریعت و طریقت و اتباع کتاب و سنت ہم چنیں استوار و مستقیم باشد، و در ارشاد طالبان شانے عظیم و نفسے قوی دارد، دریں جزو زماں مثل ایشاں در بلاد مذکور دریافتہ نمی شود، مگر در گزشتگان، بلکہ در ہر جزو زمان وجود ایں چنیں عزیزاں کم تر بودہ است، چہ جائے ایں زمان کہ پُر فتنہ و فساد است [1]۔

(یعنی ان حضرات کی جو قدر ہم جانتے ہیں، تم کیا جانو، ہندوستان کے لوگوں کے احوال ہماری نظر سے اوجھل نہیں ہیں۔ میں نے بلادِ عرب کو بھی دیکھا ہے اور وہاں گھوما پھرا ہوں۔ وہاں کے معتمد علیہ لوگوں سے اس عزیز (مرزا مظہر جان جاناں) کے دین و تقویٰ کے بارے میں سنا اور تحقیق کیا ہے۔ وہ جادۂ شریعت پر قائم، منزلِ طریقت کے راہ نورد اور کتاب و سنت کی صراط مستقیم پر گام فرسا ہیں۔ طالبان رشد و ہدایت میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اور وہ عظیم کردار کے مالک ہیں۔ ان بلاد میں ان کے مرتبے کا کوئی شخص نہیں ہے۔ البتہ گزشتہ دور میں ان کے پایہ کے لوگ موجود تھے، مگر وہ بھی بہت کم۔ اس دورِ پُرفتن میں تو ان اوصاف کے حامل ناپید ہیں۔)

کیفیت نماز:

"ذکر طریق کیفیت صلوٰۃ" کے عنوان کے تحت نعیم اللہ بہرائچی معمولات مظہریہ کے صفحہ ۷۵ پر لکھتے ہیں:

معمول چنیں بود کہ صلوٰۃ خمسہ را در اوقات مخصوصہ و مستحبہ ادا می نمودند و رعایت اعتدال رکوع و سجود و قیام و قعود و قومہ و جلسہ بجامی آوردند و می فرمودند کہ شریعت عبارت ازہمیں اعتدال و اقتصاد است و دست را برابر سینہ می بستند و می فرمودند کہ ایں روایت ارجح است از روایت زیر ناف۔

(یعنی حضرت مرزا جانِ جاناں کا معمول یہ تھا کہ پانچوں نمازیں ان کے صحیح اوقات میں ادا کرتے اور رکوع، سجود، قیام و قعود اور جلسہ میں کامل اعتدال سے کام لیتے۔ فرمایا کرتے کہ شریعت اسی اعتدال و اقتصاد سے عبارت ہے۔ نماز میں ہاتھ سینے پر باندھتے اور فرماتے کہ سینے پر ہاتھ باندھنے کی روایت زیر ناف ہاتھ باندھنے کی روایت سے راجح ہے۔)

حدیث ہی کو مدارِ عمل ٹھہراتے:

مرزا ممدوح فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے اور فروعات میں اسی مسلک کے پیرو تھے، لیکن اگر مسائل حنفیہ کے خلاف کوئی صحیح حدیث انھیں مل جاتی تو قول امام کو ترک کر دیتے اور اس حدیث کو مدارِ عمل

[1] کلمات طیبات، ص ۱۵۸ بر حاشیہ۔

Marfat.com

ٹھہراتے۔ جو لوگ حدیث صحیح چھوڑ کر روایاتِ فقہیہ پر عمل کرتے ہیں، ان پر تعجب کا اظہار فرماتے، چنانچہ سید عبدالحی حسنی فرماتے ہیں:

ویقول، العجب کل العجب ان الحدیث الصحیح غیر المنسوخ لا یعمل بہ مع انہ یروی عن النبی المعصوم عن الخطاء صلی اللہ علیہ وسلم ببضع وسائط من الرواۃ و یعمل بالروات الفقھیۃ التی نقلھا القضاۃ والمفتیون بوسائط عدیدۃ عن الامام غیر المعصوم مع ان ضبطھم وعدلھم غیر معلوم[1]۔

(بڑے تعجب کی بات ہے کہ ان صحیح اور غیر منسوخ احادیث پر تو عمل نہ کیا جائے جو اللہ کے معصوم عن الخطا پیغمبر (ﷺ) سے ثقہ روات کے واسطے سے مروی ہیں، اور اس کے برعکس ان فقہی روایات کو معمول بہا ٹھہرا لیا جائے جو امام غیر معصوم سے قضات اور ارباب فتویٰ حضرات نے ان واسطوں سے نقل کی ہیں، جن کا عدل وضبط بھی معلوم نہیں۔)

رفع سبابہ اور فاتحہ خلف الامام:

اسی طرح کتب تاریخ میں حضرت مرزا صاحب کے حالات کے ضمن میں مرقوم ہے کہ وہ تشہد میں رفع سبابہ اور فاتحہ خلف الامام پر عامل تھے۔ چنانچہ الیانع الجنی میں ہے:

ویقوی قرأۃ الفاتحۃ فیما لا یجھر الامام فیہ بالقرأۃ[2]۔

(یعنی حضرت مرزا مظہر جان جاناں کا یہ معمول تھا کہ وہ سرّی نمازوں میں سورۂ فاتحہ پڑھنے پر زور دیتے تھے۔)

مولانا محمد حیات سندھی مدنی محدث فرماتے ہیں کہ مسائل میں وہ عمل بالحدیث کو ضروری قرار دیتے تھے، اگرچہ ان کے مذہب (حنفیت) کے خلاف ہی ہو۔

عمل بالحدیث کی تاکید:

مرزا ممدوح ہر معاملے میں اتباع سنت کو ملحوظ خاطر رکھتے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے بارے میں منقول ہے کہ وہ رفع سبابہ یعنی نماز میں انگشت شہادت اٹھانے کے قائل نہ تھے، اس ضمن میں مرزا صاحب سے کسی بزرگ نے خط کے ذریعے استفسار کیا، تو اس کے جواب میں نہایت وضاحت سے لکھا کہ مجدد صاحب کو یہ حدیث نہیں

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۲۔

[2] الیانع الجنی، ص ۹۶۔

Marfat.com

پہنچی۔ اگر پہنچتی تو اس پر ضرور عمل کرتے۔ ان کے فرزند شیخ محمد یحییٰ سرہندی رفع سبابہ کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک رسالہ بھی لکھا ہے، جس میں حدیث کی روشنی میں رفع سبابہ کا ثبوت دیا ہے۔ مرزا صاحب مزید فرماتے ہیں کہ کسی اہل علم یا کسی امام یا کسی صحابی کو حدیث رسول ﷺ کا نہ پہنچنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس ضمن میں ان کے فارسی خط کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ اس کی پوری وضاحت ہو جائے اور یہ معلوم ہو سکے کہ اس باب میں حضرت مرزا صاحب ممدوح کا نقطہ نظر کس درجہ صاف اور واضح ہے۔ لکھتے ہیں:

”آپ نے لکھا تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں سے ایک مکتوب میں رفع سبابہ (نماز میں انگشت شہادت اٹھانے) سے منع کیا ہے اور آپ (یعنی مرزا مظہر جانِ جاناں) حضرت مجدد سے اتنی محبت کے باوجود رفع سبابہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ محبّ کے لیے ضروری ہے کہ اپنے محبوب کا اتباع کرے۔ مخدوما! اللہ تعالیٰ نے کتاب وسنت کی پیروی انسانوں کے لیے فرض ٹھہرائی ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ ①

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

لا یومن احدکم حتی یکون هواه تبعالما جئت به۔

(یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اپنی خواہش کو اس کے تابع نہ کر دے، جو میں لایا ہوں۔)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ ﷺ کے کامل نائب ہیں، انھوں نے اپنے طریقے کی بنیاد کتاب وسنت پر رکھی ہے، اور علما نے رفع سبابہ کے ثبوت میں بہت سے ایسے رسائل تصنیف کیے ہیں، جن میں فقہائے حنفیہ کی روایات اور صحیح احادیث سے اس مسئلے کو ثابت کیا گیا ہے، یہاں تک کہ حضرت مجدد کے چھوٹے صاحب زادے شیخ محمد یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے۔ انھیں ایک بھی ایسی حدیث نہیں ملی، جس سے رفع سبابہ کی نفی ثابت ہوتی ہو۔ یاد رکھیے، حضرت مجدد الف ثانی کا ترک رفع سبابہ، امر اجتہادی ہے، اور وہ سنت جو منسوخ نہ ہوئی ہو، مجتہد کے اجتہاد سے بہر حال مقدم ہے۔ سنت نبوی ﷺ سے رفع سبابہ کا ثبوت مل جانے کے بعد محض اس وجہ سے ترک رفع کرنا کہ حضرت مجدد نے بھی ترک کر دیا تھا، معقول بات نہیں ہے۔ خود حضرت مجدد بھی تو سنت رسول ﷺ کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ وہ حنفی مذہب کے حامل تھے، اور امام

① یہ سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۶ ہے۔ ترجمہ یہ ہے: اور کسی مسلمان مرد یا مسلمان عورت کو یہ لائق نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو بھی اپنے کام میں کوئی اختیار باقی ہے۔

Marfat.com

ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

اذا ثبت الحدیث فھو ما مذھبی۔

(یعنی جب حدیث ثابت ہو جائے تو وہ میرا مذہب ہے۔)

نیز ارشاد ہے:

واترکوا قولی بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مقابلے میں میرا قول ترک کر دو۔)

اس لیے امید ہے کہ حضرت مجدد اس امر اجتہادی کو ترک کرنے اور صحیح احادیث کو قبول کرنے سے ناراض نہ ہوں گے ___ اور اگر لوگ یہ کہتے ہیں کہ کیا حضرت مجدد کو اپنے وسیع علم کے باوصف یہ معلوم نہیں تھا کہ احادیث سے رفع سبابہ کا ثبوت ملتا ہے، تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ان کے زمانے تک ہندوستان میں ان کتابوں اور رسالوں نے شہرت نہیں پائی تھی، لہٰذا وہ ان کی نظر سے نہیں گزرے اور انھوں نے ترک سبابہ پر عمل کیا۔ اگر مل جاتے اور ان کے مطالعہ میں آجاتے تو ہرگز ترک رفع سبابہ نہ کرتے، کیونکہ وہ اس امت کے اکابر میں سے اتباع سنت کے سب سے زیادہ متمنی تھے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ کشف کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا مندی نہ پا کر انھوں نے ترکِ رفع سبابہ کر دیا، تو ہم کہتے ہیں کہ کشف کو طریقت کے سلسلے میں تو قابل اعتبار مانا جا سکتا ہے، احکام شریعت میں کشف ہرگز حجت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں حضرت مجدد نے اپنے اس مکتوب میں مسئلۂ زیر بحث کے بارے میں کشف کا کوئی دعویٰ بھی تو نہیں کیا۔ بہر حال یہ جزوی مخالفت سنت، حضرت مجدد کے قاعدۂ کلی یعنی ترغیب اتباع سنت کے ذیل میں آتی ہے اور بارآور ہوگی۔ والسلام [1]۔

انتقالِ مذہب اور تقلید کے سلسلے میں:

اسی طرح ایک اہل علم نے ایک مکتوب کے ذریعے انتقال مذہب یعنی ایک فقہی مسلک سے دوسرے فقہی مسلک میں منتقل ہو جانے کے بارے میں مرزا صاحب موصوف سے ایک استفسار کیا تو انھوں نے تفصیل سے اس کی وضاحت فرمائی اور جواب میں جو خط تحریر فرمایا، اس میں مولانا محمد حیات سندھی مدنی محدث کے اس رسالے کا فارسی میں خلاصہ تحریر کیا ہے، جو حضرت محدث ممدوح نے عربی میں لکھا ہے، نیز امام سیوطی کی تصنیف ''جزیل المواہب فی انتقال المذاہب'' کا حوالہ نقل کیا ہے۔ اس سے مختلف مذاہب فقہی سے متعلق مرزا صاحب کی صحت فکر کا پتا چلتا ہے اور واضح ہوتا ہے کہ مسائل کو سمجھنے اور ان پر عمل کی بنیادیں استوار کرنے کا ان کے

[1] کلمات طیبات ص ۲۷، ۲۸، مکتوب ۱۵۔

Marfat.com

نزدیک اصل پیمانہ کتاب وسنت ہے۔ ان کا زاویہ نظریہ ہے کہ جو فقہی مسلک، کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہو، اسی کو قبول اور اختیار کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں مرزا صاحب کے فارسی خط کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

''آپ نے حدیث کے مطابق عمل کرنے کی غرض سے ایک مسلک سے دوسرے مسلک میں منتقل ہونے کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ مخدوما! حدیث کے مطابق عمل کرنے کے سلسلے میں شیخ محمد حیات مدنی نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس کی تلخیص فارسی میں تحریر کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران: ۳۱)

(اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دیجیے کہ) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔)

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

لا یؤمن احدکم حتیٰ یکون ھواہ تبعالما جئت بہ[1]۔

(یعنی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اس کی خواہش ان امور کی تابع نہ ہو جنھیں میں لایا ہوں۔)

یہ صحیح حدیث ہے۔ ابوالقاسم بن اسماعیل بن فضل اصفہانی نے ''کتاب الحجۃ'' میں اسے روایت کیا ہے۔

''روضۃ العلما'' میں بھی مذکور ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

اترکوا قولی بخبر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم وقول اصحابہؓ۔

(کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور آپ کے صحابہ کرام کے قول کے مقابلے میں میرا قول ترک کردو۔)

امام ابوحنیفہ کا مشہور قول ہے:

اذا صح الحدیث فھو مذھبی۔

(حدیث رسول اکرم ﷺ ہی میرا مذہب ہے۔)

اگر اطلاع کے باوجود کوئی شخص حدیث صحیح پر عمل نہ کرے تو اس نے امام صاحب کے اس قول کی کہ ''رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں میرا قول ترک کردو'' مخالفت کی۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ کسی بھی عالم نے تمام احادیث کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ چنانچہ امام صاحب کا یہ قول کہ آنحضرت ﷺ کے فرمان کے مقابلے میں میرا قول ترک کردو، اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو تمام احادیث نہیں پہنچی تھیں، ان میں سے بعض رہ گئیں، اور کیوں نہ رہتیں، جب کہ اہل امت میں خلفائے راشدین جیسے بلند مرتبت حضرات سے بھی جو ہر وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں رہتے تھے، بعض حدیثیں فوت ہوگئیں۔

[1] مشکوۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، فصل ثانی۔

Marfat.com

ہر وہ شخص جسے فن حدیث میں معارضت ہے، خوب جانتا ہے کہ امت کے افراد پر فقط اتباع پیغمبر واجب ہے، ائمہ میں سے کسی کا اتباع واجب نہیں۔ اس لیے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ کسی بھی مجتہد کا فقہی مسلک اختیار کر لے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صحیح حدیث پر عمل کرنے سے انسان امام ابوحنیفہ کے مذہب سے نکل جاتا ہے تو اس کے پاس اپنے دعوے کے لیے جو دلیل ہے، اسے پیش کرے۔ البتہ ان مشہور مذاہب فقہیہ میں سے ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں منتقل ہونے کے مسئلے کا بیان تفصیل چاہتا ہے۔

امام سیوطی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ''جزیل المواہب فی انتقال المذاہب'' ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں منتقل ہو جانا جائز ہے۔ امام رافعی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ امام نووی بھی یہی کہتے ہیں۔ صاحب ''روضہ'' لکھتے ہیں کہ مذاہب فقہ کی تدوین کے بعد کیا یہ جائز ہے کہ مقلد ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں چلا جائے۔؟ ہم کہتے ہیں کہ مقلد پر یہ لازم ہے کہ دونوں مذاہب کے مجتہدین کے مطابق طلبِ علم کرے، اور جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ دوسرا مجتہد زیادہ عالم ہے تو انتقال مذہب جائز ہے، بلکہ لازم ہے۔ نیز اگر ہم اسے انتقال مذہب کا اختیار دے دیں تو بھی جائز ہے۔

مقلد کی بھی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ یہ چار چیزوں سے خالی نہیں۔ مقلد، جاہل ہے یا عالم۔ پھر ان دونوں (یعنی مقلد جاہل یا مقلد عالم) کے انتقال مذہب کی وجہ دینی ہے یا دنیوی۔

اگر جاہل ہے، فقہ سے واقف نہیں اور اپنے مذہب کے بارے میں سوائے نام کے کچھ نہیں جانتا، صرف مال و جاہ حاصل کرنے کے لیے مذہب بدلتا ہے تو اس کی یہ حرکت صحیح نہیں ہے۔

اگر عالم اور فقیہ ہے اور صرف دنیوی غرض کے لیے مذہب بدلتا ہے تو یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے، کیونکہ وہ فقط دنیوی مقاصد کے لیے مذہب سے کھیلتا ہے اور یہ بالکل ناجائز ہے۔

اگر فقیہ ہے اور مذہب بدلنے کی وجہ دینی اسباب ہیں، دوسرا مذہب اس کی نظر میں قوی دلائل کے ساتھ ترجیح کا حامل ہے تو ایسے شخص کے لیے انتقال مذہب واجب ہے، ایک روایت کے مطابق جائز ہے۔

اگر فقہ سے واقف نہیں ہے، کسی اور شخص نے اسے اپنے مذہب میں داخل کیا ہے، خود جاہل رہا ہے۔ دوسرے مذہب میں فقہ کی اہمیت سے واقفیت اور تفقہ حاصل کرنے کی امید رکھتا ہے تو ایسے شخص کے لیے بھی انتقال مذہب واجب ہے، کیوں کہ مذہب میں تفقہ، جہل سے بہتر ہے۔ کسی ایک مذہب میں درجہ فقاہت حاصل کرنا، تمام مذاہب کے

Marfat.com

جہل سے بہر حال اولیٰ ہے۔ غالباً جاہل کی عبادت بھی صحیح نہیں ہوتی۔

اگر انتقال مذہب کا کوئی دینی یا دنیوی مقصد نہیں ہے بلکہ محض عمل ہی اس کی وجہ ہے تو عام آدمی کے لیے جائز ہے، لیکن فقیہ کے لیے ممنوع ہے۔ کیوں کہ اس نے طویل مدت میں اس مذہب کی فقہ حاصل کی ہے۔ اب اگر دوسرے مذہب میں جائے گا تو اس کی فقہ حاصل کرنے کے لیے پھر ایک عمر چاہیے، اس پر عمل جو اصل مقصد ہے نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا اس کے لیے مذہب تبدیل نہ کرنا بہتر ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی غیر حنفی، حنفی مذہب اختیار کر لے تو جائز ہے اور حنفی مذہب کا حامل دوسرے مذہب میں چلا جائے تو ناجائز ہے، یہ محض ان کا تعصب ہے۔ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب امام برابر ہیں۔ اگر حنفی مذہب یا کسی اور مذہب کی تقدیم کے بارے میں کوئی آیت یا حدیث وارد ہوتی تو اس مذہب کی تقلید امت کے ہر فرد پر واجب ہوتی، دوسرے مذہب کی تقلید ناجائز قرار پاتی۔ یہ نقطۂ نظر اجماع کے خلاف ہے۔

صاحب جامع الفتاویٰ حنفی مذہب کے ماننے والے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی مرد اور کسی عورت کا شافعی مذہب سے حنفی مذہب اختیار کر لینا یا حنفی مذہب سے شافعی مذہب میں منتقل ہو جانا جائز ہے۔ بزرگان دین میں سے بہت سے حضرات نے انتقال مذہب کیا ہے۔ اگر ناجائز ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ جو کوئی اس کے خلاف کہتا ہے، اس کا قول بے دلیل اور غیر معقول ہے [1]۔

دورِ پیری کا ایک خط:

مرزا جانِ جاناں کے خطوط بڑے متوازن ہیں۔ لوگوں نے ان سے مختلف علمی سوالات کیے اور تصوف و طریقت کے پیچیدہ اور متنازعہ مسائل دریافت کیے، لیکن انھوں نے توازن اور اعتدال کی حدود میں رہ کر ان کے جواب دیے۔ ایک خط انھوں نے ایک بزرگ سید موسیٰ خاں دھبیدی کو لکھا۔ یہ مرزا صاحب کے دور پیری کا خط ہے۔ اس وقت حضرت مرحوم کی عمر اسی (۸۰) سال کے قریب ہو چکی تھی۔ یہ خط کسی علمی یا فقہی سوال کے جواب میں نہیں ہے، لیکن اس سے پتا چلتا ہے کہ اس عمر میں بھی وہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے اور ان کا باقاعدہ حلقہ تصوف قائم تھا۔ اس میں دنیا کی بے ثباتی اور ایام گزشتہ کا ذکر کرتے ہیں۔ فارسی خط کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

الحمدللہ علی نوالہ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ و صحبہ و الہ۔

بعد حمد و صلوٰۃ۔ فقیر جانِ جاناں کی طرف سے حضرت سید موسیٰ صاحب ملاحظہ فرمائیں۔ فقیر اس وقت اوائل ماہ صفر ۱۱۸۸ھ میں پانی پت کے اندر عافیت سے ہے۔ محلّہ دہلی کے لوگ بھی بخیر ہیں۔ میری عمر اب اسی (۸۰)

[1] کلمات طیبات، ص ۲۸ تا ۳۰، مکتوب ۱۶۔

Marfat.com

سال کے قریب پہنچ گئی ہے۔ بڑھاپے کا ضعف غالب ہے۔ روزانہ چار وقت حلقہ ہوتا ہے۔ صبح، دوپہر، شام اور رات کو۔ لوگ حاضر ہوتے ہیں۔ علما و سادات کے گروہ کے گروہ اجازت حاصل کر کے (اپنے اپنے) شہروں کو جانے کی رخصت پاتے ہیں۔ اب میرے ہم عمروں میں کم لوگ باقی رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان کی حالت ابتر ہے۔ ہر طرف فتنہ برپا ہے۔ ارادۂ حج تھا، ناتوانی اور بے سامانی نے اجازت ہی نہ دی۔ اب سفر دراز آخرت درپیش ہے۔ حق تعالیٰ بزرگوں کی دعا سے آسانی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچا دے۔ آپ کے جدا ہونے کے بعد سے آج تک آپ کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ بعد انتظارِ بسیار حاجی عبدالقادر نے جو آپ کے مخلصوں میں سے ہیں، آپ کی سلامتی کا پیغام پہنچایا، جس سے اس مردۂ صد سالہ کے جسم میں جانِ تازہ آ گئی اور ایام گزشتہ کی صحبتیں یاد آنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر اور ارشاد و تلقین میں برکت عطا فرمائے۔

آپ نے اس علاقے کو منور کر دیا ہے۔ آپ سے اظہار اشتیاق ملاقات کروں تو بے کار ہے۔ اسباب ظاہری کے پیش نظر آپ سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بشرط حسن خاتمہ، بہشت جاوداں میں خاطر خواہ ملاقات میسر آئے گی۔

چوں کہ بُعدِ مسافت کے باعث بہت کم ہندوستانی آپ کے علاقے میں آتے جاتے ہیں، اس لیے ارسال خط و کتابت سے بھی قاصر ہوں اور آپ بھی معذور ہیں۔ الحمد للہ دعا سے غافل نہیں ہوں۔ آپ بھی خاتمہ بالخیر کی دعا سے مجھ کو فراموش نہ فرمائیں۔

ہمارے ہم پیروں (پیر بھائیوں) میں سے اس ہندوستان میں سوائے مرزا مظفر کے جو کہ ارشاد و تلقین میں مشغول ہیں، اب کوئی زندہ نہیں رہا۔ بلکہ خاندان عالی شان میں بھی ایسے صاحب زادگان جو اصحاب ارشاد و تاثیر ہوں، نہیں رہے۔ والسلام۔

(دیگر یہ کہ) اقامت دہلی کو ترک کرنے کا سبب یہ ہے کہ طالبان خدا، شہر میں کم اور قصبات میں زیادہ ہیں۔ تنعم و تجمل کے اسباب جو سرمایہ غفلت ہوا کرتے ہیں، شہر میں زیادہ اور دیہات و قصبات میں کم ہیں۔ والسلام [1]۔

ہندو مذہب کے بارے میں:

مرزا مظہر جانِ جاناں سے ایک شخص نے ہندو مذہب، ہندوؤں کے معتقدات اور ہندوؤں کی کتابوں کے بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے ایک مکتوب میں اس کی بھی وضاحت کی۔ خط طویل ہے، لیکن بعض علمی جزئیات کو محیط ہے لہٰذا پورے خط کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ اس سے مرزا صاحب کی وسعت معلومات کا پتا چلتا ہے۔

---

[1] مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔ بحوالہ "الفرقان" لکھنؤ۔ بابت جمادی الاخریٰ ۱۳۸۱ھ/ نومبر ۱۹۶۱ء

Marfat.com

''تم نے دریافت کیا ہے کہ آیا مشرکین عرب کی طرح کفار ہند کا دین بے اصل ہے یا اس کی کوئی حقیقت تھی، جو بعد میں منسوخ ہوگئی؟ اور یہ کہ ان کے پیش رووں کے متعلق کیا عقیدہ رکھنا چاہیے؟

''اختصار کے ساتھ اس کا تحقیق اور انصاف کی روشنی میں جواب تحریر کیا جاتا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اہل ہند کی قدیم کتابوں سے جو کچھ پتا چلتا ہے، وہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی پیدائش کے آغاز میں رحمت الٰہی نے ان کی دنیوی اور اخروی اصلاح کے لیے ''وید'' نام کی ایک کتاب، ایک فرشتے کے ذریعے جو ''برہما'' ❶ کے نام سے موسوم ہے اور جو ان کے عقیدے کے مطابق دنیا کی ایجاد کا ذریعہ اور آلہ ہے، بھیجی تھی۔ یہ کتاب چار دفاتر کو محیط ہے اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کی خبروں پر مشتمل ہے۔ ان کے علما نے اس کتاب سے چھ مذاہب استخراج کیے ہیں، اور اپنے اصولِ عقائد کی بنیاد اسی کو قرار دیا ہے۔ اس فن کو وہ ''دھرم شاستر'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ یعنی فن ایمانیات، ہماری اصطلاح میں اسے ''علم کلام'' کہا جاتا ہے۔

''نوع انسان کو انھوں نے چار فرقوں میں منقسم کیا ہے اور اس کتاب سے چار مسلک اخذ کیے ہیں۔ ہر فرقے کا ایک مسلک ٹھہرایا ہے اور فروع اعمال کی اساس اسی پر رکھی ہے۔ اس فن کا نام ان کی بولی میں ''کرم شاستر'' ہے، یعنی فن عملیات، جسے ہم اپنی اصطلاح میں ''علم فقہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لوگ چوں کہ فسخ احکام کے قائل نہیں ہیں، اور ہر دور اور ہر زمانے کے اہل دانش کے طبائع کے مطابق تبدیلی ضروری ہے، لہٰذا انھوں نے دنیا کی طویل عمر کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے کا نام ''جگ'' رکھا ہے۔ پھر ہر ''جگ'' کے لیے کتاب (وید) کے چاروں دفاتر سے طریق عمل اخذ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے متاخرین نے اس میں جو تصرفات یا تغیرات کیے ہیں، وہ قابل اعتنا نہیں ہیں۔

''ان کے تمام فرقے اللہ کی توحید پر ایمان رکھتے ہیں اور دنیا کو حادث و مخلوق مانتے ہیں۔ فنائے عالم، حشر جسمانی اور نیک و بد اعمال کی جزا کا انھیں یقین ہے۔ ان لوگوں کے عقلی و نقلی علوم، ریاضات،

❶ اس لفظ کے حاشیے میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ''رودِ کوثر'' (ص ۶۴۶، ۶۴۷) میں لکھتے ہیں کہ ''علامہ اقبال کا بھی کسی زمانے میں یہی خیال تھا۔ جب ''مخزن'' میں انھوں نے ہندوؤں کے مقدس بھجن گاتیری کا (۱۹۰۲ء) میں ترجمہ شائع کرایا تو اس میں ایک شعر یہ تھا:

ہر چیز کی حیات کا ہے پروردگار تو　　　زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو

''زائیدگانِ نور'' کی ترکیب کے متعلق اقبال نے یہ نوٹ دیا تھا۔ ''زائیدگانِ نور'' یعنی دیوتے۔ سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں۔ یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو، دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے، ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا، جس کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیوں کہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے، اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا موجب گردانا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔'' (اقبال)

Marfat.com

مجاہدات، تحقیق معارف اور مکاشفات میں بڑی دست رس حاصل ہے۔ ان کے کتاب خانے آج تک موجود ہیں۔ ان لوگوں میں بت پرستی کی جو رسم جاری ہے، اس کی تہہ میں شرک فی الالوہیت کا جذبہ کارفرما نہیں ہے، بلکہ اس کی حقیقت دوسری ہے۔

''ان کے عالموں اور دانش مندوں نے انسانی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، جس کی ترتیب یہ ہے۔ حصہ اول میں علوم و آداب کی تحصیل۔ حصہ دوم میں حصول معاش اور حصول اولاد۔ حصہ سوم تصحیح اعمال اور اصلاح نفس۔ حصہ چہارم میں ترک و تجرید کی مشق و ریاضت، جو انسان کی منتہائے کمال ہے، اور نجات کبریٰ جسے وہ ''مہامکت'' کہتے ہیں، اسی حصۂ چہارم میں منحصر ہے۔

''ان کے دین میں مکمل نظم و نسق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتب دین تھا، لیکن اب منسوخ ہو گیا ہے۔ شریعت اسلامی میں منسوخ شدہ مذاہب میں سوائے یہود اور نصاریٰ کے دین کے اور کسی دین کا ذکر نہیں، حالاں کہ ان کے علاوہ بھی بہت سے مذاہب منسوخ ہوئے اور بہت سے پیدا ہوئے اور ختم بھی ہوئے۔

''معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کی آیات کریمہ: ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ ❶ (کوئی امت ایسی نہیں، جس میں ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو) اور ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ﴾ ❷ (اور ہر امت میں رسول آیا) کے مطابق ممالک ہند میں بھی نبی اور رسول بھیجے گئے ہیں، اور ان کے احوال ان کی کتابوں میں مرقوم بھی ہیں، نیز جو ان کے آثار باقی ہیں، ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کمال و تکمیل کے مرتبے تک پہنچ گئے تھے اور رحمت عام نے اس وسیع مملکت کے انسانی معاملات کو فراموش نہیں کیا تھا۔

''منقول ہے کہ خاتم الرسل ﷺ کی بعثت سے پہلے ہر قوم میں پیغمبر بھیجے گئے تھے اور پوری قوم پر اپنے پیغمبر کی اطاعت اور فرماں برداری واجب تھی، نہ کہ دوسری قوم کے پیغمبر کی۔ ہمارے پیغمبر ﷺ کے ظہور کے بعد (جو پوری دنیا کے لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں اور خاتم الانبیاء ہیں اور جن کا دین مشرق و مغرب کے تمام ادیان کو منسوخ کر دینے والا ہے) جب تک دنیا باقی ہے، کسی کو ان کی اطاعت و فرماں برداری کے دائرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے آج تک کہ اس پر ایک ہزار ایک سو اسی سال گزر چکے، جو کوئی ان کی اطاعت میں نہ آیا، کافر ہے۔ لیکن آپ کی آمد سے پہلے لوگوں پر اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔ چوں کہ اسلام اس آیت کریمہ ﴿مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ ❸

❶ سورۂ فاطر: ۲۴۔

❷ سورۂ یونس: ۴۷۔

❸ یہ سورۂ مومن کی آیت نمبر ۷۸ کا ایک ٹکڑا ہے۔ آیت کے چند الفاظ یہ ہیں: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے: (اے پیغمبر) ہم آپ سے پہلے بہت پیغمبر بھیج چکے ہیں۔ ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ کو بتا دیا اور بعض کا نہیں بتایا۔

Marfat.com

کے مطابق بہت سے انبیا کے احوال سے متعلق خاموش ہے، لہٰذا ان کے بارے میں خاموش رہنا ہی اولیٰ ہے۔ نہ تو ہمیں ان کی پیروی کرنے والوں کے کفر و ہلاک کا یقین کرنا ضروری ہے اور نہ ان کی نجات پر ہی یقین کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں حسن ظن سے کام لینا ضروری ہے۔ بشرطیکہ طبیعتوں میں تعصب کا عمل دخل نہ ہو۔ اہل فارس کے بارے میں بھی بلکہ ہر ملک کے باشندوں کے بارے میں جو رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے گزرے ہیں، اور شریعت کی زبان جن کے متعلق خاموش ہے، یہی عقیدہ رکھنا بہتر ہے، اور بغیر کسی قطعی دلیل کے کسی کو کافر کہنا آسان نہیں سمجھنا چاہیے۔

''ان لوگوں کی بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض فرشتے جو اللہ کے حکم سے اس عالم کون و فساد میں تصرف رکھتے ہیں، یا بعض کاملین کی ارواح جن کا اجسام سے ترک تعلق کے بعد بھی اس کائنات میں تصرف باقی ہے، یا بعض ایسے زندہ افراد جو ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق حضرت خضر کی طرح حیات جاوید رکھتے ہیں، یہ لوگ ان کے بت تراش کر ان کو مرکز توجہ ٹھہراتے ہیں، اور اس توجہ کی وجہ سے کچھ مدت بعد یہ صاحب صورت سے ربط پیدا کر لیتے ہیں، اور پھر اس ربط کی بنا پر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کے تعلق کے سبب سے ان کی احتیاجیں پوری کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل اس ذکر رابطہ سے مشابہت و مماثلت رکھتا ہے، جو بعض مسلمان صوفیا کے ہاں مروج ہے کہ وہ اپنے پیر کی صورت کا تصور کرتے ہیں اور اس سے فیض اٹھاتے ہیں۔ (یعنی تصور شیخ) فرق صرف یہ ہے کہ مسلمان صوفیا، پیر کا بت نہیں تراشتے۔ لیکن یہ بات کفار عرب کے عقیدے سے مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ وہ بتوں کو اپنی ذات سے مؤثر اور متصرف جانتے تھے، اللہ تعالیٰ کے تصرف کا آلہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ لوگ ان بتوں کو زمین کا خدا قرار دیتے تھے اور خدا کو آسمان کا۔ یہ شرک فی الالوہیت ہے۔

''لیکن ان (کفار ہند) کا سجدہ ریز ہونا، سجدہ تہنیت ہے، سجدہ عبودیت نہیں۔ یہ وہی سجدہ ہے جو ان لوگوں کے مذہب کے مطابق وہ ماں، باپ، پروہت اور استاد وغیرہ کو بھی سلام کی جگہ کرتے ہیں، اور اسے یہ ''ڈنڈوت'' کہتے ہیں۔ باقی رہا تناسخ، تو جاننا چاہیے کہ عقیدۂ تناسخ سے کفر لازم نہیں آتا۔ والسلام [1]۔''

اس خط سے کئی چیزوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک یہ کہ مرزا جانِ جاناں، ہندو مذہب کے طریق عبادت سے بھی آگاہ تھے، اور ان کی مذہبی کتابوں کے مندرجات سے واقفیت رکھتے تھے۔ دوسرے کسی کو کافر قرار دینے کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ وسیع القلب اور فراخ حوصلہ عالم دین تھے۔

بلندیٔ اخلاق اور بلندیٔ کردار کی تلقین:

مرزا صاحب نہایت بلند اخلاق اور بلند کردار عالم دین تھے، اور لوگوں کو بھی یہی تعلیم دیتے تھے۔ بالخصوص علما اور اپنے مریدین کو بار بار حلم اور بردباری کی تلقین کرتے۔ ایک خط میں ایک شخص شاہ محمد سالم کو لکھتے ہیں:

[1] کلمات طیبات، ص ۲۵ تا ۲۷۔ مکتوب ۶۷۔

Marfat.com

''اپنی بدخلقی سے پیروں کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی تمھارے طریقے کی طرف رجوع کرے تو اس سے خدمت لینے کی بجائے، خود اس کی خدمت کرو۔ البتہ اگر وہ غلبۂ محبت کی وجہ سے خود ہی تمھاری خدمت کرے تو دوسری بات ہے ❶۔''

ایک خط میں ایک خاتون عقیدت مند کو اپنے سے بڑے کے لیے ادب اور چھوٹوں پر رحم و شفقت کی ان الفاظ میں تاکید فرماتے ہیں:

''اگر بزرگوں کے ساتھ ادب اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے زندگی گزارو تو کوئی تم سے برائی نہیں کرے گا۔ شوہر کی خدمت اور اطاعت کی پوری کوشش کرنی چاہیے، غصہ و غضب پی جانا چاہیے۔''

مرزا صاحب کی گھریلو زندگی بڑی تلخ تھی۔ ان کی بیوی انتہائی تند مزاج تھیں، پھر ان کو جنون کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ وہ عمر بھر ان کے لیے دردِ سر بنی رہیں۔ شاہ غلام علی لکھتے ہیں:

حضرت ایشاں می فرمودند کہ ایشاں را عارضہ سودا لاحق گشت و غلبہ جنون عقل را مستور ساخت ❷۔

(حضرت مرزا صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ ان کی اہلیہ کو سودا کی بیماری لاحق ہو گئی ہے اور غلبۂ جنون عقل پر چھا گیا ہے۔)

لیکن نہ کبھی بیوی پر سختی کی اور نہ کبھی دل میں علیحدگی اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ہمیشہ اس کی خدمت اور خاطر داری کو شعار بنائے رکھا۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی جو ان کے زمانے میں دیارِ ہند کے بہت بڑے عالم و فقیہ تھے، مرزا صاحب کے خاص مریدین میں سے تھے۔ مرزا صاحب کے ان سے انتہائی مخلصانہ مراسم تھے۔ ان کی بیمار بیوی قاضی صاحب مرحوم کے پاس پانی پت گئیں تو مرزا صاحب نے بیوی کے بارے میں ان کو خط لکھا کہ:

''ان کی درخواست پر پانی پت بھیجنے کا فیصلہ ہوا ہے۔ جب وہ پانی پت پہنچیں تو تمھارا فرض ہے کہ ان کی دل جوئی اور خاطر داری میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھو۔ وعظ و نصیحت میں ان پر سختی نہ کرنا، ان سے بہت ہی نرمی کا برتاؤ کرنا، اگر اس فقیر کی پس پشت برائی کریں تو ہرگز ان کا مقابلہ نہ کرنا، ان سے ہرگز بددل نہ ہونا، کیونکہ ہماری اور تمھاری خیریت اسی میں ہے۔''

مرزا صاحب کی بیوی کی حالت کبھی بہتر ہو جاتی تو نہایت مسرت کا اظہار کرتے اور خوش ہوتے کہ اب انھیں افاقہ ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے متعدد خطوط میں کیا ہے۔

مرزا صاحب کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود تو اولاد سے محروم تھے، لیکن ان کی بیوی کا ایک عزیز تھا جس کا نام پیر علی تھا، یہ بھی جنون اور سودا کا مریض تھا۔ اس کے اسلوب زندگی سے بھی مرزا صاحب بہت تنگ تھے، لیکن بے بس تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

❶ مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط، ص ۱۳۶۔

❷ مقاماتِ مظہری، فصل شانزدہم، ص ۶۳۔

Marfat.com

سیاسی حالات:

سیاسی اعتبار سے مرزا صاحب کے زمانے کے حالات نہایت ابتر تھے۔ مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہو چکی تھی اور اس کی شان وشوکت ختم ہو رہی تھی۔ ملک کے مختلف علاقوں میں سکھ اور مرہٹے بالخصوص مسلمانوں پر بے پناہ ظلم ڈھا رہے تھے۔ لوگ اس صورت حال سے انتہائی پریشان تھے۔ خود مرزا صاحب اپنے بعض مکتوبات میں اس کا بڑے دکھ اور تکلیف کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ وہ ملک کے سیاسی نشیب وفراز سے پوری طرح باخبر تھے، دہلی اور ملک کے دوسرے شہروں میں جو کچھ اکھاڑ پچھاڑ ہو رہی تھی، اس سے وہ بدرجہ غایت نالاں تھے۔ خود مسلمان امرا و وزرا بھی ظلم وستم ڈھانے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ شاہ عالم ثانی کا وزیر نجف عالم بڑا ظالم شخص تھا۔ مرزا صاحب ایک خط میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

”جس دن سے نجف خاں آیا ہے، اس شہر (دہلی) میں فقیر سے لے کر بادشاہ تک ہر شخص کی حالت خراب ہے۔“

مرزا صاحب بڑی دوررس نگاہ رکھتے تھے۔ اس زمانے کے سیاسی اتار چڑھاؤ کی کوئی بات ان سے مخفی نہ تھی۔ غلام عسکری خاں کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”شہر کے حالات سے لے کر محل کی خبروں تک فقیر سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ تمام حقائق فقیر تک پہنچ جاتے ہیں۔“

شعروشاعری:

مرزا صاحب بہت سے اوصاف کے مالک تھے۔ وہ شاعر بھی تھے، جیسا کہ پہلے بتایا گیا، ان کے اشعار کا مجموعہ خود ان کی زندگی میں تیار ہو چکا تھا، جس پر انھوں نے مقدمہ بھی لکھا۔ یہ شعر انہی کے ہیں:

ہوسِ عشق مکن اے دل بے صبر و قرار	عاشقی فن شریف است مگر کار تو نیست

ساقی بدہ آں مے کہ زمستی نشناسیم	پیمانہ کدام و لبِ جانا نہ کدام است

یہ اشعار بھی مرزا صاحب کے ہیں، جو وہ آخری دنوں میں شدت تکلیف اور عالم اضطراب میں پڑھتے تھے:

بنا کر دند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن	خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سیل خوں از سینۂ گرم رواں کردست عشق	نازم اعجازش کہ طوفاں از تنور آوردہ است

زخمِ دلِ مظہر مبادا بہ شود آگاہ باش	کایں جراحت یادگارِ ناوکِ مژگانِ اوست

Marfat.com

اردو کلام:

مرزا مظہر ممدوح نے اردو میں بھی شعر کہے ہیں۔ انھیں اردو زبان کا محسن کہنا چاہیے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا — لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بے کس افسوس ہے — کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا
چلے اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا — نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے — اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا — ڈبویا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا
جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے — غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم — کہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا، جانِ جاناں اپنا

نہیں کچھ غم کہ کیوں جلتا نہیں پیاں گسل میرا — کہ میں روتا ہوں دل کی بے کسی پر ہائے دل میرا

جواں مارا گیا خوباں کے اوپر میرزا مظہر — بھلا تھا یا برا تھا زور کچھ تھا خوب کام آیا
زخمی تری نگہ کا اک پل جیا تو پھر کیا — صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار — ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور — کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیکن — جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم — مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

گر گل کو گل کہوں تو ترے رُو کو کیا کہوں — بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

توفیق دے کہ شور سے اک دم وہ چپ رہے — آخر یہ میرا دل ہے، الٰہی جرس نہیں

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر — فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

Marfat.com

آج مت رنگِ حنا سے کف پا لال کرو — اے بتاں اس دلِ پُرخون کو پامال کو

یہ بلبلوں کا صبا مشہدِ مقدس ہے — قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

کسی کے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن — نہایت منہ سے لگایا ہے سجن نے بیڑہ پان کو

آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلا کہو — مت اس ستارۂ سوختہ کو دل کہا کرو

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ — اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ہاتھ
آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے — مینا لگا ہے جب سے مجھ بے نوا کے ہاتھ
مرتا ہوں میرزایئے گل دیکھ ہر سحر — سورج کے ہات چنوری تو پنکھا صبا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دلِ نازک کو اپنے تو — یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

تجلی گر تری پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی — فلک یوں چرخ کیوں کھاتا، زمیں کیوں فرش ہو جاتی
حنا تیرے کفِ پا کو نہ اس شوخی سے سہلاتی — یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انھوں کی نیند کیوں جاتی
الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا — محبت گر ہماری چشمِ تر سے منھ نہ برساتی

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے — کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے
نہ تو ملنے کے قابل رہا ہے — نہ تجکو وہ دماغ و دل رہا ہے
نہیں آتا کسی تکیہ اوپر خواب — یہ سر پانوں کے تیرے ہل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو — یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل — یہیں تک تھی ہماری زندگانی

وفات:

مرزا مظہر جانِ جاناں کی موت قاتل کی گولی سے واقع ہوئی۔ اس کی تہہ میں سیاسی اور مذہبی دونوں اسباب کارفرما تھے۔ اس متن کی تشریح یہ ہے کہ مرزا صاحب کے ارباب عقیدت اور اصحاب ارادت کی کثیر تعداد روہیلوں پر مشتمل تھی۔ وہ لوگ مغل حکومت کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکے تھے۔ نجف خاں کے زمانۂ وزارت میں جو شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت میں اس منصب پر فائز تھا، روہیلوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور انھوں نے

Marfat.com

دہلی کے مختلف علاقوں میں با قاعدہ سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ لوگ اس وقت تک عیش وعشرت سے دور تھے اور اپنے دست و بازو میں طاقت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نجف خاں سیاسی طور پر ان سے خوف زدہ رہتا تھا اور اپنے اقتدار کے لیے ان سے شدید خطرہ محسوس کرتا تھا۔ مرزا جانِ جاناں کی خانقاہ روہیلوں کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ نجف خاں متعصب شیعہ تھا اور مرزا صاحب کے مسلکی افکار وتصورات اس سے بالکل برعکس تھے۔ لہٰذا اس کے نزدیک سوا اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ مرزا صاحب کو قتل کرادے۔ چنانچہ ۷؍محرم ۱۱۹۵ھ/۳؍جنوری ۱۷۸۱ء کی شب کا کافی حصہ گزر چکا تھا کہ کچھ لوگوں نے مرزا صاحب کے دروازے پر دستک دی۔ ملازم باہر آیا۔ اس نے نوواردوں سے آنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے مرزا سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ ملازم نے اندر جا کر اطلاع دی۔ مرزا صاحب خواب گاہ سے باہر آئے۔ ان میں سے ایک مغل نوجوان نے آگے بڑھ کر پوچھا: ''مرزا مظہر آپ ہی ہیں؟'' مرزا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے دو ساتھیوں نے اس کی تصدیق کی۔ مغل نوجوان نے فوراً مرزا پر طمنچہ کی گولی داغ دی۔ گولی سینے میں بائیں جانب دل کے قریب پیوست ہوگئی۔ مرزا زمین پر گر پڑے، اور قاتل فرار ہو گئے۔ مسلمان جراحوں نے بہت علاج کیا، مگر افاقہ نہ ہوا۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب قاتل کا پتا نہ چلا تو بادشاہ دہلی نے مرزا صاحب کو پیغام بھیجا کہ قاتل کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر آپ اس کے بارے میں کچھ بتائیں تو ہم اس کو سزا دیں۔ جواب میں فرمایا:
''فقرا کشتۂ رہِ خدا ہیں۔ مردے کو مارنا قتل نہیں کہلاتا۔ قاتل ملے تو آپ سزا نہ دیں، اسے یہاں بھیج دیں۔''

آخر تیسرے دن ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ/ ۶ جنوری ۱۷۸۱ء کو مغرب کے وقت مرزا انتقال کر گئے ❶۔

نماز کے لیے بے چینی:

مرزا صاحب، نماز اور روزے کے لیے ہر آن پریشان رہتے اور ہمیشہ وقت پر یہ فریضہ ادا کرتے۔ یہی کیفیت موت کے وقت بھی ان پر طاری تھی۔ شاہ غلام علی وفات کے موقعے پر ان کی خدمت میں حاضر تھے۔ وہ اس سلسلے میں ان کی بے چینی کا مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار کرتے ہیں:

از نہایت ضعف، آواز مبارک شنیدہ نمی شدہ، روز صوم، روز جمعہ بعد نماز صبح از بندہ پرسیدند کہ یازدہ نماز از وقضا شدہ، وتمام بدن خون آلودہ است، طاقت برداشتن سر نہ باشد، نماز موقوف باید داشت و باشارہ برو ادا کند شما دریں مسئلہ چہ معلوم است؟ عرض نمودم، مسئلہ آں است کہ حضرت ایشاں فرمودند۔ بعد از گزاشتن نیم روز ہر دو دست برداشتہ تا دیرے فاتحہ خواندند ❷۔

(انتہائی کمزوری اور ضعف کی وجہ سے آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جمعہ کے روز، روزہ رکھتے تھے۔ نماز فجر

❶ مقامات مظہری، ص ۶۱۔

❷ مقامات مظہری، ص ۶۱۔

Marfat.com

کے بعد مجھ سے پوچھا کہ گیارہ نمازیں قضا ہو گئی ہیں۔ تمام بدن خون آلودہ ہے۔ سر اٹھانے کی ہمت نہیں۔ اٹھ کر نماز نہیں پڑھی جا سکتی، اشارے سے پڑھتا ہوں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا، مسئلہ وہی ہے جو آپ نے فرمایا۔ دوپہر کے وقت دونوں ہاتھ اٹھا کر دیر تک دعا کرتے رہے۔)

تدفین:

مرزا صاحب کو دہلی میں ترکمان دروازے کے باہر ایک حویلی میں دفن کیا گیا۔ یہ حویلی ان کی بیوی کی ملکیت تھی۔ بعد میں یہ حویلی خانقاہ شاہ غلام علی کہلائی۔ آج کل یہ خانقاہ شاہ ابوالخیر کے نام سے مشہور ہے۔ لوح قبر پر خود مرزا کا یہ شعر کندہ ہے:

بہ لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

اکثر معتقدین و معاصرین نے ان کی وفات کی تاریخیں کہیں، جن میں ایک میر قمر الدین منت ہیں، انھوں نے حدیث کے ان الفاظ سے تاریخ نکالی:

عاش حميدًا ومات شهيدا۔

۱۱۹۵ھ

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے قرآن مجید کی اس آیت سے تاریخ نکالی:

﴿اولئك مع الذين انعم الله عليهم﴾ ❶

۱۱۹۵ھ

مرزا صاحب کا وصیت نامہ:

مرزا جانِ جاناں نے وفات سے پہلے ایک وصیت نامہ لکھا تھا، جس سے ان کی اتباع کتاب و سنت کا پتا چلتا ہے۔ یہ وصیت نامہ حسب ذیل ہے:

''حمد و صلوٰۃ کے بعد فقیر جانِ جاناں محمدی مجددی، اس حالت میں کہ جس میں اقرار و مقر صحیح و معتبر ہوتا ہے، ان احباب کو چند وصیتیں کرتا ہے، جنھوں نے اس سے اخذ طریقت کیا ہے۔

''فقیر کی تجہیز و تکفین میں سنت نبوی پر عمل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے۔ اس کے بعد میری قبر پر دکان نہ لگائی جائے، کیوں کہ میں زندگی میں بھی اس کا مخالف تھا۔ میں بندگانِ خدا میں سے ایک

❶ قاتلانہ حملے اور وفات کی تفصیلات شاہ غلام علی نے مقامات مظہری میں بیان کی ہیں۔ دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی اس سلسلے کے واقعات تحریر کیے ہیں۔

Marfat.com

بندہ ہوں۔ میں نے صرف خدا کے نام پر تعلیم دی ہے اور بس۔!

''چند روز پہلے میری بیوی نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اپنے امورِ آخری کی تدبیر ان پر چھوڑ دوں۔ میں نے اس سلسلے میں انھیں ایک تحریر دے دی ہے تاکہ میرے بعد میرے مخلص ان کی مخالفت نہ کریں۔ وہ جہاں چاہیں مجھے دفن کریں۔ میں نے اس بات کا زبانی اقرار کرلیا ہے۔ لیکن ان دنوں یہ مستورہ کسی قطعہ زمین کی مالک نہ تھیں۔ حال ہی میں انھوں نے ایک حویلی خرید لی ہے، میں اس جگہ سے سخت متنفر ہوں۔ اگر وہ مجھے اس جگہ دفن کرنا چاہیں تو دوستی کے تقاضے سے میرے احباب پر واجب ہے کہ ہرگز یہ بات منظور نہ کریں۔ ہاں اس جگہ کے علاوہ جہاں بھی جگہ میسر ہو، ان کی مرضی کا خیال رکھیں۔ بیرون ترکمان دروازہ مناسب تر جگہ ہے۔

''اس مستورہ نے عارضہ سودا اور طویل عمری کی وجہ سے مجھے پریشان کیا ہے، جو دوستوں سے مخفی نہیں، لیکن میں نے سب معاف کر دیا ہے۔ اس محبت کے خیال سے جو انھیں خدا اور رسول ﷺ سے ہے، میرے مخلصین پر میرے حق وفا کے مطابق ان کی دل جوئی لازم ہے۔

''میرے مخلصین کو یہی وصیت کافی ہے کہ تادم آخریں، اتباع سنت میں کوشاں رہیں اور خدا کے سوا کسی کو مقصودِ حقیقی اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور کو متبوع واجب الاتباع نہ سمجھیں۔ فقیروں کے طور طریق اپنائیں اور دنیاداروں سے میل جول سے گریز کریں، علوم دین کے شغل سے خود کو معذور نہ رکھیں۔ اللھم وفقھم ❶۔''

نجف خاں:

مرزا مظہر جانِ جاناں کو چوں کہ نجف خاں نے قتل کرایا تھا، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ اس کے حالات بھی بیان کر دیے جائیں۔

نجف خاں، ایرانی نژاد تھا اور ایران کے بادشاہ حسین خاں صفوی کے وزیر اعظم آغا نجف خاں کا پوتا تھا۔ ۱۷۳۷ء کو اصفہان میں پیدا ہوا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اپنی اس بہن کے ساتھ جو صفدر جنگ کے بھائی محمد محسن کے عقد میں تھی، ہندوستان آیا اور الہ آباد کے حاکم محمد قلی خاں کے ہاں ملازم ہو گیا۔ ۱۷۶۱ء میں شجاع الدولہ نے محمد قلی خاں کو قتل کر دیا تو نجف خاں فرار ہو کر بنگال چلا گیا۔ وہاں نواب قاسم علی خاں نے اسے ملازم رکھ لیا اور فوج کی تیاری کے لیے تین لاکھ روپے دیے۔ ۱۷۶۴ء میں جب بکسر کی لڑائی کے بعد نجف خاں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر شجاع الدولہ کو قتل کیا اور قلعہ الہ آباد پر انگریزوں کا قبضہ کرا دیا تو اسے شاہی جرنیل تسلیم کر لیا گیا، کیوں کہ انگریز سیاسی مصالح کی بنا پر شاہ عالم ثانی کی حمایت میں جنگ کر رہے تھے۔ پھر انگریزوں کی سفارش پر اسے کوڑا کا شاہی فوج دار مقرر کیا گیا، لیکن پورا لگان وصول نہ کر سکنے کے الزام میں تین سال بعد اس

❶ مرزا صاحب نے یہ وصیت نامہ تحریر کر کے اپنے خلیفہ نعیم اللہ بہرائچی کو دے دیا تھا، جنھوں نے یہ معمولات مظہریہ میں نقل کیا ہے۔

Marfat.com

منصب سے الگ کر دیا گیا۔ اس اثنا میں نجف خاں ایک سال الہ آباد میں بے کار پڑا رہا۔ مئی ۱۷۷۱ء میں جب مغل حکمران عالم شاہ ثانی الہ آباد سے دہلی آیا تو نجف خاں کو بھی ساتھ لے آیا۔ اب وہ شاہی فوج کا کپتان مقرر ہوا، اور فوج کو منظم اور مسلح کرنے کے لیے اسے پچاس ہزار روپے دیے گئے۔

یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ جب بادشاہ الہ آباد سے دہلی آیا تو یہ شہر بادشاہ کے دشمنوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ جاٹ، مرہٹے، سکھ اور روہیلے اپنی اپنی طاقت آزمانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ صرف نجف خاں ہی وہ شخص تھا، جس نے ان تمام طاقتوں کو کچلا۔ اس نے خاص طور پر روہیلوں کو اپنا نشانہ بنایا، جن کی بڑھتی ہوئی طاقت مغل حکومت کے لیے مستقل خطرہ بنتی جا رہی تھی۔

دہلی کا دربار عرصے سے شیعہ اور سنی فرقوں کا اکھاڑہ بن چکا تھا۔ ایرانی اور تورانی باشندوں کے باہمی جھگڑوں کی بنیادی وجہ یہی مذہبی اختلاف تھا۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد جب ساداتِ بارہ کے دو بھائیوں نے طاقت پکڑی تو شیعیت کو بہت عروج حاصل ہوا۔ صفدر جنگ اور عماد الملک کی چپقلش کا بڑا باعث یہی چیز تھی۔ نجف خاں کٹر شیعہ تھا اور اس کے دورِ اقتدار میں سنی علما کو ہدفِ ستم ٹھہرایا گیا۔ اسی بنا پر بہت سے لوگ نجف خاں سے علانیہ اظہارِ نفرت کرنے لگے تھے۔ چنانچہ مرزا مظہر جانِ جاناں ایک خط میں صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ جس دن سے نجف خاں دہلی آیا ہے، فقیر سے لے کر بادشاہ تک ہر شخص کی حالت خراب ہے۔

مصحفی نے تذکرۂ ہندی گویان میں لکھا ہے کہ میں نجف خاں کے دور میں بارہ سال تک خانہ نشین رہا۔ اس حشر اجساد و اموات میں، تلاش معاش کے لیے ہرگز گھر سے نہیں نکلا۔

مولانا فخر الدین جو مرزا مظہر جانِ جاناں کے معاصر اور بارھویں صدی ہجری کے بہت بڑے ہندی عالم، صوفی اور مدرس تھے، نجف خاں سے انتہائی نالاں تھے۔ مرتے وقت اس نے مولانا فخر الدین کو بلوایا۔ وہ اس کے پاس چلے تو گئے مگر فرمایا کہ ہمارا اور تمھارا کوئی باہمی تعلق نہیں ہے، صرف عیادت کو آ گیا ہوں۔ نجف خاں کے جنازے میں مولانا فخر الدین شامل نہیں ہوئے۔

نجف خاں، مئی ۱۷۷۱ء میں عالم شاہ ثانی کے ساتھ الہ آباد سے دہلی آیا اور اسے شاہی فوج کے کپتان کا منصب عطا ہوا۔ ۵ جون ۱۷۷۲ء کو اسے میر بخشی مقرر کیا گیا۔ ۱۷۷۹ء کو وکیل مطلق بنایا گیا۔ ۱۷۸۲ء/ ۱۱۹۶ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔

نجف خاں حکومت کے مختلف بلند مناصب پر فائز رہا، مگر انتظامی صلاحیتوں سے محروم تھا۔ عیاش بھی ہو گیا تھا۔ یہ تمام عیب اس کے زوال کا باعث بنے۔

آخر میں یہ پھر عرض کر دیں کہ حضرت میرزا مظہر جانِ جاناں، سرزمین برصغیر کے جلیل القدر عالم، بلند مرتبہ فقیہ، مشہور شیخ، معروف صوفی اور بہت متقی بزرگ تھے۔ فارسی اور اردو کے بہترین شاعر تھے۔ ان کے دور کے علما و مشائخ اور ادبا و شعرا کھلے دل سے ان کی تعریف کرتے اور انھیں مختلف قسم کے علمی اوصاف کا مالک قرار

Marfat.com

دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا علم ہم دوشِ عمل اور ان کا فکر ہم آہنگ تحقیق تھا۔

کتاب وسنت کے اس شیدائی کو اللہ نے مرتبۂ شہادت سے سرفراز کیا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ ❶۔

۵۷۔ مولانا جار اللہ سائیپوری

مولانا جار اللہ بن محمود بن عطاء اللہ بن عبدالحی بن علم الدین سائیپوری کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے کہ وہ حدیث اور فقہ کے ممتاز علمائے ہند میں سے تھے۔ ''کتاب الشتیٰ'' کے نام سے ان کی ایک مفید تصنیف بھی ہے۔ انھوں نے ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء میں وفات پائی ❷۔

۵۸۔ مولانا جان محمد لاہوری

مولانا جان محمد لاہوری، بارھویں صدی ہجری میں بلدۂ لاہور کے مشاہیر افاضل میں سے تھے۔ حدیث، فقہ اور اصول فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔ لاہور میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ معرفت وطریقت میں بھی بڑی شہرت کے مالک تھے۔ لاہور کے محلّہ پرویز آباد میں، جس کی آبادی شہر سے باہر تھی، سکونت پذیر تھے۔

مولانا جان محمد کے حالات میں مذکور ہے کہ صغر سنی میں شیخ اسماعیل (جو بڑے میاں کے عرف سے معروف تھے، اب بھی لاہور کے علاقہ باغ بان پورہ میں بڑے میاں کا درس موجود ہے) کے خلیفہ شیخ عبدالحمید سے تحصیل علم کرتے تھے۔ ایک روز اپنے استاذ (شیخ عبدالحمید) کے ساتھ میاں صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میاں صاحب نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا، اے لڑکے! اگر تم عالم و فاضل ہو جاؤ تو کیا ہمارے ساتھ حدیث کا تکرار کرو گے؟ مولانا جان محمد ابھی عمر کی ابتدائی منزلوں میں تھے، شرم وحیا اور پاس ادب سے خاموش رہے۔ شیخ عبدالحمید نے جو ان کے استاذ تھے، فرمایا، جواب دو کہ اگر آپ کی دعا اور توجہ سے تحصیل علم کی نعمت سے بہرہ ور ہو گیا تو حاضر خدمت ہوں گا۔ چنانچہ سعادت مند شاگرد نے میاں صاحب ممدوح کے سامنے یہی کلمات دہرا دیے۔ میاں صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کی جو درجہ قبولیت کو پہنچی اور جان محمد بہت

❶ مرزا مظہر جانِ جاناں کے حالات کے لیے دیکھیے: خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ۶۸۴ تا ۶۸۷۔ مقامات مظہری۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۳۔ انوار العارفین، ص ۴۲۲ تا ۴۲۵۔ سرد آواز، ص ۲۳۲۔ الیانع الجنی، ص ۶۷۔ گلزار اولیا، ص ۴۱ تا ۴۷۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ص ۴۵۰۔ کلمات طیبات۔ تذکرۂ بے نظیر، ص ۱۱۶ تا ۱۱۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۰ تا ۵۴۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۲۶، ۲۲۷۔ مفتاح التواریخ، ص ۳۵۸۔ مرقع دہلی، ص ۴۰، ۴۱۔ گل رعنا، ص ۱۲۰ تا ۱۳۲۔ معمولات مظہریہ۔ مکاتیب مرزا مظہر۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط۔ آب حیات، ص ۴۱ تا ۴۷۔ رود کوثر، ص ۴۴۶ تا ۴۴۹۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۴۔

Marfat.com

تھوڑی مدت میں علم و فضل کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ یہاں تک کہ علمی فضیلت و قابلیت میں اپنے استاد شیخ عبدالحمید سے بھی فوقیت لے گئے۔ شیخ عبدالحمید، لائق شاگرد کے علم و فضل اور ذہانت و قابلیت سے بہت خوش تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اب شاگرد استاذ سے بھی آگے نکل گیا ہے اور اس کا طائر ہمت مزید بلندی کی طرف محوِ پرواز ہے تو اپنے سے علیحدہ کر کے خود ہی شیخ تیمور کے حلقۂ درس میں داخل کرا دیا، جو لاہور کے اکابر علمائے وقت میں سے تھے۔ کچھ عرصہ ان سے استفادہ کیا اور دستار فضیلت حاصل کی۔ اس کے بعد میاں اسماعیل عرف میاں کلاں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حسب وعدہ ان سے حدیث کا تکرار کرنے لگے۔ اس کے بعد اس کام کے لیے جمعہ اور دوشنبہ کا دن مقرر ہوا۔ جب تک میاں صاحب زندہ رہے، ہفتے میں دو دفعہ بالالتزام دونوں کے درمیان تکرار حدیث کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا جان محمد لاہوری نے ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء کو لاہور میں وفات پائی❶۔

۵۹۔ شیخ جلال الدین گجراتی

شیخ جلال الدین بن محمد بن جعفر بن جلال بن محمد حسینی بخاری گجراتی، ۲ر جمادی الاولیٰ ۱۰۶۲ھ/ یکم اپریل ۱۶۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی شیخ محمد گجراتی ایک نامور عالم تھے، بیٹے نے انہی سے علم حاصل کیا اور فقہ کی تحصیل بھی کی، طریقت و تصوف بھی انہی سے سیکھا، یہاں تک کہ علم و فضل اور فقہ و تصوف کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ دو رسالے بھی تصنیف کیے۔ ایک خوابوں کی تعبیر سے متعلق، جس کا نام ''مرآۃ الرویا'' ہے۔ دوسرا اذکار و اشغال اور وظائف کے بارے میں، اس کا نام ''مفتاح الحاجات'' ہے۔

وفات سے پہلے سخت بیمار ہو گئے تھے۔ بیماری کچھ اس نوعیت کی تھی کہ غذا بالکل ترک کر دی تھی۔ البتہ تھوڑا سا پھل انار یا انجیر وغیرہ کھا لیتے تھے۔ ۲۰ر ذی الحجہ ۱۱۱۴ھ/ ۲۶ر اپریل ۱۷۰۳ء کو احمد آباد میں فوت ہوئے۔ ''محبوب ذی المنن'' کی روایت کے مطابق ۱۱۰۴ھ/ ۱۶۹۳ء کو وفات پائی❷۔

۶۰۔ مولانا جلال الدین مچھلی شہری

مولانا جلال الدین جعفری ہاشمی مچھلی شہری، قاضی ثناء الدین جعفری زیلبی ہاشمی کی نسل سے تھے۔ سلسلۂ نسب رسول اللہ ﷺ کے ابن عم حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مشہور مقام مچھلی شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ علم حاصل کیا اور فقہ و اصول کے ماہرین میں گردانے گئے۔ عمر بھر درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں مصروف رہے۔ علم فقہ میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۳۹۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۵۔ خزینۃ الاصفیاء، ص ۸۳، ۸۴۔

❷ محبوب ذی المنن، حصہ دوم، ص ۲۳۵، ۲۳۶۔ مرآۃ احمدی، ج ۲، ص ۲۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۶۔

Marfat.com

فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ کہتے ہیں انھوں نے فتاویٰ عالم گیری کی پہلی جلد تصنیف کی [1]۔

۶۱۔ شیخ جمال الدین گجراتی

شیخ جمال الدین بن رکن الدین عمری چشتی گجراتی، عالم صالح اور اپنے دور کے مشہور شیخ تھے۔ ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۷ء کو احمد آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی شیخ رکن الدین گجراتی سے جو عالم کبیر تھے، علم حاصل کیا۔ عرصے تک ان سے منسلک رہے۔ طریقت و تصوف کی تحصیل بھی ان ہی سے کی۔ علوم سے فارغ ہونے کے بعد درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں۔ متعدد کتابوں پر شروح و حواشی لکھے۔ صاحب جود و سخا اور پیکر کرم و احسان تھے۔ طلبا کی ایک جماعت ان سے استفادہ کرتی تھی، ان کے ساتھ انتہائی سخاوت کا برتاؤ کرتے۔ مسافروں کی مدد کرتے۔ ان کے شب و روز کے دو ہی مشاغل تھے، ایک عبادت، دوسرے تدریس و تصنیف، ان کی تصانیف و شروح میں سے مندرجہ ذیل کتابیں لائق تذکرہ ہیں۔

شرح جامی پر حاشیہ، منہل الصافی پر حاشیہ، زبدہ پر حاشیہ، قطب الدین رازی کی شرح شمسیہ پر حاشیہ، علم معانی و بیان کی مشہور کتاب مطول پر حاشیہ، سعد الدین تفتازانی کی شرح العقائد پر حاشیہ، حاشیہ الخیالی پر حاشیہ، مختصر المعانی پر حاشیہ، تلویح پر حاشیہ، تفسیر المدارک پر حاشیہ، تفسیر بیضاوی پر حاشیہ، تفسیر الاحمدی پر حاشیہ، تفسیر حسینی پر حاشیہ۔ ان تفاسیر قرآن پر حواشی کے علاوہ خود انھوں نے تفسیر المختصر اور تفسیر نصیری کے نام سے تفسیریں لکھیں۔ علاوہ ازیں فتح الجمال تصنیف کی۔

پھر مولانائے روم کی مثنوی کی شرح سپرد قلم کی۔ سواطع جامی کی شرح لکھی۔ جام جہاں نما کی شرح لکھی، فصوص الحکم کی شرح لکھی، سید محمد بن یوسف حسینی کی ''اسماء الاسرار'' کی شرح لکھی، مرآۃ العارفین کی شرح، التعرف کی شرح، عوارف المعارف کی شرح، آداب المریدین کی شرح، اسرار الخلوت کی شرح، بحر الاسرار کی شرح بھی ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ علاوہ ازیں درۃ التاج، مرقاۃ السلوک، قرۃ العین، نور الاولیا، رکن الطریقۃ، مشہد الجمال، آثار السلوۃ، مراصد الکمال، کمند وحدت، شرح التقسیم وغیرہ متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ اس عالم دین کو ہر موضوع سے دلچسپی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف و شروح کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ کہتے ہیں ایک سو بیالیس شروح و تصانیف ان کی یادگار ہیں۔

شیخ جمال الدین گجراتی شاعر بھی تھے۔ چنانچہ فارسی کا ایک دیوان ان کے رشحات فکر میں شامل ہے۔

اس عالم دین نے ۶ ربیع الثانی ۱۱۲۴ھ/۲ مئی ۱۷۱۲ء کو وفات پائی [2]۔

---

[1] تجلی نور، ج ۲، ص ۱۲۱، ۱۲۲۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۰۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۶، ۵۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۲۶۶۔

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۸، ۵۹۔ محبوب ذی المنن، حصہ دوم، ص ۲۲۹ تا ۲۳۳۔

Marfat.com

ـــــ ح ـــــ

۶۲۔ مولانا حامد جون پوری

مولانا حامد جون پوری کبار فقہائے ہند میں سے تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے، لیکن آغاز جوانی ہی میں ترک وطن کر گئے تھے۔ زیادہ تر کتب درسیہ سید محمد زاہد بن سید محمد اسلم ہروی سے پڑھیں اور بعض کے لیے دانش مند خاں یعنی علامہ محمد شفیع یزدی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، پھر اس مرتبہ علمی کو پہنچے کہ اکثر علوم وفنون میں اپنے شیوخ واساتذہ کی زندگی میں ہی مہارت پیدا کر لی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند تدریس آراستہ فرمائی اور علمی وفنی مباحث میں درجۂ کمال سے سرفراز ہوئے۔

ان کی فراوانی علم سے متاثر ہو کر بادشاہ ہند شاہ جہان نے ان کے لیے یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ بعد ازاں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں ''فتاویٰ عالم گیری'' کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا تو عالم گیر نے اس خدمت علمی پر مامور کر دیا۔ عالم گیر نے ان کو اپنے بیٹے شہزادہ محمد اکبر کا اتالیق بھی بنا دیا تھا❶۔

ڈاکٹر زبید احمد نے مولانا حامد جون پوری کے حاشیہ تفسیر بیضاوی کی نشان دہی بھی کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ بوہار لائبریری (ہوگلی) میں موجود ہے❷۔

۶۳۔ شیخ حبیب اللہ بہاری

شیخ حبیب اللہ بن ذکی الدین بہاری، شیخ شرف الدین احمد بن یحیٰی منیری کی اولاد سے تھے۔ بلدۂ بہار میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والد شیخ ذکی الدین بہاری سے جو ایک عالم دین بزرگ تھے، تحصیل کی۔ بعد ازاں عازم جون پور ہوئے۔ وہاں شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کے بیٹے شیخ محمد ارشد عثمانی جون پوری کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ یہاں تک کہ مختلف علوم وفنون اور فقہ میں کمال حاصل کیا۔ پھر واپس اپنے شہر بہار تشریف لے گئے اور اپنے اسلاف کی مسند مشیخت کو زینت بخشی۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ ہدیۃ السالکین اور تحفۃ الذاکرین کے نام سے دو کتابیں تصنیف کیں۔

جمعرات کے روز ۲۹ ربیع الاول ۱۱۱۸ھ/۳۰ جون ۱۷۰۶ء کو وفات پائی❸۔

---

❶ تجلی نور، ج ۲، ص ۹۳، ۹۴۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۲۹، ۱۳۰۔ بزم تیموریہ، ص ۲۴۰، ۲۴۱۔ انفاس العارفین۔ سبحۃ المرجان۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۶۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۰۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۲۹۸، ۲۹۹۔ ''معارف'' اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۴۷ء۔

❷ عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ، ص ۲۷۳۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۰ بحوالہ گنج ارشدی۔

Marfat.com

۶۴۔ قاضی حبیب اللہ تاج پوری

قاضی حبیب اللہ تاج پوری عابد و زاہد، متقی و متورع اور نامور عالم و فقیہ تھے۔ تاج پور شہر کے منصب قضا پر فائز تھے۔ طریقت و تصوف سے بھی وابستگی تھی اور اس سلسلے میں شیخ محمد ارشد بن محمد رشید عثمانی جون پوری سے فیض یافتہ تھے۔ رشد و ہدایت کے پیکر تھے۔ فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے۔ عمر بھر لوگوں کی ظاہری و باطنی اصلاح میں مصروف رہے۔ ۱۸؍ ذی الحج ۱۱۰۸ھ/ ۲۸؍ جون ۱۶۹۷ء کو وفات پائی۔ مدن پور میں مدفون ہیں، جو اعمال سارن میں ایک قریہ تھا[1]۔

۶۵۔ شیخ حبیب اللہ قنوجی

شیخ حبیب اللہ قنوجی کا مولد و منشا شہر قنوج ہے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم کے لیے سندیلہ کا عزم کیا۔ وہاں کے بعض علماء سے ''ضوء المصباح'' کا درس لیا۔ پھر جون پور گئے جو اس زمانے میں علم کا مرکز تھا۔ وہاں مولانا عبدالباقی صدیقی جون پوری کے مدرسے میں داخلہ لیا اور تمام مروجہ کتب درسیہ پڑھیں۔ پھر الہ آباد کا قصد فرمایا، وہاں شیخ عبدالجلیل الہ آبادی (متوفی ۶؍ شعبان ۱۱۱۴ھ/ ۱۵؍ دسمبر ۱۷۰۲ء) سے اخذ طریقت کیا اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہ کر تصوف و سلوک کی منزلیں طے کیں۔

شیخ موصوف عالم باعمل اور فقیہ نامدار تھے۔ اور ناصح و واعظ۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ مذاق الصوفیہ: یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور تصوف سے متعلق ہے۔ آغاز ''حمد بے حد مر جلیلے را'' کے الفاظ سے ہوتا ہے۔

۲۔ خلاصۃ الاکتساب: یہ کتاب بھی سلوک و تصوف کے بارے میں ہے اور فارسی میں ہے۔ اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: سبحان اللہ منہ البدایۃ والنہایۃ۔

۳۔ جواہر الخمسہ۔

۴۔ تذکرۃ الاولیا۔

۵۔ روضۃ النبی فی الشمائل۔

۶۔ انیس العارفین۔

۷۔ ایک کتاب الفاضل کے نام سے مسائل فقہ کے بارے میں تصنیف کی۔

۸۔ ایک رسالہ علم منطق کے موضوع میں لکھا۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۱ بحوالہ گنج ارشدی۔

Marfat.com

شیخ حبیب اللہ قنوجی نے ۱۱۴۰ھ/ ۱۷۲۸ء کو قنوج میں وفات پائی۔ بعض علما نے اس عالم وفقیہ کی تاریخ وفات الموت حبس یوصل الحبیب الی الحبیب کے الفاظ سے نکالی ❶۔

۶۶۔ سید حسن دہلوی عرف رسول نما

سید حسن بن ابوالحسن حسینی نارنولی ثم دہلوی، رسول نما کے عرف سے معروف تھے۔ شیخ وقت اور عالم وفقیہ تھے۔ نارنول میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ قرآن مجید اور فارسی کے چند مختصر رسائل پڑھنے کے بعد بچوں کو پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد جون پور چلے گئے اور وہاں کے بعض علما سے چند روز تک عربی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ انہی دنوں جون پور کے ایک عالم بنارس کے سفر پر روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ چلے گئے۔ پھر اس عالم نے بنارس سے الہ آباد کا قصد کیا تو سید حسن نے موضع بہلول کی راہ لی، جو ان دنوں لکھنؤ سے بیس میل کے فاصلے پر ایک قریہ تھا۔ بہلول کے رئیس کا نام چودھری جلال الدین تھا، وہ ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ بڑے اعزاز سے پیش آیا اور اپنے گاؤں میں ان کی آمد کو غنیمت جانا۔ کچھ عرصے کے بعد بہلول سے لکھنؤ چلے گئے۔ لکھنؤ میں ایک عالم دین مولانا عبدالقادر عمری لکھنوی اقامت پذیر تھے، ان سے تحصیل علم کی۔ جون پور، بنارس، بہلول اور لکھنؤ میں ان کی کل مدت قیام وسفر چودہ سال بنتی ہے۔

لکھنؤ سے اپنے وطن نارنول کا عزم کیا اور صوفیا وفقرا میں شمولیت اختیار کر لی۔ بارہ سال نارنول میں مقیم رہے۔ پھر دہلی چلے گئے اور تادمِ زندگی دہلی ہی کو اپنا مسکن قرار دیے رکھا۔

سید حسن ممدوح علم تفسیر، حدیث، اصول فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ اس دور کے علما و مشائخ میں علم وحلم، انکسار و تواضع، وقار و اکرام اور ہیبت وجلال میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ ہمیشہ ریاضت ومجاہدہ میں مشغول رہتے، نہ خود اہل دنیا سے اختلاط رکھتے اور نہ اہل دنیا کو اپنے قریب آنے کا موقع دیتے۔

مشہور تھا کہ خواب میں ان کو رسول اللہ ﷺ کی زیارت ورؤیت کا شرف حاصل ہوتا تھا، لہٰذا لوگوں نے ان کو ''رسول نما'' کا لقب دے رکھا تھا۔

اس عالم وفقیہ نے ہفتے کے روز ۲۲ رشعبان ۱۱۰۳ھ/ ۲۹ راپریل ۱۶۹۲ء کو وفات پائی ❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۲۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۴۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۷، ۴۳۸۔ عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ، ص ۳۰۶، ۲۶۳۔

❷ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، مناقب الحسن رسول نما۔ منتخب اللباب، ج ۲، ص ۵۵۲، ۵۵۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۳، ۶۴۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۵۳۔ سمات الاخیار ص ۷۶۔

Marfat.com

۶۷۔ قاضی حسن سعید جون پوری

قاضی حسن سعید بن محمد سعید بن محمد مبارک حسینی جون پوری، شیخ وقت اور متقی عالم تھے۔ فقہ اور اصول فقہ کے ماہرین میں سے تھے۔ ان کا مولد و منشا جون پور تھا۔ طویل مدت تک حصول علم میں مشغول رہے، یہاں تک کہ فتویٰ اور تدریس کے منصب بلند پر فائز ہوئے۔ پہلے جون پور کی مسند افتا سنبھالی، پھر وہیں کے قاضی مقرر کیے گئے۔ ان کے والد شیخ محمد سعید جون پوری دہلی میں ملوک و امرا کے نزدیک بڑی عزت و احترام کے مالک تھے۔ قاضی حسن سعید نے بھی حکام وقت سے تقرب پیدا کر لیا تھا، جس کے نتیجے میں دہلی کے قاضی اکبر کے منصب کو پہنچے۔ پھر ہندوستان کی مسند قضا سے سرفراز ہوئے۔ بارھویں صدی ہجری کے اس جید عالم و فقیہ نے ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں وفات پائی ❶۔

۶۸۔ قاضی حیدر کشمیری

قاضی حیدر بن ابو حیدر کشمیری، شیخ و فاضل اور دیار کشمیر کے اکابر فقہا میں سے تھے۔ قاضی خاں کے عرف سے معروف تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ شیخ عبدالرشید زرگر کشمیری (متوفی ۱۱۵۵ھ/ ۱۷۴۲ء) اور دیگر علما سے علم حاصل کیا۔ جب مختلف علوم و فنون کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تو تنگیٔ معاش کی وجہ سے ترکِ وطن کر کے دہلی کا عزم کیا اور اورنگ زیب عالم گیر کے لشکر میں آ گئے۔ وہاں سیادت خاں صدر الصدور سے تعلق پیدا کر کے بادشاہ (اورنگ زیب) کی خدمت میں حاضری دی۔ اورنگ زیب علمائے دین کا قدر دان تھا، اس کو ان کی وسعت علم کا پتا چلا تو اپنے پوتے محمد عظیم کا اتالیق مقرر کر دیا۔ کچھ عرصہ اس خدمت پر مامور رہے۔ پھر دہلی کے قاضی مقرر کیے گئے۔ ان کی معدلت گستری سے بادشاہ اتنا متاثر ہوا کہ ۱۱۱۷ھ/ ۱۷۰۵ء میں قاضی القضاۃ کا منصب عطا کر دیا۔

اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم نے ان کو جودھ پور بھیج دیا تھا۔ وہاں جا کر مسجدیں تعمیر کیں اور گرجے ڈھا دیے۔ اس علاقے کے مختلف شہروں میں قاضی و والی مقرر کیے اور غیر مسلموں سے جزیہ وصول کیا۔ اس کشمیری عالم و فقیہ نے عارضہ اسہال سے ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء کو دکن میں وفات پائی، ان کی میت دکن سے کشمیر لا کر دفن کی گئی ❷۔

---

❶ تجلی نور، ج ۲، ص ۲۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۳۷۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۶۴، ۶۵۔

❷ مآثر عالم گیری، ص ۵۱۴، ۵۲۱، ۵۲۴۔ منتخب اللباب، ج ۲، ص ۶۰۶، ۶۰۷۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۶۲۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۷۷۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۵۴۔ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۱۶، ۲۱۷۔ روضۃ الابرار، ص ۵۹۔

Marfat.com

ـــــ خ ـــــ

٦٩۔ خواجہ میر درد دہلوی

خواجہ میر درد دہلوی نجیب الطرفین سید تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب والد کی جانب سے گیارہ واسطوں سے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے اور والدہ کی جانب سے پچیس واسطوں سے حضرت امام حسن عسکری سے ملتا ہے۔

خواجہ نقشبند:

خواجہ میر درد کے اجداد کرام میں سے جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، ایک بزرگ خواجہ بہاء الدین نقشبند تھے جو سلسلۂ نقشبندیہ کے سرخیل تھے۔ ان کا نام محمد بن محمد بخاری تھا اور خواجہ بہاء الدین کے عرف سے معروف تھے۔ ''خواجہ'' ان کا لقب تھا، جس کا اطلاق ان کی اولاد میں بھی جاری رہا۔ اس لفظ کی وضاحت میں خود خواجہ میر اپنی کتاب ''علم الکتاب'' میں لکھتے ہیں:

''خواجہ بمعنی مالک و سردار و صاحب و مولیٰ است، لہٰذا اطلاق آں بر ذریات مولیٰ الموالی علیہ السلام کردہ اند، و اکابر سادات ملقب بہ لقب خواجگان شدہ اند، و حضرت بہاء الدین نقشبند قدس سرہ العزیز کہ از سادات صحیح النسب اند و بایازدہ واسطہ جد پدری بندہ اند، نیز خواجہ می گفتند۔

(یعنی لفظ خواجہ مالک، سردار، صاحب اور مولیٰ کے معنی میں مستعمل ہے، اس لیے اس کا اطلاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد پر ہونے لگا اور اکابر سادات خواجگان کے لقب سے ملقب ہوئے۔ حضرت بہاء الدین نقشبند قدس سرہ العزیز بھی جو کہ صحیح النسب سادات میں سے تھے اور گیارہ واسطوں سے والد کی جانب سے میرے جد امجد ہیں، خواجہ کہلائے۔)

خواجہ بہاء الدین کو نقشبند اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کا پیشہ کمخواب بافی اور نقشبندی تھا۔ چنانچہ سفینۃ الاولیاء میں دارا شکوہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

حضرت می فرمودند کہ من و پدرم بہ صنعت کمخواب بافی و نقشبندی مشغول بودیم۔

(کہ حضرت خواجہ بہاء الدین فرمایا کرتے تھے کہ میں اور میرے والد کمخواب بافی اور نقشبندی کا کام کرتے تھے۔)

خواجہ بہاء الدین کی وفات کے بعد ان کی اولاد نے بھی اپنے لیے لفظ خواجہ اور نسبت نقشبند کو اپنے اسما کے ساتھ برقرار رکھا۔ خواجہ نقشبند ممدوح ۷۱۸ھ/ ۱۳۱۸ء کو بخارا میں پیدا ہوئے۔ عمر بھر رشد و ہدایت میں مشغول

Marfat.com

رہے۔ ۱۳ ربیع الاول ۷۹۱ھ/ ۱۲ مارچ ۱۳۸۹ء کو بخارا میں وفات پائی۔ "قصر عارفاں" میں دفن کیے گیے جو اس زمانے میں بخارا سے ایک کوس کے فاصلے پر واقع تھا۔

برصغیر میں آمد:

خواجہ بہاء الدین نقشبند کے کم وبیش تین سو سال بعد ان کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ محمد طاہر نقشبند اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں وارد ہند ہوئے، اور یہی وہ بزرگ ہیں جنھیں خواجہ میر درد کے مورث اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ اورنگ زیب بزرگان دین اور علمائے کرام کا بے حد قدر دان تھا، وہ ان سے انتہائی عقیدت سے پیش آیا، اپنے قریب بٹھایا اور حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کی درخواست کی، مگر خواجہ محمد طاہر نے اسے منظور نہ فرمایا۔ ان کے تین بیٹے تھے، خواجہ محمد صالح، خواجہ محمد یعقوب اور خواجہ فتح اللہ! خواجہ صاحب نے اپنے ان بیٹوں کو تو دہلی میں عالم گیر کے دربار میں چھوڑا اور خود حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ (ایک روایت کے مطابق بخارا چلے گئے تھے)۔ خواجہ صاحب کے دہلی سے جانے کے بعد اورنگ زیب بادشاہ نے ان کے تینوں بیٹوں کی بڑی توقیر کی اور ان کی شان کے مطابق مناصب عطا کیے۔ خواجہ محمد صالح اور خواجہ محمد یعقوب کی تو اپنے بھائی شہزادہ مراد کی دو بیٹیوں سے شادی بھی کر دی تھی۔ تیسرے بھائی خواجہ فتح اللہ کا عقد بھی بادشاہ نے ایک مغل شہزادی سے کرنا چاہا مگر انھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ صحیح النسب سید ہیں، مغل خاندان میں شادی کر کے اپنے نسب میں اختلال نہیں پیدا کرنا چاہتے۔

خواجہ فتح اللہ کے بیٹے نواب ظفر اللہ خاں اور نواب ظفر اللہ خاں کے بیٹے خواجہ محمد ناصر عندلیب تھے۔ خواجہ محمد ناصر کے والد (نواب ظفر اللہ خاں) اور دادا (خواجہ فتح اللہ خاں) کا شمار عہد عالم گیری کے امرا میں ہوتا تھا، لیکن خواجہ محمد ناصر عندلیب پر ترک دنیا اور درویشی کا غلبہ تھا اور مستغنی المزاج بزرگ تھے، اس لیے قبول امارت اور حصول منصب کو درخور اعتنا نہیں گردانا اور فقر و غنا کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کو تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصانیف ہیں:

۱۔ نالۂ عندلیب: یہ کتاب فارسی نثر میں ہے۔ مصنف شہیر نے یہ کتاب ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۰ء میں مکمل کی۔ حضرت نواب سید صدیق خاں رحمۃ اللہ علیہ (بھوپال) کے فرزند گرامی نواب سید نور الحسن خاں مرحوم کی سعی جمیلہ سے شائع ہوئی۔ اٹھارہ سو صفحات پر محیط ہے۔

۲۔ رسالہ ہوش افزا: یہ بھی نثر میں ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۳۔ دیوان عندلیب: خواجہ ممدوح شاعر بھی تھے۔ یہ ان کے فارسی کلام کا مختصر مجموعہ ہے۔

خواجہ محمد ناصر عندلیب عالم و صوفی اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ انھوں نے چھیاسٹھ سال کی عمر پا کر ۱۱۷۲ھ/ ۱۷۵۹ء کو انتقال کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لائق بیٹے خواجہ میر درد مسند نشین ہوئے، جن کے

Marfat.com

ضروری حالات درج ذیل ہیں۔

باپ کی وفات کے وقت (۱۱۷۲ھ/ ۱۷۵۹ء میں) خواجہ میر درد کی عمر انتالیس سال تھی، لہٰذا ان کا سال ولادت ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۱ء ہے۔ ان کا نام خواجہ میر ہے اور لفظ ''خواجہ'' نام کا جز ہے۔ یہ نام ان کے نانا میر سید محمد قادری بن میر احمد خاں شہید نے رکھا تھا۔ اس ضمن میں خواجہ میر درد خود لکھتے ہیں:

ایں اسم فقیر کہ خواجہ میر است وقت تولدِ بندہ والد بزرگ وار والدۂ ماجدۂ ام سید العارفین میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خاں شہید گزاشت اند ❶۔

(یعنی اس فقیر کا نام خواجہ میر ہے جو میری ولادت کے وقت میری والدۂ گرامی کے والد سید العارفین میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خاں شہید نے رکھا۔)

تعلیم و تربیت:

خواجہ میر نے علوم رسمیہ کی کتابیں اپنے والد محترم خواجہ محمد ناصر عندلیب سے پڑھیں۔ البتہ مثنوی مولانا روم کے لیے مفتی دولت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فارسی کی تعلیم سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی سے حاصل کی۔ خواجہ میر تمام علوم شرعیہ میں کامل تھے اور قرآن، علوم قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور تصوف وطریقت میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔

ابتدائے جوانی میں سپاہی پیشہ اور فوج شاہی میں ملازم تھے۔ بعد ازاں عین عالم شباب میں (انتیس سال کی عمر کو پہنچے تو) یہ سلسلہ ترک کر کے اور علائق دنیا سے الگ ہو کر فقر و درویشی کی زندگی اختیار کر لی اور سلوک و تصوف کی وادی میں قدم زن ہو گئے۔ پھر تمام عمر اسی راہِ حق کے مسافر رہے۔ وہ سلسلۂ نقشبندیہ کے چشم و چراغ تھے اور اپنے نام کے ساتھ ''محمدی'' کی نسبت رکھتے تھے۔ ''نقشبندی مجددی محمدی'' کہلاتے تھے۔ بڑے متقی اور پرہیز گار تھے۔

سلسلۂ نقشبندیہ میں سماع ممنوع ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میر درد سماع کے قائل تھے۔ دہلی کے تمام بڑے بڑے مغنی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس فن کی باریکیوں کا علم حاصل کرتے۔ سماع کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ سماع اور غنا کے سلسلے میں لوگ خود ہی میرے پاس آتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے، چلے جاتے ہیں۔ میں نہ کسی کو بلاتا ہوں، نہ کسی کے پاس جاتا ہوں، نہ گانا سننے کو دوسروں کی طرح عبادت سمجھتا ہوں، نہ انکار کرتا ہوں، نہ اس کی اباحت کا فتویٰ دیتا ہوں۔ البتہ اس سلسلے میں میرا عقیدہ وہی ہے، جو میرے بزرگوں کا ہے۔۔۔۔۔ عقیدۂ من ہماں است کہ عقیدۂ بزرگان من است ❷۔

❶ علم الکتاب، ص ۸۴۔

❷ نالہ درد، ص ۷۔ نالہ ۳۷۔

Marfat.com

بادشاہ کو سرزنش:

خواجہ میر درد بے حد مستغنی المزاج تھے۔ آداب محفل کا بھی انتہائی خیال رکھتے تھے، جو اس کا خیال نہ رکھتا اگرچہ وہ کتنی بڑی شخصیت کا مالک ہوتا خواجہ اسے فوراً ڈانٹ دیتے اور سرزنش کرتے۔ اس ضمن کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ ان کے ہاں ہر قمری مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو محفل سماع منعقد ہوتی تھی، جس میں اس دور کے بڑے بڑے علما و مشائخ اور وزرا و امرا شامل ہوتے تھے، حتیٰ کہ اس زمانے کا مغل حکمران شاہ عالم ثانی بھی اس محفل میں شریک ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ شاہ عالم کے پاؤں میں شدید درد تھا، وہ اسی حالت میں محفل سماع میں آگیا، لیکن تکلیف اتنی بڑھی کہ وہ برداشت نہ کر سکا اور شدتِ درد سے مجبور ہو کر تھوڑا سا پاؤں پھیلا دیا۔ خواجہ میر درد کے فقر و بوریا نشینی نے بادشاہ کی اس حرکت کو اپنے روایتی آداب محفل کے منافی سمجھا اور فرمایا: ''یہ چیز فقیر کے آداب محفل کے خلاف ہے۔'' بادشاہ نے عذر بیان کیا اور معافی مانگی۔ فرمایا: ''اگر طبیعت خراب تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

خواجہ میر کا تخلص:

خواجہ میر کا تخلص درد تھا، لیکن تخلص کے لیے یہ لفظ کیوں پسند کیا؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ خود ہی لکھتے ہیں کہ میرے والد خواجہ محمد ناصر، عندلیب تخلص کرتے تھے، ان کے پیر شاہ سعد اللہ گلشن تخلص کرتے تھے اور ان کے پیر حضرت عبدالاحد، گل تخلص کرتے تھے، لہٰذا اس رعایت سے میں نے اپنے لیے درد تخلص تجویز کر لیا[1]۔

تخلص کے بارے میں وہ مزید لکھتے ہیں:

میرے ناموں کی طرح میرا تخلص بھی الہامی ہے۔ قرآن مجید میں پہلے پارے میں جو الف، لام، میم، حروف مقطعات آئے ہیں، ان کے متعلق بعض اہل معارف کا کہنا ہے کہ اگر انھیں ملا کر لکھا جائے تو ''الم'' بن جاتا ہے اور ''الم'' عربی میں ''درد'' کو کہتے ہیں، اور یہی میرا تخلص ہے۔

عسرت اور تنگ دستی:

خواجہ میر درد کے والد مکرم خواجہ محمد ناصر عندلیب کو اللہ نے تمام نعمتوں سے نوازا تھا۔ ان کے آبا و اجداد بھی امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، لیکن خود انھوں نے علائق دنیوی سے کنارہ کش ہو کر درویشانہ زندگی اختیار کر لی تھی اور گوشہ نشین ہو گئے تھے، یہی اثر سعادت مند بیٹے (خواجہ میر درد) پر بھی پڑا۔ انھوں نے بھی ملازمت و مناصب کو ترک کر دیا۔ جائداد بھی چھوڑ دی اور اپنے آپ کو یادِ الٰہی کے لیے وقف کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

---

[1] آہ سرد، ص ۱۵۶۔

Marfat.com

غربت و افلاس نے آ گھیرا اور گھر میں عسرت و تنگ دستی نے ڈیرے ڈال دیے۔ یہاں تک کہ فاقہ کشی تک نوبت آ گئی۔ مگر اس مردِ خدا نے نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور نہ کسی سے کبھی کچھ طلب کیا۔ امرائے مملکت اور وزرائے حکومت ان کے گھر آتے اور فیض حاصل کرتے، خود بادشاہ ان کی مجلسوں میں آتا اور استفادہ کرتا تھا، لیکن انھوں نے کسی کے حضور دامن طلب دراز نہیں کیا۔ اپنی بوریا نشینی اور فقر کے مقابلے میں متاع دنیا کو ہمیشہ حقیر گردانا۔ قدرتی طور پر گھر کے تمام افراد کو بھی یہی تربیت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ تکلیف برداشت کر لیتے تھے، مگر عالم آخرت کے مقابلے میں اس جہان فانی کی کسی شی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کی عسرت و غربت کا لوگوں کو بھی علم تھا، لیکن کسی کو کچھ پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور ان کے جذبۂ استغنائے قلب اور عاطفہ توکل علی اللہ سے سب مرعوب تھے اور کچھ کہنے کی اپنے آپ میں ہمت نہ پاتے تھے۔

خواجہ میر درد کی یہی ادائے خاص تھی، جس کی وجہ سے ان کی ذاتی عظمت و رفعت، خودداری و بلند ہمتی، ان کے علم و فضل، فقر و استغنا، توکل و قناعت، زہد و تقویٰ اور عجز و انکسار کا سب معاصرین کھلے اور واضح الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔

ان کے زمانے میں سلطنت مغلیہ انتہائی اضمحلال کا شکار ہو گئی تھی۔ ہر طرف انتشار اور اختلال پھیلا ہوا تھا۔ شہر دہلی ملک کا دارالحکومت تھا، لیکن یہ شہر گوناگوں شورشوں اور سیاسی سازشوں کا شکار ہو گیا تھا۔ امن و امان مفقود ہو چکا تھا۔ اہل کمال معاشی بدحالی کا نشانہ بن چکے تھے اور علمائے دین کی قدر و منزلت میں انتہائی کمی واقع ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے بے شمار اصحاب کمال اور ارباب علم ترک شہر کر کے مختلف علاقوں کے نوابوں کے پاس چلے گئے تھے، مگر جن اصحاب فضل و کمال اور شعرائے عالی مقام نے اس دورِ ابتلا میں بھی دہلی کو اپنا مسکن ٹھہرائے رکھا، ان میں خواجہ میر درد اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے اسمائے گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ کسی موقعے پر بھی ان کے پائے استقلال میں جنبش نہیں آئی اور دنیوی عز و جاہ کے عارضی اسباب ان کے فقر و درویشی کی وسیع اور دائمی دولت پر غلبہ نہیں پا سکے۔ یہ تا دمِ آخریں دہلی میں مقیم رہے اور ان کی ذات ہمیشہ مرجع خلائق رہی۔

تصانیف:

خواجہ میر درد جہاں تصوف و طریقت کے مرتبۂ بلند پر فائز تھے اور شعر و شاعری میں بے حد شہرت کے مالک تھے، وہاں وہ صاحب تصانیف بھی تھے۔ انھوں نے بارہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں، جن میں دیوان فارسی سمیت گیارہ کتابیں فارسی زبان میں ہیں اور ایک اردو دیوان ہے۔ ان کتابوں کا مختصر الفاظ میں تعارف درج ذیل ہے۔

۱۔ اسرار الصلوٰۃ: یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔ خواجہ ممدوح نے یہ اس وقت تصنیف کیا تھا، جب ان کی عمر

Marfat.com

صرف پندرہ سال تھی۔ اس کا سالِ تصنیف ۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۵ء ہے۔ یہ ان کی اولین تصنیف ہے۔ اس میں نماز کے ارکان ہفت گانہ "سر" کے عنوان سے الگ الگ تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ رسالہ حضرت نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم کے لائق فرزند نواب سید نورالحسن خاں مرحوم کی سعی جمیلہ سے اشاعت پذیر ہوا۔

۲۔ واردات: یہ کتاب ایک سو گیارہ "واردات" پر مشتمل ہے۔ ہر "وارد" کا الگ عنوان قائم کیا گیا ہے، مثلاً وارداول کا عنوان ہے، "فاتح الواردات' اور وارد ثانی کا عنوان ہے، "نورمن اللہ" اس طرح دیگر واردات چلتی ہیں۔ اس کی وجہ تالیف خود خواجہ میر درد نے یہ بیان کی ہے کہ بسا اوقات غلبۂ حالات میں یعنی شدتِ مشاہدہ اور استیلاءِ تالّہ سے جو معانی قلب پر منکشف ہوتے تھے، وہ رباعیات کی شکل میں ڈھل کر زبان سے نکل پڑتے تھے۔ انہی رباعیات کے مجموعے کو "واردات" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مقامات معرفت وحقیقت کے بیان پر مشتمل ہے۔ ہر وارد کا ایک دیباچہ مرقوم ہے۔ آغاز اور اختتام پر ایک رباعی ہے اور دونوں رباعیوں کے درمیان نثر میں تشریحات اور تعلیقات بیان کی گئی ہیں۔ واردات کا سن تکمیل ۱۱۷۲ھ/ ۱۷۵۹ء ہے۔ اسی سال خواجہ کے والد بزرگ وار خواجہ محمد ناصر عندلیب نے وفات پائی اور اسی سال وہ انتالیس سال کی عمر میں باپ کی جگہ مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔

یہ کتاب بھی خواجہ صاحب کی دیگر تصانیف کی طرح نواب سید نورالحسن خاں مرحوم کی مہربانی سے شائع ہوئی۔

۳۔ علم الکتاب: یہ کتاب بھی نواب سید نورالحسن خاں مرحوم کی کوشش سے معرض طباعت میں آئی۔ اور خواجہ میر درد کی یہ سب سے ضخیم کتاب ہے جو ۶۴۸ صفحات پر محیط ہے۔ یہ کتاب درحقیقت رسالہ واردات کی شرح ہے۔ رسالہ واردات ایک سو گیارہ واردات پر مشتمل ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی اور شاگرد خواجہ محمد میر اثر کی فرمائش پر اس کی شرح سپرد قلم کی جسے ایک سو گیارہ رسائل میں منتقل کر دیا اور پھر اس مجموعے کو "علم الکتاب" کے نام سے موسوم کیا۔

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے "علم الکتاب" کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خواجہ میر درد کے علم الٰہی میں تبحر اور ان کے کمالاتِ معرفت کی حقیقت اس تصنیف سے واضح ہوتی ہے۔ جابجا طویل عربی عبارتیں بے تکلف غایت و بلاغت کے ساتھ مثلِ چشمۂ رواں ہیں۔ مطالب حقہ کا ہجوم ہے۔ آیات اور احادیث اس روانی اور آسانی سے ہر موقعے پر درج ہوتی جاتی ہیں کہ پڑھنے والے کا قلب ان کے انوار سے پُرنور و معمور ہوتا جاتا ہے۔ سلوک کے مسائل کو آیات و احادیث سے مجتہدانہ اور عارفانہ قوت کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ خود خواجہ میر درد "نالہ درد" میں فرماتے ہیں کہ "نالہ عندلیب" اور "علم الکتاب" طریقہ محمدیہ کے سلوک کے لیے کافی ہیں۔ یہ کتاب متانت اور قوت تحریر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بہترین تصانیف کے ہم پلہ ہے۔

۴۔ نالہ درد: یہ کتاب خواجہ ممدوح نے ۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء میں مکمل کی۔ اس کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں کہ

Marfat.com

علم الکتاب ختم ہونے کے بعد جو نئے مطالب ان کے قلب و ذہن پر وارد ہوئے، ان کو ان کے چھوٹے بھائی خواجہ میر اثر جمع کرنے لگے۔ جب یہ مجموعہ مکمل ہو گیا تو ''نالہ درد'' اس کا نام رکھا۔ یہ رسالہ ۱۲۱ صفحات کو محتوی ہے، اس کی طباعت بھی نواب سید نور الحسن خاں صاحب کی توجہِ خاص کی مرہون منت ہے۔

۵۔ آہ سرد: اس کا سن تکمیل ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء ہے۔ ۶۴ صفحات کا مختصر رسالہ ہے۔ اس کی طباعت بھی نواب سید نور الحسن خاں صاحب کی وجہ سے ہوئی۔

۶۔ شمع محفل: اس رسالے کی تصنیف کا آغاز انھوں نے اپنی عمر کے باسٹھویں سال یعنی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء میں کیا تھا، اس کی تصنیف سے وہ ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء میں فارغ ہوئے، جب کہ ان کی عمر چھیاسٹھ برس کو پہنچ گئی تھی۔ یہ رسالہ اگرچہ ۱۲۶۷ھ میں مطبع کریمی سہسرام سے چھپ چکا تھا، تاہم نواب سید نور الحسن خاں صاحب نے دوبارہ شائع کرایا۔

۷۔ درد دل: اس کی اور شمع محفل کی تالیف کا آغاز ایک ہی سال (۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء) میں کیا گیا تھا اور اختتام بھی ایک ہی سال (۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء) میں ہوا۔ دونوں رسالوں کی دوبارہ طباعت نواب سید نور الحسن خاں مرحوم کی کوشش اور توجہ سے ہوئی۔

۸۔ حرمت غنا: غنا کی حلت اور حرمت کی بحث میں ہے۔

۹۔ واقعات درد: مسائل تصوف پر مشتمل ہے۔

۱۰۔ سوز دل: یہ بھی تصوف و طریقت کے مسائل پر محیط ہے۔

۱۱۔ دیوان فارسی: خواجہ میر درد کا یہ فارسی دیوان اگرچہ مختصر ہے، لیکن لطافت و حلاوت، پختگی اور زورِ بیان میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ دیوان بھی خواجہ ممدوح کی دیگر تصانیف کی طرح نواب سید نور الحسن خاں کی مالی اعانت سے ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء میں مطبع انصاری دہلی سے طبع ہو کر شائع ہوا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شد منشاء ظہور دو عالم وجود ما ۔۔۔ جوشید نشأ تین ز جوش شرابِ ما

جوش زد بادۂ توحید بہ میخانۂ ما ۔۔۔ بحر دارد بہ گرہ قطرہ پیمانۂ ما
بے خودی پردہ کشائے حرم دل باشد ۔۔۔ بستہ احرام رہش لغزشِ مستانۂ ما
زینت و زیب زنان باد مبارک بزباں ۔۔۔ سازِ دنیا نکند ہمت مردانۂ ما

او دلبر و دل آزار ما دل زدست دادہ ۔۔۔ یارب چہ پیش آمد آمادۂ بلائیم
ما از وفا نہ پرسیم تو از جفا نگوئی ۔۔۔ تا چند آزمائی تا چند آزمائیم

Marfat.com

برسر کوئے تو ام یک بار باید گریست — ابر تاداند کہ ایں مقدور می باید گریست
نے دوائے راست می آید، نہ جاں ہم می رود — درد برحال من بیمار می باید گریست

ایک رباعی ملاحظہ کیجیے، کتنی عمدہ ہے:

برہستی خود اعتمادے می کن — نے بہر کس قصد فسادے می کن
چندے اگرت زمانہ ایں جادارد — خاکے شو وانتظار بادے می کن

۱۲۔ دیوان اردو: خواجہ میر درد کا اردو دیوان کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ آخری اشاعت (۱۹۶۲ء) مجلس ترقی ادب لاہور کی ہے، جو جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کے پُراز معلومات مقدمے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ دیوان اردو کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

گزروں ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں واں کے لوگ — ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا، یہ باغ تھا

مت جا ترو تازگی پہ اس کی — عالم تو خیال کا چمن ہے

اس زیست کا اعتبار کیا ہے — کوئی دم میں یہ زندگی ہوا ہے

قلبی واردات کے بارے میں درد کے یہ اشعار پڑھیے:

کچھ ہے خبر تجھے بھی کہ اٹھ اٹھ کر رات کو — عاشق تری گلی میں کئی بار ہو گیا

ہم جانتے ہیں درد اندھیرے میں رات کو — تو لگ رہا ہے کوچے میں جس گھات کے لیے

تم آکر جو پہلے ہی مجھ سے ملے تھے — نگاہوں میں جادو سا کچھ کر دیا تھا

یک بیک نام لے اٹھا میرا — جی میں کیا اس کے آگیا ہو گا

دو رباعیاں پڑھنے کے قابل ہیں:

کیا جانیے کیا دل پہ مصیبت یہ پڑی ہے — ایک آگ سی کچھ ہے کہ وہ سینے میں گڑی ہے

Marfat.com

اس طرح سے اک لخت جو آنسو نہیں تھمتے معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

دو نگاہیں جو چار ہوتی ہیں برچھیاں دل کے پار ہوتی ہیں
بے وفائی پہ اس کی مت جا تو ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں

غزلیات کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

دل مرا پھر دکھایا کس نے سو گیا تھا، جگا دیا کس نے
وہ مرے چاہنے کو کیا جانے یہ سندیسا سنا دیا کس نے
وہ بلائے سے بھاگتا تھا اور درد تجھ تک بلا دیا کس نے

گل و گلزار خوش نہیں آتا باغ بے یار خوش نہیں آتا
کیا جفا کے سوا تجھے کچھ اور اے ستم گار! خوش نہیں آتا
درد ہم کو یہ رات دن تیرا نالۂ زار خوش نہیں آتا

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما اس طرف کو کبھو گزر نہ کیا
کیوں بھویں تانتے ہو بندہ نواز سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے سامنے آیا جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا

جتنی بڑھتی ہے اتنی گھٹتی ہے زندگی آپ ہی آپ کٹتی ہے
زلف کی کج ادائیاں دیکھو ہر گھڑی منہ سے جا لپٹتی ہے
آج ہے آہ کی ہوا کچھ اور دیکھیے کس طرف پلٹتی ہے

کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجیے:

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا بس، ہجومِ یاس، جی گھبرا گیا

Marfat.com

حال مجھ غم زدے کا جس تس نے ‏ جب سنا ہو گا رو دیا ہو گا

درؔد کا حال کچھ نہ پوچھو تم ‏ وہ ہی رونا ہے، نت وہی غم ہے

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا ‏ ہم سبھی مہمان تھے یہاں، اک تو ہی صاحب خانہ تھا
وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا ‏ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
حیف! کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں ‏ آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا
ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ ‏ وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
بھول جا، خوش رہ، عبث وے سابقے مت یاد کر ‏ درؔد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

کس کی یہ چشم مست نے بزم کو یوں جھکا دیا ‏ مثلِ حباب سرنگوں شرم سے ہرایاغ ہے
جلتے ہی جلتے صبح تک، گزری ہے تمام شب ‏ دل ہے کہ شعلہ ہے کوئی، شمع ہے یا چراغ ہے
پایئے کس جگہ بتا، اے بت بے وفا تجھے ‏ عمر گزشتہ کی طرح گم ہی سدا سراغ ہے
سیرِ بہارو باغ سے، ہم کو معاف کیجیے ‏ اس کے خیالِ زلف سے درؔد کسے فراغ ہے

وفات:

خواجہ میر درؔد نے چھیاسٹھ سال عمر پا کر بروز جمعہ ۲۴ رصفر ۱۱۹۹ھ/ ۶ رجنوری ۱۷۸۵ء کو دہلی میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنی موت کی خود پیش گوئی کی تھی جو بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں خواجہ صاحب نے دو رسالے (شمع محفل اور دردِ دل) بہ یک وقت ضبط تحریر میں لانا شروع کیے تھے۔ ان دونوں کی تکمیل ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء میں ہوئی۔ ''دردِ دل'' کے آخر میں خود خواجہ صاحب رقم فرماتے ہیں کہ اب میری عمر کا چھیاسٹھواں سال ہے، اور سن ۱۱۹۹ھ ہے، جو سال اس رسالے کی تکمیل کا ہے، وہی سال میری وفات کا ہے۔ اسے قدرت خداوندی کہیے کہ خواجہ صاحب نے اسی سال رحلت فرمائی۔ ان کی قبر پر یہ الفاظ کندہ ہیں: ''رحلت ۲۴ رصفر ۱۱۹۹ھ یوم جمعہ قبل صبح صادق۔''

خواجہ صاحب مرحوم، دہلی میں ترکمان دروازے کے باہر اپنے والد بزرگ وار خواجہ محمد ناصر عندلیب کے قریب مدفون ہیں۔ آج کل اس مقام کو ''باغیچہ میر درد'' کہتے ہیں۔ یہ جگہ شہر پناہ کے باہر شاہ جی کے تالاب سے ملی ہوئی ہے [1]۔

---

[1] مقدمہ دیوان اردو، ص۸۴۔

Marfat.com

اولاد:

خواجہ میر درد کے ایک ہی بیٹے تھے، جن کا نام خواجہ ضیاء الناصر تھا اور وہ الم تخلص کرتے تھے۔ ان کے علاوہ دو لڑکیاں تھیں۔

خواجہ درد کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی اور شاگرد خواجہ محمد میر آثر مسند نشین ہوئے۔ میر آثر کی وفات کے بعد درد کے صاحب زادے خواجہ ضیاء الناصر الم نے مسند رشد و ہدایت کو زینت بخشی۔ ان کے بعد خواجہ محمد نصیر رنج نے یہ خدمت قبول کی۔ اس طرح یہ سلسلہ خواجہ میر درد کے خاندان میں جاری رہا❶۔

شاگرد:

خواجہ میر درد کے شاگردوں اور ان سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں مسلمان بھی شامل تھے اور ہندو بھی۔ مسلمانوں میں ان کے شاگرد مندرجہ ذیل حضرات تھے۔

۱۔ شیخ محمد قیام الدین قائم چاند پوری (متوفی ۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۷ء)

۲۔ ہدایت اللہ خاں ہدایت دہلوی (متوفی ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء)

۳۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراق دہلوی (متوفی قبل از ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء)

خواجہ محمد میر اثر: یہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے مرید اور شاگرد بھی تھے۔ نیک اور متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔ خواجہ صاحب کی وفات کے بعد مسند نشین ہوئے۔

لالہ سری رام دہلوی اپنی تصنیف خم خانۂ جاوید میں لکھتے ہیں:

"خواجہ میر درد کے عالم ضعیفی میں ان کے ایک مرید نے عرض کی کہ دنیا دارِ فانی ہے اور حضرت کا وقتِ آخر، حضور فرمائیں کہ آپ کے بعد کس کو آپ کا جانشین اور صاحبِ سجادہ مانا جائے۔ آپ یہ سن کر آنسو بھر لائے اور جواباً یہ قطعہ پڑھا:

موت کیا ہم سے فقیروں سے تجھے لینا ہے　　　مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں
تا قیامت نہیں مٹنے کے دلِ عالم سے　　　درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں❷

چنانچہ میر اثر ہی کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا۔

۵۔ میر محمد علی بیدار، عرف میر محمدی (متوفی ۱۲۰۹ھ/ ۱۷۹۵ء)

۶۔ مرزا محمد اسماعیل طپش عرف مرزا حاجی: دہلی کے باشندے تھے، لیکن بعد میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔

۷۔ محمد پناہ خاں، جو پہلے نثار تخلص کرتے تھے، بعد میں حکیم تخلص کرنے لگے تھے۔

---

❶ مقدمہ دیوان اردو، ص ۸۴۔

❷ خم خانۂ جاوید، ج ۱، ص ۱۱۲ (مطبوعہ ۱۹۰۸ء)

Marfat.com

۸۔ خواجہ ضیاء الناصر الم: یہ خواجہ میر درد کے فرزند بھی تھے اور شاگرد بھی۔

ہندوؤں میں ان کے شاگرد مندرجہ تحت حضرات تھے:

۱۔ نرائن داس بیخود دہلوی: دہلی کے مشہور مہاجن تھے۔

۲۔ جھمن ناتھ جھمن: دہلی کے باشندے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

۳۔ لالہ بال مکند حضور: دہلی کے کھتری تھے۔ فارسی کے ماہر اور عربی سے آشنا تھے۔

۴۔ بھکاری لال عزیز دہلوی: بڑے خوش گو شاعر تھے۔

۷۰۔ قاضی خلیل اللہ حیدر آبادی

قاضی خلیل اللہ بن قاضی بابا بن آقا رضی حسینی رضوی بخاری ثم حیدر آبادی۔ حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ ان کے والد قاضی بابا عالم دین بزرگ تھے، لائق بیٹے نے ان سے اور دیگر علمائے عصر سے اخذ علم کیا، اور اپنے دور کے نامور فقہا میں گردانے گئے۔ قاضی بابا، حیدر آباد کی مسند قضا پر متمکن تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ منصب ان کے بیٹے قاضی خلیل اللہ کے سپرد ہوا۔ قاضی خلیل اللہ، معاملات قضا میں نہایت اچھی شہرت کے مالک تھے۔ اللہ سے ڈرنے والے، متواضع اور عبادت گزار۔ ہمیشہ ذکر الٰہی اور اطاعت رسول ﷺ میں مشغول رہتے۔

بارھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ نے ۲۱ رجب ۱۱۵۲ھ/۱۳ اکتوبر ۱۷۳۹ء کو حیدر آباد میں وفات پائی❶۔

۷۱۔ شیخ خوب محمد گجراتی

شیخ خوب محمد چشتی احمد آبادی گجراتی، اپنے زمانے کے عالم اور فقیہ تھے۔ معرفت و طریقت میں بھی کامل تھے اور علاقۂ گجرات کے مشاہیر مشائخ میں سے تھے۔ انھوں نے بام جہاں نما کی شرح لکھی اور تصوف کے موضوع پر کئی رسالے تصنیف کیے۔ ۲۴ شوال ۱۱۰۳ھ/ ۲۹ جون ۱۶۹۲ء کو احمد آباد میں فوت ہوئے❷۔

۷۲۔ قاضی خیر اللہ جون پوری

قاضی خیر اللہ بن مبارک بن ابوالبقا حسینی واسطی جون پوری، بارھویں صدی ہجری کے یہ عالم و فقیہ شہر جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والد گرامی سید مبارک سے جو اس نواح کے جلیل القدر عالم

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۱۔ محبوب ذی المنن، حصہ دوم، ص ۶۲۸، ۶۲۹۔

❷ مرآۃ احمدی، ج ۲، ص ۱۰۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۱۔

Marfat.com

تھے، اخذ علم کیا۔ نہایت ذہین اور طباع تھے۔ علوم متداولہ میں اس قدر دست رس حاصل کی کہ ان کا شمار کبار علما و فقہا کے زمرے میں ہونے لگا۔ وسعت معلومات کی بنا پر جون پور کے قاضی مقرر کیے گئے۔ علم و مطالعہ کا شوق طبیعت پر غالب تھا۔ زیادہ تر وقت درس و افادہ میں صرف کرتے ❶۔

ــــ د ــــ

۷۳۔ سید درگاہی بلگرامی

سرزمین بلگرام علم و فضل اور معرفت و طریقت کے لحاظ سے نہایت شہرت کی حامل ہے۔ اس مردم آفرین خطے میں بے شمار علمائے عظام اور فقہائے عالی مقام پیدا ہوئے اور انھوں نے بڑی علمی خدمات انجام دیں۔ ان میں بارھویں صدی ہجری میں جن حضرات نے جنم لیا، ان میں سید درگاہی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

سید درگاہی بن سید عبدالخیر بن سید درویش بن سید حاتم بن سید بدرالدین حسینی واسطی بلگرامی۔ سید درگاہی کا مولد و منشا بلگرام ہے۔ ابتدائے عمر ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ اس کے لیے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور قاضی علیم اللہ کچندوی (متوفی ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء) اور دیگر علما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تحصیل کی۔ یہاں تک کہ فقہائے حنفیہ کی نامور جماعت میں ان کا شمار ہونے لگا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد قاضی علیم اللہ کچندوی کے عم محترم شیخ عبدالرسول سے کسب طریقت کیا اور علم و معرفت میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ بعد ازاں مراجعت فرمائے بلگرام ہوئے اور ہمہ تن درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ اسی کار خیر میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔ ۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۹ء کے بعد بلگرام میں رحلت فرمائی ❷۔

۷۴۔ مفتی درویش محمد بدایونی

مفتی درویش محمد عثمانی بدایونی فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ حافظ رحمت خاں کے عہد میں بریلی کے منصب افتا پر مامور تھے۔

حافظ رحمت خاں ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء میں پیدا ہوا، اور حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ وہ روہیل کھنڈ (یعنی بریلی، شاہ جہان آباد اور پیلی بھیت) کا حکمران بن گیا، واقعات کی رفتار بدلتی رہی تا آنکہ ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء میں حافظ رحمت خاں اور نواب شجاع الدولہ کے درمیان کڑہ میراں پور کے مقام پر جنگ ہوئی۔ نواب

❶ تجلی نور، ج ۲، ص ۷۱۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۳۴۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۲۔

❷ مآثر الکرام دفتر اول، ص ۸۵، ۸۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۳، تقصار جنود الاحرار، ص ۲۰۷۔

Marfat.com

شجاع الدولہ کی اعانت کے لیے وارن ہیسٹنگز نے کرنل چمپین کی سپہ سالاری میں انگریزی فوج روانہ کی۔ سخت مقابلہ ہوا اور حافظ رحمت خاں مارا گیا۔

حافظ رحمت خاں نہایت عادل، نیک اور رحم دل حکمران تھا۔ غریبوں کا حامی، مظلوموں کا مددگار اور علما وفضلا کا قدر دان تھا۔ اس کے عہد حکومت میں ہر طرف امن وامان تھا۔ اس نے علما کی بڑی سرپرستی کی، وہ پانچ ہزار علما کو اپنے خزانے سے وظائف ادا کرتا تھا۔ حافظ قرآن تھا اور اصحابِ فضل وکمال سے بہتر سلوک روا رکھتا تھا۔ مفتی درویش محمد بدایونی اس کے عہد میں بریلی کے منصب افتا پر فائز تھے ❶۔

۷۵۔ شیخ رحمت اللہ لکھنوی

شیخ رحمت اللہ بن غلام محمد بکری بجنوری لکھنوی اپنے زمانے کے نامور عالم، فقیہ اور صوفی تھے۔ انھوں نے مشائخ کے حالات میں ''تذکرۃ الاصفیا'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ سال تصنیف ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء اور مقام تصنیف لکھنؤ ہے ❷۔

۷۶۔ شیخ رحمت اللہ کشمیری

شیخ رحمت اللہ بن محمد مقیم بن مومن کشمیری، کشمیر میں پیدا ہوئے اور اسی سرزمین میں تربیت پائی۔ مولانا محمد محسن کشمیری (متوفی ۱۱۸۱ھ/۱۷۶۷ء) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ پھر خود مسند درس آراستہ کی اور سرگرم تدریس ہوئے۔ دیار کشمیر کے معروف عالم اور یگانہ فقیہ تھے۔ ذکی، فطین اور عابد وزاہد عالم تھے۔ ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء میں داعی اجل کو لبیک کہا ❸۔

۷۷۔ مولانا رستم علی قنوجی

مولانا رستم علی بن علی اصغر صدیقی قنوجی، عالم کبیر اور شیخ وقت تھے۔

۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء کو قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والد مولانا علی اصغر صدیقی قنوجی سے، جو نامور عالم دین تھے اور جن کا سلسلہ درس جاری تھا، حصول علم کا آغاز کیا، زیادہ تر کتب درسیہ انہی سے

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۳۔ تاریخ فرخ آباد۔ حیات حافظ رحمت خاں۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۴۔

❸ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۵۔

Marfat.com

پڑھیں۔ جب (۱۵؍شعبان ۱۱۴۰ھ/ ۱۶؍مارچ ۱۷۲۸ء) کو والد وفات پا گئے تو عازم لکھنؤ ہوئے۔ وہاں استاذ الاساتذہ شیخ نظام الدین بن قطب الدین انصاری سہالوی کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے، اور باقی کتابیں انھی سے پڑھیں۔ ۱۱۴۲ھ/ ۱۷۳۰ء میں فارغ التحصیل ہو کر قنوج واپس گئے اور اپنے والد کے مدرسے میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اپنے بھائی مولانا محمد کامل قنوجی (متوفی ۱۱۴۶ھ/ ۱۷۳۳ء) سے جو کبار علمائے عصر میں سے تھے، طریقہ نقشبندیہ میں فیض حاصل کیا۔

مولانا رستم علی قنوجی درس و تدریس اور علم و فضل میں مرتبہ امامت پر فائز تھے۔ درس و افادہ اور تصنیف و تالیف کے علاوہ ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ بہترین مدرس اور بہترین مصنف تھے۔ عمر کے آخری دور میں جب کہ مرہٹوں نے قنوج پر تسلط حاصل کر لیا تھا، مولانا ممدوح قنوج سے فرخ آباد چلے گئے تھے۔ وہاں سے بریلی منتقل ہو گئے۔ اس نواح کا حکمران حافظ رحمت خاں تھا جو علما کا قدردان تھا، اس نے ان کی بہت تکریم کی اور نہایت احترام سے پیش آیا۔ پھر انھوں نے بریلی ہی میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں وفات پائی۔

مولانا رستم علی قنوجی مفسر قرآن بھی تھے۔ ایک طویل مضمون کو مختصر الفاظ میں بیان کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے تفسیر ''جلالین'' کے انداز پر قرآن مجید کی مختصر تفسیر لکھی، نیز ''نور الانوار شرح منار الاصول'' کا اختصار سپرد قلم کیا۔

اس عالم دین نے ۱۱۷۸ھ/ ۱۷۶۵ء کو بریلی میں انتقال کیا اور تدفین بھی وہیں ہوئی، لیکن چھ ماہ بعد ان کی میت کو بریلی سے قنوج لایا گیا اور اپنے والد مولانا علی اصغر علی صدیقی کے قریب دفن کیا گیا[1]۔

ـــــ ز ـــــ

۷۸۔ شیخ زین العابدین سرہندی

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے خاندان کا ہر فرد علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھا۔ اللہ نے اپنی رحمت بے پایاں سے اس خاندان کو جس نعمت عظمیٰ سے نوازا، وہ دیار ہند کے چند ہی خاندانوں کے حصے میں آئی ہو گی۔ اس دودمانِ بلند مرتبت کے ایک بزرگ شیخ زین العابدین سرہندی تھے، جو حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے اور شیخ محمد یحییٰ کے فرزند گرامی تھے۔

شیخ زین العابدین سرہندی، ۱۰۷۴ھ/ ۱۶۶۴ء کو سرہند میں پیدا ہوئے اور علم و ارشاد کی گود میں تربیت پائی۔ شیخ حجت اللہ نقشبندی سرہندی سے کسب علم اور اخذ طریقت کیا۔ طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے،

[1] تذکرۂ علمائے ہند، ص ۶۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۶، ۸۷۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۹۔ ابجد العلوم، ص ۹۳۲۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۷۲، ۳۷۳۔

Marfat.com

یہاں تک کہ فقہ و اصول اور تصوف میں ماہر ہوئے، بہت سے فضائل باطنی اور کمالات ظاہری سے دامن بھرا۔ پھر تدریس وارشاد میں سرگرم عمل ہوئے۔ اس اثنا میں متعدد علما و فضلا نے ان سے استفادہ کیا۔

اس جلیل القدر عالم دین اور ماہر معقولات و منقولات نے ماہ رمضان المبارک کے آخری دن ۱۱۲۸ھ/ ۶ ستمبر ۱۷۱۶ء کو سرہند میں رحلت فرمائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر چون (۵۴) برس تھی ❶۔

ــــــ س ــــــ

۷۹۔ سید سعد الدین بلگرامی

سید سعد الدین بن سید جمال الدین بن سید مربی بن سید عبد النبی حسینی واسطی بلگرامی بارھویں صدی ہجری کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ مرکز علم و عرفان بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ سید نعمت اللہ بلگرامی (متوفی ۵ رمضان المبارک ۱۱۴۰ھ/ ۴ اپریل ۱۷۲۸ء) سے علم حاصل کیا۔ پھر تلاش معاش کی غرض سے امرا و ملوک کی ملازمت کے لیے بلگرام سے نکلے اور عرصے تک اپنے مولد و مسکن سے باہر رہے۔ بعد ازاں وطن واپس لوٹے اور لوگوں سے منقطع ہو کر افادۂ طلبا اور مطالعہ کتب میں مصروف ہو گئے ❷۔

۸۰۔ مولانا سعد الدین کشمیری

مولانا سعد الدین بن مولانا امان اللہ شہید بن خیر الدین کشمیری، ۱۱۲۷ھ/ ۱۷۱۵ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد مکرم مولانا امان اللہ شہید (۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۹ء) کے سامنے زانوئے تلمذ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس کو اپنا مشغلہ ٹھہرایا اور ارض کشمیر کے کبار فقہا میں گردانے گئے۔ عالم شباب ہی میں علمی دنیا میں شہرت حاصل کر لی تھی، اور لوگ دور دور سے سفر کر کے ان کی خدمت میں آنے لگے تھے۔ بہترین مناظر بھی تھے۔ اکثر مباحث میں حریف پر بازی لے جاتے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا اور بے شمار لوگ فیض یاب ہوئے۔

مولانا سعد الدین کشمیری نے اپنے والد گرامی مولانا امان اللہ کی شہادت کے اڑتیس (۳۸) دن بعد عین عالم جوانی میں صرف چوبیس برس عمر پا کر ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۵۱ء/ ۲۳ مارچ ۱۷۳۹ء کو سفر آخرت اختیار کیا ❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۲۔

❷ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۸۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۵۔

❸ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲، ۴۴۳۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۶۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۵، ۹۶۔

Marfat.com

۸۱۔ سید سعد اللہ سلونی

سید سعد اللہ بن سید عبدالشکور حسینی سلونی، مضافات الٰہ آباد کے ایک قصبے ''سلون'' کے باشندے تھے۔ صغر سنی ہی میں اکتساب علم میں مشغول ہو گئے تھے اور بہت جلد طلب علم کی منازل طے کر لی تھیں، یہاں تک کہ معقولات و منقولات کے ماہرین اور فحول علمائے ہند میں شمار کیے گئے۔ دور شباب میں مسند تدریس آراستہ کر لی تھی اور درس و افادہ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ تصوف و طریقت میں بھی کامل تھے اور اس ضمن میں اپنے والد بزرگ وار سید عبدالشکور سلونی سے اخذ فیض کیا تھا۔

کچھ عرصہ تو دیار ہند ہی میں ہنگامۂ درس و افادہ بپا کیے رکھا، بعد ازاں حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ وہاں بارہ سال اقامت گزیں رہے۔ حجاز کے علما سے علم حدیث حاصل کیا اور پھر ایک مدت تک وہاں پڑھاتے رہے۔ حجاز سے واپس آ کر شہر ''سورت'' کو اپنا مسکن بنا لیا۔

اورنگ زیب عالم گیر سید سعد اللہ سلونی کی بے حد تکریم کرتا تھا۔ اس نے ان کو دو گاؤں بطور جاگیر عطا کیے، جن سے انھیں آٹھ لاکھ روپے سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ سلطان اورنگ زیب کے دل میں ان کا اس درجہ احترام تھا کہ وہ ان کو خط لکھتا تو ''سیدی وسندی'' کے الفاظ سے خطاب کرتا۔

سید سعد اللہ سلونی کی عادت تھی کہ وہ بادشاہ سے حاجت مند لوگوں کی سفارشیں کرتے اور کوشش فرماتے کہ ان کے کام مکمل ہو جائیں۔ بادشاہ ان کی بات مانتا اور اپنے ہاتھ سے خط کا جواب لکھتا۔ ایک مرتبہ انھوں نے بادشاہ سے ایک عامل کی سفارش کی۔ بادشاہ نے اپنے کاتب کو حکم دیا کہ شیخ کو یہ خط لکھا جائے کہ وہ ظالموں کی سفارش نہ کیا کریں۔ اس کے بعد بادشاہ نے ان کو اپنے ہاتھ سے خط لکھنا بند کر دیا تھا، لیکن وہ برابر بادشاہ کو خط لکھتے رہے۔

سید سعد اللہ اپنے مکتوبات میں سلطان اورنگ زیب کو اہل بیت کے ائمہ اثنا عشرہ سے محبت رکھنے کی بھی تاکید فرماتے۔ جب اس سلسلے میں انھوں نے بار بار خط لکھے تو بادشاہ نے حاضرین دربار سے کہا کہ سید سعد اللہ سلونی مجھے جو محبت اہل بیت کی تلقین فرماتے ہیں، یہ تو بالکل صحیح ہے، لیکن اہلِ سنت کے نزدیک تو امامت بارہ اماموں میں منحصر نہیں ہے۔

سید سعد اللہ متعدد کتابوں کے مصنف اور شارح بھی تھے اور معقولات و منقولات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں یہ کتابیں شامل ہیں: تعلیقات، ''حاشیہ قدیمہ و جدیدہ'' منطق میں رسالہ آداب البحث، فقہ میں ''یمین الوصول'' پر حاشیہ، رسالہ در ثبوت مذہب شیعہ، مثنوی معنوی کے چالیس اشعار کی شرح، حاشیہ بر ہدایۃ الحکمۃ، کشف الحق اور تحفۃ الرسول وغیرہ متعدد کتب و رسائل۔

دیار ہند کے اس عالم نے ۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۸ھ/ ۲۰/ جنوری ۱۷۲۶ء کو شہر سورت میں وفات پائی

Marfat.com

اور وہیں مدفون ہیں❶۔

مولوی فقیر محمد جہلمی نے حدائق الحنفیہ میں سید سعد اللہ کا سن وفات ۱۰۳۸ھ/ ۱۷۲۶ء لکھا ہے اور انھیں گیارھویں صدی ہجری کے علمائے کرام میں شامل کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ بارھویں صدی ہجری کے علما میں سے تھے اور ۲۷ ؍ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۸ھ/ ۲۰ ؍ جنوری ۱۷۲۶ء کو فوت ہوئے۔

۸۲۔ شیخ سلطان محمد کرمانی

شیخ سلطان محمد کرمانی دہلوی کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ سید حسن نارتولی دہلوی مشہور بہ "رسول نما" کے شاگرد تھے۔ طویل عرصے تک ان کی صحبت و رفاقت میں رہے اور درس و افادہ طلبا کو اپنا مشغلہ قرار دیے رکھا❷۔ بارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم و فقیہ کے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

۸۳۔ سید سلطان مقصود کالپوی

سید سلطان مقصود بن احمد بن محمد حسینی ترمذی شہر کالپی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم کے لیے بلگرام کا عزم کیا اور شیخ سعد اللہ بن مرتضیٰ بلگرامی سے کتب درسیہ کی تحصیل کی۔ اور اپنے دور کے عالم و فقیہ اور علم نحو اور علوم عربیہ کے ماہر مانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و افادہ میں سرگرم ہوئے۔ بعض درسی کتابوں پر مفید تعلیقات و حواشی قلم بند کیے، میبذی کی شرح ہدایۃ الحکمۃ پر حاشیہ، شہاب الدین دولت آبادی کی شرح قصیدہ بردہ پر حاشیہ۔

سید سلطان مقصود کالپوی نے ماہ صفر ۱۱۲۳ھ/ مارچ ۱۷۱۱ء کو وفات پائی❸۔

۸۴۔ شیخ سیف اللہ بخاری دہلوی

شیخ سیف اللہ بخاری ارض ہند کے جلیل القدر محدث اور فقیہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پڑپوتے تھے۔ شیخ ممدوح تک ان کا سلسلۂ نسب اس طرح پہنچتا ہے: سیف اللہ بن نور اللہ بن نور الحق بن عبدالحق محدث بخاری دہلوی۔ حدیث و فقہ کے اجل علما میں سے تھے۔ فارسی میں شمائل ترمذی کی شرح لکھی اور اسے "اشرف الوسائل فی شرح الشمائل" کے نام سے موسوم کیا۔ یہ شرح انھوں نے ۱۰۹۱ھ/ ۱۶۸۰ء میں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں لکھی❹۔

---

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۰۷، ۲۰۸۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۷۳۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۶، ۹۷۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۹، بحوالہ بحر زخار۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۹، ۱۰۰۔

❹ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۰۲، بحوالہ مرآۃ الحقائق۔

Marfat.com

ـــ ش ـــ

۸۵۔ مفتی شرف الدین لکھنوی

مفتی شرف الدین بن محی الدین لکھنوی اعظمی کا مولد ومنشا لکھنؤ ہے۔ کافی عرصے تک اپنے والد مکرم مولانا محی الدین لکھنوی سے علم حاصل کرتے رہے، جو اس دور کے معروف علما میں سے تھے۔ پھر کورہ تشریف لے گئے۔ وہاں شیخ لطف اللہ کوروی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے درسی کتابوں کی تحصیل کی۔ بعد ازاں شیخ غلام نقشبند بن عطاء اللہ لکھنوی سے تفسیر بیضاوی پڑھی، اخذ طریقت بھی انہی سے کیا، یہاں تک کہ علم فقہ اور دیگر علوم میں مہارت پیدا کرلی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد، اس دور کے مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر سے قرب حاصل کیا۔ اس نے ان کے علم وفضل اور تحقیق وکاوش سے متاثر ہوکر چار صدی کے منصب سے نوازا اور بعض خدمات شرعیہ انجام دینے پر مامور کیا۔ سلطان محمد شاہ کے عہد تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر ان کو تین ہزاری کا منصب عطا کیا گیا۔ سالہا سال تک اس منصب سے مفتخر رہے۔

مفتی شرف الدین لکھنوی متعدد کتابوں کے مصنف وشارح بھی تھے، جن میں حاشیہ شرح المواقف اور حاشیہ تفسیر بیضاوی شامل ہیں۔

بارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم وفقیہ نے ۲۷ رذی الحجہ ۱۱۳۳ھ / ۳۰ ستمبر ۱۷۲۱ء کو منیر میں وفات پائی[1]۔

۸۶۔ شیخ شکر اللہ جون پوری

شیخ شکر اللہ بن نور اللہ جنیدی جون پوری، شیخ معروف اشرف کی اولاد سے تھے، جن کا سلسلۂ نسب شیخ جنید ابوالقاسم بغدادی کی طرف منتہی ہوتا ہے۔ شیخ شکر اللہ کے پردادے کا نام اللہ داد، تھا۔ وہ جس گاؤں میں سکونت پذیر تھے، اس کا نام مخدوم پور تھا۔ شیخ اللہ داد، مخدوم پور سے نقل مکانی کرکے ایک اور گاؤں اللہ داد پور چلے گئے تھے۔ پھر ان کے والد گرامی، اللہ داد پور کی سکونت ترک کرکے، ایک دوسرے گاؤں ہمزہ پور میں منتقل ہوگئے تھے، جو صوبہ یوپی میں اعمال دیمو میں واقع تھا۔ ہمزہ پور ہی میں شکر اللہ کی ولادت ہوئی اور وہیں نشو ونما پائی۔ بعد ازاں جون پور گئے اور وہاں رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی کے مدرسے میں داخل ہوئے اور کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ پھر اپنے والد گرامی شیخ نور اللہ کے حکم کے مطابق سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی فوجی چھاؤنی میں چلے گئے جو اس زمانے میں بیجاپور میں تھی۔ بیجاپور سے اورنگ آباد کا قصد کیا۔ وہاں ان کے چچا محمد

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۰۴، ۱۰۵ بحوالہ باغ وبہار۔

Marfat.com

زاہد مقیم تھے، ان کے پاس رہنے لگے۔ محمد زاہد، عالم آدمی تھے، ان سے مشکوٰۃ المصابیح کا درس لیا۔ اورنگ آباد سے پھر جون پور کا عزم فرمایا۔ جون پور میں شیخ محمد رشید عثمانی کے صاحب زادۂ گرامی شیخ محمد ارشد سے اخذ طریقت کیا اور پھر تمام عمر انہی کی خدمت میں رہے۔

شیخ شکر اللہ جون پوری، عالم وفقیہ، زاہد و عابد اور صاحب حسن اخلاق تھے۔ انھوں نے اپنے شیخ و مرشد محمد ارشد جون پوری کے ملفوظات بھی جمع کیے، جو کافی ضخیم ہیں۔ بعد ازاں ان ملفوظات کو ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۳ء میں شیخ محمد ارشد کے پوتے شیخ غلام رشید بن محب اللہ بن محمد ارشد عثمانی (متوفی ۵رصفر ۱۱۶۷ھ/ ۲ردسمبر ۱۷۵۳ء) نے مرتب کیا۔ گنج ارشدی کی ترتیب کے وقت اس کے جامع شیخ شکر اللہ جون پوری زندہ تھے ❶۔

۸۷۔ شیخ شمس الدین جون پوری

شیخ شمس الدین بن ملا انگنون صدر جہاں جون پوری، عالم وفقیہ تھے، مسلکاً حنفی تھے اور اپنے شہر جون پور کے نامور فقہا میں سے تھے۔

شمس الدین جون پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشو ونما پائی اور اپنے والد گرامی ملا انگنون صدر جہاں جون پوری اور ملا محمد عسکری جون پوری کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیا۔ ان کے والد منصب صدر جہانی پر فائز تھے۔ ان کی وفات کے بعد خود اس منصب پر متمکن ہوئے۔

صالح، متدین اور عمدہ سیرت کے عالم دین تھے۔ کثیر الدرس والافادہ تھے ❷۔

۸۸۔ قاضی شہاب الدین گوپاموی

قاضی شہاب الدین بن محمد حسین بن عبدالسلام بن احمد بن شہاب الدین عمری گوپاموی، علامہ محبّ اللہ عمری الہ آبادی کے بھانجے تھے۔ صوبہ یوپی کے شہر گوپامئو میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ شیخ قطب الدین انصاری سہالوی (متوفی ۱۱۰۳ھ/ ۱۶۹۲ء) سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ اپنے دور کے علامہ وفقیہ اور نامور شیخ قرار پائے۔ مآثر الکرام کی روایت کے مطابق انھوں نے قاضی عبدالرحیم مراد آبادی سے تحصیل علم کی۔

قاضی شہاب الدین گوپاموی، ہمیشہ سرگرم درس وافادہ رہے۔ منقول ہے کہ ان سے چار سو اصحاب نے استفادہ کیا، جن میں خود ان کے بیٹے قاضی قطب الدین گوپاموی (متوفی ۲۵ر رمضان ۱۱۶۰ھ/ ۱۹ر ستمبر ۱۷۴۷ء) مولانا محمد صالح بنگالی، مولانا محمد اشرف شارح سلم العلوم، قاضی محمد مبارک بن محمد دائم عمری گوپاموی

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۰۶، بحوالہ گنج ارشدی۔

❷ تذکرۃ العلماء، ج ۲، ص ۹۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۴۸۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۰۷، ۱۰۸۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۶۷۔

Marfat.com

اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔ ان بزرگوں نے دیار ہند کے مختلف علاقوں میں درس و تدریس کی مسندیں بچھائیں اور بے شمار علما و طلبا نے ان سے اخذ علم کیا۔

بارھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا❶۔

۸۹۔ قاضی شیخ الاسلام گجراتی

قاضی شیخ الاسلام، علامہ وقت اور شیخ زماں تھے۔ مشہور فقہائے ہند میں سے تھے۔ علم و عمل، زہد و تقویٰ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اپنی مثال آپ تھے۔ صدق و امانت اور عفت و صیانت میں ان کا درجہ بہت بلند تھا، معاملہ فہمی، حسن اخلاق، اخلاص و مروت اور خوف خدا میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ عجز و انکسار اور رجوع الی اللہ میں یگانہ حیثیت کے حامل تھے۔ معقولات و منقولات کے ماہر تھے، وسعت معلومات اور فقاہت میں درجہ امامت پر فائز تھے۔ عہد عالم گیری کے بلند مرتبت اصحاب علم و فضل میں شمار کیے جاتے تھے۔ قاضی القضاۃ عبدالوہاب احمد آبادی گجراتی کے لائق فرزند تھے۔ تقویٰ اور پرہیز گاری کا یہ عالم تھا کہ والد کی وفات کے بعد ان کی جائداد میں سے کوئی شے اپنے پاس نہیں رکھی۔ بعض چیزیں تو فقرا و مساکین میں بانٹ دیں اور باقی اعزہ و اقارب کو دے دیں کہ ممکن ہے اس سے عنداللہ والد کے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

بات یہ ہے کہ ان کے والد قاضی عبدالوہاب احمد آبادی گجراتی، اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں قاضی القضاۃ کے منصب علیا پر مامور تھے۔ لیکن مال و دولت جمع کرنے میں محتاط نہ تھے۔ اس ضمن میں ان کی شہرت بہت خراب تھی اور مشکوک طرز عمل کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وفات کے وقت انھوں نے بہت دولت چھوڑی۔ دو لاکھ اشرفیاں اور پانچ لاکھ روپے تو نقد تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے جواہرات اور بہت بڑی جائداد تھی۔ لیکن یہ سارا مال چوں کہ مشکوک اور مشتبہ تھا، لہٰذا قاضی شیخ الاسلام نے اس میں سے کوئی چیز بھی اپنے پاس نہیں رکھی، سب مال مختلف لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

قاضی القضاۃ عبدالوہاب احمد آبادی کی وفات کے بعد سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے ۱۰۸۴ھ/ ۱۶۷۳ء میں ان کی جگہ ان کے صاحب زادے قاضی شیخ الاسلام کو قاضی لشکر کے عہدے پر مامور ہونے کا حکم جاری کیا، مگر انھوں نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ عالم گیر کو انکار کی اطلاع پہنچی تو اس نے ذاتی طور پر انھیں مجبور کیا کہ وہ ہر صورت میں اس منصب پر فائز ہونے کی منظوری دیں۔ بادشاہ کے اصرار پر شیخ الاسلام نے یہ منصب بڑی بے دلی اور کراہت کے ساتھ قبول کیا۔ پھر جب اس منصب پر فائز ہو گئے تو عدل و قسط اور انصاف و عدالت میں اپنی تمام مساعی وقف کر دیں۔ اظہار حق، شہادتوں کی چھان بین اور تفتیش مقدمات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جو مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا، پوری دیانت داری سے اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی

❶ مآثر الکرام دفتر اول، ص ۲۷۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۱۰۔

Marfat.com

اور اصل معاملے کے تمام پہلوؤں کو بے نقاب کیا۔ اس کے ہر گوشے کی تحقیق کی اور گواہوں کے صدق و کذب کے بارے میں پورا اطمینان حاصل کیا۔ کہیں کوئی جھول باقی نہیں رہنے دیا اور اس نتیجے تک پہنچنے کی امکان بھر سعی کی کہ کسی گواہ یا کسی ادنیٰ یا اعلیٰ اہل کار کو مدعی یا مدعیٰ علیہ نے کسی قسم کی رشوت تو نہیں دی۔ کوئی کسی نوع کے لالچ یا حرص وطمع میں تو نہیں آیا۔ اظہار حق اور قولِ صدق میں بادشاہ کی بھی کبھی پروا نہیں کی، اگرچہ بادشاہ کی مخالفت ہی ہوتی ہو اور اس کی طبعِ نازک پر ان کا انداز کلام گراں گزرتا ہوں۔

شاہ نواز مآثر الامرا میں قاضی شیخ الاسلام کی بادشاہ کے سامنے حق گوئی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے جب دکن پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور وہاں کے حکمرانوں کو زیر کرنے کی ٹھانی تو قاضی شیخ الاسلام سے فتویٰ پوچھا۔ چوں کہ دکن کے حکمران بھی مسلمان تھے، لہٰذا شیخ الاسلام نے بادشاہ کی مخالفت کی اور فتویٰ دیا کہ اسے دکن پر فوج کشی نہیں کرنی چاہیے۔

شاہ نواز یہ بھی لکھتا ہے کہ قاضی شیخ الاسلام نے کافی مدت تک خدمت قضا پر متمکن رہنے کے بعد اس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی، حالاں کہ بادشاہ عالم گیر مصر تھا کہ وہ ہر حال میں اس منصب پر فائز رہیں۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ منصب قضا چھوڑ دینے کے بعد وہ حجاز تشریف لے گئے تھے۔ وہاں حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔ پھر ہندوستان واپس لوٹے تو احمد آباد میں اقامت گزین ہو گئے۔ جب عالم گیر کو ان کی معاودت ہند اور سکونت احمد آباد کا پتا چلا تو ان پر بڑی عنایات کیں اور ہدایا وعطایا سے نوازا۔ بادشاہ نے ان کو پہلے قضا اور پھر صدارت کی پیش کش کی، لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے معذرت کر دی۔ جب بادشاہ نے بہت اصرار کیا تو بادل نخواستہ قبول منصب کی غرض سے اپنے شہر (احمد آباد) سے روانہ ہوئے، لیکن دورانِ سفر ہی میں انتقال کر گئے۔ بادشاہ کو ان کی وفات کا علم ہوا تو نہایت حزن وملال کا اظہار کیا۔

درباری وقائع نگار محمد ساقی مستعد خاں نے اپنی تصنیف مآثر عالم گیری میں قاضی شیخ الاسلام کا کئی مقام پر ذکر کیا ہے اور ہر جگہ نہایت احترام سے ان کا نام لیا ہے۔ مثلاً ١٠٨٦ھ/ ١٦٧٥ء کے واقعات کے ضمن میں جو اورنگ زیب عالم گیر کا انیسواں سال جلوس اور قاضی عبدالوہاب کا سن وفات ہے، مستعد خاں لکھتا ہے:

”قاضی عدالت ملا عبدالوہاب نے ١٥ر رمضان ١٠٨٦ھ/ ٣ر دسمبر ١٦٧٤ء کو دارالسلطنت میں وفات پائی۔ جہاں پناہ (بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر) نے قاضی مذکور کے بیٹے شیخ الاسلام کو جو دارالسلطنت کے قاضی تھے، اپنے حضور میں طلب فرما کر ان کے باپ کی جگہ قاضی لشکر مقرر فرمایا[1]۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والد کی وفات کے وقت قاضی شیخ الاسلام، دارالسلطنت دہلی کے منصب قضا پر متعین تھے۔

دوسری جگہ جلوس عالم گیری کے ستائیسویں سال (ماہ ذی الحجہ ١٠٩٤ھ/ نومبر ١٦٨٣ء) کے واقعات

---

[1] مآثر عالم گیری، ص ١٦٤۔

Marfat.com

میں یہی وقائع نگار رقم طراز ہے:

''قاضی عبدالوہاب کے بیٹے شیخ الاسلام، اپنی ذاتی استعداد اور فطرتِ سلیم کے تقاضے کے تحت جذبۂ محبت الٰہی سے بے قرار ہوئے اور دنیا سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ہر چند بادشاہ جہاں پناہ نے ان پر عنایات فرمائیں اور ترکِ خدمت سے منع کیا، اور عہدۂ قضا کو جو انہی جیسے پاک باز نفوس کو زیب دیتا ہے، انہی کی ذات سے وابستہ رکھنا چاہا، لیکن قاضی شیخ الاسلام نے اپنے ارادوں میں کسی طرح تبدیلی نہ کی۔ بادشاہ نے مجبور ہو کر قاضی ممدوح کی رائے سے سید ابوسعید کی جو عالی نسب سید اور قاضی عبدالوہاب کے داماد (اور قاضی شیخ الاسلام کے بہنوئی) تھے، عہدۂ قضا مرحمت فرمایا❶۔''

ایک اور مقام پر عالم گیر کے بیالیسویں سال جلوس اور ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء کے واقعات کے سلسلے میں محمد ساقی مستعد خاں، حسب ذیل الفاظ میں قاضی شیخ الاسلام کا ذکر کرتا ہے:

محبت، خدا دوستی اور شفقت بندہ نوازی کی وجہ سے بادشاہ نے شیخ الاسلام کے نام ایک اشتیاق آمیز فرمان ان کے برادر نورالحق کے ہاتھ ارسال فرمایا۔ فرمان کا مضمون یہ تھا کہ آپ شغل قضا سے مستعفی اور سفر حجاز سے مراجعت کے بعد ایک مرتبہ بھی حضور میں نہیں آئے۔ اگر اس طرف توجہ مبذول کریں تو مناسب ہوگا۔ شیخ الاسلام، اس وقت احمد آباد میں مقیم تھے۔ بادشاہ کا منشا یہ تھا کہ اگر شیخ مذکور حضور میں آ جائیں اور صدارت کی خدمت قبول کر لیں تو یہ عہدۂ جلیلہ ان کو تفویض فرمایا جائے۔ لیکن اس کے برعکس شیخ الاسلام کا ارادہ دوبارہ طوافِ کعبہ کا احرام باندھنے کا تھا۔ اتنے میں دفعتاً مرض نے شدت اختیار کی اور مرحوم کو سفر آخرت طے کرنا پڑا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے❷۔

بہر حال قاضی شیخ الاسلام عہد عالم گیری کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ انھوں نے ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء میں وفات پائی اور دیگر لوگوں کے علاوہ بادشاہ نے بھی ان کی وفات پر انتہائی حزن و تاسف کا اظہار کیا❸۔

ـــ ص ـــ

۹۰۔ شیخ صبغت اللہ سرہندی

شیخ صبغت اللہ سرہندی، حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور حضرت شیخ محمد معصوم

❶ مآثر عالم گیری، ص ۲۵۵۔

❷ مآثر عالم گیری ص ۳۶۹۔

❸ منتخب اللباب، ج ۲ ص ۴۱۴، ۴۱۵۔ مآثر عالم گیری، ص ۱۴۸، ۲۱۰، ۲۲۵، ۲۳۹، ۲۵۱، ۳۳۹، ۳۹۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۱۱، ۱۱۲

Marfat.com

سرہندی کے بیٹے تھے۔ ۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۳ء میں پیدا ہوئے اور علم ومعرفت کی گود میں پرورش پائی۔ شیخ محمد معصوم نے اپنے اس نیک بخت بیٹے کے چہرے پر تقویٰ وصالحیت کے آثار دیکھ کر اوران کے ورع وعبادت سے متاثر ہوکر، انھیں مرتبہ قطب پر فائز ہونے کی بشارت دی تھی۔

شیخ صبغت اللہ سرہندی اپنے دور کے نامور عالم وفقیہ تھے۔ ان کے شب وروز لوگوں کو رشد وہدایت اور طریق حق کی دعوت دینے میں صرف ہوتے تھے۔ ہر وقت ترویج شریعت اور ترغیب سنت میں سرگرم عمل رہتے۔ اسی بنا پر لوگوں نے ان کو مروّج الشریعت کا لقب دے رکھا تھا، جس کا مطلب ہے، شریعت حقہ کے احکام کو رواج دینے والا۔

برصغیر پاک وہند میں حضرت مجدد الف ثانی کا خاندان علم وفضل، زہد وتقویٰ اور تصوف وطریقت میں خاص شہرت کا حامل ہے۔ جو خدماتِ دینیہ اس خاندان کے بزرگوں نے انجام دیں، وہ ارض ہند کے کسی اور خاندان کے حصے میں نہیں آئیں۔ شیخ صبغت اللہ سرہندی کا مرتبہ بھی اس سلسلے میں بڑا بلند ہے۔

خطۂ سرہند کے اس رفیع المنزلت عالم وفقیہ اور خانوادۂ مجددیہ کے بلند مرتبت مرد صالح نے ۹ ربیع الاول ۱۱۲۱ھ/ ۸ مئی ۱۷۰۹ء کو وفات پائی ❶۔

ــــ ض ــــ

۹۱۔ سید ضیاء اللہ بلگرامی

سید ضیاء اللہ بن خان محمد بن عبدالغفار بن تاج الدین حسینی واسطی بلگرامی، علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ اپنے عہد کے شیخ، عالم اور نامور فقیہ تھے۔ مولد ومنشا بلگرام ہے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کا جذبہ بیدار ہوا۔ سب سے پہلے تجوید کے ساتھ قرآن مجید حفظ کیا۔ اس زمانے میں بلگرام کو علم وفضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی، اور وہاں مشہور علمائے کرام کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ سید ضیاء اللہ نے حفظ قرآن کے بعد ان علما سے مختلف درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر مزید تحصیل علم کی غرض سے دیگر مقامات کا قصد کیا اور مروجہ علوم کی بعض کتابوں کا درس لیا۔ کچھ عرصے بعد کالپی گئے۔ وہاں شیخ احمد بن محمد حسینی ترمذی کالپوی کی مسند طریقت آراستہ تھی، ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تصوف کی بعض کتابیں ان سے باقاعدہ درساً درساً پڑھیں۔ بعد ازاں علوم ظاہری وباطنی پر عبور حاصل کر کے اپنے شہر بلگرام واپس آئے۔

سید ضیاء اللہ بلگرامی گوناگوں اوصاف کے مالک تھے۔ معقولات ومنقولات میں مہارت کے ساتھ ساتھ انشا ومراسلہ نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی کی نظم ونثر میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ٦، ص ۱۱۳ بحوالہ تذکرۃ الانساب از قاضی ثناء اللہ۔

Marfat.com

بلگرام کے اس ہمہ اوصاف عالم وفقیہ نے منگل کے روز ۲۵؍شعبان ۱۱۰۴ھ/ ۲۱؍اپریل ۱۶۹۳ء کو اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کا سفر اختیار کیا❶۔

ـــــ ط ـــــ

۹۲۔ سید طفیل محمد اترولوی بلگرامی

سید طفیل محمد بن سید شکر اللہ حسینی اترولوی ثم بلگرامی، معقول و منقول کے مجمع البحرین، فقہ واصول کے ماہر اور تفسیر وحدیث کے عالم تھے۔ ۷؍ذی الحجہ ۱۰۷۳ھ/ ۳؍جولائی ۱۶۶۳ء کو اترولی کے ایک سید خاندان میں پیدا ہوئے۔ اترولی ایک گاؤں کا نام ہے جو اس زمانے میں اعمال آگرہ میں واقع تھا۔ ان کے والد سید شکر اللہ حسینی بڑے نیک بزرگ تھے، انھوں نے سعادت مند بیٹے کو اوائل عمر ہی میں ایک معروف فاضل سید سعد اللہ حسینی بلگرامی (متوفی ۱۷؍شوال ۱۱۱۹ھ/ ۳۱؍دسمبر ۱۷۰۷ء) کے حلقہ ارادت میں داخل کرا دیا تھا۔ ابھی صغر سن میں تھے کہ ان کے عم محترم سید احسن اللہ انھیں اترولی سے دارالسلطنت دہلی لے گئے۔ علم صرف کی ابتدائی کتاب میزان الصرف کا ایک سبق تبرکاً سید حسن رسول نما نارنولی (متوفی ۲۲؍شعبان ۱۱۰۳ھ/ ۲۹؍اپریل ۱۶۹۲ء) سے پڑھا اور شرح جامی تک کتابیں اپنے عم مکرم سید احسن اللہ حسینی بلگرامی سے پڑھیں۔ پندرہ سال کی عمر میں ۱۰۸۸ھ/ ۱۶۷۷ء کے لگ بھگ کسب علم کی غرض سے اترولی سے بلگرام گئے۔ وہاں بعض کتب درسیہ کا درس سید مربی بلگرامی (متوفی ۱۶؍شعبان ۱۱۱۷ھ/ ۲۲؍اکتوبر ۱۷۰۵ء) اور سید سعد اللہ بلگرامی (متوفی ۱۷؍شوال ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۳ء) سے لیا اور بعض کے لیے قاضی علیم اللہ کچندوی (متوفی ۱۱۱۵ھ/ ۲۲؍اگست ۱۷۰۳ء) کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ مطولات سید قطب الدین شمس آبادی (متوفی ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء) سے پڑھیں۔ حدیث کی تحصیل سید مبارک بن فخر الدین حسینی واسطی بلگرامی (متوفی ۲۰؍ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۹ء) سے کی۔ بعد ازاں مستقل طور پر بلگرام ہی میں سکونت اختیار کر لی اور اپنے آپ کو درس وافادہ طلبا کے لیے وقف کر دیا۔

سید طفیل محمد چوں کہ اترولی میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے اترولوی کہلائے اور پھر وہاں سے بلگرام میں نقل مکانی کر گئے تھے، لہٰذا بلگرامی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ بے حد متقی عالم دین تھے۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی دل میں مال و دولت جمع کرنے کی حرص پیدا نہیں ہوئی۔ نہ مکان بنایا اور نہ شادی کی۔ ہمیشہ دنیا سے دور اور اس کے ساز وسامان سے نفور رہے۔ خلق کثیر نے ان سے اخذ علم کیا۔ ان کے تلامذہ کی بہت بڑی جماعت میں سید غلام علی آزاد بلگرامی بھی شامل ہیں۔

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۳۰ تا ۲۲۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۱۸۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۹۸۔ سرو آزاد، ص ۲۵۰، ۲۵۱۔ تذکرۂ بے نظیر، ص ۸۴۔ مفتاح التواریخ، ص ۲۸۷، ۲۸۸۔

Marfat.com

سید طفیل محمد بلگرامی شاعر بھی تھے۔ ان کے بعض اشعار ان کے حالات سے متعلق کتابوں میں درج ہیں۔

سید ممدوح نے ۲۴؍ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ/۲۴؍ مارچ ۱۷۳۹ء کو بلگرام میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

۹۳۔ سید طیب بلگرامی

سید طیب بن نعمت اللہ بن طیب بن عبدالواحد حسینی واسطی بلگرامی، بارھویں صدی ہجری میں بلگرام کے شیخ و فاضل تھے اور ان کا شمار اس دور کے معروف علما اور اللہ کے برگزیدہ بندوں میں ہوتا تھا۔

سید طیب حسینی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ سید عبدالہادی حسینی بلگرامی (۲۰؍ ربیع الاول ۱۱۳۳ھ/ ۸؍ جنوری ۱۷۲۱ء) سے اخذ علم کیا۔ حدیث کے لیے سید مبارک بن فخر الدین حسینی واسطی (متوفی ۲۰؍ ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ/ ۲۰؍ اگست ۱۷۰۴ء) کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ سید طیب بلگرامی کے والد مکرم سید نعمت اللہ حسینی بلگرامی (متوفی ۵؍ رمضان ۱۱۴۰ھ/ ۴؍ اپریل ۱۷۲۸ء) بہت بڑے صاحب فضل اور عالم دین تھے، کتب درسیہ میں ماہر اور علوم حکمیہ میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے فائق تھے۔ بحث و مناظرہ میں تیز تھے، مولانا قطب الدین شہید سہالوی (شہادت ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء) کے شاگرد تھے، اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد بلگرام میں درس و افادۂ طلبا میں مشغول ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد اس لائق بیٹے (سید طیب حسینی بلگرامی) نے ان کی مسند سنبھالی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

سید طیب متعدد خصوصیات کے مالک تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے آبا و اجداد کے علوم و معارف کے وارث تھے اور اپنے دور کے قابل ذکر عالم دین تھے۔ ان کا خط بڑا خوب صورت تھا اور نہایت زود نویس تھے۔ انھوں نے کئی ضخیم درسی اور غیر درسی کتابوں کی کتابت کی مثلاً شرح جامی کی شروع سے آخر تک صرف ایک ہفتے میں کتابت کر دی تھی۔ اسی طرح محدث یمن اور دیار عرب کے مشہور بزرگ شیخ یحییٰ بن ابوبکر العامری الیمنی الشافعی (۸۱۶۔۸۹۳ھ/۱۴۱۳ء۔۱۴۸۸ء) کی کتاب ''بہجۃ المحافل'' جو سیرت نبوی ﷺ کے موضوع پر ہے اور ضخیم کتاب ہے، تیس روز میں لکھ ڈالی تھی۔ ان کا کتب خانہ بہت بڑا اور شان دار تھا جو نایاب اور عمدہ کتابوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے بیشتر کتابیں ان کی خود اپنی کتابت کردہ تھیں۔ وفات کے بعد یہ کتب خانہ ان کی ایک عظیم یادگار تھا۔ عالم جوانی میں کچھ دن ملازمت بھی کی مگر وظائف و اوراد اور مطالعہ کتب میں بہ دستور مشغول

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۱۳۳ تا ۱۴۰۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۸، ۹۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۱۸، ۱۱۹۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲۔ سبحۃ المرجان، ص ۹۰ تا ۹۳۔ ابجد العلوم، ص ۹۱۰۔ سرو آزاد، ص ۲۵۱، ۲۵۲۔ تقصار جنود الاحرار، ص ۲۲۲۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ص ۱۴ تا ۱۸۔

Marfat.com

رہے۔ والد کی وفات کے وقت احمد آباد (گجرات) میں ملازم تھے۔ ان کی وفات کی خبر سنتے ہی سلسلۂ ملازمت ترک کر کے فوراً بلگرام پہنچ گئے اور سجادۂ اسلاف پر متمکن ہو گئے۔

سید طیب بلگرامی چند کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں ایک کتاب سیرت کے موضوع پر ہے، جسے ''الجامع الطیبی'' کے نام سے موسوم کیا۔ ایک کتاب، مسائل فقہ کے بارے میں تصنیف کی۔

بلگرام کے اس متعدد اوصاف کے حامل، صاحب علم وفضل بزرگ نے چہارشنبہ کے روز ۷/رجب ۱۱۵۲ھ/ ۲۹/ستمبر ۱۷۳۹ء کو بلگرام میں وفات پائی اور اپنے جد امجد سید عبدالواحد حسینی بلگرامی کے قریب دفن کیے گئے❶۔

ـــــ ظ ـــــ

۹۴۔ سید ظریف حسینی عظیم آبادی

ہندوستان کے صوبہ بہار میں ایک شہر برصغیر کی قدیم تاریخ میں ''عظیم آباد'' کے نام سے معروف تھا۔ یہ شہر اس وقت ''پٹنہ'' کے نام سے موسوم ہے اور صوبہ بہار کا دارالحکومت ہے۔ یہ شہر کسی زمانے میں علم وفضل کا منبع تھا، تصوف وطریقت کا مرکز اور تحقیق وتدقیق کا گہوارہ تھا۔ اس میں بے شمار علماء پیدا ہوئے اور لاتعداد اصحابِ فضل نے درس وتدریس کی شمع روشن کی۔ ان میں بارھویں صدی ہجری کے ایک عالی قدر عالم سید ظریف حسینی عظیم آبادی بھی تھے، جو شیخ وقت اور علامہ عصر تھے۔ فقہ واصول اور علم کلام میں انھیں دست رس حاصل تھی۔ شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء) کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد سید ظریف عظیم آبادی اپنے شہر عظیم آبادی میں سرگرم تدریس ہوئے اور مدرسہ سیف خاں میں مسند درس آراستہ کی۔ اپنے استاذ گرامی شیخ نظام الدین انصاری سہالوی سے انھیں شدید محبت وعقیدت اور قلبی تعلق تھا، ان کی موت کی خبر پہنچی تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور شدت غم سے روتے روتے آنکھیں ضائع ہو گئیں، لیکن بعد میں پتا چلا کہ شیخ زندہ ہیں اور انتقال کی خبر غلط تھی، لیکن اس اثنا میں لائق شاگرد کی بصارت ختم ہو چکی تھی۔

منقول ہے کہ سید ظریف حسینی چند کتابوں کے مصنف بھی تھے، مگر ان کی تصانیف کا علم نہیں ہو سکا۔ ان سے علما وطلبا کی ایک بڑی تعداد نے استفادہ کیا❷۔

---

❶ مآثر الکرام، ص ۴۹ تا ۵۱۔ تقصار، ص ۲۰۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۱۹، ۱۲۰۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۲۱، بحوالہ رسالہ قطبیہ۔

Marfat.com

ع

۹۵۔ شیخ عبدالباسط سندھی

شیخ عبدالباسط سندھی کے والد بزرگ وار کا اسم گرامی مخدوم علی احمد قُمری تھا۔ وہ بڑے خوش آواز اور خوش الحان تھے، اسی لیے ''قُمری'' کے عرف سے معروف تھے۔ صاحب کمال اور صاحب فضیلت شخص تھے۔ ان کے بیٹے شیخ عبدالباسط بھی اپنے زمانے اور علاقے کے جید عالم تھے اور فقہ واصول اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ عالم گیر کے دربار میں گئے اور تاریخ فتح قلعہ اس آیت کریمہ سے نکالی: ﴿هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ ❶۔ قدر شناس بادشاہ نے اس کے انعام میں اور ان کے کمالات علمی کے پیش نظر انھیں ٹھٹھہ کے منصب قضا کے ساتھ ''صدی'' کا اعزاز بھی عطا کیا، جس پر وہ عرصے تک فائز رہے۔ آخری دنوں میں حجاز تشریف لے گئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کر کے واپس ٹھٹھہ آئے۔ ضعف پیری اور سن رسیدگی کے باوجود طلبا کو درس دینے میں مشغول رہتے ❷۔

۹۶۔ سید عبدالجلیل حسینی بلگرامی

سید عبدالجلیل بن سید امیر احمد حسینی واسطی بلگرامی، علامہ وقت، شیخ دوراں، فاضل عصر، صاحب مفاخر بیضا اور حامل مآثرِ غرا تھے۔ مشہور مؤرخ اور تذکرہ نگار میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نانا تھے۔ حدیث، لغت اور سیرت میں ان کے استاذ بھی تھے۔ ۱۳ر شوال ۱۰۷۱ھ/ یکم جون ۱۶۶۱ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ کچھ بڑے ہوئے تو سید سعد اللہ بلگرامی (متوفی ۱۷ر شوال ۱۱۱۹ھ/ ۳۱ر دسمبر ۱۷۰۷ء) سے مختصرات پڑھیں۔ بعد ازاں مزید حصول علم کے لیے علاقہ اودھ کے مختلف قصبات و بلاد کا سفر کیا اور مشاہیر اساتذۂ عصر سے فیض یاب ہوئے۔ پھر اس عہد کے معروف بزرگ شیخ غلام نقشبند لکھنوی (متوفی ۱۱۲۶ھ/ ۱۷۱۴ء) کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے استفاضہ کیا۔ حدیث کی سند سید مبارک بن فخر الدین حسینی بلگرامی (متوفی ۲۰ر ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ/ ۲۲ر اگست ۱۷۰۳ء) سے حاصل کی۔ اس کے بعد عازم دکن ہوئے۔ ان دنوں سلطان اورنگ زیب عالم گیر دکن ہی میں فروکش تھا، اس سے ملاقات کی تو اس نے ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء میں بخشیگری کا منصب عطا کیا اور ساتھ ہی صوبہ پنجاب کے شہر گجرات کا سرکاری وقائع نگار مقرر فرمایا۔ پھر ان کی خدمات ۱۱۱۶ھ/ ۱۷۰۴ء کو علاقہ سندھ میں

❶ یہ سورہ ص کی آیت نمبر ۳۹ ہے۔ ترجمہ یہ ہے: (یہ ہماری عطا ہے، سو چاہے تو بخش دے اور چاہے تو اپنے پاس بغیر حساب کے رکھ لے۔)

❷ تحفۃ الکرام، ص ۶۸۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۳۶۔

Marfat.com

بھکر اور سیوستان میں منتقل کر دیں۔ اس خدمت پر ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء تک مامور رہے۔ پھر اس سے معزول ہو گئے اور فرخ سیر کے عہد میں ان کی جگہ ان کے بیٹے سید محمد (متوفی ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء) کو اس منصب سے سرفراز کیا گیا۔

ترکِ منصب کے بعد سید عبدالجلیل بلگرامی، دہلی میں مقیم ہو گئے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اسماء الرجال اور تاریخ کے بہت بڑے عالم تھے۔ معانی، بیان، بدیع اور تاریخ و سیرت میں بھی دست گاہ رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی کے شاعر تھے۔ معقولات و منقولات کے جامع اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ لغت میں اس درجہ عبور تھا کہ گویا اس کے معدن اور مصدر تھے۔ اس کے تمام گوشوں، اس کی تمام باریکیوں اور نزاکتوں سے باخبر تھے۔ اس دور میں معرفت لغت میں غالباً ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ سب سے منفرد اور یگانہ تھے۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے ماہر تھے۔ ان زبانوں میں فصاحت سے بات کرتے اور خوب صورت شعر کہتے۔ عربی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یا صاح لا تلم المتیم فی الھوی　　　ھو عاشق لا یثنی عن خلہ
یأبیٰ الدواء سقامہ کعیونہ　　　فعلی الطبیعۃ یا معالج خلہ

(اے صاحب! تو عاشق کو اس کی محبت میں ملامت نہ کر، وہ عاشق ہے اور اپنی عادت سے گریز نہیں کرے گا۔

اس کی بیمار آنکھیں دوا کو قبول نہیں کرتیں۔ پس اے معالج! تو اس کو فطرت کے فیصلے پر چھوڑ دے۔)

دو س شعر اور ملاحظہ ہوں:

حبیبی قوس حاجبہ کنون　　　وصاد بدین مقلۃ شکل عینہ
لعمری انہ نص جلی　　　علیٰ ان الرمایۃ حق عینہ

(جو میرا دوست ہے، اس کی بھوؤں کی کمان نون اور صاد کی طرح ہے۔ اس کی آنکھوں کی ڈھیلے موٹے ہیں۔

میری زندگی کی قسم، یہ بات بالکل واضح ہے کہ تیر اندازی اس کی آنکھوں کا حق ہے۔)

ایک مرتبہ خواجہ عبدالباسط دہلوی سے زمخشری کی ''ربیع الابرار'' طلب کی تو یہ شعر لکھ بھیجے:

یا باسط الایدی یا غیث الندی　　　صیرت مزرعۃ العطاء مریعا
لا غرو ان اطلب ربیعا منکم　　　فالغیث یعطی العالمین ربیعا

(اے کشادہ حال، اے مددگار، تو عطا و بخشش کی خوش گوار کھیتی بن گیا ہے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ میں تم سے ربیع طلب کر رہا ہوں، اور ابر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ایک دنیا کو ربیع یعنی موسم بہار سے نوازتا ہے۔)

Marfat.com

ایک شعر یہ بھی پڑھیے:

ھو البدر الا انہ البحر زاخرا سوی انہ الفرض نمام لکنہ الوبل

(وہ چودھویں کا چاند ہے، مگر وہ ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا، سمندر بھی ہے، علاوہ ازیں وہ شیر بھی ہے، اور برسنے والا بادل بھی۔)

ایک شعر اور دیکھیے:

ھو القطب الا انہ البدر طالعا سوی انہ المریخ لکنہ السعد

(وہ قطب ہے، مگر وہ چودھویں کا چاند بھی ہے جو نمودار ہوا، اور ساتھ ہی وہ اگر چہ مریخ بھی ہے، تاہم سعد ہے۔)

زبان پر قدرت کا یہ عالم تھا کہ ۱۱۱۱ھ/ ۱۷۰۰ء کو اورنگ زیب عالم گیر نے قلعہ ستارہ فتح کیا تو ایک رات میں عربی اور فارسی میں گیارہ قطعے اس فتح کی تاریخ میں نظم کیے اور رسالے کے صورت میں مرتب کر کے اسے ''گل زارِ فتح شاہ ہند'' اور ''طوطی نامہ فیروزی شاہ عالم گیر'' کے نام سے موسوم کیا۔ یہ قطعے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے اور الطاف خسروانہ سے سرفراز ہوئے۔ اس میں لطف کی بات یہ ہے کہ رسالے کے ان دونوں ناموں سے قلعہ ستارہ کے فتح کی تاریخ نکلتی ہے۔

اس عظیم المرتبت عالم نے ہفتے کی رات ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ/ دسمبر ۱۷۲۵ء کو دہلی میں وفات پائی اور ان کی وصیت کے مطابق میت کو بلگرام لے جا کر جمعے کے روز نمازِ عصر کے اول وقت ۶/ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۸ھ/ ۳۰ دسمبر ۱۷۲۵ء کو ان کے والد گرامی میر سید احمد بلگرامی کے قریب دفن کیا گیا❶۔

۹۷۔ سید عبدالحکیم لاہوری

سید عبدالحکیم کا نسب نامہ یہ ہے: عبدالحکیم بن بایزید بن نظام الدین بن محمد بن مبارک حسنی قادری لاہوری، معروف رجالِ فضل وصلاح اور مشہور مشائخ میں سے تھے۔ سلسلۂ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک منتہی ہوتا ہے۔ ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں تربیت پائی۔ جید عالم دین، فقیہ صالح، متقی ومتدین، متواضع، متحمل مزاج، حلیم الطبع اور بے حد منکسر تھے۔ ۱۱۰۸ھ/ ۱۶۹۷ء کو لاہور میں وفات پائی❷۔

❶ حیات جلیل (از مقبول احمد صمدانی) سبحۃ المرجان، ص ۷۹ تا ۹۴۔ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۴۵ تا ۲۶۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۱۳۹، ۱۴۰۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۷، ۹۰۸۔ قضاء الارب من ذکر علما والنحو والادب، ص ۲۰۵، ۲۰۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۷۔ خزانۂ عامرہ، ص ۳۵۲ تا ۳۶۱۔ مفتاح التواریخ، ص ۳۱۰، ۳۱۱۔ تذکرہ بے نظیر، ص ۹۰ تا ۹۵۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۸، ۱۰۹۔ سرو آزاد، ص ۲۵۳ تا ۲۸۶۔

❷ خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۷۱، ۱۷۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

Marfat.com

۹۸۔ شاہ عبدالرحیم دہلوی

حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمہ اللہ بارھویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے عالم کبیر، فقیہ نام دار، شیخ جلیل اور عارف باللہ تھے۔ نسباً فاروقی تھے، شاہ وجیہ الدین عمری دہلوی کے لائق بیٹے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد گرامی تھے۔

شاہ عبدالرحیم دہلوی کے حالات بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر ان کے خاندان اور آباواجداد میں سے بعض بزرگوں کے حالات وکوائف بھی درج کردیے جائیں تاکہ پتا چل سکے کہ خاندانِ ولی اللہی علم وفضل اور تقویٰ وللّٰہیت میں ابتدا ہی سے کس اونچے درجے کا مالک تھا۔

مفتی شمس الدین:

شاہ عبدالرحیم دہلوی کا خاندان، برصغیر پاک وہند کا مشہور ترین علمی خاندان ہے۔ فضل وصلاح، علم وعرفان، عمل وکردار، جہاد فی سبیل اللہ، تصنیف وتالیف، درس وتدریس اور تحریر وتقریر میں ارض ہند کا کوئی خاندان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کے تمام افراد علمی جدوجہد، عمل وعزم، دعوت وارشاد، تبلیغ واشاعت دین، ہمت وحوصلہ، عبادت وریاضت، ورع وتقویٰ اور تدین وصالحیت کے ارفع اوصاف سے متصف تھے۔ بدعات ومحدثات کی بیخ کنی اور توحید ورسالت کی نشر وترویج میں جو خدمات اس خاندان کے علمائے عالی مقام نے انجام دیں، اس میں کوئی اس کا حریف نہیں۔

اس خانوادۂ بلند مرتبت کے پہلے بزرگ جو ارض ہند میں وارد ہوئے، مفتی شمس الدین تھے، انھوں نے مشرقی پنجاب کے ایک شہر رہتک میں سکونت اختیار کی۔ اس نواح میں وہ اسلام کے بہت بڑے مبلغ اور داعی تھے۔ منقول ہے کہ وہ اصلاً عربی النسل تھے اور ہر طبقہ فکر کے لوگوں میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم مروجہ میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے۔ نیکی اور اتقا میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

مفتی کمال الدین:

مفتی شمس الدین کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مفتی کمال الدین مسند افتا پر متمکن ہوئے۔ وہ بھی باپ کی طرح صالح اور متقی تھے۔ عالم وفاضل، متبع کتاب وسنت اور حامی دین متین تھے، دقیق النظر، بلند فکر اور روشن خیال تھے۔ ریاضت ومجاہدہ کی بہت سی منزلیں طے کرچکے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت تحقیق مسائل اور مطالعہ کتب میں صرف ہوتا تھا۔ اس درجہ دینی کمالات کے مالک تھے کہ تھوڑے ہی عرصے میں اہل علم اور اصحاب فضل کے حلقوں میں مقبول ومشہور ہوگئے۔ اپنے بلندمرتبت باپ کے صحیح جانشین تھے اور اللہ نے ان کو ہر قسم کی خوبیوں سے نوازا تھا۔

Marfat.com

مفتی قطب الدین:

مفتی کمال الدین کا انتقال ہوا تو ان کے بعد ان کے لائق اور ہونہار فرزند مفتی قطب الدین کو منصب افتا تفویض کیا گیا۔ ان کے حالات زندگی کا پتا نہیں چل سکا، تاہم اتنا معلوم ہے کہ وہ بھی اس خاندان عالی قدر کی ایک ممتاز شخصیت تھے اور دعوت وارشاد اور تبلیغ واشاعت دین میں خاص شہرت کے حامل تھے۔

شیخ عبدالمالک:

مفتی قطب الدین راہیٔ ملک بقا ہوئے تو ان کے صاحب زادے شیخ عبدالمالک نے اس مسند کو زینت بخشی۔ شیخ عبدالمالک، عاقل وفہیم اور ذہین وطباع تھے۔ روحانیت وللّٰہیت کے اعلیٰ جوہر سے آراستہ تھے۔ ان کا دل علم کی روشنی سے تاباں اور فراست وفطانت کی ضو سے درخشاں تھا۔ ان کی فراوانیٔ علم سے اس خاندان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور اس کی نجابت وشرافت میں بے حد اضافہ ہوا۔

شیخ عبدالمالک نے ابتدائی درسی کتابیں اپنے ہی خاندان کے علما سے پڑھی تھیں۔ اس کے بعد مزید حصول علم کا شوق دامن گیر ہوا تو فنون مروجہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ پھر تحصیل علم حدیث کی طرف عنان توجہ مرکوز فرمائی۔ قرآن مجید سے ان کو انتہائی لگاؤ تھا۔ زیادہ وقت تلاوت قرآن میں صرف کرتے اور لوگوں کو اس کے اسرار ونکات سے آگاہ فرماتے۔ بہترین واعظ اور مبلغ تھے اور ان کے پند ومواعظ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ توحید کی تبلیغ اور بدعات کی تردید احسن طریقے سے کرتے۔ کتنے ہی لوگوں نے ان کے پیرایۂ وعظ سے متاثر ہو کر خلافِ شرع رسوم وعوائد کو ترک کیا اور شریعت حقہ کو مشعل راہ ٹھہرایا۔ افسوس ہے انھوں نے زیادہ عمر نہ پائی اور عین عالم جوانی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

قاضی بدھا:

شیخ عبدالمالک کی رحلت کے بعد رہتک کے قضا واحتساب اور افتا کا معزز عہدہ ان کے عزیز القدر فرزند قاضی بدھا کے حصے میں آیا۔ قاضی بدھا زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے، البتہ بلندیٔ اخلاق اور تقویٰ وصالحیت میں اپنے دور اور گردونواح کی منفرد شخصیت تھے۔ عقل ودانش اور فکر وفہم میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔

قاضی قاسم:

قاضی بدھا کے دو بیٹے تھے۔ ایک قاضی قاسم، دوسرے قاضی منکن۔ بلاشبہ دونوں بھائی تقدس وپاک بازی میں ممتاز تھے اور علوم ظاہری وباطنی سے بہرہ ور۔ لیکن باپ کے منصب قضا کے وارث، قاضی قاسم قرار پائے۔

Marfat.com

قاضی قادن:

قاضی قاسم کے بھی دو صاحب زادے تھے۔ بڑے قاضی قادن اور چھوٹے شیخ کمال الدین۔ دونوں بھائی عالم و فاضل، عقیل و فہیم اور ذہین و فطین تھے۔ مگر باپ کی رحلت کے بعد منصب قضا و افتا کے وارث قاضی قادن ہوئے، کیوں کہ وہ شیخ کمال الدین سے عمر میں بڑے تھے۔

شیخ محمود:

شیخ قادن نے بھی دو فرزند اپنی یادگار چھوڑے۔ بڑے شیخ محمود اور چھوٹے شیخ آدم۔ قاضی قادن کے ارتحال کے بعد شیخ محمود کو قضا و فتویٰ کا منصب عطا ہوا۔ وہ اس خانوادے کے برگزیدہ اور معزز و محترم فرد تھے۔ سب لوگ ان کی بے انتہا تکریم کرتے تھے۔ نہ صرف شہر رہتک میں ان کی علمی شان و شوکت مسلمہ تھی، بلکہ اس کے اطراف و جوانب میں بھی ہر طبقہ و خیال کے لوگوں میں انھیں تعظیم و توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن ان کی طبیعت میں انقلاب و تغیر کی کچھ ایسی لہر دوڑی کہ منصب قضا ترک کر کے اور اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو کر امورِ حکومت میں شامل ہو گئے اور سپاہیانہ زندگی اختیار کر لی۔

شیخ احمد:

شیخ محمود کے صاحب زادۂ گرامی قدر شیخ احمد تھے، جو عالم طفولیت ہی میں اپنے وطن رہتک سے نکل گئے تھے اور اس دور کے ایک عالم دین شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم کی خدمت میں چلے گئے تھے۔ شیخ احمد کی تعلیم و تربیت شیخ عبدالغنی کے ہاں ہوئی۔ ان کی فراست و قابلیت سے متاثر ہو کر شیخ عبدالغنی نے اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی۔ شیخ احمد کافی مدت شیخ عبدالغنی کے پاس رہے۔ اس کے بعد دوبارہ رہتک آ گئے تھے اور قلعہ کے باہر ایک بہت بڑی عمارت تعمیر کرا کے خود بھی اسی میں رہنے لگے تھے اور اپنے تمام اعزہ و اقارب کو بھی اس میں ٹھہرایا۔ بیدار مغز اور عالم شخص تھے۔

شیخ منصور اور شیخ حسین:

شیخ احمد کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام شیخ منصور تھا اور دوسرے کا شیخ حسین! شیخ احمد کی آئندہ نسل کا سلسلہ انھی دو بیٹوں سے چلا۔ شیخ منصور متواضع اور بلند اخلاق تھے، شجاعت و بہادری اور تحمل و بردباری میں بے مثل تھے، شیخ حسین سے عمر میں بڑے تھے۔ چھوٹے بھائی شیخ حسین بھی تدین و تقویٰ میں ممتاز اور بہترین اوصاف سے متصف تھے۔

Marfat.com

شیخ معظم:

شیخ منصور کی دو بیویوں سے چار لڑکے تھے۔ شیخ معظم اور شیخ اعظم ایک بیوی سے، اور شیخ عبدالغفور اور شیخ اسماعیل دوسری بیوی سے۔ سب سے بڑے شیخ معظم تھے۔ شیخ معظم بھی باپ کی طرح شجاع اور جری تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سپاہیانہ طرز زندگی اختیار کر لیا تھا۔ کفار کے خلاف کئی معرکوں میں شریک ہوئے اور کامیاب رہے۔ جنگ جو اور مجاہد پیشہ تھے۔ اللہ نے انھیں علم و فضل اور نیکی و صالحیت کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا۔

شیخ وجیہ الدین:

شیخ معظم کے تین بیٹے تھے۔ شیخ جمال الدین، شیخ فیروز اور شیخ وجیہ الدین۔! شیخ وجیہ الدین بہت سی خوبیوں کے مالک اور متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ جہاں یہ عرفان و ادراک، علم و معرفت، فضل و کمال اور اتقاء و للّٰہیت میں یگانہ روزگار تھے، وہاں فنون سپاہ گری اور شجاعت و بسالت میں بھی خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کے زمانے میں مغلیہ سلطنت کا نامور تاج دار شہاب الدین محمد شاہ جہان تخت ہند پر جلوہ افروز تھا۔ یہ اس کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ شاہ جہان کی نظر بندی کے بعد ان کا بیٹا سلطان اورنگ زیب عالم گیر ملک کے اورنگِ سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے شیخ وجیہ الدین کی شجاعانہ سرگرمیوں سے متاثر ہو کر انھیں ایک ممتاز فوجی عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ یہی شیخ وجیہ الدین ہیں جو حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی کے والد گرامی قدر اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے جد امجد تھے۔ ان کی پارسائی اور بہادری و جواں مردی کے متعدد واقعات کتابوں میں منقول ہیں۔

اس خاندان کے تمام افراد اپنے وقت کے فقید المثال لوگ تھے۔ یہ خاندان ارضِ ہند میں کوکب درخشاں اور مہر تاباں کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ خاندان ہے جس نے اس برصغیر کی دبیز ردائے ظلمت کو تار تار کیا اور اپنی علمی مساعی اور بھرپور عملی کوششوں سے ملک کو دین صحیح کے نور و ضیا کی لازوال دولت سے روشناس کرایا۔ ان میں سے ہر ایک کی کتاب زندگی حیرت انگیز کوائف سے معمور اور سبق آموز واقعات سے مملو ہے۔ آیئے، اس مختصر تمہید اور خاندانِ شاہ ولی اللہی کے اسلاف کرام کے سرسری تعارف کے بعد حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ضروری حالات کو مرکز توجہ ٹھہرائیں اور انھیں قلم و قرطاس کی گرفت میں لانے کی کوشش کریں۔

ولادت اور دیگر حالات:

شاہ عبدالرحیم ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور علم و فضل کی گود، ورع و تقویٰ کی فضا اور

Marfat.com

تصوف وطریقت کے ماحول میں پرورش پائی۔ اورنگ زیب عالم گیر کا زمانہ حکومت تھا اور شاہ صاحب کے والد شیخ وجیہ الدین، عالم گیر کی حکومت میں ایک معزز منصب پر فائز تھے۔

شاہ عبدالرحیم کے نانا کا نام شیخ رفیع الدین محمد تھا، جو ایک نیک اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ ان کے حالات میں مرقوم ہے کہ انھوں نے اپنی وفات سے پہلے گھر کا سامان جمع کیا اور شرعی حساب کے مطابق تمام ورثا میں تقسیم کر دیا۔ جب سب سے چھوٹی لڑکی کی باری آئی تو انھیں فوائد طریقت کے چند اجزا اور مشائخ کا شجرہ عطا فرمایا۔ اس پر شیخ کی بیوی نے عرض کیا، یہ لڑکی ابھی غیر شادی شدہ ہے، اسے کاغذ کے یہ چند اوراق دینا مناسب نہیں۔ اس کے لیے شادی کا سامان مہیا کرنا ضروری ہے۔ فرمایا کاغذ کے یہ اجزا ہمارے اسلاف کی یادگار اور بزرگوں کی میراث ہیں، ہم ان کاغذات کو دنیا کی تمام شوکت وحشمت سے زیادہ قیمتی اور وقیع ٹھہراتے ہیں۔ اس لڑکی کے ایک فرزند پیدا ہوگا، جو بڑا ہو کر اہل اللہ کی جماعت کا سربراہ قرار پائے گا اور بہت بڑا عالم دین اور مقتدر پیشوا ہوگا۔ درحقیقت وہ ہماری معنوی میراث کا صحیح حق دار ہوگا، لہٰذا یہ اوراق اس کے حوالے کر دینا۔ اس لڑکی کی شادی کے سامان اللہ خود مہیا کرے گا۔ وہ مسبب الاسباب ہے، تم اس کے متعلق کوئی فکر نہ کرو۔

اس لڑکی کی شادی شیخ وجیہ الدین سے ہوئی اور اس سے شاہ عبدالرحیم پیدا ہوئے۔ جب وہ سن رشد و شعور کو پہنچے تو یہ کاغذات ان کے حوالے کر دیے گئے۔

شاہ عبدالرحیم نے ابتدائی درسی کتابیں اپنے بھائی ابوالرضا محمد دہلوی سے اور علوم مروجہ کی انتہائی کتابیں قاضی محمد زاہد بن محمد اسلم ہروی سے پڑھیں۔ شرح عقائد کے کچھ اسباق شیخ عبداللہ بن عبدالباقی نقشبندی دہلوی سے پڑھے اور ساتھ ہی ان سے بہت سے روحانی فیوض حاصل کیے۔ ان سے بیعت ہونے کی بھی درخواست کی لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور سید عبداللہ اکبر آبادی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ وہ ان سے طریقہ نقشبندیہ کے مطابق بیعت ہوئے اور کافی عرصہ ان سے منسلک رہے۔ پھر شیخ ابوالقاسم اکبر آبادی سے وابستہ ہو گئے اور ان سے بہت استفاضہ کیا۔ مشہور بزرگ شیخ عظمت اللہ بن عبداللطیف اکبر آبادی سے خرقۂ چشتیہ حاصل کیا۔

بادشاہوں کی مجالس میں حاضری سے گریز:

شاہ عبدالرحیم کا شمار کبار مشائخ چشتیہ میں ہوتا تھا۔ قرآن وحدیث اور فقہ کے جلیل القدر علما اور عابد و زاہد اہل علم اور اصحابِ معرفت ان کے زہد وورع اور فضل وکمال پر متفق ہیں۔

شاہ عبدالرحیم گوشہ گیر عالم دین تھے۔ ملوک وامرائے مملکت کے درباروں میں جانے سے قطعی انکار کر دیتے۔ ان کے زمانے میں اورنگ زیب عالم گیر ہندوستان کا حکمران تھا جو نیک دل اور متدین بادشاہ تھا۔ اس کی خواہش کے باوجود شاہ صاحب اس کے پاس نہ جاتے۔ چنانچہ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا

Marfat.com

ہے جو حسب ذیل ہے:

شاہ عبدالرحیم کا ایک مخلص اور بے ریا معتقد بادشاہ اورنگ زیب کے سلسلۂ خدام میں داخل تھا۔ ایک دفعہ وہ عالم گیر کو پنکھا کر رہا تھا کہ دفعۃً اس پر محویت غالب ہوئی اور پنکھا ہاتھ سے چھوٹ کر اس زور سے بادشاہ پر گرا کہ وہ چونک پڑا۔ بیدار ہونے کے بعد دریافت کیا کہ یہ بے جا حرکت کرنے کی کیا وجہ ہے؟ غریب خادم نے کانپتی ہوئی زبان اور تھرتھراتی ہوئی آواز سے شاہ عبدالرحیم کا کچھ حال اور ان کی طرف اپنے انتساب کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس وقت ان کا خیال ذہن میں آ گیا تھا، جس کی وجہ سے وہ یہ بھول گیا کہ بادشاہ کو پنکھا کر رہا ہے۔ اس خیال میں کچھ اس طرح کھو گیا کہ پنکھا ہاتھ سے گر پڑا۔ عالم گیر نے یہ بات پورے غور اور توجہ سے سنی اور غائبانہ مشتاقِ ملاقات ہو کر بولا کہ شاہ صاحب کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔ خادم نے نہایت سماجت سے عرض کیا کہ بادشاہوں کی محفلوں اور امیروں کے گھروں میں جانا شاہ صاحب کا دستور نہیں۔ چونکہ عالم گیر مذہب کا سخت پابند اور اہل اللہ کا انتہائی معتقد تھا لہٰذا خادم کا یہ جرأت مندانہ جواب سن کر اس کے دل میں شاہ صاحب سے اشتیاق ملاقات کی آگ بھڑک اٹھی اور اپنے دربار کے ایک معتمد علیہ شخص کو، جو شاہ صاحب سے غایت درجہ کا اعتقاد رکھتا تھا، شاہ صاحب کی خدمت میں روانہ کیا اور اشتیاق ملاقات کے لیے جو اضطرابی کیفیت طاری تھی، بیان کی۔ اس شخص نے شاہ صاحب کو بادشاہ ہند کا پیغام پہنچایا، اور اس کے دربار میں جانے کی درخواست کی۔ مگر شاہ صاحب نے جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں بادشاہ سے ملاقات کے لیے اس کے دربار میں نہیں جا سکتا۔ عالم گیر کے فرستادہ نے مایوس ہو کر شاہ صاحب سے عرض کیا کہ آپ کاغذ پر لکھ دیجیے تاکہ میں وہ تحریر بادشاہ کو دکھا دوں اور وہ آپ کے نہ جانے کو میری تقصیر پر محمول نہ کرے۔ آپ نے ایک بوسیدہ کاغذ کا ٹکڑا زمین سے اٹھایا اور یہ عبارت لکھی:

''اہل اللہ کی جماعت کا اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ بئس الفقیر علیٰ باب الامیر اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: ﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ ❶ قرآن مجید کے ان الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر آپ کو دنیاوی اعزاز اور حشمت وشوکت حاصل ہے، وہ اس کائنات کے کل کا ایک نہایت ہی اقل القلیل جز ہے۔ اگر میں یہ تسلیم بھی کر لوں کہ آپ مجھ سے مل کر خوش ہوں گے اور اپنی دنیاوی شوکت وحشمت میں سے کچھ مجھے دیں گے تو اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں کہ ایک جزو دیں گے اور میں اس جز کے لیے اپنا نام خدا کے دفتر سے خارج نہیں کرانا چاہتا، کیونکہ بزرگان چشتیہ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ جس شخص کا نام بادشاہ کے رجسٹر میں درج ہو جاتا ہے، خدا تعالیٰ کے رجسٹر سے اس کا نام کھرچ دیا جاتا ہے۔''

یہ الفاظ لکھ کر شاہ عبدالرحیم نے عالم گیر کو بھیج دیے۔ بادشاہ نے یہ الفاظ بار بار پڑھے اور بڑے غور سے پڑھے۔ ان الفاظ سے اس کو ہر دفعہ ایک نیا لطف محسوس ہوتا۔ کاغذ کا یہ پرزہ اس کے نزدیک اس درجہ محبوب

❶ یہ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۸ کا ایک جز ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: (آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کا فائدہ کم ہے)۔

Marfat.com

تھا کہ اس نے اسے جیب میں ڈال لیا اور بصورت تعویذ اپنے پاس رکھا۔ جب وہ نیا خلعت زیب تن کرتا، اسے جیب سے نکال کر دوسری جیب میں رکھ لیتا۔ فرصت کے وقت اسے باقاعدہ پڑھتا اور زار و قطار روتا❶۔

مسائل فقہی پر تعامل:

فقہی مسائل پر تعامل کے سلسلے میں شاہ عبدالرحیم ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ اکثر مسائل میں حنفی مسائل کے مطابق عمل کرتے اور حنفی فقہ کو پیش نظر رکھتے، لیکن بعض مسائل کے بارے میں ان کی تحقیق یہ تھی کہ فقہ حنفی کے ان مسائل پر حدیث کو ترجیح حاصل ہے۔ ان مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ نماز میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے، اسی طرح نماز جنازہ میں بھی سورۂ فاتحہ ترک نہ کرتے ــــــ ایک روز شیخ عبدالاحد سرہندی (متوفی ۲۷/ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ/ ۱۳/ دسمبر ۱۷۱۵ء) نے جو شیخ محمد سعید کے بیٹے اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے پوتے تھے، اس مسئلے پر بحث چھیڑ دی اور اپنے اسلاف سے ایک متواتر نقل اس طرح پیش کی کہ نماز باجماعت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کچھ لوگ بہ صورت جماعت ایک پُرشوکت بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر عرض احوال کریں اور ظاہر ہے کہ بادشاہ کا درباری ادب اس امر کا مقتضی ہے کہ اس کے سامنے سب لوگ بہ یک وقت اپنی حاجتیں پیش نہ کریں بلکہ ایک ہی شخص سب کی نمائندگی کا فرض انجام دے۔

شاہ عبدالرحیم نے جواب میں فرمایا کہ نماز کو بادشاہ کے سامنے اس کے دربار میں معروضات پیش کرنے پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔ اللہ کے حضور خاص شکل و انداز سے دعا اور الحاح و خضوع سے مناجات کرنا اور ایک مخصوص طریقے سے نفس کو تہذیب و تزکیہ سے آراستہ کرنا نماز کہلاتا ہے۔ اللہ، سمیع ہے، اگر تمام دنیا کے لوگ ایک ہی میدان میں کھڑے ہو جائیں اور ان میں سے ہر شخص الگ زبان اور دوسرے سے مختلف الفاظ و انداز میں اللہ سے کچھ طلب کرے تو وہ علیحدہ علیحدہ ہر شخص کی سنتا ہے۔ اس کے حضور ایک کی دعا و مناجات دوسرے کی دعا و مناجات میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔

قبولیت دعا:

شاہ عبدالرحیم کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا، جن میں ایک نعمت یہ عطا فرمائی کہ وہ مستجاب الدعوات تھے۔ ان کی قبولیت دعا کے متعلق ان کے حالات میں متعدد واقعات مرقوم ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے بڑے لڑکے صلاح الدین کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہوئے اور مرض نے یہاں تک طول پکڑا کہ زندگی کی امید بالکل منقطع ہو گئی اور ظاہری اسباب دیکھ کر شاہ صاحب ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ خود شاہ صاحب یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب میں نے دیکھا کہ صلاح الدین کی رگِ

❶ حیات ولی، حاشیہ، ص ۱۹۸ تا ۲۰۰۔

Marfat.com

حیات کٹ چکی ہے تو لوگوں کو کفن خرید کر لانے اور قبر تیار کرنے کا حکم دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی فوراً میرے دل میں ایک جذبہ بیدار ہوا اور میں نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ جب میری الحاح و عاجزی بہت بڑھ گئی تو ایک فرشتہ آیا اور اس نے صلاح الدین کی حیات و صحت کی بشارت دی۔ اسی اثنا میں صلاح الدین کو چھینک آئی اور کروٹ بدل کر کھڑے ہو گئے۔

شاہ عبدالرحیم کی قبولیت دعا کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ دہلی میں بارش کا سلسلہ بند ہو گیا اور قحط سالی کے آثار پیدا ہو گئے، جس سے لوگوں میں بے چینی اور بے قراری پھیل گی۔ لوگ دعا کے لیے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کی۔ دعا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ آسمان پر ابر نمودار ہوا اور ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ شاہ صاحب نے فرمایا کثرتِ باراں ہماری کچی دیواروں کو کسی چیز سے ڈھانپ دینے پر موقوف ہے۔ غیبی تدبیر ہمارے مکان کی دیواروں کو ڈھانے اور مسمار کرنے سے احتراز کرتی ہے۔ ان کے یہ الفاظ سن کر لوگوں نے فوراً بانس اور گھاس ان کے مکان کی دیواروں پر ڈال دیا۔ بعد ازاں اتنی موسلا دھار بارش ہوئی کہ خشک چشمے اور سوکھی نہریں پانی سے ابل پڑیں اور عرصے تک بارش کی ضرورت نہ رہی۔

تبحر علمی:

شاہ عبدالرحیم علم و فضل میں بڑی فوقیت رکھتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس نیل گوں آسمان کے نیچے شیخ عبدالرحیم سے زیادہ فن حدیث کا ماہر اور عالم ان کے عہد میں کوئی نہ تھا۔ اگر میں انصاف سے اس سلسلے میں رائے ظاہر کروں تو بلا تامل اس حقیقت کا اعتراف کروں گا کہ میں نے ان جیسا ایک شخص بھی نہیں دیکھا جو تمام علوم میں عموماً اور حدیث و فقہ میں خصوصاً تبحر رکھتا ہو۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد شاہ صاحب کے پایہ کے کسی محدث و مفسر اور فقیہ کو ہندوستان کی گود میں پرورش پانا بہت کم نصیب ہوا ہوگا۔ شاہ صاحب کو صحاح کی اکثر حدیثیں از بر تھیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تمام احادیث مع اسناد کے بلا توقف بیان کرنے میں انھیں ملکہ خاص حاصل تھا۔

طالب علمی کا ایک واقعہ:

شاہ صاحب بچپن ہی سے نہایت ذہین تھے اور جودتِ فکر میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اس ضمن میں ان کا طالب علمی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے جو درج ذیل ہے:

میر محمد زاہد ہروی کے مدرسے میں ملا حامد جون پوری، شاہ صاحب کے ہم درس تھے اور دونوں شرح مواقف پڑھتے تھے، جو نہایت دقیق اور مشکل کتاب ہے۔ ملا حامد بھی بڑے طباع اور تیز ذہن تھے۔ شاہ

Marfat.com

صاحب کتاب کی عبارت پڑھتے تھے اور کہیں نہ رکتے تھے، نہ کوئی بات استاد سے پوچھتے تھے۔ ملا حامد اس پر نالاں تھے۔ وہ ہر مسئلہ استاذ سے بتفصیل سمجھنا چاہتے تھے۔ ایک روز شاہ صاحب کتاب کا ایک مشکل مقام پڑھ رہے تھے۔ ملا حامد کو یقین تھا کہ شاہ صاحب یہاں ضرور رکیں گے اور استاذ سے پوچھیں گے، مگر وہ مسلسل پڑھتے چلے گئے۔ اس سے ملا حامد کو سخت غصہ آیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: آپ کچھ سمجھتے بھی ہیں یا یوں ہی آگے کو بھاگے جا رہے ہیں؟ شاہ صاحب نے نرمی سے جواب دیا، میرا خیال تھا آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی، تو فرمایئے، میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔ ملا حامد نے کتاب کے اس دقیق اور مشکل مقام پر انگلی رکھ کر کہا، بتایئے اس کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے تفصیل و وضاحت سے اور آسان الفاظ میں بات سمجھا دی۔ اس وقت ان کے استاذ میر محمد زاہد ہروی بھی تشریف فرما تھے اور ہم درس طلبا بھی موجود تھے۔ وہ ان کی حدتِ فہم سے متعجب بھی ہوئے اور خوشی کا اظہار بھی کیا۔

شوق شعری:

علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت تامہ کے ساتھ ساتھ، شاہ عبدالرحیم شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے اور ان کی شاعری میں پند و نصائح کا رنگ غالب تھا۔ مثلاً یہ رباعی انہی کی ہے:

اے کہ نعمت ہائے تو از حد افزوں   شکرِ نعمت ہائے تو از حد بروں
عجز از شکرِ تو باشد شکرِ ما   گر بود فضلِ تو مارا رہنموں

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے والد نماز ظہر کے بعد اچانک میری طرف متوجہ ہوئے اور برجستہ یہ دو شعر ارشاد فرمائے:

اگر تو راہِ حق بخواہی اے پسر   خاطرِ کس را مرنجاں الحذر
در طریقت رکن اعظم رحمت است   ایں چنیں فرمود آن خیر البشر

یہ رباعی پڑھ کر فرمایا: ''ولی اللہ! قلم دوات پکڑو اور یہ رباعی لکھ لو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے دفعتاً میرے دل میں اس مضمون کو اسی غرض سے القا فرمایا ہے کہ تمھیں وصیت کروں۔

اہل اللہ اور مجاذیب سے ملاقات:

حضرت شاہ عبدالرحیم چونکہ خود بھی اہل اللہ اور صاحب تقویٰ تھے، اس لیے وہ اس قسم کے حضرات سے بہت تعلق رکھتے تھے۔ مجذوبوں سے بھی ان کو انس تھا اور متعدد مجذوبوں سے انھوں نے ملاقات بھی کی۔ اس نوع کے بہت سے واقعات خود شاہ صاحب نے بیان کیے ہیں۔ ان میں ایک واقعہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ کسی تقریب سے سونی پت گیا۔ اتفاقاً دل میں خیال آیا کہ یہاں منور مجذوب کو دیکھنا چاہیے۔

Marfat.com

چنانچہ میں وہاں پہنچا جہاں وہ قیام پذیر تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ مگر جوں ہی اس نے میری آہٹ محسوس کی، چاروں طرف سے اپنی گڈری سمیٹ کر اس میں لپٹ گیا اور ہوش و حواس بحال کر کے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں تھوڑی دیر بیٹھا اور جب دیکھا کہ وہ کوئی بات نہیں کرتا تو خود میں نے گفتگو شروع کی اور کہا، مجھے آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے، اگر عقل و ہوش سے جواب دیں تو عرض کروں۔ اس نے کہا، آپ بات کیجیے، میں حتی الامکان احتیاط سے جواب دوں گا۔ میں نے کہا، صرف اتنی بات بتائیں کہ آپ کو ایسی کون سی چیز حاصل ہے، جس نے آپ کی ساری عقل و تمیز ختم کر کے رکھ دی ہے اور ہوش و حواس سلب کر لیے ہیں۔ مجذوب نے میری بات سن کر پہلے تو سکوت اختیار کیا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہو۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔ عزیز من! یہ ایسا نازک اور باریک سوال ہے، جس کا جواب عبارت کے قالب میں ڈھالنا اور الفاظ کے پیرایہ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ البتہ ایک مثال کے اسلوب میں تم پر اس کی کیفیت ظاہر کرتا ہوں۔ سنو! جس چیز نے ہماری عقل و تمیز سلب کر کے ہمیں مجنونوں اور دیوانوں کے زمرے میں داخل کیا ہے، اسے ایک ایسی کیفیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص نے مقدار سے زیادہ گرمی محسوس کی اور پسینے میں غرق ہو گیا۔ ناگہاں نہایت سرد اور خوش آئند ہوا کے جھونکے شروع ہو گئے، جن سے اس کو راحت کلی حاصل ہوئی۔ بس یہی کیفیت ہم لوگوں پر طاری ہو کر ہمیں اس درجے کو پہنچا دیتی ہے۔ میں نے کہا، اس سے بہتر کیفیت تو سالکوں کو حاصل ہوتی ہے، مگر پھر بھی ان کی عقل بحال اور حواس قائم رہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ عزیز من! یہ مشیت الٰہی ہے، جس شخص کو جیسا چاہتا ہے رکھتا ہے۔

صوفیا کا لباس:

شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں، ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ صوفیا کے لباس میں مقید رہنا بہر کیف تکلف سے خالی نہیں۔ اس خیال نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ میں نے اسی آن وہ لباس اتار پھینکا اور سپاہیانہ لباس پہن لیا۔ یعنی عمامہ باندھا، کمر میں تلوار لگائی اور گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل پڑا۔ ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ ایک مجذوب سامنے سے آ کر کہنے لگا، کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص چاند کو پیالے سے چھپا لے؟ ہرگز نہیں۔ عزیز من! تیرے معبود کی قسم۔ یہ لباس تیری شان کے سزاوار نہیں۔ اسے اتار ڈال اور لباس صوفیا زیب تن کر۔ چنانچہ اسی وقت میں نے بالالتزام صوفیا کا سا لباس اختیار کر لیا۔ اس کے علاوہ کسی قسم کا لباس پہننا پسند نہیں کیا۔

مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد:

ہندوستان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خدمت علم حدیث کی بنیاد ڈالی، مگر اس زمانے میں چونکہ چاروں طرف جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، لہٰذا حضرت شیخ کی تمام تر مساعی کے باوجود اس کی پوری

Marfat.com

طرح اشاعت و ترویج نہ ہو سکی۔ ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے شاہ عبدالرحیم کو پیدا کیا اور انھوں نے دہلی میں مدرسہ قائم کیا، جس نے مدرسہ رحیمیہ کے نام سے شہرت پائی۔ اس مدرسے میں انھوں نے لوگوں کو علم حدیث کی تعلیم دینا شروع کی۔ اس میں دور دراز مقامات سے کثیر تعداد میں علما و طلبا علم حدیث پڑھنے کے لیے آنے لگے اور لوگوں میں اس کے حصول کے لیے ایک تحریک پیدا ہو گئی اور پھر آہستہ آہستہ بے شمار شائقین علوم دینی اس چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔

علمی مباحث:

شاہ عبدالرحیم دہلوی کی خدمت میں مختلف مقامات سے علمائے دین تشریف لاتے اور ان سے بعض دلچسپ علمی بحثیں ہوتیں۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ شاہ ولی اللہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن میرے والد (شاہ عبدالرحیم) نے مجھ سے بیان کیا کہ سید علیم اللہ نے، جو شیخ آدم قدس سرہ کے اکابر اصحاب میں سے ایک نہایت مقتدر اور جلیل القدر شخص ہیں اور جن کے فضل و کمال اور علمی کارناموں کی بڑی شہرت ہے، حرمت تمباکو کے موضوع پر ایک پُر زور رسالہ لکھا اور دو افغانیوں کی معرفت علمائے دہلی کے پاس بھیجا۔ سب سے پہلے وہ رسالہ مجھے دکھایا گیا۔ اس رسالے میں قرآن کی آیت: ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾ [1]۔ اور اسی نوع کے چند اور دلائل سے حرمت تمباکو میں استدلال کیا گیا تھا۔ میں نے رسالہ پڑھا تو اُن افغانی حضرات سے صاف الفاظ میں کہا کہ حرمت تمباکو سے متعلق یہ تمام استدلال بالکل کم زور ہیں۔ ان سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے بعد میں نے اس میں درج شدہ روایات کی تفصیل سے تردید کی اور مذکورہ بالا آیت کی صحیح تفسیر بیان کی۔ اس ضمن میں وہ اقوال پیش کیے جو معتبر و مستند مفسرین سے منقول ہیں۔ اگرچہ میری تقریر مدلل اور معلومات سے پُر تھی، تاہم وہ افغانی نہ تو اس سے متاثر ہوئے اور نہ انھوں نے اس میں کوئی دلچسپی لی، بلکہ ناراض اور ناخوش ہو کر مجلس سے اٹھے اور ملا یعقوب کے مدرسے میں پہنچ گئے۔ ملا یعقوب دہلی کے مشہور عالم اور فاضل شخص تھے، مگر تمباکو نوشی کے سخت عادی تھے اور اسے قطعی مباح سمجھتے تھے۔ یہ لوگ ان کے مدرسے میں گئے تو وہ برسر مجلس اور دورانِ درس حقہ پی رہے تھے۔ افغانی طلبا نے اس پر اعتراض کیا تو ملا یعقوب نے کہا، میں برسر مجلس اس لیے حقہ پیتا ہوں کہ لوگوں کو اس کی اباحت معلوم ہو جائے اور اگر کسی کو اس کے مباح ہونے میں شبہ ہو تو دلیل پیش کرے، میں اس کا جواب دوں گا۔

سید علیم اللہ کے فرستادوں یعنی افغانی طلبا نے جرأت مندانہ انداز میں کہا، چونکہ اس مسئلے کا ماخذ موجود ہے، اس لیے اس کا فیصلہ بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس رسالے میں سے چند فقہی دلائل پیش کیے۔ ملا یعقوب نے فوراً ان کی تردید کر دی، اور وہ لوگ زورِ دلائل میں ان کا مقابلہ نہ کر پائے۔ اب وہ

[1] یہ سورۂ دخان کی آیت ۱۰ ہے۔ ترجمہ یہ ہے: (اس دن کا انتظار کرو کہ آسمان سے واضح طور پر دھواں نکلے گا۔)

Marfat.com

دوبارہ شاہ عبدالرحیم کی خدمت میں آئے اور ملا یعقوب سے مباحثہ و مناظرہ کی کیفیت بیان کی۔ شاہ عبدالرحیم نے فرمایا، حرمت تمباکو سے متعلق تمھارا استدلال غلط ہے، اس لیے تمھارے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہیے تھا۔

شاہ صاحب نے ان سے کہا، مغموم ہونے کی ضرورت نہیں، اب میں تمھیں ایک دلیل بتاتا ہوں۔ تم ملا یعقوب کے پاس جاؤ اور اسی طرح بات کرو جس طرح میں تم سے کہتا ہوں۔

تم ان سے قرآن کی آیت ﴿يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ ❶۔ کی شانِ نزول دریافت کرو۔ وہ اس کا جواب یہ دیں گے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زوجۂ مطہرہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے گھر شہد تناول فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تمام ازواج مطہرات نے حضرت زینب پر رشک کرتے ہوئے آپس میں مشورہ کیا کہ آج آنحضرت ﷺ جس بیوی کے پاس تشریف لائیں، وہ آپ سے افسوس ناک لہجے میں عرض کرے کہ حضور کے مبارک منہ سے گندنے (مغافیر) کی بو آ رہی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، میں نے گندنا (مغافیر) تو نہیں کھایا، البتہ شہد کھایا ہے۔ اس پر ایک زوجہ مطہرہ نے عرض کیا، معلوم ہوتا ہے شہد کی مکھی گندنے کے درخت پر بیٹھی ہے اور اس کی بو شہد میں سرایت کر گئی ہے۔ یہ بات سن کر آنحضرت ﷺ نے اپنے آپ پر شہد کو حرام ٹھہرا لیا اور نتیجتاً یہ آیت نازل ہوئی۔

شاہ صاحب نے مزید فرمایا کہ جب ملا یعقوب اس آیت کی شان نزول کے بارے میں تقریر کر چکیں تو آپ ان سے سوال کریں کہ آخر آنحضرت ﷺ کے نزدیک شہد کی علت کراہت کیا تھی؟ ملا یعقوب بجز اس کے کچھ نہ کہہ سکیں گے کہ علت کراہت بدبو تھی۔ اس پر آپ ان سے پوچھیں کہ حدیث شریف میں جو یہ الفاظ وارد ہیں کہ من اکل ھاتین الشجر تین فلا یقربن مسجدنا ❷۔ تو اس میں علت نہی کیا ہے؟ ملا یعقوب جواب دیں گے ''بوئے بد''، اس کے بعد آپ بے دھڑک ہو کر پوچھیں کہ حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ خوشبو سے رغبت اور بدبو سے نفرت کرتے تھے تو یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو ہم آپ سے سوال کرتے ہیں کہ تمباکو میں بدبو ہے یا نہیں؟ اگر اس سوال کے جواب میں ملا یعقوب یہ کہیں کہ تمباکو میں بدبو نہیں ہے، تو آپ ان سے پوچھیں کہ جن لوگوں نے کبھی تمباکو نہیں پیا ہے، ان سے دریافت کرنا چاہیے کہ اس کی بو دماغ کو اچھی معلوم ہوتی ہے یا بری۔؟ اور جب اس میں ازراہِ تجربہ و مشاہدہ بوئے بد کا پایا جانا ثابت ہوتا ہے تو اصحابِ علم اور اہل ورع و تقویٰ کے نزدیک مناسب یہی ہے کہ تمباکو نوشی ترک کر دیں۔

---

❶ یہ سورۂ تحریم کی آیت نمبر ا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: (اے پیغمبر! جو چیز اللہ نے آپ کے لیے حلال قرار دی ہے، آپ اسے اپنے لیے حرام کیوں ٹھہراتے ہیں۔)

❷ یہ حدیث الفاظ کے تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ مختلف کتب احادیث میں موجود ہے۔ سنن ابی داؤد کے کتاب الاطعمہ میں بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ان دو پودوں (یعنی لہسن اور پیاز) کھانے کے بعد (اس وقت تک) مسجد میں نہ جائے (جب تک اس کی بو باقی رہے)

Marfat.com

چنانچہ وہ دونوں افغانی طلبا دوبارہ ملا یعقوب کے پاس گئے اور اسی طرح سلسلہ گفتگو شروع کیا جس طرح شاہ عبدالرحیم نے فرمایا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملا یعقوب نے ان باتوں کا اعتراف کیا اور اسی وقت چلم اور نے کو توڑ ڈالا اور تمباکو نوشی ہمیشہ کے لیے ترک کر دی۔

شاہ صاحب سے ملا عبداللہ چلپی کی بیعت:

ایک مرتبہ ایک مجلس میں شاہ عبدالرحیم صاحب کی ملاقات ملا عبداللہ چلپی سے ہوئی، جنھوں نے بعد میں فتاویٰ عالم گیری کا فارسی میں ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس ملاقات کے نتیجے میں وہ شاہ عبدالرحیم سے بیعت بھی ہوئے۔ اس ملاقات کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے، جو حضرت شاہ ولی اللہ اپنے والد محترم حضرت شاہ عبدالرحیم کی زبانی بیان فرماتے ہیں۔ ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

عبداللہ چلپی ایک داعی تھا، جو روم (ترکستان) سے ایران اور ایران سے ہندوستان آیا۔ اس کے بارے میں عجیب وغریب باتیں لوگوں میں مشہور تھیں۔ ان میں ایک بات یہ تھی کہ وہ چالیس روز بے آب و دانہ حجرے میں معتکف رہتا ہے۔ باہر سے حجرے کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اور وہ چالیس دن بعد صحیح اور تندرست حالت میں باہر نکل آتا ہے۔ یہ بھی سنا جاتا تھا کہ اندھیرے میں بیٹھ کر قرآن مجید لکھتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زمین میں گھس جاتا ہے اور جہاں سے چاہتا ہے، نکل آتا ہے۔ ان باتوں کی جہ سے اس کا شمار اولیاء اللہ اور اصحاب کرامات بزرگوں میں کیا جانے لگا۔ شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں، عبداللہ چلپی کے اس قسم کے کمالات و فضائل سن کر میرے دل میں اس سے اشتیاق ملاقات کا جذبہ ابھرا اور میں اس سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ ان دنوں وہ بادشاہ سے چھپ کر ایرانیوں کے مکان میں قیام پذیر تھا۔ وہ شیعہ تھے، میں وہاں پہنچا۔ مذہبی معاملے میں ان سے بحث کا سلسلہ جاری رہا اور انھوں نے بلا تکلف بتایا کہ وہ میری باتوں سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

غرض میں نے عبداللہ چلپی سے ملاقات کی۔ یقین جانیے، میں جس بے تابی اور جذبۂ شوق سے اس سے ملنے گیا تھا، اس کی شکل دیکھ کر اس کے لیے میرے دل میں اس سے کہیں زیادہ نفرت اور کراہت پیدا ہوئی۔ میں نے نظر اول ہی سے معلوم کر لیا کہ یہ شخص اولیاء اللہ کے آداب و اسالیب سے بالکل نا آشنا ہے۔ اسی بنا پر میں نے اس کی تعظیم سے گریز کیا۔ میں نہایت مکدر ہو کر واپس آنے لگا تھا کہ میرے چہرے کا یہ فوری تغیر ایک ایرانی نے بھانپ لیا اور بولا ''کیا وجہ ہے کہ جس شوق سے آپ عبداللہ کی ملاقات کو تشریف لائے تھے، اس سے کہیں زیادہ اسے دیکھ کر اعراض اور پہلو تہی کی''؟ میں نے صاف الفاظ میں جواب دیا کہ ''میں عبداللہ کو اللہ کا ولی سمجھتا تھا، لیکن دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ولی نہیں ہے بلکہ صاحب دعوت ہے۔'' عبداللہ نے میری یہ بات سنی تو کہا ''شیخ سچ کہتے ہیں۔''

اس کے بعد عبداللہ نے دعائے سیفی پڑھنا شروع کی اور پڑھتے پڑھتے ایسے مقام پر پہنچا، جہاں

Marfat.com

اگر چہ قواعد نحوی کے لحاظ سے اعراب میں دونوں طرح کا احتمال تھا تاہم وجدان کے اعتبار سے صرف ایک ہی وجہ متعین تھی اور عبداللہ نے دوسری وجہ اختیار کی تھی۔ اس پر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں بول اٹھا۔ ''عبداللہ! تم نے غلط پڑھا ہے۔'' اس کے جواب میں اس نے پورے زور سے کہا: ''نہیں۔ میں نے غلط نہیں پڑھا۔ میں نے صحیح پڑھا ہے۔ آپ مجھے غلط بتا رہے ہیں۔'' اس پر بحث شروع ہوگئی اور دعائے سیفی کے وہ نسخے فراہم کیے گئے جو اساتذہ سے پہنچے تھے۔ مختلف اساتذہ کے بارہ نسخے دیکھے گئے اور اتفاق کی بات یہ کہ ان میں اعراب وہی درج تھا جو عبداللہ نے پڑھا تھا۔ اب تیرھواں نسخہ دیکھا گیا۔ یہ نسخہ شیخ احمد جام کے تبرکات میں سے تھا اور سب نسخوں سے زیادہ معتبر اور مستند مانا جاتا تھا۔ یہ نسخہ بہت مشکل سے کسی اہل علم امیر حکومت کے کتب خانے سے منگوایا گیا تھا۔ اس میں وہ اعراب لکھا تھا، جو میں کہتا تھا۔ اس پر عبداللہ نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور میری تحسین کی۔

اس کے بعد اس نے ایرانیوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''تم جانتے ہو، میں نے اس سلسلے میں اتنی تحقیق اور چھان بین کیوں کی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں دعائے سیفی پڑھتے پڑھتے اس مقام پر پہنچتا تھا جس کے نحوی اعراب کے بارے میں شیخ نے مجھ سے اختلاف کیا، تو میں اپنے سامنے ایک ظلمت اور تاریکی پاتا تھا۔''

بالآخر عبداللہ چلپی نے نہ صرف شاہ عبدالرحیم کی بات تسلیم کر لی بلکہ ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا اور ان سے بیعت ہو کر طریقہ قادریہ میں شامل ہوا۔

فتاویٰ عالم گیری میں حصہ:

شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فقہ اور اس کے مختلف گوشوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فتاویٰ عالم گیری کے سلسلے میں بھی انھوں نے خدمات انجام دیں۔ وہ فتاویٰ عالم گیری کے باقاعدہ مرتبین کی جماعت میں تو شامل نہ تھے، البتہ اس کی ترتیب و تدوین کے بعد اس پر نظر ثانی میں ان کا حصہ ہے۔ فتاویٰ کی ترتیب کے بعد اس پر نظر ثانی کا مرحلہ پیش آیا تو اس کا اہتمام شیخ حامد جون پوری کے سپرد کیا گیا تھا۔ شیخ حامد جون پوری اپنے وقت کے جید عالم وفقیہ تھے اور علامہ محمد زاہد ہروی کے مدرسے میں شاہ عبدالرحیم دہلوی کے ہم سبق رہ چکے تھے، اس بنا پر شاہ صاحب کی فقہی عظمت اور علمی قابلیت سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ایک دن وہ شاہ صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ اگر آپ فتاویٰ کی دوبارہ تدوین اور نظر ثانی میں مجھ سے تعاون کریں تو اس کے صلے میں ایک معقول رقم روزانہ آپ کی خدمت میں پیش ہوتی رہے گی۔ لیکن شاہ صاحب مستغنی المزاج اور بے نیاز قسم کے عالم تھے، انھوں نے شیخ حامد کی اس پیش کش کو کوئی اہمیت نہ دی اور بے توجہی سے ان کو ٹال دیا۔ اتفاق سے شاہ صاحب کی والدہ ماجدہ نے یہ بات سن لی تھی، انھوں نے بیٹے کی بے پروائی پر خفگی کا اظہار کیا اور گھر کی مالی کمزوریوں کی وجہ سے اصرار کیا کہ وہ یہ خدمت بہرحال قبول کر لیں۔ چنانچہ شاہ صاحب نے والدہ کے حکم سے مجبور ہو کر شیخ حامد کی بات مان لی اور فتاویٰ پر نظر ثانی کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔

Marfat.com

ایک دن شاہ عبدالرحیم فتاویٰ کے ایک مقام کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ایسی عبارت پر نظر پڑی، جس میں بہت الجھاؤ اور اختلال تھا اور اس اختلال کی وجہ سے مسئلہ زیر بحث کی اصل صورت بالکل بدل گئی تھی۔ شاہ صاحب نے شیخ حامد کو فتاویٰ عالم گیری کے اس حصے کے مؤلف کی اس لغزش سے متنبہ کیا اور فرمایا کہ میرے نزدیک یہ عبارت مختل اور الجھی ہوئی ہے اور اصل مسئلہ یوں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شیخ حامد جون پوری نے شاہ صاحب کی بات پر توجہ نہ کی اور مؤلف کی وسعت نظر پر اعتماد کر کے آگے بڑھنے کو ترجیح دی۔

شاہ صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید اور وضاحت کے لیے جب مسئلہ زیر بحث کا ماخذ تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ دو کتابوں میں مختلف عبارتوں میں لکھا گیا ہے۔ مگر یہاں صورت حال یہ تھی کہ فتاویٰ عالم گیری کے مؤلف نے دونوں عبارتوں کو بلا کسی فرق اور امتیاز کے ایک ہی جگہ درج کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اختلال پیدا ہو گیا تھا، لہٰذا شاہ صاحب نے فتاویٰ کے حاشیے پر یہ عبارت لکھ دی:

من لم یتفقه فی الدین قد خلط فیه، هذا غلط، وصوابه کذا۔

کہ جو دین کی سمجھ سے بہرہ مند نہیں، اس نے اصل بات کو خلط ملط کر دیا ہے، یہ غلط ہے۔ اصل مسئلہ یوں ہے۔

جس زمانے میں فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین اور نظر ثانی کا مرحلہ درپیش تھا، اس زمانے میں خود اورنگ زیب اس میں انتہائی دلچسپی لیتا تھا۔ اس میں اس کی محنت اور اہتمام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شیخ نظام برہان پوری اس کام کے نگران تھے۔ ان کا فقہی مرتبہ بہت بلند تھا۔ وہ نظر ثانی شدہ مواد کے روزانہ ایک یا دو صفحے بادشاہ کے سامنے پڑھا کرتے اور بادشاہ کامل توجہ اور انہماک سے ایک ایک مسئلے کو دیکھتا اور پورے غور سے سنتا تھا۔ وہ کاتبوں کی غلطیاں بھی خود درست کرتا تھا۔ جب شیخ نظام برہان پوری معمول کے مطابق بادشاہ کے سامنے کتاب پڑھنے لگے اور اس مقام پر پہنچے، جسے شاہ صاحب نے مختل اور الجھا ہوا قرار دیا تھا، تو شاہ صاحب کے حاشیے کی عبارت کو متن کے ساتھ ملا کر پڑھ دیا۔ بادشاہ نے یہ عبارت سنی تو بڑا حیران ہوا۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ شیخ برابر پڑھتے ہی جا رہے ہیں، رکتے نہیں ہیں تو کہا:

ایں عبارت چیست؟

(یہ کیا عبارت ہے؟)

ذرا پھر پڑھیے۔ شیخ نظام دوسری مرتبہ بھی حاشیہ اور متن کا فرق سمجھے بغیر اسی طرح پڑھ گئے۔ اب عالم گیر نے شیخ سے اس مقام کی وضاحت چاہی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے، اور کہا:

ایں مقام را مطالعہ نہ کردہ ام فردا بہ تفصیل عرض خواہم کرد۔

(میں نے اس مقام کا مطالعہ نہیں کیا، کل تفصیل سے بتاؤں گا۔)

شیخ بڑے حیران اور پریشان ہوئے۔ عالم گیر سے فارغ ہوئے تو فوراً شیخ حامد جون پوری کے پاس

Marfat.com

پہنچے اور خفگی کا اظہار کیا۔ فرمایا، میں نے یہ مسودہ آپ کے اعتماد پر چھوڑ دیا، مگر آپ نے اس پر غور نہیں کیا اور مجھے بادشاہ کے سامنے نادم ہونا پڑا۔

شیخ حامد نے یہ بات سنی تو شاہ عبدالرحیم کے پاس آئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ شاہ صاحب نے وہ دونوں کتابیں جو مسئلہ زیر بحث کا اصل ماخذ تھیں، شیخ حامد کے سامنے رکھ دیں اور عبارت کی بے ربطی اور اختلال واضح کیا❶۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبدالرحیم کے والد گرامی وفات پا چکے تھے اور آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔ والدہ کے مجبور کرنے پر فتاویٰ عالم گیری کی تدوین اور نظر ثانی کے شعبے میں ملازمت کرنا پڑی۔ ادھر ان کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کو پتا چلا تو وہ خفا ہوئے اور ترکِ ملازمت کے لیے کہا۔ شاہ صاحب نے ان سے والدہ کے اصرار اور مالی ضرورت کی بات کی اور ساتھ ہی فرمایا کہ دعا کیجیے، ملازمت خود بخود چھوٹ جائے۔ بادشاہ کے پاس مدونین فتاویٰ کے ناموں کی فہرست وقتاً فوقتاً پیش ہوتی رہتی تھی۔ اب یہ فہرست پیش ہوئی تو اس نے شاہ عبدالرحیم کا نام اس سے خارج کر دیا اور کہا۔

اگر خواستہ باشد ایں قدر زمین بدہیدہ۔

(یعنی اگر وہ چاہیں تو جتنی ان کو تنخواہ دی جاتی ہے، اس قدر زمین دے دی جائے۔)

لیکن شاہ صاحب فرماتے ہیں:

قبول نہ کردم وشکرانہ بجا آوردم وحمد خدا تعالیٰ گفتم❷۔

(یعنی میں نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا، بادشاہ کے اس اقدام پر اس کا شکریہ ادا کیا اور ترکِ ملازمت پر الحمدللہ کے الفاظ کہے۔)

انتقال:

انتقال سے کچھ عرصہ پہلے شاہ عبدالرحیم جسمانی طور پر خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ اسی کمزوری اور نقاہت کی حالت میں رمضان المبارک کے روزے رکھے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ میں ان دنوں زیادہ تر انہی کے پاس رہتا تھا۔ ان کی زبان پر استغر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم۔ کے الفاظ جاری رہتے۔ ماہ صفر میں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی، لیکن اس حالت میں بھی نماز کا بہت خیال رکھتے اور روقت پر نماز ادا کرتے۔ ۱۲ر صفر ۱۱۳۱ھ/۲۴ر دسمبر ۱۷۱۸ء کو صبح پو پھٹنے سے پہلے ان پر موت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کرب کے علائم میں بھی دل میں نماز کا خیال تھا۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے بار بار پوچھتے کہ فجر کی نماز کا

❶ انفاس العارفین، ص ۲۴۔

❷ انفاس العارفین، ص ۲۴۔

Marfat.com

وقت ہو گیا ہے؟ لوگوں نے کہا نماز کا وقت ابھی نہیں ہوا۔ اس پر قدرے خفگی سے فرمایا۔ اگر تمھاری نماز کا وقت نہیں ہوا تو نہ سہی، ہماری نماز کا وقت تو ہو چکا ہے۔ فرمایا، مجھے قبلہ رخ کر دو۔ چنانچہ قبلہ رخ کر دیے گئے۔ نماز کے وقت میں اگرچہ کچھ دیر تھی، مگر آپ نے اشاروں سے نماز فجر ادا کی۔ اس کے بعد اسم ذات کے ذکر میں مشغول ہو گئے اور اسی حالت میں انتقال کر گئے۔

شاہ عبدالرحیم نے چہار شنبہ کے روز ۱۲/صفر ۱۱۳۱ھ/۲۴/دسمبر ۱۷۱۸ء کو ستتر (۷۷) سال کی عمر پا کر فرخ سیر کے عہد میں بمقام دہلی، داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات کے پچاس روز بعد مغل بادشاہ فرخ سیر گرفتار ہوا، اور دہلی میں بڑے سخت واقعات رونما ہوئے، جن کی وجہ سے ایک عام بے چینی اور اضطراب کی فضا پیدا ہو گئی❶۔

۹۹۔ شیخ عبدالرحیم حسینی بیجاپوری

شیخ عبدالرحیم حسینی بیجاپوری، شیخ و فاضل اور فقہ، اصول فقہ اور مروجہ علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ شہر بیجاپور میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور بچپن ہی سے حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ مختصرات اپنے شہر کے اساتذہ سے پڑھیں۔ پھر جب قاضی ابوالبرکات نے سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی رکاب میں بیجاپور کا سفر کیا تو ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور بے شمار لوگوں کو اپنے علم و فضل سے مستفید فرمایا۔

شیخ عبدالرحیم بیجاپوری نے چہار شنبہ کے روز ۱۹/جمادی الاخریٰ ۱۱۶۸ھ/۲/اپریل ۱۷۵۵ء کو وفات پائی❷۔

۱۰۰۔ قاضی عبدالرسول سہالوی

شیخ عبدالرسول بن یوسف بن سلیمان بن سعد اللہ انصاری سہالوی کا مولد و منشا نواح لکھنؤ کا ایک قریہ سہالی ہے۔ انھوں نے دہلی کے اساتذہ سے علم حاصل کیا، اور اپنے دور کے کبار فقہائے حنفیہ میں گردانے گئے۔ بعد ازاں علاقہ اودھ میں تشریف لے گئے اور سید عبدالرزاق حسنی قادری بانسوی سے اخذ طریقت کیا۔ طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے۔ پھر اعمالِ ڈھاکہ میں ایک مقام ''کونہیٹہ'' کے منصب قضا پر مامور ہوئے۔ سرزمین بنگال میں اس عالم و فقیہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا❸۔

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے، انفاس العارفین اور حیات ولی وغیرہ کتابوں کے وہ حصے جن میں شاہ عبدالرحیم کے حالات مرقوم ہیں

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۴۵۔ محبوب ذی المنن حصہ اول، ص ۵۰۶، ۵۰۷۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۴۸، بحوالہ اغصان الانساب۔

Marfat.com

۱۰۱۔ شیخ عبدالصمد چریا کوٹی

قاضی عبدالصمد بن قاضی ابوالحسین بن ملا محمد ماہ بن قاضی منصور عباسی، عالی طبع اور روشن ذہن عالم تھے۔ جلیل القدر فقہا میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے والد گرامی قاضی ابوالحسن چریا کوٹی سے تحصیل کی۔ پھر سند قضا حاصل کرنے کے لیے، جو ان کا موروثی منصب تھا، والد کے حکم سے دہلی گئے۔ وہاں تمام علما میں صاحب فضل و کمال قرار پائے، یہاں تک کہ ارکانِ شاہی نے ان کو فقہ واصول اور دیگر علوم منقول ومعقول میں یگانہ تسلیم کیا۔ بادشاہ دہلی محمد شاہ کے فرمان سے انھیں پرگنہ چریا کوٹ اور دیگر مقامات کا منصب قضا عطا ہوا۔ مگر انھوں نے فقط پرگنہ چریا کوٹ کے منصب قضا کو ترجیح دی، دیگر مقامات کا عہدۂ قضا ان کے قدیم مستحقین کے سپرد کر دیا۔ دہلی سے چریا کوٹ آئے تو قضا کی نازک ذمہ داریوں میں مصروف ہو گئے اور فصل خصومات کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اپنے مفوضہ فرائض کامل دیانت داری سے انجام دیتے، جس کی وجہ سے بڑی شہرت پائی۔ یگانۂ آفاق حافظ محمد اسحاق ان کے شاگرد تھے۔

قاضی عبدالصمد چریا کوٹی نے ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۸ء کو وفات پائی۔ ”قاضی منصف“ مادہ تاریخ وفات ہے [1]۔

۱۰۲۔ قاضی عبدالصمد عثمانی جون پوری

قاضی عبدالصمد جون پوری، ایک فاضل شخص تھے اور فقہ واصول کے چوٹی کے علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ سرزمین ہند کے جلیل القدر عالم وفقیہ شیخ محمد رشید بن مصطفیٰ عثمانی جون پوری (مصنف رشیدیہ۔ متوفی ۱۹ر رمضان ۱۰۸۳ھ) کے بھتیجے اور شاگرد تھے۔ عرصے تک ان سے وابستہ رہے، یہاں تک کہ تمام متداول علوم و فنون میں سب سے فوقیت لے گئے۔ پھر دہلی گئے اور علمائے کرام کی اس جماعت میں شامل ہوئے جو فتاویٰ عالم گیری کی تصنیف پر مامور تھے۔ بعد ازاں دکن کے ایک شہر میں عہدۂ قضا پر متعین کیے گئے اور خاصی مدت اس منصب پر فائز رہے۔ پھر لکھنؤ منتقل ہو گئے، وہاں آٹھ سال اقامت گزین رہے۔ بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر ان کی انتہائی تکریم کرتا تھا۔ اس نے انھیں کئی گاؤں بطور جاگیر عنایت کیے۔ ۲۷ر رجب کو (سن وفات کا ذکر نہیں ملا) علاقہ دکن میں وفات پائی اور میت کو ایک گاؤں میں جو ”سوکلائی“ کے نام سے موسوم تھا، لایا گیا اور وہیں قاضی باغ (حدیقۃ القاضی) میں مدفون ہوئے [2]۔

---

1. تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۲۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵۲۔
2. نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵۲، بحوالہ باغ بہار۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۰۳۔

Marfat.com

۱۰۳۔ مولانا عبدالصمد دیوی

شیخ عبدالصمد اعظمی دیوی، مفتی عبدالسلام اعظمی کی اولاد سے تھے۔ قصبہ دیوہ (یوپی) میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما کی منزلیں طے کیں۔ اپنے عصر کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں مہارت پیدا کی۔ تفسیر قرآن مجید میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور بہترین تفسیری نکات بیان فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی تالیف کیا۔ احمد شاہ کے عہد میں دارالسلطنت دہلی میں امراو ملوک کی سلکِ ملازمت میں منسلک ہو گئے تھے۔ کافی عرصہ یہ خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر فرخ آباد چلے گئے۔ وہاں نواب غالب جنگ نے اپنے بیٹے مظفر جنگ کا اتالیق مقرر کر دیا تھا۔ وفات تک اس منصب پر مامور رہے[1]۔

۱۰۴۔ مولانا عبدالفتاح صمدانی

مولانا ابوالفرح عبدالفتاح بن ہاشم حسینی صمدانی کا شمار بارھویں صدی ہجری کے مشاہیر فقہائے ہند میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مرکزِ علم جون پور میں سید محمد جون پوری سے اخذ علم کیا۔ پھر دہلی تشریف لے گئے، وہاں سید محمد زاہد ہروی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شریک ہو گئے اور سید ممدوح کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ علم و تحقیق اور فضل و کمال میں یہاں تک ترقی کی کہ فقہائے عظام اور علمائے کرام کی اس جماعت میں شامل کیے گئے، جنھوں نے فتاویٰ عالم گیری مرتب کرنے کی فقہی خدمت انجام دی۔ یعنی مولانا عبدالصمد حسینی صمدانی بارھویں صدی ہجری میں عہد اورنگ زیب عالم گیر کے وہ فقیہ نامور تھے، جو فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین میں باقاعدہ شامل تھے اور جنھوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بے حد کوشش کی تھی[2]۔

۱۰۵۔ مولانا عبدالقادر گجراتی

مولانا عبدالقادر بن عبدالغفور گجراتی کا لقب نواب محی الدولہ قادر یار خاں بہادر تھا۔ فقہ اور اصول فقہ کے جید عالم تھے۔ سورت سے اورنگ آباد منتقل ہو گئے تھے، وہاں ایک مدت تک تکیہ شیخ محمود مسافر اورنگ آبادی میں مقیم رہے۔ پھر حیدر آباد کے نواب نظام علی خاں سے تقرب پیدا کیا جو اس زمانے میں علاقہ برار کے والی تھے۔ انھوں نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر فوج کے منصب قضا پر مامور کر دیا۔ اس کے بعد ۵ ربیع الاول ۱۱۸۲ھ/۲۰ جولائی ۱۷۶۸ء کو جب خود نواب نظام علی خاں اپنے بھائی صلابت جنگ کی جگہ سربراہ مملکت ہوا تو مولانا عبدالقادر گجراتی کو محکمۂ احتساب اور صدارت عظمیٰ پر فائز کیا۔ نیز "محی الدولہ قادر یار خاں بہادر" کے

---

1. نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵۳۔ عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ (اردو ترجمہ تاریخ فرخ آباد) ص ۲۲، ۲۳۔
2. نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵۶، ۱۵۷۔ بحوالہ عزیز التواریخ۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۱۲۔

Marfat.com

لقب سے سرفراز کیا۔ عرصے تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس عالم وفقیہ نے غالباً ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں وفات پائی۔ ان کے بھائی حکیم جعفر کو اسی سال ان کے بعد منصب صدارت تفویض ہوا تھا❶۔

۱۰۶۔ شیخ عبدالقادر پٹنی مکی

شیخ عبدالقادر پٹنی بن شیخ ابوبکر مفتی مکہ معظمہ، شیخ محمد طاہر پٹنی کی اولاد سے تھے۔ فصاحت و بلاغت میں ممتاز، نامور فاضل اور مستند فقیہ تھے۔ مروجہ علوم کی تحصیل شیخ عبداللہ انصاری مکی شافعی سے کی۔ ان کی تصانیف میں چار جلدوں پر مشتمل فتاویٰ اور مجموعہ منشآت مشہور ہیں۔ ۱۱۸۳ھ/ ۱۷۶۹ء میں انتقال ہوا❷۔

۱۰۷۔ شیخ عبدالقادر لاہوری

شیخ عبدالقادر بن عمر بن ہشام حسنی گیلانی لاہوری کی لاہور میں ولادت ہوئی اور اسی شہر میں پلے بڑھے۔ اپنے ماموں شیخ اسماعیل بن قاسم اچی لاہوری (متوفی ۱۱ربیع الثانی ۱۱۴۱ھ/۴/اکتوبر ۱۷۲۸ء) سے علم فقہ حاصل کیا۔ حدیث اور تفسیر کی تحصیل بھی انہی سے کی۔ شیخ عبدالرسول زنجانی لاہوری سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں۔ بعض علوم میں سید محمد بن علاء الدین حسینی لاہوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔ ان کا شمار مشائخ قادریہ میں ہوتا تھا۔ اس سلسلے کے متعدد حضرات نے ان سے استفاضہ کیا۔ کشف الاسرار الصغیر، کشف الاسرار الکبیر اور اسرار کتمانی ان کی تصانیف ہیں۔ ۲۸/ذی الحجہ ۱۱۵۴ھ/ ۱۸/فروری ۱۷۴۲ء کو وفات پائی❸۔

۱۰۸۔ سید عبدالکریم حسینی قنوجی

سید عبدالکریم بن محمد حسینی قنوجی، مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کے فاضل بزرگ تھے اور فقہ واصول کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ اورنگ زیب نے ان کے علم وفضل کی وجہ سے انھیں برہان پور شہر کا جزیہ وصول کرنے پر مامور کر دیا تھا۔ یہ اہم خدمت انھوں نے بہترین طریقے سے انجام دی۔ پھر بادشاہ نے یہی خدمت علاقہ دکن میں بھی اس کے سپرد کی۔ چنانچہ وہ دکن کے چار اقطاع کی وصولی جزیہ پر مامور ہوئے۔ نہایت فاضل، نیک سیرت، کریم النفس، متدین اور پاک باز امیر مملکت تھے۔ اس منصب کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کی سرگرمیاں بھی جاری تھیں❹۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵۸، بحوالہ تزک محبوبی۔

❷ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۲۸۔

❸ خزینۃ الاصفیا، ص ۱۹۱، ۱۹۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۱۵۹۔

❹ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۱۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۷۰۔

Marfat.com

۱۰۹۔ شیخ عبدالکرم صدیقی بلگرامی

شیخ عبدالکریم صدیقی بلگرامی اپنے وقت کے معروف اور جید عالم تھے۔ فقہ واصول اور دیگر علوم مروجہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ معقولات ومنقولات کے ماہر تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ ابتدا میں قرآن مجید حفظ کیا، پھر بلگرام ہی کے علمائے کرام سے مختلف علوم کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سرگرم درس وافادہ ہوئے۔ عربی ادبیات میں اس درجہ عبور حاصل تھا کہ مشہور درسی کتاب مقامات حریری زبانی یاد تھی اور عربی انشا پردازی میں بہت تیز تھے۔ عمر کے آخری دور میں مقامات حریری ہی کے انداز میں خود چند مقالے سپرد قلم کیے اور فارسی میں مقامات کی شرح بھی لکھی۔ حدت فکر اور کتابوں پر عبور کا یہ عالم تھا کہ نامور استاد اور محقق شیخ طفیل محمد اترولوی (متوفی ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) کے لیے صرف تین دن میں معروف اور ادق درسی کتاب ''شمسیہ'' کی شرح تحریر فرمادی۔ عربی اور فارسی کا خط بڑا عمدہ تھا اور نہایت تیزی سے لکھتے تھے۔

بلگرام کے اس عالم وفقیہ نے بارھویں صدی ہجری کے آخر میں وفات پائی[1]۔

۱۱۰۔ قاضی عبدالکریم کشمیری

قاضی عبدالکریم کشمیری کا مولد ومنشا کشمیر ہے۔ مفتی ابوالفتح کشمیری اور دیگر علما سے اخذ علم کیا اور دیار کشمیر کے جلیل القدر شیخ اور عالم وفقیہ ہوئے۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی فوجی چھاؤنی میں گئے، وہاں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ پھر بادشاہ نے ان کو کشمیر کے منصب قضا سے سرفراز کیا، جس پر چوبیس سال مامور رہے۔ عالم گیر کے آخری ایام حکومت میں اس منصب سے علیحدہ ہوئے۔ منصب قضا کی انجام دہی میں نہایت محتاط تھے۔ ان کی عدالت میں کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو اس کے تمام پہلوؤں پر انتہائی غور کرتے اور صحیح فیصلے پر پہنچنے میں اللہ سے رو رو کر دعا کرتے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی کہ کسی مقام پر لغزش فہم کا شکار نہ ہو جائیں۔ بہت نیک، عابد و زاہد، صلاح وتقویٰ کے زیور سے آراستہ اور شب بیدار تھے[2]۔

۱۱۱۔ مخدوم قاضی عبداللطیف ٹھٹھوی

مخدوم قاضی عبداللطیف بن عبدالرحمٰن بن محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی، حدیث، فقہ اور اصول کے ماہر تھے۔ ان کے والد شیخ عبدالرحمٰن بھی جید عالم تھے اور ان کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ بلند بخت بیٹے نے بھی افادۂ علما وطلبا کو اپنا معمول ٹھہرایا اور والد مکرم اور جد امجد کے مدرسے میں سرگرم تدریس ہوئے۔ ان کا معمول تھا کہ ہر روز

---

1. مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۲۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۱۶۱۔
2. تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۱۵، ۱۱۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۱۔ روضۃ الابرار، ص ۶۱۔

Marfat.com

نمازِ عصر کے بعد اپنی مسجد میں درس حدیث دیتے۔ ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء کو محمد سرفراز خاں کے لشکر میں منصب قضا پر فائز ہوئے۔ جمعۃ المبارک کے دن لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے ❶۔

۱۱۱۲۔ شیخ عبداللہ حسنی لاہوری

شیخ عبداللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبداللہ بن اسماعیل بن قاسم بن علی بن بدرالدین بن اسماعیل بن عبداللہ الشریف حسنی اچی لاہوری، مشہور علما و فقہا اور معروف اربابِ فضل و صلاح میں شمار ہوتے تھے۔ ہمیشہ تدریس و تلقین میں مشغول رہتے۔ اصحابِ ثروت اور امرا کے ہاں کبھی نہ جاتے۔ متوکل علی اللہ اور قانع عالم دین تھے۔ ۱۱ر ربیع الثانی ۱۱۴۱ھ/۴ر اکتوبر ۱۷۲۸ء کو لاہور میں فوت ہوئے ❷۔

۱۱۱۳۔ سید عبداللہ سندیلوی

سید عبداللہ بن زین العابدین حسینی سندیلوی، ہندوستان کے صوبہ یوپی کے قصبہ سندیلہ کے باشندے تھے۔ عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ فقہ، اصول اور کلام کے ماہرین میں سے تھے۔ علامہ کمال الدین انصار سہالوی ثم فتح پوری (متوفی ۱۴ر محرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵ر اگست ۱۷۶۱ء) سے اخذ علم کیا۔ کافی عرصہ ان کی صحبت و رفاقت میں گزارا۔ جب علوم مروجہ میں شمس بازغہ تک پہنچے تو ارضِ ہند کے مشہور عالم شیخ حمداللہ سندیلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے، جو فلسفہ و منطق میں یگانۂ روزگار تھے۔ انھی سے سند فراغت حاصل کی۔ پھر خود درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور طویل عرصے تک تشنگانِ علوم کو مستفید فرماتے رہے۔ بعد ازاں امیٹھی (یوپی) کے نامور عالم شیخ عبدالباسط امیٹھوی کے حلقۂ بیعت و ارادت میں شامل ہو گئے۔ یہ ان کا وہ دور تھا، جب کہ لوگوں سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ذکی اور متقی عالم تھے۔ آخر عمر میں جنون و جذب کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اسی حالت میں فوت ہوئے ❸۔

ان کے استاذ حمداللہ سندیلوی:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سید عبداللہ حسینی سندیلوی کے استاذ گرامی شیخ حمداللہ سندیلوی کا تعارف بھی کرا دیا جائے، کیوں کہ وہ اپنی معروف کتاب ''حمداللہ'' کی وجہ سے جو ان کے نام کے ساتھ ہی معروف ہے، ہمارے مدارس دینیہ سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔

❶ تحفۃ الکرام، ص ۶۹۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۲۔

❷ خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۸۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۳۔

❸ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۰۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۴۔

Marfat.com

ہندوستان کے صوبہ یو پی میں ضلع ہردوئی کا ایک قدیم اور معروف قصبہ ''سندیلہ'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ قصبہ لکھنؤ سے تیس میل کے فاصلے پر مراد آباد جانے والی ریلوے لائن پر واقع ہے۔ مرقوم ہے کہ یہ قصبہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی (متوفی ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء) کے ایک مرید اور خلیفہ مخدوم سید علاء الدین (۶۹۰۔۷۶۴ھ) نے آباد کیا تھا۔ اس قصبے میں متعدد نامور اصحاب علم اور ارباب فضل پیدا ہوئے، جن میں بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم اور مولانا سید عبداللہ سندیلوی کے استاذ گرامی شیخ حمداللہ سندیلوی کا نام نامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔ شیخ حمداللہ بن شکر اللہ بن دانیال بن پیر محمد ''نسباً صدیقی، مذہباً شیعہ اور مولد و مسکن کے لحاظ سے سندیلوی تھے۔ ان کا مدفن بھی سندیلہ ہے۔ شیخ کمال الدین فتح پوری (متوفی ۱۴ر محرم ۱۱۷۵ھ/۱۵ر اگست ۱۷۶۱ء) اور فاضل اجل شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸ر جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/۱۵ر اپریل ۱۷۴۸ء) کے تلمیذ تھے۔ یوں تو تمام علوم متداولہ میں عبور رکھتے تھے، لیکن فلسفہ و منطق اور علوم حکمیہ میں خصوصیت سے یگانۂ روزگار تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اس سلسلے میں درجہ امامت اور مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے۔ ان علوم کی تدریس میں انھوں نے نہایت شہرت پائی۔ یہی وجہ ہے کہ والیٔ اودھ ابوالمنصور خاں نے ارض ہند کے مغل حکمران احمد شاہ سے ان کی سفارش کی اور بادشاہ نے انھیں فضل اللہ خاں کا لقب عطا کیا اور کافی جاگیر بھی دی۔ پھر انھوں نے اپنے آبائی قصبہ سندیلہ میں بہت بڑا مدرسہ قائم کیا۔

شیخ حمداللہ نے متعدد علمی وفنی کتابوں پر حواشی و تعلیقات سپرد قلم کیں، جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

حمداللہ: یہ کتاب قاضی محبّ اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) کی منطق کی مشہور کتاب سلم العلوم کی مفصل و بسیط شرح ہے۔ یہ شرح خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے، جو اس کے فاضل شارح ''حمداللہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اپنے موضوع سے متعلق کتاب کی علمی افادیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ کتاب صدیوں سے برصغیر پاک و ہند کے مدارس دینیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ علما و طلبا میں اس کتاب کو بے پناہ تلقی و قبولیت حاصل ہوئی۔

حواشی شمس البازغہ: شمس البازغہ، شیخ محمود جون پوری (متوفی ۱۹ر ربیع الاول ۱۰۶۲ھ/ ۱۹ر فروری ۱۶۵۲ء) کی شہرۂ آفاق کتاب ہے اور درس نظامیہ میں داخل ہے۔ اس کتاب کو اہل علم نے لائق اعتنا ٹھہرایا اور اس پر حواشی و تعلیقات لکھے۔ شیخ حمداللہ نے بھی اس پر حاشیہ لکھا۔

حاشیہ صدرا: قاضی محمد بن ابراہیم شیرازی ''مشہور عالم تھے، صدر الدین ان کا لقب تھا۔ ہمارے مدارس میں ''ملا صدرا'' کے نام سے معروف ہیں۔ ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰ء میں فوت ہوئے۔ بہت سی علمی وفنی کتابوں کے مصنف اور محشی تھے۔ انھوں نے ایک بہت مشہور متن ہدایۃ الحکمۃ کی شرح قلم بند کی، جس میں منطق اور طبعیات والٰہیات کے مسائل کو زیر بحث لایا گیا۔ ہدایۃ الحکمۃ کے مصنف اثیر الدین مفضل بن عمر ابہری تھے، قاضی محمد بن ابراہیم شیرازی (صدرالدین) نے اس کی ایک مبسوط شرح لکھی، جو ان کے نام کی مناسبت سے ''صدرا'' کے نام سے مشہور

Marfat.com

ہوئی۔ یہ کتاب داخل نصاب ہے۔ شیخ حمد اللہ سندیلوی نے اس کتاب (صدرا) کی شرح لکھی۔

شرح زبدۃ المقامات: شیخ محمد بن حسین بن عبد الصمد حارثی عاملی ہمدانی، ان کا لقب بہاء الدین تھا۔ مسلکاً شیعہ تھے۔ ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء میں فوت ہوئے۔ بہت سی علمی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں بعض درس نظامیہ میں شامل ہیں۔ صرف بہائی بھی انہی کی تصنیف ہے۔ ان کی ایک تصنیف کا نام زبدۃ الاصول ہے۔ شیخ حمد اللہ سندیلوی نے اس کی شرح قلم بند کی۔

بے شک شیخ حمد اللہ دیارِ ہند کے صاحب کمال محقق و مصنف اور مدرس تھے۔ بے شمار تشنگان علوم نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان کا سلسلہ تدریس بہت وسیع تھا۔ انھوں نے ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء کو دہلی میں وفات پائی❶۔

۱۱۴۔ قاضی عبداللہ گجراتی

قاضی عبداللہ بن شریف گجراتی مسلکاً حنفی تھے۔ شیخ و فاضل اور فقہ واصول کے جید عالم تھے۔ احمد آباد شہر کے قاضی تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کا بیٹا شہزادہ محمد اعظم گجرات کا والی ہو کر آیا تو اس نے ان کو عساکر شاہی کے منصب قضا پر متعین کر دیا۔ کافی عرصہ اس منصب پر مامور رہے۔ پھر خود سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء میں قاضی ابو سعید گجراتی کی جگہ انھیں قضائے اکبر کا اعزاز بخشا اور ہندوستان کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ طویل مدت تک یہ خدمت ان کے سپرد رہی۔ پھر مسند صدارت تفویض کی گئی۔ ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء کو مرض فالج میں مبتلا ہو کر دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔ ان کے بعد قاضی محمد اکرم دہلوی (متوفی ۱۱۱۶/۱۷۰۴ء) جو دار الحکومت کے موروثی مفتی تھے، عساکر کی خدمت قضا پر مامور ہوئے❷۔

۱۱۵۔ مولانا عبداللہ امیٹھوی

مولانا عبداللہ امیٹھوی، فقہ و اصول اور علم کلام میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸ر جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/ ۲۵ر اپریل ۱۷۴۸ء) کے شاگرد تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود درس و تدریس میں مصروف ہو گئے تھے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ ارض ہند کے مشہور شیخ و عالم سید علم اللہ حسنی بریلوی کے بعض اخلاف بھی ان سے مستفید ہوئے۔ بادشاہِ دہلی احمد شاہ کے عہد میں وفات پائی❸۔

---

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۵۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۷۴، ۷۵۔ تذکرۃ المصنفین درس نظامی، ص ۹۱ تا ۹۳۔ لباب المعارف العلمیہ، ص ۱۳۷، ۱۳۸، ۳۱۲۔ تراجم الفضلاء، ص ۸۔

❷ مآثر عالم گیری، ص ۳۶۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۵۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۶، بحوالہ رسالہ قطبیہ۔

Marfat.com

۱۱۶۔ مولانا سید عبداللہ بلگرامی

مولانا سید عبداللہ حسینی بلگرامی کی ولادت اور نشوونما بلگرام میں ہوئی۔ قرآن مجید اور ابتدائی کتابیں اپنے قصبے بلگرام میں پڑھیں۔ پھر کھنڈو کا عزم کیا جو یوپی میں دریائے گنگا کے کنارے ایک پرگنہ تھا۔ اس زمانے میں کھنڈو کو علم وفضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور وہاں قاضی علیم اللہ کھنڈوی (متوفی ۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۳ء) کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوگئے اور طویل عرصے تک ان سے مصروفِ استفادہ رہے۔ یہاں تک کہ مختلف علوم وفنون پر عبور حاصل کیا اور کبار فقہائے حنفیہ میں گردانے گئے۔ کتابت میں بھی مہارت پیدا کی اور سات قسم کے رسوم الخط سیکھے۔ فنون حرب کی تربیت بھی حاصل کی۔ بعد ازاں نواب سربلند خاں کے دربار میں پہنچے۔ اس نے پہلے محکمہ فوج میں پھر ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں احمد آباد کے منصب صدارت پر مامور کیا۔ وہیں علامہ وجیہ الدین علوی گجراتی کے نواسے شاہ اسد اللہ علوی سے شرح المواقف پڑھی اور شیخ قوام الدین گجراتی سے ہدایۃ الفقہ کا باقاعدہ درس لیا۔ وہیں علاقہ گجرات کے جلیل القدر عالم اور نامور فاضل شیخ نورالدین احمد آبادی (متوفی ۹ رشعبان ۱۱۵۵ھ/ ۲۸ر ستمبر ۱۷۴۲ء) سے رابطہ پیدا ہوا۔ مآثر الکرام کی روایت کے مطابق شاہ اسد اللہ علوی سے مولانا سید عبداللہ نے یہ بھی کہا کہ محمد اعظم شاہ کے عہد حکومت میں ایک فاضل سے ایک تقریب ضیافت میں علمی مباحثہ ہوگیا، لیکن انھوں نے بات غصے اور رنج تک پہنچا دی۔ یہاں مباحثہ نہیں ہونا چاہیے۔ شاہ صاحب نے فرمایا: یہ لفظ آپ نے کیوں کہے، علمی بحثیں ہونی چاہئیں۔ لیکن غم وغصہ نہیں بلکہ افادہ و استفادہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد سید صاحب شاہ کے گھر گئے اور علمی مباحث کا سلسلہ شروع ہوا، جس سے خود شاہ صاحب بھی اور حاضرین مجلس بھی بہت محظوظ ہوئے۔

مولانا سید عبداللہ بلگرامی کو دہلی میں استقا کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ اسی حالت میں انھیں بلگرام لایا گیا، انھوں نے ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۲۰ء کو بلگرام میں وفات پائی[1]۔

۱۱۷۔ مولانا عبدالمقتدر بہاری

مولانا عبدالمقتدر بن عبدالنبی بہاری، علوم حدیث وفقہ میں مرتبۂ کمال پر فائز تھے اور اپنے عصر کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کے والد مولانا عبدالنبی بہاری بھی صاحب فضل وکمال تھے۔ لائق بیٹے نے والد مکرم سے علم حاصل کیا، حدیث بھی انہی سے پڑھی[2]۔

---

[1] مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۳۷، ۲۳۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۶، ۱۶۷۔

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۹۔

Marfat.com

۱۱۸۔ مفتی عبدالمومن کشمیری

مفتی عبدالمومن بن احسن اللہ کشمیری اپنے عہد کے معروف عالم وفقیہ تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ مولانا عبداللہ بن محمد فاضل کشمیری (متوفی شوال ۱۱۷۱ھ/ جون ۱۷۵۸ء) اور شیخ عبدالسلام کشمیری (متوفی ۱۸ر شوال ۱۱۷۱ھ/ ۲۵ر جون ۱۷۵۸ء) سے حصول علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کریم داد خاں کے عہد میں کشمیر کی مسند افتا پر فائز ہوئے۔ ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں وفات پائی[1]۔

۱۱۹۔ قاضی عبدالنبی عثمانی احمد نگری

قاضی عبدالنبی بن عبدالرسول بن ابو محمد بن عبدالوارث عثمانی احمد نگری، اپنے زمانے میں دیار ہند کے مشہور عالم دین تھے۔ احمد نگر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ ان کے والد شیخ عبدالرسول عثمانی گجراتی (متوفی ۱۹ر شوال ۱۱۳۰ھ/ ۴ر ستمبر ۱۷۱۸ء) اپنے دور کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ لائق بیٹے نے مختصرات باپ ہی سے پڑھیں۔ باپ کی وفات کے بعد شیخ عبداللہ احمد نگری اور سید بخش حسینی کرمانی خیر آبادی سے اخذ علم کیا۔ پھر گجرات گئے اور حاشیہ قدیمہ وغیرہ کتب درسیہ شیخ قطب الدین عثمانی گجراتی سے اور اکثر کتب درسیہ شیخ محمد محسن بن عبدالرحمٰن صدیقی گجراتی سے پڑھیں اور کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ علم نحو اور علم منطق میں اپنے تمام ابنائے عصر سے فوقیت لے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد احمد نگر کے عہدۂ قضا پر مامور ہوئے۔ ساتھ ہی درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔

قاضی عبدالنبی عثمانی احمد نگری کو تصنیف وتالیف سے بھی تعلق تھا اور وہ اپنے دور کے کثیر التصانیف عالم دین تھے۔ ان کی تصانیف وشروح کی تفصیل درج ذیل ہے:

جامع الغموض ومنبع الفیوض: یہ علم نحو کی معروف کتاب کافیہ ابن حاجب کی ایک مبسوط شرح ہے۔ کتاب فارسی زبان میں ہے جو فاضل مصنف نے ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۱ء میں علاقہ گجرات کے شہر احمد نگر میں لکھی۔

دستور العلما: یہ علوم وفنون کی اصطلاحات میں چار مجلدات پر مشتمل ہے۔

یزدی کی شرح تہذیب پر مبسوط ومفصل حاشیہ۔

میر زاہد ملا جلال پر حاشیہ۔

علم صرف کی درسی کتاب، دستور المبتدی پر حاشیہ۔

عاملی کی خلاصۃ الحساب پر حاشیہ۔

اصول الحسامی پر حاشیہ۔

علم معانی وبیان کی کتاب مطول پر حاشیہ۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۹۔ روضۃ الابرار، ص ۶۹۔

Marfat.com

علامہ سعد الدین تفتازانی کی شرح العقائد پر حاشیہ۔
حاشیہ الخیالی علیٰ شرح العقائد۔
علامہ محمد رشید عثمانی جون پوری کی علم مناظرہ کی کتاب، رشیدیہ پر حاشیہ۔
اسی موضوع سے متعلق ایک اور کتاب شریفیہ پر حاشیہ۔
سیف المبتدین فی قتل المفرورین۔

بہر حال قاضی عبدالنبی عثمانی احمد نگری بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر ہندی عالم تھے اور علوم متداولہ کے ہر گوشے پر عمیق نظر رکھتے تھے❶۔

۱۲۰۔ مولانا عبدالولی طرخانی کشمیری

مولانا عبدالولی طرخانی کشمیری، عالم حدیث اور فقیہ و شیخ تھے۔ علاقہ ترکستان کے ایک شہر ''طرخان'' میں پیدا ہوئے اور اپنے علاقے کے علما سے اخذ علم کیا۔ پھر طرخان ہی سے حجاز تشریف لے گئے اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ وہاں صحاح ستہ کے محشی و شارح شیخ ابوالحسن سندھی مدنی سرگرم تدریس حدیث تھے، ان کے مدرسہ دارالشفا میں داخل ہوئے۔ ان سے علم حدیث اور تفسیر کا درس لیا اور سند و اجازہ سے بہرہ مند ہوئے۔ ارضِ حجاز سے ہندوستان آئے اور کشمیر میں سکونت اختیار کی۔ بارھویں صدی ہجری کے اس نامور عالم ربانی نے کشمیر میں درس و تدریس کا غلغلہ بلند کیا اور تفسیر و حدیث کی اشاعت کی۔

اس عالم و فقیہ سے مفتی قوام الدین محمد کشمیری، اور خلق کثیر نے اخذ علم کیا۔

مولانا عبدالولی چوں کہ موضع طرخان میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے تھے، اس لیے طرخانی کہلائے، اور پھر کشمیر کو اپنا مسکن ٹھہرالیا تھا، لہٰذا کشمیری مشہور ہوئے۔ اس جلیل القدر عالم نے ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۸ء میں جام شہادت نوش کیا❷۔

۱۲۱۔ میر سید عبدالوہاب منور آبادی

میر سید عبدالوہاب بن ہاشم حسینی منور آبادی خطۂ کشمیر کے باشندے تھے۔ عالم باعمل، فقیہ کامل اور متورع و متقی تھے۔ ان کا شمار کبار فقہائے ہند میں ہوتا تھا۔ تمام عمر قرآن و حدیث کی تدریس اور تحقیق مسائل میں مصروف رہے۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ اور اخذ علم کیا۔ اسی (۸۰) سال سے زائد عمر پا کر ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۰ء کو اچھی صحت میں رحلت فرمائی❸۔

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۳۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۲، ۱۷۳۔
❷ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۳۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۴۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۵۔ روضۃ الابرار، ص ۷۱۔
❸ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۳۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۴، ۱۷۵۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۳۔ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۵۔ روضۃ الابرار، ص ۶۲۔

Marfat.com

۱۲۲۔ شیخ عتیق اللہ جالندھری

شیخ عتیق اللہ کا سلسلہ نسب یہ ہے: عتیق اللہ بن فاضل بن مصطفیٰ بن عثمان بن اللہ بخش بن قاسم بن اسماعیل بن ابراہیم حسینی بلخی سرہندی ثم جالندھری۔

شیخ عتیق اللہ کا سلسلۂ نسب حضرت زید بن علی بن حسین سے ملتا ہے۔ ان کے آباو اجداد بلخ کے رہنے والے تھے، بعد میں وارد ہند ہوئے اور پنجاب کے شہر جالندھر کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ شیخ ممدوح کا مولد ومنشا جالندھر ہے۔ انھوں نے مختلف علمائے عظام سے تحصیل کی اور فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں شمار ہوئے۔ دل میں تصوف وطریقت کا جذبہ موج زن ہوا تو شیخ ابوالمعالی بن محمد اشرف حسینی انبیٹھوی (متوفی ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء) کی خدمت میں حاضری دی جو ضلع سہارن پور کے قریہ انبیٹھہ کے باشندے تھے اور ہندوستان کے مشاہیر مشائخ میں گردانے جاتے تھے۔

شیخ عتیق اللہ حسینی جالندھری نے ماہ شعبان ۱۱۳۱ھ/ جون ۱۷۱۹ء میں وفات پائی [1]۔

۱۲۳۔ قاضی عثمان احمد عثمانی بلگرامی

قاضی عثمان احمد بن قاضی احسان اللہ عثمانی بلگرامی، اصحاب فضل وصلاح اور اربابِ خیر ومعروف میں سے تھے۔ عالم وشیخ اور نامور فقیہ تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما کی منزلیں طے کیں۔ ابھی چار سال کے تھے کہ پیر محمد بن محمد فاضل حسینی قنوجی کے حلقۂ درس میں داخل کرادیے گئے۔ کچھ بڑے ہوئے تو عازم سندیلہ ہوئے۔ وہاں مولانا عبداللہ بن زین العابدین حسینی سندیلوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور بعض کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ بعض کتابیں ایک اور بزرگ دین محمد بن وجیہ الدین سندیلوی سے پڑھیں۔ وہاں سے ملاوہ کا قصد کیا، جہاں شیخ محمد عظیم ملانوی بن کفایت اللہ فاروقی گوپاموی ثم ملانوی (متوفی بعد ۱۱۰۰ھ) سرگرم درس وافادہ تھے، ان سے کتب درسیہ میں سے مطولات کی تکمیل کی۔ مثلاً تفسیر بیضاوی اور صحیحین انہی سے پڑھیں اور انہی سے سند حدیث لی۔ بعدازاں اپنے وطن بلگرام تشریف لے گئے [2]۔

۱۲۴۔ قاضی عصمت اللہ فاروقی لکھنوی

قاضی عصمت اللہ فاروقی لکھنوی، قاضی عبدالقادر فاروقی لکھنوی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب اٹھارہ واسطوں سے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ قاضی عصمت اللہ لکھنوی ارضِ ہند

[1] خزینۃ الاصفیا، ج۔ ص ۴۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۱۷۷۔

[2] مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۸۵، ۲۸۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۷۔

Marfat.com

کے فاضل بزرگ تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں پرورش پائی۔ اپنے والد مکرم قاضی عبدالقادر فاروقی لکھنوی (متوی ۲۷ رشعبان ۱۰۷۶ھ/ ۲۲ رفروری ۱۶۶۶ء) اور مفتی وجیہ الدین گوپاموی (متوفی ۵ر جمادی الاخریٰ ۱۰۸۳ھ/ ۱۸ر ستمبر ۱۶۷۲ء) سے جو مرتبین فتاویٰ عالم گیری میں شامل تھے، علم حاصل کیا۔ طریقت وسلوک کی منزلیں شیخ پیر محمد سلونی (متوفی ۲۲ر محرم ۱۰۹۹ھ/ ۱۸ر نومبر ۱۶۸۷ء) سے طے کیں۔ پھر بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر سے منسلک ہو گئے۔ اس نے ان کو مراد آباد کا والی مقرر کر دیا۔ خاصی مدت اس منصب پر فائز رہے۔ بعد ازاں مختلف شہروں میں آنا جانا رہا۔

قاضی ممدوح ایک صاحب ثروت اور امیر عالم دین تھے۔ سخی، ایثار پیشہ اور مستحقین پر مال و دولت خرچ کرنے والے تھے۔ علما و مشائخ کا اس درجہ خیال رکھتے کہ انھیں خراجی زمینوں سے ایک لاکھ کاشت کار دیے، جن کے ساتھ کثیر تعداد میں مویشی بھی تھے۔ نیز اپنی جاگیروں سے سات گاؤں عطا کیے۔ طلبا سے تعلق خاطر کا یہ عالم تھا کہ روزانہ دو سو طلبا کو کھانا کھلاتے اور رمضان المبارک میں روزانہ ایک ہزار اشخاص کو اپنے ذاتی لنگر سے کھانا مہیا کرتے۔ علم فقہ اور اس کی جزئیات و فروع پر عبور کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مرتبین فتاویٰ عالم گیری کی جماعت میں شامل تھے۔ حافظِ قرآن اور علومِ عربیہ کے ماہر تھے۔

قاضی عصمت اللہ لکھنوی کی وفات ساحل نربدہ پر ۱۲ر رجب ۱۱۱۳ھ/ ۲ر دسمبر ۱۷۰۱ء کو اس وقت ہوئی جب وہ بلادِ دکن سے لوٹ رہے تھے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۶۷ سال تھی۔

تذکرہ علمائے ہند کی روایت کے مطابق ہفتے کی رات ۲ر رجب ۱۱۱۳ھ/ ۲۲ر نومبر ۱۷۰۱ء کو دکن کے راستے میں موضع بربندہ میں وفات پائی اور جمعہ کے روز ۱۷ر شوال ۱۱۱۳ھ/ ۶ر مارچ ۱۷۰۲ء کو لکھنؤ کے قریب بھدانوہ میں دفن کیے گئے ❶۔

۱۲۵۔ شیخ عصمت اللہ سہارن پوری

شیخ عصمت اللہ بن محمد اعظم بن عبدالرسول سہارن پوری، مسلکاً حنفی تھے اور ہندوستان کے نامور محقق تھے۔ سہارن پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ دیارِ ہند کے مختلف اساتذہ سے علم حاصل کیا اور فقہ، اصول، فروع، معانی، بیان، ہیئت، ہندسہ، ریاضی وغیرہ علوم میں مہارت پیدا کی۔ یہ وہ ہندی عالم ہیں جن کی چشم بصارت غائب تھی لیکن چشم بصیرت تیز اور روشن تھی۔ ذہن اور دماغ کے تمام گوشے منور تھے۔ کتابوں پر استحضار کا یہ عالم کہ نابینا ہونے کے باوجود طلبا کو درس دیتے، علما کو مستفید فرماتے، مشکل تریں موضوع پر کتابیں تصنیف کرتے، کتب درسیہ کی شرحیں سپرد قلم کرتے اور باقاعدہ فتوے دیتے۔ یعنی وہ بہ یک وقت عالم، فقیہ، مدرس، مصنف، مفتی سب کچھ تھے۔ تصانیف و شروح درج ذیل ہیں:

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۴۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۱۳ تا ۳۱۶۔

Marfat.com

حاشیہ شرح جامی: ملا عبدالرحمٰن جامی نے علم نحو کی انتہائی کتاب کافیہ کی جو ابن حاجب کی تصنیف ہے، فوائد ضیائیہ کے نام سے شرح لکھی۔ یہ شرح بڑی مفصل اور مبسوط ہے اور شرح جامی کے نام سے مشہور ہے۔ مدارس دینیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ مولانا عصمت اللہ سہارن پوری نے شرح جامی پر حواشی تحریر کیے۔

شرح تشریح الافلاک: محمد بن حسین بن عبدالصمد حارثی عاملی ہمدانی، اپنے لقب بہاء الدین سے معروف تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں بعض کتابیں داخل نصاب ہیں۔ علم صرف کی صرف بہائی اور علم ہیئت کی تشریح الافلاک انہی کی تصانیف ہیں۔ انھوں نے ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء کو اصفہان میں وفات پائی۔ مولانا عصمت اللہ سہارن پوری نے تشریح الافلاک کی نہایت عمدہ اور بسیط شرح لکھی۔

شرح خلاصۃ الحساب: علم ریاضی میں بھی خلاصۃ الحساب کے نام سے تشریح الافلاک کے مصنف شہیر بہاء الدین عاملی نے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ مولانا سہارن پوری اس کی بھی بہترین شرح ضبط تحریر میں لائے۔ یہ علمی کام انھوں نے ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء میں مکمل کیا۔

رسالہ حرمۃ الغناء والمزامیر: یہ رسالہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے: سبحانك اللهم ارنا حقائق الاشياء كماهي، ولا تجعلنا من الناس من يشتري لهو الحديث والملاهي۔ یہ ان کی ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۸ء کی تصنیف ہے، اور ایک مقدمہ، سات فصول اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ غنا کے معنی اور مسئلۂ زیر بحث کی تعیین پر محیط ہے۔

اس سے آگے فصل اول میں وہ آیات قرآنی مندرج ہیں جو غنا اور مزامیر کی حرمت پر دلالت کناں ہیں۔ فصل ثانی میں وہ احادیث منقول ہیں جو اس کی حرمت پر دال ہیں۔ فصل ثالث ان اقوال مجتہدین کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو اس کی حرمت میں وارد ہیں۔ فصل رابع حرمت غنا و مزامیر میں صوفیا کے اقوال کو گھیرے ہوئے ہے۔ فصل خامس حرمت رقص سے متعلق ہے۔ فصل سادس میں ان احادیث کی محدثانہ نقطہ نظر سے وضاحت کی ہے، جن سے غنا و مزامیر اور رقص و سرود کو مباح قرار دینے والے لوگ استدلال کرتے ہیں۔ فصل سابعہ میں مرقوم ہے کہ صوفیا میں اباحت غنا کی شہرت کے اصل اسباب کیا ہیں۔ خاتمۂ کتاب میں اہل غنا و رقص کے موقف کی شریعت کی روشنی میں تردید کے بعد حقائق کی روشنی میں تردید کی گئی ہے۔

رقیب باب المعروف والمنکر: یہ کتاب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق ہے۔ آغاز، الحمد للہ الذي يامرنا بالعدل والاحسان کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ سن تالیف ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء ہے۔ کتاب ایک مقدمہ، چند فصلوں اور خاتمہ پر محتوی ہے۔ مقدمہ کتاب میں امر اور نہی کی اصل تعریف بیان کی گئی ہے۔ فصول کتاب میں فاضل مصنف نے پہلے وہ آیات و احادیث نقل کی ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔ پھر امر اور نہی کے ارکان و فرائض بیان کیے ہیں۔ بعد ازاں ان لوگوں کو ہدف تنقید و تردید ٹھہرایا ہے جو امر اور نہی کے سلسلے میں لوگوں سے تعرض نہیں کرتے اور ان سے سختی سے پیش نہیں آتے۔ اس

Marfat.com

سے آگے امرا و سلاطین کو معروف کا حکم دینے کا بیان ہے۔ پھر ولایت وحکومت اور اس کی شرائط کی صراحت ہے۔ خاتمہ کتاب میں خلفائے راشدین اور دیگر زعمائے اسلام کی سیرت کا تذکرہ ہے۔

شیخ عصمت اللہ سہارن پوری نے ۱۱۱۳ھ/ ۱۷۵۱ء میں وفات پائی ❶۔

شیخ عصمت اللہ سہارن پوری کے حالات کے سلسلے میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان ❷ میں میر غلام آزاد بلگرامی نے، ابجد العلوم ❸ میں نواب حسن صدیق خاں نے، قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب ❹ میں سید ذوالفقار احمد نے تذکرہ علمائے ہند میں ❺ رحمان علی اور حدائق الحنفیہ ❻ میں مولوی فقیر محمد جہلمی نے شیخ عصمت اللہ سہارن پوری کا سالِ وفات ۱۰۳۹ھ/ ۱۶۳۰ء لکھا ہے۔ یعنی انھیں گیارھویں صدی ہجری کے علما میں شمار کیا ہے۔ صرف صاحب نزہۃ الخواطر علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی نے ان کو بارھویں صدی ہجری کے ہندی علما کی فہرست میں تحریر کیا ہے اور سن وفات ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۱ء لکھا ہے ❼۔ علامہ عبدالحی حسنی کا ماخذ سید محمد بن سعید عبدالجلیل حسینی بلگرامی (متوفی ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء) کی تصنیف تبصرہ الناظرین ہے۔ باقی سب تذکرہ نگاروں کا ماخذ میر غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء) کی مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان ہیں۔ ہمارے خیال میں علامہ عبدالحی حسنی کا موقف صحیح ہے۔ کیونکہ تبصرۃ الناظرین نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانے کی کتاب ہوگی۔ ان کا تمام کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو کی تحویل میں چلا گیا تھا۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے شیخ عصمت اللہ سہارن پوری کے بارے میں اسی سے معلومات اخذ کی ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے شیخ ممدوح کے بارے میں جو تفصیلات درج کی ہیں، وہ کسی اور تذکرہ نگار نے بیان نہیں کیں۔

یہاں یہ سوال ذہن میں ابھر سکتا ہے کہ اگر تبصرۃ الناظرین نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے کتب خانے کی کتاب ہے تو خود نواب صاحب نے ابجد العلوم میں شیخ سہارن پوری کا سن وفات ۱۰۳۹ھ/ ۱۶۳۰ء کیوں رقم فرمایا ہے؟ تو اس بارے میں یہ عرض ہے کہ ممکن ہے ان کی نظر اس پر نہ پڑی ہو، اور انھوں نے مآثر الکرام ہی کو پیش نگاہ رکھا ہو۔ لیکن نزہۃ الخواطر کے مصنف شہیر نے ان مصنفین گرامی کے تسامح کی نشان دہی نہیں کی۔ معلوم نہیں کیوں؟ واللہ اعلم بالصواب۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۸۰، ۱۸۱، بحوالہ تبصرۃ الناظرین از محمد بن عبدالجلیل بلگرامی۔

❷ دیکھیے ص ۱۹۴۔

❸ ص: ۹۰۰۔

❹ ص ۵۲۔

❺ ص ۱۹۷۔

❻ ص ۴۰۷۔

❼ ملاحظہ ہو، نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۸۰، ۱۸۱۔

Marfat.com

۱۲۶۔ شیخ عطاء اللہ دہلوی

شیخ عطاء اللہ بن حسن حسینی نارنولی ثم دہلوی، عالم وفقیہ اور مشاہیر مشائخ میں سے تھے۔ اصلاً نارنول کے رہنے والے تھے، اس لیے نارنولی کہلائے۔ لیکن ان کے والد گرامی سید حسن رسول (متوفی ۲۲ر شعبان ۱۱۰۳ھ/ ۲۹ر اپریل ۱۶۹۲ء) نارنول سے دہلی منتقل ہو گئے تھے اور وہیں گھر بنا لیا تھا۔ شیخ عطاء اللہ ممدوح ان کے تیسرے بیٹے تھے۔ دہلی میں سکونت کی وجہ سے دہلوی مشہور ہوئے❶۔

۱۲۷۔ شیخ علی اصغر قنوجی

شیخ علی اصغر بن عبدالصمد بکری کرمانی قنوجی، عالم کبیر اور شیخ وقت تھے۔ الفصول العمادیہ کے فاضل مصنف شیخ عمادالدین کرمانی کی اولاد سے تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، صرف ونحو اور علم بیان ومعانی میں وحید العصر تھے۔ تصوف وسلوک سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ ۱۰۵۱ھ/ ۱۶۴۱ء کو قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ علوم درسیہ اور فنونِ متداولہ کی تحصیل سید محمد قنوجی (متوفی ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۹۰ء) سے کی، جو اس زمانے میں قنوج میں سرگرم درس وافادہ تھے۔ شیخ عصمت اللہ سہارن پوری (متوفی ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۱ء) کی خدمت میں بھی گئے، ان سے متوسطات ومطولات کی تکمیل کی۔ ان کے علاوہ اور بھی مختلف علمائے کرام سے استفادہ کیا اور علم وفضل کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ ان کے اساتذہ کی فہرست میں شیخ لطف اللہ کوروی، مولانا محمد زمان کاکوروی اور نواب دیانت خاں ایسے رفیع المرتبت علما کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ تصوف وطریقت میں لکھنؤ جا کر پیر محمد لکھنوی سے استفاضہ کیا۔ پھر اپنے وطن قنوج کو مراجعت کی۔ یہ وہ عالم وفقیہ ہیں جو تمام علائق دنیا سے منقطع ہو کر علما وطلبا کو پورے ساٹھ سال علوم مروجہ پڑھاتے رہے۔ اس طویل مدت میں بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ قرآن مجید پر گہری نظر تھی۔ ثواقب التنزیل کے نام سے تفسیر جلالین کے انداز پر ایک تفسیر لکھی۔ یہ ان کی عمر کے آخری دور کی تصنیف ہے۔ اس سے پہلے تصوف و سلوک کے بارے میں بھی کچھ کتابیں تصنیف کیں۔ اس موضوع کی بعض کتابوں پر حواشی وتعلیقات بھی سپرد قلم کیے۔ برصغیر پاک وہند کے یہ عالم وفقیہ تادم واپسیں مصروف تدریس رہے۔

ان کے حالات میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے بعض آباواجداد مدینہ منورہ سے کرمان آئے اور وہاں سے ان کے ایک بزرگ شیخ مبارک بن عمادالدین وارد ہند ہوئے اور قنوج میں توطن اختیار کیا۔

شیخ علی اصغر قنوجی نے ۱۵ر شعبان ۱۱۴۰ھ/ ۱۶ر مارچ ۱۷۲۸ء کو وفات پائی❷۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۸۲، بحوالہ بحر زخار۔

❷ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۳۹، ۲۴۰، (بضمن ترجمہ قاضی علیم اللہ کچندوی) ابجد العلوم، ص ۹۳۰، ۹۳۱۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۳۶۸۔ تقصار جنود الاحرار، ص ۱۸۹۔ ہدیۃ العارفین، ج ۱، ص ۶۶۷۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۸۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۴۱، ۱۴۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۸۷۔

Marfat.com

۱۲۸۔ مفتی علیم اللہ گوپاموی

مفتی علیم اللہ بن عبیداللہ بن عیسیٰ بن آدم شہابی صدیقی گوپاموی کا شمار ارضِ ہند کے علمائے اعلام میں ہوتا تھا۔ اپنے دور کے شیخ اور فقیہ تھے۔ ان کے والد مفتی عبیداللہ بھی اپنے علاقے کے جلیل القدر عالم تھے اور صوبہ یوپی کے شہر گوپامئو کی مسندافتا پر فائز تھے۔ والد کی وفات کے بعد لائق بیٹے (مفتی علیم اللہ گوپاموی) کو اس شہر کا مفتی مقرر کیا گیا۔ ۱۴؍ ذی الحجہ ۱۱۰۳ھ/ ۱۶؍ اگست ۱۶۹۲ء کو فوت ہوئے ❶۔

۱۲۹۔ سید عنایت اللہ بلگرامی

سید عنایت اللہ بن عبدالستار بن حاتم بن بدرالدین حسینی واسطی بلگرامی بہت بڑے فقیہ، جلیل القدر عالم دین اور اپنے دور کے بے نظیر طبیب تھے۔ نہایت ذہین، بلند فکر اور طباع تھے۔ ابتدا میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اس وقت بلگرام میں میر سید اسماعیل بن سید قطب عالم حسینی بلگرامی (متوفی ۴؍ شوال ۱۰۸۸ھ/ ۲۰؍ نومبر ۱۶۷۷ء) کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں داخل ہو گئے۔

سید اسماعیل سے انھوں نے تمام درسی کتابیں باقاعدہ پڑھیں اور خوب علمی تربیت حاصل کی۔ یوں تو تمام علوم مروجہ میں درجۂ کمال پر فائز تھے، لیکن فقہ اور طب میں بالخصوص بہت مشہور تھے اور اس میں کوئی اس علاقے میں ان کا ہم سر نہ تھا۔ استخراج مسائل فقہیہ میں جماعت علما میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ ان کے عہد کے تمام اصحابِ فتویٰ فقہ واصول میں ان کے تفوق کو مانتے اور ان کی بالادستی کے معترف تھے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے ہر وقت مطالعہ کتب میں مصروف رہتے۔ مطالعہ کتب، افتا نویسی اور طبابت ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا اور اس میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ بلگرام کے اس بلند مرتبہ عالم وفقیہ نے ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء کو وفات پائی ❷۔

۱۳۰۔ شیخ عنایت اللہ سندھی

شیخ عنایت اللہ بن فضل اللہ ٹھٹھوی سندھی، عالم کبیر اور فقیہ نامدار تھے۔ معقولات ومنقولات کے ماہر تھے۔ مولانا احمد بن اسحاق ٹھٹھوی کے شاگرد تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند تدریس بچھائی۔ ان کے شاگردوں میں مولانا ضیاء الدین بن ابراہیم ٹھٹھوی، شیخ محمد معین بن محمد امین سندھی مصنف ''دراسات اللبیب'' اور علما کی بڑی جماعت شامل ہے۔ ۱۱۱۴ھ/ ۱۷۰۲ء کو سرزمین سندھ میں فوت ہوئے ❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۱۔

❷ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۳۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۳۔

❸ تحفۃ الکرام، ص ۶۸۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

Marfat.com

۱۱۳۱۔ سید عنایت اللہ بالا پوری

سید عنایت اللہ بن محمد اللہ داد بن موسیٰ بن ظہیر الدین حسینی خجندی بالا پوری، شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ مشائخ نقشبندیہ میں سے تھے۔ شیخ ابو المظفر نقشبندی، برہان پوری (متوفی تقریباً ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۷ء) اور شیخ محمد معصوم بن شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندی (متوفی ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ/ ۷ راگست ۱۶۶۸ء) سے اخذ طریقت کیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے مشہور شہر برہان پور سے چار میل کے فاصلے پر بالا پور کے مقام کو اپنا مسکن ٹھہرالیا اور صدق و عفاف، توکل و استغنا کے ساتھ لوگوں سے منقطع ہو کر عبادت الٰہی اور افادۂ عوام میں مشغول ہو گئے۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ نوافل و ادعیہ سے متعلق عنایۃ الواصلین کے نام سے ان کی ایک تصنیف بھی ہے۔ ۱۱۱۷ھ/ ۱۷۰۵ء میں فوت ہوئے ❶۔

۱۱۳۲۔ شیخ عنایت اللہ شال کشمیری

شیخ عنایت اللہ شال کشمیری سرزمین کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ نامور علمائے کشمیر سے اکتساب علم کیا، جن میں مولانا ابو الفتح کشمیری اور مولانا عبدالرشید کشمیری شامل ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ حیدر بن فیروز چرخی کشمیری کے فرزند گرامی سے بھی استفادہ کیا۔ کم عمری ہی میں معقول و منقول کے ماہر ہو گئے، بالخصوص حدیث اور فقہ میں درجہ کمال کو پہنچے۔ حدیث رسول اللہ ﷺ سے شغف و محبت کا یہ عالم تھا کہ چھتیس مرتبہ طلبائے علم کو صحیح بخاری پڑھائی۔ مثنوی مولانا روم نہایت ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ علم و فضل میں اپنے اقران و معاصرین سے فائق تر تھے۔ اچھے شاعر تھے اور صوفیانہ انداز کے شعر کہتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ صبغت اللہ سرہندی (متوفی ۹ ربیع الاول ۱۱۲۱ھ/ ۸ رمئی ۱۷۰۹ء) سے اخذ طریقت کیا۔ سخت قسم کے موحد تھے اور توحید میں یہ سختی اپنے مرشد شیخ صبغت اللہ سرہندی کی صحبت وارشاد کا نتیجہ تھی۔

ارض کشمیر کے اس ممتاز عالم و فقیہ نے اڑسٹھ (۶۸) سال کی عمر پا کر ماہ شعبان ۱۱۲۵ھ/ اگست ۱۷۱۳ء کو سفر آخرت اختیار کیا ❷۔

۱۱۳۳۔ شیخ عنایت اللہ قادری لاہوری

شیخ عنایت اللہ لاہوری قصوری کی کنیت ابو المعارف تھی۔ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۴۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۷۲۔ محبوب ذی المنن، حصہ اول، ص ۶۱۳۔

❷ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۵۲۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۵۔ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۵۔ روضۃ الابرار، ص ۶۰۔

Marfat.com

کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں فقہ کی مشہور درسی کتاب شرح وقایہ پر ایک مفصل و بسیط حاشیہ بھی ہے۔ یہ حاشیہ دو جلدوں میں ہے اور ''غایۃ الحواشی'' کے نام سے موسوم ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی نے اپنی کتاب ''عمدۃ الرعایہ'' کے مقدمے میں جو شرح وقایہ کا حاشیہ ہے، غایۃ الحواشی کا ذکر کیا ہے اور اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے غایۃ الحواشی کا مطالعہ کیا ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور بہت سے مسائل پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ شیخ عنایت اللہ لاہوری کنز الدقائق کی بھی ایک مبسوط شرح ضبط تحریر میں لائے، جس کا نام ''ملتقط الحقائق'' رکھا۔ اس میں انھوں نے تشہد میں اشارہ سبابہ کو مسنون قرار دیا ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشہد میں انگشت شہادت اٹھاتے تے۔ صوم و صلوٰۃ اور دیگر ارکانِ اسلام اور عبادات کے بارے میں بھی ایک کتاب تصنیف کی۔ ۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۸ء میں مبحث وجود کے بارے میں ''تنقیح المرام'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

شیخ عنایت اللہ قادری نے ۱۱۴۱ھ/ ۱۷۲۹ء میں وفات پائی ❶۔

ـــــ غ ـــــ

۱۳۴۔ شیخ غلام اخی عثمانی بلگرامی

شیخ غلام اخی بن محی الدین بن محمد امجد عثمانی بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ بلگرام ہی میں تعلیم حاصل کی اور فقہ کے جلیل القدر علما میں شمار کیے گئے۔ حج و زیارت کی سعادت بھی حاصل کی۔ ''غنیۃ العلم'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو حدیث اور مسائل فقہ کا ایک مجموعہ ہے۔ علم فرائض میں ''سراجی'' ایک مشہور درسی کتاب ہے، اس کا ترجمہ کیا۔ اس عالم وفقیہ نے ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء کو بلگرام میں وفات پائی ❷۔

۱۳۵۔ سید غلام حسین اورنگ آبادی

سید غلام حسین بن شہاب الدین بن محمد بن اسحاق بغدادی ثم ہندی اورنگ آبادی، نامور عالم وفقیہ اور اپنے عصر کے مشہور شیخ تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے۔ ''جبر'' نام کے ایک شہر میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں گجرات چلے گئے تھے۔ وہاں کے اساتذۂ عصر سے علم حاصل کیا۔ پھر شیخ علی رضا بن فرخ شاہ سرہندی ثم گجراتی (متوفی ۲۱ رذی القعدہ ۱۱۴۲ھ/ ۲۷ رمئی ۱۷۳۰ء) کے دامن مشیخت سے وابستہ ہو گئے، ان

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۵۲۔ خزینۃ الاصفیا، ص ۱۸۵ تا ۱۸۷۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۵، ۱۹۶۔ مقدمہ عمدۃ الرعایہ۔

❶ نزہۃ الخواطر ج، ج ۶، ص ۱۹۸۔ بحوالہ شرائف عثمانی۔

Marfat.com

سے اخذ طریقت کیا۔ بعد ازاں اورنگ آباد کا عزم کیا اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اورنگ آباد میں سب علائق دنیا سے منقطع ہو کر زہد و عبادت میں مشغول ہو گئے۔ ان کا تمام وقت تلاوت قرآن مجید، درود شریف، تہلیل و تسبیح اور دیگر وظائف و اوراد میں گزرتا۔ منقول ہے کہ پوری عمر میں کبھی نماز باجماعت ترک نہیں ہوئی۔ اس عالم دین نے ۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۱۷۶ھ/ ۱۹؍ نومبر ۱۷۶۲ء کو اورنگ آباد (دکن) میں داعی اجل کو لبیک کہا❶۔

۱۳۶۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی

قُسامِ ازل نے برصغیر پاک و ہند کی سرزمین کو جس بہت بڑی نعمت سے نوازا، وہ علم کی فراوانی ہے۔ علم کے جو چشمے اس خطۂ ارض سے پھوٹے اور جس قدر علما و فقہا، مشائخ و صلحا، محققین و مصنفین، معلمین و مدرسین، اربابِ فضل اور اصحاب کمال یہاں پیدا ہوئے، وہ کم ہی علاقوں اور ملکوں میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ محلِ وقوع کے اعتبار سے ہندوستان مرکز اسلام سے بہت دور تھا اور صحیح معنوں میں کفرستان تھا، لیکن اس پر اللہ کے احسانِ بے پایاں کا ایسا شامیانہ سایہ فگن ہوا کہ جگہ جگہ سے قال اللہ و قال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند ہونے لگیں۔ علما سرگرم تدریس ہوئے، صلحا نے رشد و ہدایت کی مسندیں بچھائیں اور فقہا و محدثین نے قلم اور زبان سے لوگوں کی ذہنی، علمی اور روحانی تربیت کا بیڑا اٹھایا، اور بہت جلد صنم کدۂ ہند گہوارۂ اسلام کی حیثیت اختیار کر گیا۔ بت تراش، بت شکن ہو گئے اور دین و شریعت سے ناآشنا لوگ، اسلام کے داعی اور دین کے مبلغ بن کر ابھرے۔

اس سلسلے میں دیارِ ہند کے بہت سے علاقوں نے بے پناہ شہرت حاصل کی، جن میں لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح کے متعدد قصبات و دیہات خاص طور سے مشہور ہیں۔ وہاں کے جو مقامات فی الواقع مردم آفرین اور علم و فضل کے مراکز کہلائے، ان میں بلگرام کی بستی کا نام تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ نقش رہے گا۔ واقعات و حالات میں خواہ کتنی بھی تبدیلی واقع ہو اور انقلاب و تغیر کی بے شک کتنی بھی لہریں اٹھیں، تاریخ کے صفحات بلگرام کو ابدالآباد تک اپنے دامن میں محفوظ رکھیں گے۔

فقہائے ہند کی پہلی جلدوں اور زیر مطالعہ جلد میں متعدد مرتبہ بلگرام اور وہاں کے علمائے کرام کا ذکر آ چکا ہے۔ ان سطور میں ہم اس بستی کے ایک اور جید عالم اور نامور مورخ سید غلام علی آزاد بلگرامی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے قبل کہ سید ممدوح کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے، یہ بتانا ضروری ہے کہ پہلے پہل وہاں علم کی شمع کب روشن ہوئی اور خانوادۂ سادات نے کس طرح اسے اپنا مسکن ٹھہرایا۔

واسطی سادات کی بلگرام میں آمد:

واسطی سادات میں سے جو سب سے پہلے سید بلگرام میں آ کر آباد ہوئے ان کا نام سید محمد صغریٰ تھا۔ وہ

❶ محبوب ذی المنن حصہ دوم، ۵۶۲، ۵۶۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۹۔

Marfat.com

خراسان سے آئے تھے اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ احیائے سنت اور اماتت بدعت میں پیش پیش رہتے تھے اور سلطان شمس الدین ایلتتمش کے حلقہ دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ ۶۱۴ھ/ ۱۲۱۷ء میں وہ ایک فوجی کی حیثیت سے غازیان اسلام کے ساتھ بلگرام آئے۔ اس زمانے میں ایک نہایت متعصب اور مغرور وسرکش راجا بلگرام کا حکمران تھا، جس کا نام سری تھا۔ سید محمد صغریٰ اس کی سرکوبی کے لیے تھوڑی سی فوج لے کر آئے۔ معرکہ قتال گرم ہوا، اور راجا اپنے تمام اقارب واعیان کے ساتھ جنگ میں مارا گیا اور سید ممدوح نے بلگرام فتح کر لیا۔ تاریخ فتح لفظ ''خداداد'' (۶۱۴ھ) سے نکلتی ہے۔ اس کے بعد سید محمد صغریٰ نے بلگرام ہی میں سکونت اختیار کر لی اور فرشوری شیوخ اور ترکمان بھی جو ان کے ساتھ تھے، یہیں رہ پڑے۔ سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

وبعد از فتح خود با شیوخ فرشوری وترکمانان دراں مقام طرح اقامت ریخت ❶۔

(یعنی بلگرام فتح کرنے کے بعد سید محمد صغریٰ نے فرشوری شیوخ اور ترکمانوں کے ساتھ اسی جگہ کو اپنا مسکن قرار دے لیا۔)

اس زمانے میں مال گزاری کا دستور یہ تھا کہ غلے کی پیداوار کا دسواں حصہ انھیں دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ سلطان سکندر لودھی کے بیٹے سلطان ابراہیم لودھی کے عہد تک جاری رہا۔ چنانچہ اس ضمن میں فرماں روائے دہلی محمود شاہ بن محمد شاہ بن سلطان فیروز نے ایک فرمان میں جو ۲۷ر ربیع الثانی ۸۰۵ھ/ ۲۴ر نومبر ۱۴۰۲ء کا لکھا ہوا ہے اور سید غلام علی آزاد بلگرامی نے اسے دیکھا ہے، یہ الفاظ مرقوم ہیں:

''چنانچہ در عہد سلاطین ماضیہ عشرعین غلہ دادہ اند ہم براں جملہ بدہند۔'' ❷

سید غلام علی آزاد کے اسلاف پرگنہ بلگرام کے غلے کی پیداوار میں سے دسواں حصہ باقاعدہ سلطان ابراہیم لودھی کے عہد تک وصول کرتے رہے۔ لیکن جمادی الاخریٰ ۹۳۲ھ/ اپریل ۱۵۲۶ء کو جب مغل حکمران ظہیر الدین بابر نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر اسے قتل کر دیا اور اپنی حکومت قائم کر لی تو بقول آزاد بلگرامی، غلے کی وصولی کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

واز عہد بابر بادشاہ سررشتہ قدیم برہم خورد ❸۔

سید محمد صغریٰ عالم وفاضل اور صاحب دعوت بزرگ تھے۔ انھوں نے ۶۲۷ھ/ ۱۲۳۰ء میں سلطان شمس الدین ایلتتمش کے حکم سے بلگرام میں ایک بلند مقام پر شہر کے وسط میں قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ مرورِ ایام سے جب قلعے کی دیواریں ٹوٹ گئیں تو اس کے کتبے کا پتھر جس پر سلطان شمس الدین کا نام کندہ تھا، محلہ سید واڑہ کی

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۱۲

❷ ایضاً۔

❸ ایضاً۔

Marfat.com

[illegible] کی عبارت یہ ہے:

[illegible] وارث [illegible]
[illegible]
[illegible] في شهر [illegible] وعشرين [illegible]

[illegible] سید محمد [illegible] کے [illegible]
[illegible] شعبان [illegible] کو وفات پائی۔
سید غلام علی آزاد [illegible] سید محمد [illegible] کی اولاد میں سے تھے۔

سید غلام علی کی ولادت اور تعلیم و تربیت:

سید غلام علی آزاد [illegible] بلگرام میں پیدا ہوئے [illegible] سید محمد [illegible] میں پیدا ہوئے [illegible] تربیت [illegible] کتب درسیہ [illegible] بلگرامی (متوفی [illegible]) [illegible] مشہور [illegible] کی تحصیل سید محمد بلگرامی [illegible] سید [illegible] بلگرامی (متوفی [illegible]) [illegible] سید [illegible] بلگرامی [illegible] اور [illegible] کی [illegible] حدیث [illegible] سید [illegible] کی خدمت میں [illegible] اور ان سے [illegible] سید [illegible] اور ان کی خدمت [illegible] اور حدیث کی [illegible] ان سے پڑھے۔

سید [illegible] تھے [illegible]
[illegible] ہوئے [illegible]

[illegible] ①
[illegible]

① [illegible]

Marfat.com

اپنے نانا سید عبدالجلیل بلگرامی سے اکتساب علم کا ذکر آزاد اشعار میں بھی کرتے ہیں۔ ایک شعر میں کہتے ہیں:

آزاد ما کہ فضل و کمال رساند　　خدمت نمود حضرت عبدالجلیل را

فارغ التحصیل ہونے کے بعد آزاد سواد بلگرام میں واپس آئے اور پھر کافی عرصہ یہاں مقیم رہے۔ آزاد طبعاً درویش منش اور صوفی مزاج تھے، اس لیے عین عالم جوانی (ماہ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۷ھ/ جنوری ۱۷۲۵ء) میں سلسلہ چشتیہ کے مطابق میر سید لطف اللہ بلگرامی المعروف بہ شاہ لدھا (متوفی شب یک شنبہ ۱۴ر جمادی الاولیٰ ۱۱۴۳ھ/ ۱۴ر نومبر ۱۷۳۰ء) سے بیعت ہوئے اور کسب فیض کیا۔

سیر و سیاحت:

اب آزاد کی سیر و سیاحت کا دور شروع ہوتا ہے۔ ۱۱۴۲ھ/ ۱۷۳۰ء میں وہ سندھ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے ماموں سید محمد بلگرامی بادشاہ دہلی کی طرف سے سندھ کے میر بخشی اور وقائع نگار تھے، اور سندھ کا ایک شہر سیوستان ان کا صدر مقام تھا۔ آزاد ان سے ملاقات کے لیے ذی الحجہ ۱۱۴۲ھ/ جولائی ۱۷۳۰ء میں بلگرام سے نکلے اور دہلی، لاہور اور ملتان سے گزرتے ہوئے، ربیع الاول ۱۱۴۳ھ/ ستمبر ۱۷۳۰ء کے عشرہ اول میں سیوستان پہنچے۔ یعنی یہ مسافت ایک برس تین مہینے میں طے ہوئی۔ اس سے اس دور کے سفر کی مشکلوں اور دشواریوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

میر سید محمد نے آزاد کی سیوستان میں آمد کو غنیمت جانا اور انھیں اپنا قائم مقام مقرر کر کے خود اپنے وطن بلگرام کا عزم کیا۔ پورے چار سال بعد وہ سندھ واپس آئے اور سیوستان پہنچے۔ آزاد نے میر ممدوح کی سرکاری ذمہ داریاں ان کے سپرد کیں اور ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴ء میں دہلی کا رخ کیا۔ یہاں آ کر انھیں پتا چلا کہ ان کے والد اپنے اہل و عیال سمیت الہ آباد تشریف لے گئے ہیں۔ یہ بات سنتے ہی وہ آگرہ ہوتے ہوئے الہ آباد پہنچے۔ جب شہر میں داخل ہوئے تو لوگ رمضان المبارک کا چاند دیکھ رہے تھے۔ والدین سے مل کر آزاد نہایت خوش ہوئے۔ الہ آباد میں تین سال مقیم رہے۔ اس تین سال کے زمانۂ قیام میں دو مرتبہ بلگرام بھی گئے۔

قصد حج:

بلگرام کے دوسرے سفر سے الہ آباد واپس آئے تو حریم دل میں سفر حج کے شوق نے کروٹ لی۔ منقول ہے کہ عہد طفولیت کے ایک خواب میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ اس خواب کی تعبیر کے لیے نہایت بے تاب رہتے تھے۔ بالآخر چارۂ ضبط نہ رہا اور ۳ر رجب ۱۱۵۰ھ/ ۱۶ر اکتوبر ۱۷۳۷ء کو بے اختیار گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ ان کی زندگی کا نہایت ہی اہم سفر تھا۔ اس سے قبل کبھی پیادہ

Marfat.com

روی کا اتفاق نہیں ہوا تھا، لیکن اس طویل سفر پر وہ پا پیادہ ہی روانہ ہو گئے اور بغیر کسی کو اطلاع دیے چپکے سے عزم سفر کیا۔ تیسرے دن لوگوں کو ان کی روانگی کا علم ہوا۔ گھر کی عورتوں نے بالخصوص بڑی پریشانی کا اظہار کیا۔ آزاد نے متعارف اور معمول کا راستہ چھوڑ کر غیر متعارف راستہ اختیار کیا تھا کہ لوگوں کو پتا نہ چل سکے اور کوئی تعاقب میں نکلے تو پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ ان کے بھائی میر سید غلام حسن نے تین منزل تک ان کا تعاقب کیا، لیکن وہ ہاتھ نہ آئے، لہٰذا مجبوراً واپس آ گئے۔

آزاد کو غیر متعارف راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے بڑی صحرا نوردی کرنا پڑی اور اس میں انھیں بہت تکلیفیں پہنچیں۔ ایک مثنوی میں جس کو وہ طلسم اعظم کے تاریخی نام سے موسوم کرتے ہیں، ان تکلیفوں کا ذکر کیا ہے۔

یوں تو آزاد سفر حج اور قصد بیت اللہ کے لیے بہت عرصے سے بے قرار تھے، لیکن اس اثنا میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے سوزِ دل کو مہمیز لگا دی اور وہ ہر ممکن عجلت کے ساتھ عازمِ بیت اللہ ہو گئے۔ ان کے شاگرد لچھمی نارائن شفیق نے گل رعنا میں وہ واقعہ خود آزاد سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ان کے قیام الہ آباد کے زمانے میں مبارز الملک نواب سر بلند خاں صوبہ الہ آباد کے ناظم تھے۔ وہ اپنے لڑکے میر محمود خاں المخاطب بہ نواب شاہ نواز خاں کو اپنا نائب بنا کر اس عہد کے حکمران محمد شاہ کی خدمت میں دہلی گئے۔ آزاد کے والد میر سید محمد نوح بلگرامی اس زمانے میں نواب شاہ نواز خاں مذکور کی سرکار میں میر سامان تھے۔ ایک دن وہ اپنے دونوں بیٹوں، میر سید غلام حسن اور میر غلام علی آزاد بلگرامی کو نواب شاہ نواز کی خدمت میں لے گئے۔ نواب اپنے بنگلے میں بیٹھے تھے اور آزاد کے والد سید محمد نوح ان کے قریب کھڑے دستخطوں کے لیے کاغذات ان کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ یہ دونوں بھائی کچھ فاصلے پر ''سلام گاہ'' میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے کہ نواب اس طرف نگاہِ التفات کریں تو یہ انھیں آداب بجا لائیں۔ لیکن نواب دستخط کرنے میں اتنے منہمک تھے کہ دیر تک اس کا موقع نہ آیا۔ چوب داروں کا قاعدہ تھا کہ ٹھہر ٹھہر کر اپنے آقا کو اشارہ کرتے تھے، مثلاً مجرائی کے لیے بلند آواز سے کہتے: ''با ادب با قاعدہ''۔ چوب دار نے دو تین مرتبہ صدا لگائی، لیکن نواب نے ادھر عنان توجہ مبذول نہ کی۔ آزاد کہتے ہیں کہ اس صورت حال سے میری غیرت جوش میں آئی اور میں نے دل میں سوچا کہ مخلوق کے دروازے پر اس قدر لجاجت کناں ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ میں وہاں سے واپس چلا آیا۔ والد گھر آئے تو مجھ سے پوچھا کہ تم نواب کو آداب بجا لائے بغیر کیوں چلے آئے۔ آخر تمھارا کیا ارادہ ہے؟ میں نے جواب دیا، جو آپ خیال فرمائیں۔ اسی دن سے میں نے عہد کر لیا کہ جتنی جلدی ہو سکے مخلوق کے دروازے سے کنارہ کش ہو کر خالق کے دروازے پر پہنچنا چاہیے۔

آخر وہ ساعت سعید آ گئی جب آزاد کی یہ تمنا پوری ہوئی اور انھوں نے مخلوق کے دروازے سے منہ موڑ کر درِ خالق کا رخ کیا۔

Marfat.com

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، آزاد بالکل خاموشی سے اس سفر پر روانہ ہوئے تھے، کسی کو اس کی اطلاع نہ دی تھی۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ والد گرامی یا کوئی اور شخص ان کے ارادے میں حائل نہ ہوں اور وطن میں مقیم رہنے اور حکومت کی ملازمت اختیار کرنے پر اصرار نہ کریں، چنانچہ اس میں وہ کامیاب رہے اور تلاش و تعاقب کے باوجود اعزہ و اقارب کے ہاتھ نہ آئے۔ اثنائے راہ میں انھوں نے اپنے اعزہ کو ایک رقعہ لکھا، جس میں یہ شعر درج تھا:

رفتہ ام از خود چہ می پرسی دگر از حال ما   کعبہ می آید در ایں وادی باستقبالِ ما

اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ آزاد کے دل میں شوقِ حج اور زیارت کعبہ کا جذبہ کس قدر موج زن تھا۔ انھوں نے بلگرام سے سرونج تک جو حدودِ مالوہ میں واقع ہے، پا پیادہ سفر کیا، اور چوں کہ اس طرح کے مشقت آمیز سفر کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، اس لیے پاؤں میں آبلے پڑ گئے اور زمین پر قدم رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس میں ان کا رفیق سفر محض تنہائی تھا۔ صبح سے شام تک چلنے سے پاؤں خون آلود ہو گئے تھے۔ ہر طرف پہاڑ اور ناہموار جنگل تھے اور خوف اور دہشت کا منظر تھا۔ لیکن ایک سچا عاطفۂ شوق تھا جو انھیں کشاں کشاں لیے جا رہا تھا۔ اس کیفیت کو مآثر الکرام میں آزاد ان اشعار میں بیان کرتے ہیں:

می بریدم رہے بہ بے پائی   با رفیقے کہ بود تنہائی
صبح تا شام راہ می رفتم   خون چکاں تر ز آہ می رفتم
ہمہ کہسار و دشت ناہموار   قدم مورد ایں رہِ دشوار
ہر قدم رودہا و جیحونہا   چوں دم تیغ تشنۂ خونہا
موج خوناب و جوش آبلہا   ریخت در راہ رنگ سلسلہا
فکر ہا دست زد بہ دامن دل   کرد شمشیر کلفتم بسمل [1]

نواب آصف جاہ کے دربار میں:

آزاد جن دنوں علاقہ مالوہ میں پہنچے، ان دنوں نظام دکن نواب آصف جاہ مالوے میں فوجیں لیے پڑا تھا۔ نواب مذکور کے لشکریوں میں ایک نیک دل شخص نے آزاد کے حالات سے مطلع ہو کر نہایت فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ گھر لے گیا۔ اپنا مہمان بنایا اور ایک نہایت شان دار رتھ سواری کو دیا۔ ان کے علم و فضل کا شہرہ چوں کہ دور دور تک پہنچ چکا تھا، لہٰذا نواب آصف جاہ کے دربار میں ایک تقریب کا انعقاد عمل میں لایا گیا اور ۲۲ر شعبان ۱۱۵۰ھ/۴ر دسمبر ۱۷۳۷ء کو نواب سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ آزاد نے زندگی میں کبھی امرا و ملوک کی مدح میں زبان آلودہ نہ کی تھی، لیکن سفر حج کے شوق اور زیارتِ بیت اللہ کی بے تابی میں اس خود داریٔ نفس کا رشتہ

[1] مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۹۲۔

Marfat.com

ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دربار میں جا کر نواب کی مدح میں یہ رباعی پڑھی:

اے حامیٔ دین، محیط جودو احسان حق داد ترا خطاب آصف شایان
او تختِ بہ درگاہ سلیمان آورد تو آلِ نبی رابہ در کعبہ رسان

مآثر الکرام میں یہ رباعی درج کرنے کے بعد خود آزاد اس کا ذکر کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

فقیر باوصف موزونی طبع مدت العمر زبان بہ مدح اغنیانہ کشودہ ام، الا ایں رباعی کہ دراستعانت سفر بیت اللہ سرزد، ودو بیت عربی کہ در دفتر ثانی در ترجمہ نواب نظام الدولہ شہید مذکور می شود [1]۔

(یعنی اس فقیر نے شاعر ہونے کے باوجود عمر میں کبھی ارباب دولت کی مدح سرائی میں زبان نہیں کھولی۔ صرف یہی ایک رباعی ہے جو سفر بیت اللہ میں استعانت کے سلسلے میں نوک زبان پر آ گئی۔ یا مآثر الکرام کے دفتر ثانی میں جسے سرو آزاد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، نواب نظام الدولہ شہید کے حالات کے ضمن میں عربی کے دو بیت موزوں ہو گئے۔)

میدان جنگ میں:

نواب آصف جاہ اس زمانے میں مرہٹوں سے برسرپیکار تھا، جس کے نتیجے میں رمضان کا پورا مہینا یوں گزرا کہ حدودِ بھوپال میں ہر طرف آتش جنگ مشتعل اور زلزلۂ قیامت بپا تھا۔ آزاد کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

القصہ دراں حدود نواب آصف جاہ متوجہ تنبیہ افواج مرہٹہ بود، تمام رمضان در سواد شہر بھوپال آتش حرب اشتعال داشت وزلزلۂ ساعت قائم بود [2]۔

(یعنی ان دنوں نواب آصف جاہ مرہٹوں کے لشکر کی سرزنش میں مصروف تھا، بھوپال کا شہر تمام رمضان المبارک میں جنگ کی آتش خیزیوں کا مرکز بنا رہا اور پورا مہینا قیامت کی سی کیفیت طاری رہی۔ درودیوار لرزتے اور کانپتے رہے۔)

خود آزاد بھی اس موقعے پر شمشیر بدست ہوئے اور جنگ میں حصہ لیا۔ اس کا ذکرہ وہ بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں:

من ہم آں روز در صفِ اسلام با یکے ذوالفقار خون آشام
قدم پُر دلانہ آفشردم حملہ ہا بر مخالفان بردم
تشنگیہائے روزۂ رمضان کردہ از کام تا جگر بریان
سفر کعبہ و صیام و جہاد ایں سہ دولت بہم مرا روداد

---

[1] مآثر الکرام: دفتر اول، ص ۲۹۲۔

[2] ایضاً۔

Marfat.com

حج کو روانگی:

رمضان المبارک (۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء) کے آخری دنوں میں نظام الملک نواب آصف جاہ نے مرہٹوں سے صلح کر لی اور جنگ ختم ہوگئی۔ اب نواب نے دکن کو مراجعت کی اور ہر طرف سے مطمئن ہو کر آزاد کے سفر حج کے لیے خرچ اور سواری کا معقول انتظام کیا۔ بقول آزاد:

''وبہ اعانت نواب زاد وراحلہ خاطر خواہ دست بہم داد[1]۔

صاحب شرائف عثمانی کے بیان کی رو سے نواب نے پانچ سو روپے عنایت کیے، جو اس زمانے میں واقعی ''خاطر خواہ'' رقم تھی۔

اوائل شوال میں آزاد، بھوپال سے نکل کر برہان پور گئے۔ وہاں سے روانہ ہوئے تو ۱۰ر ذی قعدہ کو سورت پہنچے۔ سورت کی بندرگاہ سے ۲۴ر ذی قعدہ کو جہاز میں سوار ہو کر کرۂ خاکی سے کرۂ آبی میں داخل ہوئے۔ ۱۸ر محرم ۱۱۵۱ھ/ ۲۷ر اپریل ۱۷۳۸ء کو ان کا جہاز بندرگاہ جدہ میں لنگر انداز ہوا۔ سورت سے جدہ تک کا سفر ایک مہینا اٹھارہ دن میں طے ہوا۔

شیخ محمد فاخر سے ملاقات:

شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی (متوفی ۱۱ر ذوالحجہ ۱۱۶۴ھ/ ۱۹ر اکتوبر ۱۷۵۱ء) جو برصغیر کے سلفی العقیدہ عالم کبیر، متبع سنت، مصنف شہیر، نامور محدث وفقیہ اور بلند منزلت صوفی وشاعر تھے، اس زمانے میں وہیں قیام فرماتے۔ آزاد کے بہت قدر دان تھے۔ ان کی آمد کی خبر سن کر نہایت اشتیاق سے استقبال کو آئے۔ آزاد جہاز سے اترے تو سب سے پہلے انہی سے ملاقات ہوئی اور دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔ آزاد لکھتے ہیں:

شیخ محمد فاخر متخلص بہ زائر الہ آبادی...... در جدہ تشریف داشت، خبر قدوم فقیر از مردم جہازی کہ دو روز پیش از جہاز ما رسیدہ بود، یافتہ، برلب دریا انتظار می کشید، ہمیں کہ قدم از بحر خشکی گزاشتم ملاقات شد، وسرور عجبی دست داد[2]۔

(یعنی شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی...... جدہ میں تشریف فرماتھے، جو لوگ ہمارے جہاز سے دو دن پہلے وہاں پہنچ چکے تھے، ان سے اس فقیر کی آمد کی اطلاع پا کر ساحل سمندر پر انتظار کر رہے تھے۔ جوں ہی میں نے سمندر سے خشکی میں قدم رکھا، ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اور بے حد مسرت ہوئی۔)

مکہ مکرمہ میں حاضری:

آزاد کا دل سرزمین حجاز میں پہنچنے کے لیے انتہائی بے تاب تھا اور آنکھیں زیارت حرمین کے لیے

[1] مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۹۳، ۲۹۴۔

[2] مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۹۴۔

Marfat.com

بدرجہ غایت بے قرار تھیں۔ وہ ہر ممکن عجلت کے ساتھ جدہ سے روانہ ہوئے اور ۲۳ محرم ۱۱۵۱ھ کو مکہ مکرمہ کی ارض پاک پر قدم رکھا۔ وہاں ان کی جبینِ نیاز اپنے پروردگار کے حضور بیت اللہ میں سجدہ ریز ہوئی اور تسکین قلب و روح کا سامان بہم پہنچایا۔ خود فرماتے ہیں:

"وجبین ناز بآستان سائی بیت اللہ برافروختم۔"

حرم مقدس میں ان کے دل کے تار ہل چکے تھے اور باطن کی دنیا یک لخت بدل گئی تھی، چنانچہ سراپا عجز ہو کر ان کی زبان حق بیان سے یہ ترانہ بلند ہوا۔

الٰہی نالہ گرمی دل دیوانۂ مارا | کرامت کن نہاں آتشینی دانۂ مارا
مدہ در دست زنگارِ ہوس آئینہ دل را | زحسن خویش کن آباد حیرت خانۂ مارا
کریماں را نظر برزشتی مہمان نمی باشد | مبرا ز باغ بیروں سبزۂ بیگانۂ مارا
دریں نرم کہن از دست مردم آبرو مشکن | تو گردش دہ برنگ آسمان پیمانۂ مارا
دل مادر چراغاں تجلی رنگ می بازد | سمندر ساز و در آتش نشاں پروانۂ مارا
تہی مگزار یک دم سینہ را از جنبش آہی | بایں سنبل سراسر سبز کن ویرانۂ مارا
صریر خامۂ آزاد را شور دو عالم کن | نمک دہ از قبول خویشتن افسانۂ مارا

مدینہ منورہ میں آمد:

مکہ مکرمہ میں آزاد اس وقت پہنچے تھے، جب موسم حج گزر چکا تھا، اور اگلے سال کے حج میں کئی مہینے باقی تھے، لہٰذا صرف تین دن وہاں رہے تھے کہ دل میں مدینہ منورہ کے لیے آتشِ شوقِ زیارت بھڑک اٹھی۔ خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں:

چوں موسم حج دور بود، سہ روز در مکہ معظّمہ ماندہ رو بمدینہ منورہ آوردم وغبارِ آستانِ رسالت راکحل الجواہر چشم نیاز ساختم ❶۔

(یعنی چوں کہ زمانۂ حج ابھی دور تھا، اس لیے صرف تین دن مکہ معظّمہ میں رہ کر مدینہ منورہ کا رخ کیا اور چشم عقیدت نے غبارِ آستانۂ رسالت کو سرمہ بنایا۔)

مآثر الکرام میں رقم طراز ہیں کہ ۲۶ محرم ۱۱۵۱ھ/ ۵ مئی ۱۷۳۸ء کو مکہ معظّمہ سے مدینہ طیبہ کا قصد کیا۔ ان کی عمر اس وقت چھتیس برس کی تھی۔

از آں جا کہ شوق مدینہ سکینہ جلوہ ریز بود، طاقت صبر در خود نیافتہ بست و ششم منہ روزِ جمعہ بعد ادائے نماز جمعہ رو براہِ مدینہ مقدسہ آوردم۔ بست و پنج ماہ صفر کہ دریں تاریخ از کتم عدم بہ شہرستان ہستی وا رسیدہ ام،

---

❶ خزانہ عامرہ، ص ۱۲۵۔

Marfat.com

ومرحلہ سی وششم گزاشتم، وقت سحر از سوادِ مدینہ منورہ سرمۂ سعادت در چشم کشیدم، ودیدۂ آرزومند را برقبۂ روضۂ اقدس مالیدم ❶۔

(مکہ معظمہ سے دلِ بے قرار میں مدینہ منورہ کی شوقِ زیارت نے کروٹ لی، چنانچہ طاقت صبر نہ پاکر ۲۶/محرم کو جمعۃ المبارک کے دن، نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد مدینہ مقدسہ کی راہ اختیار کی۔ ۲۵/ ماہ صفر کو کہ اسی تاریخ کو میں جہانِ عدم سے عالم وجود میں آیا تھا اور اب چھتیس سال کی عمر کو پہنچ گیا ہوں، سحری کے وقت، سوادِ مدینہ کا سرمۂ سعادت آنکھوں میں ڈالا اور دیدۂ آرزومند کو روضۂ اقدس کے آستانۂ مبارکہ کی دید سے بہرہ مند کیا۔)

اس دور میں سفر کس قدر دشوار تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ آزاد نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ تک کی مسافت ایک مہینے میں طے کی۔

مولانا محمد حیات سندھی سے اجازۂ حدیث:

جس زمانے میں میر غلام علی آزاد مدینہ منورہ میں آئے، اس زمانے میں وہاں کشور سندھ کے جلیل القدر محدث وفقیہ اور رفیع المرتبت عالم ومصنف مولانا محمد حیات سندھی مدنی (متوفی ۲۶/صفر ۱۱۶۳ھ/۲۴/جنوری ۱۷۵۰ء) کا ہنگامۂ درس جاری تھا اور بے شمار اصحاب فضل وکمال ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ وہ سندھ کے چاچڑ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور اعمال بھکر کے موضع عادل پور کے باشندے تھے۔ عنفوان شباب ہی میں حجاز تشریف لے گئے تھے اور مدینہ منورہ میں متوطن ہو گئے تھے۔ آزاد اگرچہ ہندوستان کے متعدد باکمال علما اور فاضل اساتذہ سے تحصیل کر چکے تھے اور اہل علم کے نزدیک بڑی قدر ومنزلت کے مالک تھے، لیکن تشنگی علم ہنوز باقی تھی اور وہ سیرابی ذہن وفکر کے مزید سامان تلاش کر رہے تھے۔ چنانچہ مدینہ منورہ پہنچے تو مولانا محمد حیات کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ ان سے صحیح بخاری پڑھی اور صحاح ستہ کی سند لی۔ مولانا ممدوح کا آزاد نہایت احترام سے نام لیتے اور ان کے فضل وکمال کا فراخ دلی سے اعتراف کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

در شہور اقامت ایں بلدۂ طیبہ صحیح بخاری را خدمت مولائی واستاذی شیخ محمد حیات السندی المدنی نور اللہ ضریحہ سند کردم واجازتِ صحاح ستہ وسائر مفردات مولانا برگرفتم ❷۔

(یعنی جن مہینوں میں مجھے مدینہ کے بلدۂ طیبہ میں اقامت کا موقع ملا، میں نے مولائی واستاذی شیخ محمد حیات سندھی مدنی (اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے) کی خدمت میں حاضر ہو کر صحیح بخاری کا درس لیا اور صحاح

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۹۴۔

❷ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۹۴۔

Marfat.com

ستہ کی سند و اجازہ کا شرف حاصل کیا۔)

اس زمانے میں آزاد کا یہ معمول تھا کہ اکثر راتوں کو مسجد نبوی میں جا کر منبر رسول ﷺ کے قریب بیٹھ جاتے اور صحیح بخاری کا مطالعہ کرتے۔ ان دنوں ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے:

نمود جلوۂ اعجاز شمع مطلبی ۔۔۔ نماند شوخی چشم شرار بولہبی

چند روز کم آٹھ مہینے مدینہ منورہ میں قیام رہا۔

مکہ مکرمہ کو روانگی:

آزاد ۲۵ر صفر ۱۱۵۱ھ/ ۳ر جون ۱۷۳۸ء کو مدینہ شریف آئے تھے۔ ۱۴ر شوال ۱۱۵۱ھ/ ۱۴ر جنوری ۱۷۳۹ء کو قصد حج سے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ روانگی کے وقت وہ جس قلبی کیفیت سے دوچار تھے اور جو حالت ان پر طاری تھی، اس کا تذکرہ انھوں نے نہایت مؤثر انداز اور رقت آمیز الفاظ میں سبحۃ المرجان میں کیا ہے❶۔

بارہ دن کے بعد ۲۶ر شوال کو وہ مکہ معظّمہ پہنچے۔ یہاں مناسک حج کی ادائیگی کے ساتھ تحصیل علم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ مکہ معظّمہ میں انھوں نے شیخ عبدالوہاب طنطاوی مصری سے جو اس دور کے مشہور محدث ہو گزرے ہیں، فن حدیث میں استفادہ کیا۔ آزاد لکھتے ہیں کہ جب شیخ عبدالوہاب کو میرے تخلص کا علم ہوا اور مجھ سے لفظ آزاد کے معنی سمجھے تو فرمایا: یا سیدی انت من عتقاء الله❷۔

۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹ء کے سال کا آغاز ان کو مکہ معظّمہ ہی میں ہو گیا تھا۔ چار مہینے سے زیادہ عرصہ وہ اس مقدس شہر میں مقیم رہے اور اس اثنا میں فریضۂ حج ادا کیا۔

ماہ ربیع الاول میں وہ مکہ مکرمہ سے طائف کی سیر کے لیے نکلے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے مرقد پر پہنچے۔ وہاں ان اشعار میں اپنے جذبۂ اخلاص کا اظہار کیا:

اے صبا روبہ مزار پسر عم نبی ۔۔۔ خاکِ آں روضہ کم از عنبر ترشنانی

کردہ ام خوب تماشا چمن طائف را ۔۔۔ نہ رسد ہیچ گلِ او بہ گلِ عباسی

آخر ربیع الثانی ۱۱۵۲ھ/ جولائی ۱۷۳۹ء میں وہ طائف سے مکہ مکرمہ واپس آئے اور طواف وداع کرنے کے بعد جدہ کو روانہ ہوئے۔

مراجعت ہند:

۳ر جمادی الاولیٰ ۱۱۵۲ھ/ ۲۸ر جولائی ۱۷۳۹ء کو آزاد مراجعت ہند کی غرض سے بندرگاہ جدہ سے

---

❶ دیکھیے، سبحۃ المرجان، ص ۱۲۰۔

❷ سرو آزاد، ص ۲۹۴۔

Marfat.com

جہاز میں سوار ہوئے، چھبیس روز کے بعد ۲۹ر جمادی الاولیٰ کو ان کا جہاز سورت پہنچا۔ ۲ر جمادی الاخریٰ کو وہ شہر سورت میں داخل ہوئے۔

آزاد اپنی تصنیف ''ید بیضا'' میں وطن واپسی کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ''اہل وعیال، بالخصوص والدین کی محبت مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی اور اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وطن جا کر ان کی خدمت کروں اور مجھ پر جو ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کرنے کا فرض انجام دوں۔'' لیکن یہ عجیب بات ہے کہ سورت پہنچ کر وہ فوری طور پر وطن نہیں گئے بلکہ پانچ مہینے سے بارہ تیرہ دن اوپر وہیں مقیم رہے۔ پھر وہاں سے نکلے تو دکن کا رخ کیا۔ شرائف عثمانی کے دیباچے میں شیخ غلام حسن ثمین ان کے دکن جانے کے بارے میں اس امکان کا اظہار کرتے ہیں کہ نظام الملک نواب آصف جاہ نے آزاد کو حج کے لیے رخصت کرتے وقت ان سے یہ استدعا کی تھی کہ واپسی پر اسی (دکن کے) راستے سے آئیں۔ ممکن ہے، سورت پہنچ کر انھیں نظام الملک کی یہ استدعا یاد آ گئی ہو، اور جذبۂ احسان مندی نے دکن جانے پر مجبور کر دیا ہو۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو مسلسل ساڑھے پانچ مہینے سورت میں کیوں رکے رہے؟ سب سے پہلے انھیں دکن جانا چاہیے تھا۔

دکن کو روانگی:

۱۱ر ذوالقعدہ ۱۱۵۲ھ/ ۲۹ر جنوری ۱۷۴۰ء کو وہ سورت سے دکن کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۷ر ذوالقعدہ کو اورنگ آباد پہنچے۔ وہاں انھوں نے بابا شاہ مسافر نقشبندی کی خانقاہ میں قیام کیا۔ اس خانقاہ میں آزاد نے مختلف اوقات میں سات سال کا طویل عرصہ گزارا۔ پہلی دفعہ کم وبیش دو سال مقیم رہنے کے بعد ۲ر رمضان ۱۱۵۴ھ/ ۳۱ر اکتوبر ۱۷۴۱ء کو اورنگ آباد سے نکلے اور قلعہ محمد آباد، بیدر، خاندیش، اور برار وغیرہ کی سیاحت کرتے ہوئے اس شہر میں پہنچے جو دکن کے سلاطین بہمنیہ کا دار السلطنت رہ چکا تھا۔ اس شہر کا حال بیان کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں کہ اب یہ شہر خستہ حالت میں ہے اور بڑی بڑی شاہی عمارتیں کھنڈروں میں بدل چکی ہیں، جو دیکھنے والوں کے لیے سامانِ عبرت پیدا کرتی اور دنیا کی ناپائداری کا مرثیہ پڑھتی ہیں۔

۴ر محرم ۱۱۵۵ھ/ ۲۷ر فروری ۱۷۴۲ء کو وہ حیدر آباد میں وارد ہوئے۔ حیدر آباد کی وہ بہت تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس شہر کی عمارتیں بڑی عمدہ ہیں۔ شاہ راہیں کشادہ ہیں۔ یہاں پانی کی فراوانی ہے۔ درخت اور کھیت شاداب ہیں۔ ۱۹ر صفر تک وہ حیدر آباد میں مقیم رہے اور ۱۵ر جمادی الاولیٰ کو اورنگ آباد لوٹے۔

نظام الدولہ ناصر جنگ سے انسلاک:

۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء میں نظام الملک نواب آصف جاہ نے اپنے بیٹے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کو اورنگ آباد کی صوبے داری پر مامور کیا۔ ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں آزاد کی اس سے ملاقات ہوئی۔ شفیق ''گل رعنا''

Marfat.com

میں لکھتے ہیں کہ نواب نظام الدولہ سے اس ملاقات کی وجہ ایک دن آزاد نے ان سے یہ بیان کی کہ حجاز سے واپس آنے کے بعد میں سورت ہوتا ہوا، اورنگ آباد پہنچا۔ یہاں میں نے دس سال توکّل میں گزار دیے۔ اب میری عمر چالیس سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ قوائے جسمانی میں کمزوری کے آثار نمایاں ہو گئے تھے اور لازمی ضروریات کے لیے اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج سمجھنے لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب توکل سے کام نہیں چل سکتا۔ انھی ایام میں نواب نظام الدولہ نے مجھ سے رفاقت وانسلاک کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اسے قبول کر لیا۔

اس سلسلے میں شفیق مزید لکھتے ہیں کہ اس کے بعد آزاد نے فرمایا کہ ''نواب نظام الدولہ کی رفاقت اختیار کرنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ کسی ایک شخص کے حلقۂ ملازمت میں رہنا، توکل کی زندگی اختیار کرنے سے بہتر ہے۔ کیونکہ بہ نسبت ہزار لوگوں پر نظر رکھنے کے ایک ہی شخص پر نظر رکھنا زیادہ اولیٰ ہے۔ جب ہر طرف سے نظر ہٹ کر ایک ہی شخص پر مرکوز ہو جاتی ہے تو یہ چیز جمعیت قلب اور سکونِ خاطر کا باعث بنتی ہے۔'' اور ہر کام خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی بلا کسی تشویش کے پورا ہو جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں بھی آزاد نے اسی نقطۂ فکر کا اظہار کیا ہے:

توکل را نظر ہر روز بر تو خدمتے باشد   ہماں بہتر کہ ایں کس یار صاحب دولتے باشد
اگر بستی میاں را در کشادہ کار محتاجاں   تقرب با خدا وندانِ دولت طاعتے باشد
سواد فکر را از پرتوِ دولت چراغاں کن   تر ازیں جامعیت با سلیمان نسبتے باشد

توکل کے بارے میں آزاد کی اس تعبیر سے ہر شخص کو اتفاق نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے، آزاد کے ذاتی حالات بہت زیادہ پریشان کن نوعیت اختیار کر گئے ہوں اور کئی قسم کی پریشانیاں ان پر مسلط ہو گئی ہوں، یا ان کی افتادِ طبع ہی ایسی ہو جس نے انھیں توکل سے منہ موڑ کر ایک صاحب دولت سے وابستہ ہونے پر مجبور کر دیا ہو۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، ایک عالم دین اور صاحب فضل و کمال کا شیوہ یہی ہے کہ وہ اللہ پر توکل رکھے اور اسی کو کارساز سمجھے۔ سرکار سے وابستگی اور امرا سے انسلاک شرعاً ممنوع نہیں ہے، تاہم توکل، اللہ ہی پر رکھنا چاہیے، وہ انسان کے مناسب حال کوئی بہتر صورت پیدا کر دیتا ہے۔

بہرحال نواب نظام الدولہ ناصر جنگ، حسن اخلاق کا مالک اور اہل علم کا قدر دان تھا۔ اسی بنا پر وہ آزاد کا بہت مداح اور ان کے علم و فضل اور فہم و فراست کی وجہ سے ان کی بہت تکریم کرتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں نواب نظام الملک آصف جاہ نے اسے حیدر آباد طلب کیا تو نظام الدولہ نے آزاد کو بھی ساتھ جانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ وہ اس کی معیت میں ۲۷/ ذوالقعدہ ۱۱۵۹ھ/ ۳۰/ نومبر ۱۷۴۶ء کو اورنگ آباد سے چلے اور سری رنگ پٹن تک سیاحت کی، جو کہ مہاراجا میسور کی عمل داری میں واقع تھا۔ ماہ صفر ۱۱۶۱ھ/ فروری ۱۷۴۸ء میں وہ اورنگ آباد واپس آئے۔

Marfat.com

حج ثانی کا خیال اور اس کا ترک:

اسی سال رمضان المبارک کے مہینے میں آزاد کے دل میں دوبارہ عرب جانے کا خیال کروٹ لینے لگا۔ وہ لکھتے ہیں:

درعشرۂ اخیر رمضان ۱۱۶۱ھ/ستمبر ۱۷۴۸ء مزاج بندہ راوحشتے بہم رسید، بخاطر افتاد کہ از ہمہ قطع نظر باید کرد و بار دیگر سری بہ دیار عرب باید کشید ❶۔

(یعنی رمضان ۱۱۶۱ھ/ستمبر ۱۷۴۸ء کے عشرۂ آخر میں میرے مزاج میں ایک شورش سی پیدا ہوئی اور دل نے چاہا کہ تمام امور سے قطع تعلق کر کے دوبارہ دیار عرب کو جانا چاہیے۔)

لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ کیوں؟ اس کی وجہ وہ خود ہی بیان کرتے ہیں۔

ناگاہ شب بیست و ہفتم ماہ مذکور، طرف سحر، درعالم رویا اندیشہ ام متوجہ شعر گردید، بیتے موزوں ساختم، ومعاً از خواب بیدار شدم، بیت بیاد ماند و آں اینست۔

چہ خوش گفت گویندۂ نامدار مکش دست از دامن روزگار

لختے بتامل رفتم، دانستم کہ گویندہ سروش غیبی است ومخاطب بندہ، امتثال امر غیب واجب دیدم وارادۂ کہ تصمیم یافتہ بود، فسخ نمودم، وسرّ الہام آنست کہ حجے کہ فرض بود، پیش ازیں بتقدیم رسید، اگر دست از دامن علائق ظاہری می کشیدم وبہ تحصیل نافلہ شتافتم، چندیں حقوق واجب الادا فوت می باشد۔

ترک واجب نتواں کرد پے نافلہا ❷۔

(یعنی ۲۷/ رمضان المبارک کی شب کو سحری کے وقت جب کہ میں سویا ہوا تھا، اچانک خواب میں فکر شعری بیدار ہوا، اور توجہ ادھر منتطف ہوئی۔ ایک شعر موزوں ہوا، اور معاً آنکھ کھل گئی۔ وہ شعر مجھے یاد ہے، جو یہ ہے:

چہ خوش گفت گویندۂ نامدار مکش دست از دامن روزگار

کہ کہنے والے نے یہ کیا خوب بات کہی ہے کہ دامن روزگار سے ہاتھ نہ کھینچو۔

تھوڑی دیر کے لیے میں سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر سمجھا کہ کہنے والا آواز غیبی ہے اور مخاطب یہی بندہ (آزاد) ہے۔ امر غیب کو ماننا میرے نزدیک ضروری ہے۔ چنانچہ وہ ارادہ جسے میں پختہ کر چکا تھا، فسخ کر دیا۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جو حج فرض تھا، وہ میں پہلے کر چکا۔ اب اگر علائق ظاہری سے دامن کشاں ہوں گا اور حصول نفل کے لیے سرگرداں ہوں گا تو اس سے وہ حقوق فوت ہو جائیں گے، جن کا ادا کرنا مجھ پر واجب ہے۔ اور نوافل کے لیے واجب کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔)

---

❶ سرو آزاد، ص ۲۹۳۔

❷ سرو آزاد، ص ۲۹۲۔

Marfat.com

آزاد کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔ حج زندگی میں ایک ہی مرتبہ فرض ہے۔ علائق ضرور یہ کو ترک کر کے دوبارہ قصد حج کرنا حقوقِ واجب الادا سے صرفِ نظر کرنے کے مترادف ہے۔

برہان پور اور حیدر آباد وغیرہ کے سفر:

۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء میں آزاد نے دوسری مرتبہ برہان پور کا سفر کیا۔ اسی سال وہ ۱۴ر شوال کو ارکاٹ گئے اور ایک سال چند مہینے وہاں رہے۔ ۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۱ء میں نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کی شہادت کے بعد وہ اورنگ آباد چلے گئے۔ ۱۱۵۶ھ/ ۱۷۵۲ء میں نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں حیدر آباد گئے تو انھیں بھی ساتھ لے گئے۔ ۹ر رجب کو اورنگ آباد سے چلے اور ۷ر شعبان کو حیدر آباد پہنچے۔ پھر ۱۶ر ذوالقعدہ کو حیدر آباد سے نکلے اور ۵ر ذی الحجہ کو اورنگ آباد لوٹے۔ بعد ازاں ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء میں بھی آزاد حیدر آباد گئے اور ۱۱۶۸ھ/ ۱۷۵۵ء میں اورنگ آباد واپس آئے۔

جوان بیٹے کا انتقال:

آزاد کے ایک ہی بیٹے تھے اور سید نور الحسن ان کا نام تھا۔ وہ اپنے وطن بلگرام میں رہتے تھے اور بلگرام کے ایک تالاب میں غسل کرتے ہوئے عین عالم جوانی میں غرق ہو گئے تھے۔ یہ حادثہ ۱۱۶۸ھ/ ۱۷۵۵ء میں پیش آیا۔ آزاد کے لیے یہ نہایت غم انگیز حادثہ تھا۔ جوان بیٹے کی وفات پر انھوں نے دردناک مرثیہ لکھا، جس کا ایک شعر یہ ہے:

قیامت برسرایں بوستان رفت که یک گل داشت آں ہم نوجواں رفت

(اس باغ پر قیامت گزر گئی، جس کا ایک ہی پھول تھا اور وہ بھی جوان)

اس حادثے کے بعد آزاد کی سیر وسیاحت کی تفصیل نہیں ملتی۔ ممکن ہے پھر انھوں نے زیادہ سفر نہ کیا ہو۔ ایک تو نوجوان بیٹے کی موت کا حادثہ انتہائی سخت تھا، دوسرے ان کی عمر اس وقت باون (۵۲) سال کی ہو چکی تھی اور وہ کہولت کی منزل میں داخل ہو گئے تھے، اس لیے ہو سکتا ہے، سیر وسیاحت کا سلسلہ ختم کر دیا ہو۔ خیال یہ ہے کہ ان کا حیدر آباد کا مذکورہ بالا سفر آخری تھا۔ اس کے بعد وہ اورنگ آباد ہی میں مستقل طور پر رہنے لگے تھے، اس سے باہر نہیں گئے۔ چنانچہ ۱۱۸۱ھ/ ۱۷۶۷ء میں ''گل رعنا'' میں لچھمی نرائن شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد اورنگ آباد میں سکونت پذیر ہیں:

خود آزاد کا اپنا بیان بھی یہی ہے۔

چند بار بہ تماشائے اطراف ملک دکن برخاستم، اکنوں در دار الامن اورنگ آباد گوشہ گیرم ❶۔

❶ خزانہ عامرہ، ص ۱۲۵۔

Marfat.com

(یعنی کئی دفعہ ملک دکن کے اطراف و جوانب کی سیر و سیاحت کا لطف اٹھایا، لیکن اب اورنگ آباد کے دارالامن میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گیا ہوں۔)

ایک اہل علم ولیم چیمبرز تھے، جو آزاد کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے آزاد کی مشہور تصنیف ''خزانہ عامرہ'' کے بعض حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں:

(آزاد) اس وقت تک اورنگ آباد دکن میں بقید حیات ہیں اور سالہا سال تک علمی و ادبی مشاغل اور سیر و سیاحت میں مصروف رہنے کے بعد اب عزت و احترام اور کسی قدر ٹھاٹھ کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر پچاسی (۸۵) برس ہے، موجودہ نظام حیدر آباد دو بار ان سے ملنے اورنگ آباد آ چکے ہیں۔

ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ اورنگ آباد میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ خود نظام دکن ان کا بے حد احترام کرتا اور ملاقات کے لیے آتا تھا۔ اس شہر کے لوگوں اور اس کے در و دیوار سے آزاد بہت مانوس ہو گئے تھے اور اسی شہر کو جسے وہ دارالامن قرار دیتے ہیں، اپنا مستقل مسکن ٹھہرا لیا تھا۔

آزاد نے زندگی میں بہت سفر کیے اور مختلف مقامات کی سیاحت کو گئے، لیکن اس سے ان کا مقصد مال و دولت جمع کرنا ہرگز نہ تھا، فقط ایک شوق تھا جو انھیں جگہ جگہ لیے پھرتا تھا۔ خود لکھتے ہیں:

حق سبحانہ، علیم است کہ ہلال وار مقصود ازیں سیر و سفر نہ تن پرور باشد، حاشا وکلّا بلکہ مانند بدر منظور شکست نفس بود[1]۔

(خدا گواہ ہے کہ اس سیر و سیاحت سے میرا مقصد ہلال کی طرح تھا، جو طلوع ہونے کے بعد نمایاں تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ تن پروری و خود نمائی نہ تھا بلکہ بدر کی مانند جو کمال پر پہنچنے کے بعد رو بزوال ہو جاتا ہے، خواہش شکست نفس تھی۔)

بہر کیف آزاد کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزرا اور انھوں نے دیار ہند کے متعدد شہروں اور علمی مرکزوں کا مختلف تقریبات کے سلسلے میں سفر کیا۔ ان کی بعض تصانیف کا آغاز اور اختتام بھی سفر اور سیاحت ہی کے دوران میں ہوا۔ آئندہ سطور میں ہم ان تصانیف کا ذکر کریں گے، جو کئی عنوانات پر مشتمل ہیں اور عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں۔

تصانیف:

آزاد کی تصانیف کا تذکرہ کرنے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ ان کی تصانیف سرزمین برصغیر میں اپنی نوعیت کی اولیں تصانیف ہیں۔ فن رجال اور علم تاریخ سے مسلمانوں کو ہمیشہ خاص لگاؤ اور تعلق خاطر رہا ہے، لیکن اسے ایک علمی حادثہ کہنا چاہیے کہ برصغیر میں اہل علم کی بہت بڑی اکثریت کے باوجود اس موضوع کو کسی

---

[1] سرو آزاد، ص ۲۹۵۔

Marfat.com

نے بھی لائق التفات نہ گردانا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس خطہ ارض کے بے شمار اصحاب علم اور ارباب کمال کے حالات گم نامی کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔ اس نواح میں آزاد پہلے عالم اور اولین مصنف ہیں، جنھوں نے اس اہم موضوع کو ہدف فکر ٹھہرایا اور اس سرزمین کے علما وفضلا کے حالات ہمیشہ کے لیے صفحات قرطاس میں محفوظ کر دیے۔ انھوں نے اس اولیت پر متعدد مقامات میں اظہار فخر کیا ہے اور بلاشبہ اس فخر میں وہ حق بجانب ہیں۔ اب تصانیف کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

۱۔ ید بیضا: یہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے اور آزاد کی پہلی تصنیف ہے۔ یہ کتاب سیوستان (سندھ) کے زمانۂ قیام میں لکھی گئی جو ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۳ء میں مکمل ہوئی۔ اہل سیوستان نے آزاد سے اس کی کئی نقلیں لیں۔ ایک شخص اس کا ایک نسخہ دہلی بھی لے گیا تھا۔ آزاد جب سیوستان سے اپنے وطن بلگرام جاتے ہوئے لاہور آئے تو یہاں ان کی ملاقات محمد فقیر اللہ آفرین لاہوری سے ہوئی۔ انھوں نے بڑی خواہش کا اظہار کر کے ''ید بیضا'' کا ایک نسخہ ان سے لیا۔

ید بیضا کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور اہل ذوق میں یہ اتنی جلد مقبول ہوئی کہ متعدد مقامات میں پھیل گئی۔ لیکن الہ آباد کے زمانۂ قیام میں، آزاد کو ''موادتازہ'' میسر آیا اور انھوں نے اس کا پہلا نسخہ منسوخ کر کے ایک نیا نسخہ مرتب کیا۔ یہ نسخہ ۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۵ء میں مکمل ہوا۔ آزاد نے ''طبع کلیم ید بیضا نمود'' اس کی تاریخ کہی۔

علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ انھوں نے ''اس کتاب کا اصلی مسودہ خود آزاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے[1]۔''

ید بیضا کا قلمی نسخہ پبلک لائبریری پٹنہ (بہار۔ ہندوستان) میں موجود ہے۔

۲۔ روضۃ الاولیا: یہ کتاب خلد آباد کے اولیائے کرام کے حالات میں ہے، اور ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء میں اس زمانے میں لکھی جب وہ برہان پور کی سیر کو گئے۔

۳۔ شمامۃ العنبر فی ماورد فی الھند من سید البشر: یہ کتاب آزاد نے ۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء میں ان دنوں تصنیف کی جب وہ دوسری مرتبہ برہان پور گئے۔ تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں ہند کا جو ذکر آیا ہے، وہ اس رسالے میں جمع کر دیا گیا ہے۔

۴۔ مآثر الکرام: حج بیت اللہ کے لیے جانے سے پہلے آزاد نے اپنے وطن بلگرام کے علما وفضلا اور قرا وشعرا کے حالات ضبط تحریر میں لانا شروع کیے تھے۔ اس کا کچھ حصہ وہ قلم بند بھی کر چکے تھے کہ ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء میں حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہو گئے اور یہ اہم کام درمیان ہی میں رہ گیا۔ حرمین سے واپس آنے کے بعد جب دکن میں مستقل طور پر قیام فرمایا تو وہ نامکمل مسودہ وطن سے منگوا کر اس کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ یہ مسودہ دو جلدوں میں مکمل کیا گیا۔ ایک جلد مآثر الکرام کے نام سے موسوم ہے اور دوسری سرو آزاد کے نام سے۔ پھر مآثر الکرام کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا۔ حصہ اول جسے وہ فصل اول کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، ۸۱ فقرا و مشائخ

---

[1] مقالات شبلی، ج ۵ ص ۱۲۵۔

Marfat.com

کے حالات پر مشتمل ہے۔ حصہ ثانی جسے فصل ثانی کہا جاتا ہے، اے فضلا کے حالات وکوائف پر محیط ہے۔

۵۔ سروِ آزاد: جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، یہ کتاب مآثر الکرام کی جلد ثانی ہے، اور شعرا کا تذکرہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں یا دونوں جلدیں ۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ یہ کتابیں صرف بلگرام کے اہل علم کے حالات تک محدود نہیں ہیں بلکہ ارضِ ہند کے بعض دیگر علما وفضلا کے سوانح بھی ان میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کتابوں کو بنیادی کتب حوالہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ آزاد نے یہ کتابیں معرض تصنیف میں لاکر بہت بڑی علمی اور تحقیقی خدمت انجام دی ہے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ آزاد کی ان کتابوں پر بلگرام کے بعض حضرات نے اعتراضات بھی کیے اور ان کے جواب اور تردید میں آزاد ہی کے ایک ہم وطن شیخ غلام حسن ثمین صدیقی نے شرائف عثمانی کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ شیخ غلام حسن ثمین نے ان کتابوں کے بارے میں شرائف عثمانی کے مقدمے میں جو الفاظ لکھے ہیں، ان کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

''جب آزاد نے اپنی دو کتابوں، مآثر الکرام اور سروِ آزاد، دکن سے بلگرام بھیجیں اور وہ بلگرام کے فضلا ورؤسا کی نظر سے گزریں تو وہ بڑے حیران ہوئے، کیوں کہ مآثر الکرام کے اکثر بیانات ''تاریخ واسناد وحقائق وفرامین'' کے خلاف تھے۔ اس کتاب کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ''ساقط از اعتبار'' ہے۔ آزاد کے ماموں اور استاد سید محمد بلگرامی سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے اس سلسلے میں آزاد سے دریافت کیا، وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔''

غلام حسین ثمین صدیقی نے شرائف عثمانی میں آزاد کی تاریخی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔

مآثر الکرام اور سروِ آزاد کے جواب اور تنقید میں ایک اور کتاب ''تحقیق السداد فی مزلات الآزاد'' لکھی گئی۔ یہ کتاب ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء میں بلگرام کے ایک غیر معروف شاعر محمد صدیق سخنور عثمانی نے لکھی۔ اس کتاب میں آزاد کی تاریخی غلطیوں کو واضح نہیں کیا گیا بلکہ ان کے اسلوب بیان اور شاعری کو ہدف تنقید ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کتاب کی وجہ تالیف ذاتی مخاصمت ہے اور اس کا لب ولہجہ نہایت درشت ہے۔ اس کے جواب میں آزاد کے ایک شاگرد عبدالقادر سمرقندی دہلوی نے ''تادیب الزندیق فی تکذیب الصدیق'' کے نام سے کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب بڑی متانت اور معقولیت سے لکھی گئی ہے اور مصنف کا انداز واسلوب بہت عمدہ ہے۔

۶۔ خزانہ عامرہ: سید غلام علی آزاد نے شعرائے فارسی کے دو تذکرے لکھے، ید بیضا اور سروِ آزاد۔ لیکن یہ تذکرے عام نوعیت کے تھے۔ ان سے شعرا کے کسی خاص طبقے کی وضاحت نہیں ہوتی تھی۔ آزاد کے بھتیجے میر سید اولاد محمد نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ایک ایسا تذکرہ مرتب کیا جائے جو صرف ان شعرا کے حالات پر محتوی ہو، جنھوں امرا اور ارباب ثروت کی مدح گستری کی ہو اور اپنے ممدوحین سے اس کا صلہ پایا ہو۔ آزاد اپنے اس بھتیجے کو بہت عزیز سمجھتے تھے، اس لیے آمادہ ہوگئے، اور ''خزانہ عامرہ'' کے نام سے ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء

Marfat.com

میں یہ تذکرہ معرض تصنیف میں آیا۔ اس کا قطعہ تاریخ خود آزاد نے کہا:

آزاد رقم نمود نو تذکرہ — در حبیب ورق ریخت نقوۂ سرہ
گنجور خرد گہر تاریخ فشاند — حق دادہ عجب خزانۂ عامرہ

خزانۂ عامرہ میں ہندوستان اور ایران کے ایک سو پینتیس شعرا کے علاوہ نظام الملک آصف جاہ، نظام الدولہ ناصر جنگ، امیر الممالک سید محمد خاں اور بعض دیگر معاصر امرا کے حالات اور مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کی جنگ کی روداد بھی بہترین انداز سے قلم بند کی گئی ہے۔ یورپین مؤرخین، اس کے مستند تاریخی مواد کی وجہ سے اس کو قابل اعتنا گردانتے ہیں۔ خزانہ عامرہ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء کی تصنیف ہے جب کہ آزاد کی عمر اکسٹھ برس کی ہو چکی تھی۔

۷۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: یہ کتاب عربی زبان میں ہے جو آزاد نے ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۴ء میں تصنیف کی۔ کتاب چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں یہ تفصیل بیان کی ہے کہ احادیث و تفاسیر میں ہندوستان کا ذکر کہاں کہاں ہوا ہے اور کس انداز سے ہوا ہے۔ درحقیقت شمامۃ العنبر فی ماورد فی الھند من سید البشر کو جس کا تعارف اوپر کی سطور میں ہو چکا ہے، فصل اول میں شامل کر لیا گیا ہے۔ دوسری فصل علمائے ہند کے حالات میں ہے۔ یہ فصل بھی زیادہ تر آزاد کی ایک اور تصنیف ''تسلیۃ الفواد'' سے ماخوذ ہے۔ تیسری فصل محسنات کلام یعنی صنائع بدائع سے متعلق ہے۔ چوتھی فصل میں عاشق و معشوق کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے ہندوستانی موسیقی اور اس کی اقسام پر بھی مفصل بحث کی ہے۔

۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء میں یہ کتاب بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں یہ کتاب مصر میں بھی طبع ہوئی۔

سبحۃ المرجان کے تیسرے اور چوتھے باب کا ترجمہ خود آزاد نے ۱۱۷۹ھ/ ۱۷۶۵ء میں غزلان الہند کے نام سے فارسی میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ انھوں نے اپنے دوست اور شاگرد عبدالقادر مہربان اور لچھمی نرائن شفیق کی فرمائش پر کیا تھا۔ لیکن خود لچھمی نرائن شفیق اپنی تصنیف گل رعنا میں لکھتے ہیں کہ آزاد نے یہ ترجمہ عبدالقادر مہربان کی خواہش پر کیا تھا۔

سبحۃ المرجان کے پہلے اور دوسرے باب کا فارسی ترجمہ بنارس کے راجا مہاراج ایسری پرشاد کی فرمائش پر سید شمس الدین بن شاہ وارث علی حسنی حسینی بنارسی نے کیا تھا۔ سید شمس الدین بنارسی اس زمانے میں راجا نندکور کے حلقۂ ملازمت میں شامل تھے۔

۸۔ مآثر الامرا: آزاد کے علمی اور تحقیقی کاموں میں مآثر الامرا کا تذکرہ نہایت ضروری ہے۔ مآثر الامرا موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے فن تاریخ میں بقول علامہ شبلی ''ایسی کتاب ہے، جس کی نظیر عربی زبان میں بھی

Marfat.com

باوجود اس وسعت اور فراوانیٔ مواد کے موجود نہیں۔'' اس کتاب کی تصنیف کا آغاز صمصام الدولہ شاہ نواز خاں نے کیا تھا جو نظام دکن کے مورثِ اعلیٰ نظام الملک آصف جاہ کے امرائے سلطنت میں سے تھے۔ شاہ نواز خاں صرف اس موضوع پر کتاب لکھنا چاہتے تھے کہ بابر کے زمانے سے عہد مغلیہ کے آخر تک جو بھی عہدہ دارانِ مملکت گزرے ہیں، ان سب کے حالات ضبط تحریر لائے جائیں۔ چنانچہ ''مآثر الامرا'' کے نام سے کتاب کی ترتیب وتدوین کا سلسلہ شروع کیا جو پورے پانچ برس جاری رہا۔

امیر صمصام الدولہ شان نواز خاں کا علمی پایہ بلاشبہ اس قدر بلند تھا کہ وہ اس قسم کی کتاب کی تصنیف سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے، لیکن امارت میں جو آرام طلبی کے لوازم پائے جاتے ہیں، وہ کتاب کی تکمیل میں مانع تھے۔ امیر موصوف خود بھی اس مجبوری کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے حالات کا جائزہ لے کر سید غلام علی آزاد بلگرامی کو یاد کیا۔ آزاد ان دنوں اپنے وطن بلگرام میں تھے۔ وہیں قاصد بھیجا اور پورا سامانِ سفران کے لیے مہیا کیا۔ مسودۂ کتاب کس درجے ترتیب کا طالب اور سخت محنت کا متقاضی تھا، اس کا اندازہ علامہ شبلی مرحوم کے مندرجہ ذیل الفاظ سے ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے حیدر آباد میں خود آزاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط دیکھا ہے، جس میں وہ ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ نواب صمصام الدولہ نے مآثر الامرا کا مسودہ بھیجا ہے۔ کتاب اچھی ہے، لیکن ترتیب کے لحاظ سے سخت اصلاح کی محتاج ہے۔ میں نے نواب صاحب کو لکھا کہ یہ کام اتنی دور سے انجام نہیں پا سکتا۔ نواب نے میرے لیے پالکی کی ڈاک کا انتظام کر دیا ہے۔ دو مہینے میں اورنگ آباد پہنچوں گا اور مسودہ درست کروں گا[1]۔

اندازہ کیجیے، اس دور کے امرائے سلطنت کا علمی ذوق کتنا گہرا تھا کہ ملک کے دور دراز علاقوں کے اہل تحقیق کا انھیں علم تھا اور وہ انھیں یاد رکھتے تھے۔ بہر کیف آزاد اورنگ آباد پہنچے اور کتاب کی اصلاح وترتیب کا کام مکمل کیا۔ لیکن اس کے بعد سوئے اتفاق سے نواب شاہ نواز خاں ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۸ء کو ایک لڑائی میں مارے گئے۔ ان کا گھر لٹ گیا۔ کتب خانہ تباہ ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ کتاب بھی برباد ہو گئی۔ آزاد اس سے بڑے فکر مند ہوئے۔ انھوں نے کمال تلاش وتفحص سے پورے ایک سال کے بعد مسودے کا سراغ لگایا، لیکن مسودہ دیکھا تو تمام اجزائے کتاب درہم برہم ہو چکے تھے اور بہت سے حصے بالکل ضائع ہو گئے تھے۔ آزاد کو اس کا بے حد دکھ ہوا، اور انتہائی مشکل اور دیدہ ریزی سے ان اوراق پریشان کو مرتب و مدون کیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ قطب الملک عبداللہ خاں کے حالات سرے سے درج ہی نہ تھے۔ امیر الامرا حسین علی خاں کا تذکرہ ابتدا سے ناقص تھا۔ آصف جاہ اور نظام الدولہ کا حال خود مصنف نے چھوڑ دیا تھا۔ آزاد نے ان سب کے حالات خود لکھے اور کتاب میں شامل کیے۔ ابوالفضل اور سعد اللہ خاں کے حالات سے بھی مسودہ خالی تھا۔ غرض آزاد نے کتاب

---

[1] مقالاتِ شبلی، ج ۵، ص ۱۳۰۔

Marfat.com

کے تمام اجزا جمع اور مرتب کیے۔ نامکمل حالات کی تکمیل کی، خود مصنف کتاب نواب شاہ نواز خاں کے حالات لکھے۔ حمد و نعت لکھی اور ان کی محنت اور سعی و کاوش کے نتیجے میں اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک ایسی کتاب کا اضافہ ہوا، جسے ہر صورت میں جوہر نایاب کی حیثیت حاصل ہے اور جو اپنے دامن صفحات میں بے شمار معلومات کا ذخیرہ لیے ہوئے ہے۔ کتاب ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء میں مکمل ہوئی۔

۹۔ ضوء الدراری شرح صحیح بخاری: آزاد کو اللہ نے علم و تحقیق کے تمام گوشوں سے بہرہ ور کیا تھا۔ وہ حدیث سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ علم حدیث انھوں نے مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی سے اور مکہ مکرمہ میں شیخ عبدالوہاب طنطاوی مصری سے حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری سے انھیں خصوصی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور یہ کتاب ان کے زیر مطالعہ رہتی تھی۔ چنانچہ شروع سے لے کر کتاب الزکوٰۃ تک عربی میں اس کی شرح سپرد قلم کی ❶۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے اور اس کے قلمی نسخے برصغیر میں موجود ہیں۔

سید مقبول احمد صمدانی کا کہنا ہے کہ آزاد کی ضوء الدراری درحقیقت شیخ شہاب الدین کی ارشاد الساری کا بعض فوائد کی زیادت کے ساتھ ملخص ہے ❷۔

۱۰۔ دو عربی دیوان: عربی کے ان دو دیوانوں کا آزاد نے سبحۃ المرجان میں ذکر کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ مجھ سے پہلے کسی ہندوستانی کا عربی دیوان مرتب نہیں ہوا، نہ کسی ہندوستانی عالم نے اس اسلوب کے اشعار کہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں نے یہ دونوں دیوان مدینہ منورہ کے بعض فضلا کی خدمت میں بھیجے۔ انھوں نے ان کو گنبد خضرا کے سامنے رکھا بلکہ روضۂ اقدس کی جالیوں کے اندر ڈال دیا۔ مجھے امید ہے کہ ان دواوین کو قبولِ عام حاصل ہوگا ❸۔ یہ دیوان حیدر آباد سے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۱۔ السبعۃ السیارہ: یہ آزاد کے سات دواوین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ۱۱۷۹ھ سے ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۶۵ء سے ۱۷۸۰ء تک کا کلام درج ہے۔ سید مقبول احمد صمدانی کا بیان ہے کہ آزاد کے اس مجموعۂ کلام کا انتخاب ''مختار دیوان آزاد'' کے نام سے ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں مطبع آسی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔

۱۲۔ تسلیۃ الفواد فی قصائد آزاد: یہ آزاد کے قصائد کا مجموعہ ہے، جن میں زیادہ تر نعتیہ قصائد ہیں۔ اس کا کچھ حصہ آزاد نے تراجم العلما کے عنوان سے سبحۃ المرجان میں شامل کر لیا ہے۔

۱۳۔ مظہر البرکات: یہ ایک صوفیانہ مثنوی ہے جو سات دفتروں پر مشتمل ہے۔ پہلا دفتر ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء میں، دوسرا، تیسرا اور چوتھا ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں مکمل ہوا۔ پانچویں، چھٹے اور ساتویں دفتروں میں تاریخ اختتام درج

---

❶ سبحۃ المرجان، ص ۱۲۲۔

❷ حیاتِ جلیل، حصہ دوم، ص ۱۷۵۔

❸ سبحۃ المرجان، ص ۱۲۲، ۱۲۳۔

Marfat.com

نہیں ہے۔

۱۴۔ شفاء العلیل فی اصطلاحات کلام ابی الطیب متنبیؔ: یہ متنبیؔ کے کلام کی مخصوص اصطلاحات کی شرح ہے۔

۱۵۔ مکاتیب حضرت مجدد: سید مقبول احمد صمدانی کا بیان ہے کہ آزاد نے حضرت شیخ مجدد الف ثانی کے بعض مکاتیب کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ وہی مکاتیب ہیں ❶۔

۱۶۔ کشکول: اسے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن کے کیٹلاگ میں عربی کتابوں میں رکھا گیا ہے۔ صاحب قاموس العالم شمس اللہ قادری اسے فارسی کتاب بتاتے ہیں، اسٹوری کا خیال ہے کہ یہ دونوں زبانوں (عربی اور فارسی) کے اشعار کا انتخاب ہوگا ❷۔

۱۷۔ شجرۂ طیبہ: سید غلام علی آزاد کی یہ کتاب ساداتِ بلگرام کے احوال وانساب پر مشتمل ہے، اور فارسی زبان میں ہے۔

۱۸۔ مرأۃ الجمال: یہ ان ایک سو پانچ اشعار پر محیط ہے، جن میں معشوق کا سراپا بیان کیا گیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ (سبحان اللہ کلیکشن) میں ایک مخطوطہ ''مثنوی سراپائے معشوق'' کے نام سے موجود ہے۔ اسٹوری کا خیال ہے کہ ''مثنوی سراپائے معشوق'' اور ''مرأۃ الجمال'' ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں۔

۱۹۔ دیوانِ فارسی: یہ دیوان حیدر آباد میں ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء میں طبع ہو چکا ہے۔

۲۰۔ سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات: یہ ۳۲ صفحات کا رسالہ ہے جس میں آزاد نے سادات کے خصائل ومکارم بیان کیے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سادات کا خاتمہ لازماً اچھا ہوتا ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء میں بمبئی سے چھپ چکا ہے۔

۲۱۔ مثنوی بجواب مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی: یہ میر عبدالجلیل بلگرامی کی مثنوی، فرخ سیر کی کتخدائی کے متعلق ہے۔

۲۲۔ چند منظومات اور رسائل: یہ وہ رسائل ہیں، جن کا ذکر خود آزاد نے کیا ہے ❸۔ ان منظومات میں ممکن ہے کہ مثنوی بجواب مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی بھی شامل ہو۔

۲۳۔ دیوانِ اردو: عرصہ ہوا، ہندوستان کے ایک نامور محقق جناب عبدالرزاق صاحب قریشی (انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی) نے سید غلام علی آزاد بلگرامی کے حالات میں ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ یہی مضمون آزاد کی تصنیف مآثر الکرام (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء) میں شائع

❶ حیاتِ جلیل، حصہ دوم، ص ۱۷۵۔

❷ پرشین لٹریچر، جلد اول، حصہ دوم، ص ۸۲۲۔

❸ ملاحظہ ہو، سبحۃ المرجان، ص ۱۲۳۔

Marfat.com

ہوا۔ اس مضمون میں قریشی صاحب لکھتے ہیں کہ آزاد کی کسی تحریر سے یہ پتا نہیں چلتا کہ انھوں نے اردو میں بھی شعر کہے ہیں۔ ان کے تذکرہ نگار اور سوانح نویس بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ بلکہ سید مقبول احمد صمدانی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اردو میں شعر کہنا آزاد ''اپنے مرتبۂ عالی سے پست اور دوں سمجھتے تھے۔'' لیکن اسد علی خان تمنا اورنگ آبادی نے ''گل عجائب'' میں ان کے اردو دیوان کا ذکر کیا ہے اور ان کے دو شعر بھی بطور نمونے کے نقل کیے ہیں ❶۔ اسد علی خاں تمنا چوں کہ آزاد کے شاگرد تھے، اس لیے ان کے بیان پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ❷۔

بلاشبہ آزاد نے بعض مقامات پر اس بات کی تصریح کی ہے کہ وہ ہندی زبان سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ خزانۂ عامرہ میں مسعود سعد سلمان کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''من اگرچہ دو دیوان دارم، عربی و فارسی، لکن شعر ہندی را خوب می فہم و از چاشنی آں خط مستوفی دارم۔''

(یعنی میں نے اگرچہ دو دیوان لکھے ہیں جو عربی اور فارسی زبانوں میں ہیں، لیکن ہندی شعر بھی خوب سمجھتا ہوں اور اس کی چاشنی سے بہرۂ وافر رکھتا ہوں۔)

۲۴۔ گربہ نامہ: اردو کی ایک چھوٹی سی کتاب ''گربہ نامہ'' بھی ان کی طرف منسوب ہے، لیکن فی الحقیقت اس کتاب کے مصنف امروہی ہیں ❸۔

آزاد کی شاعری پر اہل علم کی تنقیدات:

کوئی محقق و مصنف اور شاعر و ادیب ایسا نہیں جس کے افکار و خیالات پر اس کے معاصرین یا بعد کے اہل نظر نے تنقید نہ کی ہو، آزاد بھی اس سے بچ نہیں سکے۔ ان کی مآثر الکرام وغیرہ پر جس انداز سے ان کے ہم عصروں نے تنقید کی اور جس اسلوب سے انھیں طعن و مخالفت کا ہدف ٹھہرایا وہ پہلے گزر چکا۔ ان کی شاعری پر جو اعتراضات کیے گئے، اب وہ سنیے۔ پاکستان کے نامور اہل علم ڈاکٹر وحید قریشی نے مآثر الکرام (مطبوعہ لاہور) پر ''پیش لفظ'' تحریر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے ان حضرات کا ذکر کیا ہے، جو آزاد کی شاعری پر معترض ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ وارستہ سیالکوٹی نے بھی تذکرۃ الشعرا میں آزاد کی شعر و شاعری پر اعتراضات وارد کیے اور ان کی بعض تصانیف سے غلطیاں نکالیں۔

---

❶ گل عجائب، ص ۳۔

❷ مآثر الکرام، طبع لاہور۔ مضمون عبدالرزاق قریشی، ص ۱۵۔ بحوالہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔

❸ رسالہ سہ ماہی صحیفہ، لاہور۔ ڈاکٹر نجم الاسلام کے دو مقالے۔ بعنوان ''گربہ نامہ''

Marfat.com

ملا محمد باقر آگاہ نے اپنی تصنیف ''چہار صد ایراد بر کلام آزاد'' میں آزاد کی تصانیف اور شاعری سے چار سو غلطیوں کی نشان دہی کی۔ آگاہ نے اس کتاب کا دوسرا تاریخی نام ''عشراتِ آزادیہ'' تجویز کیا۔ ابجد کے اعداد سے اس کا سال تصنیف ۱۱۹۹ھ نکلتا ہے، جو آزاد کی وفات سے ایک برس پہلے کا زمانہ ہے۔ یہ کتاب قلمی ہے۔

ملا محمد باقر آگاہ ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ سال وفات ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء ہے۔ یہ جنوبی ہند کے ممتاز عالم اور صاحب فضل و کمال تھے۔ آگاہ صرف آزاد ہی سے نبرد آزما نہیں ہوئے، اپنے ایک جلیل القدر ہم عصر عالم بحر العلوم مولانا عبد العلی (متوفی ۱۲۲۵/۱۸۱۰ء) سے بھی ان کے مناظرے اور مباحثے ہوتے رہے۔

''چہار صد ایراد بر کلام آزاد'' کی تصنیف کا باعث ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آزاد نے آگاہ کو ''خاں صاحب'' لکھ کر خطاب کیا۔ آگاہ اس لفظ کو اپنے لیے ننگ اور عار سمجھتے تھے۔ لہٰذا برہم ہو گئے اور ترکی بہ ترکی جواب دینے کی غرض سے آزاد کو ''مرزا بیگ'' وغیرہ لکھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتراضات کی ابتدا آگاہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ آزاد نے جواب میں آگاہ کے اشعار کی چند فنی اور ادبی غلطیاں نشان زد کر کے بھیجیں، لیکن آگاہ نے اسے مجادلے پر محمول کیا اور میدان میں اتر آئے۔ کہا کہ: الحدید یلین بالحدید (لوہے کو لوہا نرم کرتا ہے۔) بس اتنی سی بات تھی، جس کے جواب میں پوری کتاب لکھ ڈالی [۶۱]۔

علامہ شبلی، وہ اہل قلم ہیں جو آزاد کے علم و فضل، وسعت نظر اور تحقیق و تفحص کے بہت مداح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''آزاد سب سے پہلے شخص ہیں، جس نے ہندوستان کے علما اور ارباب عمائم کے حالات قلم بند کیے۔ آزاد نے اس اولیت پر خود جابجا فخر کا اظہار کیا ہے اور بجا کیا ہے۔'' وہ آزاد کی مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان کے اختصار سے تو مطمئن نہیں، البتہ انھیں ''مستند'' قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کی عربی اور فارسی شاعری کو سخت لب و لہجے میں نشانۂ تنقید ٹھہراتے ہیں اور لکھتے ہیں:

آزاد کا عربی اور فارسی کلام اگرچہ کثرت سے ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے چہرۂ کمال کا داغ ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ نہایت نادر کتب ادبیہ پر ان کی نظر ہے۔ لغات اور محاورات ان کی زبان پر ہیں، لیکن کلام میں اس قدر عجمیت ہے کہ اس کو عربی کہنا مشکل ہے۔ ان کو اس پر ناز ہے کہ انھوں نے عجم کے خیالات، عربی میں منتقل کیے ہیں، لیکن نکتہ سنج جانتے ہیں کہ یہ ہنر نہیں بلکہ عیب ہے:

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

---

[۶۱] پیش لفظ مآثر الکرام، ص ۲۱، ۲۲۔

Marfat.com

فارسی کی بھی یہی حالت ہے۔سیکڑوں، ہزاروں اشعار ہیں، ایک شعر بھی ایسا نہیں نکلتا جو اہل زبان کا کلام سمجھا جائے۔آزاد نے والہ داغستانی کے حال میں لکھا ہے کہ ”چوں کہ میری اور ان کی بہت کم صحبت رہی، اس لیے نہ میں نے ان کا ذکر سروِ آزاد میں کیا، نہ انھوں نے میرا ذکر ریاض الشعرا میں کیا۔“

اپنے خیال کے مطابق جو کچھ آزاد نے لکھا، صحیح لکھا، لیکن والہ داغستانی کی نسبت ان کا نرا حسن ظن ہے۔والہ داغستانی، آزاد کے کلام کو اس قابل کب سمجھتا تھا کہ تذکرے میں درج کرتا۔اس نے جا بجا تصریح کی ہے کہ ہندوستانی شعرا، جس زبان میں شعر کہتے ہیں خدا جانے کس ملک کی زبان ہے ❶۔

چند واقعات و لطائف:

آزاد نے بھر پور علمی و عملی زندگی گزاری اور ہر قسم کے لوگوں سے ان کی ملاقات رہی۔دنیا کی حیاتِ مستعار میں انھیں بے شمار معاملات پیش آئے۔وہ نہایت زندہ دل عالم تھے۔ان کے حالات میں بہت سے لطائف و واقعات مذکور ہیں، جن میں سے چند ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ لچھمی نرائن شفیق ان کے بہت مداح اور شاگرد تھے۔وہ اپنی کتاب گل رعنا میں لکھتے ہیں کہ آزاد ایک دن مولوی قمر الدین اورنگ آبادی کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے مولوی صاحب موصوف کو بطور ہدیہ ایک کتاب پیش کی۔درحقیقت اس شخص کو مولوی صاحب سے ایک کام تھا۔کام یہ تھا کہ وہ ان سے ناظم شہر کے نام ایک سفارشی خط لینا چاہتا تھا۔مولوی صاحب نے کتاب کو ”وجہ رشوت“ قرار دے کر لینے سے انکار کر دیا۔آزاد نے اس شخص سے کہا کہ تم یہ کتاب بہ طور ہدیہ مجھے دے دو۔اس نے دے دی۔آزاد نے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کی اور کہا کہ اب یہ کتاب میری ہے اور میں آپ کو دے رہا ہوں۔اب اس میں شائبہ رشوت باقی نہیں رہا۔مولوی قمر الدین مسکرائے اور کتاب لے لی۔حاضرین مجلس آزاد کے اس نکتے سے بہت محظوظ ہوئے۔

۲۔ ایک دن سید غلام حسن اور مولوی فخر الدین میں نغمہ و سرود کے مسئلے پر بحث چھڑ گئی۔سید غلام حسن اسے جائز قرار دیتے تھے اور مولوی فخر الدین ناجائز ٹھہراتے تھے۔مجلس میں ایک شخص حاجی حسام الدین بیٹھے تھے جو عالم بھی تھے اور بہت بڑے سیاح بھی۔وہ اس مسئلے میں سید غلام حسن کے موید تھے۔بحث نے طول کھینچا تو اسے ختم کرنے کے لیے آزاد کو ایک تدبیر سوجھی۔انھوں نے حاجی حسام الدین سے کہا کہ آپ نے مختلف مقامات کی بہت سیاحت کی ہے۔آپ یہ فرمایئے کہ حضرت ہود علیہ السلام کی قبر کہاں ہے؟ انھوں نے جواب دیا، یمن میں۔آزاد نے کہا، جی نہیں، حضرت ہود علیہ السلام کی قبر شام میں ہے۔حاجی صاحب نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ یمن میں ہے، میں نے خود اس قبر کی زیارت کی ہے۔آزاد نے جواب دیا، میں نے ایک معتبر کتاب میں پڑھا ہے

---

❶ مقالاتِ شبلی، ج ۵، ص ۱۲۹۔

Marfat.com

شام میں ہے۔ کچھ دیر دونوں میں اس پر بحث ہوتی رہی۔ سید غلام حسن اور مولوی فخر الدین اپنی بحث کو بھول کر اس بحث کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جب آزاد نے دیکھا کہ نغمہ وسرود کا جھگڑا ختم ہو چکا ہے تو حاجی حسام الدین سے کہا، آپ صحیح فرماتے ہیں، حضرت ہود علیہ السلام کی قبر یمن میں ہے۔

۳۔ جس زمانے میں آزاد شاہ محمود کی خانقاہ میں مقیم تھے، ایک مغل بخارا سے آیا اور اسے آزاد کے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ صبح کو وہ آزاد کے کمرے میں آیا اور بڑے بے تکلفانہ انداز سے کہا کہ میں تازہ وارد مہمان ہوں، آپ نے میری دعوت نہیں کی۔ آزاد نے برجستہ جواب دیا، اتنی قدیم آشنائی کے باوجود آپ میرے لیے کوئی تحفہ نہیں لائے۔

۴۔ ایک دن آزاد، نواب آصف جاہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک ہندو، مسلمان ہونے کی غرض سے آیا اور مشرف بہ اسلام ہوا۔ عرض بیگی نے عرض کی کہ یہ نومسلم چاہتا ہے کہ اس کا نام تجویز فرمایا جائے۔ نواب آصف جاہ نے آزاد سے کہا کہ اس کا کوئی ایسا نام تجویز کرو، جس سے دین اسلام کی وضاحت ہوتی ہو۔ آزاد نے کہا، دین محمد۔ نواب نے کہا، ابھی کل ہی ایک ہندو مسلمان ہوا، اور اس کا نام دین محمد رکھا گیا۔ آزاد نے فوراً جواب دیا، دین محمد جس قدر زیادہ پھیلے، بہتر ہے۔ نواب بہت خوش ہوا، اور یہی نام رکھا گیا۔

۵۔ میسور کے سفر میں ایک دن آزاد اور نواب نظام الدولہ ناصر جنگ ہاتھی پر سوار جا رہے تھے کہ ایک ہموار صحرا سے گزر ہوا، جہاں تک نگاہ جاتی تھی، سوار اور پیادے ہی نظر آ رہے تھے۔ نواب نے آزاد سے کہا، لشکر کا یہ منظر قابل دید ہے۔ آزاد نے جواب دیا کہ جبر و اختیار کا مسئلہ جو مشکل ترین مسئلہ ہے، یہاں حل ہو جاتا ہے۔ ان تمام سپاہیوں کی حرکات ایک شخص کے تابع ہیں، اور وہ اس کے ارادہ (حکم) سے حرکت کرتے ہیں۔

۶۔ ایک رات نواب نظام الدولہ نے سادات عرب کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چل رہا تھا۔ نواب کو قہوہ بہت مرغوب تھا۔ مدینہ منورہ کے ایک سید نے مزاحاً کہا: "القهوة محرمة عند بعض العلماء" نواب نے آزاد سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کا اس مسئلے کے متعلق کیا خیال ہے؟ آزاد نے جواب دیا، سید صاحب کا مفہوم یہ ہے کہ قہوہ بعض علما کے نزدیک معظم ہے، کیوں کہ "محرمة" کا مطلب احترام ہے۔ نواب خاموش ہو گئے اور سید صاحب بھی بات سمجھ گئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو سید ممدوح نے آزاد کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ نے میرے قول کی نہایت عمدہ توجیہہ کی۔

۷۔ ارکاٹ کے زمانۂ قیام میں ایک روز ایک ہرن کو نواب نظام الدولہ کے خیمے کے پاس لا کر بٹھایا گیا۔ نواب نے حاضرین مجلس سے پوچھا، آپ کی کیا رائے ہے، اسے ذبح کیا جائے یا آزاد کر دیا جائے؟ نواب صاحب ہرن کے شکار کے بہت شوقین تھے۔ ان کی رغبت طبع کے پیش نظر حاضرین نے جواب دیا، ذبح کرنا چاہیے۔ نواب نے آزاد سے پوچھا تو آزاد نے کہا، مجھے ایک قصہ یاد آ گیا ہے، اگر اجازت ہو تو سناؤں۔ نواب نے کہا، سنایئے۔ آزاد نے کہا، ایک مرتبہ ایک بادشاہ نے ایک قیدی کے قتل کا حکم جاری کیا۔ قاعدے کے

Marfat.com

مطابق قتل سے پہلے اس شخص سے پوچھا گیا کہ تمھاری کوئی خواہش ہے؟ اس نے کہا، میری یہ خواہش ہے کہ قتل ہونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے مجھے بادشاہ کی مجلس میں باریابی کا شرف بخشا جائے۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے اسے دربار میں لانے کا حکم دیا۔ دربار میں اس سے پوچھا گیا کہ کچھ کہنا چاہتے ہو؟ اس نے عرض کیا، کچھ نہیں کہنا چاہتا، لیکن جب بادشاہ اٹھ کر جانے لگا تو قیدی عرض گزار ہوا کہ بادشاہ سلامت میں قصور وار اور قابل قتل ہوں، لیکن چند لمحے آپ کی صحبت میں گزار چکا ہوں۔ اس طرح آپ پر میرا حق ثابت ہوتا ہے۔ بادشاہ اس حسن ادا سے بہت خوش ہوا، اور اسے معاف کر دیا۔ یہ قصہ سنانے کے بعد آزاد نے کہا، یہ ہرن بھی آپ کی صحبت میں بیٹھ چکا ہے۔ آگے آپ کی مرضی! نواب صاحب مسکرائے اور ہرن کا نام آزاد رکھ کر اسے آزاد کر دیا۔

۸۔ ارکاٹ ہی کے دورانِ سفر کا واقعہ ہے کہ ایک دن آزاد چند احباب کے ساتھ خیمے میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک درویش شاہ جمیل نامی ان کے پاس آئے۔ وہ ان کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے اور ان سے خوش اخلاقی سے باتیں کیں۔ جب شاہ جمیل چلے گئے تو حاضرین مجلس نے کہا، آپ نے بھی کس کی تعظیم کی، یہ تو فلاں شخص کا باورچی ہے۔ آزاد نے جواب دیا، میں نے لباس فقیر کی تعظیم کی ہے۔ اس کے بعد شاہ جمیل کی آمد و رفت کا سلسلہ جب تک جاری رہا، آزاد ان کی اسی طرح تعظیم کرتے رہے، جس طرح پہلے دن کی تھی۔ اتفاق سے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ، ہمت خاں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کے بعد شاہ جمیل، آزاد سے ملنے آئے تو ہمت خاں کے مدارالمہام امانت اللہ خاں کو بھی ساتھ لائے۔ امانت اللہ خاں نے پچاس ہون طلائی دکنی سکے آزاد کی خدمت میں پیش کیے اور کہا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمت خاں کی ذات سے آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔

۹۔ ایک دفعہ اورنگ آباد میں آزاد کی شال چوری ہو گئی۔ چند روز بعد ان کے ایک دوست نے دیکھا کہ ایک آدمی اسے بازار میں فروخت کر رہا ہے۔ اس دوست نے وہ شال خریدنے کے بہانے اس سے لے لی اور لا کر آزاد کو دکھائی اور کہا کہ اس آدمی سے پوچھنا چاہیے کہ یہ شال اس نے کہاں سے لی؟ آزاد نے کہا میں ایک چھوٹے آدمی کے ساتھ عدالت میں کھڑا ہونا پسند نہیں کرتا۔ اور یہ شال اسے واپس لوٹا دی۔

۱۰۔ جس زمانے میں نواب نظام الدولہ، مظفر جنگ سے، جس کو فرانسیسیوں کی امداد حاصل تھی، نبرد آزما تھا۔ ایک روز آزاد نے نمازِ مغرب میں سورہ ﴿اذجاء نصر الله والفتح﴾ پڑھی۔ شرکائے نماز بہت خوش ہوئے اور آزاد سے کہا کہ آپ نے یہ سورۃ بالکل برموقع پڑھی ہے، ان شاء اللہ ہماری فتح ہو گی اور ﴿یدخلون فی دین الله افواجا﴾ کے مطابق فوج نصاریٰ مطیع ہو جائے گی۔ آزاد نے کہا، میں نے یہ سورۃ قصداً فال لینے کی غرض سے پڑھی ہے۔ چنانچہ دوسرے روز نواب نظام الدولہ کی فتح کا اعلان ہوا، اور آزاد کی فال نے حقیقت کی شکل اختیار کر لی۔

Marfat.com

اس قسم کے بہت سے واقعات ولطائف ہیں جو آزاد کے بارے میں مرقوم ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد بڑے عالی ظرف، نکتہ آفرین، بذلہ سنج، شگفتہ مزاج، بلند اخلاق اور حاضر دماغ تھے۔ لچھمی نرائن شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد کی بزم میں ہزل کا گزر نہ تھا۔ ان کے قلم یا زبان پر کبھی تلخ اور متبذل لفظ نہیں آیا۔ خود ان کا اپنا شعر ہے:

زحرف تلخ مبرا است خامۂ آزاد — کہ زہر ریختن از نیشکر نمی آید

اپنی اس خصوصیت کا وہ صاف لفظوں میں اظہار کرتے ہیں کہ لوگوں سے بہت زیادہ اختلاط کے باوصف اور ہر قسم کے افراد سے شدید امتزاج کے باوجود تکریم وتعظیم ہمیشہ میرا بنیادی وصف رہا ہے۔ میرا قلم ابتذال سے محفوظ اور میری زبان ہرزہ گوئی سے مصئون ہے۔ خود مجھے بھی سب نے سزاوارِ اکرام قرار دیا ہے۔ امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے روز بھی قربِ بساطِ عزت سے مسرور ہوں گا[1]۔

ضبط وتحمل:

آزاد نہایت صلح کل، نرم خو اور حلیم الطبع عالم تھے۔ ضبط وتحمل کے پیکر تھے۔ لوگوں سے لڑنا اور جھگڑنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ اگر کوئی ناگوار بات سنتے تو صبر کرتے اور خاموش ہو جاتے۔ کہا کرتے کہ اندمالِ زخم ہنر ہے اور انقطاع بے ہنری۔ دانش مند کو چاہیے کہ عمارت کو گرنے سے بچائے۔ ڈھانے کا کام تو ہر ایک کر سکتا ہے۔ انھوں نے طبیعت کچھ ایسی پائی تھی کہ کوئی شخص انھیں ذہنی یا مالی تکلیف پہنچاتا تو انتقام نہ لیتے اور بدی کے بدلے میں بھلائی کرتے۔ ان کا قول ہے کہ سب سے بڑا انتقام یہ ہے کہ مخالف تمھارے سامنے اپنی التجا پیش کرنے پر مجبور ہو جائے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں:

آزاد من بدشمن خود بدنمی کنم — نا منصف ست ہر کہ دغامی دہد مرا

ان میں یہ خوبی تھی کہ دو شخصوں میں کشیدگی یا تلخی پیدا ہو جاتی تو اپنے حسن تدبیر سے اس کو رفع کر دیتے۔ نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں ان کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

بر رشتۂ دوستی ما گرہے عجب افتادہ بود، بناخن تدبیر شما وا شد[2]۔

(ہماری دوستی کے تعلق میں عجب گرہ پڑ گئی تھی، لیکن آپ کے ناخن تدبیر سے کھل گئی۔)

فقیرانہ زندگی:

حاکم لاہوری نے ''مردم دیدہ'' میں آزاد کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آزاد کی زندگی

---

[1] خزانہ عامرہ، ص ۴۔

[2] منشات شاہ نواز خاں۔

Marfat.com

کا بڑا حصہ ارباب دولت کی صحبت اور اصحاب امارت سے وابستگی میں گزرا، لیکن وہ جلب منفعت سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ انھوں نے کبھی سرکاری اثر ورسوخ پر اظہارِ فخر نہیں کیا۔ کبھی اپنے آپ کو اقتدار وثروت کی چوکھٹ پر نہیں گرایا اور کبھی منافعہ دنیا جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان کی ساری زندگی فقیرانہ شان اور درویشانہ انداز سے گزری۔ وہ غرور سے پاک اور فخر سے مبرا تھے۔ تواضع، حلم اور نرمی ان کا اصل جوہر تھا۔ بلند اخلاق اور خوش مزاجی کی دولت سے مالا مال تھے۔ غریبوں کے ہمدرد، محتاجوں کے معاون اور فقیروں کے مددگار تھے۔ سب سے خوش رہتے اور ہر ایک کو خندہ پیشانی سے ملتے ❶۔

لچھمی نرائن شفیق نے گل رعنا میں آزاد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو اس دنیا میں سب سے کم درجے کا ہے، وہ عالم آخرت میں سب سے اونچے درجے پر فائز ہوگا۔

آزاد خود کہتے ہیں:

سرفراز آں جہاں باشد دلیل ایں جہاں حرفِ ختم صفحہ تاجِ صفحہ آئندہ است

شفیق ان کی اس درجے تعریف کرتے ہیں کہ مبالغے کا شبہ ہوتا ہے، تاہم یہ بالکل صحیح ہے کہ خود آزاد نے اصحاب اقتدار سے اپنی ذات کے لیے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، البتہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے اور اپنے تعلقات ورسوخ سے فیض یاب کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ وہ حکام وقت سے مخلوق خدا کی پُر زور سفارش کرتے اور جو شخص کسی کام سے ان کے پاس آ جاتا، بلا تامل اس کے ساتھ چل پڑتے۔ اس بارے میں وہ کتنی عمدہ بات بیان کرتے ہیں۔

''اس خادم خلائق کا نقطۂ نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اگر دستِ کوتاہ میں طاقت رسائی نہیں تو نہ سہی، پاؤں تو ضرورت مند کے ساتھ چل کر جا سکتے ہیں۔ اگر انگشت ناتواں میں طاقت گرہ کشائی نہیں تو کیا ہوا، زبانِ قلم سے تو سفارش کی جا سکتی ہے ❷۔

حاکم وقت سے راہ ورسم کی تلقین:

آزاد بلاشبہ طبعاً مستغنی اور بے نیاز قسم کے شخص تھے، اور ان کا اسلوبِ زندگی ایک حد تک درویشانہ اور فقیرانہ تھا، لیکن وہ راہ ورسم دنیا سے بھی خوب آگاہ تھے۔ ان کے ایک مداح شاگرد لچھمی نرائن شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد کہا کرتے تھے، آدمی خواہ دنیا دار ہو یا فقیر، جس شہر میں رہے، اس کے حاکم سے تعلقات اور راہ ورسم ضرور رکھے، اس لیے کہ بیشتر امور میں حاکم کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ بلکہ بعض دفعہ انسان کسی ایسی ناگہانی مصیبت سے دوچار ہو جاتا ہے کہ حاکم کی اعانت کے بغیر اس کا رفع ہونا ممکن نہیں ہوتا۔

❶ مردم دیدہ، ص ۳۵۔

❸ خزانۂ عامرہ۔

Marfat.com

آزاد کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ یہ محض ان کا خیال یا نظریہ نہ تھا بلکہ اس پر ان کا عمل بھی تھا۔ صمصام الدولہ شاہنواز خاں نے جو خطوط آزاد کے نام تحریر کیے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ آزاد دکن کے سیاسی حالات میں عملی دل چسپی لیتے تھے اور نواب نظام الدولہ اور صمصام الدولہ وغیرہ ملکی معاملات اور سیاسی مسائل میں ان سے باقاعدہ مشورہ لیتے تھے۔ ۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۷ء میں جب صمصام الدولہ شاہنواز خاں کو ان کے منصب سے معزول کر دیا گیا تو آزاد ہی نے شاہنواز خاں کی حمایت کی اور وہ اپنے منصب پر بحال ہوئے۔

مال و دولت سے بے نیازی:

سید غلام علی آزاد کی زندگی کا بیشتر حصہ دکن کے حکمران نظام الدولہ ناصر جنگ کی رفاقت میں بسر ہوا، لیکن اس مردِ قلندر اور بندۂ خدا نے نہ کبھی کوئی دنیوی اعزاز حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی اور نہ کسی جاگیر کی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔ نواب موصوف سے ان کی رفاقت خود نواب کے لیے وجہ افتخار تھی اور وہ بربنائے عقیدت ان کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ آزاد کا اس میں کوئی دنیوی مقصد مضمر نہ تھا۔ اپنی اس خودداری کا وہ بڑے فخر کے ساتھ اعلان کرتے ہیں اور خزانۂ عامرہ میں سر اونچا کر کے واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

ہر چند با امرا ارتباط و با رؤسا اختلاط، اما سر رشتۂ استغنا انگیختہ ام، و آبروئے فقر بر درِ غنا نریختہ۔ بلے عندلیب را از مصاحبت گل زرے و ماہی را از مجالست صدف گوہرے مطمح نظر نمی باشد، و دریں معنی زمزمہ می سنجم۔

حبابم مشت من از گوہر منت تہی آمد نباشد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم[1]

(بلاشبہ میں نے وقت کے امرا و رؤسا سے ربط و تعلق کی بنیادیں استوار کیں، لیکن سر رشتۂ استغنا کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور آبروئے فقر کو دروازۂ ثروت پر نہیں جھکایا۔ عندلیب اگر مصاحبت گل اختیار کرتی ہے تو اس کا مقصود حصولِ زر نہیں ہوتا اور مچھلی ہم نشینئ صدف کو ترجیح دیتی ہے تو اس کے پیش نگاہ تلاشِ گوہر نہیں ہوتا۔ یہی صورتِ حال میری ہے اور میں نغمہ سنج ہوں کہ

میں وہ حباب ہوں جس کے ہاتھ زر و جواہر کی منت پذیری سے خالی ہیں، میں اس میں کوئی عیب نہیں سمجھتا کہ اپنے آپ کو دریا آشنا کر دوں۔)

فرماں روایانِ دکن آزاد سے بے حد عقیدت رکھتے اور ان کی انتہائی توقیر کرتے تھے۔ اگر آزاد چاہتے تو اس سے فائدہ اٹھا کر مال و دولت کے انبار لگا سکتے تھے۔ لیکن ان کی طبیعت میں اس درجہ استغنا بھرا ہوا تھا کہ انھوں نے جاہ و حشمت اور دولت و ثروت کو کبھی حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آنے دیا۔ نظام الملک نواب آصف جاہ کے انتقال کے بعد جب نظام الدولہ ناصر جنگ تخت دکن پر متمکن ہوا تو آزاد کے دوستوں اور بہی خواہوں نے کہا کہ اب آپ جو منصب چاہیں حاصل کر سکتے ہیں اور اصرار کیا کہ اس موقعے سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے،

[1] خزانۂ عامرہ، ص ۴۳۔

Marfat.com

لیکن اس فقیر منش عالم نے جواب دیا:

آزاد شدہ ام، بندۂ مخلوق نمی توانم شد۔

(میں دنیا طلبی کے جھمیلوں سے آزاد ہوں، بندۂ مخلوق نہیں بننا چاہتا۔)

اور ساتھ ہی یہ شعر پڑھا:

دریں دیار کہ شاہی بہر گدا بخشند غنیمت ست کہ مارا ہمیں بما بخشند

بلاشبہ آزاد امرا و اغنیا اور ملوکِ وقت سے مراسم رکھتے تھے، چنانچہ افتخار دولت آبادی نے تذکرۂ بے نظیر میں لکھا ہے کہ وارستہ لاہوری نے آزاد کو "نوکر پادشاہی" قرار دیا ہے جو ان کے نزدیک صحیح نہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ آزاد نے کبھی کسی بادشاہ یا امیر کی ملازمت اختیار نہیں کی ___ لیکن ہمارے نزدیک اس سلسلے میں افتخار دولت آبادی کا وارستہ لاہوری پر خفگی کا اظہار کرنا اور ان کی بات کو کلیۃً غلط قرار دینا محل نظر ہے۔

بلاشبہ امرائے مملکت سے آزاد کی تمام تر بے نیازی اور کامل استغنائے قلبی کے باوصف یہ ماننا پڑے گا کہ وہ نواب نظام الدولہ اور نواب صمصام الدولہ وغیرہ سے گہرے مراسم رکھتے تھے اور سفر و حضر میں اکثر و بیشتر ان کے ساتھ رہتے تھے، اور یہ نواب صاحبان ان کی مالی کفالت کرتے تھے۔ اس لیے وارستہ کے بیان کی کلیۃً تغلیط کرنا واقعات کے منافی ہے۔ آزاد نے ان حکمرانوں کی مدح گستری بھی کی ہے، اگرچہ وہ اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ مدح انھیں حج بیت اللہ کے شوق بے تابی کے لیے کرنا پڑی۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ آزاد نے ان کی مدح میں قلم و زبان کو حرکت دی ہے۔ حج کے لیے زاد و راحلہ کا طالب ہونا اور پھر اس کے لیے اس کی تعریف کرنا بھی تو آخر کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بات شرائط حج میں کب داخل ہے کہ اگر اپنے پاس خرچ نہیں تو دوسرے سے مانگنا اور اس کی تعریف کرنا شروع کر دو۔

بہر حال اگر آزاد نے نواب کی مدح کی ہے، اور اس نے مدح سے متاثر ہو کر سفر حج کے لیے روپے کا انتظام کر دیا یا کسی حکمران نے آزاد کی کفالت کی ہے تو یہ کوئی بری بات بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نواب ان سے بہت تعلق رکھتا تھا اور ان کا عقیدت مند تھا۔ آزاد اس کا صاف لفظوں میں ذکر کرتے ہیں۔

بافقیر و نواب نظام الدولہ محبت و اخلاص فوق البیان بود و از ابتدائے ملاقات تا انتہائے ایام حیات من آزاد را در دام حسن خلق خود مقید داشت، ہر چند خواستم کنارہ گیرم، نگزاشت، غفر اللہ [1]۔

(یعنی اس فقیر اور نواب نظام الدولہ کے درمیان اس قدر محبت و اخلاص تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ ابتدائے ملاقات سے لے کر نواب کی وفات تک یہی صورت حال رہی۔ یوں سمجھیے کہ مجھ آزاد کو اس نے اپنے اخلاقِ حسنہ کے دام میں قید کر رکھا تھا۔ ہر چند میں اس سے کنارہ کش ہونا چاہتا تھا، لیکن وہ مرحوم مجھے چھوڑتا ہی نہ تھا۔)

---

[1] خزانہ عامرہ، ص ۵۵۔

Marfat.com

تاہم ان سب باتوں کے باوجود یہ بہرکیف حقیقت ہے کہ آزاد کا جذبۂ استغنا بہت بلند تھا اور ہرگز کسی کے دست نگر ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ نواب کی اگر انھوں نے مدح کی ہے، یا حج کے لیے زادِ راہ طلب کیا ہے، یا نواب نے دیا ہے تو اس کے پیچھے دونوں کا باہمی تعلق، بے پناہ محبت، پُرخلوص عقیدت اور بے تکلفی کارفرما ہے۔

فقر کی بہترین راہ:

سید غلام علی آزاد بلگرامی، جہاں علم وفضل میں باکمال تھے، وہاں فکر وعمل کے اعتبار سے بھی بلند مرتبے کے حامل تھے اور فقر و درویشی کی بہترین راہ پر گام فرسا تھے۔ اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر شفیق نے گل رعنا میں درج کیا ہے، جو انھوں نے آزاد سے بیان کیا۔ فرماتے ہیں، حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد میں نے اپنے دل میں سوچا کہ فقر کئی اقسام میں منقسم ہے، مجھے کون سا فقر اپنانا چاہیے۔ کامل غور وفکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ پیری اور مشیخت سے تو بہر طور آزاد ہی رہنا چاہیے، البتہ جادۂ صدق کو اختیار کرنا اور معاملات میں صاف رہنا ضروری ہے، کیوں کہ جھوٹ اگر دنیا کے معاملات میں فروغ نہیں پاسکتا تو امورِ دینی میں تو اور بھی بدتر ثابت ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کرامات گوئی، خواب ورؤیا کا معاملہ اور پیری مریدی کا سلسلہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اس کی اصلاح ناممکن ہے۔ صدق وصفا اور خوش معاملگی ناپید ہوگئی ہے اور عرس مجموعۂ بدعات بن کر رہ گئے ہیں۔ شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد فرمایا کرتے تھے، عرس کو بے کمال لوگوں نے اپنی شہرت کا وسیلہ اور عوام کو بے وقوف بنانے کا ذریعہ بنالیا ہے۔

آزاد رقم طراز ہیں کہ نفع دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک اخروی اور دوسرا دنیوی۔ صلۂ دنیوی دنیا داروں کی مداحی سے ملتا ہے اور صلۂ اخروی مدحت نبوی اور توصیف اکابرِ دین سے نصیب ہوتا ہے۔ میں نے مدحت رسول (ﷺ) میں اشعار کہے ہیں اور اس طرح اپنی شفاعت اخروی کے لیے ایک وسیلہ قوی پیدا کرلیا ہے۔

چوں مدح رسول کام من شد حسان الہند نام من شده [1]

ایں دریوزہ گرِ فیض الٰہی در تمام عمرِ خود لب بمدح امیرے نکشود و نامہ خود بستائش دولت مندے سیاہ نہ نمود، و دریں باب ہوی می کشم:

مہر برلب کرد آزاد از ثنائے اغنیا نیست ارباب دول راباب در دیوان ما [2]

(یعنی فیض الٰہی کے اس دریوزہ گر نے عمر بھر کسی امیر کی مدح میں لب نہیں کھولے اور کبھی اپنے نامۂ اعمال کو کسی دولت مند کی ستائش سے سیاہ نہیں کیا۔)

مآثر الکرام میں آزاد لکھتے ہیں کہ جس روز سے میں نے اپنے ناصیۂ اخلاص کو بیت اللہ کی چوکھٹ پر حضورِ خداوندی میں جھکایا ہے، دنیا کے تمام لوگوں سے بیگانگی اختیار کرلی ہے۔

---

1. خزانہ عامرہ، ص ۴۔
2. ایضاً، ص ۳۔

Marfat.com

حسان الہند:

سید غلام علی آزاد بلگرامی برصغیر کے وہ عالم دین ہیں، جنھوں نے علم و فضل میں بے حد شہرت حاصل کی اور تمام اصناف علم میں نام پیدا کیا۔ وہ اپنی فضیلت و کمال کی وجہ سے اپنے تمام معاصرین پر فوقیت رکھتے تھے اور اپنی زندگی ہی میں جید عالم اور نامور فاضل کے طور پر مشہور ہو گئے تھے۔ مدحت رسول ﷺ ان کا مرغوب اور دل پسند موضوع تھا۔ اسی بنا پر ان کے عہد ہی میں انھیں حسان الہند کے لقب سے یاد کیا جانے لگا تھا۔ اس لیے کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرح انھوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی مدح میں عربی زبان میں متعدد قصائد لکھے اور بے شمار شعر کہے۔ ان کا اپنا شعر ہے:

چوں مدح رسول کام من شد   حسان الہند نام من شد

ان کے شاگرد قاضی عبدالقادر مہربان اورنگ آبادی اور دیگر حضرات نے انھیں اسی لقب سے یاد کیا ہے۔

معاصرین سے علمی صحبتیں اور ادبی لطیفے:

غلام علی آزاد کی ولادت سے دو سال بعد (۱۱۱۸/۱۷۰۶ء) دُودمانِ تیموریہ کے عظیم حکمران اورنگ زیب عالم گیر نے وفات پائی اور اس کے بعد دورِ زوال شروع ہو گیا۔ اس لحاظ سے آزاد اس عہد کے اہل علم ہیں، جب سلطنت مغلیہ کے عروج کا دور ختم ہو چکا تھا اور اس کے آفتابِ اقتدار کا وسعت پذیر سایہ سکڑ رہا تھا۔ اب ارکانِ دربار بھی اس مرتبہ علمی کے حامل نہ تھے جو تیموری درباروں کی علمی اور ادبی روایات کا خاصہ رہا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہندوستان علم و ادب کی دولت سے تہی دامن ہو گیا تھا اور اس ملک کی گود قابل شخصیتوں کے وجود سے خالی ہو گئی تھی۔ یہاں سید عبدالجلیل بلگرامی، ملا نظام الدین انصاری، شیخ محبّ اللہ بہاری، والہ داغستانی اور شیخ علی حزین خاں آرزو جیسے اصحاب فضل و کمال اور نکتہ آفرین موجود تھے۔ یہ وہ حضرات ہیں، جن میں سے زیادہ لوگوں سے آزاد کی صحبتیں رہیں۔ ان صحبتوں سے پتا چلتا ہے کہ آزاد علم و فضل، عادات و اطوار، حاضر دماغی، زود فہمی، نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی میں کتنے اونچے مرتبے کے حامل تھے۔ ان علمی صحبتوں اور ادبی لطیفوں کی چند مثالیں گزشتہ سطور میں بیان کی جا چکی ہیں اور چند مقالات شبلی میں علامہ شبلی نے بیان کی ہیں، جو بڑی دلچسپ اور معلومات آفرین ہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ علامہ شبلی پہلے اہل قلم ہیں، جنھوں نے ''الندوہ'' لکھنؤ (اپریل ۱۹۰۵ء) میں آزاد پر مضمون لکھا اور اردو داں حضرات کو ان سے متعارف کرایا۔ اگرچہ یہ مضمون بہت مختصر اور تشنہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس اختصار میں بہت کچھ بیان کر دیا گیا ہے۔ ذیل کی چند سطور میں اسی مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے۔

Marfat.com

۱۔ ایک دن نظام الدولہ نواب ناصر جنگ شہید دربار میں آئے۔ اہل سخن اور شعرا و فضلا میں سے موسوی خاں، جرأت اورنگ آبادی، صمصام الدولہ شاہ نواز خاں، میرزا جان رسا، رضوی خان اور نقد علی خان ایجاد وغیرہ ہم عنان تھے۔ نواب نے ایک تازہ غزل پڑھنا شروع کی، جو آزاد سے اصلاح پا چکی تھی۔ ایک شعر میں نواب موصوف نے "سرو" کو "خراماں" باندھا تھا۔ اس شعر پر تمام فضلائے حاضرین کی معترضانہ نگاہیں اٹھیں۔ نواب نے حیران ہو کر آزاد کی طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ شعر آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔ آزاد نے فوراً سند میں مرزا صائب کا شاعر پڑھا:

یک رہ بر آراز آستیں دست نگاریں در چمن　　تادستہا پنہاں کند سرو خراماں در بغل

جرأت نے کہا تعجب ہے کہ مرزا صائب نے سرو کو خراماں باندھا۔ سرو چلتا پھرتا نہیں، خراماں کیوں کر ہو سکتا ہے؟ آزاد نے جواب دیا، شاعری کی بنیاد تخیل پر ہے۔ شاخیں ہوا کے اشارے سے ہلتی ہیں اور ان سے درخت جھومتا نظر آتا ہے۔ یہی درخت کا خراماں ہوتا ہے۔ اسی لیے عربی میں شاخ کو میاد کہتے ہیں۔ صائب کے علاوہ اور شعرا نے بھی سرو کو خراماں باندھا ہے۔ خواجہ حافظ کا شعر ہے:

سرو از صبا گردد چناں تاچوں قدرت باشد رواں　　ہر چند بخرامد باآں سرو خراماں کے رسد

۲۔ شیخ علی حزین اپنے زمانے کے سب سے زیادہ مشہور شاعر تھے۔ وہ ایران سے ہندوستان آرہے تھے۔ جب سندھ کے علاقے سیوستان میں پہنچے تو سید غلام علی آزاد سیوستان سے روانہ ہو کر وطن جارہے تھے۔ راستے میں ایک مقام پر اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ بڑی پُر لطف مجلسیں رہیں۔ حزیں کا معیار بہت اونچا تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، لیکن آزاد کی بڑی قدر دانی کی۔ اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں آزاد کو تحفۃً دیں۔ اس کے بعد آزاد نے بھی ان کے مرتبے کو خوب پہچانا، جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ خان آرزو نے حزین پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان میں سے بعض کا جواب آزاد نے خزانۂ عامرہ میں دیا ہے اور اچھے انداز سے بادلائل ان کا دفاع کیا ہے۔

خان آرزو سے آزاد کا غائبانہ تعارف تھا۔ انھوں نے اپنے تذکرہ مجمع النفائس میں دو مقامات پر آزاد کا ذکر کیا ہے اور بہت اچھی طرح کیا ہے۔

۳۔ شاہ آفرین لاہوری پنجاب کے مشہور شاعر تھے۔ جس زمانے میں آزاد بلگرام سے سیوستان (سندھ) جارہے تھے، اس زمانے میں لاہور سے گزرتے ہوئے ۲۹ رمحرم ۱۱۴۳ھ/ ۳ راگست ۱۷۳۰ء کو ان سے ملاقات ہوئی۔ دوسری مرتبہ آزاد سندھ سے واپس بلگرام جاتے ہوئے رجب ۱۱۴۷ھ/ دسمبر ۱۷۳۴ء کو لاہور اترے اور پانچ دن یہاں مقیم رہے۔ اس زمانے میں آزاد ید بیضا لکھ چکے تھے۔ آفرین نے بڑے اصرار سے اس کی نقل لی اور اپنی مثنوی ابنانِ معرفت ان کی نذر کی۔ ان پانچ دنوں میں دونوں فضلا کی بڑی علمی اور ادبی صحبتیں رہیں۔

Marfat.com

۴۔ حاکم لاہوری شاعر اور تذکرہ نگار تھے، شاہ آفرین لاہوری کے شاگرد تھے اور ابتدا میں دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد کو یہ تعلق ختم کر کے واقف لاہوری کے ساتھ حرمین شریفین کا عزم کیا۔ واقف تو راستے میں بیمار پڑ گئے اور سورت ہی میں رہ گئے۔ حاکم کو البتہ سعادت حج نصیب ہوئی۔ حج سے واپس آئے تو حاکم اور واقف دونوں اورنگ آباد گئے۔ وہیں آزاد سے ملاقات ہوئی۔ حاکم نے اورنگ آباد کے زمانہ قیام میں شعرا کا تذکرہ لکھا اور التزام یہ کیا کہ صرف ان شعرا کا حال قلم بند کیا، جن کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کتاب مکمل ہوئی تو ''تحفۃ المجالس'' اس کا نام رکھا۔ آزاد سے کتاب کے بارے میں بات کی تو انھوں نے کہا موضوع کی مناسبت سے ''مردم دیدہ'' زیادہ مناسب رہے گا۔ حاکم پھڑک اٹھے اور یہی نام رکھا۔ خاتمہ کتاب میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

نسخۂ تازہ کردہ ام تالیف　　که از و تازہ شد روانِ سخن
نام او کرد مردمِ دیدہ　　آنکہ بودہ است راز دانِ سخن
اسم سامی او غلام علی است　　سروِ آزاد بوستانِ سخن

۵۔ والہ داغستانی جو اپنے عہد کے بڑے شاعر اور سخن ور تھے، ان سے بھی آزاد کو ملنے اور کچھ عرصہ ہم مجلس رہنے کا موقع ملا۔ جس زمانے میں آزاد سیوستان سے دہلی جا رہے تھے، اتفاق سے انہی دنوں والہ داغستانی بھی ایران سے ہندوستان آ رہے تھے۔ دونوں کی راستے میں ملاقات ہوئی اور سیوستان سے دہلی تک دونوں ہم سفر و ہم عنان رہے۔ دورانِ سفر میں ایک دن والہ نے آزاد سے کہا کہ آؤ ہم دونوں گھوڑے دوڑائیں۔ آزاد نے پہلے تو انکار کیا، لیکن والہ کا اصرار بڑھا تو مجبوراً ان کی بات ماننا پڑی۔ والہ کا ایرانی گھوڑا آزاد کے ہندی گھوڑے کا مقابلہ نہ کر سکا اور پیچھے رہ گیا۔ آزاد آگے نکل گئے۔ والہ کو اس پر بڑا دکھ ہوا۔ اثنائے راہ میں ایک دن آزاد نے اپنا یہ شعر پڑھا:

زدہ ام برسر جہاں پاپوش　　بے سبب ایں برہنہ پائی نیست

والہ نے خیال کیا کہ آزاد کو میدانِ شعری میں شکست دینے کا موقع ہاتھ آگیا ہے۔ بولے ہمارے ملک میں ''کفش'' کہتے ہیں، ''پاپوش'' نہیں کہتے۔ آزاد ہار ماننے اور چپ رہنے والے کب تھے۔ فوراً اپنی تائید میں مرزا صائب کا یہ شعر پڑھ دیا:

چرخ دودے است کہ از خرمن من خاستہ است　　خاک گردے است کہ افشاندۂ پاپوشِ من است

والہ صائب کا یہ شعر سن کر خاموش ہو گئے۔

ایک روز والہ نے آزاد سے پوچھا کہ لفظ ''طیار'' طائے حطی سے ہے یا تائے قرشت سے؟ آزاد نے جواب دیا میرزا محمد رفیع کے شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ طائے حطی سے ہے:

دارد چو مرغ عمرت پرواز بس بہ سرعت　　اسباب عیش و عشرت طیار گونہ باشد

Marfat.com

پھر کہا کہ میرزا سعید اشرف کا کلام بھی اس کی تائید کرتا ہے:

می پرد باز از ہوائے عشق او رنگ از زخم گرچہ باز نجیر موج بادہ طیارش کنم

۶۔ نور العین واقف سے آزاد کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ مختلف مواقع پر آزاد نے ان کی بڑی مدد کی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اورنگ آباد سے ہندوستان کے کسی علاقے کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ڈاکوؤں کے چنگل میں پھنس گئے اور تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ صرف ایک عینک اور تھوڑا سا پارہ جو وہ اپنے پاس رکھتے تھے، بچ گیا۔ واقف نے بالا پور پہنچ کر آزاد کے پاس ایک آدمی بھیجا اور بذریعہ خط حقیقت حال سے مطلع کیا۔ خط میں یہ شعر لکھا:

عینکے و پارۂ سیماب باما ماندہ است چشم بے خواب و دل بے تاب باما ماندہ است

آزاد نے مدد کے لیے ہنڈوی کے ذریعے کچھ روپے ارسال کیے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دوستوں اور ضرورت مندوں کا کتنا خیال رکھتے تھے اور ان کی مدد کرنا کتنا ضروری سمجھتے تھے۔

۷۔ ایک دن نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید کے ہاں اہل سخن جمع تھے۔ کسی نے مرزا صائب کا یہ شعر پڑھا:

اہل کمال را لب اظہار خامشی است منت پذیر ماہِ تمام از ہلال نیست

اس کے معنی میں سخت اختلاف ہوا، اور واقعی اس میں اختلاف کی گنجائش تھی۔

ماہِ تمام یعنی بدر کا ہلال سے منت پذیر نہ ہونا ایک بے معنی سی بات تھی۔ حاضرین بڑے زور و شور سے سرگرم مباحثہ تھے کہ دفعتہً آزاد نے کہا، یہاں ماہ تمام سے بدر مراد نہیں بلکہ پورے مہینے کا چاند مراد ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اہل کمال کا چپ رہنا بھی ان کے کمال کا اظہار کر دینا ہے۔ اس دعوے کی شاعرانہ دلیل یہ ہے کہ جو مہینا انتیس (۲۹) دن کا ہوتا ہے، ماہِ نو کا محتاج ہوتا ہے، لیکن جو مہینا پورے تیس دن کا ہوتا ہے، اس کو ہلال کی حاجت نہیں۔ سب نے آزاد کے ذہن رسا اور معنی فہمی کی داد دی[1]۔

دکن میں مستقل سکونت:

آزاد کی تربیت و تعلیم کی بیشتر منزلیں ان کے آبائی وطن بلگرام میں طے ہوئیں، بعد ازاں متعدد بلاد و امصار کی سیاحت کی۔ پھر ان کی زندگی کے تقریباً اڑتالیس سال دکن میں گزرے۔ یہ ان کی زندگی کا طویل ترین اور اہم دور ہے اور یہی آخری دور بھی ہے۔ اس طویل مدت میں آزاد کو کئی حوادث پیش آئے۔ ان کے والدین کا انتقال ہوا۔ ماموں اور استاد سید محمد بلگرامی نے وفات پائی۔ اکلوتا نوجوان بیٹا نور الحسن تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔ خالہ زاد بھائی سفر آخرت پر روانہ ہوا، اور بھی بہت سے عزیز اور دوست دنیا سے رخصت ہو گئے، لیکن دکن کی محبت

[1] مقالات شبلی، ج ۵، ص ۱۳۱ تا ۱۳۵۔

Marfat.com

نے دل پر کچھ ایسا قبضہ کیا اور وہاں کی مٹی نے ایسا دامن پکڑا کہ آزاد نے وہاں سے نکلنے کا نام تک نہ لیا۔ بھتیجے میر سید اولاد محمد ذکا اور پوتے امیر حیدر کو بھی پاس بلالیا اور ان کی تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد بلگرام واپس بھیجا۔

دکن میں ان کی سکونت اورنگ آباد میں تھی اور اس شہر سے ان کو انتہائی محبت تھی۔ عمر کے آخری دور میں ان کو بخار، پیچش، قولنج وغیرہ کے عوارض لاحق ہو گئے تھے۔ ساتھ ہی ضعف اور نقاہت کا بھی غلبہ ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں انھیں خطوط لکھتے اور تسلی دیتے رہتے تھے۔ ''منشات شاہ نواز خاں'' کے نام سے شاہ نواز خاں کے مجموعہ مکتوبات کا قلمی نسخہ بمبئی یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اس کے حوالے اس زمانے کی تاریخ کی بعض کتابوں میں مرقوم ہیں۔ اس میں وہ خطوط درج ہیں جو شاہ نواز خاں نے آزاد کو ان کے آخری دور میں تحریر کیے۔ ان سے ان عوارض کا بھی پتا چلتا ہے جن میں آزاد مبتلا تھے۔

سفر آخرت کی تیاری:

مختلف عوارض کے ہجوم کی وجہ سے ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں آزاد کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وقت رحلت قریب ہے۔ چنانچہ اپنی قبر کے لیے اورنگ آباد سے بارہ کوس کے فاصلے پر خلد آباد میں حضرت شاہ برہان الدینؒ غریب کے مرقد کے قریب زمین کا ایک قطعہ بھی خرید لیا تھا۔ پھر سب احباب اور مشائخ و شعرا کو اپنے ہاں جمع کر کے ان کو بہترین کھانا کھلایا۔ ہر ایک سے الگ الگ معافی مانگی۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا یہ دنیا دار الفنا ہے۔ اصل اور ہمیشہ کا ٹھکانا وہی ہے، جو مرنے کے بعد حاصل ہوگا۔ آخرت میں ہم سب یکے بعد دیگرے باہم ملیں گے۔ آج کی تقریب الوداعی تقریب ہے اور ھذا فراق بيني وبينكم کا معاملہ ہے۔ اس موقعے پر آزاد بہت ہشاش بشاش تھے لیکن حاضرین پر رقت و حسرت طاری تھی[1]۔

وفات:

اس واقعہ سے پانچ سال بعد تک آزاد زندہ رہے اور ۲۴ / ذوالقعدہ ۱۲۰۰ھ/ ۱۸/ ستمبر ۱۷۸۶ء کو چھیاسی برس کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ ان کی وصیت اور خواہش کے مطابق انھیں اورنگ آباد سے بارہ میل دور خلد آباد میں دفن کیا گیا۔ ان کی لوح قبر پر یہ الفاظ مرقوم ہیں:

ھو الحی القیوم۔

حسان الہند میر غلام علی آزاد حسینی واسطی بلگرامی۔

ولادت: ۲۵/ صفر المظفر ۱۱۱۶ھ۔

وفات: ۲۴/ ذیقعدہ الحرام ۱۲۰۰ھ۔

[1] محبوب الزمن، ج ۱، ص ۲۸۵، ۲۸۶۔

Marfat.com

۱۳۷۔ قاضی غلام مصطفیٰ انصاری لکھنوی

قاضی غلام مصطفیٰ بن محمد اسعد بن شیخ قطب الدین انصاری سہالوی ثم لکھنوی، اپنے جد امجد اور جلیل القدر عالم شیخ قطب الدین انصاری سہالوی کی زندگی میں موضع سہالی میں پیدا ہوئے۔ پھر اپنے چچاؤں کے ساتھ سہالی سے نقل مکانی کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ ان کے ایک چچا شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸ر جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/ ۲۵ر اپریل ۱۷۴۸ء) تھے، جو اپنے دور کے ممتاز عالم اور ہندوستان کے مدارس دینیہ کے با قاعدہ نصاب تعلیم کے اولین بانی تھے۔ یہ نصاب تعلیم درسِ نظامیہ کے نام سے معروف ہے، اور کچھ تغیر و تبدل کے ساتھ ہمارے مدارس میں اب تک اس کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ قاضی غلام مصطفیٰ انصاری نے لکھنؤ میں تربیت پائی اور اپنے انہی رفیع المرتبت عم محترم شیخ نظام الدین انصاری سے اخذ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد قاضی غلام مصطفیٰ طلب رزق کے لیے دہلی چلے گئے تھے۔ وہاں جانے کے بعد وہ ملاوہ کے قاضی مقرر کیے گئے تھے۔ لیکن ملاوہ کے جس قاضی کو معزول کر کے ان کا تقرر عمل میں آیا تھا، وہ ان کے تقرر سے سخت نالاں تھے۔ چنانچہ اس نے ان کو معزول کرانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس طرح دونوں میں کش مکش رہنے لگی۔ کبھی اس کی کوشش سے قاضی غلام مصطفیٰ اپنے منصب سے معزول ہو جاتے اور کبھی قاضی غلام مصطفیٰ کی جدوجہد سے وہ الگ ہو جاتے اور منصب قضا پر یہ فائز ہو جاتے۔ یہ سلسلہ کافی عرصے تک جاری رہا۔ بالآخر اپنے عہدے سے الگ ہو کر قاضی غلام مصطفیٰ دہلی سے اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ ان کے صاحب زادۂ گرامی محمد علی بھی ساتھ تھے۔ ان کے حریف قاضی کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے کچھ لوگوں کو ان کے پیچھے لگا دیا اور انھوں نے راستے ہی میں ان کو قتل کر دیا[1]۔

۱۳۸۔ سید غلام نبی بلگرامی

سید غلام نبی بن محمد ارشد بن خضر بن کمال الدین حسینی واسطی بلگرامی، اپنے زمانے کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ صلاح و تقویٰ میں جماعت علما میں خاص طور سے مشہور تھے۔ مولد و منشا بلگرام ہے، جو اس عہد میں علم و علما اور صلحا و اتقیا کا مرکز تھا۔ شعور کی آنکھیں کھولیں تو نامور عالم مولانا قطب الدین گوپاموی (متوفی ۲۵ر رمضان ۱۱۶۰ھ/ ۱۹ر ستمبر ۱۷۴۷ء) کے بعض تلامذہ سے چند کتب درسیہ پڑھیں۔ پھر مولانا احمد اللہ حسینی خیر آبادی (متوفی ماہِ رجب ۱۱۶۷ھ/ مئی ۱۷۵۴ء) سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ فلسفہ و حکمت کی کچھ کتابوں کی تحصیل بھی انہی سے کی۔ بعد ازاں علامہ کمال الدین انصاری فتح پوری (متوفی ۱۴ر محرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵ر اگست ۱۷۶۱ء) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ ان سے باقی درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ ان علمائے عظام سے اخذ علم کے بعد پھر

---

[1] اغصان الاربعہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۰۔

Marfat.com

مولانا احمد اللہ حسینی خیرآبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے باقاعدہ سند فراغت لی۔

سید غلام نبی بلگرامی، مشہور عالم و ادیب میر سید غلام علی آزاد بلگرامی کے معاصرین میں سے تھے۔ جب میر غلام علی آزاد اورنگ آباد (دکن) میں مقیم تھے تو یہ بھی ۲۰؍ذی الحجہ ۱۱۶۸ھ/ ۲۷؍ستمبر ۱۷۵۵ء کو ان کے پاس اورنگ آباد گئے اور کچھ عرصہ ان کے یہاں اقامت گزیں رہے۔ بعدازاں ۱۹؍محرم ۱۱۶۹ھ/ ۲۵؍اکتوبر ۱۷۵۵ء) کو علاقہ مدراس کے شہر ارکاٹ اور ترچنا پلی کے لیے رخت سفر باندھا❶۔

سید غلام نبی بلگرامی کے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا بھی علم نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ ۱۱۶۹ھ/ ۱۷۵۶ء میں زندہ تھے۔ ان کی علمی و تدریسی سرگرمیوں کے بارے میں بھی کتب تذکرہ و رجال خاموش ہیں۔

ــــ ف ــــ

۱۳۹۔ قاضی فتح علی قنوجی

قاضی فتح علی قنوجی کا شمار اونچے درجے کے علما میں ہوتا تھا۔ آبا و اجداد قنوج شہر کے منصب قضا پر فائز تھے۔ حصول علم کے بعد یہ بھی اسی مسند بلند پر متمکن ہوئے۔ مشہور عالم شیخ علی اصغر قنوجی (متوفی ۱۵؍شعبان ۱۱۴۰ھ/ ۱۶؍مارچ ۱۷۲۸ء) کے شاگرد رشید تھے۔ اپنے علاقے اور عہد کے فاضل، نامور ادیب، مشہور فقیہ اور شیخ تھے۔ علوم مروجہ اور فنونِ متداولہ میں مہارت رکھتے تھے۔ اور اس میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے فوقیت لے گئے تھے۔ ان کی تصانیف میں حاشیہ شرح تہذیب اور حاشیہ مقاماتِ حریری شامل ہیں۔ معقولات و منقولات کے اس عالم نے ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء کے لگ بھگ وفات پائی❷۔

۱۴۰۔ مولانا فخرالدین مانک پوری بلگرامی

مولانا فخرالدین مانک پوری بلگرامی، نامور فاضل شیخ بہاء الدین نحوی بلگرامی کے فرزند رشید تھے۔ شیخ بہاء الدین درحقیقت بلگرام کے رہنے والے تھے لیکن کسی وجہ سے مانک پور تشریف لے گئے تھے، وہیں ان کے بیٹے مولانا فخرالدین پیدا ہوئے اور اسی شہر میں نشوونما پائی۔ لہٰذا مانک پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ مختصرات کتب درسیہ اپنے والد گرامی شیخ بہاء الدین سے پڑھیں۔ بعدازاں ان کے حسب ارشاد استاذ المحققین میر سید طفیل محمد بلگرامی (متوفی ۲۴؍ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ/ ۲۴؍مارچ ۱۷۳۹ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۸۶، ۲۸۷۔ سرو آزاد، ص ۳۱۲ تا ۳۱۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۲۔

❷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷۲۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۷۔

Marfat.com

حلقہ شاگردی میں شمولیت کی۔ باقی درسی کتابیں انہی سے پڑھیں اور علم وفضل کے بلند مرتبے کو پہنچے اور سید غلام علی آزاد کے بقول ''در فقاہت ید طولیٰ بہم رساند''، یعنی علم فقہ میں بڑی دسترس حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد لغت کی مشہور کتاب تاج العروس کے مصنف سید مرتضیٰ حسینی زبیدی (متوفی ماہ شعبان ۱۲۰۵ھ/ اپریل ۱۷۹۱ء) کے جد امجد سید قادری حسینی بلگرامی (متوفی ۱۳؍ ربیع الاول ۱۱۴۵ھ/ ۲۳؍ اگست ۱۷۳۲ء) کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے اور اس زمانے کے دستور کے مطابق ان کی خدمت میں تصوف وطریقت کی منزلیں طے کیں۔ جب ہر لحاظ سے درجۂ کمال کو پہنچ گئے تو درس وتدریس کی مسند بچھائی۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔

مولانا فخر الدین مانک پوری بلگرامی، فضل وصلاح کے اوصاف سے متصف اور جلیل القدر علما وفضلا میں گردانے جاتے تھے۔ ۱۱۴۰ھ/ ۱۷۲۸ء کے بعد فوت ہوئے ❶۔

۱۴۱۔ مولانا فخر الدین دہلوی

مولانا فخر الدین بن شیخ محب اللہ بن شیخ نور اللہ بن شیخ نور الحق بن شیخ عبد الحق محدث دہلوی، شیخ وقت، عالم کبیر اور معروف محدث وفقیہ تھے۔ متعدد علوم کے ماہر اور کئی مشہور کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے آبا واجداد اس برصغیر میں حدیث وفقہ کے جید عالم اور بہت سی کتابوں کے مصنف ومؤلف اور مترجم تھے۔ درس وافادہ میں بھی انھیں خاص شہرت حاصل تھی۔ مولانا فخر الدین بھی اس سلسلے میں انہی کے نقش قدم پر چلے اور عمر بھر حدیث و فقہ کی خدمت میں مصروف رہے۔ فارسی زبان میں صحیح مسلم کی بسیط ومفصل شرح سپرد قلم کی، اسی طرح حصن حصین کی مبسوط شرح اور عین العلم کی شرح لکھی ❷۔

۱۴۲۔ شیخ فرخ شاہ سرہندی

شیخ فرخ شاہ سرہندی، حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے پوتے اور شیخ محمد سعید سرہندی کے بیٹے تھے۔ ۱۰۳۸ھ/ ۱۶۲۹ء میں پیدا ہوئے اور سن شعور کو پہنچے تو اپنے والد سے علم حاصل کرنا شروع کیا۔ فقہ، ادب اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ معقول ومنقول کی کتابیں پڑھیں اور تمام فنونِ مروجہ میں ماہر ہوئے۔ بالخصوص حدیث وفقہ اور تصوف میں بڑا نام پایا۔ حافظہ تیز تھا اور قوتِ فہم میں شہرت رکھتے تھے۔ بحث ومناظرے سے بہ درجہ غایت دلچسپی تھی اور حدیث اور علم حدیث سے بے حد لگاؤ تھا۔ صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔ حرمین شریفین گئے اور حج وزیارت کا شرف حاصل کر کے وطن واپس آئے تو درس وافادہ میں مشغول ہو گئے۔

---

❶ مآثر الکرام، ص ۱۴۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۷، ۲۱۸۔

❷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۶۷ بضمن ترجمہ مولوی سلام اللہ محدث رام پوری۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۸۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۸، بضمن ترجمہ مولوی سلام اللہ۔

Marfat.com

صاحب الیانع الجنی شیخ محسن ترہٹی کا بیان ہے کہ شیخ فرخ شاہ کو حدیث سے اس قدر محبت تھی کہ ستر ہزار احادیث مع متن واسناد اور جرح وتعدیل کے حفظ تھیں اور مسائل فقہیہ میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے، واللہ اعلم۔

الیانع الجنی کے فاضل مصنف نہایت تعجب سے کہتے ہیں کہ حدیث پر اس قدر عبور و استحضار کے باوجود انھوں نے ایک رسالہ لکھا، جس میں حالت تشہد میں اشارۂ انگشتِ شہادت سے منع کیا ہے، حالاں کہ تشہد میں اشارۂ انگشت شہادت کا واضح طور سے حدیث میں ثبوت موجود ہے۔

شیخ موصوف نے حدیث اور فقہ کے بعض مسائل پر رسائل تصنیف کیے۔ ایک رسالے میں ان اعتراضات کا جواب دیا جو بعض لوگ ان کے جد امجد حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ پر وارد کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں القول الفاصل بین الحق والباطل، کشف الغطاء عن وجوہ الخطاء رسالة فی حرمة الغناء، رسالة فی العقائد، رسالة فی الحقیقة المحمدیه اور حاشیه علیٰ حاشیة عبدالحکیم علی الخیالی، ان کی تصانیف ہیں۔

شیخ فرخ شاہ سرہندی نے ۴؍ شوال ۱۱۲۲ھ/ ۱۵؍ نومبر ۱۷۱۰ء کو وفات پائی ❶۔

۱۴۳۔ سید فرید الدین بلگرامی

سید فرید الدین بن معین الدین بن عبدالوہاب حسینی واسطی، شیخ و فاضل اور فقہ و اصول کے ممتاز علما میں سے تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بچپن ہی میں اپنے شہر کے علما سے حصولِ علم میں مشغول ہوگئے تھے۔ بعد ازاں دوسرے بلاد و امصار کا سفر کیا اور مختلف فضلائے عصر کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ شیخ احمد امیٹھوی (متوفی ۹؍ ذوالقعدہ ۱۱۳۰ھ/ ۲۳؍ ستمبر ۱۷۱۸ء) سے جو ملا جیون کے عرف سے معروف تھے اور اپنے زمانے میں ہندوستان کے جلیل القدر عالم اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ بعض کتابوں کی تکمیل علامہ غلام نقشبندی لکھنوی (متوفی ماہ رجب ۱۱۲۶ھ/ جولائی ۱۷۱۴ء) سے کی۔ سند فراغت بھی ان سے حاصل کی۔ اس کے بعد شیخ جنید بن عبدالواحد امیٹھوی سے اخذ طریقت کیا۔ سید قادری بلگرامی (متوفی ۱۳؍ ربیع الاول ۱۱۴۵ھ/ ۲۳؍ اگست ۱۷۳۲ء) کے ساتھ حجازِ مقدس گئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ حج سے فارغ ہو کر ہندوستان واپس آئے تو سورت میں اقامت گزین ہو گئے اور اپنے آپ کو درس و تدریس اور افادۂ علما و طلبا کے لیے وقف کر دیا۔

اس ہندی عالم و فقیہ نے ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء کے بعد سفر آخرت اختیار کیا۔ سید غلام علی آزاد بلگرامی جن کی وفات ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء میں اورنگ آباد (دکن) میں ہوئی، لکھتے ہیں کہ بہت سی درسی کتابیں، جن میں مطولات اور مختصرات شامل ہیں، سید فرید الدین کے قلم سے تصحیح شدہ اور محشّٰی بلگرام میں موجود ہیں ❷۔

❶ الیانع الجنی، ص ۹۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

❷ مآثر الکرام، ص ۱۲۷، ۱۲۸۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۲۲۳۔

Marfat.com

۱۴۴۔ مولانا فصیح الدین پھلواروی

مولانا فصیح الدین بن ابویزید بن محمد فرید بن محمد حسین بن عطاء اللہ ہاشمی جعفری پھلواروی، ان کے بارے میں سید عبدالحی حسنی لکھنوی نزہۃ الخواطر میں حدیقۃ الازہار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ اپنے زمانے کے عالم وفقیہ اور شیخ تھے۔ پھلواری میں پیدا ہوئے جو ہندوستان کے صوبہ بہار کا مشہور شہر ہے اور جسے علم وفضل اور دعوت وارشاد کے سلسلے میں دیارِ ہند میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ پھلواری ہی میں نشوونما پائی۔ مدت تک اپنے شہر کے اساتذہ سے حصول علم میں مصروف رہے۔ پھر دہلی کا قصد کیا اور شیخ احمد امیٹھوی معروف بہ ملا جیون سے اخذ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے آبائی شہر پھلواری کو مراجعت کی اور سب امور سے منقطع ہو کر درس وافادہ کو مقصد حیات ٹھہرالیا۔

سید عبدالحی حسنی لکھنوی برصغیر پاک وہند کے نامور عالم شاہ سلیمان پھلواروی کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب موصوف سے میں نے سنا کہ مولانا فصیح الدین نے ملا عوض وجیہ سمرقندی سے تحصیل علم کی تھی۔ شاہ صاحب کا بیان ہے کہ میں نے یہ بات ایک شاہی فرمان میں دیکھی ہے جو مغل حکمران سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم نے ان کو بھیجا تھا[1]۔

مولانا فصیح الدین پھلواروی وہ عالم دین اور نامور فقیہ ہیں، جو عہد عالم گیری میں فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی باکمال جماعت میں باقاعدہ طور پر شامل تھے۔ اس کا ذکر جناب عون احمد صاحب قادری نے ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''ملا فصیح الدین کا وطن بہار کا ایک مردم خیز قصبہ پھلواری تھا۔ وہ اہل پھلواری کے مورثِ اعلیٰ حضرت امیر عطاء اللہ جعفری کے پڑپوتے تھے۔ تحصیل علم کے لیے دہلی گئے اور ملا عوض وجیہ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر تکمیل کی۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر کا عہد تھا۔ استاد دربارِ شاہی کے ممتاز لوگوں میں سے تھے۔ ملا فصیح الدین اپنے استاد کے ذریعے عالم گیر کے دربار میں پہنچے اور اپنے تبحر علمی کی بناپر فتاویٰ عالم گیری کی تدوین میں شریک کیے گئے۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے ان کی علمی قابلیت اور جوہر ذاتی کی قدر کر کے مددِ معاش میں ایک سو بیگہ اراضی اور ایک روپیہ یومیہ خرچ کے لیے عطا فرمایا۔

''جب دہلی سے اپنے وطن پھلواری واپس آئے تو اپنے آبائی مدرسے میں درس دینا شروع کیا۔ ان کے آبائی مدرسے کا تذکرہ بھی اگلے دور کی کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ مدرسہ مسجد سنگی سے اتر کی جانب تھا۔ اس میں حضرت امیر عطاء اللہ کی اولاد سے علما وفضلا درس دیا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۹ء تک نہایت عروج کے ساتھ آباد رہا۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۳، ۲۲۴۔

Marfat.com

''ملا فصیح الدین کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ پھلواری کے متقدمین علما میں ان کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد کثیر تھی۔ ارشد تلامذہ میں موصوف کے چاروں صاحب زادے اور قاضی حیات مرید اور ملا غلام شرف الدین قابل ذکر ہیں۔

''بڑے لڑکے ملا صبیح الدین ان کے بعد مسند درس پر بیٹھے اور بہت سے لوگوں نے ان سے علمی فیض حاصل کیا۔ ان کے بعد اس مسند پر ان کے بھانجے ملا مبین جعفری بیٹھے جو بہ یک واسطہ ملا نظام الدین فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ ملا مبین کے بعد ملا فصیح الدین کی مسند تدریس کچھ دنوں خالی رہی۔ پھر ان کے بھائی ملا معین کے پوتے مولانا حافظ الغنی اس پر جلوہ افروز ہوئے اور ساٹھ برس تک اس مسند پر درس دیتے رہے۔

''ملا فصیح الدین نے ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء میں وفات پائی اور مسجد سنگی کے مشرقی جانب مقبرے میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

''ملا فصیح الدین کے صاحب زادے ملا صبیح الدین کے نام سلطان عالم گیر کی طرف سے جو فرمان تھا، اس میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ فرمان طویل ہے۔ یہاں اس کا وہ حصہ نقل کیا جاتا ہے، جس میں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

''دریں وقت میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ یک روپیہ یومیہ از خزانہ بلدہ عظیم آباد صوبہ بہار و یک صد وبست بیگہ زمین از پرگنہ پھلواری مضاف صوبہ بہار در مدِ معاش بصلائے تدوین فتاویٰ بنام ملا شیخ فصیح الدین مقرر بود۔ الحال بمتعلقانِ ملا مذکور متوف بلا قید اسامی دیدہ و دانستہ حسب الضمن مقرر شد۔''

''یہ فرمان ملا فصیح الدین کے انتقال کے بعد (۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) ۱۵ر رجب دوشنبہ ۱۱۲۰ھ/ ۱۹ر ستمبر ۱۷۰۸ء کو تجدید کیا گیا تھا۔ ملا فصیح الدین کے نام جو فرمان تھا اس میں بھی ان کی شرکت کا ذکر تھا، مگر وہ ضائع ہو گیا۔''

مولانا فصیح الدین پھلواروی کے بارے میں مولانا سید غلام حسنین شاہ پھلواروی نے بھی ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں ایک مختصر سا مضمون تحریر کیا تھا، جو درج ذیل ہے:

''حضرت ملا فصیح الدین جعفری پھلواروی کا جامعین فتاویٰ عالم گیری میں ہونا یہاں کی خاندانی روایات پر مبنی ہے اور یہ روایت تحریر میں آئی تو بہت بعد میں۔ ان کے ہم عصروں میں سے یا ان کے متصل مؤلفین میں سے کسی کا نوشتہ موجود نہیں ہے۔ اس زمانے کا عام مذاق یہ تھا کہ تذکروں میں بزرگوں کے محض کشف و کرامات کا منضبط کر لینا کافی سمجھتے تھے۔ لیکن پھر بھی اہل علم خاندان میں جو روایت مسلسل چلی آ رہی ہو وہ بالکل بے اصل اور غیر وقیع نہیں ہو سکتی۔ اس خاندان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے روایت کے وزن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

''اس خاندان کے مورث خواجہ عطاء اللہ عہد ہمایوں و اکبری میں یہاں (پھلواری میں) آ کر مقیم ہوئے۔ خاندانی روایت کے بموجب تو یہ وزرائے شاہی میں سے تھے، لیکن وہاں ان کی کوئی اہم حیثیت ضرور تھی۔

Marfat.com

''ابوالفضل کے اکبرنامہ میں بضمن وقائع ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء خواجہ عطاء اللہ کا نام بھی ایک جگہ پر مذکور ہے۔ خدابخش خاں صاحب مرحوم کی لائبریری میں شاہان وزرائے مغلیہ کے ساتھ ایک مرقع امیر عطاء اللہ کا بھی البم کی شکل میں موجود ہے۔ شیر شاہی خاندان کی تباہی کے بعد مغل سلاطین نے رہتاس سے لے کر راج گیر تک پٹنہ کے جنوب میں بہت سے مغل، شیوخ اور راجپوت خاندان مختلف مناصب کے ساتھ آباد کر دیے تھے تاکہ پٹھانوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیں۔ اسی زمانے میں خواجہ عطاء اللہ بھی دہلی سے یہاں آئے۔ یہ عبداللہ ابن جعفر طیار کی اولاد سے تھے، اسی لیے یہ خاندان جعفری کہلاتا ہے۔ امیر عطاء اللہ نے یہاں سنگ سرخ کی ایک مسجد بنوائی جو اب تک پھلواری کی جامع مسجد ہے، جہاں جمعہ و اعیاد کی سب سے بڑی جماعت ابھی تک ہوتی ہے اور خاکسار راقم الحروف کے زیر تولیت ہے۔ اسی مسجد میں ملا فصیح الدین درس و افتا کا مشغلہ رکھتے تھے اور اسی سے متصل ان کا مزار بھی ہے۔ چنانچہ شاہ عالم اول فرزند و جانشین عالم گیر نے از روئے فرمان مجریہ ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء ملا فصیح الدین کے لیے وظیفہ مقرر کیا تھا جو از روئے پروانگی و بمہر ''اخلاص خاں'' ملا صاحب موصوف کے فرزندوں کو ملا تھا۔ اس کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

''......ملا مذکور شاگرد اخوند ملا عوض وجیہ...... متوطن قصبہ پھلواری سرکار و صوبہ بہار فاضل و متوکل است، نیم روپیہ و بست بیگہ زمین [1] مدد معاش از سابق دارد بخرچ وفا نمی کند امیدوار از تفصیلات ____ و یومیہ مسجد بآں قصبہ بنا کردۂ جد مشار الیہ مقرر است نیم روپیہ یومیہ بدستور اصل و بست بیگہ زمین مزروع اضافہ مرحمت شد و نیم روپیہ یومیہ مسجد دیدہ و دانستہ۔''

''اس فرمان سے ظاہر ہے کہ ملا فصیح الدین پھلواروی شہنشاہ عالم گیر کے ہم عصر تھے اور فاضل متعارف تھے۔ نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ خاندان کئی پشت سے دربار شاہی سے متعلق تھا۔ پس فتاویٰ عالم گیری کے جمع کرنے میں انھوں نے بھی کچھ خدمت انجام دی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، بلکہ ایسا ہونا بہت ہی قرین قیاس ہے۔ تاریخ تو بہت سے خاندانی رواجوں، روایتوں اور انفرادی نوشتوں، دفینوں اور سفینوں کو اکٹھا کر کے بنائی جاتی ہے۔ پھر پھلواری کے ذی علم و مقتدر خاندان کی روایت تاریخ کا ماخذ کیوں نہیں بن سکتی [2]۔

نزہۃ الخواطر اور ''معارف'' کی ان دونوں تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا فصیح الدین پھلواروی بارھویں صدی ہجری کے متعارف فقہائے ہند میں سے تھے۔

۱۴۵۔ سید فضل اللہ کالپوی

سید فضل اللہ بن احمد بن محمد بن ابوسعید حسینی ترمذی کالپوی کا شمار علمائے مشاہیر اور فقہائے نام دار میں ہوتا تھا۔ مولد و منشا کالپی ہے۔ ان کے والد سید احمد بن محمد (متوفی ۱۹ر صفر ۱۰۸۴ھ/۲۶ر مئی ۱۶۷۳ء) بھی عالم

---

[1] یہ لفظ غالباً ''یک روپیہ و یک صد و بست بیگہ زمین'' ہے۔

[2] ماخوذ از معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۴۷ء۔ نیز ملاحظہ ہو، برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۳۰ تا ۳۳۴۔

Marfat.com

دین تھے۔ لائق بیٹے نے فقہ کی تعلیم باپ سے حاصل کی، اخذ طریقت بھی انہی سے کیا اور والد کی وفات کے بعد مسند مشیخت پر بیٹھے۔ سید فضل اللہ سے بھی خلق کثیر نے فیض حاصل کیا ۱۴/ ذو القعدہ ۱۱۱۱ھ/ ۲۳/ اپریل ۱۷۰۰ء کو فوت ہوئے ❶۔

۱۴۶۔ شیخ فضل اللہ پرنیوی

شیخ فضل اللہ بن محمد فاضل بن رکن الدین پرنیوی، فضل وصلاح کے پیکر اور اپنے عہد کے عالم وفقیہ تھے۔ علاقہ بنگال کے ایک مقام ''پرنیہ'' میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ حصول علم کے شوق میں صغرسنی ہی میں جون پور آ گئے تھے، جس کو علم وعلما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اکثر درسی کتابیں شیخ محمد ارشد عثمانی جون پوری (متوفی ۲۴/ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۳ھ/ ۱۵/ نومبر ۱۷۰۱ء) سے پڑھیں، جو صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۱۹/ رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ/ ۲۹/ دسمبر ۱۶۷۲ء) کے فرزند رشید اور اس عہد کے جلیل القدر عالم تھے۔ کچھ کتابوں کے لیے بعض دیگر علما کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اخذ طریقت بھی شیخ محمد ارشد سے کیا اور مشیخت وتصوف کے مرتبہ بلند کو پہنچے۔ تکمیل علم اور حصولِ فیض کے بعد شیخ محمد ارشد نے انھیں وثیقۂ خلافت لکھ کر دیا اور اپنے وطن پرنیہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ وطن جا کر شادی کی اور درس وافادہ میں کمربستہ ہو گئے۔ اس اثنا میں ان سے بہت سے علما وطلبا نے استفادہ کیا۔

ارضِ بنگال کے اس عالم وفقیہ کو چہارشنبہ کے روز ۹/ رمضان المبارک ۱۱۸۰ھ/ ۸/ فروری ۱۷۶۷ء کو اپنے شہر پرنیہ میں شہید کیا گیا اور مکان کے قریب ہی دفن کیے گئے۔ منقول ہے کہ ان کی تصانیف بھی تھیں، لیکن اس ہنگامے میں ضائع ہو گئیں ❷۔

۱۴۷۔ مولانا فضل اللہ بہاری

شیخ فضل اللہ بن ابوالفضل بہاری فقہ واصول اور علوم عربیہ کے جید علما میں سے تھے۔ عالم شباب میں بہار سے فرخ آباد چلے گئے تھے۔ بعض کتب درسیہ قاضی محمد مربی حسینی پھانوی سے پڑھیں۔ پھر بعض دیگر بلاد کے سفر کو نکلے اور علامہ محمد حسن بن غلام مصطفیٰ لکھنوی (متوفی ۳/ صفر ۱۱۹۹ھ/ ۱۶/ ستمبر ۱۷۸۴ء) کے درس میں شریک ہوئے اور باقی درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ حصولِ علم کے بعد فرخ آباد کا رخ کیا اور شیخ کرامت اللہ واعظ دہلوی کی صاحب زادی سے نکاح کیا۔ نہایت قانع، پاک باز اور متدین عالم تھے۔ شب وروز درس وافادہ میں سرگرم عمل رہتے۔ تاریخ فرخ آباد کے مصنف مفتی ولی اللہ بن احمد علی حسینی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے متوسطات

❶ عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور سیاسی تاریخ، ص ۲۶۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۵۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۵ بحوالہ گنج ارشدی۔

Marfat.com

کتب درسیہ میں سے بعض کتابیں پڑھیں۔

شیخ فضل اللہ بہاری نے ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸ء میں فرخ آباد میں انتقال کیا[1]۔

۱۴۸۔ سید فیروز جائسی

سید فیروز بن جنید بن عبدالرحمٰن بن کمال بن جلال اشرفی جائسی، شیخ اور فاضل کبیر تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ شہر جائس میں مسند درس پر فائز تھے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے حصول علم کیا[2]۔

۱۴۹۔ خواجہ فیض الحسن سورتی

خواجہ فیض الحسن کا سلسلۂ نسب یہ ہے: فیض الحسن بن نور الحسن بن محمد بن ابوالحسن بن جمال الدین حسینی سورتی، ۱۰۹۸ھ/ ۱۶۸۷ء میں سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ سورت ہی کے علما سے علم حاصل کیا اور بحث و اشتغال میں سرگرم ہوئے، یہاں تک کہ فقہ و اصول میں تمام معاصرین و اقران سے سبقت لے گئے۔ مسائل فقہ میں استحضار کا یہ عالم تھا کہ فتاویٰ نقشبندیہ تصنیف کیا۔ نیز شرح خلاصۃ الکیدانی الموسوم بہ فرخ شاہی تصنیف کی۔ یہ وہ عالم دین ہیں جو فضل و صلاح میں مشہور تھے اور باکمال آدمی تھے۔ ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء کو سورت میں فوت ہوئے[3]۔

ـــــ ق ـــــ

۱۵۰۔ سید قاسم دہلوی

سید قاسم بن ہاشم بن حسن حسینی دہلوی اپنے زمانے کے عالم و فقیہ اور شیخ تھے۔ درحقیقت نارنول سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان کے دادا سید حسن جو علما و شیوخ کے حلقوں میں سید حسن رسول نما کے نام سے معروف تھے، نارنول سے دارالسلطنت دہلی منتقل ہوگئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔

سید قاسم فضلا و اعیانِ علمائے ہند میں سے تھے۔ دن رات درس و تدریس میں منہمک رہتے۔ اس سے وقت ملتا تو عبادت اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ فقرا کے لباس میں ملبوس رہتے اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا[4]۔

---

1. نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۶۔ عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ، ص ۲۳۴۔
2. نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۷، بحوالہ التحائف الاشرفیہ۔
3. حدیقۃ احمدیہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۷، ۲۲۸۔
4. نزہۃ الخواطر، ج ۶، ۲۲۹، بحوالہ بحر زخار۔

Marfat.com

۱۵۱۔ مولانا قطب الدین شہید سہالوی

لکھنؤ سے تیس بتیس میل کے فاصلے پر ایک بستی ''سہالی'' کے نام سے موسوم ہے۔ کسی زمانے میں یہ بستی علم و علما کا مرکز اور فضل و کمال کا سرچشمہ کہلاتی تھی۔ گزشتہ تین سو سال سے برصغیر کے عربی اور دینی مدارس میں درس نظامی کے نام سے جو طریق تدریس جاری ہے، اس کے مرتب اسی بستی کے ایک عالم دین مولانا نظام الدین انصاری سہالوی تھے اور وہ انہی سرعنوان مولانا قطب الدین شہید سہالوی کے فرزند رشید تھے۔ وہ درس نظامیہ کا جو کابل سے لے کر راس کماری تک تمام مدارس عربیہ میں تین صدیوں سے جاری ہے، اس کے بانی اگرچہ مولانا نظام الدین انصاری سہالوی تھے، لیکن ان سے قبل زیر تذکرہ بزرگ اور ان کے والد مولانا قطب الدین شہید سہالوی نے بھی اس کو ایک خاص اندازِ ترتیب بخشا تھا۔

مولانا قطب الدین شہید سہالوی علامہ وقت، معقول و منقول کے ماہر اور بارھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے جلیل القدر فرد تھے اور انصاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

اسلام جب حدودِ عرب سے نکل کر دیگر ممالک میں پھیلنا شروع ہوا تو عرب کے بہت سے خاندان جو ہجرت کر کے ان ممالک میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، ان میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے خاندان کے لوگ بھی شامل تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ نے ہرات کو اپنا مسکن ٹھہرالیا تھا۔ انہی میں سے ایک شخص علاء الدین انصاری نے ہرات سے ہندوستان کا رخ کیا اور اس ملک میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔ ان کا مدفن قصبہ ''برناوہ'' میں ہے جو دہلی اور متھرا کے راستے میں واقع ہے۔ انہی علاء الدین کی نسل سے ایک عالم دین شیخ نظام الدین انصاری ہوئے ہیں، جو لکھنؤ سے تیس بتیس میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں ''سہالی'' چلے گئے تھے۔ شیخ موصوف مستقل طور سے یہاں رہنے لگے اور درس و تدریس میں سرگرم عمل ہوئے۔ بعد میں درس نظامیہ کے نام سے عربی دینی مدارس کے لیے مستقل نصاب مرتب کیا، جو اب تک برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے مدارسِ دینیہ میں باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے اور اپنے مرتب کے اسم گرامی کی مناسبت سے اسی نام کے ساتھ موسوم ہے۔

اس خاندان کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ دیارِ ہند میں کئی صدیوں سے اس کو سرچشمہ فضل و کمال کی حیثیت حاصل ہے۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ حافظ تھے جو علم و عمل کی دنیا میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ مغلیہ حکومت کا یہ ایک زریں کارنامہ تھا کہ پورے ملک میں ہر مقام پر وقائع نویس موجود رہتے تھے، یہ اہم کام بھی ان کے فرائض میں شامل تھا کہ بادشاہ کو یہ اطلاع دیتے رہیں کہ اصحاب علم اور اربابِ کمال کہاں کہاں موجود ہیں اور کیا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جوں ہی بادشاہ ان کے مرتبۂ علمی سے آگاہ ہوتا، ان لوگوں کے لیے جاگیریں مقرر ہو جاتیں، جن کی مال گزاری ان کے لیے معاف کر دی جاتی۔ شہنشاہ اکبر کو شیخ حافظ کے بارے میں وقائع نویس نے اطلاع دی تو فرمانِ شاہی کے ذریعے ان کی

Marfat.com

بھی جاگیر مقرر ہو گئی اور مال گزاری معاف کر دی گئی۔ اغصانِ اربعہ کے مصنف ولی اللہ کے بیان کے مطابق بادشاہ نے اس فرمان میں شیخ کے بارے میں نہایت تعظیم کے الفاظ استعمال کیے۔ شیخ حافظ نے جو مدرسہ قائم کیا، اس میں طلبا کے قیام و طعام کا باقاعدہ انتظام تھا اور تمام مصارف کی کفالت خود شیخ موصوف کرتے تھے۔

مولانا قطب الدین شہید چوتھی پشت میں انہی شیخ حافظ کی نسل سے تھے۔ مولانا ممدوح کے والد کا اسم گرامی شیخ عبدالحلیم انصاری اور دادا کا نام نامی عبدالکریم انصاری تھا۔ شیخ عبدالحلیم لاہور کے مدرسے میں مدرس تھے۔ لائق بیٹے نے اسی زمانے میں ان سے علم حاصل کیا۔ وہ صغرسنی ہی میں حصولِ علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے دور کے جلیل القدر علما سے تحصیل کی اور علوم متعارفہ کے لیے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد صالحیت و طریقت میں بھی مرتبہ کمال کو پہنچے۔ بعدازاں خود مسند تدریس آراستہ کی اور سرگرم درس و افادہ ہوئے۔ نہایت عابد و زاہد اور متدین عالم دین تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن کو درس دیتے اور شب کو مشغول عبادت ہو جاتے۔ ہفتے میں دو دن سہ شنبہ اور جمعۃ المبارک کو تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے۔ ملوک و امرا سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ان کے فضل و کمال کا چرچا بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر تک پہنچا تو اس نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، لیکن اس درویش صفت عالم نے اپنے اسلاف کی روایات کو ترک کرنا اور گوشۂ عزلت کو چھوڑ کر حکمرانوں کے دربار میں جانا مناسب نہ سمجھا۔

مولانا قطب الدین کا ایک خاص اسلوبِ درس تھا، جو خود انہی کا قائم کردہ تھا۔ وہ ہر فن کی صرف ایک مستند اور جامع کتاب پڑھاتے تھے اور اس سے شاگرد کو اس فن کے تمام مسائل پر عبور حاصل ہو جاتا تھا۔ اس ضمن میں مولانا عبدالاعلیٰ رسالہ قطبیہ میں لکھتے ہیں:

مولانائے شہید از ہر فن یک یک کتاب می خوانیدند، شاگردان محقق می شدند۔

یعنی مولانا قطب الدین ہر فن کی ایک ایک کتاب اس طریقے سے پڑھاتے تھے کہ شاگرد محقق کے مرتبے پر پہنچ جاتے۔

شہادت:

مولانا قطب الدین سہالوی کو درجہ شہادت نصیب ہوا تھا، اس لیے لفظ ''شہید'' ان کے نام کے ساتھ اس طرح التزام سے لکھا جاتا ہے کہ یہ لفظ گویا ان کے نام کا جز ہو گیا ہے۔ شہادت کی جو تفصیلات ان کے سوانح نگاروں نے لکھی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

سہالی میں دو خاندان آباد تھے، ایک عثمانی خاندان اور دوسرا انصاری خاندان، جو مولانا قطب الدین کا خاندان تھا۔ سہالی کے گرد و نواح میں خان زادے مقیم تھے۔ ان کا سہالی کے ایک شخص محمد آصف چودھری سے جو انصاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے، زمین کی سرحدوں کے سلسلے میں ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔ محمد آصف وہاں کے

Marfat.com

ممتاز زمیندار اور مولانا قطب الدین کے سسر تھے۔ اس تعلق کی بنا پر خان زادوں کو مولانا ممدوح سے بھی عداوت ہوگئی تھی، لیکن مولانا کو چوں کہ سلطان اورنگ زیب کے دربار میں بے حد عزت و تکریم حاصل تھی، لہٰذا یہ لوگ انھیں کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ سوئے اتفاق سے سہالی میں عثمانی خاندان کے جو لوگ آباد تھے، ان کے اور محمد آصف انصاری کے مابین موضع بلرن کی آب پاشی کے بارے میں نزاع پیدا ہوگیا۔ اس قسم کے نزاع باشندگانِ دیہات کے لیے نہایت خطرناک نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ یہاں بھی بالآخر یہی صورت حال سامنے آئی اور فریقین کی طرف سے شدومد کے ساتھ تیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن مولانا قطب الدین بیچ میں پڑے اور دونوں طرف کے لوگ واپس چلے گئے۔

یہ بالکل عارضی سی بات تھی۔ اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ موقع پا کر سہالی کے نواح میں رہنے والے خان زادوں نے سہالی پر پھر چڑھائی کر دی اور کئی سو آدمی گاؤں میں گھس آئے۔ انھوں نے انصاریوں کے خلاف عثمانی خاندان کے لوگوں کو خوب بھڑکایا اور کہا کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں، تم محمد آصف پر حملہ کردو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے مل کر محمد آصف کے مکان پر ہلہ بول دیا۔ ایک روایت کے مطابق وہ اس وقت ایک تقریب کے سلسلے میں اپنے داماد مولانا قطب الدین کے گھر گئے تھے۔ سنگ دل حملہ آوروں نے مولانا کے مکان پر یلغار کر دی اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ دیواروں میں نقب لگائی اور اندر گھس گئے۔ پھر تیروں، بندوقوں اور تلواروں کے اس طرح مسلسل وار کیے کہ مولانا موصوف جام شہادت نوش کر گئے۔

یہ واقعہ دوشنبہ کے روز ماہ رجب ۱۱۰۳ھ/ مارچ ۱۶۹۲ء میں پیش آیا۔ اس وقت ان کی عمر تریسٹھ سال کی تھی۔

مولانا کے ساتھ چند طلبا بھی جو اس وقت مشغولِ درس تھے، شہید کر دیے گئے۔ ستم گروں نے اس خوں ریزی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے گھر کا مال و اسباب بھی لوٹ لیا اور ان کا کتب خانہ بھی جو اس زمانے میں سیکڑوں کتابوں پر مشتمل تھا، جلا کر برباد کر دیا۔ مولانا کی لاش اور محمد آصف کا سر ساتھ لے گئے۔ تین چار دن کے بعد مولانا کے دونوں ہاتھ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیے اور لاش سہالی بھیج دی۔ چنانچہ ۲۷ ؍ رجب ۱۱۰۳ھ/ ۴؍ اپریل ۱۶۹۲ء کو نماز جنازہ پڑھ کر تجہیز و تکفین کی گئی۔

بعض تذکروں میں اس طرح مرقوم ہے کہ مخالفین نے پہلے چودھری محمد آصف کے مکان پر حملہ کیا۔ وہ مولانا کے پاس اعانت و مشورت کے لیے آئے تھے، مخالفوں نے تعاقب کیا اور ان کے ساتھ مولانا کو بھی شہید کر دیا۔

ایک روایت یہ ہے کہ شیخ قطب الدین کے دادا محترم نے عثمانی خاندان کے ایک غریب آدمی کو اپنی زمین میں جگہ دی۔ پھر آہستہ آہستہ ایک وقت آیا کہ اس شخص کی اولاد مال دار ہوگئی اور سہالی کے نواح میں کئی دیہات ان کی ملکیت میں آگئے۔ بعد میں دونوں فریقوں کے درمیان جھگڑا ہوگیا، جس کے نتیجے میں مولانا

Marfat.com

قطب الدین ان کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ ان کا مکان نذرِ آتش اور کتب خانہ تباہ کر دیا گیا اور ان کے بیٹے نظام الدین کو، جو آگے چل کر درسِ نظامیہ کے بانی بنے اور اس وقت صرف چودہ سال کی عمر کے تھے، گرفتار کر لیا گیا۔

جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت مولانا قطب الدین کے تین صاحب زادے موجود تھے۔ ایک محمد رضا، دوسرے نظام الدین، تیسرے محمد سعید۔ یہ اس جھگڑے میں زخمی ہو گئے تھے اور باپ کی شہادت کی اطلاع دینے کے لیے شہنشاہ اورنگ عالم گیر کے پاس گئے تھے جو اس زمانے میں علاقہ دکن میں تھا۔

مولانا موصوف کے ان صاحب زادوں نے باپ کی شہادت کے بعد بادشاہ کی خدمت میں ایک محضر لکھا، جس میں واقعہ کی پوری تفصیل بیان کی۔ اس پر سب مشہور علما، رؤسا اور عمالِ شاہی کے دستخط ثبت ہیں۔ اس محضر میں تمام واقعات اور قاتلوں کے نام درج ہیں۔ یہ محضر نہایت درد انگیز اور الم ناک ہے۔ چوں کہ یہ ایک بہت بڑی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا بعینہٖ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بحکم آیۂ کریمہ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ۔ سوال می کنم و گواہی می خواہم با جماعۂ ستم رسیدگان محمد سعید و نظام الدین و محمد رضا پسران مولوی قطب الدین ساکن قصبہ سہالی سرکار لکھنؤ صوبہ اودھ از قضاۃِ اسلام و مشائخ کرام و جمہورِ انام برایں معنی کہ بر اصاغر و اکابر ایں دیار روشن و ہویدا است کہ مولوی مذکور موصوف بکمالات انسانیہ و فضائل علمیہ و عملیہ و حافظ قرآن مجید بودند، و غیر اشغال تدریس و تکرار باطلبۂ علوم دینیہ و عبادت و طاعت کارے نداشتند، و در اوقات فراغ از درس و عبادت بہ تصنیف در علم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول می پرداختند، بتاریخ رجب المرجب سن ۱۱۰۳ھ/ مارچ ۱۶۹۲ء مطابق روز دوشنبہ بر عادتِ قدیمہ از نمازِ فجر و وظائف فراغ اندوختہ در مدرسہ آمدہ، بدرس جمیع از فضلائے حاضر الخدمت مشغول شدند، چوں دو گھڑی روز برآمد، اسد اللہ و باقر و پیر محمد سکنہ روضہ عملۂ پرگنہ سہالی، و نور و غلام محی الدین بساون، و ساون ساکنان قصبہ سہالی و فقیر اللہ متوطن قصبہ دیوا، و انور ساکن استی معمولہ پرگنہ بجنور وغیرہ زمینداران گرد و پیش خانہ مولوی را محاصرہ نمودند و از ہر چہار طرف دیوار نقبہا زدہ اندرون در آمدند و مولوی را ایک زخم تیر و یک زخم تفنگ و ہفت ضرب شمشیر براو رسانیدہ، شہید ساختند، و شیخ غلام محمد نبیرۂ زبدۃ الاولاد بندگی شیخ نظام الدین ساکن امیٹھی و دیگر شیخ شرف اللہ ساکن سندیلہ کہ بخواندنِ فاتحۃ الفراغ در خدمت بودند نیز از دست ظلمۂ مذکورین شہید شدند۔ و محمد آصف چودھری پرگنہ سہالی کہ برائے مدد مولوی رسیدہ، با ہمراہیانِ خود شہید شدند۔ بندہ محمد سعید و جمعے از طلبا و شیخ فضل اللہ برادر نائب قاضی عبد اللہ قاضی پرگنہ سہالی وغیرہ زخمی شدند۔

پس از آنکہ جملۂ مذکورین از قتل و نکارح فراغ شدند، بہ نہب اموال و امتعہ کہ در حویلی بود پرداختند، چنانچہ اثرے ازاں نگزاشتند۔ و کتب مولوی وغیرہ از مردم کہ قریب آں مجتمع بود اکثرے ازاں آتش دادہ سوختند، درآں میان مصحف مجید چہار جلد و مشکوٰۃ وغیرہ از کتب احادیث و مصنفات مولوی حاشیہ تلویح، شرح عقائد نسفیہ و

Marfat.com

تعریفات بزدوی و حاشیہ مطول وغیرہ کتب کثیر الحجم مشتمل بر فوائد جمیلہ بودند، ہمہ سوختہ شد و ہمہ را بردند۔ با مستورانِ مولوی و برادران بانواع ہتک حرمت پیش آمدند۔ بعدازاں برخانہ شیخ حسام الدین عم زادِ حقیقی مولوی وغیرہ برادران و مردم غربا سکنہ قصبہ سہالی برریختند، مال ومتاع ہرچہ بود بغارت بردند۔

چوں وقت دو پہراز کارہائے مسطور فارغ شدند و مراجعت بمسکن خود کہ موضع پینتی پور معمولہ پرگنہ فتح پور و دیوا وغیرہ باشد نمودند، بندہ نظام الدین پسر خرد مولوی را اسیر کردہ ہمراہ گرفتند، ونعش مولوی و سر محمد آصف چودھری نیز باخود بموضع مذکور بردند۔ بعدازسہ چہار روز از الحاح و عجز بعضے شرفائے فتح پور و دیوا بندہ نظام الدین را خلاص نمودند، و سر محمد آصف دادند ونعش مولوی را جا بجا مدفون می کردند ومی برآوردند۔ آخر بعد نہ روز ہر دو دست بریدہ گرفتند ونعش بہ قصبہ سہالی فرستادند۔ چنانچہ جمع از مسلمین نماز جنازہ خواندہ بتاریخ بست وہفتم شہر مذکور در قصبہ سہالی مدفون ساختند ❶۔

فارسی زبان کی اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

ہم مظلومین محمد سعید، نظام الدین اور محمد رضا پسرانِ مولانا قطب الدین ساکن قصبہ سہالی سرکار لکھنؤ صوبہ اودھ پر جو ستم ڈھایا گیا ہے، اس کے متعلق ہم آیت مبارکہ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ❷ کی رو سے قضاتِ اسلام، مشائخ کرام اور تمام لوگوں سے سوال کرتے ہیں اور گواہی طلب کرتے ہیں کہ اس نواح کے تمام چھوٹے بڑوں پر یہ بات روشن اور واضح ہے کہ مولانا قطب الدین کمالاتِ انسانی اور فضائل علمی و عملی سے متصف تھے۔ وہ قرآنِ مجید کے حافظ تھے اور درس و تدریس، طلبا سے علوم دینیہ کے مباحث و تکرار اور عبادت و اطاعت الٰہی کے سوا کسی کام سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ ان کا یہ معمول تھا کہ درس و عبادت سے فارغ اوقات میں علم تفسیر و حدیث اور فقہ و اصول پر مشتمل کتابوں کی تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے۔ دوشنبہ کے روز ماہ رجب ۱۱۰۳ھ/ مارچ ۱۶۹۲ء کی ایک تاریخ کو نمازِ فجر اور وظائف سے فارغ ہو کر اپنے معمول کے مطابق مدرسے میں تشریف لائے اور ان تمام فضلائے کرام کو جو حاضر خدمت تھے، درس دینے لگے۔ ابھی دو گھڑی سورج چڑھا کہ سہالی کی نواحی بستی کے اسد اللہ، باقر اور پیر محمد، قصبہ سہالی کے نور، غلام محی الدین، بساون اور ساون، قصبہ دیوا کا فقیر اللہ، موضع استی علاقہ بجنور کے انور وغیرہ اور گرد و پیش کے دوسرے زمینداروں نے مولانا کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور چاروں طرف سے دیواروں میں نقب لگا کر اندر گھس آئے۔ مولانا کو ایک زخم تیر کا، ایک بندوق کا لگایا اور سات وار تلوار کے کیے، جس سے وہ شہید ہو گئے۔ شیخ نظام الدین ساکن امیٹھی کے نبیرۂ گرامی شیخ غلام محمد اور شیخ شرف اللہ ساکن سندیلہ بھی جو فاتحہ فراغت کے لیے مولانا کی

❶ منقول از مقالات شبلی، ج ۳، ص ۱۱۰، ۱۱۱۔

❷ یہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۳ کے چند مبارک الفاظ ہیں، جن کا ترجمہ یہ ہے کہ شہادت کو مت چھپاؤ، جو اسے چھپاتا ہے، اس کا دل گناہ گار ہے۔

Marfat.com

خدمت میں حاضر تھے، ظالموں کے دست تظلم سے جام شہادت نوش کر گئے۔ محمد آصف چودھری بھی جو مولانا کی مدد کو آئے، اپنے ساتھیوں سمیت شہید کر دیے گئے۔ مجھ محمد سعید اور تمام طلبا اور شیخ فضل اللہ کو جو سہالی کے نائب قاضی، قاضی عبداللہ کے بھائی تھے اور دیگر لوگوں کو زخمی کر دیا۔

ان مذکورہ بالا لوگوں کو قتل اور زخمی کرنے کے بعد حویلی پر دھاوا بول دیا اور تمام سامان لوٹ لیا۔ کوئی چیز بھی باقی نہ چھوڑی۔ مولانا کی اور ان دیگر لوگوں کی کتابیں، جو ان کے پاس رہتے تھے، سب نذرِ آتش کر دیں۔ ان میں سے چار قرآنِ مجید اور کتب حدیث میں سے مشکوٰۃ وغیرہ پر مشتمل جو ذخیرۂ احادیث موجود تھا، سب جلا کر خاکستر کر دیا۔ خود مولانا کی تصانیف مثلاً حاشیہ تلویح، شرح عقائد نسفی، تعریفات بزدوی اور حاشیہ مطول وغیرہ سب کتابیں جو بڑی ضخیم تھیں اور بہترین فوائد و مضامین پر مشتمل تھیں، ایک ایک کر کے آگ میں جلا ڈالیں یا لوٹ لیں اور ضائع کر دیں۔ مولانا کے گھر کی خواتین اور اقارب کی بھی بہت توہین کی اور ان سے نہایت ہتک آمیز سلوک روا رکھا۔

اس کے بعد مولانا کے چچا زاد بھائی شیخ حسام الدین اور دوسرے عزیزوں کے گھروں کا رخ کیا۔ وہاں بھی جی بھر کر لوٹ مار کی۔ اس سے بھی صبر نہ آیا تو قصبہ سہالی کے دیگر غربا کو تختۂ مشق ستم بنایا، ان کا مال و متاع لوٹ لیا اور جو چیز نظر آئی غارت کر دی۔

جب یہ لوگ دوپہر کے وقت اس قتل و غارت سے فارغ ہوئے تو اپنے مسکن موضع پینتی پور، جو کہ پرگنہ فتح پور اور دیوا کے نواح میں واقع ہے، جاتے ہوئے مجھ نظام الدین کو جو مولانا قطب الدین کا ایک خرد سالہ بیٹا ہے، گرفتار کر کے اور مولانا کی نعش نیز محمد آصف چودھری کا سر تن سے جدا کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ تین چار روز کے بعد فتح پور اور دیوا کے بعض شرفا و نجبا کی منت و عاجزی سے مجھ نظام الدین کو رہا کیا اور محمد آصف کا سر واپس لٹایا۔ مولانا کی نعش کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اسے جگہ جگہ دفن کرتے اور نکالتے رہے۔ بالآخر نو دن کے بعد ان کے دونوں ہاتھ کاٹ کر رکھ لیے اور نعش سہالی بھیج دی، جہاں تمام مسلمانوں نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور ۲۷ / رجب ۱۱۰۳ھ / ۴ / اپریل ۱۶۹۲ء کو انھیں سہالی میں دفن کیا گیا۔

مولانا سے عداوت اور قتل کی وجہ:

تذکرہ نگاروں نے مولانا قطب الدین کی مخالفت اور قتل کی کوئی معقول وجہ بیان نہیں کی اور اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ یہ گروہ یکایک مولانا سے کیوں عداوت پر اتر آیا تھا۔ چودھری محمد آصف سے تو دشمنی اور مخالفت کی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے، لیکن مولانا قطب الدین کی حیثیت تو بالکل دوسری تھی۔ وہ ایک درویش منش اور گوشہ گیر آدمی تھے، ان سے آخر کیوں اس قدر عداوت ہوئی کہ معاملہ بے حد سنگین نوعیت اختیار کر گیا اور انھیں نہایت سفاکی اور بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

Marfat.com

مولوی ولی اللہ فرنگی محلی لکھنوی نے عمدۃ الوسائل میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتلوں کا یہ گروہ نہایت ظالم تھا اور یہ لوگ اپنے حلقۂ زمینداری میں اپنے ماتحتوں پر انتہائی ظلم ڈھاتے اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ ادھر مولانا قطب الدین بہت بڑے عالم، نہایت متقی اور متدین بزرگ تھے۔ ان کے ان اوصاف کی وجہ سے بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر بھی ان کا بہت احترام کرتا اور ان سے ربط و تعلق رکھتا تھا۔ وہ دربار کے امرا اور حکومت کے ذمہ دار اہل کاروں کو اکثر ان کی خدمت میں بھیجتا رہتا تھا۔ اس وجہ سے دوسرے فریق کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ ہمارے مظالم کی تفصیلات کہیں بادشاہ تک نہ پہنچ جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اس خطرے کا سدباب ضروری سمجھا اور اپنی ستم رانیوں کو چھپانے کے لیے ان میں ایک زبردست ستم کا اضافہ کیا۔

بادشاہ کا فرمان اور قاتلوں کا انجام:

مولانا قطب الدین کے بیٹے محمد سعید مذکورہ بالا محضر لے کر اورنگ زیب عالم گیر کے پاس دکن پہنچے۔ بادشاہ کو مولانا کے قتل اور اس کی تفصیلات کا علم ہوا تو انتہائی افسوس کا اظہار کیا اور لکھنؤ کے عمال حکومت کے نام فرمان بھیجا کہ قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور ان کا غرور و پندار خاک میں ملا دیا جائے۔ صوبے دار لکھنؤ نے فرمانِ شاہی دیکھتے ہی سرکاری سپاہی روانہ کیے، جنھوں نے قاتلوں کا گھر بار غارت کر دیا اور مخالفین مارے ڈر کے بھاگ کر وطن سے کہیں دور چلے گئے۔ آخر قاتلوں کے اہل خانہ اور اعزہ و اقارب نے یہ جعلی وفات نامہ تیار کر کے بادشاہ کے دربار میں پیش کیا کہ قاتل اپنی موت مر گئے ہیں۔ اصل قاتل کا نام اسد اللہ تھا جو سہالی کے نواحی گاؤں پینتی پور کا رہنے والا تھا۔ وہ روپوش ہو کر قصاص سے بچ گیا تھا اور کئی سال تک زندہ رہا۔ رسالہ قطبیہ کی روایت کے مطابق وہ شخص عام طور پر مولانا قطب الدین شہید کے فرزند شیخ نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اس نے شیخ کی خدمت میں خون بہا کی پیش کش کی، لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، بلکہ اپنا حصہ معاف ہی فرما دیا۔ وہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، لیکن اس کے آنے سے انھیں تکلیف ہوتی تھی اور وہ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے تھے۔

عمدۃ الوسائل میں مولوی ولی اللہ فرنگی محلی بیان کرتے ہیں کہ میں ۱۲۰۹ھ/ ۱۷۹۵ء میں پینتی پور گیا اور گاؤں کی حالت دیکھی تو ویران اور تباہ ہو چکا تھا، گاؤں والے کہتے تھے کہ یہ اسی خون ناحق کا نتیجہ ہے۔

بادشاہ کی طرف سے مکان کا عطیہ:

بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے ایک فرمان کے ذریعے مولانا قطب الدین کے صاحب زادوں کو لکھنؤ میں دو مکان عطیہ کیے۔ (جنھیں فرنگی محلی کہا جاتا ہے) اس شاہی فرمان کے جو اس خاندان میں موجود ہے، کچھ حصے درج ذیل ہیں:

Marfat.com

دریں وقت میمنت اقتران فرمان والا شان واجب الاذعان صادر شد کہ یک منزل حویلی فرنگی محل بامتعلقہ آں واقع بلدۂ لکھنؤ مضاف بہ اودھ کہ از امکنۂ نزولی است برائے بودن شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر فرمودیم، باید کہ حکام و عمال و مصدیان مہمات حال و استقبال و جاگیرداران و کروریان آں رابنام مشار الیہما معاف و مرفوع القلم دانستہ بوجہ من الوجوہ مزاحم و معترض نہ شوند، و اندریں باب شد مجدد نہ طلبہ ــــــ مرقوم غرہ ذی قعدہ سال سی و ہفتم جلوس والا نوشتہ شد۔

فرمان کی پشت پر جو عبارت درج ہے، اس کا پہلا فقرہ یہ ہے:

شرح یادداشت واقع بتاریخ روز پنجشنبہ ۱۴/ شعبان المعظم سن ۳۷ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ مطابق مرداد ماہ برسالہ صدارت و مشیخت پناہ، فضیلت و کمالات دست گاہ سزاوار مرحمت و احسان، صدر رفیع القدر فاضل خاں و نوبت واقعہ نویسی کم ترین بندگانِ درگاہِ خلائق پناہ حسام الدین حسین قلمی می گردد کہ بعرض مقدس و معلی رسید کہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید ساکن قصبہ سہالی بسبب شہادتِ پدرِ خود قصبہ مذکور را گزاشتہ جلا وطن گردیدند کدام مکان یا سکونت ندارند ــــــ

مولانا قطب الدین کی شہادت ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء میں ہوئی تھی، اور فرمانِ شاہی کی تاریخ تحریر شعبان ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۴ء ہے۔ عالم گیر اس زمانے میں دکن میں تھا، اس لیے شیخ محمد سعید کو وہاں پہنچنے اور فرمان جاری ہوتے دو برس کا عرصہ گزرا۔ اس فرمانِ شاہی کے بعد مولانا قطب الدین شہید کا تمام خاندان سہالی سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ یہ خاندان فرنگی محل میں مقیم ہوا، جو علم و عمل کا مرکز بن گیا۔

فرنگی محل کی وجہ تسمیہ:

فرنگی محل کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ فرانس کا ایک سوداگر اس محلے میں تجارت کی غرض سے فروکش تھا۔ اس کے فرنگی ہونے کی وجہ سے اس محلے یا اس کے مکانات کو فرنگی محل کہا جاتا تھا۔ وہ وطن واپس چلا گیا تو اس کے مکانات سرکاری قبضے میں آ گئے۔ بعد ازاں علما کا جو خاندان اس میں آباد ہوا، اس نے فرنگی محلی کی نسبت سے شہرت پائی اور پھر یہ علاقہ علوم و فنون کا گہوارہ اور ایک خاص نقطۂ فکر کی علامت بن گیا۔

تصانیف:

مولانا قطب الدین شہید سہالوی اپنے زمانے کے مصنف بھی تھے۔ انھوں نے ہفتے کے سات دنوں کو مختلف علمی کاموں کے لیے تقسیم کر رکھا تھا۔ جمعہ اور منگل کے دن وہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ کئی کتابیں ان کی تصانیف تھیں جو ان پر حملے کے وقت مخالفین نے ضائع کر دی تھیں۔ ان کی تصانیف کا ذکر گزشتہ صفحات میں ان کے حالات کے ضمن میں آچکا ہے اور وہ یہ تھیں:

الامور العامہ پر حاشیہ، التلویح پر حاشیہ، شرح حکمت العین پر حاشیہ، شرح العقائد العضدیہ پر حاشیہ، شرح العقائد النسفیہ پر حاشیہ، مطول پر حاشیہ اور ایک رسالہ تحقیق دار الحرب۔

Marfat.com

مولانا کے بیٹے:

مولانا قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے چار بیٹے تھے۔ شیخ محمد اسعد، شیخ محمد سعید، شیخ نظام الدین اور شیخ محمد رضا ____ شیخ محمد اسعد عمر میں سب سے بڑے اور علم میں ممتاز تھے۔ اپنے فضل وکمال کی وجہ سے باپ کی زندگی ہی میں برہان پور کے منصب صدارت پر فائز ہوئے۔ بادشاہ اورنگ زیب کے دربار سے تعلق رکھتے اور اس کے ہم رکاب رہتے تھے۔ رئیسانہ مزاج کے مالک تھے۔ حاشیہ قدیمہ پر حاشیہ تحریر کیا اور ایک مناظرے میں ملا جیون امیٹھوی پر فتح پائی۔ شاہ عالم کے زمانے میں فوت ہوئے۔ باپ کی شہادت کے وقت سہالی میں موجود نہ تھے۔

ملا قطب الدین کے دوسرے صاحب زادے شیخ محمد سعید تھے، جو باپ کی شہادت کے وقت سہالی میں موجود تھے۔ حملے کے وقت زخمی ہو گئے تھے اور دشمن انھیں قیدی بنا کر ساتھ لے گئے تھے۔ صحت یاب ہوئے تو بادشاہ کی خدمت میں محضر پیش کرنے اور اپنی مظلومیت کی تفصیل بتانے دکن گئے اور لکھنؤ میں اقامت کے لیے فرنگی محلی کے حصول اور معافی کا فرمان لائے۔ علم فقہ پر عبور کی وجہ سے فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین میں شامل ہوئے۔ عین عالم جوانی میں شاہ عالم کے عہد میں وفات پائی۔

مولانا کے تیسرے بیٹے شیخ نظام الدین تھے۔ باپ کی شہادت کے وقت چودہ پندرہ سال کی عمر تھی۔ بڑے بھائی محمد سعید کے ساتھ سہالی سے لکھنؤ چلے گئے تھے اور خاندان کے دیگر افراد کی معیت میں فرنگی محل میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ برصغیر کے جلیل القدر عالم، معقولات و منقولات کے ماہر اور نہایت ذہین تھے۔ برصغیر پاک و ہند کے دینی عربی مدارس میں تین سو سال سے درس نظامی کے نام سے جس نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے، اس کے مرتب و مصنف یہی فاضل گرامی قدر تھے اور انہی کے نام کی نسبت سے اسے درسِ نظامی کہا جاتا ہے۔ ۸/ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/ ۲۵/ اپریل ۱۷۴۸ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

چوتھے لڑکے محمد رضا تھے جو سب سے چھوٹے تھے اور باپ کی شہادت کے وقت ان کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ علوم متداولہ بڑے بھائی نظام الدین سے پڑھے اور غالباً انہی کی زندگی میں انتقال کر گئے تھے۔ درس وافادہ میں سرگرم رہتے تھے۔

مولانا قطب الدین کے حالات کے ضمن میں ان کے صاحب زادوں کا یہ مختصر سا تعارف ہے۔ ان کے جو حالات ہمیں میسر آ سکے، ان شاء اللہ فقہائے ہند کی اگلی جلد میں اپنے اصل مقام پر حروفِ تہجی کی ترتیب سے بیان ہوں گے [1]۔

---

[1] مولانا قطب الدین کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے: مآثر الکرام، ص ۱۹۸، ۱۹۹۔ سبحۃ المرجان، ص ۷۶۔ رسالہ قطبیہ اغصانِ اربعہ۔ عمدۃ الوسائل۔ اغصان الانساب۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۰ تا ۱۹۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۴، ۹۰۵۔ احوال علمائے فرنگی محل، ص ۱ تا ۱۱۔ مقالاتِ شبلی، ج ۳، ص ۱۰۶ تا ۱۱۴۔ آثار الاول۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۶۷ تا ۱۶۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۰، ۲۳۱۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۲۹۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۱۸ تا ۳۳۱۔

Marfat.com

۱۵۲۔ سید قطب الدین شمس آبادی

سید قطب الدین حسینی شمس آبادی، درحقیقت امیٹھی کے سادات میں سے تھے۔ بعد میں شمس آباد منتقل ہو گئے تھے، جو اعمال قنوج میں واقع ہے، لہٰذا شمس آبادی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ اپنے دور کی عظیم شخصیت تھے اور ہندوستان کے فحول واکابر علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تمام عمر درس وافادہ میں مصروف رہے اور بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں مولانا قطب الدین شہید سہالوی کے ہم درس تھے، لیکن مولانا قطب الدین ان سے پہلے فارغ التحصیل ہو گئے تھے اور خود اپنی مسند تدریس آراستہ کر لی تھی۔ اس زمانے میں یہ بھی مولانا قطب الدین کی خدمت میں گئے اور بقیہ کتب درسیہ کے لیے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

نہایت قانع، بے نیاز، متوکل علی اللہ اور پاک باز عالم دین تھے۔ بڑی عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے، کئی کئی دن چولہے میں آگ نہ جلتی اور کوئی چیز کھانے کو میسر نہ آتی، لیکن نہ کسی سے اپنی ضرورت کا اظہار کرتے اور نہ حرف شکایت زبان پر لاتے۔ اسی حالت میں مصروف تدریس اور افادۂ طلبا میں سرگرم رہتے۔ طلبا اور مستفیدین سے خندہ پیشانی سے ملتے اور مسرت آمیز لہجے میں ان سے باتیں کرتے۔ کتب درسیہ کے مشکل اور پیچیدہ مسائل طلبا کی ذہنی اور علمی قابلیت کے مطابق انتہائی آسان الفاظ میں حل کر دیتے۔ علوم متداولہ پر گہری نظر تھی اور ہر آن طالبانِ علم کا ہجوم ان کے گرد وپیش رہتا۔

تذکرہ نگاروں کے بقول ان کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن میں قاضی محب اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) حافظ امان اللہ بنارسی (متوفی ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۴۱ء) اور سید طفیل محمد اترولوی بلگرامی (متوفی ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور یہ وہ حضرات علما ہیں، جنھوں نے اس برصغیر میں اپنے علم وفضل اور تحقیق وکاوش کے میدان میں نہایت شہرت حاصل کی اور خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔

سید قطب الدین شمس آبادی نے ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء میں ستر سال کی عمر پا کر وفات پائی ❶۔

۱۵۳۔ سید قطب الدین اورنگ آبادی

سید قطب الدین بن سعد اللہ حسینی بہاری ثم اورنگ آبادی، ۱۹ ربیع الثانی ۱۱۲۰ھ/ ۲۵ اگست ۱۷۰۸ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کا آغاز کیا۔ بعض کتابیں حافظ اسماعیل سے اور بعض مولانا حبیب اللہ سے پڑھیں۔ فنونِ ریاضی کی تحصیل حاجی حسام الدین سے کی اور مدت تک ان حضرات سے وابستہ رہے، یہاں تک کہ اصول وفروع میں مرتبۂ کمال کو پہنچے اور تمام علوم مرجہ اور فنون متداولہ

---

❶ رسالہ قطبیہ۔ مآثر الکرام، ص ۲۰۰۔ سبحۃ المرجان، ص ۶۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۵۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۴۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۶۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۱، ۲۳۲۔

Marfat.com

میں نامور ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے والد مکرم سید سعد اللہ حسینی کی جگہ مسند مشیخت کو زینت بخشی۔

سید صاحب موصوف بہت سے اوصاف سے متصف تھے۔ معقولات ومنقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ہمیشہ درس وافادہ میں سرگرم رہتے۔ ۱۹ رجمادی الاولیٰ ۱۱۶۹ھ/ ۲۰ فروری ۱۷۵۶ء کو فوت ہوئے ❶۔

۱۵۴۔ شیخ قطب الدین سرہندی

شیخ قطب الدین حنفی نقشبندی سرہندی، حدیث اور فقہ کے جلیل القدر عالم تھے۔ شیخ محمد زبیر سرہندی سے اخذ طریقت کیا اور مدت مدید تک ان کی صحبت میں رہے۔ ۱۱۷۳ھ/ ۱۷۶۰ء میں حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت سے بہرہ مند ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ اذکار واشغال سے متعلق "وہب الزبیر" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ❷۔

۱۵۵۔ مولانا قطب الدین عباسی الٰہ آبادی

مولانا قطب الدین عباسی الٰہ آبادی، برصغیر کے رفیع المنزلت عالم اور مشہور مصنف حضرت مولانا محمد فاخر زائر عباسی الٰہ آبادی کے فرزند رشید تھے اور اپنے دور کے عظیم فضلا اور جید علما میں سے تھے۔ ابتدائے محرم ۱۱۳۸ھ/ستمبر ۱۷۲۵ء کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ فلسفہ ومنطق کی کتابیں شیخ برکت اللہ الٰہ آبادی سے پڑھیں۔ شیخ کمال الدین فتح پوری (متوفی ۱۴ رمحرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵ اگست ۱۷۶۱ء) کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان کے والد گرامی قدر شیخ محمد فاخر حج کو گئے تو یہ لائق فرزند ان کی مسند رشد وہدایت پر متمکن ہوئے۔ طویل عرصے تک نہایت عمدہ اسلوب اور کتاب وسنت کے مطابق یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ صلاح وخیر، قناعت وایثار اور عفت وتقویٰ کے اوصاف سے موصوف تھے۔

مولانا ممدوح بارھویں صدی ہجری میں دیار ہند کے عالم کبیر اور فقہ واصول اور منطق وحکمت کے نامور فاضل تھے۔ شاعر بھی تھے اور فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، مصیب تخلص کرتے تھے۔ دونوں زبانوں میں ان کے مستقل دیوان بھی ہیں۔

دار الحرب کے مسئلے سے متعلق ایک رسالہ تصنیف کیا۔ علم منطق میں بھی ایک رسالہ لکھا۔ ان کا ایک ایسا مجموعہ کلام بھی ہے، جو ہم وزن مختلف اشعار پر مشتمل ہے، اس مجموعۂ کلام کا نام انھوں نے "بستان الحقیقت" رکھا۔

حج بیت اللہ کے ارادے سے حجاز مقدس گئے اور مکہ مکرمہ پہنچے تو حج سے پہلے ہی ماہ ذی قعدہ ۱۱۸۷ھ/ فروری ۱۷۷۴ء میں وفات پا گئے۔ مکہ مکرمہ میں دفن کیے گئے ❸۔

---

❶ مآثر الامرا، ج ۲، ص ۲۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۲۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۳۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۴۔ اتحاف النبلا بضمن ترجمہ مولانا محمد فاخر الٰہ آبادی، ص ۲۰۷۔

Marfat.com

۱۵۶۔ سید قطب احمد حیدر آبادی

سید قطب احمد حیدر آبادی، جلیل القدر عالم تھے۔ حیدر آباد کے مفتی، سید میراں بخاری بیجاپوری (متوفی ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء) کے فرزند رشید تھے۔ حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے والد مکرم سید میراں سے علم حاصل کیا اور درس و افادہ کو اپنا مشغلہ قرار دیا۔ اپنے علم و فضل کی بنا پر حیدر آباد کی مسند افتا پر فائز ہوئے۔ حیدر آباد اور اس کے نواح کے لوگ افتا و مسائل میں انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ اس عالم و فقیہ نے ۴ رشوال ۱۱۶۳ھ/ ۲۶ راگست ۱۷۵۰ء کو وفات پائی[1]۔

۱۵۷۔ قاضی قل احمد سترکھی

قاضی قل احمد بن احمد مسعود بن نعمت اللہ بن ولی محمد سترکھی، اپنے عہد کے مشہور فقہائے ہند میں گردانے جاتے تھے۔ سترکھہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اپنے والد گرامی اور دیگر علمائے وقت سے علم فقہ اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے والد مرحوم کی جگہ سترکھہ کے منصب قضا پر متعین ہوئے اور تازندگی یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ مغل حکمران محمد شاہ کے عہد میں وفات پائی[2]۔

۱۵۸۔ سید قمر الدین اورنگ آبادی

سید قمر الدین بن منیب اللہ بن عنایت اللہ حسینی بالاپوری ثم اورنگ آبادی، علوم عقلیہ و نقلیہ میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے۔ ان کے آبا و اجداد ساداتِ خجند میں سے تھے۔ ان کے اسلاف میں ایک بزرگ سید ظہیر الدین خجندی اپنے وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور پنجاب میں ضلع گوجراں والا کے ایک قصبے ایمن آباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ بعد ازاں سید ظہیر الدین کے پوتے سید محمد نے ایمن آباد سے دکن کا رخ کیا اور وہیں مستقل طور پر اقامت گزین ہو گئے۔

سید قمر الدین ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۱ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی سید منیب اللہ (متوفی ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء) سے حصولِ علم کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے قرآنِ مجید حفظ کیا۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے مطابق باپ سے اخذ طریقت بھی کیا۔ ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں دہلی گئے اور وہاں کے بعض علما و مشائخ سے علوم متداولہ کی کتابیں پڑھیں۔ دو سال دہلی رہے۔ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں عازم سرہند ہوئے اور بعض اساتذۂ عصر سے تحصیل کی۔ پھر لاہور گئے اور یہاں کے علما و مشائخ سے ملے اور استفادہ کیا۔ ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء میں بالاپور گئے اور وہاں سے اورنگ آباد کا

[1] محبوب ذی المنن، حصہ دوم، ص ۶۲۳، ۶۲۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۵۔

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۵۔

Marfat.com

قصد کیا۔ ایک عرصے تک وہاں قیام پذیر رہنے کے بعد ۱۱۷۴ھ/۶۱ ۱۷ء میں اپنے دو بلند مرتبت بیٹوں نور الہدیٰ اور نور العلیٰ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ ۱۱۷۵ھ/۶۲ ۱۷ء میں واپس آئے اور درس و افادہ میں سرگرم ہو گئے۔

سید قمر الدین اورنگ آبادی مشہور عالم و فقیہ اور معقولات و منقولات کے ماہر تھے۔ اس زمانے میں بحث و اشتغال میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا اور بے شمار علما و طلبا نے ان کے درس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔

سید موصوف مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں:

مظہر النور: یہ عربی زبان میں وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مفصل و بسیط کتاب ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۱۶۴ھ/۵۱ ۱۷ء ہے۔

نور الکریمتین۔

نور الطہور۔

سید زاہد ہروی کی ایک لغزش علمی کے بارے میں جوان سے حاشیہ قطبی میں سرزد ہوئی ایک رسالہ لکھا۔

مسائل فقہ میں ایک رسالہ تحریر کیا۔

تاویل رؤیا کے بارے میں ایک رسالہ قلم بند کیا۔

اس کے علاوہ کچھ اور کتب و رسائل بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔

اس عالم و فقیہ نے پیر کے دن ۲؍ ربیع الاول ۱۱۹۳ھ/ ۱۹؍ مارچ ۱۷۷۹ء کو اورنگ آباد (دکن) میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے [1]۔

ـــ ک ـــ

۱۵۹۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی

شیخ کلیم اللہ بن نور اللہ بن محمد صالح صدیقی جہاں آبادی، ۲۴؍ جمادی الاخریٰ ۱۰۶۰ھ/۱۴؍ جون ۱۶۵۰ء کو دار الحکومت دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور اساتذۂ عصر سے حصول علم کیا۔ پھر حجاز مقدس گئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ طویل عرصے تک وہاں مقیم رہے اور مختلف علما و مشائخ سے اخذ علم اور کسب فیض کیا۔ بعد ازاں ہندوستان کو معاودت کی اور دہلی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ عابد و زاہد اور متقی عالم دین تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ شیخ کلیم اللہ کے آبا و اجداد معمار تھے جو مکانوں کی تعمیر کا کام کرتے تھے، لیکن کلیم اللہ کو اللہ نے

[1] سبحۃ المرجان، ص ۱۰۱ تا ۱۱۳۔ خزانہ عامرہ، ص ۳۸۰ تا ۳۸۴۔ ابجد العلوم، ص ۹۱۹۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۲، ۴۵۳۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۸، ۲۳۹۔ محبوب ذی المنن حصہ دوم، ص ۶۰۷ تا ۶۲۱۔

Marfat.com

تعمیر قلوب اور اصلاح باطن کے لیے منتخب کیا۔ دہلی کی جامع مسجد جو شاہ جہان کے عہد حکومت میں تعمیر کی گئی، اسی شیخ کلیم اللہ کے جد امجد محمد صالح نے تعمیر کی تھی۔ وہ اپنے دور کے بہت بڑے مہندس اور انجینئر تھے۔

شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی، جہاں مشہور مدرس اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے، وہاں اچھے مصنف بھی تھے۔ مختلف عنوانات پر انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں قرآن مجید کی تفسیر بھی شامل ہے۔ باقی تصانیف کے نام یہ ہیں: کشکول، المرقع فی الرقی والتکسیر، سواء السبیل، عشرۂ کاملہ، رسالہ درردروافض، مجموعہ مکتوبات کلیمی۔ انھوں نے شیخ بو علی سینا کی القانون کی شرح بھی سپرد قلم کی جس کا ایک نسخہ مکتبہ حامدیہ رام پور (ہندوستان) میں موجود ہے۔

شیخ موصوف نے ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۱ھ/ ۱۷ اکتوبر ۱۷۲۸ء (ایک روایت کے مطابق ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۲۱ء) کو وفات پائی اور اپنی حویلی میں دفن کیے گئے جو دہلی کے خانم بازار میں واقع تھی [1]۔

۱۶۰۔ سید کلیم اللہ مکی

سید کلیم اللہ محمد بن عبدالسلام بن محمد بن نور محمد، فاضل اور علامہ وقت تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ سید کلیم اللہ کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہوئی اور علم و معرفت کی گود اور فضل و کمال کی آغوش میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اپنے والد مکرم سید عبدالسلام سے تعلیم پائی۔ علم فقہ بھی انہی سے حاصل کیا، اخذ طریقت بھی انہی سے کیا، یہاں تک کہ اجل علما کے رتبے اور کبار مشائخ کے درجے کو پہنچے۔ بعد ازاں والد محترم کی اجازت سے ۱۱۰۵ھ/ ۱۶۹۴ء میں ہندوستان کا سفر کیا اور دکن آ گئے اور وہاں کے مشہور مقام بالکنڈہ میں جو اعمالِ حیدر آباد میں واقع ہے، اقامت اختیار کی۔

سید کلیم اللہ مکی جو ہندوستان میں مستقل قیام کی وجہ سے ہندی کہلائے، بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ نامور فقیہ اور پُر جوش مبلغ تھے۔ عوام کو رشد و ہدایت کی راہ پر لگانا، ان کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا۔ لوگوں سے بیعت لیتے تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نہایت سخت تھے۔ زہد و عبادت کی تلقین فرماتے اور شریعت غرا پر استقلال و استقامت کی تاکید کرتے۔ زاہد و قانع، عبادت گزار، متوکل علی اللہ، مرقع حسن اخلاق، متواضع، حلیم الطبع اور نرم خو تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ و استفاضہ کیا۔

بارھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ اور دین اسلام کے سرگرم مبلغ نے ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء میں مالکنڈہ (دکن) میں داعی اجل کو لبیک کہا [2]۔

---

[1] مآثر الکرام، ص ۱۴۱۔ تقصار جنود الاحرار، ص ۲۰۰۔ خزانۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۴۹۴، ۴۹۵۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۲۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۸، ۴۳۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴۰، ۲۴۱۔ مشائخ چشت، ص ۳۶۶۔ انوار العارفین، ص ۴۲۹، ۴۳۰۔ واقعات دار الحکومت دہلی، ج ۳، ص ۱۱۶، ۱۱۷۔ محبوب ذی المنن، حصہ دوم، ص ۲۷، ۲۸۔

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴۱، ۲۴۲۔

Marfat.com

۱۶۱۔ شیخ کمال الدین سندھی

شیخ کمال الدین بن عنایت اللہ بھکری سندھی، عالم وفقیہ اور مشہور فاضل تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں دیوان حافظ کی ایک مفصل شرح اور اصطلاحات رضویہ شامل ہیں۔ اس سندھی عالم وفقیہ نے ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں وفات پائی❶۔

۱۶۲۔ شیخ کمال الدین فتح پوری

شیخ کمال الدین بن محمد دولت بن محمد یعقوب انصاری سہالوی ثم فتح پوری، اپنے وقت کے عالم کبیر اور علوم متعارفہ کے امام تھے۔ شیخ قطب الدین انصاری سہالوی کے ابن عم تھے۔ ان کے والد گرامی قاضی محمد دولت جوارض ہند کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے، شیخ قطب الدین کی شہادت کے بعد ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء میں سہالی سے فتح پور چلے گئے تھے، لہٰذا فتح پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ان کے زیرِ تذکرہ بیٹے کمال الدین فتح پور ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی، اس لیے انھوں نے اباً وجداً سہالوی ہونے کے باوجود اپنے مولد ومنشا کی وجہ سے فتح پوری کی نسبت سے شہرت پائی۔

شیخ کمال الدین نے بعض درسی کتابیں اپنے ایک ہم نام شیخ کمال الدین عظیم آبادی سے پڑھیں اور باقی کتب درسیہ کی تکمیل کے لیے درسِ نظامیہ کے بانی شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸؍جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/ ۲۵؍اپریل ۱۷۴۸ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ طویل عرصے تک ان کی صحبت میں رہے اور اس قدر استفادہ کیا کہ شیخ کے تلامذہ اور فیض یافتہ حضرات میں سے کوئی اس مرتبے کو نہیں پہنچ سکا، جس مرتبہ علمی کو یہ پہنچے۔ شیخ کی زندگی ہی میں سرگرم تدریس ہو گئے تھے اور اکابر علمائے ہند میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ معقولات ومنقولات میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ اصول وفروع میں کامل تھے، بالخصوص علم کلام اور منطق و حکمت میں اپنے سب اقران سے فائق تھے۔ حدیث وفقہ میں بھی مرجع مستفیدین تھے۔ ذکی اور ذہین تھے۔ جن معتدد علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا، ان میں مولانا محمد برکت الہ آبادی، مولانا محمد حسن لکھنوی، مولانا محمد ولی لکھنوی، مولانا محمد اسلم سندیلوی، شیخ عبداللہ سندیلوی اور ملا حمداللہ سندیلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیخ کمال الدین موصوف کئی دقیق علمی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں کبریت احمر، عروۃ الوثقیٰ، حاشیہ کمالیہ برشرح عقائد جلالیہ، شرح تہذیب کے حاشیہ زاہدی پر تعلیقات وغیرہ شامل ہیں۔ ارض ہند کے یہ صاحب علم بزرگ ستر سال سے زائد عمر پا کر ۱۴؍محرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵؍اگست ۱۷۶۱ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے❷۔

---

❶ تحفۃ الکرام، ص۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴۲۔

❷ مآثر الکرام، ص ۲۸۹، ۲۹۰۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۲، ۱۷۳۔ اغصان الانساب (از رضی الدین محمود فتح پوری)۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴۲، ۲۴۳۔

Marfat.com

مراجع و مصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا:

۱۔ ابجد العلوم: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع صدیقیہ بھوپال۔

۲۔ اتحاف النبلا: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع نظامی، کان پور۔

۳۔ احوال علمائے فرنگی محل: شیخ الطاف الرحمٰن۔ مطبع مجتبائی دہلی۔

۴۔ اخبار الصنادید: حکیم نجم الغنی رام پوری۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ

۵۔ ادبیاتِ سرحد: رضا ہمدانی۔ نیا مکتبہ، پشاور ۱۹۵۳ء۔

۶۔ ادبیاتِ سرحد: فارغ بخاری۔ نیا مکتبہ، پشاور ۱۹۵۵ء۔

۷۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ بہ ضمن ''مضمون ڈاکٹر محمد جہاں گیر خاں۔''

۸۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ بہ ضمن ''ابوالمظفر اورنگ زیب عالم گیر'' مضمون شیر محمد گریوال۔

۹۔ اذکار الابرار: شاہ محمد تقی حیدر۔ شاہی پریس، لکھنؤ۔ ۱۳۵۷ھ۔

۱۰۔ ارمغان شاہ ولی اللہ: محمد سرور جامعی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔

۱۱۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبع احمدی۔ دہلی۔

۱۲۔ انفاس العارفین: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔

۱۳۔ انوار العارفین: حافظ محمد حسین مراد آبادی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔

۱۴۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر: علامہ شبلی۔ مطبوعہ، مشہور آفسٹ کراچی۔ ناشر اردو مرکز، گنپت روڈ، لاہور۔ طبع ششم۔ ۱۹۴۹ء۔

۱۵۔ برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ: محمد اسحاق بھٹی۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔

۱۶۔ برہان پور کے سندھی اولیا المعروف بہ تذکرہ اولیائے سندھ: سید محمد مطیع راشد برہان پوری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ طبع اول ۱۹۷۰ء۔

۱۷۔ بزم تیموریہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

۱۸۔ بزم سخن: سید علی حسن خاں بن نواب سید صدیق حسن خاں، مطبع نامی مفید عام، آگرہ۔ ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔

Marfat.com

۱۹۔ بوستانِ اخبار: سید احمد مارہروی۔ مطبوعہ آگرہ۔۱۳۳۱ھ۔

۲۰۔ تاریخ برہان پور: خلیل الرحمٰن برہان پوری۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔۱۳۱۷ھ۔

۲۱۔ تاریخ تحفۃ الکرام: جلد اول، دوم، سوم۔ مطبع حسینی اثنا عشری، محلہ فراش خانہ، وزیر گنج، ومطبع ناصری، لاہور۔۱۳۰۴ھ۔

۲۲۔ تاریخ خورشید شاہی: غلام امام خاں ترین۔ مطبع خورشیدیہ، حیدر آباد (دکن)۔۱۲۸۶ھ/۱۸۷۰ء۔

۲۳۔ تاریخ شیراز ہند جون پور: سید اقبال حسین۔ ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس، جون پور۔۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء۔

۲۴۔ تاریخ کشمیر اعظمی: خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔ ناشر، غلام محمد نور محمد، تاجران کتب سری نگر۔۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء۔

۲۵۔ تاریخ مشاہیر چشت: خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی۔۱۹۵۳ء۔

۲۶۔ تاریخ معصومی: میر محمد معصوم بھکری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔۱۹۵۹ء۔

۲۷۔ تاریخ النوائط: نواب عزیز جنگ بہادر۔ مطبوعہ عزیز المطابع، حیدر آباد (دکن) ۱۳۲۲ھ۔

۲۸۔ تجلی نور المعروف بہ تذکرہ مشاہیر جون پر: نور الدین زیدی، مطبع اعظم المطابع، جون پور۔۱۸۸۹ء۔

۲۹۔ تحفۃ الکرام: میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔۱۹۵۹ء۔

۳۰۔ تحفہ کشمیر: منشی گنیش لعل دہلوی۔ مطبع کوہ نور، لاہور۔۱۸۵۳ء۔

۳۱۔ تحقیقاتِ چشتی: نور احمد چشتی۔ پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور۔۱۹۶۴ء۔

۳۲۔ تذکرہ آثار الشعرا: سید محمد ممتاز۔ مطبع شاہ جہانی، بھوپال۔۱۳۰۴ھ۔

۳۳۔ تذکرۃ الابرار والاشرار: حضرت اخون درویزہ۔ ادارہ اشاعت سرحد، قصہ خوانی بازار پشاور۔

۳۴۔ تذکرۂ علمائے بنارس: جلد اول، سید مظہر حسن کوروی۔ سلیمانی پریس بنارس۔ طبع اول۔۱۹۱۶ء۔

۳۵۔ تذکرہ جلوۂ خضر: فرزند احمد صغیر بلگرامی۔ مطبع نور الانوار، آگرہ۔ طبع اول۔۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء۔

۳۶۔ تذکرۃ الشعرا: میر دولت شاہ۔ مطبع مجیدی کان پور۔۱۳۲۶ھ۔

۳۷۔ تذکرہ شعرائے اورنگ آباد: مولوی سردار علی حیدر آبادی۔ شمس الاسلام پریس، حیدر آباد (دکن) ۱۳۴۵ھ

۳۸۔ تذکرہ شعرائے اردو: میر حسن دہلوی۔ مقدمہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ۔۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء۔

۳۹۔ تذکرہ صوفیائے سندھ: اعجاز الحق قدسی۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۵۹ء۔

۴۰۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ: محمد دین فوق۔ گلزار محمدیہ اسٹیم پریس، لاہور۔۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء۔

۴۱۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل: مولوی محمد عنایت اللہ۔ مطبوعہ لکھنؤ۔۱۹۳۰ء۔

۴۲۔ تذکرہ علمائے ہند: رحمان علی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔۱۹۱۴ء۔

۴۳۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ، محمد ایوب قادری)، ناشر: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۱ء۔

۴۴۔ تذکرہ فارسی گویاں: غلام ہمدانی مصحفی۔ انجمن ترقی اردو، دہلی۔۱۹۳۴ء۔

Marfat.com

۴۵۔ تذکرہ گلشن بے خار: نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ مرتبہ، کلب علی خاں فائق۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۷۳ء۔

۴۶۔ تذکرہ مشائخ بنارس: ابوالاثر عبدالسلام۔ ندوۃ المعارف، بنارس۔ ۱۳۷۱ھ۔

۴۷۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری: محمد علی حیدر۔ مطبع اصح المطابع لکھنؤ۔ ۱۹۲۷ء۔

۴۸۔ تذکرہ مصنفین درس نظامی: اختر راہی۔ مسلم اکادمی، محمد نگر، لاہور۔ ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء۔

۴۹۔ تذکرہ مورخین: نبی احمد سندیلوی۔ مطبع سلیمانی، بنارس۔ ۱۹۲۶ء۔

۵۰۔ تذکرہ ہندی گویاں: غلام ہمدانی مصحفی۔ مرتبہ، عبدالحق، جامع برقی پریس، دہلی۔ ۱۹۳۳ء۔

۵۱۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: نواب صدیق حسن خاں۔ بھوپال۔ ۱۲۹۸ھ۔

۵۲۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ مطبوعہ دمشق۔ ۱۹۵۸ء۔

۵۳۔ چمنستانِ شعرا: رائے لچھمی نرائن شفیق۔ مرتبہ: عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو حیدر آباد (دکن) طبع اول۔ ۱۹۲۸ء۔

۵۴۔ حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ: محمد حسن نقشبندی مجددی مظہری۔ مطبوعہ، مسلم پریس لاہور۔

۵۵۔ حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء۔

۵۶۔ حدیقۃ الاولیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۷۷ء۔

۵۷۔ حکایات کشمیر: محمد دین فوق۔ کریمی پریس، لاہور۔ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء۔

۵۸۔ حیات حافظ رحمت خاں: سید الطاف علی بریلوی۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل برانچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی (طبع ثانی) ۱۹۶۳ء۔

۵۹۔ حیات العلما: سید عبدالباقی سہسوانی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء۔

۶۰۔ حیاتِ ولی: مولانا محمد رحیم بخش دہلوی۔ مکتبہ سلفیہ، لاہور۔ ۱۹۵۵ء۔

۶۱۔ خزانۂ عامرہ: میر سید غلام آزاد بلگرامی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء۔

۶۲۔ خزینۃ الاصفیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نامی گرامی سراج پنڈت بیج ناتھ موسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ۔ ۱۲۹۰ھ۔

۶۳۔ خلاصۃ التواریخ: لالہ سجان رائے بٹالوی۔ بہ تصحیح ظفر احسن۔ مطبع جی اینڈ سنز، دہلی۔ ۱۹۱۸ء۔

۶۴۔ دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی: ابن حسن۔ ترجمہ، عبدالغنی نیازی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۵۸ء۔

۶۵۔ دہلی اور اس کے اطراف: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ انجمن ترقی اردو، دہلی۔ ۱۹۵۸ء۔

۶۶۔ دیوانِ درد (اردو): مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۶۲ء۔

۶۷۔ دیوان میرزا مظہر جان جاناں: مطبع مصطفائی، کان پور۔ ۱۲۷۱ھ۔

۶۸۔ ذخیرۃ الخوانین: شیخ فرید بھکری۔ مقدمہ و تصحیح، ڈاکٹر سید معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی۔

۶۹۔ رقعاتِ عالم گیری: مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۲۴ء۔

۷۰۔ رودِ کوثر: ڈاکٹر شیخ محمد اکرام۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۵ء۔

Marfat.com

۷۱۔ روضۃ الابرار: محمد دین۔ سراج المطابع، جہلم۔۱۳۰۲ھ۔

۷۲۔ روضۃ الاولیا: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع اعجاز صفدری، حیدرآباد (دکن)۔۱۳۰۱ھ۔

۷۳۔ ریاض الصفحا: (تذکرہ ہندی گویاں)۔ غلام ہمدانی مصحفی۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ جامع برقی پریس، دہلی۔ طبع اول۔۱۹۳۴ء۔

۷۴۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع بمبئی۔۱۳۰۳ھ۔

۷۵۔ سخندانِ فارس: محمد حسین آزاد۔ مطبع مفید عام ، لاہور۔۱۹۰۷ء۔

۷۶۔ سخن شعرا: عبدالغفور نساخ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء۔

۷۷۔ سروِ آزاد: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع مفید عام، آگرہ۔۱۹۱۰ء۔

۷۸۔ سفینۃ الاولیا: داراشکوہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔۱۸۸۴ء۔

۷۹۔ سید احمد شہید: غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور۔۱۹۵۴ء۔

۸۰۔ سیرت سید احمد شہید: ابوالحسن علی ندوی۔ لاہور۔

۸۱۔ سیر الاولیا: محمد مبارک علوی المعروف بہ امیر خرد کرمانی۔ مطبع محب ہند، دہلی۔۱۳۰۲ھ۔

۸۲۔ سیر المتاخرین: غلام حسین خاں طباطبائی۔ نول کشور، لکھنؤ۔

۸۳۔ سیر المصنفین جلد اول: محمد یحییٰ تنہا۔ محبوب المطابع، دہلی۔۱۹۲۴ء۔

۸۴۔ سیر المصنفین جلد دوم: محمد یحییٰ تنہا۔ جامع ملیہ پریس، دہلی۔۱۹۲۸ء۔

۸۵۔ شبابِ کشمیر: محمد دین فوق۔ علمی پرنٹنگ پریس، لاہور۔۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء۔

۸۶۔ طرف الاماثل بتراجم الافاضل: مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی، مطبع یوسفی، لکھنؤ۔۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء۔

۸۷۔ عالم گیر نامہ: منشی محمد کاظم۔ کالج پریس، کلکتہ۔۱۸۶۸ء۔

۸۸۔ عہد اسلامی کا ہندوستان: ریاست علی ندوی۔ ادارۃ المصنفین، پٹنہ۔۱۹۵۰ء۔

۸۹۔ عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ: (ترجمہ تاریخ فرخ آباد، مفتی ولی اللہ فرخ آبادی) مرتبہ محمد ایوب قادری، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی۔۱۹۶۵ء۔

۹۰۔ فرحت الناظرین (شخصیات): محمد اسلم پسروری، ترجمہ و ترتیب، محمد ایوب قادری، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۹۷۲ء۔

۹۱۔ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ: مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی، مطبوعہ مصر، طبع اول۔۱۳۲۴ھ۔

۹۲۔ قاموس الاعلام: شمس اللہ قادری۔ حیدرآباد (دکن) ۱۹۳۵ء۔

۹۳۔ قاموس المشاہیر: جلد اول، دوم، سوم، نظام الدین حسین نظامی بدایونی۔ نظامی پریس، بدایوں۔۱۹۲۴۔۱۹۲۶ء۔

۹۴۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب: ذوالفقار احمد۔ مطبع فیض منبع مفید عام، آگرہ۔۱۳۱۶ھ۔

۹۵۔ کلمات طیبات: ابوالخیر محمد بن احمد مراد آبادی۔ مطبع مجتبائی دہلی۔۱۳۰۹ھ۔

Marfat.com

۹۶۔ گل رعنا: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ طبع سوم، ۱۹۶۴ء۔

۹۷۔ گلزار اولیا: مظفر حسین۔ مطبع سبحانی، حیدر آباد (دکن) ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء۔

۹۸۔ گلشن ہند: میرزا علی لطف۔ تصحیح وتحشیہ مولانا شبلی ومقدمہ مولوی عبدالحق، رفاہِ عام پریس، لاہور۔

۹۹۔ گل عجائب (تذکرۂ شاعراں): اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) طبع اول۔ ۱۹۳۶ء۔

۱۰۰۔ مآثر الامرا۔ جلد اول، دوم، سوم، شاہ نواز خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۸۸ء/۱۸۹۰ء۔

۱۰۱۔ مآثر عالم گیری: محمد ساقی مستعد خاں۔ بہ تصحیح آغا احمد علی، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۷۱ء۔

۱۰۲۔ مآثر الکرام: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ، لاہور۔ ۱۹۷۱ء۔

۱۰۳۔ محبوب ذی المنن تذکرہ علمائے دکن: عبدالجبار خاں ملکاپوری۔ مطبع رحمانی وحسن پریس، حیدر آباد (دکن) ۱۳۳۲ھ۔

۱۰۴۔ محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن: عبدالجبار خان ملکاپوری۔ مطبع رحمانی، حیدر آباد (دکن) ۱۳۲۹ھ۔

۱۰۵۔ مخزن نکات (تذکرہ شعرائے اردو): شیخ قیام الدین قائم چاند پوری۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) ۱۹۲۹ء۔

۱۰۶۔ مرأت احمدی: مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر۔ مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۹۲۷ء۔

۱۰۷۔ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط: مترجمہ ومرتبہ، خلیق انجم۔ مکتبہ برہان۔ جامع مسجد، دہلی۔ طبع اول ۱۹۶۲ء۔

۱۰۸۔ مشاہیر ادب۔ اردو: مہیش پرشاد۔ ناشر، نند کشور اینڈ برادرز، بنارس۔ طبع اول۔ ۱۹۳۲ء۔

۱۰۹۔ مشاہیر کشمیر: منشی محمد دین فوق۔ کریمی پریس، لاہور۔

۱۱۰۔ مشکوٰۃ المصابیح: ولی الدین۔ اصح المطابع، دہلی۔ ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۲ء۔

۱۱۱۔ معارف (ماہ نامہ) اعظم گڑھ: بابت ماہ اپریل ۱۹۴۷ء۔ مضمون سید غلام حسین شاہ ندوی پھلواروی۔

۱۱۲۔ المعارف (ماہ نامہ) لاہور۔ بابت ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ۔ مارچ ۱۹۶۸ء۔ مضمون مولانا غلام رسول مہر۔

۱۱۳۔ المعارف (ماہ نامہ) لاہور۔ بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ/ اگست ۱۹۶۸ء۔ مضمون پروفیسر محمد اسلم۔

۱۱۴۔ معمولات مظہری: نعیم اللہ بہرائچی۔ مطبع محمدی، لاہور۔ ۱۳۱۰ھ۔

۱۱۵۔ مفتاح التواریخ: منشی دانشور۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۲۸۴ھ۔

۱۱۶۔ مقدمہ رقعاتِ عالم گیری: نجیب اشرف ندوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔

۱۱۷۔ مقالاتِ شبلی، جلد سوم: دارالمصنفین اعظم، طبع دوم۔ ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء۔

۱۱۸۔ مقالاتِ شبلی (تاریخ حصہ اول) جلد پنجم: دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۶ء۔

۱۱۹۔ مقاماتِ مظہری: شاہ غلام علی علوی مجددی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء۔

۱۲۰۔ مقدمہ نکات الشعرا (تذکرہ شعرائے اردو): میر تقی میر۔ مقدمہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی، نظامی پریس، بدایوں۔ ناشر، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

Marfat.com

۱۲۱۔ مکاتیب میرزا مظہر جان جاناں: مرتبہ عبدالرزاق قریشی۔علوی بک ڈپو، بمبئی۔۱۹۶۶ء

۱۲۲۔ مناقب حسن رسول نما: سید محمد ہاشم۔گلزار ہینڈ سٹیم پریس، لاہور۔۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء۔

۱۲۳۔ منتخب اللباب: جلد اول، دوم، محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں۔ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ،۱۸۶۹ء۔

۱۲۴۔ مؤرخین ہند: شمس اللہ قادری۔تاریخ آفس، حیدر آباد (دکن) ۱۹۳۳ء۔

۱۲۵۔ نزہۃ الخواطر: (جلد پنجم) سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد (دکن)۔۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء۔

۱۲۶۔ نزہۃ الخواطر: (جلد ششم): سید عبدالحی حسینی لکھنوی۔دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، (دکن) ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۷ء۔

۱۲۷۔ ہند عہد اورنگ زیب میں: مرزا یار جنگ سمیع اللہ بیگ۔تاج پریس، حیدر آباد (دکن) ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء۔

۱۲۸۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے: سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء۔

۱۲۹۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے: دارالمصنفین اعظم گڑھ۔۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء۔

۱۳۰۔ ہندوستان گزشتہ وحال: رائے بہادر لالہ بیج ناتھ۔عثمانی پریس، آگرہ۔۱۹۰۴ء۔

۱۳۱۔ الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی: محمد بن یحییٰ المدعو بہ محسن تیمی بکری ترہتی۔مطبع صدیقی، بریلی۔۱۲۸۷ھ۔

Marfat.com

فقہائے ہند

بارھویں صدی ہجری

حصہ دوم

Marfat.com

Marfat.com

ترتیب

◆	مقدمہ	۷۷۵
◆	شاہ عالم بہادر شاہ اول	۷۷۸
◆	معز الدین جہاں دار شاہ	۷۸۶
◆	فرخ سیر	۷۸۶
◆	رفیع الدرجات	۷۸۷
◆	رفیع الدولہ	۷۸۷
◆	ساداتِ بارہہ	۷۸۸
◆	محمد شاہ	۷۹۰
◆	احمد شاہ ابدالی	۷۹۶
◆	احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملے	۷۹۷
◆	احمد شاہ۔ مغل حکمران	۸۰۴
◆	عالم گیر ثانی	۸۰۵
◆	عالم شاہ ثانی	۸۰۶
◆	ایسٹ انڈیا کمپنی	۸۰۸
◆	اَوْدھ کی حکومت	۸۱۵
◆	سراج الدولہ	۸۱۷
◆	روہیل کھنڈ کی حکومت	۸۲۰
◆	حیدرآباد کی آصف جاہی حکومت	۸۲۵
◆	سلطنت خداداد میسور	۸۲۸
◆	حرفِ آخر	۸۳۲
◆	ـــــــ م ـــــــ	
◆	۱۔ شیخ مجیب اللہ جعفری پھلواروی	۸۳۵
◆	۲۔ قاضی محب اللہ بہاری	۸۳۵
◆	۳۔ سید محمد قنوجی	۸۴۰
◆	۴۔ شیخ محمد گجراتی	۸۴۴
◆	۵۔ قاضی محمد آصف نگرامی	۸۵۴
◆	۶۔ شیخ محمد ارشد جون پوری	۸۵۴
◆	۷۔ مولانا محمد اسعد انصاری سہالوی	۸۴۶
◆	۸۔ سید محمد اشرف حسینی بلگرامی	۸۴۷
◆	۹۔ شیخ محمد اشرف کشمیری	۸۴۹
◆	۱۰۔ مولانا محمد اعلیٰ تھانوی	۸۵۰
◆	۱۱۔ میر محمد افضل دہلوی	۸۵۱
◆	۱۲۔ قاضی محمد اکرم سندھی	۸۵۱
◆	۱۳۔ قاضی محمد اکرم دہلوی	۸۵۲
◆	۱۴۔ مفتی محمد امان گوپاموی	۸۵۲
◆	۱۵۔ قاضی محمد امیر فاروق گوپاموی	۸۵۲
◆	۱۶۔ مولانا محمد امین کشمیری	۸۵۳
◆	۱۷۔ سید محمد باقر بلگرامی	۸۵۴
◆	۱۸۔ شیخ محمد باقر سندھی	۸۵۴
◆	۱۹۔ مولانا محمد جمیل جون پوری	۸۵۴
◆	۲۰۔ قاضی محمد حافظ بلگرامی	۸۵۸
◆	۲۱۔ قاضی محمد حسین شافعی گجراتی	۸۵۹
◆	۲۲۔ سید محمد حکم بریلوی	۸۵۹
◆	۲۳۔ شیخ محمد حیات سندھی	۸۶۰
◆	والد کا اسم گرامی	۸۶۱

Marfat.com

مولد و مسکن اور ابتدائی حالات	۸۶۱
مدینہ منورہ میں سکونت اور استاد کی جانشینی	۸۶۲
علمی رفعت اور تذکرہ نگاروں کا اظہارِ عقیدت	۸۶۳
تصانیف	۸۶۷
اخلاق و عادات اور تدین و تقویٰ	۸۷۳
صحت عقیدہ کا بہ درجہ غایت اہتمام	۸۷۴
شیخ کا مسلک	۸۷۶
تلامذہ	۸۷۸
وفات	۸۸۰
شیخ کے استادِ گرامی۔ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر	۸۸۱
۲۴۔ قاضی محمد حیات برہان پوری	۸۸۶
۲۵۔ سید محمد مخدوم پھلواروی	۸۸۷
۲۶۔ قاضی محمد دولت فتح پوری	۸۸۷
۲۷۔ سید محمد راجے جون پوری	۸۸۸
۲۸۔ مولانا محمد رضا انصاری سہالوی	۸۸۸
۲۹۔ شیخ محمد رضا لاہوری	۸۸۹
۳۰۔ مولانا محمد سعید انصاری سہالوی	۸۸۹
۳۱۔ شیخ محمد سعید انبالوی	۸۹۰
۳۲۔ مولانا محمد شجاع ہتگامی	۸۹۰
۳۳۔ مولانا محمد شفیع بدایونی	۸۹۲
۳۴۔ قاضی محمد شفیع گجراتی	۸۹۲
۳۵۔ مولانا شیخ محمد صادق ٹھٹھوی سندھی	۸۹۲
۳۶۔ شیخ محمد صالح بنگالی	۸۹۳
۳۷۔ مولانا محمد صدیق لاہوری	۸۹۳
۳۸۔ مولانا محمد طاہر عباسی الہ آبادی	۸۹۹
۳۹۔ مولانا محمد طاہر حسینی شاہ جہان پوری	۹۰۰
۴۰۔ مولانا محمد عابد سنامی لاہوری	۹۰۱
۴۱۔ قاضی محمد عاشق کیرانوی	۹۰۱
۴۲۔ سید محمد عدل بریلوی	۹۰۲
۴۳۔ شیخ محمد علی بدایونی	۹۰۲
۴۴۔ شیخ محمد غوث کاکوروی	۹۰۳
۴۵۔ شیخ محمد فاخر زائر عباسی الہ آبادی	۹۰۴
علم و فضل	۹۰۴
حج بیت اللہ کے لیے مختلف سفر	۹۰۵
شیخ کے متعلق اکابر علما کی رائے	۹۰۷
شاہ ولی اللہ دہلوی سے ملاقات	۹۱۰
تصانیف	۹۱۰
شعر و شاعری	۹۱۲
وصیت اور تدفین	۹۱۳
اولاد	۹۱۴
تلامذہ	۹۱۴
۴۶۔ مولانا محمد فاضل سورتی	۹۱۴
۴۷۔ سید محمد فیض بلگرامی	۹۱۵
۴۸۔ شیخ محمد محسن دہلوی	۹۱۵
۴۹۔ مولانا محمد محسن کشو کشمیری	۹۱۶
۵۰۔ مولانا محمد محسن کشمیری	۹۱۶
۵۱۔ مولانا محمد مراد لاہوری	۹۱۷
۵۲۔ مولانا محمد مراد کشمیری	۹۱۷
۵۳۔ مولانا محمد مراد سندھی	۹۱۸
۵۴۔ شیخ محمد مراد رفیقی کشمیری	۹۱۸
۵۵۔ مولانا محمد معصوم جائسی	۹۱۹

Marfat.com

♦	۵۶۔شیخ محمد معین سندھی	۹۱۹
♦	۵۷۔شیخ محمد ممتاز نصیر آبادی	۹۲۵
♦	۵۸۔شیخ محمد مومن الجزائری	۹۲۵
♦	۵۹۔شیخ محمد ناصر الہٰ آبادی	۹۲۶
♦	۶۰۔خواجہ محمد ناصر عندلیب دہلوی	۹۲۷
♦	۶۱۔شیخ محمد نصیر شیخ پوری	۹۲۸
♦	۶۲۔مولانا محمد نعیم جون پوری	۹۲۸
♦	۶۳۔سید محمد نور نصیر آبادی	۹۲۹
♦	۶۴۔سید محمد وارث حسینی بنارسی	۹۳۰
♦	۶۵۔مولانا محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی	۹۳۱
♦	۶۶۔سید محمد ہدیٰ نصیر آبادی	۹۳۲
♦	۶۷۔شیخ محمد یحییٰ عباسی الہٰ آبادی	۹۳۳
♦	۶۸۔مولانا محمود نائطی	۹۳۴
♦	۶۹۔سید محی الدین حسینی نیوتنی	۹۳۴
♦	۷۰۔شیخ محی الدین الہٰ آبادی	۹۳۵
♦	۷۱۔قاضی مراد الدین کشمیری	۹۳۵
♦	۷۲۔سید مربی بلگرامی	۹۳۵
♦	۷۳۔قاضی مربی پھانوی	۹۳۶
♦	۷۴۔سید مرتضیٰ ملتانی	۹۳۶
♦	۷۵۔شیخ مرتضیٰ عباسی چریا کوٹی	۹۴۰
♦	۷۶۔مرزا خان جالندھری	۹۴۰
♦	۷۷۔سید معظم شاہ سورتی	۹۴۱
♦	۷۸۔مولانا معین الدین عثمانی منیری	۹۴۲
♦	۷۹۔شیخ موسیٰ امیٹھوی	۹۴۲
♦	۸۰۔مفتی میراں بیجاپوری	۹۴۲
♦	ن	
♦	۸۱۔قاضی نجم الدین برہان پوری	۹۴۳
♦	۸۲۔مولانا نجم الدین برہان پوری	۹۴۳
♦	۸۳۔سید نصیر الدین ہروی برہان پوری	۹۴۳
♦	۸۴۔شیخ نظام الدین انصاری سہالوی	۹۴۵
♦	انصاری اور عثمانی خاندانوں کی کش مکش	۹۴۶
♦	مولانا قطب الدین کی شہادت	۹۴۷
♦	فرنگی محل لکھنؤ میں سکونت	۹۴۷
♦	شیخ نظام الدین کی تحصیل علم	۹۴۸
♦	مسندِ تدریس	۹۴۸
♦	اخلاق وعادات	۹۴۹
♦	انکسار وتواضع	۹۵۰
♦	تصانیف	۹۵۱
♦	درسِ نظامیہ کی ترتیب	۹۵۲
♦	مدرسۂ نظامیہ اور درسِ نظامیہ	۹۵۴
♦	شیخ نظام الدین کا نصابِ تعلیم اور اس کی خصوصیات	۹۵۶
♦	تلامذہ	۹۵۸
♦	اولاد	۹۶۰
♦	مرض اور وفات	۹۶۱
♦	۸۵۔قاضی نظام الدین احمد آبادی	۹۶۲
♦	۸۶۔شیخ نعمت اللہ سندھی	۹۶۲
♦	۸۷۔حاجی نعمت اللہ نوشہردی	۹۶۳
♦	۸۸۔قاضی نور الحق گجراتی	۹۶۳
♦	۸۹۔مفتی نور الحق دہلوی	۹۶۳
♦	۹۰۔قاضی نور الحق انصاری کرانوی	۹۶۴
♦	۹۱۔شیخ نور الدین گجراتی	۹۶۴
♦	۹۲۔مولانا نور الدین گنت پوری	۹۶۵
♦	۹۳۔شیخ نور اللہ بنارسی	۹۶۶

Marfat.com

◆	۹۴۔ سید نور اللہ بلگرامی	۹۶۶
◆	۹۵۔ مولانا نور اللہ کشمیری	۹۶۶
◆	۹۶۔ شیخ نور اللہ برہانوی	۹۶۷
◆	۹۷۔ شیخ نور محمد بدایونی	۹۶۷
◆	ـــــ و ـــــ	
◆	۹۸۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	۹۶۸
◆	برصغیر کے چند مشہور علمی خاندان	۹۶۸
◆	شاہ ولی اللہ کے اسلاف	۹۷۰
◆	شاہ ولی اللہ کی ولادت	۹۷۱
◆	تعلیم و تربیت	۹۷۲
◆	شادی	۹۷۳
◆	بیعت و خلافت	۹۷۳
	قصدِ حجاز	۹۷۴
◆	مراجعت وطن	۹۷۵
◆	شاہ صاحب کا زمانہ	۹۷۵
◆	اوصافِ گوناگوں	۹۷۸
◆	تصانیف	۹۷۸
◆	خدمت قرآن مجید	۹۷۸
◆	علم حدیث کی خدمت	۹۹۰
◆	علم فقہ	۹۹۱
◆	اجتہاد اور تقلید	۹۹۳
◆	مسلکی نقطۂ نظر	۹۹۵
◆	علم تصوف	۱۰۰۴
◆	اقتصادی، معاشرتی اور اصلاحی نظریات	۱۰۰۶
◆	سیاسی بصیرت کی چند مثالیں	۱۰۱۲
◆	مکتوبات	۱۰۲۰
◆	شعر و شاعری	۱۰۲۱
◆	آخری مرض اور وفات	۱۰۲۳
◆	شاہ صاحب کے فرزندانِ گرامی	۱۰۲۶
◆	قرآن مجید کا اردو ترجمہ	۱۰۲۸
◆	ـــــ ی ـــــ	
◆	۹۹۔ مولانا یار محمد لاہوری	۱۰۲۹
◆	۱۰۰۔ شیخ یٰسین جون پوری	۱۰۳۱
◆	۱۰۱۔ مفتی یعقوب فرنگی محلی لکھنوی	۱۰۳۱
◆	مراجع و مصادر	۱۰۳۲

Marfat.com

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ فقہائے ہند کی جلد پنجم حصہ دوم کا مقدمہ ہے۔ اس سے قبل ہندوستان کے چھٹے مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کی زندگی کے مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں اور علما وفقہا سے اس کے تعلقات وروابط کی وضاحت کی گئی ہے، نیز بتایا گیا ہے کہ خود اورنگ زیب کے حدودِ علم کس قدر وسیع تھے اور مسائل دین میں اس کو کس درجے عبور حاصل تھا۔

اورنگ زیب نے قمری حساب سے اکانوے (۹۱) سال تیرہ دن عمر پائی اور پچاس برس دو ماہ ستائیس دن حکومت کی۔ وہ بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کا عدیم المثال بادشاہ تھا اور اس کا دورِ حکومت متعدد اعتبارات سے کامیابی اور کامرانی کا دور تھا۔ اس نے ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ ہندوستان کے اس شہنشاہ نے بسترِ مرگ پر اپنے بیٹوں کو مخاطب کر کے جو آخری الفاظ کہے، ان سے پتھر کا دل بھی موم ہو جاتا ہے اور جس پیرائیہ بیان میں دنیا کی ناپائیداری اور اپنی بے بسی اور حرماں نصیبی کا ذکر کیا اس سے اس کے سخت سے سخت دشمن کا کلیجہ بھی شق ہونے لگتا ہے۔ اس کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

جب میں پیدا ہوا تو میرے گرد لوگوں کا مجمع تھا اور اب موت کے وقت تن تنہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں زندہ ہوں اور کس لیے دنیا میں آیا تھا۔ افسوس کہ مجھ سے مخلوقِ خدا کی بھلائی کا کوئی کام نہ ہو سکا۔ نہیں معلوم کہ میرا ٹھکانا کہاں ہوگا اور اس عاصی سرتاپا اور آلودۂ گناہ کو بارگاہِ خداوندی میں کس سلوک کا مستحق ٹھہرایا جائے گا۔ اب میں دنیا سے رخصت ہوتا ہوں اور سب کو خدا کی حفاظت میں دیتا ہوں۔ میرے نامور اور سعادت مند بیٹوں کو آپس میں لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔ نہ لوگوں کا جو بندگانِ خدا ہیں، قتل روا رکھنا چاہیے۔ میری تمام عمر رائیگاں گئی۔ اگرچہ خدا کی یاد ہمیشہ میرے دل میں رہی مگر میں اپنی تیرہ چشمی سے اس نورِ نظر کو پہچان نہ سکا۔ آئندہ مجھے اپنی زندگی کی کوئی امید نہیں رہی۔ مجھ سے بخار نے مفارقت اختیار کر لی ہے اور ہڈیوں کا ڈھانچا باقی رہ گیا ہے۔ لشکریوں میں بدنظمی پھیل گئی ہے اور وہ اسی طرح مایوس و بے یار و مددگار ہیں جیسے کہ

Marfat.com

میں خود ہوں۔ میرے دل کو چین اور روح کو اطمینان نہیں۔ میں اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے آپ کو خدا سے دور سمجھتا ہوں۔ جب خود میں نے ہی آس توڑ دی تو دوسروں سے کیا امید رکھ سکتا ہوں۔ تم میری آخری وصیت پر عمل کرو۔ ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کا خون بہنے لگے اور ان کی موت کا وبال مجھ ناکارہ کی گردن پر رہے۔ میں بہت گناہ گار ہوں اور نہیں جانتا کہ کیا کیا عذاب میرے مقدر میں ہیں۔ دنیا میں آتے وقت کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ اب جانے لگا ہوں تو گناہوں کے بوجھ کی بھاری گٹھڑی سر پر لیے جا رہا ہوں۔ میں تم کو اور تمھارے بچوں کو خداوند عالم کی حفاظت میں دیتا ہوں اور تم سے رخصت ہوتا ہوں۔ والسلام علیکم ❶۔

اورنگ زیب نے ایک وصیت نامہ لکھا، جس کے چند الفاظ یہ ہیں۔

بے کس آمدیم و بے کس رفتیم۔ سر برہنہ آمدیم و رفتیم۔ ہمراہ تابوت، نشان و مور چال وغیرہ لوازمہ شاہانہ نماند۔ حمید الدین خاں کہ صادق الاعتقاد است، تابوت را بہ درگاہ شاہ برہان رساند و جائے قبر بہ دستور درویشاں دفن کنند ❷۔

(یعنی اکیلے آئے اور اکیلے جا رہے ہیں۔ ننگے سر آئے اور ننگے سر جا رہے ہیں۔ لوازم پادشاہی اور علم شاہانہ کوئی چیز ساتھ نہیں ہے۔ حمید الدین خاں جو کہ ہمارے ساتھ مخلصانہ تعلقات رکھتا ہے، شاہ برہان کی درگاہ میں جنازہ پہنچا دے اور درویشوں کی طرح لوگ مجھے قبر میں دفن کر دیں۔)

اورنگ زیب کی وفات کے وقت اس کے تین بیٹے زندہ تھے۔ سب سے بڑا محمد معظم۔ اس سے چھوٹا محمد اعظم اور سب سے چھوٹا کام بخش۔! باپ نے ایک وصیت کے ذریعے سلطنت ہند کو ان تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ بڑا بیٹا اس وصیت پر عمل کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا بھائی محمد اعظم اس کے لیے تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاجو کے مقام پر دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ ہوئی، جس میں محمد اعظم اور اس کے دو لائق بیٹے بیدار بخت اور والا جاہ مارے گئے۔ محمد معظم سب سے چھوٹے بھائی کام بخش کو بھی باپ کی وصیت کے مطابق اس کا علاقہ دینے پر آمادہ تھا۔ بلکہ کچھ زیادہ بھی دینے پر رضامند تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس نے بھی یہ بات منظور نہ کی۔ آخر کار معرکہ کارزار گرم ہوا اور کام بخش شدید زخم کھانے کے بعد وفات پا گیا۔

آگے چل کر مغل بادشاہوں میں تخت نشینی کے مسئلے پر پیہم خوں ریزیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہت سے لائق امرائے سلطنت مارے گئے اور رفتہ رفتہ ملک کے نظم و نسق کے تمام رشتے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔ اور آخری نتیجہ یہ نکلا کہ اس ملک سے مغل حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (۱۱۱۸ھ۔۱۷۰۶ء) کے بعد جو دور شروع ہوا۔ اسے مغل حکومت کے دور زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

---

❶ واقعات دار الحکومت دہلی، حصہ، اول، ص ۵۸۴-۵۸۵-

❷ واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول ص ۵۸۶

Marfat.com

سلسلہ فقہائے ہند کی گزشتہ جلدوں میں ہم سلطنت مغلیہ کے عہد عروج کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ آیئے اب اس کے زمانۂ زوال اور دور انحطاط کے بعض افسوس ناک واقعات کا بھی مطالعہ کریں کہ تاریخ، قوموں کے اسی اتار چڑھاؤ کا نام ہے۔ آج ایک قوم داد حکمرانی دے رہی ہے تو کل دوسری اورنگ سلطنت پر قبضہ جما لیتی ہے۔ تاریخ کے بے رحم ہاتھوں سے کبھی کوئی محفوظ نہیں رہا۔ مغلوں پر بھی تاریخ کا یہ عمل جاری ہوا اور وہ اس کے خونی پہیوں کی گردش میں آ کر رہے۔ ذیل کی سطور میں اختصار کے ساتھ اسی الم انگیز اور اذیت ناک داستان کی بعض تفصیلات بیان کرنا مقصود ہے۔

اورنگ زیب کی وفات یعنی ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۸۰۶ء تک سو سال کے عرصے میں مندرجہ ذیل مغل حکمران تخت ہندوستان پر بیٹھے۔

۱ محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول: ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء تک۔

۲ معزالدین جہاں دار شاہ: ۱۷۱۲ء سے ۱۷۱۳ء تک۔ یہ فرخ سیر کے ہاتھوں قتل ہوا۔

۳ فرخ سیر: ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ لاولد مرا۔

۴ رفیع الدرجات: ۱۷۱۹ء میں صرف چھ ماہ حکمرانی کر کے مرض دق سے وفات پائی۔

۵ رفیع الدولہ: ۱۷۱۹ء میں صرف تین مہینے حکمران رہا اور وفات پائی۔

۶ نیکو سیر: چند روز حکومت کی۔

۷ ابوالفتح نصیرالدین روشن اختر محمد شاہ عرف رنگیلا: ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک حکمران رہا (محمد شاہ رنگیلا کی تخت نشینی کے چند ماہ بعد یکم اکتوبر ۱۷۲۰ء سے ۸ نومبر ۱۷۲۰ء تک صرف ایک مہینا آٹھ دن ابراہیم بھی تخت نشین رہا۔ اس مختصر مدت میں اس نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کرا لیا تھا)

۸ مجاہدالدین ابوالنصر احمد شاہ: ۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۴ء تک حکومت کی اور پھر معزول و مکحول ہوا۔

۹ ابوالعادل عزیزالدین محمد عالم گیر ثانی: ۱۷۵۴ء سے ۱۷۵۹ء تک بادشاہ رہا۔ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔

۱۰ مرزا عبداللہ عالی گوہر شاہ عالم ثانی: ۱۷۵۹ء سے ۱۸۰۶ء تک حکومت کی۔ ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں نے اس کی سلطنت کو درہم برہم کر دیا تھا اور یہ مغل بادشاہ انگریزوں کی حفاظت میں رہتا تھا۔

یہ دس (بلکہ ابراہیم سمیت) گیارہ مغل بادشاہ ہیں جو ۱۷۰۷ء سے ۱۸۰۶ء تک کے سو سال کے عرصے میں تخت نشین ہند ہوئے۔ یہ نہایت افراتفری اور انتہائی بدامنی کا زمانہ تھا۔ بادشاہ بے بس اور مجبور محض تھے۔ امرائے سلطنت جو چاہتے کرتے تھے، بادشاہ انھیں کچھ کہنا بھی چاہتے تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ بادشاہوں کی کمزوری اور عدم جرأت کی وجہ سے ہندوستان کئی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں منقسم ہو گیا تھا اور مغل حکمرانوں کے تاج کی قدر و منزلت باقی نہ رہی تھی۔ اب تاریخی ترتیب کے ساتھ اس دور کے ضروری واقعات معرض تحریر میں لائے جاتے ہیں تاکہ پچھلا سلسلہ بھی قائم رہے اور آئندہ کے حالات بھی سامنے آ جائیں۔

Marfat.com

شاہ عالم بہادر شاہ اول:

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول تخت ہند پر متمکن ہوا۔ یہ ہندوستان کا ساتواں مغل حکمران تھا۔ ۳۰ رجب ۱۰۵۳ھ (۴ر اکتوبر ۱۶۴۳ء) کو برہان پور میں پیدا ہوا۔ اور سلطنت وحکومت کی گود میں پرورش پائی۔ کچھ دور اپنے جد نامدار شاہ جہاں کی حکومت کا دیکھا اور پورا زمانہ باپ کی حکمرانی کا آنکھوں کے سامنے گزرا۔ اس طرح باپ اور دادا دونوں کے زیر تربیت رہنے کے مواقع میسر آئے۔ سلطنت مغلیہ کی تاریخ میں اسے بہادر شاہ اول کہا جاتا ہے۔

بہادر شاہ نے کچھ ہوش سنبھالا تو قرآن مجید حفظ کیا اور مختلف اساتذہ سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ فنون حرب سے بہرا ور ہوا اور آداب سلطنت میں دسترس حاصل کی۔ مجموعی اعتبار سے بہادر شاہ اول، بلند اخلاق، عمدہ خصال، نرم خو اور حلیم الطبع بادشاہ تھا۔

اورنگ زیب کی وفات کے وقت بہادر شاہ کابل کی ولایت پر متعین تھا اور اس کا چھوٹا بھائی محمد اعظم دکن کی صوبے داری پر مامور تھا۔ محمد اعظم ۱۲ر شعبان ۱۰۶۳ھ/ ۲۸ر جون ۱۶۵۳ء کو پیدا ہوا تھا اور محمد معظم یعنی بہادر شاہ سے عمر میں دس برس چھوٹا تھا۔ محمد معظم اورنگ زیب کی وفات سے بارہ روز بعد ۱۰ ذی الحجہ ۱۱۱۸ھ (۴ر مارچ ۱۷۰۷ء) کو بھاری لشکر کے ساتھ کابل سے روانہ ہوا۔ لاہور کے قریب پہنچ کر اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور ۱۲ جون ۱۷۰۷ء کو آگرہ کے قریب جاجو کے مقام پر آ کر خیمہ زن ہوا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں اس کے باپ اورنگ زیب نے اپنے بھائی داراشکوہ کو شکست دی تھی۔

ادھر محمد اعظم بھی فوج لے کر احمد نگر سے روانہ ہوا، اور امرائے سلطنت اور ارکان حکومت کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ بہادر شاہ کے قریب آ کر پڑاؤ کیا۔ اب دونوں طرف کی فوجیں آگرہ اور دھول پور کے درمیان ایک دوسرے کے آمنے سامنے پڑی تھیں اور وہی ساموں گڑھ کا میدان تھا، جہاں ٹھیک اکیاون (۵۱) برس پہلے اورنگ زیب اور داراشکوہ کے درمیان معرکۂ کارزار گرم ہوا تھا۔

بہادر شاہ طبعاً نرم مزاج اور صلح جو تھا۔ اس نے ہر چند بھائی کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھایا اور جنگ سے بچنے کی کوشش کی۔ اس کی خواہش تھی کہ باپ کی وصیت پر عمل کیا جائے اور لڑائی سے محفوظ رہا جائے۔ لیکن محمد اعظم اس پر آمادہ نہ تھا۔ وہ پورے ملک کا خود بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ بالآخر لڑائی ہوئی اور سخت خوں ریزی کے بعد بہادر شاہ فتح یاب ہوا، اور ہندوستان کا تاج شاہی سر پر رکھا۔

کہا جاتا ہے کہ فریقین کی فوج ساڑھے چھ لاکھ کی کثیر تعداد پر مشتمل تھی۔ جنگ کے نتیجے میں محمد اعظم اور اس کے دو لائق اور شجاع بیٹے بیدار بخت اور والاجاہ مارے گئے، اور بہت سے امرائے مملکت اور ماہرین جنگ قتل ہو گئے۔ یہ واقعہ اتوار کے دن ۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ (۸ر جون ۱۷۰۷ء) کو پیش آیا۔ یعنی اورنگ زیب

Marfat.com

عالم گیر کی وفات سے صرف چار مہینے بعد۔

بہادر شاہ کا سب سے چھوٹا بھائی کام بخش تھا اور باپ کے زمانے میں بیجا پور کا والی تھا۔ اس نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا اور خطبے میں بھی اپنا نام شامل کیا۔ بہادر شاہ لشکر کثیر کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوا اور حیدرآباد کے قریب جا پہنچا۔ ادھر کام بخش بھی اپنی سپاہ کے ساتھ نمودار ہوا۔ لڑائی کے شعلے بلند ہوئے اور کام بخش کو میدان جنگ میں شدید زخم آئے۔ اسی حالت میں گرفتار کر کے اسے شاہی کیمپ میں لایا گیا۔ بہادر شاہ نے اپنے بیٹے معزالدین کو کام بخش کے استقبال کے لیے بھیجا اور حکم دیا کہ اسے اعزاز و اکرام کے ساتھ لایا جائے۔ جب اس کو سخت زخمی حالت میں خیمے میں لایا گیا اور اس کے مرتبے کے مطابق جگہ دی گئی تو وہ زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ بہادر شاہ بھائی کی ملاقات کے لیے آیا اور رقت آمیز لہجے میں کہا:

نمی خواستم کہ شمارا چنیں بہ بینم ❶۔

(میں آپ کو اس حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔)

کام بخش نے بھی سرد آہ بھر کر بہادر شاہ کو انہی الفاظ میں جواب دیا اور وفات پا گیا۔ ''جان بجان آفرین سپرد ❷''

یہ واقعہ ۳/ ذی قعدہ ۱۱۲۰ھ (۱۳/ جنوری ۱۷۰۹ء) کو رونما ہوا۔ اور بہادر شاہ کابل سے لے کر کلکتہ کے آخری سرے تک ہندوستان کے وسیع ملک کا بادشاہ بنا۔

شاہ عالم بہادر شاہ اول بہت متحمل مزاج بادشاہ تھا۔ وہ علما و صوفیا کی مجالس میں بھی حاضر ہوتا اور ان سے مستفید ہوتا تھا۔ اگر اس قسم کی کسی مجلس میں مزاج شاہانہ کے خلاف بھی کوئی بات ہو جاتی تو خاموشی اختیار کر لیتا۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ اردو کے مشہور شاعر اور صوفی خواجہ میر درد کے ہاں ہر مہینے ارباب تصوف کا اجتماع ہوتا تھا۔ اس میں ایک مرتبہ شاہ عالم بلا اطلاع چلا آیا۔ اس روز اس کے پاؤں میں تکلیف تھی اور درد ہو رہا تھا اس لیے ذرا پاؤں پھیلا دیا۔ میر درد نے بادشاہ کو اس حالت میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہا۔ ''یہ حرکت فقیر کے آداب محفل کے خلاف ہے۔'' بادشاہ شرمندہ ہوا اور کہا: ''معاف کیجیے پاؤں میں عارضہ ہے، اس لیے معذور ہوں'' میر درد نے کہا۔ ''عارضہ تھا تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

یہ ایک مثال ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ دور زوال کے مغل بادشاہ بھی علما و صوفیا کی انتہائی قدر کرتے اور ان کے سامنے زبان کو حرکت نہ دیتے تھے۔ اگر ان سے کوئی غلطی ہو جاتی تو فوراً معذرت طلب کر لیتے تھے۔

مغل دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ بہادر شاہ عالم و فاضل، بامروت، خوش اخلاق عمدہ کردار کا مالک،

❶ سیر المتاخرین، ج ۲ ص ۳۷۹

❷ سیر المتاخرین ج ۲ ص ۳۷۹

Marfat.com

عبادت گزار، صاحبِ عزم اور جرأت مند بادشاہ تھا۔ مطالعۂ کتب کا شائق اور علما کا عقیدت مند تھا۔ اصحاب فضل اور ارباب کمال کا احترام کرتا تھا۔ فیاض دل اور نیک طینت تھا۔ عادل ومنصف اور غریب پرور تھا۔ فریادی کی دادرسی کرتا اور درخواست گزار اس کے دربار سے مایوس نہ جاتا۔ لیکن تدبر سے محروم، سیاسی معاملات میں غور وفکر سے عاری اور قوت فیصلہ سے تہی دامن تھا۔ یعنی اس تلاطم خیز زمانے میں جس چیز کی اصل ضرورت تھی وہ اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس کے ان عیوب نے آگے چل کر مغل سلطنت کو بے حد نقصان پہنچایا اور اس کے نظم و نسق کی چولیں ڈھیلی کر دیں۔ بہادر شاہ کی بے بصیرتی اور بے تدبیری کی وجہ سے تین قومیں اس کی پریشانی کا باعث بنیں:

۱۔ مرہٹے۔

۲۔ سکھ۔

۳۔ راجپوت۔

مرہٹوں نے بہادر شاہ کے باپ اورنگ زیب عالم گیر کو بھی ہمیشہ پریشانی میں مبتلا کیے رکھا تھا۔ اگرچہ اس نے بہت حد تک مرہٹوں کو زیر اور ان کے بڑے بڑے ٹھکانوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن وہ ان کی جمعیت اور طاقت کو جو بڑا زور پکڑ چکی تھی کلیۃً ختم کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ چنانچہ اس کی وفات کے بعد انھوں نے پھر سر اٹھایا اور میدان میں نکل آئے۔ یہ نہایت بے رحم اور لٹیرے لوگ تھے جو صرف مسلمانوں ہی کے مخالف نہ تھے اور فقط انہی کو ہدف ستم نہ بناتے تھے، ہندوؤں کو بھی تنگ کرتے اور ان پر کئی قسم کے ظلم ڈھاتے تھے۔ یعنی بلا استثنا وہ سب کے دشمن تھے اور ہر طبقے کے لیے مصیبت کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ان کے بے پناہ مظالم کی وجہ سے تمام لوگ ان سے پریشان تھے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ بہادر شاہ کو ان کے سامنے جھکنا اور مجبوراً علاقۂ دکن کے خراج سے انھیں حصہ ادا کرنا پڑا۔ یہ پہلی بہت بڑی کمزوری تھی جس کا مرہٹوں کے مقابلے میں بہادر شاہ نے عملاً اظہار کیا۔ ایک مغل تاج دار اور اورنگ زیب عالم گیر کے وارث کا اس طرح مخالف کے سامنے سرنگوں ہو جانا انتہائی افسوس ناک بات تھی۔ آگے چل کر اس کے نہایت تکلیف دہ نتائج نکلے اور ہندوستان کی مغل سلطنت کے اسباب زوال میں اسے ایک اہم سبب قرار دیا گیا۔

دوسرا گروہ سکھوں کا تھا جو مغلوں کے لیے سخت پریشانی کا موجب بنا۔ سکھوں کی تاریخ کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں گرونانک سے ہوتا ہے۔ وہ توحید کی تبلیغ کرتے اور لوگوں کو اللہ کی عبادت درس دیتے تھے۔ ہندوؤں کے علاوہ مسلمان بھی ان کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ فقیر طبع اور درویش منش آدمی تھے۔

گرونانک کی وفات کے بعد جو شخص ان کی گدی پر بیٹھا، اس کا نام انگد تھا، جو گرو جی کا ایک مخلص

Marfat.com

خادم اور پیرو کار تھا۔ وہ تیرہ سال تک لوگوں میں گرونانک کی تعلیم کا پرچار کرتا رہا۔ انگد کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے ایک ارادت مند امرداس کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ امرداس نے بائیس برس تک اس سلسلے کو چلایا اور اپنے داماد رام داس کو اپنا خلیفہ بنایا، جو سات سال اس مسند پر فائز رہے۔ بعد ازاں ان کے بیٹے گرو ارجن نے باپ کی جگہ سنبھالی۔ وہ پچیس برس تک اپنے گروؤں کی تعلیم کو پھیلاتے رہے۔ انھوں نے اپنے فرقے کی جتھہ بندی کی۔ پھر ان کے بیٹے گرو ہرگوبند وارث ہوئے اور اڑتیس (۳۸) سال اس مسند پر متمکن رہے اور سکھوں میں فوجی روح پھونکی۔ گورو ہرگوبند نے اپنے بعد اپنے نواسے ہررائے کو اس تعلیم کے فروغ کے لیے مقرر کیا۔ ہررائے سترہ سال اپنے عقیدت مندوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ پھر ان کے بیٹے ہرکشن گدی نشین ہوئے۔ وہ صرف تین سال ہی اپنے فرقے کی قیادت کر پائے تھے کہ فوت ہو گئے۔ ان کے بعد گرو ہرگوبند کے بیٹے گرو تیغ بہادر سکھ پنتھ کی خدمت کے لیے میدان میں نکلے۔

گرو تیغ بہادر کے زمانے میں اس فرقے کے لوگوں نے صرف بھگتی اور درویشی پر ہی قناعت نہ کی، بلکہ سیاست کے میدان میں اتر آئے۔ ان کے پیرو باقاعدہ مسلح ہو کر وسیع تعداد میں باہر نکلتے اور پوری آزادی سے گرو کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں گھومتے پھرتے۔ اس طرح یہ لوگ حصول اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور حکومت پر قبضہ کرنے کی غرض سے منظم ہونے لگے۔ حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگوں سے اپنی ضرورت کی چیزیں جبراً وصول کرتے اور ملک میں بدامنی پھیلاتے۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسی زمانے میں ایک مسلمان فقیر بھی جس کا نام حافظ آدم تھا، پنجاب میں لوٹ کھسوٹ کرتا پھرتا تھا۔ یہ شخص مسلمانوں کو پریشان کرتا اور گرو تیغ بہادر مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو مختلف طریقوں سے ہراساں کرتا تھا۔ شاہی وقائع نگاروں نے اورنگ زیب عالم گیر کو اطلاع دی کہ دو شخص درویشوں اور فقیروں کے بھیس میں رعایا میں خوف و ہراس پیدا کر رہے ہیں اور کچھ لوگ ان کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اگر ان کے خلاف کارروائی نہ کی گئی اور ان کی سرگرمیوں کو فوری طور پر بند نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ آگے چل کر یہ ملک اور حکومت کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائیں گے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے ادھر توجہ کی اور لاہور کے صوبے دار کو لکھا کہ اس فتنے کو جس طرح ممکن ہو ختم کیا جائے۔ صوبے دار نے بادشاہ کے حکم پر عمل کیا اور باغیوں کو سزا دی۔ ظاہر ہے جب بادشاہ نے خود اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی بغاوت کو برداشت نہیں کیا تو ان کی بغاوت کو جس کا دائرہ فقر و درویشی کی شکل میں روز برو وسیع ہو رہا تھا اور امن پسند رعایا جن کے مظالم سے سخت تکلیف میں مبتلا تھی، کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے مسلمان فقیر حافظ آدم کو ملک بدر اور سکھ گرو کو باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی جمعیت منتشر ہو گئی۔

اس کے بعد دسویں گرو گوبند سنگھ کا زمانہ آیا۔ ان کا دور ۱۶۷۵ء سے شروع ہو کر ۱۷۰۸ء تک چلتا ہے۔ انھوں نے دوبارہ سکھ پنتھ کو مسلح اور منظم کیا۔ وہ مذہب جس کی ابتدا فقر و درویشی سے ہوئی تھی، گرو گوبند

Marfat.com

سنگھ کی کوششوں سے خنجر و شمشیر کا مذہب بن گیا اور اس کے ماننے والے ''خالصہ'' کا روپ دھار کر تلوار اور کرپان ہاتھ میں پکڑ کر میدان میں نکل آئے۔ جب ان کا باغیانہ رویہ حد سے بڑھ گیا تو مجبوراً شاہی فوج حرکت میں آئی۔ گرو جی بھاگ کر پہاڑی علاقے میں روپوش ہو گئے، لیکن انکے دو لڑکوں کو گرفتار کر کے بغاوت کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ وفات سے پہلے گرو گوبند سنگھ مغل فوج میں عہدے دار مقرر ہو گئے تھے اور پھر جب بہادر شاہ کے زمانے (۱۷۰۸ء) میں ایک پٹھان نے ذاتی عداوت کی بنا پر دکن میں انھیں زخمی کیا تو بہادر شاہ نے ان کے علاج کے لیے شاہی طبیب بھیجا تھا۔

گرو گوبند سنگھ کے بعد ایک اور شخص سامنے آیا، جس نے مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کیے۔ اس کو تاریخ میں بندہ بیراگی، یا بندہ بہادر یا بندہ سنگھ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ شخص دراصل ہندو تھا اور اس کا نام لچھمن داس تھا۔ گورو گوبند سنگھ کے قیام دکن کے زمانے میں یہ ان کے پاس گیا۔ انھوں نے پوچھا ''کون ہو؟'' کہا ''بندہ''! اس کے بعد یہ اسی نام سے مشہور ہو گیا۔

یہ بہادر شاہ اول کا عہد تھا اور مغل حکومت رو بہ زوال ہو چکی تھی۔ بندہ بیراگی نے موقع سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلموں کی ایک جمعیت فراہم کر لی جو سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی، پھر ان کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور اپنے آپ کو سکھوں کے گروؤں کا خیر خواہ ظاہر کر کے مسلمانوں کو انتہائی ظلم وستم کا شکار بنایا۔ ان کے بچوں کو قتل کیا، جوانوں کو مارا، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیے، بوڑھوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور ان کے گاؤں کے گاؤں جلا ڈالے۔ یہ انتہائی سفاک اور درندہ صفت آدمی تھا۔ اس کو انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔ اس نے متعدد قصبات کو تاراج کیا اور کئی شہروں میں غارت گری کی۔ بے شمار زندہ لوگوں کو آگ میں جھونک دیا۔ ترس اور رحم نام کی کسی چیز سے یہ آشنا نہ تھا۔ سکھوں کا ایک فرقہ اس ستم گر کو گرو مانتا ہے۔

بندہ بیراگی اور اس کے گروہ کی دل خراش اور جگر فگار داستانیں سن کر خود بہادر شاہ اس کی گوشمالی کے لیے دہلی سے لاہور پہنچا، لیکن وہ اس کے قابو میں نہ آیا۔ اس کے بعد فرخ سیر نے اس کو ختم کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے نامور امیر عبدالصمد خان نے اسے گرفتار کر لیا اور پھر اسے قتل کر دیا گیا۔

تیسرا اہم مسئلہ جس سے مغل حکمران دوچار ہوئے، راجپوتوں کا تھا۔ ان کے بارے میں مختصر طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دہلی سے بجانب جنوب کم وبیش ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ان کے مشہور قصبات واقع تھے جو آج بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جے پور، جودھ پور وغیرہ علاقوں میں یہ لوگ بڑی تعداد میں آباد تھے اور کسی نہ کسی شکل میں ان کی حکومتیں قائم تھیں۔ ان کے مشہور ٹھکانوں اور اہم قصبوں میں سے بیانہ، کامہ، ڈیگ قابل ذکر ہیں، ان کا مرکزی مقام بھرت پور تھا، جو ریاست بھرت پور کا دارالحکومت تھا۔ آزادی ملک کے بعد ریاستوں کی حیثیت باقی نہ رہی تو بھرت پور اس ضلعے کا صدر مقام ہو گیا۔ اس علاقے کی سرحدیں

Marfat.com

آگرہ اور متھرا سے ملتی ہیں۔ آگرہ سے بھرت پور زیادہ سے زیادہ پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر ہوگا۔ ہندوؤں کے نزدیک اس علاقے کو تاریخی عظمت بھی حاصل ہے اور مذہبی تقدس بھی، کیونکہ سری کرشن جی کی ولادت اسی علاقے میں ہوئی تھی اور ان کا خاندان اس علاقے میں سکونت پذیر تھا۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ بھرت پور کرشن جی کے چچا کے نام پر آباد کیا گیا تھا۔ نیز کہا جاتا ہے کہ وہاں کے قصبے ''کامہ'' میں سری کرشن کے نانا اقامت گزین تھے۔

مغل بادشاہوں کے عہد عروج میں یہ علاقہ شاہی خاندان کے بعض افراد کو جاگیر کے طور پر عطا ہوا کرتا تھا۔ نور جہاں کو جو مغلوں کے زمانۂ عروج کی مشہور و ممتاز ملکہ تھی، جاگیر میں یہی علاقہ دیا گیا تھا۔ اس علاقے میں راجپوتوں کی آبادی تعداد میں شاید زیادہ نہیں ہوگی لیکن قوت و طاقت میں یہ لوگ ہمیشہ نمایاں اور غالب رہے۔ ان میں سے متعدد خاندانوں نے ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ اب میواتی کہلاتے ہیں، ان میواتیوں میں سے کچھ لوگ تو قیام پاکستان کے بعد نقل مکانی کر کے پاکستان آ گئے اور کچھ وہیں آباد ہیں۔

جب مغلیہ سلطنت کی مرکزی طاقت میں زوال کے آثار نمایاں ہونے لگے اور ملک میں طوائف الملوکی پھیلنے لگی تو علاقۂ بھرت پور کے راجپوتوں میں بھی اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان کے سردار کا نام بدن سنگھ تھا۔ ۱۷۲۳ء میں ڈیگ کے مقام پر اس کو راج تلک دیا گیا۔ اس نے بھرت پور کو اپنی راج دھانی بنایا اور ایک بااختیار راجے کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا۔ اس کے بائیس لڑکے تھے۔ سب سے بڑا لڑکا سورج مل تھا، جو بہت خردمند، بااستعداد اور سیاست کے نشیب و فراز سے آگاہ تھا۔ بدن سنگھ نے سورج مل کو ولی عہد بنایا اور حکومت کا کاروبار اس کے سپرد کیا۔ بدن سنگھ نے تینتیس برس دو ماہ دس دن حکومت کر کے ۱۷۵۶ء (۱۱۷۰ھ) کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ اس کے بعد سورج مل نے مستقل فرماں روا کی حیثیت سے ریاست کی زمام اختیار ہاتھ میں لی۔ وہ راجپوتوں کا اس قدر بلند حوصلے اور مضبوط عزم و ارادے کا حکمران تھا کہ اس دور کے ہندوستان کی ہر حکومت اس کی سیاسی طاقت کا وزن محسوس کرتی اور معاملہ فہمی سے متاثر تھی۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کے خلاف محاذ آرائی کی اور ان کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے میدان میں اترا تو مرہٹوں نے سورج مل کے دروازے پر دستک دی اور طالبِ امداد ہوئے۔ یہ بڑا نازک موقع تھا، لیکن سورج مل نے نہایت عقل مندی کا ثبوت دیا اور سیاسی بصیرت کی بنا پر اس جنگ میں ملوث ہونے سے بھی بچ گیا اور اپنی ریاست کو بھی محفوظ رکھا۔ اس نے مرہٹوں کو یہ دانشمندانہ مشورہ دیا کہ وہ چوں کہ گوریلا جنگ لڑنے کے عادی ہیں، اس لیے ابدالی کے مقابلے میں یہی جنگ لڑیں۔ بھاری اسلحۂ جنگ، شاہانہ خیمے اور حرم سرائیں اس موقعے پر ان کے لیے کارآمد نہیں ہوں گے۔ یہ سب چیزیں ان کے لیے مصیبت بن جائیں گی۔ مناسب یہ ہے کہ یہ ساز و سامان ریاست بھرت پور کے قلعوں میں

Marfat.com

محفوظ کر دیا جائے اور صرف خالی گھوڑوں پر سوار ہو کر ابدالی کا مقابلہ کیا جائے۔ مرہٹہ سرداروں نے سورج مل کی اس تجویز کو سراہا اور اس کی رائے سے اتفاق کیا، لیکن سداشیوراؤ بھاؤ جو مرہٹوں کا کمانڈر انچیف تھا، اس رائے سے متفق نہیں ہوا، اس نے یہ کہہ کر سورج مل کی تجویز رد کر دی کہ سورج مل ایک بڑا زمیندار ہے جس نے آرام و راحت کی زندگی اختیار کر لی ہے، اس کو لڑائی سے کیا واسطہ اور یہ کیا جانے کہ دشمن کا مقابلہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ سورج مل کو لڑائی سے محفوظ رہنے اور فریق جنگ نہ بننے کا بہترین موقع میسر آ گیا۔

لیکن سورج مل نے سیاست میں انتہائی زیرک ہونے کے باوجود ایک بہت بڑی غلطی بھی کی جو بالآخر اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ نجیب الدولہ اس کا پرانا اور مخلص دوست تھا، اس نے اس کو اپنا مخالف بنا لیا۔ وہ اس طرح کہ اس کی بیماری کے زمانے میں کسی معمولی سی بات پر سورج مل نے دہلی کی طرف یلغار کی اور اس پر حملہ کر دیا، مگر نتیجہ سورج مل کی توقع کے خلاف نکلا۔ مخالف فوج میدان میں نکلی تو سورج مل مقابلے میں مارا گیا۔ یہاں یہ بات بھی لائق مطالعہ ہے کہ جب سورج مل زخمی ہو کر گر پڑا تو اس کے مخلص محافظوں میں سے ایک مسلمان پیرزادہ بھی تھا، جس کا نام شیخ احمد تھا اور فتح پور کا رہنے والا تھا۔ اس پر سورج مل بہت اعتماد کرتا تھا۔ یہ بھی سورج مل کی حفاظت اور مدافعت کرتا ہوا اس کے ساتھ ہی قتل ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۷۶۴ء (۱۱۷۷ھ) میں پیش آیا۔ سورج مل نے آٹھ سال دو ماہ پندرہ دن حکومت کی۔

بہر حال اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں بھی اور اس کی وفات کے بعد بالخصوص مغل بادشاہوں کو جن خطرناک اور بڑے مسائل سے دوچار ہونا پڑا، ان میں مرہٹوں، سکھوں اور راجپوتوں کا ذکر بہت اہم ہے۔ آگے چل کر اس سلسلے میں جو واقعات رونما ہوئے اور جو طاقتیں ان کے لیے اذیت کا باعث بنیں، موقع و محل کی مناسبت سے ان کا مناسب الفاظ و اسلوب میں ذکر کیا جائے گا۔

اورنگ زیب عالم گیر کے جانشین محمد معظم بہادر شاہ اول کے حالات میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ وہ مسلکاً شیعہ تھا اور شیعیت کی تبلیغ بھی کرتا تھا۔ جب وہ لاہور آیا تو علما کو حکم دیا کہ وہ جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں علی ولی اللہ ووصی رسول اللہ کے الفاظ کا اضافہ کریں۔ اس پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور علما نے جن میں مولانا محمد مراد لاہوری اور مولانا یار محمد لاہوری پیش پیش تھے، بادشاہ کے حکم کے خلاف سخت احتجاج کیا اور ماننے سے انکار کر دیا۔ لاہور کے عوام نے علما کا ساتھ دیا۔ لاہور کی بادشاہی مسجد میں لوگ ایک ہجوم کی شکل میں خطبۂ جمعہ میں شامل ہوئے اور بادشاہ کے اس حکم کی شدید مخالفت کی۔ بادشاہ نے علما کو طلب کیا اور فقہا و مجتہدین کے اقوال پیش کر کے دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس کا حکم مبنی بر صحت ہے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور بحث و مناظرے میں علما کے دلائل وزنی ثابت ہوئے۔ بعض علما کو اس موقعے پر گرفتار بھی کیا گیا۔ لیکن اس کا بیٹا عظیم الشان جو سنی العقیدہ تھا، درمیان میں پڑا۔ اس نے علما کے موقف کی حمایت کی

Marfat.com

اور باپ کو اپنا حکم واپس لینے پر مجبور کیا۔ یہ واقعہ دیگر مؤرخین کے علاوہ منشی غلام حسین طباطبائی نے بھی سیر المتاخرین میں بیان کیا ہے، چونکہ یہ مورخ خود شیعہ ہے، اس لیے اس کے اسلوب بیان میں بادشاہ کی تائید اور علما کی مخالفت صاف نظر آتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ علما نے نہایت ''عصبیت'' سے کام لیا۔ ''بلوائے عام'' پر اتر آئے اور وہ ناصبی تھے۔ ''ناصبی شعارند ❶''۔

مجموعی طور پر بہادر شاہ اچھا آدمی تھا اور علم وعلما سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمدرد و خیر خواہ اور رحم دل تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ تخت نشینی کے سلسلے میں یہ بھائیوں سے جنگ نہیں کرتا چاہتا تھا اور مخلوق خدا کی خوں ریزی سے گریزاں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ باپ کی وصیت کے مطابق سلطنت ہند کو تینوں بھائیوں میں تقسیم کرلیا جائے، لیکن دوسرے دونوں بھائیوں نے اس سے اتفاق نہ کیا اور باپ کی وصیت کو درخور اعتنا نہ سمجھا، تو مجبوراً اسے تلوار سے کام لینا پڑا۔ مگر اس کے باوجود مقتول بھائیوں کے بیٹوں سے نہایت اچھا سلوک روا رکھا اور ان کو برابر مستحق محبت والفت گردانتا رہا۔

بہادر شاہ کے زمانے میں کوئی اہم کام نہیں ہوا، بلکہ ملک میں کئی سیاسی الجھنیں پیدا ہوئیں اور سلطنت مغلیہ ترقی کے بجائے زوال سے روشناس ہوئی اور متعدد ایسے گروہ عالم وجود میں آ گئے جن میں سے آگے چل کر ہر گروہ مستقل خطرے کا نشان بن گیا۔

ہندوستان کے اس بادشاہ کو ''شہ بے خبر'' کہا جاتا تھا ❷۔ یہ لفظ اس کے لیے کیوں استعمال ہوتا تھا؟ مورخین اس کی کوئی توجیہ نہیں بیان کرتے۔ لیکن اس زمانے کے حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے یہ لقب اسے اس لیے دیا تھا کہ وہ امور سلطنت میں اتنی دلچسپی نہیں لیتا تھا، جتنی اس کے آباواجداد لیتے تھے اور یہ کہ اس کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے سلطنت میں ضعف واضمحلال پیدا ہوگیا تھا۔ حالانکہ وہ نہایت نازک دور تھا اور ہر طرف مخالفت کی مہیب گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور اس دور میں مغلیہ سلطنت کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے انتہائی جدوجہد اور مستعدی کی ضرورت تھی، لیکن بہادر شاہ اس وصف سے بہرہ مند نہ تھا۔

بہادر شاہ کے آخری دور میں پنجاب سکھوں کے شدید مظالم کی زد میں آ گیا تھا اور ان کے لیڈر بندہ بیراگی نے اس پورے علاقے کو بے پناہ مصائب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس کے سدباب کے لیے بہادر شاہ دہلی سے لاہور پہنچا، وہ کوشش کے باوجود باغیوں پر تو قابو نہ پا سکا لیکن اس اثنا میں وہ خود بیمار پڑ گیا اور ۲۱ رمحرم ۱۱۲۴ھ/ ۹ رفروری ۱۷۱۲ء کو وفات پا گیا۔ اس کی میت لاہور سے دہلی لے جائی گئی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرقد کے جوار میں اسے دفن کیا گیا۔

بہادر شاہ نے ستر سال چھ مہینے عمر پائی اور پانچ سال ایک مہینا بائیس دن حکومت کی۔

❶ اصل فارسی الفاظ کے لیے دیکھیے سیر المتاخرین ج ۲ ص ۳۸۱

❷ منتخب اللباب حصہ دوم ص ۶۳۰۔

Marfat.com

معزالدین جہاں دارشاہ:

بہادر شاہ کی وفات کے بعد تخت نشینی کے مسئلے پر پھر اس کے بیٹوں کے درمیان جھگڑا ہوا، اور آتش جنگ مشتعل ہوئی۔ اب مغلیہ خاندان کے نااہل اسلاف نے لاہور کو میدان جنگ بنایا۔ پہلی جنگوں کی طرح یہ جنگ بھی نہایت ہولناک اور شدید تھی۔ اس جنگ میں بہادر شاہ کے بیٹوں میں سے جہاں دار شاہ، رفیع الشان اور جہاں شاہ ایک طرف تھے اور عظیم الشان ایک طرف! جنگ کے نتیجے میں عظیم الشان مارا گیا۔ لیکن اس کے تین دن بعد جہاں دار شاہ، رفیع الشان اور جہاں شاہ کے درمیان پھر معرکہ قتال گرم ہوا اور رفیع الشان اور جہاں شاہ قتل ہوئے۔ ان کے بیٹے بھی مارے گے اور معزالدین جہاں دار شاہ اورنگ سلطنت پر متمکن ہوا۔ یہ بادشاہ بالکل نااہل اور بعض وزرا و امرا کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا، اس کی اپنی کوئی رائے نہ تھی، وزیر جو چاہتے کرتے تھے۔ اس نے اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی جہاں تک ممکن ہوا مغل خاندان کے ان تمام شہزادوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جن سے کوئی خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

فرخ سیر:

بہادر شاہ اول کے بیٹے عظیم الشان کا ایک بیٹا فرخ سیر تھا جو اس جنگ میں بارہہ کے سید حسین علی خاں (صوبے دار بہار) کی وجہ سے بچ گیا تھا۔ اس نے جہاں دار شاہ سے باپ اور بھائی کے خون کا بدلہ لینے کا عزم کیا اور بنگال سے بھاری لشکر کے ساتھ آگرے کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں دار شاہ کو اس کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی اپنے بڑے بیٹے اعزالدین کی معیت میں لشکر عظیم کے ساتھ مقابلے کو نکلا۔ اس وقت بارہہ کے سادات (دونوں بھائی) سید حسین علی خاں (صوبے دار بہار) اور سید حسن علی خاں (صوبے دار الٰہ آباد) بھی فرخ سیر کے ہم رکاب تھے۔ ۲۸ دسمبر ۱۷۱۲ء کو آگرہ کے قریب دونوں طرف کی فوجیں مقابلے میں اتریں اور سخت لڑائی ہوئی، جس میں فرخ سیر جیت گیا۔ ۱۷ر ذی قعدہ ۱۱۲۴ھ/۵ر دسمبر ۱۷۱۲ء کو جہاں دار شاہ جان بچا کر میدان محاربہ سے فرار ہوا اور دہلی کا رخ کیا۔ فرخ سیر فتح یاب ہونے کے بعد ۱۸ ذی قعدہ ۱۱۲۴ھ (۶ر دسمبر ۱۷۱۲ء) کو آگرہ میں تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ چند روز وہیں مقیم رہا۔ اس کے بعد دہلی کو لوٹا اور حالات کا جائزہ لیا۔ ۲۳ر ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/۱۰ر جنوری ۱۷۱۳ء کو جمعے کے روز فرخ سیر کے حکم سے معزالدین جہاں دار شاہ کو قتل کر دیا گیا، اور اس کے ساتھ ہی اس کے امیر الامرا ذوالفقار خاں کا سر بھی تلوار سے اڑا دیا گیا۔

جہاں دار شاہ ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء کو پیدا اور ۲۳ر ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/۱۰ر جنوری ۱۷۱۳ء کو قتل ہوا۔ ۵۲ سال نو مہینے عمر پائی۔ اپنے والد بہادر شاہ اول کی وفات سے لے کر آگرہ میں فرخ سیر کے ہاتھوں شکست کھانے تک دس مہینے حکومت کی۔ دہلی میں مقبرۂ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے قریب دفن ہوا۔

Marfat.com

فرخ سیر نے سادات بارہہ یعنی سید حسین علی خاں اور سید حسن علی خاں کی مدد سے تاج شاہی سر پر رکھا۔ مغلیہ عہد کے امرائے مملکت میں یہ دونوں بھائی بہت اہمیت اختیار کر گئے تھے۔ حسین علی خاں صوبہ بہار کا اور حسن علی خاں صوبہ الٰہ آباد کا والی تھا۔ دونوں بھائی نہایت مغرور اور خود سر تھے۔ انھیں مغلوں کے دور زوال میں عملاً ''بادشاہ گر'' کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، جس کو چاہتے تخت سے اتار دیتے اور جس کو چاہتے بٹھا دیتے۔ فرخ سیر بھی انہی کی مدد اور کوشش سے برسر اقتدار آیا تھا۔ فرخ سیر ایک محتاط اور معاملہ فہم حکمران تھا۔ رعایا کا خیال رکھتا تھا۔ علمائے دین سے بھی اس کے مراسم و روابط تھے۔ اس نے جب دیکھا کہ پنجاب میں بندہ بیراگی نے لوگوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا رکھا ہے اور سکھ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو پریشان کر رہے ہیں تو اس کی رگ حمیت جوش میں آئی اور ظالموں کو وہ سزا دی جس کے وہ واقعی مستحق تھے۔

پھر اس نے جب یہ محسوس کیا کہ بارہہ کے سید برادران اس پر چھا گئے ہیں اور وہ ان کی گرفت میں ہے تو ان سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا نتیجہ اس کے حق میں نہایت اذیت ناک نکلا اور وہ ان کی قید میں بری طرح پھنس گیا۔ انھوں نے اس کو گرفتار کر کے آنکھوں میں لوہے کی سلائی پھیر دی اور بصارت سے محروم کر دیا۔ بعد میں انتہائی ذلت کے ساتھ اسے قتل کر دیا گیا۔

فرخ سیر ۱۰۹۸ھ/ ۱۶۸۷ء کو پیدا ہوا۔ ۱۸/ ذیقعدہ ۱۱۲۴ھ/ ۶/ دسمبر ۱۷۱۲ء کو بادشاہ بنا۔ ۱۱۲۸ھ کے شروع میں جسونت سنگھ راٹھور کے بیٹے مہاراجہ اجیت سنگھ کی لڑکی سے شادی کی۔ ۸/ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ (۱۷/ فروری ۱۷۱۹ء) کو بارہہ کے سید بھائیوں نے اس کو دہلی کے قلعے میں گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

فرخ سیر کو ہمایوں کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔ اس کی مدت حکومت ساڑھے چھ سال کے قریب بنتی ہے۔

رفیع الدرجات:

فرخ سیر کو قتل کرنے کے بعد سادات بارہہ نے ۹/ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ/ ۱۸/ فروری ۱۷۱۹ء کو رفیع الشان کے بیٹے اور بہادر شاہ کے پوتے شمس الدین محمد ابوالبرکات رفیع الدرجات کو تخت نشین کیا۔ اس سے قبل یہ قلعۂ سلیم گڑھ میں محبوس تھا، وہاں سے نکال کر حکومت ہند کی باگ ڈور اس کے سپرد کی گئی، لیکن یہ سل اور دق کا مریض اور نہایت نحیف و کمزور آدمی تھا۔ دو مہینے دس دن حکومت کے بعد ۱۹/ رجب ۱۱۳۱ھ/ ۲۷/ مئی ۱۷۱۹ء کو وفات پا گیا۔

رفیع الدولہ:

رفیع الدرجات کی وفات کے بعد سادات بارہہ نے اس کے بھائی شمس الدین محمد رفیع الدولہ شاہ جہان ثانی کو بادشاہ بنایا۔ ۲۰/ رجب ۱۱۳۱ھ/ ۲۸/ مئی ۱۷۱۹ء کو تاج شاہی اس کے سر پر رکھا۔ چند روز بعد یہ بھی

Marfat.com

دنیا سے کوچ کر گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ان سیدوں نے ہندوستان کی مغل بادشاہت کو کھیل بنا رکھا تھا۔ جس کو چاہتے بادشاہ بنا دیتے اور جب جی چاہتا اس کو موت کی نیند سلا دیتے۔ رفیع الدولہ کے بعد نیکو سیر کو بادشاہت عطا کی۔ کچھ عرصے کے لیے ایک شخص ابراہیم کو بھی اس اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ یعنی ۱۸ فروری ۱۷۱۹ سے ۲۷ اگست ۱۷۱۹ تک انھوں نے یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات، رفیع الدولہ اور نیکو سیر تین شخصوں کو ہندوستان کے تخت سلطنت کا مالک بنایا۔

اس سے آگے محمد شاہ کا دورِ حکومت شروع ہوتا ہے جو خاصا طویل اور کئی سال کو محیط ہے۔ نیز بہت سے سنگین حوادث و واقعات کو اپنے دامنِ تاریخ میں سمیٹے ہوئے ہے۔ لیکن اس کا آغاز کرنے سے پہلے سادات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مغلوں کے اس دور کے حالات میں بار باران کا ذکر آتا ہے۔

سادات بارہہ:

سادات بارہہ سید ابوالفرح کی اولاد سے تھے جو بغداد کے قریب شہر واسط کے رہنے والے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب سترھویں پشت میں زید شہید کے واسطے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں سید ابوالفرح اپنے بارہ بیٹوں کے ساتھ واسط کی سکونت ترک کر کے ہندوستان آئے اور صوبہ دہلی کی سرہند سرکار میں پٹیالہ کے قریب اس خاندان کے لوگ الگ الگ چار گاؤں میں آباد ہو گئے۔ بعد ازاں یہ سادات اس علاقے سے نکل کر گنگا اور جمنا کے دوآبے میں ضلع مظفر نگر (یوپی) چلے گئے اور مختلف مقامات میں اقامت اختیار کر لی۔

اکبر کے زمانے میں سادات بارہہ نے کئی مہموں میں حصہ لیا اور اپنی جواں مردی کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ اکبر کی وفات کے بعد تخت نشینی کا مسئلہ سامنے آیا تو سید خاں بارہہ نے انتہائی کوشش کی کہ جہاں گیر کے بجائے اس کے بیٹے خسرو کو ہندوستان کا بادشاہ بنایا جائے، مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے تک اگرچہ یہ سادات مغل فوج میں ملازم تھے لیکن ان کو کبھی کوئی اعلیٰ منصب عطا نہیں ہوا۔

مغل تاریخ کے دو سید برادران حسن علی اور حسین علی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ضلع مظفر نگر (یوپی) کے قصبہ بارہہ کے باشندے تھے۔ انھوں نے اٹھارھویں صدی کے ابتدائی بیس سالہ دور میں ''بادشاہ گر'' کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ان کے والد کا نام سید عبداللہ خاں تھا، جس نے اورنگ زیب عالم گیر کے بخشی ممالک روح اللہ کے زیرِ نگرانی ترقی کی منزلیں طے کی تھیں۔

سید عبداللہ خاں کے بیٹے حسن علی خاں اور حسین علی خاں حسینی واسطی مملکت تیموریہ کے معروف اور سخت مزاج امرا و وزرا میں سے تھے۔ حسن علی بڑا اور حسین علی چھوٹا تھا۔ حسن علی نے پہلے پہل اورنگ زیب عالم

Marfat.com

گیر سے تقرب حاصل کیا اور مدت تک اس کی سرکار میں خدمت انجام دیتا رہا۔ عالم گیر کی وفات کے بعد دونوں بھائیوں نے اس کے بیٹے شاہ عالم بہادر شاہ سے وابستگی اختیار کی اور جاجو کی لڑائی میں محمد اعظم کے خلاف داد شجاعت دی۔ بہادر شاہ نے فتح یاب ہونے کے بعد تاج شاہی سر پر رکھا تو حسن علی کو الہ آباد کا اور حسین علی کو پٹنہ کا والی مقرر کر دیا اور اعزاز و اکرام کا مستحق گردانا۔ بہادر شاہ نے سفر آخرت اختیار کیا تو ان سید بھائیوں نے اس کے جانشین معز الدین جہاں دار شاہ کو شکست دی اور فرخ سیر کو تخت حکومت پر بٹھا دیا۔ فرخ سیر نے اس کے صلے میں ان کو بہت سے اعزازات سے نوازا۔ حسن علی کو ''قطب الملک، یمین الدولہ، سید عبداللہ خاں بہادر، ظفر جنگ، سپہ سالار، یار وفادار'' کے القاب سے سرفراز کیا اور اپنا وزیر اعظم بنایا۔ حسین علی کو ''عمدۃ الملک بہادر، فیروز جنگ، سپہ سالار، امیر الامرا'' کے القاب کے علاوہ میر بخشی کا منصب عطا فرمایا۔ لیکن اس کے بعد ان سیدوں نے فرخ سیر کو بھی بہت بڑی سزا دی، اس کی آنکھیں بے کار کر دیں اور پھر قتل کر دیا۔ اس کے بعد رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، نیکو سیر، ابراہیم اور محمد شاہ کو تخت حکومت پر بٹھایا اور بادشاہت کو ایک کھلونے کی حیثیت دے دی۔ لیکن محمد شاہ نے عقل مندی اور چال بازی سے ۶ رذی الحجہ ۱۱۳۲ھ/ ۲۸ ستمبر ۱۷۲۰ء کو اثنائے سفر میں حسن علی خاں کو قتل کرا دیا۔ حسین علی خاں اس وقت دہلی میں تھا۔ اسے بڑے بھائی کے قتل کی اطلاع ملی تو نہایت برافروختہ ہوا، جو شہزادے اور امرائے مملکت اس وقت اس کی سخت گیری کی وجہ سے محبوس تھے، انھیں رہا کیا اور ان سے محمد شاہ کے خلاف سازش کر کے ایک فوج تیار کی، اور جنگ کے لیے روانہ ہوا۔ شاہی فوج اور حسین علی کے ساتھیوں کے درمیان لڑائی ہوئی، نتیجہ یہ نکلا کہ حسین علی میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ مگر گرفتار کر کے قید خانے میں ڈالا گیا اور اسی حالت میں ذی الحجہ ۱۱۳۵ھ/ ستمبر ۱۷۲۳ء کی آخری تاریخ کو موت کی آغوش میں چلا گیا۔ بعد ازاں ۱۷۳۷ء میں جب روہیلوں نے مخالف قوتوں کو تاراج کیا تو ان سید برادران کی اولاد و احفاد کو بھی قتل یا منتشر کر دیا گیا اور پھر ان کا کہیں کوئی اثر باقی نہ رہا۔

یہ دونوں بھائی نہایت شجاع، جرأت مند، بہادر، جنگ جو اور دلیر تھے۔ شجاعت و مردانگی میں کوئی ان کا حریف نہ تھا، لیکن حسن علی خاں جاہل، متکبر، انتہائی خود سر اور مغرور تھا۔ سیاسی فہم و فراست سے عاری اور معاملات ملکی میں فکر و تدبر سے نا آشنا تھا۔ اس کے برعکس حسین علی عاقل و فہیم، صاحب جود و کرم اور بہت سے اوصاف کا مالک تھا۔ اہل علم سے تعلق رکھتا، ان کی مجالس میں بیٹھتا اور علمی مسائل میں ان سے بحث و مذاکرہ کرتا تھا۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مغل دربار میں ایک عرصے سے کئی قسم کے جھگڑے چل رہے تھے اور امرائے مملکت اور ارباب حل و عقد ان میں ملوث تھے۔ پھر ان کے نتائج کا سلسلہ دور تک چلتا تھا۔ ان جھگڑوں میں ایک جھگڑا ایرانی اور تورانی امرائے حکومت کا تھا، جو ابتدا میں خالص مذہبی نوعیت کا تھا اور چند لوگوں تک محدود تھا، یعنی امرا کی شیعہ سنی کش مکش۔ تورانی امرا اہل سنت سے تعبیر تھے اور ایرانی امرا شیعہ سے! امرا کی یہ باہمی کش مکش پرانی تھی جو اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ لیکن چوں کہ وہ مغل حکومت کا دورِ

Marfat.com

شباب تھا اور حکمران ذاتی طور پر خاص وجاہت وشہامت کا مالک اور اپنا ایک دبدبہ وطنطنہ رکھتا تھا، اس لیے بات باہر نہیں نکلتی تھی اور اس زہر کے نتائج محسوس نہیں ہوتے تھے۔ لیکن عالم گیر کے انتقال کے فوراً بعد اندر کی تمام کمزوریاں سامنے آ گئیں، عناصر حکومت میں ضعف یہاں تک بڑھ گیا کہ کہیں اعتدال باقی نہ رہا اور ان دو متضاد نظریوں کے اندرونی تصادم نے ایک مستحکم حکومت کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ سادات بارہہ وطناً ایرانی نہ تھے، مسلکاً ایرانی تھے۔ ان کے زمانۂ اقتدار میں ایرانی امرا کو تورانی امرا پر اتنی برتری حاصل ہوئی کہ بعض بڑے بڑے تورانی امرا امور حکومت سے دست کش ہو کر گھروں میں بیٹھ گئے اور کسی معاملے سے کوئی تعلق باقی نہ رکھا۔

سادات بارہہ کے عہد اقتدار میں یہ پرانا مسئلہ بہت افسوس ناک طریقے سے ابھر کر سامنے آیا اور اس کا انجام نہایت ہولناک ہوا۔ یکے بعد دیگرے کئی مغل حکمران تھوڑی مدت کے لیے آئے اور گئے، کسی کو استحکام نصیب نہ ہوا، اور کوئی بادشاہ ان سادات کی ذلت آمیز سازشوں کی بدولت اطمینان سے ملک کے نظم ونسق کی طرف توجہ نہ دے سکا۔

محمد شاہ:

ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ غازی۔ اس کا نام روشن اختر تھا۔ جہاں شاہ کا بیٹا اور شاہ عالم بہادر شاہ اول کا پوتا تھا۔ ۲۳/ربیع الاول ۱۱۱۴ھ/ ۶/اگست ۱۷۰۲ء کو جمعۃ المبارک کے روز پیدا ہوا۔ دیگر شہزادوں اور بیگمات شاہی کے ساتھ اس کو اور اس کی والدہ کو سید حسن علی خاں نے اس وقت سے قید کر رکھا تھا، جب اس کے والد جہاں شاہ کی وفات کے بعد جہاں دار شاہ کو تخت حکومت پر بٹھایا تھا۔ اب نئے بادشاہ کی ضرورت پڑی تو ماں بیٹا دونوں کو قید خانے سے نکالا اور ۱۵/ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ/ ۱۸/ستمبر ۱۷۱۹ء کو آگرہ میں تخت ہند پر متمکن کیا۔ تخت نشینی کے وقت محمد شاہ کی عمر سترہ سال تھی۔ آگے چل کر یہ ''محمد شاہ رنگیلا'' کے نام سے مشہور ہوا۔

محمد شاہ کے زمانے میں سلطنت مغلیہ کئی حصوں میں بٹ گئی تھی اور مختلف علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ دکن کا صوبے دار نظام الملک آصف جاہ برائے نام بادشاہ کا ماتحت تھا، درحقیقت اس نے حیدر آباد میں الگ حکومت قائم کر لی تھی۔ لکھنؤ میں بھی اودھ کی ایک جداگانہ سلطنت وجود میں آ گئی تھی۔ غرض ہندو، مسلمان اور غیر ملکی طاقتیں اس کے عہد میں میدان میں نکل آئی تھیں اور طوائف الملوکی پھیل گئی تھی، جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ پوری سلطنت انگریز کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

محمد شاہ کے کارناموں میں ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بارہہ کے سید بھائیوں (حسین علی اور حسن علی کو ختم کیا) لیکن یہاں اس کی متحمل مزاجی کی بھی داد دینی چاہیے کہ حسین علی کے قتل کا انتقام لینے کے لیے اس کا بڑا بھائی حسن علی بادشاہ کے مقابلے میں آیا تو متھرا کے شمال میں تقریباً تیس بتیس میل دور شیر گڑھ کے مقام پر گرفتار کر کے قید کر لیا گیا اور اسی حالت میں اس کو دہلی لایا گیا۔ لڑائی میں چونکہ وہ زخمی ہو گیا تھا، لہٰذا

Marfat.com

دہلی آنے کے کچھ عرصہ بعد انہی زخموں کی وجہ سے اس کا انتقال ہو گیا۔ محمد شاہ کو متعدد سرکردہ لوگوں نے کہا کہ حسن علی کو حالت قید میں قتل کر دینا چاہیے کیونکہ اس نے کئی بادشاہوں، شہزادوں اور امیروں پر سخت مظالم ڈھائے ہیں، لیکن محمد شاہ نے وسعت قلب کا ثبوت دیا اور اس کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ کہا کہ ایک بھائی پہلے ہی قتل ہو چکا ہے اور ان کا زور ختم ہو گیا ہے، اب اس کو قتل کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

محمد شاہ کے دور کو تاریخ ہند میں ابتری اور خون خرابے کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ بادشاہ ملکی معاملات میں غفلت اور بے پروائی سے کام لیتا تھا۔ دکن کا صوبے دار نظام الملک آصف جاہ ایک زیرک اور دور اندیش امیر تھا۔ وہ دکن میں اپنی خود مختار سلطنت قائم کرنے کے لیے فضا ہموار کر رہا تھا اور دہلی کی مرکزی حکومت پر بھی اپنا اثر اقتدار بحال رکھنا چاہتا تھا۔ دکن کے سیاسی حالات ایسے تھے کہ وہاں مرہٹوں سے بنا کر رکھنا اور تعلقات استوار کرنا ضروری تھا، اور اس نے یہی کیا۔ اپنی اس سلطنت کو محفوظ رکھنے کے لیے، جس کے مستقبل قریب میں قیام کا نقشہ وہ اپنے ذہن میں ترتیب دے رہا تھا، اس نے مرہٹوں سے دوستی گانٹھی۔

نظام الملک نے اپنے علاقے کو مرہٹوں کی دست برد سے بچانے اور بادشاہ دہلی کو پریشانی میں مبتلا کرنے کے لیے ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۶ء) میں مرہٹوں کو اکسایا اور انھیں دلی کی طرف متوجہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باجی راؤ پیشوا نے دہلی پر یلغار کر دی اور شاہی لشکر کو اس کے گھر جا کر شکست دی۔ مرہٹوں کو اس سے یہ فائدہ پہنچا کہ ان کا ''چوتھ'' (یعنی ۲۵ فیصد) دینے کا مطالبہ جو ایک عرصے سے جاری تھا، مان لیا گیا۔ باشاہ کو علم تھا کہ مرہٹوں کو دہلی کا راستہ نظام الملک نے دکھایا ہے، مگر خاموش رہا، بلکہ اس کے عہدہ و منصب میں اضافہ کیا۔

پھر اسی نظام الملک نے نوابان اودھ کے مورث اعلیٰ برہان الملک نواب سعادت خاں سے ساز باز کر کے ایران کے بادشاہ قلی خاں کو جسے تاریخ میں نادر شاہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ہندوستان پر حملے کے لیے تیار کیا۔ چنانچہ ۱۷۳۸ء میں وہ چھتیس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ ایران سے روانہ ہوا۔ محمد شاہ کی فوج بھی دہلی سے نکلی اور کرنال کے قریب جا کر پڑاؤ کیا۔ فریقین کے لشکر چند روز تک ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے مگر کوئی مقابلہ نہ ہوا۔ پھر لوٹ مار شروع ہوئی، جس نے آگے چل کر جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ محمد شاہ کی فوج دو لاکھ افراد پر مشتمل تھی، لیکن شکست کھا گئی۔ تاہم رزم گاہ میں موجود رہی۔ کچھ دن تذبذب اور پریشانی کی حالت میں گزرے، بالآخر جب امرائے سلطنت نے دیکھا کہ نظام الملک کا رجحان نادر شاہ کی طرف ہے تو مجبوراً محمد شاہ کو نادر شاہ کے حضور سر اطاعت خم کرنا پڑا۔

نادر شاہ نے محمد شاہ کو اسی عزت و احترام کا مستحق گردانا جو ایک بادشاہ ذی جاہ کے شایانِ شان تھا، لیکن ساتھ ہی امور سلطنت سے بے اعتنائی اور پست ہمتی کا طعنہ بھی دیا، یہ بھی کہا کہ میرا مقصد آپ سے سلطنت چھیننا نہ تھا، فقط انتظام مملکت کی طرف توجہ دلانا تھا۔ تاہم جب تک آپ مجھے تاوان جنگ ادا نہ کریں گے، دارالسلطنت دہلی پر میرا قبضہ رہے گا۔ ۹ر مارچ ۱۷۳۹ء کو پہلے محمد شاہ شہر میں پہنچا۔ اس کے پیچھے نادر شاہ قلعے

Marfat.com

میں داخل ہوا۔ نادر شاہ نے اپنی فوج کو سختی سے حکم دے دیا تھا کہ باشندگان دہلی سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے، لیکن بعد میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دے دیا اور چند گھنٹوں میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی موت کا لقمہ بن گئے۔ محمد شاہ نے اپنا سفیر نادر شاہ کی خدمت میں بھیجا، جس نے صاف لفظوں میں نادر شاہ سے معذرت کی۔ پھر کہیں قتل سے ہاتھ رکا۔

نادر شاہ نے سلطنت ہند پر قبضہ تو نہیں کیا، البتہ محمد شاہ سے چار کروڑ روپے تاوان جنگ کے طور پر طلب کیے، نیز صوبہ کابل، دریائے سندھ کا مغربی علاقہ اور پنجاب کے کچھ محالات (اضلاع) سلطنت ایران میں داخل ہوئے۔ اورنگ زیب کی پوتی نادر شاہ کے بیٹے کے حبالۂ عقد میں دی گئی۔ جاتے ہوئے نادر شاہ تخت طاؤس بھی ساتھ لے گیا۔ پورے ملک سے جو مال و دولت اس نے سمیٹا اس کا تخمینہ ۸۰ کروڑ روپے لگایا جاتا ہے۔ نادر شاہ کئی مہینے ہندوستان میں قیام کرنے کے بعد ۵ مئی ۱۷۳۹ء کو دہلی سے ایران روانہ ہوا۔ تب جا کر دہلی کے لوگوں نے کہیں سکھ کا سانس لیا۔

نادر شاہ نے قتل و غارت کے بعد محمد شاہ کو کچھ نصیحتیں بھی کیں، جن میں ایک یہ تھی کہ نظام الملک سے خبردار رہنا اور اس کے دھوکے میں نہ آنا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ نادر شاہ نے بانیٔ سلطنت اودھ برہان الملک سعادت خاں اور موسس حکومت آصفیہ نظام الملک آصف جاہ کو طلب کیا اور انھوں نے اس کو محمد شاہ کے خلاف دعوت جنگ دے کر جس ذلیل حرکت کا ارتکاب کیا تھا، اس پر سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ نادر شاہ کے تلخ و تند لہجے سے دونوں بہت نادم ہوئے اور مارے شرم کے اس کے سامنے سے ہٹ گئے۔ وہ اس پر آمادہ ہو گئے کہ اس بے عزتی سے تو زہر کھا لینا بہتر ہے۔ چنانچہ نظام الملک نے تو جھوٹ موٹ زہر کھایا اور تھوڑی بہت تکلیف کا اظہار کر کے کھڑا ہو گیا لیکن سعادت خاں نے سرطان کے شدید حملے سے انتقال کیا، تاہم کہا جاتا ہے کہ اس پر زہر کی علامتیں نمودار تھیں ❶۔ ممکن ہے یہ سرطان کا اثر ہو۔

اب بادشاہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل اعتماد شخص اعتماد الدولہ نواب قمر الدین خاں تھا، اس کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ یہ بہت لائق اور جرأت مند امیر تھا، لیکن حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کر لیا تھا کہ سلطنت کو گھن لگ چکا تھا اور نظم و نسق کی ساری چولیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ صوبہ بنگال، بہار، اڑیسہ، اور روہیل کھنڈ سب اپنی اپنی جگہ خود مختار ہو گئے تھے۔ روہیل کھنڈ کے باغی سردار کو تو بادشاہ نے شکست بھی دی، لیکن پھر بھی اس کا علاقہ قبضے میں نہ آ سکا۔

نادر شاہ کے قتل و غارت گری کے بعد ایک آفت یہ پڑی کہ محرم ۱۱۶۱ھ/ جنوری ۱۷۴۸ء میں درانی افغان احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس کے مقابلے کو برہان الملک سعادت خاں کے بھانجے اور داماد نواب منصور علی خاں صفدر جنگ کو سپہ سالار فوج بنا کر بھیجا گیا۔ نواب قمر الدین خاں وزیر اعظم بھی میدان جنگ میں

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے واقعات دار الحکومت دہلی ج ا ص ۶۴۶ تا ۶۵۰۔

Marfat.com

موجود تھا اور اپنے خیمے میں نماز پڑھ رہا تھا کہ ناگاہ غنیم کی جانب سے توپ کا ایک گولہ اس کے قریب آ کر گرا، اور اس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ حادثہ جمعے کے روز ۲۲ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ (۱۱ اپریل ۱۷۴۸ء) کو پیش آیا۔

اس لائق وزیر اعظم کی موت کے سانحے کا علم بادشاہ محمد شاہ کو ہوا تو شدت غم سے بے ہوش ہو گیا اور غش کھا کر گرا۔ ساتھ ہی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ سانحہ جمعرات ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ (۱۶ اپریل ۱۷۴۸ء) کو رونما ہوا۔

محمد شاہ نے ۴۷ سال عمر پائی اور ۲۹ سال پانچ مہینے ۲۳ دن حکومت کی۔ دہلی میں مقبرہ نظام الدین اولیا میں دفن ہوا۔

محمد شاہ کا عہد مغلیہ سلطنت کے لیے مختلف النوع مصائب کا عہد تھا۔ اس کے زمانے میں پنجاب کے سکھوں نے بھی سر اٹھایا۔ چنانچہ کپور تھلہ کے جسا سنگھ نے ۱۷۴۳ء میں لاہور پر حملہ کیا اور اس کے صوبے دار زکریا خاں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد جھگڑے اور تصادم کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ ۱۷۶۶ء میں وہ فوج لے کر آیا اور دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ احمد شاہ ابدالی کو اس کی اطلاع پہنچی تو وہ دہلی کی طرف بڑھا لیکن جسا سنگھ، ابدالی کی آمد کی خبر سن کر دہلی سے رخصت ہو گیا اور پہاڑوں میں جا کر پناہ لی۔ اس کے بعد اس نے دہلی کا رخ تو نہیں کیا، البتہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں لوٹ مار جاری رہی۔ ۱۷۸۳ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

محمد شاہ بے شک ''محمد شاہ رنگیلا'' کے نام سے مشہور ہوا، اور عرف عام میں لفظ ''رنگیلا'' اس کے نام کا جز قرار پایا، لیکن اس کا اصل نام روشن اختر تھا اور اس ''روشن اختر'' کی زندگی کے کچھ روشن پہلو بھی ہیں، جن کو بہر کیف ملحوظ رکھنا چاہیے۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک تجدید و اصلاح کا آغاز اسی کے دور میں ہوا، جو اس ملک کا عظیم الشان اور عدیم المثال سلسلۂ دعوت و ارشاد ہے۔ شاہ صاحب کی ہمدردیاں بھی ہمیشہ اس بادشاہ کے ساتھ رہیں۔ اگر یہ فی الواقع اتنا ہی بدعنوان اور بدقماش ہوتا، جتنا کہ عام طور پر ظاہر کیا جاتا ہے تو شاہ صاحب ہرگز اس کو لائق اعتنا نہ گردانتے۔

یہاں یہ واقعہ بھی لائق توجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کے والد مکرم شاہ عبدالرحیم نے جس مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تھا، وہ ایک مختصر سی جگہ تھی، اور اس زمانے کے حالات کے مطابق شاید اسے کافی سمجھا جاتا ہو گا لیکن جب شاہ ولی اللہ تکمیل علم حدیث کے بعد حرمین شریفین سے واپس آئے تو یہ جگہ طلبائے علم کے لیے کفایت نہیں کرتی تھی، کیونکہ ملک کے اطراف و اکناف سے طلبا کھنچ کھنچ کر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے لگے تھے۔ یہ اسی محمد شاہ رنگیلے کا عہد تھا، اس کے علم میں جب یہ بات آئی کہ مدرسہ رحیمیہ کی پرانی جگہ شاہ ولی اللہ کے حلقۂ درس کے طلبا کے لیے کافی نہیں رہی تو اس نے بقول مولوی بشیر الدین احمد دہلوی ان کو نئی جگہ عطا کی۔

''روشن اختر محمد شاہ کا زمانہ تھا، اس نے مولانا کو بلا کر شہر میں ایک عالی شان مکان دے کر آپ کو اندرون

Marfat.com

شہر رکھا۔قدیم جگہ غیر آباد ہوگئی❶۔''

شاہ صاحب کے اس مدرسے کی عمارت کے بارے میں جوان کو محمد شاہ نے تدریس حدیث کے لیے عطا کی تھی، مصنف مذکور مزید لکھتے ہیں۔

''یہ مدرسہ کسی زمانے میں نہایت عالی شان اور خوب صورت تھا اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا❷۔''

یہ مدرسہ کتنا وسیع اور کشادہ ہوگا اور اس کا پھیلاؤ کہاں تک ہوگا، اس کا اندازہ مصنف مذکور کے ان الفاظ سے ہوسکتا ہے جو انھوں نے ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد اس وقت تحریر کیے، جب دہلی کے محلوں اور آبادیوں کا پرانا سلسلہ بالکل بدل دیا گیا تھا۔

''اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں، مگر محلّہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسے کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے❸۔''

اس مدرسے کی وسعت کا اندازہ اس حقیت سے کیجیے کہ اس میں شاہ ولی اللہ نے درس قرآن وحدیث دیا، ان کے بعد مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کے الفاظ میں

''ان کے چاروں صاحب زادوں نے وہی مشغلہ جاری رکھا اور اس مدرسے نے تعلیم دینیات میں وہ نام پایا کہ ہندوستان میں شہرہ ہوگیا۔ جب شاہ صاحب کے صاحب زادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق (مہاجر مکی) نے مدرسے کی خدمت اپنے ذمے لی❹۔

بہر حال یہ کوئی بہت بڑی عمارت ہوگی جو شاہ ولی اللہ کو مدرسے کے لیے محمد شاہ نے دی۔ ملاحظہ کیجیے شاہ ولی اللہ کو محمد شاہ رنگیلے کے اس عطیے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی نے کیسے دلچسپ الفاظ تحریر کیے ہیں۔

فرماتے ہیں۔

''خصوصاً شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تو اس رنگیلے نے وہ رنگین سلوک کیا ہے کہ اگر مسلمان اس غریب کو محض اس کی اسی خدمت کی بنیاد پر بخش دیں تو وہ اس کا مستحق قرار پا سکتا ہے❺۔''

محمد شاہ کے عہد میں دہلی کو بزرگان دین کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ بہ یک وقت بائیس ایسے علمائے کرام وہاں موجود تھے جو دعوت وارشاد کا فریضہ انجام دیتے تھے۔شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رقم طراز ہیں۔

---

❶ واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۵۸۶۔

❷ ایضاً ص ۱۷۳۔

❸ ایضاً ص ۱۷۴۔

❹ واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۷۳۔

❺ الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۱۶۴۔

Marfat.com

در عہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بودند، و ایں چنیں اتفاق کم می شود ❶۔

(یعنی محمد شاہ کے زمانے میں دہلی میں ہر سلسلے اور طریقے کے بائیس صاحب ارشاد و دعوت بزرگ قیام پذیر تھے، اور یہ ایسا اتفاق ہے جو (کسی بادشاہ کے زمانے میں) کم ہی ہوتا ہے۔)

محمد شاہ کے عہد میں اردو شاعری کو بھی نشو و ارتقا کے مواقع میسر آئے اور یہ فن کافی آگے بڑھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانے میں بادشاہ اخلاقی انحطاط اور عیش کوشی کا شکار ہو گئے تھے اور یہ مہلک مرض چند خاندانوں کو چھوڑ کر تقریباً پورے معاشرے میں سرایت کر گیا تھا اور زوال سلطنت کا یہ ایک بنیادی سبب تھا۔ حکیم مومن خاں مومن کے ایک شاگرد آقا محمود بیگ راحت نے زوال سلطنت کے اسباب کا بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے اور اٹھارھویں صدی کے حالات کی عمدہ الفاظ میں تصویر کشی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ایک روز ابو نصر محمد اکبر شاہ ثانی کے دربار میں ذکر زوال سلطنت آ گیا۔ بخشی محمود نے عرض کی، چار آدمیوں نے مملکت کو تباہ کر دیا۔

"اول حکیموں نے۔ فرماں روایان بیدار مغز کو وہ مقویات کھلائیں کہ تاب تحمل نہ ہو سکی، مزاج عشرت طلب ہو گیا۔

"دوسرے کلاونتوں نے۔ ان کے گھر میں جو نوخیز ہوئی اس کو پیش کیا اور اس میں اپنا افتخار پیدا کیا۔ سلاطین کو رقص و سرود میں مائل رکھا۔ ڈوم ڈھاڑی مدار المہام ہوئے، انتظام فرماں روائی میں خلل واقع ہوا، دشمنوں نے سر اٹھایا، بدخواہوں نے پیر پھیلائے، جابجا خود سر ہو گئے، شرفا کو دربار میں مداخلت نہ ہوئی، ان کی بات کسی نے نہ سنی، وقت پر ان لوگوں نے طرح دی، غنیم کی بن آئی۔

تیسرے کثرت عیال نے۔ ادھر ازواج کی کثرت ہوئی، ادھر اولاد کی ترقی ہوئی، نزاع خانگی سے خلش ہوئی۔

چوتھے مشائخ و پیرزادوں نے۔ جب کبھی حاضر ہوئے اور کچھ ذکر سلطنت آیا، اپنے تئیں عرش پر پہنچایا، مسائل تصوف بیان کرنے لگے۔ کنج عزلت کی خوبیاں عرض کرنے لگے، خون بندگان خدا سے ڈرانے لگے، جب شیخ جی شیخی بگھار چکے، پھر اپنی کرامت جتانے لگے، ہم دعا کرتے ہیں، دعاؤں کا لشکر حضور کی فتح و نصرت کو کافی ہے، دشمن ادھر منہ بھی نہیں کرنے کا۔ خود پامالِ سم سمندانِ لشکر دعا سے دولت و اقبال ہوگا۔

فرماں روا ان کے دام میں آ گئے، پیر جی کی دعا پر تکیہ کیا، چار بالش عشرت پر تکیہ نشین ہوئے۔ اراکین گوشہ گزین ہوئے، غنیم نے قابو پایا، اقلیم پر زور لگایا، دعا کی فوج آتی رہی، حکومت جاتی رہی، لیکن زوال حکومت سے علوم اسلامی کی اشاعت میں ضعف نہ آیا، بلکہ ان کا زیادہ فروغ ہوا ❷۔

---

❶ ملفوظات عزیزیہ ص ۱۰۶۔

❷ رود کوثر ص ۶۰۲، ۶۰۳ بحوالہ نتائج المعانی ص ۱۷۵، ۱۷۶۔

Marfat.com

بہر حال وہ دور ہر اعتبار سے انحطاط کا دور تھا۔ صرف محمد شاہ ہی نہیں بہت سے لوگ اخلاقی برائیوں کا شکار تھے۔

محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ اورنگ ہند پر متمکن ہوا، لیکن اس کے حالات کا مطالعہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کے درانی حکمران احمد شاہ ابدالی کے بارے میں چند باتیں بیان کردی جائیں، جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان پر اس کے حملوں کا سلسلہ محمد شاہ کے عہد آخر (۱۷۴۷ء) سے شروع ہو گیا تھا، جو ۱۷۶۹ء تک جاری رہا۔

احمد شاہ ابدالی:

۱۷۳۷ء میں جب نادر شاہ نے قندھار پر فوج کشی کی تو جنگی قیدی کی حیثیت سے ایک شخص احمد خاں کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ نادر شاہ نے اسے دیکھا تو بہت متاثر ہوا، اور اسے اپنے ذاتی خدمت گاروں اور چوب داروں کی جماعت میں شامل کر لیا، جنھیں ''یساول'' کہا جاتا تھا۔ احمد خاں بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا، وہ بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا، نادر شاہ کے اعلیٰ اور قابل اعتماد فوجی افسروں میں گردانا گیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ نادر شاہ نے اس پر مزید اعتماد کیا اور اسے خزانے کا مہتمم بنا دیا۔ وہ نادر شاہ کی مجلسِ کارکن کا رکن بھی مقرر ہو گیا تھا۔ نادر شاہ کھلے دربار میں سب کے سامنے اس کی تعریف میں کہا کرتا تھا کہ میں نے ایران، توران اور ہندوستان میں کوئی شخص ان خوبیوں اور صلاحیتوں کا حامل نہیں دیکھا جو احمد خاں کی ذات میں پائی جاتی ہیں۔ نادر شاہ اکثر جنگی مہموں میں احمد خاں کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

۹ مارچ ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ فاتح کی حیثیت سے دہلی آیا اور محمد شاہ کے محل میں داخل ہوا تو احمد خاں اس کے ہم رکاب تھا اور دیوان عام میں نظام الملک آصف جاہ کے قریب بیٹھا تھا۔ نظام الملک نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے سے شہامت اور عظمت کے آثار نظر آئے، اور کہا کہ یہ شخص ضرور بادشاہ بنے گا۔ یہ بات نادر شاہ کے کانوں میں بھی پہنچ گئی۔ اس نے احمد خاں کو بلایا اور جیب سے چاقو نکال کر اس کے کان تھوڑے کاٹ دیے، اور کہا ''جب تم بادشاہ ہو جاؤ گے تو ان کو دیکھ کر میری یاد تازہ ہو جائے گی۔''

۲ جون ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ اپنے کیمپ میں قتل کر دیا گیا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی ملک میں انتشار پھیل گیا اور بدنظمی پیدا ہو گئی۔ یہ حالات احمد خاں کے لیے نہایت فائدہ مند ثابت ہوئے اور اس نے افغانستان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

یہاں یہ واقعہ بھی لائق ملاحظہ ہے کہ نادر شاہ کے قتل کے بعد جب احمد خاں افغانستان کی طرف بھاگا تو لاہور کے ایک بزرگ شاہ محمد صابر کو اپنے ساتھ لیا۔ شاہ محمد صابر نے نادر شاہ کے قتل سے تین دن پہلے پیشین گوئی کی تھی کہ احمد خاں بادشاہ ہوگا۔ ابھی یہ افغانستان بھی نہ پہنچے تھے کہ شاہ محمد صابر نے احمد خاں سے اصرار کر

Marfat.com

کہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے۔ احمد خاں نے اعلان کرنے میں تامل کیا تو شاہ محمد صابر نے اس کو زبردستی مٹی کے ایک ڈھیر پر بٹھا دیا اور کہا ''یہ تمہارا تخت ہے۔'' پھر گیہوں کا ایک خوشہ اس کے سر پر رکھا اور کہا ''تم درانی بادشاہ ہو''۔ بہرحال احمد خاں نے احمد شاہ درانی کے نام سے حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی۔ ابدالی ایک معروف افغان قبیلہ ہے، جس سے احمد شاہ کا نسبی تعلق تھا، اس لیے احمد شاہ ابدالی کے نام سے مشہور ہوا۔

تخت نشینی سے قبل احمد شاہ کئی دفعہ ہندوستان آ چکا تھا اور اس ملک کے حالات سے اچھی طرح باخبر تھا۔ اس کے مال و دولت، مرکزی حکومت کے ضعف و اضمحلال، امرائے مملکت کی رقابتوں اور فساد انگیز حرکتوں کا اسے علم تھا اور تمام معاملات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک اس نے ہندوستان پر نو مرتبہ دھاوا بولا اور ہر مرتبہ اس کو زیروزبر کیا۔ البتہ ان حملوں کے اسباب مختلف تھے۔ کبھی خود آیا اور کبھی اسے بلایا گیا۔

احمد شاہ ابدالی متعدد اعتبارات سے اپنے عہد کا ممتاز اور منفرد حکمران تھا۔ جہاں گیری و جہاں بانی، تدبر و سیاست، فوجی قابلیت، اور عسکری صلاحیت میں بے مثل تھا۔ پھر اس کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ مذہب سے پورا تعلق رکھتا تھا۔ علما و مشائخ کی قدر کرتا اور ان سے مشورے لیتا۔ دینی مسائل میں ان سے مذاکرہ کرتا اور شرعی امور میں ان کی بات کو حتمی قرار دیتا۔ لاہور، پشاور اور بٹالہ کے مشائخ کی خدمت میں کئی دفعہ حاضر ہوا۔ دہلی، اجمیر، اور پانی پت عقیدت کے جذبات کے ساتھ جاتا۔ پابند شرع اور سنی العقیدہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود وسیع النظر، فراخ دل اور غیر متعصب تھا۔ شیعہ، ہندو، عیسائی، سب مذاہب کے لوگ پوری آزادی سے اس کے ملک میں قیام پذیر تھے۔ حکمرانوں میں عام طور پر جو برائیاں پائی جاتی ہیں، احمد شاہ ان سے مبرا تھا۔ مے نوشی اور افیون وغیرہ کے استعمال سے اس کا دامن پاک تھا۔ شعائر مذہبی پر عامل تھا۔ سادہ لیکن باوقار زندگی بسر کرتا تھا، جس کی وجہ سے اس کو ہر طبقے میں معزز و محترم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ہاں رسائی حاصل کرنا بہت آسان تھا۔ عدل و انصاف کے تقاضوں کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ اس نے ۲۰ رجب ۱۱۸۶ھ (۲۳ اکتوبر ۱۷۷۲ء) کو سفر آخرت اختیار کیا۔

احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملے:

احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک ہندوستان پر مسلسل نو حملے کیے اور اس ملک کو خوب پامال کیا۔ سات حملے شاہ ولی اللہ کی زندگی میں ہوئے۔

۱۔ ۱۷۴۷ء میں پہلا حملہ پنجاب پر ہوا۔ اس حملے میں وہ لاہور اور سرہند پر بلا کسی مقابلے کے قابض ہو گیا، لیکن جب آگے قدم بڑھائے تو مغل فوج سے آمنا سامنا ہوا، اور ابدالی ہزیمت اٹھا کر واپس چلا گیا۔

Marfat.com

۲۔ ۱۷۵۰ء میں اس نے دوسری دفعہ پنجاب پر یلغار کی۔ صفدر جنگ نے مغل بادشاہ کے اصرار سے مجبور ہو کر مرہٹوں سے معاہدہ کیا، لیکن یہ معاہدہ ناکام رہا۔ اس زمانے میں معین الملک (میر منو) لاہور کا والی تھا، اس نے ابدالی کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا اور پنجاب کا کچھ حصہ اس کے حوالے کر دیا۔ کہتے ہیں کہ معین الملک کو یہ علاقہ ابدالی کے حوالے کرنے کی ہدایت مغل بادشاہ نے کی تھی۔

۳۔ تیسرا حملہ ۱۷۵۱ء میں کیا۔ معین الملک کو حملے کی اطلاع ہوئی تو ۹ لاکھ روپے ابدالی کی خدمت میں ارسال کیے، تاکہ یہ رقم لے کر وہ واپس چلا جائے، لیکن ابدالی نے پیش قدمی جاری رکھی۔ معین الملک نہیں چاہتا تھا کہ ابدالی سے برسرپیکار ہو، مگر پنجاب کے ایک بااثر امیر کوڑا مل نے حملہ آور ابدالی سے صلح کی شدید مخالفت کی۔ کافی بحث وتمحیص کے بعد آخر کار جنگ کا فیصلہ کیا گیا۔ دونوں طرف کی فوجیں میدان محاربہ میں اتریں تو کوڑا مل لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے بعد معین الملک کی ہمت ٹوٹ گئی اور اس نے صلح کی پیش کش کی۔ احمد شاہ ابدالی نے جواب دیا کہ میں کوڑا مل سے نمٹنا چاہتا تھا، اب وہ مر گیا ہے تو لڑائی ختم ہے۔ جتنے روپے کا میں نے مطالبہ کیا تھا، وہ بھیج دو۔

۴۔ ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر چوتھی بار ہلہ بولا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے کشمیر کے گورنر سے اپنے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ گورنر نے انکار کیا تو ابدالی نے حملہ کر دیا۔ اس وقت کشمیر کا راجا رنجیت دیو تھا، جو ۱۷۳۵ء سے ۱۷۸۱ء تک اس خطے کا حکمران رہا۔ اس نے بہادری اور جگرداری سے ابدالی کا مقابلہ کیا، لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور کشمیر ابدالی کے قبضے میں چلا گیا۔

۵۔ ۱۷۵۷ء میں ابدالی پانچویں مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، لیکن اس حملے کی نوعیت پہلے حملوں سے مختلف تھی۔ اب وہ خود نہیں آیا تھا بلکہ بلایا گیا تھا۔ بادشاہ عالم گیر ثانی کا وزیر عماد الملک غازی الدین نہایت نخوت پسند تھا۔ بادشاہ اس کی وجہ سے بہت پریشان تھا، اس نے وزیر سے نجات حاصل کرنے کے لیے ابدالی کو دعوت دی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ عالم گیر ثانی نے ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت نجیب الدولہ کے ذریعے دی تھی۔ اس زمانے میں مغل حکومت اس درجے کمزور ہو گئی تھی کہ احمد شاہ ابدالی اس ملک کی سیاست اور انتظامی معاملات میں دخیل ہو گیا تھا۔ وہ دہلی گیا، بادشاہی محل میں قیام کیا اور ملک کے تمام علاقوں سے حکومت کے وکیلوں اور امیروں کو بلایا گیا، انھوں نے ابدالی کو نذریں پیش کیں اور سب نے اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا۔ البتہ جاٹوں کے سردار اور نمائندے نہیں آئے۔ ابدالی نے عماد الملک غازی الدین کو وزارت سے علیحدہ کیا اور بادشاہ کے بڑے بیٹے علی گوہر کو نائب سلطنت مقرر کیا۔ خود اپنی شادی محمد شاہ بادشاہ کی بیٹی حضرت بیگم سے رچائی اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کا عقد عالم گیر ثانی کی بہن سے کیا۔

ان معاملات سے فارغ ہونے کے بعد ابدالی نے جاٹوں کی طرف توجہ کی اور ان سے معرکہ آز

Marfat.com

ہوا۔ اس مہم میں عماد الملک غازی الدین اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ابدالی کی بے حد مدد کی، جس سے ابدالی بہت خوش ہوا، اور عالم گیر ثانی کو لکھا کہ اس کو دوبارہ وزیر مقرر کر دیا جائے۔ عالم گیر ثانی نے ابدالی کی یہ بات ماننے سے نہایت ادب کے ساتھ انکار کیا، لیکن ابدالی اپنی بات پر اڑا رہا۔ قلم دان وزارت غازی الدین کے حوالے کیا اور نجیب الدولہ کو امیر الامرا کا منصب عطا فرمایا، اور بادشاہ اس قدر مجبور تھا کہ ابدالی سے کچھ نہ کہہ سکا۔

۶۔ ۱۷۶۰ء میں ابدالی نے چھٹی مرتبہ ہندوستان پر چڑھائی کی۔ اب ملک کے حالات بہت نازک صورت اختیار کر گئے تھے اور مرہٹوں نے آفت مچا رکھی تھی۔ ہندو، مسلمان، ملک کے راجے اور امرا وزرا سب ان سے نالاں تھے۔ ان تمام عناصر نے ابدالی کو دعوت دی۔ شاہ ولی اللہ اور نجیب الدولہ کے نام بھی انھی لوگوں میں شامل ہیں، جنھوں نے ابدالی سے مرہٹوں کے خلاف امداد کی درخواست کی تھی۔ اسی دعوت اور درخواست امداد کے نتیجے میں احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کے میدان میں جنگ ہوئی جو تاریخ ہند کی ایک مشہور جنگ ہے۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے کے بعد مغلیہ سلطنت کا نظام درہم برہم اور اس کا تمام تر ڈھانچا بے کار ہو گیا تھا۔ صوبے مرکز سے علیحدہ اور خود مختار ہو گئے تھے۔ چنانچہ نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں، علی وردی خاں نے بنگال میں اور سعادت علی خاں نے اودھ میں اپنی اپنی آزاد حکومتوں کی بنیاد رکھ دی تھی۔ پنجاب کی بساط سیاست پر سکھ قدم جما رہے تھے۔ ملک کے جنوبی اور مغربی حصوں میں مرہٹے مسلط ہو گئے تھے اور اتنی طاقت پیدا کر لی تھی کہ بہار، بنگال اور اڑیسہ کے علاقوں کو تاراج و پامال کرنے پر اتر آئے تھے۔ خود دہلی کی مرکزی حکومت کا یہ حال تھا کہ ایرانی اور تورانی جھگڑا زوروں پر تھا۔ امرائے سلطنت باہمی بغض و عناد کا شکار تھے اور مخالف فریق کو نیچا دکھانے کے لیے مرہٹوں کے دروازے پر دستک دیتے اور ان سے طالب امداد ہوتے تھے، جس کے نتیجے میں دہلی کے گرد و نواح میں مرہٹوں کی طاقت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

۱۷۵۶ء میں ملہار راؤ ہلکر اور رگھوناتھ راؤ نے جو مشہور مرہٹے تھے، شمالی علاقے کو زیر نگیں کرنے کی غرض سے جاٹوں کی مدد حاصل کی اور اگست ۱۷۵۷ء میں دہلی پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ نجیب الدولہ ان کے سامنے جھکنے اور صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بعد مرہٹوں کی غضب ناک فوج نے پنجاب کو نشانہ بنایا اور اپریل ۱۷۵۸ء میں لاہور پر قابض ہو گئی اور اپنی طرف سے لاہور کی ولایت آدینہ بیگ کے سپرد کی۔ آدینہ بیگ کی وفات کے بعد پنجاب میں پھر مخالفانہ ہنگامے ہونے لگے تو داتا جی سندھیا نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ پنجاب کا رخ کیا اور صورت حال پر قابو پایا۔ اب اس نے پنجاب کی حکومت ایک مرہٹے سا باجی سندھیا کے سپرد کی۔ یہ ملک میں مرہٹوں کے زور اور عروج کا زمانہ تھا اور ان کے حوصلے لحہ بہ لحہ بڑھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنی طاقت کا مزید مظاہرہ کرنے کی خاطر روہیل کھنڈ پر یلغار کرنے کا عزم کیا۔

Marfat.com

بہر حال تاریخ ہند کا یہ ایک نازک موڑ تھا۔ حالات اتنی تیزی سے بگڑ رہے تھے کہ مغل بادشاہ ان پر قابو پانے سے عاجز آ گئے تھے اور امرا کے آپس کے اندرونی جھگڑوں نے ان کو اور بھی پریشان کر دیا تھا۔ شاہ ولی اللہ اس دور کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے یہ کیا کہ ایک طرف تو نجیب الدولہ کو ہمت اور جرأت سے مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کیا، دوسری طرف افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان کا قصد کرے اور اس ملک کے لوگوں کو مرہٹوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائے۔

۱۷۵۹ء میں احمد شاہ ابدالی نے پنجاب کا عزم کیا اور ۲۷ نومبر کو سرہند تک پہنچ گیا۔ وہاں سے وہ دہلی کو روانہ ہوا۔ تھانیسر پہنچا تو مرہٹہ جرنیل داتا جی سندھیا اپنی فوج لے کر مقابلے کو آیا، لیکن شکست کھائی۔ یہ وہی داتا جی سندھیا ہے، جس نے ۶ جنوری ۱۷۶۰ء کو دہلی آکر نظام الدین اولیا کے مزار کو لوٹا تھا اور پھر اس سے تین دن بعد ۹ جنوری کو دہلی سے دس میل دور براری گھاٹ پر لڑائی میں مارا گیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی کی فوجیں آگے بڑھیں تو جنکوجی سندھیا اور ملہار راؤ ہلکر نے اپنے لشکر کے ساتھ اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ جب پیشوا کو اس ناکامی کا علم ہوا تو اپنے جنگ جو جرنیل سدا شیو راؤ بھاؤ کو ابدالی کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ یہ وہی مرہٹہ جرنیل تھا، جس نے تھوڑا عرصہ پیشتر نظام دکن کو شکست دی تھی اور جس کی جواں مردی کی سارے دکن میں دھوم مچی تھی اور جس کی بہادری کی داستانوں سے یہ پورا علاقہ گونج رہا تھا۔ بھاؤ بلاشبہ بہادر جرنیل تھا، وہ مختلف شہروں اور قصبوں کو روندتا ہوا دہلی پہنچا اور ۳ اگست ۱۷۶۰ء کی صبح کو اس نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے کئی دیگر علاقوں کو پامال کیا اور ۲۹ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو اس کا لشکر پانی پت کے میدان میں اترا۔

احمد شاہ ابدالی پہلے ہی غصے سے بھرا ہوا تھا، لیکن جب اس کو سدا شیو راؤ بھاؤ کے ان مظالم کا جو وہ راستے میں مظلوم رعایا پر توڑتا آیا تھا، پتا چلا تو اور طیش میں آ گیا اور باغ پت کے قریب دریائے جمنا عبور کر کے یکم نومبر ۱۷۶۰ء کو پانی پت کے میدان میں آکر خیمہ زن ہو گیا۔

یہ وہی پانی پت کا میدان ہے جو اس سے پہلے دو عظیم اور ہولناک جنگوں کا تماشا دیکھ چکا تھا اور دودمان مغلیہ کے دو نامور بادشاہوں ـــــ ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کے مقابلے میں ظہیر الدین بابر کی بہادری اور ۱۵۵۶ء میں ہیموں بقال کے مقابلے میں جلال الدین اکبر ـــــ کی شجاعت کے نقش جس کے سینے میں ثبت ہو چکے تھے۔ اب دو سو سال بعد وہ تیسری جنگ کا نظارہ دیکھنے کو بے تاب تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے میدان جنگ میں قدم رکھتے ہی ایک باصلاحیت جرنیل کی حیثیت سے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور مرہٹوں کی رسد کے راستے بند کر دیے۔ اس جنگ میں روہیلوں کی فوج بھی ابدالی کے ہم عنان تھی۔ ڈھائی مہینے جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس اثنا میں کبھی صلح کی بات چیت بھی ہو جاتی تھی۔ بالآخر مرہٹے صلح سے بالکل مایوس ہو گئے اور ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کی تاریخ فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ شروع شروع میں مرہٹہ فوج کا پلہ بھاری

Marfat.com

تھا اور ابدالی کی فوج کے دستے پسپا ہونے لگے تھے۔ مرہٹوں کا توپ خانہ اتنا مضبوط تھا کہ اس نے مسلسل گولہ باری سے قیامت بپا کر دی، لیکن روہیلوں نے بھی مقابلے میں جان کی بازی لگا دی اور نہایت بہادری سے توپ خانے پر قبضہ کر لیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جنگ میں ابدالی کو اپنی فوج میں شکست کے آثار نظر آنے لگے، وہ انتہائی نازک وقت تھا۔ اس نے اپنی محافظ فوج کے جوانوں کو حکم دیا کہ بھاگنے والوں کو روکو، جو نہ رکیں انھیں قتل کر دو۔ چنانچہ ابدالی کی محافظ فوج نے میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں کو سختی کے ساتھ روکا۔ اب فوج کے قدم جم گئے اور لڑائی زیادہ تیزی سے ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد مرہٹے پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔ سداشیو راؤ بھاؤ اور پیشوا کا بیٹا وشواس راؤ میدان میں مارے گئے۔ اور بڑے بڑے سردار اور فوجی قتل ہوئے۔ مادھوجی سندھیا (جو لنگڑا ہو گیا تھا) اور ملہار راؤ ہلکر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ بھاگتے ہوئے مرہٹوں کا ابدالی کی فوج نے جس میں روہیلے بھی شامل تھے، دور تک تعاقب کیا۔ میلوں تک مرہٹوں کی لاشیں نظر آتی تھیں۔ دیہات کی عورتیں بھی گھروں سے باہر نکل آئیں، انھوں نے مرہٹہ فوج کو خوب لوٹا۔ مقتولین کی تعداد ۳۲ ہزار کے قریب تھی اور جو لوگ قید ہوئے، وہ کم و بیش بائیس ۲۲ ہزار تھے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ مرہٹوں نے بھاگتے وقت میدان جنگ میں جو مال و دولت چھوڑا، اس کے علاوہ پچاس ہزار گھوڑے، دو لاکھ گائیں، کئی ہزار اونٹ اور پانچ سو ہاتھی ان کے کیمپوں سے ابدالی کی فوج کے ہاتھ آئے۔ شکست کے بعد مرہٹوں کی بے چارگی کا یہ واقعہ قابل بیان ہے کہ سورج مل جاٹ نے بیس ہزار مرہٹوں کو ایک ایک کمبل اور دو دو روپے فی کس دے کر دکن روانہ کیا۔

بہر حال پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو ابدالی کے مقابلے میں اس ذلت آمیز شکست سے دو چار ہونا پڑا کہ ایک مصنف کے بقول "مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی"۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کے بعد مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ مرہٹوں کے قومی رہنماؤں اور فوجی سرداروں کی ایک پوری نسل ایک ہی معرکے میں صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ کے تسلسل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرہٹوں کی طاقت ختم نہیں ہوئی۔ ان کی تگ و تاز اس کے بعد بھی جاری رہی، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ خود بادشاہ دہلی مرہٹوں کا محتاج ہو گیا۔

جنگ سے فارغ ہو کر ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء کو ابدالی دہلی میں داخل ہوا۔ مرہٹوں کے ایام اقتدار میں اس شہر کی حالت نہایت خستہ اور خراب ہو چکی تھی۔

اگر مغلیہ سلطنت میں تھوڑی بہت رمق باقی ہوتی اور اس کے حکمران عقل و شعور سے کام لیتے تو اس جنگ کے نتائج ان کے لیے نہایت فائدہ مند ہو سکتے تھے اور ان کے اقتدار کا زمانہ ہندوستان میں طول کھینچ سکتا تھا۔ لیکن مغل حکومت کے جسم سے جان نکل چکی تھی اور خالی ڈھانچا باقی رہ گیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی جب پانی پت کے میدان میں مرہٹوں سے مصروف پیکار تھا، وہ مغل حکمران شاہ عالم

Marfat.com

ثانی کا عہد تھا اور شاہ عالم ثانی اس زمانے میں بہار میں فروکش تھا۔ جنگ کے اختتام پر احمد شاہ ابدالی دہلی آیا تو اس نے شاہ عالم ثانی کو دہلی بلایا اور اپنا آدمی بھیجا کہ بعض ضروری مسائل کے متعلق اس سے گفتگو کرنا مقصود ہے، مگر وہ نہیں آیا۔ پھر ابدالی نے شاہ عالم ثانی کی والدہ نواب زینت محل سے عرض کیا اور ان سے بیٹے کے نام خط لکھوایا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

''احمد شاہ ابدالی قلعے میں آگئے ہیں ___ آج رجب کی ۲۰ تاریخ تک میں ان سے کئی مرتبہ مل چکی ہوں۔ وہ تمھارے یہاں آنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں ___ میرے بیٹے! تم آؤ اور یقین رکھو کہ تمھارے آنے پر سب معاملات طے پا جائیں گے ___ (احمد شاہ ابدالی کے بیٹے) تیمور شاہ نے بڑے خلوص اور محبت سے مجھے تحفے بھیجے ہیں۔ تمھارے بدخواہ بدگمانیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں گے، تم ان کی باتوں میں نہ آؤ۔ میرے بیٹے! تم یہاں جلد پہنچو، اگر خدانخواستہ احمد شاہ ابدالی تم سے ملے بغیر چلے گئے تو پھر تم نئی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔''

شاہ عالم ثانی کو دہلی بلانے کی متعدد وجوہ میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزوں کے حلقۂ اقتدار سے نجات حاصل کر لے اور دہلی آ کر احمد شاہ ابدالی کی موجودگی میں اپنی طاقت کا جائزہ لے اور اسے مستحکم کرنے کی طرف توجہ دے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

احمد شاہ ابدالی ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء کو دہلی میں داخل ہوا تھا، ڈیڑھ مہینے سے کچھ اوپر دہلی میں رہا۔ اس نے ۲۰ مارچ ۱۷۶۱ء کو اپنی فوج کو روانگی کا حکم دیا۔ اس کی فوج نے دہلی سے نکلتے وقت شہر میں خوب لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا اور تین دن تک لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کیے رکھا۔ واپسی پر ابدالی پنجاب پہنچا تو سکھوں نے اس پر یلغار کر دی۔ فوج کے سپاہی مال غنیمت سے لدے ہوئے تھے، بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی، وہ نقصان اٹھا کر افغانستان پہنچے۔

۷۔ ہندوستان پر ساتواں حملہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۲ء میں کیا۔ اس حملے کا سبب سکھوں کے ہنگاموں کو ختم کرنا تھا۔

۸۔ ۱۷۶۷ء میں ابدالی نے ہندوستان پر آٹھویں مرتبہ دھاوا بولا۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اس حملے سے ابدالی کا مقصد انگریزوں کو سرزمین بنگال سے نکالنا ہے، چنانچہ انگریزوں نے اپنے دفاع کے لیے فوج کا ایک دستہ الٰہ آباد روانہ کر دیا تھا تا کہ اودھ کے علاقے میں ابدالی کا مقابلہ کیا جائے۔

۹۔ ۱۷۶۹ء میں ابدالی نے ہندوستان کو پھر یاد فرمایا اور سکھوں کو نشانہ بنایا۔ یہ اس کا نواں حملہ تھا، لیکن اس نازک موقعے پر ابدالی کی فوج کے بارہ ہزار سپاہیوں نے اس سے غداری کی اور اسے مجبوراً کابل واپس جانا پڑا۔

Marfat.com

احمد شاہ ابدالی بلاشبہ کئی بہتر اوصاف کا مالک تھا۔ مرہٹوں کی بپھری ہوئی اور بے لگام طاقت کو ختم کرنا اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بات بھی اس کے بہتر کارناموں کی فہرست میں شامل ہے کہ اس نے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم نہیں کی، حالانکہ چاہتا تو کر سکتا تھا۔ وہ نو مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس نے بار بار حملے کر کے اس ملک کا کچومر نکال دیا۔ مغل حکومت کے اس دورِ زوال میں کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ نادر شاہ نے صرف ایک دفعہ ہندوستان کا قصد کیا اور چند گھنٹے دہلی میں قتل و غارت اور لوٹ مار کی۔ دریبہ کا دروازہ جواب تک ''خونی دروازہ'' کے نام سے مشہور ہے، وہی دروازہ ہے جہاں سے نادر شاہی فوج نے باشندگان دہلی کے قتل کا آغاز کیا تھا، مگر یہ سلسلہ صبح کے آٹھ بجے سے دوپہر کے تین بجے تک جاری رہا تھا۔ لیکن ابدالی نے مستقل طور پر یہ راستہ دیکھ لیا تھا۔ اس کے منہ کو لہو لگ چکا تھا اور انسانی خون کی لذت سے اس کی زبان آشنا ہو گئی تھی، اس لیے وہ بار بار یہاں آیا اور اس کی فوجوں نے دہلی میں جو چاہا کیا۔

واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دیگر امور کے علاوہ مال و زر کی ہوس بھی ابدالی کو اس کمزور ملک کو تہ و بالا کرنے پر اکساتی رہی۔ وہ جب واپس جاتا، بے پناہ دولت سمیٹ کر جاتا۔ مالی لحاظ سے اس نے ہندوستان کو نچوڑ لیا تھا۔ ایک حملے میں تو اس کی فوج نے دہلی کو دل کھول کر لوٹا، بعض شریف گھرانوں کی عورتوں نے خودکشی کر لی، متھرے میں بھی لوٹ کھسوٹ اور قتل کا بازار گرم ہوا۔ دریائے جمنا میں لاشیں تیرنے لگیں اور اس کا پانی متعفن ہو گیا۔ جب ابدالی کی فوجوں میں ہیضہ پھوٹا تو مجبوراً واپسی کا ارادہ کیا۔ لیکن چلتے چلتے ابدالی نے اپنی شادی محمد شاہ کی دختر حضرت بیگم سے رچائی اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کا نکاح عالم گیر ثانی کی بہن سے کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ابدالی مجموعی طور پر اچھا بادشاہ تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کا درد اپنے دل میں رکھتا تھا۔ نادر شاہ کی طرح سفاک اور ستم گر نہیں تھا، لیکن اس کی فوج نہایت اجڈ، خودسر اور مغرور تھی۔ وہ حملہ آور کی حیثیت سے اس ملک میں وارد ہوتی، فاتح کی حیثیت سے لوٹ مار کرتی اور اس کے باشندوں سے وہی سلوک روا رکھتی جو مفتوح قوم سے رکھا جاتا ہے۔ اس نے بے شک پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں کو زیر کیا اور ان کی طاقت کو کچلا، لیکن روہیلوں اور شجاع الدولہ کی فوجیں بھی تو اس میں شامل تھیں، جو میدان میں باقاعدہ اپنی بہادری کے جوہر دکھا رہی تھیں۔ پھر خود نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ بھی شریک جنگ تھے۔ روہیلوں نے مرہٹوں کے توپ خانے پر قبضہ کر کے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا تھا۔ ایک موقعے پر جب ابدالی کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ پسپا ہونے لگی تو روہیلوں ہی کے لشکر نے کمال شجاعت سے مرہٹوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا تھا۔ کیا اس بہادری کا صلہ بھی ابدالی ہی کو ملے گا اور ہندوستان کی فوجوں کے یہ کارنامے کسی شمار میں نہیں آئیں گے؟

کہا جاتا ہے کہ ابدالی کو شاہ ولی اللہ نے دعوت دی تھی ــــــ یہ صحیح ہے۔ لیکن شاہ صاحب کی دعوت ایک سیاسی ضرورت پر مبنی تھی۔ وہ سیاسی ضرورت یہ تھی کہ مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مرہٹے پورے ملک میں پاؤں

Marfat.com

پھیلا رہے تھے اور بلا امتیاز مذہب وملت سب کو پریشان کرتے تھے۔ چنانچہ سیر المتاخرین کی روایت کے مطابق ہندو راجے اور امرائے مملکت بھی ان کے مظالم لا تتناہی سے چیخ اٹھے تھے اور ان کا سر کچلنے اور باشندگان ملک کو ان سے نجات دلانے میں سب متفق اللسان تھے۔ اس کے لیے ان کی نظر احمد شاہ ابدالی پر پڑی اور وہ سب اس دعوت میں شریک تھے۔ شاہ صاحب سیاسی بصیرت کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک اذیت کو دوسری اذیت قبول کرنے سے ہی رفع کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس ضرورت سے مجبور ہو کر ابدالی کو صرف ایک مرتبہ دعوت دی تھی۔ اس کو یہ پٹا لکھ کر نہیں دے دیا تھا کہ تم سال دو سال کے بعد آ دھمکا کرو اور ہمیشہ اس ملک کو روندتے اور پامال کرتے رہو۔ شاہ صاحب ایک لمحے کے لیے بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ملک پر جنگ کی گھٹائیں چھائی رہیں، اس کی اقتصادی حالت کو نقصان پہنچایا جائے، اس کے معاشی وسائل کو تہس نہس کیا جائے، اس کی دولت کے ذخائر دوسرے ملک میں منتقل کیے جائیں اور اس کے باشندے پریشانی کا شکار ہوں۔ شاہ صاحب ہمیشہ امن پسند رہے اور امن وسلامتی کے ساتھ تصنیف وتالیف اور خدمت قرآن وحدیث میں زندگی گزار دی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

بعض حضرات کہا کرتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی جو دولت ہندوستان سے لے کر جاتا تھا، وہ مال غنیمت تھا اور فاتح شرعاً اس کا استحقاق رکھتا ہے۔ بے شک فاتح لشکر کو مال غنیمت کا حق پہنچتا ہے، اور مال غنیمت وہ ہے جو فاتح لشکر کو مفتوح فوج سے حاصل ہو۔ ملک کے عام باشندوں اور گھر بیٹھے شہریوں کے مال و دولت کو لوٹنے کا اسے ہرگز حق نہیں پہنچتا۔ یہ کھلی جارحیت اور ظلم ہے، دنیا کا کوئی مذہب اس لوٹ کھسوٹ کی اجازت نہیں دیتا۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی فوج نے مختلف مقامات پر لوٹ مار کا سلسلہ جاری رکھا۔

احمد شاہ مغل حکمران:

احمد شاہ ابدالی کا تذکرہ درمیان میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد اب پھر مغل حکمرانوں کی طرف آتے ہیں۔ محمد شاہ کی وفات کے وقت اس کا بیٹا مجاہد الدین محمد ابو النصر احمد شاہ وارث تخت ہوا۔ اس کو باپ کی موت کی اطلاع پانی پت میں ملی۔ نواب صفدر جنگ اس کے ہم عنان تھا۔ اس نے ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ (۱۹/اپریل ۱۷۴۸ء) کو چتر شاہی سر پر رکھا اور لوازم جلوس سے آراستہ ہوا۔ قلم دانِ وزارت نواب صفدر جنگ کے حصے میں آیا، جو خاندان اودھ سے تعلق رکھتا تھا۔ اب سلطنت مغلیہ کا وقار روز بروز گھٹتا جا رہا تھا اور مختلف علاقوں کے حکمران خود مضبوط اور مرکز سے باغی ہوتے جا رہے تھے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ جمادی الاخری ۱۱۶۷ھ (اپریل ۱۷۵۴ء) کے آخر میں بادشاہ کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی اور معدوم البصارت کر کے سلیم گڑھ میں قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد صفحۂ تاریخ سے اس کا نام بالکل محو ہو گیا۔ لیکن ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ مسند بادشاہت سے بیس سال بعد ۲۷ شوال ۱۱۸۸ھ (۳۱/دسمبر ۱۷۷۴ء) کو قید خانے میں اس کی موت واقع ہوئی اور ہمایوں کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔ دیگر مغل حکمرانوں کی طرح یہ بادشاہ بھی علما وفقہا کا قدردان تھا۔

Marfat.com

عالم گیر ثانی:

احمد شاہ کی معزولی کے بعد ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ (۲رجون ۱۷۵۴ء) کو جہاں دار شاہ کے بیٹے عزیز الدین کو عالم گیر ثانی کا لقب دے کر تخت نشین کیا گیا۔ عزیز الدین ۱۰۹۹ھ/ ۱۶۸۸ء میں پیدا ہوا تھا اور فرخ سیر کے زمانے سے قید خانے میں پڑا تھا۔ اسے قید سے نکال کر بادشاہ بنایا گیا تھا، اور یہ اس کے بڑھاپے کا دور تھا۔ اس کی بادشاہت بالکل برائے نام تھی اور تمام اختیارات غازی الدین خاں کے ہاتھ میں تھے جو اس کا وزیر تھا۔ سلطنتِ مغلیہ گھٹتے گھٹتے اطراف دہلی کے چند اضلاع تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ پنجاب ہاتھ سے نکل چکا تھا، دکن اور اودھ دونوں خود مختار سلطنتیں ہو گئی تھیں۔ ملک کے بڑے حصے پر مرہٹوں کا قبضہ تھا۔ کچھ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل تھا۔ دہلی کا بادشاہ چند امیروں اور وزیروں کے رحم و کرم پر تھا اور اس کے تاج کی اب کوئی عزت باقی نہ رہی تھی، لیکن عیش و عشرت کا سلسلہ بدستور وہی تھا۔ بادشاہ ستر سال کی عمر کو پہنچ گیا تھا کہ فروری ۱۷۵۶ء میں محمد شاہ کی بیٹی حضرت بیگم سے (جو صرف سولہ سال کی تھی اور حسین و جمیل تھی) شادی رچانا چاہی، لیکن حضرت بیگم نے انکار کر دیا اور خودکشی کی دھمکی دی۔

عالم گیر ثانی کا وزیر غازی الدین نہایت شقی القلب اور ظالم شخص تھا۔ بادشاہ کی ذرہ بھر آبرو اس کے دل میں نہ تھی اور وہ اس کو کسی بہانے ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ غازی الدین، دکن کے والی نظام الملک کا پوتا تھا اور ظلم و ستم اس کی سرشت میں داخل تھا۔ اس نے مغل بادشاہوں کے عزل و نصب اور قتل و غارت کا وہی سلسلہ شروع کر رکھا تھا جو اس سے قبل سادات بارہہ کا تھا۔ سادات بارہہ بھی اپنے زمانے میں بادشاہ گر کی حیثیت سے مشہور تھے، اور دکن کے نظام الملک کا خاندان بھی اب یہی ”خدمات“ انجام دے رہا تھا۔

غازی الدین نے عالم گیر ثانی کے قتل کا منصوبہ بنایا اور اس سے انتہائی سفاکانہ سلوک کیا۔ اس زمانے میں یہ بے کس و مظلوم بادشاہ امور سلطنت سے دست کش ہو کر خلوت نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کا فکر و عقیدہ کچھ ایسا تھا کہ درویشوں اور فقیروں سے میل جول رکھتا اور ان کی صحبت کو اچھا سمجھتا تھا۔ ایک روز مہدی علی خاں نے جو غازی الدین خاں کا شریکِ سازش تھا، بادشاہ سے کہا کہ ایک درویش کامل کوٹلہ فیروز شاہ میں تشریف لائے ہیں اور قابل زیارت بزرگ ہیں۔ مہدی علی خاں نے ان کی چند کشوف و کرامات بھی بیان کیں۔ بھولا بادشاہ درویش کی عقیدت کے جوش میں مہدی علی خاں کے جھوٹ کے جال میں آ گیا اور فقیر باکرامت کی زیارت کو چل پڑا۔ جب پہلے دروازے پر پہنچا، تو مہدی علی خاں نے تلوار بادشاہ سے لے لی۔ پردہ اٹھا کر اندر لے گیا اور دروازے بند کر دیے۔ بادشاہ اندر پہنچا تو دیکھا کہ موت کے فرشتے انسانوں کی صورت میں سامنے کھڑے ہیں۔ چار ازبک تلواریں سونت کر بادشاہ پر پل پڑے۔ سرتن سے جدا کر دیا اور بے سرتن کو جمنا کی ریت پر پھینک دیا۔ ایک ظلم یہ کیا کہ لاش کے کپڑے بھی اتار کر لے گئے۔ کئی روز بعد بادشاہ کی لاش ملی اور ہمایوں کے مقبرے میں دفن ہوئی۔ بادشاہ کے اس مظلومانہ قتل کا سانحہ ۱۸ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ (۹ردسمبر ۱۷۵۹ء) کو پیش آیا۔

Marfat.com

عالم شاہ ثانی:

عالم گیر ثانی کے قتل کے بعد اس کا بیٹا ابوالمظفر جلال الدین سلطان علی گوہر شاہ عالم ثانی کے لقب سے بادشاہ ہوا۔ عالم شاہ ثانی ۱۷ ذیقعدہ ۱۱۴۰ھ/۱۴ر جون ۱۷۲۸ء کو پیدا ہوا، اور ۳۳ سال کی عمر میں ۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۷۳ھ (۲۴ر دسمبر ۱۷۵۹ء) کو تخت حکومت پر بیٹھا۔

عالم شاہ ثانی کو احمد شاہ ابدالی نے عالم گیر ثانی کا ولی عہد نامزد کیا تھا۔ غازی الدین خاں اس کا مخالف تھا۔ وہ ابدالی کی موجودگی میں تو خاموش رہا، لیکن ابدالی کے دہلی سے واپس جانے کے بعد اس کو گرفتار کر کے جیل میں ڈالنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ چنانچہ اس نے فوج کو حکم دے کر محل کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن شہزادے نے ہمت سے کام لیا اور گرفتاری سے بچ گیا۔ اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے رات کی تاریکی میں محل کے روشن دان سے کودا اور دیواروں کو پھاند کر باہر آ گیا۔ باہر اس کے کچھ ساتھی گھوڑے لیے تیار کھڑے تھے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور گھوڑے جمنا میں ڈال کر دریا پار کیا۔ مجنوں کے ٹیلے تک پہنچے تو وہاں ایک مرہٹہ سردار فوج لیے بیٹھا تھا۔ اس نے شہزادے کا استقبال کیا اور نہایت احترام سے اپنی نگرانی میں اسے فرخ نگر تک پہنچایا۔ وہاں موسیٰ خاں بلوچ سے ملاقات ہوئی، اس نے شہزادے کو کئی ہزار روپے کی پیش کش کی۔ مرہٹہ سردار تو واپس آ گیا اور شہزادہ وہاں سے نجیب الدولہ کے پاس سہارن پور پہنچ گیا، جہاں وہ آٹھ مہینے مقیم رہا۔ نجیب الدولہ نے اس کے شاہانہ مرتبے کے مطابق سامان سفر تیار کیا اور وہ مراد آباد، بریلی، لکھنؤ اور الٰہ آباد کی خاک چھانتا ہوا، عظیم آباد (پٹنہ) پہنچا۔ اسی سفر میں جب وہ بنگال جاتے ہوئے ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ (نومبر ۱۷۵۹ء) میں کرم ناسا سے پار اترا تو اس کے والد عالم گیر ثانی کے قتل کا المیہ پیش آیا، جس کی اطلاع اسے کچھ عرصہ بعد صوبہ بہار کے ایک گاؤں ''کاتونی'' میں ملی۔ شہزادے نے یہ خبر سنتے ہی چند لوگوں کے سامنے کھانے کی دو میزیں ایک دوسری سے ملائیں، اور اوپر قالین بچھایا اور اسے تخت سلطنت قرار دے کر شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کر کے اس پر جلوس کیا۔

افراتفری کے اس زمانے میں مغل بادشاہت کی کیا قدر و منزلت رہ گئی تھی، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ تخت نشین ہونے کے بعد یہ بادشاہ پورے دس سال تک اپنے دارالحکومت دہلی نہیں جا سکا۔ الٰہ آباد میں بیٹھا برائے نام حکومت کرتا رہا۔ امرا کی سازشوں اور وزراء کی رقابتوں میں گھرا، اور انگریزوں کے پنجۂ جبر میں پھنسا ہوا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اس کو چھبیس لاکھ روپے سالانہ ملتے تھے اور یہ اس رقم کو غنیمت سمجھتا تھا۔ یہ چھبیس لاکھ روپے اسے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کے بدلے میں دیے جاتے تھے، بعد میں یہ بھی بند کر دیے گئے تھے۔ بادشاہ کے ذاتی مملوکہ علاقے بھی دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیے گے۔ ادھر اس کا بیٹا مرزا جوان بخت مرہٹوں کے اثر و اقتدار میں پھنسا ہوا دہلی میں بیٹھا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ۱۷۶۳ء کے اواخر میں بھرت پور کے سورج مل جاٹ نے پہلے آگرہ پر چڑھائی کی، اس کے بعد بعض اور علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ تخت نشینی

Marfat.com

کے بارہ سال بعد ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو بادشاہ شاہ عالم ثانی دہلی آیا، لیکن یہاں اسے نہایت تکلیف دہ حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

ایک وقت ایسا آیا کہ غلام قادر روہیلہ کئی قسم کے حیلے بہانے کر کے بادشاہ کے قریب ہو گیا۔ بادشاہ نے اسے خلعت سے نوازا، اور منصب وزارت اور مرصع سپر سے سرفراز کیا، اور اس نے قرآن درمیان میں رکھ کر وفاداری کا عہد کیا۔ لیکن اس بدبخت نے بادشاہ کو سلیم گڑھ کے قلعے میں محبوس کر دیا، اور ایک محبوس شہزادے بیدار بخت کو جیل سے نکال کر تخت پر بٹھا دیا۔ اس ناہنجار نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، ۹ ذیقعدہ ۱۲۰۲ھ کو بادشاہ کی آنکھیں نکال دیں۔ پھر نہایت رعونت اور نخوت کے ساتھ بولا ''اب تجھے کیا سوجھتا ہے'' شاہ عالم نے جواب دیا۔ ''مجھے وہ قرآن پاک دکھلائی دے رہا ہے جو تیرے اور میرے درمیان ہے۔''

جفا کار اور ستم گر غلام قادر کا انجام بھی نہایت عبرت ناک ہوا۔ پہلے تو بادشاہ کے اندھا کر دینے کی خبر دبی رہی، لیکن جوں ہی لوگوں کو اس کا علم ہوا، وہ تھرا اٹھے اور قلعے کے گرد جمع ہو گئے۔ مرہٹہ فوج بھی بادشاہ کی مدد کو پہنچی۔ غلام قادر رات کے اندھیرے میں گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگا، لیکن گھوڑا ایک گڑھے میں گر پڑا۔ گھوڑا تو اٹھ کر دوڑ گیا، مگر غلام قادر بے ہوشی کی حالت میں رات بھر وہیں پڑا رہا۔ صبح کو گرفتار کر کے اسے متھرا میں گوالیار کے مادھوجی سندھیا کے کیمپ میں لے جایا گیا۔ مرہٹے بعض وجوہ کی بنا پر اب بادشاہ کے حامی تھے۔ وہاں اسے گدھے کی دم کی طرف منہ کر کے سوار کیا اور بازار میں پھرایا گیا۔ غلام قادر نے گالیاں دینی شروع کر دیں تو زبان جڑ سے کاٹ دی گئی۔ پھر اندھا کر کے ناک، کان، ہاتھ پاؤں کاٹ کر شاہ عالم کے حضور بھیجا گیا۔ لیکن جو لوگ اسے لے جا رہے تھے، انھوں نے راستے میں اسے ایک درخت پر الٹا لٹکا دیا اور اسی حالت میں ۳ر مارچ ۱۷۸۹ء کو اس کا دم نکل گیا۔ بیدار بخت جسے تخت پر بٹھایا گیا تھا، زندہ درگور ہوا۔

شاہ عالم ثانی نے جو طبع موزوں رکھتا تھا، اپنی مظلومیت پر دردناک شعر کہے۔

نابینا ہونے کے باوجود عالم شاہ ثانی کو دوبارہ تخت پر بٹھایا گیا۔ لیکن وہ صرف نام کا بادشاہ تھا۔ اس کے قبضے اور اختیار میں کوئی چیز نہ تھی۔ نو لاکھ روپے سالانہ پنشن مرہٹوں سے ملتی تھی، وہ بھی کبھی ملی، کبھی نہ ملی۔ دو ہزار روپے ماہانہ پنشن ایسٹ انڈیا کمپنی دیتی تھی۔ اس طرح وہ دو طرف سے دباؤ میں تھا۔ اس کے علاوہ نذرانوں اور چھوٹے چھوٹے رؤسا کی پیش کش کی آمدنی تھی، جس سے انگریز عہدے داروں کو بھی نذر دینی پڑتی تھی۔ پھر چھوٹے چھوٹے خلعتوں سے بھی بادشاہ معززین کو سرفراز کرتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ عالم شاہ ثانی ایک دور اندیش، جرأت مند اور بلند حوصلہ بادشاہ تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں کی گرفت اسے بہت ناگوار گزرتی تھی۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے تگ و دو بھی کی، اور ان طاقتوں سے تعاون کے لیے بھی کوشاں ہوا جو انگریزوں سے برسر پیکار تھیں۔ پھر اس کی سزا بھی اسے بھگتنی پڑی اور بالآخر انگریزوں کے زیر نگیں آنے پر مجبور ہوا۔ افسوس ہے، اس کو اس وقت حکومت ملی جب

Marfat.com

پورے ملک میں سازشوں کا وسیع جال بچھا ہوا تھا اور ہر طرف ہنگامے بپا تھے۔ حالات بگڑ چکے تھے اور اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔

شاہ عالم ثانی نے ۷ رمضان المبارک ۱۲۲۱ھ (۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء) کو اس دنیائے فانی سے عالم آخرت کے لیے رخت سفر باندھا۔

بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے شاہانِ مغلیہ کی یہ مختصر داستان تھی۔ اس کی بے شمار تفصیلات قلم زد کر دی گئی ہیں۔ اب اس حکومت کے دورِ زوال کے دو بادشاہ باقی ہیں۔ ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی اور ابوالظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ۔ ان کے ضروری حالات ''فقہائے ہند'' کی اگلی جلد میں بیان کیے جائیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔

ایسٹ انڈیا کمپنی:

یہ عالم ہست و بود بے شمار آلام و حوادث کی جولان گاہ ہے جو ہمیشہ زمانے کی رفتار کے ساتھ سطح ارض پر نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے دوائر عمل اتنے محدود اور اثرات و نتائج اس درجہ ناپائیدار ہوتے ہیں کہ انھیں ناقابل اعتنا سمجھ کر ترک کر دیا جاتا ہے اور تاریخ کے صفحات میں انھیں کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔ بعض اپنے خوش گوار یا ناخوش گوار اثرات کی وسعت و شدت کی بنا پر عرصۂ دراز کے لیے یادوں کے گہرے نقوش اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور تاریخ کے اوراق انھیں نمایاں جگہ دیتے ہیں۔ پھر ان کی وجہ سے قوموں اور ملکوں کی تقدیر کا دھارا اپنا رخ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اتوار کا دن، ۲۸ رمضان المبارک ۹۰۳ھ (۲۰ مئی ۱۴۹۸ء) کی تاریخ تھی کہ جنوبی ہند کی بندرگاہ کالی کٹ (ملیبار) کے ساحل پر ایک واقعہ پیش آیا، جو اس وقت اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا معمولی اور اتنا چھوٹا تھا کہ کسی نے اس کو اہمیت نہ دی۔ لیکن آگے چل کر یہ واقعہ پاک و ہند کی تجارتی اور سیاسی فضا میں ایسے اسباب پیدا کرنے اور ایسے عناصر کے قدم جمانے کا باعث بن گیا کہ یہ برصغیر اجنبی اقتدار کی زنجیروں میں جکڑا گیا اور طویل مدت تک محکومی و غلامی کی سزا بھگتتا رہا۔ یہ پرتگیزوں کی آمد کا واقعہ تھا، جو واسکوڈی گاما کی قیادت میں چار چھوٹے جہاز لے کر ایک عرب ماہر بحریات احمد بن ماجد نجدی کی رہنمائی میں راس امید کا چکر کاٹتے ہوئے کالی کٹ کے ساحل پر اترے تھے۔ اس کے بعد انگریزوں کے یہاں تک پہنچنے کے لیے راستہ ہموار ہوا۔

پھر اس ملک کے سیاسی افق پر جس کا کاشانۂ تقدیر کافوری شمعوں سے جگمگا رہا تھا، سیاہ بادل چھا گئے اور وہ یورپی ممالک جو تجارتی لحاظ سے تاریک گوشوں میں سمٹے بیٹھے تھے، ممتاز حیثیت اور نئی شان و شوکت سے ابھر کر سامنے آئے۔

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ پرتگیزوں کے ساحل ہند پر ورود سے قبل بحیرۂ روم، بحیرۂ اٹلانٹک،

Marfat.com

بحیرۂ قلزم، بحر ہند اور بحرالکاہل کے سینے پر عرب مسلمانوں کے سفینے تیرتے پھرتے تھے، جن کی ترکتازیوں کا سلسلہ چین اور جاوا تک پھیلا ہوا تھا۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ پرتگیزوں نے ان کے بیڑے تباہ کر دیے اور تجارت پر قبضہ کر لیا۔

یہ ایک طویل داستان ہے جو بہت سے تلخ حقائق اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ یہاں اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ساحل ہند پر پہلی بحری تجارتی یلغار کرنے والا یورپی قافلہ پرتگیزوں کا تھا۔ پھر ان کی جگہ ہالینڈ کے ولندیزیوں نے لی۔ ان کے بعد انگریز اور فرانسیسی جہاز راں بحر ہند میں وارد ہوئے۔ برصغیر کی سمندری تجارت کے اکھاڑے میں ان دونوں کے درمیان شدید مقابلہ ہوا، اور دونوں نے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی بھرپور کوششیں کیں۔ بالآخر اس کش مکش میں انگریز غالب آئے اور پھر آہستہ آہستہ وہ برصغیر پر قابض ہو گئے۔

انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو آگے چل کر برصغیر کی فرماں روا بن گئی، ۱۶۰۱ء میں ہندوستان کو پہلے تجارتی جہاز روانہ کیے، اور شروع ہی میں اسے بے پناہ منافع حاصل ہونے لگا، یہاں تک کہ بارھویں سفر میں ہر حصے دار کو ۳۳۴ فی صد منافع ہوا۔ اس منافعے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے تاجروں اور یہاں کی حکومت نے انگریز تاجروں کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا اور ان کو اپنے دامن محبت میں جگہ دی۔ جہاں گیر کے عہد میں جب کپتان ہاکنز دربار میں پہنچا تو بادشاہ نے فراخ دلی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ ۱۶۰۸ء میں اس کو سورت میں جو اس زمانے میں مشہور بندرگاہ تھی، کوٹھی تعمیر کرنے کی اجازت ملی۔ یہ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کا دور تھا۔ اس کے پانچ سال بعد ۱۶۱۳ء میں سرطامس برطانوی سفیر کی حیثیت سے ہندوستان آیا تو جہاں گیر اس کی شائستگی اور قابلیت سے بہت متاثر ہوا، اور اسے اس مغل بادشاہ کی نجی صحبتوں میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اب سورت کے علاوہ احمد آباد، برہان پور، آگرہ، اجمیر اور کھمبایت وغیرہ شہروں میں انگریزوں کی کوٹھیاں اور کمپنی کے گودام تعمیر ہونے لگے۔ کمپنی کے ملازم لاکھوں کا لین دین کرتے تھے۔ ان سے برصغیر کے تاجروں کی ہمدردیوں کا یہ حال تھا کہ کسی انگریز کو مکان نہ ملتا تو ہندی تاجر اس کے لیے اپنا مکان خالی کر دیتا۔ قرض کی ضرورت ہوتی تو خوشی سے مطلوبہ رقم پیش کر دیتا، یا اس کا ضامن ہو جاتا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے بہت جلد بحری برتری حاصل کر لی تھی اور بحر ہند میں اس کے تجارتی جہاز دندناتے پھرتے تھے۔ ایک مرتبہ جہاں گیر کے عہد میں یہ انگریزی کمپنی اپنی بحری طاقت کے بل بوتے پر مغل حکومت سے باقاعدہ بحری جنگ پر تیار ہو گئی تھی۔ فریقین کے درمیان وجہ مخاصمت کمپنی کے کارندوں کی یہ شکایت تھی کہ شاہی ملازم تجارتی مال درآمد پر محصول لینے میں سختی کرتے اور رشوتیں لیتے ہیں، اور حکومت ہند کے کارکنوں کو یہ شکوہ تھا کہ بدیسی تاجر، ان دیہات سے جو ساحل سمندر پر واقع ہیں، بچے پکڑ کر لے جاتے ہیں اور غلام بنا کر انھیں فروخت کرتے ہیں۔ نیز ہندی تاجروں کے جہازوں کو سمندر میں لوٹ لیتے ہیں، اس طرح یہ

Marfat.com

لوگ بحری قزاقی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتوں سے جب لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی تو بدیسی تاجروں میں میدان میں لڑنے کی طاقت تو تھی نہیں، وہ کوٹھیوں سے اپنا سامان اٹھا کر جہازوں میں منتقل کر دیتے اور سمندر میں ہندی جہازوں کو خوب لوٹتے اور عملے کے ارکان کو گرفتار کر لیتے۔ بالآخر ہندی تاجر فریاد لے کر حکومت کے پاس جاتے اور وہ ان کا یہ صحیح مطالبہ منظور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اس طرح کی دو لڑائیاں ___ ایک کلکتے میں اور دوسری سورت کے قریب ___ انگریزوں نے اورنگ زیب عالم گیر سے لڑیں اور یہ مضبوط مغل حکومت ان کے سامنے بے بس ہو گئی۔ اسی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت اور مرہٹوں کی بھی شدید مخالفت پر اتر آئی، لیکن اسے کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز کارکن محض تاجر نہ تھے، سپاہی بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب برصغیر میں وسیع پیمانے پر طوائف الملوکی پھیلی اور امن عامہ خطرے میں پڑ گیا تو کمپنی کے کارپردازوں کی حفاظت کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں کرنا پڑا۔ ان کی ساحلی کوٹھیاں جو بمبئی، سورت، مدراس اور کلکتے وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں تھیں، پہلے ہی سے قلعہ بند تھیں، مسلح جوان ابتدا ہی سے ان کے حلقۂ ملازمت میں شامل تھے اور ان کے جہاز یوم اول ہی سے حربی ضروریات کو پیش نگاہ رکھ کر بنائے گئے تھے۔ ان کی یہی فوجی طاقت تھی، جس کو انھوں نے اورنگ زیب کے انتقال کے بعد برصغیر میں پوری آزادی کے ساتھ استعمال کیا اور اس سے خوب کام لیا۔

اٹھارھویں صدی میں مغلیہ سلطنت کی عظمت کا چراغ گل ہونے لگا تو برصغیر کے متعدد علاقوں میں نئی حکومتیں ظہور میں آئیں۔ مرہٹوں نے مغلوں کی شان و شوکت کے کھنڈروں پر اپنی طاقت کے محل تعمیر کیے، پورے مہاراشٹر اور وسطی ہند پر قبضہ جما لیا، اور مالوہ اور گجرات تک تگ و تاز کی۔ نادر شاہ ایران سے چلا اور دلی کو تہ و بالا کر دیا اور صدیوں کے جمع شدہ مال و متاع کو چشم زدن میں تاراج کر دیا۔ خود مغلوں نے جن لوگوں کو مختلف صوبوں کے والی اور حاکم مقرر کیا تھا، وہ اپنی اپنی جگہ خود مختار بن بیٹھے تھے۔ بنگال میں علی وردی خاں، اودھ میں برہان الملک سعادت علی خاں، روہیل کھنڈ میں افغان سردار اور دکن میں نظام الملک آصف جاہ نے بلاشرکت غیرے حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی۔ دہلی کی مرکزی حکومت کی اطاعت سے منہ موڑا، خراج دینا بند کیا اور نذرانے ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس صورت حال سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز کارکنوں کے حوصلے اور بڑھے اور وہ براہ راست سیاسیات میں دخل دینے لگے۔ پھر جن علاقوں کی حکومتیں مالی لحاظ سے کمزور تھیں، انگریز سرمایہ داروں نے ان کی روپے پیسے سے مدد کرنا شروع کی اور انھیں قرض دینے لگے تاکہ یہ ان کے زیر بار احسان رہیں اور ان کے سامنے دم نہ مار سکیں۔ چنانچہ جب انھوں نے اپنی مصلحتوں کی بنا پر محمد علی کو کرناٹک کی صوبے داری پر متعین کیا تو اسے روپے کی ضرورت پڑی کیونکہ وہ فوجیوں کی تنخواہیں بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت اس نے انگریزوں کی طرف رجوع کیا اور اپنی مجبوری بیان کی تو انھوں نے چند انگریز سرمایہ داروں سے اسے چار لاکھ اشرفی بہ طور قرض دلائی اور شرط یہ عائد کی کہ مدراس کی حکومت نواب کی ضمانت دے،

Marfat.com

اور ساتھ ہی یہ بھی طے کیا گیا کہ چند اضلاع بہ صورت رہن قرض خواہوں کے سپرد کیے جائیں جن کی مال گزاری سے وہ سود وصول کرتے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب کے صوبے کے کئی ضلعے عملاً انگریزوں کے ماتحت چلے گئے، وہ ان کا مالی لحاظ سے محتاج بھی ہو گیا اور اس کے علاقے میں کمپنی کا ولایتی مال بھی خوب فروخت ہونے لگا، یعنی یہ علاقہ ان کی ایک مستقل منڈی بن گیا۔

ابھی کرناٹک کا مرہونہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز سرمایہ داروں اور تاجروں کے قبضے میں تھا کہ ۱۷۵۷ء میں بنگال کا علاقہ بھی ان کے زیر نگیں آ گیا یعنی جنگ پلاسی میں انگریزوں کے مقابلے میں میر جعفر کی غداری سے سراج الدولہ کی شکست ایک عظیم انقلاب کا باعث بنی کہ جس سے برصغیر کی سیاسی فضا بالکل بدل گئی اور اس ملک میں انگریزوں کے قدم اور مضبوط ہو گئے۔ اس کی ضروری تفصیل آگے آ رہی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جب مرکزی طاقت کے کمزور ہو جانے کے باعث صوبوں کے والی اور گورنر آزاد ہو گئے اور ان کے علاقوں کے خراج اور نذرانوں کی آمدنی جو مغل بادشاہ کے مرکزی خزانے میں جاتی تھی، بند ہو گئی، پھر حاکموں کے عزل و نصب کے بارے میں بھی بادشاہ کے حکم کو ناقابل تعمیل قرار دیا جانے لگا تو ملک کے تمام عمال و حکام خودسر ہو گئے اور باہم لڑائی جھگڑے پر اتر آئے۔ ان آزاد، خودسر اور خود مختار حکومتوں اور جماعتوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز اہل کار بھی شامل تھے، جو ڈیڑھ سو سال سے اس ملک میں رہ رہے تھے۔ طویل مدت میں ان کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی۔ اب وہ محض غیر ملکی یا بدیسی نہیں رہے تھے، بلکہ ملک کے دوسرے باشندوں، افغانوں، مغلوں، مرہٹوں اور دیگر قوموں کی طرح ہندی اور دیسی ہو گئے تھے۔ یا یوں کہیے کہ اس برصغیر میں جو ہمیشہ مختلف قوموں کا ''عجائب خانہ'' رہا ہے ایک سفید فام قوم کا اضافہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے ہندی طرز معاشرت اختیار کر لی تھی، شہری آبادیوں میں یہاں کے باشندوں سے گھل مل کر رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی زبان سیکھ لی تھی اور شعر و شاعری کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور شعر کہتے اور پڑھتے تھے۔ پھر یہاں کے باہمی سیاسی جھگڑوں میں مختلف فریق ان سے مدد لیتے اور وہ مدد دیتے تھے۔ انگریز چونکہ ایک منظم قوم تھے اور برصغیر کے لوگ افراتفری اور انتشار کا شکار ہو گئے تھے، اس لیے آگے چل کر اپنی مضبوط تنظیم کی وجہ سے وہ اس ملک پر غالب آ گئے اور جہاں کے باشندے ان کی محکومی کی زنجیر میں جکڑے گئے۔

جنگ پلاسی کے بعد بنگال پر میر جعفر کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی، تمام اہم معاملات اور سلطنت کے درو بست پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ تھا۔ اس سے کمپنی کو آگے قدم بڑھانے کے خوب مواقع میسر آئے اور وہ جلب مال وزر میں بے لگام ہو گئی۔ اس سے قبل فرخ سیر کے زمانے میں انگریزی مال کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا جا چکا تھا۔ وہ اس طرح کہ مغل بادشاہ فرخ سیر ایک مرتبہ بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹر ہملٹن نے اس کا علاج کیا اور بادشاہ کو صحت ہو گئی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر ڈاکٹر ہملٹن سے کہا کہ بتاؤ تمہیں کس انعام و اکرام سے نوازا جائے؟ ڈاکٹر نے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں مانگا۔ عرض کیا انگریزوں کے تجارتی مال سے محصول معاف کر دیا جائے۔ بہر حال

Marfat.com

انگریزوں کے حق میں برصغیر کے حالات روز بروز سازگار ہو رہے تھے اور کمپنی کے علاوہ انگریزوں نے نجی طور پر بھی تجارت شروع کر دی تھی۔ بنگال کی ہر منڈی میں انگریز تاجر موجود تھے اور وہ پان، بانس، چاول، گھی، بھس، نمک، چھالیہ، مچھلی، تمباکو وغیرہ کی خرید وفروخت کرتے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے تھے۔ ہندی تاجران کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے، کیونکہ دیگر اخرجات کے علاوہ ان کو محصول بھی ادا کرنا پڑتا تھا، اور انگریز تاجر اس محصول سے مستثنیٰ تھے۔

سراج الدولہ کے قتل کے بعد انگریزوں نے بنگال کی حکومت میر جعفر کے سپرد کر دی تھی، اس سے اختلاف ہوا تو اس کے داماد میر قاسم کو حکمران بنا دیا۔ میر قاسم کے پاس ہندی تاجروں کی طرف سے انگریز تاجروں کی کاروباری بدعنوانیوں کی شکایات آنے لگیں۔ نیز خود میر قاسم نے کمپنی کے حکام سے فریاد کی کہ انگریزوں کے ہر چھوٹی بڑی تجارت پر قبضہ کر لینے سے میری حکومت بہت خسارے میں ہے اور انگریز تاجروں سے محصول معاف ہونے کی وجہ سے حکومت کو پچیس لاکھ روپے سالانہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن ان شکایتوں اور فریادوں کا انگریزوں پر ذرہ اثر نہ ہوا۔ بالآخر میر قاسم نے ہندی تاجروں سے بھی محصول لینا بند کر دیا۔ یہ بات کاروباری نقطہ نظر سے انگریزوں کے خلاف جاتی تھی، لہٰذا انھوں نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا اور نتیجتاً میر قاسم کو بنگال چھوڑ کر شمالی ہند کی طرف جانا پڑا۔ پھر وہاں سے وہ والیٔ اودھ شجاع الدولہ اور شاہ عالم بادشاہ کے پاس پہنچا۔ ان سے فوجی مدد لے کر بنگال کا رخ کیا اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں سے جنگ لڑی اور شکست کھائی۔ اس سے اگلے سال ۱۷۶۵ء میں الہ آباد کا صلح نامہ مرتب ہوا، جس کی رو سے بادشاہ دہلی کی طرف سے کمپنی کو بنگال کا دیوان یعنی مال گزاری وصول کرنے والا حاکم مقرر کیا گیا اور اس کے بدلے میں کمپنی کی طرف سے بادشاہ کا نذرانہ مقرر ہو گیا۔ علاوہ ازیں بنگال کے میر جعفر (جسے میر قاسم کے حکومت چھوڑ جانے کے بعد دوبارہ برسر حکومت لایا گیا تھا) ذاتی مصارف اور انتظامی محکموں کے اخراجات کے لیے ایک رقم معین کر دی گئی اور طے پایا کہ ان دو مصارف کے بعد جو کچھ بچ رہے گا، وہ کمپنی کا ہوگا۔ اس معاہدے کی تحریر تک تو حکومت میں انگریزوں کا عمل دخل باقاعدہ نہ تھا، لیکن اس فرمان شاہی کی رو سے انھیں حکومت پر قبضہ کرنے کی باضابطہ سند حاصل ہو گئی۔

انگریزوں کی اس کمپنی نے محمد علی سے کرناٹک پر حکومت قائم کرنے کے صلے میں لاکھوں روپے کمائے اور کئی اضلاع حاصل کیے۔ اس کے علاوہ کمپنی نے میر جعفر سے بنگال کی حکومت کا سودا کیا۔ پہلے میر جعفر سے سراج الدولہ کو ختم اور اس کی گدی پر قبضہ کرنے کے بدلے میں ۱۷۵۷ء میں ساڑھے تین کروڑ سے زائد رقم وصول کی۔ پھر ۱۷۶۰ء میں میر جعفر کو ہٹا کر اس کی جگہ میر قاسم کو تخت نشین کیا، اور میر قاسم سے تقریباً ستائیس لاکھ روپے ملے۔ اس کے بعد ۱۷۶۳ء میں پھر میر قاسم کو الگ کر کے میر جعفر کو لایا گیا اور اس سے کم وبیش ڈیڑھ کروڑ روپے میں سودا چکایا۔ پھر ۱۷۶۵ء میں نجم الدولہ کی طرف رجوع کیا اور اس سے کوئی بیس لاکھ روپے لیے

Marfat.com

اور بنگال میں اس کی حکومت قائم کی۔ اس طرح کمپنی نے پانچ کروڑ روپے تو نقد کمائے اور جو مراعات حاصل کیں وہ اس کے علاوہ تھیں۔ اس قسم کے مختلف طریقوں سے ۱۷۷۱ء تک کمپنی اور اس کے اہل کاروں کو کوئی بیس کروڑ روپے کی رقم وصول ہوئی۔ پھر تھوڑے عرصے بعد یہ رقم چالیس کروڑ روپے کو پہنچ گئی۔ اندازہ لگائیے اس زمانے میں روپے کی قیمت کیا تھی اور اب کیا ہے؟ اور زمانۂ حال کے حساب کے مطابق ڈھائی سو سال قبل اس رقم کو کتنی اہمیت حاصل ہوگی۔

مشرقی ہند میں بنگال، بہار اور اڑیسہ بہت زرخیز اور بڑے صوبے تھے۔ انگریزوں نے سب سے پہلے یہیں قدم جمائے۔ بادشاہ دہلی سے جسے غلام قادر روہیلہ نے آنکھیں نکال کر اندھا کر دیا تھا، کمپنی نے چھبیس لاکھ روپے سالانہ دینے کے وعدے پر انہی تینوں صوبوں کی دیوانی لکھوائی، لیکن بعد میں بادشاہ کے چھبیس لاکھ روپے بھی ضبط کر لیے اور اس کے مملوکہ علاقے بھی دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ یعنی نہ سراج الدولہ سے وفا کی، نہ میر جعفر اور میر قاسم کو معاف کیا، نہ بادشاہ دہلی کو قابل رحم سمجھا۔ جس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہوئی، فائدہ اٹھایا، پھر اسے بے مصرف سمجھ کر پیچھے پھینک دیا۔

بکسر کی لڑائی کے بعد لارڈ ولزلی کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے گورکھ پور، روہیل کھنڈ اور جنوبی دوآبے کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ پھر کرناٹک کے نواب کو معزول اور سلطان ٹیپو کو شکست دینے کے بعد وہ تمام علاقے ہتھیا لیے جو بعد میں احاطۂ مدراس میں شامل ہوئے۔

مرہٹے جن کا سرحد بنگال سے لے کر کاٹھیاواڑ تک اور گوالیار سے لے کر ستارا تک ڈنکا بج رہا تھا، نہایت سخت جان قوم تھے، کمپنی نے ان کو بھی ان کے علاقوں سے بزور شمشیر بے دخل کیا۔ اس سے قبل یہ اورنگ زیب عالم گیر سے بھی کئی معرکوں میں شکست کھا چکے تھے، اور احمد شاہ ابدالی سے بھی پانی پت کے میدان میں بری طرح ہزیمت اٹھا چکے تھے، لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ان میں کمال یہ تھا کہ شکست کھانے کے بعد پھر ابھرتے اور بار بار میدان میں اترتے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلے میں بھی آئے اور کچلے گئے۔

اب کمپنی نے برصغیر میں تقریباً تمام مخالف طاقتوں کو ختم کر دیا تھا اور اس کے مقبوضات میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک قدم یہ اٹھایا کہ اپنے مقبوضہ علاقوں کی اعلیٰ ملازمتوں سے برصغیر کے لوگوں کو ناقابل اعتماد سمجھ کر الگ کر دیا اور ان کی جگہ انگریزوں کو بھرتی کیا۔ عدالتوں میں بھی یہی صورت حال پیدا کر دی۔

۱۷۶۵ء میں کمپنی کے دیوانی یا صیغۂ مال پر قبضے کے سات سال بعد تک بنگال میں دوعملی سی قائم رہی۔ یعنی کمپنی کی حکومت بھی تھی اور نواب کی بھی۔ ۱۷۷۲ء میں گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے اس صورت حال کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس نے پولیس اور فوج داری کا انتظام بھی کمپنی کے ہاتھ میں دے دیا۔ ہر ضلعے میں کلکٹر مقرر کیے جو مال گزاری وصول کرنے کے علاوہ مقدمات مال کے فیصلے بھی خود ہی کرتے تھے۔ اپیل کی سماعت کے لیے کلکتے میں دو عدالتیں قائم کیں، صدر نظامت اور صدر دیوانی۔ لیکن انگلستان کی پارلیمنٹ کے ارکان کو جب

Marfat.com

کمپنی کے کارپردازوں کی ان زیادتیوں کا پتا چلا جو انھوں نے باشندگان ہند پر روا رکھی تھیں، تو ۱۷۷۳ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کیا، جس کی رو سے بورڈ آف کنٹرول یعنی جماعت نگران کار اور عدالت ہائی کورٹ قائم کیے۔ یہ پہلا ہائی کورٹ تھا جو شاہ انگلستان کی طرف سے کلکتے میں قائم ہوا اور مسٹر امپی اس کے چیف جسٹس انگلستان سے مقرر ہو کر آئے۔ ان کی تنخواہ آٹھ ہزار روپے ماہانہ تھی۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ ہائی کورٹ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس کے جج بعض فیصلے کمپنی کے مفادات کے خلاف بھی کر دیتے تھے۔ اب مسٹر وارن ہیسٹنگز نے یہ چال چلی کہ ان آٹھ ہزار روپے کے علاوہ جو مسٹر امپی چیف جسٹس کو انگلستان کے بادشاہ کے حکم سے ملتے تھے، کمپنی کی طرف سے مزید آٹھ ہزار روپے دینے کا اعلان کیا اور بیرونی اپیلیں بھی چیف جسٹس کے سپرد کر دیں۔ اس سے گورنر جنرل کا مقصد چیف جسٹس کو روپے کا لالچ دے کر کمپنی کے مفادات کا تحفظ کرانا تھا۔

بہرحال جب عدالتوں کا نظام بھی بہت بگڑ گیا، کمپنی کی زیادتیاں بھی حد کو پہنچ گئیں اور کمپنی کے اہل کاروں کے رویے سے ہندوستانیوں کی بلاوجہ تحقیر بھی ہونے لگی تو برطانوی پارلیمنٹ نے کئی سال بعد ۱۸۳۲ء میں کمپنی سے تجارت کا حق چھین لیا اور اس کے ہاتھ میں صرف ہندوستان کی حکومت رہ گئی، وہ بھی ۱۸۵۷ء میں ختم ہو گئی، اور اس سال سے پورا برصغیر براہ راست برطانوی حکومت کے تسلط میں چلا گیا۔

انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور حکومت یوں تو برصغیر کے تمام لوگوں کے لیے انتہائی تکلیف کا دور تھا، لیکن مسلمان اس میں بالخصوص نہایت اذیت میں مبتلا تھے۔ کیونکہ انگریز انہی سے حکومت چھین رہے تھے اور انہی کے درپے آزار تھے تاکہ یہ دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں اور اپنی غصب شدہ حکومت کے حصول کے لیے میدان میں نہ اتر سکیں۔ لیکن انگریزوں کی بے پناہ الم ناکیاں ان کی جدوجہد کا راستہ نہ روک سکیں اور ان کے مجاہدانہ جوش و جذبے میں رکاوٹ نہ پیدا کر سکیں۔ چنانچہ برصغیر کے علمائے دین نے نعرۂ جہاد بلند کیا اور مسلمان ان کی رہنمائی میں میدان میں اترے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کا فتویٰ جاری کیا اور اس ملک کو دارالحرب قرار دیا۔ ان کے بھتیجے مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی نے انگریزوں کے خلاف تقریریں کیں، عوام کو ان کی مخالفت پر ابھارا اور بالآخر شاہ عبدالعزیز کے ایک پاک باز مرید و شاگرد سید احمد شہید بریلوی کی قیادت میں ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا اور انگریزی حکومت کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کو جام شہادت نوش کیا۔ علمائے برصغیر کی عظیم جماعت ان کے ساتھ تھی۔ علاقۂ میوات کا ایک غیور مسلمان جس کا نام چیتو تھا، پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ انگریزوں سے معرکہ آرا ہوا۔ غرض آزادی کی بہت سی تحریکیں جن میں مسلمان پیش پیش تھے اور بالخصوص علمائے دین جن میں مرکزی کردار ادا کر رہے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں اٹھیں۔ ان سب تحریکوں کا ضروری تذکرہ فقہائے ہند کی آئندہ جلدوں میں ان حضرات کے حالات کے ضمن میں کیا جائے گا، جو ان تحریکوں کے قائد یا ان سے وابستہ رہے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

Marfat.com

اودھ کی حکومت:

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں معرض وجود میں آ گئی تھیں اور ان کے حکمران خود مختار ہو گئے تھے۔ ان ریاستوں میں اودھ کی ریاست کا نام سرفہرست ہے۔ اودھ ہندوستان کا ایک علاقہ ہے جو صوبہ یوپی کے کچھ اضلاع پر مشتمل تھا اور اس کا دارالسلطنت لکھنؤ تھا۔

اودھ کا پہلا حکمران محمد امین تھا جو نیشاپور کے خاندان سادات سے تعلق رکھتا اور نامور تاجر تھا۔ وہ عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم بہادر شاہ اول کے دور حکومت میں دہلی پہنچا اور شاہی خدمات پر مامور ہوا۔ بہادر جرنیل، صاحب تدبیر اور بہت بڑا منتظم تھا۔ محمد شاہ بادشاہ نے سادات بارہہ (حسین علی خاں اور حسن علی خاں) سے نجات حاصل کرنے اور انھیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، تو محمد امین بادشاہ کا شریک راز تھا۔ حسین علی خاں کے قتل کے بعد حسن علی خاں سے مقابلے اور قتل کی نوبت آئی تو اس وقت بھی اس نے بڑی مستعدی کا ثبوت دیا اور اس نازک موقعے پر فتح حاصل کی۔ اس شجاعت اور مستعدی کے صلے میں محمد امین پہلے صوبۂ اکبر آباد کی حکومت پر فائز ہوا، پھر اسے صوبۂ اودھ کا والی مقرر کیا گیا، بعد ازاں مرکزی حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اودھ کو اس نے ایک مستقل ریاست کی شکل دے دی اور زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بادشاہ دہلی کی طرف سے برہان الملک اور سعادت خاں کے القاب سے سرفراز ہوا۔ نادر شاہ نے اسی سعادت خاں کی دعوت پر ہندوستان پر یلغار کی تھی اور اسی کے مشورے سے دہلی شہر میں قتل وغارت کا بازار گرم کیا تھا۔ پھر اس نے اسی اثنا میں ۹ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ (۹ مارچ ۱۷۳۹ء) کو اودھ کے حکمران کی حیثیت سے وفات پائی۔

برہان الملک نواب سعادت خاں کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب وہ اودھ کی عنان حکومت سنبھالنے کے لیے جا رہا تھا اور فرخ آباد سے کشتی کے ذریعے دریائے گنگا عبور کر رہا تھا تو آب گنگا کی موجوں میں سے ایک مچھلی برآمد ہوئی اور اچھل کر سعادت خاں کی جھولی میں آ پڑی۔ سعادت خاں نے اس کو نیک فال سمجھ کر پکڑ لیا۔ پھر اس کی سوکھی ہوئی ہڈیاں اودھ کے آخری حکمران نواب واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ کے عجائب گھر میں محفوظ رہیں۔ کہتے ہیں کہ غالباً یہی وہ تصور ہے جس کا اثر نہ صرف قیصر باغ وغیرہ کی تصویروں میں اب تک نمایاں ہے، بلکہ حکومت اودھ کے سکوں اور سرکاری کاغذات میں بھی مچھلی کی تصویر نے نمایاں جگہ حاصل کی[1]۔

سعادت خاں نے اپنے زمانۂ حکومت میں علاقۂ اودھ میں مکمل امن وامان قائم رکھا اور اس کی حدیں اتنی وسیع کر لیں کہ غازی پور، جون پور، بنارس اور چنار بھی اس میں شامل ہو گئے۔ سعادت خاں کی وفات کے بعد اس کے بھتیجے اور داماد صفدر جنگ کو ۱۷۴۸ء میں مغلیہ حکومت کا وزیر مقرر کیا گیا۔ یہ وہی حکمران تھا جس نے

---

[1] علمائے ہند کا شاندار ماضی، ج ۲ ص ۵۶ (حاشیہ نمبر ۱)۔

Marfat.com

روہیلوں کی مضبوط مسلمان قوم کے مقابلے میں مرہٹوں سے فوجی امداد طلب کی تھی۔ پھر اس ضمن میں جو جنگیں ہوئیں ان کے نتیجے میں مرہٹے اس طرح ابھر کر سامنے آئے کہ روہیل کھنڈ پر اپنے حقوق کا دعویٰ کرنے لگے۔

صفدر جنگ کے بعد ۱۷۵۴ء میں اس کا بیٹا شجاع الدولہ اودھ کا حکمران بنا۔ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔ شجاع الدولہ اس کے مقابلے میں آیا اور ۱۷۶۴ء کو بکسر کے مقام پر شکست کھائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اودھ کا صوبہ کمپنی کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۷۶۵ء میں الٰہ آباد کا عہد نامہ ہوا، جس کی رو سے کان پور، الٰہ آباد اور فتح پور کو چھوڑ کر، اودھ کا باقی علاقہ شجاع الدولہ کو واپس دے دیا گیا۔ اس نے یہ بھی اقرار کیا کہ وہ پچاس لاکھ روپے کی رقم انگریزوں کو دے گا۔ ۱۷۷۳ء میں عہد نامۂ بنارس کی تکمیل ہوئی۔ اس عہد نامے کی رو سے پچاس لاکھ کی یہ رقم بادشاہ دہلی کو ادا کی گئی تا کہ وہ اپنا وقار و اقتدار بحال رکھ سکے۔ یہ ریاست چونکہ مرہٹوں اور بنگال کے درمیان واقع تھی، اس لیے انگریزوں نے اس کو اور زیادہ اپنے زیر اثر کر لیا۔ اور انگریزی فوجوں کے اخراجات جو دو لاکھ دس ہزار روپے ماہانہ تھے۔ اسی ریاست پر ڈال دیے گئے۔ علاوہ ازیں کڑہ اور الٰہ آباد کے اضلاع جو شاہ دہلی کے قبضے میں تھے، نوب اودھ کے ہاتھ پچاس لاکھ روپے میں فروخت کر دیے گئے، اس لیے کہ بادشاہ دہلی نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے قطع تعلق کر کے یہ اضلاع مرہٹوں کے حوالے کر دیے تھے۔

۱۷۷۵ء میں آصف الدولہ اودھ کا نواب مقرر ہوا تو وارن ہیسٹنگز کی کونسل کی مخالف اکثریت نے اس کا خراج دو لاکھ ۶۰ ہزار روپے ماہانہ تک بڑھا دیا اور مجبور کیا کہ وہ اضلاع جون پور، غازی پور اور بنارس کے شاہی حقوق مکمل طور پر کمپنی کو منتقل کر دے۔ آصف الدولہ نے ۱۷۹۷ء میں وفات پائی اور نواب سعادت علی خاں اس کی مسند پر بیٹھا۔

۱۸۰۱ء میں لارڈ ولزلی نے آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی اور اس کے جانشین نواب سعادت علی خاں کو پورا روہیل کھنڈ اور دو آب کا ایک حصہ انگریزوں کے حوالے کرنے پر مجبور کیا، چنانچہ اس علاقے کی تمام آمدنی انگریزی فوج کے خرچ کے لیے وقف کر دی گئی۔

نواب سعادت علی خاں نے ۱۸۱۴ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا غازی الدین حیدر وارثِ تخت ہوا۔ یہ پہلا حکمران تھا جس نے شاہ اودھ کا لقب اختیار کیا۔ اودھ کا یہ حکمران ۱۸۲۷ء میں سفر آخرت پر روانہ ہوا۔ اس کے بعد علاقۂ اودھ کے مندرجہ ذیل بادشاہ ہوئے

۱۔	ناصر الدین حیدر	۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء
۲۔	محمد علی شاہ	۱۸۳۷ تا ۱۸۴۲ء
۳۔	امجد علی شاہ	۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء
۴۔	واجد علی شاہ	۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء

۱۸۵۶ء میں لارڈ ڈلہوزی نے صوبۂ اودھ کا الحاق انگریزی علاقے سے کر دیا اور واجد علی شاہ کا وظیفہ

Marfat.com

مقرر کر کے اسے کلکتے میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے دی گئی، جہاں اس نے ۱۸۸۷ء میں انتقال کیا اور اس کے ساتھ ہی اودھ کی بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔

سراج الدولہ:

سلطنت مغلیہ کے زوال پذیر عہد میں جن امرائے مملکت اور وزرائے سلطنت نے مختلف علاقوں اور صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم کیں، ان میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کے ناظم علی وردی خاں کا نام بھی شامل ہے، جس کا لقب مہابت خاں تھا۔ یہ شخص اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ اس کی چھوٹی بیٹی کا نام آمنہ بیگم تھا۔ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں آمنہ بیگم کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام مرزا محمد رکھا گیا۔ علی وردی خاں نے مرزا محمد کی عمدہ طریقے سے تربیت کی اور سراج الدولہ کا لقب عطا کیا۔ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں سراج الدولہ کا باپ دربھنگہ کے پٹھانوں کے ہاتھوں مارا گیا تو علی وردی خاں نے سراج الدولہ کو بہار کے منصب نظامت پر مامور فرمایا، اور موت سے پہلے ۱۹ اپریل ۱۷۵۶ء کو اپنا ولی عہد نامزد کیا۔

اس وقت بنگال میں دو یورپین قومیں آباد تھیں۔ ایک ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز، دوسرے فرانسیسی۔ لیکن انھیں بنگال میں اپنے مقبوضہ علاقوں کی قلعہ بندی کا حق حاصل نہ تھا۔ فرانسیسیوں نے تو اس پر عمل کیا، لیکن انگریزوں نے کلکتے میں اپنے قلعے (فورٹ ولیم) کی تعمیر کا کام جاری رکھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے ڈھاکہ کے دیوان راج بلبھ کے بیٹے کرشن داس کو، جس پر شاہی خزانے کے ۵۳ لاکھ روپے غبن کرنے کا الزام تھا، اپنی پناہ میں لے لیا۔ نواب سراج الدولہ نے فورٹ ولیم کے گورنر ڈریک کے پاس اپنے ایلچی نرائن سنگھ کو یہ خط دے کر بھیجا کہ اس کے یہ مطالبے منظور کیے جائیں۔

۱۔ فورٹ ولیم کونسل قلعہ بندی میں مزید اضافہ نہ کرے۔

۲۔ ”مرہٹہ خندق“ کو جو شہر کے اردگرد کھودی گئی ہے، پر کر دیا جائے۔

۳۔ کرشن داس کو واپس بھیجا جائے۔

یہ مطالبات بالکل صحیح تھے لیکن ڈریک نے سراج الدولہ کے ایلچی نرائن سنگھ سے بے اعتنائی سے گفتگو کی اور بے رخی سے پیش آیا۔ ۲۰ مئی ۱۷۵۶ء کو اس نے نواب سراج الدولہ کے نام ایک مراسلہ بھیجا جس میں کرشن داس کو واپس کرنے سے انکار کر دیا اور قلعہ بندی کے بارے میں لکھا کہ یہ اقدام خطرۂ جنگ کے پیش نظر ضروری ہے۔ ڈریک کا یہ جوابی مراسلہ نواب سراج الدولہ کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔ اس نے اس تحریر سے اندازہ کر لیا کہ انگریزوں کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ اس نے دو اعلیٰ فوجی افسروں ـــــ درلبھ رائے اور حکم بیگ ـــــ کے نام فرمان جاری کیا کہ انگریزوں کی قاسم بازار والی فیکٹری کا محاصرہ کر کے اس میں ہر قسم کی درآمد پر پابندی لگا دی جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور ۲۴ مئی ۱۷۵۶ء کو نواب کے فوجی دستوں نے فیکٹری کا محاصرہ کر لیا۔ بعد

Marfat.com

ازاں کچھ اور کمک بھی بھیج دی گئی۔ ۳ جون ۱۷۵۶ء کو خود نواب سراج الدولہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ سراج الدولہ انگریزوں کا سخت دشمن تھا، لیکن اس کے باوجود صلح کی فضا میں اور خوش اسلوبی سے تمام مسائل کو حل کرنے کا خواہاں تھا، لڑائی جھگڑے سے بہرحال گریزاں تھا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعدد ذمے دار انگریزوں نے بھی اس کی تائید کی اور اس کے موقف کو صحیح قرار دیا، کیونکہ اس نے قاسم بازار کے گرفتار شدہ تمام انگریز قیدیوں کو رہا کر دیا تھا اور کمپنی کے اثاثے کو بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لیکن فورٹ ولیم کے انگریز گورنر ڈریک نے نہ تو سراج الدولہ کی کسی تجویز کو لائق اعتنا سمجھا اور نہ اپنے انگریز ساتھیوں کی کسی بات کو قابل توجہ ٹھہرایا۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے فوج کا ایک دستہ توسکھ ساگر کی طرف روانہ کیا اور ایک قلعہ تھانہ کی جانب بھیجا، لیکن نواب سراج الدولہ کی فوج نے دونوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اب نواب کے لیے میدان جنگ میں نکلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، چنانچہ وہ ۱۶ جون ۱۷۵۶ء کو تیس ہزار فوج کے ساتھ فورٹ ولیم کے سامنے آ نمودار ہوا، اور ہر طرف سے انگریزوں پر ہلہ بول دیا۔ چار دن تک شدید لڑائی جاری رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے عورتوں اور بچوں کو جہاز میں سوار کر کے محفوظ مقامات پر بھیج دیا اور خود ڈریک میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کی جگہ ایک اور انگریز ہال ویل آیا۔ اس نے آتے ہی حالات کا جائزہ لیا اور صلح کا جھنڈا بلند کر دیا۔ ۲۰ جون کو ہتھیار ڈال دیے اور سراج الدولہ کی فوجیں فورٹ ولیم میں داخل ہو گئیں۔

اس موقعے پر سراج الدولہ نے نہایت عالی ظرفی کا ثبوت دیا، نہ کسی انگریز پر ہاتھ اٹھایا، نہ کسی کو تشدد کا نشانہ بنایا، نہ کسی سے سختی کا سلوک روا رکھا اور نہ کوئی سامان لوٹا۔ فورٹ ولیم کونسل کا سیکریٹری کک کہتا ہے کہ نواب اور اس کی فوج کے شریفانہ اور ہمدردانہ رویے سے حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے پا جائیں گے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکمران نواب کی عائد کردہ شرائط کے تحت جو بالکل صحیح ہیں، اپنا کاروبار جاری رکھ سکیں گے۔

لیکن اس کے بعد ایک بالکل غلط اور جھوٹا افسانہ تراشا گیا، وہ یہ کہ سراج الدولہ نے ۱۴۶ انگریز قیدیوں کو ایک اٹھارہ فٹ لمبی اور چودہ فٹ دس انچ چوڑی کال کوٹھڑی میں، جس کا نام "بلیک ہول" رکھا گیا، بند کر دیا تھا اور ان میں سے صرف ۲۳ زندہ بچے، باقی سب مر گئے۔ یہ نہایت سنگین الزام تھا اور سراسر کذب و افترا پر مبنی! خود دیانت دار انگریز مورخین بھی اس کی تردید کرتے ہیں، کیونکہ اتنی چھوٹی سی کوٹھڑی میں اتنے لوگ سما ہی نہیں سکتے، اور یہ نواب سراج الدولہ پر وسیع پیمانے پر حملہ کرنے اور انگریزوں کو اس کے خلاف مشتعل کرنے کی ایک سازش تھی۔

بہرحال سراج الدولہ کی انگریزوں کے مقابلے میں یہ بہت بڑی فتح تھی جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکام سخت پریشان تھے، دوسری طرف اس کے اندرونی دشمن بھی اس کو برداشت نہیں کرتے تھے اور اس کے درپے آزار رہتے تھے۔ بلیک ہول (کال کوٹھڑی) کی جھوٹی خبر بھی انگریزوں نے بہت مشہور کر رکھی

Marfat.com

تھی، چنانچہ اس کا بدلہ لینے کے لیے کرنل کلائیو اور امیر البحر واٹسن بری اور بحری فوج لے کر مدراس سے بنگال پہنچے، اور بعض مقامات پر قبضہ کر لیا۔ ادھر سراج الدولہ کے بعض ذمے دار افسروں نے نہایت بے پروائی سے کام لیا اور انگریزی فوج کو قلعۂ کلکتہ پر قابض ہونے کے مواقع فراہم کر دیے۔ سراج الدولہ نے خود فوج لے کر انگریزوں کے مقابلے میں حرکت کرنے کا ارادہ کیا تو کئی بدخواہ آڑے آئے۔ اس پر شب خون مارنے کی بھی کوشش کی۔ اسی اثنا میں سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا، یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ انگریزی فوج نے ہگلی کو فتح کر لیا اور سراج الدولہ کے کمانڈر میر جعفر نے انگریزوں سے اس کے خلاف ساز باز شروع کر دی۔ اس سے انگریزوں کے حوصلے بڑھ گئے اور فتح قریب نظر آنے لگی۔ پھر مغربی سمت سے سراج الدولہ کو احمد شاہ ابدالی کے متعلق یہ خبر پہنچی کہ وہ بنگال پر حملہ کرنے والا ہے، چنانچہ اس نے مصلحتاً فروری ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کی طرف دست مصالحت بڑھایا لیکن کلائیو کی نیت خراب تھی، وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو سراج الدولہ کو زیر کرنے کے لیے اس کی مدد کرے اور پھر اس کی مسند پر بیٹھ کر انگریزوں کے مفادات کا تحفظ کرے۔ چنانچہ اس کی نظر میر جعفر پر پڑی اور اسے بنگال کی حکومت کا لالچ دے کر ہاتھ میں لیا۔ امی چند سوداگر نے جو اس سازش میں شریک تھا، اپنی کوششوں کے صلے میں کلائیو سے تیس لاکھ روپے کی رقم طلب کی۔ کلائیو نے اس کے ساتھ یہ فریب کیا کہ اسے ایک جعلی عہد نامہ لکھ کر دیا اور امی چند اسے صحیح سمجھ کر مطمئن ہو گیا۔

میر جعفر سے کلائیو نے جو خفیہ معاہدہ کیا تھا، اس کی رو سے میر جعفر نے انگریزوں کے ساتھ سراج الدولہ کی جنگ کو ناگزیر بنا دیا۔ چنانچہ ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو کلائیو اپنی فوج کو جدید اسلحہ سے مسلح کر کے شمال کی جانب بڑھا اور بغیر کسی مقابلے کے سراج الدولہ کی فوج نے قتوہ کلائیو کے حوالے کر دیا، جہاں سے اس کو کافی سامان جنگ ہاتھ آیا۔ نواب سراج الدولہ ۵۰ ہزار پیادہ اور ۱۸ ہزار سوار اور ۵۰ توپوں کے ساتھ بھاگیرتی ندی کے کنارے جو پلاسی کے قریب بہتی ہے، خیمہ زن ہوا۔ بائیں بازو کی فوج میر جعفر کے زیر کمان تھی۔ پلاسی کے میدان میں جنگ شروع ہوئی۔ سراج الدولہ نے انگریزی فوج کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی، لیکن انگریزوں کو گھیرے میں لینے والی فوج میر جعفر کے ماتحت تھی جو سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں سے ساز باز کر چکا تھا۔ توپ و تفنگ کی لڑائی صرف قلب کی فوج نے کی، جس کا کمانڈر میر مدن تھا، میر مدن نے خوب داد شجاعت دی اور لڑتے لڑتے دشمن کی گولی کا نشانہ بنا۔ اس کی موت سے سراج الدولہ کا دل ٹوٹ گیا، اور شام تک میر جعفر کی غداری کا بھید بھی کھل گیا جو لڑائی سے الگ ہو گیا تھا۔

شب کی تاریکی میں سراج الدولہ میدان جنگ سے بھاگ کر مرشد آباد پہنچا اور اسلحہ، گھوڑے اور ہاتھی اور سب انگریزوں کے ہاتھ آئے۔ میر جعفر پہلا شخص تھا جو جنگ کے اختتام پر انگریزی فوج کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ اس طرح پلاسی کی لڑائی میر جعفر کی غداری کی بنا پر انگریزوں کی "فتح" اور سراج الدولہ کی "شکست" پر منتج ہوئی۔ دراصل یہ جنگ نہیں تھی صریح دھوکا تھا۔

Marfat.com

نواب سراج الدولہ اس شکست کے بعد نہایت پریشان ہوا، اور میر جعفر کی نمک حرامی اور عیاری نے، جو اس کا رشتے دار اور فوجوں کا کمانڈر تھا، اس کو انتہائی غم واندوہ میں مبتلا کر دیا۔ وہ مرشد آباد سے روانہ ہوا تو اس کی ہندو بیوی راج کنور جس کا اسلامی نام لطف النساء تھا، بہ اصرار اس کے ہم راہ ہوئی اور کہا کہ اس پریشانی کے عالم میں، میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ تین دن کی بھوک پیاس اور انتہائی تکلیف کے بعد دونوں میاں بیوی بہرال کے مقام پر پہنچے اور کھانے پینے کی تلاش میں دانا شاہ کے مزار کی طرف روانہ ہوئے، لیکن پہچانے گئے۔ وہاں ایک شخص کے گھر میں پناہ لی، اس نے بھی غداری کی اور کسی میر صاحب نے روپے کے لالچ میں میر جعفر کے داماد میر قاسم کو خبر کر دی۔

نواب سراج الدولہ مع اہل وعیال کے گرفتار ہوا۔ لاکھوں روپے کے موتی اور جواہر میر قاسم کے ہاتھ آئے اور نواب کو پابہ زنجیر میر جعفر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے اور اس کے بیٹے میرن نے اسی حالت میں جیل میں لے جانے اور قتل کرنے کا حکم دیا۔ لیکن نواب پر تلوار چلانے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ آخر نواب سراج الدولہ اور اس کے نانا علی وردی خاں کا ایک پرانا نمک خور غلام آگے بڑھا اور کہا کہ ”زنجیروں سے جکڑے ہوئے اس نواب پر یہ غازی تلوار چلائے گا۔“ رات کا وقت تھا کہ یہ نمک حرام غلام قید خانے میں داخل ہوا۔ نواب اسے دیکھ کے چونکا اور بولا، ”تم مجھے قتل کرنے آئے ہو؟“ غلام نے نہایت بے باکی سے جواب دیا۔ ”بے شک“! نواب فوراً اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوا، اور اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگی۔ پھر سر اٹھایا اور جلاد سے کہا۔ ”کیا میر جعفر اس پر راضی نہیں کہ میں کسی گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کیا کروں؟“ جلاد کڑک کر بولا۔ ”چپ رہو۔“ نواب پھر سجدے میں گر پڑا، اور جلاد نے اس کی گردن اڑا دی۔ جلاد نے نواب کا سر کاٹ کر میر جعفر کے حضور پیش کیا، اور بہت سے انعام واکرام سے نوازا گیا۔

اس طرح ۲۹ جون ۱۷۵۷ء کو اپنے ہی اہل کاروں کی سازش اور سپہ سالار (میر جعفر) کی غداری سے انگریزوں کے اس بہت بڑے دشمن کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کا عظیم سانحہ ہے جو برصغیر کی تاریخ کا الم انگیز حصہ بنا۔

روہیل کھنڈ کی حکومت:

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جو حکومتیں معرض قیام میں آئیں، ان میں ایک حکومت علاقۂ روہیل کھنڈ میں، روہیلہ پٹھانوں کی تھی۔ برصغیر کے عہد زوال میں روہیلوں کی یہ ایک مستحکم حکومت تھی اور خطۂ ہند میں اس کے حکمران بڑے اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ انگریزوں، مرہٹوں اور بعض دیگر طاقتوں سے یہ کئی دفعہ نبرد آزما ہوئے اور ہر حریف سے اپنی قوت وطاقت کا لوہا منوایا۔

اٹھارھویں صدی میں روہیلہ پٹھانوں کا نامور سردار اور ممتاز حکمران حافظ رحمت خاں تھا، جس کے

Marfat.com

جرأت مندانہ اقدامات اور صائب نقطۂ نظر نے بعض بڑی بڑی قوتوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ یہ شخص ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) کو "تورشہامت پور" میں پیدا ہوا، جو "روہ" (افغانستان کے وسیع سلسلہ کوہستان) میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

آج سے کم و بیش تین سو سال پیشتر اس علاقے کے پٹھانوں نے ترک وطن کر کے ہندوستان کے اس علاقے میں بود و باش اختیار کر لی تھی جو دامن ہمالہ میں واقع ہے اور تاریخ میں "کھیڑ" کہلاتا ہے۔ ان لوگوں کا اصل وطن چونکہ "روہ" تھا، اس لیے انھوں نے ہندوستان کے جس علاقے میں سکونت اختیار کی وہ "روہیل کھنڈ" کے نام سے مشہور ہوا۔

روہیلہ پٹھانوں کے سردار اور حافظ رحمت خاں کے والد شاہ عالم خاں کا غلام داؤد خاں پہلا شخص تھا جو روہ سے چل کر کھیڑ (ہندوستان) آیا اور اس علاقے کے راجوں اور زمینداروں کے ہاں فوجی خدمات انجام دینے لگا۔ اپنے حسن سلوک اور اوصاف گوناگوں کی بنا پر عوام و خواص میں داؤد خاں کو احترام و اکرام کا مستحق گردانا جاتا تھا۔ اس نے یہاں تک ترقی کی کہ اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کر لی۔ اس کے عروج و شہرت کی خبریں اس کے وطن روہ میں پہنچیں تو وہاں کے بہت سے لوگوں نے ہندوستان کا رخ کیا، جن میں حافظ رحمت خاں کا والد شاہ عالم خاں بھی شامل تھا۔

شاہ عالم خاں چونکہ داؤد خاں کا آقا تھا، اس لیے داؤد خاں نے اس کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد دونوں میں کوئی ایسی رنجش پیدا ہوئی کہ داؤد خاں نے شاہ عالم خاں کو قتل کر ڈالا۔ اس سے تھوڑی مدت بعد خود داؤد خاں بھی مارا گیا۔

داؤد خاں کی وفات کے بعد اس کے متبنیٰ علی محمد خاں نے اس کی مسند سنبھالی۔ علی محمد خاں دلیر اور بہادر سپاہی تھا۔ اس زمانے کے مغل بادشاہ نے اسے طبل اور علم عطا کیا اور نواب کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ وزیر سلطنت قمر الدین خاں کا تقرب بھی اسے حاصل تھا۔ ۱۷۴۲ء میں جب اس نے راجا ہرنند کو شکست دے کر کھیڑ پر قبضہ کر لیا تو روہیلے پٹھان کثیر تعداد میں وہاں آباد ہو گئے تھے، جن میں زیادہ تر علی محمد خاں کے فوجی سپاہی اور خاندان کے لوگ تھے۔ یہ شخص خود تو روہیلہ نہیں تھا، لیکن روہیلوں کی مدد اور سرپرستی کی وجہ سے روہیلہ سردار کہلایا۔ اس کے زمانے میں روہیلے اس قدر جری ہو گئے تھے کہ علی محمد کی قیادت میں انھوں نے بریلی اور اس کے گرد و نواح کو تہ و بالا کر ڈالا۔ ان کی ان سرگرمیوں کی شکایت مغل بادشاہ محمد شاہ (۱۷۱۹ء۔۱۷۴۸ء) کو پہنچی تو اس نے ان کی سرکوبی کے احکام جاری کیے۔ شاہی فوج ان کے مقابلے کو نکلی لیکن ناکام رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روہیلوں کے حوصلے اور بڑھے، اپنی مہم کو زیادہ تیز کیا اور مزید علاقوں پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ اب بریلی، پیلی بھیت، شاہ جہان پور اور بہت سے بلاد و قصبات پر ان کا پرچم اقتدار لہرا رہا تھا۔

روہیلوں کی فتوحات سے اودھ کا نواب صفدر جنگ بہت پریشان تھا۔ اس کی دو وجہیں تھیں، ایک یہ

Marfat.com

کہ وہ خود اپنی مملکت کی حدوں کو وسیع کرنے کے لیے سوچ رہا تھا اور روہیلے اس کے لیے رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ کٹر شیعہ تھا اور روہیلے سخت سنی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ملک میں سنی اس طرح فتح حاصل کریں۔ اپنے عقیدے کی بنا پر وہ ان کو برداشت نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے بادشاہ دہلی سے علی محمد خاں کی شکایت کی اور بادشاہ اس کے اکسانے پر روہیلوں کے مقابلے کے لیے خود فوج لے کر نکلا۔ علی محمد خاں نے شاہی فوج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ وزیر الممالک قمر الدین خاں کے کہنے پر بادشاہ نے علی محمد خاں کی جان بخشی تو کر دی، البتہ اسے قیدی بنا کر اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔

اس زمانے میں علی محمد خاں کا دست راست اور بہت بڑا معاون حافظ رحمت خاں تھا، بادشاہ نے اسے کچھ نہیں کہا، لیکن روہیلوں نے علی محمد خاں کی گرفتاری کو قومی غیرت کا سوال بنا لیا اور اسے پٹھانوں کی توہین قرار دیا۔ اس کا انتقام لینے کے لیے رحمت خاں ایک بھاری فوج کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ وزیر الممالک قمر الدین خاں اور کچھ لوگوں کے درمیان میں پڑنے سے علی محمد خاں کو رہائی حاصل ہوئی اور ساتھ ہی سرہند کی صوبے داری تفویض کی گئی، جہاں سکھوں اور جاٹوں نے ہنگامے بپا کر رکھے تھے۔ کچھ دنوں بعد (۱۷۴۸ء میں) بادشاہ کو دہلی میں احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملے کی اطلاع پہنچی۔ اس نے اس خطرے کے پیش نظر کہ روہیلے کہیں اس کے ساتھ نہ مل جائیں، علی محمد خاں کو سرہند کی صوبے داری سے الگ کر کے روہیل کھنڈ میں اس کے پہلے منصب پر مامور کر دیا۔ اسی اثنا میں بادشاہ محمد شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ احمد شاہ نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ کچھ عرصہ بعد ۳ شوال ۱۱۶۲ھ (۴ ستمبر ۱۷۴۹ء) کو علی محمد خاں بھی اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔ وفات سے دو دن پہلے اس نے حافظ رحمت خاں کو اپنا جانشین بنایا۔ لیکن رحمت خاں چونکہ مخلص آدمی تھا اور حکومت کا اسے کوئی لالچ نہ تھا، اس لیے علی محمد خاں کے چھوٹے بیٹے سعد اللہ خاں کے حق میں حکومت سے دست بردار ہو گیا۔ اس کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام عبد اللہ خاں تھا اور ایک کا فیض اللہ خاں۔ مگر دونوں افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی قید میں تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے جب ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۳ء) میں ہندوستان پر حملہ کیا تو ان کو رہا کر دیا تھا ___ یہ وہی فیض اللہ خاں ہے جو بعد میں ریاست رام پور کا بانی ہوا، جو آزادی کے بعد صوبہ یوپی میں ضم ہو چکی ہے۔

روہیل کھنڈ کی حکومت بہت سے نشیب و فراز سے گزری اور دوسرے امرائے ہند کے علاوہ خود علی محمد خاں کے تینوں بیٹوں کے درمیان بھی اس کے لیے بڑی کش مکش ہوئی۔ بالآخر اس کی زمام اختیار حافظ رحمت خاں کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے اس کو قائم رکھنے اور اس کے انتظام کو بہتر طریقے سے چلانے کے لیے پوری کوشش کی۔ اودھ کے حکمرانوں سے جنگ کی، مرہٹوں سے برسر پیکار ہوا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکمرانوں کا مقابلہ کیا، دوسری حریف طاقتوں سے بھی کئی مرتبہ معرکہ آرائی کی نوبت آئی، لیکن یہ شخص نہایت استقلال سے اپنی جگہ پر قائم رہا۔ یہ ایک شجاع، بہادر اور دور اندیش حکمران تھا۔ ۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) میں جب احمد شاہ ابدالی

Marfat.com

اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کے میدان میں آخری مقابلہ ہوا، جس میں مرہٹوں کی حکومت ختم ہوگئی تو حافظ رحمت خاں، اس کے بیٹے عنایت خاں اور چچازاد بھائی دوندے خاں نے جو نجیب الدولہ کا خسر تھا، عملاً حصہ لیا اور اپنی جاں باز فوجوں سے احمد شاہ ابدالی کی پوری مدد کی۔ احمد شاہ ابدالی نے رحمت خاں کی بہادری اور حربی قابلیت سے متاثر ہوکر اسے اٹاوا کا شہر عنایت کیا، جہاں ابھی تک مرہٹوں کا قبضہ تھا، رحمت خاں نے بزور شمشیر انھیں شہر سے باہر نکالا۔

۱۷۶۳ء میں علی محمد خان کے بیٹے نواب سعد اللہ خاں کا انتقال ہوا، تو روہیل کھنڈ کے لوگوں نے علی محمد خاں کے کسی بیٹے کو اپنا حاکم نہیں بنایا بلکہ حافظ رحمت خاں کی قیادت میں رہنا پسند کیا۔ ۱۷۶۸ء تک اس علاقے میں بالکل امن وامان رہا۔ یہ روہیلوں کے عروج کا زمانہ تھا۔

اب ملک کے حالات تیزی کے ساتھ نئے قالب میں ڈھل رہے تھے اور برصغیر کے سیاسی افق پر انگریزوں کی طاقت روز بروز نمایاں ہوکر ابھر رہی تھی۔ حافظ رحمت خاں بھی اس صورت حال کو خوب سمجھتا تھا اور کسی فریق سے خواہ مخواہ لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) میں نجیب الدولہ اور ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں رحمت خاں کے چچازاد بھائی دوندے خاں جو اس کا بہت بڑا حامی تھا، وفات پاگئے تھے، جس سے ہندوستان میں پٹھانوں کی سیاسی طاقت کو شدید دھچکا لگا۔

رحمت خاں تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ خاموشی کے ساتھ اپنے علاقے کی ترقی کے لیے غور کرنا اور اس کے باشندوں کی خدمت کرنا ہی اس دور کا اصل کام ہے، لیکن اودھ کے شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں نے اس کا رخ دوسری طرف موڑ دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اسے مجبور ہوکر میدان جنگ میں اترنا پڑا۔ شجاع الدولہ نے ایک طرف تو وارن ہیسٹنگز سے بات کی اور اس کو بیس لاکھ روپے نقد ادا کر کے اور پینسٹھ لاکھ روپے کا وعدہ کر کے کمپنی کی امداد طلب کی۔ دوسری طرف دہلی کے بادشاہ شاہ عالم کو یہ لالچ دے کر اس سے روہیل کھنڈ پر حملہ کرنے کی اجازت لی کہ اس کو فتح کرنے کے بعد آدھا علاقہ اس کی ملکیت میں دے دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ خود بعض روہیلہ سرداروں نے میدان جنگ میں اترنے سے انکار کر دیا۔

رحمت خاں کے لیے یہ نہایت پریشانی کا زمانہ تھا اور سب طاقتیں اس کے خلاف متحد ہوگئی تھیں۔ اس نے مجبور ہوکر صلح کی کوشش کی اور وارن ہیسٹنگز سے ملاقات کرنا چاہی، لیکن اس نے ملاقات کے بجائے کرنل چمپین کی کمان میں شجاع الدولہ کی امداد کے لیے انگریزی فوج میدان میں اتار دی۔ کرنل چمپین نے رحمت خاں کو خط لکھا کہ یا تو نواب شجاع الدولہ کو دو کروڑ روپے ادا کرو، یا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ نامعقول اور ناقابل قبول مطالبہ تھا، اور اس سے گفت وشنید کے دروازے بند ہوگئے تھے۔ جنگ کے بغیر اب کوئی چارۂ کار نہ رہا تھا۔ چنانچہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) کو کڑھ میراپور میں فریقین کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں

Marfat.com

آ ئیں۔ دشمن کی فوج بہت بڑی تعداد میں تھی اور روہیلوں کا لشکر اس کی نسبت بہت کم تھا۔ حافظ رحمت خاں خود میدان جنگ میں موجود تھا۔ لڑائی شروع ہوئی، توپوں کے منہ کھلے اور چاروں طرف آگ برسنے لگی۔ اتنے میں ایک گولہ رحمت خاں پر گرا، اور وہ اسی وقت دم توڑ گیا۔ ادھر سے اس کا ایک سابق ملازم سلطان آیا، اس نے اپنے آقا کا سر کاٹ کر شجاع الدولہ کی خدمت میں پیش کیا، جسے دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کے بعد اس کی لاش تلاش کی گئی، جو میدان جنگ سے ملی اور سر کو لاش کے ساتھ سی دیا گیا۔ پھر اسے بریلی بھیج دیا گیا، جہاں اس کو دفن کر دیا گیا۔ اس طرح ہندوستان میں روہیلوں کے قلیل المدت، مگر شان دار دور حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ سانحہ ہفتے کے روز ۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ (۲۳ راپریل ۱۷۷۴ء) کو پیش آیا۔

حافظ رحمت خاں نے ایک شخص راؤ پہاڑ سنگھ کو کئی جاگیریں عطا کی تھیں۔ اس نے ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) میں اپنے اس محسن کی قبر پر مقبرہ تعمیر کیا، اور ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں رحمت خاں کے بیٹے ذوالفقار خاں نے اس مقبرے کی تکمیل کی۔

حافظ رحمت خاں کی وفات کے بعد فاتح شجاع الدولہ کے حکم سے روہیل کھنڈ کے پورے علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی گئی۔ بے شمار گاؤں جلا دیے گئے، اور وہاں کے باشندوں کو یا تو قید کر لیا گیا یا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ روہیلہ سرداروں کی تعمیر کی ہوئی سیکڑوں عمارتیں مسمار کر دی گئیں۔ رحمت خاں کے اہل و عیال اور رشتے داروں پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے، ان کی عورتوں اور بچوں کو سخت پریشانی میں مبتلا کیا گیا۔ شجاع الدولہ کی والدہ نے مختلف مظالم کے واقعات سنے تو وہ چیخ اٹھی اور بیٹے سے ظلم و ستم کا سلسلہ بند کرنے کی التجا کی، لیکن شجاع الدولہ نہیں مانا۔ اس کے بعد جب شجاع الدولہ خود خطرناک بیماری میں مبتلا ہوا، اور اسے یہ بھی اطلاع ملی کہ روہیلے دوبارہ جمع ہو کر لڑائی کی تیاری کر رہے ہیں تو دل میں کچھ نرمی پیدا ہوئی اور بعض قیدیوں کو رہا کر دیا۔

رحمت خاں، حافظ قرآن، پرہیزگار، نیک سیرت اور بلند اخلاق حکمران تھا۔ عادل و منصف، عالی دماغ اور رعایا کے لیے مشفق و مہربان تھا۔ علم و علما سے بے حد تعلق و عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے روہیل کھنڈ میں بہت سے مدارس قائم کیے اور جگہ جگہ درس و تدریس کا انتظام کیا۔ اس کی قلمرو میں بے شمار علما و فضلا جمع ہو گئے تھے۔ وہ پانچ ہزار علمائے کرام کو ملک کے خزانۂ عامرہ سے وظیفے اور تنخواہیں دیتا تھا۔ طلبا کے اخراجات کی خود کفالت کرتا اور انھیں معقول ماہانہ وظائف سے نوازتا۔ اس نے دیہات و قصبات میں مسجدیں بنائیں اور ان میں باقاعدہ خطیب، مدرس، مؤذن اور خادم مقرر کیے، جن کے مصارف ملکی خزانے سے ادا کیے جاتے تھے۔ روہیل کھنڈ کا اہل علم حکمران تھا اور اس کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جو شکست کے بعد روہیل کھنڈ سے لوٹ کر شجاع الدولہ اپنے ساتھ لکھنؤ لے گیا تھا۔ بعد میں بعض کتابیں انگریزوں نے لندن میں بھی پہنچائیں جو انڈیا آفس لائبریری میں اب تک محفوظ ہیں۔

رحمت خاں بوقلموں اوصاف کا حامل تھا۔ شجاعت و بہادری اور فہم و فراست میں یکتا، متحمل مزاج اور

Marfat.com

متین تھا سخاوت و جودت میں اپنی مثال آپ۔ فارسی اور پشتو کا اچھا شاعر تھا۔

اس نے زراعت و تجارت کو بھی خوب ترقی دی اور کسانوں، مزدوروں اور کاشت کاروں کا ہمیشہ خیال رکھا۔ اپنے علاقے میں شان دار عمارتیں تعمیر کرائیں، جن میں بیشتر شجاع الدولہ نے اس لیے بھی منہدم کرادی تھیں کہ ان کی ساخت و بناوٹ اس کے خاص عقیدہ و مسلک سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔

رحمت خاں با جماعت نماز ادا کرتا، رمضان میں عام لوگوں کے ساتھ تراویح پڑھتا اور خود قرآن مجید سناتا، چھوٹے بڑے ہر شخص کی بات توجہ اور اطمینان سے سنتا اور لوگوں کو ہر موقعے پر حق کہنے کی تلقین کرتا۔ وہ اگرچہ مطلق العنان حکمران تھا مگر اس نے رعایا کے تمام افراد کو برملا بات کرنے اور حق وصداقت کا اعلان کرنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی اور وہ حریت فکر و عمل کا داعی تھا۔ اس کا دروازہ ہر شخص کے لیے ہر آن کھلا رہتا اور کوئی فریادی یا ضرورت مند خالی ہاتھ واپس نہ جاتا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ روہیلہ پٹھانوں کا ایک حصہ بنگش خاندان تھا، جس کا سربراہ اس زمانے میں نواب محمد خاں بنگش تھا۔ اس سلسلے کی ایک مضبوط کڑی نجیب خاں تھا، جس نے دربار شاہی میں رسائی حاصل کر کے رکن حکومت کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور نجیب الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ عظیم لوگ تھے اور ملک کو اجنبی اقتدار سے پاک رکھنا چاہتے تھے، لیکن اس دور میں غدار اور عیار و مکار گروہ نے اپنی مخالفانہ سرگرمیوں کا جال اتنا وسیع کر لیا تھا کہ ان کی زد سے کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

حیدر آباد کی آصف جاہی حکومت:

حیدر آباد (دکن) کی آصف جاہی حکومت بھی مغلوں کے دور زوال کی منت پذیر ہے، جس نے بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں جنم لیا۔ اس کے بانی کا نام فخر الدین تھا، جسے مغل دربار سے فتح جنگ اور نظام الملک آصف جاہ وغیرہ کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔ اس کے دادا کا نام عابد خاں تھا جو سمرقند سے تین کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں علی آباد میں پیدا ہوا، اور پھر اپنے علم و استعداد کی بنا پر شیخ الاسلام کے مرتبے کو پہنچا۔ مغل حکمران شاہ جہان کے عہد میں دہلی آیا اور دربار شاہی سے منصب و جاگیر کا مستحق قرار پایا۔ شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کا تقرب حاصل کیا اور ماہولی کا قلعہ دار بنا۔

عابد خاں کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب اورنگ زیب نے قلعۂ گولکنڈہ پر حملہ کیا تو یہ اس کا ہم رکاب تھا اور توپ کے گولے سے زخمی ہو گیا تھا، لیکن صبر وضبط کا یہ حال تھا کہ ایک درباری جملتہ الملک اسد خاں اس کی مزاج پرسی کو آیا تو یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جراح اس کے شانے سے ٹوٹی ہوئی ہڈی کی کرچیں نکال رہا ہے اور یہ شخص نہایت تحمل و استقلال کے ساتھ بیٹھا لوگوں سے باتیں کر رہا ہے اور ایک ہاتھ میں قہوے کی پیالی پکڑے اطمینان سے قہوہ پی رہا ہے اور ہنس ہنس کر کہہ رہا ہے کہ یہ جراح اپنے فن میں بڑا ماہر ہے۔ لیکن زخم اتنا کاری تھا

Marfat.com

کہ عابد خاں اس سے صحت یاب نہ ہوسکا اور ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ (۲؍جنوری ۱۶۸۷ء) کو وفات پا گیا۔

عابد خاں کا بیٹا میر شہاب الدین خاں تھا۔ اس کی ولادت بھی اپنے آبائی وطن علی آباد (سمرقند) میں ہوئی۔ باپ ہندوستان میں شاہی منصب پر فائز ہوا تو بیٹے کو بھی بلا لیا، وہ ۱۰۷۹ھ (۱۶۶۸ء) میں دہلی پہنچا اور دربار کی ملازمت وخطابات سے بہرہ مند ہوا۔ یہ بھی باپ کی طرح نہایت مستعد اور تیز آدمی تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء میں طاعون کی وبا پھیلی تو یہ اس کی لپیٹ میں آ گیا اور اس کے اثر سے نابینا ہو گیا، لیکن سرکاری فرائض اسی طرح انجام دیتا رہا، یہاں تک کہ بعض علاقوں میں فوجوں کی کمان بھی کی جو انتہائی مشکل کام ہے، آخر عمر تک اسی حالت میں یہ مشکل کام کرتا رہا۔ ۷ اشوال ۱۱۲۲ھ/ ۲۷؍نومبر ۱۷۱۰ء کو مرض استقا سے احمد آباد میں فوت ہوا۔ اس نے اپنی زندگی میں دہلی کے اجمیر دروازے کے باہر ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ اس کے احاطے میں مقبرہ بھی بنوایا تھا، وفات کے بعد اس کی میت احمد آباد سے دہلی لائی گئی اور اسی مقبرے میں اسے دفن کیا گیا۔ یہی مدرسہ بعد میں دہلی کالج کے نام سے موسوم ہوا۔

میر شہاب الدین خاں کی شادی شاہ جہان بادشاہ کے نامور وزیر علامی سعد اللہ خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ نظام الملک آصف جاہ، جس نے آگے چل کر حیدر آباد (دکن) کی آصف جاہی حکومت کی بنیاد رکھی، اسی خاتون کے بطن سے تھا۔

نظام الملک نہایت چالاک اور تیز نظر آدمی تھا۔ عہد انحطاط کے مغل دربار میں اسے بڑا اثر ورسوخ حاصل تھا۔ دہلی کی مرکزی حکومت کی طرف سے مختلف اوقات میں یہ کئی صوبوں کے منصب ولایت پر مامور رہا۔ بالآخر دکن کا قصد کیا۔ ایک طرف تو یہ دکن میں ایک خود مختار حکومت قائم کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا، دوسری جانب دہلی کی مرکزی حکومت پر بھی اپنا اثر قائم رکھنے کا خواہاں تھا۔ دکن اور اس کے گرد ونواح میں مرہٹے ایک زوردار طاقت تھے، جن سے اس کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو ان کی یلغار سے محفوظ رکھنے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ان کو دہلی پر حملے کے لیے آمادہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۶ء) میں مرہٹوں کا سیلاب دہلی کی طرف بڑھا اور فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہو گیا۔ کئی روز تک مرہٹہ فوج دہلی کے بازاروں میں دندناتی رہی، آخر بادشاہ دہلی محمد شاہ رنگیلا سے معاہدہ کر کے واپس گئی۔ نظام الملک اس حرکت سے خود تو مرہٹوں کی دست برد سے محفوظ ہو گیا مگر مغل بادشاہ کو ان کے مطالبات ماننے پر مجبور کر دیا۔ محمد شاہ کو معلوم تھا کہ مرہٹوں کے دہلی پر حملے میں نظام الملک کا ہاتھ ہے مگر وہ بعض ایسی مجبوریوں میں جکڑا ہوا تھا کہ اسے کچھ نہ کہہ سکا بلکہ الٹا اسے ''وکالت مطلقہ'' کے بہت بڑے عہدے، آصف جاہ کے خطاب اور ہشت ہزاری منصب سے مفتخر کیا۔

اس کے بعد ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں نادر شاہ نے دہلی پر جو زبردست حملہ کیا اور اس شہر کو جس سفاکی کے ساتھ تاراج کیا اس میں برہان الملک کے ساتھ نظام الملک کا ہاتھ بھی کارفرما تھا۔

Marfat.com

یہاں اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ نظام الملک ''وکالت مطلقہ'' کا منصب عالی حاصل کرنے کے کچھ عرصہ بعد حیدر آباد چلا گیا، اور دہلی میں اپنے بیٹے غازی الدین خاں کو اپنا نائب مقرر کر گیا۔ حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ دکن میں نظام الملک نے اور دہلی میں غازی الدین خاں نے اپنے سیاسی مستقبل کے تحفظ کا ذریعہ مرہٹوں کو قرار دے لیا تھا اور دونوں باپ بیٹا اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان کا سہارا مرہٹوں کی طاقت ہے، لہٰذا ان کی مدد کرنا اور ان سے تعلقات استوار رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے کے لیے مرہٹوں کے دروازے پر دستک دی۔ غازی الدین خاں نے بادشاہ دہلی کو ہاتھ میں رکھنے کے لیے بھی مرہٹوں کا سہارا تلاش کیا، اودھ کے حکمرانوں کو زیر کرنے کے لیے بھی انھی سے استمداد کی، اپنے دوسرے مخالفوں کا زور توڑنے کے لیے بھی انھی سے مدد مانگی۔ دہلی کے بادشاہ عالم گیر ثانی کو بھی اسی شخص نے قتل کرایا۔ پانی پت کی لڑائی میں احمد شاہ ابدالی اور اس کے ہندوستانی حلیفوں کے مقابلے میں مرہٹوں کی امداد بھی اسی سلطنت کے معماروں نے کی۔ پھر میسور کی سلطنت خداداد کے بانی نواب حیدر علی اور اس کے بیٹے سلطان ٹیپو کے خلاف بھی حیدر آباد کے ارباب اختیار شمشیر بکف ہو کر میدان مبارزہ میں نکلے اور مرہٹوں اور انگریزوں کی کھل کر امداد کی۔ غرض اس ریاست کے اصحاب بست وکشاد نے ہر موقعے پر مرہٹوں اور انگریزوں کا ساتھ دیا۔

یہ ریاست دو سو سال تک ارض دکن میں قائم رہی۔ برصغیر کی آزادی کے بعد ستمبر ۱۹۴۸ء میں اس کا خاتمہ ہوا۔ دو سو سال کی اس طویل مدت میں اس کے حکمرانوں نے کئی بہت اچھے کام بھی کیے۔ اس کا آخری حکمران میر عثمان علی خاں تھا۔ اس کے عہد میں تو ہندوستان میں اس ریاست کو مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کا ایک نشان سمجھا جاتا تھا۔ اس ملک میں عربی اور اردو کی جو خدمت میر عثمان علی خاں کے دور میں ہوئی، وہ تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ نقش رہے گی۔ اس دور میں بے شمار علمی اور تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں اور متعدد نایاب ونایید کتابوں سے اہل علم محض حیدر آباد (دکن) کی وجہ سے متعارف ہوئے۔ پھر اس نے ایک عظیم الشان علمی ذخیرے کو عربی سے اردو میں منتقل کرایا۔ خدمت علم وتحقیق کے لیے بہترین ادارے قائم کیے اور برصغیر کے بے شمار اصحاب علم اور ارباب فضل نے ان اداروں میں خدمات انجام دیں۔ علما فضلا اور شعرا ادبا کا ایک مجمع وہاں مختلف تحقیقی وتصنیفی فرائض انجام دینے پر متعین ہوا۔

ریاست حیدر آباد نے اپنے خرچ پر تصنیف وتالیف کے ادارے قائم کیے، تحقیق وترجمے کے مراکز کھولے اور تعلیم وتدریس کے لیے حدود ریاست میں یونیورسٹی سے لے کر ابتدائی درجے کے مدارس کا جال بچھا دیا۔ پھر اس میں لباس، گفتگو اور میل جول میں ایسی ثقافت اور تہذیب کو عام کیا گیا جو ارض ہند میں مسلمانوں کی ایک دل کش اور جاذب نظر علامت بن گئی۔ کہنا چاہیے کہ دیارِ ہند میں اہل علم اور اصحاب فن کے مرکز کی حیثیت سے حیدر آباد کو وہی مرتبہ حاصل تھا جو بنو عباس کے عہد میں ممالک اسلامی میں بغداد کو حاصل تھا۔ اس کی تمام

Marfat.com

سیاسی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ اس کی علمی و تحقیقی خدمات کا پہلو بے حد ہمہ گیر اور وسعت پذیر ہے۔

سلطنت خداداد میسور:

بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں برصغیر کے مختلف حصوں میں جو حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں میسور کی سلطنت خداداد خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ جنوبی ہند کی اس سلطنت کا بانی حیدر علی خاں تھا جو معمولی فوجی عہدے سے ترقی کر کے منصب حکمرانی پر فائز ہوا۔ یہ شخص بہت دلیر اور جنگ جو تھا۔ ملک گیری و جہاں بانی کے تمام اوصاف اس میں پائے جاتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز، ریاست حیدر آباد کے ارباب اختیار اور مرہٹے اس کے حریف تھے۔ اس نے ان سب سے ٹکر لی اور مختلف محاذوں میں ان سے بر سر پیکار رہا۔

اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کی اصل دشمن دو طاقتیں تھیں۔ ایک ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز جو متعدد مقامات پر اپنے قدم جما چکے اور حکومت کے دروبست پر قابض ہو گئے تھے، اور ان کی فوجیں جنگی سازو سامان سے لیس ہو کر اس ملک کے بیشتر حصوں میں دندناتی پھرتی تھیں۔ دوسرے مرہٹے جو حرب وضرب اور جنگ وجدال میں بڑی شہرت رکھتے اور برصغیر کے بعض گوشوں میں اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ لیکن اس عہد کے ہندوستانی مسلمانوں کی حرماں نصیبی ملاحظہ ہو کہ مسلمانوں کی جو علاقائی حکومت ان دو طاقتوں سے پنجہ آزما ہونے کے لیے میدان میں اترتی، دوسری مسلمان حکومتوں کے اصحاب بست وکشاد اس کی گردن ناپنا شروع کر دیتے۔ چنانچہ بنگال میں سراج الدولہ انگریزوں کے مقابلے میں آیا تو خود مسلمان ہی اس کی شکست کا باعث بنے۔ حافظ رحمت خاں نے انگریزوں اور مرہٹوں سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تو اودھ کے شجاع الدولہ نے انگریزوں سے گٹھ جوڑ کر کے اس کو ختم کر ڈالا۔ پھر جنوبی ہند میں حیدر علی اور اس کے بعد اس کے بیٹے سلطان ٹیپو نے ان کے خلاف تلوار اٹھائی تو نظام حیدر آباد کی حکومت بھاری فوج لے کر سامنے آ کھڑی ہوئی اور انگریزوں اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر میسور کی اس مسلمان سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ارکاٹ کا نواب محمد علی خاں والا جاہ بھی ان کا معاون تھا۔ اگر یہی مسلمان حکومتیں متحد ہو کر اپنے مشترکہ دشمن کا مقابلہ کرتیں تو کبھی بیرونی طاقت ان پر مسلط نہ ہو سکتی۔ انگریزوں نے پہلے تو ان کی باہمی مخالفت سے فائدہ اٹھا کر ان کی قوت کو منتشر کیا اور پھر انھیں مستقل طور پر اپنے حلقۂ غلامی میں جکڑ لیا۔

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کی علاقائی سلطنتوں میں میسور کی سلطنت خداداد خاص اہمیت وشہرت کی حامل تھی، جس کی بنیاد نواب حیدر علی خاں نے رکھی۔ حیدر علی تمام عمر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار رہا اور ساری زندگی انگریزوں، مرہٹوں اور حکومت حیدر آباد سے جنگ کرتے ہوئے بسر کر دی۔ اس نے ۳۰ ذی الحجہ ۱۱۹۵

Marfat.com

کی رات (۷ دسمبر ۱۷۸۲ء) کو ارکاٹ کے قریب نرسنگ رائن پٹ میں وفات پائی اور سرنگا پٹم میں دفن ہوا۔

حیدر علی کی وفات کے بعد اس کے بڑے بیٹے سلطان ٹیپو نے زمام اختیار ہاتھ میں لی۔

ٹیپو جمعے کے روز ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ (۱۰ نومبر ۱۷۵۰ء) کو بنگلور سے بیس میل دور ''دلون ہلی'' کے مقام پر پیدا ہوا۔ ٹیپو کی ولادت سے قبل حیدر علی اولاد نرینہ سے محروم تھا اور بیٹے کی شدید خواہش دل میں رکھتا تھا۔ چنانچہ ارکاٹ کے ایک بزرگ ٹیپو مستان ولی کے مزار پر حاضر ہوا، اور اللہ تعالیٰ سے بیٹے کی پیدائش کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور بیٹا عطا کیا تو اسی بزرگ کے نام پر بیٹے کا نام ٹیپو رکھا۔ ٹیپو پانچویں سال کو پہنچا تو حصول علم کا آغاز ہوا۔ عربی اور فارسی کی متداول کتابیں پڑھیں، انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سیکھیں، فنون سپاہ گری یعنی تیر افگنی، نیزہ بازی، شمشیر زنی، اور تفنگ اندازی وغیرہ میں مہارت پیدا کی اور حرب وضرب اور رزم و پیکار کے پرانے اور نئے طریقوں کی تربیت حاصل کی۔

حیدر علی خاں چونکہ خود بڑا جنگ جو اور بہادر تھا، اس لیے بیٹے کو بھی اسی راہ پر لگایا اور دلیر بیٹے نے اس وادیٔ پُر خار کے تمام نشیب وفراز سے کامل واقفیت بہم پہنچائی۔ ۱۷۶۵ء میں حیدر علی نے ملیبار پر حملہ کیا تو ٹیپو کی عمر صرف پندرہ برس تھی، مگر جرأت اور حوصلے کا یہ حال تھا کہ تھوڑی سی فوج لے کر دشمن کا تعاقب شروع کر دیا اور اس کے لشکر کو ڈھکیلتا ہوا گھنے جنگل میں لے گیا، یہاں تک کہ وہ لوگ ٹیپو کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔

۱۷۶۷ء میں حیدر علی خاں نے نظام دکن کی خدمت میں قیمتی تحائف دے کر ایک وفد بھیجا، اس وفد کا قائد ٹیپو سلطان تھا، جس کی عمر اس وقت سترہ سال کی تھی۔ نظام نے شہزادے کو ''نصیب الدولہ'' اور ''فتح علی خاں بہادر'' کے خطاب دیے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ٹیپو کا اصل نام فتح علی خان نہیں تھا بلکہ یہ خطاب تھا جو اسے نظام دکن نے دیا تھا۔ اس کے بعد یہ بھی نام کے طور پر بولا جانے لگا۔

ٹیپو سلطان جرأت مند باپ کا جرأت مند بیٹا تھا۔ انگریزوں، مرہٹوں، اور دوسرے حریفوں کے ساتھ حیدر علی کے جو محاربے ہوئے، ان سب میں ٹیپو شامل رہا اور ہر موقعے پر دشمن کا مقابلہ کیا۔ جون ۱۷۶۷ء میں انگریزوں کی جنگی سرگرمیوں کا پتا لگانے اور ان کے فوجی ٹھکانوں میں ہراس پیدا کرنے کے لیے حیدر علی نے جو فوج مدراس بھیجی، اس میں ٹیپو بھی شامل تھا۔ اس کے بعد مختلف محاذوں پر اس نے خوب داد شجاعت دی اور دشمن اس کی جنگی صلاحیتوں کا لوہا ماننے پر مجبور ہوا۔

حیدر علی خاں کی وفات اس وقت ہوئی جب وہ انگریزوں سے برسر پیکار تھا اور خود ٹیپو بھی محاذ جنگ پر تھا، اسے پانچویں روز (۱۱ دسمبر ۱۷۸۲ء) کو ملیبار میں عظیم باپ کی موت کی اطلاع ملی۔ وہ ۲۵ دسمبر ۱۷۸۲ء کو چکملور پہنچا، جہاں اس کا لشکر مقیم تھا۔ والد کی موت کے افسوس کی وجہ سے اس نے اپنے رسمی استقبال کی ممانعت کر دی تھی۔ وہ غروب آفتاب کے بعد خاموشی سے لشکر گاہ میں داخل ہوا، اور فرش زمین پر بیٹھ کر سلطنت کے سرداروں کو شرف باریابی بخشا۔ ۲۰ محرم ۱۱۹۷ھ (۲۶ دسمبر ۱۷۸۲ء) کو جمعرات کے دن مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی

Marfat.com

اور سلطنت خداداد کی زمام حکومت ہاتھ میں لی۔ اس وقت ٹیپو کی عمر بتیس سال کی تھی۔

ٹیپو سلطان جب سلطنت خداداد کے منصب حکومت پر متمکن ہوا تو وہ برصغیر کی ایک اہم اور طاقت ور حکومت تھی۔ رقبے کے لحاظ سے وہ شمال میں دریائے کرشنا سے لے کر جنوب میں ریاست ٹراونکور اور ضلع تناولی تک پھیلی ہوئی تھی۔ مشرق میں اس کی حد مشرقی گھاٹ تھی اور مغرب میں اس کا دامن سمندر کو چھو رہا تھا۔ آبادی، زرخیری اور حسن انتظام میں یہ ایک مثالی سلطنت تھی۔ قدرتی دولت بھی اللہ نے اس کو فراوانی سے عطا کی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جنگ و پیکار کا بھی ایک طویل سلسلہ اس سے وابستہ ہو گیا تھا۔ ایک طرف نظام حیدر آباد اور مرہٹے اس کو ہڑپ کرنے کے درپے تھے، دوسری طرف انگریز تھے جو پورے ہندوستان پر اپنا پرچم اقتدار لہرانے کے لیے ہر طرف سے یلغار کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور اس سلطنت کو اپنے راستے کی بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ ارکاٹ کا نواب محمد علی والا جاہ بھی اس کو ختم کرنے پر تلا ہوا تھا اور اپنے عارضی مفاد کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کا سخت حامی بن گیا تھا۔ میسور کا قدیم ہندو خاندان بھی، جس سے حیدر علی نے یہ حکومت چھینی تھی، ٹیپو کے درپے آزار تھا۔ اس طرح ٹیپو سلطان کم سے کم پانچ دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ اور یہ اس کی عزیمت و حوصلہ مندی اور عقل و تدبر کے زبردست امتحان کا وقت تھا۔ اس کی نگاہِ دوررس اور سیاسی بصیرت نے تمام حریف طاقتوں کی نیتوں کو بھانپ لیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس نے جو تاج شاہی سر پر رکھا ہے، وہ بے شک بہ ظاہر لعل و جواہر سے مزین ہے، لیکن درحقیقت یہ کانٹوں کا تاج ہے، اور اس پر چاروں طرف سے تلواریں گھوم رہی ہیں۔ اس نے نہایت استقلال کا ثبوت بہم پہنچایا اور مخالف قوتوں کا پامردی سے مقابلہ کیا۔

تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ خود اس کے متعدد اہل کار اور عمال حکومت نے بھی اس کے خلاف غداریوں کا وسیع سلسلہ شروع کر دیا اور اس کے گرد و پیش سازشوں کا ایک خوف ناک جال بچھا دیا۔ ان غداروں اور نمک حرام لوگوں میں میر صادق، میر غلام علی لنگڑا، بدر الزماں خاں نائط، میر معین الدین، میر قمر الدین، میر قاسم علی اور پورنیا کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ حکومت کے اہم مناصب پر فائز تھے اور ٹیپو سلطان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے ٹیپو کے دشمنوں سے رابطہ قائم کیا، ان پر حکومت کے راز ظاہر کیے اور بالخصوص انگریزوں سے گٹھ جوڑ کر کے اپنے مربی کے قتل اور اس کی حکومت کے خاتمے کا باعث بنے۔

ٹیپو سلطان اس برصغیر کی عظیم شخصیت تھی، وہ خود اہل علم تھا اور اہل علم کا قدر دان تھا اور پسندیدہ عادات و اطوار کا مالک، نیک اور عبادت گزار لوگوں سے اس کو محبت تھی۔ اس کا معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا اور ادعیۂ مسنونہ پڑھتا۔ ہمیشہ باوضو رہتا اور امور خیر میں وقت صرف کرتا۔ تقویٰ شعاری اور حیاداری کا یہ عالم تھا کہ حمام میں بھی کپڑا باندھ کر غسل کرتا، پاؤں اور ہاتھوں کے سوا جسم کا کوئی حصہ کبھی لوگوں کے سامنے ظاہر نہ ہونے دیتا۔ کبھی ایسا لباس زیب تن نہیں کیا جس میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔ اس کے ملک کی اکثر ہندو عورتیں بازاروں اور گلیوں میں سر اور سینہ کھول کر چلنے کی عادی تھیں، سلطان اسے پسند نہ کرتا تھا، لہٰذا حکم

Marfat.com

جاری کر دیا کہ کوئی عورت کرتے اور اوڑھنی کے بغیر باہر نہ نکلے۔

کتابوں سے اس کو بے حد تعلق خاطر تھا۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی کی کئی ہزار قلمی کتابیں اس کے ذاتی کتب خزانے میں محفوظ تھیں، جن میں سے بہت سی کتابیں اس کی شہادت کے بعد دوسرے سامان کے ساتھ لوٹ لی گئیں۔ ان میں س بے شمار کتابیں لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔ یہ کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم وفنون پر مشتمل ہیں۔

ٹیپو نے ملک میں زراعت اور صنعت کو بڑی ترقی دی، تجارت کو وسعت دینے کی غرض سے بیرونی ممالک سے روابط بڑھائے۔ اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کیے اور رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے بے پناہ کوششیں کیں۔ وہ حکومت کو اللہ کی طرف سے امانت سمجھتا تھا اور اس امانت کا حق ادا کرنے کی جو صورت بھی ممکن ہوتی اس کو بروئے کار لاتا۔ بحری اور بری فوج کو نئے انداز سے منظم کیا اور ''فتح المجاہدین'' کے نام سے ایک کتاب لکھوائی، جس میں فوج کی تنظیم اور اس کی نقل وحرکت کے وہ قواعد بھی درج ہیں، جو اس زمانے میں مغربی ممالک میں رائج تھے۔ اور وہ قواعد بھی مرقوم ہیں جو خود سلطان نے اپنے تجربات کی روشنی میں وضع کیے۔ فن جہاز سازی سے بھی اس کو شغف تھا، اس سلسلے میں اس نے حالات کے مطابق بہت سی نئی چیزیں ایجاد کیں۔

بہرکیف ٹیپو سلطان اپنے دور کا عدیم المثال حکمران تھا، اپنی قلمرو میں اس نے جو اصلاحات نافذ کیں، وہ تاریخ میں زریں حروف سے لکھنے کے لائق ہیں۔ ارض ہند کے اس نامور جرنیل اور ممتاز حکمران کے کارنامے ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

ٹیپو سلطان نے ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۱۳ھ (۴ مئی ۱۷۹۹ء) کو شہادت پائی۔ اس کی موت کا الم ناک حادثہ اس وقت پیش آیا جب بارھویں صدی ہجری اپنی بساط لپیٹ چکی تھی اور تیرھویں صدی ہجری نے اپنے سفر کے تیرہ سال پورے کر لیے تھے۔ عیسوی حساب سے اٹھارھویں صدی قریب الاختتام تھی۔ اس مرد مجاہد کا وقت آخر جہاں حسرت وافسوس کی ایک اندوہ ناک یادگار اپنے پیچھے چھوڑ گیا، وہاں اس کے عزم وحوصلہ اور جرأت و شجاعت کا ایک لافانی نقش بھی اوراق تاریخ پر ثبت کر گیا۔

یہ ایک انتہائی غم انگیز سانحہ ہے کہ جب شیر دل ٹیپو کو پتا چلا کہ وہ محل میں محصور ہو گیا ہے اور انگریزی فوج لحہ بہ لحہ اس کا محاصرہ تنگ کر رہی ہے تو آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہا ____ ''رضائے مولیٰ بر ہمہ اولیٰ''۔

۴ مئی ۱۷۹۹ء کا دن اس کی زندگی کا آخری دن تھا۔ شدید دھوپ میں دوپہر کے وقت وہ انگریزوں سے دست بدست جنگ کر رہا تھا، اس کے غدار ساتھیوں یہاں تک کہ اس خادم نے بھی جو ہاتھ میں پانی کی چھاگل لیے سامنے کھڑا تھا، ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ چند رفقائے خاص کے سوا سب اہل کار انگریز کے ہاتھ بک چکے تھے۔ دربار کے ذمے دار لوگوں نے انگریزی فوج کو قلعے میں داخل کیا اور جب بہادر سلطان اپنے چند محافظوں کے ساتھ دشمن کے سامنے سینہ سپر ہوا تو محافظ بھی پیچھے ہٹ گئے۔ عین اس وقت جب کہ وہ نہایت دلیری سے

Marfat.com

دشمنوں پر تلوار کے فیصلہ کن وار کر رہا تھا، شدت پیاس سے بے قرار ہو کر خادم سے پانی طلب کیا، خادم خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے خدا کا واسطہ دے کر پانی کا ایک قطرہ مانگا، سنگ دل خادم پر اس لجاجت کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ نہ اس کا ہاتھ حرکت میں آیا نہ چھاگل سے پانی کا گھونٹ باہر نکلا۔ بالآخر وہ شدید زخمی ہو کر پانی مانگتا ہوا گھوڑے سے گرا، اور جام شہادت نوش کر کے اپنی پیاس بجھائی، اور تاریخ جبر وستم کی پیشانی پر خون شہادت سے ہمیشہ کے لیے یہ فقرہ ثبت کر دیا۔

''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

لیکن ادھر جب انگریز جرنیل ہارس نے سلطان کی خون آلود لاش پر نگاہ ڈالی تو فرط مسرت سے پکار اٹھا۔ ''آج ہندوستان ہمارا ہے۔''

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اٹھارھویں صدی میں برصغیر کے جن مجاہدوں نے انگریزی اقتدار کا مقابلہ کیا اور اس کے نتیجے میں درجۂ شہادت کو پہنچے، ان میں تین شخصیتیں نمایاں ہیں:

ایک سراج الدولہ۔

دوسرے حافظ رحمت خاں روہیلہ۔

تیسرے ٹیپو سلطان۔

انھوں نے علی الترتیب ۲۹ جون ۱۷۵۷ء، ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء اور ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو جام شہادت نوش کیا۔

واقعات کی صحیح ترتیب سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی آخری جنگوں کو ''جنگ'' سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ سراج الدولہ لڑائی کے میدان میں نہیں آنا چاہتا تھا، لیکن اس کو دجل وفریب سے اس کے وزرا و امرا پلاسی کے میدان میں لائے اور اسے بعد میں گرفتار کر کے شہید کر دیا گیا۔

حافظ رحمت خاں کے ساتھ بھی دھوکا ہوا، جس کا نتیجہ اس کی موت کی شکل میں نکلا۔

ٹیپو سلطان سے بھی اس کے ساتھیوں نے غداری کی، انگریزی فوج کے لیے قلعے کے دروازے کھول دیے۔ ادھر وہ قلعے میں داخل ہوئی اور ادھر میر صادق نے اپنی فوج کو بلا کر تنخواہ دینا شروع کر دی۔ سلطان کو اس سے بے خبر رکھا گیا، اور وہ انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کے اچانک حملے کے موقعے پر تنہا کھڑا تھا، لیکن یہ اس کی انتہا درجے کی بہادری تھی کہ اس نے دشمن کے سامنے جھکنا گوارا نہیں کیا اور شہادت سے ہم کنار ہو گیا۔

حرف آخر:

بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے سیاسی واقعات وحوادث کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حکمرانوں کے خلاف امرائے سلطنت کی غداریوں اور عمال حکومت کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ پھر ایک واقعے کے ساتھ دوسرا واقعہ اور دوسرے کے ساتھ تیسرا اس طرح پیوستہ ہے کہ کسی

Marfat.com

بات کو خاص ترتیب سے بیان کرنا مشکل ہے۔ ہم نے اپنی حد تک کوشش کی ہے کہ تاریخ کے خس وخاشاک میں سے مطلب کی ضروری باتیں چھانٹ لیں اور انھیں قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اس سعی میں ہم کہاں تک کامیاب ہیں، یہ فیصلہ کرنا قارئین کا کام ہے۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی اگرچہ سیاسی اعتبار سے زوال وانحطاط کی صدی ہے اور اس میں حکمرانوں اور امرائے مملکت میں دین داری کا عنصر بھی کم ہی نظر آتا ہے لیکن اس میں علوم وفنون نے خوب ترقی کی، علما وفقہا کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ حکمرانوں نے بھی علم کے فروغ میں پورا حصہ لیا اور اہل علم کی ہر موقعے پر پذیرائی کی۔ ان سے تعلقات بڑھائے اور انھیں عزت واکرام کے مستحق گردانا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر حکمران کے عہد میں اہل علم اور اصحاب فضل کی ایک جماعت موجود رہی ہے۔ ان کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔

اس کے بعد تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس صدی کے لیل ونہار مزید غم ناک واقعات کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ اس میں صرف دو مغل حکمران ہندوستان کے افق سیاست پر باقی رہ گئے ہیں۔ ایک ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی، جس کا دور بادشاہت ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک اکتیس سال پر محیط ہے۔ دوسرا ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر جو ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بیس سال مسند بادشاہت پر متمکن رہا۔ یہ صرف نام کے بادشاہ تھے، حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور پورے برصغیر پر انگریزوں کا پرچم اقتدار لہرانے لگا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان میں شدید ردعمل ہوا، اور انگریز کی مخالفت میں کئی تحریکوں نے جنم لیا۔ اس ضمن کے ضروری واقعات فقہائے ہند کی اگلی جلدوں میں بیان کیے جائیں گے۔

ان شاء اللہ العزیز۔ ربنا اتنا من لدنك رحمة وهي لنا من امرنا رشدا۔

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی، سانده، لاہور

Marfat.com

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بارھویں صدی ہجری

۱۔ شیخ مجیب اللہ جعفری پھلواروی

شیخ مجیب اللہ بن ظہور اللہ بن کبیر الدین جعفری پھلواروی، اپنے عصر اور علاقے کے نامور فقیہ، جید عالم دین اور فضل و صلاح میں یگانہ تھے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے، اس لیے جعفری کی نسبت سے مشہور تھے۔

شیخ مجیب اللہ پھلواروی ۱۱ ربیع الثانی ۱۰۸۹ھ / ۲۳ مئی ۱۶۷۸ء کو پھلواری میں پیدا ہوئے، جو صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ میں واقع ہے اور عرصۂ دراز سے علم و فضل کے مرکز کی حیثیت سے مشہور ہے۔ ہوش سنبھالا تو وہیں کے ایک بزرگ مولانا فصیح الدین پھلواروی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ ایک روایت کے مطابق اپنے ماموں زاد بھائی مولانا عماد الدین جعفری پھلواروی (متوفی ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۲۴ھ / ۱۴ رجون ۱۷۱۲ء) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعد ازاں عازم بنارس ہوئے۔ وہاں شیخ محمد وارث حسینی بنارسی (متوفی ۱۰ ربیع الثانی ۱۱۶۷ھ / ۴ رفروری ۱۷۴۵ء) کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شرکت کی اور باقی علوم مروجہ کی تحصیل فرمائی۔ پھر اپنے شہر پھلواری کو مراجعت کی، اور ۱۱۲۲ھ میں مولانا عماد الدین جعفری پھلواروی سے اخذ فیض کیا۔ کسب علم اور اخذ طریقت کے بعد اپنے شہر پھلواری میں مسند دعوت و ارشاد آراستہ کی اور خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔

شیخ مجیب اللہ جعفری پھلواروی نے ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء میں وفات پائی[1]۔

۲۔ قاضی محبّ اللہ بہاری

قاضی محب اللہ بن عبد الشکور عثمانی صدیقی بہاری، دیار ہند کے نامور فقہا اور ممتاز علما میں سے تھے۔

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۴۹، ۲۵۰۔ بحوالہ شجرۃ الشیخ بدر الدین۔

Marfat.com

موضع کڑ میں پیدا ہوئے جو اعمال محبّ علی پور مضافات بہار شریف (ہندوستان) میں واقع تھا۔ ان کا خاندان ''ملک'' کہلاتا تھا اور اس علاقے میں شرافت اور علم و قابلیت میں مشہور تھا۔ قاضی محبّ اللہ اوائل شباب ہی میں تحصیل علم کے لیے پورب وغیرہ کے علاقوں میں چلے گئے تھے۔ متعدد مقامات میں گھومے پھرے اور کئی علما سے ابتدائی اور اوسط درجے کی کتابیں پڑھیں۔ بالآخر شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی (سال شہادت ۱۱۰۳/۱۶۹۲ء) کی خدمت میں گئے اور ان سے کچھ درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ بعض کتب درسیہ علامہ قطب الدین حسینی شمس آبادی (متوفی ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء) سے پڑھیں۔ یہاں تک کہ اللہ نے ان کو علم کا بحر ذخائر بنا دیا اور آسمان علوم وفنون کے ستاروں میں انھیں بدر کامل کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے بقول وہ ''بحرے است از علوم و بدرے است بین النجوم''۔

تحصیل علم کے بعد حکومت کے ایوانوں سے وابستہ ہونے کا عزم کیا اور شاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں پہنچے جو ان دنوں بلاد دکن میں مقیم تھا۔ علما کے اس قدر دان بادشاہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر لکھنؤ کے منصب قضا پر متمکن کیا۔ کئی سال اس عہدے پر فائز رہے۔ بعد ازاں معزول ہوگئے۔ دوسری مرتبہ پھر دکن کا عزم کیا اور بادشاہ سے ملاقات کی۔ اب اس نے ان کو حیدرآباد (دکن) کا قاضی مقرر کر دیا۔ کچھ عرصے بعد کسی وجہ سے بادشاہ ان سے ناراض ہوگیا اور انھیں منصب قضا سے علیحدہ کر دیا گیا۔

چند دنوں بعد لوگوں نے بادشاہ کے حضور ان کی سفارش کی اور قصور معاف کر دیا گیا۔ اب بادشاہ نے ان کو اپنے پوتے رفیع القدر کی تعلیم پر مامور کیا، جو محمد معظم (شاہ عالم) کا بیٹا تھا۔ پھر جب زندگی کے آخری دور میں اورنگ زیب عالم گیر نے کابل کی ولائت محمد معظم کے پسرد کی اور وہ اپنے بیٹے رفیع القدر کو ساتھ لے کر دکن سے کابل روانہ ہوا تو قاضی محبّ اللہ بہاری کو بھی ساتھ لے گیا۔ عالم گیر کی وفات کے بعد ۱۱۱۸ھ میں محمد معظم نے شاہ عالم کا لقب اختیار کر کے ہندوستان کی زمام حکومت ہاتھ میں لی تو اس نے قاضی محبّ اللہ بہاری کو ممالک ہند کی صدارت عظمیٰ کے منصب جلیلہ پر فائز کیا اور فاضل خاں کا لقب عطا فرمایا۔ یہ واقعہ ۱۱۱۹ھ کا ہے۔

قاضی محبّ اللہ بہاری علمی رفعت کے مالک اور جلالت قدر کے حامل تھے۔ ذہانت و فطانت میں یگانہ اور تحقیق و تدقیق میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ہر گوشۂ علم پر ان کی نظر تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور دیگر تمام علوم پر انھیں عبور حاصل تھا۔ فارسی اور عربی کے بہترین ادیب تھے۔ مولوی رحمان علی ''تذکرہ علمائے ہند'' میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

بحرے بود از بحار علوم و بدرے بود بین النجوم۔

(یعنی اگر علوم کے دریا جاری ہوں تو قاضی محبّ اللہ کی حیثیت علم کے تیز رو دریا اور ستاروں کے درمیان بدر کامل کی تھی۔)

Marfat.com

ہندوستان کی سرزمین کو جن اجلۂ علما کے قدم چومنے کا شرف حاصل ہوا ان میں قاضی محبّ اللہ بہاری کے نام نامی کو بڑی اہمیت حاصل ہے، وہ اونچے درجے کے مدرس، بلند مرتبہ شارح اور لائق مصنف تھے۔ ان کو اللہ نے بے حد شہرت عطا کی اور اپنے معاصرین میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھے گئے۔ ان کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ اسی دور میں ان کی کتابوں کو درس نظامیہ میں شامل کرلیا گیا اور ان کے حواشی وشروح معرض تحریر میں لائے گئے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ سلم العلوم: یہ کتاب علم منطق میں ہے اور اس فن کے نہایت دقیق اور مشکل مباحث کو محتوی ہے۔ درس نظامیہ میں شامل ہے اور علمائے منطق نے اس کو شروع ہی میں لائق اعتنا ٹھہرالیا تھا۔ اس پر انھوں نے حواشی لکھے اور اس کی شرحیں سپرد قلم کیں۔

ہندوستان سے باہر کے ماہرین منطق کی دو ایسی کتابیں ہیں جنھیں طبقۂ علما میں عالم گیر شہرت حاصل ہوئی۔ پہلی کتاب نجم الدین عمر بن علی قزوینی کی ''الشمسیہ'' ہے اور دوسری علامہ سعد الدین تفتازانی کی ''تہذیب المنطق''۔ ان کتابوں کو اصحاب منطق میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس حلقے میں اس قدر متداول ہوئیں کہ انھیں داخل نصاب کیا گیا اور شروح وحواشی کے لیے شائستۂ التفات گردانا گیا۔ مدارس عربیہ میں ان کتابوں کے بعد قاضی محبّ اللہ بہاری کی ''سلم العلوم'' کی باری آتی ہے اور یہ کتاب طلبا کو باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے۔ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر مشمولات منطق کے اعتبار سے اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتی ہے۔ مصنف شہیر نے متعلقہ فن کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں رہنے دیا۔ تمام منطقی اشکالات اور اس فن دقیق کے نزاعی مباحث کا احاطہ کرلیا ہے۔ مصنف نے اس کے مقدمے میں اس تمنا کا اظہار کیا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ ''سلم العلوم، کتب درسیہ میں اس طرح چمکے جس طرح ستاروں میں چاند چمکتا ہے۔''

ان کی زندگی ہی میں ان کی یہ تمنا پوری ہوگئی تھی اور اہل علم نے اس کی شرحیں لکھنے کی طرف عنان توجہ مبذول کرلی تھی۔

سلم العلوم کی پہلی شرح کس نے لکھی، اس سلسلے میں مولانا فضل امام خیرآبادی (متوفی ۵ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ/ ۹ مئی ۱۸۲۸ء) جو دیار ہند کے نامور عالم ہیں، قاضی محمد مبارک گوپاموی (متوفی ۵ شوال ۱۱۶۲ھ/ ۲۷ ستمبر ۱۷۴۹ء) کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اول کسے کہ حاشیہ برمیر زاہد نوشت وسلم راشرح کرد، او بود۔

(یعنی قاضی محمد مبارک گوپاموی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے میرزاہد پر حاشیہ لکھا اور سلم کی شرح سپرد قلم کی۔)

لیکن واقعات کی ترتیب اور دیگر حالات سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا فضل امام خیرآبادی کی یہ بات صحیح

Marfat.com

نہیں، اس لیے کہ قاضی محمد مبارک گوپاموی نے اپنی شرح کے خاتمے پر لکھا ہے:

قد تم الشرح بفضل من الله تعالیٰ و تبارك من عبده محمد مبارك فی سنة الف ومائة واربعین وثلث من الهجره النبوية فی سابع شهر ربيع الاول يوم الخميس فی بلدة شاه جهان اباد۔

(یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کے بندے محمد مبارک کے ہاتھوں یہ شرح ۷ ربیع الاول ۱۱۴۳ھ کو بروز جمعرات شہر شاہ جہان آباد (دہلی) میں مکمل ہوئی۔)

سلم العلوم کی ایک شرح بارھویں صدی ہجری کے دیار ہند کے ممتاز فاضل شیخ احمد عبدالحق فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۹ ذی الحجہ ۱۱۸۷ھ/۲۱ فروری ۱۷۷۴ء) نے تحریر فرمائی۔ وہ اپنی شرح (تصدیقات) کے خاتمے پر رقم طراز ہیں:

صنفه خادم الطلبة احمد عبدالحق بن فاضل الكامل محمد سعيد بن ملا قطب الدين شهيد قطب العلماء والعرفان الانصاری السهالی سنة الف ومائة وثلاثين من الهجره النبوية۔

(طلبا کے خادم احمد عبدالحق بن شیخ محمد سعید بن ملا قطب الدین شہید انصاری سہالوی نے یہ شرح ۱۱۳۰ھ میں تصنیف کی۔)

شیخ احمد عبدالحق فرنگی محلی کے الفاظ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قاضی محمد مبارک گوپاموی کی شرح کو اولیت حاصل نہیں ہے اور مولانا فضل امام خیر آبادی کا یہ کہنا تاریخی لحاظ سے درست نہیں کہ سلم العلوم کی شرح سب سے پہلے قاضی محمد مبارک گوپاموی نے لکھی، اس لیے کہ قاضی محمد مبارک نے اپنی شرح ۷ ربیع الاول ۱۱۴۳ھ کو مکمل کی اور شیخ احمد عبدالحق فرنگی محلی اس سے تیرہ سال پیشتر ۱۱۳۰ھ میں اس اہم کام سے فارغ ہو چکے تھے۔

لیکن اس کے باوجود یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ شیخ احمد عبدالحق کی شرح اولین شرح ہے، اس لیے کہ خود شیخ احمد عبدالحق کے الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی سلم العلوم کی کچھ شرحیں لکھی گئی تھیں۔ چنانچہ اپنی شرح کے خاتمے پر احمد عبدالحق رقم طراز ہیں:

وكنت بالغا فی الايضاح لم نجد مثله شرحا موضحا فائقا للابكار نافعا للطلاب۔

(میں نے مطالب کتاب کی وضاحت میں پوری کوشش کی ہے، ایسی واضح، عمدہ افکار میں ممتاز اور طلبائے علم کے لیے مفید کوئی دوسری شرح ہم نے نہیں پائی۔)

شیخ احمد عبدالحق کے ان الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی سلم العلوم کی کچھ شرحیں قلم بند ہو

Marfat.com

چکی تھیں، لیکن ان میں الجھاؤ تھا اور وہ طلبا کے لیے زیادہ واضح اور سود مند نہ تھیں۔

بہر حال شیخ محبّ اللہ بہاری کی اس کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور متعدد حضرات نے اس کی شرحیں لکھیں جن میں شرح احمد عبدالحق، شرح قاضی مبارک، شرح حمد اللہ سندیلوی، شرح ملامبین اور شرح ملامسافر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۲۔ مسلم الثبوت: قاضی محب اللہ بہاری کی یہ کتاب اصول فقہ سے تعلق رکھتی ہے اور مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کتاب کا نام تاریخی ہے جس سے سال تالیف ۱۱۰۹ھ نکلتا ہے۔ یعنی یہ کتاب انھوں نے ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء میں تصنیف کی۔

مسلم الثبوت اپنے موضوع میں نہایت اہم کتاب ہے اور اصول فقہ کی اونچے مرتبے کی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ علما و طلبا کے حلقے میں بہت مقبول و متداول ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے اصول فقہ کے بنیادی اور اصولی مباحث کو ہدف فکر و نظر ٹھہرایا ہے۔ برصغیر کے علاوہ یہ کتاب مصر کے علما و طلبا میں بھی مقبول ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''مسلم الثبوت'' شافعی اور حنفی اصول فقہ سے متعلق ہے۔ یہ کتاب افغانستان کے مشہور عالم ملا حبیب اللہ قندھاری (تیرھویں صدی ہجری) کے ملاحظہ میں آئی تو انھوں نے ''مغتنم الحصول فی علم الاصول'' کے نام سے اس موضوع پر کتاب تصنیف کی، جس کا نقطہ نظر بعض امور میں ''مسلم الثبوت'' سے کافی حد تک مختلف ہے۔ کتاب اپنے مباحث و مندرجات کے اعتبار سے بڑی علمی ہے۔ یہ قلمی کتاب ہے، ہمارے علم کے مطابق پاکستان میں اس کے صرف دو ہی نسخے ہیں، ایک پشاور یونیورسٹی لائبریری میں اور ایک حضرت مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانے (وزیر آباد) میں۔ حضرت حافظ صاحب کے کتب خانے کا نسخہ ہمیں حضرت مولانا محمد عطا اللہ حنیف کی وساطت سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ نسخہ بڑے سائز کے ۲۴۷ اوراق پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ ۲۴ سطور کو محیط ہے۔ خط بہت اچھا ہے۔ ''مغتنم الحصول فی علم الاصول'' کے فاضل مصنف نے ''مسلم الثبوت'' کے بعض مقامات کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ انداز فاضلانہ اور محققانہ ہے۔ یاد رہے یہ وہی ملا حبیب اللہ قندھاری ہیں، جو مولانا عبداللہ غزنوی (متوفی ربیع الاول ۱۲۹۸ھ/ فروری ۱۸۸۱ء) کے استاذ اور مرشد تھے۔

۳۔ الجواہر الفرد: یہ بھی منطق کی کتاب ہے اور جزو لا یتجزیٰ کے بارے میں ہے۔

یہ تینوں کتابیں مدارس عربیہ اور طبقۂ علما میں مروج و متداول ہیں۔

۴۔ مغالطۃ عامۃ الورود: یہ ایک رسالہ ہے جس میں یہ بحث کی گئی ہے کہ مذہب حنفیہ رائے اور قیاس کے سلسلے میں مذہب شافعیہ سے زیادہ بعید ہے۔

Marfat.com

قاضی محبّ اللہ بہاری نے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی اور شہر بہار (ہندوستان) کے محلّہ چاند پور میں مدفون ہوئے ❶۔

وفات کی تاریخ ان الفاظ سے مستخرج ہے:

قاضی مولوی محبّ اللہ ۱۱۱۹ھ — رفتہ سوئے ارم حبیب اللہ ۱۱۱۹ھ

''بزم تیموریہ'' میں سال وفات ۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے۔

۳۔ سید محمد قنّوجی

سید محمد قنوجی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن محمد بن محمد بن کدائی بن سید ملک بن عمادالدین بن حسین بن علاالدین علی بن محمد بن ضیاء الدین حسینی دہلوی ثم قنوجی۔!

سید محمد قنوجی سرزمین ہند کے مشاہیر فقہا اور کبار علما میں سے تھے۔ قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم کے لیے رخت سفر باندھا اور قاضی عبدالقادر عمری لکھنوی (متوفی ۲۷ شعبان ۱۰۷۶ھ) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کتب درسیہ پڑھیں۔ پھر الٰہ آباد کا قصد کیا، وہاں شیخ محبّ اللہ الٰہ آبادی (متوفی ۹ رجب ۱۰۵۸ھ/ ۲۰ جولائی ۱۶۴۸ء) کا سلسلۂ تدریس جاری تھا، اس میں شرکت کی اور نعمت علم سے فیض یاب ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن قنوج تشریف لائے اور تمام دنیوی معاملات سے منقطع ہو کر گھر میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گئے اور اپنے آپ کو عبادت الٰہی اور افادۂ طلبا کے لیے وقف کر دیا۔

اس زمانے میں مغل حکمران شاہ جہان تخت ہند پر متمکن تھا۔ وہ علم اور علما سے بے حد تعلق خاطر رکھتا تھا۔ سید محمد قنوجی کے فضل و کمال اور فراوانئ علم کا شہرہ اس تک پہنچا تو اس نے اپنے سال جلوس کے بتیسویں سال انھیں دربار میں طلب کیا اور پھر ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اس درجے متاثر ہوا کہ عمر بھر اپنے سے جدا نہ ہونے دیا۔ حتیٰ کہ قلعہ آگرہ کے ایام اسیری اور زمانۂ نظر بندی میں بھی ساتھ رکھا۔ محمد صالح کمبوکی

---

❶ مآثر الکرام ص ۲۰۰، ۲۰۱۔ ابجد العلوم ص ۹۰۵۔ سبحۃ المرجان ص ۷۶، ۷۷۔ نزہتہ الخواطر، ج ۶، ص ۲۵۰ تا ۲۵۲۔ قضاۃ الارب من ذکر علماء النحو والادب ص ۲۰۲، ۲۰۳۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۳۱، ۴۳۲۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۵، ۱۷۶۔ ترجمۃ الفضلاء ص ۸۱۔ تذکرہ مصنفین درس نظامی ص ۲۱۰ تا ۲۱۴۔ بزم تیموریہ، ص ۲۵۲۔ مقدمہ سلم العلوم۔ علمائے ہند کا شان دار ماضی ج ا ص ۴۰۵، ۴۰۶۔

Marfat.com

روایت کے مطابق شاہ جہان ان سے قرآن و حدیث اور دیگر کتب اسلامی سنتا تھا اور تمام حاضرین مجلس اس جلیل القدر عالم سے استفادہ کرتے تھے ❶۔

شاہ جہان کی وفات کے وقت بھی سید موصوف اس کے پاس موجود تھے۔ جن حضرات نے اس کی تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیے اور میت کو قلعے کے برج مثمن کے دروازے سے حصار سے باہر لائے، ان میں ایک سید محمد قنوجی بھی تھے۔ پھر نماز جنازہ اور تدفین میں بھی شامل تھے۔

شاہ جہان کی وفات کے بعد ان کو اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے ساتھ وابستہ کر لیا اور اپنے خاص مصاحبوں اور ندیموں میں شامل کیا اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین و ترتیب میں بھی ان کو شریک فرمایا۔ عالم گیر ان کی بے حد تکریم کرتا اور عجز و نیاز مندی سے پیش آتا۔ وہ انھیں ''استاذ'' کہہ کر پکارتا اور کہا کرتا تھا کہ یہ میرے بھی استاذ ہیں اور میرے والد کے بھی۔!

اورنگ زیب عالم گیر، سید محمد قنوجی سے امام غزالی کی تصنیفات بالخصوص احیاء علوم الدین اور کیمیائے سعادت کا درس لیتا۔ ہفتے میں تین روز وہ مجلس شاہی کے مذاکرۂ علوم میں سرگرم رہتے۔ اس اثنا میں بادشاہ ان سے دیگر کتابوں کے علاوہ حدیث، فقہ اور سلوک و تصوف کے موضوع سے متعلق مختلف کتابیں پڑھتا اور ان کے مندرجات کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ علاوہ ازیں فتاویٰ عالم گیری کے بارے میں مذاکرہ کرتا اور بحث میں باقاعدہ حصہ لیتا۔

سید محمد قنوجی جہاں علم و فضل میں یکتا تھے، وہاں فقر و بے نیازی میں بھی منفرد تھے۔ ان کا ہندوستان کے ان دو عظیم بادشاہوں سے انتہائی قریبی تعلق رہا۔ بادشاہ اگرچہ ان سے بدرجۂ غایت عقیدت رکھتے تھے لیکن سید ممدوح ان سے کبھی کسی منصب و امارت کے خواہاں نہیں ہوئے۔ امارت پر ہمیشہ درویشی کو ترجیح دی، اور دربار شاہی سے تعلق کے باوجود زندگی کے آخری دم تک علما کی خاص نوع کی وضع قطع اور مخصوص ہیئت کو اپنائے رکھا۔ وہ کسی لمحے بھی اس دائرۂ خاص سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے۔ حالانکہ ان کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ اپنے شہر قنوج میں معقول مالی حیثیت کے حامل اور کئی گاؤں کے مالک تھے۔

سید محمد قنوجی کا ذکر حضرت سید نواب صدیق حسن خاں نے بھی ابجد العلوم میں کیا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے علاقے اور شہر کے صاحب ثروت عالم دین تھے اور رفاہ عامہ کے کاموں میں خصوصیت سے روپیہ خرچ کرتے تھے۔ نواب صاحب کے عربی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''سید محمد قنوجی، سادات سے تعلق رکھتے تھے اور اورنگ زیب عالم گیر کے استاذ تھے۔ ان کی بہترین یادگاروں میں سے ایک عمارت مسافر خانے کی ہے، جس کی اس نواح میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان کا ایک باغ ہے، جس میں ایک بہت بڑا قبرستان ہے۔ اسی قبرستان میں خود ان کی اپنی قبر بھی ہے۔ علوم ریاضی اور علوم عربیہ میں انھیں بڑی دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے معانی و بیان کی مشہور کتاب مطول پر حاشیہ تحریر کیا۔ وہ عظیم المرتبت،

❶ عمل صالح ج ۳ ص ۲۶۶۔

Marfat.com

حامل عز و جاہ، صاحب ثروت اور مال دار عالم تھے۔ علم وحکمت اور شوکت وشہامت کی دولت ان کی ذات میں سمٹ آئی تھی۔ اس شہر (قنوج) میں ان کے ورثا بھی رہتے ہیں لیکن وہ سب نا اہل لوگ ہیں ❶۔

بہر حال سید محمد قنوجی اپنے دور کے جلیل القدر عالم وفقیہ اور فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت کے رکن تھے۔ جس طرح شاہ جہان ان کی وسعت معلومات سے متاثر ہوکر ان سے استفادہ کرتا تھا، اسی طرح اورنگ زیب عالم گیر بھی انھیں انتہائی اعزاز واحترام کا مستحق گردانتا اور ان سے مستفیض ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ عالم گیر کے گیارھویں سال جلوس (۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء) میں ۱۰ شعبان کو اس کے بیٹے شہزادہ محمد اعظم کی تقریب نکاح منعقد ہوئی تو سید محمد قنوجی کو وکیل نکاح بنایا گیا۔ اس کے بعد عالم گیر کے سولھویں سال جلوس (۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) میں اس کے بیٹے شہزادہ محمد سلطان کا نکاح مراد بخش کی بیٹی دوست دار بانو بیگم سے ہوا تو سید محمد قنوجی کو بادشاہ کی طرف سے گواہ مقرر کیا گیا۔

اورنگ زیب نے مختلف مواقع پر انھیں انعام واکرام اور خلعت سے بھی سرفراز کیا۔

بلاشبہ سید محمد قنوجی اپنے عصر کی عظیم شخصیت تھے، گونا گوں اوصاف سے متصف اور علم وتحقیق میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ علما وفقہا، ارباب حکومت اور امرائے سلطنت میں بڑے مرتبہ وعزت کے حامل تھے۔ بادشاہ ان کی فضیلت علمی، تدین و پارسائی اور دقت نظر سے بہت متاثر تھا، اسی وجہ سے وہ ان پر پورا اعتماد کرتا اور اہم مواقع پر انھیں اپنے ساتھ رکھتا اور ان سے مشورے لیتا تھا۔

انھوں نے ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء میں وفات پائی ❷۔

اولاد:

سید محمد قنوجی کے تین بیٹے تھے۔ ایک کا نام سید احمد تھا، ایک کا سید شریف اور ایک کا میر عبدالکریم! تینوں بڑے منتظم اور قابل تھے اور عالم گیر کے حلقہ ملازمین سے منسلک۔! ان کے تفصیلی حالات تو معلوم نہیں ہو سکے، البتہ جو کچھ معلوم ہوسکا ہے وہ یہ ہے کہ سید احمد کو قاضی محمد حسین محتسب (جو فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین میں سے تھے) کے انتقال کے بعد اورنگ زیب کی طرف سے محتسب کا عہدہ تفویض کیا گیا تھا ❸۔

سید شریف کے متعلق مآثر عالم گیری میں جلوس عالم گیری کے تیسویں سال (۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء) کے

❶ ابجد العلوم ص ۹۳۴۔

❷ ان کے حالات کے لیے یہ کتابیں بھی دیکھیے۔ مآثر الامراء، ج ۳ ص ۵۰۴۔۔ عالم گیر نامہ صفحات ۳۴۷، ۳۹۷، ۴۲۷، ۴۶۸، ۹۳۲ تا ۹۳۵، ۱۰۶۰۔ مآثر عالم گیری صفحات ۷۲، ۹۴، ۱۳۸۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۳، ۲۱۵، ۲۱۶۔ نزہتہ الخواطر ج ۶، ص ۲۵۳، ۲۵۴۔ بزم تیموریہ ص ۲۲۴۔ برصغیر میں علم فقہ ص ۲۸۹ تا ۲۹۵۔

❸ مآثر عالم گیری (اردو ترجمہ) ص ۱۱۲۔

Marfat.com

حالات کے ضمن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی انتظامی صلاحیتوں کے مالک اور لائق شخص تھے۔

اس سال کثرت باراں کی وجہ سے شدید قحط پڑا تھا، اس موقعے پر انھوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ مآثر عالم گیری کا مصنف محمد ساقی مستعد خاں جن فارسی الفاظ میں ان کی خدمات کا ذکر کرتا ہے، ان کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''اس زمانے میں شدید بارش کی وجہ سے زمین پر دریا بہنے لگے اور قحط پڑ گیا۔ شہر کے ارد گرد غلے کی رسد بند ہوگئی اور رعایا میں ماتم بپا ہو گیا۔ لاکھوں بندگان خدا کی جانیں تلف ہوگئیں۔ مکان، دریا اور جنگل مردہ جسموں سے پٹ گئے۔ لشکر گاہ کی یہ حالت تھی کہ شب کو دولت خانۂ شاہی کے گرد مردہ جسموں کے انبار لگ جاتے، جن کو جاروب کش یا خاکروب روزانہ گھسیٹ کر دریا میں ڈالتے تھے۔ صبح سے شام تک لاشوں کے اٹھانے کا سلسلہ جاری رہتا۔

''صورت حال یہاں تک ابتر اور تکلیف دہ ہوگئی تھی کہ لوگوں کو بھوک کی شدت سے مردار کھانے سے کوئی پرہیز نہ رہا تھا۔ مردوں کی لاشوں سے شہر کے تمام گلی کوچے پٹ گئے تھے۔ بارش کے مسلسل اور طویل سلسلے نے انسانوں اور حیوانوں کے گوشت پوست کو گلا دیا تھا، خطرہ یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ مردار کی سخت بدبو آب و ہوا میں تعفن پیدا کر کے ان لوگوں کو بھی موت کے منہ میں دھکیل دے گی جو زندہ بچ گئے تھے۔

''چند ماہ بعد بارش کا زور گھٹا اور دریا کی طغیانی کم ہوئی تو اطراف و جوانب سے شہر میں غلہ پہنچنے لگا۔ سردار خاں کی بجائے سید شریف خاں کرورہ گنج کی خدمت پر مامور ہوئے، یہ وہی سید شریف خاں ہیں جو حضرت فردوس آشیانی اور اورنگ زیب عالم گیر کے استاذ اعلیٰ قدوۃ المشائخ پیر سید محمد قنوجی کے فرزند گرامی تھے، اور سید محمد قنوجی فضل و کمال میں مشہور اور عقل و شعور میں معروف تھے۔ اس موقعے پر رعایا پرور بادشاہ کے حسن نیت سے گرانی رفع ہوئی اور ملک میں غلہ ارزاں ہو گیا[1]۔''

اورنگ زیب نے سید شریف کو ان کی قابلیت اور گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر امجد خاں کا لقب عطا کیا تھا۔ نزہۃ الخواطر میں ان کے حالات جن الفاظ میں مرقوم ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے:

''سید شریف محمد امجد بن محمد بن محمد حسینی قنوجی، نواب امجد خاں۔ سید محمد قنوجی کے بیٹے تھے۔ ان کا شمار اس عصر کے نامور علما کی جماعت میں ہوتا تھا۔ علوم و فنون اور طریقت میں اپنے باپ سید محمد قنوجی سے فیض حاصل کیا تھا اور عرصے تک ان کے ساتھ منسلک رہے تھے۔ حصول علم کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کے مقربین میں شامل ہو گئے۔ اس نے قاضی محمد حسین جون پوری کی وفات کے بعد ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء میں ان کو محکمہ احتساب پر فائز کر دیا اور امجد خاں کے لقب سے سرفراز کیا۔ طویل مدت تک، اس عہدے پر متمکن رہے۔ پھر

[1] مآثر عالم گیری ص ۲۹۲، ۲۹۳۔

Marfat.com

صدارت ہند کے منصب علیا پر فائز کیے گئے ❶"

سید محمد قنوجی کے تیسرے بیٹے سید میر عبدالکریم قنوجی تھے جو فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے نامور علما میں سے تھے۔ عالم گیر کی طرف سے برہان پور میں جزیہ وصول کرنے کے منصب پر مامور تھے۔ اس ضمن میں ان کی سرگرمیاں عالم گیر کے نزدیک اس درجے قابل قدر تھیں کہ ان سے متاثر ہو کر اس نے دکن کے چار علاقوں سے وصولی جزیہ کا عہدہ بھی ان کے سپرد کر دیا تھا۔ علم و فضل کی فراوانی کے ساتھ جود و سخاوت، عفت و تقوٰی اور حسن اخلاق کی نعمت سے بھی مالا مال تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ درسیاست میں کامل مہارت رکھتے تھے اور ان کے ہاں یہ سلسلہ ہر حالت میں جاری رہتا تھا۔ عالم گیر کی طرف سے امانت ہفت چوکی کے منصب کے ساتھ ساتھ جائے نماز خانہ کے داروغہ کی خدمت بھی ان کے سپرد تھی۔

تلامذہ:

سید محمد قنوجی کے تلامذہ اور فیض یافتگان کا حلقہ بھی خاصا وسیع تھا جس میں ہندوستان کے دو بہت بڑے مغل بادشاہ بھی شامل تھے۔ ایک شہاب الدین محمد شاہ جہان، اور دوسرے اورنگ زیب عالم گیر! ان کے علاوہ اور بھی متعدد حضرات نے ان سے مستفید ہونے کا شرف حاصل کیا۔ ان میں سے ایک شیخ علی اصغر قنوجی تھے، جو اپنے عہد کے مشہور عالم و فقیہ تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ نہایت نیک، متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ قنوج میں ان کا ہنگامۂ درس جاری تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف و سلوک وغیرہ میں ممتاز درجے پر فائز اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

ان کے آبا و اجداد اصلاً مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے۔ خاندان کے بعض حضرات نے مدینہ منورہ کی سکونت ترک کر کے کرمان میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ پھر وہاں سے خاندان کے ایک بزرگ نے جن کا نام شیخ مبارک بن عماد الدین تھا، ہندوستان کا رخ کیا اور قنوج میں متوطن ہو گئے۔ وہیں ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء میں شیخ علی اصغر کی ولادت ہوئی اور پھر یہ شہر مستقل طور سے ان کا مسکن قرار پا گیا۔

شیخ علی اصغر نے پورے ساٹھ سال قنوج میں مسند تدریس بچھائے رکھی، اور اس اثنا میں بے شمار حضرات نے ان سے استفادہ کیا۔ دیار ہند کے اس جید عالم و فقیہ نے ۸۹ سال عمر پا کر ۱۵ شعبان ۱۱۴۰ھ/۱۶/ مارچ ۱۷۲۸ء کو وفات پائی۔

۴۔ شیخ محمد گجراتی

شیخ محمد بن جعفر بن جلال بن محمد حسینی بخاری گجراتی، حضرت شیخ جلال الدین بخاری اچی کی اولاد سے

❶ نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۳، ۲۸۴۔

Marfat.com

تھے۔ ۲ ربیع الاول ۱۰۴۷ھ/ ۱۵ جولائی ۱۶۳۷ء کو پیدا ہوئے اور احمد آباد میں اپنے والد گرامی شیخ جعفر گجراتی اور دیگر علمائے عصر سے اخذ علم کیا، یہاں تک کہ اپنے زمانے اور علاقے کے جلیل القدر اور بلند مرتبہ فقیہ ہوئے۔

ان کا اصل مشغلہ درس و تدریس تھا، جس سے بہت سے علمائے کرام اور طلبا علم نے استفادہ کیا۔ تصنیف و تالیف میں بھی دلچسپی رکھتے تھے اور قرآن و حدیث پر اچھی نظر تھی۔ چنانچہ قرآن مجید کی ایک تفسیر تو فارسی میں لکھی، جس میں روایت اہل بیت کا التزام کیا۔ دوسری تفسیر عربی میں تفسیر جلالین کے انداز پر تحریر کی۔

کتب احادیث میں مشکوٰۃ کو ان دنوں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ شیخ محمد گجراتی نے اسے بھی مرکز التفات ٹھہرایا اور ''زینۃ النکات فی شرح المشکوٰۃ'' کے نام سے اس کی شرح سپرد قلم فرمائی۔ اس کے علاوہ مختلف مسائل سے متعلق اور بھی متعدد رسائل تحریر کیے۔

شیخ محمد گجراتی نے چونسٹھ (۶۴) برس عمر پا کر ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۱ھ/ ۲ دسمبر ۱۶۹۹ء کو احمد آباد میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے [1]۔

۵۔ قاضی محمد آصف نگرامی

لکھنؤ کے نواح میں بہت سے قصبات و دیہات کو اہل علم کے مراکز کی حیثیت حاصل رہی ہے، ان میں ایک قریہ نگرام ہے، جس کی خاک سے متعدد اصحاب کمال پیدا ہوئے اور پھر ان کی علمی شہرت دور دراز علاقوں میں پہنچی۔ علمائے نگرام میں ایک بزرگ قاضی محمد آصف گزرے ہیں جو اس نواح میں اپنے عصر کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ ان کا کتب خانہ مختلف فنون کی بہترین کتابوں پر مشتمل تھا۔ انھوں نے ۲۲ ربیع الاول ۱۱۸۵ھ/ ۵ جولائی ۱۷۷۱ء کو نگرام میں وفات پائی [2]۔

۶۔ شیخ محمد ارشد جون پوری

شیخ محمد ارشد جون پوری، مشہور عالم اور درس نظامیہ کی معروف کتاب ''رشیدیہ'' کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کے فرزند گرامی تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب انتیس واسطوں سے شیخ سری سقطی تک پہنچتا ہے۔

دیار ہند کے بہت بڑے عالم، شیخ اور متقی بزرگ تھے۔ ۱۰۴۱ھ/ ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوئے اور علم و مشیخت کی گود میں پرورش پائی۔ قران مجید پڑھا اور خوش نویسی اور کتابت مختلف حضرات سے سیکھی۔ علم صرف کی ابتدائی کتابیں یعنی میزان الصرف سے لے کر دستور المبتدی تک ایک عالم مولانا نصراللہ سے پڑھیں۔ اس کے بعد کتب نحو میں سے مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ اور شرح جامی وغیرہ کی تحصیل کی۔ اسی اثنا میں منطق کی ابتدائی کتابوں سے لے کر

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۵۷۔ بحوالہ مرأۃ احمدی

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۶۷۔

Marfat.com

انتہائی کتابوں تک مختلف اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ معانی و بیان، ہیئت و ریاضی، مناظرہ، فقہ، اصول فقہ، علم فرائض، اصول حدیث، فلسفہ، تفسیر اور حدیث وغیرہ مروجہ علوم کی تمام کتابوں کا جید و مشاہیر اساتذہ سے باقاعدہ درس لیا۔ اپنے والد مکرم شیخ محمد رشید جون پوری سے بھی متعدد فنون کی بہت سی کتابیں پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ بے حد ذہین تھے، حافظہ بڑا تیز پایا تھا۔ تمام متداول علوم کی تحصیل سے اکیس سال کی عمر میں فارغ ہو گئے تھے۔ والد کی زندگی ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

بے حد متدین عالم تھے۔ تدریس کے ساتھ تلقین و موعظت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ قناعت و عفت اور فقر و توکل میں وہی معمول تھا جو والد گرامی شیخ محمد رشید کا تھا۔ ہر شخص سے نرمی اور انکسار کے ساتھ پیش آتے۔ مریض کی عیادت کرتے اور جنازوں میں شامل ہوتے۔ چھوٹے بڑے کی دعوت قبول فرماتے اور کسی کے لیے اذیت رسانی کا باعث نہ بنتے۔ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے اور اس پر خوش رہتے۔ نماز باجماعت پڑھنے اور اول وقت ادا کرنے کا اہتمام کرتے اور اپنے تلامذہ و رفقا کو بھی اس کی تاکید فرماتے۔ سری نمازوں میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھتے۔

شیخ محمد ارشد جون پوری نے سلوک و تصوف کے موضوع پر چند رسائل بھی تصنیف کیے۔ ''گنج ارشدی'' کے نام سے خود ان کے ملفوظات ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء میں ان کے شاگرد شیخ شکر اللہ جون پوری نے جمع کیے، اور شیخ غلام رشید جون پوری (متوفی ۵ صفر ۱۱۶۷ھ) نے ان ملفوظات کو مرتب کیا۔ گنج ارشدی کا قلمی نسخہ جون پور میں موجود ہے۔ اس میں بہت سے علما و فضلا اور صوفیا و اولیا کے حالات و کوائف مرقوم ہیں اور اس کے حوالے مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔

شیخ محمد ارشد جون پوری رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۴ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۳ھ/۱۵ نومبر ۱۷۰۱ء کو جون پور میں وفات پائی[1]۔

۷۔ مولانا محمد اسعد انصاری سہالوی

مولانا محمد اسد انصاری سہالوی، برصغیر کے معروف عالم دین مولانا قطب الدین انصاری سہالوی شہید کے چار بیٹوں میں سے بڑے بیٹے تھے۔ موضع سہالی میں پیدا ہوئے جو لکھنؤ کے نواح میں اصحاب فضل کا مشہور قصبہ تھا۔ اپنے والد مولانا قطب الدین سہالوی سے اخذ علم کیا۔ بارھویں صدی ہجری کے جید علما میں سے تھے۔ اپنے علمی کمال کی وجہ سے باپ کی زندگی ہی میں برہان پور کے منصب صدارت پر فائز ہو گئے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے دربار سے منسلک تھے اور اس کے ہم رکاب رہتے تھے۔ رئیسانہ مزاج کے مالک تھے۔ حاشیہ قدیمہ پر حاشیہ تحریر کیا۔ بارھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے مشہور عالم و مصنف ملا جیون امیٹھوی کے

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۰ تا ۲۷۲ بحوالہ گنج ارشدی۔

Marfat.com

ہم عصر تھے، اور ایک مناظرے میں ملا جیون کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ علاقہ دکن میں فوت ہوئے۔ رجب ۱۱۰۳ھ/ مارچ ۱۶۹۲ء میں جب ان کے والد مولانا قطب الدین ❶ کو کوسہالی میں شہید کیا گیا یہ وہاں موجود نہ تھے ❷۔

۸۔ سید محمد اشرف حسینی بلگرامی

سید محمد اشرف حسینی ترمذی بلگرامی کا تعلق سادات ترمذ سے تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ والد کا اسم گرامی سید عبدالدائم تھا۔ اس خاندان کے پہلے بزرگ جو ترمذ سے ہندوستان آئے، سید احمد تختہ تھے۔ یہاں آنے کے بعد وہ لاہور میں سکونت پذیر ہوئے اور اسی شہر میں وفات پائی۔ سید احمد تختہ کے اخلاف میں سے ایک بزرگ سید محمد بن قاسم نے قنوج کا رخ کیا اور وہیں توطن اختیار کرلیا تھا۔ جب شیر شاہ سوری نے دائی پور کے قریب شیر گڑھ آباد کیا تو بخاری سادات اور شہر قنوج کے بعض دیگر بزرگوں نے قنوج سے نقل مکانی کر کے شیر گڑھ کو اپنا مسکن بنالیا۔ سید محمد بن قاسم بھی قنوج سے اٹھ کر شیر گڑھ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ پھر جب سوری خاندان کی حکومت ختم ہوگئی اور ہندوستان پر مغلوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا تو قنوج کے ان لوگوں نے جو شیر گڑھ میں آبسے تھے، پھر قنوج کا رخ کیا، لیکن سید محمد بن قاسم نے وہیں رہنے کو ترجیح دی اور فرمایا:

ما فقیریم ہمیں صحرا مناسب حال ماست ❸۔

(ہم فقیر لوگ ہیں یہی جنگل ہمارے لیے موزوں جگہ ہے۔)

سید محمد کی وفات شیر گڑھ ہی میں ہوئی، لیکن ان کی میت کو وہاں سے لاکر قنوج میں دفن کیا گیا۔

سید محمد کے بیٹے سید حسن تھے، جنھیں ''بندگی سید حسن'' کہا جاتا تھا، انھوں نے شیر گڑھ میں ایک نہایت شان دار مسجد تعمیر کی۔ وہ بڑے سخی اور مہمان نواز تھے۔ دائی پور میں فوت ہوئے۔

سید حسن کی اولاد میں ایک بزرگ سید فرید الدین پیدا ہوئے۔ وہ دائی پور کی سکونت ترک کر کے بلگرام میں متوطن ہوگئے تھے۔ یہی وہ سید فرید الدین ہیں جن کی اولاد میں سید محمد اشرف بلگرامی کا نام نامی شامل ہے۔ سید محمد اشرف بڑے نیک اور بلند مرتبے کے عالم دین تھے۔ بلگرام کے علما و فضلا میں انھیں نہایت قدر و منزلت حاصل تھی۔ وہاں کے مشہور علما میں سے سید عبدالجلیل بلگرامی (متوفی ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ) اور استاذ المحققین میر سید طفیل محمد بلگرامی (متوفی ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) ان سے خاص تعلق رکھتے تھے اور ان کے انتہائی مداح تھے۔ مرد صالح، فاضل اجل اور طریقۂ سلف صالحین کے پابند تھے۔ صوری و معنوی فضائل کے حامل اور ہر لحاظ

❶ مولانا قطب الدین کے حالات اور ان کی شہادت کی تفصیلات کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد پنجم۔

❷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۲۔

❸ مآثر الکرام ص ۲۷۹۔

Marfat.com

سے اونچی شخصیت کے مالک تھے۔

سید محمد اشرف ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۴ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ جوانی کی منزل میں داخل ہو چکے تھے اور شادی بھی ہو چکی تھی کہ تحصیل علم کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں بلگرام کے متعدد اصحاب علم مصروف درس و افادہ تھے، جن میں میر سید عبدالجلیل بلگرامی کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور ان سے مروجہ علوم کی کئی کتابیں پڑھیں۔ پھر سید نور اللہ بلگرامی (متوفی ۱۴ شعبان ۱۱۱۴ھ/۲ جنوری ۱۷۰۲ء) کی خدمت میں گئے۔ ان سے فقہ اور معقولات وغیرہ کی بعض کتابوں کی تحصیل فرمائی۔ بعد ازاں سید سعد اللہ بلگرامی (متوفی ۱۷ شوال ۱۱۱۹ھ/۳۱ دسمبر ۱۷۰۷ء) کی طرف رجوع کیا، بعض کتابوں کی تکمیل ان سے کی۔ ان کے علاوہ مولانا شہاب الدین چوبے پوری سے بھی استفادہ کیا۔ مولانا ممدوح کا شمار فلسفہ و منطق کے مشہور علما میں ہوتا تھا اور قنوج کے نواح میں ایک مقام چوبے پور میں سکونت پذیر تھے، جو اس دور میں اچھا خاصا قریہ تھا اور علمی حلقوں میں مشہور تھا۔

علوم متداولہ اور فنون مروجہ سے فارغ ہونے کے بعد سید محمد اشرف بلگرامی نے حکومت وقت سے راہ و رسم پیدا کی اور اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے محمد اعظم کے دربار میں جا کر اس کے حلقۂ ملازمین میں شامل ہو گئے، اور اپنی انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر بڑا نام پیدا کیا۔ بعد ازاں نواب مبارز الملک سربلند خاں تونی سے تقرب پیدا کیا اور جن خدمات پر مامور ہوئے انھیں نہایت حسن و خوبی سے سرانجام دیا۔ پھر نواب صفدر جنگ کی رفاقت اختیار کی، وہاں بھی جو فرائض ان کے سپرد کیے گئے، ان کی تکمیل میں ہر لحاظ سے کامیاب رہے۔ آخر میں احمد شاہ بن محمد شاہ بادشاہ (۱۱۶۱۔ ۱۱۶۷ھ/۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) کی وزارت میں شامل ہو گئے اور امور مفوضہ کی انجام دہی میں بے حد محنت اور سرگرمی کا ثبوت دیا۔ جب کبر سنی کو پہنچ گئے تو اپنے وطن مالوف بلگرام واپس آ گئے۔

سید محمد اشرف بلگرامی کی عمر کا بیشتر حصہ ملوک و امرا کی مصاحبت میں گزرا اور حکومت کے بلند مناصب پر فائز رہے۔ شب و روز کی عبادت کے معمولات میں کبھی فرق نہیں آنے دیا۔ سفر و حضر میں نماز تہجد ہمیشہ پابندی سے ادا کرتے رہے۔ تلاوت قرآن انتہائی جذب و شوق اور عجز و انکسار سے کرتے۔ تفسیر، حدیث اور تصوف کا مطالعہ ان کا خاص موضوع تھا، وقت کا بڑا حصہ اسی میں صرف کرتے۔ نماز باجماعت کے پابند تھے۔ خط بہت عمدہ تھا۔ فقہ کی مشہور درسی کتاب شرح وقایہ پر حاشیہ سپرد قلم کیا اور خوب صورت خط میں شروع سے آخر تک اپنے قلم سے لکھا۔

سید غلام علی آزاد بلگرامی ان کے حالات کے چشم دید گواہ ہیں، انھوں نے ان کا تذکرہ بڑے عمدہ انداز میں کیا ہے اور اختصار کے ساتھ زندگی کی تمام سرگرمیوں کا بہترین اسلوب میں نقشہ کھینچا ہے۔ وہ ان کے آخری دور کے بارے میں لکھتے ہیں:

از کبر سن وضعف قویٰ طاقت قیام نماندہ بود، بزور عصا یا اعانت دیگرے برمی خاست۔ روز عیدین

Marfat.com

سوار شدہ در مسجد جامع، محلّہ میدان پورہ می آمد و با حاضران ملاقات می کرد و می گفت، ہر چند نماز عیدین بہ عذر شرعی از من ساقط است، اما دریں روز کہ بہ تصدیع تمام حاضر مسجد می شوم، نیت آنست کہ نماز جماعت میسر شود و ملاقات با احباب دست دہد خدا داند سال آئندہ در می یابم یا نے ❶۔

(یعنی بڑھاپے اور شدید جسمانی کمزوری کی وجہ سے جب کھڑا ہونے کی بھی طاقت باقی نہ رہی تھی، لاٹھی کے سہارے یا کسی دوسرے شخص کی مدد سے کھڑے ہوتے تھے، عیدین کی نماز کے لیے محلّہ میدان پورہ کی جامع مسجد میں آتے اور لوگوں سے ملاقات کرتے اور کہتے کہ اگرچہ عذر شرعی کی بنا پر نماز عیدین میں حاضری مجھ سے ساقط ہے، تاہم اس دن بے حد تکلیف کے ساتھ مسجد میں حاضر ہوتا ہوں، نیت فقط یہ ہے کہ نماز با جماعت میسر آجائے، اور دوستوں سے ملاقات کا موقع مل جائے۔ خدا جانے آئندہ سال یہ سعادت حاصل کرسکوں یا نہ کرسکوں۔)

برصغیر کے اس جلیل القدر عالم نے ۹ صفر ۱۱۶۵ھ/ ۱۷ دسمبر ۱۷۵۱ء کو ۹۱ سال عمر پا کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان اشعار سے تاریخ وفات نکالی:

میر اشرف سر آمد فضلاء بر و تشریف سوئے منزل قدس
ہاتفے گفت سال رحلت او اشرفِ واردان محفل قدس ۱۱۶۵ھ ❷

۹۔ شیخ محمد اشرف کشمیری

شیخ محمد اشرف بن محمد طیب کشمیری، ارض کشمیر کی منتو برادری سے تعلق رکھتے تھے اور دیار کشمیر کے نامور فقہا میں سے تھے۔ قاضی حیدر کشمیری (متوفی ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء) کے پوتے تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہاں کے اکابر علما سے اخذ علم کیا۔ پھر شیخ محمد محسن کشمیری (متوفی ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) سے منسلک ہو گئے اور ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔

جودت طبع، دقت ذہن، استقامت مزاج اور علم و فضل میں یگانہ تھے۔ بحث و اشتغال میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ افتا و تدریس میں مرتبۂ بلند پر فائز تھے۔ قرآن مجید پر گہری نظر تھی۔ ردشیعیت میں بہت تیز تھے۔ قرآن مجید کے بعض اہم مقامات کی وضاحت، علم قرأت اور شیعہ کی مخالفت میں کچھ کتابیں تصنیف کیں۔ بعض اور مسائل کے بارے میں بھی کتابیں لکھیں۔ ان کی تصانیف میں جواہر الحکم مشہور کتاب ہے۔ مجادلہ اور بلاغت کلام میں اپنے اقران سے ممتاز تھے۔

شیخ محمد اشرف منتو کشمیری نے ۱۱۲۳ھ/ ۱۷۱۱ء میں وفات پائی ❸۔

❶ مآثر الکرام، ص ۲۸۰۔

❷ حالات کے لیے دیکھیے مآثر الکرام ص ۲۷۸ تا ۲۸۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۴، ۲۷۵۔

❸ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۲۱۶۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۹۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۳۴، ۴۳۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۵۔

Marfat.com

۱۰۔ مولانا محمد اعلیٰ تھانوی

برصغیر کی مردم آفرین سرزمین کے ان فحول علما اور اکابر فضلا میں جنھوں نے بارھویں صدی ہجری کا زمانہ پایا، مولانا محمد اعلیٰ تھانوی کا اسم گرامی علم و تحقیق کی رو سے ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ افسوس ہے، اس جلیل القدر عالم کے تفصیلی حالات تذکرہ و تاریخ کی کتابوں نے محفوظ نہیں کیے۔ جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان کے والد کا نام علی، دادا کا محمد حامد اور پڑدادا کا نام محمد صابر تھا۔ نسباً فاروقی اور مسلکاً حنفی تھے۔ یوپی کے مشہور مقام تھانہ بھون میں پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد کا شمار اپنے دور کے اکابر فضلا میں ہوتا تھا۔ ان کے والد شیخ علی ایک جلیل القدر عالم تھے۔ جد امجد کا علمی مقام بھی مسلم تھا۔ اس لحاظ سے کہنا چاہیے کہ شیخ محمد اعلیٰ نے علم و فضل کی گود میں پرورش پائی۔ علم نحو اور دیگر علوم مروجہ کی تحصیل والد مکرم سے کی۔ علم فقہ کی متداول کتابیں بھی انھی سے پڑھیں۔ بعض دیگر علمائے عصر سے بھی اخذ فیض کیا لیکن نہایت افسوس ہے ان اساتذہ کرام کے اسمائے گرامی کو اس دور کی کتب رجال نے اپنے صفحات میں جگہ نہیں دی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا محمد اعلیٰ تھانوی نے اپنی تمام توجہ مطالعۂ کتب میں مبذول کر دی اور تیزی کے ساتھ ذخائر علمی کو سمیٹنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تحقیق کے دروازے کھول دیے اور مروجہ علوم کی علمی و فنی اصطلاحات میں ماہر کامل کے درجے پر فائز ہوئے۔

۱۱۵۸ھ میں ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام ''کشاف اصطلاحات الفنون'' ہے۔ اس کتاب نے ان کو ہمیشہ کے لیے زندگی و تابندگی بخش دی ہے۔ اپنے موضوع کی یہ نہایت عمدہ کتاب ہے۔ لائق مصنف نے اس میں تمام مروجہ عقلی اور نقلی علوم کی اصطلاحات بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ کون سی اصطلاح کہاں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً کلام، اصول، فقہ، صرف، نحو، منطق و حکمت، طب، ہندسہ، ریاضی وغیرہ علوم کی اصطلاحات کا بڑی وضاحت سے ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مستشرقین نے بھی اس سے بے حد اعتنا کیا اور مشہور مستشرق اسپرنگر اور ولیم ناسولیس نے اس کی طباعت کو ضروری قرار دیا۔ چنانچہ انھوں نے محمد وجیہ مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ، عبدالحق اور غلام قادر ایسے جید اور ممتاز علما سے اس کی تصحیح کرائی اور پھر ۱۸۶۲ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے بڑے اہتمام کے ساتھ اسے شائع کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۳۸۲ھ (۱۹۶۲ء) میں ڈاکٹر لطفی عبدالبدیع، ڈاکٹر عبدالنعیم اور استاذ امین الخولی کی تحقیق و تصحیح اور حواشی کے ساتھ یہ کتاب مصر سے شائع ہوئی۔

قیاس کہتا ہے کہ شیخ محمد اعلیٰ تھانوی نے اورنگ زیب عالم گیر کا عہد پایا ہوگا اور اس عصر کے علما سے ان کی صحبتیں بھی رہی ہوں گی، کیونکہ اورنگ زیب نے ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء میں وفات پائی اور شیخ محمد اعلیٰ نے ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء میں اپنی کتاب مکمل کی۔ لیکن اورنگ زیب سے ان کی ملاقات وغیرہ کا ذکر کسی کتاب میں

Marfat.com

ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ سید عبدالحی حسنی نزہتہ الخواطر میں لکھتے ہیں کہ ان کو مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۵ ارجب ۱۳۶۲ھ/۱۸ جولائی ۱۹۴۳ء) نے بتایا کہ شیخ محمد اعلیٰ عہد عالم گیری میں تھانہ بھون کے عہدۂ قضا پر مامور تھے ❶۔

بہر حال اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں ہوسکے اور نہ تاریخ ولادت و وفات کا علم ہوسکا ہے۔

۱۱۔ میر محمد افضل دہلوی

میر محمد افضل دہلوی ثم الہ آبادی، ایک فاضل بزرگ تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تحصیل علوم کی، یہاں تک کہ اکثر علوم میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ حدیث، فقہ، کلام اور دیگر علوم میں ماہر تھے۔ زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز تھے۔ قانع اور مستغنی المزاج تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ان کا ایک دیوان بھی ہے جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ شعر انہی کا ہے:

دیدیم بے تو جلوۂ باغ و بہار حیف گل خندہ زد بہ بیکسی ماہزار حیف

میر محمد افضل دہلوی نے ۱۲ ربیع الاول ۱۱۵۰ھ یا ۱۱۵۱ھ/ ۲۹ جون ۱۷۳۷ء یا ۱۷۳۸ء میں داعی اجل کو لبیک کہا ❷۔

۱۲۔ قاضی محمد اکرم سندھی

قاضی محمد اکرم نصر پوری سندھی، اپنے زمانے کے عالم کبیر اور محدث و فقیہ تھے۔ ان کے والد قاضی عبدالرحمٰن تھے، جو جید عالم اور ممتاز فاضل تھے اور شاہ جہان کے عہد سے لے کر اورنگ زیب عالم گیر تک کی تمام مدت حکومت میں حرمین شریفین کے نذرانوں کے متولی رہے تھے۔ اس خدمت کے صلے میں انھیں ایک بڑی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ قاضی محمد اکرم ان کے فرزند کبیر تھے، جو اپنے وقت کے فاضل اور نامور عالم تھے۔ حدیث، فقہ اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ اصول حدیث پر بالخصوص گہری نظر تھی۔ اس موضوع پر ایک کتاب بھی تصنیف کی۔ اس کتاب کا نام "امعان النظر فی توضیح نخبۃ الفکر" ہے۔ یہ بڑی ضخیم کتاب تھی، جو نخبۃ الفکر کی مفصل شرح تھی۔ سید عبدالحیی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب مولانا عبدالحی بن عبدالحلیم انصاری لکھنوی کے کتب خانے میں دیکھی ہے۔

قاضی محمد اکرم کے ایک بیٹے "میاں مدنی" کے نام سے معروف تھے۔ انھوں میاں مدنی اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ بڑے نیک اور متقی عالم تھے ❸۔

❶ نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۲۷۸۔ مقدمہ کشاف اصطلاحات الفنون مطبوعہ مصر۔
❷ ریاض الشعراء (از علی قلی خان داغستانی) نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۰۔
❸ تحفۃ الکرام ص ۵۳۹، ۵۴۰۔ نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۲۔

Marfat.com

۱۳۔ قاضی محمد اکرم دہلوی

قاضی محمد اکرم دہلوی، عالم کبیر، شیخ وقت اور کبار فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں دارالحکومت دہلی میں مفتی عسا کر تھے اور یہ عہدہ آبا و اجداد سے ان کے خاندان میں چلا آ رہا تھا۔ طویل مدت تک اس منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر عالم گیر نے ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء میں ان کو اورنگ آباد کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء میں عالم گیر نے قاضی اکبر کی مسند پر قاضی عبداللہ بن محمد شریف گجراتی کو متمکن کیا تھا۔ جو بعد میں صدارت کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء میں مرض فالج سے ان کا انتقال ہوا تو قاضی اکبر کے منصب پر قاضی محمد اکرم دہلوی کو مامور کیا گیا۔ پھر عمر بھر یہ اس منصب پر فائز رہے۔ فقہ کے بے مثال عالم اور بہترین عادات و اطوار کے حامل تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے دو سال قبل ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔ بادشاہ ان کے فضل و کمال اور علم و دیانت سے بہت متاثر تھا۔ ان کی وفات کا اسے شدید افسوس تھا اور وہ ان کے نام کے ساتھ ہمیشہ ''مرحوم'' کا لفظ استعمال کرتا تھا❶۔

۱۴۔ مفتی محمد امان گوپاموی

مفتی محمد امان بن ابوسعید بن علیم اللہ بن عبیداللہ شہابی صدیقی گوپاموی کا شمار فقہائے عصر اور علمائے اعلام میں ہوتا تھا۔ گوپامئو میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی مفتی ابوسعید گوپاموی (۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) سے جو (نامور عالم، معروف فقیہ اور مفتی وقت تھے) تحصیل علم کی۔ دیگر علمائے کرام سے بھی استفادہ کیا، والد کی وفات کے بعد منصب افتا پر متعین ہوئے۔ ہمیشہ درس و افادہ میں مصروف رہتے۔ ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں اس جہان فانی سے رخصت ہوئے❷۔

۱۵۔ قاضی محمد امیر فاروقی گوپاموی

قاضی محمد امیر بن قاضی محمد مبارک فاروقی گوپاموی ہندوستان کے صوبہ یوپی کے قبصہ گوپامئو میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ علوم مروجہ کی تحصیل اپنے والد مکرم قاضی مبارک گوپاموی (متوفی ۵ شوال ۱۱۶۲ھ/ ۷ ستمبر ۱۷۴۹ء) سے کی اور فقہ و اصول اور دیگر علوم متداولہ میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ بارھویں صدی ہجری کے یہ ہندی عالم و فقیہ تھے اور فضل و صلاح سے بہرہ مند تھے۔ اپنے والد محترم کی طرح اخلاق فاضلہ کے حامل

---

❶ مآثر عالم گیری ص ۳۶۹ (اردو)۔ نزہتہ الخواطر ج ۶، صفحہ ۲۸۲، ۲۸۳۔

❷ نزہتہ الخواطر ج ۶، ص ۲۸۳۔

Marfat.com

اور بہترین اوصاف سے متصف تھے۔ گوپامئو کے منصب قضا پر متمکن تھے اور ساتھ ہی تدریس و تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات اور تصانیف کا علم نہیں ہو سکا❶۔

۱۶۔ مولانا محمد امین کشمیری

خطۂ کشمیر کے جلیل القدر علما میں سے مولانا محمد امین کافی بلدیمری کشمیری بڑی شہرت کے مالک تھے۔ ان کا مولد و منشا کشمیر ہے۔ ارض کشمیر کے نامور علما سے جن میں مولانا ابوالقاسم کشمیری اور ان کے والد مولانا جمال الدین کشمیری شامل ہیں، علم حاصل کیا اور وہاں کے علمائے مدققین اور فقہائے محققین میں گردانے گئے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف ان کا اصل مشغلہ تھا۔ انھوں نے اکثر کتب متداولہ مثلاً شرح تہذیب وغیرہ پر شروح و حواشی لکھے اور علم فرائض سے متعلق نظم و نثر میں مفصل رسائل تصنیف کیے۔ متعدد علمائے کشمیر مثلاً مولانا عنایت اللہ شال اور ملا محمد محسن وغیرہ نے ان سے علم حاصل کیا۔ توکل و قناعت کی دولت سے مالا مال تھے۔ تدریس اور علمی مباحث میں مشغول رہتے تھے۔

مولانا محمد امین کشمیری کو عمر کے آخری دور میں ایک دردناک حادثہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ ان کی دو بیٹیاں تھیں، عمر بلوغت کو پہنچیں تو ان کی شادی کی تیاری شروع کی اور جہیز وغیرہ بنانے کی غرض سے ہندوستان گئے۔ جب دہلی پہنچے تو دونوں لڑکیوں نے جو اپنے وطن کشمیر ہی میں تھیں، غلطی سے دوا کے بجائے زہر کھا لیا اور جاں بحق ہو گئیں۔ مولانا کو خواب میں معلوم ہوا کہ آپ کی مہم انجام کو پہنچ گئی ہے، اب آپ واپس کشمیر جا کر درس و تدریس اور اشاعت علوم میں مشغول ہو جائیے۔ چنانچہ آپ کشمیر آ گئے اور درس و افادہ طلبا میں مشغول ہو گئے۔

مولانا محمد امین شاعر بھی تھے۔ انھوں نے کئی علمی مضامین کو اشعار کے قالب میں ڈھالا۔ حاضر جواب اور شگفتہ مزاج عالم تھے۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ کشمیر کا ایک قاضی جس کا نام قاضی عبدالکریم تھا، ہندوستان کے سفر پر گیا۔ گھوم پھر کر خاصی مدت کے بعد واپس آیا تو مولانا محمد امین اس کی ملاقات کو گئے۔ وہ مولانا ممدوح کو جانتا تھا، مگر چوں کہ خاصی مدت کشمیر سے باہر رہا تھا، اس لیے آپ کو پہچان نہ سکا۔ نام پوچھنے کے بعد پہچانا تو بہت معذرت کی اور کہا کہ ملاقات طویل عرصے کے بعد ہوئی ہے اس لیے افسوس ہے جلدی سے پہچاننے میں دقت پیش آئی۔

مولانا نے قاضی عبدالکریم کو طنز کرتے ہوئے فوراً جواب دیا: بے شک آپ معذور ہیں۔ عربی کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ: اذا جاء القضاء عمی البصر۔

(یعنی قاضی بننے کے بعد انسان آنکھوں سے اندھا ہو جاتا ہے۔)

مولانا محمد امین کانی کشمیری، ماہ رمضان المبارک لیلۃ القدر ۱۱۰۹ھ/ ۲۹ مارچ ۱۶۹۸ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۸۴ بحوالہ تذکرۃ الانساب۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۹۱، ۱۹۲۔ روضۃ الابرار۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۲، ۱۸۳۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۳۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۵، ۲۸۶۔

Marfat.com

۱۷۔ سید محمد باقر بلگرامی

سید محمد باقر حسینی واسطی بلگرامی، سید محمد صغریٰ (متوفی ۱۴ شعبان ۶۴۵ھ/ ۱۵ دسمبر ۱۲۴۷ء) کی اولاد سے تھے۔ والد کا اسم گرامی سید داور بخش تھا۔ اپنے عصر کے عالم وفقیہ تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ سید فرید الدین بلگرامی (متوفی تقریباً ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء) اور سید نور اللہ بلگرامی (متوفی ۱۳ شعبان ۱۱۱۳ھ/ ۲ جنوری ۱۷۰۲ء) سے علوم متداولہ کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں سید عبد الجلیل بلگرامی (متوفی ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ/ ۱۸ دسمبر ۱۷۲۵ء) سے منسلک ہو گئے۔ ان سے خوب استفادہ کیا اور تمام علوم سے بہرہ ور ہوئے۔ عربی ادب اور حسن خط میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔ عمر بھر درس و تدریس میں سرگرم رہے اور بے شمار لوگوں کو مستفید فرمایا۔ ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں اس دنیائے ناپائدار سے رخت سفر باندھا اور بلگرام میں مدفون ہوئے[1]۔

۱۸۔ شیخ محمد باقر سندھی

شیخ محمد باقر سندھی، اخوند عبد الواسع کے بیٹے اور دیار سندھ کے مشہور بزرگ شیخ حمزہ واعظ کی اولاد سے تھے۔ فقہ کے جید عالم تھے۔ گوشہ گیر قسم کے صاحب علم تھے اور شہرت و ناموری کو بالکل پسند نہ کرتے تھے۔ علم فقہ میں اس قدر دسترس حاصل تھی کہ اس میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ حافظہ بے حد قوی پایا تھا اور ذہانت میں سب سے تیز تھے۔ چھوٹے بڑے سب ان کی تکریم میں پیش پیش رہتے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ کم وبیش اسّی (۸۰) برس کی عمر میں انتقال فرمایا[2]۔

۱۹۔ مولانا محمد جمیل جون پوری

بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر ہندی علما اور نامور فقہا میں سے ایک بزرگ مولانا محمد جمیل صدیقی بروتوی جون پوری تھے۔ ان کے والد کا اسم گرامی مفتی عبد الجلیل اور جد امجد کا نام نامی مفتی شمس الدین تھا۔ مفتی عبد الجلیل صدیقی جون پوری اپنے وقت کے وہ عالم اور فقیہ و زاہد تھے، جنھوں نے تمام عمر درس و تدریس میں صرف کر دی اور ۸ شوال ۱۰۷۶ھ/ ۳ اپریل ۱۶۶۶ء کو جون پور میں وفات پائی۔ جد امجد مفتی شمس الدین صدیقی جون پوری بھی عالم کبیر اور فاضل نبیل تھے۔ جون پور کی مسند افتا پر فائز تھے اور درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے۔ ۱۰۴۷ھ/ ۱۶۳۷ء کو جون پور میں فوت ہوئے اور اپنے مدرسے ہی میں دفن کیے گئے۔ ان کے آبا و اجداد

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۳۶، ۲۳۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۸۹۔

[2] تحفۃ الکرام ص ~~۱۹۸، ۱۹۹~~۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۸۹۔

Marfat.com

کا شمار بھی مشاہیر علمائے عصر میں ہوتا تھا۔

مولانا محمد جمیل صدیقی ماہ ذی قعدہ ۱۰۵۵ھ/ دسمبر ۱۶۴۵ء کو جون پور میں پیدا ہوئے اور علم و فضل کی فضا میں پرورش پائی۔ ان کی ولادت کے زمانے میں خود ان کے گھر میں علم کی شمع فروزاں تھی اور اس عہد کے جون پور کو اصحاب کمال اور ارباب فضیلت کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس سے خوب استفادہ کیا اور متعدد فضلا سے تحصیل علم کی۔ شرح وقایہ اور مختصر معانی تک درسی کتابیں صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ/ ۹ دسمبر ۱۶۷۳ء) سے پڑھیں اور باقی علوم متداولہ کی تکمیل شیخ نور الدین جعفر بن عزیز اللہ جون پوری سے کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند تدریس سنبھالی اور درس وافادہ کا غلغلہ بلند کیا۔

مولانا محمد جمیل صدیقی جون پوری کا شمار بارھویں صدی ہجری کے برصغیر کے رفیع المنزلت فقہا میں ہوتا تھا اور وہ ایک ذی مرتبت خاندان کے لائق فرزند تھے۔ ذہن نہایت رسا پایا تھا، قوت ادراک بے حد تیز تھی، اور فراست میں بہ درجۂ غایت شہرت رکھتے تھے، جودتِ طبع کے مالک تھے، پاکیزہ فکر عالم اور کئی خالص فنی کتابوں کے مصنف تھے۔ معانی و بیان کی معروف درسی کتاب ''مطول'' اور علم نحو کی شرح جامی کے مبحث عطف پر حواشی تحریر کیے۔ علاوہ ازیں علم فقہ پر ایک رسالہ لکھا اور تصوف کے بارے میں ''تنبیہات جمیلی'' کے نام سے ایک کتاب سپرد قلم کی۔ فقہائے برصغیر کی اس خوش بخت جماعت میں شامل تھے جنھوں نے ''فتاویٰ عالم گیری'' کی تدوین کا عظیم اور یادگار فقہی کارنامہ انجام دیا۔

مولانا محمد جمیل جون پوری کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع تھا۔ گنج ارشدی کے مؤلف شیخ غلام رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۵ صفر ۱۱۶۷ھ) بھی ان کے حلقہ درس میں شامل رہے۔ انھوں نے ان سے یہ کتابیں پڑھیں۔ مختصر المعانی اور مطول مع حاشیہ سید شریف ❶ علامہ سعد الدین تفتازانی کی شرح العقائد مع حاشیہ خیالی، شرح المطالع مع حاشیہ سید، حسامی، نور الانوار کے کچھ اجزا، شرح وقایہ، ہدایۃ الفقہ، شیخ محمود جون پوری کا رسالہ الجبر والاختیار اور شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کی مشہور تصنیف رشیدیہ۔

بحر زخار کی روایت کے مطابق شیخ نظام الدین اورنگ آبادی (متوفی ۲ ذیقعدہ ۱۱۴۴ھ/ ۱۶ اپریل ۱۷۳۲ء) شیخ نور الہدیٰ ایٹھوی (متوفی ۱۳ رجب ۱۱۳۳ھ/ ۲۹ اپریل ۱۷۲۱ء) سید حسن رسول نما (متوفی ۲۲ شعبان ۱۱۰۳/ ۲۹ اپریل ۱۶۹۲ء) اور بہت سے حضرات نے ان سے علم حاصل کیا۔ علاوہ ازیں مولانا نور الدین جعفر گنت پوری جون پوری (متوفی ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء) کا نام بھی تذکرہ نویسوں نے ان کے تلامذہ میں لکھا ہے، انھیں مولانا نور الدین جعفر غازی پوری بھی کہا جاتا ہے کیونکہ گنت پور اعمال غازی پور میں واقع تھا۔

مولانا محمد جمیل کی ذہانت اور جودتِ طبع کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ جس زمانے میں وہ مولانا نور الدین جون پوری کے حلقۂ درس میں شریک تھے اور اصول فقہ کی کتاب ''نور الانوار'' پڑھ رہے تھے،

❶ سید شریف سے علی بن محمد بن علی جرجانی (متوفی ۶ ربیع الثانی ۸۱۶ھ/ ۱۳ جولائی ۱۵۱۰ء) مراد ہیں۔

Marfat.com

کتاب ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ استاد نے دہلی کا قصد کیا اور لائق شاگرد نے سلسلۂ درس کے منقطع ہونے پر اظہار افسوس کیا تو استاد نے فرمایا اب تمھیں مزید درس کی ضرورت نہیں رہی، مطالعہ کافی ہے۔

ان کی ذہانت کا ایک اور واقعہ بھی بڑا ہی تعجب خیز ہے، وہ یہ کہ ایک مرتبہ علم معانی و بدیع کی کتاب ''مطول'' کی ایک دقیق عبارت کا مطالعہ کر کے اپنے نامور استاد مولانا نورالدین کی خدمت میں گئے اور دوران درس اس عبارت کا وضاحت سے مطلب بیان کیا۔ استاد نے بڑی توجہ سے سنا اور شاگرد کی تحسین کرتے ہوئے فرمایا، اس عبارت کا مطلب میں نے آج تمھاری تشریح سے سمجھا۔

لائق شاگرد کی بے پناہ ذہانت کی وجہ سے ان کے اساتذہ خوش ہو کر انھیں ملا جلال اور ملا شریف کہا کرتے تھے۔

مولانا محمد جمیل جون پوری جب دہلی گئے اور مختلف اہل علم سے ملے اور ان سے بعض علمی مباحث پر گفتگو ہوئی تو وہ حیران رہ گئے اور تمام علمائے دہلی پر ان کی علمی ہیبت طاری ہوگئی۔ اس ضمن میں مشاہیر جون پر کے الفاظ قابل ملاحظہ ہیں۔

> آں چناں جودت ذہن بود کہ اگر یک بار متن کسے کتاب بیند حاجت حاشیہ نہ افتد۔ ہر مطالب دقیق کہ پیش آید فوراً بہ قوت ذہن حل گردد، بارہا استادش فرمودے کہ ملا جمیل رامماثل علامہ میر شریف و ملا جلال گفتن بے جا نیست۔ وقتیکہ ملا جمیل وارد دہلی شدہ شہرۂ فضیلتش چناں شائع گردیدہ وہیبتش طاری شد کہ بہر درس کہ رسیدے درس موقوف گشتے۔ روزے در مدرسۂ ملا لطف اللہ دہلوی رفت، در یک سطر ہفت یا ہشت شبہات پیش نمود۔ ملا لطف اللہ از جوابش عاجز آمدند❶۔
>
> (یعنی قوت ذہن اس قدر تیز تھی کہ ایک مرتبہ کسی کتاب کا متن دیکھ لیتے تو حاشیے کی طرف مراجعت کی ضرورت نہ رہتی، جو بھی دقیق اور پیچیدہ مباحث سامنے آتے فوراً قوت ذہانت سے ان کی گرہیں کھل جاتیں۔ ان کے استاد اکثر فرماتے کہ ملا جمیل کو علامہ میر شریف ❷ اور ملا جلال ❸ کے مماثل قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ملا جمیل جب دہلی گئے تو

❶ مشاہیر جون پور، ص ۸۸۔

❷ علامہ میر سید شریف جرجانی کا نام علی بن محمد بن علی تھا۔ ۲۲ شعبان ۷۴۰ھ/۲۲ فروری ۱۳۴۰ء کو جرجان میں پیدا ہوئے۔ بہت بڑے عالم و فاضل اور جلیل القدر بزرگ تھے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، ہیئت اور دیگر علوم پر عبور رکھتے تھے۔ متعدد کتابوں کے شروح اور حواشی لکھے۔ ان کی کئی تصانیف عربی علوم کے مدارس میں باقاعدہ پڑھائی جاتی ہیں۔ ۶ ربیع الثانی ۸۱۶ھ/ ۶ جولائی ۱۴۱۳ء کو شیراز میں فوت ہوئے۔

❸ ملا جلال الدین دوانی مراد ہیں، جو ۸۳۰ھ (۱۴۲۷ء) میں صوبہ شیراز کے ضلع گازرون میں =

Marfat.com

ان کی فضیلت علمی کا شہرہ اس قدر پھیلا اور وہاں کے علما پر اتنا رعب طاری ہوا کہ جس حلقۂ درس میں چلے جاتے سلسلۂ درس موقوف ہو جاتا۔ ایک روز ملا لطف اللہ دہلوی ❶ کے درس میں گئے تو (زیر درس کتاب کی) ایک سطر میں سات یا آٹھ شبہات وارد کیے اور ملا لطف اللہ ان کا جواب دینے سے عاجز آ گئے۔)

بہر حال مولانا محمد جمیل بہت بڑے عالم تھے اور درس و تدریس ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ جون پور کے محلّہ مفتی میں ایک وسیع اور پختہ خانقاہ اور ایک مدرسہ تعمیر کرایا، جس میں خود درس دیتے اور لوگوں کی باطنی اصلاح کرتے تھے۔ لیکن اب یہ گہوارۂ علم اور مرکز روحانیت دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا ہے ''مشاہیر جون پور'' کے مصنف دردناک الفاظ میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

چوں زمانہ دگرگوں شد، اکنوں آثارے ہم باقی نہ ماند، جزایں کہ برایں زمین کہ پیش دروازہ شاہ طفیل حسین است، کشت کاری می شود و چشم بصیرت مشاہدۂ نہجار دنیا می کند ❷۔

(زمانہ انقلاب کی اس قدر تیز لہروں کی زد میں آ گیا ہے اور رنگ دہر اس طرح بدل گیا ہے کہ اب اس (درس گاہ اور خانقاہ) کے کوئی آثار باقی نہیں رہے، سوائے اس کے کہ دروازہ شاہ طفیل حسین کے سامنے کی زمین پر کاشت کاری ہوتی ہے، اور چشم بصیرت اس دنیائے ناہنجار کی عبرت ناکیوں کا مشاہدہ کرتی ہے۔)

یہ بھی صدیوں پہلے کی بات ہے اب معلوم نہیں کیا حال ہوگا۔

مولانا محمد جمیل جون پوری جہاں ایک رفیع القدر عالم دین اور بہترین مدرس تھے، وہاں ایک نامور صوفی اور صاحب طریقت بزرگ بھی تھے اور لوگوں کے قلب و باطن کی اصلاح کرتے تھے۔ دیوان عبدالرشید سے باقاعدہ بیعت تھے۔ اس کا ذکر صاحب مشاہیر جون پوران الفاظ میں کرتے ہیں:

علاوہ فضائل صوری صاحب کمالات باطنی ہم بود و بیعت وارادت از دیوان عبدالرشید آوردہ ❸

= ''دوان'' نام کی ایک چھوٹی سی بستی میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل کے اس مرتبہ بلند کو پہنچے کہ ''محقق دوانی'' کہلائے۔ علوم و فنون کی کئی کتابوں کے مصنف اور محشی تھے۔ ان کی بعض تصنیفات درس نظامیہ میں داخل ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ وغیرہ تمام علوم متداولہ کے ماہر تھے۔ ۹ ربیع الثانی ۹۰۸ھ (۱۲ اکتوبر ۱۵۰۲ء) کو مرض اسہال سے انتقال کیا اور اپنے گاؤں دوان میں سپرد خاک کیے گئے۔

❶ ملا لطف اللہ دہلوی مہندس تھے اور ریاضی و ہندسے کے بہت بڑے عالم اور مشہور فاضل تھے۔ حساب کے موضوع سے متعلق نظم میں ایک کتاب لکھی اور ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء میں علامہ عاملی کی خلاصۃ الحساب کی شرح سپرد قلم کی۔ فنون ریاضیہ پر تین رسالے تصنیف کیے۔ ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء کے لگ بھگ وفات پائی۔

❷ مشاہیر جون پور، ص ۸۹۔

❸ ایضاً، ص ۸۸۔

Marfat.com

(فضائل علم کے علاوہ باطنی کمالات سے بھی مالا مال تھے اور دیوان عبدالرشید کے حلقۂ بیعت وارادت میں شامل تھے۔)

مولانا محمد جمیل نے بہ درجہ غایت علمی خدمات انجام دیں، لیکن فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب میں ان کی شمولیت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے لیے خود بادشاہ وقت اورنگ زیب عالم گیر نے ان کو منتخب کیا۔

چنانچہ مشاہیر جون پور کے مصنف لکھتے ہیں:

وقتیکہ عالم گیر بادشاہ دہلی جہت نمود فتاویٰ منسوب باسم خود، فضلائے ناموران دیار ہند طلبید، از جون پور ملا جمیل بر چیدایشاں را بخود خواستہ۔ شریک مجمع اجتماع نمود [1]۔

(جب بادشاہ دہلی اورنگ زیب نے ایک ایسا فتاویٰ مرتب کرنے کی طرف عنان توجہ مبذول کی جو اس کے نام سے منسوب ہو تو اس نے دیار ہند کے نامور فضلا کو طلب کیا۔ اس کے لیے جون پور سے ملا جمیل کو منتخب کیا اور ان سے ذاتی طور پر اس (مرتبین فتاویٰ کی) جماعت میں شریک ہونے کی درخواست کی۔)

اس ہمہ اوصاف موصوف عالم وفقیہ نے ۶ رجب ۱۱۲۳ھ/۹ اگست ۱۷۱۱ء کو ۶۸ سال کی عمر پا کر جون پور میں داعی اجل کو لبیک کہا اور مفتی محمد صادق کے قبرستان میں اپنے والد گرامی ملا عبدالجلیل صدیقی جون پوری کی قبر کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

تاریخ مشاہیر جون پور میں ان کے پسماندگان میں تین بیٹوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو غلام معین الدین عرف شاہ امیر علی، شاہ طفیل حسین اور شاہ یتیم الحسن کے ناموں سے موسوم ہیں [2]۔

۲۰۔ قاضی محمد حافظ بلگرامی

قاضی محمد حافظ بن محمد فضیل بن محمد یوسف عثمانی بلگرامی، بلگرام کے قاضی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ قاضی محمد سلیم عثمانی بلگرامی (متوفی ۲۸ محرم ۱۱۱۴ھ/۱۳ جون ۱۷۰۲ء) کے بھتیجے تھے۔ قاضی محمد سلیم بلگرام کے منصب قضا پر متعین تھے، لیکن انھوں نے یہ منصب ترک کر کے اپنے بھتیجے قاضی محمد حافظ عثمانی کو اس پر فائز کر دیا تھا۔

قاضی محمد حافظ عثمانی نے عمر کے ابتدائی دور میں قرآن مجید حفظ کیا، بعد میں جوانی کی منزل میں داخل

---

[1] مشاہیر جون پور، ص ۸۸۔

[2] مولانا محمد جمیل صدیقی جون پوری کے حالات کے لیے یہ کتابیں بھی ملاحظہ ہوں۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۹۴، ۲۹۵۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۴۱، ۷۔۴۲، ۷۔ نیز دیکھیے برصغیر میں علم فقہ ص ۲۸۲ تا ۲۸۶۔

Marfat.com

ہوئے تو کسب علم کی طرف عنان توجہ ملتفت کی۔ اس کے لیے عازم مانک پور ہوئے اور ملا محمود سے مختصرات کی تحصیل کی۔ پھر جائس کا قصد کیا اور معقول و منقول کی کتابیں شیخ غلام مصطفیٰ بن محمد اشرفی جائسی سے پڑھیں۔ بعدازاں بلگرام واپس آئے اور اپنے چچا قاضی محمد سلیم عثمانی بلگرامی کی جگہ قاضی مقرر کیے گئے۔

قاضی محمد حافظ بلگرامی اپنے دور کے معروف عالم اور جلیل القدر فقیہ تھے۔ معقولات و منقولات کے ماہر تھے۔ شگفتہ مزاج، عمدہ خصال، بلند اخلاق اور پیکر جود وسخا تھے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ بلگرام میں انتہائی عزت و تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ چھوٹے بڑے سب ان کی تعظیم بجا لانے اور سلام کرنے میں سبقت کرتے۔ خط نسخ اور خط نستعلیق میں مہارت رکھتے تھے۔ فرائض قضا انجام دینے میں کمال درجے کے دیانت دار تھے۔

قاضی محمد حافظ عثمانی بلگرامی نے ۲۲ محرم ۱۱۲۳ھ/ یکم مارچ ۱۷۱۱ء کو موہان میں وفات پائی جو اعمال لکھنؤ میں ایک مشہور شہر ہے۔ وہاں سے ان کی میت بلگرام لائی گئی اور ۲۷ محرم ۱۱۲۳ھ/ ۶ مارچ ۱۷۱۱ء کو بلگرام میں دفن کیے گئے [1]۔

۲۱۔ مولانا محمد حسین شافعی گجراتی

مولانا محمد حسین بن محمد علی بن ناخدا احمزہ گجراتی، جید عالم اور اپنے دور کے عظیم فقیہ تھے۔ مسلکاً شافعی تھے۔ خط بہت عمدہ تھا۔ سید عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں کہ انھوں نے مولانا محمد حسین گجراتی کے ہاتھ کی نہایت خوب صورت خط میں لکھی ہوئی کتاب ''المنہاج'' دیکھی جو امام نووی کی تصنیف ہے اور علم فقہ میں ہے۔ اس کی کتابت سے وہ ۲۰ جمادی الاخریٰ ۱۰۵۸ھ/ ۲ جولائی ۱۶۴۸ء کو فارغ ہوئے۔ اس وقت وہ مدرسہ نواب محمد غیاث خاں شہر ''خجستہ بنیاد'' میں مقیم تھے۔ یہ محمد شاہ غازی کے اٹھائیسویں سال جلوس کا واقعہ ہے [2]۔

۲۲۔ سید محمد حکم بریلوی

سید محمد حکم بن سید محمد بن سید علم اللہ حسنی بریلوی، حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اسلاف میں سے تھے۔ صوبہ یوپی کے شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والد گرامی سید محمد بریلوی (متوفی ۲۴ ربیع الثانی ۱۱۵۶ھ/ ۶ جون ۱۷۴۳ء) سے جو ایک عارف باللہ بزرگ تھے، فیض حاصل کیا اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے۔ پھر مختلف مقامات کے متعدد بلند مرتبہ اہل علم سے استفاضہ کیا، جن میں مندرجہ

---

1. مآثر الکرام ص ۱۱۹ تا ۱۲۱۔ تقصار جیود الاحرار، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۹۵، ۲۹۶۔
2. نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۹۹۔

Marfat.com

ذیل حضرات شامل ہیں:

شیخ سعدی بخاری جو اپنے وقت کے اکابر رجال میں سے تھے۔

شیخ عبدالاحد سرہندی (متوفی ۲۷ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ/۱۳ دسمبر ۱۷۱۵ء) جو شیخ محمد سعید سرہندی کے بیٹے اور حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور اپنے عصر کے ممتاز عالم اور محدث تھے۔

شیخ عبدالنبی السیام جوراسی نقشبندی جو بارھویں صدی ہجری کے عالم کبیر اور مشہور صوفی تھے۔

شیخ محمد یحییٰ تکمیل علم کے بعد اپنے وطن رائے بریلی واپس آئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ علامہ وقت اور وسیع المطالعہ بزرگ تھے۔ کئی عمدہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصانیف میں یہ کتابیں شامل ہیں:

تفسیر حسنی: یہ قرآن مجید کی فارسی زبان میں تفسیر ہے۔

محکم التنزیل: یہ عربی زبان میں قران مجید کی تفسیر ہے

تلخیص الصراح: یہ لغت کی کتاب ہے۔

ملخص البلاغہ: یہ علم معانی سے متعلق ہے۔

فقہ: میراث اور حساب کے موضوع پر رسائل۔

لآلی النحو: یہ علم نحو سے متعلق ایک رسالہ ہے جو اپنے بھائی سید محمد عدل بریلوی کے لیے تصنیف کیا۔

وفات:

سید محمد حکم بریلوی نے ۲۲ شوال ۱۱۵۰ھ/ یکم فروری ۱۷۳۸ء کو صرف بیالیس (۴۲) برس کی عمر پا کر انتقال کیا[۱]۔

۲۳۔ شیخ محمد حیات سندھی

برصغیر میں ارض سندھ کو ہمیشہ یہ فخر حاصل رہا ہے کہ اس میں بے شمار نامور اور جید علما پیدا ہوئے، جنھوں نے مختلف ملکوں اور علاقوں میں علم کی روشنی پھیلائی اور لاتعداد لوگوں کو معارف دینیہ اور علوم اسلامیہ سے روشناس کرایا۔ ان اولوالعزم اور خوش بخت حضرات کی وسیع فہرست میں علامہ محمد حیات سندھی کا اسم گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

حضرت ممدوح بارھویں صدی ہجری کے عالم کبیر، محدث جلیل اور فقیہ ذی مرتبت تھے۔ علم و فضل کے میدان میں انھوں نے عالم گیر شہرت پائی اور حدیث و فقہ کی تدریس و اشاعت میں بلند درجے پر فائز ہوئے۔

[۱] نزہتہ الخواطر، ج ۶، ص ۲۹۹، ۳۰۰۔ بحوالہ اعلام الہدیٰ

Marfat.com

والد کا اسم گرامی:

شیخ محمد حیات سندھی کے والد کے اسم گرامی کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے۔ علامہ المرادی اور سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے ان کا نام ابراہیم لکھا ہے۔ ❶ لیکن شیخ کے شاگرد میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے ''فلاریہ'' تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

روزے از اصل ونسب شیخ استفسار کردم، بہ خط شریف بر قطعہ کاغذے نوشتہ داد، والد الفقیر محمد حیات السندی المدنی اسمہ ملافلاریہ ❷........

یعنی ایک روز میں نے شیخ کے وطن اور نسب کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کاغذ کے ایک پرزے پر تحریر فرما کر مجھے بھیجا کہ اس فقیر محمد حیات سندھی مدنی کے والد کا نام ملا فلاریہ ہے........

حضرت نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ محمد حیات سندھی مدنی کے حالات اپنی تین مشہور کتابوں میں رقم فرمائے ہیں، ان کا ماخذ ماثرالکرام ہے، لہٰذا انھوں نے بھی ان کے والد کا نام ملا فلاریہ رقم فرمایا ہے ❸۔ ممکن ہے والدین نے ان کا نام فلاریہ رکھا ہو، اور ابراہیم انھوں نے بعد میں خود رکھ لیا ہو۔

مولد و مسکن اور ابتدائی حالات:

مولانا محمد حیات سندھی، موضع عادل پور میں پیدا ہوئے جو سرزمین سندھ کے علاقہ بھکر کے اطراف میں ایک گاؤں تھا۔ اس وقت یہ گاؤں ضلع سکھر تعلقہ گھوٹکی سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر بہ جانب جنوب واقع ہے اور اس نواح کی ایک پرانی آبادی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اس گاؤں میں دینی مدرسہ بھی قائم تھا۔ اس کے آثار اب بھی وہاں موجود ہیں ❹۔

شیخ ممدوح سندھ کے ''چاچڑ'' قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ عادل پور کے اطراف و جوانب میں ''چاچڑ'' قبیلے کے لوگوں کی بستیاں اب بھی موجود ہیں۔ حضرت شیخ کی تاریخ پیدائش اور ابتدائی حالات کا پتا نہیں چلتا، اور کسی تذکرہ نگار نے اس سلسلے میں کوئی معلومات بہم نہیں پہنچائیں۔ بہت سے عظیم آدمیوں کے ابتدائی کوائف بعض دفعہ پردۂ اخفا میں رہتے ہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ کون شخص آگے چل کر آسمان علم و فضل کا کس قدر درخشندہ ستارہ بننے والا ہے اور کتنی کثیر تعداد میں اصحاب فضل و کمال اس سے کسب ضیا اور اخذ فیض کریں گے۔ شیخ محمد

---

❶ سلک الدرر، ج ۴، ص ۳۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۰۱۔

❷ مآثر الکرام، ص ۱۴۴۔

❸ ملاحظہ ہو۔ (۱) اتحاف النبلا، ص ۴۰۳، ۴۰۴۔ (۲) ابجد العلوم ص ۸۹۴، (۳) تقصار جیود الاحرار، ص ۲۲۴۔

❹ ماہنامہ ترجمان الحدیث (لاہور) بابت فروری ۱۹۷۹ء ص ۲۳ از مولانا ارشاد الحق اثری۔

Marfat.com

حیات سندھی کا اسم گرامی بھی انہی بلند مرتبت حضرات کی فہرست میں شامل ہے، جن کے حصول علم کی ابتدائی سرگرمیوں کا راز نہیں کھلتا اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شروع شروع میں انھوں نے کن کن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، کس کس بزرگ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں، اور عالم طفولیت کی منزلیں کہاں طے کیں؟ صرف اتنا سراغ ملتا ہے کہ سن شعور کو پہنچے تو سندھ کے مردم خیز شہر ٹھٹھہ چلے گئے اور وہاں مولانا محمد معین سندھی (متوفی ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء) کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے۔ مولانا محمد معین سندھی اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور نامور فاضل تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد اور ''دراسات اللبیب'' کے مصنف شہیر تھے۔

ٹھٹھہ اس زمانے میں علما و فضلا کا مرکز تھا اور وہاں ممتاز اہل علم کے حلقہ ہائے درس جاری تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ شیخ محمد حیات سندھی نے جو اپنے عہد کے مشہور شائق علم تھے، مولانا محمد معین سندھی کے علاوہ وہاں کے بعض دیگر حضرات علما سے بھی اخذ علم کیا ہوگا، مگر تذکرہ نویس اس سلسلے میں خاموش ہیں۔

اس کے بعد شیخ سندھی نے ارض حجاز کا رخ کیا۔ سب سے پہلے حج بیت اللہ سے بہرہ اندوز ہوئے۔ پھر مدینہ منورہ پہنچے اور وہاں شیخ عبداللہ بن سالم بصری مکی (متوفی ۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۲ء) شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی (متوفی ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء) شیخ حسن بن علی العجیمی اور دیگر ارباب فضل سے مستفید ہوئے اور سند و اجازہ حاصل کیا۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں ان کے ہم وطن اور کشور سندھ کے ایک جید عالم شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھی مدنی (متوفی ۱۱۳۸ھ) کی مسند درس آراستہ تھی، محمد حیات ان کی خدمت میں گئے اور حدیث کا زیادہ تر درس انہی سے لیا۔ انہی کے فیض صحبت سے علم حدیث اور اس کے متعلقات میں تبحر حاصل کیا۔ شیخ ابوالحسن موصوف یوں تو تمام علوم مروجہ میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، لیکن حدیث نبوی میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے اور اس میں نہایت شہرت کے مالک تھے۔

مدینہ منورہ میں سکونت اور استاد کی جانشینی:

شیخ محمد حیات سندھی کے شاگرد میر سید غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۰۰ھ/ ۱۸ ستمبر ۱۷۸۶ء) نے استاذ کا ذکر بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ممدوح آغاز جوانی ہی میں حجاز تشریف لے گئے تھے، اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

شیخ محمد حیات قدس سرہ درعنفوان شباب توفیق زیارت حرمین شریفین یافت و در مدینہ منورہ توطن و تاہل گزید و کمر بہ تحصیل علم بربست، و باوجود فقدان وجہ معاش استقامت را کار فرمود و نزد علمائے حرمین معظمین، سیما شیخ ابوالحسن سندی نزیل مدینہ منورہ نور اللہ مضجعہ کسب کمالات نمود[1]۔

(شیخ محمد حیات قدہ سرہ کو اوائل شباب ہی میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کا شرف حاصل ہو گیا

[1] مآثر الکرام، ص ۱۴۵۔

Marfat.com

تھا۔ انھوں نے مدینہ شریف میں سکونت اختیار کرلی تھی، وہیں شادی کرلی تھی اور حصول علم کے لیے کمربستہ ہوگئے تھے۔ معاش کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کے باوجود، نہایت استقامت و استقلال سے رہے اور علمائے حجاز بالخصوص شیخ ابوالحسن سندھی رحمۃ اللہ علیہ مقیم مدینہ منورہ سے کسب کمال کیا۔)

تحصیل علم کے بعد مدینہ منورہ ہی کو اپنا مسکن قرار دے لیا اور استاذ محترم شیخ ابوالحسن سندھی کی وفات کے بعد ان کے جانشین مقرر ہوئے اور ان کی مسند تدریس کو رونق بخشی۔ پھر پورے چوبیس سال رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا درس دیا اور تمام زندگی اسی بابرکت علم کی خدمت میں گزار دی۔

وجلس مجلسه بعد وفاته اربعا وعشرين سنته [1]۔
(شیخ ابوالحسن سندھی کی مسند درس پر چوبیس سال متمکن رہے۔)

علمی رفعت اور تذکرہ نگاروں کا اظہار عقیدت:

تمام تذکرہ نگار شیخ محمد حیات سندھی کی علمی رفعت، فقہی عظمت، ورع و تقویٰ اور فراوانی علم وفضل کا کھلے لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں اور ان کی دقت نظر، وسعت مطالعہ اور بصیرت علمی کو مانتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اتحاف النبلا میں علامہ محمد فاخر زائر الٰہ آبادی کی ایک فارسی نظم درج کی ہے جو انھوں نے شیخ محمد حیات سندھی کی تعریف میں کہی۔ جی چاہتا ہے، وہ نظم یہاں بھی نقل کر دی جائے، تاکہ شیخ کے اوصاف گوناگوں کا اندازہ ہو سکے۔

علامہ محمد فاخر زائر الٰہ آبادی کو شیخ محمد حیات سندھی کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ وہ قابل احترام استاد کے بارے میں کہتے ہیں۔

باد بر روئے صفحۂ دوراں — محفل آرائے حلقۂ انساں
شیخ الاسلام عصر علامہ — درفنونِ حدیث فہامہ
موشگافِ دقائق ایماں — رازدان حقائق ایماں
رُستہ از حبس ربقۂ تقلید — بستہ بر اجتہاد رائے مزید
درس فرمائے مسجد نبوی — بطریق رشیق مصطفوی
آں محمد حیات بخت بلند — بحدیث نبی قوی پیوند
متع اللہ زمرۃ الاعیان — بافاداتہ الی الازمان!
سرمن خاکپائی او بادا — جان من دررضائی او بادا [2]

---

[1] نزہۃ الخواطر ج۶ ص ۳۰۱۔

[2] اتحاف النبلا ص ۴۰۴۔

Marfat.com

شیخ سندھی موصوف کے ایک اور تلمیذ رشید سید غلام علی آزاد بلگرامی اپنی مشہور فارسی تصنیف مآثر الکرام میں استاذ مکرم کا تذکرہ ان پُرعظمت الفاظ سے شروع کرتے ہیں:

از علمائے ربانیین وعظمائے محدثین است ❶۔

(شیخ محمد حیات سندھی کا شمار علمائے ربانی اور عظیم القدر محدثین کی جماعت میں ہوتا ہے۔)

اپنی ایک عربی تصنیف سبحۃ المرجان میں آزاد بلگرامی ان کے بارے میں رقم فرماتے ہیں:

هو من العلماء الربانيين وعظماء المحدثين ، هون العلم بالعمل وزان الحسن بالحلل ❷۔

(وہ عالم ربانی اور عظیم الشان محدث تھے، ان کا علم ہم آہنگ عمل تھا۔)

آزاد مزید لکھتے ہیں:

وشد حزامه على درس الحديث المحمدى وافنى عمره فى خدمة الكلام الاحمدى ، وكان يعظ الناس قبل صلاة الصبح بالمسجد المعلى ويقتحم عليه جم غفير من اهل السعادة فى ذالك الوقت المصفى وانتفع به خلق كثير من العرب والعجم وارتوى بمنهله عطاش هيم من اصحاب الهمم واقبل عليه قطان الحرمين و مصر والشام والروم والهند بالاعتقاد والانقياد يلتمسون من بركاته ويستمدونه من فيوضاته وفتح الله عليه بمواهب سنية حتى عاش فى عيشة مرضية ❸۔

(شیخ محمد حیات سندھی) درس حدیث کے لیے کمر بستہ ہو گئے اور ارشادات پیغمبر ﷺ کی خدمت میں عمر صرف کر دی۔ نماز فجر سے پہلے مسجد نبوی میں وعظ فرماتے اور اس بہترین وقت میں سعادت مند لوگ ایک ہجوم کی شکل میں ان کے ارشادات سننے کے لیے آتے اور عرب وعجم کے باشندے وسیع تعداد میں ان سے مستفید ہوتے۔ اس طرح ان کے چشمۂ صافی سے تشنگان فیض کی ایک بڑی جماعت سیراب ہوئی اور بلند ہمت حضرات نے ان سے استفادہ کیا۔ مکہ، مدینہ، مصر، شام، روم اور ہندوستان کے مختلف گوشوں سے انتہائی عقیدت و نیاز مندی کے جذبات کے ساتھ لوگ ان کی خدمت میں آتے، ان کی برکات علوم سے متمتع ہوتے اور فیوض گوناگوں سے اپنا دامن طلب بھرتے۔ اللہ تعالیٰ نے

---

❶ مآثر الکرام ص ۱۴۴۔

❷ سبحۃ المرجان ص ۹۵۔

❸ ایضاً ص ۹۵، ۹۶۔

Marfat.com

اس جلیل القدر عالم دین پر اپنے انعامات بوقلموں کے دروازے کھول دیے اور اس عظیم شخصیت نے رضائے الٰہی کے سائے میں زندگی بسر کی۔)

میر شیر علی قانع (متوفی ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء) نے تحفۃ الکرام میں شیخ محمد حیات سندھی کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے، ان کا ترجمہ یہ ہے۔

مخدوم محمد حیات سندھی کا مدینہ منورہ میں ایک مدرسہ تھا اور اس سرزمین میں وہ مقتدر عالم اور ممتاز فاضل شمار ہوتے تھے ❶۔

نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصانیف میں خاصی تفصیل سے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی مشہور تصنیف ''تقصار جیود الاحرار'' کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

شیخ محمد حیات سندھی محدث، مجتہد مدنی از علمائے ربانیین وعظمائے محدثین است ❷۔

(یعنی شیخ محمد حیات سندھی محدث، مجتہد مدنی کا اسم گرامی علمائے ربانی اور عظیم اصحاب حدیث کی فہرست میں شامل ہے۔)

شیخ عبدالقادر کوکبانی، جنھیں عرصۂ دراز تک شیخ محمد حیات سندھی کی مجالس علمی اور حلقۂ درس میں بیٹھنے کا شرف حاصل رہا، لکھتے ہیں:

میں ایک طویل مدت تک ان کی خدمت میں رہا، لیکن کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے کوئی مباح بات بھی منہ سے نکالی ہو ❸۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ شیخ عام گفتگو میں کتنے محتاط تھے، جو بات زبان سے نکالتے، اسے پہلے احتیاط کی ترازو میں اچھی طرح تول لیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصحاب حدیث اور علمائے ربانیین کا ہمیشہ یہی شیوہ رہا ہے۔ وہ امور مباح سے بھی دامن کشاں رہتے ہیں، نہ زبان کو غیر شرعی بات سے ملوث کرتے ہیں، نہ نوک قلم کو۔!

مولوی رحمان علی تذکرہ علمائے ہند میں ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شیخ محمد حیات سندھی از علمائے ربانیین وعظمائے محدثین عالم باعمل بود، نام پدرش ملا فلاریہ از قبیلۂ چاچڑ ساکن اطراف عادل پور محروسہ ملک سندھ، شیخ محمد حیات از وطن خود بحرمین شریفین در عنفوان شباب رفتہ مناسک بیت حرام دریافت و بہ مدینہ طیبہ رخت اقامت انداخت، وسوائے توکل اسباب معیشت ذخیرہ نہ ساخت و بہماں حالت موجودہ بہ تحصیل علوم پرداخت و باز شاگردی مولانا ابوالحسن سندھی مقیم مدینہ سکینہ برداشت و علم علوم درسیہ بمیامن او برافراخت، واجازت حدیث از مولانا عبداللہ بن سالم بصری یافت وتمام سرمایۂ عمر خود

❶ تحفۃ الکرام، ص ۱۲۷۔

❷ تقصار جیود الاحرار، ص ۲۲۴۔

❸ ماہ نامہ ''الرحیم'' (حیدر آباد سندھ) بابت جولائی ۱۹۶۳ء ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' از مخدوم امیر احمد۔

Marfat.com

بہ درس حدیث نبوی در باخت ❶۔

(شیخ محمد حیات سندھی باعمل عالم دین تھے، ان کا شمار علمائے ربانی اور عظیم القدر محدثین میں ہوتا ہے۔ ان کے والد کا نام ملا فلاریہ تھا۔ چاچڑ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ حج کی غرض سے عین عالم جوانی میں اپنے وطن سے حرمین شریفین گئے، مناسک حج ادا کیے اور پھر مدینہ منورہ میں اقامت گزین ہو گئے۔ توکل علی اللہ کے سوا کوئی ذریعہ معیشت اور ذخیرۂ مال نہ رکھتے تھے۔ اسی حالت غربت میں تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ مولانا ابوالحسن سندھی مقیم مدینہ منورہ کی شاگردی اختیار کی اور علوم درسیہ ان سے پڑھے۔ اجازۂ حدیث مولانا عبداللہ بن سالم بصری سے لیا، پھر خود درس حدیث کی مسند آراستہ کی اور تمام عمر اس خدمت میں بسر کر دی۔)

سید عبدالحی حسنی لکھنوی ان کے حالات کا آغاز بڑے پُر احترام الفاظ سے کرتے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

الشیخ الامام الکبیر المحدث محمد حیات بن ابراھیم السندی المدنی، احد العلماء المشھورین ❷۔

(شیخ، امام، عالم کبیر، محدث محمد حیات بن ابراہیم سندھی مدنی، شہرۂ آفاق علما میں سے تھے۔)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی معروف تصنیف ''تذکرہ'' میں شیخ محمد حیات سندھی کا نام نامی بارھویں صدی ہجری کے ان اکابر و مشاہیر علما و فضلا کی فہرست میں درج فرمایا ہے، جو ''بلاد عربیہ و عثمانیہ'' میں خدمات دینیہ انجام دے رہے تھے۔ لکھتے ہیں:

اکثر مشاہیر علم و ارشاد، جیسے شیخ ابراہیم کورانی، محمد بن احمد سفارینی النجدی، سید عبدالقادر کوکبانی، شیخ عمر فاسی تیونسی، شیخ سالم بصری، امیر محمد بن اسماعیل یمانی، سید عبدالخالق زبیدی، علامی خانی صاحب ایقاظ، شیخ محمد حیات سندھی المدنی وغیرہم شاہ راہِ عام سے اپنی راہ الگ رکھتے تھے اور حقیقت مستورہ کے شناسا و حق آگاہ تھے ❸۔

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم اپنی تصنیف ''رود کوثر'' میں شیخ محمد حیات سندھی کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

جو علما تکمیل تعلیم کے بعد حجاز میں مقیم ہو گئے تھے، ان میں سندھ کے کئی فاضل تھے، جن میں مولانا محمد حیات سندھی مدنی سب سے ممتاز تھے۔ وہ عادل پور (سندھ) کے قریب پیدا ہوئے۔ عنفوان شباب ہی میں حج کے لیے گئے اور حج کے بعد مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔ مولانا ابوالحسن سندھی مدینہ منورہ اور مولانا عبداللہ سالم بصری سے تکمیل تعلیم کی اور اپنے آپ کو درس حدیث کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے سب سے نامور محدثوں میں ہوتا تھا۔ آپ مسجد نبوی میں صبح کی نماز سے قبل وعظ کہتے اور ایک جم غفیر آپ کے ارشادات سننے کے لیے حاضر ہوتا ❹۔

❶ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۸۶۔
❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۰۔
❸ تذکرہ، ص ۳۹۷۔
❹ رود کوثر، ص ۶۱۵۔

Marfat.com

تصانیف:

شیخ محمد حیات سندھی جہاں بہت بڑے استاذ حدیث تھے، وہاں متعدد علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے نامور محدث، جلیل القدر فقیہ، عظیم محقق اور عالی دماغ عالم تھے۔ ذیل میں ان کی تصانیف کا تعارف کرایا جاتا ہے:

۱۔ الایقاف علی سبب الاختلاف: یہ ایک رسالہ ہے جو ''تقلید اور عمل بالحدیث'' کے اہم موضوع پر مشتمل ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے یہ صراحت کی ہے کہ صحابہ کرام، تابعین عظام، ائمہ مجتہدین اور ان کے تلامذہ عالی مقام کے درمیان فقہی نوعیت کے اختلافات کیوں کر ابھرے، ان اختلافات کی اصل حقیقت کیا ہے اور کن وجوہ واسباب کی بنا پر بعض مسائل میں وہ مختلف الرائے ہوئے، نیز اس رسالے میں انھوں نے صحابہ کرام کے طریق استدلال، اسلوب استنباط اور تخریج مسائل کی بھی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ ہمیشہ کتاب وسنت ہی کو مدار عمل ٹھہراتے تھے۔ اگر انھیں اپنے قول وعمل کے خلاف کوئی حدیث پہنچ جاتی تو اسی وقت اس سے رجوع فرما لیتے۔

یہ رسالہ اپنے موضوع میں نہایت عمدہ علمی مباحث پر محیط ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ محمد حیات سندھی تقلید کے قائل نہ تھے، بلکہ براہ راست کتاب وسنت کو بنیاد عمل قرار دیتے تھے، اور اس کی روشنی میں اجتہاد کو صحیح سمجھتے تھے۔

اس مفید رسالے کی طباعت کی طرف سب سے پہلے برصغیر کے مشہور عالم ومحقق حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم (ولادت ۱۷ محرم ۱۲۵۶ھ وفات ۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ/ ۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء) نے عنان توجہ منعطف کی۔ اس کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا اور ضروری حواشی لکھے۔ پھر اپنے ماہ نامہ ''اشاعۃ السنۃ'' کی جلد اول (بابت ماہ رجب ۱۲۹۸ھ۔ جنوری ۱۸۸۱ء) ضمیمہ نمبر ۴ص ۲۴ تا ۴۳) میں شائع کیا۔

اس کے بعد یہی ترجمہ زبان کی کچھ اصلاح اور صحت الفاظ کے ساتھ حضرت الاستاذ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی سعی وکوشش سے ۱۳۷۹ھ (۱۹۵۹ء) میں مکتبہ سلفیہ لاہور کی طرف سے طبع ہوا۔ مکتبہ سلفیہ کی اشاعت میں یہ خوبی ہے کہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف صاحب نے ابتدا میں شیخ محمد حیات سندھی اور مولانا محمد حسین بٹالوی کے مختصر مگر ضروری حالات بھی تحریر فرما دیے ہیں، جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

تیسری مرتبہ یہ رسالہ ہندوستان کے ایک فاضل حضرت مولانا عبدالجلیل سامرودی مرحوم کی سعی جمیلہ سے دہلی میں شائع ہوا۔ اس پر سال طباعت مرقوم نہیں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ''رفع الملام عن ائمۃ الاعلام'' کے نام سے ایک رسالہ سپرد قلم کیا تھا، جس میں امام نے تفصیل اور جامعیت سے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ ان کے تلمیذ رشید امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی مشہور تصنیف ''اعلام الموقعین'' میں اس اہم موضوع کی عمدہ انداز سے وضاحت کی ہے۔ شیخ محمد حیات

Marfat.com

سندھی نے "الایقاف علی سبب الاختلاف" میں ان دونوں بزرگوں سے استفادہ کیا ہے۔

شیخ محمد حیات سندھی کے ہم عصر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" میں اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ نہایت عمدگی سے اس کے متعلقہ پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" کے المبحث السابع میں بھی اس پر مدلل اور مبرہن بحث فرمائی ہے۔ اہل علم کے لیے اس موضوع سے متعلق ان تمام کتابوں اور بحثوں کا مطالعہ دلچسپی اور اضافہ معلومات کا باعث ہوگا۔

۲۔ تحفة الانام فی العمل بحدیث النبی علیه الصلوٰة والسلام: حدیث وسنت کو مدار عمل ٹھہرانے کے موضوع سے متعلق یہ رسالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اختصار کے باوجود اس میں نہایت بنیادی باتیں معرض بیان میں آگئی ہیں۔ اس کی عمدگی کا ثبوت اس بات سے مل سکتا ہے کہ علامہ صالح فلانی کی معروف کتاب "ایقاظ همم اولی الابصار" کے بہت سے مندرجات اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ حضرت نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے بھی "الجنة فی الاسوة الحسنته بالسنة" میں اس رسالے سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح صاحب سبل السلام علامہ امیر محمد بن اسماعیل یمانی کی تصنیف "ارشاد النقاد الی تیسیر الاجتهاد" کے بہت سے مشمولات اسی رسالے سے مقتبس ہیں۔ یہ رسالہ اس درجہ اہمیت کا حامل ہے کہ شیخ محمد حیات سندھی کے شاگرد رشید حضرت مرزا مظہر جان جاناں (متوفی ۱۰ محرام ۱۱۹۵ھ/۶ جنوری ۱۷۸۱ء) نے اپنے ایک فارسی مکتوب میں اس کی تلخیص کر دی ہے [1]۔

تحفۃ الانام میں شیخ محمد حیات سندھی نے یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہر حال میں ضروری ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کی اتباع کرنا اور اس کے قول وعمل کو صحیح قرار دینا گمراہی اور جہالت کی دلیل ہے۔ پھر اس میں اس اہم مسئلے پر بحث کی گئی ہے کہ بعض لوگ کسی ایک خاص امام کی تقلید کرتے ہیں اور اسی کے قول کو صحیح سمجھتے ہیں جو ان کے امام سے منقول ہو، وہ اپنے امام کے مقابلے میں بسا اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، قول صحابہ کو بھی ترک کر دیتے ہیں اور دیگر ائمہ دین کے اقوال وارشادات کی بھی پروا نہیں کرتے۔ شیخ محمد حیات سندھی نے اس قسم کے حضرات کی شدید مخالفت کی ہے اور اس رسالے میں ان کے اس طرز عمل کو خلاف شرع قرار دیا ہے۔

یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر اپنے موضوع میں بالکل واضح ہے۔ مکتبہ محمدیہ بمبئی میں یہ رسالہ موجود ہے۔ بمبئی کے ایک عالم دین حضرت مولانا عبدالجلیل سامرودی مرحوم کی کوشش سے چند سال قبل مکتبہ سلفیہ دہلی سے یہ رسالہ طبع ہو چکا ہے۔ سال طباعت مرقوم نہیں۔

۳۔ فتح الغفور فی وضع الایدی فی الصلوٰة علی الصدور: نماز میں ہاتھ کہاں

[1] ملاحظہ ہو کلمات طیبات ص ۲۸ تا ۳۰ - نیز دیکھیے فقہائے ہند ص ۱۳۰ تا ۱۴۱ -

Marfat.com

باندھنے چاہئیں؟ فقہائے کرام اس مسئلے میں مختلف آرا رکھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام سفیان ثوری رحمہم اللہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے۔ لیکن امام شافعی (علی قول المشہور) اور امام مالک سینے کے نیچے اور ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے۔ امام احمد سے ایک تیسرا قول یہ بھی منقول ہے کہ ناف کے نیچے یا اوپر سینے کے نیچے جہاں چاہے باندھ سکتا ہے۔ امام شافعی سے ایک قول سینے پر ہاتھ باندھنے کا بھی منقول ہے۔ مولانا محمد حیات سندھی بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کے حق میں ہیں، اور ان کا یہ رسالہ اسی کی تائید میں ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے دعوے کو احادیث و آثار سے بادلیل ثابت کیا ہے۔ اور ''تحت السرۃ'' (ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے) والی حدیث کے بارے میں کھل کر بحث کی ہے۔ بحث ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وبما تقدم ان الوضع الایدی علی الصدور فی الصلوٰۃ اصلا اصیلا ودلیلا جلیلا فلا ینبغی لاھل الایمان الاستنکاف عنه❶۔

یعنی گزشتہ بحث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا بنیادی اور صحیح ترین دلائل سے ثابت ہے، پس اہل ایمان کو اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔

رسالہ فتح الغفور سب سے پہلے بہت عرصہ مع ترجمے کے طبع ہوا تھا۔ اس کے بعد مولانا عبدالتواب ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش سے ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء میں ملتان سے شائع ہوا۔ لیکن اب نایاب ہے۔

۴۔ تحفة المحبين فی شرح الاربعین النوویه: یہ اربعین نووی کی شرح ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور (ہندوستان) کے کتب خانے میں موجود ہے❷۔

مولانا ارشاد الحق اثری (ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد) ایک مضمون ''علامہ محمد حیات سندھی'' میں تحریر کرتے ہیں کہ سید محب اللہ شاہ پیر آف جھنڈا کے مکتبہ علمیہ عالیہ میں بھی شیخ محمد حیات سندھی کی اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جو ۳۵ ورق پر مشتمل ہے اور شعبان ۱۳۰۲ھ کا مکتوبہ ہے❸۔

شیخ محمد حیات سندھی شیدائی سنت تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی سے انھیں بے پناہ قلبی محبت تھی۔ ''تحفة المحبين'' کا ہر مقام اس کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: لا یؤمن احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعاً لما جئت به❹۔

(تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اس کی خواہش ان امور کے تابع نہ ہو،

---

❶ فتح الغفور، ص ۸۔

❷ علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ ص ۲۸۶۔

❸ ماہ نامہ ترجمان الحدیث، لاہور، بابت ماہ مارچ ۱۹۷۹ء ص ۳۴۔

❹ مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، فصل ثانی۔

Marfat.com

جنھیں میں لایا ہوں)

اس حدیث کی شرح میں مولانا محمد حیات سندھی رقم طراز ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے تین درجے ہیں۔ ایک درجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے فرامین کو اس طرح حق سمجھے کہ اس کے بغیر صحت ایمان ممکن نہیں، اس قسم کے لوگ کثرت سے موجود ہیں، دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ کے ارشادات کو حق جانتے ہوئے ان کی مخالفت سے بچنے کی کوشش کرے، ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ کوئی حرج اور بوجھ محسوس کیے بغیر حضور ﷺ کی اطاعت کی جائے، یہاں تک کہ انسان اپنی تمام خواہشات کو آنحضرت ﷺ کے ارشادات کے تابع کردے ____ ان اوصاف کے حامل افراد کی تعداد بہت قلیل ہے، اور یہی وہ خوش بخت لوگ ہیں جنھیں محمدی کہنا چاہیے۔

اس کے بعد انتہائی سوز قلب کے ساتھ جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ لکھتے ہیں:

هذا هوا المحمدی الذی اذا ثبت عنده قول حبیبه وفعله المحکمات انشرح بهما صدره واخذ بهما باعظم الرضاء والسرور واختلط ذلك بقلبه وقالبه فلو اجتمع من بین اقطار الارض علی ان یصدوه عن قول محبوبه وفعله لما ترکهما ولم یبال بخلاف کائنا من کان۔ اه این هٰو لآءِ المحمدیون فی زماننا هذا، اللّٰهم اجعل سنة حبیبه محمد ﷺ احب الینا من ارواحنا وانفسنا۔

(انہی اوصاف حمیدہ کا حامل وہ محمدی ہے کہ جب اس کے نزدیک اس کے محبوب حقیقی ﷺ کا قول وفعل پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے تو اس کا سینہ کھل جاتا ہے اور بہ درجۂ غایت رضا ورغبت اور کامل مسرت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہوتا اور اس کی تمام کیفیات اپنے جسم و روح پر طاری کرلیتا ہے۔ اگر ساری دنیا کے لوگ بھی اس کو اس کے محبوب ﷺ کے قول و عمل سے روکنے کے لیے جمع ہو جائیں تو بھی وہ اسے نہیں چھوڑتا اور اس سلسلے میں کسی کی مخالفت کی پروا نہیں کرتا۔ آہ! یہ محمدی گروہ ہمارے اس زمانے میں کہاں ہے؟ اے اللہ! اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کی سنت مطہرہ کو ہمارے لیے، ہمارے انفس وارواح سے عزیز تر کردے۔)

یہ پورا رسالہ اسی طرح کے احوال وکوائف پر محیط ہے۔

۵۔ شرح الترغیب والترهیب لمنذری: یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اسماعیل پاشا نے اسے شیخ محمد حیات سندھی کی تصانیف میں شمار کیا ہے [1]۔

[1] دیکھیے ہدیۃ العارفین ج ۲، ص ۳۲۷۔

Marfat.com

۶۔ مختصر الزواجر عن اقتراف الکبائر: ''الزواجر'' علامہ ابن حجر مکی (متوفی ۹۷۳ھ) کی مشہور تصنیف ہے، جس میں کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے۔ تذکیر و ترہیب کے متعلق یہ بہترین کتاب ہے۔ ''الزواجر'' عرصہ ہوا، مصر میں طبع ہوئی تھی، لیکن اب کم یاب ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں محفوظ ہے، جو ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء کا مکتوبہ ہے۔ یعنی مصنف کی وفات سے صرف گیارہ سال بعد کا۔ اس پر نامور علمائے کرام کے دستخط ثبت ہیں۔ اسی ''الزواجر'' کا اختصار مذکورہ بالا نام سے شیخ محمد حیات سندھی نے کیا ہے۔ شیخ ممدوح کی اس کتاب کا ذکر اسماعیل پاشا نے بھی کیا ہے❶۔

۷۔ شرح الحکم العطائیہ: ''الحکم'' شیخ تاج الدین ابوالفضل احمد بن محمد المعروف بہ ابن عطاء اللہ الاسکندرانی الشاذلی المالکی (متوفی ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء) کی مشہور تصنیف ہے۔ تزکیۂ نفس اور اصلاح احوال کے موضوع سے متعلق یہ بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کی سات شرحوں کا ذکر کیا ہے❷، جن میں شیخ محمد بن ابراہیم بن عباد کی شرح ''غیث المواہب العلمیہ'' اور شیخ احمد بن محمد الحسنی کی ''ایقاظ الھمم'' چھپ چکی ہیں۔ ''شرح الحکم العطائیہ'' کے نام سے ''الحکم'' کی شرح شیخ محمد حیات سندھی نے لکھی ہے۔ اس شرح کا ذکر اسماعیل پاشا نے کیا ہے❸۔

۸۔ مقدمہ فی العقائد: خیرالدین زرکلی نے جو شیخ محمد حیات سندھی کا ''عالم بالحدیث'' کے الفاظ سے تذکرہ کرتے ہیں، اپنی تصنیف ''الاعلام'' میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے❹۔

۹۔ شرح اربعین للنووی: شرح الحکم العطائیہ کے ذیل میں شیخ محمد حیات سندھی کی شرح اربعین نووی کا ذکر ایضاح المکنون میں اسماعیل پاشا نے بھی کیا ہے اور لکھا ہے۔ ''محمد حیات السندی شارح الاربعین النوویہ'' نیز ڈاکٹر محمد اسحاق نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ملا علی قاری کی اربعون حدیثا فی جوامع الکلم کی شرح ہے❺۔

۱۰۔ ارشاد النقاد الی تیسیر الاجتہاد: عمر رضا کحالہ نے معجم المؤلفین میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور شیخ محمد حیات سندھی کو محدث، فقیہ، اصولی، مفسر اور صوفی کے پُرعظمت الفاظ سے یاد کیا ہے❻۔ مگر مولانا ارشاد

---

❶ ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۳۲۷۔

❷ کشف الظنون ج ۱ ص ۶۷۶،۶۷۵۔

❸ ایضاح المکنون ج ۱ ص ۴۱۳۔ ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۳۲۷۔

❹ الاعلام ج ۶ ص ۳۴۴۔

❺ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون ج ۱ ص ۴۱۳۔ نیز ملاحظہ ہو علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ ۲۸۲ (اردو ترجمہ ''کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو دی اسٹڈیز آف حدیث لٹریچر'' از ڈاکٹر محمد اسحاق)

❻ معجم المؤلفین ج ۹ ص ۲۷۵

Marfat.com

الحق اثری اس کتاب کو شیخ محمد حیات سندھی کی تصنیف قرار نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک عمر رضا کحالہ کا اس کتاب کو شیخ محمد حیات سندھی کی تصنیف کہنا وہم معلوم ہوتا ہے۔ یہ رسالہ درحقیقت امیر محمد بن اسماعیل یمانی کی تصنیف ہے جو الرسائل المنیریہ میں مطبوع ہے [1] ___ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس نام کی کتاب شیخ محمد حیات سندھی نے بھی لکھی ہو۔

۱۱۔ شرح الحکم الحدادیه: ہدیۃ العارفین میں اسماعیل پاشا نے شیخ محمد حیات سندھی کی بعض تصانیف کا ذکر کیا ہے، جن میں یہ کتاب بھی شامل ہے [2]۔

۱۲۔ رساله فی رد بدعة التعزیه: اس کا ذکر نواب صدیق حسن خاں نے بھی کیا ہے اور سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے بھی [3]۔

۱۳۔ رساله فی النهی عن عشق المرد والنسوان: نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف النبلا میں اور سید عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر میں شیخ محمد حیات سندھی کی اس تصنیف کا ذکر کیا ہے۔ نواب صاحب کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ موجود تھا۔ یہ اور شیخ کے بعض دیگر رسائل وہ مکہ معظمہ سے لائے تھے۔ چنانچہ اتحاف النبلا میں لکھتے ہیں۔ ”وبعض ایں رسائل را فقیر از مکہ معظّمہ آوردہ“۔

نواب صاحب نے اس کے چند اقتباسات بھی اتحاف النبلا میں درج کیے ہیں [4]۔

لفظ مرد، لفظ امرد کی جمع ہے۔ لغت میں امرد کی تعریف یہ ہے: الشاب طرشاربه ولم تنبت لحیته۔

یعنی وہ جوان جس کی مونچھیں پھوٹ رہی ہوں اور داڑھی نہ آ گی ہو۔

اس رسالے میں شیخ نے نوعمر لڑکوں اور غیر محرم عورتوں سے عشق و محبت قائم کرنے کی سخت مذمت کی ہے اور تفصیل سے لکھا ہے کہ یہ قطعی طور پر شریعت کے خلاف ہے۔ جو صوفیا ”عشق“ کے نام سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، قرآن و حدیث کی روشنی میں شیخ سندھی نے ان کی سخت تردید کی ہے۔ یہ رسالہ ان ”صوفیا“ کے رد میں ہے، جنھوں نے ”عشق“ کی اصطلاح قائم کر کے عوام کو غلط راہ پر لگا دیا ہے۔ مندرجات اور دلائل کے اعتبار سے یہ رسالہ نہایت عمدہ ہے۔

۱۴۔ اعفاء اللحیة: یہ رسالہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، داڑھی بڑھانے کے مسئلے پر ہے۔ اس کا خطی نسخہ حضرت پیر محب اللہ راشدی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ چھوٹے سائز کے دس صفحات پر مشتمل ہے [5]۔

---

[1] ماہنامہ ”ترجمان الحدیث“ (لاہور۔ بابت مارچ ۱۹۷۹ء ص ۳۷)

[2] ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۳۲۷۔

[3] اتحاف النبلا ص ۴۰۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۰۲۔

[4] اتحاف النبلا ص ۴۰۴۔

[5] ترجمان الحدیث، لاہور۔ بابت ماہ مارچ ۱۹۷۹ء ص ۳۸

Marfat.com

اس رسالے کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے شیخ محمد حیات سندھی نے لکھا ہے کہ انھوں نے ایک رسالے میں پڑھا کہ داڑھی بڑھانا مستحب ہے، یہ مسئلہ سنت تعبدی کے ذیل میں نہیں آتا بلکہ اس کا تعلق سنت عادیہ سے ہے، جو شخص ایک ''قبضہ'' سے کم داڑھی رکھتا ہے وہ تارک مستحب ہے۔ چنانچہ بعض دوستوں نے رفع وہم کے لیے ان سے سوال کیا کہ اس مسئلے کے بارے میں قول فیصل کیا ہے؟ اس کے جواب میں انھوں نے یہ رسالہ تحریر کیا۔

ان الفاظ کے بعد شیخ نے احادیث و آثار کی روشنی میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ اس بات کی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ داڑھی بڑھانا سنت عادیہ سے ہے۔ ان کے نزدیک داڑھی بڑھانا وجوب کے درجے میں داخل ہے۔ چنانچہ اس مسئلے میں مفصل بحث کے بعد وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں رسالے کے آخر میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

وھذا کلہ تبین ان اصل الاعفاء واجب کما اوضحنا، وتارکہ تارک واجب، یستحق مایستحقہ تارک الواجب، ولو تنزل عن الوجوب فلا اقل من انہ سنۃ مؤکدۃ، یستحق تارکہ مایستحق تارک السنۃ المؤکدۃ، ولیس بمندوب ولا من سنن کما زعم صاحب الرسالۃ بل ھو امر تعبدی شرعہ اللہ لانبیائہ وحثھم علیہ۔

یعنی جیسا کہ ہم نے واضح کر دیا ہے، اس بحث سے ثابت ہو گیا کہ داڑھی بڑھانا واجب ہے، اور اس کا تارک اسی سزا کا مستحق ہے جو تارک وجوب کے لیے مقرر ہے، اور اگر اسے وجوب سے کم درجہ دیا جائے تو بھی بہر حال سنت مؤکدہ سے کم نہیں، اور اس کا تارک اسی سزا کا مستحق ہے جو سنت مؤکدہ کے تارک کے لیے مقرر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ نہ تو مستحب ہے اور نہ عادی سنت کے ذیل میں آتا ہے، جیسا کہ مصنف رسالہ کا خیال ہے بلکہ یہ تعبدی امر ہے، جس پر عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کو حکم دیا ہے۔

اخلاق و عادات اور تدین و تقویٰ:

شیخ محمد حیات سندھی کا شمار بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر فضلا اور رفیع المرتبت ہندی علما میں ہوتا ہے، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور دیگر علوم مروجہ پر انھیں کامل عبور حاصل تھا اور مسائل شرعیہ میں گہری اور عمیق نظر رکھتے تھے۔ درس و تدریس میں منفرد اور وعظ و تبلیغ میں اپنی مثال آپ تھے۔ ورع و تقویٰ کے اونچے مرتبے پر فائز تھے۔ زہد و عبادت میں اپنے عصر کے فقید المثال عالم تھے۔ پابندیٔ شریعت میں بے نظیر تھے۔ تنہائی پسند اور خلوت نشین تھے۔ مگر قلب کی دنیا بے حد آباد اور فکر کا جہاں پُر ہجوم تھا۔ ان کے نہاں خانۂ دل میں جو عالم بس رہا تھا، اسی کی رونق میں مگن رہتے۔ گفتگو میں نہایت محتاط اور اخلاق حسنہ کا دل آویز پیکر تھے۔ ان کا

Marfat.com

معمول تھا کہ ہمیشہ پہلی صف میں شریک ہو کر باجماعت نماز ادا کرتے۔ فرائض تدریس باقاعدگی سے انجام دیتے اور طلبا سے بہ درجہ غایت شفقت سے پیش آتے۔ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں احکام شرع کو پیش نگاہ رکھتے اور امور دین کے سلسلے میں کسی کی پروانہ کرتے۔ متحمل مزاج اور عمدہ خصائل کے حامل تھے۔ قول و عمل میں کتاب و سنت کے حسین سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ تبلیغ اسلام کا اس درجے اہتمام فرماتے کہ مسجد نبوی میں نماز فجر سے قبل وعظ کہتے۔ ان کی مجلس وعظ میں بے شمار لوگ شامل ہوتے اور وہ ان کے انداز کلام اور تفہیم مسائل کے اسلوب سے بے حد متاثر ہوتے۔ اس عظیم الشان عالم دین کو یہ شرف حاصل ہے کہ اپنے استاذ گرامی شیخ ابوالحسن سندھی کبیر کی وفات کے بعد ان کی مسند درس پر پورے چوبیس برس تک مدینہ منورہ میں تدریس حدیث کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس طویل مدت میں کسی کے سامنے دست طلب دراز نہیں کیا۔ ہر حال میں اللہ پر توکل رکھا۔ ان کا ذریعۂ معاش، اور وسیلہ آمدنی صرف توکل علی اللہ تھا۔

شیخ محمد حیات سندھی اپنے بوقلموں اوصافِ فکری اور گونا گوں کمالات علمی کی بنا پر تمام معاصر علما اور عرب ممالک کے اصحاب فضل میں بے حد عزت و تکریم کے مالک تھے۔ دور دراز کی مسافت طے کر کے اور دشوار گزار منزلیں عبور کر کے ارباب کمال اور طلبائے علم ان کی خدمت میں آتے اور استفادہ کرتے۔ مستفدین و مسترشدین کے لیے ہر آن ان کے دروازے کھلے رہتے۔ حجاز کی ارض مقدس میں انھیں بے پناہ اثر و رسوخ حاصل تھا اور لوگ ان کی تحقیق و کاوش کی وسعتوں سے حد درجہ متاثر تھے۔

صحت عقیدہ کا بہ درجہ غایت اہتمام:

شیخ محمد حیات سندھی کے حالات میں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ عقیدے کے بارے میں نہایت سخت تھے۔ یا نرم الفاظ میں یوں کہیے کہ بہت ہی محتاط تھے۔ وہ اس بات کا بہ درجہ غایت اہتمام فرماتے کہ کوئی امر خلافِ سنت نہ ہو، جس سے عقیدے کے مجروح ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔

اس سلسلے کا ایک واقعہ ان کے تلمیذ رشید میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے بیان کیا ہے، جو خود انہی کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ''غلام علی'' وغیرہ قسم کے ناموں کو بھی خلافِ شرع قرار دیتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اس قسم کی اضافت صرف اللہ کی طرف ہونی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے خود اپنے اس شاگرد کے نام ''غلام علی'' کو محل اعتراض ٹھہرایا۔

اس ضمن میں آزاد کو استاد نے جو خط لکھا اور پھر انھوں نے اس کی وضاحت میں جو جواب تحریر کیا، وہ خود آزاد نے اپنی دو کتابوں، مآثر الکرام (فارسی) اور سبحۃ المرجان (عربی) میں نقل کیا ہے۔ اسے انہی کے الفاظ میں پڑھنا چاہیے۔ آزاد لکھتے ہیں:

شیخ قدس سرہ مکتوبے بنام فقیر نمود و اسم فقیر غلام علی بے اضافت غلام تحریر فرمود، از جہت

Marfat.com

آں کہ در حدیث شریف آمدہ کہ ہمہ کس عباداللہ اند، اطلاق عبودیت نسبت بہ مخلوق نباید کرد۔ فقیر در جواب نامہ نوشت بایں مضمون کہ مسلم روایت می کند۔ عن ابی هریرہ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال لایقولن احدکم عبدی وامتی، کلکم عبیداللہ وکل نسائکم اماء اللہ، ولکن لیقل غلامی وجاریتی وفتای وفتاتی ❶۔

وبخاری روایت می کند لایقل احدکم عبدی وامتی ولیقل فتای وفتاتی وغلامی ❷۔ نیز قلمی ساختم کہ اگر واضع اسم غلام را بہ معنی عبد ارادہ کردہ باشد و دیگرے معنی فرزند ارادہ کردہ تلفظ نماید او را می رسد کہ لکلی امرء مانوی شیخ قدس سرہ بعد وصول خط داد انصاف داد و بعد ازیں اسم فقیر غلام علی تحریر فرمود ❸۔

یعنی ایک مکتوب میں شیخ محترم نے میرا نام ''غلام علی'' لکھنے کے بجائے صرف ''غلام'' تحریر فرمایا اور لکھا کہ حدیث شریف میں ہے کہ تم سب اللہ کے بندے ہو، لہٰذا عبدیت کی نسبت مخلوق کی طرف نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے جواب میں اس فقیر (غلام علی آزاد) نے لکھا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کسی کو ''عبدی'' (میرا بندہ) اور ''امتی'' (میری لونڈی) نہ کہو، کیونکہ تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمھاری سب عورتیں اللہ کی لونڈیاں ہیں۔ بلکہ ''غلامی وجاریتی'' یا ''فتای وفتاتی'' کہنا چاہیے۔ اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص کسی کو ''عبدی وامتی'' نہ کہے بلکہ ''فتای وفتاتی وغلامی'' کہے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ اگر نام رکھنے والے نے ''غلام'' کے معنی ''عبد'' کے مراد لیے ہیں تو یہ ممنوع ہے اور اگر فرزند کے معنی لیے ہیں تو اس حکم کا

❶ اس حدیث کے لیے دیکھیے صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الالفاظ من الادب وغیرھا باب حکم اطلاق لفظة العبد والامة والمولیٰ والسید ص ۲۳۸۔

❷ صحیح بخاری کی یہ روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ سے ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں۔ انہ قال لایقل احدکم اطعم ربک، وضیٔ ربک، اسق ربک، ولیقل سیدی ومولای ولایقل احدکم عبدی وامتی ولیقل فتای وفتاتی وغلامی (صحیح بخاری ج ۱ کتاب العتق باب کراهة التطاول علی الرقیق وقوله عبدی وامتی ص ۳۴۶)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ اپنے مالک کو کھانا کھلاؤ، اپنے مالک کو وضو کراؤ، اپنے مالک کو پانی پلاؤ، بلکہ سیدی ومولائی کہے۔ میرا بندہ یا میری لونڈی بھی نہ کہے۔ بلکہ فتای، فتاتی اور غلامی کہے۔

❸ مآثر الکرام ص ۱۴۵، ۱۴۶۔ یہ واقعہ آزاد نے اپنی عربی تصنیف سبحۃ المرجان میں بھی بیان کیا ہے۔ دیکھیے صفحہ ۹۶۔

Marfat.com

اطلاق اس پر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر شخص کی بات کا دارومدار اس کی نیت پر ہے۔ شیخ کو یہ خط ملا تو میری تحسین فرمائی اور اس کے بعد ہمیشہ میرا نام غلام علی لکھتے رہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ عقیدے کے بارے میں شیخ نہایت محتاط تھے اور اس کی صحت کا پورا خیال رکھتے تھے۔ لیکن کتاب وسنت کے دلائل سے اگر کوئی بات ان کے قائم کردہ خیال کے خلاف ثابت ہو جاتی تو اس سے فوراً رجوع فرما لیتے، جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے۔

شیخ محمد حیات سندھی امور بدعت سے نفور اور شائبہ شرک سے دامن کشاں رہتے تھے۔ اس ضمن کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، اور وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں شیخ محمد بن عبدالوہاب مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات کے حلقۂ درس میں شریک تھے، انھوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کے حجرۂ مبارک پر کھڑے دعا و استغاثہ میں مشغول ہیں اور کئی قسم کی بدعات کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ادھر سے شیخ محمد حیات بھی تشریف لے آئے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب انھیں دیکھ کر احترام بجا لائے، استاد کے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھے اور سوال کیا کہ ان لوگوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ شیخ نے جواب میں یہ آیت پڑھی:

﴿إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبَٰطِلٌ مَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ﴾ (الاعراف: ۱۳۹)

یعنی یہ لوگ جس (شغل) میں (پھنسے ہوئے) ہیں، وہ برباد ہونے والا ہے اور جو کام یہ کرتے ہیں، سب بے سود ہے۔

شیخ کا مسلک:

نواب صدیق حسن خاں اور مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی نے شیخ محمد حیات سندھی کے فقہی مسلک کی بھی وضاحت کی ہے۔ مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی ان کے شاگرد تھے، استاد کی تعریف میں مولانا زائر نے جو نظم کہی، وہ گزشتہ سطور میں درج کی جا چکی ہے، اس میں انھوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ وہ مقلد نہ تھے۔

رُستہ از حبس ربقہ تقلید　　بستہ براجتہاد رائے مزید

یعنی شیخ محمد حیات تقلید شخصی سے آزاد تھے اور اجتہاد کے قائل تھے۔

اسی طرح نواب صدیق حسن خاں اتحاف النبلا میں لکھتے ہیں:

دروقت خود شیخ محمد حیات مرتبۂ اجتہاد داشت، تقلید، ہیچکی نمے کرد[1]۔

(شیخ محمد حیات اپنے دور میں مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ کسی کے مقلد نہ تھے۔)

نواب صاحب اپنی ایک اور تصنیف تقصار میں شیخ موصوف کے حالات بیان کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

[1] اتحاف النبلا ص ۴۰۴

Marfat.com

تمام عمر در خدمت حدیث شریف صرف ساخت، وتبحر عظیم دریں فن اشرف اندوخت و بمرتبۂ اجتہاد برآمدہ، وقلادۂ تقلید از گلو فرو افگند ❶۔

(شیخ محمد حیات نے تمام عمر حدیث شریف کے علم کی خدمت میں صرف کر دی۔ اس پاکیزہ ترین فن میں بے حد تبحر حاصل کیا اور قلادۂ تقلید کو گلے سے اتار کر مرتبۂ اجتہاد کو پہنچے۔)

لیکن اس صراحت کے باوجود بعض علمائے احناف نے شیخ محمد حیات کو فقہی لحاظ سے حنفی مسلک کے اعیان و اکابر میں شمار کیا ہے ❷۔ ممکن ہے ابتدا میں ان کا تعلق حنفیت سے رہا ہو، لیکن ان کی تصانیف اس کی تائید نہیں کرتیں۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف نے شیخ کی تصنیف "الایقاف علی سبب الاختلاف" کے شروع میں جو مقدمہ تحریر کیا ہے، اس میں وہ ان کے مسلک کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس دور کے عام حالات کے مطابق ابتداً گو حنفی طریقے پر گامزن ہوں گے۔ لیکن محقق علمائے حدیث وفقہ کے فیض تربیت اور علوم حدیث میں براہ راست ممارست کی وجہ سے بالآخر تحقیق کی راہ پسند کر لی اور تقلید سے دست بردار ہو گئے، جیسا کہ آپ کی تصانیف سے اندازہ ہو سکتا ہے ❸۔"

مولانا عطاء اللہ حنیف کا یہ تجزیہ بالکل قرین صحت ہے۔ عین ممکن ہے ابتدائی دور میں وہ فروع فقہ میں حنفیت کو ترجیح دیتے ہوں، کیوں کہ ان کے عہد میں برصغیر میں زیادہ تر اہل علم فقہی لحاظ سے اسی مسلک کے حامل تھے۔ لیکن بعد میں وہ فکر و عمل کے اعتبار سے بالکل بدل گئے تھے۔ چنانچہ ان کی بعض تصانیف انہی مسائل پر مشتمل ہیں جو فقہ حنفی سے مطابقت نہیں رکھتے۔ مثلاً انھوں نے تقلید شخصی کی مضبوط دلائل سے شدید مخالفت کی ہے اور براہ راست کتاب وسنت کو مدار عمل ٹھہرانے پر زور دیا ہے۔ پھر نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے کے مسئلے کو بہ دلائل ثابت کیا ہے۔ اسی طرح بعض دیگر مسائل پر بھی بحث کی ہے، جن میں اہل حدیث اور احناف الگ الگ آرا کے حامل ہیں۔ ان میں شیخ محمد حیات سندھی نے اسی نقطۂ نظر کی تائید فرمائی ہے جو اہل حدیث کا ہے۔ اور اسی کو احادیث صحیحہ سے ہم آہنگ قرار دیا ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں نے بھی اپنی متعدد تحریروں میں ان مسائل کا ذکر فرمایا ہے اور شیخ محمد حیات کے نقطۂ نظر کو ان کا نام لے کر اپنے بعض فارسی مکتوبات میں بیان کیا ہے۔ مرزا صاحب ممدوح نے ان تمام مسائل یعنی تقلید شخصی، براہ راست کتاب وسنت، نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے اور رفع سبابہ وغیرہ سے متعلق صاف الفاظ میں شیخ محمد حیات سندھی کے نقطۂ فکر کی تائید کی ہے اور ان کی بہت سی عربی عبارات کو جو ان مسائل سے متعلق ہیں، فارسی میں منتقل کر دیا ہے۔

---

❶ تقصار جیود الاحرار ص ۲۲۴۔

❷ دیکھیے مقدمہ نصب الرایہ، ص ۴۹۔

❸ مقدمہ بر "الایقاف علی سبب الاختلاف" ص ۵۔

Marfat.com

علاوہ ازیں شیخ محمد حیات کے مسلک کے بارے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان کی مشہور تصنیف "الایقاف علی سبب الاختلاف" کا اردو ترجمہ بھی معروف اہل حدیث عالم مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے کیا اور مختلف اوقات میں ان کی تصانیف بھی اہل حدیث کے اشاعتی اداروں نے شائع کیں۔ کسی حنفی ادارے نے ان کی کوئی تصنیف شائع نہیں کی۔

تلامذہ:

شیخ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ کا پورے چوبیس سال مدینہ طیبہ میں غلغلۂ تدریس بلند رہا۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی انتہائی استقلال اور کامل اخلاص و محبت کے ساتھ اشاعت کی۔ حجاز، مصر، شام، نجد، یمن اور ہندوستان کے بے شمار حضرات نے ان سے حصول علم کیا۔ پھر جن لوگوں کو ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، خود ان کو اللہ تعالیٰ نے فضل و کمال کے مختلف گوشوں میں بے پناہ اعزاز سے نوازا اور بے حد شہرت و ناموری عطا فرمائی۔ ان کے شاگردوں کو یہ سعادت حاصل ہے کہ وہ معرفت و ادراک کے لحاظ سے بوقلموں اوصاف سے متصف اور فضل و کمال کے اعتبار سے گوناگوں خصوصیات سے بہرہ مند ہیں۔

شیخ کے شاگردوں کی طویل فہرست سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہاں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۰۰ھ/ ۱۸ ستمبر ۱۷۸۶ء) مختلف اقسام علم مثلاً حدیث و فقہ، تاریخ و رجال اور ادب و شعر میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ اور تصنیف و تالیف میں بے حد شہرت کے مالک تھے ❶۔

۲۔ شیخ محمد صادق سندھی (متوفی ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳ء) اصول حدیث کے ماہر اور بہجۃ النظر شرح نخبۃ الفکر کے مصنف شہیر تھے۔

۳۔ شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی (متوفی ۱۱ ذوالحجہ ۱۱۶۴ھ) تحقیق و تدقیق میں اپنے دور کے ممتاز سلفی العقیدہ عالم، متبع سنت اور نامور محدث و فقیہ تھے۔ شاعر اور ادیب بھی تھے۔

۴۔ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب، مجاہد فی سبیل اللہ، مبلغ دین، مصلح وقت اور مجدد عصر تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں اور اپنے عصر اور علاقے میں توحید کی بے پناہ اشاعت کی۔ ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) میں پیدا اور ۱۲۰۶ھ (۱۷۹۲ء) میں فوت ہوئے۔

۵۔ امیر محمد بن اسماعیل یمانی سبل السلام اور کئی کتابوں کے مصنف، مشہور شارح حدیث اور معروف محدث اور فقیہ تھے۔ ۱۰۷۶ھ/ ۱۶۶۶ء کے لگ بھگ کحلان میں پیدا ہوئے۔ بارھویں صدی ہجری

❶ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے فقہائے ہند

Marfat.com

میں انھوں نے بے حد علمی خدمات انجام دیں۔

۶۔ سید حاجی فقیر اللہ علوی شکار پوری، ان کا شمار بارھویں صدی ہجری کے ارض سندھ کے ممتاز علما میں ہوتا ہے۔ ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء میں درۂ خیبر کے ایک پہاڑ ''روتاس'' کے حدود میں پیدا ہوئے، جو اس وقت پشاور سے بجانب مغرب تقریباً ۱۸ میل اور جمرود سے ۹ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

ان کا طالب علمی (۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء) تک کا زمانہ موضع خرقئی (علاقہ پشاور) اور جلال آباد (افغانستان) کے نواح میں موضع ''حصارک'' کے مقام پر گزرا۔ اس کے بعد ۱۱۵۰ھ تک قندھار میں رہے۔ پھر آخر عمر ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء تک شکار پور (سندھ) میں اقامت گزیں رہے۔ ہندوستان، افغانستان، حجاز اور یمن کے علما و مشائخ سے استفادہ کیا اور مختلف علوم میں ان سے سند و اجازہ کی سعادت حاصل کی۔ علم حدیث کی متعدد کتابیں شیخ محمد حیات سندھی اور شیخ محمد ہاشم ٹھٹھوی سے پڑھیں۔ عارف باللہ اور عالم باعمل فقیہ تھے۔ تفسیر اور حدیث پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں قطب الارشاد، براہین النجاۃ، الفتوحات الغیبیہ، الازہار فی ثبوت الآثار زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی علمی رفعت کا اصل اندازہ ان کے مکتوبات سے ہوتا ہے، جو ان کی اولاد میں سے ایک جید عالم سید میر علی نواز علوی کی کوشش سے لاہور میں چھپ چکے ہیں۔ یہ مجموعہ ۸۵ مکتوب کو محتوی ہے اور تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور سیاست وغیرہ کی معلومات کو دامن صفحات میں لیے ہوئے ہے۔

سید فقیر اللہ علوی کی ایک اہم تصنیف ''وثیقۃ الابرار'' ہے، جس میں انھوں نے اپنے سلاسل اسانید و اجازات کی تفصیل درج کی ہے۔ یہ ایک قلمی کتاب ہے جو ایک مقدمہ، آٹھ فصول اور خاتمے پر محیط ہے۔ کتاب کے ابتدا میں مصنف نے مولانا محمد صادق بن دین دار حصارکی جلال آبادی، شیخ محمد حیات سندھی، شیخ محمد ہاشم ٹھٹھوی، شیخ محمد مسعود پشاوری اور اس زمانے کے مفتی مکہ شیخ عبدالقادر اور بعض دیگر علما و محدثین کا ذکر کیا ہے۔ آگے چل کر ہر فصل میں ان تمام علوم کی تفصیل سے سند بیان کی ہے جو مصنف نے مختلف اساتذہ سے حاصل کیے۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔

سید فقیر اللہ علوی عربی اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں شکار پور (سندھ) میں فوت ہوئے اور وہیں محلہ ہزاری میں دفن کیے گئے [1]۔

۷۔ شیخ ابوالحسن ٹھٹھوی سندھی صغیر۔ یہ ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء کو ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں حجاز چلے گئے اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں وہاں شیخ محمد حیات سندھی کا حلقۂ درس جاری تھا، اس میں داخل ہو گئے اور خوب استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ علم حدیث

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ماہ نامہ ''الحق'' (اکوڑہ خٹک) بابت جنوری ۱۹۷۸ء ''ایک نادر مخطوطہ۔ وثیقۃ الابرار۔ حضرت شیخ فقیر اللہ شکار پوری کا سلسلہ اسانید'' از ڈاکٹر سید سعید اللہ، استاد شعبہ اسلامیات، پشاور یونیورسٹی۔ نیز دیکھیے ماہ نامہ ''الرحیم'' (حیدر آباد سندھ) بابت اگست ۱۹۶۳ء۔ ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' از مخدوم امیر احمد۔

Marfat.com

کے شیخ ہوئے اور اجتہاد کے مرتبے کو پہنچے۔ حنفی المسلک تھے لیکن مذہبی تعصب سے بالکل پاک۔ اگر کوئی حق بات اپنے امام کے مذہب کے خلاف دیکھتے تو مذہب امام کو چھوڑ کر حق پر عمل پیرا ہوتے۔ شاگردوں کو بھی یہی ہدایت فرماتے کہ اگر کسی مسئلے میں فقہی روایات کو حدیث نبوی ﷺ کے خلاف پائیں تو فقہی روایات پر حدیث نبوی کو ہر حال میں ترجیح دی جائے۔

شیخ ابوالحسن نے نخبۃ الفکر کی شرح لکھی۔ انھوں نے ابن اثیر کی جامع الاصول کی شرح بھی لکھنی شروع کی تھی، لیکن صرف ایک ہی جلد کی شرح لکھ سکے۔

شیخ ممدوح نہایت خوش خط تھے۔ ان کا معمول تھا کہ صحیح بخاری کی انتہائی احتیاط سے اعراب ڈال کر کتابت کرتے۔ جب کتاب مکمل ہو جاتی تو اہل ذوق بڑے شوق سے ایک سو ریال میں اسے خرید لیتے۔ ان کے ہاتھ کا صحیح بخاری کا مکتوبہ نسخہ امام یمن کے کتب خانے میں موجود ہے[1]۔

شیخ ابوالحسن سندھی صغیر نے ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں مدینہ منورہ میں رحلت کی اور جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

شیخ محمد حیات سندھی مدنی کے ان جلیل القدر تلامذہ کرام کے علاوہ شیخ احمد بن عبدالرحمن سندھی، شیخ محمد سعید صفر، شیخ عبدالقادر خلیل کدک، شیخ عبدالقادر بن احمد، شیخ احمد، شیخ عبدالکریم بن عبدالرحیم داغستانی، شیخ علی بن ابراہیم عبسی، شیخ عبدالکریم بن احمد الشراباتی، شیخ علی بن عبدالرحمٰن الاسلامبولی، شیخ علی بن محمد الزہری، مفتی محمد بن عبداللہ مدنی، شیخ علیم اللہ بن عبدالرشید لاہوری المدفون بہ دمشق، شیخ خیرالدین بن محمد زاہد سورتی اور علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے تحصیل علم کی۔

شیخ ممدوح کے تلامذہ بھی استاد کی طرح علم حدیث سے از حد تعلق خاطر رکھتے تھے اور ان کے دلوں میں اس علم کا اثر نہایت گہرا اور راسخ تھا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ عنہم۔

وفات:

شیخ محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے دیار حبیب ﷺ میں عمر بھر حدیث نبوی کی مقدس شمع جلائے رکھی، اسی کی روشنی میں وہ زندگی کی منزلیں طے کرتے رہے اور پھر اسی کی خدمت کرتے ہوئے ۲۶ صفر ۱۱۶۳ھ/۲۴ جنوری ۱۷۵۰ء کو مدینہ منورہ میں ہمیشہ کے لیے اللہ کے حضور پہنچ گئے۔ انھیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا، جہاں صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، محدثین وفقہا اور علما و صلحا کی بہت بڑی تعداد مدفون ہے۔ ان کے شاگرد رشید میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ''رحلۃ شیخی'' تاریخ وفات نکالی۔

---

[1] ماہ نامہ ''الرحیم'' (حیدر آباد سندھ) بابت اگست ۱۹۶۳ء۔ ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' از مخدوم امیر احمد۔

Marfat.com

شیخ کے استادِ گرامی ــــ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر:

شیخ محمد حیات سندھی کے اساتذۂ کرام میں سے ایک بزرگ شیخ ابوالحسن سندھی تھے۔ ابوالحسن سندھی نام کے دو حضرات تھے۔ ایک ابوالحسن صغیر اور دوسرے ابوالحسن کبیر۔ جن کا تذکرہ ان سطور میں مقصود ہے، وہ ابوالحسن سندھی کبیر تھے۔ یہی شیخ محمد حیات سندھی کے استاد گرامی تھے، جن کا مدینہ منورہ میں ہنگامۂ تدریس گرم تھا اور جن کی وفات کے بعد، ان کی مسند تدریس پر شیخ محمد حیات سندھی متمکن ہوئے۔

شیخ ابوالحسن سندھی کبیر کا سالِ ولادت معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ علاقۂ سندھ کے مرکز علم ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور بارھویں صدی ہجری کے اکابر علمائے ہند میں گردانے گئے۔ ان کا اصل نام محمد تھا، والد کا نام نامی عبدالہادی تھا۔ کنیت ابوالحسن تھی اور کنیت ہی سے مشہور ہوئے۔ شیخ ممدوح نے اپنے آبائی شہر ٹھٹھہ میں تربیت حاصل کی اور حصول علم کی منزلیں بھی اسی شہر کے اعاظم رجال اور اکابر علما کی نگرانی میں طے کیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں ان کے علمی کمالات کی شہرت پھیل گئی اور طلبائے علم دور دراز کی مسافت طے کر کے شامل درس ہونے لگے۔ طلبا ان کے اندازِ تعلیم اور اسلوب تدریس سے نہایت متاثر ہوتے، کیونکہ وہ اس نہج سے مشکل اور دقیق مسائل کی عقدہ کشائی کرتے تھے کہ ہر بات آسانی سے مخاطب کے ذہن نشین ہو جاتی، لیکن خود استاد اس علم پر قانع نہ تھے۔ ان کے اندر مزید تحصیل کا جذبہ موجزن تھا۔ چنانچہ ٹھٹھے کی مسند درس کو خیر باد کہا اور اسلامی ملکوں کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ سب سے پہلے تستر گئے، وہاں کے علما سے استفادہ کیا۔ پھر حجاز مقدس کی راہ لی اور راستے کی بے پناہ دشواریوں سے گزرتے ہوئے حرم پاک پہنچے۔ کچھ عرصہ مکہ معظّمہ میں قیام کیا، پھر مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ وہاں سید محمد برزنجی اور شیخ ابراہیم کردی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شریک ہو گئے اور ان حضرات گرامی سے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ شیخ عبداللہ بن سالم بصری سے بھی مستفید ہوئے۔ پھر اسی خطۂ مبارکہ کو وطن بنا لیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

واقعات کی ترتیب اور حالات کی رفتار سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں سندھ کی سکونت ترک کر کے حجاز پہنچے تھے۔ کیونکہ ان کے استاد شیخ ابراہیم کردی کا جو ولی اللّٰہی سلسلۂ اسناد کی ایک کڑی ہیں، سال وفات ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء ہے۔ یعنی بارھویں صدی ہجری کا اوائل۔ اس سے لازم آتا ہے کہ شیخ ابوالحسن کا ان سے مستفید ہونے کا واقعہ اس سے پہلے کا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب کہ ہندوستان کے تختِ حکومت پر اورنگ زیب عالم گیر متمکن تھا۔

شیخ ابوالحسن سندھی طبعاً تنہائی پسند تھے، اس لیے حرم نبوی ﷺ میں اقامت کے ابتدائی ایام گوشہ نشینی میں گزرے، لیکن مسجد نبوی ﷺ میں سلسلۂ درس شروع کیا تو لاکھوں دلوں کے مالک تھے اور تشنگان علم ہجوم در ہجوم ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ان کا حلقۂ درس ہر ملک کے علما اور طلبا کا مرکز تھا۔ عرب ملکوں کے علاوہ

Marfat.com

ہندوستان، افغانستان اور روم کے طالبان فیض بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اخذ علم کرتے۔ وہ دیار ہند کو چھوڑ چکے تھے، لیکن اس ملک کے حضرات بھی ان کے حلقۂ درس میں شریک تھے، جن میں شیخ محمد حیات سندھی کا اسم گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ وہ شیخ ابوالحسن کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ استاد کی وفات کے بعد وہی اس خزانۂ علم کے وارث ہوئے، اور ان کی مسند تدریس کا تاج زریں اسی تلمیذ رشید کے سر کی زینت بنا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس لائق شاگرد نے استاذ کی جانشینی کا پورا پورا حق ادا کیا اور اس درس گاہ عظیم کو جو مرجع خلائق بن گئی تھی، نہایت کامیابی سے چلایا۔ پھر آگے چل کر شیخ محمد حیات سندھی کی مساعی جمیلہ سے اس درس گاہ کے اثرات ہندوستان کے اہل علم پر بھی خوب نمایاں ہوئے اور شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی اور میر سید غلام علی آزاد بلگرامی جیسے جلیل القدر علما اور متنوع خوبیوں کے حامل حضرات اس سے فیض یاب ہوئے۔ ان بزرگوں نے اہل ہند کے ذہن کو نئی جلا بخشی اور ان کے فکر کو تحقیق و کاوش کی تابندہ راہوں سے آشنا کیا۔

شیخ ابوالحسن سندھی قرآن، حدیث اور فقہ پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ ان بنیادی علوم کی متعدد اولیں اور اونچے درجے کی کتابوں پر انھوں نے حواشی تحریر کیے جن سے علما و طلبا بہت استفادہ کرتے ہیں اور حلقۂ اہل علم میں ان کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ ان حواشی سے ان کی دقت نظر، قرآن و حدیث میں عبور و مہارت اور فقہ میں وسعت معلومات کا پتا چلتا ہے۔

تفسیر قرآن مجید کے سلسلے میں ان کی قابل قدر خدمت یہ ہے کہ دو مشہور تفسیروں، تفسیر بیضاوی اور تفسیر جلالین پر شان دار حواشی تحریر فرمائے۔ قرآن کے ضمن میں ان کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی ایک مستقل تفسیر لکھی۔

علم حدیث کے وہ ماہر تھے اور اس کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ اس بنیادی علم کی انھوں نے بے پناہ خدمت کی۔ یہ خدمت تدریس کی صورت میں بھی کی اور تحریر کی صورت میں بھی۔ ان کا یہ بہت بڑا علمی کارنامہ ہے کہ صحاح ستہ پر حواشی لکھے۔ صحیح بخاری اور ابن ماجہ کا حاشیہ مصر میں طبع ہوا۔ نسائی کا حاشیہ ہندوستان میں چھپا۔ صحیح مسلم کا حاشیہ پاکستان کے نامور اہل حدیث عالم حضرت مولانا عبدالتواب ملتانی مرحوم نے علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیا۔ ابوداؤد کا غیر مطبوعہ حاشیہ سید احسان اللہ شاہ مرحوم (المعروف پیر جھنڈا) کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ترمذی کا حاشیہ غالباً مکمل نہیں ہو سکا تھا۔

احادیث کی ان بنیادی کتابوں کے حواشی کے علاوہ شیخ ابوالحسن سندھی نے مسند امام احمد پر بھی حاشیہ لکھا۔

شیخ ممدوح کو مسند امام ابوحنیفہ، ہدایہ اور فتح القدیر شرح ہدایہ پر بھی حواشی لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی بوقلموں خدمات علمیہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بہ یک وقت کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ مفسر

Marfat.com

قرآن، شارح حدیث، فقیہ نام دار، مدرس، مبلغ، محشی، مصنف، سب کچھ تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بے شمار کمالات سے نوازا تھا۔

شیخ ابوالحسن سندھی کی تصانیف وحواشی سے پتا چلتا ہے کہ وہ عامل بالحدیث تھے اور کتاب وسنت ہی کو مرکز التفات ٹھہراتے تھے ان کے شاگرد شیخ محمد حیات سندھی لکھتے ہیں۔

كان زاهداً متورعاً كثير الاتباع لكتاب الله وسنة رسول الله ﷺ۔

یعنی شیخ ابوالحسن عابد وزاہد اور متبع کتاب وسنت تھے۔

مولانا محمد عابد سندھی رقم طراز ہیں:

كان الشيخ عاملاً بالحديث لا يعدل عنه الى مذهب۔

کہ شیخ ابوالحسن حدیث پر عمل پیرا تھے۔ حدیث کے علاوہ کسی مذہب کو قابل اعتنا نہیں قرار دیتے تھے۔

جس زمانے میں شیخ ابوالحسن سندھی مدینہ منورہ میں مقیم تھے، اس زمانے میں ان کے ایک ہم وطن شیخ ابوالطیب سندھی بھی وہاں اقامت گزیں تھے۔ وہ بھی جلیل القدر عالم اور وسیع المطالعہ فاضل تھے۔ جامع ترمذی کے شارح اور درمختار کے محشی تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کا غلغلۂ درس بلند تھا۔ حکام وقت اور ارباب اختیار کے درباروں میں انھیں رسائی حاصل تھی۔ مذہباً حنفی اور طریقتاً نقشبندی تھے۔ اپنے مسلک میں نہایت متشدد تھے اور جزئیات فقہ میں عبور رکھتے تھے۔ اختلاف مسلک کی بنا پر شیخ ابوالحسن سندھی کبیر کے زبردست حریف تھے۔ ان کی وجہ سے شیخ ابوالحسن سندھی کو بارہا شدید آزمائشوں اور ابتلاؤں میں سے گزرنا پڑا۔ شیخ محمد عابد سندھی نے اس دور کے بعض واقعات بیان کیے ہیں، جن میں دونوں کے درمیان وجہ مخالفت کا اصل راز سامنے آ جاتا ہے، اور شیخ ابوالحسن کو اپنے ہم وطن وہم عصر حریف کے باعث جو تکلیفیں اٹھانا پڑیں، ان کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ شیخ محمد عابد سندھی فرماتے ہیں۔

شیخ ابوالحسن سندھی عامل بالحدیث تھے۔ حدیث سے صرف نظر کر کے کسی مذہب کی طرف عنان توجہ مبذول نہیں فرماتے تھے۔ رکوع سے پہلے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے اور دو رکعتوں سے اٹھتے وقت رفع الیدین کرتے اور سینے پر ہاتھ باندھتے تھے، ان کے زمانے میں شیخ ابوالطیب سندھی جو حنفی المذہب تھے، اپنے مسلک فقہی سے ہرگز ادھر ادھر نہیں ہوتے تھے۔ اس قسم کے مسائل میں شیخ ابوالحسن سے شیخ ابوالطیب مناظروں کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ شیخ ابوالحسن متنازعہ فیہ مسائل میں اپنے دلائل بیان کرتے تو شیخ ابوالطیب ان کے جواب میں عاجز آ جاتے۔ یہی مخاصمت ان دونوں علما میں ہمیشہ قائم رہی۔ ایک مرتبہ روم کے قضاتِ احناف میں سے ایک شخص قاضی کی حیثیت سے مدینہ منورہ میں آئے تو شیخ ابوالطیب ان کے پاس تشریف لے گئے اور شکایت کی کہ شیخ ابوالحسن ان کے فقہی مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ بعض مسائل کا ذکر کر کے یہ بھی کہا کہ وہ ان مسائل میں ائمہ احناف کے مخالف ہیں۔ قاضی نے اپنے طور پر شیخ ابوالحسن کے حالات اور فقہی نظریات کے

Marfat.com

بارے میں معلومات فراہم کیں تو انھیں پتا چلا کہ شیخ ابوالحسن تمام علوم متداولہ میں درجۂ امامت پر فائز ہیں اور مختلف فنون میں ماہر کامل ہیں۔ ان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ اہل مدینہ شیخ ابوالحسن کے شاگرد ہیں اور انھیں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد قاضی مذکور شیخ ابوالحسن سے نہایت احترام کے ساتھ پیش آئے، اپنے لیے دعا کی درخواست کی اور عزت کے ساتھ ان سے ہم کلام ہوئے۔

شیخ ابوالطیب سندھی نے یہ عادت بنالی تھی کہ جو قاضی بھی مدینہ منورہ میں آتا، اس کے پاس جاتے اور شیخ ابوالحسن کی شکایت کرتے لیکن کوئی قاضی بھی انھیں کچھ نہ کہتا، ہر قاضی انھیں اپنے ہاں بلاتا اور ان سے گفتگو کرتا تو ان کے علم اور نیکی سے اس قدر متاثر ہوتا کہ احترام کے ساتھ رخصت کرتا۔ ایک مرتبہ ایک متعصب قاضی وہاں آیا۔ شیخ ابوالطیب نے حسب معمول اس کے پاس شیخ ابوالحسن کی شکایت کی تو اس نے شیخ کو دربار میں طلب کیا اور نہایت سخت لہجے میں حکم دیا کہ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھا کریں اور پہلی تکبیر کے سوا رفع الیدین نہ کیا کریں۔ شیخ نے جواب دیا، میں آپ کی یہ بات نہیں مانوں گا، وہی کچھ کروں گا، جو حدیث میں مذکور ہے اور اسی طرح نماز پڑھوں گا جس طرح خود رسول اللہ ﷺ نے پڑھی یا پڑھنے کا حکم دیا۔

قاضی سخت مزاج اور متعصب تھا، وہ شیخ ابوالحسن سے یہ صاف جواب سننے کو تیار نہ تھا، اس نے غصے میں آکر شیخ کو جیل بھیج دیا اور ایسی تنگ کوٹھڑی میں محبوس کرنے کا حکم دیا جس میں ہر وقت تاریکی چھائی رہتی تھی، کوئی چیز نظر نہ آتی تھی، حوائج ضروریہ کے لیے بھی ان کو باہر نہیں نکالا جاتا تھا۔ شیخ چھ دن اس کال کوٹھڑی میں بند رہے۔ پھر اہل مدینہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ وہ قاضی کی بات مان لیں اور جیل سے باہر آجائیں شیخ نے ان کو جواب دیا کہ جو بات صحیح حدیث سے ثابت نہیں اور رسول اللہ ﷺ سے مروی نہیں، میں اسے ہرگز نہیں مانوں گا، اور جو عمل رسول اللہ ﷺ سے صحیح حدیث کی رو سے ثابت ہے، اسے کسی صورت نہیں چھوڑوں گا۔ یہ بات انھوں نے قسم کھا کر کہی۔

اس کے بعد اہل مدینہ پھر قاضی کے پاس گئے اور پُرزور الفاظ میں شیخ کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ قاضی نے قسم اٹھا کر کہا کہ اگر میں نے ان کو نماز میں سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے دیکھ لیا تو دوبارہ جیل بھیج دوں گا۔ اہل مدینہ نے شیخ سے عرض کیا کہ ایک کپڑا لے کر پشت پر اوڑھ لیں اور اس کو دونوں طرف سے دونوں کندھوں پر ڈال لیں۔ اس کے نیچے سینے پر بھی ہاتھ باندھ لیا کریں اور رفع الیدین بھی کرلیا کریں۔ شیخ نے یہ تجویز منظور فرمالی۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصے بعد قاضی وفات پا گیا اور شیخ نے دوبارہ پہلے کی طرح کھلے بندوں سینے پر ہاتھ باندھنا اور رفع الیدین کرنا شروع کر دیا۔

بہر حال شیخ ابوالحسن سندھی کبیر بہت بڑے محدث اور عامل بالحدیث عالم تھے۔ ان کا سلسلۂ درس حدیث بہت وسیع تھا جو مسجد نبوی میں جاری تھا۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ واقعات سے انداز ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیچھے کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کے شاگرد رشید شیخ

Marfat.com

محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ ان کے جانشین ہوئے، جو تقلید شخصی کے مخالف اور متبع کتاب و سنت تھے۔

تذکرہ و رجال کی کتابوں میں ارض سندھ کے اس جلیل القدر محدث کو شیخ ابوالحسن سندھی کبیر لکھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ شیخ ابوالحسن دو تھے اور دونوں سندھی تھے۔ دونوں نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ امتیاز کے لیے ایک کو شیخ ابوالحسن سندھی صغیر کہا جاتا ہے جو شیخ ابوالحسن بن محمد صادق سندھی صغیر تھے۔ ان کی تاریخ وفات ۲۵ رمضان ۱۱۸۷ھ/ ۱۰ دسمبر ۱۷۷۳ء ہے۔ مقام وفات مدینہ منورہ ہے۔

دوسرے شیخ ابوالحسن سندھی کبیر ہیں، ان کا پورا نام شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی تھا، لقب نورالدین تھا۔ یہی وہ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر ہیں، جن کے حالات قارئین کرام کے زیر مطالعہ ہیں۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ایک روایت کے مطابق ۱۱۴۱ھ/ ۱۷۲۹ء میں وفات پائی۔ ایک روایت میں ۱۱۳۹ھ/ ۱۷۲۷ء اور ایک میں ۱۲ شوال ۱۱۳۸ھ/ ۲ جون ۱۷۲۶ء منقول ہے۔ ایک اور روایت ۱۱۳۶ھ کی بھی ہے۔

مدینہ منورہ میں اس جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت محدث کی وفات پر انتہائی حزن و ملال کا اظہار کیا گیا۔ نماز جنازہ میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ ان کے تدین و تقویٰ اور بے پناہ خدمت حدیث سے ہر طبقہ و خیال کے لوگ انتہائی متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ان کے انتقال پر عورتوں نے بھی بے حد افسوس کیا اور جنازہ اٹھا تو ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھروں کے دروازوں میں کھڑی ہوگئیں۔ دکان داروں نے فرط غم سے دکانیں بند کر دیں، حکومت کے اہل کاروں اور ولات و عمال نے میت کو کندھا دیا۔ میت کو مسجد نبوی میں لایا گیا اور وہیں نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اور پھر اس عظیم سندھی الاصل محدث و فقیہ کو جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ علما و طلبا اور عوام و خواص نے ان کی وفات کو ایک عظیم سانحہ قرار دیا اور اس پر نہایت غم و اندوہ کا اظہار کیا۔

شیخ ابوالحسن کے حالات ❶ ماہ نامہ ''الرحیم'' (حیدر آباد) میں بھی مرقوم ہیں جو ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' کے عنوان کے تحت مخدوم امیر احمد مرحوم نے تحریر کیے ہیں۔ اس میں شیخ ممدوح کے حالات مندرجہ ذیل ہیں:

''نورالدین محمد بن عبدالہادی ٹھٹھوی ثم مدنی معروف بہ شیخ ابوالحسن کبیر۔ سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے علما سے علم حاصل کیا۔ پھر مدینہ شریف ہجرت کر گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

''آپ نے مدینہ منورہ میں ''مدرستہ الشفا'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ آج تک موجود ہے اور ترکی اوقاف میں شامل ہے۔ راقم الحروف کو جب اللہ تعالیٰ نے ۱۹۵۲ء میں حرم نبوی کی زیارت کی توفیق عطا کی تو اس مدرسے کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ اس مدرسے کو ''مدرستہ الشفا'' کیوں کہا گیا؟ اس کے متعلق دو

❶ شیخ ابوالحسن سندھی کے حالات کے لیے دیکھیے ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور۔ مورخہ ۴ مارچ و ۱۱ مارچ ۱۹۵۵ء مضمون بہ عنوان ''علامہ ابوالحسن سندھی رحمۃ اللہ علیہ'' از مولانا ابوالفضل فیض الرحمن الثوری۔

Marfat.com

روائتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس مدرسے میں قاضی عیاض کی مشہور کتاب ''الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ'' کا درس لازمی طور پر اور خاص اہتمام سے دیا جاتا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ شیخ کے زمانے میں ایک سالار فوج بیمار پڑ گیا تھا اور زندگی کی امید منقطع ہو چکی تھی۔ آخر اس نے شیخ ابوالحسن کی طرف رجوع کیا جو اس وقت مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیتے تھے، اور نذر مانی کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ نے صحت عطا کی تو وہ حضرت شیخ کی تدریس کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کرائیں گے۔ اللہ نے اسے صحت بخشی اور اس نے اپنی نذر پوری کی اور شیخ کے لیے ایک مدرسہ بنایا۔ اس مدرسے کا نام ''مدرستہ الشفا'' رکھا۔

ہمارے خیال میں ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض یا تضاد نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مدرسے کے نام میں دونوں مناسبتوں کا خیال رکھا گیا ہو۔

''اس مدرسے میں ایک اچھا خاصا کتب خانہ ہے، جس میں مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کتابیں اکثر و بیشتر شیخ ابوالحسن کے شاگردوں کی لکھی ہوئی ہیں۔''

''مسند امام احمد بن حنبل کے ایک مخطوطہ نسخے پر میں نے دیکھا کہ آخر میں ایک طالب علم نے لکھا تھا کہ میں نے یہ کتاب شیخ ابوالحسن سندھی کی خدمت میں مسجد نبوی میں فلاں وقت پڑھ کر پوری کی اور حلقۂ درس میں اتنے طالب علم شامل تھے۔

''آپ کے اساتذہ میں شیخ شمس بن محمد برزنجی، برہان کورانی اور عبداللہ بصری جیسے شیوخ شامل تھے۔

''مخدوم ابوالحسن نے صحاح ستہ پر حواشی لکھے تھے، جن میں سے اکثر مصر اور ہندوستان میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مسند امام احمد بن حنبل، اذکار نبویہ پر بھی حواشی تحریر کیے تھے۔ علامہ ابن حجر کی کتاب ''شرح نخبتہ الفکر'' پر بھی حاشیہ لکھا تھا۔ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کی شرح بھی لکھی تھی۔ خلاصہ یہ کہ آپ فن حدیث کے ایک محقق حافظ اور صاحب تدقیق فاضل تھے۔ تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ علامہ کتانی ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۷ء اور علامہ عبدالرحمٰن الجبرتی ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء بتاتے ہیں۔ آپ کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا''❶۔

۲۴۔ قاضی محمد حیات برہان پوری

قاضی محمد حیات برہان پوری بارھویں صدی ہجری کے نامور فقیہ تھے اور ان کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ مغل حکمران محمد شاہ اور بعض دیگر بادشاہوں کے عہد میں برہان پور کے منصب قضا پر متمکن رہے۔ ایک مغل بادشاہ نے ان کی فقہی اور علمی قابلیت کی بنا پر ان کو قاضی شریعت خاں کے پراعزاز لقب سے سرفراز کیا۔ ممدوح محکمۂ قضا کی اہم ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ درس و افادۂ طلبا میں بھی مصروف رہتے تھے۔ ان سے علما کی بہت بڑی تعداد نے اخذ علم کیا❷۔

❶ ماہ نامہ ''الرحیم'' (حیدرآباد سندھ) مطابق جولائی ۱۹۶۳ء مضمون ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' از مخدوم امیر احمد۔

❷ نزہتہ الخواطر، ج ۶، ص ۳۰۲ بحوالہ تاریخ برہان پور۔

Marfat.com

۲۵۔ سید محمد مخدوم پھلواروی

سید محمد مخدوم بن امان اللہ بن محمد امین بن محمد جنید ہاشمی جعفری پھلواروی، صوبہ بہار کے مردم خیز شہر پھلواری میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ حصول علم کا آغاز اپنے والد گرامی سید امان اللہ پھلواروی سے کیا، جو اپنے دور کے صاحب علم بزرگ تھے۔ اس کے بعد مزید تحصیل کے لیے مختلف بلاد و امصار میں گئے اور متعدد اساتذہ سے اخذ علم کیا۔ شیخ محمد وارث حسینی بنارسی (متوفی ۱۰ ربیع الثانی ۱۱۶۶ھ/۱۴ جنوری ۱۷۵۳ء) کی خدمت میں بھی گئے، جن کا بنارس میں سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ پھر اپنے عصر کے مشہور عالم و فقیہ اور شیخ مانے گئے۔ صالحیت اور تقویٰ کی نعمت سے بھی مالا مال تھے۔

سید محمد مخدوم پھلواروی فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن پھلواری واپس آئے اور وہاں انھوں نے خود درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور تمام عمر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

پھلواری کے اس عالم و فقیہ نے ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ/ ۱۷ دسمبر ۱۷۵۹ء کو وفات پائی[1]۔

۲۶۔ قاضی محمد دولت فتح پوری

قاضی محمد دولت فتح پوری، اپنے عصر کے فاضل علمائے حنفیہ میں سے تھے۔ ان کا آبائی تعلق موضع سہالی سے تھا جو نواح لکھنؤ میں واقع ہے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

قاضی محمد دولت بن محمد یعقوب بن فرید بن سعد اللہ بن احمد بن حافظ الدین انصاری سہالوی، قاضی محمد دولت کے والد محمد یعقوب، شیخ محب اللہ عمری الہ آبادی کے بھانجے تھے جو اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور فاضل بزرگ تھے۔

قاضی محمد دولت موضع سہالی میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی اور وہیں شیخ قطب الدین شہید سہالوی سے علم حاصل کیا۔ رسالہ قطبیہ کے بیان کے مطابق شیخ شہید نے ان کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ ان کی شہادت کے بعد ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء میں یہ سہالی سے فتح پور منتقل ہو گئے اور وہاں اپنے سسر ابو الرافع حسامی کے گھر میں رہنے لگے۔ پھر فتح پور سے دہلی گئے۔ اس زمانے میں بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے حکم سے شیخ نظام برہان پوری کی نگرانی میں علما کی ایک جماعت فتویٰ ہندیہ کی ترتیب پر مامور تھی۔ یہ وہی فتاویٰ ہے جو آگے چل کر فتاویٰ عالم گیری کے نام سے معروف ہوا۔ قاضی محمد دولت چونکہ علم فقہ اور اس کے متعلقات میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور حلقہ علما میں خاص شہرت کے مالک تھے، لہٰذا فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل کیے گئے۔ بعد ازاں عالم گیر نے ان کو شہر سورت کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ منصب قضا کے لیے بادشاہ سے ان کی سفارش سید محمد حسینی

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ۳۰۳ بحوالہ حدیقۃ الازہار۔

Marfat.com

قنوجی نے کی تھی اور اس سفارش کی وجہ شیخ محب اللہ عمری الہ آبادی سے ان کا تعلق قرابت تھا۔

اغصان الانساب کی روایت کے مطابق یہ قاضی مقرر ہو کر سورت جا رہے تھے کہ اثنائے سفر میں راہزنوں کے چنگل میں پھنس گئے اور قتل کر دیے گئے ❶۔

۲۷۔ سید محمد راجے جون پوری

سید محمد راجے حسینی واسطی جون پوری مشہور عالم وصوفی سید محمد حفیظ حسینی واسطی جون پوری (متوفی ۲۰ شوال ۱۱۲۸ھ/ ۲۶ ستمبر ۱۵۱۶ء) کے پوتے تھے۔ عالم باعمل تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بہت سی کتب درسیہ اپنے جد امجد سید محمد حفیظ جون پوری سے پڑھیں۔ ان کی وفات کے بعد اپنے شہر (جون پور) کے اساتذہ کرام سے استفادہ کیا، یہاں تک کہ فقہ واصول میں مہارت پیدا کر لی اور جماعت علما میں ''افقہ الفقہاء'' کے طور پر شہرت پائی۔ قانع، متوکل علی اللہ اور پاک باز بزرگ تھے، شاعر بھی تھے۔ بڑے متین اور صاحب اعزاز واکرام عالم دین تھے، ہمیشہ درس وتدریس میں مشغول رہتے۔ ۱۷ ربیع الاول ۱۱۸۳ھ/ ۲۱ جولائی ۱۷۶۹ء کو فیض آباد میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

۲۸۔ مولانا محمد رضا انصاری سہالوی

مولانا محمد رضا سہالوی، شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے چوتھے بیٹے تھے جو باپ کی شہادت کے وقت سب سے چھوٹے تھے۔ سہالی میں پیدا ہوئے اور ابھی بارہ سال کی عمر کے تھے کہ ان کے والد گرامی شیخ قطب الدین سہالوی شہید کر دیے گئے۔ اس کے بعد یہ خاندان سہالی سے لکھنؤ منتقل ہو گیا اور بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے ان کو مستقل سکونت کے لیے فرنگی محل عطا کیا۔ لکھنؤ پہنچ کر اس خاندان کے اہل علم نے فرنگی محل میں درس وتدریس کا وہی قدیم سلسلہ شروع کر دیا جو سہالی میں جاری تھا۔ اس سے خلق کثیر نے فیض حاصل کیا۔

مولانا محمد رضا سہالوی نے لکھنؤ میں اپنے بڑے بھائی شیخ نظام الدین سہالوی سے کسب علم کیا، اور علوم مروجہ میں کامل دسترس حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود بھی لکھنؤ میں مسند تدریس بچھائی اور طویل عرصے تک علما وطلبا کو مستفید فرماتے رہے۔ اس اثنا میں شیخ عبدالرزاق حسینی بانسوی سے اخذ طریقت بھی کیا۔ بعد ازاں ارض حجاز کا قصد فرمایا اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد کوئی پتا نہیں چل سکا کہ کہاں گئے اور کب فوت ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق حج سے فارغ ہونے کے بعد مکہ مکرمہ سے بغداد چلے گئے

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۳۔ برصغیر میں علم فقہ ص ۳۱۷۔

❷ تجلی نور، ج ۲ ص ۶۹۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۳۲۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۰۳، ۳۰۴۔

Marfat.com

تھے، وہیں انتقال کیا۔ ایک خیال یہ ہے کہ شاید اپنے برادر کبیر شیخ نظام الدین سہالوی کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ شیخ نظام الدین سے عمر میں سات سال چھوٹے تھے۔

رسالہ قطبیہ کی روایت کے مطابق مولانا محمد رضا سہالوی نے قاضی محبّ اللہ بہاری کی مشہور درسی کتاب "مسلم الثبوت" کی شرح بھی سپرد قلم کی تھی۔ مسلم الثبوت اصول فقہ کی معروف کتاب ہے اور درس نظامیہ میں شامل ہے۔ اس قسم کی کتاب کی شرح وہی عالم لکھ سکتا ہے جو علم فقہ، اصول فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں مہارت رکھتا ہو۔

بہرحال مولانا محمد رضا سہالوی کے حرمین شریفین جانے کے بعد ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ان کے سال وفات اور مقام وفات کا بھی کسی کو علم نہیں❶۔

۲۹۔ شیخ محمد رضا لاہوری

شیخ محمد رضا لاہوری، سرزمین پنجاب میں بارھویں صدی ہجری کے نامور فاضل اور مشہور عالم تھے، زیادہ تر درس و تدریس اور فتاویٰ نویسی میں مصروف رہتے۔ حسن قبول، کثرت تلامذہ اور مسترشدین کی تعداد میں اس دور کے پنجاب میں ان کا بڑا نام تھا۔ خطۂ پنجاب کے اس عالم و فقیہ نے ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۸ھ/ ۱۱/اگست ۱۷۰۶ء کو اپنے شہر لاہور میں وفات پائی❷۔

۳۰۔ مولانا محمد سعید انصاری سہالوی

مولانا محمد سعید سہالوی، شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے دوسرے بیٹے تھے۔ موضع سہالی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والد گرامی شیخ قطب الدین شہید سے علم حاصل کیا اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ والد کی شہادت کے بعد ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء میں مظلومی کا محضر لے کر بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کی بارگاہ میں دکن گئے اور بادشاہ سے لکھنؤ کی مشہور عمارت فرنگی محل کی معافی اور عطیے کا فرمان حاصل کیا۔ واپس آ کر اس عمارت پر قابض ہوئے۔ بعد ازاں اپنے تمام بھائیوں اور اعزہ و اقارب سمیت اس میں سکونت گزین ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد دوبارہ فرنگی محل کی معافی اور عطیے کے فرمان کی توثیق و استحکام وغیرہ کے لیے بادشاہ کی خدمت میں گئے اور اسناد قبضہ حاصل کر کے تمام کاغذات بھائیوں کے پاس بھیجے۔

مولانا محمد سعید انصاری سہالوی اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم و فقیہ، باعمل اور صاحب عفت و حیا بزرگ تھے۔ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل ہونے کا بھی انھیں اعزاز حاصل ہے۔ بارھویں

❶ احوال علمائے فرنگی محل ص ۳۲، ۳۳۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۵۹۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۸۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۴۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۵۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۳۱۔

Marfat.com

صدی ہجری کے اس عالم دین نے مغل حکمران شاہ عالم کے عہد حکومت میں عالم جوانی میں وفات پائی۔

ایک روایت کے مطابق بادشاہ سے دوسری مرتبہ فرنگی محل کی اسناد توثیق لے کر لکھنؤ میں بھائیوں کو بھجوا دیں تھیں اور خود مکہ معظّمہ تشریف لے گئے تھے۔ پھر وہیں بیمار ہو کر راہیٔ ملک بقا ہوئے ❶۔

۳۱۔ شیخ محمد سعید انبالوی

شیخ محمد سعید بن محمد یوسف بن غلام محمد بن محمد افضل حسینی ترمذی انبالوی، کبار علما میں سے تھے۔ مشرقی پنجاب کے شہر انبالہ کے رہنے والے تھے اور وہاں کی مسند مشیخت پر فائز تھے۔ متبع سنت اور حدیث رسول اللہ ﷺ کے بہ درجہ غایت پابند تھے۔ اسلاف کرام کے ان آثار و روایات کو جو کتاب و سنت سے ہم آہنگ ہوں، ماننا ضروری قرار دیتے تھے۔ معاملات دنیا سے منقطع ہو کر زہد و عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اپنا مشغلہ حیات قرار دے لیا تھا۔ دین کی تبلیغ و اشاعت ان کا مطمحِ نظر تھا۔ اسباب دنیا سے اس قدر بے نیاز تھے کہ کوئی شئی اپنے پاس نہ رکھتے اور کھانے پینے کی کسی چیز کا ذخیرہ نہ کرتے۔ جو کچھ کہیں سے ملتا، بے دریغ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے، کل کی بالکل پروا نہ کرتے۔ ملوک و امرا ان کو لاکھوں روپے نقد اور کئی قسم کی چیزیں بھیجتے، ان میں سے کوئی چیز گھر میں نہ رکھتے، سب فقرا و مساکین اور مستحقین میں تقسیم کر دیتے۔ دنیا کے مال و متاع میں سے کوئی شے بھی رات کو اپنے پاس نہ رہنے دیتے، جس وقت کچھ ہاتھ آتا، اسی وقت اصحاب حاجت کو دے دیتے۔

شیخ محمد سعید انبالوی نے ۵ رمضان المبارک ۱۱۰۳ھ/۱۱ مئی ۱۶۹۲ء کو وفات پائی۔ ان کی قبر بکھرام میں ہے ❷۔

۳۲۔ مولانا محمد شجاع ہتگامی

مولانا محمد شجاع بن معز الدین ہتگامی، موضع ہتگام میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں اعمال الٰہ آباد (یوپی) میں ایک اچھا خاصا قریہ تھا۔ وہیں تربیت پائی۔ علامہ محمد برکت الٰہ آبادی اور قاضی محمد پناہ جون پوری سے حصول علم کیا۔ اس کے بعد شیخ محمد معصوم کاکوروی سے اخذ طریقت کیا، طویل مدت تک ان سے منسلک رہے اور علم و معرفت کی بلند منزلوں تک پہنچے۔ پھر جب ان کے علاقے پر کفار کا غلبہ ہو گیا تو افغانستان چلے گئے۔ خاصا عرصہ وہاں سکونت اختیار کیے رکھی۔ بعد ازاں وطن واپس آئے تو "منہج الرشاد لنجاۃ العباد" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ صاحب نزہۃ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھنوی کے پاس خود

❶ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۶۲، ۶۳ - تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۰ - نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۱۱-

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۱۱، ۳۱۲ بحوالہ بحر زخار-

Marfat.com

مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا، اس کا سال کتابت ۱۱۸۱ھ/ ۱۷۶۷ء ہے۔

کتاب تین مقالات اور خاتمے پر مشتمل ہے۔ دو مقالے اعتقادیات پر محیط ہیں۔ مقالۂ اول مبدا اور مقالۂ ثانی معاد کا احاطہ کیے ہوئے ہے، مقالۂ ثالث اوراد و وظائف سے متعلق ہے۔ خاتمۂ کتاب بعض اولیائے کرام اور عالم خواب میں رسول اللہ ﷺ کی رؤیت کے بارے میں ہے۔

اس کتاب کے چند اقتباسات سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر کی جلد ششم میں نقل کیے ہیں۔ ان میں ایک اقتباس تشہد میں رفع سبابہ کے متعلق ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> اختلف علماء نا فی رفعها وعدمه فی التشهد فاجازه قوم ونقاه اخرون فالمثبتون کثیرون والنافون شرذمة قلیلون والحق ان الرافع هوالموافق للاحادیث الصحاح والروایات الفقهیة۔

> یعنی ہمارے علما کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ تشہد میں انگشت شہادت اٹھانی چاہیے یا نہیں۔ ایک جماعت نے اٹھانے کی اجازت دی ہے اور دوسروں نے اس سے روکا ہے، جو لوگ رفع سبابہ کے ثبوت کے قائل ہیں، ان کی تعداد زیادہ ہے اور روکنے والے بہت تھوڑے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ رفع سبابہ احادیث صحاح اور روایات فقہیہ کے عین مطابق ہے۔

ایک زمانے میں طبقۂ علما میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا کہ نماز جمعہ کے بعد احتیاطاً نماز ظہر پڑھنی چاہیے یا نہیں۔ بعض اس کے قائل تھے اور بعض مخالف۔ دونوں طرف کے علما اس سلسلے میں دلائل پیش کرتے ہیں۔ شیخ محمد شجاع ہتگامی نے بھی اس مسئلے پر بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ نماز جمعہ کا وجوب کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ فقہا میں اس کے وجوب سے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ اختلاف شرائط جمعہ میں ہے۔ مصنف نے اس ضمن میں دونوں نقطۂ ہائے نظر بیان کر دیے ہیں اور آخر میں یہ کہا ہے کہ روایات فقہی کی رو سے نماز جمعہ کے بعد بطور احتیاط نماز ظہر پڑھ لینی چاہیے۔ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت اور ان کا اپنا حکمران نہ ہو۔

شیخ محمد شجاع ہتگامی نے اس کتاب میں یزید بن معاویہ اور حجاج بن یوسف پر لعنت بھیجنے کی سخت الفاظ میں مخالفت کی ہے اور اس سلسلے میں مختلف دلائل دیتے ہوئے ایک دلیل یہ دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل قبلہ اور نمازیوں پر لعنت بھیجنے سے منع فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> لاینبغی اللعن علیه ولا علی الحجاج ومن کان من اهل القبلة لان النبی صلی الله علیه وسلم نهی عن لعن المصلین۔

> یعنی نہ تو یزید کو ملعون کہنا چاہیے نہ حجاج بن یوسف کو، نہ کسی ایسے شخص کو جو اہل قبلہ میں سے ہے، اس لیے کہ رسول ﷺ نے نمازیوں کو ملعون قرار دینے سے منع فرمایا ہے۔

کتاب کے جو بعض اقتباسات سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر میں نقل کیے ہیں، وہ بڑے

Marfat.com

دلچسپ اور مدلل ہیں۔ مصنف نے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض افکار سے بھی شدید اختلاف کیا ہے۔

بارھویں صدی ہجری کے یہ عالم قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر علوم مروجہ پر گہری نظر رکھتے تھے ❶۔

نمازِ جمعہ کے بعد احتیاطاً نمازِ ظہر پڑھنے کے متعلق مولانا محمد سجاع ہنگامی کا نقطۂ نظر صحیح نہیں۔ جمعہ ہر زمانے اور ہر ملک میں پڑھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد احتیاطاً نماز ظہر پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۳۳۔ مولانا محمد شفیع بدایونی

صوبہ یوپی کے شہر بدایوں کو طویل عرصے تک علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مولانا محمد شفیع بدایونی بھی اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے، اور عہد اورنگ زیب کے معروف علما اور ممتاز فقہا میں سے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد میں سے ایک بزرگ قاضی دانیال تھے جو عراق سے آئے اور بدایوں کے قاضی مقرر کیے گئے۔ انھوں نے مستقل طور پر بدایوں ہی میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ ان کی اولاد میں سے ایک شخص شیخ مصطفیٰ تھے، جو تصوف و معرفت میں یگانۂ روزگار تھے اور شیخ محی الدین ابن عربی کی تصنیفات کے دقیق مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں ماہر تھے۔ فقہ پر بھی نظر رکھتے تھے۔ یہ مولانا محمد شفیع بدایونی کے والد گرامی تھے۔ مولانا محمد شفیع بدایونی نے اپنے بلند مرتبت باپ سے علم حاصل کیا، اور فقہ، اصول اور تصوف کے اونچے درجے کو پہنچے۔ تمام عمر درس و تدریس میں صرف کر دی اور تشنگان علوم کو مستفید فرمایا۔ ۹۷ سال کی عمر پا کر ۲۲ شوال کو گیارھویں صدی ہجری کے آخر، یا بارھویں صدی ہجری کے اوائل میں فوت ہوئے۔ دو بیٹے اپنی یادگار چھوڑے، ایک کا نام مولانا محمد شریف تھا اور دوسرے کا خطیب عبداللطیف ❷۔

۳۴۔ قاضی محمد شفیع گجراتی

قاضی محمد شفیع گجراتی حنفی المسلک تھے۔ اپنے علاقے کے شیخ و فاضل بزرگ تھے اور فقہ و اصول میں یگانۂ روزگار شمار کیے جاتے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں میرٹھ کے منصب قضا پر مامور کیے گئے، جو اعمال احمد آباد میں واقع ہے ❸۔

۳۵۔ مولانا محمد صادق ٹھٹھوی سندھی

مولانا محمد صادق ٹھٹھوی سندھی شیخ عنایت اللہ ٹھٹھوی سندھی کے فرزند ارجمند تھے، جو دیار سندھ کے

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۱۵ تا ۳۱۸۔

❷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۹۳، ۱۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۱۸۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۱۹۔ بحوالہ مرآۃ احمدی۔

Marfat.com

بہت بڑے صوفی تھے۔ شیخ محمد صادق سندھی، ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ علم نحو اور علوم عربیہ یعنی فقہ و اصول اس دور کے جید عالم شیخ محمد معین سندھی سے حاصل کیے، اور علوم منقول و معقول کے فحول علما میں گردانے گئے۔ حصول علم کے بعد حج کے لیے روانہ ہوئے اور شہر سورت میں پہنچے تو وہاں شیخ عبدالولی بن شیخ سعد اللہ سلونی کا حلقۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور شیخ ممدوح سے علوم حکمیہ کی تکمیل کی۔ پھر اپنے وطن سندھ واپس آ گئے اور درس وتدریس کو اپنا مشغلہ بنالیا۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ صرف تدریس سے تعلق رکھتے تھے [1]۔

۳۶۔ شیخ محمد صالح بنگالی

شیخ محمد صالح بنگالی، فقہ و اصول، فلسفہ وحکمت، منطق و کلام اور تمام فنون نقلیہ وعقلیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ کتب درسیہ پہلے قاضی شہاب الدین گوپاموی (متوفی تقریباً ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء) سے پڑھیں۔ اس کے بعد سید محمد زاہد حسینی ہروی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ پھر خود درس و تدریس کی مسند بچھائی اور بہت سے طلبائے علم کو مستفید فرمایا [2]۔

۳۷۔ مولانا محمد صدیق لاہوری

مولانا محمد صدیق بن محمد حنیف بن محمد لطیف لاہوری۔ اپنے زمانے میں لاہور اور اس کے گرد ونواح کے جلیل القدر عالم تھے۔ ان کے والد محمد حنیف کابل سے لاہور آ کر مقیم ہوئے تھے، اور مسجد وزیر خاں میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ محمد صدیق اتوار کے روز ۲۹ محرم ۱۱۲۸ھ/۱۳ جنوری ۱۷۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر کو پہنچے تو صاحبِ تعلیقاتِ بیضاوی مولانا محمد عابد لاہوری سے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد مرزا احمد اللہ، ملا حفیظ اللہ، ملا عبداللہ، مولانا شہر یار، مولانا محمد عابد لاہوری اور بعض دیگر علما کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے اور تحصیل علم کی۔ پھر بحث واشتغال اور علم وفضل میں مرتبۂ بلند پر فائز ہوئے۔ جماعتِ علما میں صاحب فضل و کمال قرار پائے اور افتا وتدریس کی مسند جلیلہ کو رونق بخشی۔ طویل مدت تک درس و افادہ میں مصروف رہے۔ پھر ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء میں ارض حجاز کا سفر کیا اور حج وزیارت کے شرف سے مشرف ہوئے۔ اس زمانے میں وہاں متعدد اصحاب حدیث تعلیم حدیث کے فرائض انجام دیتے تھے، مولانا محمد صدیق ان کی خدمت میں گئے اور شیخ یحییٰ بن صالح مکی مدرس مدرسہ مسجد الحرام اور نامور محدث شیخ ابوالحسن سندھی مدرس مدرسہ مدینہ منورہ سے حدیث کی سند لی۔

مولانا محمد صدیق متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن کے نام یہ ہیں۔

سلک الدرر: یہ رسول اللہ ﷺ کی غیر منقوط سیرت ہے۔

---

[1] تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۶۵، ۳۶۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۲۰۔

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۲۱ بحوالہ رسالہ قطبیہ۔

Marfat.com

مدار الاسلام فی علم الکلام: القول الحق فی ترك الشعر والحلق، شروط الایمان، درء التعسف عن ساحة عصمة یوسف، هدم الطاغوت فی قصة هاروت وماروت، نورهدم الثقلین فی تمثال النعلین، شرح النفحات الباهره فی جواز القول بالخمسة الطاهره المسمی به توضیح السنة فی تفضیح البدعه، ازالة الفسادات فی شرح مناقب السادات ۔ یہ کتاب شیخ شہاب الدین دولت آبادی کی مناقب السادات کی شرح ہے۔تبییض الرق فی تبیین الحق فی ردماتساهل فیه الشیخ عبدالحق، جامع الوظائف، لقطة الحطب، الدیوان مزیل الاحزان، زبدة الفرح، جامع طب احمدی، ترجمه فقر محمدی، هدیة انام، یہ کتاب خطیبوں کے لیے ہے۔ان کے علاوہ ان کی بعض اور تصانیف بھی تھیں۔

مولانا محمد صدیق لاہوری، نامور فقیہ، کثیر التصانیف مصنف، بہترین ادیب اور انشا پرداز، مشہور مدرس اور صاحب تحقیق مفتی تھے۔خطۂ لاہور کے اس ہمہ اوصاف عالم نے ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء میں اس دنیائے فانی سے سفر آخرت اختیار کیا[1]۔

گزشتہ سطور میں مولانا محمد صدیق لاہوری کے اساتذہ میں ایک عالم دین مولانا شہر یار کا نام آیا ہے۔ یہ بہت بڑے صاحب علم بزرگ تھے اور لاہور کی مسجد چینیا نوالی میں امامت و خطابت اور تدریس و افتا کے منصب پر فائز تھے۔ان کے تفصیلی حالات تو افسوس ہے، معلوم نہیں ہو سکے، البتہ ان کا ایک واقعہ پروفیسر مولانا علم الدین سالک مرحوم نے روزنامہ ''امروز'' (لاہور مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۶۰ء) کے عید نمبر میں اپنے ایک مضمون میں بیان کیا تھا، جو ''لاہور کی تاریخی عید'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔اس واقعہ کا تعلق مولانا محمد صدیق سے بھی ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا، جب لاہور میں احمد شاہ ابدالی اور میر منو کا مقابلہ ہوا، اور ابدالی نے میر منو کو شکست دے کر لاہور فتح کیا۔اتفاقاً ان دنوں عید الفطر آئی تو احمد شاہ ابدالی نے مسجد وزیر خاں میں مولانا محمد صدیق کی اقتدا میں نماز ادا کی۔اس واقعہ کو سمجھنے کے لیے اس کا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے تاکہ اُس عہد کے پنجاب اور لاہور کے سیاسی حالات کا علم ہو سکے۔

نواب معین الملک عرف میر منو مغل حکمران محمد شاہ (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ، ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) کے وزیر اعظم نواب قمر الدین خاں کا خلف الرشید تھا۔اس نے سرہند کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے خلاف لڑتے ہوئے غیر معمولی شجاعت اور بے مثال استقلال کا مظاہرہ کیا تھا۔جب اس کا باپ توپ کے گولے سے زخمی ہو کر دارو گیر جہاں سے آزاد ہو گیا تو محمد شاہ نے اسے لاہور کا ناظم مقرر کیا اور حکم دیا کہ جس قدر جلد ہو سکے حالات پر قابو پایا جائے اور پنجاب سے ان عناصر کو ختم کر دیا جائے جو فتنہ و فساد پھیلانے کا باعث ہیں۔مرکز اس سلسلے

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۴- حدائق الحنفیہ ص ۴۵۱، ۴۵۲- نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۲۳، ۳۲۴-

Marfat.com

میں اس کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کرے گا۔

میر منو ان ہدایات کے مطابق لاہور پہنچا، اردگرد کے حالات کا جائزہ لیا اور مقابلہ کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی۔ ابھی وہ اپنے اس فرض سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ اطلاع ملی کہ احمد شاہ ابدالی سرہند کی جنگ کا انتقام لینے کے لیے بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ لاہور کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ میر منو نے اپنی فوج کو جمع کیا اور مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ دونوں جانب کی فوجیں عرصے تک ایک دوسرے کے سامنے پڑی رہیں۔ کبھی کبھار کوئی چھوٹی موٹی جھڑپ ہو جاتی، لیکن اس کے ساتھ ہی صلح کے لیے گفت و شنید بھی جاری رہی۔ آخر دونوں فریق (میر منو اور احمد شاہ ابدالی) اس بات پر متفق ہو گئے کہ لاہور کے چار محال یعنی سیالکوٹ، پسرور، گجرات اور اورنگ آباد کا مالیہ خراج کے طور پر سالانہ احمد شاہ کی خدمت میں پیش ہوتا رہے گا۔ یہ معاہدہ طے ہونے کے بعد ابدالی واپس چلا گیا۔

اس طرح ابدالی کے بیرونی خطرے کو دور کر کے میر منو داخلی فتنوں کی طرف متوجہ ہوا، اور ان کو ختم کرنے کے لیے اسے وقت مل گیا۔ اس نے اپنے علاقے میں نہایت مؤثر اقدامات کیے اور تھوڑے ہی عرصے میں پورے علاقے کو پہلے تو مرہٹوں سے نجات دلائی، پھر کامل حزم و احتیاط سے سکھوں کی طاقت کو ختم کیا اور ان کی دہشت گردی کی وجہ سے شہری اور دیہاتی زندگی میں جو تعطل پیدا ہو گیا تھا، اس کو رفع کیا۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملتان اور لاہور کے صوبے امن و سلامتی کا گہوارہ بن گئے۔

ان معاملات سے فارغ ہو کر میر منو نے ابدالی کے متوقع حملوں کی روک تھام کے لیے عملی تدابیر اختیار کیں۔ سرحدوں پر مورچے بنائے اور وہاں تازہ دم فوج متعین کی۔ وسائل رسل و رسائل اور آمد و رفت کا پورا انتظام کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام علاقہ خطرات کی زد سے محفوظ ہو گیا اور ہر شخص امن و اطمینان کا سانس لینے لگا۔

۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) کے آخر میں محمد شاہ نے وفات پائی۔ احمد شاہ ابدالی کو اس کی وفات کا پتا چلا تو اسے میر منو سے صلح کرنے پر بہت افسوس ہوا، کیونکہ وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھا کہ ایک بادشاہ کی موت اور دوسرے کی تخت نشینی سے کس قدر جھمیلے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر چند وہ میر منو کے مقابلے میں اترنا چاہتا تھا، مگر معاہدے کی پابندیوں سے جکڑا ہوا تھا، تاہم وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے بہانے تلاش کرتا رہا، لیکن اس وقت اسے کوئی بہانہ نہ مل سکا۔ ادھر میر منو بھی اس کے عزائم سے غافل نہ تھا، اس نے چار محال کے خراج کا چکمہ دے کر اور ایک سال کی رقم ادا کر کے اگرچہ اسے وقتی طور پر شمالی ہند پر حملہ آور ہونے سے روک دیا تھا، لیکن خراج کی پوری رقم چونکہ ادا نہیں کی گئی تھی، اس لیے اس کو بہانہ بنا کر کسی وقت بھی وہ شمالی ہند کو پامال کرنے کے لیے خراج کی بقایا رقم کو وجہ نزاع قرار دے سکتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ابدالی نے بقایا رقم کا مطالبہ کیا اور میر منو نے حسب معمول اسے الفاظ کی شیرینی سے ٹالنا چاہا۔ ابدالی نے یہ سوچ کر کہ فوج کشی کے بغیر یہ رقم وصول نہ ہو گی، فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ ایک لشکر جرار کے ساتھ دریائے سندھ عبور کیا، اور پوری تیزی سے چناب کے کنارے پہنچ کر دم لیا۔ وہاں سے اپنے دیوان راجہ سکھ جیون لال کو میر منو کے پاس بھیجا تا کہ وہ اس جھگڑے کو مصالحت

Marfat.com

کے ساتھ طے کر لے اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ راجہ سکھ جیون لال لاہور پہنچا تو میر منو نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور پوری خاطر مدارات کی، لیکن اسے خراج کی رقم وصول نہ ہوسکی اور وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا، جس سے احمد شاہ ابدالی کو سخت صدمہ پہنچا۔

دیوان راجہ سکھ جیون لال کو خالی ہاتھ واپس بھیجنے کے فوراً بعد میر منو نے اپنی فوج کو تیاری کا حکم دیا اور ایک زبردست فوج کے ساتھ چناب کی جانب روانہ ہوا۔ اس سے اس کا مقصد احمد شاہ ابدالی پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس کی دھمکیوں کی اسے پروا نہیں اور وہ لڑنے کو تیار ہے۔ لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے اس نے والی ملتان دیوان کوڑا مل اور والیٔ دوآب (جالندھر) آدینہ بیگ کو لکھا کہ وہ اپنی اپنی فوجوں کو حرکت دیں اور دریائے چناب کے کنارے آکر اس سے ملیں۔ ساتھ ہی احتیاط کے پیش نظر اپنی والدہ اور اہل وعیال کو (جموں) کشمیر بھیج دیا تاکہ وہ حملہ آور کی دست برد سے محفوظ رہیں۔

احمد شاہ ابدالی نے میر منو کے عزم وثبات کو دیکھ کر اپنے مورچے وزیر آباد اور سوہدرہ کے درمیان قائم کیے۔ مگر یہ مقام بھی اسے پسند نہ آیا تو وہاں سے آہستہ آہستہ سرکتا ہوا شاہدرہ کے قریب پہنچ گیا۔ میر منو بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ اس نے دریائے راوی عبور کیا اور خندقیں کھود کر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ ابدالی کا لشکر اس کے سامنے اور لاہور شہر اس کی پشت پر تھا۔ اب خندقوں کی اوٹ میں اکا دکا جھڑپیں ہونے لگیں۔ کئی روز یہ سلسلہ جاری رہا، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ البتہ فریقین کی فوجوں کی کثرت سے راوی اور چناب کا درمیانی علاقہ بالکل برباد ہو گیا اور قحط کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ایک رات ابدالی نے نہایت خفیہ طریقے سے راوی کو عبور کیا اور محمود بوٹی، اور شالامار باغ کے گردونواح میں اپنا کیمپ قائم کر لیا اور فیصلہ کن جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

ادھر میر منو کو اس کا علم ہوا تو اس نے بھی شمشیر بند ہو کر غنیم سے معرکہ آرا ہونے کا عزم کر لیا، شہر پناہ، قلعہ اور دوسرے اہم ناکوں کو درست کیا اور خندقوں کا دوبارہ جائزہ لیا۔ اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اس کے مورچے روز بروز کمزور ہو رہے ہیں، سامان رسد میں کمی واقع ہوگئی ہے اور جانوروں کے لیے چارہ کم یاب ہو گیا ہے۔ ابدالی کے فوجی دستے ہر چیز کی درآمد کو سختی کے ساتھ روک رہے ہیں۔ جھڑپیں بدستور جاری ہیں اور شکستہ دیواروں اور فصیلوں کی مرمت ہو رہی ہے۔ اس طرح چار مہینے گزر گئے۔ قحط نے باشندگان شہر کو اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ لیا ہے، مگر فوج کے لوگ پوری دلیری سے ابدالی کی ہر تدبیر کو ناکامی سے بدل دینے میں مصروف ہیں اور اس کے ہر حملے کا دنداں شکن جواب دے رہے ہیں۔ اس کے آدمی آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو میر منو کے فوجی پوری طاقت کے ساتھ ان کو پیچھے مورچوں میں دھکیل دیتے ہیں۔

احمد شاہ ابدالی کو یقین ہو گیا تھا کہ میر منو آخر دم تک لڑے گا، وہ لاہور شہر کا دفاع کرتا ہوا مر جائے گا مگر شہر اس کے حوالے نہیں کرے گا۔ یہ سوچ کر اس نے محاصرے کو اور زیادہ سخت کر دیا، اور جن جن راستوں سے شہر میں کھانے پینے کا سامان آتا تھا، ان پر قبضہ کر لیا۔ اس سے شہر کے لوگ بہت زیادہ پریشانی میں مبتلا ہو

Marfat.com

گئے اور حالات اس درجے ابتر ہو گئے کہ لوگوں نے چھپر کاٹ کاٹ کر چارے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیے۔ اس صورت حال کو دیکھ میر منو نے مجلس مشاورت منعقد کی، جس میں دیوان کوڑا مل، آدینہ بیگ اور متعدد چھوٹے بڑے امیر شریک ہوئے، انھوں نے تمام حالات کا جائزہ لیا اور افغانوں کے جبر و تشدد اور ظلم و ستم پر سخت نفرت کا اظہار کیا۔ معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد متفقہ طور سے فیصلہ کیا گیا کہ یا تو شہر سے باہر نکل کر دشمن پر حملہ کیا جائے اور پوری قوت سے کام لے کر اسے ختم کر دیا جائے یا پھر مصالحت کی کوشش کی جائے، مگر دیوان کوڑا مل نے اس کے خلاف رائے دی، اس نے کہا کہ جنگ کو طول دیا جائے کیونکہ دو ہفتے تک گرمی شروع ہو جائے گی، افغان اسے برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں، وہ اس سے گھبرا جائیں گے اور محاصرہ ختم کر کے واپس جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن دیوان مذکور کے اس دور اندیشانہ مشورے پر کسی نے کان نہ دھرے، اور سب لوگ پہلی تجویز پر عمل کرنے اور حملے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ ۱۲ اپریل ۱۷۵۲ء کو زور دار حملہ کیا گیا اور نتیجتاً پہلے ہی حملے میں محمود بوٹی کے کئی مورچوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنی فوجوں کی کمزوری دیکھی تو سواروں کو حکم دیا کہ وہ بھی توپ خانے کے ساتھ مل کر حملہ کریں۔

دو پہر تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، توپیں آگ برسا رہی تھیں اور لڑائی پوری شدت سے جاری تھی۔ اتنے میں دیوان راجہ کوڑا مل کا ہاتھی ایک قبر میں دھنس گیا اور ایک افغان سپاہی نے پوری تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا سر کاٹ لیا اور بطور نذر ابدالی کی خدمت میں پیش کیا۔ میر منو کے لیے یہ بہت بڑا حادثہ تھا، اور اس کی فوج میں اس سے بددلی اور انتشار پھیل گیا۔ آدینہ بیگ میدان جنگ سے بھاگ گیا اور فوج تتر بتر ہو گئی۔ میر منو نے حالات پر قابو پانے کی بے حد کوشش کی مگر ناکام رہا۔ مجبوراً باقی ماندہ فوج کو ساتھ لے کر شہر پناہ کے اندر داخل ہوا۔ لیکن اس کی حالت بالکل قابل اعتماد نہ رہی تھی۔

میر منو کے لیے یہ سخت آزمائش اور شدید ابتلا کا وقت تھا، اس نے ہر طرف سے مایوس ہو کر صلح کے لیے سلسلۂ جنبانی شروع کیا، اور ابدالی کے پاس اپنے ایلچی بھیجے اور اس کے صدر اعظم شاہ ولی خاں کی وساطت سے گفتگوئے مصالحت کا آغاز ہوا۔ ابدالی بھی تنگ آچکا تھا اور یہ سب اس کی منشا کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ معمولی سی ابتدائی گفت و شنید کے بعد اس نے محاصرہ اٹھا لیا اور اپنے ایک معتمد امیر جان خاں کو میر منو کے پاس بھیجا کہ اس کو کامل اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کے پاس لائے۔ ابدالی اس وقت شالا مار باغ میں مقیم تھا۔ امیر جان خاں میر منو کو اپنے ساتھ لے کر دربار میں داخل ہوا تو بادشاہ نے نہایت اعزاز و احترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا، مزاج پرسی کی اور بہترین الفاظ میں خیر خیریت پوچھی۔ ادھر ادھر کی بات چیت کے بعد احمد شاہ ابدالی نے میر منو سے کہا۔

''تم نے ابھی تک اپنے آقا (یعنی میرے) حضور اپنی نیازمندی کا اظہار کیوں نہیں کیا اور خاص اسی مقصد کے لیے ہمارے دربار میں حاضری نہیں دی''؟

میر منو نے کہا: ''میرا تعلق دوسرے آقا سے ہے۔''

Marfat.com

احمد شاہ ابدالی نے طنز کرتے ہوئے کہا: ''اس آڑے وقت میں تمھارا آقا تمھاری مدد کے لیے کیوں نہیں آیا؟''

میر منو نے جرأت مندانہ لہجے میں جواب دیا: ''اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ اس کے خادم اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں، کسی کے محتاج نہیں ہیں۔''

اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے میر منو سے پوچھا: ''فرض کرو، میں اس جنگ میں تمھارے ہاتھوں گرفتار ہو جاتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے؟''

میر منو نے نہایت متانت سے جواب دیا: ''میں اسی وقت اعلیٰ حضرت کا سر اقدس، جناب کے جسم مبارک سے علیحدہ کرتا اور اسے بطور نذر شہنشاہ دہلی کے حضور پیش کرتا۔''

احمد شاہ نے سوال کیا: ''اب تم مجھ سے اپنے ساتھ کس سلوک کی توقع رکھتے ہو؟''

میر منو نے پہلے سے زیادہ سنجیدہ شکل بنا کر جواب دیا: ''میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں، اگر آپ قصاب ہیں تو میرا سر قلم کر دیں، اگر بردہ فروش ہیں تو میرا جسم فروخت کر دیں اور اگر بادشاہ ہیں تو مجھے شاہانہ سلوک کا مستحق قرار دیں۔''

میر منو کے اس جواب سے احمد شاہ ابدالی نہایت متاثر ہوا، اس کا چہرہ چمک اٹھا اور اپنی نشست سے اٹھ کر میر منو سے بغل گیر ہوا، اسے فرزند خاں بہادر رستم ہند کا خطاب عطا کیا اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

ابھی احمد شاہ ابدالی کا قیام لاہور میں تھا کہ عید کا دن آ گیا۔ احمد شاہ کے حکم سے عید کی نماز کا انتظام مسجد وزیر خاں میں کیا گیا۔ اس کا باقاعدہ اعلان ہوا، اور امرا و وزرا کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں لوگ مسجد میں جمع ہوئے۔ ان دنوں مسجد وزیر خاں کے خطیب یہی مولانا محمد صدیق لاہوری تھے، جن کا اوپر کی سطروں میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ متبحر عالم دین اور ایک علمی خاندان کے فاضل جلیل تھے۔ ان کے والد بھی مسجد وزیر خاں کے منصب خطابت پر فائز رہ چکے تھے اور سب کے نزدیک قابل احترام تھے۔ نماز ختم ہوئی تو مولانا محمد صدیق خطبے کے لیے منبر پر تشریف لائے، خطبہ شروع ہوا، خطبے کے دوران انھوں نے احمد شاہ ابدالی کی طرف اشارہ کر کے اسے ''سلطان العادل'' کے لقب سے پکارا۔

اس وقت مولانا شہر یار بھی مسجد میں موجود اور نماز میں شریک تھے، وہ عالم گیر علمی شہرت کے مالک تھے، خطیب سے کچھ دور بیٹھے ہوئے تھے۔ اہل لاہور کے نزدیک وہ انتہائی قدر و منزلت کے حامل تھے۔ مسجد چینیاں والی میں گزشتہ بیس پچیس برس سے ان کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، جو ہندوستان کے علاوہ، ایران، توران، افغانستان، بلخ، بدخشاں اور ترکستان تک پھیلا ہوا تھا اور ان تمام ممالک کے طلبائے علم باقاعدہ ان کی خدمت میں آتے اور شریک درس ہوتے تھے۔ خود مسجد وزیر خاں کے خطیب مولانا

Marfat.com

محمد صدیق لاہوری بھی ان کے شاگرد تھے۔

جب خطبہ ختم ہوا اور مولانا شہریار اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھے تو کسی نے انھیں بتایا کہ آپ کے شاگرد رشید نے محض خوشامد کی غرض سے احمد شاہ ابدالی کو ''سلطان العادل'' کہا ہے، حالانکہ افغانوں کے بے پناہ مظالم سے تمام ملک چیخ اٹھا ہے۔ مولانا شہریار امام کے قریب پہنچے، احمد شاہ بھی وہاں کھڑا تھا۔ مولانا محمد صدیق نے احتراماً استاد کے ہاتھ چومے اور انتہائی تکریم بجالائے۔ احمد شاہ نے پوچھا، یہ کون بزرگ ہیں؟'' مولانا محمد صدیق نے کہا، ''میرے استاد مولانا شہریار۔'' وہ ان کی شہرت و قابلیت سے واقف تھا۔ چنانچہ وہ بھی آداب بجا لایا، اور سلام کیا۔ قدم بوسی کرنا چاہی تو مولانا نے منع کر دیا اور فرمایا ''یہ شریعت کے خلاف ہے۔ اس قسم کی حرکت بالکل نہیں کرنی چاہیے''۔ پھر اپنے شاگرد سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بیٹا! تم خوب جانتے ہو کہ افغانوں نے اہل شہر کو انتہائی پریشان کیا اور ہر قسم کے ظلم کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے ظلم و تشدد کی فریاد کتنی مرتبہ بادشاہ کے حضور کی گئی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی، کیا بادشاہ نے اس کا کوئی ازالہ کیا؟ اپنے ظالم سپاہیوں اور ستم گر سرداروں کو سزا دی؟ انھیں مظلوم شہریوں پر ظلم ڈھانے سے روکا؟ یاد رکھو، اسلام ایسے بادشاہ کو عادل کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔''

تمام حاضرین مولانا شہریار کی اس پُر تاثیر تقریر سے کانپ اٹھے۔ احمد شاہ ابدالی نے مولانا کو چپ کرانا چاہا مگر انھوں نے پروا نہ کی، اور اپنی بات مکمل کر کے رہے۔ آخر بادشاہ نے کہا۔

''حضرت مولانا! آپ کس کے بارے میں اور کس کے سامنے یہ باتیں کر رہے ہیں؟''

مولانا شہریار نے جواب دیا: ''میں خوب جانتا ہوں کہ میرا مخاطب کون ہے اور میں کس کے سامنے کھڑا یہ باتیں کر رہا ہوں۔''

احمد شاہ نے کہا: ''اس گفتگو کا انجام بھی آپ کو معلوم ہے؟''

مولانا شہریار نے کہا: ''ہاں! شہادت یا جلاوطنی، میں دونوں کے لیے تیار ہوں۔''

احمد شاہ ابدالی نے غصے میں آ کر مولانا کی جلاوطنی کا حکم دیا، اور پھر مولانا شہریار موضع ٹانڈہ ضلع ہوشیار پور میں جا کر آباد ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔

۳۸۔ مولانا محمد طاہر عباسی الہ آبادی

مولانا محمد طاہر عباسی الہ آبادی، علم و عمل میں یکتا، فضل و کمال میں منفرد اور درس و افادہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ برصغیر کے معروف عالم دین شیخ محمد یحیٰ عباسی الہ آبادی المعروف شیخ خوب اللہ الہ آبادی کے فرزند گرامی قدر اور نامور فاضل مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی کے برادر محترم تھے۔ ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۸ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے، جو ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک مشہور شہر ہے۔ تفسیر بیضاوی کے محشی مفتی جار اللہ حسینی الہ آبادی سے علم حاصل کیا اور فقہ کی تعلیم بھی انہی سے پائی، یہاں تک کہ تمام علوم مروجہ میں ماہر کامل ہوئے اور سب سے

Marfat.com

فوقیت لے گئے۔ تصنیف و تدریس اور افتا میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ نہایت ذہین، تیز حافظہ اور وسعت معلومات کے مالک تھے۔ معقولات و منقولات میں دسترس رکھتے اور مذاہب سلف و خلف سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ ان کے دو بھائی مولانا محمد ناصر الہ آبادی اور مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی جن کا شمار برصغیر کے فحول علما میں ہوتا ہے، ان کے شاگرد تھے، مولانا محمد یٰسین عثمانی جون پوری بھی ان کے حلقہ تلمذ میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

سلسلۂ تدریس کے ساتھ ساتھ مولانا محمد طاہر الہ آبادی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں ایک کتاب ''تحقیق الحق'' ہے جو انھوں نے قاضی نور اللہ شستری کی ''احقاق الحق'' کے جواب میں لکھی۔ قاضی شستری نے یہ کتاب شیخ روز بہان کی ''ابطال الباطل'' کے رد میں لکھی تھی، اور روز بہان نے اسے مطہر حلی کی ''نہج الحق'' کی تردید میں تصنیف کیا تھا۔ تحقیق الحق کے علاوہ مولانا محمد طاہر نے ابن العربی کی فصوص الحکم کی شرح سپرد قلم کی۔ بحث فدک کے بارے میں ایک رسالہ تالیف کیا۔ الشجرۃ القادریہ کی شرح قلم بند کی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ثبوت میں ایک رسالہ تحریر فرمایا۔ تفسیر بیضاوی پر تعلیقات لکھیں، قصیدہ طمطراقیہ کی شرح لکھی اور آیات تطہیر کی تفسیر رقم فرمائی۔ بہر حال مولانا محمد طاہر الہ آبادی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کے والد محترم مولانا محمد یحییٰ الہ آبادی بھی جلیل القدر عالم اور صوفی تھے۔ مولانا محمد طاہر نے پیر کے دن ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۳ھ/۲ نومبر ۱۷۳۰ء کو عین عالم شباب میں صرف تینتیس (۳۳) سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت مولانا محمد یحییٰ زندہ تھے۔ وہ بیٹے سے ٹھیک ایک سال بعد ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ/۳۱ اکتوبر ۱۷۳۱ء کو فوت ہوئے[1]۔

۳۹۔ مولانا محمد طاہر حسینی شاہ جہان پوری

مولانا محمد طاہر حسینی شاہ جہان پوری، فاضل اجل اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں یگانہ روزگار تھے۔ شاہ جہان پور میں پیدا ہوئے اور حصول علم کے شوق میں مختلف اساتذہ کی خدمت میں حاضری دی، جن میں درس نظامیہ کے مرتب مولانا نظام الدین سہالوی لکھنوی (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/۲۵ اپریل ۱۷۴۸ء) اور مولانا صفتہ اللہ خیر آبادی (متوفی ۱۸ ذی قعدہ ۱۱۵۷ھ/۱۲ دسمبر ۱۷۴۴ء) کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ سلسلۂ قادریہ کے مطابق مولانا نظام الدین سہالوی سے اخذ طریقت بھی کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے شہر شاہ جہاں پور میں مسند درس بچھائی اور زندگی بھر درس و افادہ میں مصروف رہے۔ بارھویں صدی ہجری میں یہ اپنے علاقے اور شہر کے جید علما میں گردانے جاتے تھے[2]۔

---

[1] نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۳۲۵، ۳۲۶ بحوالہ ذیل الفیات۔

[2] نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۳۲۶۔

Marfat.com

۴۰۔ مولانا محمد عابد سنامی لاہوری

مولانا محمد عابد سنامی لاہوری اپنے وقت اور علاقے کے شیخ، عالم کبیر اور مفسر وفقیہ تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھے۔ ولادت اور نشوونما لاہور میں ہوئی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے اور شیخ محمد سعید سرہندی کے بیٹے شیخ عبدالاحد سرہندی (متوفی ۲۷ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ/۱۳ دسمبر ۱۷۱۵ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ طویل مدت تک ان سے استفادہ کرتے اور اخذ علم اور کسب معرفت میں مصروف رہے۔ بلند ہمت اور مستقل مزاج اتنے تھے کہ دل میں حج بیت اللہ کے شوق نے کروٹ لی تو لاہور سے پاپیادہ روانہ ہو گئے اور راستے کی تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ فریضہ حج ادا کیا، مدینہ طیبہ گئے اور پھر عازم وطن ہوئے۔

مولانا محمد عابد لاہوری عابد وزاہد بزرگ تھے۔ قرآن مجید کی بکثرت تلاوت کرتے اور شب وروز کا بیشتر وقت وظائف واوراد اور ذکر الٰہی میں گزارتے۔ اس کے ساتھ ہی ہنگامۂ درس بھی جاری رکھتے اور بے شمار لوگ ان سے علمی استفادہ کرتے۔ ان کے حلقۂ درس میں تقریباً دو سو آدمی روزانہ آتے جو علم ومعرفت سے بہرہ مند ہوتے۔ یہ عالم دین تصنیف وتالیف کا بھی گہرا ذوق رکھتے تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں تفسیر بیضاوی کے حواشی وتعلیقات (لیکن نامکمل) خلاصۂ کیدانی کی بسیط ومفصل شرح، قصیدۂ بانت سعاد کی شرح، وجوہ اعجاز قرآن، رسالہ فی الاربعۃ الاحتیاطیۃ بعد صلوٰۃ الجمعہ، العشرۃ المبشرہ۔ فضائل الامۃ المرحومہ کتابیں ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

مولانا محمد عابد سنامی لاہوری نے ۱۸ رمضان المبارک ۱۱۶۰ھ/۱۲ ستمبر ۱۷۴۷ء کو وفات پائی اور لاہور میں دفن کیے گئے [1]۔

۴۱۔ قاضی محمد عاشق کرانوی

قاضی محمد عاشق بن عبدالواحد بن محمد یعقوب انصاری سہالوی ثم کرانوی اپنے دور کے شیخ اور فقیہ تھے۔ شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے خاندان سے تھے۔ مولد ومنشا موضع سہالی ہے، جو لکھنؤ کے نواح میں واقع ہے۔ برصغیر کے نامور عالم اور درس نظامیہ کے مرتب شیخ نظام الدین انصاری سہالوی، (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/۲۵ اپریل ۱۷۴۸ء) کے ہم درس تھے۔ شرح شمسیہ سے لے کر شرح مواقف تک درسی کتابوں میں دونوں ایک دوسرے کے شریک درس رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عازم دہلی ہوئے اور مغل بادشاہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء میں ان کو اعمال مظفر نگر کے دو گاؤں کرانہ اور شاملی کے منصب

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۱، ۲۰۲۔ معمولات مظہریہ ص ۱۸، ۱۴۳۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۴۴، ۴۴۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۲، ۳۲۷

Marfat.com

قضا پر مامور کیا۔ ان کے علم وفضل کی بنا پر اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم نے جو اس زمانے میں ہندوستان کا بادشاہ تھا، انھیں ''معین العلماء'' کا لقب عطا کیا۔ تمام عمر مسند قضا پر متمکن رہے۔ نہایت نیک، پابند شرع اور عبادت گزار تھے۔ فرائض قضا بڑی محنت اور مستعدی سے انجام دیتے، اس اہم خدمت کے ساتھ ساتھ درس وافادے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ دور دراز سے تشنگان علوم حاضر خدمت ہوتے اور اخذ علم کرتے۔ اس عالم وفقیہ نے ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۶ء میں کرانہ میں وفات پائی❶۔

۴۲۔ سید محمد عدل بریلوی

سید محمد عدل بن سید محمد بن سید علم اللہ حسنی بریلوی کا شمار کبار مشائخ نقشبندیہ میں ہوتا ہے۔ اپنے عصر اور علاقے کے عارف کبیر اور فقیہ نام دار تھے۔ برصغیر کے جلیل القدر مجاہد حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجداد میں سے تھے۔ زہد وتقویٰ، ورع وعبادت، ایثار واستغنا، علو ہمت، اخلاق فاضلہ، لوگوں کی مدد اور اپنے رفقا کی اعانت کے سلسلے میں ان کا مقام بہت بلند تھا اور اس ضمن میں انھیں خاص شہرت حاصل تھی۔

سید محمد عدل یوپی کے شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ تحصیل علم اپنے بڑے بھائی سید محمد حکم بریلوی (متوفی ۲۲ شوال ۱۱۵۰ھ/ یکم فروری ۱۷۳۸ء) سے کی۔ سید محمد حکم نے علم صرف اور نحو کے موضوع سے متعلق ان کے لیے کچھ رسالے بھی تصنیف کیے۔ بھائی سے تحصیل علم کے بعد والد محترم سید محمد حسنی بریلوی (متوفی ۲۴ ربیع الثانی ۱۱۵۶ھ/ ۶ رجون ۱۷۴۳ء) سے وابستہ ہوگئے۔ ان سے اخذ طریقت کیا اور مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ والد کی وفات کے بعد علاقۂ اودھ کی مشیخت انہی کے حصے میں آئی اور بہت سے علما ومشائخ اور خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔ سید محمد عدل حسنی بریلوی نے ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۹۲ھ/۱۳ اکتوبر ۱۷۷۸ء کو بریلی میں وفات پائی اور وہیں اپنے جد مکرم سید علم اللہ حسنی کے زاویہ میں دفن کیے گئے❷۔

۴۳۔ شیخ محمد علی بدایونی

شیخ محمد علی بن محمد نظیف بن عبداللطیف بن محمد شفیع عثمانی بدایونی، اپنے زمانے کے نامور فقہا اور مشاہیر اصحاب صلاح میں سے تھے۔ ان کے دادا عبداللطیف بدایوں کی اس مسجد کے خطیب تھے، جسے سلطان شمس الدین التمش نے ۶۲۰ھ (۱۲۲۳ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ محمد علی ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بڑے ہوئے تو حصول علم کی طرف توجہ کی، کچھ عرصہ تو اپنے شہر کے علما سے اخذ علم کرتے رہے، بعد ازاں دہلی کا عزم کیا، وہاں قاضی مبارک فاروقی گوپاموی (متوفی ۵ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ/ ۱۸ ستمبر ۱۷۲۹ء) کا ہنگامۂ درس

❶ مناقب رزاقیہ اغصان الانساب۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۲۸۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۳۰، ۳۳۱۔ اعلام الہدیٰ۔

Marfat.com

جاری تھا، جو اپنے عہد کے بہت بڑے عالم، مدرس اور مصنف تھے، محمد علی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ اسی اثنا میں انھوں نے قاضی محمد پناہ جون پوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جو بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم اور معقول و منقول کے ماہر تھے۔ قاضی محمد پناہ جون پوری کے ذکر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ محمد شاہ کے عہد میں نادر شاہ دہلی آیا تو بہت سے علما بھی اس کے ہم رکاب تھے۔ قاضی محمد پناہ نے اس کے سامنے ان علما سے مسئلہ قتال پر مناظرہ کیا اور وہ ایک اہم مناظرہ تھا جس میں قاضی ممدوح نے نادر شاہ کے علما کو اپنے علم و فضل کے زور سے لاجواب کر دیا تھا۔ اس موقعے پر ان کے کثرت مطالعہ اور وسعت معلومات سے متاثر ہو کر نادر شاہ نے انھیں مستعد خاں کا خطاب عطا کیا اور محمد شاہ نے ان کو جون پور کے منصب قضا پر مامور کیا، جس پر وہ عمر بھر متعین رہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد شیخ محمد علی بدایونی شیخ عبداللہ حسینی دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جنھیں نیکی اور تقوے کی فراوانی کی وجہ سے اپنے عصر کے ابدال میں شمار کیا جاتا تھا، ان سے انھوں نے اخذ طریقت کیا اور مستفیض ہوئے۔ بعد ازاں اپنے شہر بدایوں گئے اور تمام تر توجہ درس و افادۂ طلبا میں مبذول کر دی۔ اس اثنا میں بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا اور ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔ شیخ محمد علی بدایونی نے ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں لکھنؤ میں داعی اجل کو لبیک کہا[1]۔

۴۴۔ شیخ محمد غوث کاکوروی

شیخ محمد غوث کاکوروی نہایت فاضل آدمی تھے۔ کاکوری کے مردم آفرین خطے سے تعلق رکھتے تھے۔ صاحب تذکرۃ الانساب نجم الدین خاں کاکوروی کی روایت کے مطابق بڑے بلند مرتبے کے مالک تھے، سلسلۂ نسب چھبیس واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے اور علم و عمل کے ماحول اور فضل و کمال کی فضا میں پرورش پائی۔ مختلف علوم کی مختصر اور چھوٹی کتابیں شیخ محمد زمان کاکوروی[2] سے پڑھیں اور مطولات کے لیے شیخ ابوالواعظ ہرگامی[3] (یکے از مرتبین فتاویٰ عالم گیری) اور شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی[4] کے باب عالی پر دستک دی۔ علم حدیث شیخ محمد یعقوب بنانی لاہوری[5] سے حاصل کیا۔

---

1. نزہتہ الخواطر، ج ۶، ص ۳۲۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۳۔
2. شیخ محمد زمان کاکوروی کے حالات کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب ''برصغیر میں علم فقہ'' ص ۳۲۳۔
3. شیخ ابوالواعظ ہرگامی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو ''برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ'' ص ۳۰۵ تا ۳۰۸ اور فقہائے ہند جلد چہارم۔
4. شیخ قطب الدین شہید سہالوی کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد پنجم۔
5. شیخ محمد یعقوب بنانی لاہوری کے حالات کے لیے دیکھیے ''برصغیر میں علم فقہ'' ص ۳۲۳۔ نیز ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد پنجم۔

نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۳۳۹۔ برصغیر میں علم فقہ ص ۳۲۲ تا ۳۲۴

Marfat.com

حصول علم کے بعد شیخ محمد غوث کاکوروی نے بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر سے ملاقات کی۔ ان دنوں علمائے ہند کی ایک جماعت فتاویٰ عالم گیری مرتب کر رہی تھی۔ شیخ محمد غوث چونکہ علم فقہ پر عبور رکھتے تھے، اس لیے اورنگ زیب نے ان کو بھی علما کی اس جماعت میں شریک کر لیا اور وہ یہ اہم خدمت انجام دینے میں مصروف ہو گئے۔ فتاویٰ عالم گیری کی تدوین کا سلسلہ تکمیل کو پہنچا تو بادشاہ نے ان کو علاقۂ اودھ میں جزیہ وصول کرنے پر مامور کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شیخ ممدوح نے درس و تدریس اور افادۂ طلبا کا کام بھی بہ دستور جاری رکھا، اس میں بھی وہ نہایت کامیاب تھے، بے شمار علما اور طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

شیخ محمد غوث کاکوروی نے ۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۶ء میں اس دنیائے فانی سے رخت سفر باندھا❶۔

۴۵۔ شیخ محمد فاخر زائر عباسی الٰہ آبادی

شیخ محمد فاخر زائر عباسی الٰہ آبادی کے والد ماجد کا اسم گرامی شیخ محمد یحییٰ تھا جو برصغیر کے ممتاز عالم تھے اور شیخ خوب اللہ الٰہ آبادی کے عرف سے معروف تھے۔ ان کا تذکرہ آئندہ صفحات میں آ رہا ہے۔

شیخ محمد فاخر کی ولادت ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء میں ہوئی۔ مولد و منشا ہندوستان کے صوبہ یو پی کا شہر الٰہ آباد تھا۔ چشم شعور وا ہوئی تو دیکھا کہ گھر میں علم کی نہر جاری ہے اور پوری فضا تقویٰ و پرہیز گاری سے معمور!

علم و فضل:

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے ''سرو آزاد'' میں شیخ محمد فاخر زائر کا ذکر نہایت محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ زائر کے علم و فضل اور تدین و تقویٰ سے انتہائی متاثر تھے۔ ان کی علمی سرگرمیوں، ان کی تصنیفات، وسعت معلومات، ان کے جذبۂ اتباع سنت، ان کی مہمان نوازی، ان کی فراخیٔ قلب، کشادہ دستی، ان کے ذوق شعری اور ملکۂ ادبیت کا خوب صورت الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں۔ اس باب میں ان کے فارسی الفاظ جذبات عقیدت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

شیخ محمد فاخر جن کا تخلص زائر تھا اور شیخ محمد یحییٰ المعروف، شاہ خوب اللہ الٰہ آبادی عباسی کے فرزند رشید تھے، عمدہ ترین اوصاف سے متصف اور بلند ترین مناقب سے بہرہ مند تھے۔ ان کی اساس فکری بہ درجہ غایت محکم تھی اور وہ کمالات بوقلموں میں مدارج علیا پر فائز تھے۔ نیکی میں ولایت کبریٰ کے مرتبے کو پہنچے ہوئے، علوم نقلیہ میں میزان عدل اور فنون عقلیہ میں برہان اصل۔ کمال درجے کے پابند شرع، ہمیشہ ہر معاملے میں احکام شریعت کو مشعل راہ قرار دینے والے، انتہائی کشادہ دست اور شگفتہ مزاج۔ کسی چیز کو بچا کر اور ذخیرہ بنا کر نہ رکھتے، اپنے بیگانے سب پر بے دریغ احسان کرتے۔ ان کے شب و روز کا زیادہ تر حصہ سفر میں گزرتا اور دوران

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۳۹۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۲۲ تا ۳۲۴۔

Marfat.com

سفر مسافروں کی کثیر تعداد ان کے ہمراہ ہوتی۔ ہر شخص کو سامان اکل و شرب خود مہیا فرماتے اور اس کے لباس و پیرہن کی کفالت کرتے۔ جب تک تمام رفقا کے سامنے کھانا نہ آجاتا، دستر خوان پر نہ بیٹھتے (۱)۔

شیخ محمد فاخر آغاز عمر ہی میں اپنے والد مکرم شیخ محمد یحییٰ الہ آبادی اور برادر اکبر شیخ محمد طاہر الہ آبادی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے تھے۔ تمام کتب درسیہ خاص ترتیب اور محنت کے ساتھ پڑھیں اور پھر عین جوانی میں خود مسند تدریس کو زینت بخشی۔ ان کے نانا کا اسم گرامی شیخ محمد افضل تھا، جو اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم اور صاحب کمال فاضل تھے۔ وہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/۱۲ جنوری ۱۷۱۳ء کو فوت ہوئے۔ انھوں نے وقت ولادت ہی سے محمد فاخر کو اپنی آغوش تربیت وارادت میں لے لیا تھا، لیکن نواسے کی پیدائش سے صرف چار سال بعد شیخ محمد افضل کا انتقال ہو گیا، اس لیے پھر وہ ان کے والد شیخ محمد یحییٰ کی تربیت میں دے دیے گئے تاکہ وہ اپنے سایۂ پدری میں بیٹے کی تربیت و تحصیل علم کا خاطر خواہ انتظام کریں اور ان کی ذہنی وفکری صلاحیتوں کے نشو ونما کے لیے بہترین اسباب مہیا فرمائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم و عمل کی بے پناہ دولت سے مالا مال کیا اور اپنے والد گرامی شیخ محمد یحییٰ کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ یہ ان کی عین جوانی کا زمانہ تھا۔

حج بیت اللہ کے لیے مختلف سفر:

شیخ محمد فاخر ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۷ء میں عازم حرمین شریفین ہوئے اور ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۹ء میں سعادت حج حاصل کی۔ اس سال شیخ محمد فاخر کے بعد سید غلام علی آزاد بلگرامی بھی حج بیت اللہ کے لیے گئے تھے۔ جب آزاد جہاز سے جدہ کی بندرگاہ سے اترے تو شیخ ممدوح وہاں موجود تھے، انھوں نے آزاد کا شان دار استقبال کیا اور دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ان دونوں کے درمیان پہلے ہی سے بہت اچھے اور مخلصانہ تعلقات تھے اور ایک دوسرے کی انتہائی قدر کرتے تھے۔ دونوں اکٹھے مکہ مکرمہ گئے اور زیارت بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی کا ہنگامہ درس حدیث جاری تھا، جس سے عرب و عجم کے بے شمار علما و طلبا مستفید ہو رہے تھے، شیخ محمد فاخر نے اس موقع کو غنیمت جانا اور طلب حدیث کے لیے اس میں شامل ہو گئے اور خوب استفادہ کیا۔ شیخ محمد حیات سے انھوں نے حدیث کی مروجہ کتابیں پڑھیں، صحیح بخاری مکمل کی اور صحیح مسلم کا کچھ حصہ پڑھا۔ شیخ محمد حیات نے یکم شعبان ۱۱۵۰ھ/۱۳ نومبر ۱۷۳۷ء کو انھیں سند و اجازہ سے سرفراز کیا۔ بعد ازاں اسی جہاز سے جس پر آزاد بلگرامی گئے تھے، شیخ محمد فاخر واپس ہندوستان تشریف لائے۔ ارض حجاز سے واپسی پر صحیح مسلم کا ایک نسخہ بھی اپنے ساتھ لائے، جس کی کچھ برس پیشتر ایک نقل کتب خانہ حبیب گنج (علی گڑھ) میں موجود تھی۔ طباعت و اشاعت کے اس دور میں شاید اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے، لیکن یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ اس برصغیر میں حدیث کی کسی کتاب کا قلمی نسخہ کسی کے پاس پایا جانا بہت بڑی بات تھی۔

(۱) سرو آزاد ص ۲۱۸

Marfat.com

۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں شیخ محمد فاخر کے دل میں دوسری مرتبہ داعیۂ حج پیدا ہوا، اور وہ الٰہ آباد سے حجاز کی مقدس سرزمین کو روانہ ہوئے۔ اس عہد کے سفر کی صعوبتوں اور راستوں کی طوالت کا اندازہ کیجیے کہ الٰہ آباد سے روانہ ہونے سے کئی ماہ بعد شیخ بندرگاہ سے جہاز میں سوار ہوئے۔ سیاسی لحاظ سے ہندوستان میں یہ دور بڑا ہی پر آشوب تھا اور بحر ہند کے ساحلی علاقوں کی بندرگاہوں میں مرہٹوں کے ظلم وستم کا انتہائی الم ناک سلسلہ جاری تھا، وہ لوگوں کو لوٹتے اور ان پر بے حد مظالم ڈھاتے تھے۔ جس جہاز میں شیخ محمد فاخر سوار تھے، سوئے اتفاق سے وہ بھی مرہٹوں کی گرفت میں آ گیا۔ مرہٹے اس پر حملہ آور ہوئے اور بسی کی بندرگاہ میں لے گئے، جہاز میں جتنے لوگ سوار تھے ان کا سامان لوٹ لیا۔ شیخ محمد فاخر کے سامان کی طرف متوجہ ہوئے تو دیگر سامان کے علاوہ ان کے پاس کتابوں کا ایک صندوق بھی تھا، راہزن مرہٹوں نے شیخ کا سامان تو لوٹ لیا، البتہ کتابوں کا صندوق واپس کر دیا اور یہ مہربانی بھی کہ اپنی طرف سے سواری کا انتظام کر کے انھیں سورت کی بندرگاہ میں پہنچا دیا۔ اس کے بعد دوسرا جہاز روانہ ہونے تک شیخ ممدوح سورت ہی میں اقامت گزیں رہے۔ کئی مہینوں کے شدید انتظار کے بعد صفر ۱۱۵۶ھ/اپریل ۱۷۴۳ء میں جہاز روانہ ہوا۔ لیکن قدرت الٰہی کا فیصلہ دیکھیے کہ بندرگاہ مخا میں پہنچ کر یہ جہاز تباہ ہو گیا اور دوسرے جہاز کے انتظام تک مجبوراً کئی مہینے اس بندرگاہ میں ٹھہرنا پڑا۔ ان دنوں سمندر کے مدوجزر کا اندازہ کر کے کشتیاں چلتیں اور جہاز روانہ ہوتے تھے اور صاف موسم کی آمد تک لوگ بندرگاہوں میں پڑے رہتے تھے۔ خدا خدا کر کے کشتی چلنے کا موسم آیا تو شیخ اس میں سوار ہوئے اور مکہ معظمہ کا قصد فرمایا۔ وہاں سے روانہ ہو کر ۲۲ رمضان ۱۱۵۶ھ/ ۲۹ اکتوبر ۱۷۴۳ء کو حرم کعبہ میں داخل ہوئے اور حج بیت اللہ کیا۔ اس سال حج جمعۃ المبارک کو ہوا تھا، جسے عرف عام میں ''حج اکبر'' کہا جاتا ہے۔ تین سال بعد ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں ہندوستان کا قصد فرمایا اور بندرگاہ سورت میں اترے۔ جمادی الاولیٰ ۱۱۵۹ھ/مئی ۱۷۴۶ء میں سورت سے وطن روانہ ہوئے۔ اس عہد کی مشکلات سفر دیکھیے کہ رجب ۱۱۵۹ھ/ جولائی ۱۷۴۶ء کو شیخ دہلی پہنچے، یعنی سورت سے دہلی تک کا سفر تین مہینے میں طے ہوا۔ میرزا مظہر جان جاناں جن کا شمار بارھویں صدی ہجری میں برصغیر کے رفیع القدر علما میں ہوتا تھا ان دنوں دہلی میں فروکش تھے، وہ شیخ ممدوح سے ملے اور نہایت محظوظ ہوئے۔ شیخ کے قیام دہلی کے زمانے میں ان دونوں کی کئی صحبتیں ہوئیں اور مختلف قسم کے مسائل زیر بحث آئے۔

دہلی سے شیخ محمد فاخر اپنے وطن الٰہ آباد پہنچے اور صرف ایک سال وہاں ٹھہرے تھے کہ تیسری مرتبہ دل میں جذبۂ حج بیت اللہ نے پھر انگڑائی لی اور شوال ۱۱۶۰ھ/ اکتوبر ۱۷۴۷ء میں الٰہ آباد سے عازم بنگال ہوئے۔ اس مرتبہ وہ بنگال سے جہاز میں سوار ہونا چاہتے تھے۔ الٰہ آباد سے عظیم آباد، پٹنہ اور مرشد آباد وغیرہ بلاد وامصار کو روانہ ہوئے۔ اپنے اوصاف بوقلموں کی بنا پر وہ دیار ہند میں انتہائی اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ راستے میں جن جن شہروں اور علاقوں کے حکام وامرا اور عوام وخواص کو ان کی تشریف آوری کا علم ہوتا وہ استقبال کے لیے آتے اور انتہائی عزت وتکریم کا ثبوت بہم پہنچاتے۔ اس طرح ہگلی کی بندرگاہ میں پہنچے اور وہاں سے جہاز پر

Marfat.com

سوار ہوئے، لیکن جہاز نے ابھی چند روز کا سفر کیا تھا کہ اس کے تختے ٹوٹ گئے اور جہاز بے کار ہو گیا۔ آخر چاٹ گام واپس آئے اور دوسرے جہاز کا انتظار کرنے لگے، چار مہینے چاٹ گام میں مقیم رہے، لیکن موسم کی خرابی کے باعث جہاز روانہ نہ ہو سکا۔ بالآخر واپس الٰہ آباد کو مراجعت فرما ہوئے۔ اثنائے راہ میں جس طرف سے گزر ہوتا لوگ بے حد عقیدت سے پیش آتے۔

اب کی مرتبہ شیخ محمد فاخر تقریباً دو مہینے الٰہ آباد مقیم رہے اور چوتھی مرتبہ قصد حج فرمایا۔ اس کے لیے انھوں نے دہلی کا عزم کیا اور ۲۵ رمضان ۱۱۶۲ھ/ ۲۸ اگست ۱۷۴۹ء کو وارد دہلی ہوئے۔ چند روز دہلی میں قیام رہا۔ ان دنوں سید غلام علی آزاد بلگرامی دکن میں قیام پذیر تھے اور شیخ محمد فاخر سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ شیخ نے محض ان سے ملاقات کے لیے دہلی سے دکن کا قصد کیا۔ وہ یکم شعبان ۱۱۶۴ھ/ ۱۴ جون ۱۷۵۱ء کو اس مقصد کے لیے دہلی سے روانہ ہوئے۔ اور ۵ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ/ ۱۴ اکتوبر ۱۷۵۱ء کو برہان پور پہنچے۔ یعنی دہلی سے برہان پور تک کا سفر چار مہینے میں طے ہوا۔ لیکن آزاد بلگرامی افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ قسمت نے یاوری نہ کی اور وقت نے مہلت نہ دی کہ دو پرانے دوست ایک دوسرے سے ملاقات کر سکیں۔ شیخ دریائے نربدا عبور کر کے سرسام کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ اسی حالت میں برہان پور پہنچے تو مرض نے شدت اختیار کر لی اور ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ/ ۲۰ اکتوبر ۱۷۵۱ء کو یک شنبہ کے روز اشراق کے وقت اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔ آزاد بلگرامی کے الفاظ میں "جان عزیز را درراہ بیت اللہ فدا ساخت" تاریخ ولادت جو ۱۱۲۰ھ ہے "خورشید" سے اور تاریخ وفات "زوال خورشید" سے نکلتی ہے۔

شیخ کے متعلق اکابر علما کی رائے:

شیخ محمد فاخر نے صرف چوالیس (۴۴) برس عمر پائی۔ آزاد بلگرامی جوان کے جگری دوست تھے، بدرجہ غایت شان دار الفاظ میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ انھیں وہ متقی، پرہیز گار، عبادت گزار، بدرجۂ کمال پابند شرع، متبع سنت، خوش مزاج، وسیع القلب، شگفتہ بیان، علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر، صاحب صفات رضیہ، ولی اللہ، حامل میزان عدل، پیکر جود وسخا، اور محسن انسانیت قرار دیتے ہیں۔ وہ ان کے علمی کمالات اور ذاتی محاسن کی وجہ سے ان کی موت پر نہایت حزن وملال کا اظہار کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

واحسرتا کہ ایں چنیں صاحب کمال درایام شباب ازیں عالم رحلت کرد و داغ مفارقت بر دل یاراں گزاشت، سپہر دوّار اگر عمر ہا چرخ زند مشکل کہ چنیں ذات قدسی صفات بہم رساند[۱]۔

(نہایت حسرت وملال کی بات ہے کہ ان اوصاف کے حامل اور صاحب کمال نے عالم جوانی میں اس دنیا سے کوچ کیا اور دوستوں کے دل پر داغ جدائی چھوڑا، آسمان اگر تمام عمر گھومتا رہے تو مشکل ہے کہ اس

[۱] سرو آزاد، ص ۲۱۸

Marfat.com

قسم کا قدسی صفات شخص پیدا ہو۔)

مرزا مظہر جان جاناں بارھویں صدی ہجری کی عظیم شخصیت اور شیخ محمد فاخر کے معاصر تھے، وہ شیخ کی انتہائی تعظیم کرتے تھے۔ وسعت علم اور کشادگی فکر و نظر کے باوجود وہ ایک گوشہ گیر بزرگ تھے، کسی کے ہاں آمد و رفت نہ رکھتے تھے، لیکن شیخ محمد فاخر کے پاس ضرور جاتے، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

مرزا خلاف وضع خود بملاقات شیخ محمد فاخر اکثر می رسد ❶۔

(مرزا مظہر جان جاناں اپنی عادت کے خلاف اکثر شیخ محمد فاخر کی ملاقات کو جاتے۔)

وہ شیخ کے علم و فضل اور اتباع سنت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بسیارے از کبرائے دین را مشاہدہ نمودم، بعد از یازدہ صد سال یک شخص کہ عبارت از شیخ محمد فاخر باشد موافق کتاب و سنت دریافتم ❷۔

(بہت سے اکابر دین کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، مگر گیارہ سو سال کے بعد صرف ایک شخص کو جس کا نام شیخ محمد فاخر ہے، قرآن و حدیث کے موافق پایا۔)

وہ یہ بھی فرماتے ہیں:

بسار ارباب کمال را برخوردم، آں قدر کہ نزد شیخ محمد فاخر ارزاں شدم ہیچ جا اتفاق نیفتاد ❸۔

یعنی بہت سے اہل کمال کو آزما دیکھا، لیکن جو چیز شیخ محمد فاخر کے پاس وافر مقدار میں حاصل ہوئی وہ کسی دوسری جگہ نہ مل سکی۔

نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

شیخ محمد فاخر اگرچہ در جمیع فنون و تمام علوم ید بیضا داشت و علم سبقت بر سابقین می افراشت لیکن علم حدیث بروئے بحدے غالب آمدہ کہ گویا غیر آں را آشنا نہ بودہ است۔ غالب تصانیف او در انتصار سنت است و مختار اہل حدیث و رد بدعت و اہل اوست ❹۔

(شیخ محمد فاخر یوں تو تمام علوم و فنون میں کامل دسترس رکھتے تھے اور اپنے سے پہلے اہل علم کے مقابلے میں ان کی معلومات کا جھنڈا سب سے اونچا تھا، لیکن خصوصیت کے ساتھ علم حدیث تو ان پر اس قدر غالب تھا کہ گویا اس کے علاوہ انھیں کسی چیز سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ ان کی زیادہ تر تصانیف سنت محمدیہ کی تائید اور مسائل اہل حدیث کی وضاحت اور اہل بدعت کی تردید میں ہیں۔)

❶ سرو آزاد ص ۲۱۸

❷ ایضاً

❸ ایضاً

❹ اتحاف النبلاء ص ۴۰۶۔

Marfat.com

دوسری جگہ نواب صاحب لکھتے ہیں:

وے رحمہ اللہ تعالیٰ امام ائمہ متبعین سنت سرزمین ہند وشیخ الشیوخ اکابر علما ارجمند، ظاہرش محدث بود و باطنش صوفی ❶۔

(یعنی شیخ محمد فاخر رحمۃ اللہ علیہ کو سرزمین ہند میں ائمہ متبعین سنت کے امام کی حیثیت حاصل تھی اور اکابر علمائے مشاہیر میں ان کا درجہ شیخ الشیوخ کا تھا، وہ ظاہر میں محدث اور باطن میں صوفی تھے۔)

شاہ غلام علی نے مقامات مظہریہ میں ان کو کبار علمائے حدیث میں شمار کیا ہے ❷۔

مولوی رحمان علی نے شان دار الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

شاہ محمد فاخر الہ آبادی زائر تخلص بن شاہ خوب اللہ الہ آبادی جامع علوم ظاہر و باطن بود۔ اکتساب علوم ظاہر بخدمت برادر کلاں خود شیخ محمد طاہر کردہ، حق سبحانہ تعالیٰ شانہ او را شانے عظیم داوہ بود، بعمر بست و یک سالگی بجائے پدر بزرگ وار وسادہ آرائے خلافت شدہ ❸۔

(شاہ محمد فاخر الہ آبادی جن کا تخلص زائر تھا، شاہ خوب اللہ الہ آبادی کے بیٹے تھے، ظاہری و باطنی علوم میں پوری جامعیت کے مالک تھے۔ انھوں نے علوم ظاہری اپنے بڑے بھائی شیخ محمد طاہر سے حاصل کیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو شان عظمت سے نوازا تھا، اکیس برس کی عمر میں اپنے جلیل القدر باپ کی جگہ مسند خلافت پر متمکن ہو گئے تھے۔)

سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے ان کا ذکر کرتے ہوئے بڑے بڑے عمدہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے ''الشیخ العالم الکبیر المحدث محمد فاخر ــــ'' کے الفاظ سے ان کے تذکرے کا آغاز کیا ہے۔ تحریر کرتے ہیں:

وكان فريد زمانه فی الاقبال علی الله والا شتغال بالعبادة والمعاملة الربانية، قد غشيه نور الايمان وسيماء الصالحين، انتهی اليه الورع وحسن السمت والتواضع والاشتغال بخاصة النفس واتفق الناس علی الثناء عليه والمدح لشمائله وصار مشارا اليه فی هذا الباب وكان لا يتقيد بمذهب ولا يقلد فی شئی من امور دينية بل كان يعمل بنصوص الكتاب والسنة ويجتهد برايه وهواهل لذلك ❹۔

(وہ (شیخ محمد فاخر) رجوع الی اللہ، اشتغال بالعبادۃ اور امور ربانی میں یکتائے دوراں

❶ تقصار، ص ۱۱۵۔

❷ ایضاً

❸ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۰۶۔

❹ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۴۱۔

Marfat.com

تھے۔ان کو نور ایمانی اور عادات نیکو کاراں نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا، ورع وتقویٰ، حسن عادات، انکسار وتواضع اور خدمت خلق کا سلسلہ ان پر ختم ہو گیا۔ سب لوگ ان کے خصائل کے مداح اور ان کے حسن اطوار کے معترف تھے۔ اس باب میں ان کی شخصیت خاص اہمیت کی حامل تھی۔ وہ کسی ایک فقہی مذہب کے پابند نہ تھے، بلکہ کتاب وسنت کے نصوص کو مدار عمل ٹھہراتے اور اجتہاد کرتے تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے علم وفضل اور کثرت معلومات کی بنا پر وہ اجتہاد کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔)

شاہ ولی اللہ دہلوی سے ملاقات:

شیخ محمد فاخر جب (غالباً) پہلی مرتبہ دہلی میں رونق افروز ہوئے تو انھیں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے دہلی کی جامع مسجد میں نماز پڑھی تو آمین بالجہر پکاری، ان لوگوں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی اور وہ شیخ کے مرتبۂ علم وفضل سے بھی واقف نہ تھے۔ نماز میں آمین بالجہر کی آواز ان کے پردۂ سماع سے ٹکرائی تو سخت حیران ہوئے، نماز کے بعد شیخ کو گھیر لیا اور مختلف قسم کی باتیں کرنے لگے۔ شیخ نے ہر چند حدیث کا حوالہ دے کر انھیں اپنی بات سمجھانے اور مطابق سنت ثابت کرنے کی کوشش کی، مگر کسی نے ایک نہ مانی اور بہ دستور بحث کرتے رہے۔ آخر شیخ نے فرمایا کہ میری بات تم نہیں مانتے تو مجھے اپنے شہر کے کسی عالم کے پاس لے چلو، ان سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ وہ لوگ آپ کو حضرت شاہ ولی اللہ کے پاس لے گئے اور ساری بات ان کے گوش گزار کی۔ شاہ صاحب نے لوگوں سے فرمایا، رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے آمین بالجہر پکارنا ثابت ہے۔ شاہ صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سن کر لوگ چلے گئے اور بھیڑ چھٹ گئی، شیخ محمد فاخر اور شاہ ولی اللہ دونوں رہ گئے۔ موقع پا کر شیخ محمد فاخر نے شاہ صاحب سے کہا۔ "آپ کھلتے کیوں نہیں؟" شاہ صاحب نے جواب دیا۔ "اگر کھل جاتا تو آج آپ کو کیسے بچاتا؟ [۱]"

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ محمد فاخر الہ آبادی کے درمیان یہ پہلی ملاقات تھی، اس سے قبل غائبانہ طور پر تو ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے، لیکن ملاقات کا موقع میسر نہ آیا تھا۔ ملاقات ہوئی تو دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے اور لوگوں کے جانے کے بعد قریب سے ایک دوسرے کے افکار و تصورات کو سمجھنے اور باہم کھل کر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔

تصانیف:

شیخ محمد فاخر متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ان کی تمام تصانیف سنت نبوی ﷺ کے انصار وحمایت اور

[۱] تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۳۳۹۔

Marfat.com

بدعات واہل بدعت کے رد میں ہیں۔ بارھویں صدی ہجری میں ان کا شمار برصغیر کے ان علمائے عظام میں ہوتا ہے، جو مسلکاً اہل حدیث اور قول وعمل میں متبع کتاب وسنت اور اس کے زوردار مبلغ تھے۔ شیخ محمد فاخر ایک فارسی شعر میں اپنے مسلک کا اظہار صاف الفاظ میں کرتے ہیں:

ما اہل حدیثیم دغا رانہ شناسیم   صد شکر کہ در مذہب ما حیلہ وفن نیست

ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ مجموعۂ نور السنة وقرة العينين در اثبات سنيّت رفع اليدين: یہ حضرت شیخ کی دو کتابوں کا مجموعہ ہے اور فارسی نظم میں ہے۔ دونوں کتابوں کا یہ مجموعہ نماز اور اس کے متعلقہ مسائل پر مشتمل ہے۔ شعر کی زبان میں یہ مسائل نہایت واضح اور خوب صورت انداز میں بیان کیے گئے ہیں اور ان کا اصل ماخذ کتاب وسنت ہے۔

نور السنة در حقیقت شیخ مجد الدین فیروز آبادی کی مشہور کتاب ''سفر السعادة'' کا مختصر اور منظوم ترجمہ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سنت کے مطابق نماز ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ یہ کتاب ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی تھی، پھر نایاب ہوگئی۔ اس کے بعد ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ (اکتوبر ۱۹۵۹ء) میں جمعیت اہل حدیث گوجراں والا نے شائع کی۔ ابتدا میں ''تذکارِ فاخر'' کے عنوان سے حضرت مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے حضرت شیخ محمد فاخر کے مختصر حالات تحریر فرمائے ہیں۔ یہ کتاب چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''مثنوی قرة العین در اثبات سنیة رفع الیدین'' ہے۔ یہ بھی شیخ محمد فاخر کی منظوم تصنیف ہے۔ اس میں رفع الیدین کے مسئلے پر تحقیقی گفتگو کی گئی ہے اور حدیث کی رو سے یہ مسئلہ بہ دلائل ثابت کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ اکتیس ۳۱ صفحات پر محیط ہے۔ دونوں کتابوں کے مجموعے کے صفحات مسلسل درج کیے گئے ہیں۔ کل صفحات ۷۱ ہیں اور اسے گوجراں والا کی جمعیت اہل حدیث نے شائع کیا ہے۔

۲۔ رسالہ نجاتیہ: یہ رسالہ عقائد کے بارے میں ہے اور نواب سید صدیق حسن خاں (متوفی ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) کے ضروری اضافوں کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا۔ اصل رسالہ فارسی میں ہے۔ شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی نے اس کا اردو ترجمہ کیا اور یہ جمعیت اہل حدیث لاہور کی طرف سے اپریل ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ ساتھ ہی فارسی متن دیا گیا ہے۔ شروع میں فاضل مترجم نے شیخ کے ضروری حالات بیان کیے ہیں۔ یہ رسالہ ۵۶ صفحات کو محتوی ہے۔

۳۔ مثنوی در تعریف علم حدیث: شیخ کی یہ مثنوی علم حدیث کی تعریف میں ہے۔

۴۔ دیوان فارسی: یہ شیخ محمد فاخر زائر کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ اس دیوان میں حدیث کو رائے اور قیاس پر ترجیح دی گئی ہے۔ بدعات کے ترک اور سنت رسول اللہ ﷺ کو اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ عقاید میں متکلمین اور معقولیوں کی روش کو اپنانے سے منع فرمایا گیا ہے اور ان عقاید کے اخذ وقبول کی ترغیب دی گئی ہے جو

Marfat.com

کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں۔ان اشعار میں خالص دینی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔شاعرانہ نقطہ نگاہ سے بھی ان اشعار کا معیار بڑا بلند ہے۔

شعروشاعری:

شیخ محمد فاخر بوقلموں اوصاف کے حامل اور گونا گوں خوبیوں کے مالک تھے۔جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا وہ اپنے زمانے کے بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ان کے جگری دوست سید غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کے ذوق شعری کی بڑی تعریف کی ہے۔نواب صدیق حسن خاں نے بھی ان کے چند اشعار اپنی تصنیف ''اتحاف النبلا'' میں نقل کیے ہیں اور انھیں بہترین شاعر قرار دیا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں:

بباغ عاشقی از میوہ و گل نیست سامانے　　کنم بادام و نرگس رافدائے چشم گریانے

دارم دلے کہ بردم تیغ ست راہ او　　مژگان چشم یاربود سیر گاہ او

برمیان برزدہ دامان زکجامی آئی　　مرحبا گربشکار دلِ ما می آئی

حب دنیامی فریبد خاطر افسردہ را　　گوشالی می دہدروباہ شیر مردہ را

مرا از آمد و رفت نفس روشن شدایں معنی　　کہ اقبال جہاں دردم زدن ادبارمی گردد

آینیہ باصفائے رخت روگرفتہ است　　گل پیش آں دہن دہن بوگرفتہ است

کنند گور پرستاں زیارت زاہد　　کہ زیر گنبد دستار زندہ در گورست

تاپیرو چار یار اخیار نہ　　از چار اصول دیں خبر دار نہ

درطبع تو ایں چار عنصر باہم　　تاہست باعتدال بیمار نہ

بقول زائر زرائیدگراں ماندم　　شہود یار مانع گردد از اغیار عاشق را

Marfat.com

زائر رائے قوم مرانیست بہرۂ علم حدیث کرد زخود بے خبر مرا

زائر از کشکول اہل رائے نتواں لقمہ خورد بر سر خوان رسول اللہ مہمانیم ما

جز شرعۂ سنت نرود جانب جنت زائر بکجا رائے برد اہل جہاں را

از احادیث رسول آوردہ ام اسرار دین نیست غیر از گوہر شہوار در دکان ما

زائر ہمہ علم و عمل او زحدیث ست بیچارہ جزیں خانہ دگر ہیچ ندارد

بہرکیف شیخ محمد فاخر زائر جو بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم، مفسر، محدث اور فقیہ تھے، بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ ان کے اشعار توحید الٰہی، اتباع سنت اور عمل بالحدیث کے موضوع پر مشتمل ہیں۔ یہ ان کی شاعری کا کمال ہے کہ کاروان فکر و خیال برابر جادۂ مستقیم پر قائم رہا ہے، کسی مقام اور موقعے پر ذرہ بھی ادھر ادھر قدم نہیں رکھا۔

وصیت اور تدفین:

شیخ محمد فاخر کو ارضِ حجاز میمنت طراز سے انتہائی محبت اور بے حد تعلق خاطر تھا۔ وہ ایک حج سے واپس آنے کے فوراً بعد دوسرے کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔ اس سفر میں ان کو بے شک کتنی تکلیف پہنچتی، اس کی کوئی پروانہ کرتے۔ ان کی موت بھی اسی سفر کے دوران ہوئی۔ وہ چوتھے حج کے لیے جا رہے تھے کہ برہان پور پہنچ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ برہان پور میں بہت سے بزرگان دین اور مشائخ کرام مدفون ہیں، ان میں ایک نامور بزرگ شیخ عبداللطیف ہیں۔ شیخ محمد فاخر نے وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ انھیں شیخ عبداللطیف کی قبر کے جوار میں دفن کیا جائے، کیونکہ وہ بے حد پابند شریعت بزرگ تھے اور ان کی قبر پر بدعات کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ غلام علی آزاد بلگرامی ان کی اس وصیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

در حالت مرض وصیت کرد کہ از مشائخ برہان پور شیخ عبداللطیف قدس سرہ در کمال تشرع بودند و بر مرقد مبارک ایشاں بدعت ہائے اہل زماں بعمل نمی آید، مرا در جوار ایشاں دفن سازند، موافق وصیت بعمل آوردند [1]۔

(حالت مرض میں انھوں (شیخ محمد فاخر) نے وصیت کی کہ مشائخ برہان پور میں شیخ عبداللطیف قدس سرہ حد درجہ پابند شریعت بزرگ تھے اور ان کا مرقد مبارک لوگوں کے ارتکاب بدعت سے محفوظ ہے، مجھے ان کی قبر کے نزدیک دفن کیا جائے، چنانچہ ان کی اس وصیت پر عمل کیا گیا۔)

[1] سرو آزاد ص ۲۲۸۔

Marfat.com

اولاد:

شیخ محمد فاخر زائر کے دو بیٹے تھے۔ایک شاہ قطب الدین تھے،جن کا انتقال مکہ معظمہ میں ۱۱۸۷ھ یا ۱۱۸۸ھ کو ہوا۔ دوسرے شاہ محمد اجمل تھے،جو اپنے آباواجداد کے وسادۂ خلافت پر متمکن تھے اور الٰہ آباد میں ان کا دائرہ بہت مشہور تھا۔انھوں نے ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں وفات پائی۔

تلامذہ:

شیخ محمد فاخر زائر الٰہ آبادی کے تلامذہ اور ان سے فیض یافتہ حضرات کا بھی ایک خاص حلقہ تھا۔اپنے والد گرامی کی وفات کے بعد الٰہ آباد میں عین جوانی میں انھوں نے مسند درس وافادہ آراستہ کر لی تھی۔ پھر ان کا سلسلۂ سفر بھی جاری رہتا تھا،جس میں عقیدت مندوں کی کثیر تعداد ان کے ہم عنان ہوتی تھی جنھیں وہ رشد و ہدایت اور دعوت وتبلیغ سے بہرہ مند کرتے تھے۔اس لیے یہ حقیقت ہے کہ ان کے تلامذہ اور ان سے فیض یافتہ حضرات کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ملک کے ہر حلقۂ فکر اور طبقۂ خیال کے لوگ ان کی انتہائی تعظیم کرتے تھے، جس طرف کو جاتے ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے استقبال کو آتے اور ان سے استفادہ واستفاضہ کرتے۔ وفور علم اور تقویٰ وتدین میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

۴۶۔مولانا محمد فاضل سورتی

مولانا محمد فاضل کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد فاضل بن محمد حامد بن عبدالمجید بن احمد بن صالح عبیدی حجازی بدوی ثم ہندی سورتی۔ ان کے آبا واجداد سرزمین حجاز کے رہنے والے تھے اور قبیلۂ بنی عبید سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد ازاں ان میں سے کوئی بزرگ ہندوستان آئے اور گجرات کے علاقے میں سکونت اختیار کی۔ مولانا محمد فاضل کی ولادت اور نشو ونما گجرات ہی میں ہوئی۔ بڑے ہوئے تو اس زمانے کے جلیل القدر عالم شیخ زین العابدین احمد آبادی (متوفی ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء) سے اخذ علم کیا اور علوم مروجہ میں مہارت حاصل کی۔

مولانا محمد فاضل کا اصل پیشہ تجارت تھا۔اور اتنا وسیع تھا کہ لوگ انھیں ''ملک التجار'' کہتے تھے اور اللہ نے مال ودولت کثرت سے عطا فرمایا تھا۔

تجارت کے ساتھ ساتھ علم وتحقیق سے بھی تعلق رکھتے تھے اور تصنیف وتالیف کا بھی صاف ستھرا ذوق تھا۔کئی کتابوں کے مصنف تھے،جن میں یہ کتابیں شامل ہیں:

نصیحۃ الصغار، ھدایۃ المسلمین، حزب المحزوب، معین الفضائل فی شرح الشمائل، شرح دلائل الخیرات، حاشیہ الدرر۔ یہ کتاب فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔

Marfat.com

نہایت عابد وزاہد اور عالم باعمل تھے۔ ارض حجاز میں گئے اور حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔ پھر جب ہندوستان واپس آئے تو پہلے کچھ عرصہ شہر سورت میں ٹھہرے، پھر وہاں سے احمد آباد کو روانہ ہو گئے۔ احمد آباد میں ان کے بیٹے مقیم تھے اور وہ بیٹوں کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن راستے ہی میں لوگوں نے ان کو قتل کر دیا۔ یہ حادثہ ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۲۹ھ/ ۱۸ نومبر ۱۷۱۷ء کو پیش آیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف پینتالیس برس تھی ❶۔

۴۷۔ سید محمد فیض بلگرامی

سید محمد فیض حسینی واسطی بلگرامی کا مولد ومنشا بلگرام ہے۔ سید اسماعیل بلگرامی سے اخذ علم کیا۔ کتب حدیث سید مبارک حسینی بلگرامی سے پڑھیں اور حدیث وفقہ میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ میر سید عبدالجلیل بلگرامی سے بھی فیض حاصل کیا۔ سید محمد فیض بلگرامی اور میر سید عبدالجلیل بلگرامی کے درمیان انتہائی مخلصانہ تعلقات قائم تھے۔ سید محمد فیض بلگرامی کے تصنیفی کارناموں میں شمائل ترمذی اور حصن حصین کا فارسی ترجمہ ہے۔ بلگرام کے اس جلیل القدر عالم دین نے ساٹھ سال کی عمر پا کر ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء میں سفر آخرت اختیار کیا ❷۔

۴۸۔ شیخ محمد محسن دہلوی

بارھویں صدی ہجری میں برصغیر میں محمد محسن نام کے تین بزرگ اپنے خداداد فضل وکمال کی وجہ سے بہت مشہور تھے جو معقولات میں مہارت اور حدیث وفقہ میں دسترس رکھتے تھے، ان میں سے ایک کا تعلق دہلی سے تھا اور دو کا سرزمین کشمیر سے۔ ذیل میں ان تینوں کا ترجمہ درج ہے۔

شیخ محمد محسن دہلوی کی جائے ولادت وتربیت دہلی ہے۔ ہندوستان کے ممتاز عالم حضرت شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے۔ طریقتاً مجددی نقشبندی اور مسلکاً حنفی تھے۔ اپنے دور کے نامور عالم وفقیہ اور جامع معقول ومنقول تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے جلیل القدر فرزند شیخ محمد معصوم سرہندی سے اخذ فیض کیا اور کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے۔

دہلی کے اس عالم وفقیہ سے خلق کثیر نے استفادہ کیا، جن میں شیخ نور محمد بدایونی (متوفی ۱۱ ذی قعدہ ۱۱۳۵ھ/ ۱۲ اگست ۱۷۲۳ء) کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ شیخ محمد محسن دہلوی ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴ء میں فوت ہوئے ❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۴۱، ۳۴۲ بحوالہ حدیقہ احمدیہ

❷ مآثر الکرام ص ۲۳۵، ۲۳۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۴۴

❸ خزینۃ الاصفیاء ج ۱، ص ۶۶۴ تا ۶۶۶۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۲۔ حدائق الحنفیہ ۴۴۰۔ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۳۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۴۶

Marfat.com

۴۹۔ مولانا محمد محسن کشو کشمیری

مولانا محمد محسن کشو کشمیری اپنے عہد اور علاقۂ کشمیر کے شیوخ و فضلا اور کبار علما میں سے تھے۔ معقولات و منقولات پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ حنفی المسلک تھے۔ مولانا محمد امین حنفی کشمیری (متوفی ۲۷ رمضان ۱۱۰۹ھ ــــ ۲۹ مارچ ۱۶۹۸ء) کے شاگرد تھے۔ محقق اور دقیق النظر عالم تھے۔ دین داری اور فضل و کمال میں بڑی شہرت پائی۔ بہت سے علما و طلبا نے جو بعد میں خود تدریس کی مسند پر فائز ہوئے، ان سے کسب علم کیا۔ تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ کئی درسی کتابوں پر حواشی و تعلیقات سپرد قلم کیے، جن میں فقہ کی شہرۂ آفاق کتاب ہدایہ اور معانی و بیان کی مشہور کتاب مطول خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ نیز شرح عقائد عضدیہ پر حاشیہ لکھا۔ علاوہ ازیں المواہب العلیہ اور نجاۃ المومنین کے نام سے دو کتابیں تصنیف کیں۔

مولانا محمد محسن کشو کشمیری نے ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء میں رحلت فرمائی ❶۔

۵۰۔ مولانا محمد محسن کشمیری

بارھویں صدی ہجری کے دیار کشمیر میں محمد محسن نام کے دو عالم دین گزرے ہیں۔ ایک وہ جن کا اوپر کی سطور میں ذکر ہوا، اور وہ ہیں مولانا محمد محسن کشو کشمیری (متوفی ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) دوسرے مولانا محمد محسن کشمیری وہ تھے، جن کا ترجمہ زیر نظر سطور میں دیا جا رہا ہے۔ یہ نامور بزرگ اور خطۂ کشمیر کے جید عالم مولانا امان اللہ شہید (شہادت ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) کے شاگرد رشید تھے۔ علاقۂ کشمیر کے شیخ و فاضل اور مشہور فقیہ تھے۔ مسلک کے لحاظ سے حنفی اور فقہ و اصول کے ماہر تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ تحریر و کتابت میں بہت تیز اور خوشخط تھے۔ انھوں نے صحیح بخاری، تفسیر بیضاوی، مشکوٰۃ المصابیح، ہدایہ اور بہت سی دیگر کتابوں کی اپنے ہاتھ سے کتابت کی۔ اس زمانے میں طباعت و اشاعت کا فن تو معرض وجود میں نہیں آیا تھا، کتاب محفوظ کرنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا، اور یہ بہت معزز کاروبار بھی تھا۔

مولانا محمد محسن کشمیری نے درس و تدریس میں بھی بڑا نام پایا، اور عمر بھر یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ان سے علاقۂ کشمیر کے بے شمار علما و طلبا نے استفادہ کیا، جن میں شیخ رحمت اللہ کشمیری (متوفی ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء) قاضی مراد الدین کشمیری (متوفی ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء) اور ملا عبدالستار کشمیری کے نام خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔

مولانا محمد محسن کشمیری نے جمادی الاخریٰ ۱۱۸۱ھ/ نومبر ۱۷۶۷ء میں رحلت فرمائی ❷۔

---

❶ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۲۱۶ ۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۲ ۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۲ ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۴۷۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۷۱ ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۴۷ ۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۹۔

Marfat.com

۵۱۔ مولانا محمد مراد لاہوری

مولانا محمد مراد لاہوری نواح لاہور کے جید عالم دین مفتی عبدالسلام لاہوری کے لائق فرزند تھے۔ بارھویں صدی ہجری کے ممتاز فاضل اور فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ ولادت و تربیت لاہور میں ہوئی اور اپنے والد مکرم مفتی عبدالسلام لاہوری سے کسب علم کیا۔ تصوف و طریقت کی طرف رجحان ہوا تو بحر زخار کی روایت کے مطابق شیخ شاہ محمد بدخشی کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے اخذ طریقت کیا اور مدت تک ان سے منسلک رہے۔

مولانا محمد مراد کے حالات میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد معظم ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۷ء) میں شاہ عالم بہادر شاہ (اول) کے لقب سے ہندوستان کا بادشاہ بنا تو اس کا رجحان شیعیت کی طرف تھا۔ اس نے ملک بھر کی مساجد کے خطیبوں کے نام حکم جاری کیا کہ خطبۂ جمعہ اور عیدین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذکر میں ان کے نام کے ساتھ ''علی ولی اللہ ووصی رسول اللہ'' کے الفاظ کا اضافہ کیا جائے۔ ملک میں بادشاہ کے اس فرمان کی شدید مخالفت ہوئی۔ لاہور میں بھی اس کے خلاف سخت ردعمل ہوا، اور علما اور عوام نے بادشاہ کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے مولانا محمد مراد لاہوری اور مولانا یار محمد لاہوری کو اس مسئلے پر بحث کے لیے تسبیح خانہ میں طلب کیا۔ ان حضرات نے شریعت کی روشنی میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔ بادشاہ نے ان کے دلائل سن کر اور عوام کی برہمی اور علما کی مخالفت سے خوف زدہ ہو کر اپنا حکم واپس لے لیا، لیکن اس کے باوجود احتجاج کے لیے شاہی مسجد میں بہت بڑے ہجوم کی شکل میں لوگ جمع ہو گئے۔ بادشاہ کو اطلاع پہنچی تو اس نے نہایت خفگی کا اظہار کیا، اور لاہور کے تین جلیل القدر علما، مولانا محمد مراد، مولانا یار محمد اور مولانا جان محمد کو گرفتار کر کے قلعے میں محبوس کر دیا۔ ان پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انھوں نے حکومت کے خلاف عوام کو فتنہ و فساد کے لیے برانگیختہ کیا ہے۔ خافی خاں نے منتخب اللباب میں یہ واقعہ ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء کے حوادث و واقعات کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔

مولانا محمد مراد لاہوری بارھویں صدی ہجری کے جید عالم و فقیہ تھے، افسوس ہے، ان کی تاریخ ولادت و وفات اور دیگر حالات کا علم نہیں ہو سکا[1]۔

۵۲۔ مولانا محمد مراد کشمیری

مولانا محمد مراد کشمیری مسلکاً شیعہ تھے اور وادیٔ کشمیر کے نامور فضلا میں گردانے جاتے تھے۔ مشہور شیعی عالم حر عاملی کے شاگرد تھے۔ شیعی فقہ پر عبور رکھتے تھے۔ معروف محشی اور مصنف تھے۔ انھوں نے شیعہ

[1] منتخب اللباب ج ۲، ص ۶۸۱، ۶۸۲۔ نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۴۸، ۳۴۹۔

Marfat.com

مذہب کی ایک اہم کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" پر حاشیہ لکھا۔ اپنے استاد محترم حر عاملی کی تصنیف "بدایۃ الھدایہ" کی مبسوط شرح سپرد قلم کی۔ یہ شرح حر عاملی کے حکم سے لکھی اور اس کا نام "الدلیل الساطع" رکھا۔ "بداھیۃ الھدایہ" کی ایک مختصر شرح بھی لکھی، جس کو "النور الساطع" کے نام سے موسوم کیا❶۔

۵۳۔ مولانا محمد مراد سندھی

مولانا محمد مراد سندھی کبار علمائے سندھ میں سے تھے۔ وقت کے فاضل فقیہ ہونے کی وجہ سے انھیں اپنے شہر کے منصب قضا پر مامور کر دیا گیا تھا۔ ہمیشہ وعظ وتذکرہ اور درس وتدریس میں مصروف رہتے۔ آخر عمر میں ارض حجاز گئے اور جدہ میں اس زمانے کے ایک وزیر ریحان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان کے فضل وکمال سے اتنا متاثر ہوا کہ ان کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہو گیا۔ ریحان نے ان کے لیے جدہ میں ایک رباط، ایک مسجد اور ایک مکان تعمیر کرایا۔

مولانا محمد مراد سندھی متورع ومتقی اور صاحب عزیمت بزرگ تھے۔ قرآن، حدیث اور فقہ پر عبور کا یہ عالم تھا کہ اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کی یہ تصنیف کتاب وسنت اور فقہ کے نقطۂ نظر سے بہت سے مسائل پر محیط ہے۔ انھوں نے جدہ ہی میں وفات پائی۔ ان کے سال وفات کا پتا تو نہیں چل سکا البتہ شیخ رفیع الدین مراد آبادی نے اپنی کتاب ''الرحلۃ'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔

شیخ رفیع الدین مراد آبادی ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۷ء میں حج وزیارت کے لیے حرمین شریفین گئے تھے اور مولانا محمد مراد سندھی ان کے وہاں جانے سے قبل انتقال کر چکے تھے❷۔

۵۴۔ شیخ محمد مراد رفیقی کشمیری

شیخ محمد مراد رفیقی بارھویں صدی ہجری میں وادیٔ کشمیر کے جید علما میں سے تھے۔ اپنے علاقے کے فضلائے وقت سے مستفید ہوئے اور علوم ظاہری وباطنی میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ علوم منقولہ بالخصوص حدیث اور فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔ کتابوں کے انتہائی شائق تھے اور بہت سی کتابیں ان کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ مطالعۂ کتب اور صحبت اہل علم وکمال کے سوا انھیں کسی چیز سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ورع وتقویٰ میں بھی بڑی شہرت کے مالک تھے۔ مخلص اور پاک باز اہل علم تھے۔ عین جوانی میں وفات پائی اور کم عمر اولاد چھوڑ کر عالم آخرت کی راہ لی❸۔

---

❶ نجوم السماء۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۴۹، ۳۵۰۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۵۰

❸ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۲۱۴۔

Marfat.com

۵۵۔ مولانا محمد معصوم جائسی

مولانا محمد معصوم جائسی کے والد کا اسم گرامی نظام الدین تھا۔ بارھویں صدی ہجری کے نامور شیخ، بلند مرتبہ عالم، ممتاز فقیہ اور معروف اصولی تھے، علوم عربیہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ فقہی لحاظ سے حنفی المسلک تھے۔ کئی مفید اور عمدہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں ایک تصنیف ''الفصول المعصومیہ'' ہے جو عربی زبان میں فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے تلمیذ رشید قاضی نعمت اللہ کے لیے تصنیف کی تھی۔ اس کے شروع میں یہ الفاظ درج ہیں:

لا احصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك۔

الفصول المعصومیہ، ۳۷ فصول کو محتوی ہے۔ یہ فصول ابواب القضاء، دعویٰ، شہادت، اختلاف، اقرار، وکالہ، بیوع، اقالہ، صلح، ابرا، شفعہ، قسمہ، غصب، رہن، توکیل وغیرہ ابواب فقہیہ کو اپنے دامن صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ صاحب نزہۃ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں کہ یہ کتاب انھوں نے دیکھی ہے اور بڑی مفید ہے[1]۔

۵۶۔ شیخ محمد معین سندھی

سندھ کی سرزمین علم وفضل کے لحاظ سے ہمیشہ زرخیز رہی ہے اور اس نے مختلف ادوار میں بے شمار اصحاب فضل وکمال کو جنم دیا ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں جن عظیم اور ممتاز شخصیتوں نے اس کی گود میں پرورش پائی ان میں شیخ محمد معین سندھی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی مولانا محمد امین اور دادا کا نام نامی شیخ طالب اللہ تھا۔ یہ خاندان اپنی گوناگوں خصوصیات کی بہ دولت سندھ میں تین پشتوں سے امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔

محمد معین، سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے، جو اس وقت علم وعلما کا مرکز اور محدثین وفقہا کا گہوارہ تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش کا علم نہیں ہوسکا۔ شعور کی آنکھیں کھولیں تو گھر میں اسلامی علوم وفنون کا دریا بہہ رہا تھا، اور ان کے والد مولانا محمد امین کا سلسلۂ فیض جاری تھا۔ ہونہار بیٹے نے ابتدائی تعلیم جلیل القدر باپ سے حاصل کی۔ اس کے بعد اقلیم سندھ کے ایک رفیع المرتبت عالم اور معقولات ومنقولات کے ماہر شیخ عنایت اللہ بن فضل اللہ ٹھٹھوی (متوفی ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء) کے باب عالی پر دستک دی اور ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ جب اپنے علاقے اور گردوپیش کے علما سے استفادہ کر چکے تو دہلی کا رخ کیا۔ دہلی میں اس زمانے میں علوم قرآن و حدیث کے چشمے ابل رہے تھے اور حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ رحیمیہ کی مسند تدریس پر ان کے

[1] نزہۃ الخواطر، ج۶، ص۳۵۰، ۳۵۱۔

Marfat.com

لائق فرزند حجۃ الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ متمکن تھے۔ محمد معین نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور علوم معقول و منقول سے بہرہ مند ہوئے۔

دہلی سے فارغ التحصیل ہونے اور شاہ ولی اللہ سے حصول علم کے بعد واپس اپنے وطن کا عزم کیا اور اس عہد کے عام رواج کے مطابق تصوف و طریقت کی طرف مائل ہوئے۔ پہلے شیخ ابوالقاسم نقشبندی کی طرف رجوع کیا جو فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے، ان سے خوب مستفیض ہوئے۔ پھر شیخ عبداللطیف بھٹائی (متوفی ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء) کا در تصوف کھٹکھٹایا اور ان سے فیض یاب ہوئے، جس کے نتیجے میں علم و معرفت کے بلند مرتبے کو پہنچے۔

شیخ محمد معین سندھی اپنے عصر اور علاقے میں قرآن و حدیث کے فہم میں یکتا، فقہ و اصول پر عبور میں منفرد، تحقیق و کاوش میں ممتاز، ذکاوت و فطانت میں بے نظیر اور ادب و شعر میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ علوم مروجہ میں مہارت اور فنون متداولہ پر وسعت نظر میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ بے حد ذہین اور نکتہ رس عالم تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سلسلۂ تدریس جاری کیا اور مسند درس آراستہ فرمائی، جس سے بے شمار طلبا و علمانے استفادہ کیا اور کثیر التعداد حضرات نے ان کے چشمۂ فیض سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔

میر علی شیر قانع سرزمین سندھ کے مشہور مورخ تھے، وہاں کے علما و فضلا، صوفیا و اتقیا اور امرا و حکام کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ شیخ محمد معین کی علمی ہمہ گیری اور اوصاف بوقلموں کا تذکرہ مقالات الشعرا میں ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

جامع علوم معقول و منقول، حاوئ معالم فروغ و اصول، کاشف حقائق علمی و عملی، شارح دقائق صدری و معنوی، علامۂ عصر، نحریر وقت، مظہر حقائق ربانی ❶۔

یعنی شیخ محمد معین ٹھٹھوی معقولات و منقولات کے جامع، فروع و اصول کے عالم، علمی و عملی گتھیوں کو سلجھانے والے، ذہنی و فکری الجھنوں کے شارح، علامہ عصر، اپنے عہد کے نہایت قابل بزرگ اور احکام خداوندی کی وضاحت میں یدطولیٰ رکھنے والے تھے۔

اپنے متنوع اوصاف و کمالات کی بدولت ہر حلقے میں انھیں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ میر علی شیر قانع اپنی ایک اور تصنیف تحفۃ الکرام میں ان کے اسلاف کے بارے میں رقم طراز ہیں ❷۔

شیخ محمد معین کے والد مخدوم محمد امین تعلقہ روپارہ اور میدان باراں کے گاؤں ''ڈائی'' یا (والی) کے رہنے والے تھے اور ''دل لاکھ'' قوم کے فرد مخدوم طالب اللہ کے فرزند تھے۔ اپنے آبائی وطن کی سکونت ترک کر کے ٹھٹھے میں اقامت پذیر ہوئے اور علمی اور عملی فضیلت میں بڑی شہرت پائی۔ مخدوم طالب اللہ کے حلقۂ ارادت

❶ مقالات الشعراء ص ۱۲۱۔

❷ تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۶۹۳، ۶۹۴۔

Marfat.com

میں ایک شخص فاضل خاں شامل تھا۔ جو عالم اور نیک شخص تھا۔ بادشاہ وقت شاہ جہان کے دربار میں رسائی حاصل کر کے اچھے منصب پر فائز ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کا عقد مخدوم طالب اللہ کے بیٹے مخدوم محمد امین سے کر دیا تھا۔ اس عقد کی وجہ سے مخدوم محمد امین بڑی شان و شوکت کو پہنچے اور عوام و خواص میں بے حد عزت و احترام کے مالک ہوئے۔

مخدوم محمد امین کے بیٹے مخدوم محمد معین تھے، اللہ نے ان کی ذات گرامی میں بہت سی صفات جمع کر دی تھیں، وہ اپنے وقت میں جملہ علوم و فنون اور کمالات کے جامع تھے۔ معقولات و منقولات میں اپنے عہد کے علامہ اور اپنے زمانے کی لاجواب شخصیت تھے۔ کمالات علمی کے باجود راہ سلوک سے بھی آگاہ تھے، کتنے ہی بزرگان دین سے ان کی صحبتیں رہیں۔

مولوی رحمان علی ان کے فضل و کمال کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے اوصاف علمی کی بنا پر حکام وقت بھی ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور انتہائی تعظیم سے پیش آتے تھے۔

مخدوم محمد معین سندھی ____ شاگرد مخدوم عنایت اللہ جامع جمیع علوم، حاوی معقول و منقول، نحریر عصر، علامۂ دہر بود، باوجود کمالات علمی آشنا بحر معرفت شدہ، بصحبت بسیارے از بزرگان دین رسیدہ، حکام وقت بدیدنش بکمال تعظیم می رسیدند، دے بہ ایشاں ملاقات ہا نیکو کردی [1]۔

(شیخ محمد معین سندھی۔ حضرت مخدوم عنایت اللہ سندھی کے شاگرد تھے۔ تمام فنون کے جامع اور معقول و منقول پر دسترس رکھتے تھے۔ اپنے وقت کے فاضل اور اپنے عصر کے علامہ تھے۔ کمالات علمی کے ساتھ دریائے معرفت کے بھی غواص تھے۔ بہت سے بزرگان دین کی صحبت میں رہ چکے تھے ____ حکام وقت بھی ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوتے اور وہ بھی ان سے خلوص و محبت سے ملتے تھے۔)

مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی تکملہ مقالات الشعرا میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

عمدۃ العلما الربانیین و قدوۃ المفسرین والمحدثین۔ مخدوم محمد معین [2]۔

یعنی مخدوم محمد معین اپنے عہد میں علمائے ربانی میں بلند تر اوصاف کے حامل اور مفسرین و محدثین کے سرخیل تھے۔

نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ مخدوم محمد معین ٹھٹھوی کا ذکر اپنی دو کتابوں میں کرتے ہیں۔ ایک اتحاف النبلا میں، اور دوسری کتاب دلیل الطالب علی الرجع المطالب میں۔ اول الذکر کتاب میں وہ حضرت مخدوم کی تصنیف ''دراسات اللبیب'' کے مندرجات کا تعارف کراتے ہوئے اس کے مصنف شہیر کے بارے میں رقم

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۶، ۲۱۷

[2] تکملہ مقالات الشعراء ص ۱۸۵۔

Marfat.com

کرتے ہیں۔

للشیخ الفاضل المحقق محمد معین بن محمد امین سندی ❶۔

کہ دراسات اللبیب شیخ فاضل محقق محمد معین بن محمد امین سندھی کی تصنیف ہے۔

ثانی الذکر کتاب میں نواب صاحب حضرت مخدوم ممدوح کو ''الشیخ العلامتہ الادیب محمد معین'' ❷ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح صاحب نزہتہ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھنوی بھی ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

مخدوم محمد معین ٹھٹھوی اپنے زمانے میں اقلیم سندھ کے شیخ، فاضل اور علامہ تھے۔ حدیث، کلام اور علوم عربیہ کے جید عالم تھے۔ نہایت ذکی، عالی فکر، ماہر علم وعرفان، بہترین شاعر، صاحب طرز ادیب، معقول ومنقول میں یکتا اور تصوف وطریقت میں ممتاز تھے ❸۔

شیخ محمد معین سندھی، علم حدیث میں خاص طور سے درک رکھتے تھے اور اس کے مختلف گوشوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جہاں اقوال فقہا حدیث رسول اللہ ﷺ سے ہم آہنگ نہ ہوں، وہاں اقوال فقہا کو ترک کر دیا جائے گا اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ کو مدار عمل قرار دیا جائے گا۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اہل علم کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے اور ہر زمانے کے علما کو جن میں اجتہاد کی شرائط پائی جائیں، حق اجتہاد حاصل ہے۔ وہ تقلید کے سخت مخالف تھے۔ ان مسائل میں ان کے اور ان کے معاصر مولانا محمد ہاشم سندھی ٹھٹھوی (متوفی ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء) کے درمیان مباحث ومناظرات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مولانا محمد ہاشم سندھی بھی اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے اور حنفی المسلک تھے۔ وہ تقلید کے زبردست حامی اور اجتہاد کے مخالف تھے۔ لیکن اس کے برعکس شیخ محمد معین کا نقطۂ فکر دوسرا تھا، وہ حدیث کے مقابلے میں قول امام کو ماننے سے صاف لفظوں میں انکار کرتے تھے، اس لیے دونوں کے درمیان خوب بحثیں چلتی تھیں۔

شیخ محمد معین سندھی کو تصنیف وتالیف میں خاص شہرت حاصل تھی۔ انھوں نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کتابیں تصنیف کیں اور بڑے بڑے اہم مسائل کو زیر بحث لائے۔ ان کا طرز بیان زوردار اور مدلل ہے۔ ان کی عربی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب: یہ کتاب بارہ دراسات کو محیط ہے اور ردتقلید میں ہے۔ اس میں اس امر کی تفصیل سے صراحت کی گئی ہے کہ مسائل شرعیہ میں بنیادی حیثیت صرف

---

❶ اتحاف النبلاص ۷۸۔

❷ دلیل الطالب علی ارجح المطالب ص ۱۶۷۔

❸ نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۳۵۱، ۳۵۲۔

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور آپ کے ارشادات عالی قدر کو حاصل ہے۔ اگر کہیں حدیث پیغمبر اور قول امام میں تصادم ہو، تو حدیث کو ترجیح دی جائے گی اور قول امام کو ترک کر دیا جائے گا۔ اس باب میں حضرت مصنف نے محکم دلائل سے گفتگو کی ہے اور جن حضرات نے جہاں جہاں حدیث کے مقابلے میں قول امام کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان کو انتہائی سختی سے ہدف تنقید ٹھہرایا ہے۔ یہ کتاب اپنے انداز کی بہترین کتاب ہے۔ شروع سے آخر تک زبان بڑی صاف اور اسلوب بیان محققانہ ہے۔ نواب صدیق حسن خاں نے ''اتحاف النبلا'' میں اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ فاضل محقق شیخ محمد معین بن محمد امین سندھی کی یہ تالیف عمل بالحدیث اور مخالف حدیث مذہب کے ترک کے بارے میں نہایت عمدہ ہے۔ اس کے مشمولات و مندرجات مبنی بر تحقیق ہیں، اس کی زبان و عبارت میں انتہائی متانت پائی جاتی ہے اور جو باتیں اس میں بیان کی گئی ہیں، وہ حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔ حضرت مصنف نے اپنے دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بدرجۂ غایت دقت نظر سے کام لیا ہے[1]۔

دراسات اللبیب سب سے پہلے ۱۲۸۴ھ میں لاہور سے طبع ہوئی تھی، لیکن پھر بالکل نایاب ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں لجنۃ احیاء الادب السندی (یعنی سندھی ادبی بورڈ کراچی) کی طرف سے شائع کی گئی کتاب اپنے موضوع میں لائق مطالعہ ہے۔ فقہی مسائل میں حضرت مصنف کا زیادہ تر نقطۂ نظر وہی ہے جو اہل حدیث حضرات کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض ہم عصر حنفی علما نے کتاب کے اس قسم کے مضامین کی تردید کی اور حضرت شیخ محمد معین سندھی کے نقطۂ نظر کی مخالفت میں کتابیں تصنیف کیں، لیکن جو زور اور وزن شیخ محمد معین سندھی کے دلائل اور اسلوب میں پایا جاتا ہے، وہ ان کے مخالفین کی کتابوں میں نہیں ہے۔

۲. الحجۃ الجلیلہ فی قضاء الحکم بالافضیلہ۔

۳. ایقاظ الوسنان۔

۴. رسالہ فی اثبات اسلام ابی طالب۔

۵. انوار الوجد من منع المجد۔

۶. غایت الایضاح فی المحاکمۃ بین الودرو ابن الصلاح۔

۷. رسالہ فی بحث حدیث المصراۃ۔

۸. رسالہ فی تحقیق معنی الحدیث لانورث ماترکنا صدقۃ۔

۹. مواہب سید البشر فی حدیث الائمۃ الاثنی عشر۔

۱۰. غایۃ الفسخ لمسئلۃ النسخ۔

۱۱. قرۃ العین فی ابکاء علی الامام الحسین۔

[1] اتحاف النبلاص ۷۸۔

Marfat.com

۱۲. اثبات رفع الیدین فی الصلوۃ۔

۱۳. ابرار الضمیر المنصف الخبیر۔

۱۴. رسالہ فی انتقاد المومنین من فتح القدیر۔

۱۵. رسالہ فی بحث تناسخ۔

۱۶. رسالہ بالاجوبۃ الفاضلہ الامثلۃ العشرۃ الکاملۃ۔

۱۷. رسالہ فی تحقیق اہل البیت۔

یہ سترہ کتب ورسائل عربی زبان میں ہیں۔ فارسی میں بھی انھوں نے کتابیں تصنیف کیں، جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ اثبات رفع الیدین فی الصلوۃ۔

۲۔ شرح رموز عقائد صوفیہ۔

۳۔ رسالہ اویسیہ۔

۴۔ طریقہ العون فی حقیقۃ الکون۔

شیخ محمد معین سندھی نماز میں رفع یدین کے قائل تھے۔ اس کے اثبات میں انھوں نے دو رسالے تصنیف کیے۔ ایک عربی میں اور ایک فارسی میں۔ ان دونوں رسالوں میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور صحابہ کرام کے اقوال وعمل کی روشنی میں رفع یدین کا ثبوت دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ان کی تصنیفات کے ناموں سے ظاہر ہے، وہ بعض مسائل میں ایسے افکار ورجحانات کے حامل ہیں، جن کا عام اہل سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً

وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اصحاب ثلاثہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم پر فضیلت دیتے تھے۔

عمل اہل بیت کو عمل اہل مدینہ پر ترجیح دیتے تھے۔

حضرت حسین کی شہادت کے دن افسوس کے طور پر رونے کے قائل تھے۔

ابوطالب کے ایمان کے قائل تھے۔

وجد وسماع کو صحیح قرار دیتے تھے۔

شیخ محمد معین سندھی جہاں تصنیف وتالیف میں یکتا، تحقیق وتدقیق میں بے مثال اور بحث ومناظرہ میں عدیم النظیر تھے، وہاں بہت بڑے مدرس اور معلم بھی تھے۔ ان کا سلسلۂ تدریس بڑا وسیع تھا، بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا اور پھر ان میں سے ہر ایک نے آگے چل کر عظیم الشان علمی اور تدریسی خدمات انجام دیں۔

شیخ محمد معین فارسی اور اردو کے ممتاز شاعر بھی تھے۔ فارسی میں تسلیم اور اردو میں بیراگی تخلص کرتے

Marfat.com

تھے۔ ان کا فارسی کلام موجود ہے اور میر علی شیر قانع نے اپنی تصنیف مقالات الشعرا میں ان کے اشعار نقل کیے ہیں، لیکن اردو کلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ گم ہو گیا۔

شیخ ممدوح نے ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء کو ٹھٹھہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

۵۷۔ سید محمد ممتاز نصیر آبادی

سید محمد ممتاز حسنی نصیر آبادی، شاہ علم اللہ بریلوی کے پڑپوتے، شاہ ابوحنیفہ کے پوتے اور شاہ عبدالباقی کے بیٹے تھے۔ کئی پشتوں سے یہ خاندان دیار ہند میں علم وعمل کے اعتبار سے ممتاز شہرت کا حامل اور ورع وتقوی میں منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اسی خاندان کے لعل درخشاں تھے۔ اس خانوادے کو برصغیر میں اپنے فضل وصلاح کی بدولت اب تک خاص عز وشرف کا مقام حاصل ہے، اور اس کے بعض اہل علم تو اپنی گوناگوں قابلیت واستعداد کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کے اونچے مرتبے پر فائز ہیں۔

سید محمد ممتاز حسنی نصیر آبادی جو اس خاندان کے اکابر میں سے تھے، معروف اصحاب فضل وکمال میں گردانے جاتے تھے۔ وہ نصیر آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اپنے والد گرامی سید عبدالباقی نصیر آبادی (متوفی ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء) سے علم فقہ کی تحصیل کی، اخذ طریقت بھی انہی سے کیا۔ قناعت وعفت اور توکل واتقا میں اپنے آباو اجداد کا صحیح نمونہ تھے۔ سب طرف سے منقطع ہو کر عبادت الٰہی میں مشغول رہتے اور معاملات دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے ❶۔

۵۸۔ شیخ محمد مومن الجزائری

شیخ محمد مومن الجزائری مسلکاً شیعہ تھے۔ ان کا مولد ومنشاء ایران کا شہر ''شیراز'' ہے۔ متعدد بلند مرتبہ اساتذہ سے اخذ علم کیا اور فنون متداولہ میں ماہر ہوئے۔ تفسیر وحدیث، فقہ واصول، صرف ونحو، منطق وفلسفہ، فرائض وریاضی، طب، جفر ورمل، حکمت وکلام، شعر وادب، لغت، غرض معقولات ومنقولات میں اپنے عہد میں یگانۂ روزگار تھے۔ تحصیل علم کے بعد ہندوستان کا رخ کیا اور علاقہ دکن کی سیر وسیاحت شروع کی۔ پھر (غالباً) دکن ہی کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔

شیخ محمد مومن الجزائری بے شک شیعہ تھے، لیکن وسیع القلب اور کھلے ظرف کے اہل علم تھے۔ علوم وفنون کے تمام گوشوں میں دسترس رکھتے تھے۔ ان کو اللہ نے تصنیف وتالیف کا بھی ذوق اور سلیقہ عطا کیا تھا، چنانچہ مختلف عنوانات ومسائل سے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ جامع المسائل النحويه في شرح الصمدية البهاميه: یہ اپنے موضوع کی ایک مبسوط کتاب ہے۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۵۵۔

Marfat.com

۲۔ بيان الآداب۔

۳۔ مصباح المبتدين۔

۴۔ مشكوٰة العقول۔

۵۔ قرة العين۔

۶۔ سبكة اللجين: اس میں قرآن مجید کی آیات مشکلہ، احادیث غریبہ اور بعض اشعار و ابیات کی عقدہ کشائی کی گئی ہے: اس کا سال تالیف ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء ہے۔

۷۔ وسيلة الغريب: اس کا انداز وہی ہے جو ان کی تصنیف قرة العین کا ہے۔

۸۔ تحفة الغريب۔

۹۔ نخبة الطبيب: یہ طب کی مشہور کتاب ''قانونچہ'' کی شرح ہے۔

۱۰۔ تميمة الاطبا: یہ کتاب ''کشکول'' کے اسلوب کی ہے۔

۱۱۔ تمية الفواد من الم العباد: اس میں بعض نادر اشعار کا لغوی حل پیش کیا گیا ہے۔ نیز ان کی تشریح کی گئی ہے۔

۱۲۔ جنات: یہ آٹھ فنون پر مشتمل ہے۔

۱۳۔ مشرق السعدين۔

۱۴۔ مجمع البحرين۔

۱۵۔ ثمرة الفواد و سمره البعاد۔

۱۶۔ محاسن الاخبار و مجالس الاخيار: یہ کتاب سات جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

۱۷۔ ثمرة الحيات و ذخيرة الممات۔

۱۸۔ طيف الخيال فی مناظرة العلم والمال۔

شیخ محمد مومن بڑے زندہ دل اور خوش مزاج عالم تھے۔ مزاح اور ظرافت میں مشہور تھے۔

۵۹۔ شیخ محمد ناصر الٰہ آبادی

شیخ محمد ناصر عباسی الٰہ آبادی، خطۂ ہند کے نامور فاضل اور مشہور عالم تھے۔ شیخ محمد فاخر عباسی الٰہ ابادی کے چھوٹے بھائی اور شیخ محمد یحییٰ الٰہ آبادی، (معروف بہ شیخ خوب اللہ الٰہ آبادی) کے تین بیٹوں میں سے دوسرے بیٹے تھے۔ ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی شیخ محمد طاہر (متوفی ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۳ھ/۲ نومبر ۱۷۳۰ء) اور ماموں شیخ کمال الدین الٰہ آبادی سے جو علوم حکمیہ کے ماہر اور فنون مروجہ کے فاضل تھے، علم حاصل کیا اور دیار ہند کے جید علما میں گردانے گئے۔ مختلف علوم و فنون میں درک و مہارت کے

Marfat.com

ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ بہترین شاعر تھے اور ان کا کلام تین ضخیم دواوین پر محیط ہے۔ تصنیف و تالیف کا ملکہ بھی حاصل تھا۔ ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں شامل ہیں۔

منتخب الاعمال، الجواهر النفيسه، الافكار العشره، تذكره الخلفاء، تفسير آيات الاحكام، انوار الحقائق، تنبيه الاعزة بما كان لي عند الشيخ من العزة۔ ایک رسالہ اثبات مذہب حق کے بارے میں ہے۔

شیخ محمد ناصر عباسی الہ آبادی نے بدھ کے روز، مغرب کے وقت ۲۱ جمادی الاولی ۱۱۶۳ھ/ ۱۷ اپریل ۱۷۵۰ء کو صرف ۴۱ سال عمر پا کر جنت کی راہ لی، اپنے آبائی شہر الہ آباد (یوپی) میں وفات پائی اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے ❶۔

۶۰۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب دہلوی

خواجہ محمد ناصر حسینی دہلوی نجیب الطرفین سید تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب دس واسطوں سے حضرت خواجہ بہاالدین محمد نقشبندی بخاری سے اور چوبیس واسطوں سے حضرت حسن عسکری سے ملتا ہے۔

خواجہ بہاء الدین محمد نقشبند درحقیقت بخارا کے رہنے والے تھے۔ اور یہ وہی بزرگ ہیں جن کو سلسلۂ نقشبندیہ کے بانی اول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی وفات سے تقریباً تین سو سال بعد ان کے اخلاف میں سے ایک بزرگ خواجہ محمد طاہر نقشبند پیدا ہوئے۔ اس خاندان کے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے بخارا کی سکونت ترک کر کے ہندوستان کا عزم کیا۔ یہ بزرگ خواجہ محمد ناصر عندلیب دہلوی کے مورث اعلیٰ تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے تخت پر اورنگ زیب عالم گیر متمکن تھا۔ وہ ان سے انتہائی عقیدت سے پیش آیا، اور حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کی درخواست کی، مگر انھوں نے شہنشاہ ہند کی اس درخواست کو شرف قبولیت نہیں بخشا اور اپنے تین بیٹوں خواجہ محمد صالح، خواجہ محمد یعقوب اور خواجہ فتح اللہ کو دہلی میں عالم گیر کے دربار میں چھوڑا اور خود حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ ایک روایت کے مطابق واپس بخارا چلے گئے تھے ❷۔

خواجہ فتح اللہ کے بیٹے، نواب ظفر اللہ خاں اور نواب ظفر اللہ خاں کے بیٹے یہی خواجہ محمد ناصر ہوئے، جن کا تذکرہ ان سطور میں کیا جا رہا ہے۔

خواجہ محمد ناصر کی ولادت دہلی میں ہوئی، تربیت کی مختلف منزلیں بھی اسی شہر میں طے کیں۔ صغرسنی ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ اس عہد کے جن مشاہیر اصحاب فضل و کمال سے مستفید ہونے کا موقع ملا، ان میں شیخ سعد اللہ دہلوی اور شیخ زبیر بن ابوالعلا سرہندی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ کافی

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۷، ۲۱۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۵۷، ۳۵۸

❷ تفصیل کے لیے دیکھیے فقہائے ہند، ج پنجم

Marfat.com

عرصہ ان سے منسلک رہے یہاں تک کہ اللہ نے ان کے لیے علم و معرفت کے دروازے کھول دیے اور ان کا شمار فقہ و اصول اور دیگر علوم متعارفہ کے علمائے راسخین کی بلند مرتبت جماعت میں ہونے لگا۔

خواجہ ممدوح اپنے دور کے جید عالم اور ممتاز صاحب طریقت تھے اور ''محمدی'' نسبت رکھتے تھے۔ صوفیا و مشائخ کی متعارف رسوم اور اصطلاحات و اختراعات سے کبھی کوئی تعلق نہ رکھا۔ عملی و علمی کمالات کے ساتھ ساتھ ان میں ایک کمال یہ تھا کہ نامور شاعر تھے اور عندلیب تخلص کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مصنف بھی تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

۱۔ نالۂ عندلیب: یہ کتاب نثر میں ہے اور فارسی زبان میں ہے، دو ضخیم جلدوں پر محیط ہے۔ اس میں معرفت و طریقت، فقہ و اصول اور متفرق مسائل سے متعلق بڑی اہم باتیں معرض کتابت میں لائی گئی ہیں۔ مصنف نے یہ کتاب ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں مکمل کی اور نواب سید صدیق حسن خاں کے فرزند رشید نواب نور الحسن خاں مرحوم کی سعی جمیلہ سے شائع ہوئی۔ پوری کتاب اٹھارہ سو صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

۲۔ رسالہ ہوش افزا: یہ بھی نثر میں ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۳۔ دیوان عندلیب: جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا، خواجہ محمد ناصر عندلیب بہت اچھے شاعر تھے۔ ''دیوان عندلیب'' ان کے فارسی کلام کا مختصر مجموعہ ہے۔

خواجہ محمد ناصر عندلیب دہلوی نے ۶۶ سال عمر پا کر ہفتے کے روز ۲ شعبان ۱۱۷۲ھ/۳۱ مارچ ۱۷۵۹ء کو دہلی میں عالم فنا سے عالم بقا کو رخت سفر باندھا۔

۶۱۔ شیخ محمد نصیر شیخ پوری

شیخ محمد نصیر شیخ پوری شیعہ تھے اور شیخ شمس الدین اودھی کی اولاد میں سے تھے۔ مولد و منشا شیخ پورہ ہے۔ ابتدائے جوانی ہی میں ملا شاہ محمد شیرازی کی خدمت میں گئے اور ان سے کتب درسیہ پڑھیں، مشائخ ایران سے فقہ کی تعلیم پائی، حدیث کی سند بھی انہی سے لی، یہاں تک کہ حدیث، فقہ، ہیئت، ہندسہ اور حساب وغیرہ میں اونچے مرتبے کو پہنچے۔ بعد ازاں واپس ہندوستان آئے اور صوبہ بہار کے شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں سکونت اختیار کی۔ اس زمانے کے مغل بادشاہ نے صوبہ بہار میں ان کو کئی گاؤں بطور جاگیر عطا کر دیے تھے [1]۔

۶۲۔ مولانا محمد نعیم جون پوری

شیخ محمد نعیم بن مفتی محمد فائض صدیقی اودھی ثم جون پوری۔ محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔

---

[1] سیر المتاخرین ج ۲، ص ۶۱۱۔ نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۵۹۔

Marfat.com

بارھویں صدی ہجری کے عالم کبیر اور شیخ فاضل تھے۔ ان کے جد امجد کا نام نامی شیخ پیر محمد تھا جو سید سالار مسعود غازی کے ساتھ وارد ہند ہوئے اور ہندوؤں سے معرکہ کارزار گرم کیا۔ بعد ازاں علاقۂ اودھ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ شیخ محمد نعیم کے والد محترم مفتی محمد فائض تھے جو اودھ کے منصب افتا سے سرفراز ہوئے اور ایک گاؤں میں ٹھہرے جس کا نام "بدیع السرا" تھا، لیکن عوامی زبان میں اسے "بدوسرائے" کہا جاتا ہے۔

مفتی محمد فائض کے بیٹے محمد نعیم نے مصنف رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری اور دیگر علمائے عصر سے کسب علم کیا۔ اس زمانے کے عام دستور کے مطابق تصوف و طریقت کا علم بھی حاصل کیا۔ پھر اللہ نے اس قدر عروج بخشا کہ معقول و منقول میں دسترس حاصل کی اور اپنے وقت اور علاقے کے علامہ قرار پائے۔ ابتدا میں چونکہ علاقہ اودھ کے رہنے والے تھے اس لیے اودھی کہلائے، اور بعد میں جون پور کو اپنا مسکن قرار دے لیا تو جون پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ فقہ اور دیگر علوم میں ان کی ٹکر کا اس وقت کوئی دوسرا عالم نہ تھا۔ ہدایہ کی مفصل شرح سپرد قلم کی جو چودہ جلدوں میں ہے۔ حدیث کی درسی کتاب مشکوٰۃ کی شرح بھی لکھی اور کمال یہ ہے کہ یہ شرح ضعف بصارت کے بعد لکھی۔

مولانا محمد نعیم صدیقی جون پوری بلند ہمت عالم دین تھے۔ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا۔ سو سال سے زائد عمر کو پہنچ گئے تھے، لیکن نہ تدریس میں کمی پیدا ہوئی اور نہ تصنیف میں کوئی حرج واقع ہوا۔

اس جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فقیہ نے ۱۸ صفر ۱۱۲۰ھ/۸ اپریل ۱۷۰۹ء کو جمعۃ المبارک کی رات کو عالم آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔ بعض حضرات نے قرآن مجید کے ان الفاظ سے تاریخ وفات نکالی۔

وعنده جنات لهم فيها نعيم مقيم [1]۔

۶۴۳۔ سید محمد نور نصیر آبادی

سید محمد نور نصیر آبادی برصغیر کے عظیم القدر خاندان کے رکن تھے۔ یعنی رائے بریلی کے شیخ اجل حضرت سید علم اللہ حسنی کے پوتے اور حضرت سید محمد ہدیٰ کے فرزند دلبند تھے۔ اپنے جلیل القدر دادا کے زمانے میں پیدا ہوئے اور انہی کی نگرانی میں کسب علم کیا، فقہ کی تعلیم بھی ان سے پائی اور اخذ طریقت بھی انہی سے کیا۔ سید علم اللہ کو اپنے اس پوتے سے بڑی محبت تھی اور سید محمد ہدیٰ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس بچے کی تربیت میری مغفرت کا باعث ہوگی۔

سید محمد نور حصول علم سے فارغ ہوئے اور جوانی کو پہنچے تو شاہی ملازمت کے لیے دکن کا ارادہ کیا۔ سید علم اللہ کے ارادت مندوں میں سے ایک امیر نے سفارش کر کے شہزادہ اعظم جاہ کی سرکار میں ملازمت دلا دی

[1] نزہتہ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۰۔ بحوالہ گنج ارشدی۔

Marfat.com

اور بہت بڑا کام یہ کیا کہ خاص ان کے لیے دربار کے عام طریق تسلیم و بندگی کی جگہ صرف سلام مسنون کی اجازت حاصل کی۔اس طرح چودہ برس ملازمت میں گزر گئے۔ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ ایک وسیع میدان ہے اور اس میں نہایت خوب صورت مسجد بنی ہوئی ہے۔اس میں ایک بزرگ بیٹھے ہیں جن کی شکل بڑی نورانی ہے۔سامنے ایک دستار رکھی ہے۔بزرگ نے دستار کو ہاتھ میں پکڑا اور پھاڑ دیا۔سید محمد نور نے پوچھا: ''یہ کیا ہوا؟'' بزرگ نے جواب دیا: یہ ''اعظم جاہ کی سلطنت تھی، جس کی دستاویز پارہ پارہ کر دی گئی۔''

خواب سے بیدار ہوتے ہی طبیعت ملازمت سے بیزار ہوگئی اور دو برس کی رخصت لے کر گھر چلے گئے۔پھر استعفا دے دیا۔

سید محمد نور عفت و قناعت، ورع و تقویٰ، جود و سخا اور ہمدردیٔ خلائق میں اپنے واجب الاحترام والد اور لائق تعظیم دادا کے نقش قدم پر چلتے تھے۔غیبت اور کذب بیانی سے اس درجے تنفر تھا کہ اسے سن بھی نہیں سکتے تھے۔پابند سنت تھے۔اہل بدعت کے تحائف و ہدایا، ہرگز قبول نہ کرتے۔اکل حلال کا خاص طور پر اہتمام فرماتے۔عزیزوں، ہمسائیوں اور غریبوں کی خدمت کو ذریعہ سعادت سمجھتے۔اوقات شب و روز کا بیشتر حصہ انہی کی خدمت میں بسر ہوتا۔

سید علم اللہ کے خانوادۂ بلند بخت کے اس نامور عالم و فقیہ نے بدھ کے روز ۶ ربیع الاول ۱۱۴۸ھ/۱۶ جولائی ۱۷۳۵ء کو نصیر آباد میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اور اپنے نانا سید داؤد (برادر حقیقی سید علم اللہ شاہ) کے قریب دفن ہوئے❶۔

۶۴۔سید محمد وارث حسینی بنارسی

سید محمد وارث حسینی کا قدیم وطن ایک قریہ ''نونہرہ'' تھا جو اعمال غازی پور میں واقع تھا۔ان کے والد سید عنایت اللہ حسینی عہد عالم گیری میں بنارس کے منصب قضا پر مامور تھے، اس لیے بنارس ہی میں سکونت رکھتے تھے۔ان کی ولادت ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۳ء میں بنارس میں ہوئی۔عالم طفولیت ہی میں تحصیل علم میں مشغول ہو گئے تھے۔مختلف اساتذہ سے اخذ علم اور کسب فیض کیا اور فقہ، اصول، کلام اور علوم عربیہ کے اکابر علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔منطق و حکمت اور دیگر فنون میں بھی بلند مرتبے کو پہنچے۔

سید محمد وارث بنارسی نے کئی کتب درسیہ پر حواشی و تعلیقات سپرد قلم کیے۔علم فقہ کی مشہور کتاب شرح وقایہ پر حاشیہ لکھا، میر زاہد پر بھی حاشیہ تحریر کیا۔کہتے ہیں، قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی تھی۔

سید محمد وارث حسینی بنارسی نے جو اپنے علاقے اور عہد کے ممتاز فقیہ اور بہت بڑے عالم و مصنف تھے، ۱۰ ربیع الثانی ۱۱۶۶ھ/۱۴ فروری ۱۷۵۳ء کو بنارس میں وفات پائی اور وہیں آسودۂ لحد ہوئے❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۱ - سید احمد شہید ص ۵۱ - نیز دیکھیے اعلام الہدیٰ۔

❷ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۸، ۲۱۹ - تذکرہ مشائخ بنارس ص ۳۲ تا ۳۹ - برکات اولیائے ص ۱۵۴ - نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۱

Marfat.com

۶۵۔ مولانا محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی

کشور سندھ کے مردم آفرین خطے میں جن اصحاب فضل وفیض اور ارباب علم وکمال نے درس وتدریس کے ہنگامے برپا کیے اور تصنیف وتالیف کے جھنڈے گاڑے، ان میں مولانا محمد ہاشم سندھی کا نام نامی تاریخ برصغیر کے صفحات میں ہمیشہ نقش رہے گا۔ ان کے والد کا نام عبدالغفور اور جد امجد کا عبدالرحمٰن تھا۔ سندھ کے مرکز علم ٹھٹھہ کے رہنے والے تھے۔ ہوش سنبھالا تو حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ اس زمانے میں عالم کبیر مولانا ضیاء الدین ٹھٹھوی سندھی (متوفی ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء) سرگرم درس وافادہ تھے، ان کی خدمت میں حاضری دی اور درسی کتابوں کی تکمیل فرمائی۔ اس کے بعد سفر حجاز پر روانہ ہوئے، اور حج وزیارت کا شرف حاصل کیا۔ وہاں اہل علم کے کئی حلقے قائم تھے، جن میں ایک حلقہ شیخ عبدالحق صدیقی مکی کا تھا۔ شیخ ممدوح مکہ مکرمہ میں احناف کی مسند افتا پر فائز تھے، مولانا محمد ہاشم اس میں شریک ہو گئے اور شیخ ممدوح سے حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھنا شروع کیں، ان علوم میں اس قدر مہارت پیدا کی کہ تمام ساتھیوں سے سبقت لے گئے۔ واپس وطن پہنچے تو ٹھٹھے میں خود مسند تدریس آراستہ کی اور حدیث، فقہ اور علوم عربیہ کی تدریس کا غلغلہ بلند کرنے لگے۔ حضرت ممدوح فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے اور اپنے اسلوب خاص سے اس کی نشر واشاعت کو ضروری قرار دیتے تھے۔

اس زمانے میں ٹھٹھہ اصحاب فضل کا عظیم مرکز تھا، شیخ محمد معین سندھی بھی اسی شہر میں فروکش تھے جو تقلید کے سخت مخالف اور مسائل شرعیہ میں مسلک اصحاب الحدیث کے مطابق براہ راست کتاب وسنت سے استدلال کے زبردست حامی تھے۔ ان کی مشہور تصنیف ''دراسات اللبیب'' کا بیشتر حصہ اسی موضوع پر مشتمل ہے۔ مولانا محمد ہاشم اور شیخ محمد معین کے درمیان اس سلسلے میں علمی مباحث کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تحقیقی انداز میں ایک دوسرے کے درمیان خوب بحثیں چلیں۔

مولانا محمد ہاشم ٹھٹھوی منجھے ہوئے مصنف بھی تھے۔ متعدد کتابیں ان کے زور قلم کے نتیجے میں معرض تصنیف میں آئیں جن میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ بذل القوۃ فی سنی النبوۃ۔

۲۔ جنۃ النعیم فی فضائل القران الکریم: یہ کتاب انھوں نے ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء میں تصنیف کی۔

۳۔ فاکھۃ البستان فی تنقیح الحال والحرام: یہ کتاب ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں تالیف فرمائی۔

۴۔ حیاۃ القلوب فی زیارۃ المحبوب: یہ کتاب ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء میں تصنیف کی۔

۵۔ کشف الرین فی مسئلۃ رفع الیدین: شیخ محمد معین سندھی نے ''اثبات رفع الیدین فی الصلوٰۃ'' کے نام سے دو کتابیں لکھی ہیں، ایک عربی میں اور ایک فارسی میں، ان کتابوں میں انھوں نے احادیث کی رو سے نماز میں رفع یدین کرنے کا ثبوت دیا ہے۔ مولانا محمد ہاشم سندھی نے اس

Marfat.com

رسالے میں ان کا جواب تحریر فرمایا ہے۔ یہ رسالہ انھوں نے ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء میں تصنیف فرمایا۔

۶۔ ایک ضخیم کتاب فرائض الاسلام کے موضوع پر ۱۱۷۱ھ میں تصنیف کی۔ اس کتاب میں فرائض ایمان کی وضاحت کی گئی ہے، اور اس باب میں مسلمان پر جو علمی اور عملی ذمہ داریاں ہوتی ہیں، ان کی صراحت فرمائی گئی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

مولانا محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی اپنے دور کے جلیل القدر عالم تھے اور ان کے معلومات و مطالعہ کا دامن بہت وسیع تھا۔ فقہ حنفی میں انھیں عبور حاصل تھا۔ ان کی تبلیغی مساعی سے بہت سے غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ اس فاضل اجل نے ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء میں اس جہان فانی سے منہ موڑا اور جنت کی راہ لی❶۔

۶۶۔ سید محمد ہدیٰ نصیر آبادی

سید محمد ہدیٰ حسنی نصیر آبادی سید علم اللہ حسنی بریلوی (متوفی ۸ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ/۲۵ نومبر ۱۶۸۵ء) کے فرزند ارجمند تھے۔ انھوں نے علم و فضل کی فضا میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور تقویٰ و تدین کے ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے والد گرامی سید علم اللہ بریلوی سے فقہ اور دیگر علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ بلند مرتبت باپ کی صحبت کیمیا اثر سے نیکی کے ہر گوشے میں اونچے درجے پر رسائی حاصل کی۔ عالی ہمت عالم کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ سخاوت و جودت کا یہ عالم کہ کبھی کسی کا سوال رد نہ کیا۔ ایک مرتبہ ایسی حالت میں سائل نے دروازے پر دستک دی، جب کہ ایک کوئی چیز بھی پاس نہ تھی، فوراً بیوی کا زیور اتروا کر اس کے حوالے کر دیا۔

سید محمد ہدیٰ کئی جاگیروں کے مالک تھے، مگر سخاوت کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ صرف نصیر آباد کی جاگیر سے گھر کے مصارف پورے کرتے، باقی تمام تر آمدنی مستحقین کو دے دیتے۔ دو یا تین گاؤں کی آمدنی برادری کے لوگوں کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ ایک روز بارہ ہزار عالم گیری دینار کہیں سے آئے، اس مرد خدا نے سب کے سب اسی وقت بانٹ دیے، خود فاقے سے رات گزاری۔

اس جاگیر اور آمدنی کے باوجود اپنے لیے کوئی پختہ مکان تعمیر نہ کرایا، اگر اس طرف توجہ دلائی جاتی تو جواب دیتے کہ چند سانس گزارنے کے لیے چھپر اور بلند و بالا عمارت میں کوئی فرق نہیں، سب کی حیثیت یکساں ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ چھپروں میں بھی کبھی اچھی لکڑی استعمال نہ کی۔

ان کی موت اس طرح واقع ہوئی کہ مغل حکمران شاہ عالم اول سے ملاقات کے لیے نکلے، وہ دکن کی طرف جا رہا تھا، برہان پور پہنچے تو وہاں ۱۹ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ/۹ جون ۱۷۰۷ء کو وفات پا گئے۔ اقربا نے میت کو بہ طور امانت برہان پور کی خانقاہ نقشبندیہ میں دفن کیا۔ ایک برس کے بعد اسے تابوت میں رکھ کر رائے بریلی لائے اور زاویہ سید علم اللہ شاہ میں دفن کیا❷۔

❶ تحفۃ الکرام ص ۶۹۶ (اردو ترجمہ) تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۳، ۲۵۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۳۔

❷ سید احمد شہید، ص ۵۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۵، ۳۶۶۔

Marfat.com

۶۷۔ شیخ محمد یحییٰ عباسی الہ آبادی

اقلیم ہند کی جن جلیل القدر شخصیتوں نے آسمان علم وشہرت کی آخری بلندیوں تک پرواز کی، ان میں شیخ محمد یحییٰ عباسی الہ آبادی کا نام قابل ذکر ہے۔ شیخ خوب اللہ الہ آبادی کے لقب سے معروف تھے۔ والد کا اسم گرامی محمد امین تھا۔ چچا اور سسر شیخ محمد افضل عباسی الہ آبادی تھے جو بارھویں صدی ہجری کے عظیم المرتبت ہندی عالم تھے اور جن کی تاریخ ولادت ۱۰ ربیع الاول ۱۰۳۸ھ/ ۲۷ نومبر ۱۶۲۸ء اور تاریخ وفات ۲۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/ ۱۲ جنوری ۱۷۱۳ء ہے۔

شیخ محمد یحییٰ ۱۷ محرم ۱۰۸۰ھ/ ۷ جون ۱۶۶۹ء کو پیدا ہوئے اور علم وفضل کی فضا میں پرورش پائی، ہوش سنبھالا تو گھر میں شیخ محمد افضل عباسی کا سلسلۂ فیض وافادہ جاری تھا، ان سے درسی کتابوں کی تکمیل فرمائی اور طویل مدت تک ان کے دامن تربیت سے وابستہ رہے۔ اخذ طریقت بھی انہی سے کیا۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ تیرہ سال کی عمر میں علوم متعارفہ سے فارغ ہوگئے تھے۔ یہ وہ عمر ہے جب کہ عام طور پر بچے کھیل کود میں مشغول ہوتے ہیں۔

شیخ محمد یحییٰ الہ آبادی اس برصغیر کے وہ عالی دماغ شخص تھے کہ جن کا اس علاقے میں وسعت علم، کثرت مطالعہ، معرفت حدیث اور ادراک فقہ میں کوئی مثیل نہ تھا۔ علوم میں امامت اور فنون میں اجتہاد کے درجے پر فائز تھے۔ جو علمی وتدریسی خدمات انھوں نے انجام دیں، ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں وہ زریں حروف سے لکھنے کے لائق ہیں۔ درس وتدریس، موعظت وخطابت، تبلیغ واشاعت دین، زہد واتقا، عبادت الٰہی ،تصنیف وتالیف غرض ہر میدان میں ان کی تگ وتاز کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور ہر علمی ودینی معاملے میں مخلوق خدا نے ان کی رہنمائی کی ضرورت محسوس کی۔ تمام عمر حق وصداقت کا علم بلند کیے رکھا۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

القول الصحیح فی صلوٰۃ التسبیح ، الکلام المفید فیما یتعلق بالشیخ والمرید ، الکلمات المؤتلفه فی المقاصد المختلفه ، البضاعة المزجاة ، ماخذ الاعتقاد فی شان الصحابة واهل البیت الامجاد ، تزیین الاوراق فی مخرق الطباق ، خلاصة الاعمال ، بسط الکلام فی وفیات اللاعلام ، توفیر المنصعه فی باب الجمعه ، المناقب الغوثیه ، الاربعین ، اعلام الهدیٰ ، اقامة الحجه فی الجمع بین الظهر والجمعه ، رساله فی الاذکار و ثمراتها ، شرح رسالة المکیه ، حاشیه دستور المبتدی ، شرح دعاء الصباح ، اغاثة القاری فی شرح ثلاثیات البخاری ، اخراج الخبایا فی شرح الوصایا ، تذکرة الاصحاب وغیرہ۔ عربی اور فارسی کی یہ کتابیں حضرت مصنف کی بے پناہ علمی اور تحقیقی قابلیت کی غماز ہیں۔

Marfat.com

ان کے علاوہ چار ضخیم جلدوں میں ان کے مکاتیب ہیں جو انھوں نے مختلف حضرات کے نام بہت سے اہم علمی اور فقہی مسائل کے بارے میں تحریر فرمائے۔ یہ مکاتیب ان کے علو فکر، غزارت علم، دقت نظر اور ہمہ گیر معلومات کی نشان دہی کرتے ہیں۔

شیخ محمد یحییٰ کے تین بیٹے تھے، شیخ محمد فاخر، شیخ محمد ناصر اور شیخ محمد طاہر۔ یہ تینوں فضل و عرفان میں یگانہ اور فیض و کمال میں منفرد تھے۔ ان کے حالات گزشتہ صفحات میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

شیخ محمد یحییٰ عباسی الہ آبادی نے ۶۴ برس کی عمر میں ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ/ ۳۱ را کتوبر ۱۷۳۱ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا اور جنت الفردوس کی راہ لی ❶۔

۶۸۔ مولانا محمود نائطی

مولانا شہاب الدین محمود بن ابوالمحمود نائطی مدراسی، نواح مدراس کے شیخ، عالم و فقیہ اور صاحب فضل و کمال تھے۔ اس علاقے کے ارباب علم اور ثقہ لوگوں نے ان کے کئی قسم کے علمی اوصاف و کمالات بیان کیے ہیں اور انھیں بارھویں صدی ہجری کے ہندی علما میں بڑی اہمیت دی ہے ❷۔

۶۹۔ سید محی الدین حسینی نیوتنی

سید محی الدین حسینی نیوتنی، غلام محی الدین کے نام سے معروف تھے۔ اپنے عہد کے فاضل اور شیخ تھے۔ فقہ و اصول، علوم عربیہ اور تصوف میں یگانہ تھے۔ مولد و منشا ''نیوتنی'' ہے، جو اس زمانے میں علاقہ اودھ میں ایک بڑا قریہ تھا۔ کچھ بڑے ہوئے تو دل میں حصول علم کا شوق کروٹ لینے لگا اور اس عظیم مقصد کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اپنے عصر کے نامور اساتذہ کی خدمت میں گئے اور استفادہ کیا۔ شیخ لطف اللہ کوروی کے حلقۂ درس میں بھی شامل ہوئے اور ان سے منسلک رہے۔ شیخ پیر محمد لکھنوی اپنے دور کے علمائے نامدار اور صوفیائے عالی مقام میں سے تھے، ان سے بھی استفاضہ کیا۔ مختلف اصحاب سے کسب علم اور اخذ فیض کے بعد ''بانگر'' کے علاقے میں گئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ لوگوں سے بالکل الگ ہو کر یاد الٰہی کو اپنا دن رات کا مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ بانگر کے علاقے ہی میں وفات پائی ❸۔

---

❶ انوار العاملین ص ۴۶۴، ۴۶۵ - مفتاح التواریخ ص ۳۱۴ - تذکرہ علمائے ہند ص ۵۸، ۵۹ - نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۴۲۰، ۴۲۱۔

❷ تاریخ النوائط ص ۳۱۷ - نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۶-

❸ تاریخ فرخ آباد - نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۷

Marfat.com

۷۰۔شیخ محی الدین الہ آبادی

شیخ محی الدین بن قاضی داؤد الہ آبادی بارھویں صدی ہجری کے فضلائے الہ آباد اور فقہائے ہند میں بڑی شہرت کے حامل تھے۔ان کے والد گرامی قاضی داؤد الہ آبادی بھی تقویٰ شعاری اور معرفت وادراک میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔شیخ محی الدین اپنے باپ کے صحیح جانشین ہوئے،علوم ومعارف اور درس وافادہ میں وہی راستہ اختیار کیا، جو عمر بھر جلیل القدر باپ نے اختیار کیے رکھا تھا۔ان سے بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا اور وہ اللہ کے دین کی تبلیغ واشاعت کا موثر ذریعہ بنے❶۔

۷۱۔قاضی مرادالدین کشمیری

قاضی مرادالدین کشمیری کا مولد ومنشا کشمیر ہے۔مولانا عنایت اللہ کشمیر(متوفی رمضان المبارک ۱۱۲۵ھ/ستمبر ۱۷۱۳ء)اور بعض دیگر علمائے وقت کے شاگرد تھے۔حصول علم کے بعد عازم دہلی ہوئے اور مغل حکمران شاہ عالم سے تقرب پیدا کیا۔بادشاہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر انھیں منصب قضا سے سرفراز فرمایا۔خاصا عرصہ اس منصب پر فائز رہے۔بعد ازاں دہلی میں مفتی عساکر مقرر ہو گئے۔پھر ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان کے قاضی القضاۃ بنا دیے گئے۔وادیٔ کشمیر کے اس عالم وفقیہ نے بڑی ترقی کی اور اللہ نے ان کے علم وفضل کی بدولت انھیں ملک میں متعدد اعزازات سے نوازا۔۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں رحلت فرمائی❷۔

۷۲۔سید مربی بلگرامی

سید مربی بن عبدالنبی بن سید طیب بن عبدالواحد حسینی واسطی بلگرامی۔بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔گھر میں علم وفیض کا چرچا تھا، پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔اس کے بعد سید اسماعیل حسینی بلگرامی سے تحصیل علم کی۔پھر قنوج گئے اور شیخ یٰسین قنوجی سے اخذ فیض کیا۔بعد ازاں موضع ''ہرکام'' کا عزم کیا اور کتب درسیہ کی تکمیل شیخ ابوالواعظ ہرکامی سے کی۔حصول علم کے بعد اپنے وطن بلگرام واپس آئے اور درس وافادۂ طلبا میں مشغول ہو گئے۔وہاں خلق کثیر نے اس عالم وفقیہ سے استفادہ کیا۔

سید مربی کو معرفت وادراک اور فضل وکمال کے پیکر کی حیثیت حاصل تھی۔سید غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کی ہمہ گیر عزت وتعظیم کے بارے میں مآثر الکرام میں یہ عجیب واقعہ نقل کیا ہے کہ سید مربی ایک مرتبہ کسی تقریب کے سلسلے میں قصبہ مارہرہ گئے، وہاں سے موضع اترولی تشریف لے گئے۔شیخ محمد عاقل اترولوی جو

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶،ص ۳۶۷ بحوالہ بحر زخار۔

❷ مختصر تاریخ کشمیر (فارسی) ص ۱۳۔از مفتی علاء الدین محمد۔مطبع رشیدی لاہور، ۱۳۰۱ھ۔نزہۃ الخواطر، ج ۶،ص ۳۶۷

Marfat.com

تصوف وطریقت میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے، وہیں کے رہنے والے تھے، انھیں معلوم ہوا تو وہ حضرت سید ممدوح کے خیر مقدم کے لیے آئے اور شان دار استقبال کیا۔ کمال ادب و نیاز کے ساتھ انھیں اپنے گھر لے گئے اور سر سے دستار مبارک اتار کر صحن خانہ میں بچھائی۔ عرض کیا کہ حضرت اپنے قدم مبارک اس دستار پر رکھتے ہوئے صحن میں سے گزریں۔ سید مربی اس پر آمادہ نہ ہوئے تو ان کا اصرار بڑھا، بالآخر جب انھوں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو مجبور ہو گئے اور ان کے التماس کے مطابق دستار پر قدم رکھتے ہوئے صحن سے گزرے۔

سید مربی کئی روز شیخ محمد عاقل کے مکان پر اترولی میں مقیم رہے اور اس اثنا میں تصوف وطریقت کے مختلف مسائل پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ جن حضرات نے سید مربی سے اخذ فیض کیا ان کی طویل فہرست میں سید طفیل محمد اترولوی بلگرامی اور شیخ محمد عاقل اترولوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

سید مربی حسینی بلگرامی دوشنبہ کے دن ۱۴ شعبان ۱۱۱۷ھ/۲۰ نومبر ۱۷۰۵ء کو اس جہان فانی سے سفر آخرت پر روانہ ہوئے❶۔

۷۳۔ قاضی مربی پھانوی

قاضی مربی حسینی ترمذی پھانوی بارھویں صدی ہجری کے مشہور ہندی شیخ اور فقیہ تھے۔ رجال علم وصلاح میں ان کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مولد ومنشا ''پھانی'' ہے جو اس زمانے میں ایک گاؤں تھا۔ مختلف بلاد وقصبات میں جا کر فاضل اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، پھر سید قطب الدین شمس آبادی (متوفی ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء) کی خدمت میں آئے اور ان سے مروجہ درسیات کی آخری کتابیں پڑھیں اورفقہ واصول کے اونچے مرتبے پر فائز ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد فرخ آباد کی مسند قضا پر متمکن کیے گئے۔

قاضی مربی کتب درسیہ پر اس درجے عبور رکھتے تھے کہ منطق کی مشہور کتاب سلم العلوم کی شرح لکھی اور میر زاہد پر حاشیہ تحریر کیا❷۔

۷۴۔ سید مرتضیٰ ملتانی

سید مرتضیٰ حسینی ملتانی کا تذکرہ خافی خاں نے منتخب اللباب (جلد دوم) میں اورنگ زیب کے آخری عہد یعنی ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء کے واقعات میں کیا ہے اور انھیں مرتضیٰ واعظ لکھا ہے۔ یہ دیار ہند کے معروف علما اور مشہور مشائخ میں سے تھے۔ صالح اور متدین عالم تھے۔ اصلاً ملتان کے باشندے تھے۔ عابد وزاہد، تہجد گزار،

❶ مآثر الکرام ص ۹۴ تا ۹۸ - نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۸ - تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۷۶ - تقصار جیود الاحرار، ص ۲۰۹، ۲۱۰

❷ نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۸، بحوالہ تاریخ فرخ آباد۔

Marfat.com

جرأت مند، کثرت سے روزہ رکھنے والے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں انتہائی تیز، احکام الٰہی کی تبلیغ و اشاعت میں نہ کسی سے ڈرتے اور نہ کسی نوع کا خوف دل میں لاتے، اہل بدعت کے خلاف شمشیر برہنہ۔ نہ خود اہل دنیا سے اختلاط و ارتباط رکھتے اور نہ اسے جائز سمجھتے۔ ملوک و سلاطین سے کوئی چیز قبول نہ کرتے، نہ خراجی زمینوں سے کوئی چیز لیتے اور نہ ماہانہ یا سالانہ نقدی یا جنس کی صورت میں کوئی شے وصول کرتے۔ عالی ہمت، خود دار اور دین کے معاملے میں انتہائی غیور۔ بعض اہل علم سماع کو جائز سمجھتے ہیں لیکن سید مرتضی ملتانی اس کے قریب تک نہ جاتے اور قائلین سماع سے سختی کا برتاؤ کرتے۔ شب برأت اور عاشورہ کے موقعے پر بعض حلقوں میں جو رسوم و رواج پائی جاتی ہیں اس سے شدت کے ساتھ منع فرماتے، عیدین کا چاند دیکھنے کے بعد بھی کچھ لوگوں میں غیر شرعی امور کے ارتکاب کی عادت پڑ گئی ہے، اس سے پوری قوت سے روکتے۔ میت کے تیجے، ساتویں، دسویں اور چالیسویں کی شدید مخالفت کرتے اور ختم وغیرہ کے نام پر جو کچھ پکایا اور کھلایا جاتا ہے، اسے قطعی ناجائز ٹھہراتے۔ فرمایا کرتے کہ کچھ لوگ اللہ کے نام پر کھانا پکاتے ہیں لیکن غریبوں، مسکینوں اور مستحق لوگوں کو دینے کے بجائے یا تو خود کھا جاتے ہیں یا اپنے اعزہ واقربا اور امیر طبقے میں تقسیم کر دیتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بری بات ہے۔

سید مرتضی ملتانی بدعات و محدثات کو کسی شکل میں بھی برداشت نہ کرتے تھے۔ پکے ہوئے کھانے یا پھل وغیرہ پر ختم پڑھنے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی جو رسم چل نکلی ہے، اس کی سختی سے تردید کرتے، اسے خلاف شریعت قرار دیتے اور لوگوں کو اس کے ارتکاب سے منع فرماتے۔ تمبا کونوشی کو حرام قرار دیتے، اور اس میں سختی کرتے۔ علمائے سو کو سخت الفاظ میں مطعون ٹھہراتے اور امرائے مملکت اور عمال حکومت سے ان کی مصاحبت کو ہدف تنقید بناتے۔ جو اصحاب علم اغنیا سے ربط و تعلق کی بنا پر امور شرع میں مداہنت کا ثبوت دیتے اور معاملات دین میں نرمی برتتے ہیں ان کو ہرگز قابل معافی نہ سمجھتے۔ ان لوگوں کے بارے میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ یہ حصول مال کی غرض سے امرا کی مجلسوں میں جاتے اور فسق و فجور کے ارتکاب میں عملاً ان کی حوصلہ افزائی کا باعث بنتے ہیں۔

مشائخ کی قبروں پر عرس منعقد کرنے، وہاں رقص و سرود کی محفلیں جمانے اور سماع و غنا کا اہتمام کرنے پر شدید تنفر کا اظہار فرماتے، اور اس قبیل کے تمام افعال کو مکروہات و منکرات میں گردانتے۔ برسر منبر اس کی نکیر کرتے اور اپنے قول و عمل سے جہاں تک ممکن ہوتا اس نوع کی حرکات سے لوگوں کو منع فرماتے۔

سید مرتضی ملتانی کا شمار بارھویں صدی ہجری کے فحول علما، جلیل القدر مشائخ اور زور دار واعظین میں ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کسی کو اپنے حلقہ بیعت میں داخل ہونے کی دعوت نہ دیتے۔ اگر کوئی ان سے بیعت ہونا چاہتا تو صاف لفظوں میں فرماتے کہ میں تمھیں برائی سے رکنے اور منکرات سے دامن کشاں رہنے کی تاکید کرتا ہوں اور پوری قوت سے تلقین کرتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے ہر قسم کی برائی کا دروازہ بند کر دینے کے لیے جدوجہد کرو۔ وہ لوگوں سے اس بات کا اقرار لیتے کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں، جن برائیوں کا

Marfat.com

ارتکاب ان سے ہو چکا ہے، اس سے اللہ کے حضور نہایت عجز و انکسار سے عفو و درگزر کی درخواست کرتے ہیں اور اس کے سامنے مغفرت کے لیے اپنا دامن پھیلاتے ہیں۔ ہم اللہ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں معصیت سے کنارہ کش رہنے اور خلاف شرع امور سے بچنے کی توفیق مرحمت فرمائے گا۔

سید مرتضیٰ ملتانی اس زمانے کے عالم تھے جب آبادیوں کا یہ پھیلاؤ نہ تھا، جو موجودہ دور میں ہمارے سامنے ہے۔ نہ شہروں اور قصبوں میں یہ بھیڑ تھی، جس سے آج کل ہم دوچار ہیں۔ آبادیوں کا سلسلہ محدود تھا، بالخصوص مسلمانوں کی تعداد بڑی کم تھی، لیکن اس کے باوصف ان الفاظ کے ساتھ جو وہ بیعت لیتے تھے، اس سے متاثر ہو کر ملتان اور لاہور وغیرہ کے تین یا چار ہزار افراد ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہو گئے تھے اور یہ سلسلہ بلاد دکن تک وسعت اختیار کر گیا تھا۔

ان کی پاک بازی اور احتیاط کا یہ حال تھا کہ امرائے مملکت کے گھروں سے کھانا نہ کھاتے۔ اگر روپے وغیرہ کی شکل میں کوئی نذر پیش کرتا تو اس وقت تک قبول نہ فرماتے، جب تک یہ تحقیق نہ کر لیتے کہ اس کے ذرائع آمدنی کیا ہیں، اس کا کاروبار کیا ہے، وہ جو مال لے کر آیا ہے، یا جس سے کھانا کھلانا چاہتا ہے وہ حلال اور طیب ہے، مشکوک تو نہیں یا اس میں حرمت کا کوئی شائبہ تو نہیں پایا جاتا، وہ اپنے اہل و عیال کے حقوق ادا کرتا ہے، اللہ نے اپنے بندوں کے جو فرائض اس پر عائد کیے ہیں انھیں پورا کرتا ہے، اپنے مال سے عشر یا زکوٰۃ وغیرہ دیتا ہے۔ اگر تحقیق کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ اس کی آمدنی حلال ذرائع کی ہے تو دعوت قبول فرما لیتے، ورنہ بلا جھجک رد کر دیتے۔ اس بات کی قطعاً پروا نہ کرتے کہ لوگوں پر ان کے قول و فعل کا کیا اثر پڑے گا اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ نہ یہ دیکھتے کہ دعوت کرنے والا کتنا بڑا آدمی ہے۔

امور شرع کی اس زبردست حمایت اور بدعات و منکرات کی سخت مخالفت کی پاداش میں انھیں مخالفین کی طرف سے مبتلائے اذیت کیا گیا اور کئی قسم کی تکلیفیں پہنچائی گئیں مگر اس مرد باہمت نے کوئی پروا نہیں کی۔ ایک مرتبہ وہ دکن کے شہر اورنگ آباد پہنچے اور معمول کے مطابق وعظ کہا، جس میں اہل بدعت پر شدید نکیر کی اور علما و مشائخ کو اللہ کے دین میں ان کی مداہنت کی وجہ سے مطعون ٹھہرایا۔ بات حکومت کے ایوانوں تک پہنچی تو اورنگ آباد کے قاضی نے جس کا نام محمد اکرم تھا، سید مرتضیٰ کو اپنی عدالت میں طلب کیا۔ وہ قاضی کی عدالت میں گئے تو وہاں کے لوگ بھی ایک ہجوم کی شکل میں قاضی کے پاس پہنچ گئے۔ یہ لوگ اس طریقے سے قاضی کی مخالفت اور سید مرتضیٰ کی حمایت کر رہے تھے کہ سید مرتضیٰ کو خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں قاضی کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ وہ خود ہجوم میں آئے اور لوگوں کو آگے بڑھنے اور قاضی کی مخالفت کرنے سے روکا۔ اس کے بعد وہ قاضی کے سامنے پیش ہوئے تو قاضی نے ان سے تمباکو کی حرمت اور حلت کے مسئلے پر بحث شروع کر دی۔ آخر کار قاضی نے ان سے کہا کہ جس مسجد میں وہ وعظ کہہ رہے ہیں، وہ اتنی تنگ ہے کہ لوگ اس میں سما نہیں سکتے۔ قاضی کی گفتگو کے سیاق و سباق سے پتا چلتا تھا کہ اس کا اصل مقصد ان کے وعظ و تبلیغ میں رکاوٹ پیدا کرنا تھا۔

Marfat.com

اس زمانے میں ہندوستان کا بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر تھا اور وہ بعض قلعوں کی تسخیر کے سلسلے میں پونہ میں مقیم تھا۔ سید مرتضیٰ ملتانی بادشاہ کے پاس پہنچے اور اسے اپنا تصنیف کردہ ایک رسالہ پیش کیا، جس کا نام ''حق گو'' تھا۔ اورنگ زیب نے ابھی اس کے تین ہی صفحے پڑھے تھے کہ فرط ادب و تاثر سے رسالہ زانو پر رکھ لیا اور کہا الحمدللہ ثم الحمدللہ! میری مملکت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بلا کسی خوف و خطر کے مسائل شریعت مطہرہ کی وضاحت اور کلمہ حق کی تبلیغ میں ہر آن کوشاں رہتے ہیں۔

اورنگ زیب جو خود بھی شریعت کا عالم اور نیک بادشاہ تھا، سید مرتضیٰ کے علم و اخلاص سے نہایت متاثر ہوا اور اپنے بیٹے کام بخش کو حکم دیا کہ انھیں شاہی محل میں لے جائے اور جو یہ ارشاد فرمائیں اس پر پورا عمل کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ نے سید مرتضیٰ سے تحائف بادشاہی قبول فرمانے کی درخواست کی۔ لیکن سید صاحب نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ بادشاہوں اور حکمرانوں سے تحائف و ہدایا قبول کرنا ان کے معمول کے خلاف ہے۔ بادشاہ پر ان کے انکار کا بہت ہی خوش گوار اثر پڑا۔

کچھ عرصے کے بعد اورنگ زیب بادشاہ نے جب یہ دیکھا کہ سید مرتضیٰ بہت دیانت دار عالم دین ہیں تو ان سے عہدۂ احتساب پر متعین ہونے کی درخواست کی اور کہا کہ جس شہر کی آب و ہوا ان کی طبیعت کے موافق ہو، اس میں سکونت اختیار کر لیں، وہ فرمائیں کہ کس شہر کی فضا ان کے قیام کے لیے مناسب رہے گی، میں اس کے لیے تحریری حکم جاری کر دیتا ہوں۔ سید مرتضیٰ نے جواب دیا کہ میں خواص کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں، عوام تو پہلے ہی سے میری بات مانتے ہیں، اگر اس کے لیے حکم جاری کیا جائے تو حاضر ہوں۔ بادشاہ نے کہا کہ ''خواص'' سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں یہ بات سمجھ نہیں سکا۔

اورنگ آباد کا قاضی محمد اکرم بھی اس وقت موجود تھا، وہ سید مرتضیٰ کا مخالف تھا، ان کے افکار و تصورات سے شدید اختلاف کرتا اور ان کی ذات سے عناد رکھتا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جان کر بادشاہ کو جواب دیا کہ ''خواص'' سے سید کی مراد اولیائے کرام کی قبریں ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں اولیا کی قبروں پر مامور کر دیا جائے اور یہ برسر منبر کہا کرتے ہیں کہ جن قبروں پر غنا کی محفلیں اور سماع کی مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں، ان میں سے بزرگوں کی ہڈیوں کو نکال کر جلا دیا جائے۔

اورنگ زیب نے کہا، میرے خیال میں سید مرتضیٰ کا یہ مطلب نہیں ہے۔ وہ صرف ان بدعات کے مخالف ہیں جن کا قبروں پر ارتکاب کیا جاتا ہے۔

سید مرتضیٰ نے اپنے متعلق قاضی محمد اکرم کی اس توجیہ کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ یہ مجھ پر افترا باندھ رہے ہیں۔ میں اولیائے کرام کا پورا احترام کرتا ہوں اور ان کی تعظیم کو ضروری قرار دیتا ہوں۔ لیکن ان کے نام پر جو بدعات و محدثات کا سلسلہ جاری ہے، اس کی کسی صورت میں تائید نہیں کر سکتا۔ اصل دین وہی ہے جو اللہ نے رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا، وہ ہر قسم کے شرک سے بالکل پاک ہے۔ میں اسی دین کا حامی اور مبلغ ہوں، جس کی

Marfat.com

ترویج واشاعت آنحضرت ﷺ نے فرمائی۔ باقی سب غلط ہے۔ قاضی محمد اکرم میرے بارے میں سراسر افترا اور کذب بیانی سے کام لے رہے ہیں۔

یہ کہہ کر وہ مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور برہان پور کو روانہ ہو گئے۔ اس زمانے کے بعد مشائخ وعلما نے ان کو سخت پریشانی میں مبتلا کیا اور ان کے ساتھ توہین آمیز رویہ اختیار کیا۔ وہ وعظ وتبلیغ کے لیے مسجد میں منبر پر کھڑے ہوئے تو ان کی اہانت کی، جس کی بنا پر وہ لوگوں سے علیحدہ ہو گئے اور بالکل گوشہ گیر ہو کر گھر میں بیٹھ گئے اور اسی حالت میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر کے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

بعض لوگوں کا کہنا کہ انھیں زہر دے کر قتل کر دیا گیا تھا❶۔

۷۵۔ شیخ مرتضیٰ عباسی چریاکوٹی

شیخ مرتضیٰ عباسی چریاکوٹی ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں چریاکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ یحییٰ اور جد امجد کا اسم گرامی شیخ عبدالحق تھا۔ آباواجداد سب اصحاب علم تھے۔ ان کے نانا شیخ عبدالفتاح بن مبارک عباسی چریاکوٹی بھی ذی علم بزرگ تھے۔ بہت سی درسی کتابوں کی تکمیل نانا ہی سے کی۔ پھر والد محترم شیخ یحییٰ سے اخذ علم کیا اور طویل عرصے تک ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔ اور اکابر فقہائے حنفیہ میں شمار کیے گئے۔ اپنے گرامی قدر نانا شیخ عبدالفتاح کی تصنیف ''میراث نامہ'' کی شرح سپرد قلم کی۔ خود اپنی ایک تصنیف ''کتاب الرضوانی'' اپنی یادگار چھوڑی۔

شیخ مرتضیٰ عباسی نے ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۸ء کو چڑیاکوٹ میں انتقال کیا❷۔

۷۶۔ مرزا خان جالندھری

مرزا خان کا لقب اوحد الدین تھا۔ مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کے عالم وصوفی بہلول برکی کے والد تھے۔ عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ انھوں نے ''نظم الدرر والمرجان فی تلخیص سیر سید الانس والجان'' کے نام سے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارک میں ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں موجود ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ سید علیم اللہ حسینی جالندھری نے جو اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور صاحب طریقت بزرگ تھے، اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس ترجمے کو انھوں نے ''نثر الجواہر فی تلخیص سیر ابی الطیب والطاہر'' کے نام سے موسوم کیا۔ یہ فارسی ترجمہ ۱۹۰۲ میں ''پیسہ اخبار'' (لاہور) سے شائع ہوا۔ فاضل مترجم نے دیباچے میں لکھا ہے:

❶ منتخب اللباب ج ۲، ص ۵۶۱ تا ۵۶۵۔ نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۷۰۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۷۱ بحوالہ تاریخ مکرم۔

Marfat.com

''میں نے محسوس کیا کہ اوحدالدین مرزا خان برکی جالندھری کی عربی کتاب ''نظم الدرر والمرجان فی تلخیص سیر سید الانس والجان'' اگرچہ مبسوط و مفصل نہیں، تاہم نادر معلومات کو محیط ہے اور ہر چند کہ خواص ہی اس سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور عوام اس کے اشارات و مندرجات سے محروم رہتے ہیں، اس لیے میں نے خیال کیا کہ عوام کو سمجھانے کے لیے اختصار کو بہ صورت تفصیل پیش کر کے اس کا ترجمہ ''نثر الجواہر فی تلخیص سیر ابی الطیب والطاہر'' کے نام سے فارسی میں کردوں۔ چنانچہ میں نے کتاب کا ترجمہ شروع کر دیا❶۔

سٹوری نے ''نظم الدرر'' اور ''نثر الجواہر'' دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے، لیکن تفصیل بتاتے ہوئے اس سے سہو ہو گیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ کتاب نظم الدرر سید علیم اللہ حسینی کی تصنیف ہے اور مرزا خاں نے ''نثر الجواہر'' کے نام سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے❷ لیکن جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا، حقیقت اس کے برعکس ہے۔

مرزا خاں نے نظم الدرر کے علاوہ مندرجہ ذیل رسائل بھی تصنیف کیے، جن کے خطی نسخے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ مخطوطات شیرانی میں موجود ہیں۔

۱۔ کتمان الاسرار: نمبر ۲۱۵۸ اوراق ۵۶، ورق ۱ تا ۱۶ موجود نہیں۔ یعنی کتاب ناقص ہے۔

۲۔ تنبیہ الاغبیا: ۲۱۵۸۔

۳۔ شرح اقوال جنید بغدادی: نمبر ۲۱۵۸۔

سماع کے بارے میں بھی انھوں نے ایک رسالہ تصنیف کیا، جس کا حوالہ ان کے فرزند بہلول برکی نے (جو اپنا نام) گول برکی بتاتے ہیں، اپنے ایک رسالے سیف المسلول کے دیباچے میں دیا ہے❸۔

۷۷۔ سید معظم شاہ سورتی

سید معظم شاہ حسینی سورتی ہندوستان کے شہر ''سورت'' میں پیدا ہوئے، نشوونما بھی وہیں ہوئی اور اساتذۂ عصر سے تعلیم پائی، اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں گردانے گئے۔ ان کے والد سید شاہ بھی اپنے دور کے نامور عالم تھے اور سورت کی مسند مشیخت پر فائز تھے۔ لائق بیٹے نے باپ کی وفات کے بعد ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء میں ان کی جگہ سنبھالی❹۔

---

❶ نثر الجواہر تلخیص سیر ابی الطیب والطاہر، ص ۲۔

❷ پرشین لٹریچر، ص ۲۰۶۔

❸ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۴ ذیل لفظ ''برکی''

❹ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۷۴، بحوالہ حقیقۃ السورۃ

Marfat.com

۷۸۔ مولانا معین الدین عثمانی منیری

مولانا معین الدین عثمانی منیری متقی عالم دین اور بہت بڑے صوفی فقیہ تھے۔ اصلاً اعمال بہار کے ایک گاؤں ''مدھور'' کے باشندے تھے۔ وہاں سے موضع ''منیر'' میں منتقل ہو گئے تھے، جو ان کے ننھیال کا مسکن تھا۔ بڑے ہوئے تو حصول علم کے لیے جون پور چلے گئے۔ وہاں کے علما و اساتذہ سے درسی کتابیں پڑھیں اور صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری اور ان کے لائق فرزند شیخ محمد ارشد جون پوری سے اخذ طریقت کیا۔ کافی عرصہ ان دونوں سے مستفیض ہوتے رہے۔ بعد ازاں منیر واپس آ گئے اور درس و تدریس میں منہمک ہو گئے۔ بہت سے علما و فضلا نے ان سے استفادہ کیا۔

شیخ معین الدین عثمانی منیری نے ۵ شعبان ۱۱۳۱ھ/ ۱۲ جون ۱۷۱۹ء کو منیر میں وفات پائی اور شیخ یحییٰ منیری کے قبرستان میں دفن کیے گئے ❶۔

۷۹۔ شیخ موسیٰ امیٹھوی

شیخ موسیٰ بن عبدالرقیب بن جعفر بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی شیخ صالح تھے اور فضل و صلاح میں ممتاز۔ ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۴ء کو موضع امیٹھی میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی شیخ عبدالرقیب سے جو علم و عمل میں بڑی شہرت رکھتے تھے، علم فقہ کی تعلیم پائی، طریقت و سلوک کی منزلیں بھی انھی کی نگرانی میں طے کیں اور والد کی وفات کے بعد دعوت و ارشاد میں کمربستہ ہو گئے۔

شیخ موسیٰ نے ۸۷ برس کی عمر پا کر ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء کو امیٹھی میں انتقال کیا ❷۔

۸۰۔ مفتی میراں بیجاپوری

شیخ میراں بیجاپوری کا مولد و منشا بیجاپور ہے۔ شیخ محمد بن عبدالرحمٰن بیجاپوری اور دیگر علمائے کرام سے علم حاصل کیا، اور فقہ و اصول اور دیگر علوم میں ممتاز قرار پائے۔ اپنے علم و فضل کی بدولت عہد عالم گیری میں حیدر آباد کے منصب افتا پر مامور ہوئے اور درس و تدریس کی مسند کو زینت بخشی۔ کبر سنی کو پہنچے تو حیدر آباد کے محکمۂ افتا سے الگ ہو کر بیجاپور تشریف لے گئے اور وہاں اقامت اختیار کر لی۔ لیکن کچھ عرصے بعد پھر حیدر آباد چلے گئے تھے۔ ۱۱۲۵ھ/ ۱۷۱۳ء میں وہیں وفات پائی ❸۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۷۴، بحوالہ گنج ارشدی۔

❷ ایضاً، ص ۳۷۷

❸ محبوب ذی المنن ج ۲، ص ۷۹۸، ۷۹۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۲۷۹۔

Marfat.com

ن

۸۱۔ قاضی نجم الدین برہان پوری

قاضی نجم الدین برہان پوری کے والد کا نام حبیب احمد تھا، فقہائے حنفیہ میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ عہد عالم گیری میں عادل آباد کے منصب قضا پر متعین ہوئے اور عالم گیر کی موت کے بعد عرصے تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اپنے دور کے مشہور عالم مولانا عباس برہان پوری کے داماد تھے [1]۔

۸۲۔ مولانا نجم الدین برہان پوری

اسی نام کے برہان پور میں ایک اور عالم دین مولانا نجم الدین عباس تھے، یہ بھی حنفی المسلک تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے مشاہیر علما و فقہا اور اکابر اصحاب تصوف میں ہوتا تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں زیادہ مشہور کتابیں یہ ہیں۔

نجم العلم۔ یہ عین العلم کی شرح ہے اور عربی زبان میں ہے۔

الصحف المطهره۔ علم اليقين ترجمه العقائد السنيه۔ بزبان فارسی [2]۔

۸۳۔ سید نصیر الدین ہروی برہان پوری

سید نصیر الدین ہروی برہان پوری، برہان پور کے نامور عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ پرہیز گار اور متقی بزرگ تھے۔ اکل و شرب اور لباس وغیرہ کے معاملے میں انتہائی محتاط تھے۔ ہمیشہ ذکر الٰہی اور عبادت میں مشغول رہتے، کثرت سے روزے رکھتے اور شب کو قیام کرتے، ہر کام میں اللہ پر توکل رکھتے، ان کا معمول تھا کہ عشا کے بعد دو گھڑی آرام فرماتے اور پھر اٹھ کھڑے ہوتے۔ تہجد کی نماز پڑھتے اور تلاوت قرآن کرتے۔ قرآن مجید کی تلاوت میں اس درجے رقت طاری ہو جاتی کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور قمیص بھیگ جاتی۔

سید نصیر الدین ابتدائے جوانی ہی میں دونوں پاؤں اور بائیں ہاتھ سے معذور ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کسی کے محتاج نہ تھے۔ قرآن مجید، کتب تفسیر اور تصوف و سلوک کی مختلف کتابوں کی کتابت کرتے تھے اور اس سے جو آمدنی ہوتی اس سے گزر اوقات کرتے۔

اہل دنیا اور ارباب حکومت سے نہ خود کوئی اختلاط رکھتے اور نہ انھیں موقع دیتے کہ وہ ان سے ارتباط

---

[1] نزہتہ الخواطر، ج ۶، ص ۳۸۰، بحوالہ تاریخ برہان پور۔

[2] ایضاً۔

Marfat.com

رکھ سکیں۔ نہ کسی سے کوئی نذر قبول کرتے اور نہ کسی بہانے کوئی چیز لیتے۔ اگر کسی طرف سے کوئی ہدیہ قبول فرمانے پر مجبور بھی ہو جاتے تو اس سے بہتر صورت میں اس کا بدلہ دیتے۔

امرائے سلطنت اور والیان ملک سے نہ صرف ربط و تعلق سے گریز کرتے بلکہ ان سے سخت نفرت کرتے اور نہایت تلخ کلامی سے پیش آتے، کوئی ان میں سے ملاقات کو حاضر ہوتا تو چہرے پر کبیدگی کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ وہ لوگ نذر و نیاز کی شکل میں کوئی چیز پیش کرتے تو صاف لفظوں میں لینے سے انکار کر دیتے۔ ان کو نصیحت بھی کرتے تو تلخ کلامی سے کرتے تا کہ وہ ان سے نفرت کرنے لگیں اور آنا جانا بند کر دیں۔

خافی خاں نے سید نصیر الدین کا تذکرہ ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء کے واقعات و حوادث کے ضمن میں کیا ہے۔ اس کے نقل کردہ مندرجہ ذیل دو واقعے قابل مطالعہ ہیں:

۱۔ ایک مرتبہ علاقہ برہان پور کا والی منور خاں سید نصیر الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق خاصا لاؤ لشکر اس کے ہم عناں تھا اور یہ لوگ ہاتھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ سید نصیر الدین نے اس علاقے کے والی سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تمھارے ہاتھیوں اور لشکریوں کی وجہ سے راستے بند ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو آمد و رفت میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ تمھارا یہاں آنا رعایا کے لیے تکلیف اور زحمت کا باعث بنتا ہے، اس میں عوام کو جو پریشانی لاحق ہوتی ہے، وہ ان پر تمھارا بہت بڑا ظلم ہے۔ چونکہ تم میرے پاس آتے ہو، اس لیے اس ظلم میں خود یہ فقیر بھی شریک ہوتا ہے۔

منور خاں نے جوب میں عرض کیا: ''ہم محض اس لیے حاضر ہوتے ہیں کہ آپ اپنی باطنی توجہ ہم پر مبذول فرمائیں اور ہمیں اپنی طرف کھینچیں۔''

فرمایا: بارگاہ الٰہی میں میرے جیسا گناہ گار کون ہوگا کہ مجھے اس نے دونوں پاؤں اور ایک ہاتھ سے محروم کر دیا ہے۔ یہ میری معصیت کا نتیجہ ہے۔ تم اپنی رعایا کو پریشانی میں نہ ڈالو، اور معاملات حکومت میں اللہ کی مخلوق پر رحم کرو، ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی کوئی عذاب نازل ہو جائے۔

۲۔ سید نصیر الدین کے استغنا اور اللہ پر توکل کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ عنایت اللہ خاں نے جو سید نصیر الدین کے عقیدت مندوں میں سے تھا، بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ بیت المال سے سید ممدوح کے لیے کچھ رقم عطا کر دے۔

عنایت اللہ خاں نے مندرجہ ذیل چار اوصاف کی وجہ سے ان کو قابل امداد قرار دیا:

۱۔ سید نصیر الدین سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔

۲۔ صاحب علم و فضل ہیں۔

۳۔ صاحب صلاح و تقویٰ ہیں۔

۴۔ معذور ہونے کی وجہ سے مستحق امداد ہیں۔

Marfat.com

اس زمانے میں برہان پور کا صدر خواجہ ادہم تھا۔ بادشاہ نے اسے خط لکھا کہ وہ اس کو سید موصوف کی مالی حیثیت کے بارے میں آگاہ کرے تا کہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ ان کی کس طریقے سے مالی مدد کی جائے، ماہانہ یا سالانہ!

چنانچہ خواجہ ادہم خود سید موصوف کے پاس گیا اور بادشاہ کا خط پڑھ کر سنایا۔ سید نصیر الدین نے ان کو جواب دیا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ بے شک میرا نام نصیر الدین ہے لیکن میں مستحق اعانت یا قابل امداد نہیں ہوں۔ خواجہ ادہم کو انھوں نے جن الفاظ میں جواب دیا وہ یہ ہیں:

بایں غلطی و گمان ہم اسمی دیگرے شاید نزد من آوردید۔ امادریں حکم چہار صفت نوشتہ اند، ازاں جملہ سیادت را انکار نمی تواں نمود و دعویٰ ہم ندارم اما از صلاح و استحقاق و فضیلت کہ نوشتہ اند، تحقیق من است کہ ہیچ کدام درمن نیست ❶۔

یعنی شاید آپ اس غلط فہمی کی بنا پر میرے پاس تشریف لائے ہیں کہ اتفاق سے میرے نام کے ساتھ اس شخص کا نام ملتا ہے اور ہم دونوں ہم نام ہیں۔ بادشاہ کے اس خط میں اس شخص کی امداد کے لیے حکم جاری کیا گیا ہے جو چار صفات کا حامل ہے، ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ سید ہے۔ سید ہونے سے نہ میں انکار کرتا ہوں اور نہ اس کا دعوے دار ہوں۔ دوسری صفت صلاح و تقویٰ ہے۔ تیسری استحقاق، اور چوتھی فضیلت علمی ہے۔ میں اپنے طور پر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان صفات میں سے کوئی صفت بھی مجھ میں نہیں پائی جاتی۔

خواجہ ادہم جو علاقہ برہان پور کا صدر تھا، سید نصیر الدین کے اس جواب سے نہایت متعجب ہوا۔ اس نے کہا کہ "شاید آپ کے پاس اللہ پر توکل کا سرمایہ موجود ہے۔" فرمایا: "کیوں نہیں، یقیناً میرے رزق کی کنجی اس ذات اعلیٰ کے ہاتھ میں ہے، جس کے تیرے آقا و بادشاہ جیسے لاکھوں کروڑوں لوگ محتاج ہیں۔"

سید نصیر الدین برہان پوری نے اس سال وفات پائی جس سال کہ شاہ عالم نے اپنے بھائی کام بخش کو قتل کیا تھا۔ ان کی وفات ان دونوں بھائیوں کی لڑائی کے چھ مہینے بعد ہوئی، اور یہ حادثہ ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں پیش آیا تھا۔

۸۴۔ شیخ نظام الدین انصاری سہالوی

شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کا شمار برصغیر کے علمائے اجلا اور اعاظم رجال میں ہوتا ہے۔ وہ اقلیم ہند کے علامہ شہیر اور صاحب علوم و فنون تھے۔ ان کے والد کا اسم گرامی شیخ قطب الدین سہالوی تھا، جو لکھنؤ سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع ایک مقام "سہالی" کے رہنے والے تھے۔

بنیادی طور پر یہ خاندان خالص عرب تھا اور اس کا نسبی تعلق رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی حضرت

---

❶ منتخب اللباب ج ۲، ص ۵۵۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۸۶، ۳۸۲۔

Marfat.com

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے تھا۔ جب اسلام کی نشرو اشاعت کے دائروں نے وسعت اختیار کی، اور اس کی پاکیزہ قدریں حدود عرب سے نکل کر دیگر ممالک کو متاثر ومنور کرنے لگیں تو اس دودمان عالی شان کے ایک صوفی منش بزرگ خواجہ ابواسماعیل عبداللہ بن محمد انصاری نے ہرات کو اپنا مسکن ٹھہرایا اور وہیں ۴۸۱ھ/ ۱۰۸۸ء میں وفات پائی۔ خواجہ ممدوح کی اولاد میں سے ایک ذی علم شخص جو جلال الدین انصاری کے نام سے موسوم تھے ہرات سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔ دہلی میں انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا، جس میں تدریس کے ہنگامے بپا کیے۔ بعد میں ان کے اخلاف نے دہلی کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ کے قریب موضع ''سہالی'' میں اقامت اختیار کر لی اور درس وتدریس کے سلسلوں میں مشغول ہو گئے۔ قیام سہالی کی وجہ سے یہاں کے علمانے سہالوی کی نسبت سے شہرت پائی۔

شیخ نظام الدین کے والد گرامی شیخ قطب الدین تھے، جو برصغیر کے علما میں ممتاز مرتبے کے حامل تھے۔ وہ تقریباً ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۱ء کو سہالی میں پیدا ہوئے اور ہندوستان کے جلیل القدر علما سے مختلف علوم کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا مشغلہ اختیار فرمایا، اور پوری زندگی اس مقصد عظیم کے لیے وقف کر دی۔ تفسیر وحدیث، فقہ واصول منطق وفلسفہ، معانی وبیان، صرف ونحو، ادب وکلام وغیرہ تمام علوم مروجہ کی بھرپور اشاعت کی اور ملک کے بہت سے علما وطلبا کو مستفید فرمایا۔ شیخ قطب الدین نے ہر طرف سے منقطع ہو کر افادۂ طلبا کو مرکز توجہ ٹھہرالیا تھا، اور امرا و وزرا کی مجالس سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں ان کا شہرۂ علم وفضل دور دور تک پھیل گیا تھا اور خود بادشاہ ان کی کاوش وتحقیق کی ہمہ گیری سے متاثر تھا۔ اس نے کئی دفعہ ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور دربار میں آنے کے لیے کہا، مگر انھوں نے بادشاہ کے دربار سے دور رہنے کو ترجیح دی اور درس وافادہ کو ہر چیز سے مقدم گردانا۔

تین سو سال پیشتر کے حالات کے مطابق سہالی میں شیخ قطب الدین کا بہت بڑا مدرسہ تھا، مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے طلبا کثیر تعداد میں ان سے استفادہ کرتے تھے۔ تدریس میں ان کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ علاوہ ازیں تصنیف وتالیف اور تدین وتقویٰ میں بھی ان کو اللہ تعالیٰ نے بلند مرتبہ عطا فرمایا تھا۔

انصاری اور عثمانی خاندانوں کی کش مکش:

سہالی میں اس زمانے میں دو مشہور خاندان آباد تھے۔ ایک عثمانی خاندان اور دوسرا انصاری خاندان مولانا قطب الدین کا تعلق انصاری خاندان سے تھا۔ سہالی کے گردونواح میں خان زادے مقیم تھے، ان کا سہالی کے ایک شخص چودھری محمد آصف سے جو انصاری خاندان سے تھا، زمین کی سرحدوں کے سلسلے میں ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔

محمد آصف سہالی کا بڑا زمیندار اور مولانا قطب الدین کا سسر تھا۔ اس تعلق کی بنا پر خان زادوں کو مولانا

Marfat.com

ممدوح سے بھی عداوت ہوگئی تھی، لیکن مولانا کو چونکہ بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، لہٰذا یہ لوگ انھیں کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ سوئے اتفاق سے سہالی میں عثمانی خاندان کے جو لوگ آباد تھے، ان کے اور محمد آصف انصاری کے درمیان آب پاشی کے بارے میں نزاع پیدا ہو گیا۔ بات آگے بڑھی اور فریقین مقابلے پر اتر آئے تو مولانا قطب الدین بیچ میں پڑے اور دونوں طرف کے لوگ جو لڑائی کے لیے مسلح ہو کر آئے تھے، واپس چلے گئے۔

مولانا قطب الدین کی شہادت:

لیکن بعد میں حالات نے ایسا خطرناک رخ اختیار کیا کہ سہالی کے نواح میں رہنے والے ان خان زادوں نے سہالی پر حملہ کر دیا اور کئی سو آدمی گاؤں کے اندر گھس آئے۔ انھوں نے عثمانی خاندان کے لوگوں کو انصاری خاندان کے خلاف خوب بھڑکایا اور انھیں اپنی امداد کا یقین دلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے مل کر محمد آصف کے مکان پر ہلہ بول دیا۔ سنگ دل حملہ آوروں نے مولانا قطب الدین کے مکان کا بھی محاصرہ کر لیا اور اچانک اندر گھس کر نیزوں، بندوقوں اور تلواروں سے بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا۔ مولانا موصوف بھی جام شہادت نوش کر گئے۔

یہ حادثہ ١٩ رجب ١١٠٣ھ (٢٧ مارچ ١٦٩٢ء) کو پیش آیا۔ مولانا کی موت چونکہ مظلومانہ موت تھی، لہٰذا موت کے بعد ''شہید'' کا لفظ مولانا قطب الدین کے نام کا جز ہو گیا اور وہ مولانا قطب الدین شہید کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی شہادت پر کسی نے ایک مصرع کہا تھا، آزاد بلگرامی نے پہلے تین مصرعے لگا کر رباعی بنا دی:

علامہ بحر زاخر فضل و ہنر   درد امن ارباب طلب ریخت گہر
دل خون شد و تاریخ وقائش فرمود   قطب عالم شدہ شہید اکبر
١١٠٣ھ

فرنگی محل لکھنؤ میں سکونت:

مولانا قطب الدین انصاری سہالوی کی شہادت کے وقت ان کے چار بیٹے تھے۔ محمد اسعد، محمد سعید، نظام الدین اور محمد رضا۔ ان سب حضرات کا شمار اپنے زمانے کے شیوخ اور جید علما میں ہوتا تھا۔ والد گرامی کی شہادت کے بعد یہ حضرات سہالی کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے اور شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے ان کو رہائش کے لیے ''فرنگی محل'' کی عمارت عطا کر دی تھی، اسی لیے بعد میں ''فرنگی محلی'' کی نسبت ان کے نام کا ضروری حصہ ہو گئی۔ مولانا قطب الدین اور ان کی شہادت کا مفصل ذکر ''فقہائے ہند'' کے گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ ان کے بیٹوں میں سے شیخ محمد اسعد، شیخ محمد رضا اور شیخ محمد سعید کا ترجمہ اس کتاب کی گزشتہ سطور میں بسلسلہ ردیف م تحریر ہوا ہے۔ اب ذیل میں شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کے حالات بیان کیے جا رہے ہیں۔

Marfat.com

شیخ نظام الدین کی تحصیل علم:

شیخ نظام الدین، شیخ قطب الدین سہالوی کے تیسرے فرزند تھے۔ والد کی شہادت کے وقت ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی اور طالب علمی کا زمانہ تھا۔ شیخ قطب الدین نے ۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ (مطابق ۲۷ مارچ ۱۶۹۲ء) کو جام شہادت نوش کیا۔ اس حساب سے ان کا سال ولادت تقریباً (۱۰۸۸ھ ـ ۱۶۷۷ء) بنتا ہے۔ شعور کی آنکھیں کھولیں تو گھر میں علم کی نہر جاری تھی اور مسند درس پر خود ان کے والد گرامی قدر شیخ قطب الدین متمکن تھے۔ ابتدائی درسی کتابیں انہی سے پڑھیں۔ والد کی شہادت کے بعد پورا خاندان لکھنؤ کے علاقہ فرنگی محل میں اقامت گزیں ہوگیا تو تکمیل علم کے لیے کوشاں ہوئے چنانچہ اس سلسلے میں مختلف بلاد وقصبات میں گئے اور جلیل القدر علما سے استفادہ کیا، جن میں شیخ امان اللہ بنارسی (متوفی ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۱ء) شیخ غلام نقشبندی لکھنوی (متوفی رجب ۱۱۲۶ھ/ جولائی ۱۷۱۴ء) اور بعض دیگر علمائے عصر شامل ہیں۔

مسند تدریس:

تحصیل علم سے فارغ ہوتے ہی شیخ نظام الدین اپنے والد بزرگ وار کی مسند درس پر فائز ہوئے اور چند ہی دنوں میں ان کا آستانۂ علم معمورۂ ہند کے بہت سے علاقوں کے علما وطلبا کا مرجع بن گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علوم ظاہری کی تکمیل سے فراغت کے کئی سال بعد شیخ نظام الدین نے علوم باطنی کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی۔ اس وقت ان کی عمر چالیس برس کی تھی اور اس نواح کے نامور بزرگ شاہ عبدالرزاق بانسوی کے تصوف وطریقت کا تمام ہندوستان میں شہرہ تھا۔ شیخ نظام الدین ان کی خدمت میں گئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شاہ عبدالرزاق علوم درسیہ سے بہرہ مند نہ تھے، لہٰذا سب لوگوں کو اس بیعت سے تعجب ہوا۔ علمائے فرنگی محل نے تو برملا شیخ نظام الدین کے اس اقدام کی مخالفت کی۔ شیخ کے تلامذہ میں سے ایک صاحب مولانا کمال الدین تھے جو علوم عقلیہ میں بالخصوص دست گاہ رکھتے تھے اور نہایت ذہین اور طباع تھے، اپنے مقابلے میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انھوں نے شیخ نظام الدین کی بیعت پر بڑی خفگی کا اظہار کیا اور صاف لفظوں میں شیخ سے کہا کہ آپ نے ایک جاہل کے ہاتھ پر کیوں بیعت کی اور اپنے فضل وکمال کو ایک ناآشنائے علم صوفی کے سامنے کیوں جھکایا؟ انھوں نے اسی پر بس نہیں کی، وہ شاہ عبدالرزاق کی خانقاہ میں پہنچے اور ذہن میں فلسفے کے چند مسائل سوچے کہ شاہ صاحب سے ان کے بارے میں دریافت کریں گے۔ روایت مشہور ہے کہ وہ شاہ عبدالرزاق کے پاس گئے تو شاہ صاحب نے خود ان مسائل کا ذکر چھیڑا، اور اس انداز سے ان پر اظہار خیال فرمایا کہ مولانا کمال الدین بالکل خاموش ہو گئے اور اسی وقت خود مولانا کمال الدین اور ان کے ساتھیوں نے شاہ صاحب کی بیعت کر لی۔

Marfat.com

شاہ عبدالرزاق بانسوی نے ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء میں رحلت فرمائی۔ان کی وفات کے بعد شیخ نظام الدین سہالوی نے ان کے خلیفہ سید اسماعیل بلگرامی (متوفی ۱۴ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ/۲۳ اکتوبر ۱۷۵۱ء) سے فیوض باطنی حاصل کیے۔

اخلاق وعادات:

شیخ نظام الدین انصاری سہالوی ابتدا ہی حسنِ اخلاق کے حامل، متوکل علی اللہ اور مستغنی المزاج تھے۔ ان کا وہی طریق عمل تھا جو سلف صالحین کا تھا، بے حد نیک اور پرہیز گار تھے۔سید غلام علی آزاد بلگرامی ''مآثر الکرام'' میں ان سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فقیر بہ تاریخ نوزدہم ذی الحجہ سنۃ ثمان واربعین ومائۃ والف در بلدۂ لکھنؤ صحبت مولوی را دیدم طریقۂ سلف صالحین داشت وشعشۂ تقدس از ناصیۂ ہمایوں می تافت ❶۔

(میں ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ/۲۰ اپریل ۱۷۳۶ء کو لکھنؤ گیا تو شیخ نظام الدین سے ملا، میں نے دیکھا کہ وہ سلف صالحین کے طریقے پر گامزن ہیں اور ان کی پیشانی پر تقدس کی شعاعیں چمک رہی ہیں۔)

یہی بات آزاد بلگرامی نے ان کے متعلق اپنی عربی تصنیف سبحۃ المرجان میں لکھی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

انا دخلت لکنئو فی التاسع عشر من ذی الحجة الحرام سنة ثمان واربعین ومائة والف واجتمعت بالملا نظام الدین فوجدته علی طریقة السلف الصالحین وکان یلمع علی جبینه نورالتقدیس ❷۔

یعنی میں ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ/۲۰ اپریل ۱۷۳۶ء کو لکھنؤ گیا تو ملا نظام الدین سے شرف نیاز حاصل ہوا، میں نے ان کو سلف صالحین کے نقش قدم پر پایا۔ان کی پیشانی پر تقدیس کا نور چمک رہا تھا۔

شیخ نظام الدین کی علمی شہرت چھوٹی عمر ہی میں علما وطلبا کے حلقوں میں پھیل گئی اور امرا وحکام کے درباروں میں پہنچ گئی تھی۔اگر وہ چاہتے تو ہر قسم کا جاہ ومنصب آسانی سے حاصل کر سکتے تھے۔لیکن اس طرف کبھی توجہ نہ کی اور دامن نفس کو دنیوی آلائشوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔متواتر دو دو تین تین دن کے فاقے ہوتے تھے اور وہ عالی مرتبت عالم، انتہائی مستقل مزاجی سے برداشت کرتے تھے۔امرائے مملکت اور ارباب دولت

❶ مآثر الکرام ص ۲۱۲

❷ دیکھیے سبحۃ المرجان ۹۵

Marfat.com

سے قطعاً میل جول نہ رکھتے تھے۔ ذہنی لحاظ سے اس قدر اونچے مرتبے کے حامل تھے کہ اغنیا وامرا میں سے کوئی حاضر خدمت ہوتا تو بے اعتنائی سے پیش آتے۔ اس کا اندازہ شیخ غلام مخدوم کے اس بیان سے ہو سکتا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

ایک دن میں شیخ نظام الدین کی خدمت میں حاضر تھا اور بیماری کی وجہ سے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، اس اثنا میں امرائے مملکت میں سے ایک صاحب ملاقات کے لیے آئے، ان کے پاس ادب سے میں نے چارپائی پر سے اترنا چاہا تو شیخ نے فرمایا، ''اصحاب دولت کو دیکھ کر بدحواس کیوں ہوتے ہو، آرام سے لیٹے رہو۔''

ارباب حکومت سے بے التفاتی کے بارے میں ان کا ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ امرائے شاہی میں سے ایک امیر ہفت ہزاری کا منصب رکھتا تھا اور شیخ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا، اس نے ایک مرتبہ جمعے کے دن عین نماز کے وقت کہلا بھیجا کہ اگر آپ تھوڑی دیر انتظار فرمائیں تو میں بھی حاضر ہو کر آپ کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل کر سکوں۔ شیخ نے ذرا انتظار کیا، پھر یہ کہہ کر کہ ''نماز اللہ کی رضا کے لیے ہے، اہل دنیا کے لیے نہیں ہے۔'' نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔

انکسار و تواضع:

بلا شبہ شیخ بے نیاز طبیعت کے مالک تھے، لیکن یہ بے نیازی ہر ایک کے لیے نہ تھی، صرف جاہ پسند ارباب دولت اور امرائے مملکت کے لیے تھی، ورنہ مزاج میں انکسار، تواضع اور مسکنت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس سلسلے کے چند واقعات لائق مطالعہ ہیں:

ایک مرتبہ ایک ایرانی جس کا نام ابوالمعالی تھا، شیخ نظام الدین کا شہرۂ علمی سن کر ملاقات کے لیے آیا۔ شیخ اپنے معمول کے مطابق نہایت سادگی سے درس گاہ میں چٹائی پر بیٹھے درس دے رہے تھے۔ نووارد مہمان کی نظروں کے سامنے ایرانی علما کا جاہ و جلال گھوم رہا تھا، اس کی نگاہِ التفات شیخ نظام الدین کی طرف نہ جا سکی۔ پوچھا مولانا نظام الدین کہاں تشریف رکھتے ہیں؟ فرمایا مولانا کے بارے میں تو میں نہیں جانتا، البتہ نظام الدین میرا ہی نام ہے۔ ایرانی وہیں بیٹھ گیا اور چند فقہی مسائل ان کے سامنے پیش کیے اور کہا کہ اہل حق (یعنی شیعہ مذہب کے ماننے والوں) کے نزدیک اس کا کیا جواب ہے؟ شیخ نے اس کا نقطۂ نگاہ سمجھ کر شیعہ حضرات کی فقہی روایت کے مطابق جواب دیا، وہ نہایت خوش ہوا۔ پھر کہا کہ انہی مسائل کی اہل ضلالت (یعنی اہل سنت) کے مذہب کی روشنی میں وضاحت فرمایئے۔ شیخ نے اس کے سوال کے جواب میں مسائل متعلقہ کے بارے میں اہل سنت کی روایات بیان کیں۔ وہ شیخ کے اسلوب کلام اور وسعت علم سے نہایت متاثر ہوا، اور کہا کہ ان کے متعلق جو سنا تھا، اس سے کہیں زیادہ پایا۔

علما کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ وہ علمی مباحث کے میدان میں اترتے ہیں تو اس سے اپنے علم کا

Marfat.com

اظہار اور دوسروں سے امتیازی درجہ حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، اس لیے وہ حریف کے مقابلے میں عام طور پر خاموشی اختیار نہیں کرتے، بلکہ بہ دستور بحث و مجادلے میں مصروف رہتے ہیں، لیکن شیخ نظام الدین اس نقص سے بالکل مبرا تھے۔ منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب ان سے کسی مسئلے میں بحث کرنے کے لیے تشریف لائے اور آتے ہی مسئلہ دریافت کیا۔ شیخ نے اپنی تحقیق کے مطابق جواب دیا۔ معترض نے اعتراض کیا، اور بربنائے بحث شیخ کی تغلیط کی۔ شیخ چپ ہو گئے۔ انھوں نے مشہور کر دیا کہ میں نے نظام الدین سے علمی مباحث میں گفتگو کی، وہ میرے مقابلے میں چل نہیں سکے اور میں نے ان کو خاموش کرا دیا۔ شیخ کے تلامذہ کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور اسے اپنے استاد کی توہین قرار دیا۔ چنانچہ ایک شاگرد ان صاحب کے پاس گئے اور اپنے زور بیان اور اسلوب استدلال سے ان کو بالکل ساکت کر دیا۔ یہ واقعہ شیخ کے علم میں آیا تو اس درجے برہم ہوئے کہ اس شاگرد کو حلقۂ درس سے نکال دیا اور فرمایا کہ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ میری وجہ سے کسی شخص کی شہرت اور عزت میں فرق آئے۔

شیخ نظام الدین طبعی طور پر نرم مزاج تھے، کسی کو پریشان کرنا اور اس سے بدلہ لینا ان کی فطرت میں داخل نہ تھا۔ ہر معاملے میں عفو و درگزر سے کام لینے کے عادی تھے۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے مل سکتا ہے کہ ان کے والد شیخ قطب الدین کی مظلومانہ شہادت کے واقعات بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے علم میں لائے گئے تو اس نے عمال حکومت کے نام فرمان بھیجا کہ شیخ قطب الدین کے قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور ان کا گھر بار برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ لکھنؤ کے صوبے دار نے سرکاری سپاہ بھیج کر ان کا گھر غارت کر دیا، مخالفین وطن چھوڑ کر بھاگ گئے اور کچھ عرصے کے بعد قاتلوں کے اہل خاندان نے جعلی وفات نامہ لکھ کر عالم گیر کے دربار میں پیش کیا کہ قاتل مر گئے ہیں۔ شیخ کے اصل قاتل کا نام اسد اللہ تھا، جو سہالی کے نواح میں موضع پینتی پور کا رہنے والا تھا، وہ روپوش ہو گیا اور مدت تک زندہ رہا۔ شیخ نظام الدین جب سہالی کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ منتقل ہو گئے اور فرنگی محل میں درس کا سلسلہ شروع کیا تو وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ اس نے شیخ سے خون بہا پیش کرنے کی بھی درخواست کی، لیکن انھوں نے قبول نہیں فرمایا، بلکہ اپنا حصہ معاف کر دیا، تاہم ان پر عظیم باپ کی شہادت کا یہ اثر تھا کہ جب قاتل اسد اللہ ان کے سامنے آتا تو اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے۔ شیخ نظام الدین کی متحمل مزاجی اور بردباری ملاحظہ ہو کہ باپ کے قاتل کو دیکھتے، اور پہچانتے ہیں، وہ ان کے پاس آتا بھی ہے لیکن نہ اس سے قصاص لیتے ہیں (بلکہ اپنا حصہ معاف کر دیتے ہیں) اور نہ سرکار میں شکایت کر کے اسے گرفتار کراتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر علو اخلاق کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

تصانیف:

شیخ نظام الدین انصاری سہالوی بہت سی درسی کتابوں کے مصنف، محشی اور شارح تھے۔

Marfat.com

مولانا فضل امام خیر آبادی لکھتے ہیں:

تصانیف بسیار در علوم حکمیہ و اصول دارد❶۔

یعنی اس عالم اجل نے علوم حکمیہ اور اصول میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔

شیخ کی تصانیف کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے مسائل حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، منطق و فلسفہ اور تذکرۂ رجال، ہر موضوع پر کتابیں تصنیف کیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ رسالہ فی وضوء الرسول: اس میں وضو کے بارے میں حدیث کی روشنی میں مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

۲. شرح التحریر فی اصول الدین: یہ کتاب اصول فقہ کے بارے میں ہے۔ اس شرح کو وہ مکمل نہ کر سکے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لائق بیٹے مولانا عبدالعلی فرنگی محلی نے جو اپنے علم و فضل کی فراوانی کی وجہ سے ''بحر العلوم'' کے لقب سے معروف تھے، اس شرح کی تکمیل فرمائی۔

۳۔ شرح مسلم الثبوت: یہ بھی اصول فقہ کے موضوع پر ہے اور بہترین شرح ہے۔

۴۔ الصبح الصادق شرح منارا لانوار: اس کا تعلق بھی اصول فقہ سے ہے۔

۵۔ حاشیہ شرح عقائد دوانی: یہ علم کلام سے متعلق ہے۔

۶۔ شرح رسائل مبارزیہ: یہ بھی علم کلام سے متعلق ہے۔

۷۔ حاشیہ علیٰ حاشیہ قدیمہ علیٰ شرح تجرید دوانی: اس کا تعلق بھی علم کلام سے ہے۔

۸۔ حاشیہ شمس البازغہ: علم فلسفہ سے متعلق ہے۔

۹۔ حاشیہ شرح ہدایت الحکمت: اس کا موضوع بھی فلسفہ ہے۔

۱۰۔ مناقب رزاقیہ: یعنی ملفوظات شاہ عبدالرزاق بانسوی۔

شیخ نظام الدین سہالوی کی یہ تصانیف، حواشی اور شروح عالمانہ اور محققانہ ہیں۔

درس نظامی کی ترتیب:

شیخ نظام الدین کا سب سے بڑا کارنامہ درس نظامیہ کی ترتیب اور معمورۂ ہند کے مدارس عربیہ میں ایک خاص طریق تعلیم کا تعین ہے۔ ان سے پہلے بھی کئی سو سال سے مدارس ہند میں تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ ملک کے ہر حصے میں علمائے کرام پوری مستعدی سے یہ بنیادی خدمت انجام دے رہے تھے۔ پنجاب میں عرصہ دراز سے لاہور کو مرکز علم کی حیثیت حاصل تھی اور قابل ترین اصحاب کمال درس و افادہ میں مصروف تھے۔ علاوہ ازیں سیالکوٹ اور سرہند وغیرہ علاقوں میں بھی درس کے حلقے قائم تھے۔ ارض کشمیر میں بھی بے شمار اصحاب فضل

❶ تراجم افضلا، ص ۴

Marfat.com

کی مسانید تدریس آراستہ تھیں۔

لیکن اس باب میں صوبۂ یوپی کے بلاد و قصبات مثلاً لکھنؤ، سہالی، بلگرام، دیوہ، بنارس، گوپامئو، الہٰ آباد اور اس کے گرد و نواح کے علاقے بالخصوص ممتاز اور ہندوستان کے تمام صوبوں میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ صوبہ یوپی میں دس دس پانچ پانچ میل کے فاصلے پر شریف خاندانوں اور عمدہ اوصاف سے متصف لوگوں کے دیہات آباد تھے، جن میں مدارس دینیہ کے سلسلے جاری تھے اور نامور فضلا ان میں باقاعدہ درس دیتے تھے۔ ان مدارس کو سلاطین و امرا کی سرپرستی حاصل تھی اور وسیع تعداد میں طلبا ان میں حصول علم کے لیے آتے تھے۔ علم و فضل کی فراوانی کی بنا پر شاہ جہان بادشاہ پورب کے اس علاقے کو اپنی مملکت کا شیراز قرار دیتا تھا۔ سید غلام علی بلگرامی اس دور کے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

اگر چہ جمیع صوبہ جات ہند بوجود حاملان علوم تفاخر دارند...... اما صوبہ اودھ و الہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نتواں یافت، چہ در تمام صوبۂ اودھ و اکثر صوبہ الہٰ آباد بفاصلہ پنج کروہ نہایت دہ کروہ تخمیناً آبادی شرفا ونجبا است کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین و مدد معاش داشتہ اند و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ، و مدرسان عصر در ہر جا ابواب علم برروئے دانش پژوہان کشادہ و صلائے اطلبو العلم در دادہ، و طلبہ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند، و ہر جا موافقت دست بہم داد، بہ تحصیل مشغول می شوند و صاحب توفیقان ہر معمورہ طلبہ علم را نگاہ می دارند، و خدمت ایں جماعہ را سعادت عظمٰی می دانند۔ صاحب قران ثانی شاہ جہاں انار اللہ برہانہ، می گفت ''پورب شیراز مملکت ما است [1]۔''

یعنی اگر چہ ہندوستان کے تمام صوبوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان میں اہل علم اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں، لیکن صوبہ اودھ اور الہٰ آباد کا اس خصوصیت میں کوئی دوسرا صوبہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ صوبۂ اودھ اور الہٰ آباد میں پانچ پانچ دس دس کوس کے فاصلے پر شرفا اور نجبا کے دیہات آباد ہیں، جن میں نامور فضلا کے سلسلہ ہائے درس جاری ہیں۔ سلاطین و حکام انھیں باقاعدہ وظائف عطا کرتے اور مدد معاش کے لیے زمینیں دیتے ہیں۔ انھوں نے مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائیں اور ان میں جو مدرسین درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں، ان کی مالی امداد کی جاتی ہے۔ ہر گاؤں میں علما و فقہا نے علم کے دروازے وا کر رکھے ہیں، جن میں دور و نزدیک سے کثیر تعداد میں طلبا آ کر تعلیم حاصل کرتے اور اپنی استعداد کے مطابق مستفید ہوتے ہیں۔ ہر علاقے کے طلبا کی ارباب دولت پوری دیکھ بھال اور ان کے مصارف کی کفالت کرتے ہیں۔ وہ لوگ علما و طلباء کی خدمت کو اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر صاحب قران ثانی شاہ جہان بادشاہ مرحوم کہا کرتا تھا کہ پورب کا علاقہ ہماری مملکت کا شیراز ہے۔

سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ قیام مدارس اور خدمت علما و طلباء کا یہ نظام ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء تک

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۱۳، ۲۱۴

Marfat.com

قائم رہا۔ جب برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری صوبہ اودھ کا صوبے دار مقرر ہوا تو اس نے تمام معافیاں ضبط کر لیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علما و فضلا کی اولاد نے کسب معاش سے مجبور ہو کر پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ترک کر کے سپاہ گری کو اپنا پیشہ بنا لیا، مدرسے ویران ہو گئے، علمی صحبتیں درہم برہم اور تحقیقی محفلیں ختم ہو گئیں۔ ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں الٰہ آباد کا صوبے دار صفدر جنگ مقرر ہوا تو اس نے رہی سہی معافیاں بھی ضبط کر لیں۔ احمد شاہ کے زمانے میں صفدر جنگ کو وزارت اعلیٰ کا منصب ملا تو اس کے نائب نے وظیفہ داروں کو مزید تنگ کرنا شروع کیا اور اس طرح علم کی پُر بہار بستیوں پر خزاں چھا گئی اور مدرسے اجڑ گئے ❶۔

غرض ارض ہند کے ان عظیم و مشہور مدارس میں سے ایک مدرسہ سہالی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بھی تھا جو عرصہ دراز سے جاری تھا اور جس سے بے شمار طلباء نے دستار فضیلت حاصل کی۔ یہی وہ مدرسہ ہے جو آگے چل کر لکھنؤ کے فرنگی محل کے قالب میں ڈھلا اور درس نظامیہ کے سنگ بنیاد کا باعث بنا۔ ''درس نظامیہ'' جو ہمارے برصغیر کی علمی تاریخ اور تدریسی زبان کا سب سے نمایاں لفظ ہے، اس کے بانی اول یہی شیخ نظام الدین سہالوی تھے، جن کا اسم گرامی ہماری ان گزارشات کا سرعنوان ہے۔ اس کی ترتیب کا اولیں مقام لکھنؤ کے فرنگی محل کی چار دیواری ہے۔ اسے ایک بلند بخت عالم دین نے ایسی ساعت سعید میں مرتب فرمایا کہ پشاور کے آخری سرے کے پہاڑوں سے لے کر کلکتے کے ساحل تک پورے معمورۂ ہند کے مدارس دینیہ میں تیزی کے ساتھ پھیل گیا۔ علما نے خندہ پیشانی سے اس کو قبولیت کا شرف بخشا اور طلباء نے اس کے تمام پہلوؤں کا کامل توجہ سے تتبع کیا۔ اس کی مقبولیت یہاں تک پہنچی کہ اب تک یہ حال ہے کہ کسی کو عالم نہیں تسلیم کیا جاتا جب تک ثابت نہ ہو جائے کہ اس نے اسی طریقۂ درس کے مطابق تعلیم حاصل کی ہے۔

لیکن سخت حیرت انگیز تعجب کی بات ہے کہ اکثر مدارس دینیہ کے ارباب اہتمام اور مدرسین تک کو معلوم نہیں کہ درس نظامیہ کب بنا؟ اس کا بانی کون تھا اور وہ کس علاقے اور ملک کا رہنے والا تھا؟ بعض مدارس کے عہدے دار اور ناظم بھی اس سلسلے میں کوئی علم نہیں رکھتے۔ ان سے یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ اس کا بانی دولت سلجوقیہ کا وزیر نظام الملک تھا، جس نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا تھا۔ انھیں بالکل معلوم نہیں کہ اپنے مدارس میں جس درس نظامیہ کے مطابق وہ تین سو سال سے تعلیم دے رہے ہیں، وہ خود انہی کے ملک برصغیر کے ایک عالم دین شیخ نظام الدین انصاری سہالوی فرنگی محلی کے ذہن رسا کا کارنامۂ فخر ہے جو اپنے بانی کے نام کی مناسبت سے درس نظامیہ کے نام سے مشہور ہوا۔

مدرسہ نظامیہ اور درس نظامیہ:

موقع کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ نظامیہ اور درس نظامیہ میں جو فرق ہے، یہاں

❶ مآثر الکرام ص ۲۱۴

Marfat.com

اس کی وضاحت کر دی جائے۔

مدرسۂ نظامیہ خواجہ نظام الملک نے قائم کیا تھا جو دو سلجوتی حکمرانوں (الپ ارسلان اور اس کے بیٹے ملک شاہ کا) وزیر رہ چکا تھا۔ یہ ایک عظیم الشان درس گاہ تھی جو نظام الملک نے بغداد کے مشرقی حصے میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک وسیع و عریض قطعہ زمین میں قائم کی تھی۔ اس کی تعمیر کا آغاز شنبہ کے روز یکم ذی قعدہ ۴۵۷ھ (۱۵/اکتوبر ۱۰۶۵ء) کو ہوا۔ تعمیر کے نگران شیخ الشیوخ ابوسعد نیشاپوری تھے۔ پورے دو سال تک تعمیر کا سلسلہ جاری رہا اور یکم ذی قعدہ ۴۵۹ھ (۱۳ستمبر ۱۰۶۷ء) کو عمارت مکمل ہوئی۔ اس کے صدر دروازے پر نظام الملک کا نام کندہ کیا گیا اور چاروں طرف بازار اور حمام بنوائے گئے۔ عمارت اس قدر وسیع تھی کہ اس میں کئی لاکھ آدمی سما سکتے تھے۔

منقول ہے کہ مدرسہ نظامیہ کی تعمیر کے دوران میں ایک دفعہ خواجہ نظام الملک کو یہ اطلاع پہنچی کہ اس کے ایک کارندے نے بہت سی رقم خورد برد کر لی ہے۔ جب اس کارندے کو پتا چلا کہ خواجہ نظام الملک کو اس کی خیانت کا علم ہو گیا ہے تو وہ باز پرس سے بچنے کے لیے بصرے بھاگ گیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ضمیر نے ملامت کی تو مجبور ہو کر نظام الملک کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان الفاظ کے ساتھ عفو تقصیر کی التجا کی۔

''اے خواجہ! آپ نے یہ مدرسہ اللہ کی رضا کے لیے تعمیر کرایا ہے۔ پس خیانت کرنے والے کا معاملہ بھی اللہ کے سپرد کر دیجیے۔ آپ کو ثواب ملے گا اور خائن اپنے کیے کی سزا پائے گا۔''

نظام الملک نے جواب میں کہا: مجھے اس مال کا غم نہیں جو تم نے یا کسی اور نے اس مدرسے کی تعمیر میں کھایا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس مدرسے کی عمارت اتنی مضبوط ہوتی جتنی مسجد منصوری اور شفاخانہ عضدی کی ہے، مجھے تو یہ غم ہے کہ تم لوگوں نے مسالے میں خیانت کی ہے جس کی وجہ سے عمارت مستحکم نہیں ہوگی اور جلد خراب ہو جائے گی۔

اکثر مورخین کا بیان ہے کہ مدرسہ نظامیہ کی تعمیر پر ساٹھ ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ یہ رقم آج کل کے کم و بیش ساٹھ لاکھ روپے کے لگ بھگ ہوگی۔ پھر جس زمانے میں یہ مدرسہ تیار ہوا، اس وقت تعمیر کے سامان کی قیمت اور مزدوروں اور معماروں کی اجرت موجودہ زمانے کی نسبت بہت ہی کم تھی۔ اس سے اس مدرسے کی عظمت اور شان و شکوہ کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

شنبہ کے روز ۱۰ ذی قعدہ ۴۵۹ھ (۲۳ستمبر ۱۰۶۷ء) کو مدرسہ نظامیہ کی رسم افتتاح ہوئی۔ اس موقعے پر بغداد کی تقریباً تمام آبادی نئی عمارت امنڈ آئی تھی۔ یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ خواجہ نظام الملک نے علامہ شیخ ابواسحاق شیرازی کو مدرسے کا مدرس اعلیٰ نامزد کیا تھا اور افتتاح بھی انہی کو کرنا تھا۔ لیکن جب وہ اس مقصد کے لیے مدرسے کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں ایک کم سن لڑکے نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

یا شیخ کیف تدرس فی مکان مغصوب۔

Marfat.com

یعنی اے شیخ! آپ اس جگہ کیسے درس دیں گے جو زبردستی حاصل کی گئی ہے۔

شیخ ابواسحاق لڑکے کی زبان سے یہ بات سنتے ہی شہر سے باہر نکل گئے اور ایک غار میں جا کر بیٹھ گئے۔ ادھر جب حاضرین انتظار کرتے کرتے مایوس ہو گئے تو بغداد کے ایک بااثر رئیس شیخ عبدالملک ابوالمنصور کے ایما پر امام ابونصر بن صباغ (مصنف ''الشامل والکامل'') سے درخواست کی گئی کہ وہ رسم افتتاح ادا فرمائیں۔ امام موصوف نے لوگوں کے اصرار پر مسند درس کو رونق بخشی اور اس طرح بغداد کے ''مدرسہ نظامیہ'' میں تدریس کا آغاز ہوا۔

امام ابونصر رحمۃ اللہ علیہ بیس دن تک مدرسہ نظامیہ میں درس دیتے رہے۔ اس اثنا میں خواجہ نظام الملک کی خواہش کے مطابق شیخ ابواسحاق شیرازی سے رابطہ قائم کر کے ان کا شک رفع کیا گیا اور شدید اصرار سے ان کو مدرسے میں درس دینے پر رضا مند کیا گیا۔ چنانچہ مدرسے کے افتتاح کے بیس دن بعد انھوں نے امام ابونصر کی جگہ شیخ الجامعہ کے فرائض سنبھالے۔

غرض مدرسہ نظامیہ کے بانی اور مؤسس نظام الملک مملکت سلجوقیہ کے وزیر اور دنیوی لحاظ سے اپنے وقت کی بہت بڑی شخصیت تھے۔ علمی اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ بلند تھا۔

اس کے برعکس درس نظامیہ کے بانی شیخ نظام الدین انصاری سہالوی تھے، جن کا حکومت کے ایوانوں اور سرکاری درباروں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ایک درویش منش اور فقیر طبع عالم تھے۔ مالی لحاظ سے غربت کا شکار تھے۔ ان کے آبا واجداد کا سلسلۂ درس مدت مدید سے جاری تھا۔ انھوں نے کوئی نیا مدرسہ جاری نہیں کیا بلکہ نصاب درس میں نئی اصلاحات نافذ فرمائیں اور ان کا مرتب کردہ نصاب ان کے نام کی مناسبت سے ''درس نظامیہ'' کہلایا۔ مدرسہ نظامیہ کے مؤسس اور درس نظامیہ کے بانی کے درمیان کم وبیش سات سو سال کا طویل عرصہ حائل ہے۔

شیخ نظام الدین کا نصاب تعلیم اور اس کی خصوصیات:

شیخ نظام الدین کا مرتب کردہ نصاب تعلیم جو درس نظامیہ کہلاتا ہے، مختلف گیارہ علوم وفنون پر مشتمل ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ تفسیر: جلالین، بیضاوی۔

۲۔ حدیث: مشکوٰۃ المصابیح۔

۳۔ فقہ: شرح وقایہ، ہدایہ اولین، ہدایہ آخرین۔

۴۔ اصول فقہ: نورالانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت۔

۵۔ کلام: شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف۔

Marfat.com

۶۔ بلاغت: مختصر معانی، مطول تا بحث ما انا قلت۔

۷۔ فلسفہ: میبذی، صدرا، شمس البازغہ۔

۸۔ منطق: صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، مع میر قطبی، مسلم الثبوت۔

۹۔ صرف: میزان الصرف، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ۔

۱۰۔ نحو: نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی۔

۱۱۔ ریاضی: خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس مقالۂ اول، تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیہ، شرح چغمینی باب اول۔

شیخ نظام الدین کا مرتبہ نصاب تعلیم (یعنی درس نظامیہ) بہت سی خصوصیات کا حامل ہے، جو مختصر طور پر درج ذیل ہیں۔

۱۔ اس میں ارض ہند کے متعدد علما کی کتابیں شامل ہیں جن میں بعض وہ حضرات ہیں جو شیخ کے ہم عصر ہیں، مثلاً ملا جیون (متوفی ۹ ذی قعدہ ۱۱۳۰ھ/ ۲۳ ستمبر ۱۷۱۸ء) کی نور الانوار، شیخ محبّ اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) کی مسلم الثبوت اور سلم العلوم وغیرہ۔ ان کے زمانے سے قبل کے ہندی علما کی کتابیں بھی داخل نصاب ہیں۔ مثلاً سید علی اکبر الہ آبادی (متوفی ۱۰۹۰ھ/ ۱۶۷۹ء) کی فصول اکبری، ملا محمود جون پوری (متوفی ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ/ ۹ فروری ۱۶۵۲ء) کی شمس البازغہ وغیرہ۔

یہ وہ حضرات علما ہیں جن کی کتابوں نے درس نظامیہ کے بہت سے حصے پر تسلط جما لیا ہے۔ شیخ نظام الدین نے اس نصاب کے ذریعے پوری علمی دنیا سے ان کو متعارف کرایا۔ یہ پہلے عالم ہیں جنھوں نے ہندی فضلا کی تصنیفات کو یہ اعزاز بخشا اور داخل نصاب کیا، ورنہ ان سے قبل کسی ہندی عالم کی کوئی کتاب مروجہ نصاب تعلیم میں داخل نہیں کی گئی تھی۔ اس سے واضح ہوا کہ شیخ نظام الدین صحیح معنوں میں علما کے قدردان تھے، وہ نہایت صاف دل عالم تھے اور ان کا ذہن معاصرانہ کشاکش سے پاک تھا۔

۲۔ انھوں نے ہر فن کی مشکل کتابیں نصاب میں داخل کیں تاکہ طلباء کی ذہنی اور فکری کاوشوں میں تیزی آئے اور ان کے غور و خوض کے پیمانوں میں وسعت پیدا ہو۔

۳۔ دیگر علوم کی نسبت منطق اور فلسفے کی کتابیں زیادہ رکھیں، کیونکہ ان کے دور کی علمی فضا کا تقاضا یہی تھا۔ اس زمانے کا عام رجحان یہ تھا کہ طلباء فنون میں خام نہ رہیں ان کی فنی قوت میں اضافہ ہو۔

۴۔ علم حدیث کی صرف ایک کتاب رکھی، یعنی مشکوٰۃ، اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر مشکوٰۃ کو اچھے طریقے سے پڑھ لیا جائے تو باقی کتب احادیث کو مطالعہ کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ خیال قرین صحت نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ احادیث کی امہات الکتب کو استاد سے باقاعدہ پڑھے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔ ہمارے خیال میں صرف مشکوٰۃ کو داخل نصاب کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانے کے ہندوستان میں کتب احادیث کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ صرف وہی حضرات ان سے متعارف

Marfat.com

تھے جو حصول علم کے لیے حجاز کا سفر اختیار کرتے تھے۔

۵۔ اس نصاب میں ادب کا حصہ ناپید ہے، جو اس کا ایک کمزور پہلو ہے۔

۶۔ اس نصاب تعلیم میں شیخ نظام الدین انصاری نے جس چیز کو خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھا وہ یہ تھی کہ طالب علم کی استعداد مطالعہ اس قدر مضبوط ہو جائے کہ فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد وہ ہر مروجہ فن کی کتابوں کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اس نصاب کی تمام کتابوں کو پورے غور کے ساتھ پڑھ لیا جائے تو علوم عربیہ کو فہم کی گرفت میں لانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

۷۔ علاوہ ازیں یہ نصاب اس قدر مختصر ہے کہ طالب علم کو اس پر سالہا سال صرف کرنا نہیں پڑتے، بلکہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ درسی کتابوں سے فارغ ہو جاتا ہے، چنانچہ اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ کتنے ہی طلبا کم سنی میں فارغ التحصیل ہو کر تدریس کی مسندوں پر فائز ہو گئے۔

۸۔ اس نصاب کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقہی تعصب قطعاً نہیں ہے، اس لیے کہ تعصب دراصل کتب فقہیہ کی بھرمار سے پیدا ہوتا ہے، اور یہ نصاب اس سے مبرا ہے۔

۹۔ پھر اس کی ترتیب میں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے کہ معاصر علما کی تصانیف کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے، تاکہ معاصرت کا مرض ختم ہونے میں مدد مل سکے۔

۱۰۔ اس ضمن میں شیخ نظام الدین کی کسرنفسی اور تواضع ملاحظہ ہو کہ انھوں نے اس میں اپنی کوئی تصنیف نہیں رکھی، حالانکہ وہ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فاضل اور مصنف تھے۔

شیخ کی وفات کے بعد حالات کے مطابق درس نظامیہ میں تبدیلی اور اضافے کا عمل جاری رہا۔ لیکن بنیادی طور پر اس میں روح وہی کارفرما رہی اور وہ کتابیں اس میں داخل رہیں جو شیخ نظام الدین نے تجویز کی تھیں۔

تلامذہ:

اس زمانے کے حالات کے مطابق شیخ نظام الدین سہالوی کا سلسلۂ درس نہایت وسیع تھا، ان سے بے شمار علما وطلباء نے استفادہ کیا اور پھر آگے چل کر ان میں سے ہر شخص فضل وکمال میں ممتاز مرتبے پر فائز ہوا۔ ان کے تلامذہ کی وسعت پذیر فہرست میں چند نامور اور فحول علما کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ سید کمال الدین حسینی عظیم آبادی: علوم حکمیہ میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ عرصے تک فتح پور کی مسند تدریس پر متمکن رہے۔ اس کے بعد نواب سیف خاں نے عظیم آباد (پٹنہ) میں ایک مدرسے کی تاسیس کی تو اس کی درخواست پر وہاں تشریف لے گئے۔ خلق کثیر نے ان سے اخذ علم کیا۔ ان کی موت کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔ اپنے استاذ شیخ نظام الدین سے انھیں انتہائی عقیدت اور محبت تھی، اطلاع پہنچی کہ شیخ

Marfat.com

وفات پا گئے ہیں، اسی صدمے میں انتقال کر گئے، حالانکہ شیخ زندہ تھے اور ان کی وفات کی خبر غلط تھی۔

۲۔ سید ظریف حسینی عظیم آبادی: فقہ و اصول اور علم کلام میں عبور رکھتے تھے۔ نواب سیف خاں کے مدرسے میں جو عظیم آباد (پٹنہ) میں قائم کیا گیا تھا، خدمت درس انجام دیتے تھے۔ استاذ گرامی شیخ نظام الدین سے بہ درجہ غایت مودت رکھتے تھے، ان کی وفات کی غلط خبر مشہور ہوئی تو فرط غم سے نڈھال ہو گئے اور اس قدر روئے کہ آنکھوں کی بصارت ضائع ہو گئی۔ کئی کتابوں کے مصنف اور بے شمار علما کے استاد تھے۔

۳۔ شیخ کمال الدین انصاری سہالوی: اپنے وقت کے عالم کبیر اور علامۂ عصر تھے، علوم پر مجتہدانہ نظر رکھتے اور ہر فن میں امامت کے مرتبے پر فائز تھے۔ شیخ نظام الدین کے قریبی رشتے دار اور لائق شاگرد تھے۔ متعدد کتابوں کے محشی اور مصنف تھے۔ لاتعداد لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۴ محرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵ اگست ۱۷۶۱ء کو فوت ہوئے۔

۴۔ شیخ غلام محمد گجراتی برہان پوری: عالم اجل اور نامور استاد تھے۔ عمر بھر علوم کی نشر و فروغ میں مصروف رہے۔ بوہرہ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۴۹ھ/ ۱۷۳۶ء میں برہان میں انتقال کیا۔

۵۔ مولانا حقانی امیٹھوی ٹانڈوی: کبار علما میں سے تھے۔ علوم و فنون میں پوری دسترس رکھتے تھے۔ بہت سے علما نے ان سے کسب علم کیا۔ ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۱۹۰ھ/ ۴ جولائی ۱۷۷۶ء کو ٹانڈہ شہر میں فوت ہوئے۔

۶۔ مولانا عبداللہ امیٹھوی: فقہ، اصول، اور علم کلام پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم تھے۔ درس و افادہ میں اپنی مثال آپ تھے۔

۷۔ شیخ احمد بن غلام نقشبند لکھنوی: شیخ و فاضل اور علوم عربیہ میں یگانہ تھے۔ فقہ، اصول اور دیگر فنون میں ممتاز تھے۔ تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ بے شمار حضرات نے ان سے اکتساب علم کیا۔

۸۔ شیخ حمد اللہ صدیقی سندیلوی: مذہباً شیعہ تھے، علوم حکمیہ میں مرتبۂ امامت پر فائز تھے۔ بہت بڑے مدرس اور مصنف تھے۔ ارض ہند کے مشاہیر اساتذہ فن میں شمار کیے جاتے تھے۔ منطق و فلسفہ کی متعدد انتہائی کتابوں کے حواشی و تعلیقات سپرد قلم کیے۔ حلقہ علما میں ان کی کتابیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ ان کے استاد شیخ نظام الدین کی وفات کے بعد ان میں سے بعض درس نظامیہ میں داخل کی گئیں۔ ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء کو دہلی میں انتقال کیا۔

۹۔ مولانا عبدالرشید جون پوری: منطق و فلسفہ اور اصول کے جید عالم تھے۔ ذہانت و فطانت میں منفرد اور زہد و عبادت میں ممتاز تھے۔ متوکل علی اللہ، متورع اور کثیر الدرس و افادہ تھے۔ علما کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ لکھنؤ میں وفات پائی۔

۱۰۔ سید غلام محمد عمر حسینی شمس آبادی: علم و معرفت میں یگانۂ روزگار تھے۔ بہت سے علما نے ان سے استفادہ کیا۔

Marfat.com

۱۱۔ مولانا غلام فرید محمد آبادی: اپنے عہد اور علاقے کے فحول علما اور مشہور مشائخ میں سے تھے۔ اعمال اعظم گڑھ کے ایک مقام ''محمد آباد'' میں پیدا ہوئے۔ قناعت اور توکل کی زندگی بسر کرتے تھے۔ صالح، متقی اور پرہیز گار عالم دین تھے۔

۱۲۔ مولانا محمد حسن لکھنوی: عالم اجل اور شیخ کامل تھے۔ ذکاوت و ذہانت میں ممتاز درجے کے مالک تھے۔ مختلف علوم و فنون کی اہم کتابوں کے شروح و حواشی سپرد قلم کیے۔

غرض شیخ نظام الدین سہالوی کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے اور آج برصغیر میں مدارس دینیہ کی جو رونق دکھائی دیتی ہے، وہ کسی نہ کسی طرح انہی کے پرتو فیض کا نتیجہ ہے۔ ان کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ برصغیر (جس میں موجود نقشے کے مطابق پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش تین ملک شامل ہیں) کا تمام تر سلسلۂ درس انہی کے نام نامی سے منسوب ہے۔ ان کے زمانے میں خطۂ ہند کے بیشتر علما کی نسبت تلمذ انہی کی طرف جاتی تھی۔ سید غلام علی آزاد بلگرامی اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

امروز علمائے اکثر قطر ہندوستان نسبت تلمذ بہ مولوی دارند و کلاہ گوشہ تفاخر می شکنند کسے کہ سلسلہ تلمذ بہ ادمی رساند بین الفضلائے علم امتیازی افرازد ❶۔

یعنی اس دور کی سرزمین ہند کے زیادہ تر علما اپنی نسبت شاگردی مولانا نظام الدین سہالوی سے رکھتے ہیں اور انہی کے کلاہِ پُر فخر سے وابستہ ہیں۔ حالت یہ ہے کہ جو شخص ان کے دامن شاگردی سے منسلک ہو جاتا ہے، وہ اہل علم اور ارباب فضل میں ممتاز مقام حاصل کر لیتا ہے۔

آج مدارس دینیہ کے حلقوں میں جس طرح شیخ نظام الدین کا نام روشن ہے، اسی طرح ان کے تلامذہ کا ذکر بھی پوری آب و تاب کا حامل ہے اور اپنی تدریسی و تصنیفی خدمات کی بنا پر نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اولاد:

شیخ نظام الدین کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی، لوگ دوسری شادی پر مجبور کرتے تھے، لیکن وہ اس پر رضامند نہ تھے، جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو فرمایا، میں اس مخمصے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ البتہ کسی بزرگ کا ارشاد ہوگا تو مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑے گا۔ آپ نے شیخ اسماعیل بلگرامی (متوفی ۱۴ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ/۲۳ اکتوبر ۱۷۵۱ء) سے فیض باطنی حاصل کیا تھا۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ مجھے القا کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ دوسری شادی سے آپ کی اولاد ہوگی۔ چنانچہ خاصی عمر ہو چکی تھی کہ قصبہ سترکھ میں دوسری شادی کی، جس سے وہ گوہر شہوار پیدا ہوا، جس نے اپنی خداداد صلاحیتوں، اور بے پناہ علمی فضیلت کی بنا پر اہل علم کے حلقوں میں

❶ مآثر الکرام ص ۲۱۲

Marfat.com

''بحر العلوم'' کے پرشکوہ لقب سے شہرت پائی۔

بحر العلوم کا اصل نام عبدالعلی ہے، علم وفضل میں ان کو جو عظیم الشان مرتبہ حاصل تھا، وہ کسی اہل علم سے مخفی نہیں۔ بحر العلوم اپنی رفعت علمی کی بنا پر انتہائی شہرت کے حامل ہیں۔ اس جلیل القدر عالم نے ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ/۱۳ راگست ۱۸۱۰ء کو مدراس میں وفات پائی۔ ان کا تذکرہ تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے کرام کے ضمن میں کیا جائے گا، ان شاء اللہ العزیز۔

مرض اور وفات:

شیخ نظام الدین کو کئی سال سے مثانے کی پتھری کا مرض لاحق تھا، لیکن ہمیشہ تدریس وتصنیف میں مصروف رہے، کبھی علاج کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جب عمر کا آخری دور آیا اور ستر برس سے آگے نکل گئے تو کمزوری اور ضعف نے ایسا گھیرا ڈالا کہ چارپائی پر لیٹ گئے اور زنان خانے میں رہنے لگے۔ لیکن بیمار پرسی کو لوگ کثرت سے آتے تھے اور بار بار پردہ کرانے میں اہل خانہ کو تکلیف ہوتی تھی، لہٰذا شیخ عبدالحق نے عرض کیا کہ اگر آپ دیوان خانے میں تشریف فرما رہیں تو زیادہ اچھا ہے۔ شیخ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے دن ایک بزرگ شاہ عبدالغنی عیادت کو آئے تو شیخ نے یہ مصرعہ پڑھا:

ہر روز بینم تنگ تر سوراخ ایں غربا لہا

اور پھر فرمایا کہ عبدالحق ہی کی مرضی پر عمل کرو، چنانچہ زنان خانے سے اٹھے اور دیوان خانے میں تشریف لے آئے اور وہیں وفات پائی۔

شیخ نظام الدین کی دو بیویاں تھیں۔ منقول ہے کہ دوسری شادی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ مرض میں جب شدت آئی تو پہلی بیوی حاضر خدمت ہوئیں اور کہا کہ مجھ سے جو قصور ہوا معاف فرما دیجیے۔ فرمایا تم نے کوئی قصور نہیں کیا۔ البتہ مجھ سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ تمھاری موجودگی میں دوسری شادی کی۔ میری خطا معاف کر دو۔ تھوڑی دیر بعد دوسری بیوی آئیں اور کہا، آپ تو تشریف لے جا رہے ہیں، اولاد کو کس کے سپرد کیا ہے۔ شیخ کو اس سے سخت ذہنی کوفت ہوئی، حاضرین سے کہا کہ مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔ پھر فرمایا ''نظام الدین تو جا رہا ہے لیکن خدا ہمیشہ رہے گا'' آپ نے پچھتر سال عمر پا کر چہار شنبہ کے روز ۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/۲۶ راپریل ۱۷۴۸ء کو دوپہر کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا[1]۔

[1] شیخ نظام الدین کے حالات کے لیے یہ کتابیں دیکھیے: سبحۃ المرجان ص ۹۴، ۹۵۔ ابجد العلوم ص ۹۱۱ - مآثر الکرام ص ۲۱۲ تا ۲۱۶ - تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۱۸۱ - احوال علمائے فرنگی محلی ص ۹، ۱۰، ۷۷ - تراجم الفضلاء ______ مقالات شبلی ج ۳ ص ۹۱ تا ۱۰۱ - حدائق الحنفیہ ص ۱۱۵ - تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۱ - نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۸۱، ۳۸۲ - قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب ص ۲۱۰ - الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند ص ۱۶، ۱۷

Marfat.com

۸۵۔ قاضی نظام الدین احمد آبادی

قاضی نظام الدین بن شیخ نور الدین بن محمد صالح احمد آبادی گجراتی بارھویں صدی ہجری کے عالم و فقیہ اور عبادت گزار بزرگ تھے۔ علم و فضل کی فضا میں پیدا ہوئے اور تقویٰ و صالحیت کے ماحول میں پرورش پائی۔ اس درجے مرتبۂ کمال کو پہنچے کہ عمق نظر اور فنون گوناگوں میں وسعت فکر میں اپنے اقران و معاصرین سے بازی لے گئے۔ سلاطین و امرائے مملکت سے گہرا ربط و تعلق رکھتے تھے اور وہ انھیں انعام و اکرام اور خلعت فاخرہ سے سرفراز کرتے تھے۔ یہاں تک کہ احمد شاہ نے ہاتھی بھی عطا کیا۔ مغل حکمران احمد شاہ نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں احمد آباد کے منصب قضا پر مامور کیا اور عمر بھر اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ بے حد عزیمت و استقامت کے مالک تھے، اسلام کے بارے ان کے جذبات نہایت نازک تھے اور اس ضمن میں بہ درجۂ غایت سخت اور متصلب تھے، اعلائے کلمۃ اللہ میں انتہائی جدوجہد سے کام لیتے تھے۔ دینی معاملات میں کسی قسم کی مداہنت کے قائل نہ تھے۔ اگر کوئی دین سے متعلق معاملہ پیش آ جاتا تو کسی کی پروا نہ کرتے اور مصلحت دنیوی سے بالا ہو کر وہی قدم اٹھاتے جو ان کے نزدیک موافق شریعت ہوتا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء کو شاہ پور میں ہندوؤں نے مسجد کے قریب مندر تعمیر کیا اور نماز کے اوقات میں سنکھ بجانے لگے۔ ظاہر ہے اس سے نماز میں خلل پیدا ہوتا تھا اور مسلمان اس صورت حال سے بڑے پریشان تھے۔ قاضی نظام الدین کو اطلاع پہنچی تو انھوں نے بادشاہ کو بتائے بغیر مندر منہدم کرا دیا۔ بادشاہ دہلی احمد شاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے قاضی موصوف کی غیرت دینی اور پر جوش جذبہ اسلامی پر مسرت کا اظہار کیا اور انھیں خلعت فاخرہ اور ہاتھی عطا فرمایا۔

قاضی نظام الدین احمد آبادی گجراتی، کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں میزان الساعۃ، تفصیل الفصول، قہوہ کے متعلق ایک رسالہ، فضائل علما کے بارے میں ایک رسالہ اور دیگر رسائل شامل ہیں۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۲ ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ/۲۱ ستمبر ۱۷۵۲ء کو احمد آباد میں وفات پائی اور اپنے والد گرامی شیخ نور الدین کی قبر کے قریب مدفون ہوئے [1]۔

۸۶۔ شیخ نعمت اللہ سندھی

شیخ نعمت اللہ بن عبدالجمیل بن رحمت اللہ ٹھٹھوی سندھی کا شمار علاقہ سندھ کے معروف ارباب فضل و صلاح میں ہوتا تھا۔ علوم عربیہ، نحو و فقہ اور اصول وغیرہ کی تعلیم اپنے نانا شیخ ضیاء الدین ٹھٹھوی سے حاصل کی، اور علوم حکمیہ شیخ محمد صادق ٹھٹھوی سے پڑھے۔ عالم شباب ہی میں یعنی بیس سال کی عمر میں بہت سے فضائل علمی سے

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۲ ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۸۵، ۳۸۶۔

Marfat.com

متصف ہوگئے تھے اور درس و افادہ کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ تقویٰ، صلاحیت حکمی اور جامعیت علمی میں بہت سے معاصرین سے فوقیت لے گئے تھے۔ حج و زیارت کے لیے حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہوئے اور بندر ''کلفہ'' میں وفات پائی۔ یہ واقعہ ۱۸ ذی قعدہ ۱۱۷۹ھ/ ۲۸ اپریل ۱۷۶۶ء کو پیش آیا۔ تحفۃ الکرام کے مصنف شہیر شیر علی قانع کے استاد تھے ❶۔

۸۷۔ حاجی نعمت اللہ نوشہروی

حاجی نعمت اللہ نوشہروی، پنجاب کے موضع نوشہرہ کے رہنے والے تھے، مسلکاً حنفی تھے۔ اپنے علاقے اور عصر کے فاضل آدمی تھے۔ مولد و منشا کشمیر ہے۔ شیخ امان اللہ شہید کشمیری (شہادت ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) کے شاگرد تھے۔ ان سے فقہ اور دیگر علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ حدیث و قرأت وغیرہ کی سند بھی انہی سے حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد توکل و عفت اور قناعت کے ساتھ درس و افادہ میں مصروف رہے۔ زہد و عبادت میں یگانہ تھے۔ ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸ء میں رحلت فرمائی ❷۔

۸۸۔ قاضی نور الحق گجراتی

قاضی نور الحق بن قاضی عبدالوہاب گجراتی اپنے دور کے مشاہیر فقہا اور نامور علما میں سے تھے۔ بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر نے ۱۰۹۰ھ/ ۱۶۷۹ء میں ان کو منصب قضا پر معمور کیا۔ ۱۱۰۸ھ/ ۱۶۹۷ء میں ان کو اعمال گجرات کے شہر مانڈو کے عہدۂ احتساب پر متعین کیا گیا ❸۔

۸۹۔ مفتی نور الحق دہلوی

مفتی نور الحق بن محب اللہ بن مفتی نور اللہ بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، دیار ہند کے مشہور فقیہ اور ممتاز عالم تھے۔ خاندانی اعتبار سے اونچے مرتبے کے حامل تھے، ذاتی طور پر بھی اپنے وقت کی اہم شخصیت تھے۔ ان کے والد گرامی شیخ محبّ اللہ دہلوی اپنے آبا و اجداد کی طرح نامور عالم تھے۔ لائق بیٹے نے انہی سے حصول علم کیا۔ اپنے جد امجد شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی فارسی تصنیف ''ماثبت بالسنہ'' کی شرح لکھی ❹۔

---

❶ تحفۃ الکرام ص ۶۸۳، ۶۸۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۸۷۔

❷ حدائق الحنفیہ ص ۴۴۹، ۴۵۰۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۸۸

❸ مآثر عالم گیری

❹ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۸۹

Marfat.com

۹۰۔ قاضی نور الحق انصاری کرانوی

ہندوستان کے صوبہ یو پی میں ایک جگہ ''کرانہ'' ہے، جس میں مختلف اوقات میں متعدد علمائے کرام پیدا ہوئے۔ قاضی نور الحق انصاری بھی اسی کرانہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام قاضی محمد عاشق انصاری تھا۔ قاضی نور الحق انصاری جلیل القدر عالم تھے۔ فقہائے حنفیہ میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی۔ شیخ کمال الدین فتح پوری (جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے) کے والد قاضی محمد عاشق انصاری کے چچا زاد بھائی تھے۔ قاضی نور الحق نے انھی سے علم حاصل کی اور نامور علما میں گردانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بریلی میں نواب سعد اللہ خاں کے مدرسے میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس زمانے میں نواب سعد اللہ خاں انھیں دو سو روپے ماہانہ دیتا تھا۔ پھر جب ان کے والد قاضی محمد عاشق وفات پا گئے تو واپس ''کرانہ'' تشریف لے گئے اور وہاں کے عہدۂ قضا پر مامور کیے گئے۔ طویل عرصے تک اس منصب پر فائز رہے۔ بعد ازاں انھیں موضع دیوبند کا قاضی مقرر کیا گیا، دیوبند میں انھوں نے اپنا مکان تعمیر کیا۔ اس کے بعد اپنے آبائی قصبے کرانہ میں بھی مکان بنایا اور لوگوں سے منقطع ہو کہ گوشہ گیری کی زندگی بسر کرنے لگے۔ کئی درسی کتابوں پر تعلیقات لکھیں اور وراثت کے موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا۔ ستر سال سے زائد عمر پا کر ۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۶ء میں فوت ہوئے ❶۔

۹۱۔ شیخ نور الدین گجراتی

سرزمین ہند کے مشاہیر اساتذہ اور جید علما میں شیخ نور الدین بن شیخ محمد صالح احمد آبادی گجراتی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے، وہ علم و فضل میں امامت کے درجے پر فائز تھے اور فنون متداولہ میں عمیق نظر رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ کے عالم تھے۔ جامع معقول و منقول اور حاویٔ فروع و اصول تھے۔ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۰۶۳ھ/ ۲۹ مارچ ۱۶۵۳ء کو احمد آباد میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ ان کی والدہ ماجدہ بھی عالمہ و فاضلہ تھیں، اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ لائق بیٹے نے شیخ سعدی کی مشہور فارسی کتاب ''گلستان'' انھی سے پڑھی اور قابلیت کا یہ عالم تھا کہ سات دن میں پوری کتاب مکمل کر لی۔ اس کے بعد کتب درسیہ کی تحصیل کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ کتابیں مولانا احمد بن سلیمان گجراتی اور مولانا فرید الدین احمد آبادی کے حلقۂ درس میں پڑھیں، حدیث کی تکمیل شیخ محمد بن جعفر حسینی بخاری سے کی، اخذ طریقت بھی انھی سے کیا، فضائل علمیہ میں اس مرتبۂ کمال کو پہنچے کہ کثرت درس و افادہ میں ان کے عہد اور شہر میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ ان کی بے پناہ قابلیت سے متاثر ہو کر گجرات کے صدر محمد اکرم الدین نے (جنھیں شیخ الاسلام خاں کا خطاب ملا تھا، اور جو شیخ ممدوح کے شاگرد اور مرید تھے) احمد آباد میں مدرسہ ہدایت بخش کے نام سے ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۸۹، ۳۹۰ بحوالہ اغصان الانساب۔

Marfat.com

اس مدرسے پر ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے صرف ہوئے تھے۔ اس کی تعمیر ۱۱۰۹ھ میں شروع ہوئی اور ۱۱۱۱ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ طلباء کے مصارف کے لیے خراجی زمین کے کئی دیہات وقف تھے۔

شیخ نورالدین احمد آبادی نہایت عبادت گزار تھے۔ تہجد کے سخت پابند تھے۔ ملوک وسلاطین کی مجلسوں میں بالکل نہیں جاتے تھے اور نہ ان کے تحفے اور ہدیے قبول کرتے۔ ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۱ء میں حرمین شریفین کا قصد فرمایا اور حج وزیارت کا شرف حاصل کیا۔ مراجعت ہند کے بعد پھر خدمت علم میں مصروف ہو گئے۔ باوجود اس کے کہ بڑھاپا چھا گیا تھا اور ضعف وکمزوری نے قبضہ جمالیا تھا، بہ دستور درس وافادہ اور تصنیف وتالیف کا عظیم کام کرتے رہے۔ بہت سی رفیع المرتبت علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف اور شارح تھے جو ان کی غزارت علم اور وسعت نظر پر دلالت کرتی ہیں۔ ان میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

تفسیر مختصر علی القرآن المجید۔ التفسیر النورانی للسبع المثانی، التفسیر الربانی: یہ سورہ بقرہ کی تفسیر ہے. حاشیة علی اوائل تفسیر بیضاوی، نور القاری شرح صحیح البخاری، حاشیه علی الحاشیة القدیمه، حاشیته علیٰ شرح المواقف، حل المعاقد لحاشیة شرح المقاصد، حاشیة علی الشرح المطالع، حاشیة تلویح، حاشیه عضدی، حاشیه علی المطول، حاشیه شرح وقایه، حاشیه شرح جامی، حاشیة المنهل، حاشیه شمسیه، حاشیه تهذیب المنطق۔

اس کے علاوہ الطریق الامم کے نام سے ابن عربی کی فصوص الحکم کی شرح لکھی۔ انھوں نے چھوٹی بڑی ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں جو دقیق اور اہم مسائل پر مشتمل ہیں۔

شیخ نورالدین احمد آبادی نے منگل کے روز ۹ شعبان ۱۱۵۵ھ/۲۸ ستمبر ۱۷۴۲ء کو احمد آباد میں وفات پائی [1]۔

۹۲۔ مولانا نورالدین گنت پوری

مولانا نورالدین جعفر گنت پوری ضلع غازی پور کے ایک مقام گنت پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی، اور گنت پوری کہلائے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو جون پور چلے گئے، اس لیے ان کے نام کے ساتھ جون پوری کی نسبت وابستہ ہو گئی۔ وہاں شیخ محمد جمیل جون پوری (متوفی ٦ رجب ۱۱۲۳ھ/۹ اگست ۱۷۱۱ء) کا سلسلہ درس جاری تھا، اکثر کتب درسیہ انہی سے پڑھیں، بعض کتابوں کی تکمیل شیخ محمد افضل عباسی الٰہ آبادی (متوفی ۲۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/۱۲ جنوری ۱۷۱۴ء) سے کی، یہاں تک کہ بحث واشتغال میں درجہ کمال کو پہنچے اور علم و

[1] سبحۃ المرجان ص ۹۴۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۷، ۲۴۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ٦، ص ۳۹۰، ۳۹۱۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب ص ۲۰۹، ۲۱۰۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۴۴۔ اتحاف النبلاء، ص ۴۲۷، ۴۲۸۔ مآثر الکرام ص ۲۱۰ تا ۲۱۲۔ ابجد العلوم۔ ص ۹۱۱۔

Marfat.com

فضل میں خوب ناموری حاصل کی، افتا و تدریس میں ماہر ہوئے، فروع و اصول میں ممتاز علما میں شمار کیے گئے۔

مولانا نور الدین گنت پوری جون پوری صالح عالم دین، عابد و زاہد اور کثرت سے تلاوت قرآن کرنے والے اور نوافل کا اہتمام کرنے والے تھے۔ ۱۱۲۰ھ کو جون پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

۹۳۔ شیخ نور اللہ بنارسی

شیخ نور اللہ بن حسین مفتی محمد آبادی بنارسی کا شمار نامور فقہا میں ہوتا تھا، صوفی مزاج فقیہ اور عمدہ اوصاف کے حامل تھے۔ ان کے فرزند شیخ امان اللہ بنارسی (متوفی ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۱ء) جلیل القدر فقیہ اور ممتاز فاضل تھے۔

شیخ نور اللہ نے بنارس میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے ❷۔

۹۴۔ سید نور اللہ بلگرامی

سید نور اللہ بن کرم اللہ حسینی واسطی بلگرامی کا مولد و منشا بلگرام ہے، ہوش سنبھالا تو حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ بعض درسی کتابیں اپنے شہر (جون پور) کے اساتذہ سے پڑھیں، بعد میں دیگر شہروں کا عزم فرمایا۔ اپنے دور کے فقیہ اور عالم گردانے گئے۔ پرہیزگار عالم دین تھے۔ بڑی عمر کو پہنچ کر قرآن مجید حفظ کیا۔ ہمیشہ درس و افادہ میں مصروف رہے۔ ۱۳ شعبان ۱۱۱۳ھ/۲ جنوری ۱۷۰۲ء کو انتقال کیا ❸۔

۹۵۔ مولانا نور اللہ کشمیری

مولانا نور اللہ کشمیری، نور بابا پتلو کے عرف سے معروف تھے۔ وادی کشمیر کے ممتاز فاضل اور شیخ تھے۔ بعض درسی کتابیں ایک کشمیری عالم شیخ عبدالستار سے پڑھیں۔ پھر عازم دہلی ہوئے۔ وہاں شیخ حسام الدین محمد، قاضی مستعد خاں اور قاضی مبارک کے حلقہ ہائے درس جاری تھے، ان میں داخل ہوئے۔ اور مدت تک ان سے کسب علم میں مشغول رہے، یہاں تک علوم میں خوب بہرہ ور ہوئے اور فتویٰ و تدریس کی کامل صلاحیت پیدا ہو گئی۔ مرزا مظہر جان جاناں کی خدمت میں بھی حاضری دی۔ ان سے طریقۂ نقشبندیہ کے مطابق اخذ طریقت کیا۔ بعد ازاں کشمیر کو مراجعت فرمائی اور درس و تدریس کی مسند آراستہ کی۔ فنون متداولہ پر اس قدر عمیق نظر رکھتے تھے کہ خیالی اور مطول پر حواشی تحریر کیے۔ یہ دونوں کتابیں درس میں شامل ہیں اور دقیق مسائل پر محیط ہیں۔ مولانا نور اللہ کشمیری نے ۴ ربیع الاول ۱۱۹۵ھ/ ۲۸ فروری ۱۷۸۱ء کو سفر آخرت اختیار کیا اور کشمیر میں دفن کیے گئے ❹۔

❶ تجلی نور ج ۲ ص ۸۹، ۹۰۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۷۴۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۹۳۔
❷ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۹۳ بحوالہ گنج ارشدی۔
❸ مآثر الکرام ص ۱۰۸ تا ۱۱۰۔ تقصار جیود الاحرار ص ۲۱۵، ۲۱۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۹۳۔
❹ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۸۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۵۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۹۳، ۳۹۴۔

Marfat.com

مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں ان کا نام ''نور محمد'' لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ صحیح نام ''نور اللہ'' ہے۔

۹٦۔ شیخ نور اللہ برہانوی

شیخ نور اللہ صدیقی برہانوی کا مولد و منشا برہانہ ہے جو اس زمانے میں ایک قریہ تھا۔ چھوٹی عمر ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ پھر دہلی کا رخ کیا، وہاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور عرصۂ دراز تک ان سے منسلک رہے، یہاں تک کہ اپنے استاذ گرامی کی زندگی ہی میں کبار علمائے ہند میں شمار ہونے لگے اور حدیث، فقہ اور دیگر علوم میں ماہر تسلیم کیے گئے۔ سلسلۂ درس بھی جاری فرمایا، جس سے متعدد نامور ہندی علما نے استفادہ کیا، ان علما میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزند گرامی قدر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان سے کتب فقہ کی تکمیل کی۔ شیخ نور اللہ برہانوی نے اپنی ایک بیٹی بھی شاہ عبدالعزیز صاحب کے عقد میں دے دی تھی۔ شیخ نور اللہ نے ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء کے لگ بھگ رحلت فرمائی ❶۔

۹۷۔ شیخ نور محمد بدایونی

شیخ نور محمد حسینی بدایونی دیار ہند کے علمائے ربانی میں سے تھے اور جلیل القدر فقیہ تھے۔ نقشبندی تھے۔ شیخ محمد حسن دہلوی (متوفی ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۵ء) اور شیخ سیف الدین سرہندی (متوفی ۱۰۹۸ھ/ ۱٦۸۷ء) کی خدمت میں گئے اور ان سے حصول علم کیا۔ طویل عرصے تک ان دونوں علما سے انسلاک اختیار کیے رکھا، اس کے بعد ان پر جذب و استغراق کا غلبہ ہو گیا۔ یہ صورت حال پندرہ سال رہی۔ زہد و ورع میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے، کسی کے محتاج نہ تھے۔ ان کی عادت تھی کہ کئی دنوں کا کھانا اکٹھا پکا لیتے، پھر جب بھوک بہت غالب آتی تو اس میں سے کھا لیتے۔ اغنیا اور امرا کی دعوت قبول نہ کرتے، نہ ان کے ہاں جاتے۔ قناعت کا یہ عالم تھا کہ دستر خوان پر کبھی دو کھانے جمع نہ کرتے۔ ایک پر اکتفا کرتے، بہت کم اور سادہ کھاتے۔

شیخ نور محمد بدایونی سے مرزا مظہر جان جاناں نے کسب فیض کیا تھا۔ مرزا موصوف فرماتے ہیں کہ شیخ نور محمد قدسی صفات عالم تھے۔ لوگوں کی مدح اور ذم سے ان کا ذہن بالکل خالی تھا، اللہ کی رضا پر راضی رہتے اور اسی کے فیصلے کو آخری اور صحیح فیصلہ قرار دیتے۔

شیخ نور محمد حسینی بدایونی نے ۱۱ ذیقعدہ ۱۱۳۵ھ/۱۲ اگست ۱۷۲۳ء کو دہلی میں وفات پائی ❷۔

---

❶ نزہتہ الخواطر، ج ٦ ص ۳۹۴۔

❷ معمولات مظہریہ ص ۱۸ و ۱۴۱۔ نزہتہ الخواطر، ج ٦، ص ۳۹۵۔

Marfat.com

و

۹۸۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

برصغیر کی سرزمین فضل وکمال کے لحاظ سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہی ہے۔اس کی خاک سے بے شمار علما و فضلا پیدا ہوئے، جنھوں نے ہر حال اور ہر دور میں علم کی شمع روشن رکھی اور درس و تدریس کی گہما گہمی میں زندگی بسر کی۔ان میں متعدد حضرات وہ ہیں جو انفرادی حیثیت سے میدان عمل میں اترے اور لاتعداد لوگوں کو مستفید فرمایا۔ان کی علمی سرگرمیوں اور روحانی فیض رسانیوں کی تفصیلات تذکرہ و رجال کی کتابوں اور بزرگان دین کے ملفوظات میں موجود ہیں۔

برصغیر کے چند مشہور علمی خاندان:

پھر ایسے کئی خاندان ارض ہند میں نمودار ہوئے جن کے اسلاف و اخلاف کی بھرپور کوششوں سے نہ صرف باشندگان برصغیر نے استفادہ کیا بلکہ پوری علمی دنیا میں ان کی شہرت پھیلی اور تمام عالم اسلام ان سے فیض یاب ہوا۔ان خاندانوں میں صدیوں تک علم کے چشمے ابلتے رہے اور ہر دور میں وسیع پیمانے پر تشنگان علوم ان کے دروازوں پر حاضری دیتے اور اپنی صلاحیتوں اور فکری استعداد کے مطابق ان سے استفادہ کرتے رہے۔ ان خاندانوں میں برصغیر کے جو خاندان اپنے اوصاف بوقلموں کی بنا پر سب سے نمایاں ہو کر ابھرے، ان میں مندرجہ ذیل چند خاندان بالخصوص قابل ذکر ہیں اور بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر تمام برصغیر کے اہل علم انہی کے حلقۂ تلمذ اور دائرۂ فیض میں شامل ہیں۔

۱۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۱۴ شوال ۹۷۱ھ۔ وفات ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ/ ۲۶ مئی ۱۵٦۴ء تا ۳۰ نومبر ۱٦۲۴ء) کا خاندان، جن کا سلسلۂ فیض صدیوں تک جاری رہا اور اس دودمان عالی مقام کے ہر فرد نے خدمت دین میں پشت ہا پشت تک ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اس خاندان نے مشرقی پنجاب کے ایک قصبے سرہند میں جنم لیا اور پھر بہت جلد پورے ہندوستان کے فیض یافتگان کے قبلہ گاہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ چار سو سال سے مختلف صورتوں میں ان کا سلسلۂ رشد و ہدایت جاری ہے[1]۔

۲۔ رائے بریلی کے حضرت سید علم اللہ کا خاندان، جس کے بہت سے افراد نے فضل و کمال کے مختلف گوشوں میں ناموری حاصل کی۔اس کے فیض کی وسعتوں نے پورے برصغیر کو گھیر لیا ہے۔ تین سو

[1] مجدد الف ثانی کے حالات کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد چہارم۔

Marfat.com

سال سے زائد مدت گزری کہ اس خاندان کے مرد جلیل سید علم اللہ شاہ ❶ (ولادت ۱۲ ربیع الاول ۱۰۳۳ھ۔ وفات ۸ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ/ ۲۴ دسمبر ۱۶۲۳ء تا ۲۶ اکتوبر ۱۶۸۵ء) نے تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا علم ایسی ساعت سعید میں اٹھایا اور رائے بریلی سے اپنی پاکیزہ مساعی کا آغاز کیا کہ اب تک یہ سلسلہ جاری ہے اور حضرت سید ممدوح کے اخلاف نے پوری آب و تاب کے ساتھ اس بنیادی اور اہم کام کو جاری رکھا۔ ان سے برصغیر سے باہر کے اہل علم بھی مستفیض ہوئے۔

۳۔ سہالی کے مولانا قطب الدین انصاری سہالوی شہید (ولادت تخمیناً ۱۰۴۰ھ۔ شہادت ۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ/ ۱۶۳۱ء تا ۲۷ مارچ ۱۶۹۲ء) ❷ کا خاندان، جس نے بعد میں فرنگی محل کا قالب اختیار کیا اور پورے برصغیر کو فیض یاب فرمایا۔ اس خاندان کے علمائے مشاہیر فقہائے نام دار نے علم و عمل کے میدان میں جو شان دار خدمات انجام دیں، خطۂ ہند کے اصحاب علم اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اسی خاندان کے بلند مرتبت عالم مولانا نظام الدین انصاری سہالوی (فرنگی محلی) نے درس نظامیہ کے نام سے ایک نصاب تعلیم مرتب کیا، جو تین سو سال سے پشاور سے لے کر کلکتے تک تمام مدارس عربیہ میں مروج ہے۔ اس خاندان کے علمائے کرام نے خطۂ ہند کے اہل علم پر جو احسان عظیم کیا، اسے علمی تاریخ کے زریں باب کی حیثیت حاصل ہے۔ مولانا نظام الدین انصاری سہالوی کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔

۴۔ مولانا محمد یحییٰ عباسی الٰہ آبادی کا خاندان بھی خدمت علم میں بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس خاندان کے بلند پایہ علما میں سے مولانا محمد فاخر زائر الٰہ آبادی اور ان کے لائق احترام بھائیوں کے اسمائے گرامی بالخصوص لائق تذکرہ ہیں۔ ان کے حالات و سوانح گزشتہ صفحات سابقہ میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

۵۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا خاندان۔ شیخ ممدوح محرم ۹۵۸ھ/ فروری ۱۵۵۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور ۹۴ سال عمر پا کر ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ/ ۹ جون ۱۶۴۲ء کو دہلی ہی میں وفات پائی۔

۶۔ چھٹا خاندان حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اس خاندان کے معزز ارکان نے بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں جو علمی اور عملی کارنامے انجام دیے، اس میں کوئی ان سے ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد گرامی حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی کے حالات کے ضمن میں ان کے خاندان کے اسلاف کے کوائف ضروری تفصیل سے بیان کیے جا چکے ہیں ❸۔ لیکن آئندہ سطور میں چونکہ اس خاندان ذی مرتبت کے رکن اعظم حضرت شاہ ولی اللہ محدث

❶ سید علم اللہ شاہ بریلوی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد چہارم۔

❷ مولانا قطب الدین انصاری سہالوی کے حالات و سوانح کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد ششم۔

❸ ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد پنجم۔

Marfat.com

دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ مقصود ہے، اس لیے موضوع میں ربط قائم رکھنے کے لیے یہاں بھی اختصار کے ساتھ ان کے اسلاف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے اسلاف:

اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو وارد ہند ہوئے، شیخ شمس الدین مفتی تھے۔ اغلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے دور آغاز ہی میں وہ یہاں آ گئے تھے۔ انھوں نے رہتک کو اپنا مسکن ٹھہرایا جو آزادی سے قبل پنجاب میں واقعہ تھا اور اب ہریانہ میں ہے۔ اس زمانے میں بھی یہ ایک بارونق شہر تھا۔ شیخ ممدوح علوم ظاہری و باطنی کے حامل اور صاحب کشف بزرگ تھے۔ شاہ ولی اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

واین بزرگ مردے عالم و عابد بودہ است واول کسے کہ از نژار قریش دراں بلدہ در آمد و بسبب وے شعائر اسلام ظہور نمود وطغیان کفر منطفی شد ❶۔

یعنی شیخ شمس الدین ایک عالم و عابد بزرگ تھے، اور یہ خاندان قریش کے پہلے شخص ہیں جو اس شہر میں آئے اور جن کی وجہ سے اس نواح میں شعائر اسلام کی ترویج ہوئی اور کفر کی طغانیوں کا سلسلہ بند ہوا۔

شیخ شمس الدین نے رہتک میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنے علم و فضل اور علو مرتبت کی بنا پر اس شہر کے دستور کے مطابق شہر کے مفتی مقرر ہوئے۔ پھر افتا کا یہ سلسلہ ان کے خاندان میں باقاعدہ جاری ہو گیا۔

چنانچہ ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے شیخ کمال الدین کو مفتی مقرر کیا گیا، ان کے بعد شیخ عبدالملک، پھر قاضی کبیر الدین، پھر قاضی قاسم اور سب سے آخر میں قاضی قوام الدین عرف قاضی قادن اس عہدۂ بلند پر فائز ہوئے، لیکن جب قاضی قادن کے بیٹے محمود کی باری آئی تو انھوں نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا، اس لیے کہ انھوں نے سپاہیانہ زندگی اختیار کر لی تھی، مگر اس کے باوجود اس خاندان کے شرف و مجد میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

شیخ محمود کی شادی سونی پت کے سادات میں ہوئی تھی جس سے ان کے بیٹے احمد پیدا ہوئے۔ احمد کو شیخ عبدالغنی بن عبدالحکیم سونی پتی نے اپنی آغوشِ تربیت میں لے لیا تھا، انھوں نے بہترین طریقے سے ان کی تربیت کی۔ بڑے ہو کر شیخ احمد نے رہتک میں قلعے کے باہر ایک وسیع عمارت تعمیر کرائی جس میں اپنے خاندان کے تمام لوگوں کو سکونت کے لیے الگ الگ مکان عطا کیے۔

شیخ احمد کے بیٹے منصور اور پوتے محمد معظم تھے، یہ بھی علم و فضل میں عالی مرتبہ رکھتے تھے لیکن طرز حیات سپاہیانہ تھی، اس لیے عمر بھر جنگ و جدل میں مصروف رہے۔ ان دونوں کی شجاعت و مردانگی کے واقعات شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب ''امداد فی مآثر الاجداد'' میں بیان کیے ہیں۔

شیخ محمد معظم کے فرزند رشید شیخ وجیہ الدین تھے، جو شاہ ولی اللہ کے جد امجد تھے۔ یہ عالم دین اور صاحب

---

❶ امداد فی مآثر الاجداد، ص ۲۔

Marfat.com

حال بزرگ تھے، اس کے ساتھ ہی ایک بہادر سپاہی بھی تھے۔ ان کی بہادری کے متعدد اہم واقعات کتابوں میں مرقوم ہیں۔ ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ جب کھجوہ کے مقام پر اورنگ زیب عالم گیر اور شجاع کے درمیان معرکۂ کارزار گرم ہوا تو شیخ وجیہ الدین اس زمانے میں اورنگ زیب عالم گیر کی کمان میں شجاع کی فوجوں سے برسر پیکار تھے۔ شجاع کی فوج میں کئی مست ہاتھی تھے، جن کے مسلسل اور تیز حملوں سے عالم گیر کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور نہایت پریشانی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس وقت شیخ وجیہ الدین نے بے حد جرأت کا ثبوت دیا۔ وہ بے دھڑک ہو کر سب سے زیادہ شریر اور مست ہاتھی پر ٹوٹ پڑے۔ ہاتھی ان کی طرف تیزی سے لپکا اور انھیں گھوڑے سمیت سونڈ میں لپیٹنا چاہا، لیکن شیخ نے آگے بڑھ کر اتنا زوردار حملہ کیا کہ تلوار سے ہاتھی کی سونڈ کے دو ٹکڑے کر دیے۔ زخمی ہاتھی شدت کرب سے اس قدر بدحواس ہوا کہ بلبلاتا ہوا اپنی فوج پر پلٹ پڑا اور شجاع کی فوج میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ابتری پھیل گئی۔ عالم گیر یہ تماشا خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ شیخ کی اس بے انتہا بہادری پر نہایت خوش ہوا۔ ان کی کمر میں اپنے ہاتھ سے تلوار باندھی جو ان کی شجاعت کا بہت بڑا اعتراف تھا۔ اس کے ساتھ ہی منصب میں اضافہ کرنا چاہا، لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور اپنے اسی اعزاز و منصب کو کافی سمجھا جو پہلے سے حاصل تھا۔

پھر جب دکن میں سیوا جی مرہٹے کی چیرہ دستیاں حد سے متجاوز ہونے لگیں تو شہنشاہ اورنگ زیب نے شیخ وجیہ الدین ہی کو ایک فوج دے کر اس مہم پر روانہ کیا۔ لیکن برہان پور کے قریب پہنچے تو انھیں بہت سے ڈاکوؤں نے آ گھیرا۔ ان سے اتنا شدید تصادم ہوا کہ جامِ شہادت نوش فرما کر ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

شیخ وجیہ الدین کے بیٹے شاہ عبدالرحیم تھے، جو ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء میں پیدا اور ۷۷ برس کی عمر پا کر ۱۱۳۱ھ میں فوت ہوئے۔ شاہ عبدالرحیم اپنے عہد میں دیار ہند کے بہت بڑے عالم، مفسر، محدث اور فقیہ تھے۔

شاہ ولی اللہ کی ولادت:

شاہ عبدالرحیم کے فرزند رشید حضرت شاہ ولی اللہ تھے۔ شاہ عبدالرحیم عمر کی ساٹھ منزلیں طے کر چکے تھے کہ دوسری شادی کی۔ شاہ ولی اللہ کے سوانح نگاروں اور خود شاہ صاحب نے بھی انفاس العارفین میں لکھا ہے کہ شاہ عبدالرحیم نے دوسری شادی کسی غیبی اشارے کی وجہ سے کی تھی۔ بعض لوگوں نے اس پر اعتراض بھی کیا اور کہا:

دریں عمر کدخدائی مناسب نہ بود [1]۔

(اس عمر میں شادی مناسب نہ تھی۔)

لیکن شاہ عبدالرحیم نے لوگوں کی یہ باتیں سنیں تو فرمایا:

مدتے دراز از عمر من باقیست و فرزندان بوجود خواہند آمد [2]۔

(میری عمر کا طویل حصہ ابھی باقی ہے اور چند لڑکے ابھی اور پیدا ہوں گے۔)

[1] انفاس العارفین ص ۶۳۔

[2] ایضاً ص ۶۴۔

Marfat.com

چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ اس شادی کے بعد میرے والد (شاہ عبدالرحیم) سترہ ۱۷ سال زندہ رہے اور ان کے دولڑکے تولد ہوئے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی بروز چہار شنبہ، بوقت طلوع شمس، ۴ شوال ۱۱۱۴ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۳ء) کو بہ عہد اورنگ زیب عالم گیر پیداہ ہوئے۔ شاہ صاحب کی پیدائش سے چار سال بعد عالم گیر نے وفات پائی اور اس کے ساتھ ہی مغل حکومت کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ کا مولد موضع پھلت ہے، جو ضلع مظفر نگر (یوپی) میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ علمی اعتبار سے اس گاؤں کو بڑی شہرت اور اہمیت حاصل ہے۔

شاہ ولی اللہ نے جس زمانے میں شعور کی دہلیز پر قدم رکھا، اس زمانے کو سیاسی لحاظ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے عہد زوال سے تعبیر کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ مذہبی اور علمی اعتبار سے مسلمانوں نے اس عہد میں بے حد ترقی کی منزلیں طے کیں اور اصلاح وتجدید کے رفیع الشان کارنامے انجام دیے۔ چنانچہ جس زمانے میں ہندوستان میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے، اسی زمانے میں (۱۱۱۵ھ۔۱۷۰۳ء) میں اسلام کے دور جدید کا دوسرا عظیم مصلح اور مجدد ملت شیخ محمد بن عبدالوہاب سرزمین نجد میں ظہور پذیر ہوا۔

شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور والدہ کی جانب سے حضرت موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے۔

تعلیم وتربیت:

شاہ صاحب نے علم وفضل کی گود اور تقویٰ وتصوف کی فضا میں پرورش پائی۔ پانچ سال کی عمر میں پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ساتویں سال میں قرآن پاک ختم کیا۔ اسی سال میں نماز اور روزے کی پابندی شروع کر دی۔ اسی سال میں فارسی کی کتابیں پڑھنے لگے۔ سال بھر میں یہ سلسلہ بھی ختم کر دیا۔ اس کے بعد صرف ونحو کی کتابوں کا آغاز کیا۔ دس برس کی عمر میں شرح جامی پڑھ ڈالی اور پھر منقولات میں جا پہنچے۔ بعدازاں اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

علم حدیث میں مشکوٰۃ پڑھی، لیکن کتاب البیوع سے کتاب الادب تک کا حصہ چھوڑ دیا۔ اجازہ پوری کتاب کا حاصل ہو گیا۔ صحیح بخاری کتاب الطہارت تک، شمائل النبی پوری کا سماع کیا، قرأت بعض ساتھیوں نے کی، علم تفسیر میں کچھ حصہ بیضاوی کا اور کچھ حصہ تفسیر مدارک کا پڑھا۔ قرآن مجید، اس کے معانی اور شان نزول کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھا۔ اس اثنا میں کتب تفسیر کی طرف رجوع کیا، جس سے بہت سے تفسیری فوائد حاصل ہوئے۔

علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ (تھوڑے سے حصے کے سوا) دونوں کتابیں پڑھیں۔ اصول فقہ میں

Marfat.com

حسامی اور توضیح تلویح کا کچھ حصہ پڑھا۔ منطق میں شرح شمسیہ مکمل کی اور شرح مطالع کا کچھ حصہ پڑھا۔ کلام میں شرح عقائد، خیالی کا کچھ حصہ اور شرح مواقف کا کچھ حصہ۔ سلوک میں عوارف کا کچھ حصہ اور کچھ رسائل نقشبندیہ وغیرہ۔ حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی اور لوائح، مقدمہ شرح لمعات۔ مقدمہ نقد النصوص۔ خواص اسماء وآیات میں اپنے والد گرامی شاہ عبدالرحیم کا خاص مجموعہ، جس کی انھوں نے چند مرتبہ اجازت دی۔ طب میں موجز القانون، حکمت میں شرح ہدایت الحکمت وغیرہ۔ نحو میں کافیہ وشرح جامی، معانی میں مطول اور مختصر معانی پڑھیں۔ ہندسہ وحساب میں بعض مختصر رسالے مکمل کیے۔

حصول علم کی اس مدت میں ہر فن کے بارے میں بہت سی اونچی باتیں شاہ ولی اللہ کے ذہن میں گردش کرتی تھیں، جنھیں وہ ''سخنان بلند'' سے تعبیر کرتے ہیں، اور جتنی کوشش کرتے تھے، اس سے زیادہ مقصد حاصل ہوتا تھا۔

شادی:

شاہ صاحب چودھویں سال کی عمر کو پہنچے تو شادی ہوگئی، شادی کے لیے شاہ عبدالرحیم بہت عجلت فرما رہے تھے۔ سسرال والوں نے شادی کے ضروری اسباب مہیا ہونے کا عذر کیا تو شاہ عبدالرحیم نے ان کو لکھا کہ اس کی پروا نہیں۔ شادی جلد ہونی چاہیے اور اس ''جلدی'' میں ایک راز پنہاں ہے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ ''یہ راز شادی کے بہت جلد بعد ظاہر ہوگیا۔ شادی پر ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میری بیوی کی والدہ وفات پاگئیں، اس کے جلد ہی بعد میری بیوی کے نانا اور اس کے چند ہی دن بعد شیخ فخر العالم، فقیر کے عم محترم شیخ ابوالرضا کے بیٹے فوت ہوگئے۔ بعد ازاں اس فقیر کے بڑے بھائی شیخ صلاح الدین کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔''

شاہ ولی اللہ اس سے آگے افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں:

''اس کے فوراً بعد میرے والد بزرگوار پر بہت ہی ضعف اور نقاہت کا غلبہ ہوگیا اور مختلف عوارض نے ان کو آگھیرا۔ اس کے بعد ان کی وفات کا حادثہ پیش آگیا۔ غرض بزرگوں کی یہ جماعت منتشر ہوگئی اور سب کو معلوم ہوگیا کہ اگر اس زمانے میں شادی نہ ہوتی تو پھر کئی سال تک اس کا امکان نہ تھا۔''

بیعت وخلافت:

شاہ ولی اللہ پندرہ سال کے ہوئے تو والد بزرگوار نے ان کی تربیت روحانی کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور اپنے حلقۂ بیعت میں داخل کیا۔ سترہ سال کے ہوئے تو اپنا خلیفہ مقرر فرمالیا اور بیعت وارشاد کی اجازت مرحمت کی۔ بیعت وارشاد کی اجازت دیتے ہوئے انھوں نے "یدہ کیدي" کہا، یعنی ولی اللہ کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے۔ اسی سال انھوں نے انتقال کیا۔ والد کی رحلت کے بعد شاہ صاحب نے مسند علم و

Marfat.com

ارشاد کو زینت بخشی اور ان کی جگہ درس و تدریس اور وعظ و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ کم و بیش بارہ برس کتب دینیہ و عقلیہ کا درس دیتے رہے۔ اس اثنا میں شاہ صاحب نے ہر علم میں مہارت حاصل کی اور ہر فن میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ ان پر توحید الٰہی کے راز کھلے، جذب کی راہیں کشادہ ہوئیں، معرفت و سلوک کی بہت بڑی دولت میسر آئی اور علوم وجدانیہ کی نعمت سے مالا مال ہوئے۔

فرماتے ہیں، میں نے مذاہب اربعہ کی کتابیں پڑھیں، ان کے اصول فقہ کو مرکز التفات ٹھہرایا اور جن احادیث سے وہ تمسک کرتے ہیں ان پر غور کیا۔ ان کے گہرے مطالعہ و ملاحظہ کے بعد، وہی اسلوب و انداز میرے لیے قابل عمل اور لائق پذیرائی قرار پایا جو فقہائے محدثین کا تھا۔

قصد حجاز:

شاہ ولی اللہ صاحب بارہ سال اپنے والد محترم شاہ عبدالرحیم کی مسند دعوت و ارشاد پر فائز رہے۔ اس کے بعد دل میں سفر حجاز کا داعیہ ابھرا، اور ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۱ء کے آخر میں حج بیت اللہ کی نعمت سے مشرف ہوئے۔ ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۲ء میں مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ اس کے بعد مدینہ منورہ گئے اور شیخ ابو طاہر اور مشائخ حرمین سے روایت حدیث کی سعادت حاصل کی۔ شیخ ابو طاہر سے علم حدیث لی، اس سے قبل ہندوستان میں علم حدیث کی تعلیم مولانا محمد افضل سیالکوٹی سے حاصل کی تھی۔ مشائخ حرمین سے دلچسپ صحبتیں رہیں اور خوب استفادہ کیا۔ ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۲ء میں بھی شرف حج سے مشرف ہوئے۔ یعنی دو حج کیے۔

شاہ صاحب کے قلب صافی میں علم حدیث سے جو زیادہ رغبت پیدا ہوئی، اس کی بنیادی وجہ علمائے حجاز سے شرف تلمذ ہے۔ ان کی صحبت و تلمذ سے ذہن کی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں اور فکر و عمل کی دنیا بالکل بدل گئی۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خاندان ولی اللہی کے اکابر کے ذہن پر وحدت الوجود کا تصور نمایاں تھا۔ خود شاہ صاحب پر بھی اس کا اثر تھا، لیکن مشائخ حجاز کی صحبت و رفاقت سے اس کے اثرات زائل ہو گئے۔ بالخصوص شیخ ابو طاہر سے جو مسلکاً شافعی تھے، شاہ صاحب بہت متاثر ہوئے۔

جس زمانے میں ارض ہند کے شاہ ولی اللہ مدینہ منورہ میں طلب علم میں مشغول تھے، اسی زمانے میں سرزمین نجد کے شیخ محمد بن عبدالوہاب مدینہ طیبہ کے مختلف جید اساتذہ سے تحصیل علم میں مصروف تھے۔ یعنی مستقبل کے یہ دونوں مجدد اور عظیم مصلح ایک ہی عہد میں دیار حبیب (ﷺ) میں علمی اور روحانی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان دونوں مجددین ملت کو ایک ہی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ نجد اور ہندوستان کی علمی، عملی، دینی اور سیاسی فضا بہت حد تک ایک سی تھی۔ اس لیے دونوں نے اپنے اپنے حالات کے مطابق ایک ہی انداز سے اپنی تجدیدی مساعی کا آغاز کیا اور ایک ہی اسلوب سے اپنے کام کی رفتار کو آگے بڑھایا۔ پھر دونوں کو اپنی تبلیغی تگ و تاز کے سلسلے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، وہ بھی ایک ہی قسم کی تھیں۔

Marfat.com

مراجعت وطن:

جس زمانے میں شاہ صاحب حجاز مقدس کو روانہ ہوئے تھے، اس زمانے میں ہندوستان کی سیاسی حالت نہایت ابتر تھی اور مرہٹوں کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اسی وجہ سے ہندوستان کے بعض حضرات نے شاہ صاحب کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ عرب ہی میں اقامت گزین ہو جائیں۔ لیکن آپ نے مشائخ حجاز سے مستفید ہونے کے بعد واپس ہندوستان آنے کو ترجیح دی اور تبلیغ و اشاعت دین کے لیے اپنے آبائی وطن کو منتخب کیا۔

شاہ صاحب نے جب مراجعت وطن کی تیاری فرمائی تو اپنے ایک نامور استاد شیخ ابوطاہر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور الوداعی سلام عرض کیا۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ میں اس وقت کو کبھی نہیں بھول سکتا، جب میری روانگی کا زمانہ قریب آیا اور جدائی کی گھڑی سر پر آ کھڑی ہوئی اور میں نے الوداعی ملاقات اور رخصتی سلام کے دوران یہ شعر پڑھا تو عجیب سماں پیدا ہو گیا:

نسیت کل طریق کنت اعرفه　　الا طریقا یؤدینی الیٰ ربعکم

یعنی میں سوائے اس راستے کے جو مجھے تیرے گھر تک پہنچا دے، ان تمام راستوں کو بھول گیا ہوں، جن سے میں اس سے پہلے آشنا تھا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں، یہ شعر سنتے ہی شیخ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور شدت تأثر سے دونوں رخسار سرخ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وفور گریہ سے ان کا گلا رندھ گیا۔ اس کے بعد انھوں نے انتہائی خلوص کے ساتھ اس عاجز کے لیے دعائے خیر کی۔

شیخ ابوطاہر اپنے تلمیذ رشید شاہ ولی اللہ کے فہم و ادراک کے انتہائی مداح تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ولی اللہ مجھ سے الفاظ کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے معانی کی سند لیتا ہوں۔

شاہ صاحب بروز جمعہ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ (۹ جولائی ۱۷۳۲ء) کو اپنے وطن دہلی واپس پہنچے۔

شاہ صاحب کا زمانہ:

شاہ ولی اللہ کی ولادت ایسے وقت میں ہوئی تھی، جب سلطنت مغلیہ اپنے عروج کی آخری منزل میں پہنچ گئی تھی اور صرف چار سال بعد یعنی اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے ساتھ ہی اس کا آفتاب اقبال زوال پذیر ہونے لگا تھا۔

شاہ ولی اللہ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۳ء) کو پیدا ہوئے اور عالم گیر نے ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) کو وفات پائی۔ اس حساب سے شاہ صاحب کی ولادت عہد عالم گیری کے آخری زمانے میں ہوئی، یعنی اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے چار سال پہلے شاہ صاحب نے اس عالم ناسوت میں قدم رکھا اور

Marfat.com

ان کا کاروانِ حیات دس بادشاہوں کے عہد سے گزرا۔ وہ بادشاہ بہ ترتیب حکمرانی حسب ذیل ہیں:

۱۔ اورنگ زیب عالم گیر۔ (۲) محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول۔ (۳) معزالدین جہاں دار شاہ۔ (۴) فرخ سیر۔ (۵) رفیع الدرجات (۶) رفیع الدولہ (۷) محمد شاہ المعروف رنگیلا۔ (۸) ابراہیم شاہ صرف ایک ماہ آٹھ دن حکومت کی۔ (۹) ابوالنصر احمد شاہ عالم گیر ثانی۔ اور (۱۰) شاہ عالم۔

اس طویل عہد میں ہندوستان میں جو ہیبت ناک واقعات اور خون ریز حوادث رونما ہوئے، وہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے انتہائی ذہنی اذیت اور قلبی کوفت کا باعث ہیں۔ اس مدت میں پورا ملک مختلف فتنوں اور مسلسل صدموں کی خوف ناک لہروں کی زد میں رہا۔ مرہٹوں کی بے پناہ سرکشی، سکھوں کے خون ریز مظالم، نادر شاہ کے قتل عام، سادات بارہ کے تسلط، ان کے ہاتھوں فرخ سیر کی گرفتاری اور پھر انتہائی بے کسی کی موت، ہندوستان کی سیاست میں روہیلوں کی شرکت، دربار شاہی کے ایرانی اور تورانی امرا کی باہمی کش مکش، ارض ہند پر احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملے، مغربی طاقتوں کی بتدریج ملکی سیاسیات میں مداخلت، بنگال میں انگریزوں کا اقتدار اور مدراس کے بعض علاقوں پر اس کی حکومت کا قیام۔ یہ ایسے واقعات تھے جو تقریباً سب کے سب شاہ ولی اللہ کی نظروں کے سامنے ظہور میں آئے۔ شاہ صاحب ان سے بہ درجۂ غایت متاثر اور بے حد مغموم ہوئے۔ اس تاثر اور غم واندوہ کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ شاہ صاحب جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، وہ ابتدا ہی سے انتہائی حساس تھا اور اس کے تمام افراد مسلمانوں کی مشکلات سے بے حد اذیت محسوس کرتے تھے۔ شاہ صاحب کے والد گرامی شاہ عبدالرحیم بھی ان حوادث سے سخت ملول تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ ملک کو مختلف مصائب کے ہجوم نے ہر طرف سے گھیر لیا ہے تو سلطنت آصفیہ کے بانی نظام الملک آصف جاہ کو ایک دردناک خط لکھا اور حکومت اسلامی کے تحفظ کے لیے میدان جہاد میں اترنے کی تلقین، فرمائی۔ تلقین جہاد کے سلسلے میں تاریخی نوعیت کا یہ خط شاہ عبدالرحیم نے اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے دس بارہ سال بعد تحریر کیا تھا۔ غالباً وہ محمد شاہ کا ابتدائی عہد حکومت تھا۔ اصل خط فارسی میں ہے، اس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

بہ جانب وزیر الممالک آصف جاہ در تحریص جہاد تحریر یافت:

یعنی وزیر الممالک آصف جاہ کی طرف جہاد کا شوق دلانے کے لیے تحریر کیا گیا۔

''اس فقیر کے دل پر یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ عالم ملکوت میں اس امر کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ کفار ذلت وخواری سے دوچار ہوں اور اس سے کچھ عرصہ بعد باغیوں کا گروہ رسوائی اور خرابی میں مبتلا ہو۔ اگر شوکت مآب اور صاحب شہامت (آصف جاہ) ان گمراہ لوگوں کی مخالفت میں کمر ہمت باندھ لیں تو یہ تمام کارنامے آپ کی طرف منسوب ہوں گے، تمام عالم آپ کا مطیع ہوگا اور یہ کوشش اللہ کے دین کی ترویج اور آپ کی حکومت کے استحکام کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

اس سلسلے میں تھوڑی سی جہد وجہد بھی بہت بڑے فائدے کا باعث ہوگی۔ یاد رہے، اگر آپ (کفار

Marfat.com

کو زیر کرنے کے لیے) کوشاں نہ ہوں، تب بھی وہ حوادث سماوی سے ہلاک اور کمزور ہو جائیں گے، لیکن اس صورت میں اسے آپ کے کارنامے میں شمار نہ کیا جائے گا:

کار زلف تست مشک افشانی و اما عاشقاں
مصلحت راتہمتے برآہوئے چنیں بستہ اند

چونکہ یہ بات یقینی طور پر معلوم تھی، اس لیے بے اختیار آں عزیز کو خط لکھا گیا۔ وقت کو غنیمت جانیں اور جہاد کے معاملے میں ہرگز سستی یا دیر نہ کریں۔ عنقریب سب چیزیں واضح ہو جائیں گی۔ چونکہ مجھے ایک ضروری چیز کا اظہار مقصود تھا اور دوستی اور خیر خواہی کا جذبہ دامن گیر ہو کر اس کے لیے مجبور کرتا تھا، لہٰذا مبالغے سے احتراز کیا گیا ہے، اس سے زیادہ وضاحت سے لکھنا ممکن نہ تھا۔

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں درنمے آید سواراں راچہ شد

اس کے بعد یعنی خط کے بالکل آخر میں شاہ عبدالرحیم تحریر فرماتے ہیں:

سخنے کہ با محرمان خود در پردہ ادامی کردیم ایں جا بے پردہ نوشتہ شد، تا عذر نماند۔ والسلام والاکرام۔

"یعنی وہ باتیں جو محرموں سے بھی راز میں کہی جاتی ہیں، یہاں بے حجاب نوک قلم پر آئی ہیں تاکہ کوئی عذر باقی نہ رہے۔"

شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے والد گرامی کے اس نہج تبلیغ کو جاری رکھا کہ جن امرا و حکام نے تنفیذ اسلام کے لیے کوششیں کیں، ان کی حوصلہ افزائی کی اور جو لوگ اسلامی حکومت کو مستحکم بنانے کے لیے میدان عمل میں نمودار ہوئے، ان کی پوری مدد کی۔ ان میں ایک پائندہ خاں روہیلہ ہے، جو مشرقی ہند کے پہاڑی علاقے میں کفار سے برسر پیکار اور نصرت اسلام کے لیے مصروف تگ و تاز تھا۔ شاہ صاحب اس کو "عزیز القدر، رفعت مآب، المجاہد فی سبیل اللہ، الرافع لکلمۃ اللہ پائندہ خاں سلمہ اللہ تعالیٰ" کے پروقار الفاظ سے خطاب کرتے ہیں۔ خود اپنا اسم گرامی انکسار کے ساتھ "از فقیر ولی اللہ عفی عنہ" تحریر کرتے ہیں۔ ان کے لیے پائندہ خاں روہیلہ کا "جہاد کوہستان موجب فرح و خوشی و سبب دعا بہ مظہر الغیب" ہوا۔ اس کی اس "سعی" سے وہ نہایت خوش ہیں اور ان الفاظ کے ساتھ دعا کرتے ہیں:

اللھم انصر من نصر دین محمد ﷺ

دوسرا خط شاہ صاحب کی طرف سے (از فقیر ولی اللہ عفی عنہ) سہارن پور کے فوجدار خاں زمان خاں کے نام رقم فرمایا گیا۔ یہ امیر بھی کفار سے برسر پیکار ہے۔ اور حمایت اسلام کے لیے میدان جنگ میں نکلا ہے۔ لہٰذا شاہ صاحب دعا کرتے ہیں کہ:

اللہ تبارک و تعالیٰ مجدد قانون شجاعت ودلاوری، خان عوالی

Marfat.com

مرتبت خاں زمان خاں جیو رامدت مدید در ردِّ مکاید طاغیان کفر از بیضۂ اہل اسلام منصور و مظفر دارد۔

یعنی خدا تبارک وتعالیٰ مجدد قانون شجاعت ودلاوری خان عالی مرتبت خاں زمان خاں جیو کو مدت مدید تک اہل کفر کی مخالفت میں کامیاب وکامران رکھے۔

اوصاف گونا گوں:

شاہ ولی اللہ، اوصاف گونا گوں کے حامل اور خصوصیات بوقلموں کے مالک تھے۔ انھوں نے اس وقت شعور کی آنکھیں کھولیں جب ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کا آفتاب لب بام آ چکا تھا، قدیم مسلم معاشرہ ختم ہو رہا تھا، اور پرانا سیاسی نظام جو کم وبیش دو سو سال سے مغل حکمرانوں کے لیے مضبوط بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا، انہدام پذیر ہو چکا تھا، ہر شعبۂ حیات میں زوال اور ہر گوشۂ زندگی میں انحطاط کے اثرات نہایت تیزی کے ساتھ پھیل رہے تھے۔ دینی حالت اور اخلاقی اقدار میں کوئی استحکام نہ رہا تھا۔ ہر طرف طوائف الملوکی، ابتری اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ دہلی کی وہ عظمت جو شاہ جہان اور عالم گیر کے دور حکومت کا طرۂ امتیاز تھی، خاک میں مل چکی تھی۔ ایسے وقت میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے اور اور تنہا ایک شخص نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے کہ پوری ایک جماعت بھی نہیں دے سکتی[1]۔

شاہ ولی اللہ صاحب کو اللہ نے بے شمار کمالات سے نوازا تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، کلام، منطق فلسفہ، تاریخ، سیاست، اقتصادیات، معاشیات، ہر موضوع پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے اسلام اور فلسفہ اسلام کو جس مربوط شکل میں پیش کیا اور جس اسلوب میں اس کے تمام گوشوں کو نکھارا اور واضح فرمایا ہے، اس میں کوئی ان کا حریف نہیں، انھوں نے جس نہج سے مختلف پیش آمدہ مسائل پر بحث کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ موضوع کی وضاحت میں وہ جو دلائل پیش کرتے ہیں اور جس زور بیان اور منطقی تسلسل سے بات کو آگے بڑھاتے ہیں، اس میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

تصانیف:

مصنف کی حیثیت سے شاہ ولی اللہ صاحب کا درجہ بہت بلند ہے اور ان کا شمار معمورۂ ارض کے جلیل

[1] ان تینوں خطوط (یعنی شاہ عبدالرحیم کے خط آصفیہ خاندان کے بانی نظام الملک آصف جاہ کے نام اور شاہ ولی اللہ کے دونوں خطوط، بنام پائندہ خان روہیلہ اور فوجدار خان زمان خاں) کا ذکر شیخ محمد اکرام نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ خط ابھی تک شائع نہیں ہوئے، اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) کے ایک قلمی مجموعے میں درج ہیں۔ دیکھیے رود کوثر ص ۵۴۵ تا ۵۴۷۔

Marfat.com

القدر مصنفین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے جو بیش قیمت علمی ترکہ تصانیف کی صورت میں اپنے پیچھے چھوڑا ہے، وہ ایک قوم یا ایک اقلیم کی میراث نہیں، بلکہ بجا طور پر پوری ملت اسلامیہ اور پورے عالم اسلام کا سرمایۂ افتخار ہے۔ ان کی تصانیف کی عظمت کا راز، صرف کثرت ہی میں پوشیدہ نہیں، بلکہ موضوع کا تنوع، کتابوں کی مقبولیت و ترویج، مضامین کے اشکال اور پیچیدگی کی عقدہ کشائی، دقیق سے دقیق مسائل کا حکیمانہ پیرایۂ بیان میں اظہار، کتابوں کی ضخامت، خیالات کا عمق، افکار کی گہرائی، الفاظ میں اختصار اور مطالب میں وسعت، یہ وہ اوصاف ہیں، جو ان کی تصانیف کو دیگر مصنفین کی تصانیف سے امتیاز بخشتے ہیں۔

ایسے مصنفین کی تعداد بہت کم ہوگی جن کی تصانیف میں کسی نہ کسی نہج سے ان کے دور کی عکاسی نہ ہوتی ہو اور ان کے حالات وظروف کی جھلک نہ پائی جاتی ہو، یا کسی حد تک اس زمان ومکان کی نشان دہی نہ ہوتی ہو، جس میں وہ زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ لیکن شاہ ولی اللہ کی تصانیف بالعموم زمان ومکان کی قید سے مبرا اور اپنے وقت ودور کے شکوہ وشکایت سے پاک ہیں۔ ان کی بعض تصانیف کے چند مقامات کو چھوڑ کر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں اس دور میں معرض تحریر میں لائی گئی ہیں، جب اس ملک کا امن وسکون غارت ہو گیا تھا اور ارض ہند میں خانہ جنگی، سیاسی بدامنی اور شور وشر کا دور دورہ تھا۔ دہلی کی سیاسی مرکزیت ختم ہو چکی تھی اور اس کا احترام خاک میں مل گیا تھا۔ ایک طرف سکھ اودھم مچا رہے تھے، دوسری طرف مرہٹوں نے ہنگامۂ بغاوت بپا کر رکھا تھا۔ تیسری طرف جاٹ یلغار کر رہے تھے اور چوتھی طرف روہیلے خودسری پر اتر آئے تھے۔ ان اندرونی سرکش عناصر کے علاوہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی جن کا شمار اس دور کے مشہور سپہ سالاروں میں ہوتا تھا، خیبر کے دروازے پر مسلح ہو کر کھڑے تھے، جب جی چاہتا ہندوستان کی سرزمین میں گھس آتے اور پھر اپنی مرضی سے واپس جاتے، کسی کو ان کے سامنے نظر اٹھانے کی جرأت اور ان سے مقابلے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ اس اثنا میں دہلی کو بار بار لوٹ مار کا نشانہ بنایا گیا اور اس کے سیاسی ومرکزی وقار کو پامال کیا گیا۔ لیکن قربان جائیے دہلی کے اس تاج دار علم اور علم بردارِ تحقیق کے کہ یہ سب تماشہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا، اور وہ کامل امن واطمینان کا پیکر بنا رہا۔ نہ دل میں اضطراب، نہ روح میں اضمحلال، نہ افکار میں انتشار، نہ قلم میں اضطرار، نہ زبان پر زمانے کی ستم رانیوں کا شکوہ، نہ لبوں سے حرف شکایت کا اظہار۔ ان کی تصانیف بوقلموں مضامین کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، مگر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بارھویں صدی ہجری کے پُرفتن اور پُرآشوب زمانے میں لکھی گئی ہیں۔ ہر موضوع پر پورے اطمینان سے اظہار خیال کیا گیا ہے اور ہر مسئلے کو کامل دلجمعی سے بیان کیا گیا ہے۔ نہ آسمان کی ہیبت ناک بجلیاں ان کے افکار کی روانی کو روک سکیں اور نہ زمین کی خوف ناک آندھیاں ان کے خیالات کے تسلسل میں خلل انداز ہو سکیں۔ فہم وفراست کی جو دولت اللہ نے ان کو بخشی تھی، مصائب و مشکلات کا سخت سے سخت ریلا بھی اس میں کسی نوع کی کمی نہ کر سکا۔ انھوں نے زمان ومکان کی گردشوں کی کبھی پروا نہیں کی اور اپنے قول وعمل سے ثابت کر دکھایا کہ اصحاب تسلیم ورضا کا منصب کتنا بلند اور ارباب علم واہل حق

Marfat.com

کی شان کتنی اونچی ہے۔

شاہ صاحب کی تصانیف کیفیت وکمیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ان کی وفات کے وقت رائے بریلی کے ایک بزرگ سید محمد نعمان حسنی دہلی میں موجود تھے اور شاہ صاحب کے پاس تھے۔انھوں نے رائے بریلی ہی کے ایک دوسرے بزرگ سید ابوسعید حسنی (متوفی ۹ رمضان المبارک ۱۱۹۳ھ/ ۹ ستمبر ۱۷۸۱ء) کے نام ایک مکتوب ارسال کیا تھا، جس میں شاہ صاحب کے اوصاف وکمالات، علم وفضل، تدین وتقویٰ، آخری علالت اور وفات کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ یہ مکتوب فارسی زبان میں ہے اور غیر مطبوعہ شکل میں ندوۃ العلما (لکھنؤ) کے کتب خانے میں موجود ہے۔اس مکتوب میں انھوں نے شاہ صاحب کی تصانیف کی تعداد نوے (۹۰) بلکہ اس سے بھی زیادہ بتائی ہے۔اس ضمن میں مکتوب نگار سید محمد نعمان حسینی کے الفاظ لائق ملاحظہ ہیں:

> صاحب من! ظاہر صحبت ایشاں رو باستتار کشیدہ، تصانیف آنحضرت نود بل زیادہ، در علوم دین، از تفسیر و اصول و فقہ و کلام و حدیث مثل حجۃ اللہ البالغہ و اسرار فقہ و منصور وازالۃ الخفاء عن الخلفاء، وترجمہ قرآن کہ ہر واحد قریب بہ ہشتاد ونود جز کلاں بہ حجم خواہد بود، و دیگر رسائل در حقائق و معارف مثل الطاف القدس و ہمعات و فیوض الحرمین وانفاس العارفین وغیر ہم کہ نشان از صحبت و برکت خدمت می دہند، می باید کہ عزیمت برایں آرند کہ ہمہ را نویسانیدہ رائج نمایند، باندک توجہات سرانجام خواہد یافت، ومثل ایں تصانیف واللہ اعلم دراسلام تصنیف شدہ باشد یانہ۔
>
> (صاحب من! حضرت (شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی ظاہری صحبت تو اب میسر نہیں آسکتی۔ البتہ علوم دینیہ میں ان کی تصانیف نوے (۹۰) کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں، جو تفسیر، اصول، فقہ، کلام اور حدیث سے متعلق ہیں۔ جیسے حجۃ اللہ البالغہ، اسرار فقہ، منصور، ازالۃ الخفاء عن الخلفاء اور ترجمۂ قرآن۔ان میں سے ہر کتاب کافی بڑی ضخامت پر مشتمل ہے۔علاوہ ازیں دیگر رسائل ہیں، جو حقائق ومعارف پر محیط ہیں، جیسے الطاف القدس، ہمعات، فیوض الحرمین اور انفاس العارفین وغیرہ۔ یہ کتابیں حضرت شاہ صاحب کے فیوض و برکات کی نشان دہی کرتی ہیں۔آپ کو چاہیے کہ ان تمام کتابوں کو لکھوا کر رائج کرنے کا عزم فرمائیں۔ یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام پا سکتا ہے۔خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اسلام کے گزشتہ دور میں اس قسم کی کتابیں معرض تصنیف میں آئی ہیں یا نہیں۔)

شاہ صاحب کی ان رفیع الشان تصانیف کا مختصر سا تعارف مندرجہ ذیل سطور میں کرایا جاتا ہے:

۱. فتح الرحمٰن: برصغیر پاک وہند میں قرآن مجید کا ترجمہ سب سے پہلے کس زبان میں ہوا، اور کس عالم دین نے کس زمانے میں کیا، یہ ایک نہایت اہم سوال اور تحقیق طلب موضوع ہے۔ واقعات کی ترتیب

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ سندھی زبان میں ہوا❶۔ مغل حکمران جہاں گیر نے بھی (جس کا انتقال ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ)۲۹/اکتوبر ۱۶۲۷ء کو ہوا، گجرات (کاٹھیاواڑ) کے ایک عالم دین شیخ محمد بن جلال حسینی گجراتی کو قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کرنے پر مامور کیا تھا، اور کہا تھا کہ ترجمہ لفظی ہو، اور الفاظ قرآن سے ایک حرف بھی زائد نہ ہو۔ نیز تاکید کی تھی کہ ترجمہ آسان اور عام فہم ہونا چاہیے۔ الفاظ اور زبان میں کسی قسم کا تکلف اور تصنع ہرگز نہ ہو❷۔

معلوم نہیں یہ ترجمہ مکمل ہوا یا نہیں ہوا، یا اب کہیں موجود ہے یا نہیں ہے۔ اگر یہ ترجمہ تکمیل کے مراحل سے گزر گیا، یا کسی حد تک بھی ہو چکا تو غالباً قرآن مجید کا یہ پہلا ترجمہ ہے جو برصغیر کے ایک عالم نے فارسی زبان میں کیا، یا اس ملک کے ایک حکمران نے ایک عالم دین کو اس اہم خدمت پر مامور کیا۔ ایک روایت کے مطابق یہ ترجمہ مکمل ہو گیا تھا اور جے پور (ہندوستان) کے ایک بزرگ عبدالرزاق کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔

لیکن اس وقت برصغیر میں فارسی زبان میں قرآن مجید کا جو ترجمہ دست یاب ہے، یا اولین ترجمے کی حیثیت سے معروف ہے، وہ مخدوم نوح بن سلامۃ اللہ کبندی (متوفی ۹۹۸ھ) کا ہے جو ۱۴۰۱ھ کو حیدر آباد (سندھ) سے شائع ہوا اور دوسرا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا ہے، جو نہایت مستند اور عمدہ ترین ترجمہ ہے اور فتح الرحمٰن کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے مقدمے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''صبیان اہل حرفہ و سپاہیان'' جو عربی کی پوری تعلیم حاصل نہیں کر پاتے، اس ترجمے سے استفادہ کریں گے، اور ''جمہور مسلمانان'' کو اس کا فائدہ پہنچے گا۔ یہ مختصر مگر بہت جامع ترجمہ ہے، اور عمدہ ترین ''فوائد'' بھی اس کے ساتھ تحریر فرمائے گئے ہیں۔ اس کی تکمیل ماہ رمضان ۱۱۵۱ھ/ دسمبر ۱۷۳۸ء میں ہوئی۔

شاہ صاحب کی یہ ایک عظیم الشان خدمت ہے۔ اس برصغیر میں فہم قرآن کا دروازہ اسی ترجمے کی بدولت کھلا۔ اس کے بعد جو ترجمے ہوئے وہ سب اسی سے مستفاد ہیں۔

۲۔ الفوز الکبیر: یہ بھی فارسی زبان میں ہے اور اصول تفسیر سے متعلق نہایت مفید اور بصیرت افروز کتاب ہے۔ چار ابواب پر مشتمل ہے، ان ابواب میں علم احکام، علم مخاصمہ، علم تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ، تذکیر بالموت و مابعد الموت اور ترتیب نزول وغیرہ اہم امور سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے سبب تالیف کا ذکر شاہ صاحب ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

چوں بریں فقیر درے از فہم کتاب اللہ کشادند، خواست کہ بعضے نکات نافعہ کہ در تدبر کلام اللہ یاراں رابہ کار آید، در رسالہ مختصر مضبوط نماید۔

یعنی جب اس فقیر (ولی اللہ) پر اللہ نے قران مجید کے فہم کے دروازے وا کردیے تو دل میں یہ

❶ دیکھیے عجائب الہند ص ۲ تا ۴۔ نیز تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فقہائے ہند جلد اول۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۱۔ نیز دیکھیے فقہائے ہند جلد ۴۔

Marfat.com

خواہش پیدا ہوئی کہ چند ایسے مفید نکات بیان کر دیے جائیں جو قرآن سے متعلق تدبر وغور کے سلسلے میں لوگوں کے لیے افادے کا باعث ہو سکیں، چنانچہ اس مختصر رسالے میں وہ نکات معرض تحریر میں لائے گئے ہیں۔

الفوز الکبیر، ۱۸۹۸ء میں مطبع مجتبائی دہلی نے شائع کی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں مولانا رشید احمد انصاری نے مطبع احمدی علی گڑھ سے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا۔

۳. فتح الخبیر: عربی زبان میں قرآن مجید کے مشکل الفاظ کی تشریح اور غرائب کی شرح پر مشتمل ہے۔ کہنا چاہیے کہ قرآن کی تفسیر کا یہ نہایت مختصر مگر جامع نمونہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام سے تفسیر کے بارے میں صحیح طریقے سے جو کچھ منقول ہے، تقریباً وہ سارا مواد اس میں سمیٹ لیا گیا ہے۔

۴. مصفی: حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق کتاب ''موطا'' کی فارسی شرح ہے۔ جلد اول مطبع فاروق دہلی سے اور جلد دوم مطبع مرتضوی دہلی سے ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں طبع ہوئی تھی۔

۵. مسوی: موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی عربی شرح ہے۔ ۱۲۹۳ھ اور ۱۳۴۷ھ/۱۸۷۶ء۔ ۱۹۲۹ء میں دو دفعہ دہلی سے شائع ہوئی۔ شاہ صاحب درس حدیث کا جو طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے۔ موطا کی یہ دونوں فارسی اور عربی شرحین یعنی مصفی اور مسوی اس کا ایک نمونہ ہیں۔

۶. حجتہ اللہ البالغتہ: اسرار دین اور فلسفۂ اسلام سے متعلق یہ معرکتہ آرا کتاب ہے۔ اس کو فلسفیانہ اسلوب میں پورے اسلام کی شرح سے تعبیر کرنا چاہیے۔ ارکان دین اور اجزائے اسلام کو اس میں نہایت حکیمانہ انداز سے بیان کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اسلام ایک مکمل اور مربوط نظام حیات کا نام ہے، جس میں انسان کی دینی زندگی اور حیات اجتماعیہ کے تمام سلسلے بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ اس میں انسان کی تمدنی ترقی کے مختلف مراحل اور سیاست ملی کے مدارج کی تفصیلات سے بھی بحث کی گئی ہے اور اس کو جن اقتصادی، معاشی اور سیاسی منازل سے گزرنا پڑتا ہے، اس کی تشریح بھی دل نشین طریقے سے کی گئی ہے۔ شاہ صاحب کے فکری رجحانات کو سمجھنے اور احکام اسلام کے فلسفیانہ مزاج کو ذہن کی گرفت میں لانے کے لیے یہ کتاب بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب عربی زبان میں ہے اور کئی دفعہ شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مشمولات و مضامین کی اہمیت کے پیش نظر متعدد اہل علم نے اس کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

۷. البدور البازغہ: اس کتاب کو حجتہ البالغہ کے بعض خاص ابواب کی تلخیص کہنا چاہیے۔ سب سے پہلے اسے مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کیا تھا۔

۸. ازالۃ الخفاعن خلافۃ الخلفاء: اس کتاب میں ''خلافت راشدہ'' کو شاہ صاحب نے ''اصل دین'' قرار دیا ہے، اور اسلامی فکر کے ارتقا اور اس کے سیاسی تصورات کی تدوین میں اسے بنیاد اور اساس ٹھہرایا ہے۔ اسلام کے ''اصول عمران'' اور ''نظریہ سیاست'' کی پوری تشریح اس میں بیان کر دی گئی ہے۔ نیز بہت سے تاریخی حقائق کی نقاب کشائی کی گئی ہے اور متعدد مسائل کی زلف گرہ گیر کو سلجھایا گیا ہے۔ کتاب فارسی زبان

Marfat.com

میں ہے۔سب سے پہلے ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں مطبع صدیقی بریلی میں اشاعت پذیر ہوئی تھی۔

۹۔ قرة العینین فی تفضیل الشیخین: فارسی زبان میں یہ ایک ضخیم کتاب ہے، جس میں شاہ صاحب نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی افضلیت بیان فرمائی ہے۔

۱۰۔ الانصاف فی سبب الاختلاف: اس کتاب میں کتب احادیث کی تالیف وترتیب اور مختلف مذاہب فقہ کے نشو وارتقا کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ نیز مسائل دینی میں فقہی نہج کے جو اختلافات پیدا ہوئے، ان کے اسباب اور پس منظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ کتاب عربی زبان میں ہے اور صحابہ، تابعین، اور بعد کے ائمہ مجتہدین کے درمیان جن مسائل کے بارے میں مختلف آرا نے جنم لیا، اس کی پوری تفصیل اس میں موجود ہے۔ اصل عربی میں کتاب مع اردو ترجمے کے مولوی محمد احسن صدیقی نانوتوی نے ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع کی تھی۔

۱۱۔ عقد الجید: تقلید اور اجتہاد سے متعلق محققانہ مباحث پر محیط ہے۔

۱۲۔ تحفة الموحدین: دعوت توحید اور رد شرک میں شاہ صاحب کی یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اگرچہ مختصر ہے مگر مطالب ومعانی کے لحاظ سے نہایت جامع کتاب ہے۔ توحید خالص کی تعریف وتصریح اور اس موضوع کے طریق بیان کے لحاظ سے شاہ ولی اللہ صاحب کی ''تحفة الموحدین'' کو حضرت شاہ اسماعیل شہید کی ''تقویة الایمان'' کے متن یا اساس و بنیاد سے تعبیر کرنا چاہیے۔ بہت عرصہ پیشتر حکیم اجمل خاں دہلوی مرحوم کے بڑے بھائی حکیم حافظ عبدالمجید خاں مرحوم (بانی طبیہ کالج دہلی) کے پریس اکمل المطابع دہلی میں یہ کتاب اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اپنے موضوع اور صاف ستھرے اسلوب بیان کی وجہ سے اس کتاب نے بڑی شہرت حاصل کی۔

۱۳۔ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری: صحیح بخاری کے تراجم ابواب کی تشریح وتوضیح کے سلسلے میں یہ کتاب اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ عربی زبان میں ہے۔ ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں دائرة المعارف حیدر آباد (دکن) سے شائع ہوئی تھی۔ پھر اصح المطابع دہلی کی طرف سے جو صحیح بخاری شائع ہوئی تھی، اس کے شروع میں اس کتاب کو بطور مقدمے کے چھاپ دیا گیا۔

۱۴۔ مجموعہ رسائل اربعہ: یہ بہت چھوٹے چھوٹے چار رسائل کا مجموعہ ہے۔ ہر رسالہ فن حدیث سے متعلق ہے۔ ایک کا نام ''الارشاد الیٰ مھمات علم الاسناد'' ہے۔ اس میں ارض حجاز کے شیوخ واساتذہ کا ذکر ہے۔ دوسرے کا نام رسالہ اوائل ہے۔ تیسرا تراجم البخاری ہے۔ یہ رسالہ ''شرح تراجم ابواب صحیح البخاری'' کے علاوہ ہے اور صرف ایک ورق کا ہے۔ چوتھے رسالے کا نام مایجب حفظ للناظر ہے۔

۱۵۔ تفہیمات الھیہ: (دوجلد) اس میں عربی اور فارسی میں تصوف وسلوک اور علم شریعت سے متعلق مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں۔ بعض ذاتی کیفیات ومشاہدات بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ بعض تفہیمات عربی میں ہیں

Marfat.com

اور بعض فارسی میں۔

۱۶۔ الخیر الکثیر: یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ علم اسرار وحقائق اور تصوف کے بارے میں بلند پایہ کتاب ہے۔

۱۷۔ فیوض الحرمین: قیام حرمین کے زمانے میں جو روحانی افاضات ومشاہدات روح وقلب پر وارد ہوئے، انھیں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۱۸۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین: اس میں ''ان مبشرات'' کا ذکر ہے، جو رسول اللہ ﷺ سے خود شاہ صاحب کو یا ان کے بعض نسبی یا روحانی بزرگوں کو حاصل ہوئے۔

۱۹۔ انفاس العارفین: اس میں شاہ صاحب نے اپنے بزرگوں کے احوال وسوانح کا تذکرہ تحریر فرمایا ہے۔ کتاب بعض بیش قیمت معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور بعض ہماری سمجھ سے بالا ہیں۔

۲۰۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین: اس میں اپنے مشائخ واساتذہ حرمین مثلاً شیخ احمد شناوی، شیخ احمد قشاشی، سید محمد علوی، سید عبدالرحمٰن الادریسی، الشہیر بالمحجوب اور شمس الدین محمد وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

۲۱۔ القول الجمیل فی بیان سواء السبیل: اس میں برصغیر پاک وہند میں صوفیا کے جو سلسلے رائج ہیں، ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں یہ کتاب مولوی خرم علی نے مطبع نظامی کانپور سے شاہ عبدالعزیز دہلوی کے اردو ترجمے اور حاشیے کے ساتھ ''شفاء العلیل'' کے نام سے شائع کی تھی۔

۲۲۔ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ: یہ کتاب صوفیا کے مختلف سلسلوں کی تاریخ اور ان کی بعض تعلیمات کے مختصر تذکرے پر مشتمل ہے۔ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء میں سید ظہیر الدین عرف سید احمد نے جو حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کے نواسے تھے، اسے مع اردو ترجمے کے مطبع احمدی سے شائع کیا تھا۔

۲۳۔ الطاف القدس: اس میں تصوف کے بنیادی تصورات کو موضوع بحث ٹھہرایا ہے۔

۲۴۔ سطعات: مسائل تصوف سے متعلق ہے۔ یہ کتاب سید ظہیر الدین عرف سید احمد نے مطبع احمدی سے شائع کی تھی اور اس کی وجہ اشاعت ان الفاظ میں بیان کی تھی ''منشا دلی اس کم ترین کا یہ ہے کہ اس کے نفع سے اعانت مدرسہ کہنہ مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی جاوے اور جو عرصہ چالیس سال سے چراغ علم گل ہو گیا ہے، جس میں اولاد مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رہتی ہے از سر نو روشن کیا جاوے۔''

۲۵۔ لمعات: اس میں علم تصوف کے بعض اہم مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

۲۶۔ مکتوبات فی مناقب امام بخاری وابن تیمیہ: یہ شاہ صاحب کے چند اہم مکاتیب کا مجموعہ ہے، جن میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب وفضائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مکاتیب نذیریہ لائبریری دہلی کے مہتمم مولانا سید عبدالرؤف مرحوم نے مع اردو ترجمے کے شائع کیے تھے۔

۲۷۔ مکتوب المعارف مع مکاتیب ثلثہ: یہ شاہ صاحب کے بعض اہم مکاتیب کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے۔

Marfat.com

۲۸۔ سرور المحزون: رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک کے بارے میں ابن سید الناس کا ایک مختصر سا رسالہ نور العین ہے۔ شاہ صاحب کی یہ کتاب اس کا فارسی ترجمہ ہے، جو بعض احباب کی درخواست پر انھوں نے کیا تھا۔ یہ رسالہ اختصار کے باوجود اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتا ہے۔ اور اسی بنا پر کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ متعدد حضرات نے اس کے اردو ترجمے بھی کیے۔ ان ترجموں میں ایک ترجمہ مولا بخش چشتی نے کنز المکنون کے نام سے کیا جو مطبع ستارہ ہند دہلی میں ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۸ء میں چھپا۔ ایک ترجمہ مولانا عاشق الٰہی نے کیا، جس کا نام الذکر المکنون رکھا۔ یہ ترجمہ فتح پرنٹنگ ورکس دہلی میں شائع ہوا۔ ایک ترجمہ قرۃ العیون کے عنوان سے نواب محمد وزیر خاں کے حکم سے ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۵ء میں کیا گیا اور مطبع محمدی ٹونک سے شائع ہوا۔

۲۹۔ الجزء اللطیف: شاہ صاحب کی خود نوشت مختصر سوانح عمری۔

۳۰۔ المقالۃ الوضیہ فی النصیحۃ والوصیہ: شاہ صاحب کا یہ وصیت نامہ ہے اور ''وصیت نامہ'' کے نام سے کئی دفعہ چھپ چکا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس کی شرح لکھی تھی جو مطبع مطبع الرحمٰن شاہ جہان آبادی سے ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی۔

۳۱۔ تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء: اس میں آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیا علیہم السلام کے واقعات وقصص اس نہج سے بیان کیے ہیں کہ مختلف زمانوں میں جو شریعتیں رائج تھیں ان کے بنیادی اصول واضح ہو جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد (سندھ) نے اسے شائع کیا۔

۳۲۔ ہوامع شرح حزب البحر: یہ حزب البحر کی شرح ہے۔

۳۳۔ العقیدۃ الحسنہ: اسلام کے بنیادی عقائد اس میں صراحت سے بیان کیے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۳۴۔ چھل حدیث: چالیس احادیث جمع کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ سب سے پہلے عبداللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۵ھ) نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کے بعد بہت سے اہل علم نے مختلف مضامین کی چالیس احادیث جمع کیں، اور لوگوں نے اس سے استفادہ کیا۔ شاہ صاحب نے بھی یہ خدمت انجام دی۔ ان کی جمع کی ہوئیں چھل احادیث کئی مرتبہ چھپ چکی ہیں۔

۳۵۔ شرح رباعتین: خواجہ باقی باللہ (متوفی ۲۵ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۲ھ/ ۲۶ نومبر ۱۷۰۰ء) کی دو رباعیوں کی شرح، جس میں تصوف کے بعض اہم نکات بیان کیے گئے ہیں۔

۳۶۔ امداد فی مآثر الاجداد: یہ ایک مختصر رسالہ ہے۔ جس میں شاہ صاحب نے اپنے بعض بزرگوں کے حالات تحریر کیے ہیں۔

۳۷۔ العطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ: یہ مختصر سا رسالہ شیخ محمد پھلتی کے حالات میں ہے جو شاہ صاحب کے نانا تھے۔

Marfat.com

۳۸۔ مسلسلات: عربی میں ہے اور فن حدیث سے متعلق ہے۔

۳۹۔ رسالہ دانش مندی: فن دانش مندی کے متعلق فارسی میں ایک چھوٹا سا رسالہ۔

۴۰۔ اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم: یہ قصائد ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی مدح و توصیف فرمائی گئی ہے، آپ کی نبوت و رسالت کے بارے میں دلائل بیان کیے گئے ہیں اور آپ ﷺ کی اطاعت کو ضروری اور فرض قرار دیا گیا ہے۔

۴۱۔ نبذة الابريزيه فی الطبقة العزيزيه: اس میں اپنے ایک بزرگ شیخ عبدالعزیز دہلوی کا ترجمہ درج ہے۔ سات صفحے کا یہ رسالہ مطبع احمدی سے مجموعہ رسائل خمسہ میں شائع ہوا تھا۔

۴۲۔ بوارق الولاية: یہ رسالہ انفاس العارفین میں شامل ہے۔

۴۳۔ شفاء القلوب۔

۴۴۔ زهراوين۔

۴۵۔ المقدمة السنيه۔

۴۶۔ فتح الودود فی معرفة الجنود۔

ان کے علاوہ شاہ صاحب کی اور بھی بہت سی تصانیف تھیں جو دست برد زمانہ کی نذر ہو گئیں ہیں اور آج ان کے نام معلوم کرنا بھی ممکن نہیں۔

یوں تو یہ تمام تصانیف بہترین عنوانات پر مشتمل اور اپنے اپنے موضوع میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، لیکن ان میں حجۃ اللہ البالغہ بالخصوص انتہائی اہم کتاب ہے۔ نواب صدیق حسن خاں اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ایں کتاب اگر چہ در علم حدیث نیست، اما شرح احادیث بسیار دراں کردہ، و حکم و اسرار آں بیان نمودہ تا آں کہ در فن خود غیر مسبوق الیہ واقع شدہ و مثل آں دریں دوازدہ صد سال ہجرت از ہیچ یکے از علمائے عرب و عجم تصنیفے بوجود نیامدہ، و من جملہ تصانیف مؤلفش مرضی بودہ است، و فی الواقع بیش ازاں است کہ وصفش تواں نوشت ❶۔

یعنی یہ کتاب اگر چہ علم حدیث سے متعلق نہیں ہے، تاہم اس میں بہت سی احادیث کی شرح کر دی گئی ہے، اور ان کے فلسفے، حکمت اور اسرار کو اس انداز سے معرض بیان میں لایا گیا ہے کہ اپنے موضوع میں یہ منفرد حیثیت اختیار کر گئی ہے، اور اس سے قبل کوئی کتاب اس اسلوب سے نہیں لکھی گئی، یہاں تک کہ اسلام کے گزشتہ بارہ سو سال کے عرصے میں علمائے عرب و عجم میں سے کوئی شخص اس قسم کی کتاب تصنیف نہیں کر سکا۔ اس کے مؤلف شہیر (شاہ ولی اللہ) کی تصانیف میں یہ عمدہ ترین تصنیف

---

❶ اتحاف النبلاص ۷۱

Marfat.com

ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کتاب کے بے بہا معلومات کی وجہ سے اس کی تعریف و توصیف کو حیطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ صاحب کی مہتم بالشان کتاب ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ آغاز میں حضرت مؤلف نے ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جس میں تالیف کتاب کی اصل وجہ بیان کی ہے۔ نیز طبقات محدثین اور علم حدیث کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ مقدمہ بہترین معلومات پر محیط ہے۔

اس کتاب میں شاہ صاحب نے اسرار دین اور فلسفۂ دین کی خوب صورت انداز میں وضاحت کی ہے۔ نیز بتایا ہے کہ احکام اسلام میں کیا مصلحتیں اور حکمتیں کارفرما ہیں۔ ارکان اسلام نماز، روزہ، حج، زکوۃ کو الگ الگ ابواب میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس سلسلے کی احادیث نقل کر کے بتایا ہے کہ عقلی نقطۂ نظر سے اس میں کیا مصالح پنہاں ہیں۔ سیاست مدن، معیشت، اقتصادیات، معاملات، احسان، آداب مجلس، مکارم اخلاق، تربیت منزل، خطابت، قضا وغیرہ امور کو مناسب تفصیل کے ساتھ عمدگی سے بیان فرمایا ہے۔ غرض یہ کتاب اپنے مشمولات و مندرجات کے اعتبار سے شاہ صاحب کی تصانیف میں بہ درجہ غایت اہمیت کی حامل ہے۔ اہل حدیث، فقہائے کرام اور فقہائے حدیث کے متعلق اس کے مباحث، نہایت معلومات افزا اور لائق مطالعہ ہیں۔

حجۃ اللہ البالغہ کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شریعت اسلامی کے اسرار و حقائق کچھ اس نہج سے معرض تحریر میں لائے گئے ہیں کہ اس کتاب کا شمار علم کلام کی عظیم کتابوں میں ہونے لگا ہے۔ علم کلام کا مطلب اسلام کے بارے میں یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا گیا ہے اور بالکل صحیح اور سچا مذہب ہے۔

کتاب کی بے پناہ افادیت کی وجہ سے اس کو حضرت نواب صدیق خاں رحمۃ اللہ علیہ کے سسر مدار المہام محمد جمال الدین خاں بہادر نائب ریاست بھوپال نے شاہ صاحب کی ایک عمدہ تصنیف ازالۃ الخفاعن خلافۃ الخلفا کے ساتھ اپنے خرچ سے ۱۲۸۵ھ/۱۷۱ء میں مطبع صدیقی بریلی سے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد حجۃ اللہ البالغہ کئی دفعہ مختلف مطابع سے شائع ہوئی۔ ۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) میں اسے مکتبہ سلفیہ، لاہور نے خوب صورت کاغذ و طباعت کے ساتھ شائع کیا۔

شاہ صاحب کی تصانیف کا یہ مجمل سا تعارف تھا۔ اب ان کی چیدہ چیدہ خدمات علمی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

خدمت قرآن مجید:

شاہ صاحب کی عظیم الشان خدمات دینیہ میں سب سے نمایاں اور رفیع المرتبت خدمت قران مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب کے زمانے میں برصغیر کی دفتری زبان فارسی تھی اور مدارس میں زیادہ تر اسی زبان

Marfat.com

کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن قرآن مجید کا فارسی زبان میں کوئی ترجمہ متداول نہ تھا۔ اس سے قبل بلاشبہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے سلاطین جون پور کے ابتدائی عہد میں ''بحر مواج'' کے نام سے قرآن مجید کی ایک تفسیر سپرد قلم کی تھی، اس تفسیر میں ہر آیت کی تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ بھی درج تھا، لیکن یہ پورے قرآن کا ترجمہ نہ تھا، قرآن کے بعض حصوں کا ترجمہ تھا، اسی لیے اسے شہرت وقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ شیخ سعدی کی طرف بھی ایک فارسی ترجمہ منسوب کیا جاتا ہے اور وہ دست یاب بھی ہے لیکن شیخ ممدوح کی طرف اس کی نسبت بہر حال مشکوک ہے۔ ویسے بھی یہ ترجمہ اہل علم میں کبھی مروّج نہیں ہوا۔

شاہ ولی اللہ اس برصغیر کے پہلے عالم ہیں، جنھوں نے قرآن مجید کے فارسی ترجمے کی سنجیدگی سے ضرورت محسوس کی اور پھر شروع سے آخر تک پورے قرآن پاک کا ترجمہ کر ڈالا۔ اس سے قبل قرآن مجید کو حفظ کرنے کا رواج تو ضرور تھا اور اس کی تفسیریں بھی موجود تھیں لیکن اس کے الفاظ کے معانی ومفہوم کو سمجھنے کے لیے سرزمین ہند کے کسی عالم کے پاس کوئی باقاعدہ ترجمہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے علما اس کی پاکیزہ تعلیمات سے یکسر محروم تھے۔ قرآن کے کسی حصے پر کوئی غیر مسلم اعتراض کرتا تو ترجمے سے ناواقفیت کی بنا پر اس کا جواب دینا اور اسے مطمئن کرنا مشکل تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کے دربار میں جب مسلمان علمائے دین اور پرتگیزی پادریوں کے درمیان اسلام اور قرآن سے متعلق مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا تو ان پادریوں نے جو قرآن کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے مضامین ومحتویات سے اچھی طرح واقف تھے، اس کے بعض مقامات کو اعتراض وتنقید کا ہدف ٹھہرایا۔ اس وقت اس راز سے پردہ اٹھا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا، وہ بھی اس کے مضامین ومشمولات کے بہت سے پہلوؤں سے پوری طرح واقفیت نہ رکھتے تھے۔ دوران بحث بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ پادری قرآن مجید کے کسی واقعہ یا مضمون پر معترض ہوتے، اور مسلمان کم علمی کی بنا پر اس کا جواب نہ دے پاتے تو فوراً کہہ دیتے کہ یہ بات تو قرآن میں سرے سے موجود ہی نہیں، لیکن جب قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جاتا تو وہ واقعہ قرآن میں موجود ہوتا۔

بہر کیف شاہ صاحب نے قرآن مجید کے ترجمے کی ضرورت کو بے حد شدت سے محسوس کیا، اور واقعات کے تسلسل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا احساس انھیں حجاز مقدس کے زمانۂ قیام میں ہوا۔ وہاں کے علمائے تفسیر وحدیث کے اثر صحبت سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ اس ملک کے مسلمانوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ چنانچہ حجاز سے واپس دہلی تشریف لانے کے بعد رمضان المبارک ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۷ یا ۱۷۳۸ء) میں اس کی تکمیل فرمائی۔

تکمیل ترجمے کے بعد شاہ صاحب کو ایک نئی مشکل کا سامنا کرنا پڑا، وہ تھی علمائے وقت کی مخالفت۔ علما کو جب پتا چلا کہ شاہ صاحب نے قرآن کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے تو شدید مخالفت شروع کر دی، بلکہ دشمنی

Marfat.com

پر اتر آئے اور کلام الٰہی کے معانی کو کسی دوسری زبان میں بیان کرنا ان کے نزدیک قرآن کی توہین اور بے ادبی قرار پایا۔ یہ ہنگامہ یہاں تک بڑھا کہ شاہ صاحب کی زندگی خطرے میں پڑ گئی اور انھیں کچھ عرصے کے لیے دہلی کی سکونت ترک کر کے کسی دوسری جگہ جانے پر مجبور ہونا پڑا۔ بالآخر شاہ صاحب نے جرأت سے کام لے کر یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرا دی کہ قرآن مجید کا مقصد محض یہی نہیں کہ حصول برکت کے لیے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر اسے گھروں میں رکھ لیا جائے، یا اس کی آیات سے بیماروں پر دم کر دیا جائے۔ یہ تو انسانی زندگی کے لیے ایک لائحہ عمل مہیا کرتا اور لوگوں کو عظیم الشان دستور حیات سے نوازتا ہے۔ دینی اور دنیوی زندگی میں کامیابی کے تمام راز اس میں مضمر ہیں۔ اگر اس کے معانی و مطالب کو اچھی طرح سمجھ کر اس کی تلاوت کی جائے تو انسانی فلاح و بہبود کے دروازے ایک ایک کر کے وا ہو جاتے ہیں، لیکن اس کی صورت یہی ہے کہ جو زبانیں ملک میں رائج ہوں، ان زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے اس انداز تفہیم سے مخالفت کا زور کم ہوا، اور پھر ان کے فارسی ترجمے کی بھی خوب اشاعت ہوئی اور اردو اور دوسری زبانوں کے تراجم کے لیے بھی راہ ہموار ہو گئی۔

شاہ صاحب کے ترجمے پر تین سو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس اثنا میں بے شمار اہل علم نے قرآن کے ترجمے کیے، یہاں تک کہ بعض حضرات نے علاقائی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ کیا، لیکن اس کی اولیت کا سہرا شاہ ولی اللہ کے سر ہی بندھے گا۔ وہ پہلے عالم ہیں، جن کے ترجمے نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور لوگوں کی وسیع تعداد نے اس سے استفادہ کیا۔ اب بھی حوالے کے لیے اسی ترجمے کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب ان تمام اوصاف سے متصف اور ان تمام خصوصیات سے مالا مال تھے، جن سے قرآن کے مترجم کو ہونا چاہیے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں وہ اوصاف و خصائص جمع نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ڈپٹی نذیر احمد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار تھیں، ترجمے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ میں علی وجہ الکمال پائی جاتی تھیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحب کی نظر تفاسیر، احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہی کا حصہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں۔ وہ سب ان کے پیش نظر ہیں، اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں، اسے اختیار کرتے ہیں[1]۔

شاہ صاحب نے قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا اور اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا، جس میں اس اہم موضوع کے بعض بنیادی گوشوں کی وضاحت کی اور بعد میں آنے والے مترجمین قرآن کے لیے رہنما اصول متعین کیے۔ علاوہ ازیں علم تفسیر کے متعلق انھوں نے "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" کے نام سے

[1] رود کوثر ص ۵۵۳، ۵۵۴۔

Marfat.com

عظیم الشان کتاب تصنیف کی۔ علوم قرآن اور فہم قرآن کے لیے یہ کتاب اولین اہمیت کی حامل ہے اور اہل علم کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

شاہ صاحب نے ''وصیت نامہ'' میں بھی قرآن مجید کے بارے میں بعض باتیں بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ پہلے قران کا لفظی ترجمہ پڑھنا چاہیے، تفسیر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ترجمہ مکمل کرنے کے بعد تفسیر پڑھی جائے۔ استاد کو چاہیے کہ طویل مباحث والی تفسیروں کے بجائے تفسیر جلالین پڑھائے اور اسی قدر پڑھائے، جتنی کہ درس میں داخل ہے۔ آیات کی شان نزول اور نحو کے مشکل مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا جائے، تاکہ طالب علم بات کی تہہ تک پہنچ جائے اور قرآن اور اس کے ضروری مطالب کو سمجھنے میں دقت پیدا نہ ہو۔

حدیث کی خدمت:

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے زمانے میں حدیث رسول اکرم ﷺ کی بھی بے حد خدمت کی۔ انھوں نے حجاز مقدس میں جید اور مشہور اساتذہ سے پہلے خود حدیث پڑھی اور اس کے متعلقہ علوم پر عبور حاصل کیا۔ اس کے بعد واپس ہندوستان تشریف لائے تو اس بنیادی علم کو مزید مرکز التفات ٹھہرایا۔ شاہ صاحب سے قبل برصغیر کے مدارس دینیہ میں حدیث کی زیادہ ترویج نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور بعض دیگر علمائے کرام نے حدیث کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی اور بعض اہم کتابوں کی شرحیں سپرد قلم کیں، تاہم اس علم کی مزید خدمت کی سخت ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے حدیث کے فروغ واشاعت کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرایا اور ان علما وطلبا کو جو منطق وفلسفہ، صرف ونحو اور فقہ کی کتابوں پر زیادہ زور دیتے تھے، علم حدیث کے حصول کی ترغیب دی۔ باشندگان ہند کے ذہن میں انھوں نے اس حقیقت کو راسخ کرنے کی کوشش کی کہ علم حدیث کی تعلیم ہمارے فرائض میں داخل ہے، جب تک اس علم کی تحصیل نہیں کی جائے گی، معرفت وادراک میں درجہ کمال تک رسائی نہیں ہو سکے گی۔

حدیث کی نشر واشاعت کے لیے شاہ صاحب نے تحریری خدمت بھی انجام دی اور تدریسی بھی۔ تحریری خدمت یہ ہے کہ موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ موطا امام مالک حدیث کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ اس کی ترتیب اور اسلوب سے شاہ صاحب بے حد متاثر تھے اور اس کی بہت تعریف فرماتے تھے۔ ''وصیت نامہ'' میں لکھتے ہیں کہ طالب علم میں جب عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے تو اسے موطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی پڑھنا چاہیے۔ موطا کو ہرگز ترک نہ کیا جائے، کیونکہ یہ علم حدیث کی اساس اور اصل ہے۔ اس کے پڑھنے سے بے شمار علمی فیوض حاصل ہوتے ہیں۔ بعض حیثیتوں سے شاہ صاحب موطا کو صحیح بخاری پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس اہم کتاب کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک فارسی میں اور دوسری عربی میں۔ فارسی شرح کو "المسویٰ" کے نام سے موسوم کیا اور عربی شرح کا نام "المصفّٰی" رکھا۔ یعنی شاہ

Marfat.com

صاحب نے ان دونوں زبانوں میں جو ان کے عہد میں اظہار خیال کا ذریعہ تھیں، موطا کی شرحیں قلم بند کیں۔ اس سے ان کا مقصد ہر قسم کے اہل علم میں موطا کو متعارف کرانا اور اس کے مطالب کو عام کرنا تھا۔

مسوّیٰ اور مصفّٰی کے علاوہ انھوں نے شرح تراجم ابواب صحیح البخاری کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جو صحیح بخاری کے تراجم ابواب کی تشریح پر مشتمل ہے۔ پھر حجۃ اللہ البالغہ تحریر فرمائی، جو اسرار شریعت اور فلسفہ احکام سے متعلق ایک ضخیم اور مشہور ترین کتاب ہے۔ اس کے مضامین و محتویات کا زیادہ تر حصہ احادیث پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب علم حدیث میں بے حد عمق اور درک رکھتے تھے۔

عوام میں اشاعت حدیث کے لیے بھی انھوں نے مختصر مگر بعض اہم کتابیں لکھیں، جن میں چہل حدیث، النوادر من الحدیث اور الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

بہر حال شاہ صاحب نے حدیث اور اس کے متعلقات کے بارے میں بہترین خدمت انجام دی اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے بے حد کوششیں کیں چنانچہ برصغیر میں حدیث اور علوم حدیث کا آج جو چرچا ہے، اس میں شاہ صاحب اور ان کے اخلاف کا بہت بڑا حصہ ہے۔

علم فقہ:

شاہ ولی اللہ، یوں تو علم فقہ اور مسائل فقہ میں کامل مہارت رکھتے تھے اور اس کی تفصیلات اور جزئیات سے پوری طرح آگاہ تھے، لیکن ان کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم فقہ سے انھیں زیادہ دلچسپی یا اور لگاؤ نہ تھا۔ اس موضوع سے متعلق نہ انھوں نے کوئی خاص اور قابل ذکر کتابیں لکھیں اور نہ بہت زیادہ فتوے تحریر کیے۔ البتہ اس علم کے صحت مندانہ اصولوں سے علما کو متعارف ضرور کرایا اور جن حالات میں اس علم کی تدوین عمل میں آئی اور عہد بہ عہد اس نے ارتقا کی جو منزلیں طے کیں اسے واضح کیا۔ اس سلسلے میں ان کی تصنیف ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' بڑی اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے اور ایک رسالے کی حیثیت رکھتی ہے تاہم تاریخ فقہ اور تاریخ علم حدیث میں نہایت معلومات افزا ہے۔ اسلام کے عہد آغاز سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک تدوین فقہ، کتب احادیث کی تیاری اور مختلف مذاہب فقہ کے آغاز اور ان کے ضروری کوائف کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں حضرت مصنف نے وہ تمام بنیادی مسائل وضاحت اور پورے اعتدال کے ساتھ بیان کیے ہیں، جو علما کے نزدیک مختلف فیہ ہیں۔ پھر اختلاف کے وجوہ و اسباب پر محققانہ اسلوب میں روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں اہل سنت کے مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مسالک فقہی کی خصوصیات اور ان کی تدوین و تشکیل کا پس منظر بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب نے احادیث کی جمع و تدوین اور اصحاب حدیث کی مختلف کتابوں مثلاً صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد کی خصوصیات و امتیازات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اجتہاد اور تقلید کے اہم مسئلے کو بھی موضوع بحث ٹھہرایا

Marfat.com

ہے اور ان وجوہ کی صراحت کی ہے جو تقلید کی ترویج کا باعث بنے۔ تقلید کے متعلق متاخرین کے گروہ نے جس غلو سے کام لیا ہے، شاہ صاحب نے اس کا بھی ذکر فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ بعد کے لوگوں نے محض تقلید کو کافی سمجھ لیا اور اسی پر جم کر بیٹھ گئے۔ اجتہاد کے دروازے بند کر لیے اور تحقیق سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ نہ حق کو باطل سے الگ کرنے کی زحمت گوارا کی اور نہ جدل کو استنباط سے ممتاز کرنے پر توجہ مبذول کی۔ ان کے نزدیک فقیہ وہی کہلاتا تھا جو بہت زیادہ باتیں کرنے کا عادی ہو، اور جس نے فقہائے متقدمین کے قوی و ضعیف اقوال میں امتیاز کیے بغیر بیان و اظہار کو اپنا شیوہ بنا لیا ہو۔ ان کے نقطہ نظر سے محدث وہ تھا جو صحیح و ضعیف حدیثوں کو شمار کرتا اور انھیں بلا سوچے سمجھے بیان کرتا پھرے۔ اس کے بعد ایسا دور آیا کہ لوگ مزید فتنے میں مبتلا ہو گئے اور تقلید میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ دلوں سے دیانت داری کا بالکل خاتمہ ہو گیا اور دین کے معاملے میں غور و فکر سے منہ موڑ لیا۔ انھوں نے اس قسم کی باتیں کرنا شروع کر دیں کہ ہم اسی روش پر چلیں گے جو ہمارے آبا و اجداد کی تھی اور اسی دین پر کاربند رہیں گے جو ہمارے بڑوں کا تھا۔ ہمارا کام فقط ان کے نقوش قدم کی پیروی کرنا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں علم فقہ باقاعدہ مدوّن اور مرتب شکل میں نہ تھا، نہ اس کی یہ تعریف کی جاتی تھی جو بعد میں کی جانے لگی۔ نہ اس زمانے میں احکام فقہ پر اس اسلوب سے بحث کی جاتی تھی جس طرح ہمارے زمانے کے فقہا میں کی جاتی ہے۔ اب یہ حالت ہے کہ فقہا، احکام دین میں سے ہر حکم کے الگ الگ ارکان، شرائط اور آداب کو دلائل سے ثابت کرتے اور معرض بیان میں لاتے ہیں۔ وہ مسائل شرعیہ کی مختلف صورتیں متعین اور فرض کر لیتے ہیں۔ پھر ان بیرونی فرضی صورتوں کو باقاعدہ موضوع بحث ٹھہراتے ہیں۔ اس سلسلے کو بعض اوقات وہ بہت دور تک پھیلا دیتے ہیں۔ عہد رسالت میں ایسا قطعاً نہ ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ آپ وضو فرماتے اور صحابہ کرام آپ کو وضو کرتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ چنانچہ وہ اسی طرح وضو کرتے، جس طرح آنحضرت ﷺ کو دیکھتے۔ ایسا نہ ہوتا کہ آنحضرت ﷺ، یہ بتاتے کہ یہ چیز وضو کا رکن ہے، یہ آداب وضو میں سے ایک ادب ہے اور یہ شرائط وضو ہیں۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نماز پڑھتے اور صحابہ آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے، چنانچہ اسی طرح نماز پڑھتے، جس طرح آپ نے نماز پڑھی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے حج کیا، اور صحابہ نے آپ کو مناسک حج ادا کرتے ہوئے دیکھا، چنانچہ انھوں نے بھی اسی طرح حج کیا جس طرح آنحضرت ﷺ نے کیا تھا۔

غرض عام طور پر آنحضرت ﷺ کا یہی معمول تھا۔ آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ وضو کے فرض چھ ہیں یا چار۔ نہ کبھی یہ فرض کیا کہ ہو سکتا ہے کوئی شخص اس طرح وضو کرے کہ اعضائے وضو پر برابر پانی نہ ڈالے، جس کی وجہ سے وضو کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا حکم لگایا جا سکے۔ ان امور کے بارے میں صحابہ کرام آپ ﷺ سے بہت ہی کم سوال کرتے تھے۔

Marfat.com

اس موقع پر شاہ صاحب نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سوال کرنے اور مسائل دریافت کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ انھوں نے آپ کی رحلت تک آپ سے صرف تیرہ سوال پوچھے، جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ ان تیرہ سوالوں میں سے ایک یہ ہے۔

یسئلونك عن الشهر الحرام قتال فيه۔ (البقرہ: ۲۱۷)

(یہ لوگ آپ سے، اے نبی! حرمت کے مہینوں میں لڑائی کی بابت پوچھتے ہیں۔)

دوسرا سوال ہے۔ یسئلونك عن المحيض۔ (البقرہ: ۲۲۲)

(اے پیغمبر!) آپ سے یہ لوگ حیض کے متعلق احکام کے سلسلے میں دریافت کرتے ہیں۔)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، صحابہ کرام، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی بات پوچھتے تھے، جو ان کے لیے دینی لحاظ سے مفید ہوتی تھی۔

اس کے بعد صحابہ کرام مختلف شہروں اور ملکوں میں پھیل گئے، اور حالات بدلے تو بہ کثرت واقعات رونما ہوئے، جن کی وجہ سے نئے نئے مسائل سامنے آئے۔ اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں مسائل میں مزید اضافہ ہوا، اور پہلے سے زیادہ باتیں معرض ظہور میں آئیں۔ اس طرح مسائل کے حل وکشود کے لیے فقہی مذاہب وجود میں آئے اور پیش آئند معاملات سے نمٹنے کے لیے نئی نئی شکلوں نے جنم لیا۔

شاہ ولی اللہ نے اس طرح فقہ کی نشو ونما اور فقہی مسائل کے عالم وجود میں آنے کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ حقیقت یہ ہے یہ کہ تمام بحث نہایت دلچسپ اور پراز معلومات ہے۔

اجتہاد اور تقلید:

شاہ صاحب نے اجتہاد اور تقلید کو بھی ہدف بحث بنایا ہے اور اس موضوع سے متعلق ان کی تصانیف میں سے "عقد الجيد في احكام الاجتهاد و التقليد" لائق مطالعہ تصنیف ہے۔ شاہ صاحب اپنی اس کتاب میں اجتہاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ علما کے مباحث اور نقطہ نظر سے اجتہاد کی جو تعریف فہم کی گرفت میں آتی ہے، وہ ہے، شریعت کے فروعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے دریافت کرنے اور سمجھنے کی پوری پوری کوشش کرنا۔ ان تفصیلی دلائل کا تمام تر مرجع چار چیزیں ہیں۔

(۱) قرآن مجید۔ (۲) سنت نبوی۔ (۳) اجماع اور (۴) قیاس۔

شاہ صاحب نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ اجتہاد کے لیے کیا شرائط ہیں اور مجتہد کون ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اجتہاد کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن وسنت کے ان مسائل سے معرفت و ادراک رکھتا ہو، جن کا تعلق احکام سے ہے۔ پھر وہ مواقع اجماع، شرائط، قیاس، کیفیت نظر ❶ عربی زبان، ناسخ

❶ مقدمات قیاس کو اس طرح مرتب کرنا کہ ان سے صحیح نتیجہ حاصل ہو سکے، نظر کہلاتا ہے۔

Marfat.com

ومنسوخ اور راویوں کے حالات کا عالم ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں، اجتہاد کے لیے علم کلام اور فقہ کی ضرورت نہیں، لیکن امام غزالی کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں فقہ کی مشق وممارست سے اجتہاد کی استعداد حاصل ہوتی ہے، اور اس دور میں مسائل کو صحیح طور سے سمجھنے کا یہی طریقہ ہے، البتہ صحابہ کے زمانے میں اس کی ضرورت نہ تھی۔

امام بغوی کے نزدیک مجتہد وہ ہوسکتا ہے، جو ان پانچ اقسام علم پر حاوی ہو۔

(۱) قرآن مجید کا علم۔

(۲) سنت رسول اللہ ﷺ کا علم۔

(۳) علمائے سلف کے اقوال کا علم، ان اقوال کا علم جن پر ان کا اجماع تھا، اور ان کا بھی جن میں وہ اختلاف رائے رکھتے تھے۔

(۴) لغت عربی کا علم اور

(۵) قیاس کا علم۔! ''قیاس'' کہتے ہیں، کتاب وسنت سے استنباط حکم کو، جب کہ پیش نظر مسئلے کا حکم نہ تو صراحتاً کتاب وسنت میں ہو، اور نہ اجماع میں۔!!

شاہ صاحب بلاشبہ اجتہاد کے قائل ہیں، لیکن ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت نہیں دیتے۔ جس عالم میں وہ شرائط پائی جائیں جو مذکورہ بالا سطور میں بیان کی گئی ہیں اور ہمارے اسلاف سے ثابت ہیں، اس کو وہ یقیناً اجتہاد کی اجازت دیتے ہیں۔

اسی طرح تقلید کے بارے میں بھی ان کا نقطہ نظر اعتدال پر مبنی ہے۔ اس ضمن میں ان کا مسلک یہ ہے کہ جو شخص کتاب وسنت کے احکام پر نظر رکھتا ہو، مسائل کی تحقیق کر سکتا ہو، اور صحیح وغیر صحیح میں امتیاز پر قادر ہو، اسے تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ اس کا فرض ہے کہ براہ راست قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرے اور اپنے علم و تحقیق کی روشنی میں نصوص شرعیہ پر نگاہ ڈالے۔ پھر انہی امور پر عمل پیرا ہو، جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں۔ لیکن جو شخص علم وفضل سے آراستہ نہیں، عام لوگوں کی صف میں شامل ہے، اس کے لیے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کیے بغیر چارہ نہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید'' کے آخر میں قرآن مجید کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں۔

﴿فَسْئَلُوْ اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

(اگر تم خود علم نہیں رکھتے تو اصحاب علم سے پوچھ لو۔)

شاہ صاحب نے اجتہاد وتقلید اور اس کے حدود پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ شیخ عبدالوہاب شعرانی کی تصنیف الیواقیت والجواہر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کہا کرتے تھے کہ جو شخص کسی مسئلے میں میری پیش کردہ دلیل سے آگاہ نہیں، اسے محض میرے کلام کی بنیاد پر فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا یہ معمول تھا کہ جب وہ فتویٰ دیتے تو اس پر تحریر فرماتے کہ یہ نعمان بن ثابت کی رائے ہے، اور

Marfat.com

جتنی میں استطاعت رکھتا تھا، اس کے مطابق یہ بہترین رائے ہے، جو شخص اس سے بہتر رائے پیش کرے، وہ صواب کی راہ ہے۔ امام مالک کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص ایسا نہیں جو اپنی بات میں قابل گرفت نہ ہو، اور اس کی بات اسی کی طرف لوٹائی نہ جائے، سوائے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے۔

شاہ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ امام حاکم اور امام بیہقی نقل کرتے ہیں کہ امام شافعی کہا کرتے تھے کہ جب کوئی مسئلہ آنحضرت ﷺ کی حدیث سے ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ ان کا یہ بھی قول ہے کہ اگر تم میری بات کو حدیث کے خلاف پاؤ تو حدیث پر عمل کرو اور میری بات کو دیوار پر دے مارو۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے ارشاد پر کسی کو کلام کرنے کا حق نہیں۔ انھوں نے ایک شخص سے یہ بھی فرمایا کہ نہ تم میری تقلید کرو، نہ مالک کی، نہ اوزاعی کی، نہ نخعی کی، اور نہ کسی اور کی۔ تم وہیں سے احکام اخذ کرو، جہاں سے ان لوگوں نے اخذ کیے تھے۔ یعنی کتاب وسنت سے۔!

شاہ ولی اللہ اس مجتہد کے اجتہاد کے قائل تھے جو ان اوصاف سے متصف ہو، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ جو لوگ مسائل شرعیہ میں خود تحقیق کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں، انھیں وہ تقلید کی اجازت نہیں دیتے۔ تقلید میں غلو اور حد سے تجاوز کرنے کے بھی وہ شدید مخالف تھے۔ اس ضمن میں وہ اعتدال کے حامی تھے اور صرف عوام کے لیے تقلید کی حمایت کرتے تھے۔ تقلید کی ایک قسم کو تو شاہ صاحب قطعاً حرام قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تقلید کی یہ وہ قسم ہے، جس میں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر مقلد ہر صورت میں صراحتاً حدیث رسول کریم ﷺ پر اپنے مفتیوں اور فقیہوں کے اقوال کو ترجیح دے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تقلید حرام کی صورت یہ ہے کہ کسی فقیہ کے بارے میں یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ علم و ادراک میں انتہا درجے کو پہنچ گیا ہے۔ اس سے غلطی اور خطا کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے مقلد کو اگر ایسی کوئی صحیح اور واضح حدیث سنائی جائے جو اس کے فقیہ کے قول کے مخالف ہو تو وہ فقیہ کے قول کو ترک نہیں کرتا۔

مسلکی نقطۂ نظر:

فروعی مسائل اور ان امور میں جو اہل حدیث اور احناف کے درمیان مختلف فیہ ہیں۔ شاہ صاحب کا نقطۂ نظر بڑے اعتدال و توازن پر مبنی تھا۔ تشدد اور غلو سے ان کو نفرت تھی۔ جو بات قرآن و حدیث کی میزان میں پوری اترتی، اسی پر عمل کرتے اور تحریر و تقریر میں اسی کا اظہار فرماتے۔ اگر کوئی شخص مسئلہ دریافت کرتا تو اسی کے مطابق جواب دیتے۔ انھوں نے ائمہ حدیث کی فقہ یا فقہ الحدیث کے کچھ بنیادی اصول مقرر کیے ہیں، جن کا اپنی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں ذکر فرمایا ہے۔ وہ اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اگر قرآن مجید میں کوئی حکم صراحت سے موجود ہو، تو اہل حدیث کے نزدیک اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ کسی دوسری طرف التفات کی ضرورت نہیں۔

Marfat.com

۲۔ اگر حکم قرآنی حکم میں تاویل کی گنجائش ہو اور مختلف مفہوم پیدا ہونے کا احتمال ہو تو اس صورت میں سنت کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ قرآن کے اسی مفہوم کو صحیح سمجھا جائے گا جس کی تائید سنت سے ہوتی ہو۔

۳۔ اگر قرآن کسی حکم کے بارے میں خاموش ہو تو عمل سنت پر ہوگا، اگرچہ وہ سنت تمام فقہا میں متعارف اور معلوم ہو، یا کسی خاص شہر، علاقے اور خاندان سے مروی ہو، کسی نے اس کو معمول بہا ٹھہرایا ہو، یا نہ ٹھہرایا ہو۔ ائمہ حدیث کے نزدیک وہ بہر حال قابل حجت اور لائق استناد قرار پائے گی۔

۴۔ اگر کسی مسئلے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث مل جائے تو اس کے مقابلے میں کسی مجتہد اور امام کے قول کو کوئی اہمیت نہ دی جائے گی، نہ کوئی اثر قابل توجہ ہوگا۔

۵۔ اگر پوری کوشش کے باوجود کسی مسئلے کی تہ تک پہنچنے کے لیے کوئی حدیث نہ ملے تو صحابہ کرام کے ارشادات اور تابعین کے اقوال کو لائق عمل ٹھہرایا جائے گا، اور اس میں کسی شہر، علاقے یا خاندان کی قید یا تخصیص نہیں ہوگی۔

۶۔ اگر جمہور فقہا کسی معاملے میں متفق ہوں تو اسے عمل کے لیے کافی قرار دیا جائے گا۔

۷۔ اگر فقہا کے درمیان اختلاف ہو، تو ان فقہا سے مروی حدیث قبول کی جائے گی جو تقویٰ اور ضبط میں زیادہ اچھی شہرت کے مالک ہوں، یا پھر اس روایت کو قابل قبول سمجھا جائے گا جو زیادہ مشہور ہو۔

۸۔ اگر علم و فضل، ورع و تقویٰ اور ضبط و حفظ میں سب ایک سے ہوں اور زیر بحث مسئلے میں متعدد اقوال منقول ہوں، تو جس امام کے قول پر مناسب سمجھیں، عمل کیا جائے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۹۔ اگر اس میں بھی اطمینان بخش کامیابی نہ ہو تو قرآن و سنت کے عمومی اقتضا اور ارشادات پر عمل کیا جائے گا اور مسئلہ زیر بحث کے نظائر کو دیکھا جائے گا۔ پھر اس کی روشنی میں حکم کا استخراج کیا جائے گا۔ اس میں اصول فقہ کے مروج و مشہور قواعد پر اعتماد نہ کیا جائے گا۔ بلکہ اطمینان قلب اور ضمیر کے سکون کو قابل اعتماد گردانا جائے گا۔

اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ شاہ ولی اللہ تقلید سے وابستگی کے زیادہ قائل نہیں ہیں اور مسائل میں کتاب و سنت کو ہر حال میں مقدم رکھنے کے سختی سے حامی ہیں۔ ائمہ سلف کے عمل و قول کا درجہ ان کے نزدیک بہت بعد میں آتا ہے۔ وہ حتی الامکان شخصی آرا و افکار اور تقلید کے جمود و تقید سے ذہنوں کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

اہل سنت کو شاہ صاحب دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک فریق کو وہ اہل الحدیث کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ایک کو اہل الرائے کے نام سے۔ یوں تو دونوں فریقوں کے نہج و اسلوب کو وہ صحیح سمجھتے ہیں لیکن فقہائے اہل حدیث کے طریق عمل کو زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غلو خواہ کسی طرف سے ہو، اس کے وہ سخت مخالف ہیں۔ مسائل میں تعصب اور حد اعتدال سے تجاوز کو وہ قطعاً برداشت نہیں کرتے۔ لکھتے ہیں:

باید دانست کہ سلف در استنباط مسائل و فتاویٰ در دو وجہ بودند۔ یکے آں کہ قرآن و حدیث و آثار صحابہ

Marfat.com

جمع می کردند واز آنجا استنباط می نمودند دریں طریقہ اصل راہ محدثین است۔ او دیگر آں کہ قواعد کلیہ کہ جمع از ائمہ تنقیح وتہذیب آں کرادہ اند یاد گیرند بے ملاحظہ ماخذ آنہا۔ پس ہر مسئلہ کہ وارد می شد جواب آں از ہمہ قواعد طلب می کردند، وایں طریقہ اصل راہ فقہا است، وغالب بر بعض سلف طریقہ اولیٰ بود، وبر بعض آخر، طریقہ ثانیہ ❶۔

یعنی یاد رکھنا چاہیے کہ سلف میں فتاویٰ ومسائل میں استنباط کے دو طریقے مروج تھے۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ قرآن وحدیث اور آثار صحابہ جمع کرتے تھے، اور انھیں اصل قرار دے کر ان کی روشنی میں پیش آئند مسائل پر غور کرتے تھے۔ یہ محدثین کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ائمہ کے منقح ومہذب کیے ہوئے قواعد کلیہ کو اصل قرار دیا جائے اور انہی سے پیش آئند مسائل کا حل تلاش کیا جائے، اور اصل ماخذ کو لائق اعتنا قرار دینے کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ یہ فقہا کا طریق عمل ہے۔ سلف کا ایک کثیر طبقہ پہلے طریقے کا پابند ہے اور ایک طبقہ دوسرے طریق عمل کا۔

یہاں شاہ صاحب نے دونوں فریقوں کے الگ الگ طریق عمل کا ذکر کر دیا ہے، کسی کو تنقید کا ہدف نہیں بنایا۔ یہ ان کی میانہ روی اور اقتصاد واعتدال کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ اصحاب الحدیث اور محدثین کے طریق عمل کو دوسرے طریق عمل پر ترجیح دیتے ہیں۔

وصیت نامے میں بھی کتاب وسنت کی پیروی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ قابل ملاحظہ ہیں۔

وصیت اول، ایں فقیر چنگ زدن است بکتاب وسنت در اعتقاد وعمل وپیوستہ بتدبر ہر دو مشغول شدن وہر روز حصہ از ہر دو خواندن، واگر طاقت خواندن نہ دارد ترجمہ ورقے از ہر دو شنیدن، ودر عقائد مذہب قدمائے اہل سنت اختیار کردن واز تفصیل وتفتیش آنچہ سلف تفتیش نہ کردند، اعراض نمودن وبہ تشکیکات معقولیان خام التفات نہ کردن، ودر فروع پیروی علمائے محدثین کہ جامع باشند میان فقہ وحدیث کردن، ودائماً تفریعات فقہیہ را بر کتاب وسنت عرض نمودن، آنچہ موافق، باشد در حیز قبول آوردن، والا ''کالائے بد بریش خاوند'' دادن، امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب وسنت استغنا حاصل نیست، وسخن متقشفۂ فقہا کہ تقلید عالمے را دستاویز ساختہ تتبع سنت را ترک کردہ اند نشنیدن وبدیشاں التفات نہ کردن، وقربت خدا جستن بہ دوری ایناں۔

یعنی اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل دونوں میں کتاب وسنت (قرآن وحدیث) کو نہایت مضبوطی سے پکڑا جائے۔ اور برابر ان کے تدبر میں مشغول رہا جائے اور اگر عربی نہ جاننے کی وجہ سے خود نہ پڑھ سکتا ہو تو کسی دوسرے سے دونوں کا کم از کم ایک ورق ترجمہ ہی سن لیا کرے اور عقائد میں قدمائے اہل سنت کا مسلک اختیار کیا جائے اور اسلاف کرام نے جس چیز کی کھود کرید نہیں کی، اس کے پیچھے نہ پڑا جائے۔ اور ''معقولیان خام'' جو شبہات پیدا کرتے ہیں ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی جائے اور فروع فقہ میں ان علمائے محدثین کی پیروی کی جائے جو حدیث وفقہ کے جامع ہوں اور فقہی تخریجات کو لازماً ہمیشہ کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ جو بات اس کے مطابق ہو اسے قبول کر لیا جائے، ورنہ ''کالائے بد بریش خاوند'' والا معاملہ کیا

❶ مصفیٰ ج ا ص ۴۔

Marfat.com

جائے۔ اور یہ یاد رکھا جائے کہ امت کسی وقت بھی ''مجتہدات فقہا'' کو کتاب وسنت کی بنیاد پر جانچنے سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتی اور وہ متقشف فقہا جو کسی عالم کی بات کو دستاویز قرار دے کر سنت کے تتبع سے بے پروا ہو گئے ہیں، ان کی بات تک نہ سنی جائے اور نہ انھیں قابل التفات گردانا جائے، بلکہ ان سے دور رہ کر اللہ کی خوش نودی اور اس کا قرب حاصل کیا جائے۔

شاہ صاحب کسی ایک ہی امام یا مجتہد کے مقلد نہ تھے، بلکہ جو بات حدیث سے ہم آہنگ ہوتی، اس پر عمل کرتے۔ اس سلسلے میں وہ احناف یا شوافع میں کسی امتیاز کے پابند نہ تھے۔ چنانچہ تفہیمات میں تحریر فرماتے ہیں:

> ونحن ناخذ من الفروع مااتفق علیه العلماء لاسیما هاتان الفرقتان العظیمتان الحنفیة والشافعیة وخصوصا فی الطهارة ولصلوٰة فان لم یتبیسر الاتفاق واختلفوا فناخذ بما یشهدله ظاهر الحدیث ومعروفه❶۔

(ہم فروعات میں ان مسائل پر عمل کرتے ہیں، جن پر علما کا اتفاق ہو، خصوصیت سے جن پر اہل سنت کی دو بڑی جماعتیں حنفی اور شافعی متفق ہوں۔ طہارت اور نماز سے متعلق مسائل میں ہم بالخصوص اس کا التزام کرتے ہیں۔ اگر ان دو بڑی جماعتوں کا اتفاق نہ ہو، تو جو مسائل ظواہر حدیث کے موافق ہوں، ان پر عمل کرتے ہیں۔)

اب ذیل میں وہ چند مسائل درج کیے جاتے ہیں جن میں شاہ صاحب رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر عمل فرماتے تھے۔

۱۔ امام کی اقتدا میں سورہ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں۔ یہ ایک مشہور مسئلہ ہے۔ احناف اس کے قائل نہیں، لیکن شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

> وان کان ماموماً وجب علیه الانصات والاستماع، فان جهرالامام لم یقراء الا عند الا سکاتة وان خافت فله الخیرة فان قرأ فلیقراء الفاتحة قرأة لایشوش علی الامام، وهذا اولی الاقوال عندی، وبه یجمع بین احادیث الباب❷۔

(مقتدی کو چاہیے کہ امام کے پیچھے خاموشی سے سنے، اگر امام اونچی آواز سے پڑھے تو مقتدی سکتوں میں پڑھے۔ اگر امام آہستہ پڑھ رہا ہو، تو مقتدی کو اختیار ہے، جس طرح

❶ تفہیمات الٰہیہ ج ۲ ص ۲۴۲۔

❷ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۹۔

Marfat.com

چاہے پڑھے۔ لیکن سورہ سفاتحہ اس طرح پڑھے کہ امام کی قرأت میں تشویش اور پریشانی نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ نقطہ نظر اولیٰ ہے، اور اس مسئلے کے متعلق جو احادیث مروی ہیں، ان میں توافق و تطابق کی صحیح صورت یہی ہے۔

۲۔ حضرات احناف نماز میں رفع یدین کے قائل نہیں، لیکن شاہ ولی اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ رفع یدین کرنے کی احادیث ''اکثر'' اور ''اثبت'' ہیں۔ اسی طرح وتر کی ایک رکعت کو بھی ''سنت'' قرار دیتے ہیں، جب کہ احناف تین رکعت کے قائل ہیں۔ مگر شاہ صاحب ان مسائل میں جھگڑے فساد کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

والحق عندی فی مثل ذلك ان الكل سنة ، ونظيره الوتر بركعة واحدة او بثلاث ، والذی یرفع ، احب الی ممن لا یرفع فان احادیث الرفع اكثر واثبت ، غیر انه لا ینبغی لانسان فی مثل هذه الصور ان یثیر علیٰ نفسه فتنة عوام بلده❶۔

(میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ رفع یدین کرنا یا نہ کرنا دونوں سنت ہیں۔ یہی معاملہ ایک رکعت یا تین رکعت وتر پڑھنے کا ہے۔ رفع یدین کرنے والا میرے نزدیک نہ کرنے والے سے زیادہ اچھا ہے، کیونکہ رفع یدین کی احادیث تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور زیادہ صحیح بھی ہیں۔ لیکن انسان کو اس قسم کے مسائل میں اپنے شہر کے لوگوں کو یہ موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ اس کے خلاف ہنگامہ بپا کر دیں۔)

۳۔ فقہائے حنفیہ وتروں کو واجب قرار دیتے ہیں اور محدثین اسے سنت کہتے ہیں۔ شاہ صاحب بھی اس میں محدثین کی تائید فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

والحق ان الوتر سنة هو اوكد السنن ، بینه علی وابن عمر وعبادة بن الصامت رضی الله عنهم ❷۔

(وتر سنت مؤکدہ ہے۔ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے اور انھوں نے اسی کی وضاحت فرمائی ہے۔

۴۔ عذر کی بنا پر دو نمازیں جمع کرنے کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ فقہائے حنفیہ نہ جمع تقدیم کے قائل ہیں، نہ جمع تاخیر کے، لیکن شاہ صاحب جمع تقدیم کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور جمع تاخیر کو بھی۔ فرماتے ہیں:

---

❶ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ص ۱۰

❷ ایضاً ص ۱۷۔

Marfat.com

ومنها الجمع بين الظهر والعصر، والمغرب والعشاء❶۔

(یعنی ایک مسئلہ نماز ظہر اور نماز عصر کو اور نماز مغرب اور نماز عشا کو جمع کر کے پڑھنے کا ہے۔)

فشرع لهم جمع التقديم والتاخير لكنه لم يواظب عليه ولم يعزم عليه مثل مافعل فى القصر❷۔

(اور رسول اللہ ﷺ نے جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں کی اجازت دی لیکن نہ اس پر ہمیشگی کا حکم دیا اور نہ اس کی تاکید فرمائی، جیسا کہ سفر میں نماز قصر کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔)

۵۔ جمعتہ القریٰ یعنی دیہات میں جمعہ پڑھنا چاہیے یا نہیں۔ احناف اور اہل حدیث کے درمیان یہ ایک مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ احناف دیہات میں جمعے کے قائل نہیں ہیں، جب کہ حدیث کی روشنی میں اہل حدیث اسے ضروری قرار دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب بھی دیہات میں جمعے کے وجوب کے قائل ہیں۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث نقل فرماتے ہیں:

وقال رسول الله ﷺ الجمعة واجبة علىٰ كل قرية❸۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جمعہ ہر گاؤں میں پڑھنا واجب ہے۔

اس سے آگے فرماتے ہیں:

ومن تخلف عنها فهو الآثم❹۔

(جو شخص جمعہ ترک کر دے وہ گناہ گار ہے۔)

۶۔ عیدین کی تکبیرات میں فقہائے حنفیہ اور محدثین میں اختلاف ہے، محدثین کا نقطہ نظر اس باب میں وہی ہے، جو اہل الحرمین (ساکنان مکہ اور باشندگان مدینہ) کا ہے۔ یعنی پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری میں پانچ تکبیریں کہی جائیں۔ اس کے بعد خطبہ دیا جائے۔ شاہ صاحب بھی اسی طریق عمل کو ترجیح دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

يكبر فى الاولى سبعاً قبل القراة، والثانية خمسا قبل القرأة، وعمل الكوفيين ان يكبر اربعاً كتكبيرات لجنائز فى الاولى قبل القراء- و فى الثانية بعدها وهما سنتان وعمل الحرمين ارجح ثم يخطب يامربتقوى الله ويعظ ويذكر❺۔

---

❶ حجتہ اللہ البالغہ ج ۲، ص ۲۴۔

❷ حجتہ اللہ البالغہ ج ۲، ص ۲۴

❸، ❹ ایضاً ص ۳۰

❺ حجتہ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۳۱

Marfat.com

(پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری میں قرأت سے پہلے پانچ تکبیریں کہی جائیں۔ (یہ عمل اہل حرمین کا ہے) لیکن اہل کوفہ کا عمل یہ ہے کہ تکبیرات جنازہ کی طرح پہلی رکعت میں قرات سے قبل چار تکبیریں کہی جائیں اور دوسری میں قرأت کے بعد کہی جائیں۔ اگرچہ یہ دونوں طریقے مسنون ہیں، لیکن اہل حرمین کا عمل زیادہ راجح اور قابل حجت ہے۔ اس کے بعد خطیب خطبہ دے، اللہ سے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دے اور وعظ و نصیحت کرے۔)

۷۔ فقہائے حنفیہ اور فقہائے شافعیہ میں اس مسئلے سے متعلق بڑا اختلاف ہے کہ ''ماء کثیر'' کیا ہے اور پانی کتنی مقدار میں ہو تو نجس ہو جاتا ہے اور کتنی مقدار میں ہو تو نجاست سے آلودہ نہیں ہوتا۔ شوافع کا مسلک اس ضمن میں یہ ہے کہ پانی قلتین ہو تو نجاست سے محفوظ رہتا ہے اور احناف عشر فی العشر'' یعنی'' دہ دردہ'' کی مقدار میں پائے جانے والے پانی کو نجاست کی آلودگی سے مبرا گردانتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کنوئیں میں کتا، بلی، چوہا وغیرہ مر جائے تو احناف کے نزدیک پانی کے ڈولوں کی ایک خاص تعداد مقرر ہے جن کا کنوئیں سے نکالنا واجب ہے، اگر اس تعداد میں ڈول نہ نکالے جائیں تو پانی نجس ہی رہتا ہے۔ شاہ ولی اللہ بھی حجتہ البالغہ میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کنویں میں جانوروں کے مرنے سے پانی کی نجاست و طہارت کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی جاتی ہیں، ان کا رسول اللہ ﷺ کے فرمان اقدس یا حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بحث کو فقہا نے خواہ مخواہ طول دیا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

وقد اطال القوم فی فروع موت الحیوان فی البئر، والعشر فی العشر، والماء الجاری ولیس فی کل ذلك حدیث عن النبی ﷺ البتة ❶۔

(کنوئیں میں مختلف قسم کے حیوانات (کتا، بلی، چوہا وغیرہ) کے مرنے اور دہ دردہ اور ماء جاری کے متعلق مسائل میں فقہاء نے طویل بحثیں کی ہیں، لیکن ان میں سے کسی مسئلے کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ کی قطعاً کوئی حدیث نہیں ہے۔)

اس سے آگے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

وبالجملة فلیس فی هذا الباب شئی یعتدبه ویجب العمل علیه وحدیث القلتین اثبت من ذالك كله بغیر شبهة ❷۔

(بات یہ ہے کہ ان مسائل کے سلسلے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جسے قابل اعتماد اور واجب العمل گردانا جائے۔ البتہ قلتین والی حدیث بلاشبہ زیادہ ثابت اور صحیح ہے۔)

❶ حجتہ اللہ البالغہ ج ۱، ص ۱۸۵۔

❷ ایضاً۔

Marfat.com

بہر حال شاہ صاحب کی تصانیف سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ہر مسئلے میں کتاب و سنت کو پیش نگاہ رکھتے ہیں، خود بھی اسی پر عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اسی پر عمل کی تلقین فرماتے ہیں۔ اگر کوئی بات کتاب و سنت میں موجود نہ ہو تو ائمہ کرام میں سے جس کے قول کو سنت سے اوفق یا اقرب پاتے ہیں، اسے اپنے لیے قابل عمل قرار دیتے ہیں اور ہر شخص کو اسی کی تاکید کرتے ہیں۔ وہ حق کو کسی ایک ہی امام یا مجتہد کے قول و عمل میں منحصر نہیں سمجھتے۔

احناف اور غیر احناف کے درمیان جن مابہ الامتیاز مسائل میں زیادہ قوی دلائل کی بنا پر شاہ صاحب احناف سے اظہار اختلاف فرماتے ہیں، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

آپ (شاہ صاحب) نے دیگر ائمہ کے بعض اقوال کو از روئے ادلہ، زیادہ قوی سمجھ کر اختیار بھی فرمایا ہے، اور یہ ذکر، نادر قسم کے مسائل ہی کا نہیں ہے بلکہ جن مسائل کو آج کل حنفیوں اور غیر حنفیوں میں مابہ الامتیاز سمجھا جاتا ہے، بعض ایسے مسائل میں بھی شاہ صاحب نے کسی دوسرے امام کے قول کو قوت دلائل کی وجہ سے اختیار کیا ہے۔ مثلاً قلتین، رفع یدین، الترجیع فی الاذان والایتار فی الاقامہ اقامۃ الجمعۃ فی القری التی فیہا اربعون رجلاً حراً وغیرہ وغیرہ[1]۔

ان الفاظ کے بعد مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

میرا خیال ہے کہ اگر آج کوئی فاضل دیانت داری سے اس روش پر چلے اور شاہ صاحب ہی کی طرح اس کو ''حنفیت'' کے مناقض نہ سمجھتا ہو، بلکہ اس کو بھی حنفیت ہی کا ایک طریقہ سمجھتا ہو، اور اسی بنا ر اپنا رشتہ حنفیت سے بھی رکھنا چاہتا ہو تو ہمارے زمانے کے ٹکسالی قسم کے حنفی حضرات کبھی بھی اس کو حنفی تسلیم نہیں کریں گے[2]۔

بلاشبہ شاہ صاحب اور ان کے رفقائے کرام عقائد، اصول، اور فروعی مسائل میں تقلید و جمود کے حامی نہیں۔ ان کا اپنا مکتب فکر یہ ہے (اور اسی کو وہ تمام لوگوں میں رائج کرنا چاہتے تھے) کہ کسی پابندی اور تقید کے بغیر مذاہب اربعہ اور ائمہ حدیث سے منقول مسائل پر، عمل کا قصر رفیع تعمیر کیا جائے۔ بہ ظاہر حنفی ہونے کے باوجود وہ اصحاب الحدیث اور شوافع کے معمولات و رجحانات کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ شاہ صاحب نے فقہی اعتبار سے مسائل حنفیہ پر کثرت سے عمل کا سلسلہ ہندوستان میں دیکھا، لیکن جب وہ حجاز تشریف لے گئے تو وہاں انھیں فقہائے شافعیہ کی بہت بڑی تعداد سے میل جول کے مواقع میسر آئے، یہ حضرات مسائل فقیہ میں عمل حجاز اور حدیث رسول اکرم ﷺ کو مقدم گردانتے تھے، شاہ صاحب چونکہ فکری لحاظ سے بلند مرتبے پر فائز تھے، لہٰذا انھوں نے ان دونوں عظیم مکاتب فکر میں اتحاد کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا، اور اپنی تصانیف میں جا بجا یہی طرز عمل اختیار فرمایا۔ ان کے انداز بیان اور اسلوب تحریر سے صاف پتا چلتا ہے کہ فقہی مسائل و افکار میں وہ اہل علم کے اذہان کو تقلید کی جکڑ

[1] الفرقان۔ شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۴۰۱

[2] ایضاً

Marfat.com

بندیوں سے آزاد دیکھنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ اصحاب فکر ونظر کو سخت لہجے میں فرماتے ہیں:

خضتم كالخوض في استحسانات الفقهاء من قبلكم وتفريعاتهم۔ اماتعرفون ان الحكم ماحكمه الله ورسوله، ورب انسان منكم يبلغه حديث من احاديث نبيكم فلايعمل به، ويقول انما عملي علىٰ مذهب فلان لاعلى الحديث ثم اختال بان فهم الحديث فالقضاء به من شان الكمل المهرة وان ائمة لم يكونوا ممن يخفىٰ عليهم هذا الحديث فما تركوه الالوجه ظهرلهم في الدين من نسخ ومرجوحية❶۔

(تم نے پوری طرح اپنے سے پہلے کے فقہا کے استحسانات اور تفریعات کی طرف توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ درحقیقت حکم تو صرف اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول ﷺ کا ہے۔ تم میں سے بہت سے لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی حدیث پہنچ جاتی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہم تو فلاں امام کے مذہب کے پابند ہیں، حدیث کے نہیں۔ وہ اپنے دل میں یہ خیال جمائے بیٹھے ہیں کہ حدیث کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ماہرین اور اصحاب کمال کا شیوہ ہے، اور ائمہ کرام سے کوئی بات مخفی نہ تھی۔ ان کو اس حدیث کا ضرور علم ہوگا، انھوں نے اس کو چھوڑ دیا اور اس پر عمل نہیں کیا تو اس کی وجہ یا تو اس کا نسخ ہوگا یا مرجوحیت ہوگی، ورنہ وہ ضرور اس پر عمل کرتے۔)

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب ان حضرات سے سخت ذہنی اور فکری کوفت محسوس کرتے ہیں، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے واضح احکام کو ترک کر کے محض بربنائے تقلید اپنے ائمہ عظام کے ارشادات کو مرکز عمل قرار دے رکھا ہے۔

شاہ صاحب ان معنوں میں حنفی نہ تھے کہ تقلید کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرائیں۔ وہ ہر چیز کو کتاب وسنت کی میزان میں رکھتے تھے اور اسی بات پر عمل کرتے تھے، جو کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہوتی۔ کسی خاص امام کے قول کے مقابلے میں کتاب وسنت کے صریح احکام کا ترک ان کے نزدیک انتہائی مذموم اور قابل نفرت ہے۔

وہ ان معنوں میں اہل حدیث بھی نہ تھے، جو بعض حضرات کے نزدیک مشہور ومتعارف ہیں۔ ان کا نقطۂ فکر یہ تھا کہ جو بات کسی فقہی مسلک میں قرآن اور حدیث کی نص صریح سے ثابت ہے، یا اس بنیادی ماخذ سے مطابقت رکھتی ہے، اس کو معمول بہا ٹھہرایا جائے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:

شیخ محمد فاخر زائر الٰہ آبادی بارھویں صدی ہجری کے نامور عالم تھے۔ ان کے حالات گزشتہ صفحات

❶ تفہیمات الٰہیہ ج ۱ ص ۲۸۳۔

Marfat.com

میں بیان ہو چکے ہیں، وہ ۱۱۲۰ھ/۱۷۸۶ء میں صوبہ یوپی کے شہر الہ آباد میں پیدا ہوئے اور ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ کو برہان پوری میں وفات پائی۔ شیخ ممدوح غالباً جب پہلی مرتبہ دہلی تشریف لائے تو انھیں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، وہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے دہلی کی جامع مسجد میں نماز پڑھی تو آمین بالجہر پکاری۔ وہاں کے لوگوں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی، اور وہ شیخ محمد فاخر اور ان کے مرتبہ علم وفضل سے بھی واقف نہ تھے۔ نماز میں آمین بالجہر کی آواز سنی تو سخت حیران ہوئے۔ نماز کے بعد شیخ کو گھیر لیا اور مختلف قسم کی باتیں کرنے لگے۔ شیخ نے ہر چند رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا حوالہ دے کر انھیں اپنی بات سمجھانے اور مطابق سنت ثابت کرنے کی کوشش کی، مگر کسی نے ایک نہ مانی اور بدستور ان سے بحث کرتے رہے۔ آخر شیخ نے فرمایا کہ میری بات تم نہیں مانتے تو مجھے اپنے شہر کے کسی عالم کے پاس لے چلو، ان سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ وہ لوگ شیخ ممدوح کو حضرت شاہ ولی اللہ کے پاس لے گئے اور ساری بات ان کے گوش گزار کی۔ شاہ صاحب نے لوگوں سے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے آمین بالجہر پکارنا ثابت ہے۔ شاہ صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سن کر لوگ چلے گئے اور بھیڑ چھٹ گئی۔ شیخ محمد فاخر اور شاہ ولی اللہ دونوں رہ گئے تو موقع پا کر شیخ محمد فاخر نے شاہ صاحب سے کہا: ''آپ کھلتے کیوں نہیں''؟

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''اگر کھل جاتا تو آج آپ کو کیسے بچاتا۔''

اس قسم کے واقعات سے صاف پتا چلتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کو معروف و متعارف معنوں میں حنفی کہنا یا اہل حدیث کے زمرے میں داخل کرنا محض کھینچا تانی ہے۔ البتہ ان کا عمل ان مسائل پر تھا جو احادیث سے ثابت ہیں اور جن پر اہل حدیث عامل ہیں۔

علم تصوف:

شاہ ولی اللہ صاحب بحر تصوف کے شناور اور اس کی تمام اداؤں سے بہ درجہ غایت آشنا تھے۔ اس کی چند وجوہ ہیں :

۱۔ ان کے دور میں تصوف کا عام چرچا تھا اور اہل علم میں اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

۲۔ شاہ صاحب کے اسلاف اس علم سے گہری وابستگی رکھتے تھے، ان کے خاندان کے دیگر اہل علم کو بھی اس سے لگاؤ تھا۔ شاہ صاحب کے اخلاف کی بھی اس سے دلچسپی قائم رہی۔

۳۔ اس دور میں انہی اہل علم کی بات کو زیادہ لائق اعتنا سمجھا جاتا تھا، جو تصوف سے رسم وراہ رکھتے تھے۔ اب بھی عام طور پر یہی حال ہے۔

۴۔ ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی جو اس دور میں بھی ہے اور اسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے متعدد علوم وفنون میں تصوف کی چھاپ موجود ہے۔ مثلاً ان کے ادب میں تصوف کے اثرات پائے

Marfat.com

جاتے ہیں، ان کی شعروشاعری کو اس نے بہت متاثر کیا ہے، فلسفۂ اسلام کی توضیح وتبیین میں اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، مذہب میں اس کا باقاعدہ عمل دخل ہے، اسلام کی تبلیغ واشاعت کے اسلوب میں اس سے مدد لی جاتی ہے، مسلمانوں کی ثقافت کا یہ ایک اہم جز بن گیا ہے اور ان کے رسم ورواج تک میں اس کی جڑیں پیوست ہوگئی ہیں۔ لہٰذا شاہ صاحب کا اس سے اثر پذیر ہونا اور اس کے مختلف گوشوں سے واقفیت حاصل کرنا وقت کا ضروری تقاضا تھا۔

شاہ صاحب نے اس علم کو مرکز التفات ٹھہرایا اور اس میں اس درجے رسوخ حاصل کیا اور گہرائی کو پہنچے کہ اسے بہ طور مثال پیش کیا جاتا ہے۔

تصوف کو مسلمانوں کے لٹریچر کے ایک لازمی جز کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے عدم اعتنا کرتا ہے تو اسے یہ سوچنا پڑے گا کہ اس طرز عمل سے مسلمانوں کے بہت سے اجزائے علم متاثر ہوں گے اور ان امور سے تہی دامن ہونے کے خطرات ابھریں گے، جو ہمارے متعدد علوم میں پوری طرح رچ بس گئے ہیں۔

علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی نظر وبصر سے اوجھل نہیں کیا جاسکتا کہ صحیح تصوف سے قلب میں اخلاص کے جذبات ابھرتے اور روح میں احسان کے داعیے کروٹ لیتے ہیں۔ اخلاق کا پاکیزہ عاطفہ جنم لیتا اور کردار کی نئی دنیا عالم وجود میں آتی ہے۔ زبان آشنائے عذوبت اور گفتار ہم آہنگ لطافت ہوتی ہے۔

بہرکیف تصوف کے کچھ اثرات مثبت اسلوب میں ظاہر ہوتے ہیں اور کچھ منفی انداز میں۔ ! مثبت اسلوب یہ ہے کہ صحت مندانہ تصوف سے، بہ الفاظ واضح اس تصوف سے جسے کتاب وسنت کی روشنی میں اختیار کیا جائے، انسان کے دل میں ترحم، تلطف، دوسرے کی ہمدردی، ایثار، خدمت گزاری، خداترسی اللہ کا خوف، ابنائے جنس سے محبت، مخلوق خدا سے مودت، تقویٰ الٰہی، فرائض شرعی کی تکمیل، اصلاح نفس، بڑے کی تکریم اور چھوٹے پر شفقت وغیرہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ منفی انداز یہ ہے کہ غلاظت قلب، انتقامی جذبات، حسد وکدورت، خواہشات نفس، عداوت ودشمنی، ہواوہوس، غیظ وغضب اور دیگر برائیوں کا صحیح تصوف سے خاتمہ ہوتا ہے۔

یہی وہ تصوف ہے جس کو اپنانے سے انسان نیکی اور صالحیت کا پیکر بن جاتا ہے، اور یہی وہ تصوف ہے جو عین اسلام ہے، اور شاہ صاحب اپنے مخاطبین کو اسی تصوف کی تلقین اور تبلیغ فرماتے ہیں۔ اس کے علاوہ ''تصوف'' کی جو بھی قسم اور شکل ہے، سب خلاف شریعت اور کتاب وسنت کے منافی ہے۔

اصحاب تصوف کے اس طرز عمل سے جو شرعی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہے، شاہ صاحب خوب آگاہ تھے۔ وہ اس کی سخت الفاظ میں تردید کرتے ہیں اور جو بدعات ان صوفیا نے مسلمانوں میں رائج کردی تھیں، ان سے بچنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ چنانچہ وصیت نامہ میں اپنی تیسری وصیت میں کہتے ہیں کہ اس زمانے کے جو مشائخ کئی قسم کی بدعات میں مبتلا ہیں، اور اپنی کرامتوں کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں، ان کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیے اور کبھی ان کے حلقہ بیعت میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ شاہ صاحب اس قسم کے لوگوں کو ''دغاباز'' اور

Marfat.com

''کرامات فروشان ایں زمانہ'' قرار دیتے ہیں۔

شاہ صاحب بلاشبہ صوفی اور اہل سلوک میں سے تھے، لیکن تصوف و طریقت کے کسی ایک ہی خاص سلسلے کے پابند نہ تھے، جس صاحب فیض کو احکام شریعت کا متبع سمجھتے، اس سے فیض حاصل کرتے۔ یعنی جس طرح وہ فقہ کے مذاہب اربعہ میں سے کسی خاص مذہب کے مقلد نہ تھے، اسی طرح اہل سلوک کے سلسلوں میں سے بھی کسی ایک سلسلے سے وابستگی نہ رکھتے تھے۔ بلکہ تمام مذاہب فقہ اور سلاسل تصوف میں سے جس کی جو بات قرآن و حدیث کے زیادہ مطابق اور انسان کی دینی اور روحانی فلاح و بہبود کے لیے زیادہ فائدہ مند سمجھتے، اسے اختیار فرما لیتے۔

شاہ صاحب نے علم تصوف کے بارے میں متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں قول الجمیل، الطاف القدس، خیر کثیر، انتباہ فی سلاسل اولیا اللہ، سطعات اہمعات، لمعات قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں تفہیمات الہیہ کا اکثر حصہ مسائل تصوف سے متعلق ہے۔ انفاس العارفین میں بھی تصوف کے بہت سے مباحث آ گئے ہیں۔ ان کتابوں کے اردو ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے بیشتر مسائل نہایت مشکل اور پیچیدہ ہیں۔ ان کا سمجھنا بھی ہر صاحب علم کے بس کا روگ نہیں۔ ان میں بعض ایسی چیزیں بھی آ گئی ہیں جن کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں ایک سے زائد رائیں ہو سکتی ہیں اور شرعی نقطہ نظر سے ان میں بہر حال اختلاف یا اتفاق کی گنجائش موجود ہے۔

اقتصادی، معاشی اور اصلاحی نظریات:

شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ کے ابواب ابتغاء الرزق، باب سیاسۃ المدنیہ، باب الرسوم السائرۃ بین الناس، باب اقامتہ الارتفاقات واصلاح الرسوم وغیرہ میں معاشرتی اصلاح کے کچھ اصول بیان کیے ہیں، جو مذہبیات، تجارت، اقتصادیات، سیاسیات، نظام حکومت، آجر اور کاشت کار کے حقوق اور بعض دیگر معاملات میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں:

- جو معاشرہ کسی کی محنت اور جدوجہد کا قدر دان نہیں، اور اس کی مناسب اجرت ادا نہیں کرتا، آجر اور مزارع پر ناقابل برداشت محصولات عائد کرتا ہے، وہ قوم کا دشمن ہے، اسے ختم ہو جانا چاہیے۔
- عیاشی کے مراکز اور جوئے اور قمار بازی کے اڈے وغیرہ یک قلم بند کر دیے جائیں۔ اگر یہ باقی رہیں گے تو دولت کی تقسیم کا صحت مندانہ نظام قائم نہیں ہو سکے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دولت زیادہ لوگوں کے ہاتھوں میں جانے اور صحیح خطوط پر گردش کرنے کے بجائے چند محدود افراد کے قبضے میں چلی جائے گی۔
- پیداوار اور آمدنی کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کا ہر فرد ایک دوسرے سے تعاون کرے۔ اگر اس میں تعاون کا اصول کارفرما نہیں ہوگا تو معاشرتی خرابیاں پیدا ہوں گی۔

Marfat.com

⊙ مزدور اور کاشت کار کی حیثیت قوت کاسبہ کی ہے، اور دولت کا حصول، محنت اور باہمی تعاون کا متقاضی ہے۔ کیوں کہ شہریت اور مدنیت کی اصل روح یہی ہے۔ جو شخص ملک اور قوم کی خدمت کے لیے تگ ودو نہیں کرتا، وہ ملکی دولت میں حصے دار بننے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔

⊙ دولت کے مستحق وہی لوگ ہیں جو اجرت اور زراعت کے ذریعے یا دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک وقوم کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ان کی خوش حالی اور ارتقا ملک وقوم کی خوش حالی اور ارتقا کے مترادف ہے۔ جو معاشرتی نظام ان قوتوں کو کمزور کرنے کے درپے ہے، اس کو قائم نہیں رہنا چاہیے۔

⊙ آجر کے اوقات کار کی تعیین اور تحدید ضروری ہے، اس کو اتنا وقت بہر حال ملنا چاہیے، جس میں وہ اپنی اخلاقی اصلاح اور روحانی پاکیزگی کے لیے کوئی قدم اٹھاسکے، اور اپنی ان صلاحیتوں کا جائزہ لے سکے جو اللہ نے اس کے اندر ودیعت کی ہیں۔

⊙ تجارت، باہمی تعاون کا عظیم ذریعہ ہے، اس لیے تجارت کو اسی بنیادی اصول کے مطابق جاری رہنا چاہیے۔ نہ تاجر پیشہ طبقے کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ غلط طریق کار اختیار کر کے چیزوں کی قیمتیں بڑھائے اور نہ حکومت کے لیے مناسب ہے کہ وہ بھاری بھرکم محصول عاید کر کے تجارت کے فروغ وترقی میں رکاوٹ پیدا کرے۔ یہ چیزیں ترقی اور باہمی تعاون کو نقصان پہنچانے کا باعث بنتی ہیں۔

⊙ زمین کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے، ملک کے باشندوں کی حیثیت فقط اتنی ہے، جتنی کہ مسافر خانے میں قیام کرنے والے کسی مسافر کی ہوسکتی ہے۔

⊙ تمام انسان بحیثیت انسان یکساں ہیں۔ کوئی شخص مالک الملک یا ملک الناس یا مالک قوم نہیں کہلا سکتا۔ کوئی اپنے آپ کو انسانوں کا مالک نہ سمجھے۔ کوئی شخص کسی بڑے سے بڑے آدمی کے لیے بھی اس قسم کے الفاظ استعمال نہ کرے۔

⊙ ریاست کے امیر یا سربراہ کی حیثیت کسی وقف کے متولی کی سی ہے۔ وقف کا متولی اگر ضرورت مند ہو تو اس میں سے اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ جس سے ملک کے ایک عام شخص کی طرح زندگی بسر کر سکے۔

⊙ شاہ صاحب نے اپنی تصنیف البدور البازغہ کے بعض مباحث اور حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف ابواب میں انسان کے بنیادی حقوق کی بھی وضاحت فرمائی ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے۔

⊙ رہائش کے لیے مکان، کھانے پینے کی چیزیں، پہننے کے لیے کپڑا، اور اتنی استطاعت کہ نکاح و ازدواج کا سلسلہ قائم ہو سکے اور بچوں کی تعلیم وتربیت ہو سکے، یہ وہ ضروریات ہیں جن کے حصول کا مذہب اور نسل کی تفریق کے بغیر ہر شخص کو استحقاق ہے

⊙ بلا امتیاز مذہب ونسل اور بلا تفاوت رنگ ولون ملک کے تمام لوگوں میں عدل وانصاف، مال وجان کا تحفظ، عزت وناموس کی حفاظت اور شہری حقوق میں یکسانیت سب کا بنیادی حق ہے۔

Marfat.com

⊙ اپنی زبان اور تہذیب و ثقافت کو محفوظ اور زندہ رکھنا ہر فرقے اور جماعت کا حق ہے۔

مذہبی معاملات میں شاہ صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تمام فرقوں میں سچائی کے اصول اور صداقت کے بنیادی تقاضے مسلمہ ہیں۔ مثلاً سب لوگ اللہ کی عبادت کو ضروری قرار دیتے ہیں، صدقات و خیرات کو لازمی چیز سمجھتے ہیں، اور روزے کے قائل ہیں، البتہ عبادت کے طریقے اور شکلیں مختلف ہیں۔ کسی کو پریشان کرنا، قتل و غارت پر آمادہ ہونا، بے حیائی پر اتر آنا، معصیت کا ارتکاب کرنا اور برائی پھیلانا یا کسی کو غلط باتوں کی ترغیب دینا، سب کے نزدیک معیوب اور مذموم ہے۔ ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ اس کی مذمت کرتے ہیں۔

شاہ صاحب نے معاشرتی اصلاح کے جو اصول اور نظریات بیان کیے ہیں۔ وہ انتہائی اہم ہیں۔ ان سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اپنی مختلف تصانیف کے متعدد ابواب میں موقع و محل کی مناسبت سے انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ ایسی باتیں تحریر فرمائی ہیں جو ہر دور میں ہر شخص کے لیے قابل قبول ہیں اور آسانی سے ذہن و فکر میں اترتی جاتی ہیں۔

اقتصادی اور معاشی نظریات کی بھی انھوں نے وضاحت کی ہے اور نہایت زور دار الفاظ میں دردناک انداز کے ساتھ ملک کے مختلف طبقوں کو مخاطب کیا ہے۔ وہ امرائے مملکت کو ان الفاظ سے خطاب فرماتے ہیں:

اے طبقہ امرا۔! غور سے سنو! کیا تمھیں اللہ کا خوف نہیں، تم دنیا کی عارضی اور فانی لذتوں میں غرق ہو رہے ہو، اور جن لوگوں کی حفاظت کی ذمے داری تم پر عائد کی گئی ہے، ان سے تم نے روگردانی کر لی ہے، تاکہ ان کے بعض لوگ بعض لوگوں کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔ تمھاری تمام تر ذہنی توانائیاں فقط اس پر خرچ ہو رہی ہیں کہ مختلف قسم کے لذیذ کھانے پکواتے اور عورتوں سے لطف اندوز ہوتے رہو۔ بہترین کپڑوں اور بلند و بالا مکانوں کے سوا تم اور کسی چیز کی طرف ملتفت نہیں ہوتے۔

سپاہیوں اور فوجیوں میں ان کے عہد میں جو برائیاں پیدا ہو گئی تھیں، ان کی نشان دہی کرتے ہوئے ملک، کے اس طبقے کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

تم اپنے اخراجات میں میانہ روی اختیار کرو اور اعتدال کی راہ اپناؤ، اپنے آپ کو صرف اتنی ہی روزی پر قناعت کرنے کے لیے آمادہ کرو جو تمھیں آخرت کی زندگی کے بہتر نتائج تک پہنچانے کے لیے کافی ہو۔ اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے کم رکھو۔ اس میں سے جو بچ جائے اس سے مسافروں اور مسکینوں کی مدد کرو۔ ناگہانی اور اتفاقی مصیبتوں اور ضرورتوں کے لیے بھی بچا کر رکھا کرو۔

مشائخ کو بالخصوص سخت الفاظ اور ترش لہجے سے خطاب کرتے ہیں فرماتے ہیں:

ہم ایسے لوگوں کو ہرگز پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے جو لوگوں کو محض اس لیے اپنے حلقہ ارادت میں داخل کرتے ہیں تاکہ ان سے روپے پیسے وصول کریں۔

اس سلسلے میں شاہ صاحب مذکورہ بالا طبقوں کے علاوہ ملک کے عام لوگوں کو بھی خطاب کرتے ہیں اور

Marfat.com

انھیں نصیحت کے اسلوب میں فرماتے ہیں:

اپنے رہن سہن اور انداز زیست میں تکلف سے کام نہ لو اگر ایسا کرو گے تو بالآخر فسق کی حدود میں داخل ہو جاؤ گے۔ اللہ کے نزدیک پسندیدہ چیز یہ ہے کہ اس کے بندے اس کی پیدا کردہ سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اتنا کچھ کمانے کی سعی کرو جس سے تمھاری ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ معاشی طور سے دوسروں پر اس طرح بوجھ نہ بنو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھاؤ۔ یا ان سے مانگو اور وہ نہ دیں۔ اسی طرح ارباب سلطنت اور اصحاب حکومت پر بھی بوجھ نہ بنو۔ تمھارے لیے مناسب اور بہتر بات یہی ہے کہ خود کما کر کھاؤ، اگر ایسا کرو گے تو خدا تمھیں معاش کی ایسی راہ سجھا دے گا جو تمھاری ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی ہوگی۔

اے ابنائے آدم! اللہ نے جس کو سکونت کے لیے جگہ عنایت کر دی ہو، جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی عطا فرما دیا ہو، جس سے سیراب ہو سکے، اتنا کھانے کو دے دیا ہو جس سے گزر بسر ہو سکے، اتنا کپڑا ہو، جس سے تن بدن کو ڈھانپ سکے، ایسی بیوی اس کے گھر میں ہو، جو رہن سہن کے معاملات میں اس کو مدد دے سکتی ہو، یاد رکھو، پوری دنیا اس شخص کو مل چکی ہے، ضروری ہے کہ ان نعمتوں پر وہ خدا کا شکر ادا کر سکے۔

اس سے آگے لکھتے ہیں:

انسان کو کمائی کی کوئی نہ کوئی راہ بہر حال اختیار کرنی چاہیے۔ یہ اس کے لیے بہت ضروری ہے۔

شاہ صاحب کا زمانہ چونکہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ ہے، اس لیے انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ کے باب سیاست المدنیہ میں زوال سلطنت کے اسباب پر بھی بحث کی ہے۔ اس کے انھوں نے مختلف اسباب بیان کیے ہیں، جن میں بڑا سبب اقتصادی ہے۔ اس زمانے میں سپاہی، شاعر، زاہد، صوفی اور بعض دیگر لوگ بالکل بے کار ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ اور بادشاہ خود ان کو انعام واکرام سے نوازتے تھے۔ اسی طرح اہل کاروں نے محنت اور سعی و کوشش کو ترک کر دیا تھا۔ حکومت نے کاشت کاروں اور تاجروں سے بھاری محصول لینا شروع کر دیے تھے، اور اس سلسلے میں ان پر سختی کی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت کو شدید دھچکا لگا اور حالات روز بروز بگڑتے چلے گئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اس زمانے میں ملک کی خرابی اور ویرانی کے زیادہ تر دو سبب ہیں۔ ایک بیت المال یعنی ملک کے خزانے پر مالی بوجھ، وہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ کسی قسم کی محنت کرنے اور مشقت اٹھائے بغیر ملکی خزانے سے اس دعوے کے ساتھ روپیہ حاصل کریں کہ وہ ملک کے سپاہی ہیں یا عالم ہیں، جو اس ملک کے خزانے کی آمدنی میں اپنا حق رکھتے ہیں ـــــــ یا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو بادشاہ خود انعام واکرام عطا کیا کرتے ہیں، جیسے زہد پیشہ لوگ یا شعرا حضرات، اسی طرح دوسرے طبقوں کے لوگ جو ملک اور سلطنت کا کوئی کام کیے بغیر کوئی نہ کوئی ایسا ذریعہ اختیار کر کے روزی حاصل کرتے ہیں، جس میں ان کو کوئی محنت نہیں کرنا پڑتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ملک کے ذرائع آمدنی کو کم کرتے ہیں اور ملک کے خزانے پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

ملک کی اقتصادی حالت کی خرابی کا دوسرا سبب کاشت کاروں، تاجروں اور مختلف پیشے کے لوگوں پر بھاری بھر کم محصول لگانا اور اس سلسلے میں ان پر سختی کرنا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ حکومت کے اطاعت شعار اور اس کے تابع احکام ہیں، وہ تباہ ہو رہے ہیں، اور جو سرکش اور نادہندہ ہیں وہ اور سرکش ہو رہے ہیں، اور ان کے ذمے حکومت کے جو واجب الادا محصول ہیں، وہ ادا نہیں کرتے، حالانکہ ملک اور سلطنت کی ترقی اس بات میں مضمر ہے کہ محصول کم ہو، اور فوج اور اہل کاروں کا تقرر ضرورت کے مطابق کیا جائے۔ اس زمانے کے لوگوں کو ہوشیار ہو کر اس راز اور نکتے کو سمجھنا چاہیے ❶۔

شاہ صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ فرسودہ نظام بہر حال تباہی سے ہم کنار ہوگا۔ انھیں ملکی فضا میں فکِ کل نظام یعنی انقلاب احوال کی صدائیں بلند ہوتی سنائی دیتی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ معاشی نظام کو صحیح اصولوں کے مطابق ترقی دینا اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنا انسانی معاشرے کے استحکام کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں وہ وضاحت سے کہتے ہیں کہ زمین کو درست کرنا، اس کو قابل کاشت بنانا، مویشیوں کی افزائش نسل کے لیے کوشاں ہونا اور باہمی تعاون سے کام لینا لازمی ہے۔ اس ضمن میں حجۃ اللہ البالغہ میں انھوں نے جو الفاظ تحریر کیے ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے:

انسانی معاشرے میں معاشی وسائل کو بروئے کار لانے کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ جائز مال کو قبضے میں لایا جائے اور اس کو مناسب اور جائز طریقے سے ترقی دی جائے، جیسے مویشیوں کی افزائش نسل، آب پاشی اور زمین کو درست کر کے زراعت کرنا وغیرہ۔ لیکن اس تعاون باہمی سے معاشی وسائل کے حصول کی لازمی شرط یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں ترقی کی طرف قدم زن ہونا ایک دوسرے کی معاشی زندگی کے لیے تکلیف اور تنگی کا سبب نہ بن جائے، جس کا نتیجہ تمدنی فساد کی صورت میں ظاہر ہونے لگے ❷۔

مال کو بڑھانے اور اقتصادی ذرائع کو ترقی دینے کے مسئلہ پر بھی شاہ صاحب نے بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں باہمی تعاون ضروری ہے، جن ذرائع میں باہمی تعاون کا فقدان ہوگا اور ایک دوسرے کی رضامندی مفقود ہوگی، وہ ناپسندیدہ اور غیر مستحسن ہوں گے۔ شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

فان كان الاستمناء فيما ليس له دخل فى التعاون كالميسر اويما هو تراض يشبه الاقتضاب كالر فان المفلس يضطر الىٰ التزام مالا يقدر علىٰ ايفائه وليس رضاه رضافى الحقيقة فليس من العقود المرضية والاالاسباب الصالحة وانما هو باطل وسحت باصل الحكمه المدينة❸۔

❶ حجۃ اللہ البالغہ باب سیاستہ المدینہ ج ۱ ص ۴۵۔

❷ حجۃ اللہ البالغہ ابواب ابتغاء الرزق، ج ۲ ص ۱۰۳۔

❸ ایضاً۔

Marfat.com

یعنی اگر مال بڑھانے میں باہمی تعاون کو دخل نہ ہو جیسے جوئے بازی یا ایسی رضامندی ہو جس میں جبر پایا جاتا ہو، جیسے سود، ایک مفلس آدمی سود مجبوری کی حالت میں ادا کرتا ہے، کیوں کہ وہ درحقیقت اس کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتا، اس قسم کے تمام معاملات ناپسندیدہ اور غیر مستحسن ہیں، اور اجتماعی زندگی میں جو اصول کارفرما ہیں، ان کے مطابق یہ معاملات باطل اور حرام قرار پاتے ہیں، ان کا صاف ستھری مدنیت اور صحت مندانہ شہریت سے کوئی تعلق نہیں۔

شاہ صاحب محصولات کی بھرمار، عیاشانہ زندگی، زیورات کی کثرت اور بلند و بالا عمارتوں کو بھی اقتصادی اعتبار سے تباہ کن اور ملک کے مفاد عامہ کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

وکذالك من مفاسد المدن ان ترغب عظماء هم فی دقائق الحلی واللباس والبناء والمطاعم وعید النساء ونحوذالك زیادة علی ماتعطیه الارتفاقات الضروریة التی لابدللناس منهاواجتمع علیها عربهم وعجمهم۔

یعنی شہروں کی بربادی اور مدنیت کی (اقتصادی) خرابی کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ وہاں کے باشندے عمدہ زیورات، بہترین لباس، پُرشکوہ عمارات، لذیذ کھانوں اور عورتوں کے حسن وغیرہ کو اپنے لیے مرغوب اور پسندیدہ چیزیں قرار دے لیں، اور اس طرح وہ ان ارتفاقات ضروریہ یا مفادات عامہ کے حصول میں حد سے تجاوز کرنے لگیں، جو انسان کی ضروریات میں شامل ہیں اور جن پر عرب وعجم کے لوگوں کا بہر حال اتفاق ہے۔

شاہ صاحب بے پناہ بصیرت کے مالک تھے، آج سے تقریباً تین سو سال پہلے اقتصادیات کے بارے میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس بنیادی مسئلے کے تمام پہلوؤں پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ حجۃ اللہ ہی میں لکھتے ہیں:

اگر کسی قوم میں تمدن کا ارتقا خاص تسلسل کے ساتھ جاری رہے تو اس کی صنعت وحرفت درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے، پھر اگر حکمران طبقہ آرام و آسائش اور زینت وتفاخر کو زندگی کا شعار بنالے تو اس کا تمام تر بوجھ قوم کے کاری گر طبقے پر پڑے گا اور اتنا بڑھ جائے گا کہ معاشرے کا بہت بڑا حصہ حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اور انسانیت کا اجتماعی اخلاق اس وقت تباہ ہو جائے گا جب جبر کے ذریعے سے لوگوں کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے تو وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح فقط روٹی کمانے کے لیے کام کریں گے۔ جب انسانوں پر ایسی سخت مصیبت نازل ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی نجات کے لیے ضرور کوئی راستہ ان کو سجھا دیتا ہے۔ یعنی ضروری ہو جاتا ہے کہ قدرت الٰہیہ انقلاب وتغیر کے سامان پیدا کر کے اس غلط حکمران طبقے کا بوجھ قوم

Marfat.com

کے سر سے اتار دے۔

حجتہ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب نے ملکیت زمین کے مسئلے کو بھی موضوع بحث ٹھہرایا ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق حقیقت میں ساری زمین سرائے یا مسجد کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے انتفاع میں سب لوگ برابر کے شریک ہیں۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

والارض کلها فی الحقیقة بمنزلة مسجد او رباط جعل وقفا علی ابناء السبیل وهم شرکاء فیه فیقدم الاسبق فالاسبق ومعنی الملك فی حق الادمی کونه احق بالانتفاع من غیره❶۔

یعنی زمین درحقیقت سب کی سب مسجد یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے جو مسافروں کے لیے وقف کی گئی ہے، اور وہ سب اس میں برابر کے شریک ہیں، تقدم صرف پہلے اور پھر اس سے پہلے کو حاصل ہوا۔ انسان کے حق میں ملک کا مطلب فقط اتنا ہے کہ وہ دوسرے کی نسبت اس سے انتفاع کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔

سیاسی بصیرت کی چند مثالیں:

شاہ ولی اللہ کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی لحاظ سے نہایت پرآشوب زمانہ تھا۔ پورا ملک بدامنی کی خوف ناک لہروں کی زد میں تھا۔ ہر طرف بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی، نظم ونسق کی تمام چولیں ڈھیلی پڑ گئیں تھیں، بادشاہ کا احترام لوگوں کے دلوں سے ختم ہو چکا تھا، عسکری نظام تباہ ہو گیا تھا، مغلوں کے ڈیڑھ سو سالہ اقتدار کا ملک گیر سایہ تیزی سے سمٹ رہا تھا، سرکش اور باغی عناصر ہر طرف دندناتے پھرتے تھے، کسی کو انھیں روکنے اور ٹوکنے کی جرأت نہ تھی۔ روہیلے، جاٹ، مرہٹے، سکھ سب ہوس ملک گیری میں مبتلا تھے۔ لوٹ مار کا دور دورہ اور قتل وغارت کا بازار گرم تھا اور مغل بادشاہوں کا تاج ان ہیبت ناک طوفانی موجوں کی لپیٹ میں آ کر اپنا روایتی وقار کھو چکا تھا۔

ظاہر ہے یہ حالات نہایت مایوس کن اور ذہنی طور سے بہ درجہ غایت اذیت ناک تھے۔ لیکن شاہ صاحب نے ہمت نہ ہاری۔ انھوں نے تاریکیوں میں روشنی تلاش کرنے کی کوشش کی اور ظلمت کے مہیب طوفانوں میں شمع جلانے کا عزم کیا۔ تمام واقعات کا پوری سیاسی بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا، زوال سلطنت کے اسباب پر غور کیا، ملک میں بسنے والی سب قوموں کے نقطہ نظر کا انداز لگایا، امرا و سلاطین کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو پرکھا اور پھر اصلاح احوال کے لیے کام کا ایک نقشہ تیار کیا۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شاہ صاحب کے اسلاف میں سے دو ایک کے سوا (جن کا ذکر گزشتہ صفحات

❶ حجتہ اللہ البالغہ، ابواب ابتغاء الرزق ج ۲، ص ۱۰۳۔

Marfat.com

میں آچکا ہے) ارباب حکومت اور اصحاب اقتدار سے کبھی کسی کو کوئی تعلق نہیں رہا۔ لیکن اس کے باوجود شاہان مغلیہ کے ہاں شاہ صاحب کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی، وہ ان سے اس درجہ عقیدت رکھتے تھے کہ ان کے مدرسے میں آتے، اور ان کی مجلس میں بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانے میں شامل ہونے کو اپنے لیے باعث برکت اور موجب سعادت قرار دیتے تھے۔ شاہی محل کی خواتین بعض اہم امور میں ان سے مشورہ کرتیں اور امرا و وزرا ان کی نصیحت آموز باتوں سے مستفید ہونے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

اس مشاورت اور حاضری کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شاہ صاحب نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے، اور مختلف حلقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ، سلطنت و حکومت کے بعض اہم اور پیچیدہ معاملات سے متعلق ان سے رائے لیتے اور دعا کی درخواست کرتے تھے۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ شاہ صاحب انتہائی سیاسی بصیرت کے مالک تھے، وہ ملک کی فضا سے واقعات کی رفتار کا پوری طرح اندازہ کر لیتے تھے۔ پھر اس کے اظہار میں جو الفاظ استعمال فرماتے، وہ بڑی احتیاط کے حامل ہوتے، وہ الفاظ کتابوں میں مرقوم ہیں اور بلاشبہ شاہ صاحب کی علمی اور فکری بلند پروازی کا عمدہ ترین ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مختلف حضرات کے نام انھوں نے جو مکتوبات تحریر فرمائے، ان میں بھی اس دور کی سیاست اور اس کے بارے میں ان کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت موجود ہے۔

شاہ صاحب کے تلامذہ کرام میں سے ایک بزرگ شیخ محمد عاشق پھلتی تھے، انھوں نے شاہ صاحب کی زندگی ہی میں ''قول الجلی واسرار الخفی'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو شاہ صاحب کے ملفوظات اور حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی ایسے بہت سے واقعات مندرج ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سیاسیات کے نشیب و فراز پر شاہ صاحب گہری نظر رکھتے تھے۔ یہ کتاب خود شاہ صاحب کے ملاحظہ گرامی میں بھی آئی تھی، اور ان کی وفات کے بعد حضرت مصنف نے اس میں ایک باب کا مزید اضافہ کیا تھا۔ اس کتاب کے حوالے سے ہندوستان کے نامور محقق پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی تصنیف ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات'' میں شاہ صاحب کے سیاسی افکار کی وضاحت کی ہے اور بعض اہم واقعات تحریر کیے ہیں۔ ان واقعات میں سے بعض باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ کتاب کی فارسی عبارتوں کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

۱۔ جب رفیع الدرجات (جو اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد چوتھا مغل بادشاہ تھا) مہلک مرض میں مبتلا ہوا اور اس کی زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی، تو سید عبداللہ خان قطب الملک کو (جو سادات بارہ میں نہایت اہم شخصیت کے مالک تھے) اس کے جانشین کی فکر ہوئی۔ خواجہ محمد سلطان اس سلسلے میں مشورے کے لیے شاہ ولی اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، بادشاہ کی اولاد کافی ہے، معلوم نہیں ان میں سے کون تخت حکومت پر بیٹھے گا۔ شاہ صاحب نے روشن اختر کا نام لیا اور کہا کہ وہ مستقبل کا بادشاہ ہوگا۔ خواجہ محمد سلطان کو اس بشارت سے خوشی ہوئی اور شہزادے کو بھی یہ خبر سنا دی، لیکن جب رفیع الدرجات کا انتقال ہوا تو سب نے متفقہ طور پر رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ قول الجلی کے مصنف لکھتے ہیں، یہ بات شاہ صاحب کے لیے تشویش خاطر کا

Marfat.com

باعث ہوئی۔ لیکن پھر بھی بشارت کے ظہور کا انتظار رہا۔ آخر چند روز بعد رفیع الدولہ کا انتقال ہو گیا اور شاہ صاحب کی بشارت پوری ہوئی۔ روشن اختر جس کا لقب محمد شاہ ہے، تخت سلطنت پر بیٹھا ❶۔

۲۔ جب سید محمد عبداللہ خان قطب الملک مذکور نے محمد شاہ کی زندگی میں سلطان ابراہیم کو تخت دہلی پر بٹھایا اور محمد شاہ سے جنگ کا ارادہ کیا تو خواجہ سلطان محمد پھر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ اس جنگ میں کون کامیاب ہوگا؟ محمد شاہ یا ابراہیم؟ شاہ صاحب نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد فرمایا:

مجھے اس طرح دکھایا گیا ہے کہ عبداللہ خان کی تمام فوج منتشر ہو گئی ہے اور اس کا ہاتھی تنہا میدان میں کھڑا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فوج کو شکست ہو گی اور محمد شاہ فتح یاب ہوگا۔ پھر جب دونوں میں جنگ ہوئی تو وہی ظہور میں آیا جس کی شاہ صاحب نے پیش گوئی فرمائی تھی ❷۔

۳۔ ایک شخص نے شاہ صاحب کی خدمت عرض کیا کہ فلاں مہینے میں سلطنت مغلیہ میں انقلاب آ جائے گا، آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا، اس وقت تو کوئی چیز معلوم نہیں ہو رہی، جب کچھ معلوم ہوگا، بتا دیا جائے گا۔ دوسرے دن فرمایا۔ ”میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک اونچا دروازہ ہے، جس پر محمد شاہ اور دو اور شخص بیٹھے ہیں۔ میں بھی وہاں موجود ہوں۔ اتنے میں ایک شخص محمد شاہ کے معزول ہونے کی خبر سناتا ہے اور اس کو ایذا پہنچانا چاہتا ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ اس کو معزول کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی محمد شاہ سے کہتا ہوں کہ یہ شخص تیرا دشمن ہے، اس کو ختم کر دے۔ محمد شاہ کی کمر میں ہتھیار بندھے ہوئے ہیں، لیکن حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور وہ اس شخص سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ شخص بھی محمد شاہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن ڈر محسوس کرتا ہے۔ بالآخر محمد شاہ اس مجلس میں محفوظ رہتا ہے۔“ ____ یہ خواب بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا، ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ایام میں انقلاب سلطنت ہرگز نہ ہوگا ❸۔“

۴۔ قول الجلی میں دہلی پر نادر شاہ کے حملے کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں۔ لکھا ہے کہ ایک دن شاہ صاحب نے فرمایا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ کا ایک دریا امنڈا آیا رہا ہے، اور بڑے بڑے حوادث پیش آنے کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ پھر جو کچھ فرمایا اس کا ترجمہ یہ ہے۔

آباد بستیاں تباہ اور برباد ہو جائیں گی اور ایسی آفت آئے گی کہ ارکان سلطنت اس کا علاج نہ کر سکیں گے اور ایسا بھی نظر آتا ہے کہ دہلی شہر جو ملک کا دار السلطنت ہے، زیادہ تر وہی آفات کی زد میں ہے ❹۔

۱۱۴۸ھ/۱۷۳۶ء کے سال کا آغاز ہوا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان مصائب کا وقت قریب آ گیا

❶ قول الجلی ص ۶۴۔

❷ قول الجلی ص ۶۵۔

❸ ایضاً ص ۸۳۔

❹ قول الجلی ص ۹۰۔

Marfat.com

ہے، جن سے آباد شہر ویران اور بستے ہوئے دیہات وقصبات تباہی سے ہم کنار ہو جائیں گے، اور شہر دہلی بالخصوص ان مصائب کا ہدف بنے گا۔ چنانچہ اس زمانے میں اتنی بارش ہوئی کہ مضبوط تر محل (قصور مشیدہ) گر گئے اور ملک کی بہت بڑی آبادی مصیبتوں کے خوف ناک ریلے میں آ گئی۔ اسی زمانے میں ''غنیم دکھنی'' (مرہٹوں) نے حملہ کیا اور شاہی عساکر کی موجودگی کے باوجود وہ دہلی کے قریب پہنچ گئے اور اس کو تباہ کرنے کا عزم کیا۔

دریا کے کنارے سخت مقابلہ ہوا، کثیر تعداد میں لوگ مارے گئے۔ بہت بڑی جنگ اور تباہی کے بعد اس مصیبت سے نجات حاصل ہوئی۔ اس کے بعد شاہ صاحب کے بعض عقیدت مندوں نے دریافت کیا کہ جس مصیبت کا خطرہ تھا، کیا وہ گزر گئی؟ فرمایا، نہیں، وہ تو آنے والی ہے۔

انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ شاہ نور اللہ، دہلی کے شاہی بازار (''سوق سلطانی'') میں کچھ چیزیں خریدنے کے لیے گئے۔ واپس آئے تو شاہ صاحب نے پوچھا۔

حال اہل بازار چگونہ دیدید؟

(بازار کے لوگوں کو کس حال میں دیکھا؟)

انھوں نے جواب دیا کہ ابھی تک تو محفوظ ہیں لیکن سب پر وحشت سی چھائی ہوئی ہے۔ یہ سن کر شاہ صاحب نے کہا:

ایں بازار رابلسان حال می گویند کہ دریں جا جوہائے خون رواں شوند [1]۔

(یہ بازار زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ یہاں خون کے دریا رواں ہوں گے۔)

اگرچہ اس وقت بہ ظاہر کوئی خاص خطرہ نظر نہ آتا تھا لیکن شاہ صاحب کے ان الفاظ سے لوگوں میں اضطراب اور بے چینی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس سے تقریباً ایک سال بعد دہلی پر نادر شاہ کا حملہ ہوا۔

نادر شاہ کا حملہ اہل دہلی کے لیے نہایت الم ناک فتنہ تھا، جس سے تباہی اور بربادی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ''قول الجلی'' کے بیان کے مطابق نادر شاہ ''ہزاراں ہزار'' افراد کے سفاک ہجوم کے ساتھ ملک کے شہروں اور قصبوں کو روندتا ہوا کرنال پہنچا اور محمد شاہ اس کے مقابلے میں آیا۔ اس زمانے میں کچھ لوگوں نے شاہ صاحب کو خطوط لکھے اور دریافت کیا کہ اب کیا ہوگا؟ آپ نے جواب دیا کہ بہت بڑی مصیبت آئے گی، لیکن محمد شاہ بہ دستور اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔

اس لڑائی میں محمد شاہ کے ۵۲ ہاتھی مارے گئے اور لشکر کا خاصا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ جو لوگ باقی بچے ان پر اتنا رعب چھا گیا کہ ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس موقعے پر ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات'' میں قول الجلی'' کی یہ عبارت درج ہے:

---

[1] قول الجلی، ص ۹۱۔

Marfat.com

باقی ماندگان راعسا کر قزلباش محصور ساختند، دریں میاں عالمی از گرسنگی جان بداد، وسلطان و وزیر ہر دو اسیر شدند❶۔

یعنی جو باقی بچے ان کو عساکر قزلباش (افغانوں) نے گھیرے میں لے لیا، ان دنوں بہت سے لوگوں نے بھوک کی شدت سے جان دے دی۔ بادشاہ اور وزیر دونوں پکڑ لیے گئے۔

وہاں سے چل کر نادر شاہ دہلی میں داخل ہوا، اور تیسرے دن اس نے قتل عام کا حکم دیا۔ صبح سے لے کر تین گھڑی دن گزرے تک اس کے تیس ہزار سواروں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیے رکھا۔ شیخ محمد عاشق پھلتی افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ہر جان داری کہ یافتند از انسان وحیوان ہمہ را بہ تیغ کشیدند تا سگ و گربہ را ہمدراں میاں نگزاشتند و شہر را آتش دادہ بازار ہا و کوشکہا را بسوختند ____ از کشتگان پشتہ ہا بر پا شدند، و در بازار ہا خصوصاً در سوق سلطانی کہ بہ چاندنی چوک مشہور است جوہائے خون رواں گردید❷۔

(نادر شاہ کے فوجی) جس جان دار کو پاتے، وہ انسان ہوتا یا حیوان اسے قتل کر دیتے۔ یہاں تک کہ انھوں نے کتوں اور بلیوں کو بھی نہ چھوڑا، شہر کے بازاروں اور مکانوں کو آگ لگا دی...... مقتولوں کے ڈھیر لگ گئے۔ سوق سلطانی (شاہی بازار) میں جو چاندنی چوک کے نام سے مشہور ہے، خون کی ندیاں بہہ گئیں۔)

شہر دہلی کی حالت اس زمانے میں انتہائی ابتر تھی۔ نہ اس میں کوئی داخل ہو سکتا نہ اس سے باہر جا سکتا تھا، نہ کھانے کی کوئی چیز میسر تھی، نہ عام استعمال کے لیے کچھ حاصل ہوتا تھا۔ ہزاروں آدمی بھوک سے بے تاب ہو کر مر گئے۔ گلی کوچے لاشوں سے اٹے پڑے تھے، ان کو دفن کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ان کی عفونت سے بے شمار لوگ دم توڑ گئے۔ ملکی حالات اس قدر بگڑ گئے کہ مغل حکومت کے باقی رہنے کا بھی کسی کو یقین نہ تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ نادر شاہ دہلی کو لوٹ کر تمام نئے اور پرانے خزانے اپنے ساتھ لے گیا۔ اور شاہ صاحب نے اپنی سیاسی بصیرت کی بنا پر جو یہ پیشین گوئی کی تھی کہ محمد شاہ بہ حیثیت بادشاہ موجود رہے گا، وہ پوری ہوئی۔

اس ہنگامہ خیز اور الم ناک دور میں شاہ صاحب کے بہت سے عقیدت مندوں نے ان کو خطوط لکھے اور دعا کی درخواست کی۔ شاہ صاحب نے سب کو تسلی دی، اور لکھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں، تمام متعلقین محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ان کے سب متعلقین و معتقدین بھی محفوظ رہے اور ان کا محلّہ بھی اللہ کے فضل سے محفوظ رہا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر جو مسلسل حملے کیے، ان کا ذکر ''القول الجلی'' میں شیخ محمد عاشق پھلتی نے متعدد مقامات پر کیا ہے۔ ان حملوں کے ملک کی سیاسی فضا پر جو اثرات مرتب ہوئے اور جو نتائج نکلے، ان کی نشان دہی بھی کی ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ''شاہ ولی اللہ

❶ قول الجلی ص ۹۲۔

❷ قول الجلی، ص ۹۳۔

Marfat.com

کے سیاسی مکتوبات'' کے مقدمے میں اسے خاصی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دہلی میں اس سے جو اضطراب پھیلا اور بے چینی پیدا ہوئی، قول الجلی کے حوالے سے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً شاہ صاحب کے حلقہ تعلقات کے بعض بزرگوں۔۔۔۔خواجہ حبیب اللہ کشمیری اور عمر خان قصوری۔۔۔۔۔نے ان سے پوچھا کہ اس دور پُر آشوب میں ہم اپنا مال و اسباب کہاں منتقل کریں اور اپنی حفاظت کے لیے کیا قدم اٹھائیں؟ شاہ صاحب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:

ما و ہمہ مخلصان ما بلکہ تمام اہل شہر دریں شور و فتنہ ان شاء اللہ محفوظ خواہم ماند و خدائے تعالیٰ لطیفہ خواہد پیدا کرد کہ امن از جمیع وجوہ ظہور خواہد آمد❶۔

(ہم اور ہمارے مخلصین بلکہ تمام باشندگان دہلی اس فتنے میں محفوظ رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ایسی صورت ظاہر فرما دے گا کہ امن کی فضا پیدا ہو جائے گی۔)

شیخ محمد عاشق پھلتی لکھتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور باشندگان دہلی محفوظ رہے۔

یہ انتہائی فتنہ خیز دور تھا، ہر طرف ہنگامے بپا تھے اور ملک کی حالت نہایت خراب ہوگئی تھی۔ مرہٹوں نے بالخصوص بہت طاقت پیدا کرلی تھی اور وہ سلطنت مغلیہ کے لیے زبردست مصیبت بن گئے تھے۔ ان کی طاقت کو پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی نے ختم کیا۔ احمد شاہ ابدالی یکم نومبر ۱۷۶۰ء کو پانی پت کے میدان میں پہنچا، اس سے دو روز پہلے ۲۹ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو مرہٹہ جرنیل سداشیو راؤ بھاؤ پانی پت کے میدان میں اپنی فوجیں اتار چکا تھا۔ ابدالی کی افغان فوجوں اور مرہٹوں کے درمیان ڈھائی مہینے تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو ابدالی نے شدید جنگ کے بعد مرہٹوں کو شکست فاش دی۔ سداشیو راؤ بھاؤ اور پیشوا کا بیٹا وشواس راؤ میدان جنگ میں مارے گئے، اور بقول ایک مؤرخ کے مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں کی اس بہت بڑی طاقت کا جس نے ہندوستان کی مغل حکومت کو انتہائی پریشان کر رکھا تھا، اس جنگ کے نتیجے میں ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود مرہٹوں کے مرکز میں کوئی گھر ایسا نہ تھا، جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو، مرہٹہ لیڈروں کی ایک پوری نسل ایک ہی معرکے میں صفحۂ ہستی سے غائب ہوگئی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی اس دور کے ہندوستان کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھے ہیں: کہ

''پانی پت کا میدان کارزار حقیقت میں شاہ ولی اللہ کا سجایا ہوا تھا❷۔''

شاہ صاحب نے ملک کی سیاسی ابتری کو ہدف فکر ٹھہرایا تو اس کی اصلاح کے لیے ان کی نظر دو شخصیتوں پر پڑی۔ ایک ملک سے باہر احمد شاہ ابدالی پر، دوسرے ملک کے اندر نجیب الدولہ پر! احمد شاہ ابدالی اپنی دیگر

❶ قول الجلی، ص ۶۰۔

❷ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۴۲۔

Marfat.com

خوبیوں کے ساتھ اس خوبی کا بھی مالک تھا کہ تمام افغان فوج اس کے زیر کمان تھی، اور نجیب الدولہ میں یہ صفت پائی جاتی تھی کہ روہیلوں کی عسکری طاقت اس کے تابع فرمان تھی۔ اپنے مکتوبات میں شاہ صاحب نجیب الدولہ کو بے حد اہمیت دیتے ہیں۔ اور اسے ''رئیس الغزاۃ'' اور ''راس المجاہدین'' کے پُرعظمت خطاب سے مخاطب فرماتے ہیں۔

ملک کے انتہائی بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کے لیے ان شخصیتوں کا انتخاب شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت پر دلالت کرتا ہے۔ روہیلوں کی جنگی صلاحیت اور فوجی قوت سب کے نزدیک مسلمہ تھی۔ ان کا رہنما نجیب الدولہ بھی عظیم سیاسی مدبر، بہادر سپاہی اور دور اندیش جرنیل تھا۔ شاہ صاحب نے اپنے وقت کی ان دو ممتاز شخصیتوں کو ایک ہی مقصد کی تکمیل کے لیے متعین کر کے انتہائی حقیقت شناسی کا ثبوت بہم پہنچایا۔

بہر کیف شاہ ولی اللہ صاحب کا ذہن سیاسی لحاظ سے بہت زرخیز تھا۔ انھوں نے اس بات کی کھل کر وضاحت کی ہے کہ ملک کی سیاسی ترقی کا راز پانچ چیزوں میں مضمر ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ ملکی خزانے میں کسی موقعے پر بھی کمی واقع نہ ہو۔ خزانہ ہر آن بھرپور رہنا چاہیے، تاکہ افواج شاہی اور تمام ملازمین سلطنت کی تنخواہیں بروقت ادا ہوتی رہیں اور حکومت کی مخالفت کا کوئی خطرہ کسی طرف سے باقی نہ رہے۔

۲۔ ملک میں جاگیرداروں کی کثرت نہیں ہونی چاہیے، ان کی تعداد جہاں تک ممکن ہو کم کر دینی چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی بہت سی جاگیرداریوں کی بنا پر زمین چھوٹے چھوٹے قطعوں کی شکل میں بے شمار حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ جاگیر کے رقبے میں اضافے کی وجہ سے مرکزی حکومت کا استحکام متاثر ہوتا ہے، اور وہ جاگیرداروں کے رحم و کرم کی محتاج ہو جاتی ہے۔ جاگیریں جتنی زیادہ ہوں گی اسی قدر حکومت کے نظم و نسق کا ڈھانچا کمزور ہوگا۔ اور کاشت کار پریشانی میں مبتلا ہوں گے، جس سے ملکی سیاست کے مجروح ہونے کے امکانات ابھریں گے۔

۳۔ ملک کے تمام گروہوں کو اعتدال میں رکھا جائے۔ کسی گروہ کی کسی معاملے میں اس طرح اجارہ داری نہیں ہونی چاہیے کہ وہ معاشرے کے کم زور افراد کو مالی یا ذہنی تکلیفوں میں مبتلا کر دے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ملک کے سیاسی حالات مستحکم نہیں رہ سکیں گے۔

۴۔ ملک کی فوج بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ملکی سرحدوں کی حفاظت کا عظیم فرض فوج ہی سرانجام دیتی ہے۔ اس کی تنخواہیں باقاعدگی کے ساتھ وقت پر ادا کی جائیں۔ اسے کسی قسم کی شکایت نہ پیدا ہونے دی جائے۔

۵۔ خالصہ کا علاقہ محدود نہ رکھا جائے، جہاں تک ہو سکے اسے وسیع کیا جائے۔

''خالصہ'' اس علاقے کو کہا جاتا تھا، جو براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتا تھا، یعنی ''خالصہ'' سے مراد

Marfat.com

وہ علاقہ ہے جو مرکزی حکومت کے انتظام یا اختیار میں ہو۔ دور بادشاہت میں علاقہ خالصہ کے محاصل اپنے مقرر کردہ حکام کے ذریعے خود بادشاہ وصول کرتا تھا۔ اس کے برعکس جاگیر کا علاقہ وہ کہلاتا تھا جس کے محاصل جاگیردار وصول کرتے تھے اور جس کا مرکزی حکومت سے براہ راست کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔

دہلی کے تخت حکومت پر جتنے بھی بڑے بڑے حکمران متمکن ہوئے وہ سب اس کوشش میں رہتے تھے کہ خالصہ کے علاقے میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے، کیونکہ اگر خالصہ کا علاقہ زیادہ ہوتا اور اس سے معقول آمدنی ہوتی تو بادشاہ آمدنی کے لحاظ سے صوبائی گورنروں اور علاقائی جاگیرداروں کا محتاج نہیں ہوتا تھا، مرکزی دفاتر اور بادشاہ کے محل کے اخراجات کے لیے جس قدر رقم کی ضرورت ہوتی، وہ برابر اس علاقے سے بادشاہ کو وصول ہوتی رہتی جو براہ راست بادشاہ کے قبضے میں ہوتا تھا، اور اس علاقے کو ''خالصہ'' سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اگر کبھی صوبائی حکومتیں یا بعض علاقوں کے جاگیردار بادشاہ سے بغاوت بھی کر دیتے اور محاصل ادا کرنے سے انکار کر دیتے، جب بھی خالصہ کی آمدنی سے مرکزی حکومت کے اخراجات بلاکسی تکلیف کے پورے ہوتے رہتے تھے۔

ظہیر الدین بابر کے حالات میں کتب تاریخ میں مرقوم ہے کہ جب اس نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور اس پر حکومت کرنے لگا تو مختلف حاکموں کو اس نے جاگیریں عطا کیں، لیکن ''خالصہ'' میں اضافے کا پورا خیال رکھا۔ کہتے ہیں، اس نے بہار کی جاگیر ایک شخص محمد زمان کو دی، لیکن ایک کروڑ پچیس لاکھ کے محاصل کے علاقے کو خالصہ قرار دے دیا۔

شاہ ولی اللہ نے خالصہ کے علاقے میں اضافے پر جو زور دیا اور اسے مرکزی حکومت کے استحکام کا بہت بڑا ذریعہ قرار دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے زمانے میں اس میں بہت کمی واقع ہو گئی تھی اور جاگیرداروں کا سلسلہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ صوبہ دہلی کے دیہات اور بعض دوسرے صوبوں کے گاؤں جو پہلے خالصہ میں شامل تھے اور جن سے بادشاہ کے مرکزی دفاتر اور ذاتی ملازموں کی تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں، سب کے سب ہاتھ سے نکل گئے تھے۔

سہارن پور، جس کے محاصل جاگیرداروں کو دے دیے گئے تھے، نجیب خان روہیلہ کے قبضے میں آ گیا تھا۔ آگرہ کے گرد و نواح کے علاقے جاٹوں کے انصرام میں تھے، جے پور کے مادھو سنگھ نے نارنول وغیرہ کے علاقوں پر تسلط جما لیا تھا۔ اسی طرح اور بھی بعض جاگیرداروں نے خالصہ کے علاقوں کو اپنے قبضے میں کر کے بادشاہ کو مالی اعتبار سے اس درجے بے بس کر دیا تھا کہ بعض دفعہ فوجیوں اور ملازموں کی تنخواہیں ادا کرنا بھی اس کے لیے انتہائی مشکل ہو جاتا تھا۔

شاہ صاحب کی فراست اور سیاسی بصیرت ملاحظہ ہو کہ وہ اپنے ان خطوط میں جو انھوں نے بادشاہوں، وزیروں اور مملکت کے امیروں کے نام تحریر کیے صاف لفظوں میں مشورہ دیتے ہیں، کہ ''خالصہ'' کے علاقے کو

Marfat.com

اس قدر وسیع ہونا چاہیے کہ دہلی کے گرد ونواح کا پورا علاقہ خالصہ میں شامل ہو، پھر وہاں سے وہ آگرہ، حصار، دریائے گنگا، اور سرہند تک ممتد ہوتا چلا جائے۔ اس کے لیے ان کے الفاظ قابل مطالعہ ہیں فرماتے ہیں:

خالصہ را کشادہ تر باید ساخت، خصوصاً آنچہ گردا گرد شاہ جہان آباد است، تا اکبر آباد و تا حصار و تا دریائے گنگ تا حد حدود سہرند، ہمہ اش یا اکثرش خالصہ شریف باشد کہ موجبِ ضعفِ امورِ سلطنت کمیِ خالصہ و قلتِ خزانہ است ❶۔

(علاقہ خالصہ کو وسیع تر کرنا چاہیے، خصوصاً وہ علاقہ جو دہلی کے اردگرد واقع ہے، آگرہ، حصار، اور دریائے گنگا اور حدود سرہند تک کا تمام تر علاقہ یا اس کا اکثر علاقہ خالصہ ہونا چاہیے کیونکہ امور سلطنت میں ضعف کا باعث خالصہ کی کمی اور خزانے کی قلت ہوتی ہے۔)

شاہ صاحب کی بلندیٔ فکر کا اندازہ کیجیے کہ مرکز کے استحکام کے لیے وہ اربابِ حکومت اور بادشاہ کو صاف لفظوں میں مشورہ دیتے ہیں کہ چھوٹے منصب داروں کو جاگیریں نہ دی جائیں، اور علاقہ خالصہ کو وسعت دی جائے، تاکہ مرکزی حکومت میں کمزوری کے آثار نمودار نہ ہوں۔

بہرحال شاہ صاحب نے حکومت کے استحکام اور سیاسی ترقی کے لیے جو یہ پانچ اصول بیان کیے اس زمانے کے لحاظ سے وہ بلاشبہ اپنی جگہ بڑے اہم اور ان کی بے پناہ سیاسی بصیرت کے عکاس تھے۔

مکتوبات:

شاہ ولی اللہ صاحب کے افکار عالیہ میں ان کے مکتوبات بھی شامل ہیں، جو انھوں نے مختلف مواقع پر ہند اور بیرون ہند کے متعدد حضرات کے نام تحریر فرمائے۔ یہ مکتوبات عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں، اور ایک مستقل علمی ذخیرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں بعض خطوط تو وہ ہیں جو انھوں نے اپنے بعض اساتذہ کی خدمت میں ارسال کیے۔ بعض اس دور کے علما و زعما کو تحریر فرمائے۔ بعض خطوط مختلف مسائل دریافت کرنے اور ضروری معاملات کے متعلق استفسار کرنے والوں کو لکھے۔ بعض خطوط بالکل علمی، مذہبی اور خالص فقہی نوعیت کے ہیں اور بعض کا تعلق ذاتی اور نجی قسم کے معاملات سے ہے۔ ان میں بیالیس (۴۲) خطوط سیاسی نوعیت کے ہیں جو پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مرتب کر کے شائع کر دیے ہیں۔ ان خطوط میں ایک خط ایک مغل بادشاہ کے نام ہے۔ کچھ وزرائے سلطنت اور امرائے مملکت کے نام ہیں۔ کچھ خطوط ملک کی بعض اہم شخصیتوں کے نام ہیں اور ایک طویل خط افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کے نام ہے۔ اس خط میں شاہ صاحب نے اس دور کے ہندوستان کے سیاسی حالات، تاریخی واقعات اور قابل اصلاح امور کی وضاحت کی ہے، اور سلطنت کے امرا و وزرا کی سازشوں اور باہمی رقابتوں کا ذکر کیا ہے۔ نیز مرہٹوں، جاٹوں اور دیگر قوموں نے ملک میں جو اودھم

❶ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مکتوب اول ص ۴۔

Marfat.com

مچار کھا تھا، اس کی ضروری تفصیلات بیان کر کے احمد شاہ ابدالی سے درخواست کی ہے کہ وہ صورت احوال کی اصلاح کے لیے مضبوط قدم اٹھائے۔ چنانچہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا کہنا ہے کہ اس خط کے بعد احمد شاہ ابدالی نے جو پہلے کئی بار ہندوستان پر حملے کر چکا تھا، پھر ہندوستان کا رخ کیا اور پانی پت میں مرہٹوں سے زبردست جنگ کی۔ اس جنگ میں مرہٹوں کو احمد شاہ کے مقابلے میں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ نظامی صاحب لکھتے ہیں:

اس خط کے نتیجے میں پانی پت کا میدان کارزار سجا۔ اس جنگ کی تاریخی اہمیت سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ لیکن یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مدرسہ رحیمیہ کا ایک مدرس اس تاریخی جنگ کے نقشے تیار کر رہا تھا۔ اس خط کے مطالعے کے بعد شاہ صاحب کی سیاسی خدمات کا ایک اہم پہلو روشن ہو جاتا ہے [1]۔

بیالیس مکتوبات کے اس مجموعے میں سولہ خط شیخ محمد عاشق پھلتی کے نام ہیں۔

یہاں شیخ محمد عاشق پھلتی کا تعارف کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ شیخ ممدوح بارھویں صدی ہجری کے ایک مشہور بزرگ تھے جو شاہ ولی اللہ کے ماموں شیخ عبیداللہ صدیقی کے بیٹے تھے۔ موضع پھلت (ضلع مظفر نگر ہندوستان) کے باشندے تھے۔ اپنے عہد کے جید عالم اور متقی بزرگ تھے۔ عرصے تک شاہ صاحب کی صحبت و رفاقت میں رہے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۱ء میں شاہ صاحب حجاز مقدس گئے تو یہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان کی علمی رفعت اور سلوک و طریقت میں درک کا یہ عالم تھا کہ شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین نے ان سے فیض حاصل کیا اور ان کی زبانی اپنے جلیل القدر باپ (حضرت شاہ ولی اللہ) کے معارف و تصوف سے متمتع ہوئے۔ سبیل الرشاد، قول الجلی اور شرح دعاء الاعتصام ان کی تصانیف ہیں۔ ۱۱۸۷ یا ۱۱۸۸ھ/۷۳-۱۷۷۴ء میں فوت ہوئے۔

بے شک شاہ ولی اللہ اپنے دور کی عظیم شخصیت تھے۔ ان کے افکار و خیالات کا سلسلہ نہایت وسعت پذیر تھا۔ وہ جس مسئلے پر گفتگو کرتے اور جس معاملے کو موضوع بحث ٹھہراتے، اس کے تمام پہلوؤں کو واضح اور مصرح کرتے جاتے۔ اس کا اندازہ ان کے مکتوبات سے بھی ہوتا ہے۔ جس طرح وہ اپنی تصانیف میں پورے زور اور دلائل سے بات کرتے ہیں، مکتوبات میں بھی انھوں نے اسی اسلوب انشا اور طرز نگارش کو برقرار رکھا۔ قلم میں وہی زور، استدلال میں وہی قوت، الفاظ کے انتخاب میں وہی احتیاط اور بیان و کلام میں وہی اعتدال ہے، جو ان کی باقاعدہ تصانیف کا طرۂ امتیاز ہے۔

شعر و شاعری:

شاہ ولی اللہ صاحب شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے اور خوب صورت شعر کہتے تھے، امین تخلص کرتے تھے۔ عربی اور فارسی میں ان کے اشعار کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے، ان کی متعدد غزلیں اور رباعیاں

[1] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ص ۵۴۔

Marfat.com

معرفت وتصوف کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

علمے کہ نہ ماخوذ زِ مشکوٰۃ نبی است — واللہ کہ سیرابی از وتشنہ لبی است
جائیکہ بود جلوۂ حق حاکم وقت — تابع شدن حکم خرد بولہبی است
"نخستین بادہ کاندر جام کردند" ❶ — مزاجش عکس آں گلفام کردند
شراب وحدت از خمخانۂ غیب — مراصبح ازل در کام کردند
چوغلطیدم زمستیہا بہر سو — حریفاں مستی از من دام کردند
ولی دارم زخود خالی حبابش میتواں گفتن — درو کیفیت جوش شرابش میتواں گفتن
وجود بے نمود معنی نادیدنی دارد — درین نیرنگہا بوئے عبابش میتواں گفتن
سوید ای دل ماپابی اندر پیچ و تاب او — نفوس عالم ام الکتابش میتواں گفتن
فرو پاشید از ہم کثرت موہوم چوں شبنم — زفیض معنی ما آفتابش میتواں گفتن

غزل کے چند شعر پڑھیے:

تا بکے محنت مہجوری و دوری بکشم — نازنین وطنم سوئے وطن بازروم
تا بکے باخس و خاشاک بود صحبت من — صدر بزم چمنم سوئے چمن بازروم
تا بکے ہمدمی سنگ شود شیوۂ من — گوہرے از عدنم سوئے عدن بازروم
تا بکے بستۂ زنجیر تعلق باشم — آہوئے از ختنم سوئے ختن باز روم
بوئے جان میر سد از بادیمن دردوجہاں — شاہ ملک یمنم سوئے یمن بازروم

چند شعر عربی کے ملاحظہ فرمائیے:

كان نجوما اومضت فی الغیاهب — عیون الافاعی اورؤس العقارب
ثلث خصال من تعاجیب ربنا — نجابة اعقاب لوالدطالب
خلافة عباس و دین نبینا — تزاید فی الاقطار من كل جانب
یؤید دین الله فی كل دورة — عصائب تتلو مثلها من عصائب
فمنهم رجال یدفعون عدوهم — بسمرا لقنا والمرهفات القواضب
ومنهم رجال یغلبون عدوهم — باقوی دلیل مفحم للبغاضب
ومنهم رجال بینوا شرح ربنا — وما كان فیه من حرام وواجب

❶ یہ مصرع صوفی شاعر فخر الدین ابراہیم عراقی (۱۲۱۳ھ-۱۲۸۹ء/۷۹۷ا-۱۸۷۲ء) کی ایک غزل کا ہے۔ دوسرا مصرع یہ ہے "زچشم مست ساقی وام کردند"۔ شاہ صاحب نے اس مصرعے کو تضمین کیا ہے، لیکن تذکرہ نگار نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، جس سے عام قاری کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ مصرع شاہ صاحب کا ہے۔

Marfat.com

ومنهم رجال يدرسون كتابه — بتجويد ترتيل وحفظ مراتب
ومنهم رجال فسروه بعلمهم — وهم علمو نامابه من غرائب
ومنهم رجال بالحديث تولعوا — وماكان فيه من صحيح وذاهب
ومنهم رجال مخلصون لربهم — بانفاسهم خصب البلاد الاجادب
ومنهم رجال يهتدى بعظاتهم — قيام الى دين من الله واصب
على الله رب الناس حسن جزائهم — بمالا يوافى عده ذهن حاسب
فمن شاء فليذكر جمال نبيه — ومن شاء فليغزل بحب الربائب
ساذكر حبى للحبيب محمد — اذا وصف العشاق حب الحبائب

اذا اخبرت يوما عن ضياء — فلا تلهج ببدر اوذكاء
وان تمدح بجود اوسمو — فلا تنظر لجود او سماء

وان لابد تمدح ذا معال! — فحسبك مدح خير الانبياء
وان تمدح رسول الله يوما — فحاز ران تقصر فى الثناء

شاہ صاحب کے عربی اور فارسی کے بہت سے اشعار کا پتا چلتا ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف چند شعر درج کیے گئے ہیں۔

آخری مرض اور وفات:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء کے محرم کی آخری تاریخ کو ہفتے کے دن باسٹھ سال عمر پا کر دہلی میں انتقال فرمایا۔ ان کے آخری مرض اور وفات کے وقت رائے بریلی کے ایک بزرگ سید محمد نعمان حسنی جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے اسلاف میں سے تھے، ان کے پاس موجود تھے۔ انھوں نے رائے بریلی ہی کے اپنے ایک عزیز سید ابوسعید حسنی کو اس کی بعض تفصیلات ایک مکتوب میں تحریر فرمائی تھیں۔ یہ مکتوب فارسی میں ہے، یہاں اس کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔ سید محمد نعمان اور ابوسعید دونوں شاہ صاحب کے مخلصین میں سے تھے۔

اللہ سبحانہ، وتعالیٰ شانہ، کے نام کے ساتھ ___ سب تعریف اللہ کی ہے اس کی نعمتوں پر، رضا بالقضا کے حصول پر، مصیبت و تکلیف میں صبر حاصل ہونے پر، اور درود و سلام سید الشاکرین، زبدۃ الراضین، قدوۃ الصابرین، شفیع المذنبین، رحمتہ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ پر، اور آپ کے آل و اصحاب پر جو کہ طیب و طاہر تھے اور آپ کے وارثین یعنی علمائے راسخین اور اولیائے مرشدین پر، یہ سلسلہ قیام قیامت تک جاری رہے گا۔

Marfat.com

حمد وصلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ امام سنت، مقتدائے ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے زمان، سرآمد اولیائے جہان، قطب زمانی، محبوب سبحانی، سیدنا ومرشدنا ولی اللہ فاروقی مجدد وقت رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر ملال کا واقعہ اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ہم جیسے غم زدہ لوگوں کے لیے عین مناسب ہے۔

چہ بخاطر رسید یارمرا　　کہ بہ ہجراں کشید کارمرا

(یعنی ہمارے دوست کے دل میں کیا آیا کہ ہمیں فراق ومہجوری میں مبتلا کر گیا)

وامصیبتاہ! اللہ کی شان بے نیازی کا یہ عجب نمونہ ہے کہ ایسے مقتدا کی روح کو صرف ۶۲ سال کی عمر میں ارجعی الی ربك راضیته مرضیته۔ (اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف راضی اور پسندیدہ ہو کر واپس جا) کی ندا دی گئی اور اہل بدعت وضلالت کو خوش اور اصحاب دین کو اندوہ گین کر دیا گیا۔ یعنی ہفتے کے دن ظہر کے وقت، محرم کی آخری تاریخ ۱۱۷۶ھ/ ۲۱ اگست ۱۷۶۲ء کو حکم خداوندی سے حضرت کے طائر روح نے قالب عنصری سے پرواز کر کے اوج علیین میں اپنا نشیمن بنالیا۔ آپ کی مفارقت سے آپ کے احباب ورفقاء کی حالت ایسی خستہ وخراب تھی کہ احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتی۔۔۔۔۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں۔ اللہ کے فضل وکرم سے اس عاصی کو حضرت (شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کی کشش نے اپنی طرف کھینچا، چنانچہ ماہ ذی قعدہ (۱۱۷۵ھ یکم جولائی ۱۷۶۲) میں بڈھانہ جا کر آستانہ بوسی کی سعادت حاصل ہوئی، اور آپ کی صحبت اقدس سے شرف یاب ہوا۔ بڈھانہ سے ۹ ذی الحجہ (۱۱۷۵ھ) کو آپ بغرض علاج دہلی تشریف لائے اور بابا فضل اللہ کے مکان پر مسجد روشن الدولہ کے احاطے میں جو چوک سعد اللہ خان میں واقع ہے، فروکش ہوئے۔ فرزندان گرامی قدر میں سے میاں محمد صاحب، میاں عبدالعزیز اور میاں رفیع الدین مدظلہم العالی، اور اقربا وتلامذہ میں سے میاں محمد عاشق صاحب، میاں اہل اللہ صاحب، میاں محمد فائق، میاں محمد جواد اور خواجہ محمد امین وغیرہ حاضر خدمت تھے۔

یہ غلام (یعنی سید محمد نعمان حسنی) میر محمد عتیق اور میر قاسم علی جنھوں نے حضرت کے آخری ایام میں شرف بیعت حاصل کیا تھا، ہر روز خدمت گاری کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے تھے۔

مشفق من!____ یہ آخری مجلسیں بھی عجیب پُر کیف اور پُر فیض تھیں۔ نفحات انس ورحمت اور رشحات قدس وبرکت بارش کی طرح برستے تھے۔ اکثر اہل نسبت حضرات اپنے وجدان صحیح سے اس صورت حال کو محسوس کرتے تھے۔ اہل اللہ اور عاف تو ہمیشہ اور ہر زمانے میں ہوتے ہیں، مگر ایسا مرد حقانی جو جمیع اوصاف حمیدہ کا حامل اور کتاب وسنت کا مجتہدانہ شان سے عالم ہو، نیز حقائق ومعارف میں بحر مواج اور دیگر علوم میں دریائے زخار ہو، صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

دورہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود
بایزید اندر خراساں یا سہیل اندر یمن

Marfat.com

یہ بات بھی لائق تعریف ہے کہ حضرت مرحوم و مغفور کی آپ سے رضامندی اور آپ پر ان کی توجہات عالیہ کو میں نے حد بیان سے زیادہ پایا، آپ کے حالات اکثر اوقات دریافت کرتے رہتے تھے۔

ابدالیوں کی جنگ کا واقعہ اور آپ کا عین اس ہنگامۂ قیامت خیز میں پہنچنا اور آپ کے قدوم گرامی سے آتش فتنہ کا فرو ہو جانا، یہ سب باتیں حضرت اپنی زبان دُرفشاں سے بیان فرمایا کرتے تھے۔ شاید آپ سے آخری ملاقات کی تمنا حضرت کے دل میں تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہ الفاظ فرمائے۔

''میر ابوسعید ارادۂ آمدن دارند، اگر زود برسند بہتر باشد۔''

(میر ابوسعید آنے کا ارادہ کر رہے ہیں، اگر جلدی آ جائیں تو اچھا ہو۔)

صاحب من! حضرت کی ظاہری صحبت تو اب میسر نہیں آ سکتی۔ البتہ علوم دینیہ میں ان کی تصنیفات نوے (۹۰) کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ تفسیر، اصول فقہ، کلام اور حدیث میں جیسے حجۃ اللہ البالغہ، ازالۃ الخفاء عن الخلفاء، اور ترجمہ قرآن، جن میں ہر کتاب کی کافی بڑی ضخامت ہے۔ ان کے علاوہ دیگر رسائل ہیں، جو حقایق و معارف پر مشتمل ہیں، جیسے الطاف القدس، ہمعات، فیوض الحرمین اور انفاس العارفین وغیرہ۔ یہ کتابیں حضرت کے فیوض و برکات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ آپ اس بات کا عزم کریں کہ ان تمام کتابوں کو لکھوا کر رائج فرمائیں گے۔ یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام پا سکتا ہے۔ معلوم نہیں اس قسم کی کتابیں گزشتہ دور میں معرض تصنیف میں آئی ہیں یا نہیں۔ واللہ اعلم۔ ارباب بصیرت ان کتابوں کی افادیت کا اقرار کرتے ہیں۔

حضرت (شاہ صاحب) کا کلام ہر بات میں اصولی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس فقیر کو اور صاحب زادگان گرامی نیز حضرت ممدوح کے تمام رفقائے کرام کو آپ کی حضرت سے محبت کے پیش نظر یہ یقین ہے کہ جیسے ہی آپ اس حادثۂ عظیمہ (یعنی شاہ صاحب کی وفات) کی خبر سنیں گے، دہلی کو روانہ ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے میں بھی آپ کی آمد کا منتظر ہوں۔ اگر آپ جلدی تشریف لائیں میں ملاقات سامی سے مسرور ہو جاؤں۔ اگر تشریف لانے میں کچھ دیر ہو تو مطلع فرمائیں، کیونکہ یہ فقیر بھی واپس وطن آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میاں محمد عاشق صاحب بعد سلام فرماتے ہیں کہ میر ابوسعید کو لکھو کہ حضرت اقدس (شاہ صاحب) کے جتنے مکتوبات بھی ان کے نام لکھے گئے ہیں، ان کی نقول ضرور بھیجیں تاکہ ان کو مکاتیب کے مجموعے میں شامل کیا جائے۔

حضرت میاں اہل اللہ صاحب اور دیگر حضرات نیز (شاہ صاحب کے) صاحب زادگان کی طرف سے سلام قبول فرمائیں۔

بڈھانہ میں حضرت اقدس کی خدمت میں بھائی محمد معین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی کیفیت بیان کر دی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے لیے دعا کی اور نہایت افسوس کا اظہار فرمایا تھا۔

Marfat.com

شاہ صاحب کے فرزندان گرامی:

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اختصار سے بیان کیا جا چکا، مختلف علوم وفنون میں شاہ ولی اللہ کا مرتبہ بہت بلند تھا اور وہ ہر مسئلے میں گہری نظر رکھتے تھے۔ نواب صدیق حسن خان ان کے فضل وکمال کی وسعتوں کا واضح الفاظ میں ذکر کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

وانصاف ایں است کہ اگر وجود او در صدر اول و زمانہ ماضی می بود امام الائمہ وتاج المجتہدین شمردہ می باشد ❶۔

یعنی انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر شاہ صاحب دور اول میں پیدا ہوتے اور زمانہ ماضی سے ان کا تعلق ہوتا تو ائمہ حدیث وفقہ کی عظیم المرتبت جماعت میں وہ امام الائمہ کے مرتبے پر فائز ہوتے اور انھیں مجتہدین کرام کے سرتاج گردانا جاتا۔

شاہ صاحب کی یہ بہت بڑی خوش بختی ہے کہ جس طرح انھوں نے تصنیفات کی صورت میں اپنے پیچھے علم وفضل کا عظیم الشان ذخیرہ چھوڑا، اسی طرح اولاد کی شکل میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص امتیاز بخشا۔ ان کی صلبی اولاد میں چار بیٹے فضل وکمال کے بلند مرتبے کو پہنچے جنھوں نے اپنے عالی قدر باپ کے علمی سلسلے کو باقاعدہ جاری رکھا اور آگے بڑھایا۔

شاہ صاحب کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی شادی اپنے ماموں کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ اس خاتون سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جن کا نام محمد تھا۔ مولانا محمد ایک عالم آدمی تھے اور شاہ صاحب کی وفات کے وقت زندہ تھے، لیکن لاولد انتقال کر گئے۔

پہلی بیوی کی وفات کے بعد شاہ صاحب کی دوسری شادی سونی پت کے ایک بزرگ سید ثناء اللہ کی صاحب زادی سے ہوئی۔ اس نیک بخت خاتون کے بطن سے پانچ بچے متولد ہوئے۔ ایک بیٹی اور چار بیٹے۔ بیٹی کا نام امتہ العزیز تھا، بیٹوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں: شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، اور شاہ عبدالغنی۔ ان کے جو حالات مل سکے وہ تو ان شاء اللہ بشرط زندگی فقہائے ہند کی اگلی جلد (تیرھویں صدی ہجری کے ضمن میں) تحریر کیے جائیں گے لیکن موقعے کی مناسبت سے ان کا مختصر تعارف ذیل کی سطور میں کرایا جاتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز:

آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔ ان کی ولادت ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ (۳۰ ستمبر ۱۷۴۶ء) میں ہوئی۔ تمام علوم مروجہ کی باقاعدہ تحصیل کی۔ نہایت ذہین اور حاضر جواب تھے۔ باپ کی وفات کے بعد ان کی مسند درس پر متمکن ہوئے۔ ساٹھ برس تک طلبائے علم کو علم حدیث اور

❶ اتحاف النبلاء، ص ۴۳۰۔

Marfat.com

دیگر علوم اسلامی کا درس دیتے رہے۔ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے نامور حضرات کے اسمائے گرامی شامل ہیں، جنھوں نے بالخصوص علم حدیث کی بہت اشاعت کی۔ شاہ عبدالعزیز کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ تین بیٹیاں تھیں، جن میں سے ایک کی شادی مولانا عبدالحی سے، دوسری کی شاہ رفیع الدین کے بیٹے مولانا عیسٰی سے اور تیسری کی شیخ محمد افضل سے ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات کو اہل علم میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور مختلف مسائل میں ان کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ انھوں نے ۸۰ سال عمر پائی اور ۷ شوال ۱۲۳۹ھ (۱۷ جولائی ۱۸۲۴ء) کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔

شاہ رفیع الدین:

آپ شاہ ولی اللہ کے دوسرے فرزند تھے۔ ۱۱۶۳ھ (۱۷۴۹ء) میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل میں یگانہ روزگار تھے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں، تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا اردو زبان میں ترجمہ کیا، جو ہر حلقے میں مقبول ہے۔ ۷۰ برس کی عمر کو پہنچ کر ۶ شوال ۱۲۳۳ھ (۹ اگست ۱۸۱۸ء) کو اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں انتقال کیا۔ اپنے والد بزرگوار کے قریب پائیں کی طرف مدفون ہوئے۔

شاہ عبدالقادر:

شاہ ولی اللہ کے تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادر تھے جو ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء) میں پیدا ہوئے اور علوم بوقلموں میں مرتبۂ اجتہاد کو پہنچے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر فنون متداولہ میں خوب مہارت پیدا کی۔ تقوے اور صالحیت میں ممتاز تھے۔ عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ان کا رفیع الشان کام ہے۔ یہ ترجمہ ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۱ء) میں مکمل ہوا۔ ''موضح القرآن'' اس کا نام ہے۔ ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ (۲۷ جون ۱۸۱۵ء) کو سفر آخرت اختیار کیا۔ اردو میں سب سے پہلے قران مجید کا ترجمہ شاہ عبدالقادر نے کیا۔

شاہ عبدالغنی:

شاہ ولی اللہ کے چوتھے فرزند شاہ عبدالغنی تھے۔ انھوں نے اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح زیادہ شہرت نہیں پائی، لیکن اس کمی کو ان کے فرزند عالی قدر حضرت شاہ اسماعیل شہید نے پورا کر دیا۔ شاہ شہید نے شاہ عبدالعزیز کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور اپنے جد امجد حضرت شاہ ولی اللہ کے کمالات علمی اور معارف روحانی میں درجہ کمال کو پہنچے، اور پھر اپنے عمل و کردار سے اس کی خوب اشاعت کی۔ انھوں نے اس برصغیر کے مسلمانوں کی مذہبی، دینی اور سیاسی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور اپنی خدمات نوع بنوع سے انوکھے اسلوب کار کی طرح ڈالی، جس کی ضروری تفصیلات سلسلہ فقہائے ہند کی آئندہ جلدوں میں بیان کی جائیں گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے فرزندان گرامی کا یہ مختصر سا تعارف ہے۔ پوری اسلامی دنیا شاہ صاحب اور ان کی اولاد کے فیوض علمی و عملی سے بہرہ یاب ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی، ان کے حالات و سوانح

Marfat.com

بھی بے شمار حضرات نے تحریر کیے اور آئندہ کرتے رہیں گے، لیکن افسوس ہے، اس وقت اس عالم آب وگل میں اس خاندان کا کوئی فرد موجود نہیں۔ نواب صدیق حسن خاں کی تصنیف ''اتحاف النبلاء'' ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں طبع ہوئی تھی۔ وہ اس میں شاہ ولی اللہ کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ولیکن دریں وقت ایں خاندان علم وکمال بتما مہا منقرض شدہ۔ دہیچ یکی ازاں ہا باقی نماندہ ❶۔

(اس وقت یہ پورا خاندانِ علم وکمال ختم ہو چکا ہے اور ان میں سے کوئی شخص اس دنیا میں باقی نہیں ہے۔)

قرآن مجید کا اردو ترجمہ:

آج اردو زبان بے حد ترقی کر چکی ہے، بہت سے علوم وفنون اس میں منتقل ہو گئے ہیں اور یہ ایک علمی زبان بن گئی ہے۔ اس میں اب قرآن مجید کے بہت سے ترجمے موجود ہیں، جن سے ہم استفادہ کرتے ہیں، لیکن آج سے ڈھائی سو سال پہلے کے حالات کو سامنے رکھیے، جب اردو زبان بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی، پورے ہندوستان میں اس زبان میں چند گنتی کی کتابیں لکھی گئی تھیں اور اہل علم میں اس زبان میں تحریر وکتابت کا رواج نہ تھا۔ نہ اس کے اصول وقواعد وضع ہوئے تھے، نہ یہ علمی زبان بنی تھی اور نہ اس میں الفاظ کا ذخیرہ موجود تھا۔ اس زمانے میں اردو زبان کو ترجمے کی زبان بنانا اور ترجمے کے لیے بھی قرآن مجید کا انتخاب کرنا علمی لحاظ سے بہت مشکل اور دل گردے کا کام تھا۔

ترجمے کے سلسلے میں یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ ترجمہ کرنے والے کے لیے کم سے کم تین اوصاف کا حامل ہونا ضروری ہے۔

۱۔ جس زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہے، اس میں مہارت رکھتا ہو۔

۲۔ جس زبان سے ترجمہ کرنا چاہتا ہے اس پر عبور ہو۔

۳۔ جس موضوع کی کتاب ترجمے کے لیے منتخب کی گئی ہے، اس موضوع کو خوب سمجھتا ہو۔

شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر بے شک عربی زبان کے ماہر تھے، مروجہ علوم وفنون میں بھی عبور رکھتے تھے۔ لیکن اردو زبان تو ان کے زمانے میں بالکل ابتدائی دور میں تھی اور اس کا دامن ابھی الفاظ وتراکیب کی وسعت سے زیادہ آشنا نہ ہوا تھا۔ اس میں قرآن مجید کا ترجمہ کرنا محض نصرت خداوندی اور ان بزرگوں کی بے پناہ ذہانت کی دلیل ہے۔

بہر حال شاہ ولی اللہ صاحب کے فرزندان گرامی ـــــ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر ـــــ کی بہت بڑی دینی خدمت، قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ جس طرح خود شاہ صاحب نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کر کے عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، اسی طرح ان کے بیٹوں نے بھی یہ عدیم المثال خدمت انجام دی۔ رحمہم اللہ تعالی

❶ اتحاف النبلا ص ۴۳۱۔

Marfat.com

ی

۹۹۔ مولانا یار محمد لاہوری

بارھویں صدی ہجری میں خطہ لاہور کے جن علمائے کرام نے خاص طور پر شہرت حاصل کی ان میں مولانا یار محمد کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ مولانا ممدوح اپنے وقت کے فاضل بزرگوں میں گردانے جاتے تھے۔ لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو ونما پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور مختلف اساتذہ سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ پھر حجاز کی ارض مقدس کا قصد کیا اور حج و زیارت کی نعمت سے مالا مال ہوئے۔ بعد ازاں مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور خدمت دین کو مقصد حیات ٹھہرایا۔ اپنے گونا گوں اوصاف کی بنا پر لوگوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور بڑی عزت و تکریم کے مالک تھے۔ اسلامی معاملات میں جری اور غیور تھے۔ امور دینیہ کی اشاعت اور تائید حق میں بحث و مناظرہ میں تیز تھے۔

اس ضمن میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہ عالم سریر آرائے سلطنت ہند ہوا تو اس نے تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد یہ حکم جاری کر دیا کہ مملکت ہند کی تمام مسجدوں کے خطیب خطبہ عیدین اور خطبہ جمعہ میں خلفائے راشدین کے ذکر میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لیں تو ان کے ساتھ لفظ ''وصی'' استعمال کریں۔ اس حکم پر پورے ملک میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور مساجد کے خطیبوں اور عوام اہل سنت نے شدید احتجاج کیا اور مختلف مقامات میں سخت ہنگامے ہوئے۔ ان مقامات میں لاہور اور احمد آباد بھی شامل ہیں۔ یہاں کے لوگ میدان میں نکل آئے۔ احمد آباد میں تو سخت اشتعال پیدا ہو گیا اور نوبت قتل و غارت تک پہنچ گئی۔ لاہور میں بھی بہت ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی اور لوگ بادشاہ کے اس حکم کی برسر عام مخالفت کرنے لگے۔ علما میں مولانا یار محمد اور مولانا محمد مراد نے بادشاہ کے اس فرمان کو ماننے اور اس پر عمل کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ مولانا یار محمد صورت حال کی وضاحت کے لیے لاہور کے قاضی کے پاس گئے اور کہا کہ بادشاہ یہ حکم واپس لے لے۔ جب معاملہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا تو خود بادشاہ نے علمائے لاہور سے گفتگو کی اور اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو موضوع بحث ٹھہرایا۔

مولانا یار محمد ہی زیادہ تر بادشاہ سے گفتگو کرتے رہے۔ مسئلہ چونکہ نازک منزل میں داخل ہو گیا تھا اور اس میں خود بادشاہ کے ذاتی وقار اور حکم کا سوال تھا، اس لیے بادشاہ کی یہ کوشش تھی کہ اس حکم پر بہر حال عمل کیا جائے۔ مگر مولانا یار محمد یہ قطعاً برداشت نہ کرتے تھے اور ان کا انداز کلام اتنا سخت تھا کہ منتخب اللباب کا مصنف خافی خان اسے ''گستاخانہ'' قرار دیتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

حاجی یار محمد در رد قول پادشاہ گستاخانہ و بے محابا پیش آمدہ با پادشاہ سوال و جواب می نمود، پادشاہ

Marfat.com

برآشفتہ فرمودند کہ ازغضب پادشاہاں نمی ترسی کہ چنیں خلاف آداب مجلس سلاطین مبادرت بکلمہ وکلام می نمائی ❶۔

یعنی حاجی یار محمد نے بادشاہ کی بات کے رد میں گستاخانہ اور غیر مؤدبانہ انداز اختیار کیا اور بادشاہ کے حضور سختی سے گفتگو کی۔ بادشاہ اس سے بہت خفا ہوا، اور فرمایا کہ تم بادشاہ کے غضب سے نہیں ڈرتے، اور تلخ کلامی سے پیش آتے ہو جو کہ بادشاہوں کی آداب مجلس کے بالکل منافی ہے۔

مولانا یار محمد چونکہ نہایت جرأت مند عالم دین تھے اور کلمۂ حق کہنے میں کسی کی پروانہ کرتے تھے، بے جھجک بولے۔

حاجی یار محمد در جواب گفت کہ من آرزوئے عطائے چہار چیز از واہب بے نخت خود داشتم، اول تحصیل علم، دوم حفظ کلام اللہ، سوم حج، چہارم شہادت۔ الحمد للہ کی از طرف عطائی سہ نعمت الٰہی کامیاب شدہ ام، آرزوئے شہادت باقی ماندہ، امید دارم کہ از توجہ پادشاہ عدالت اساس کامرواگردم ❷۔

(حاجی یار محمد نے جواب دیا کہ میں بارگاہ خداوندی سے چار چیزوں کی آرزو رکھتا تھا۔ ایک حصول علم کی، دوسرے حفظ قرآن مجید کی، تیسرے حج بیت اللہ کی، اور چوتھے راہ خدا میں شہادت کی۔ الحمد للہ! کہ اللہ نے مجھے پہلی تین چیزوں کی نعمت کے حصول میں کامیاب فرمایا دہے۔ اب آرزوئے شہادت باقی ہے۔ امید رکھتا ہوں کہ بادشاہ کی مہربانی سے اس نعمت کے حصول میں بھی کامیاب ہو جاؤں گا۔)

اس نازک اور اہم مسئلے پر کئی روز تک بحث ہوتی رہی۔ اس اثنا میں تمام لوگ مولانا یار محمد کی حمایت پر اتر آئے اور بادشاہ کے حکم کی برملا مخالفت کرنے لگے۔ منتخب اللباب کا مصنف لکھتا ہے کہ خود بادشاہ کا بیٹا عظیم الشان بھی مولانا ممدوح کا حامی اور بادشاہ کا مخالف ہو گیا۔ چنانچہ بادشاہ نے گہری نظر سے حالات کا جائزہ لیا اور علما، عوام اور خود بیٹے کو اپنے خلاف پایا تو حکم واپس لے لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ لفظ ''وصی'' شامل کرنے سے خطیبوں کو منع کر دیا۔

لیکن حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ اگرچہ بادشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا تھا مگر لوگ مطمئن نہ ہوئے اور کثیر تعداد میں نماز جمعہ میں شریک ہوئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہ لفظ پڑھا گیا تو اس کے خلاف احتجاج کیا جائے گا، لیکن جب انھوں نے خطبہ جمعہ سنا اور لفظ ''وصی'' خطبے میں نہ پڑھا گیا تو اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ پھر جب بادشاہ کو یہ اطلاع پہنچی کہ لوگ مسجد میں ہجوم کر کے آ گئے تھے تو اس نے شدید خفگی کا اظہار کیا اور مولانا یار محمد اور ان کے ساتھی علما کو گرفتار کر کے قلعے میں بند کر دیا۔ اس نے یہ قدم اس لیے اٹھایا کہ اسے شبہ تھا کہ لوگوں کو مسجد میں مولانا یار محمد اور ان کے رفقا نے بھیجا ہے۔ مگر بعد میں صورت حال معمول پر آ گئی اور گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا۔

بہرحال مولانا یار محمد لاہوری اپنے عہد کے مشہور و نامور عالم و فقیہ تھے ❸۔

❶ منتخب اللباب ج ۲ ص ۶۸۲

❷ منتخب اللباب ج ۲، ص ۶۸۲۔

❸ منتخب اللباب کے علاوہ یہ واقعہ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۱۸، ۴۱۹ میں بھی مرقوم ہے۔

Marfat.com

۱۰۰۔ شیخ یٰسین جون پوری

ارض ہند میں علم وفضل اور تصوف وسلوک کے لحاظ سے گزشتہ دور میں صوبہ یوپی کے شہر جون پور کو بڑی خصوصیت حاصل رہی ہے۔ وہاں کے اہل علم اور ذی فضل حضرات نے بے حد شہرت پائی اور تصنیف و تالیف، درس وتدریس اور دیگر اوصاف وکمالات میں بلند مرتبے کو پہنچے۔ انہی حضرات میں ایک عالم دین شیخ یٰسین بن باقر عثمانی جون پوری مازندرانی بھی تھے۔ وہ جون پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی، اور حصول علم کے لیے الٰہ آباد پہنچے۔ وہاں شیخ محمد یحییٰ عباسی (متوفی ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ/ ۳۱ اکتوبر ۱۷۳۱) اور ان کے لائق بیٹے شیخ محمد طاہر عباسی (متوفی ۲ جمادی ۱۱۴۳ھ/ ۲ نومبر ۱۷۳۰ء) کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے۔ کتب درسیہ ان دونوں باپ بیٹے سے پڑھیں۔ شیخ محمد یحییٰ عباسی سے اخذ طریقت بھی کیا اور ایک عرصے تک وہاں رہے، پھر جون پور واپس آ گئے اور شادی کی۔ کچھ مدت بعد بیوی کا انتقال ہو گیا تو گوشہ گیری کی زندگی اختیار کر لی اور پھر سفر حج پر روانہ ہو گئے۔ ۱۱۴۹ھ/ ۱۷۳۷ء میں فریضۂ حج ادا کیا۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی (متوفی ۲۶ صفر ۱۱۶۳ھ/ ۲۴ جنوری ۱۷۵۰ء) کی مسند تدریس آراستہ تھی، اس میں شریک ہو گئے اور ان سے علم حدیث حاصل کیا۔ پھر ہندوستان واپس آئے اور زندگی کے آخری دو سال فرخ آباد میں گزارے اور وہیں ۵ جمادی الاخریٰ ۱۱۸۳ھ/ ۱۶ اکتوبر ۱۷۶۹ء کو وفات پائی[1]۔

۱۰۱۔ مفتی یعقوب فرنگی محلی لکھنوی

علمائے فرنگی محلی کی طویل فہرست میں مفتی یعقوب بن عبدالعزیز بن اسعد بن قطب الدین انصاری سہالوی لکھنوی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ ممدوح کا شمار بارھویں صدی ہجری کے ممتاز ہندی علما وفقہا میں ہوتا ہے۔ ان کا مولد ومنشا لکھنؤ ہے۔ اپنے دور کے معروف عالم مولانا محمد حسن انصاری سہالوی لکھنوی (متوفی ۳ صفر ۱۱۹۹ھ/ ۱۶ دسمبر ۱۷۸۴ء) اور اپنے والد مکرم کے عم محترم اور عالم کبیر شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/ ۲۵ اپریل ۱۷۴۸ء) سے کسب علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مسند درس پر فائز ہوئے اور علم فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں شہرت حاصل کی۔ ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کی زندگی ہی میں ان کا شمار اپنے عصر کے معروف علمائے کرام میں ہونے لگا تھا۔ ان کی علمی شہرت سے متاثر ہو کر وزیر الممالک صفدر جنگ ابوالمنصور خان نے ان کو لکھنؤ کے منصب افتا پر فائز کر دیا تھا۔

مفتی یعقوب علوم دینیہ کا درس دیتے تھے اور امانت و دیانت میں نہایت مشہور تھے۔ انھوں نے ۶۳ سال عمر پائی اور ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا[2]۔

---

[1] تجلی نور، ج ۲ ص ۴۸ تا ۵۱ - تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۶۹۰ - نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۴۱۹، ۴۲۰۔

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۰ - تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۲۰۵، ۲۰۶ - نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۴۲۲ - احوال علمائے فرنگی محل ص ۸۱۳

Marfat.com

مراجع ومصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ صحیح بخاری: محمد بن اسماعیل بخاری۔ مطبع اصح المطابع دہلی۔

۲۔ صحیح مسلم: امام مسلم۔ مطبع اصح المطابع، دہلی۔

۳۔ ابجد العلوم: نواب صدیق حسن خان۔ مطبع صدیقیہ، بھوپال، ۱۲۹۵ھ۔

۴۔ اتحاف النبلا: نواب صدیق حسن خان۔ مطبع نظامی، کان پور، ۱۲۸۸ھ۔

۵۔ احوال علمائے فرنگی محل: شیخ الطاف الرحمٰن۔ مطبع مجتبائی۔

۶۔ اخبار الصنادید: حکیم نجم الغنی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔

۷۔ ادبیات سرحد: رضا ہمدانی۔ نیا مکتبہ، پشاور۔ ۱۹۵۳ء

۸۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ بہ ضمن ''ٹیپو سلطان''، مضمون غلام رسول مہر۔

۹۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ بہ ضمن ''حافظ رحمت خاں''، مضمون بزمی انصاری۔

۱۰۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور بہ ضمن ''برکی''، مضمون ڈاکٹر محمد جہاں گیر خاں۔

۱۱۔ اذکار الابرار: شاہ محمد تقی حیدر۔ شاہی پریس، لکھنؤ۔ ۱۳۵۷ھ

۱۲۔ ارمغان شاہ ولی اللہ: محمد سرور جامعی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور۔

۱۳۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبع احمدی، دہلی۔

۱۴۔ امداد فی مآثر الاجداد: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبع احمدی، دہلی۔

۱۵۔ عطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبع احمدی، دہلی۔

۱۶۔ انفاس العارفین: شاہ ولی اللہ دہلوی، مطبع مجتبائی، دہلی ۱۹۱۷ء

۱۷۔ البدور البازغہ: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ شاہ ولی اللہ اکیڈیمی، حیدر آباد (سندھ) ۱۹۷۰ء

۱۸۔ تاریخ سلطنت خداداد میسور: محمود خان بنگلوری۔ پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور۔ ۱۹۴۷ء

۱۹۔ بزم تیموریہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

۲۰۔ بزم سخن: سید علی حسن خان، مطبع نامی مفید عام، آگرہ۔ ۱۸۸۱ء

Marfat.com

۲۱۔ بوستان اخبار: سید احمد مارہروی۔ مطبوعہ آگرہ۔ ۱۳۳۱ھ۔

۲۲۔ تاریخ برہان پور: خلیل الرحمٰن برہان پوری۔ مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۱۷ھ۔

۲۳۔ تاریخ خورشید شاہی: غلام امام خان ترین۔ مطبع خورشیدیہ، حیدرآباد (دکن) ۱۲۸۶ھ۔ ۱۸۷۰ء

۲۴۔ تاریخ شیراز ہند جون پور: سید اقبال حسین۔ ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس، جون پور۔ ۱۹۶۴ء

۲۵۔ تاریخ کشمیر اعظمی: خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔ ناشر، غلام محمد نور محمد سری نگر۔

۲۶۔ تاریخ مشاہیر چشت: خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۳ء

۲۷۔ تاریخ معصومی: میر محمد معصوم بھکری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۲۸۔ تاریخ النوائط: نواب عزیز جنگ بہادر۔ عزیز المطابع، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۲ھ

۲۹۔ تجلی نور المعروف تذکرہ مشاہیر جون پور: نور الدین زیدی۔ مطبع اعظم المطابع، جون پور۔ ۱۸۸۹ء

۳۰۔ تحفۃ الکرام: میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۳۱۔ تحفہ کشمیر: منشی گنیش لعل دہلوی، مطبع کوہ نور، لاہور۔ ۱۸۵۳ء

۳۲۔ تذکرہ آثار الشعراء: سید محمد ممتاز، مطبع شاہ جہانی، بھوپال۔ ۱۳۰۴ھ

۳۳۔ تذکرۃ الشعراء: امیر دولت شاہ۔ مطبع مجیدی، کان پور۔ ۱۳۲۶ھ

۳۴۔ تذکرہ صوفیائے سندھ: اعجاز الحق قدوسی۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۳۵۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ: محمد الدین فوق۔ گلزار محمدیہ اسٹیم پریس، لاہور، ۱۳۳۸ھ

۳۶۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل: مولوی محمد عنایت اللہ۔ مطبوعہ لکھنؤ۔ ۱۹۳۰ء

۳۷۔ تذکرہ علمائے ہند: رحمان علی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۳۸۔ تذکرہ مشائخ بنارس: ابو الاثر عبد السلام۔ ندوۃ المعارف، بنارس۔ ۱۳۷۱ھ

۳۹۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری: محمد علی حیدر۔ مطبع اصح المطابع لکھنؤ۔ ۱۹۲۷ء

۴۰۔ تذکرہ مصنفین درس نظامی: اختر راہی۔ مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔ ۱۳۹۸ھ۔ ۱۹۷۸ء

۴۱۔ تفہیمات الالہیہ: شاہ ولی اللہ۔ مطبوعہ حیدرآباد (سندھ) ۱۹۶۷ء

۴۲۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: نواب صدیق حسن خان۔ مطبوعہ بھوپال۔ ۱۲۹۸ھ

۴۳۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند: سید عبد الحی حسنی لکھنوی۔ مطبوعہ دمشق۔ ۱۹۵۸ء

۴۴۔ چمنستان شعراء: رائے لچھمی نرائن شفیق: مطبوعہ حیدرآباد (دکن) ۱۹۲۸ء

۴۵۔ حجۃ اللہ البالغہ: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ۔ لاہور۔ ۱۹۷۵ء

۴۶۔ حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۳۲۴ھ۔ ۱۹۰۶ء

۴۷۔ حدیقۃ الاولیا: مفتی غلام سرور لاہور۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۷۷ء

Marfat.com

۴۸۔ حکایات کشمیر: محمد الدین فوق۔ کریمی پریس، لاہور۔ ۱۳۴۷ھ۔ ۱۹۲۹ء

۴۹۔ حیات حافظ رحمت خاں: سید الطاف علی بریلوی۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔ ۱۹۶۳ء

۵۰۔ حیات العلما: سید عبدالباقی سہوانی۔ مطبع نول کشور، لکھنو۔ ۱۳۴۰ھ۔ ۱۹۲۲ء

۵۱۔ حیات ولی: مولانا رحیم بخش دہلوی۔ مکتبہ سلفیہ، لاہور۔ ۱۹۵۵ء

۵۲۔ تذکرہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبہ احباب، لاہور۔

۵۳۔ قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مکتبہ سلفیہ، لاہور۔ ۱۳۹۶ھ۔ ۱۹۷۶ء

۵۴۔ ایضاح المکنون فی الذیل علیٰ کشف الظنون: اسماعیل پاشا۔ مکتبہ بہیہ استنبول۔ ۱۹۴۵ء۔ ۱۳۶۴ھ

۵۵۔ وارن ہیسٹنگز اور انگریزی راج: از اے۔ پی۔ مون۔ ترجمہ۔ سید اولاد علی گیلانی۔ ناشر۔ کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۱ء

۵۶۔ مومن، حالات زندگی اور ان کے کلام پر تنقید: کلب علی خان فائق رام پوری۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۶۱ء

۵۷۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل: سید طفیل احمد منگلوری علیگ۔ ناشر حماد الکتبی، شیش محل روڈ۔ لاہور۔

۵۸۔ خزانہ عامرہ: سید غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع نول کشور۔ لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۵۹۔ خزینۃ الاصفیا: مفتی غلام سرور لاہور۔ مطبع نامی گرامی سراج پنڈت بیج ناتھ موسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ۔ ۱۲۹۰ھ

۶۰۔ خلاصۃ التواریخ: لالہ سجان رائے بٹالوی۔ بہ تصحیح ظفر احسن، مطبع جی اینڈ سنز، دہلی۔ ۱۹۱۸ء

۶۱۔ رود کوثر: شیخ محمد اکرام۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۷۵ء

۶۲۔ روضۃ الابرار: محمد الدین۔ سراج المطابع، جہلم۔ ۱۳۰۲ھ

۶۳۔ روضۃ الاولیا: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع اعجاز صفدری، حیدر آباد (دکن) ۱۳۰۱ھ

۶۴۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع بمبئی۔ ۱۳۰۳ھ

۶۵۔ سرو آزاد: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۹۱۰ء

۶۶۔ سفینۃ الاولیا: داراشکوہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۸۴ء

۶۷۔ سید احمد شہید: غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۴ء

۶۸۔ سیر الاولیا: محمد مبارک علوی المعروف امیر خرد کرمانی۔ مطبع محب ہند۔ دہلی۔ ۱۳۰۲ھ

۶۹۔ سیر المتاخرین: غلام حسین طباطبائی۔ نول کشور لکھنؤ۔ ۱۲۸۲ھ

۷۰۔ طرب الاماثل بتراجم الافاضل: مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی۔ مطبع یوسفی، لکھنؤ۔ ۱۹۲۱ء

۷۱۔ فرحت الناظرین (شخصیات): محمد اسلم پسروری۔ ترجمہ وترتیب، محمد ایوب قادری مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۷۲ء

۷۲۔ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ: مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی، مطبوعہ مصر۔ ۱۳۲۴ھ

۷۳۔ قضاء الارب من ذکر علما النحو والادب: ذوالفقار احمد۔ طبع آگرہ۔ ۱۳۱۶ھ

۷۴۔ کلمات طیبات: ابوالخیر محمد بن احمد مراد آبادی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۰۹ھ

Marfat.com

۷۵۔ گل رعنا: سید عبدالحی حسنی لکھنوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ طبع سوم، ۱۹۶۴ء

۷۶۔ گلزار اولیا: مظفر حسین۔ مطبع سبحانی، حیدرآباد (دکن)۔ ۱۳۳۹ھ۔ ۱۹۲۰ء

۷۷۔ مآثر الامرا: شاہ نواز خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۸۸ء۔ ۱۸۹۰ء

۷۸۔ مآثر عالم گیری: محمد ساقی مستعد خان، نفیس اکیڈیمی، کراچی۔ ۱۹۶۲ء

۷۹۔ مآثر الکرام: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ، لاہور۔ ۱۹۷۱ء

۸۰۔ محبوب ذی المنن تذکرہ علمائے دکن: عبدالجبار خاں ملکاپوری۔ مطبع رحمانی وحسن پریس، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۳ھ

۸۱۔ محبوب ذی المنن تذکرہ شعرائے دکن: عبدالجبار خاں ملکاپوری۔ مطبع رحمانی حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۹ھ

۸۲۔ مرأت احمدی: مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر۔ مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۹۱۷ء

۸۳۔ مسلم الثبوت: قاضی محب اللہ بہاری۔ مطبع انصاری، دہلی۔ ۱۸۹۹ء

۸۴۔ مشاہیر ادب اردو: مہیش پرشاد۔ ناشر ہند کشور اینڈ برادرز بنارس۔ ۱۹۳۲ء

۸۵۔ معمولات مظہریہ: نعیم اللہ بھڑائچی۔ مطبع محمدی، لاہور۔ ۱۳۱۰ھ

۸۶۔ مقامات مظہری: غلام علی علوی مجددی۔ مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۰۹ھ۔ ۱۸۹۲ء

۸۷۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی: مطبع مجتبائی میرٹھ۔ ۱۳۱۴ھ

۸۸۔ مقالات شبلی (جلد سوم): مرتبہ، سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۳۷۵ھ۔ ۱۹۵۵ء

۸۹۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی (جلد دوم): مولانا محمد میاں۔ مکتبہ محمودیہ۔ لاہور۔ ۱۳۹۷ھ۔ ۱۹۷۷ء

۹۰۔ منتخب اللباب: خافی خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۶۹ء

۹۱۔ نزہۃ الخواطر (جلد ششم): سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ، حیدرآباد (دکن) ۱۳۷۶ھ۔ ۱۹۵۷ء

۹۲۔ نوائے معارک: عطا محمد شکارپوری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۹۳۔ مصفّیٰ ومسویٰ شرح موطا: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ جید برقی پریس۔ دہلی۔ ۱۳۴۶ھ

۹۴۔ عمل صالح (شاہ جہان نامہ): محمد صالح کنبو۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور

۹۵۔ کشف الظنون: (دو جلد) حاجی خلیفہ۔ مطبعہ بہیہ، استنبول۔ جلد اول طبع ۱۹۴۱ء۔ ۱۳۶۰ھ، جلد ثانی طبع ۱۹۴۳ء، ۱۳۶۲ھ

۹۶۔ نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ: (جزاول) ابو محمد عبداللہ بن یوسف حنفی زیلعی۔ طبع اول۔ ۱۳۵۷ھ۔ ۱۹۳۸ء

۹۷۔ واقعات دارالحکومت دہلی: (حصہ اول، دوم، سوم) بشیر الدین احمد دہلوی شمسی مشین پریس، آگرہ۔ ۱۳۳۷ھ۔ ۱۹۱۹ء

۹۸۔ ہدیۃ العارفین اسماء المولفین وآثار المصنفین: (جلد اول) اسماعیل پاشا بغدادی مطبعہ بہیہ، استنبول۔ ۱۹۵۱ء

۹۹۔ ہدیۃ العارفین اسماء المولفین وآثار المصنفین: (جلد ثانی) اسماعیل پاشا بغدادی مطبعہ بہیہ، ۱۹۵۵ء

۱۰۰۔ الیانع الجنی: محمد بن یحییٰ المدعو بہ محسن تیمی بکری ترہٹی۔ مطبع صدیقی، بریلی۔ ۱۲۸۷ھ

Marfat.com

۱۰۱۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: خلیق احمد نظامی، ادارہ اسلامیات، لاہور۔

۱۰۲۔ روز نامہ امروز: لاہور، مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۶۰ء مضمون، مولانا علم الدین سالک۔

۱۰۳۔ ہفت روزہ الاعتصام: لاہور، بابت ماہ مارچ ۴، ۱۱ مارچ ۱۹۵۵ء مضمون فیض الرحمٰن الثوری۔

۱۰۴۔ ماہ نامہ ترجمان الحدیث: لاہور، بابت ماہ مارچ ۱۹۷۹ء۔ مضمون ارشاد الحق اثری۔

۱۰۵۔ ماہ نامہ الحق: اکوڑہ خٹک، بابت ماہ جنوری ۱۹۷۸ء مضمون ڈاکٹر سید سعید اللہ۔

۱۰۶۔ ماہ نامہ الرحیم: حیدر آباد، بابت ماہ اگست ۱۹۶۳ء۔ مضمون مخدوم امیر احمد۔

Marfat.com

يؤتي الحكمة من يشاء ومن يؤت الحكمة فقد أوتي خيرا كثيرا

فقہائے ہند

محمد اسحاق بھٹی

دار النوادر

Marfat.com